★ حبِ رسولؐ اور اس کے تقاضے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۷

شمارہ ۱

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ

جنوری ۱۹۸۸ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرتعاون -/۵۰

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر

اقتدار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر - ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیویّن ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور، یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴، پاکستان، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۱

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

اقتدار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ہمارا نقطۂ نظر الم نشرح ہے کہ وطن عزیز میں متفرق اصلاحی کوششوں' اسلامائزیشن
جس کا ترجمہ ایک صاحب نے "اسلام کاری" کیا اور کیا خوب کیا ہے..... کے
آنکھوں میں دھول جھونکنے کے عمل اور انتخابات کے ذریعے جمہوری اداروں کے نقار خانے
میں چند طوطیوں کو داخل کرنے میں کامیاب ہو جانے سے کوئی خیر بر آمد نہ ہو گا۔ یہاں تو ایک
ہمہ گیر انقلابی تحریک ہی کوئی موثر تبدیلی لا سکے گی۔ اس طرح کی کوئی انقلابی تحریک نظریہ
پاکستان سے متصادم بھی ہو سکتی ہے۔ جو یہاں کوئی ایسا انقلاب برپا کرنے کی کوشش کرے جس
کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہم بارگاہ رب العزت میں نہایت عاجزی سے
دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے عطا کردہ اس خطہ ارضی میں ہماری آنکھوں کو ایک اسلامی انقلاب
سے ٹھنڈک بخشے جو منہج نبوی۔ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام..... پر استوار ہو اور
ہماری اپنی اگر نہیں تو ہماری آئندہ نسلوں کی دنیا اور عاقبت کو سنوار دے۔ دجل و فریب کے
سرابوں کی مادّی انسانیت کو راستی اور حقیقت سے روشناس کرے اور دنیا کو ظلم و عدوان کے
مہیب سایوں سے نکال کر عدل و قسط کی روشنی میں نہلا دے۔ بساط بھر اس کے لئے کوشاں بھی
ہیں' اگرچہ ہماری کوششیں تا حال کسی بھی طور اس "من عزم الامور" کام کے ہم پلہ
نہیں۔ ابھی تو ہم طنز و استہزاء ہی کا ہدف ہے۔ تاہم معذرت الی اللہ اپنا فرض ادا کرنے کی
سعی کرتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق دیئے رکھے اور استقامت عطا فرمائے۔

اس پس منظر میں ہمارا حکومت یا عوام سے کسی اکیلی برائی' کسی منفرد خرابی یا کسی مخصوص
منکر پر الجھنا اپنی منزل کھوٹی کرنے کے مترادف ہے۔ اگرچہ دیندار حلقوں اور دین پسند
جماعتوں کی طرف سے اس نوع کی بھی کوئی صدا بلند ہو تو ہماری نحیف آواز ہم آہنگ ہو گی۔

بایں ہمہ ایک دو باتوں کی دہائی دینے پر ہم مجبور ہو گئے ہیں۔ ارباب حکومت سے گزارش کرتے ہیں کہ اللہ کے غضب سے ڈریں' وہ بھی بحمد للہ مسلمان ہیں' ولادت کے فوراً بعد اذان اور اقامت ان کے کانوں میں بھی کہی گئی ہے' موت برحق ہے کسی کو اس سے رستگاری نہیں۔ ذرا سوچیں جب اپنے خالق و مالک کی عدالت میں کھڑے ہوں گے تو ان کا کون سا عذر قابلِ سماعت ہو گا۔ اور انبیاء کے جانشین علماء سے ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین حمیت اور غیرت کا طالب ہے۔ وہ کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ دین کی پاسداری اور رجوع الی اللہ کا کیا ذکر' یہاں تو گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ اس بات کا بالالتزام اہتمام ہے کہ دلوں کے دروازے ہر خیر کے لئے بند ہی نہ ہوں' مقفل ہو جائیں۔ قوم کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ پر روز بروز جری کیا جا رہا ہے۔ مسلمان بچوں اور بچیوں کی گھٹی میں مغربیت' بے حجابی و عریانی' بے باکی و گستاخی' مادر پدر آزادی اور جدت و اباحیت کے زہر کی آمیزش کی بھرپور اور کامیاب کوشش جاری ہے۔ آپ کب تک مہر بہ لب رہیں گے؟ تک تک دیدم' دم نہ کشیدم کی روش تا کجا؟؟

☆ ☆ ☆ ☆

اللہ کی بخشندہ تمام صلاحیتیں جن سے انسان برے بھلے کام لیتا ہے اور صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس نے جو علمی' فنی اور ٹیکنالوجیکل میدان مارے اور جو اضافی سہولتیں حاصل کر لی ہیں وہ سب ایسے ہتھیاروں کے ذیل میں آتی ہیں جن کو خیر اور شر دونوں ہی کے لئے یکساں موثر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ابلاغیات کے ضمن میں جو ترقی ہوئی وہ کسی دوسرے سائنسی ارتقاء سے کمتر نہیں۔ اسے لوگوں کی باخبری میں اضافے' قلب و ذہن کے رجحانات کے تعین اور سوچ کی سمت و جہت مقرر کرنے میں جو قدرت حاصل ہوئی۔ اس نے نظری' سمعی اور بصری ذرائع ابلاغ کو طلسماتی استعداد دے دی ہے۔ اور ان میں بھی ٹیلی ویژن کا بصری ذریعہ ابلاغ تو غضب ڈھاتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس کے معدودے چند مفید اور معلوماتی پروگراموں نے بڑوں اور بچوں کی ذہنی سطح' بلکہ "آئی۔ کیو" کو خاصا ہی بلند کیا۔ دوسری طرف حکومت کو اپنے کارناموں کے ڈھول پیٹنے کا اس حد تک موقع ملا کہ لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹنے پہ آ گئے ہیں۔ خبرنامے کے نام پر جناب صدر اور وزرائے کرام کی فوج

تلفر موج کی لشکر کشی دیکھ دیکھ کر ناظرین کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں' لیکن یہ سب کچھ گوارا، "مذہبی" پروگراموں کے حساب میں جمع کرنے کے لئے جو کچھ اس چھوٹی سکرین پر پیش کیا جاتا ہے' اس پر بھی ہم صبر کر لیں گے لیکن سٹیج شو اور ڈراموں کی شکل میں قوم کی رگ و پے میں جو زہر اتارا جارہا ہے اس [illegible]موش رہنا اب ممکن نہیں رہا۔ مشرقی تہذیب و تمدن اور اسلامی طرز معاشرت کی دھجیاں بکھیرنے میں جس سفاکی اور جراتِ رندانہ کو کام میں لایا جارہا ہے اسے یونہی کھل کھیلنے کا موقع دیا گیا تو ہمارا معاشرہ جو پہلے ہی شتر بے مہار ہے' اس کی رہی سہی اقدار کا بھی جھٹکا ہو جائے گا۔

ہمارے قارئین کو ٹیلی ویژن کے ڈراموں کے بارے میں گفتگو "میثاق" میں ذرا نئی چیز لگے گی۔ سو واقعہ یہ ہے کہ اس جریدے کے مدیر مسئول' برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا گھر ایسی "جدید ایجادات" سے اب تک خالی ہے' چنانچہ انہیں خبر ہی نہیں پی۔ ٹی۔ وی کیا قیامت ڈھا رہا ہے۔ البتہ ان سطور کے راقم کی رگ صحافت جب پھڑکتی ہے تو نہ صرف بعض ڈرامے ذرا باقاعدگی سے دیکھ لیتا ہے بلکہ اخبارات میں ان پر ناظرین کے تبصرے بھی نظر سے گزرتے ہیں۔ ان دنوں پی۔ ٹی۔ وی کے تمام مراکز میں نہ صرف ڈراموں کی دوڑ لگی ہوئی ہے بلکہ مقابلہ اس باب میں بھی ہے کہ کون مسلّمہ مشرقی و اسلامی شعائر کا زیادہ قرینے سے خاکہ اڑاتا ہے۔ پورے اعتماد اور ادّعا کے ساتھ کہا جا سکتا کہ بود و باش' نشست و برخاست' چال چلن' زیب و زینت اور گفت و شنید کے جو طور طریقے ان ڈراموں میں دکھائے جاتے ہیں وہ پاکستان کے فی لاکھ ایک کنبے قبیلے یا گھر میں بھی نہیں پائے جاتے لیکن اتنے ہی یقین اور شدت اندیشہ کے ساتھ یہ خطرہ نوشتۂ دیوار نظر آتا ہے کہ الا ماشاء اللہ سو فیصد گھرانوں کی نوخیز نسل کا دم انہی اطوار کو اپنانے کی خواہش پہ نکلا جارہا ہے...... پاکستان ٹیلی ویژن کے شاہکار ڈراموں کے بارے میں اس سے زیادہ لکھنا ان قیمتی اوراق کا ضیاع ہو گا۔ مرکزی وزیر اطلاعات' متعلقہ وزارت کے صاحب اختیار لوگ اور ہماری ہئیت مقتدرہ کو جو بزعم خویش ٹی وی کا قبلہ سیدھا کر چکی ہے' اللہ تعالیٰ اگر نیکی کی توفیق دیں تو یہ تھوڑا لکھا ہی بہت ہے۔ تاہم ایک ڈرامے کا ذکر کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے جس میں معمول کے رطب و یابس پر مستزاد اسلام کے عائلی نظام پہ ہمارے مہربانوں کی چیرہ دستی تجاوز کی سب حدیں پھلانگ گئی۔ کوئٹہ مرکز سے ایک

ڈرامہ چھ اقساط میں ٹیلی کاسٹ ہوا ہے جس کی کہانی کا خلاصہ یوں ہے کہ ایک شخص جو اپنی ماڈرن بیوی اور حساس وذہین بیٹے کے ساتھ معمول کی زندگی بسر کر رہا تھا' ایک لڑکی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے۔ کسی آلائش میں ملوث ہوئے بغیر اس سے شادی کا فیصلہ کرتا اور اپنی سر چڑھی بیوی کو بھی بتا دیتا ہے۔ بس اس پہ ایک طوفان کھڑا ہو جاتا ہے۔ زوجہ محترمہ گھر چھوڑ کر میکے جا بیٹھتی ہیں' بیٹے سے بھی کنارہ کر لیتی ہیں اور پھر شوہر کے تائب ہو جانے اور محترمہ کے ردعمل کی شدت سے متاثر ہو کر اس لڑکی کے بھی انکار کر دینے کے باوجود ان کی برہمی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اعتماد کے نازک آبگینے کو ٹھیس جو لگ چکی تھی۔ آخر کار بیٹے کی کس مپرسی' جذباتی ہیجان اور علالت سے متاثر ہو کر اپنے گھر لوٹتی اور شوہر سے آمنا سامنا ہونے پر اپنا آخری فیصلہ یوں سناتی ہیں۔

"میں اس گھر میں اپنے بچے کی ماں بن کر تو رہ سکتی ہوں' تمہاری بیوی بن کر نہیں"

اور اسی جملے پر ڈرامے کا اختتام ہوتا ہے۔

نکاح ثانی ہمارے دین میں ایسی معیوب حرکت تو نہیں۔ زوجین میں باہمی اعتماد اور ہم آہنگی یقیناً مطلوب شے ہے لیکن اس رشتے کو ایسا چھوئی موئی کا پیڑ کون سی شریعت میں بنایا گیا ہے؟ پھر طلاق یا خلع کے بغیر بیوی کیسے شوہر سے فارغ ہو سکتی ہے؟ اور علیحدگی کا فیصلہ ہو ہی جائے تو ایک خاتون کو محض بچے کی ماں کی حیثیت میں گھر میں کیوں کر ڈالا جائے گا؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہمارے دانشور ارباب اقتدار کے تعاون سے جس فقہ کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں' اس کی جھلکیاں آپ نے دیکھ لیں۔ شاید یہی ہے شریعت اسلامیہ کی تدوین نو! اور اسے "سب" کے لئے قابل قبول بنانے کی کوشش کا ایک نمونہ!!۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

☆ ☆ ☆ ☆

اسلام کا نام لینے والوں کو یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ سود آخرت میں کیسے زیاں کا باعث ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ سے تعبیر کیا ہے اور بادشاہ کون و مکان کی عدالت میں ہتھیار اٹھانے والے باغیوں سے جو سلوک متوقع ہے اس کے بارے میں کسی خوش فہمی کی ہرگز گنجائش نہیں۔ محمد صلی اللہ

علیہ وسلم کی کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان مبارک نے سود کے گناہ کو اپنی ماں کے ساتھ بدکاری سے ستر گنا زیادہ بڑا جرم قرار دیا تو ظاہر ہے کہ...... خاکم بدہن...... یہ نہ مبالغہ آمیزی تھی نہ شاعری۔ یہ یاددہانی ہم صرف اس عملِ شنیع سے بیزاری کے اظہار کے لئے کر رہے ہیں ورنہ اٹھتے بیٹھتے اسلام کا نام لینے والی ہماری حکومت بھی تو اسے حرام اور "متروک" قرار دے ہی چکی ہے۔ سود کے خاتمے کی نوید بہت دنوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں لیکن بالفعل دیکھ یہ رہے ہیں کہ معیشت کی اس اُمّ الخبائث کو صرف میلی آنکھوں سے محفوظ ہی نہیں رکھا جا رہا' اس کی کشید کے نت نئے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں۔ سود کو خاص و عام کے لئے زیادہ سے زیادہ دلکش' مفید اور منفعت بخش بنایا جا رہا ہے کہ ہنیاًمریاً اس سور کو کھاؤ اور خدمت قوم کا ثواب مفت میں لو۔

سود کی حرمت کے صریح احکام' اس پر نکیر کی حکمت اور معاشرے میں اس سے جو فساد پیدا ہوتا ہے اس کی توضیح و تشریح پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اہل علم نے اس پر خاصا وقیع کام کیا ہے۔ ان صفحات میں انہیں دہرانے کا موقع نہیں۔ ہم صرف دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جن کے اثرات سے ہم سب عملاً دوچار ہیں۔ ایک وہ جس کی وضاحت محمد حنیف رامے صاحب نے جو اقتصادیات میں تعلیمی استعداد اور چار سال پنجاب کے وزیر خزانہ رہنے کے باعث فہم و ادراک بھی رکھتے ہیں' راقم الحروف سے ایک نجی گفتگو میں کی اور دوسرا وہ جسے ملک کا ہر صارف بھگت رہا ہے۔ رامے صاحب کے اس دعوے میں صداقت کا وزن محسوس کیا جا سکتا ہے کہ سود کی شرح جوں جوں اونچی ہوتی جاتی ہے توں توں بیکاری میں اضافہ ہونا امر لازم ہے۔ جو شخص اپنی رقم پر گھر بیٹھے ہاتھ پیر ہلائے بغیر اور کسی نقصان کے اندیشے سے صاف بچ کر بیس سے تیس فیصد تک "منافع" حاصل کر سکتا ہے اسے باؤلے کتے نے تو نہیں کاٹا کہ اس سے کاروبار کرے' صنعت لگائے اور سو کھکھیڑ مول لے۔ اور کاروبار سکڑنے لگے' صنعت و حرفت میں سرمایہ کاری کم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ بیکاری بڑھے گی۔ سود کی بالا سے بالا تر ہوتی یہ منفعت اگر ہمیں تا حال بیکاری کے زیادہ چونکا دینے والے اضافے کا احساس نہیں ہونے دیتی تو اس کی ایک وجہ "محنت کی بر آمد" ہے جس نے ہمارے لاکھوں بھائیوں کو دیس نکالا دے رکھا ہے۔ ایک اور سبب سرکاری شعبہ میں صنعتوں کا قیام

اور " ترقیاتی " منصوبوں میں کارکنوں کی کھپت ہے۔ خود یہ رونق ان بیرونی قرضوں کی رہین منت ہے جن کے عوض ہم نے ملک وقوم کو گروی رکھ چھوڑا ہے، جنہیں ہم پیار سے " بیرونی امداد " کہتے اور فخروانبساط سے غیر ملکوں کی طرف سے اپنی صلاحیت اور کارگذاری کا اعتراف قرار دیتے ہیں۔ دوسرا پہلو اس اعتبار سے دردناک بھی ہے کہ استحصال کی حد تک بڑھا ہوا منافع جو ہمارا مرفعہ الحال کاروباری اور صنعت کار اپنے مال اور مصنوعات پر وصول کرتا ہے اس کا بدترین شکار سفید پوش متوسط طبقہ اور نان جویں سے محروم لوگوں کا گروہ ہے۔ ع

سود ایک کا، لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

ہو یہ رہا ہے کہ تاجر و کارخانہ دار اپنا پیسہ (جس کا بڑا حصہ بالعموم " کالے دھن " پر مشتمل ہوتا ہے) اونچی سے اونچی سود کی شرح پر بینکوں اور حکومت کے حوالے کر کے اپنے کاروبار اور کارخانے چلانے کے لئے بینکوں اور مالیاتی اداروں سے سود پر راس المال اور روزمرہ ضروریات کے لئے سرمایہ حاصل کرتا اور اس رقم کے سود کو بھی خرچ اور لاگت میں محسوب کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ منافع کی فیصد تو اخراجات، لاگت اور متوہّم بالائی مصارف کے مجموعے پر ہی لگے گی۔ یوں اس نے اپنے لئے منافع الگ لیا، سرمائے کو الگ دلایا اور اپنی ذاتی رقم پر سود کی آمدنی اس پر مستزاد!۔ ارتکاز زر کی یہ بدترین شکل معاشرے کے افق پہ زرگری اور زرپرستی کی جو قوسِ قزح بکھیرے ہوئے ہے اس کے مشاہدے کے لئے گھر سے نکلنا بھی ضروری نہیں۔

اہلِ وطن کو ایک طرف بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے نجی ادارے ناقابل یقین حد تک اونچی شرح کے ماہانہ " منافع " کی ضمانت دے کر مفت کی کمائی کے چکر میں ڈال رہے ہیں تو دوسری طرف ہماری حکومت بھی اس دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں۔ قومی بچت کی درجنوں سودی سکیموں کے علاوہ صوبائی حکومتیں بھی عوام سے طویل المیعاد سودی قرضے طلب کرتی رہتی ہیں۔ ایک المیہ یہ ہے کہ دفاع وطن کے مقدس نام پر جو بچت طلب کی جاتی ہے اس پر " منافع " کی شرح سب سے زیادہ ... لگ بھگ تینتیس (۳۳) فیصد ...... رکھی گئی ہے۔ ملک خداداد کا دفاع نہ ہوا، سب سے زیادہ نفع دینے والا سودا ہوا۔ اس کام میں کمائی کی سبیل ہے کونسی؟۔ انکم ٹیکس میں چھوٹ کی اضافی سہولت اس کے علاوہ ہے۔ ویسے بھی آمدنی کا

ایک متعین حصہ اگر اس طرح کی سکیموں میں لگایا جائے تو ہر کس و ناکس کو ٹیکس میں رعایت ملتی ہے..... ٹیکس گذار کی فطری طور پر خواہش ہوتی ہے کہ اس رعایت سے فائدہ اٹھائے لیکن.....
ایک نسبتاً پاک و صاف سرمایہ کاری کے سوا..... دستیاب تمام سہولتوں میں اس کا سود کی معصیت میں ملوث ہوئے بغیر چارہ نہیں یہ استثناء این۔ آئی۔ ٹی کے یونٹوں کو ہے جن کی رقم مختلف کمپنیوں کے حصص خریدنے میں لگائی جاتی اور حاصل شدہ منافع کو اخراجات منہا کر کے یونٹ ہولڈروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس شفاف و طیب پانی کو بھی گھڑے میں ایک قطرہ پیشاب ڈال کر مشکوک بنا دیا گیا۔ نیشنل انویسٹ منٹ ٹرسٹ پر قانونی طور پر یہ پابندی لگائی گئی ہے کہ یونٹ ہولڈروں کو دیا جانے والا ڈیویڈنڈ ساڑھے سات فی صد سے کم نہ ہو گا۔ حالانکہ اب تک کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ اس شرط کی ہرگز کوئی حاجت نہ تھی۔ ٹرسٹ سرمایہ کاری کے لئے اچھی شہرت رکھنے والی کمپنیوں اور صنعتوں کو منتخب کرتا اور ان سے ہمیشہ معقول ڈیویڈنڈ حاصل کرتا ہے۔ یونٹ ہولڈروں کو بتایا گیا ہوتا کہ وہ نہ صرف نفع جتنا بھی ہو ... میں شریک ہیں بلکہ نقصان کی صورت بھی موجود ہے تو نتیجے میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا البتہ حلال و حرام کی تمیز رکھنے والوں کو انشراح صدر کی نعمت ضرور میسر ہو جاتی۔

سود کو " منافع " کا بے ضرر نام دے کر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ پاکستان کی معیشت کو غیر سودی بنیادوں پر استوار کیا جا رہا ہے۔

جنوں کا نام خرد رکھ دیا' خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

لیکن للہ ذرا سوچئے اس کرشمہ سازی سے ہم کسے دھوکہ دے رہے ہیں! یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ○

مرے پر سو دُرّے۔ سود کی لعنت ہم پر مسلط تھی ہی۔ واپڈا نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اپنی شاہ خرچیاں نبھانے کے لئے دو ارب روپے کے..... زیادہ آ جائیں تو اہلاً و سہلاً..... پانچ سالہ بانڈ جاری کئے گئے ہیں جن پر ساڑھے تیرہ فیصد سے زیادہ منافع دیا جائے گا' انکم ٹیکس بالکل معاف ' کسی شناخت کی ضرورت نہیں۔ بانڈ " بے نامی " ہیں۔ کالے دھن کی نکی

جتنی چاہیں اس دریا میں ڈال دیں۔ کوئی بڑا ہاتھ مارا یا ڈاکہ بھی ڈال لیا ہے تو رقم چھپانے کے لئے کونے کھدروں کی تلاش نہ کیجئے۔ فوراً نزدیک ترین بنک سے خود جا کر ورنہ کسی کو بھیج کر واپڈا کے بانڈ خرید لیجئے۔ تعداد و مقدار کی بھی قید نہیں...... یہ ترغیبات کافی نہیں تو لیجئے زکوٰۃ کی کٹوتی بھی معاف جو آپ کی طبع نازک پر بہت گراں گذرتی ہے۔ اور جس سے بچنے کے لئے آپ جھوٹے "حلف نامے" داخل کرتے ہیں ع

تو مشق ناز کر، خون دو عالم میری گردن پر

تفنن بر طرف! حکومت زکوٰۃ کی وصولی کس طریقے اور کون سے حساب سے کرتی ہے؟ اور اس کی خرچ کی مدات کیا ہیں؟ یہ سوالات بھی اگرچہ اہم ہیں تاہم فی الحال ان سے صرف نظر کر لیا جائے تب بھی یہ حق اسے کس نے دیا ہے کہ جسے چاہے اپنی طرف سے اس کی فرضیت میں استثناء فراہم کرے۔ یہ استحقاق تو خلیفہ رسولؐ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھی نہ تھا۔ کیا اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ہم یاد دلائیں۔ مانعین زکوٰۃ نے کہا صرف یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ حکومت کو نہیں دیں گے، اپنے مستحقین میں تقسیم کر دیں گے اور ان سے جنگ کو مصلحت وقت کے خلاف سمجھنے والے ساتھیوں سے سیدنا ابو بکرؓ نے جو بات کہی وہ تاریخ کے صدف میں گوہر آبدار کی طرح محفوظ ہے۔ مفہوم یہ تھا کہ خدا کی قسم! اگر یہ لوگ وہ اونٹ تو دے دیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے اور ان کی ٹانگیں باندھنے والی وہ رسیاں نہ دیں جو حضورؐ کو دیا کرتے تھے، تب بھی میں ان سے قتال کروں گا۔

دوسری طرف شریعت اسلامیہ کے اصولوں کو یوں مذاق کا موضوع بنایا جاتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے تئیں مستحق زکوٰۃ ہی کیوں نہ ہو، اگر بنک میں کرنٹ حساب کھولنے کی بجائے رمضان المبارک سے دس دن پہلے ایک ہزار روپے کہیں سے پکڑ کر نام نہاد پی۔ ایل۔ ایس میں جمع کرا دے تو پندرہ دن بعد زکوٰۃ کے نام پر اس سے پچیس (۲۵) روپے کی کٹوتی کر لی جائے گی۔

ہم نے بات جہاں سے شروع کی، وہیں ختم کرتے ہیں۔ ارباب حل و عقد سے دردمندانہ گذارش کرتے ہیں کہ اللہ کے اوامر و نواہی کی یوں ہنسی نہ اڑائیں۔ ان بدبختوں میں شامل

ہونے سے بچیں جن سے ایک دن..... اور وہ دن آ کر رہے گا ... ہمارا رحیم و کریم اللہ یوں مخاطب ہو گا

وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ○

اظہارِ تشکّر

ہم ان تمام حضرات کے انتہائی ممنون ہیں جو ۱۹۸۷ء کے دَوران ماہنامہ میثاق، سے اشتہارات کی صورت میں تعاون فرماتے رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالے ایسے تمام حضرات کو دنیا و آخرت کی سعادتوں سے حصّہ عطا فرمائے (آمین)، ہمیں توقع ہے کہ ایسے حضرات ۱۹۸۸ء کے دَوران بھی اپنا تعاون جاری رکھیں گے۔ اور اس کارِ خیر میں اپنی شرکت کو برقرار رکھیں گے۔

منیجر اشتہارات
ماہنامہ میثاق، لاہور

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہُدیٰ

درس ۱۱ ، نشست ۵۱

مباحثِ عمل صالح

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

(سورۃ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں)

(۲)

معزز حاضرین و محترم سامعین۔ گزشتہ نشست میں ہم نے سورۃ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کی آیات کا ترجمہ تسلسل کے ساتھ پڑھ لیا تھا۔ جس سے ہمارے سامنے ان آیاتِ مبارکہ میں جو مضامین آئے ہیں' ان کا ایک اجمالی نقشہ آ گیا۔ آج سے ہم ان میں جو اہم نکات ہیں ان میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے بارے میں کسی قدر تفصیلی گفتگو کریں گے۔ چنانچہ آج تین نکات پر گفتگو ہو گی۔

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان آیات کے آغاز میں بھی شرک کی مذمت اور ممانعت ہے اور ان کا اختتام بھی اسی مضمون پر ہو رہا ہے۔ گویا وہ تمام اوصاف یا وہ تمام اقدار جو ان آیات میں بیان ہو رہی ہیں ان کے لئے توحید باری تعالیٰ ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح ہم نے سورۃ مومنون اور سورۃ معارج میں دیکھا تھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں آغاز بھی نماز سے ہوا تھا (قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○) اور پھر اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا تھا (وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○) بعینہٖ یہ بات ہمیں نظر آ رہی ہے۔ اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ چونکہ اسلام دینِ توحید ہے اور توحید کی ضد ہے شرک۔ لہٰذا اسلام جو بھی معاشرہ بنانا چاہتا ہے' اس میں توحید کو مرکز کی حیثیت

حاصل ہے۔ اور شرک کا مکمل استیصال یعنی جہاں بھی شرک کا شائبہ بھی نظر آئے اسے محو کرنا گویا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس لئے کوئی بھی معاشرہ اپنے بنیادی نظریہ' اپنے اساسی فکر کے خلاف کسی چیز کو در آنے کا موقع دے گا تو ظاہر بات ہے کہ اس سے اس معاشرے کے جڑیں کھد جائیں گی۔

اب یہاں دیکھئے کہ ابتدا میں فرمایا وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ...... بڑا فیصلہ کن انداز ہے "تیرے رب نے طے فرما دیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے" ...... اختتام پر بھی توحید ہی کا مضمون ہے البتہ انداز مختلف ہے۔ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ "اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ ٹھہرا بیٹھنا" بات ایک ہے لیکن اسلوب جدا ہے دونوں باتیں تو فی الحقیقت شرک فی العبادت کی نفی کر رہی ہیں۔ مگر دنیا میں شرک کی ایک اور قسم بھی موجود رہی ہے' جسے شرک فی الذات کہتے ہیں۔ یعنی کسی کو خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دینا۔ جیسے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔

اسی طرح اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے جتنے بت تھے' ان کے نام مونث ہیں جیسے لات' یہ الہ کا مونث ہے' عزیٰ یہ العزیز کا مونث ہے منات' یہ المنان کا مونث ہے اپنے خیال کے مطابق انہوں نے فرشتوں کو اپنا معبود قرار دیا اور ان کے بارے میں یہ سمجھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس کے ضمن میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں تنقید کی جا رہی ہے کہ ہوش مندو تم نے اللہ کو الاٹ بھی کیں تو بیٹیاں!! اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ "کیا تمہارے رب نے تم کو تو چن لیا ہے بیٹوں کے لئے؟" وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا "اور اپنے لئے فرشتوں کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لیں!" اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا "جان لو کہ یہ بات جو تم اپنی زبان سے نکال رہے ہو' یہ اللہ کی جناب میں بہت بڑی جسارت ہے' بہت بڑی گستاخی ہے"۔

دوسرا نکتہ ہے وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا یہ مضمون جیسا کہ میں نے گزشتہ مرتبہ عرض کیا تھا کہ اس سے پہلے سورہ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اور یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات اور بھی ہیں کہ

جہاں اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس مضمون کی خصوصی اہمیت کیا ہے؟ اگر آپ ذرا غور کریں گے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جسے معاشرہ یا سماج کہتے ہیں وہ خاندان کا اجتماع ہے بہت سے خاندان مل کر معاشرے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ گویا معاشرے کی اکائی خاندان ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر خاندان مستحکم ہو گا' اس کا نظام مضبوط ہو گا تو پورا معاشرہ بھی مستحکم ہو گا اور خاندان کمزور پڑ جائے تو پورے معاشرے میں بھی اضمحلال اور فساد رونما ہو گا۔ کہ اگر اینٹیں کچی ہوں گی تو فصیل بھی کچی ہو گی۔ اینٹیں پکی ہیں' ہر اینٹ اپنی جگہ ہے تب ہی کوئی فصیل پختہ کہلائے گی۔

ایک مشہور مفکر نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے اس نے کہا ہے کہ میں نے جتنی بھی تہذیبوں اور تمدنوں کا مطالعہ کیا ہے' میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کوئی تہذیب اور کوئی تمدن زوال سے دوچار نہیں ہوتا جب تک اس میں خاندان کا ادارہ کمزور نہ پڑ جائے۔ یہ گویا تہذیب و تمدن کے اضمحلال اور زوال کا نقطہ ء آغاز ہے۔ اب اگر ہم غور کریں تو خاندان کے ادارے کے ابعادِ ثلاثہ (THREE DIMENSION) یعنی تین اہم گوشے ہیں ایک گوشہ ہے شوہر اور بیوی کے باہمی ربط و تعلق کا دوسرا گوشہ ہے والدین اور اولاد کے باہمی ربط و تعلق کا اور تیسرا گوشہ ہے بہنوں اور بھائیوں کے درمیان رشتہ ء اخوت سے متعلق ہے۔ خاندان کے ادارے کے یہ تین ابعاد و اطراف یا اہم گوشے ہیں جن کے مابین اگر صحیح توازن قائم رہے گا تبھی خاندان کا نظام مستحکم ہو سکتا ہے۔ جہاں تک شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے' اس موضوع پر ہم سورۂ تحریم میں قرآن مجید کی بنیادی رہنمائی قدرے تفصیل کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔

اب یہاں یہ سمجھئے کہ اگر کسی معاشرے میں والدین سے بے رخی عام ہو جائے تو یہ خاندانی نظام کو مضمحل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہو گا۔ اگر والدین کو یہ اعتماد نہ ہو کہ بڑھاپے میں ہماری اولاد ہمارا سہارا بنے گی تو ان میں بھی خود غرضی پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر وہ بھی اپنے آپ کو کلیۃً اولاد میں ' INVEST ' کرنے کے آمادہ نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے مستقبل کے لئے کچھ بچا بچا کر رکھیں گے۔ لیکن اگر کسی معاشرے میں یہ قدر (VALUE) موجود ہے کہ بوڑھے والدین کا ان کی اولاد سہارا بنتی ہے' ان کی ذمہ داریوں کو پوری طرح

نباہتی اور ادا کرتی ہے تو والدین بھی اپنی جوانی کے دور کی ساری توانائیاں اپنی اولاد پر کھپاتے اور
' INVEST ' کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں آج بھی الحمدللہ یہ رنگ بڑی حد تک موجود
ہے۔ لیکن اس کے بالکل برعکس صورت حال دیکھنا چاہیں تو آپ یورپ اور امریکہ جاکر وہاں
کے معاشروں کا مشاہدہ کیجئے۔ وہاں موجودہ دور میں بوڑھاپا سب سے بڑی لعنت سمجھی جاتی
ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں حکومت کی سطح پر بوڑھوں کے لئے ادارے قائم ہیں' ان کی دیکھ بھال
ہو رہی ہے' لیکن وہ پیاس جو محبت کی پیاس ہوتی ہے' اس پیاس کی تسکین کا ان اداروں میں
کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ تڑپتے رہتے ہیں اپنی اولاد کو دیکھنے تک کے لئے۔ ان ممالک میں
کرسمس کی اب اہمیت یہ رہ گئی ہے کہ بوڑھے والدین ان اداروں میں اپنے دل میں یہ تمنا اور
توقع کئے منتظر رہتے ہیں کہ شاید اس کرسمس کے موقع پر ہمارے بچے ہم سے ملنے آئیں اور ہم
اپنی اولاد کی اس موقع پر شکل دیکھ سکیں۔

اس کے برعکس نظام ہے جو اسلام نے دنیا کو دیا ہے اس میں والدین کے ساتھ حسن
سلوک کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ قرآن مجید میں جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اکثر مقامات پر اللہ
کے حقوق کے متصلاً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہوتا ہے۔ سورۂ لقمان میں جب بات آئی
تھی تو وہاں والدین میں سے والدہ کا جو فائق حق ہے اسے واضح کیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض
کیا تھا کہ تکرار محض کہیں نہیں ہوتی۔ وہاں والدین میں سے والدہ کا ذکر بطور خاص تھا حَمَلَتۡهُ
اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِىۡ عَامَيۡنِ اور یہاں اگر نوٹ کریں گے تو یہاں ضعیفی کی
وہ عمر خاص طور پر پیش نظر ہے کہ جس کو قرآن مجید میں ارذل العمر قرار دیا گیا ہے۔ وہ حصہ جو
عمر کا بڑا ہی کمزوری اور بے چارگی والا حصہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمر کے اس
حصے سے اللہ کی پناہ طلب کی ہے۔ غور کیجئے کہ عمر کے اس حصے میں کیا ہوتا ہے ایک تو بوڑھے
والدین کے احساسات زیادہ نازک ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اکثر و بیشتر ان کے فہم میں بھی کمی
آجاتی ہے۔ جیسے سورہ یٰسین میں فرمایا وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِى الۡخَـلۡقِ ان کی ذہنی توانائیاں
پہلی سی نہیں رہتیں۔

فہم و فکر میں بھی اضمحلال واقع ہوتا ہے اور بہت سے لوگوں کا مشاہدہ ہو گا کہ بڑھاپے میں انسان
بچپن کی سی خواہشات عود کر آتی ہیں وہ اسی طرح کی کچھ فرمائشیں کرنے لگتے ہیں۔ ان حالات

میں واقعہ یہ ہے کہ اولاد کے لئے بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ پھر وہ ان کی سب فرمائشیں پوری بھی نہیں کر سکتے۔ کہیں نہ کہیں روک لگانی پڑے گی، رد کرنا پڑے گا اس کے پیش نظر یہاں حکم یہ دیا جارہا ہے کہ جب بھی بات کرو تو نرمی اور ادب کو بہر حال ملحوظ رکھو۔ سینہ تان کر بات نہ کرو۔ جھڑکو مت۔ ملامت نہ کرو۔ اور اگر ان کی کسی بات کو پورا نہیں کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کرو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے سامنے اپنے شانے جھکا کر رکھو۔ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ آج یہ مجھ سے سینہ تان کہ بات کر رہا ہے در آں حالانکہ یہ کبھی اس حال میں تھا کہ اس کا وجود بھی ہمارا مرہون منت تھا۔ اس کی پرورش ہمارے ذمہ تھی اور اپنا پیٹ کاٹ کر اس کی ضروریات کو مقدّم رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فرمادیا کہ اللہ سے بھی دعا کرتے رہا کرو کہ ؟ پروردگار، مجھ سے اگر کوئی کوتاہی ہو ہی جائے تو تو بخشنے والا ہے اور والدین کے تمام حقوق میں خود ادا کر بھی نہیں سکتا، ان کے احسانات کا جو بار گراں میرے کاندھوں پر ہے ان کا حساب میں نہیں چکا سکتا لہٰذا تجھ ہی سے استدعا کر رہا ہوں۔ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيْرًا "تو ان پر رحم فرما جیسے انہوں نے مجھے پالا اور پوسا جبکہ میں چھوٹا تھا"۔

ساتھ ہی تسلی بھی دے دی کہ اگر استثنائی حالات میں کبھی تمہیں ان کی بات کو رد کرنا پڑ جائے تو ایک سعادت مند بیٹے پر اس کا جو احساس طاری ہو گا اور جو کوفت اسے ہو گی اس کے ازالے کیلئے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں تمہارا رب صرف ظاہر کو نہیں جانتا بلکہ وہ جانتا ہے جو تمہارے میں جی ہے رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ تم نے اگر کسی وقت اپنے والدین کی فرمائش کو رد کیا ہے تو تمہاری کیا مجبوری ہے! تمہارے کیا حالات ہیں، تمہارا رب خوب جانتا ہے۔ اگر تم اپنی قلبی کیفیت کے اعتبار سے درست ہو اور نیک نیت ہو تو اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی مغفرت فرمانے والا ہے۔ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ۝

اب تیسرے نکتے کی طرف آیئے۔ ویسے یہ مضمون بھی اس سے پہلے آچکا ہے، لیکن یہاں ایک نئی شان سے آرہا ہے فرمایا۔ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ دیکھئے یہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے بعد اب انسان کے حسن سلوک کا دائرہ بڑھنا چاہئے اور ظاہر بات ہے کہ "الاقرب فا لاقرب" کے اصول کے مطابق جو سب سے قریب ہے وہ سب سے پہلے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ یعنی جو فطری طور پر

مقدم ہے اسی کو مقدم رکھنا ہوگا۔ پس جو قرابت دار ہیں' رشتہ دار ہیں' ان کا حق حسن سلوک میں فائق رہے گا اور مقدم رہے گا۔ پھر اس دائرے میں شامل کرو معاشرے کے محروم افراد کو۔ مساکین ہیں' مجبور ہیں' یتیم ہیں' مسافر ہیں۔ پس تمہارے حسن سلوک کا دائرہ بڑھتا چلا جانا چاہئے۔

اب دیکھئے یہاں آگے ایک عجیب بات آئی ہے۔ وہ یہ کہ کوئی شخص یہ خیر' یہ نیکی' یہ بھلائی نہیں کر سکتا اگر وہ اپنی دولت کو نام و نمود' نمائش اور اللوں تللوں میں اڑا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی تبذیر کی ممانعت کی گئی جو ادائے حقوق کی ضد ہے۔ گویا ایک ہی آیت مبارکہ میں معاشرتی و سماجی اعتبار کے اخراجات کی دو انتہاؤں کو جمع کر دیا گیا اور یہ رہنمائی دے دی گئی کہ انسان کو چاہئے کہ ابنائے نوع پر اپنی دولت مندی کا رعب گانٹھنے کے لئے نام و نمود اور نمائش کے فضول کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے اسے ان کی ضروریات اور احتیاجات کو رفع کرنے کا ذریعہ بنائے۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرمایا وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا "اپنی دولت کو اللوں تللوں میں مت اڑاؤ۔

یہاں نوٹ کیجئے گا کہ اس سلسلے میں سورۃ الفرقان میں ایک لفظ آیا تھا؟ اسراف' ...... یہاں اسراف کے بجائے ؟تبذیر' کا لفظ آیا ہے۔ اب سمجھنا ہے کہ اسراف بھی قابل مذمت شے ہے اور تبذیر بھی قابل تحذیر شے ہے' لیکن ان کے مابین فرق کیا ہے!۔ اسراف ہے انسان کا اپنی کسی جائز ضرورت کو پورا کرنے میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا۔ خوراک ہماری ضرورت ہے لیکن ضرورت سے آگے بڑھ کر انواع و اقسام کے کھانوں کو دسترخوان کی زینت کا معمول بنا لینا اسراف کے ذیل میں آئے گا۔ کپڑے پہننا اور تن ڈھانپنا ہماری ضرورت ہے' لیکن بیس بیس اور تیس تیس جوڑوں سے الماریاں بھری ہوئی ہیں' یہ اسراف ہے۔ تو جائز ضرورتوں پر ضرورت سے زاید خرچ کرنا اسراف کہلاتا ہے۔ اس اسراف کی ضد ہے بخل۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کشادگی دے رکھی ہے' آسودگی اور خوش حالی ہے لیکن انسان دولت کو سینت سینت کر رکھ رہا ہے۔ دوسروں پر تو کیا خرچ کرے گا خود اپنی جائز ضرورتوں میں بھی بخل سے کام لیتا ہے یہ انسان کی ذاتی اور نجی اخراجات کی دو انتہائیں ہیں چنانچہ انسان کے ذاتی سیرت و کردار کے اوصاف کے ضمن میں سورۃ الفرقان میں اس بات کو مثبت طریقے پر بیان کر دیا گیا

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ○ ...... "عباد الرحمٰن جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کریں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں کہ حقیقی ضرورت کے معاملے میں بھی خرچ کرتے ہوئے وہ دل میں گھٹن محسوس کریں' بلکہ ان کا معاملہ اور رویہ اعتدال کا رہتا ہے۔ " اب ذرا غور کیجئے کہ تبذیر کیا ہے؟ تبذیر اس خرچ کو کہا جاتا ہے جس کی سرے سے کوئی حقیقی ضرورت ہے ہی نہیں۔ صرف نمائش کے لئے' نمود کے لئے' لوگوں پر اپنی دولت کا رعب گانٹھنے کے لئے اپنی دولت مندی کی دھونس جمانے کے لئے دولت خرچ کی جا رہی ہے۔ جیسے ہمارے اہل ثروت کے یہاں شادی کی تقاریب کے موقع پر ہوتا ہے۔

اس تبذیر کی یہاں جو مذمت ہوئی ہے وہ بڑی ہی شدید مذمت ہے فرمایا گیا کہ یہ مبذرین' یہ فضول خرچی کرنے والے دراصل شیطانوں کے بھائی ہیں۔ غور کیجئے ایسا کیوں کہا گیا! شیطان انسانوں پر جو سب سے بڑا حربہ آزماتا ہے' خصوصاً معاشرتی' سماجی اور تمدنی سطح پر' وہ انسانوں کے دلوں سے باہم محبت واخوت کے رشتوں اور جذبات کو ختم کر کے ان میں نفرت وعداوت کے بیج بو دیتا ہے... چنانچہ شراب اور جوئے کے بارے میں سورۃ المائدہ کی آیت ۹۱ میں فرمایا گیا "شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے دل میں عداوت اور بغض اور دشمنی کے بیج بو دے" ... اب آپ غور کریں گے کہ تبذیر سے بھی یہی نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ ایک شخص جو بہت بڑا سرمایہ دار ہے' اس کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کا عالی شان بنگلہ ہے جو جگمگ جگمگ کر رہا ہے۔ اس کے چپے چپے اور درختوں کے ایک ایک پتے کے ساتھ روشنی کے قمقمے لگا دیئے گئے ہیں۔ پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی ہے اسی کوٹھی میں اس کا کوئی شوفر بھی ہے' کوئی خانساماں بھی ہے' اس کے بنگلے میں مختلف کاموں کے لئے بہت سے ملازمین بھی ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ان ملازمین میں سے کسی کی بچی جوان اس لئے بیٹھی ہوئی ہو اور اس کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکتے ہوں کہ بچی کی شادی کے ضمن میں جو کم سے کم ضروری اخراجات ہوں ان کے لئے بھی اس کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ دولت کا اس طرح جو اظہار ہوتا ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ اسے دیکھ کر کیا محبت پیدا ہو گی! کیا یگانگت کا احساس پیدا ہو گا! سوائے اس کے اور کیا ہو گا کہ نفرت وعداوت کے بیج دلوں میں بوئے جائیں گے۔ جسے ہم

'HAVES' اور ' HAVE NOTS' کا شعور اور طبقاتی فرق و تفاوت کے احساسات و جذبات کا ادراک کہتے ہیں' اسے اجاگر کرنے اور دلوں میں پختہ کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر بات یہی ہے کہ دولت مند اپنی دولت کا اس طریقے سے اظہار و نمائش کریں اس طرح دلوں کے اندر نفرت و عداوت کا لاوا پکتا رہتا ہے۔ لہٰذا فرمایا اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ط وَ کَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا ○ "یقیناً مبذرین (نام و نمود اور نمائش کے لئے اپنی دولت اڑانے والے) شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان تو ہے ہی اپنے رب کا بے حد ناشکرا۔

اگلی آیت میں ایک اور بات کی تلقین فرمائی کہ اگر تمہیں کبھی اپنے قرابت داروں سے یا دوسرے احتیاج مندوں سے یا سائلین سے کسی وقت معذرت کرنی ہی پڑے۔ اس لئے کہ تم خود بھی (فراغت اور کشادگی کے لئے) اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو تو بات نرمی کے ساتھ کرو جھڑکو نہیں' جیسا کہ سورۃ الضحیٰ میں خود حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْھَرْ ...... یہاں ایک معاشرتی اخلاقی قدر (VALUES) کے طور پر ہدایت دی جارہی ہے وَ اِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْھُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَۃٍ مِّنْ رَّبِّکَ تَرْجُوْھَا فَقُلْ لَّھُمْ قَوْلًا مَّیْسُوْرًا ○

پھر یہ بھی فرمایا کہ اس خیر بھلائی کے کام میں بھی اعتدال و توازن کی ضرورت ہے۔ "نہ تو ایسا ہو کہ ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہو" وَ لَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ یہ بخل کے لئے ایک تعبیر ہے۔ "اور نہ ایسا ہو کہ ہاتھ بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے" وَ لَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ اس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔ آدمی جذبات میں آکر کسی وقت اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد میں پچھتائے۔ "فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا" ۔ اس کی اپنی اولاد فقیروں اور بھکاریوں کی صورت اختیار کر لے۔ اس میں بھی توازن اور اعتدال درکار ہے۔ ...... اس مضمون کا اختتام ہوتا ہے اس آیت مبارکہ پر اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یَقْدِرُ ط اِنَّہٗ کَانَ بِعِبَادِہٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًا "بے شک تیرا رب ہی کھول دیتا ہے روزی جس کے لئے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ان کو دیکھنے والا ہے۔" اس آیت کے ذریعے سے دراصل یہ

اصول بیان کر دیا گیا کہ کسی کی کشادگی و تونگری اور کسی کی تنگی اور مفلسی کے ذمہ دار تم نہیں ہو اور نہ یہ واقعتاً تمہارے بس کی بات ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل اور حکمت بالغہ کی بنا پر کرتا ہے اور فراخی و تنگی میں بھی بندے کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین اہم نکات جن پر ہم آج کچھ گفتگو کر سکے ہیں۔ بقیہ امور پر گفتگو انشاءاللہ آئندہ ہوگی۔ آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے' اس کے بارے میں اگر کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! ایسے بوڑھے والدین جن کی دیکھ بھال ان کی اولاد نہیں کرتی تو ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری کن پر عاید ہوتی ہے۔ ؟

جواب...... اس قسم کی استثنائی صورتِ حال میں یقیناً معاشرہ بحیثیت مجموعی ذمہ دار ہے۔ اسلامی ریاست میں بیت المال کا نظام بھی ایسے حضرات کی کفالت کا ذمہ دار ہوگا ہے۔ علاوہ ازیں ایسے تمام اخلاقی ذرائع استعمال کئے جائیں گے تاکہ اولاد کا طرز عمل درست ہو جائے۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بڑا پیارا واقعہ ملتا ہے کہ ایک بوڑھے صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے جوان بیٹے کی شکایت کی کہ اگرچہ اسے وسعت حاصل ہے لیکن وہ ہماری دیکھ بھال نہیں کرتا۔ تو حضورؐ نے اس نوجوان کو طلب فرمایا اور اسے گریبان سے پکڑ کر وہ گریبان اس کے والد کے ہاتھ میں تھما دیا اور فرمایا' انت و مالک لابیک۔ "تم خود بھی اور جو کچھ بھی مال و اسباب تمہارے پاس ہے وہ بھی سب کا سب تمہارے والد کی ملکیت ہے"...... البتہ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ اخلاقی نصیحت و تلقین ہے۔ قانون یہ نہیں ہے۔ لیکن اولاد کے رویّے کی اصلاح کے لئے جو بھی ممکن ذرائع ہوں گے ان کو استعمال کیا جائے گا۔

سوال...... ڈاکٹر صاحب! کیا نام و نمود اور نمائش کے لئے دولت مندی کے اظہار کی شکلوں پر قانونی قدغن لگائی جا سکتی ہیں؟

جواب...... جی ہاں۔ حکومت وقت یقیناً ایسے اقدامات کر سکتی ہے کہ کچھ حدود معین ہو

جائیں۔ مثلاً شادی بیاہ کی تقریبات میں اس حد سے آگے نہیں بڑھا جائے گا۔ اس طریقے سے ایسے رسم و رواج اور ایسے طور طریقے جن کی معاشرتی سطح پر سرے سے کوئی افادیت ہے ہی نہیں اور ان پر دولت صرف ہو رہی ہو ان سب کو بھی حکومت قانوناً روک سکتی ہے۔

حضرات! آج ہم نے سورہ بنی اسرائیل کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آٹھ آیات اور چوتھے رکوع کی آخری آیت میں جو تین اہم نکات آئے ہیں' ان پر کسی قدر غور کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق دے کہ ہم اپنے معاشرے میں ان اعلیٰ اقدار کو بالفعل رائج کر سکیں اور ان کے برعکس جو منکرات ہیں ان کا استیصال کر سکیں۔

و اخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
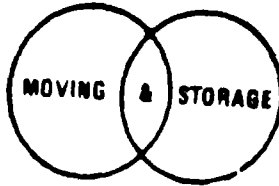
حبِّ رسول اور اس کے تقاضے

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

اسلامی جمعیت طلبہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور کی جانب سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کو جو ۵۳-۱۹۵۲ء میں کل پاکستان جمعیت کے ناظم اعلیٰ رہے تھے، سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر خطاب کی دعوت ملی جو موصوف نے قبول کر لی۔ چنانچہ ۴ نومبر ۸۰ء کو جامع قرآن، قرآن اکیڈمی میں اپنے ہفتہ وار درس قرآن اور نماز عشاء سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب یونیورسٹی کیمپس میں کالج کے ہوسٹل کی مسجد میں تشریف لے گئے جہاں تین سو کے لگ بھگ طلبہ ڈاکٹر صاحب کے لیے سراپا انتظار تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بھی ناساز تھی اور ابھی وہ ڈیڑھ گھنٹے کے درس قرآن سے فارغ ہوئے تھے لہٰذا تھکان کے آثار نمایاں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے موصوف نے قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مذکورہ بالا موضوع پر نہایت پُرتاثیر، مدلل اور فکر انگیز خطاب ارشاد فرمایا۔ طلبہ کا پورا مجمع ہمہ تن گوش برآواز اور پوری توجہ، انہماک و اشتیاق کے ساتھ خطاب سنتا رہا۔ خطاب کے بعد قریباً نصف گھنٹہ تک سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کا یہ خطاب قارئین میثاق کے افادہ کے لیے پیش ہے۔ (ادارہ)

الحمد للہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علیٰ افضلھم وخاتم النبیین محمد الامین وعلیٰ الہ وصحبہ اجمعین۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ۔

وَقَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ

ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ ط

وَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝

صَدَقَ اللّٰهُ مَوْلٰنَا الْعَظِیْمُ ط۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد ڈاکٹر صاحب نے درود ابراہیمی پڑھا اور ارشاد فرمایا
عزیز طلبا۔ مجھے ابھی یہ بتایا گیا ہے کہ اس وقت کی میری گفتگو کا موضوع "حبِ رسولؐ اور اس کے تقاضے" رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ بات میرے علم میں نہیں آئی تھی بلکہ مجھے عمومی انداز میں یہ کہا گیا تھا کہ مجھے سیرت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر گفتگو کرنی ہوگی۔ بہرحال ان دونوں چیزوں کے مابین کوئی زیادہ فرق اور بُعد نہیں ہے' ان کو آسانی سے باہم جوڑا جا سکتا ہے۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن میری آج کی گفتگو زیادہ تر جس تناظر میں ہوگی وہ سورۃ الحدید کی وہ آیت مبارکہ ہے جس پر میں ابھی قرآن اکیڈمی میں مفصل درس دے کر آ رہا ہوں۔ میں نے آج کے اس اجتماع میں حاضری سے اسی بنیاد پر معذرت کی تھی کہ ہفتہ کو بعد نماز مغرب قرآن اکیڈمی میں میرا درس ہوتا ہے۔ ہم وہاں گذشتہ آٹھ ہفتوں سے سورۃ الحدید کا سلسلہ وار مطالعہ کر رہے ہیں اور آج کی نشست میں اس سورۂ مبارکہ کی پچیسویں آیت زیر درس تھی۔ جس کی میں نے آغاز میں تلاوت کی ہے۔

آپ میں سے بہت سے حضرات کی نگاہوں سے شاید آج اخبارات میں وہ اشتہار بھی گزرا ہو جس میں اس درس سے متعلق میں نے تین سوالات معین کئے تھے۔ پہلا یہ کہ "اسلام صرف تبلیغی مذہب ہے یا انقلابی دین؟"۔ دوسرا یہ کہ "اسلامی انقلاب کا اصل ہدف کیا ہے؟"۔ اور تیسرا یہ کہ "کیا اسلامی انقلاب کے لئے طاقت کا استعمال جائز ہے؟" ...... انہی تین سوالات کے حوالے سے میں اس وقت سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے ضمن میں کچھ عرض کروں گا۔ باقی جہاں تک آپ کے مقرر کردہ موضوع کا تعلق ہے' اس سے اس کا بالکل واضح تعلق یہ ہے کہ حبِ رسولؐ کا اصل تقاضا ہے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم...... ابھی اس بات کی تاکید و تائید کے لئے میں نے آغاز میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۳۱ بھی تلاوت کی تھی جس سے ہمارے دین میں اتباع رسول کی جو اہمیت ہے وہ نہایت وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ ۔ "اے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم۔ اہل ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو" فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۔ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ "تو میرا اتباع کرو' میری راہ پر چلو' تاکہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہارے

گناہوں کو بخش دے اور اللہ ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا"۔

حُبِّ رسولؐ کا تقاضا: اتباعِ رسولؐ

اس موقع پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ دو اہم الفاظ ایسے ہیں جو اللہ کے لئے بھی استعمال ہوتے ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی۔ پہلا لفظ ہے اطاعت اور دوسرا ہے محبت" اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ-" ...... اسی طرح محبت کا لفظ اللہ کے لئے بھی آتا ہے اور رسولؐ کے لئے بھی۔ جیسے سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۲۴ میں فرمایا قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ " (اے نبی! ان مدعیان ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تمہیں اپنے باپ اور اپنے بیٹے اور اپنے بھائی اور اپنی بیویاں اور اپنے رشتہ دار اور وہ مال جو تم نے بڑی محنت سے کمائے ہیں اور جمع کئے ہیں اور اپنے وہ کاروبار جو تم نے بڑی مشقت سے جمائے ہیں اور جس میں تمہیں کساد کا اور مندے کا خوف رہتا ہے اور اپنی وہ بلڈنگیں جو تم نے بڑے ارمانوں کے ساتھ تعمیر کی ہیں جو تمہیں بڑی بھلی لگتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں تمہیں محبوب تر ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو جاؤ انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔ تو یہاں اللہ کی محبت کے ساتھ ہی رسول کی محبت کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی جہاد فی سبیل اللہ کی محبت کو بھی لے آیا گیا۔

اب میری بات کو غور سے سماعت فرمائیے۔ جب اللہ کی اطاعت اور اللہ کی محبت دونوں کو جمع کریں گے تو اس کا جو حاصل جمع ہو گا اس کا نام عبادت ہے۔ عبادت صرف اللہ کی ہے رسول کی نہیں ہے۔ اور جب رسول کی اطاعت اور رسول کی محبت کو جمع کریں گے تو اس کے حاصل جمع کو عبادت نہیں کہا جائے گا بلکہ 'اتباع' کہا جائے گا۔

عبادت کا اصل مفہوم ہے "انتہائی محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر اللہ کی بندگی اور

پرستش کرنا" اور اتباع کا مفہوم ہے 'محبت کے جذبہ سے سرشار ہو کر پیروی کرنا۔ ......
اطاعت اور اتباع میں کیا فرق ہے! اس کو بھی سمجھ لیجئے۔ اطاعت کی جاتی ہے کسی حکم کی۔ اور اتباع یہ ہے کہ کسی ہستی سے اتنی محبت ہو جائے کہ چاہے اس نے حکم نہ دیا ہو لیکن اس ہستی کے ہر عمل اور فعل کی پیروی کرنا۔ گویا بقول شاعر۔

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں۔

تو اتباع کا درجہ اطاعت سے بہت بلند اور اس کے مفہوم میں بہت وسعت ہے۔ اطاعت میں صرف حکم پیش نظر ہو گا اور اتباع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ہر عمل اور فعل کو بلکہ ہر ہر ادا کی پیروی کو سعادت سمجھا جائے گا چاہے آپؐ نے اس کا حکم نہ دیا ہو۔ حاصل گفتگو یہ کہ حبِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تقاضا ہے اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

اتباعِ رسولؐ کا ایک اہم پہلو

اسی اتباعِ رسول کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ہم اس بات کو ملحوظ رکھیں کہ بحیثیت مجموعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا رخ کیا تھا! آپؐ نے کس کام کے لئے محنت کی! آپؐ کو کیا فکر دامن گیر تھی! آپؐ نے اپنی دن رات کی سعی و کوشش اور محنت و مشقت کا ہدف کیا معین فرمایا!!...... اس دنیا میں ہر شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے لئے کوئی نہ کوئی ہدف معین کرتا ہے 'پھر اس کی ساری محنت اور بھاگ دوڑ اسی رخ پر ہوتی ہے۔ کوئی اپنے پیشے (PROFESSION) میں اعلیٰ سے اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے لئے اور اپنا مقام بنانے کے لئے محنت اور سعی و جہد کرتا ہے۔

کوئی سیاست دان ہے 'اس کا بھی ایک ہدف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو 'اقتدار اس کے ہاتھ میں یا اس کی پارٹی کے ہاتھ میں آئے۔ کاروباری آدمی ہے تو اس کا بھی ایک ہدف ہے 'وہ محنت کر رہا ہے 'مشقت کر رہا ہے 'راتوں کو جاگ رہا ہے 'کہاں کہاں سے سامان تجارت منگاتا اور کہاں کہاں بیچتا ہے! دنیا بھر کی منڈیوں میں چیزوں کے نرخوں کے اتار چڑھاؤ کی کمی بیشی کی خبر رکھتا ہے۔ یہ ساری سوچ اس کے ہدف کے تابع ہے۔

سولِ اکرمؐ کی سعی و جہد کا ہدف!

اب سوال یہ ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انتہائی جاں گسل محنت و
شقت کی زندگی بسر کی تو اس کا ہدف کیا تھا؟ جو شخص سیرت مطہرہ کا سرسری سا بھی مطالعہ کرتا
ہے تو واقعہ یہ ہے کہ وہ حیران رہ جاتا ہے کہ حضورؐ نے اپنے مشن کے لئے کتنی محنت کی ہے اور
نی مشقت جھیلی ہے ہم اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنے کے خواہشمند ہیں تو
ارے لئے سب سے اہم بات یہ طے کرنے کی ہوگی کہ حضورؐ کی زندگی کا رخ کیا تھا! آپؐ
کے سامنے کیا مقصد تھا! کس ہدف کے حصول کے لئے آپؐ نے سعی و جہد فرمائی تھی! اس کے
ن میں ایک اور بات بھی سامنے رکھئے کہ اگر خود آپ کا ایک مقصد معین ہے تو اس کے
صول کے لئے آپ کو کئی کام کرنے پڑتے ہیں۔ آپ اگر ان کئی کاموں کو علیحدہ علیحدہ
(ISOLATE) کر کے دیکھیں گے تو وہ آپ کو مختلف نظر آئیں گے، ان میں بظاہر
بط نظر نہیں آتا۔ لیکن دراصل ان کو باہم مربوط کرنے والا "ایک مقصد" ہوتا ہے۔ اس
صد کو پیش نظر رکھیں گے تو وہ تمام افعال جو بظاہر مختلف اور متضاد معلوم ہوتے ہیں وہ سب
کے سب مربوط نظر آئیں گے اور درحقیقت ان کا باہمی ربط اس وقت تک قائم کرنا مشکل ہو گا
ب تک واضح طور پر "مقصد" سامنے نہ ہو۔ ان بظاہر مختلف و متضاد افعال میں باہمی ربط و
فق تب ہی نظر آئے گا اور قائم ہو سکے گا جب مقصد معین طور پر سامنے موجود ہو گا۔

ف کی تعیین کی اہمیّت

اس مسئلہ کی اہمیت میں آپ حضرات کے سامنے واضح کر دوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
ا سیرت مطہرہ میں بعض پہلو بظاہر متضاد نظر آتے ہیں۔ اور یہ تضادات اسی صورت میں حل ہو سکتے
یں جب حضورؐ کی زندگی کا ہدف اور مشن ہمارے سامنے ہو۔ دشمنانِ اسلام خاص طور پر مستشرقین
نے ان پر اعتراضات بھی کئے ہیں اور حملے بھی۔ میں ان میں سے چند کا بطور مثال ذکر کرتا
ں۔ مثلاً یہ کہ مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضورؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم
ت ترین مصیبتیں جھیل رہے ہیں، حضورؐ کے ساتھیوں کو دہکتے انگاروں پر لٹایا جا رہا ہے، مکہ

کی سنگلاخ اور تپتی ہوئی زمین پر گردن میں رسی ڈال کر جانوروں کی لاش کی طرح گھسیٹا جارہا ہے۔ ایک مومنہ کو نہایت بہیمانہ ہی نہیں بلکہ انتہائی کمینگی سے شہید کیا جارہا ہے۔ ایک مومن کے ہاتھ پاؤں چار اونٹوں سے باندھ کر ان اونٹوں کو چار سمتوں میں ہانک دیا جاتا ہے کہ جسم کے چیتھڑے اڑ جاتے ہیں لیکن جوابی کاروائی کی اجازت نہیں ہے۔ مکہ میں بارہ برس تک حضورؐ کے کسی جان نثار نے مشرکین مکہ کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہیں کی۔ کوئی بدلہ نہیں لیا۔ اس لئے کہ حضورؐ کا فرمان تھا کہ اپنے ہاتھ باندھے رکھو!...... کوئی جوابی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ حالانکہ مکہ میں جو حضرات گرامی دولت ایمان سے مالا مال ہوئے تھے ان میں سے ہر ایک شجاعت و بہادری میں اگر ایک ایک ہزار کے برابر نہیں تو ایک ایک سو کے برابر ضرور تھا۔ اور ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم "کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ" کی تعمیل میں کسی نے اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ایک طرف یہ انتہا ہے' دوسری طرف مدنی دور میں حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں تلوار ہے' عَلَم ہے۔ آپ کے جان نثار اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھوں میں تلواریں ہیں' نیزے ہیں' تیر کمان ہے۔ جوابی کاروائی ہو رہی ہے بلکہ جیسا کہ میں "منہج انقلاب نبویؐ" کے موضوع پر اپنی مسلسل تقریروں میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں [1] کہ صرف جوابی کاروائی ہی نہیں بلکہ ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اقدام میں پہل کی ہے۔ لیکن پچھلی چند صدیوں میں جب نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے کثیر رقبہ پر مغربی سامراج کا سیاسی و عسکری استیلا تھا اور اکثر مسلم ممالک کسی نہ کسی مغربی طاقت کے غلام تھے' حکمران اقوام کی طرف سے اسلام پر بڑے شدید اعتراضات کئے گئے کہ اسلام تو بڑا خون خوار مذہب ہے اور مسلمان بڑی خونیں قوم ہے۔ اور اسلام تو تلوار کے زور پر پھیلا ہے ع "بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"۔ اغیار نے ہم پر یہ تہمت اس شدومد سے لگائی کہ علامہ شبلی مرحوم جیسے عالم دین' سیرت نگار' مؤرخ نے بھی معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا اور سیرت کی پہلی جلد میں لکھ دیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ نے اقدام میں نہ پہل کی اور

---

[1] الحمد للہ اس موضوع پر "منہج انقلاب نبویؐ" کے نام سے ڈاکٹر صاحب موصوف کے دس خطابات کتابی شکل میں موجود ہیں

نہ تلوار اٹھائی۔ بلکہ تلوار اگر اٹھائی تو مجبوراً اور اپنی مدافعت میں اٹھائی۔ علامہ شبلی مرحوم تو پھر بھی اس معاملے میں قابل عفو قرار دیے جاسکتے ہیں کہ ان کا دور وہ تھا جب انگریز کی حکومت تھی' اس کا غلبہ تھا۔ لیکن مجھے نہایت حیرت اور افسوس اس بات پر ہے' اور یہ بات قابل اعتبار ذرائع سے میرے علم میں آئی ہے کہ حال ہی میں ایک دینی جماعت کے پلیٹ فارم سے ایک نامور عالم دین کی طرف سے پاکستان کی آزاد فضا میں یہ کہا گیا ہے کہ "اسلام میں کوئی جارحانہ جنگ نہیں ہے بلکہ صرف مدافعانہ جنگ ہے۔ حضورؐ اور خلافت راشدہ کے دور میں جتنی جنگیں ہوئی ہیں وہ صرف دفاعی جنگیں تھی" ۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

جب کہ ضمنی طور پر یہ مسئلہ زیر گفتگو آگیا ہے تو ایک اہم اور اصولی بات عرض کر دوں کہ تصادم کا آغاز اصولاً داعی انقلاب کرتا ہے۔ اقدام اس کی جانب سے ہوتا ہے۔ آپ حضرات غور کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کا آغاز کہاں سے فرمایا! آپؐ نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی اور گلی گلی' صدا بلند فرمائی یَاَیُّھَا النَّاسُ قُوْلُوْا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تُفْلِحُوْا۔ اس دعوت کے مضمرات' اور مفہوم پر غور کیجئے حضورؐ فرمارہے ہیں کہ تمہارا مذہب غلط ہے اور اس مشرکانہ مذہب پر قائم شدہ تمہارا نظام فاسد ہے۔ یہ صدیوں سے قائم و رائج نظام کے خلاف اعلان بغاوت ہے یا نہیں! مکہ کی پر امن فضا میں نعرۂ بغاوت کس نے بلند کیا!۔ پر سکون شہری زندگی کے تالاب میں پتھر کس نے پھینکا کہ پورے تالاب میں ارتعاش کی لہریں اٹھ گئیں!......

اب اصل گفتگو کی طرف آیئے۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ہجرت کے بعد مکہ والوں کے خلاف اقدام میں پہل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہجرت کے بعد پہلے چھ مہینے حضورؐ نے داخلی استحکام میں صرف فرمائے۔ اس کے بعد آپؐ نے غزوۂ بدر سے قبل آٹھ چھاپہ مار دستے بھیجے جن میں سے چار میں آپؐ خود سپہ سالار تھے۔ ان مہموں کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تھا قریش مکہ کے قافلوں کے راستوں کو مخدوش بنانا جو قریش کی معاشی زندگی کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسے موجودہ دور کی اصطلاح میں قریش کا 'ECONOMIC BLOCKADE' کہا جائے گا۔ دوسرا مقصد تھا قریش کی سیاسی ناکہ

بندی۔ آج کی اصطلاح میں جو " POLITICAL ISOLATION & CONTAINMENT OF QURAISH " کہلائے گا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور مدینہ منورہ کے مابین بسنے والے بعض قبیلوں کو اپنا حلیف بنالیا اور بعض کو غیر جانب دار کہ وہ جنگ کی صورت میں نہ حضورؐ کا ساتھ دیں گے نہ قریش کا..... انہی مہموں میں سے ایک مہم عبداللہ ابن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکردگی میں وادیٔ نخلہ بھیجی۔ یہ وادی طائف اور مکہ کے مابین واقع ہے اور اس راستے سے قریش کے تجارتی قافلے طائف ہو کر یمن کے ساحل تک جاتے تھے۔ حضورؐ کی ہدایت تھی کہ قریش کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھو اور ہمیں خبر دیتے رہو۔ انؓ کو لڑائی کا کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن صورت حال ایسی پیش آئی کہ اس دستہ کی قریش کے ایک قافلے سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کافی مال تجارت اور پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ان مشرکین میں سے ایک شخص قتل ہوا، دو افراد فرار ہو گئے، دو کو قیدی بنالیا گیا اور ان کو اور مال غنیمت لے کر یہ حضراتؓ مدینہ واپس آ گئے۔ تفاصیل کے لئے نہ موقع ہے نہ وقت۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ ہجرت کے چھ ماہ بعد آٹھ مہمات کی صورت میں اقدام کی پہل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہوئی اور پہلا مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

مزید بر آں یہ بات تو ساری دنیا کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تشریف لانے کے بعد متعدد جنگیں لڑی ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں نقشہ کھینچا گیا ہے یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ "اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل کرتے بھی ہیں قتل ہوتے بھی ہیں" تو مکی زندگی اور مدنی زندگی کا فرق آپ کے سامنے ہے۔ ان میں بظاہر بہت بڑا تضاد موجود ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور مؤرخ ٹائن بی (TOYN BEE) جسے اس دور میں فلسفہ تاریخ میں اتھارٹی تسلیم کیا جاتا ہے، اس نے ایک جملہ میں پورا زہر بھر دیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ وہ کہتا ہے۔

"MUHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN"

اس کے اس جملہ کی زہرناکی کو آپ نے محسوس کیا! وہ یہ کہہ رہا ہے کہ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی تو نبیوں کے مشابہ ہے۔ دعوت ہے، تبلیغ ہے، وعظ ہے، نصیحت ہے، تلقین

ہے' انذار ہے' تبشیر ہے۔ صبر ہے۔ پتھراؤ ہو رہا ہے' لیکن جوابی کارروائی نہیں ہو رہی۔ عیسائیوں کے جو آئیڈل ہیں یعنی حضرت یحییٰ و حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام۔ ان کی زندگی کا نقشہ یہی تو تھا...... ! حضرت مسیحؑ نے تلوار تو کبھی نہیں اٹھائی! حضرت مسیحؑ کبھی کسی حکومت کے سربراہ تو نہیں بنے! ۔ حضرت یحییٰؑ کے ہاتھ میں کبھی تلوار تو نہیں آئی! ۔ تو ٹائن بی کے نزدیک مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سیرت نظر آتی ہے وہ نبوت کے نقشہ پر کچھ نہ کچھ پوری اترتی ہے۔ وہ اگرچہ حضورؐ کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتا لیکن یہ مانتا ہے کہ سیرت کا مکہ میں جو نقشہ ہے وہ نبیوں کی سیرت و زندگی سے مشابہ ہے لیکن اس کے کہنے کے مطابق وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناکام ہو گئے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ وہاں سے تو جان بچا کر نکلنا پڑا۔ البتہ اسے مدینہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم بالکل ایک نئی شکل میں نظر آتے ہیں۔ سپہ سالار ہیں' شہسوار ہیں' صدر مملکت ہیں' مدینہ کی شہری ریاست کے سربراہ ہیں' آپؐ ہی چیف جسٹس ہیں' مقدمات آ رہے ہیں اور آپؐ فیصلے صادر فرما رہے ہیں۔ معاہدے کر رہے ہیں' مدینہ آتے ہی یہود کے تینوں قبیلوں کو معاہدہ میں جکڑ لیا ہے۔ عرب کے دوسرے قبائل سے معاہدے ہو رہے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے کہ یہ صورت تو ایک سیاست دان (STATESMAN) ——— کی نظر آتی ہے۔ اس میں پیغمبرانہ شان اسے نظر نہیں آتی۔ اس کا کہنا ہے کہ سیاست دان کی حیثیت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کامیاب ہو گئے۔ ان کی کامیابی بحیثیت پیغمبر نہیں تھی۔

اسی ایک جملہ کی شرح ہے جو ایک برطانوی مورخ مسٹر منٹگمری وہاٹ نے ایک دوسرے انداز سے کی ہے۔ آپ حضرات نے نام سن رکھا ہو گا۔ ابھی زندہ ہے' مرکزی حکومت کے زیر اہتمام اسلام آباد میں ہر سال جو سیرت کانفرنس ہوتی ہے تو چند سال قبل مسٹر وہاٹ کو حکومت کی طرف سے مدعو کیا گیا تھا کہ وہ آ کر ہمیں سیرت مطہرہ سمجھائے۔ اس شخص نے سیرت پر دو کتابیں علیحدہ علیحدہ لکھی ہیں ایک کا نام ہے۔ 'MUHAMMAD AT MAKKAH' اور دوسری کا نام ہے 'MUHAMMAD AT MADINA' (صلی اللہ علیہ وسلم) اس نے حضورؐ کی سیرت کو دو حصوں میں بانٹ کر دراصل اسی ظاہری تضاد کو نمایاں کرتے ہوئے یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مکہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ہیں اور

مدینہ والے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ہیں..... میں نے یہ مثال اس لئے دی ہے کہ کسی نہ کسی درجہ میں اور بظاہر تضاد واقعتاً نظر آتا ہے۔ دشمنوں نے اسے 'EXPLOIT' کیا اور اسے تنقید و تنقیص کا موضوع بنالیا۔ لیکن ہمیں بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دو رنگ جدا ہیں۔ میں بعد میں وضاحت کروں گا کہ ان کا آپس میں ربط کیا ہے۔

اب دوسری نمایاں مثال میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آپ سب نے پڑھ رکھا ہوگا اور سن رکھا ہو گا کہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور قریش مکہ کے مابین صلح کا ایک معاہدہ ہوا تھا جو صلح حدیبیہ کے نام سے سیرت کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔ اس صلح کی شرائط بڑی حد تک یک طرفہ نظر آتی ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضورؐ نے دب کر صلح کی ہے۔ یہاں تک کہ صحابہ کرامؓ انتہائی مضطرب اور بے چین تھے کہ دب کر کیوں صلح کی جارہی ہے! ہم اتنے کمزور تو نہیں ہیں، ہم حق پر ہیں، ہم حق کے لئے جانیں دینے کے لئے تیار ہیں۔ چودہ سو صحابہ کرامؓ موت پر بیعت کر چکے تھے۔ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر عہد کر چکے تھے کہ ہم سب یہاں جانیں دے دیں گے پیٹھ نہیں موڑیں گے۔ پھر ہم دب کر صلح کیوں کر رہے ہیں صلح کی شرائط میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ واپس جاؤ، احرام کھول دو، اس دفعہ عمرہ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اول تو یہی بات صحابہ کرامؓ کے لئے ناممکن القبول تھی۔ احرام باندھ کر آئے تھے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ میں اضطراب پیدا ہوا کہ عمرہ کئے بغیر احرام کیسے کھول دیں! پھر ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر مکہ کا کوئی شخص اپنے ولی اور سرپرست کی اجازت کے بغیر مدینہ جائے گا (یعنی اسلام قبول کر کے جائے گا) تو مسلمانوں کو اسے واپس کرنا ہو گا لیکن اگر کوئی شخص مدینہ سے اسلام چھوڑ کر (مرتد ہو کر) مکہ آجائے گا تو اسے قریش واپس نہیں کریں گے۔ بڑی غیر منصفانہ بات تھی۔ اس پر صحابہ کرامؓ بڑے جزبز ہوئے، انؓ کے جذبات میں جوش و ہیجان پیدا ہوا کہ یہ صلح تو مساوی شرائط پر نہیں ہو رہی۔

چنانچہ جب صلح نامہ پر دستخط کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ احرام کھول دیئے جائیں اور قربانی کے جو جانور ساتھ ہیں ان کی یہیں قربانی دے دی جائے، اس وقت صحابہ کرامؓ کے جذبات کا عالم یہ تھا کہ کوئی نہیں اٹھا۔ کیفیت یہ تھی کہ گویا اعصاب اور اعضاء شل ہو گئے ہیں۔ سب ہی دل شکستہ تھے۔ حضورؐ نے دو مرتبہ پھر فرمایا کہ احرام

کھول دیئے جائیں اور قربانیاں دے دی جائیں لیکن پھر بھی کوئی نہیں اٹھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملول اور رنجیدہ ہو کر خیمہ میں تشریف لے گئے۔ عام معمول یہ تھا کہ سفر میں حضورؐ کے ساتھ کوئی نہ کوئی زوجہ محترمہؓ ہوتی تھیں۔ چنانچہ اس سفر میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپؐ کے ساتھ تھیں۔ حضورؐ نے انؓ سے ذکر فرمایا۔ انہوںؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ کسی سے کچھ نہ کہئے۔ بس آپؐ قربانی دے دیجئے اور احرام کھول دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے قربانی دی اور حجام کو بلایا کہ میرے سر کے بال مونڈ دو اور آپؐ نے احرام کھول دیا۔ صحابہ کرامؓ نے جب یہ دیکھا تو اب سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ جو حضرات ہدی کے جانور ساتھ لائے تھے انہوں نے قربانیاں دیں۔ اور تمام صحابہ کرامؓ نے حلق یا قصر کرا کے احرام کھول دیئے۔ اس صورت حال کی تاویل اور توجیہہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ پر اس وقت انتظار کی سی حالت طاری تھی۔ وہؓ اس خیال میں تھے کہ شاید کوئی نئی شکل پیدا ہو جائے' شاید نئی وحی آجائے۔ لیکن جب حضورؐ نے احرام کھول دیا تو حالت منتظرہ ختم ہو گئی اور سب نے حکم کی تعمیل کی ورنہ معاذ اللہ ہم صحابہ کرامؓ کے متعلق ہرگز کسی حکم عدولی کا گمان تک نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ سارا پس منظر آپ حضرات کے سامنے قدرے تفصیل سے اس لئے رکھا ہے کہ آپ صحیح اندازہ کر سکیں کہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر جو صلح کا معاہدہ ہوا اس کی شرائط واقعتاً غیر مساوی تھیں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر دب کر صلح فرما رہے تھے۔ گویا اس وقت آپؐ بہر صورت صلح کرنا چاہتے تھے۔

لیکن دو سال بعد جب ایک موقع پر قریش نے معاہدے کی ایک شق کی خلاف ورزی کی اور جب حضورؐ نے اس خلاف ورزی پر ان کی گرفت فرمائی تو قریش مکہ نے خود صلح کے خاتمے کا اعلان کر دیا تب ابو سفیان کو جو اس وقت پورے قریش کے قبیلہ کی سرداری کے منصب پر فائز تھے یہ احساس ہوا کہ جذبات میں آکر ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ یہ صلح ہمارے تحفظ (PROTECTION) کی حامل تھی۔ اس صلح کی تجدید ہونی چاہئے۔ چنانچہ ابو سفیان خود چل کر مدینہ پہنچے۔ سرتوڑ کوششیں کیں۔ سفارشیں ڈھونڈیں کہ کسی طرح حضورؐ صلح کی تجدید کی منظوری دے دیں۔ لیکن بارگاہ رسالت سے ابو سفیان کی صلح کی تجدید کے لئے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت اختیار فرمایا۔ صلح کی

تجدید کی حامی نہیں بھری۔ غور کیجئے یہاں بھی بظاہر ایک بڑا تضاد نظر آتا ہے۔ دو سال پہلے بظاہر دب کر صلح کر رہے ہیں۔ دو سال بعد قریش کے سردار کی طرف سے صلح کی درخواست ہو رہی ہے اور اس مقصد کے لئے وہ خود مدینہ آیا ہے لیکن حضورؐ صلح نہیں فرما رہے۔

اب یہ جو ظاہری تضادات نظر آ رہے ہیں ان کے مابین ربط قائم ہو گا۔ لیکن یہ ربط کس چیز کے ذریعے قائم ہو گا؟ یہ ربط قائم ہو گا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل ہدف اور مقصود کی تعیین سے۔ جس کے لئے آغازِ نبوت سے مسلسل جدوجہد ہو رہی ہے۔ تو جان لیجئے کہ یہ ہدف اور یہ مقصود و مطلوب ہے اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک وقت میں ہاتھ روکنے کا حکم ہے۔ مدافعت میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ ایک وقت میں ہاتھ کھولنے اور اقدام کرنے کا حکم ہے۔ ایک وقت میں اس مقصد کے لئے صلح مفید ہے 'لہٰذا صلح کی جارہی ہے۔ اپنی انانیت کو آڑے آنے نہیں دیا جارہا۔ دب کر اور کسی قدر شکست خوردگی کے انداز میں صلح کی جارہی ہے اور ایک وقت میں اس مقصد کی خاطر جب صلح نہ کرنا مفید ہے تب صلح نہیں کی جارہی ہے۔ تمام تضادات درحقیقت مقصد کو صحیح طور پر سمجھ لینے ہی سے رفع ہوتے ہیں۔ مستشرقین نے دراصل جو ٹھوکر کھائی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے رسولوں کی بعثت کے بنیادی مقصد ہی کو نہیں سمجھا۔

رسُولوں کو بھیجنے کا مقصد

قرآن مجید میں رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ میں قرآن اکیڈمی کی جامع القرآن میں آج ہی عشاء سے قبل اسی ایک آیت پر مفصل درس دے کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔ فرمایا لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ "بلاشبہ بالتحقیق ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو بینات کے ساتھ"۔ یعنی واضح تعلیمات اور واضح نشانیاں دے کر۔ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَ الْمِیْزَانَ۔ "اور ہم نے ان سولوں کے ساتھ کتاب بھی نازل فرمائی اور میزان بھی۔" ...... یہ سب کس لئے کیا! رسول کیوں بھیجے! کتاب اور میزان کس لئے نازل فرمائی! اس مقصد کو آیت کے اگلے حصہ میں معین فرمایا گیا۔ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۔ ط "تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم ہوں۔" گویا رسولوں کو واضح

نشانیوں کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان یعنی شریعت نازل فرمانے کی غایت اور مقصد کو یہاں بیان فرمایا جارہا ہے کہ لیقوم الناس بالقسط ۔ "تاکہ لوگ عدل وقسط پر قائم ہوں۔ ظلم کا خاتمہ ہو جائے' جبر کا خاتمہ ہو جائے' استبداد کا خاتمہ ہو جائے' اور استحصال کا قلع قمع ہو جائے۔ لیکن یہ نظامِ عدل کون سا ہو گا! ایک عدل کا نظام وہ ہے جو انسان اپنے ذہن سے بناتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ کوئی " SYSTEM OF SOCIAL JUSTICE " وجود میں آ جائے۔ چنانچہ نظام عدل اجتماعی کا ایک تصور وہ ہے جو کیمونسٹوں کے ہاں ملتا ہے۔ ایک تصور مغربی ممالک کا ہے۔ کوشش سب کی یہ ہے کہ ہم کسی حقیقی نظامِ عدلِ اجتماعی تک پہنچ جائیں لیکن انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے جتنے تصورات ہیں ان میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی نقص یا خامی رہ جاتی ہے۔ حقیقی نظام عدل اجتماعی صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعے سے نوع انسانی کو عطا فرماتا ہے جسے ہم دین و شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اللہ کے آخری نبی اور رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس شریعت کی تکمیل ہو گئی ہے۔ یہ نظام جس نے ہر ایک کے فرائض اور حقوق کا صحیح صحیح تعین کر دیا ہے۔ جس نے طے کر دیا ہے کہ کس کو کیا دیا جائے گا اور کس سے کیا وصول کیا جائے گا۔ جس میں معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق و فرائض کا تعین نہایت متوازن اور فطری انداز میں کیا ہے اور جس نے ہر شعبہ زندگی کا احاطہ کیا ہے۔ جس میں معاشرت بھی ہے اور سیاست بھی' تجارت بھی ہے اور معیشت بھی۔ جان لیجئے کہ اس نظام عدل و قسط کو قائم کرنا انبیاء کی بعثت کا ایک اہم مقصد رہا ہے۔ اور یہ ہے وہ بات جو سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ میں بیان ہوئی ہے۔ اب ذرا اس پہلو پر غور کیجئے کہ اس نظام عدل وقسط کے قیام میں رکاوٹ کون بنے گا! ظاہر بات ہے کہ جو مظلوم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظلم کا خاتمہ ہو' جو مستضعفین ہیں' جنہیں دبا لیا گیا ہے' جن کے حقوق غصب کئے گئے ہیں وہ تو چاہیں گے کہ ظالمانہ نظام ختم ہو جائے اور عادلانہ نظام قائم ہو۔ لیکن جو ظالم ہیں' جنہوں نے ناجائز طور پر اپنی حکومتوں کے قلادے لوگوں کی گردنوں پر رکھے ہوئے ہیں' جنہوں نے دولت کی تقسیم کا ایک غیر منصفانہ نظام قائم کیا ہوا ہے جس کے باعث ان کے پاس دولت کے انبار جمع ہو رہے ہیں چاہے دوسروں کو دو وقت کی روٹی بھی نہ مل رہی ہو' کیا وہ بھی پسند کریں گے کہ استحصالی و ظالمانہ نظام ختم ہو جائے

اور عدل و قسط کا نظام قائم ہو! میزان شریعت خداوندی نصب ہو جائے! ان کی عظیم اکثریت یہ تبدیلی بالکل پسند نہیں کرے گی۔ لیکن ان طبقات میں بھی کچھ سلیم الطبع لوگ ہوتے ہیں جو بیدار ہو جاتے ہیں' ان کو احساس ہو جاتا ہے کہ واقعی یہ نظام غلط ہے' باطل ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں خود آل فرعون میں سے کچھ لوگ ایمان لے آئے تھے۔ ایک مومن آل فرعون کا ذکر موجود ہے۔ سورۃ المومن میں ان کی پوری تقریر نقل کی گئی ہے۔ جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ یہ صاحب جو آلِ فرعون کے اہم سرداروں میں سے تھے' فرعون کے دربار میں ان کا اونچا مقام تھا' ایمان لے آئے تھے! یہ اس لئے ہوا کہ ان کی انسانیت بیدار تھی۔ معلوم ہوا کہ ظالم اور استحصالی طبقات میں بھی کچھ سلیم الفطرت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب حق کی دعوت ان کے سامنے آتی ہے تو اسے قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے اور عظیم اکثریت انہی لوگوں کی ہوتی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ حالات جوں کے توں (STATUS QUO) رہیں۔ تاکہ ان کے مفادات اور منفعتوں پر کوئی آنچ نہ آئے۔ جاگیرداری نظام ہے تو جاگیردار کبھی پسند نہیں کرے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہے تو سرمایہ دار کبھی نہیں چاہے گا کہ وہ نظام ختم ہو جائے۔ ہندو معاشرہ میں برہمن کبھی پسند نہیں کرے گا کہ ذات پات کی اونچ نیچ ختم ہو جائے۔ برہمن کو جو اونچا مقام ملا ہوا ہے کیا وہ چاہے گا کہ شودر کو اس کے برابر بنا دیا جائے!۔ لہٰذا چاہے سماجی ظلم ہو' چاہے معاشی ظلم ہو اور چاہے سیاسی ظلم ہو' ظالم طبقات کی عظیم اکثریت اپنے اس ظالمانہ نظام کی مدافعت اور محافظت (PROTECTION) کے لئے میدان میں آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الحدید کی اس آیت مبارکہ کے اگلے ٹکڑے میں فرمادیا گیا وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ۔ ایسے لوگوں کی سرکوبی اور علاج کے لئے ہم نے لوہا بھی اتارا ہے۔ لوہے میں جنگ کی صلاحیت ہے اس سے اسلحہ بنتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس لوہے میں دیگر تمدنی فائدے بھی ہیں..... لیکن اس آیت کی رو سے لوہے کا اصل مقصد یہ ہے کہ میزانِ خداوندی کے نصب کرنے کے مشن میں جو لوگ بھی رسولوں کے اعوان و انصار بنیں اور نظام عدل و قسط کے قیام کے لئے تن من

دھن لگانے کے لئے تیار ہو جائیں' وہ حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع اس لوہے کی طاقت کو استعمال کریں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو اس راہ میں مزاحم ہوں۔ چنانچہ اسی آیت مبارکہ کے اگلے حصہ میں اس کو اللہ تعالیٰ ایمان کی کسوٹی اور اپنی اور اپنے رسولوں کی نصرت قرار دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ

یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے غیب میں رہتے ہوئے اللہ کے دین کی اقامت کے لئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں..... یہ آیت مبارکہ ختم ہوتی ہے ان الفاظ مبارکہ پر اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ○ "بے شک اللہ قوی ہے' زور آور ہے' زبردست اور غالب ہے" ۔ یعنی لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر اللہ کی راہ میں محنت کرنے اور اللہ کی نازل کردہ میزان شریعت کو نصب کرنے کی تعلیم وہدایت اس لئے نہیں دی جا رہی کہ معاذ اللہ وہ تمہاری مدد کا محتاج ہے' اس القوی العزیز کو تمہاری مدد کی کیا حاجت! البتہ تمہاری وفاداری اور ایمان کا امتحان مقصود ہے۔ سورہ حدید کی یہ آیت قرآن مجید کی بڑی انقلابی آیت ہے اور اس میں عمومی اسلوب و انداز میں ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر رسولوں کی بعثت کا مقصد' ان" کو کتاب و میــــزان دینے کی غایت اور لوہے کے نزول کا سبب بیان ہوا ہے۔

نبی اکرمؐ کا مقصدِ بعثت : غلبۂ دین

یہی بات اور یہی مضمون' معین طور پر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے امتیازی مقصد کے ذکر میں قرآن حکیم میں تین جگہ یعنی سورۂ توبہ' سورۃ الفتح اور سورۃ الصف میں فرمائی گئی ہے فرمایا ! ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ "وہی (اللہ) ہے جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو" (اب یہاں واحد کا صیغہ آیا رسول" جبکہ سورۂ حدید میں آیا تھا لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا وہاں رسل جمع کا صیغہ تھا) کیا دے کر بھیجا! بِالۡہُدٰی پہلی چیز جو حضورؐ دے کر بھیجے گئے وہ ہے الہدیٰ یعنی قرآن حکیم' ابدی ھدایت نامہ۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃٌ لِلعالمیں

آپ کو یاد آگیا ہو گا کہ ٹیلی ویژن پر بھی میرا ایک پروگرام چلتا تھا' میں نے اس کا نام خود
بی " تجویز کیا تھا اور وہ اسی آیت سے ماخوذ تھا..... لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف
ں نہیں دیا گیا بلکہ ایک اور چیز بھی عطا کی گئی وَ دِینُ الحَق..... "اور حق کا دین یا سچا دین
ا گیا" یہ ہے وہ نظام' جو عدل و قسط پر مبنی ہے۔ اللہ کی طرف سے نوع انسانی کے لئے
ں اور مکمل شریعت! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں بھیجا گیا! حضورؐ کو دین حق کس
یا گیا! اس امتیازی مقصد کی تعیین ہے جو اس آیت سے واضح ہوئی آپ غور کیجئے کہ حضور
اللہ علیہ وسلم نے دعوت بھی دی' تبلیغ بھی فرمائی' تربیت بھی دی' تزکیہ بھی کیا۔ یہ سب
کیا۔ لیکن اس تمام جدوجہد (STRUGGLE) ——————— کا مقصد
(GOAL) کیا ہے! وہ ہے لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ "تاکہ اس دینِ حق
ر اس نظامِ عدل و قسط کو پورے نظامِ اطاعت پر غالب کر دیں" .....زندگی کا کوئی گوشہ اس
، باہر نہ رہ جائے۔ معاشرت ہو' معیشت ہو' سیاست ہو' حکومت ہو' قانون ہو' دیوانی
ن ہو چاہے فوجداری ہو' عبادات ہوں معاملات ہوں' صلح و جنگ ہو۔ ہر شے دینِ حق کے
ع ہو جائے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول کو مبعوث فرمایا۔ صلی اللہ
یہ وسلم۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ ہے مقصدِ بعثت تمام رسولوں کا کہ نظامِ عدل و قسط قائم ہو' ظلم'
انصافی' جبر و استبداد اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے۔ اور اس نظامِ عدل و قسط کے قیام کے
لئے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے نازل فرمایا' اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے
الے اپنے سر دھڑ کی بازی لگا دیں یہی مقصدِ بعثت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
ہے جو قرآن حکیم میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اب جبکہ حضورؐ کی بعثت خصوصی کا مقصد
معین ہو گیا تو اللہ اس کے آخری نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور حضور صلی اللہ
علیہ وسلم سے محبت کا دعویٰ کرنے کے کچھ نتائج اور تقاضے ہیں جو سامنے آتے ہیں۔ میں اب
انہیں ترتیب وار آپ حضرات کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور حضورؐ کے اتباع کا پہلا نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ ہماری
زندگی کا مقصد وہی ہو جائے جو آپؐ کی بعثت کا مقصد ہے۔ باقی تمام چیزیں اس کے تابع ہو

جائیں۔ اگر مقصد یہ نہیں ہے پھر تو نقشہ ہی جدا ہو گیا۔ ہم نے زندگی کے بعض گوشوں میں حضورؑ کی پیروی کر لی، مثلاً حضورؑ کے لباس کی، وضع قطع کی، آپؐ کے روزانہ کے معمولات کی پیروی کر لی تو اپنی جگہ ہر چیز مبارک ہے۔ حضورؑ کے نقشِ قدم کی جس طور اور جس انداز سے بھی پیروی کی جائے گی وہ نہایت مبارک ہے لیکن بحیثیت مجموعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کی جدو جہد کا جو رخ معین فرمایا وہ اگر ہم نے اختیار کیا نہیں تو ان چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اتباع نتیجہ خیز نہیں ہو گا۔ جیسے کہ سورۂ بقرہ کے سترھویں رکوع میں فرمایا گیا ہے وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا "ہر شخص کے سامنے کوئی ہدف ہے، کوئی مقصد ہے، جس کی طرف وہ بڑھ رہا ہے"۔ آپ حضرات نے 'STRUGGLE FOR EXISTANCE' کے نظریہ کا مطالعہ کیا ہو گا۔ آپ لوگ تو میڈیکل کے طلبہ ہیں، ظاہر بات ہے کہ آپ نے ڈارون کا فلسفہ پڑھا ہو گا اور آپ اس کے نظریہ 'SURVIVAL OF THE FITTEST' سے واقف ہوں گے۔ اس جہادِ زندگانی میں ہر شخص زور لگا رہا ہے، آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی ہدف ہے۔ تو پہلی چیز جو حضورؑ کی محبت کے تقاضا کے طور پر سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ ہمارا ہدف بھی وہی ہو جائے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ اس وقت اس ہدف کے لفظ سے بے اختیار میرا ذہن علامہ اقبالؒ کے اس مصرع کی طرف منتقل ہوا کہ

ع آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف، ..... تیر انداز پہلے تو اپنا ایک نشانہ مقرر کرتا ہے کہ میں نے تیر مارنا کہاں ہے! پھر اس کی قوت روبعمل آتی ہے۔ وہ جتنے زور کے ساتھ کمان کو کھینچ سکے گا اسی زور سے وہ تیر اپنے ہدف کی طرف جائے گا۔ علامہ نے اس مصرع میں دو چیزیں جمع کر دیں ..... کسی تیر انداز کی جدو جہد کے ضائع، اور بے نتیجہ ہونے میں دو عوامل (FACTORS) شامل ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہدف (GOALS) معین نہیں۔ دوسرا یہ کہ کمان کو نیم ولانہ اور پوری قوت سے کھینچا نہیں گیا ہے۔ اس پر پورا زور نہیں لگایا گیا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ کوئی تیر ادھر کو چلا گیا کوئی ادھر کو چلا گیا۔ ضروری ہو گا کہ ہدف بھی صحیح معین ہو اور پھر پوری قوت کے ساتھ تیر چلا کر اس ٹارگٹ کو 'HIT' کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ دونوں چیزیں نہیں ہوں گی تو تیر بے کار جائے گا۔

بہر حال میں جو بات عرض کر رہا تھا وہ یہ ہے کہ حُبِّ رسولؐ کا پہلا تقاضا ہے اتباعِ رسول۔ اس اتباعِ رسولؐ کی پہلی منزل کیا ہو گی؟ یہ کہ ہر مسلمان شعوری طور پر اپنی زندگی کا ہدف معین کر لے کہ میری زندگی کا مقصد' میری زندگی کا ہدف' میری بھاگ دوڑ کی منزل مقصود وہی ہے جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی اور وہ ہے اللہ کے دین کا غلبہ...... اسے ملک نصر اللہ عزیز مرحوم نے ایک بڑے سادے انداز میں شعر کا جامہ پہنایا ہے کہ۔

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی

میں نماز پڑھتا ہوں تاکہ اللہ یاد رہے۔ روزہ رکھتا ہوں تاکہ نفس کے منہ زور گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت مجھ میں برقرار رہے۔ زکوۃ ادا کرتا ہوں تاکہ مال کی محبت دل میں ڈیرا لگا کر نہ بیٹھ رہے۔ لیکن ان تمام اعمال کو ایک وحدت میں پرونے والا مقصد کیا ہے! وہ ہے اللہ کے دین کی سرفرازی' اللہ کے دین کی سربلندی۔ جس شخص کی زندگی کا ہدف یہ نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہیں سے اس کی زندگی کا کانٹا بدل گیا۔ اب اس کا رخ کچھ اور ہو گیا۔ اب بعض اجزاء میں وہ حضورؐ کے نقش قدم کی پیروی کر بھی رہا ہے تو جب پٹڑی بدل گئی اور بحیثیت مجموعی حضور کا اتباع مقصود و مطلوب نہ رہا تو اب اس جزوی پیروی کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ البتہ بحیثیت مجموعی اگر رخ وہی اختیار کر لیا تو اب ہر معاملہ میں حضورؐ کی پیروی نورٌ علیٰ نور کے درجہ میں آجائے گی۔

انقلاب اسلامی کے لیے حضورؐ کا طریقِ کار

اب دوسری بات کو لیجئے۔ اس منزل کے حصول اور اس منزل تک رسائی کا راستہ کون سا ہے! یہ ہم کہاں سے معلوم کریں گے! اس معاملے میں رہنمائی بھی ہمیں سیرت رسولؐ ہی سے ملے گی۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر کام ہر طریقے پر نہیں ہو سکتا۔ ہر کام کے لئے ایک طریقہ معین ہے۔ گندم کاشت کرنی ہے تو اس کا ایک خاص موسم ہے' اسی میں آپ کاشت کریں گے تو آپ کو فصل ملے گی۔ ورنہ بیج بھی ضائع ہو جائے گا خواہ خلوص و اخلاص کتنا ہی ہو۔ پھر یہ کہ اس کے لئے زمین کو تیار کرنا ہو گا۔ زمین تیار نہیں کی اور آپ گندم کے

بیج بکھیر آئے تو کیا فصل مل جائے گی! معلوم ہوا کہ گندم کے حصول کا ایک نہج ہے' منہج ہے' طریقِ کار ہے۔ اگر اس کی پیروی نہیں کریں گے تو گندم نہیں اگے گی۔ اسی طرح اس نظامِ عدل و قسط کو قائم کرنے کے لئے بھی' جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا' وہی طریقِ کار اختیار کرنا ہو گا جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔ اگر ایک شخص غلط فہمی میں ایک طریقِ کار پر عمل کر رہا ہے' وہ اپنی جگہ مخلص ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسی طریقہ سے اسلامی انقلاب آ جائے گا' اسلامی نظامِ عدل و قسط قائم ہو جائے گا تو خلوص کی بناء پر اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر مل جائے گا لیکن دنیا میں اس کی محنت کامیاب نہیں ہو گی۔ لہٰذا ہمارا دوسرا شعوری فیصلہ یہ ہونا چاہئے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے سے انقلاب برپا فرمایا! کس نہج سے نظامِ عدل و قسط قائم فرمایا! کس طریقے سے ظالمانہ' استبدادی اور استحصالی نظام کو ختم کر کے "لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ" کی منزل تک رسائی حاصل فرمائی۔

جب ہمارا یہ شعوری فیصلہ ہو جائے گا تو اب ضرورت ہو گی کہ ہم سیرتِ طیبہ کا گہرا مطالعہ کریں اور یہ معلوم کریں کہ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا طریقِ کار (METHOD) اختیار فرمایا تھا۔ اس لئے کہ کسی معاشرے میں انقلاب لانے کے لئے ہر طریقہ کارگر اور مفید نہیں ہوتا بلکہ جس قسم کی تبدیلی لانی ہو یا جس نوعیت کا انقلاب برپا کرنا مقصود ہو' اسی کی مناسبت سے طریقِ کار وضع کیا جاتا ہے۔ میں ایک مثال عرض کر دوں۔ اشتراکی انقلاب کا اپنا ایک طریقہ ہے۔ جب تک اس نظریئے کے شیدائی اور کامریڈز کسی معاشرہ میں طبقاتی شعور (CLASS CONSCIOUSNESS) پیدا نہیں کرتے کہ یہ اہلِ ثروت (HAVES) ہیں اور وہ محرومین (HAVE-NOTS) یہ مراعات یافتہ اور استحصالی طبقات ہیں اور وہ دبے ہوئے اور پسے ہوئے طبقات ہیں۔ جب تک اس شعور کو مظلوم طبقات کے ذہنوں میں راسخ نہیں کر دیا جائے گا' اس وقت تک اشتراکی انقلاب کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھ سکے گا۔ پہلے یہ طبقاتی شعور (CLASS CONSCIOUSNESS) پیدا کرنا ہو گا۔ دوسرا مرحلہ ہو گا طبقاتی کشاکش اور تصادم (CLASS STRUGGLE) کا۔

اب طبقات کو طبقات سے ٹکرا یا جائے۔ اس کے بغیر اشتراکی انقلاب کے لئے دوسرا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ ان کے علاوہ اشتراکیوں کے دوسرے مختلف ہتھکنڈے ہیں 'افراتفری پیدا کرنا' بدنظمی پیدا کرنا' اسی طرح علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا پیدا کرنا کہ ہم سندھی ہیں' ہم بلوچی ہیں' ہم پختون ہیں' ہم پنجابی ہیں' ہم مہاجر ہیں۔ ہماری تہذیب علاحدہ ہے ہماری ثقافت علاحدہ ہے' ہماری زبان علاحدہ ہے۔ اس طریقے پر ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں اور عصبیتوں کو ابھار کر باہم ایک دوسرے سے ٹکرا دینا' یہ کمیونسٹوں کی جدید تکنیک ہے۔ اس میں بموں کے دھماکوں اور دوسری تخریب کاریوں کے ذریعہ سے چاہے بوڑھوں' بچوں' عورتوں اور متعدد بے گناہ لوگوں کی جانوں کو نشانہ بنانا پڑے' چاہے ان کو قربانی کا بکرا بنانا پڑے لیکن یہ چیزیں اشتراکی انقلاب لانے کی کوششوں کے لوازم میں شامل ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ کوئی شخص شریف النفس ہے وہ مغالطوں کا شکار ہو کر اشتراکی نظریہ کا معتقد تو ہو گیا' مارکسٹ تو بن گیا لیکن ان تخریبی کاموں میں حصہ لینے کے لئے تیار نہیں۔ تو وہ حقیقی کمیونسٹ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان کاموں میں حصہ لیے بغیر اشتراکی انقلاب نہیں آ سکتا۔ اس کا ایک طریق کار ہے اس کا ایک ———— 'SET PATTERN' بن چکا ہے۔ اسی طریق سے سمجھ لیجئے کہ اسلامی انقلاب کے لئے بھی صرف وہی طریقہ مفید اور مؤثر ہو گا جس طریقے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلاب برپا فرمایا تھا۔ چنانچہ اب ہماری علمی کاوش اور جستجو یہ ہو گی' کہ ہم سیرت مطہرہ کا معروضی (OBJECTIVE) ———— مطالعہ کریں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق انقلاب کو جاننے کی کوشش کریں۔

مراحلِ انقلاب

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج انقلاب کو سمجھنے کے لئے سیرت مطہرہ کا جب مطالعہ کیا تو انقلاب کے مختلف مراحل کا ایک واضح خاکہ میرے سامنے آ گیا اور اس خاکے کی روشنی میں سیرت کے تمام واقعات مجھے انتہائی مربوط و بامعنی معلوم ہوئے۔ میرے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ انقلابی جدوجہد کے چھ مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ ہے دعوت و تبلیغ کا۔ یعنی انقلابی نظریئے کی نشر و اشاعت! اسلام کا انقلابی نظریہ ہے نظریۂ توحید۔ جان لیجئے کہ یہ نظریہ

نہایت انقلابی ہے اور اس کی زد بہت دور دور تک پڑتی ہے۔ سماجی اور معاشرتی میدان میں توحید کا تقاضا یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ سب کا خالق ایک اللہ ہے۔ پیدائشی اعتبار سے کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے۔ ذات پات اور حسب و نسب کی بنیاد پر تمام تقسیموں کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ اسی توحید کی ایک فرع (COROLLARY) یہ ہے کہ حاکم صرف اللہ ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حاکمیت مطلقہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے نظام کو قائم کرے۔ ہاں اللہ کی عطا کردہ شریعت کے دائرے کے اندر اندر قانون سازی کی جا سکتی ہے۔ سیاست کے میدان میں اس سے بڑا انقلابی نظریہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

اسی طرح معاشیات کے میدان میں توحید کا تقاضا کیا ہے! لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے ان کا مالک صرف اللہ ہے۔ ملکیت انسان کے لئے ہے ہی نہیں۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے بطور امانت ہے۔ اصل مالک تو اللہ ہے۔

ایں امانت چند روزہ نزد ماست　　در حقیقت مالکِ ہر شے خدا است

ملکیت میں تصرف کا حق لامحدود ہوتا ہے۔ آپ کا مال ہے آپ جو چاہیں کریں، میری ملکیت ہے میں جو چاہوں کروں، میری بکری ہے جب چاہوں ذبح کر دوں مجھے کلی اختیار حاصل ہے۔ لیکن امانت میں آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ امانت میں مالک کی مرضی کے مطابق تصرف ہو گا۔ مالک کی مرضی کے خلاف اگر تصرف کیا جائے گا تو وہ خیانت شمار ہو گا۔ نظریہ توحید کے تین تقاضے آپ کے سامنے آ گئے۔ معاشرتی سطح پر انسانی مساوات، سیاسی سطح پر اللہ کی حاکمیت اور انسان کے لئے خلافت کا تصور، اور معاشی سطح پر ملکیت کی بجائے امانت کا تصور!

انقلابی جدوجہد کے دوسرے مرحلے کا عنوان ہے تنظیم۔ یعنی وہ لوگ جو شعوری طور پر توحید کی اس انقلابی دعوت کو قبول کر لیں، انہیں منظم کیا جائے۔ جماعتی شکل میں ———— ' ORGANISE ' کیا جائے اس لئے کہ محض نظریہ کی دعوت و تبلیغ سے انقلاب نہیں آ سکتا جب تک کہ اس کی پشت پر فدائین اور سرفروشوں کی جماعت نہ ہو۔ اشتراکی انقلاب کو

دیکھ لیجئے۔ جب تک اشتراکی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش نہیں کرتے' جب تک وہ جیلوں کو نہیں بھر دیتے' جب تک وہ پھانسی کے پھندوں کو چوم کر اپنے گلوں میں نہیں ڈالتے' کیا کیمونسٹ انقلاب کہیں آ سکتا ہے! اسی طریقہ سے اسلامی انقلاب کے لئے ایک جماعت چاہئے' جان نثاروں کی جماعت جو پورے طور پر منظم ہو۔ جس کے لئے ہماری دین کی اصطلاح ہے سمع و طاعت (LISTEN AND OBEY) ــــــــــــ سنو اور اطاعت کرو۔ گویا ڈسپلن اس نوع کا ہونا چاہئے جیسے آدمی میں ہوتا ہے۔ ڈھیلے ڈھالے نظم کے ساتھ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔

تیسرا مرحلہ کیا ہے! تربیت اور تزکیہ یعنی جس اللہ کے لئے یہ سب کچھ کر رہے ہو' اس کے احکام کو پہلے اپنے اوپر نافذ کرو۔ جس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں انقلاب برپا کرنے چلے ہو' پہلے اس رسولؐ کی ہر ادا کو اپنی سیرت میں جذب کرو۔ جب تک یہ نہیں ہو گا کوئی کوشش بار آور نہیں ہو گی۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص بہت فعال ہے' تنظیمی اور جماعتی کاموں میں لگا رہتا ہے' بہت بھاگ دوڑ کرتا ہے لیکن اس سے دین کے احکام پر عمل میں کسل مندی' تساہل' اور بے رغبتی کا اظہار ہوتا ہے۔ تو ایسے سپاہیوں سے گاڑی نہیں چلے گی۔ ایسے لوگ کسی امتحان کے مرحلہ میں خالی کارتوس ثابت ہوں گے۔ لہٰذا تیسرا نہایت اہم مرحلہ ہے تربیت اور تزکیہ کا صحابہ کرامؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا شاہکار تھے' ہمارے لئے اصل آئیڈیل وہ ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو تربیت حضورؐ نے فرمائی تھی صحابہ کرامؓ کی' اس کی کوئی اور نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ وہ بات ہے جس کی گواہی دشمنوں کی طرف سے ملی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب سپاہِ اسلام ایرانیوں کے خلاف صف آرا تھیں تو رستم سپہ سالار افواج ایران نے مسلمان فوجوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے کچھ جاسوس بھیجے تھے۔ وہ بھیس بدل کر مسلمانوں کے کیمپ میں کچھ دن تک حالات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ واپس جا کر انہوں نے رستم کو رپورٹ پیش کی کہ "هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ" یہ عجیب لوگ ہیں' رات کو راہب نظر آتے ہیں اور دن میں شہ سوار ہیں۔" دنیا نے یہ دونوں چیزیں علاحدہ علاحدہ تو دیکھی تھیں۔ عیسائی راہب بڑی تعداد میں موجود تھے۔ آپ نے بحیرہ راہب کا واقعہ سنا ہو گا جس نے حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کو آپ کے بچپن میں پہچان لیا تھا۔ حضورؐ کے زمانہ تک عیسائیوں میں بڑے مخلص راہب موجود تھے۔ انہی میں وہ راہب بھی تھا جس نے حضرت سلمان فارسیؓ کو حضورؐ کا پتہ دیا کہ جاؤ میرا علم بتاتا ہے کہ کھجوروں کی سرزمین میں نبی آخرالزمان کے ظہور کا وقت آ گیا ہے' جاؤ قسمت آزمائی کرو۔ اندازہ لگایئے کہ کتنا بڑا عالم راہب ہو گا۔ لیکن جو راہب ہوتے تھے وہ دن کے وقت بھی راہب ہوتے ہیں رات کے وقت بھی۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تو نظر نہیں آتی تھی۔ اسی طرح قیصر و کسریٰ کی افواج بھی موجود تھیں لیکن جو دن کا فوجی ہے وہ رات کا بھی فوجی ہے۔ جہاں رات کو فوج کا پڑاؤ ہو جاتا تھا وہاں آس پاس کی کسی عورت کی عصمت کا محفوظ رہ جانا ایک معجزہ ہوتا تھا۔ کل چھڑے اڑائے جا رہے ہیں' شراب کے دور چل رہے ہیں' دل کھول کر عیاشی ہو رہی ہے...... اب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت و تزکیہ کا کمال دیکھئے کہ دو متضاد چیزوں کو جمع کر دیا۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت و کردار پر اس سے زیادہ جامع تبصرہ ہو ہی نہیں سکتا کہ هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ کہ رات کو یہ راہب نظر آتے ہیں' اللہ کے حضور سربسجود ہیں' قیام کی حالت میں قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے اور سجدہ گاہیں آنسوؤں سے تر ہیں' لیکن دن کے وقت یہی لوگ جو بہترین شہ سوار ہیں۔ اور نہایت دلیری سے لڑتے ہیں۔

تو جان لیجئے کہ کسی انقلابی جدوجہد کے یہ تین ابتدائی مراحل ہیں۔ دعوت' تنظیم اور تربیت و تزکیہ ان تینوں کا حاصل یہ ہے کہ ایک انقلابی جماعت وجود میں آئے جو ایک طاقت اور قوت بن جائے۔ اس قوت و طاقت کا کام کیا ہے! جب تک یہ طاقت بڑھ رہی ہے ، GROW کر رہی ہے۔ اپنے آپس کے روابط و تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر رہی ہے' اپنی تنظیم کو مضبوط کر رہی ہے' اپنی دعوت کے ذریعہ سے اپنے حلقۂ اثر اور BASE کو وسیع کر رہی ہے۔ لیکن جب تک اتنی طاقت نہیں ہو جاتی کہ وہ باطل سے ٹکرا سکے اس وقت تک صبر محض پر عامل رہتی ہے۔ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ "ہاتھ بندھے رکھو!" چاہے تمہارے ٹکڑے اڑا دیئے جائیں' تم ہاتھ مت اٹھاؤ۔ میں اس کا اجمالی تذکرہ پہلے کر چکا ہوں۔ انقلابی جدوجہد میں اس صبر محض (PASSIVE RESISTANCE) کی بہت اہمیت ہوتی ہے اس لئے کہ اگر ابتدائی مراحل میں انقلابی جماعت

تشدد پر اتر آئے‘ ’VIOLENT‘ ہوجائے تو اس معاشرے میں موجود باطل نظام کو اس بات کا اخلاقی جواز حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ اس مختصر سی انقلابی طاقت کو کچل ڈالے۔ اس کے برعکس اگر وہ انقلابی جماعت صبر محض کی پالیسی کو اختیار کرے اور ظالموں کی جانب سے تشدد کو جھیل جائے تو اس معاشرے کی رائے عامہ اس کے جماعت کے حق میں ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ قدرتی طور پر رائے عامہ کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوگا۔ کہ آخر ان لوگوں کو کیوں ایذائیں دی جارہی ہیں ’ان کا جرم کیا ہے! کیا انہوں نے چوری کی ہے یا ڈاکہ ڈالا ہے!۔ کیا کسی کی ناموس و آبرو پر ہاتھ ڈالا ہے! کیا کسی غیر اخلاقی حرکت کا ارتکاب کیا ہے!! ان لوگوں کا بس ایک جرم ہے کہ اللہ کو مانتے ہیں اور محمدؐ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں حکم یہی تھا کہ ہاتھ باندھے رکھو‘ مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ کفار کی طرف سے مسلمانوں پر بدترین تشدد ہوا جسے مسلمانوں نے کمال صبر سے برداشت کیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مکہ کے تمام لوگ تو سنگدل نہیں تھے۔ وہاں کی خاموش اکثریت تو دیکھ رہی تھی کہ مسلمانوں کو ناحق ستایا جارہا ہے اور یہی مسلمانوں کی اخلاقی فتح تھی جو بعد میں غزوہ بدر میں اس طرح ظاہر ہوئی کہ تین سو تیرہ بے سروسامان لشکر کے سامنے ایک ہزار کا مسلح لشکر ٹھہر نہ سکا اور مسلمانوں نے کفار کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔

تو یہ صبر محض اس انقلابی تحریک کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔ جب ہم ان مراحل کو ترتیب وار شمار کرتے ہیں تو صبر محض چوتھا مرحلہ قرار پاتا ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مرحلہ دعوت کے پہلے دن سے شروع ہوجاتا ہے۔ اور ابتدائی تینوں مراحل یعنی دعوت ’تنظیم اور تربیت کے شانہ بشانہ چلتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تعذیب و تشدد پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا اور اپنے موقف پر ڈٹے اور جمے رہنا انتہائی مشکل مرحلہ ہوتا ہے اور یہ صبر محض اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک اتنی طاقت نہ ہوجائے کہ اس نظام کے ساتھ باضابطہ تصادم مول لے سکے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ٹکراؤ کے بغیر انقلاب نہیں آتا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے وعظ اور نصیحت سے انقلاب کبھی نہیں آیا۔ لیکن پختہ ہوئے بغیر اور مناسب تیاری کے بغیر ٹکراؤ ہوگیا تو تمام جدوجہد اکارت جائے گی۔ تقریر کے آغاز میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ کوئی وجہ ہے کہ بارہ برس تک مشرکین

کی طرف سے مکہ میں شدید ترین تشدد (PERSECUTION) ہو رہا ہے' انتہائی ایذا رسانی کا سلسلہ جاری ہے لیکن حضورؐ کی طرف سے جوابی کاروائی کی اجازت نہیں ہے۔ ہر نوع کے جور و ستم کو برداشت کرو' اگر اللہ ہمت دے تو ان کی گالیوں کے جواب میں دعائیں دو۔ اس طرح اہل ایمان کا امتحان بھی ہو رہا تھا تربیت بھی ہو رہی تھی۔

لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو جائے کہ وہ انقلابی جماعت یہ محسوس کرے کہ اب ہم برملا اور کھلم کھلا نظام باطل کو چھیڑ سکتے ہیں۔ اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو انقلاب کا پانچواں مرحلہ شروع ہو جائے گا جس کا عنوان ہے اقدام یعنی 'ACTIVE RESISTANCE'۔ ______ یعنی اب اُس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑا جائے گا۔ میں اس وقت اس معاملہ کو بہت اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اس میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔ جاننے کا شوق اگر دل میں پیدا ہو جائے تو میری کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" کا مطالعہ کیجئے جس کا میں پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ ہمارے دور میں اگر کوئی ایسی اسلامی انقلابی جماعت وجود میں آ جائے تو یہ فیصلہ کرنا کہ اب کافی طاقت فراہم ہو گئی ہے اور اقدام کا مرحلہ آ گیا ہے اس کا انحصار امیر کے اجتہاد اور 'ASSESSMENT' ______ پر ہو گا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو یہ فیصلہ اللہ کی طرف سے تھا۔ ہجرت ہو رہی ہے' ساتھ ہی آیت نازل ہو گئی اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ○ اجازت دی جا رہی ہے ان لوگوں کو جن پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے تھے کہ آج ان کے ہاتھ کھول دیئے گئے اب وہ بھی 'RETALIATE' کر سکتے ہیں' بدلہ لے سکتے ہیں' ...... یہ فیصلہ کس کی طرف سے آیا! اللہ کی طرف سے' وحی کے ذریعہ سے۔ اب وحی تو نہیں آئے گی۔ اب یہ فیصلہ اجتہاد سے ہو گا۔ اب فہم و ادراک کی پوری قوتیں کام میں لا کر فیصلہ کرنا ہو گا کہ کیا ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم باطل نظام کے ساتھ ٹکر لے سکتے ہیں! اگر مشورے کے بعد امیرِ جماعت کی یہ رائے بن گئی کہ ہمارے پاس معتدبہ تعداد میں ایسے کارکن موجود ہیں جو منظم ہیں۔ سمع و طاعت کے خوگر ہیں' ان کا تعلق مع اللہ مضبوط ہے۔ ان کی اسلامی نہج پر تربیت ہو چکی ہے تزکیۂ نفس کی وادی سے وہ گزر چکے ہیں۔ اللہ کی راہ میں جان دینے کو وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔ وہ سینوں پر گولیاں کھانے

کو تیار ہیں، پیٹھ نہیں دکھائیں گے۔ اگر لاٹھیوں کی بارش ہو گی تو وہ بھاگیں گے نہیں۔ جیلوں میں بھرا جائے گا تو وہ جیلوں کو بھر دیں گے کوئی معافی مانگ کر نہیں نکلے گا۔ جب اندازہ ہو کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے تو پھر چیلنج کیا جائے گا اور آگے بڑھ کر اقدام کیا جائے گا۔

سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں یہ اقدام ہمیں اس شکل میں ملتا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ تشریف لے جا کر ٹھنڈی چھاؤں میں آرام نہیں فرمایا۔ مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی ہرزہ سرائی دیکھئے کہ وہ ہجرت کا ترجمہ کرتے ہیں "FLIGHT TO MADINA" فلائٹ کا ترجمہ ہو گا فرار...... معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ فرار ہوتا ہے کسی مصیبت سے بچنے کے لئے بھاگ کر کہیں پناہ لینا...... محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ جا کر معاذ اللہ پناہ نہیں لی تھی۔ ہجرت در اصل عنوان ہے اس کا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ اور انؐ کے اعوان وانصارؓ کے لئے ایک BASE فراہم کر دی تھی کہ جہاں سے اسلامی انقلاب کی تحریک کو LAUNCH کرنا ہے اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ہے۔ حضورؐ نے مدینہ تشریف لا کر صرف چھ مہینے داخلی استحکام پر صرف فرمائے ہیں۔ اس عرصہ میں حضورؐ نے تین کام کئے ہیں۔ پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر...... مرکز بن گیا۔ دوسرا کام مہاجرینؓ اور انصارؓ کی مواخات اور تیسرا کام آپ نے یہ کیا کہ یہود کے تین قبیلوں سے معاہدے کر لئے۔ ان کو معاہدوں میں جکڑ لیا۔ طے پا گیا کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں گے۔ ان کے تمام شہری حقوق محفوظ رہیں گے لیکن اگر کبھی کسی طرف سے مدینہ پر حملہ ہوا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے یا بالکل غیر جانب دار رہیں گے۔

ان ابتدائی چھ مہینوں کے بعد راست اقدام کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ آپؐ نے چھاپہ مار دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ قریش کی شہ رگ (LIFE LINE) پر ہاتھ ڈالا اور ان کے تجارتی قافلوں کو مخدوش بنا دیا۔ ان مہموں کے متعلق اجمالاً میں گفتگو کر چکا ہوں...... در حقیقت اس اقدام کا نتیجہ تھا کہ قریش کا ایک ہزار کا لشکر پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو کر حملہ آور ہوئے تھے سانپ بل سے باہر نکل آیا تھا اور اس طرح انقلاب محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا چھٹا اور آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) کا آغاز ہو گیا۔ اب تلواریں اور نیزے ہیں، مقابلہ ہے۔ تلوار تلوا

سے نکرا رہی ہے۔ یہ چھٹا اور آخری مرحلہ (FINAL PHASE) چھ سال کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دوران ہر طرح کی اونچ نیچ آئی۔ بدر میں ستر کافر مارے گئے' چودہ مسلمان شہید ہوئے۔ احد میں ستر صحابہؓ شہید ہو گئے۔ نشیب و فراز آئے ہیں۔ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ط۔ "اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں"۔ اللہ کی طرف سے یہ ضمانت نہیں تھی کہ اے اہل ایمان میری راہ میں جنگ کرو' تم میں سے کسی کو کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یہ گارنٹی تو کہیں نہیں دی گئی تھی۔ تم کو تو اپنی جانیں دے کر اپنی صداقت کا ثبوت دینا ہے۔ عام اہل ایمان کو کہاں گارنٹی ملتی' حضورؐ کے لئے بھی گارنٹی نہیں تھی۔ طائف میں جب حضورؐ پر پتھراؤ ہوا ہے تو آپؐ کا جسد اطہر لہو لہان ہوا کہ نہیں ہوا! ۔ احد میں جب حضورؐ کے چہرۂ مبارک پر تلوار کا وار پڑا ہے تو آپؐ کے دندان مبارک شہید ہوئے کہ نہیں ہوئے! خون کا فوارہ چھوٹا کہ نہیں چھوٹا! اور حضورؐ کے رخسار مبارک پر خود کی دو کڑیاں گھسیں کہ نہیں گھسیں! یہ سب کچھ ہوا ... ہاں ان تمام آزمائشوں سے گزرنے کے بعد' اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لگا دینے کے بعد وہ مرحلہ بھی آتا ہے کہ اللہ کی غیبی تائید و نصرت آ کر رہتی ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ کامیابی قدم چومے گی۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط۔

دورِ حاضر میں انقلابِ اسلامی کا طریق کار

اسلامی انقلاب کے منہج کے یہ چھ مراحل ہیں جنہیں میں نے یہاں نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔ اس انقلابی عمل (REVOLUTIONARY PROCESS) کو میں نے حضورؐ کی سیرت مبارکہ سے سمجھا ہے اور اس معاملے میں میرا ماخذ صرف اور صرف سیرت محمدیؐ ہے۔ اب ایک اہم بات کی طرف اور اشارہ کروں گا اور وہ یہ کہ اس انقلابی عمل کے ابتدائی چار مراحل ہر دور میں بعینہٖ اسی طرح رہیں گے جیسے ہمیں سیرت مطہرہ میں نظر آتے ہیں۔ یعنی اسلامی انقلابی جدوجہد کا پہلا مرحلہ دعوت و تبلیغ کا ہو گا۔ اس میں قرآن کو مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو گی اور انقلابی نظریہ توحید ہی کا ہو گا۔ بقول اقبال ۔

زندہ قوت تھی زمانے میں یہ توحید کبھی
اور اب کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام

آج کے دور میں توحید بریلویوں اور اہل حدیثوں کے درمیان بحث و نزع کا ایک مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس پر کھینچ تان ہو رہی ہے ورنہ حقیقت میں توحید تو پورے ایک نظامِ تمدن 'ایک نظامِ اجتماعی 'ایک نظامِ عدل و قسط کی بنیاد ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے تنظیم۔ یہاں بھی ہمیں سیرت مطہرہ سے حاصل ہونے والے اسوہ کو جوں کا توں اختیار کرنا ہو گا۔ اس تنظیم کے معاملے میں میرے نزدیک حضورؐ نے جو رہنمائی امت کو دی ہے وہ ہے نظامِ بیعت۔ اجتماعیت کے لئے بنیاد بیعت ہو گی۔ میری اس رائے سے کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے لئے ایک جماعت اور ایک تنظیم کی تأسیس کے لئے سیرت مطہرہ میں بیعت کی سنت کے علاوہ کوئی دوسری صورت موجود نہیں ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک حدیث ملتی ہے۔ جس کی صحت پر امت کے دو جلیل القدر محدثین امام بخاری اور امام مسلم رحمتہ اللہ علیہما متفق ہیں۔ سند کے اعتبار سے متفق علیہ سے زیادہ کسی روایت کا مقام نہیں ہوتا۔ اس حدیث کے الفاظ اس قدر جامع ہیں کہ میرا گہرا تأثر یہ ہے کہ اس حدیث میں ایک صحیح اسلامی انقلابی تنظیم یا جماعت کا پورا دستور موجود ہے۔ میں آپ حضرات سے درخواست کروں گا کہ اس حدیث اور اس کے ترجمہ اور تشریح کو پوری توجہ اور غور کے ساتھ سماعت فرمایئے۔ حدیث ہے

عن عبادہ بن الصامت قال بایعنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم علی السمع و الطاعہ فی العسر و الیسر و المنشط و المکرہ و علی اثرۃ علینا و علی ان لا ننازع الامر اھلہ و علی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللّٰہ لومۃ لائم۔

"حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے۔ انہوںؓ نے کہا کہ "ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ جو حکم آپ ہمیں دیں گے ہم سنیں گے اور مانیں گے۔ چاہے آسانی ہو چاہے تنگی ہو۔ چاہے وہ ہمارے نفس کو اچھا لگے چاہے اس کے لئے ہمیں اپنے نفس کو مجبور کرنا پڑے اور چاہے آپؐ ہم پر

دوسروں کو ترجیح دیں اور جس کو بھی آپؐ امیر مقرر فرما دیں گے' ہم اس کا حکم مانیں گے اور اس سے جھگڑیں گے نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جو ہماری رائے ہو گی' اور جس بات کو ہم حق سمجھیں گے اس کو بیان ضرور کریں گے ہم جہاں کہیں بھی ہوں۔ اور اللہ کے معاملہ میں حق بات کہنے سے ہم کسی ملامت گر کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈریں گے"۔

یہ ہے میرے نزدیک تنظیم کے مرحلے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت۔ اس میں صرف یہ فرق ملحوظ رکھنا ہو گا کہ حضور کی اطاعت مطلق تھی اس لئے کہ حضور کا ہر فرمان معروف کے حکم میں تھا لیکن آپؐ کے بعد اب کسی بھی امیر کی اطاعت آزاد نہیں ہو گی بلکہ معروف کے دائرے کے اندر اندر ہو گی۔ تربیت کے مرحلے میں بھی ہمیں پورے طور پر نبوی طریق کی پیروی کرنا ہو گی۔ اس میں اہم ترین چیز ہے عباداتِ مفروضہ کا اہتمام اور ان کی پابندی' مزید بر آں تلاوتِ قرآن اور حتی الامکان قیام الیل کا اہتمام۔ اسی طرح صبرِ محض کے مرحلے کو بھی ہمیں بعینہٖ اسی طرح اختیار کرنا ہو گا جس طرح ہمیں سیرت میں مکی دور میں نظر آتا ہے۔ یعنی دعوت و تبلیغ کے اس کام میں اور اقامت دین کی اس جدوجہد میں جو مصائب اور شدائد آئیں ان پر صبر کرنا ثابت قدم رہنا اور اپنا ہاتھ روک کر رکھنا...... یہ وہ چار ابتدائی مراحل ہیں جن میں ہمیں طریق نبوی کو جُوں کا تُوں اختیار کرنا ہے۔

البتہ اسلامی انقلابی جدوجہد کے پانچویں اور چھٹے مرحلے یعنی اقدام اور مسلح تصادم کے معاملے میں ہمیں احوال و ظروف کی مناسبت سے کچھ ترمیم کرنی ہو گی۔ اور اجتہاد سے کام لینا ہو گا۔ اس کی وجہ سمجھ لیجئے۔ پہلی بات یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس معاشرے سے معاملہ تھا' وہ تمام اعتبارات سے خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرہ تھا۔ آج کسی بھی مسلمانوں کے ملک میں یہ جدوجہد ہو گی تو سابقہ مسلمانوں سے پیش آئے گا چاہے اس ملک میں حکمران اور عامتہ المسلمین کی اکثریت فاسق و فاجر افراد پر مشتمل ہو۔ وہ سیکولر (SECULAR) ذہن رکھتے ہوں' لیکن کلمہ گو تو ہیں' شمار تو ان کا مسلمانوں ہی میں ہوتا ہے۔ ایک معاملہ تو یہ ہے جس کی وجہ سے صورت حال میں فرق واقع ہو گیا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس زمانہ میں طاقت کا زیادہ فرق نہیں تھا' جو تلواریں ادھر مشرکین و کفار کے پاس تھیں' وہی مسلمانوں کے پاس تھیں۔

مقدار اور تعداد (QUANTITY) کا فرق ضرور تھا لیکن نوعیت (QUALITY) کا فرق نہیں تھا۔ وہی نیزہ، تلوار، تیر کمان ان کے پاس ہے وہی ان کے پاس ہے۔ وہی گھوڑے اور اونٹ اُدھر ہیں، وہی اِدھر ہیں۔ لیکن آج کل جو استحصالی نظام بھی قائم ہے، خواہ وہ سرمایہ دارانہ ہو یا جاگیردارانہ اس کو تحفظ دینے والی حکومت ہوتی ہے جو انہی طبقات کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے مفادات رائج الوقت نظام سے بڑی مضبوطی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا مقابلہ میں حکومت آتی ہے، اس کے پاس بے پناہ قوت و طاقت ہے۔ چنانچہ مسلح تصادم والی بات موجودہ دور میں بڑی مشکل ہے۔ اس کا کوئی بدل تلاش کرنا پڑے گا...... وہ متبادل طریقے تمدن کے ارتقاء نے فراہم کئے ہیں۔ پرامن مظاہرے، پکٹنگ کرنا، گھیراؤ کرنا، چیلنج کرنا کہ فلاں فلاں کام جو اسلام کی رو سے منکر ہیں ہم یہاں نہیں ہونے دیں گے۔ یہ کام اگر ہو گا تو ہماری لاشوں پر ہو گا۔' یہ وہ راستے ہیں جو تمدن کے ارتقاء کی بدولت ہمارے لئے کھلے ہیں۔ جب تک یہ مرحلہ نہیں آتا، صرف زبان و قلم سے اس کا اظہار کیا جائے گا کہ یہ کام اسلام کے خلاف ہیں، منکر ہیں، حرام ہیں۔ ان کو چھوڑ دو، ان سے باز آجاؤ۔ ان کی جگہ معروفات کو رائج کرو۔ لیکن جب وہ وقت آجائے کہ اسلامی انقلابی جماعت یہ سمجھے کہ ہمارے پاس اتنی طاقت ہے کہ ہم مظاہروں کے ذریعہ سے حکومت کو مجبور کر سکتے ہیں تو پھر چیلنج کیا جائے گا کہ اب یہ کام ہم نہیں ہونے دیں گے۔ سڑکوں پر نکل آئیں گے۔ پرامن مظاہرے کریں گے، دھرنا مار کر بیٹھیں گے، پکٹنگ کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں کیا ہو گا! لاٹھی چارج ہو گا۔ گرفتاریاں ہوں گیں۔ جیلوں میں بھرے جائیں گے۔ حکومت اور آگے بڑھے گی تو فائرنگ ہو گی شیلنگ ہو گی۔ تو جب اس جماعت کے وابستگان نے پہلے ہی جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے، وہ سر پر کفن باندھ کر نکلے ہیں کہ ع "شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن" تو پیٹھ دکھانے کا کیا سوال! اب یا تو حکومت گھٹنے ٹیک دے گی اس لئے کہ آخر فوج بھی اسی ملک کی ہے اور عوام بھی اسی ملک کے ہیں۔ اپنوں کے خون سے ہاتھ کب تک رنگ سکیں گے۔ یا پھر نذرانہ جان اپنے رب کے حضور پیش کر کے اس تنظیم کے ارکان سرخرو ہو جائیں گے۔

اس کی ایک مثال اس دور میں ایرانیوں نے پیش کر کے دکھادی۔ اگرچہ ایران میں

نقلاب کے پہلے چار مراحل پر مطلوبہ درجے میں کام نہیں ہوا تھا۔ اس میں بہت سی خامیاں رہ
ئی تھیں...... اس کے بارے میں اس وقت میں گفتگو کرنا نہیں چاہتا...... لیکن ایک چیز انہوں
نے کر کے دکھادی۔ انہوں نے شاہ کے خلاف مسلح بغاوت نہیں کی تھی۔ انہوں نے ہتھیار
تھ میں نہیں لئے۔ خود جانیں دینے کے لئے سڑکوں پر آ گئے۔ ہزاروں مارے گئے' کوئی
پرواہ نہیں۔ لیکن ان قربانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس عاجز آ گئی۔ اور فوج نے مظاہرین پر
ولیاں چلانے سے انکار کر دیا اور آخر کار شہنشاہ کو بھاگتے بنی اور اس کا انجام یہ ہوا کہ ع
"دو گز زمین بھی مل نہ سکی کوئے یار میں' وہ شہنشاہ جو اس علاقہ میں امریکہ کا سب سے بڑا
پلیس مین تھا' اسے امریکہ بہادر نے بھی اپنے یہاں پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ وہ کونسی طاقت
ھی جس نے شہنشاہ ایران کو حکومت چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا! وہ عوام کا جذبہ اور جان
ربان کرنے پر آمادگی کی طاقت تھی۔ اس کے بغیر نظام نہیں بدلتا۔ تو اس معاملہ میں اجتہاد
سے کام لیتے ہوئے ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر صبر محض ہی کی پالیسی پر کاربند رہتے
ہوئے اقدام کرنا ہوگا مسلح تصادم کی نوبت نہیں آئے گی۔

البتہ جہاں حالات سازگار ہوں' جہاں مسلح تصادم ہو سکتا ہو' وہاں ہو گا۔ جیسے اب
فغانستان میں ہو رہا ہے۔ وہاں اس لئے ہو رہا ہے کہ ایک تو وہ قوم عرصہ سے آزاد قوم کے طور
دنیا کے نقشے پر موجود رہی ہے اس پر مغربی استعمار کا براہ راست غلبہ نہیں ہوا۔ وہ برصغیر
ک و ہند کی طرح دو سو برس تک غلام نہیں رہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ہتھیار عام ہیں۔ کوئی
مر شاید ایسا ہو جس میں ہتھیار نہ ہوں۔ ان کے بچے تو بچپن ہی سے بندوق اور رائفل سے
یلتے چلے آ رہے ہیں۔ پھر وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں گوریلا جنگ ممکن ہے ہمارا علاقہ ایسا ہے کہ
س میں گوریلا وار ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن اگر کہیں مسلح تصادم کے لئے حالات سازگار ہوں تو
مام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا فتویٰ ہے کہ وہاں نہی عن المنکر کے لئے طاقت کا استعمال کیا جا
سکتا ہے' تلوار اٹھائی جا سکتی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ کسی مسلمان فاسق و فاجر حکمران کے
خلاف مسلح بغاوت کا راستہ بالکل بند کر دیا گیا ہو۔ بغاوت ہو سکتی ہے۔ البتہ فقہاء کرام نے
س کے لئے شرط یہ عائد کی ہے کہ طاقت اتنی ہو جائے کہ اپنے اندازے اور جائزے کی حد تک
کامیابی کا واضح امکان نظر آتا ہو۔ باقی عملاً کیا ہو گا تو بہت سے ان دیکھے عوامل ایسے پیدا ہو سکتے

ہیں کہ آپ یقین سے نتیجہ کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہر حال یہ معاملہ اگرچہ مشروط ہے لیکن اتنی بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ مسلح بغاوت حرام مطلق نہیں ہے۔

لیکن ہمارے ملک کے حالات میں عملاً مسلح بغاوت ممکن نہیں ہے۔ اس کا بدل ہے پرامن اور منظم مظاہرے اور وہ تمام اقدامات جن کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ اس طرح ہم اللہ کی راہ میں جان تو دے سکتے ہیں۔ ہمارے پاس دینے کی چیز جان ہی ہے جو ہم دے سکتے ہیں۔ اس کے لئے آمادگی ضرور رہنی چاہئے۔ اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں سنا دوں۔ یہ حب رسولؐ ' یا محبت رسولؐ یا اتباع رسول ہی کا تقاضا ہو گا کہ ہماری قلبی کیفیات حدیث رسولؐ کے مطابق بن جائیں۔ حضورؐ نے فرمایا: وَالَّذِی نفسُ محمدٍ بیدہٖ لَوَدِدتُ اَن اَغزُوَ فِی سبیلِ اللّٰہِ فاُقتل ثم اُحییٰ ثم اَغزُوَ فاُقتل "اس ذات کی قسم' جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے میں یہ چاہتا ہوں' میری یہ آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں نکلوں اور قتل کر دیا جاؤں پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں" ۔ اس آرزو کا ہر مسلمان کے دل میں ہونا ایمان کی علامت ہے اور حضورؐ کے اتباع کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی طریقے سے حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ "جس کسی مسلمان نے اللہ کی راہ میں نہ کبھی جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی آرزو تھی تو اگر اس حال میں اس کو موت آئی تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوگی" ۔ گویا یہ ایمان کی شرط لازم ہے کہ یہ آرزو دل میں موجود ہو کہ اللہ تیرے دین کی سربلندی کے لئے یہ جان کام آئے' گردن کٹے' اس جسم کے ٹکڑے ہو جائیں۔ اس خواہش کا ہونا ضروری ہے خواہ اس کا مرحلہ نہ آئے' صحابہ کرامؓ میں بھی بہت سے ایسے ہیں کہ جن کا انتقال جنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہو گیا۔ ہو سکتا ہے مکی دور میں کسی صحابی کی طبعی موت واقع ہو گئی ہو۔ ان کے لئے میدان جنگ میں گردن کٹانے کی نوبت آئی نہیں ... اسی طرح عین ممکن ہے کہ ہماری زندگیوں میں اللہ کی راہ میں جانی قربانی دینے کا مرحلہ نہ آئے۔ لیکن دل میں نیت ہو' آرزو ہو' تمنا ہو' تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے واثق امید ہے کہ وہ اس پر بھی اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

حاصلِ کلام

عزیز طلبہ! میں نے سیرت مطہرہ کے ایک اجمالی نقشہ کے ذریعے سے آپ حضرات کے

سامنے حبِ رسولؐ کے تقاضے بیان کر دیئے ہیں۔ اس انداز میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ میری ہربات کو تسلیم کرلیں لیکن میرا نقطہ نظر آپ کے سامنے آیا ہے، اس پر ٹھنڈے انداز میں سوچ بچار کیجئے۔ اور ضرورت محسوس ہو تو مجھ سے تبادلہ خیال کیجئے۔

میری اس وقت کی گفتگو کا خلاصہ ذہن نشین کر کے اٹھئے۔ حبِ رسولؐ کا بنیادی تقاضا ہے اتباعِ رسولؐ ..... یہ اتباع زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی مطلوب اور مبارک ہے، لیکن اس کا اصل تقاضا یہ ہے کہ ہماری زندگی کا پورا رخ وہی ہو جائے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔ اور وہ رخ تھا غلبہ دین کی جدوجہد کا رخ! نظامِ عدل وقسط کا عملاً قیام و نفاذ! اسی مشن کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس (۲۳) سال تک جاں گسل محنت و مشقت کی، اسی کے لئے صحابہ کرام نے زندگیاں کھپا دیں۔ مصائب جھیلے، مظالم برداشت کئے۔ جانوں کے نذرانے پیش کئے..... حضورؐ اور صحابہ کرام کے نقش قدم پر ہماری زندگی کا رخ معین ہو جائے، ہماری دلچسپیاں اور ہمارے ذوق و شوق سیرت رسولؐ اور سیرت صحابہؓ کے سانچے میں ڈھل جائیں یہی حبِ رسولؐ کا اصل تقاضا ہے۔ ؎

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلماں میں اسی لئے نمازی!

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆

آداب معاشرت

شیخ رحیم الدین

کھانے پینے کے آداب

قارئین کی ایک عرصے سے خواہش تھی کہ میثاق میں جہاں ہماری فکری ونظریاتی رہنمائی کا سامان فراہم کیا جاتا ہے وہاں روزمرہ کی عملی زندگی سے متعلق رہنمائی کے لیے بھی کچھ صفحات مختص کیے جائیں۔ ______ اسی خواہش اور تقاضے کے پیش نظر ہم نئے سال سے "آداب المعاشرت" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضمون شروع کر رہے ہیں۔ اس سلسلے کا آغاز 'کھانے پینے کے آداب' سے کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں ہم نے مولانا منظور الوحیدی کی کتاب 'اسلامی عقائد واعمال' کو بنیاد بنایا ہے۔ ان مضامین کو ہمارے ایک رفیق کار شیخ رحیم الدین (فاضل دارالعلوم کراچی) ترتیب دیں گے۔ (ادارہ)

اسلام دینِ فطرت ہے جس کا کوئی بھی حکم فطرتِ انسانی کے خلاف نہیں بلکہ اس کا ہر حکم نوعِ انسانی کے لئے رحمت وبرکت ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کو مھد سے لحد تک کی زندگی گزارنے کے طور طریقے اور آداب سکھائے ہیں۔ اور یہ وہ آدابِ زندگی ہیں جن کو اس دنیا کے خالق ومالک نے (جو کہ اپنی مخلوق کے خیر وشر سے بدرجۂ اتم واقف ہے) اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہم تک پہنچائے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ انسانیت کی صلاح وفلاح اللہ تعالٰے کے حکم ماننے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں میں سے ہے۔ آئیے آج ہم آپ کو کھانا کھانے کے آداب بتلاتے ہیں۔

اللہ تعالٰے نے تمام لوگوں کو حلال کھانے، حلال پینے کا حکم دیا اور حرام کھانے سے پرہیز کا حکم دیا۔ اللہ تعالٰے نے جو چیزیں حلال کر دیں وہ انسان کی بدنی اور روحانی صحت کے لئے مفید ہیں اور جن چیزوں کو حرام قرار دے دیا، انسان کی بدنی اور روحانی صحت کے لئے نقصان دہ ہیں۔

اگر کوئی آدمی حلال کھاتا پیتا ہے تو وہ دنیا وآخرت میں بدنی صحت اور روحانی سکون حاصل کرتا ہے۔ بلکہ تمام عبادات کا مفید نتیجہ اور قلبی اطمینان اس وقت ہی حاصل ہوتا ہے کہ حلال کھا کر عبادت کرے

جو آدمی حرام کھاکر یا حرام کی برائی جسمانی اور روحانی صحت کو تباہ کرتاہے اور روحانی سکون سے محروم ہوتاہے وہ خود ہی اپنے آپ کو برباد کرتاہے ۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا (البقرۃ : ۱۶۸)

اے لوگو! ان چیزوں سے کھاؤ جو زمین میں حلال پاکیزہ ہیں ۔

اسلام نے کھانے پینے کے آداب، اوقات اور انداز بتائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا۔ سب سے خوش نصیب وہ ہے کہ جو ساری مخلوق میں سب سے بہتر اور سب سے اچھی سیرت کے مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت کرے ۔

انسان کو چاہئے کہ کھانا کھاتے وقت جوتے اتار دے تاکہ طبیعت پر بوجھ نہ رہے ۔

حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : جب کھانا رکھا جائے تو اپنے جوتے اتار دو یہ تمہارے قدموں کے لئے زیادہ راحت کی بات ہے ۔

جب تم میں سے کوئی کھانا کھائے تو بسم اللہ کہے۔ پس اگر شروع میں بھول جائے تو جب یاد آئے، یہ کہے بِسْمِ اللهِ فِي أَوَّلِهِ وَآخِرِهِ (اس کے آغاز وانجام پر اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں۔)

جب کھانا کھائے تو درمیان میں سے نہ کھائے بلکہ اطراف میں سے کھائے ۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کھانے کے درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے ۔ پس اس کے اطراف میں سے کھاؤ اور اس کے درمیان میں سے نہ کھاؤ ۔ (جامع الترمذی : باب الاطعمہ)

مسلمانوں کو مل جل کر کھانے کا حکم دیا گیا ۔ ایک روایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے عرض کیا ہم کھاتے ہیں مگر سیر نہیں ہوتے ۔ آپؐ نے فرمایا:

شائد تم جدا جدا کھاتے ہو؟ انہوں نے کہا : ہاں ! آپؐ نے فرمایا :

کھانے پر جمع ہوکر (کھاؤ) اور اس پر اللہ کا نام لو ۔ تمہارے لیے اس میں برکت ہوگی ۔

حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) بتاتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب مل کر کھاؤ اور جدا جدا نہ ہو۔ کیونکہ برکت جماعت کے ساتھ ہے ۔

سیدھا بیٹھ کر کھائے اور تکیہ لگا کر کھانا متکبرین کا کام ہے ۔

بعض لوگ ذرا ذرا سی بات پر کھانے پر اعتراض کرتے ہیں ۔ یہ عادت اچھی نہیں ۔ حضرت
ہریرۃ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کھانے میں عیب
ں نکالا ۔ اگر چاہا تو کھا لیا اور اگر ناپسند کیا تو چھوڑ دیا (صحیح البخاری : ۲ کتاب الاطعمہ)
اس طرح عجمی لوگوں کی طرح میز کرسی بچھا کر کانٹے سے کھانا بھی ناپسندیدہ کام ہے ۔ اگرچہ
م نہیں ہے ۔ مگر مناسب یہ ہے کہ زمین پر بیٹھے اور کپڑا بچھا کر اس پر کھانا رکھے اور دائیں ہاتھ
ساتھ کھائے ۔

انسان کو چاہئے کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئے ۔ دائیں ہاتھ کے ساتھ کھانا کھائے
ـمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ یا بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى بَرَكَةِ اللّٰهِ پڑھے اور سامنے سے کھائے ۔
حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
تم میں سے کوئی کھائے تو اپنے دائیں ہاتھ کے ساتھ کھائے اور جب پیئے تو اپنے دائیں ہاتھ
ساتھ پیئے کیونکہ شیطان بائیں ہاتھ کے ساتھ کھاتا ہے اور بائیں ہاتھ کے ساتھ پیتا ہے ۔
جو لوگ کھانا کھاتے وقت بسم اللہ نہیں پڑھتے وہ شیطان کے ہم نشیں ہوتے ہیں ۔
ت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ۔
ان اس کھانے کو اپنے لئے) حلال سمجھ لیتا ہے (یعنی اس میں شریک ہو جاتا ہے) جس پر اللہ
م نہ لیا جائے ۔

اگر کھانا شروع کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا یاد نہ رہے تو جب یاد آئے تب ہی
ر لے ۔ حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
نے فرمایا :

کھانے وغیرہ میں فضول خرچی بھی ناپسندیدہ عادت ہے ۔
یعنی پیٹ کی ہر خواہش پوری کرنے لگے تو یہ ڈرم سیر نہیں ہوگا ۔ حضرت مقدام بن معدیکرب
ی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا
ں نے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی برتن نہیں بھرا ۔ ابنِ آدم کو چند لقمے کافی ہیں جس سے اپنی پیٹھ
سیدھا رکھے ۔ اگر ضروری (زیادہ کھانا) ہو تو تیسرا حصہ کھانے کے لئے ، تیسرا حصہ پینے کے لئے
تیسرا حصہ سانس لینے کے لئے ہو ۔ (جامع الترمذی : باب الزھد)
حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کے سامنے ڈکار لیا۔ آپ نے فرمایا:

اپنا ڈکار ہم سے روکو۔ کیونکہ تم میں سے قیامت کے دن زیادہ طویل بھوکے وہ ہوں گے جو دنیا کے گھر میں زیادہ سیر رہیں گے۔

کھانا پکائے تو پڑوسیوں کا لحاظ رکھے اور ہو سکے تو انہیں بھی کھانے میں شریک کرے چاہے گاہے گاہے ایسا کرے۔

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تم شوربا بناؤ تو پانی زیادہ کر دو اور اس میں سے پڑوسیوں کے لئے بھی ایک چلو اٹھاؤ (یعنی انہیں بھی سالن دو) (سنن ابن ماجہ)

جب تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اسے پکڑ لے اور اس کے ساتھ لگنے والی خرابی کو دور کر دے اور اسے کھالے اسے شیطان کے لئے نہ چھوڑے اور جب تک انگلیاں چاٹ نہ لے تب تک رومال کے ساتھ صاف نہ کرے۔ کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔

رات کو کھانے کا ناغہ نہ کرے۔ چاہے تھوڑی سی غذا ہی کھائے۔ حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رات کا کھانا کھاؤ اگرچہ چند لقمے ہی ہو ـــــ اس لئے کہ عشا کا کھانا چھوڑ دینا بڑھاپا لاتا ہے۔

سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھائے پیئے۔ یہ دنیادار متکبرین کا طریقہ ہے۔

اگر اتفاقاً کھانا سامنے آجائے اور اس وقت نماز بھی کھڑی ہو جائے تو کھانا کھالے پھر نماز پڑھے۔ بشرطیکہ نماز کا وقت باقی رہے تاکہ نماز کی حالت میں کھانے کی باتیں نہ سوچتا رہے۔

کھانا تیار کرنے والے غلام یا ملازم کو کھانے میں شریک کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے شریک نہ کر سکے تو تھوڑا سا کھانا ہی اسے دے دے۔ حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا لائے تو اسے ساتھ بٹھائے یا اس سے کچھ اسے دے دے۔ کیونکہ اس نے اس کی گرمی اور دھواں سہا ہے (سنن ابن ماجہ)

اگر ضرورت پڑے تو مسجد میں بھی کھانا کھا سکتے ہیں۔ البتہ مسجد کی صفائی کا دھیان رکھے۔
اگر کھانا برتن میں رہ جائے اور وہ اس قدر قلیل ہو کہ اسے کھانے میں حرج نہ ہو تو اسے
ر برتن صاف کر دے۔ انگلیوں پر لگا ہوا کھانا چاٹ لے۔ کیا خبر کس حصّہ میں برکت ہو۔
تین انگلیوں کے ساتھ کھانا کھانا زیادہ مناسب ہے۔ سارا ہاتھ استعمال کرنا بے ہودہ عادت ہے۔
کھانے کے بعد ہاتھ صاف کر دے اور روغن یا کھانے کی خوشبو دور کر دے۔
پانی پیتے وقت تین وقفے کرے اور ایک دم سارا گلاس نہ چڑھا جائے۔ حضرت انس (رضی اللہ عنہ)
ے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پیتے وقت تین وقفے کرتے تھے اور فرماتے:
خوب سیراب کرتا، خوب امراض و تکلیف سے بچاتا اور خوب خوش گوار طریقہ ہے۔
حضرت ابنِ عباس (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم
نے فرمایا:
اونٹ کے پینے کی طرح ایک دم نہ پیو بلکہ دو اور تین دفعوں کے ساتھ پیو اور جب
پیو تو اللہ کا نام لو (یعنی بسم اللہ پڑھو) اور جب تم ہٹاؤ تو حمد بیان کرو (یعنی الحمد
للہ کہو)۔
برتن میں سانس نہ لے اور نہ ہی پھونکیں مارے۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) سے
روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے برتن میں سانس لینے یا اس میں پھونکیں لگانے
سے منع فرمایا: (جامع الترمذی)
کھلے برتن یا گلاس وغیرہ سے پانی پینا چاہیئے۔ ایسا برتن کہ جو بند ہو یا مشکیزہ ہو یا نل کے
ساتھ منہ لگا کر پانی پینا خطرناک ہے۔ کیا خبر کوئی کیڑا وغیرہ اندر چلا جائے۔
اگر برتن نہ ہو تو ہاتھوں کا چلّو بنا کر پانی پیئے۔ یہ بہترین برتن ہے۔ حضرت ابنِ عمر (رضی اللہ عنہما)
سے روایت ہے کہ ہم ایک تالاب کے پاس سے گزرے۔ ہم اس میں منہ لگا کر پینے لگے۔ جناب
رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:
منہ لگا کر نہ پیو بلکہ اپنے ہاتھوں کو دھولو پھر (ان کے ساتھ) پیو۔ ہاتھ سے زیادہ پاکیزہ
برتن کوئی نہیں ہے۔
کھڑے ہو کر کھانا پینا سخت معیوب ہے۔ بلکہ بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ کھائے پیئے۔ حضرت
ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کھڑے ہو کر

پانی پینے سے منع فرمایا:

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع کیا کہ آدمی کھڑا ہو کر پیئے۔ پوچھا گیا: پھر (کھڑے ہو کر، کھانا (کیسا) ہے! فرمایا: یہ اس سے بھی زیادہ سخت (یعنی غلط کام) ہے۔

البتہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا بہتر ہے کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی کیا اور بہتر وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کریں۔

اگر اتفاقاً پانی یا دودھ وغیرہ میں مکھی گر جائے تو اگر پینا چاہے تو مکھی کو ڈبو کر پیئے۔ کیونکہ مکھی کے ایک پر میں بیماری ہوتی ہے اور دوسرے میں شفا ہوتی ہے۔ جب ڈبوئے گا تو بیماری کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ اگر نہ پینا چاہے تو پینے کی پابندی نہیں۔

کھانے پینے کے بعد کی دعائیں

جب کھانے سے فارغ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔ حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ کہتے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ

(سب حمد اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور ہمیں پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا)

حضرت سہل بن معاذ بن انس الجہنی اپنے والد محترم (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جس نے کھانا کھایا پھر یہ کہا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ

(سب حمد اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ کھلایا اور روزی دی بغیر میری قدرت اور طاقت کے)

تو اس کے سابقہ گناہ معاف کر دیئے گئے۔ (سنن ابن ماجہ)

●●●●●●

حدیثِ رسولؐ

وعن

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ
فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ
وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا
وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ
مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ،
وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللهِ
لَوْمَةَ لَائِمٍ

(بخاری و مسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور اُن لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

نجوم ہدایت

طالب الہاشمی
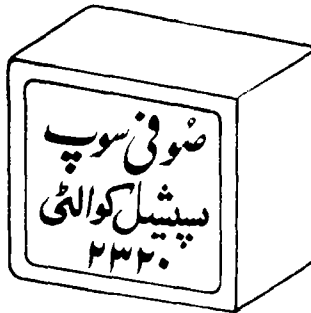
"یکتائے زمانہ"

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ بن سعد

جلاس بن سوید کا شمار مدینہ کے شرفاء میں ہوتا تھا۔ انہوں نے جب سعد بن عبید اوسی کی بیوہ سے نکاح کیا تو وہ مرحوم شوہر سے ایک کمسن بچہ بھی اپنے ہمراہ لائیں۔ یہ بچہ، جس کا نام عمیر تھا، کہنے کو تو جلاس کا ربیب تھا لیکن انہوں نے ایسی محبت اور شفقت کے ساتھ اس کی پرورش کی کہ شاید حقیقی باپ بھی اس طرح نہ کر سکتا۔ اس معصوم کو بھی جلاس سے کچھ ایسا انس اور پیار ہو گیا تھا کہ ہر وقت انگلی پکڑے ان کے ساتھ رہتا تھا۔ لوگ بھول گئے تھے کہ عمیر، جلاس کا ربیب ہے۔ وہ اس کو ان کا حقیقی بیٹا ہی تصور کرتے تھے۔ عمیر کا عہد طفلی تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں نزولِ اجلال فرمایا۔ اہل مدینہ کی ایک بڑی تعداد ہجرت نبویؐ سے قبل ہی نعمت اسلام سے بہرہ یاب ہو چکی تھی، اب باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ اسلام قبول کرنے لگے۔ جلاس بھی ایک دن کمسن عمیر کے ہمراہ رحمت عالمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نعمت اسلام سے بہرہ یاب ہو گئے۔ ارباب سیر نے جلاسؓ اور عمیرؓ کے قبول اسلام کا زمانہ متعین نہیں کیا لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ اس وقت عمیر کا لڑکپن تھا۔ وہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تھے اور ان کے والد سعد بن عبید (بن نعمان بن قیس بن عمرو بن عوف) ان کی صغر سنی میں وفات پا گئے تھے۔ گو قبول اسلام کے وقت عمیرؓ بدوِ شعور کو نہ پہنچے تھے لیکن مبداء فیاض نے انہیں نہایت صالح اور سعید فطرت سے نوازا تھا۔ رحمت عالمؐ کی زیارت کے بعد ان کے دل میں حضورؐ کے لئے ایسی محبت اور کشش پیدا ہو گئی کہ جب تک روزانہ آپؐ کو دیکھ نہیں لیتے تھے، کل نہیں پڑتی تھی۔ حضورؐ بھی ان پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ دن گذرتے گئے اور ذات رسالت مآبؐ سے عمیرؓ کی عقیدت، محبت اور نیاز مندی میں اضافہ ہوتا رہا۔

یوں تو عرب میں بارش ویسے ہی کم ہوتی ہے لیکن ۹ ہجری میں تو خشک سالی نے قیامت ڈھا دی اور سارے ملک میں قحط کا سماں پیدا ہو گیا۔ مدینہ باغوں کا شہر تھا لیکن قحط اور گرمی کی شدت سے اہل مدینہ بھی پناہ مانگ رہے تھے۔ لے دے کے ان کی امیدیں اپنے نخلستانوں سے وابستہ تھیں جن میں کھجور کے درختوں پر پھل گدرا چکے تھے اور ان کے اتارنے کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ یہی دن تھے کہ ایک دن اہل مدینہ یہ خبر سن کر چونک اٹھے کہ رومیوں کا ایک زبردست لشکر عرب پر دھاوا بولنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ سرور عالمؐ صورت حال سے پوری طرح باخبر تھے۔ آپؐ نے اہل ایمان کو جہاد کی تیاری کا حکم دیا اور فرمایا کہ ہم دشمن کا مقابلہ آگے بڑھ کر سرحد پر کریں گے۔

مسلمانوں کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا۔ کھجور کی تیار فصل' ہولناک گرمی' تپتے ہوئے صحراؤں میں طویل سفر کی صعوبتیں' خوراک پانی اور سواریوں کی قلت ہر چیز ان کی نظر کے سامنے تھی۔ لیکن وہ تو اپنی جانیں مال اور اولاد سب کچھ خدا کی راہ میں بیچ چکے تھے' انہوں نے سرور عالمؐ کے ارشاد پر کسی حیل و حجت کے بغیر لبیک کہا اور ہمہ تن جہاد کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ یہ غزوۂ تبوک یا جیش العسرۃ کی تمہید تھی۔ اس موقع پر ایثار و اخلاص کے حیرت انگیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا سارا مال و اسباب حضورؐ کے قدموں پر لا کر ڈال دیا اور جب حضورؐ نے پوچھا۔ "ابو بکر تم نے اپنے اہل عیال کے لئے کیا چھوڑا ہے۔" تو عرض کیا' "یا رسول اللہ! اللہ اور اللہ کا رسولؐ" ..... حضرت عمر فاروقؓ اپنا آدھا مال لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے تین سو اونٹ کجاوہ سمیت' سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار راہ حق میں پیش کئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف دو سو اوقیہ چاندی لے کر آئے۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ مال و دولت کا ایک انبار لے کر حاضر ہوئے۔ عاصمؓ بن عدی نے ستر وسق کھجوریں پیش کیں۔ خواتین نے اپنے زیور اتار کر اللہ کی راہ میں دے دیئے۔ غرض ہر ایک نے اپنی استطاعت کے مطابق بلکہ استطاعت سے بڑھ کر قربانی کا مظاہرہ کیا۔ ایک طرف تو اہل ایمان اس طرح صفحۂ تاریخ پر اپنے اخلاص اور ایثار کے عدیم النظیر نقوش ثبت کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف منافقین اپنی روسیاہی کا سامان فراہم کر رہے تھے۔ انہوں نے اہل ایمان کو بد دل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی' کبھی ان سے کہتے کہ

"کھجور کی فصل بالکل تیار ہے' تمہاری غیر حاضری میں یہ برباد ہو جائے گی اور تم کہیں کے نہ رہو گے۔" کبھی کہتے۔ "اس ہولناک گرمی میں تم جھلس کر رہ جاؤ گے اور زندہ واپس نہ آؤ گے۔" کبھی رومیوں کی زبردست جنگی قوت کا حال بتا کر انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ لوگ اکثر سویلم نامی کے ایک یہودی کے مکان پر جمع ہوتے اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کے منصوبے بناتے۔ انہی ایام میں ایک دن خدا جانے جلاس بن سوید کو کیا ہو گیا۔ منافقین کے بہکاوے میں آ گئے یا کھجور کی نہایت عمدہ فصل نے ان کی مت مار دی۔ اچھے بھلے مسلمان۔ کئی غزوات میں بھی شرکت کا شرف انہیں حاصل تھا۔ لیکن وائے بدبختی کہ ایک مجلس میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔

"اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ہم گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔"

اس موقع پر عمیرؓ بن سعد بھی موجود تھے۔ وہ اگرچہ نو عمر تھے لیکن ان کی پیشانی پر صبحِ سعادت کا نور چمک رہا تھا اور دل میں رحمت عالمؐ کی محبت کا سمندر موجزن تھا۔ اپنے آقا و مولا کے بارے میں جلاس کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو ان کا خون کھول اٹھا۔ کڑک کر بولے۔

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم ضرور سچے ہیں اور تم یقیناً گدھوں سے بدتر ہو۔"

جلاس نے عمیرؓ کی بات سنی تو سناٹے میں آ گئے۔ یہ لڑکا جس نے کبھی ان کے سامنے آنکھ تک نہ اٹھائی تھی آج ان کے منہ آ رہا تھا۔ بڑے جز بز ہوئے اور بولے۔ "کیا اسی دن کے لئے میں نے تجھے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ اب میں تیری کفالت سے باز آیا' کوئی اور جگہ ڈھونڈو۔"

سوتیلے باپ سے جلی کٹی سننے کے بعد عمیرؓ سیدھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ بلا کم و کاست عرض کر دیا۔ حضورؐ نے جلاس کی جسارت پر تعجب کا اظہار فرمایا اور فوراً ان کو بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوئے تو حضورؐ نے پوچھا۔

"جلاس' کیا تم نے آج فلاں مجلس میں یہ الفاظ کہے تھے۔"

جلاس کو اقرار کرنے کی ہمت نہ پڑی' صاف انکار کر گئے۔ اس وقت لسان رسالت پر یہ آیت جاری ہو گئی۔

یحلفون باللہ ماقالوا۔ و لقد قالوا کلمۃ الکفر و کفروا بعد اسلامھم و ھموا بمالم ینالوا و ما نقموا الا ان اغنھم اللہ و رسولہ من فضلہ فان یتو بوا یک خیرالھم

(وہ) اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے تو نہیں کہا حالانکہ بے شک انہوں نے کفر کا کلمہ کہا اور مسلمان ہوئے پیچھے کافر ہوئے اور ایسی چیز کا قصد کیا جس کو نہ پایا اور یہ سب کا بدلا دیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو دولت مند کر دیا۔ سو وہ اگر توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ (سورہ توبہ آیت ۷۴)

حضورؐ وحی الٰہی کے الفاظ پڑھتے جاتے تھے اور جلاس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ جب آپؐ خیرالھم پر پہنچے تو جلاس کی چیخ نکل گئی' بے اختیار رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر گر پڑے اور عرض کی۔

"یارسول اللہ خطا کار ہوں' در گزر چاہتا ہوں۔ مجھ سے بھول ہوئی' اب توبہ کرتا ہوں۔ للہ بخش دیجئے۔"

سرور عالمؐ رؤف و رحیم بھی تھے' آپؐ کو جلاس پر رحم آگیا اور آپؐ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اس کے بعد وہ حقیقی معنوں میں مسلمان ہو گئے اور پھر اپنے کسی قول یا فعل سے کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ توبہ قبول ہونے کی خوشی میں انہوں نے عمیرؓ کو پھر اپنی کفالت میں لے لیا اور جب تک زندہ رہے ان کو اپنے سے جدا نہ کیا۔

جلاسؓ کے اعتراف گناہ اور قبول توبہ کے موقع پر حضرت عمیرؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے شفقت آمیز انداز میں ان کا کان پکڑ کر مسکراتے ہوئے فرمایا

"لڑکے تیرے کانوں نے ٹھیک سنا تھا۔"

حضرت عمیرؓ بن سعد عہد رسالت میں اگرچہ کم عمر تھے لیکن سرور عالمؐ سے بے پناہ عقیدت و محبت اور بارگاہ نبوی میں باقاعدہ حاضر باشی نے انہیں منبع فضل و کمال بنا دیا تھا اور وہ اسلامی اخلاق کا پیکرِ جمیل بن گئے تھے۔ ان کے جوشِ ایمان کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ نابالغ ہونے کے باوجود جیش العسرۃ میں والہانہ شریک ہوئے اور دوران سفر میں پیش آنے والی تمام مصیبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے

رحلت فرمائی تو انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ کہیں آنا جانا چھوڑ دیا اور ہر وقت عبادت میں مشغول رہنے لگے۔ طبیعت پر خشیتِ الٰہی اور خوفِ آخرت کا غلبہ تھا اس لئے نہایت زاہدانہ زندگی گذارتے تھے لیکن وہ محض زاہد مرتاض ہی نہیں تھے بلکہ لوگوں کے دکھ سکھ میں بھی برابر شریک ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ذہنِ رسا عطا فرمایا تھا۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو آن واحد میں سلجھا دیتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا بھی بے حد شوق تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ ان کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور ان کے اوصاف و خصائل کے بے حد مداح تھے۔ اپنے عہدِ خلافت میں وہ ہمیشہ ایسے آدمیوں کی تلاش میں رہتے تھے جو حکومت کے اہم مناصب کی ذمہ داریاں کتاب و سنت کے مطابق انجام دے سکیں۔ حضرت عمیرؓ ان کے معیار پر ہر لحاظ سے پورے اترتے تھے چنانچہ انہوں نے عمیرؓ کو بلا بھیجا اور مجاہدین کے ایک لشکر کا افسر بنا کر شام بھیج دیا۔ وہاں انہوں نے رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ کچھ عرصہ بعد واپس آئے تو حضرت عمرؓ نے انہیں فوجی خدمت سے سبکدوش کر دیا اور حمص کا امیر مقرر کر دیا۔

امارتِ حمص کے منصب پر فائز ہونے کے بعد حضرت عمیرؓ نے وہاں کا کاروبار حکومت ایسی عمدگی سے انجام دیا کہ فاروق اعظمؓ کی نظروں میں ان کی عزت دوچند ہو گئی، وہ عمیرؓ کی قابلیت پر تعجب کیا کرتے تھے اور ان کو "نسیج وحدہ" (یکتا و یگانہ) کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ اگر مجھے عمیرؓ جیسی صلاحیتیں رکھنے والے چند آدمی مل جاتے تو میرا بار خلافت ہلکا ہو جاتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ عمیرؓ بن سعد سے زیادہ اچھا اور قابل آدمی شام میں کوئی نہیں تھا۔

طبقات ابنِ سعد کی روایت کے مطابق حضرت عمیرؓ سالہا سال تک حمص کے امیر رہے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ نے شہادت پائی تو وہ اس منصب سے دستکش ہو گئے اور عام شہری کی حیثیت سے حمص میں مستقل اقامت اختیار کر لی اور یہیں امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں وفات پائی، لیکن علامہ ابن اثیر اور بعض دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ انہوں نے حضرت عمر فاروقؓ کی زندگی میں ہی حمص کی امارت چھوڑ دی تھی اور مدینہ منورہ سے چند میل کے فاصلے پر اپنے اہل و عیال سمیت ایک گاؤں میں سکونت اختیار کر لی تھی وہیں انہوں

نے عہد فاروقی میں وفات پائی اور مدینہ منورہ کے قبرستان "بقیع غرقد" میں دفن ہوئے۔
حضرت عمرؓ کو ان کے انتقال کی خبر سن کر بیحد صدمہ ہوا اور وہ پیادہ پا "بقیع غرقد" کے گورستان میں تشریف لے گئے اور حضرت عمیرؓ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دیر تک ان کی مغفرت کے لئے دعا مانگتے رہے۔

جو سیرت نگار مؤخر الذکر روایت کے قائل ہیں ان کا بیان ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمیرؓ کو زکوٰۃ کی وصولی کا افسر بنا کر حمص بھیجا تھا۔ جب ان کو حمص گئے ہوئے پورا ایک سال گزر گیا اور ان کی طرف سے نہ زکوٰۃ کی رقم وصول ہوئی اور نہ کوئی اطلاع ملی تو حضرت عمرؓ بڑے مضطرب ہوئے۔ وہ اپنے امراء اور عمال پر کڑی نظر رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ انہیں باقاعدگی سے خط بھیجتے رہا کریں۔ حضرت عمیرؓ کی طویل خاموشی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ انہوں نے عمیرؓ کو ایک سخت خط لکھا کہ اب تک جس قدر رقم وصول ہوئی ہو اسے لے کر مدینہ حاضر ہوں۔

حضرت عمیرؓ کو فاروقِ اعظمؓ کا خط ملا تو انہوں نے زادِ راہ کا تھیلا کندھے پر ڈالا اور اپنا عصا ہاتھ میں لے کر پیدل ہی عازمِ مدینہ ہو گئے۔ جب کئی دنوں کے پر صعوبت سفر کے بعد مدینہ منورہ پہنچے تو یہ حال تھا کہ بال بڑھ گئے تھے، چہرہ سنولا گیا تھا اور جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔

دربار خلافت میں پہنچے تو حضرت عمرؓ ان کو اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا۔

"عمیرؓ یہ میں تمہیں کس حال میں دیکھ رہا ہوں؟"

عمیرؓ: "امیر المومنین، اللہ کے فضل سے میں اچھا بھلا ہوں۔ ہاں میرے ساتھ دنیا ہے جس کی گرانباری تلے دبا جا رہا ہوں"۔

حضرت عمرؓ: "آخر تمہارے پاس کونسی دنیا ہے؟"

عمیرؓ: "امیر المومنین یہ میرا تھیلا ہے جس میں اپنا زادِ راہ ڈال کر چلا تھا۔ یہ ایک پیالہ ہے جس میں کھانا کھاتا ہوں۔ یا اس میں پانی بھر کر اپنے کپڑے اور سر دھوتا ہوں۔ یہ میرا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں۔ یہ میرا عصا ہے جس سے حشرات الارض او دشمن کا مقابلہ کرتا ہوں۔ آخر انہیں چیزوں کا نام تو دنیا ہے"۔

حضرت عمرؓ یہ سن کر اللہ اکبر پکار اٹھے۔ پھر پوچھا۔

"کیا تم نے سارا سفر پیادہ کیا ہے؟"
عمیرؓ: "جی ہاں"
حضرت عمرؓ: کیا وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو تمہارے لئے سواری کا انتظام کر دیتا؟"
عمیرؓ: "نہ میں نے کسی سے مطالبہ کیا اور نہ کسی نے سواری کا انتظام کیا"۔
حضرت عمرؓ: "وہ لوگ کتنے برے ہیں جنھوں نے اپنے امیر کی تکلیف کا احساس نہیں کیا"۔
عمیرؓ: "امیر المومنین ایسا نہ کہیئے وہ لوگ مسلمان ہیں اور میں نے انہیں اکثر نماز پڑھتے دیکھا ہے"۔
حضرت عمرؓ "تمہیں معلوم ہے میں نے تمہیں کہاں بھیجا تھا اور کون سا کام تمہارے سپرد کیا تھا"۔
عمیرؓ: "امیر المومنین آپ نے مجھے جہاں بھیجا تھا' وہاں کے خدا ترس اور امانت دار لوگوں کو جمع کیا اور انہیں محاصل کی وصولی کا ذمہ دار بنایا۔ جو کچھ وہ وصول کر کے لائے اسے ان کی ضرورتوں پر خرچ کر دیا۔ اگر کچھ بچتا تو دربار خلافت میں بھی ضرور بھیجتا"۔
حضرت عمرؓ...... ان کا جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا "مجھے تم سے یہی امید تھی اب تم واپس اپنے عہدہ پر جاؤ"۔
عمیرؓ: "امیر المومنین اب مجھے اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیجئے۔ مجھ میں یہ بوجھ اٹھانے کی ہمت نہیں ہے۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی بات پر آخرت میں نہ پکڑا جاؤں۔ ایک دن امارت کی ترنگ میں ایک نصرانی کو کہہ بیٹھا کہ خدا تجھے خوار کرے' اسی وقت سے ضمیر ملامت کر رہا ہے اب میں کبھی امارت کی ذمہ داری قبول نہیں کروں گا"۔

حضرت عمرؓ نے ان پر بہت زور ڈالا کہ وہ اپنے عہدے پر بدستور کام کرتے رہیں لیکن وہ نہ مانے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ مدینہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک گاؤں میں مقیم ہو گئے۔

چند دن کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو سو دینار دے کر ہدایت کی کہ عمیرؓ کے گاؤں جاؤ' اگر دیکھو کہ عمیرؓ اطمینان و فراغت سے گزر کر رہے ہیں تو چپ چاپ واپس چلے آؤ اور اگر ان کو تنگ دست دیکھو تو یہ دینار ان کو دے دینا۔ وہ صاحب حضرت عمیرؓ کی قیام گاہ پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک دیوار سے ٹیک لگائے اپنے کرتے سے جوئیں صاف کر رہے ہیں (یا ایک

دوسری روایت کے مطابق مونج کی رسی بٹ رہے ہیں) ان صاحب کو دیکھ کر اھلاً و سھلاً کہا اور پوچھا۔
"آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں"۔ انہوں نے جواب دیا۔ "مدینے سے" پوچھا "امیرالمومنین کا کیا حال ہے؟"
کہا۔ "اچھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کا اجراء ونفاذ کر رہے ہیں"۔
یہ سن کر عمیرؓ نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور کہا "الٰہی! عمرؓ کا حامی وناصر رہنا۔ انہوں نے اپنی جان تیری راہ میں وقف کر رکھی ہے"۔
قاصد نے تین دن تک عمیرؓ کے ہاں قیام کیا۔ اس دوران میں انہوں نے دیکھا کہ سارے دن میں عمیرؓ کو بمشکل ایک روٹی میسر ہوتی ہے جیسے وہ مہمان کے سامنے رکھ دیتے تھے اور خود فاقہ کرتے ہیں۔ تین دن بعد انہوں نے سو دینار عمیرؓ کے سامنے رکھ دیئے اور کہا۔
"یہ امیرالمومنین نے آپ کے لئے بھیجے ہیں"۔
عمیرؓ نے دینار اٹھا لئے اور اس کے ساتھ ہی ان کی چیخ نکل گئی فرمایا۔ "واللہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے"۔
اور پھر کھڑے کھڑے ساری رقم محتاجوں اور یتیموں میں تقسیم کر دی۔
قاصد نے مدینہ واپس جا کر حضرت عمرؓ کو یہ واقعہ سنایا تو ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسی وقت عمیرؓ کو بلا بھیجا۔ جب وہ حاضر ہوئے۔ تو ان کے سامنے بہت سا غلہ اور کپڑے رکھ دیئے اور فرمایا کہ انہیں لے جاؤ۔ عمیرؓ نے عرض کی۔
"امیرالمومنین غلہ کی مجھے ضرورت نہیں کیونکہ جس وقت میں گھر سے چلا تو دو صاع جو میرے گھر میں موجود تھے البتہ کپڑے میں لئے لیتا ہوں کہ میری بیوی ان کی محتاج ہے۔ عرصہ سے تن پوشی کے لئے اسے پورا لباس میسر نہیں ہوا"۔
اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد عمیرؓ بن سعد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔
ان کی اولاد میں دو لڑکوں، عبدالرحمٰن اور محمد کا نام کتب سیر میں ملتا ہے۔ حضرت عمیرؓ کا شمار فضلائے صحابہ میں ہوتا ہے ان کا زہد وتقویٰ مثالی حیثیت رکھتا تھا اور حضرت عمر فاروقؓ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ چند حدیثیں بھی ان سے مروی ہیں، جن کے راویوں میں زہیر بن سالمؒ، ابو مسلمہ خولانیؒ اور ابو ادریس خولانیؒ جیسے ثقہ اصحاب شامل ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

معاملات و مسائل

الاستاذ شبیر احمد نورانی

چہرے کا پردہ، قرآن و سُنّت کی روشنی میں

ایک مسلمان عورت کو اپنے ستر اور حجاب کے معاملے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنا چاہئے اور یہ احکام ہمیں قرآن و حدیث سے پوری وضاحت کے ساتھ مل جاتے ہیں...... قرآن و حدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے کسی اشد ضرورت کے تحت تو وہ گھر سے باہر جا سکتی ہے ورنہ اس کو گھر میں ہی رہنا چاہئے۔ کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"ان المراة عورة، فاذا فرجت استشرفها الشیطان" "عورت تو ساری کی ساری پردہ ہے۔ جب وہ نکلتی ہے تو شیطان اسے تاکتا ہے" (سنن الترمذی۔ ابواب الرضاع، باب کراھیۃ الدخول علی المغیبات)۔

ایک دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"قد اذن ان تخرجن فی حاجتکن" تم کو اجازت ملی ہے کہ تم اپنی ضرورت کی خاطر (گھر سے باہر) نکل سکتی ہو۔ (صحیح بخاری۔ کتاب الوضوء باب خروج النساء)

معلوم ہوا کہ عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔ باہر وہ صرف کسی اشد ضرورت کے تحت ہی نکل سکتی ہے۔ گھر کے اندر بھی اس کو اپنے ستر کو چھپا کر رکھنا چاہئے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"لا ینظر الرجل الی عورۃ الرجل ولا المراۃ الی عورۃ المراۃ"

"نہ کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو دیکھے (مرد کا ستر ناف سے گھٹنے تک ہے) اور نہ ہی عورت کسی عورت کے ستر کو دیکھے۔ (صحیح مسلم کتاب الحیض باب تحریم النظر الی العورات) واضح رہے کہ عورت کا سارا جسم ستر ہے سوائے چہرے اور ہاتھ کے۔ لہٰذا ایک مسلمان عورت

اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی اپنے ستر کا خیال رکھنا چاہئے اور خاص طور پر جب گھر سے باہر نکلے تو اسے اپنا پورا جسم ڈھانپ لینا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَبَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَا بِیْبِھِنَّ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝

"اے نبی! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو ڈال لیا کریں، یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں" اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے (الاحزاب آیت نمبر ۵۹)

خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں تو معلوم ہو گا کہ یہ حکم صرف "امہات المئومنین" کے لئے خاص نہ تھا بلکہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے تھا۔ تمام مسلمان عورتوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ اپنے اوپر چادر لٹکالیں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ چادر کس قدر لٹکائی جائے تو شریعت کا منشاء پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے بھی ہم اپنی طرف سے کوئی وضاحت کرنے کی بجائے حدیث پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح حکم بیان کر دیں گے۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ

کنا نغطی وجوھنا من الرجال...... (مستدرک حاکم ج۔ اص ۴۵۴)

"ہم اپنے چہروں کو مردوں سے ڈھانپ لیتی تھیں"۔

جس طرح عام عورتیں پردہ کرتی تھیں اسی طرح امہات المئومنین بھی پردہ کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب میں غزوۂ تبوک کے واپسی سفر پر قافلے سے پیچھے رہ گئی اور قافلے والی جگہ پر ہی انتظار کرنے لگی اور صفوان بن العطل آیا تو اس نے مجھے پہچان لیا کیونکہ اس نے مجھے حکم حجاب سے پہلے دیکھا تھا لیکن میں نے اسے دیکھتے ہی اپنے چہرے کو چھپالیا۔

حدیث میں الفاظ یوں ہیں فخمرت وجھی عنہ بجلبابی (صحیح بخاری۔ کتاب المغازی باب حدیث الافک۔ صحیح مسلم کتاب التوبہ حدیث نمبر ۵۶ باب فی حدیث الافک)

"میں نے اس سے اپنے چہرے کو اپنی چادر کے ذریعے ڈھانپ لیا"۔

چہرہ چھپانا غیر محرم مردوں سے مطلوب ہے اس کے لئے بڑی چادر کا استعمال ہو سکتا ہے اور اسی طرح برقع یا کسی بھی نقاب والی چیز کا استعمال بھی صحیح ہے۔ نقاب کا استعمال خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھا۔

ایک نقاب پوش عورت کا واقعہ بھی حدیث کی کتابوں میں ان الفاظ سے موجود ہے۔

جاء ت امراۃ الی النبی صلی اللہ علیہ و سلم یقال لها ام خلاء و ھی منتقبة

"ایک عورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی ان کو ام خلاء کہا جاتا تھا اور وہ نقاب پہنے ہوئے تھیں"۔ (ابو داؤد، کتاب الجهاد باب نمبر ۸ باب فضل قتال الروم...... الخ)

اس ساری بحث کو غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ

۱ - ایک مسلمان عورت کو اپنے گھر کی حدود میں اپنے ستر (چہرے اور ہاتھوں کے علاوہ) سارا جسم ڈھانپ کر رکھنا چاہیئے۔

۲ - اگر وہ گھر سے باہر نکلے تو اپنے پردے کا بھی پورا خیال کرنا چاہیئے۔

۳ - جس طرح امہات المؤمنین اپنے چہرے کا پردہ کرتی تھیں اور دیگر مسلمان عورتیں بھی چہرے کے پردے کا اہتمام کرتی تھیں اسی طرح آج بھی ہر مسلمان عورت کو چہرے کے پردے کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

۴ - چہرے کے پردے کے لئے بڑی چادر اور نقاب والی چیز بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چُوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار: جناب فاروق احمد۔ عجمان

رفتارِ کار

حلقہ وسطی پنجاب کے زیرِ اہتمام تربیتی کیمپوں کا انعقاد

چند ماہ قبل تنظیم اسلامی کی مجلسِ مشاورت میں یہ طے پایا تھا کہ تنظیمی و دعوتی کام کے پھیلاؤ کے پیشِ نظر تنظیمِ اسلامی پاکستان کو متعدد حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ حلقہ وسطی پنجاب جو دوابہ رچنا اور رچج میں شامل اضلاع پر مشتمل ہے، کے لئے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کو امیر اور جناب شمس الحق اعوان صاحب کو نائب امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے باہم مشورہ سے تنظیم اسلامی کے رفقاء کی تربیت اور تنظیم اسلامی کے قرآنی فکر کی دعوت کو عوام تک پہنچانے کے لئے ایک پروگرام ترتیب دیا۔ اس پروگرام کے تحت ایک ٹینٹ خرید کر مختلف مقامات پر تربیتی کیمپ لگانے کا اہتمام کیا گیا۔ ماہ اکتوبر۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۸۷ء کی روداد حسب ذیل ہے:

ڈسکہ: ۸ر اکتوبر تا ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۷ء

سب سے پہلے ڈسکہ ضلع سیالکوٹ میں ۸ تا ۱۰ر اکتوبر کیمپ لگایا گیا۔ لوگوں سے رابطہ کے لئے اشتہارات۔ ہینڈ بلز اور ٹی بورڈوں کا استعمال کیا گیا۔ ۸ر اکتوبر بعد نماز مغرب میاں محمد یعقوب صاحب گجرانوالوی نے درسِ قرآن مجید دیا۔ اگلے دن حافظ محمد رفیق صاحب نے درس دیا اور ۹ر اکتوبر ہی کو جناح ہال ڈسکہ میں استحکام پاکستان کے موضوع پر ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے خطاب کیا۔ حاضری ۶۰ افراد کے لگ بھگ تھی۔ حالانکہ اسی دن کرکٹ کا سیمی فائنل میچ بھی ہو رہا تھا ــــ دروسِ قرآنِ مجید میں بھی حاضری تیس چالیس تک رہی۔ اس کیمپ میں گجرات۔ وزیر آباد۔ گوجرانوالہ، متر انوالی، کمانبانوالہ سے تقریباً ۱۵ رفقاء نے شرکت کی۔ ان دنوں کے دوران تقریباً ۲۵ افراد نے کیمپ میں آکر تنظیم کی دعوت کے بارے میں استفسار کیا اور تنظیم کا تعارف حاصل کیا۔

وزیر آباد: ۱۲ر اکتوبر تا ۱۴ر اکتوبر ۱۹۸۷ء

یہ پروگرام گورنمنٹ ڈگری کالج وزیر آباد کی گراؤنڈ میں ہوا۔ منی بورڈز اور ہینڈ بلز کے ذریعہ رابطہ کیا گیا۔ کالج کے طلباء نے کافی دلچسپی لی اور تقریباً ۸۵ افراد کیمپ میں مختلف اوقات پر تشریف

لائے ۱۲ رفقاء نے حصّہ لیا اور دن کے اوقات میں مذاکرہ اور افہام و تفہیم کے پروگرام ہوتے رہے۔

گجرات : ۱۵ / اکتوبر تا ۲۱ / اکتوبر ۱۹۸۷ء

یہ کیمپ زمیندارہ کالج کے قریب ایک پلاٹ میں لگایا گیا۔ اخبارات۔ ہینڈبل اور پوسٹروں کے ذریعے اطلاع دی گئی۔ کالج کے طلبا تک تنظیم کا منشور بھی پہنچایا گیا۔ بعد نماز مغرب درس قرآن مجید کا پروگرام بھی چلتا رہا۔ کم و بیش ۱۵۰ افراد نے تنظیم کی دعوت کا تعارف حاصل کیا۔ اس کیمپ میں لاہور سے میاں محمد نعیم صاحب ۶ رفقاء کے ساتھ تشریف لائے۔ فیصل آباد سے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب اور رحمت اللہ بٹر آئے۔ سائنس کالج میں مکتبہ بھی لگایا گیا اور قریبی محلّہ کی مسجد میں درس قرآن مجید کے پروگرام بھی ہوئے۔ ۲۵ رفقاء نے کیمپ میں حصّہ لیا۔

سوہدرہ : ۲۲ / اکتوبر تا ۲۵ / اکتوبر ۱۹۸۷ء

ہمارے رفیق جناب عبدالقیوم صاحب کے بچے کی اچانک علالت اور رفوتیدگی کے باعث پروگرام بھرپور نہ ہوسکا۔ پھر بھی ڈسکہ، گجرات، گوجرانوالہ سے رفقاء تشریف لائے اور دروس قرآن مجید میاں محمد یعقوب صاحب نے دیئے۔

کامبنانوالہ : ۲۷ / اکتوبر ۱۹۸۷ء

۲۷ / اکتوبر کو ایک روزہ کیمپ لگایا گیا۔ ایک مسجد میں درس قرآن مجید ہوا۔ حاضری تقریباً ۶۰ تھی۔ دن کے اوقات میں ۲۵ افراد نے مذاکرہ میں حصہ لیا اور یہ پروگرام رات ۳۰ : ۱۱ بجے تک جاری رہا۔

جلالپور جٹاں : ۲۸ / اکتوبر تا ۲۹ / اکتوبر ۱۹۸۷ء

اس پروگرام کے لئے پہلے سے پوسٹروں اور ہینڈبلز کے ذریعے پبلسٹی کی گئی۔ مغرب کی نماز سے قبل امیر حلقہ ڈاکٹر عبدالسمیع بھی تشریف لے آئے۔ بعد نماز مغرب درس قرآن مجید ہوا۔ حاضری تقریباً ۵۰ تھی۔ بعد نماز عشا ویڈیو کیسٹ کے ذریعے امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک تقریر دکھائی اور سنوائی گئی۔ حاضری ۱۰۰ - ۱۲۵ افراد تھی۔ رات کو ۱۵ رفقاء نے کیمپ

میں قیام کیا۔ صبح کو پھر وڈیو کیسٹ پروگرام ہوا۔

متر انوالی : ۲، نومبر تا ۳، نومبر ۱۹۸۷ء

گورنمنٹ کالج متر انوالی کے گراؤنڈ میں کیمپ لگایا گیا۔ صبح کے اوقات میں مذاکرات کے دو پروگرام ہوئے اور تقریباً ۸۰ طلباء کے سامنے ہماری دعوت وضاحت کے ساتھ آگئی۔

رائے ونڈ : ۵، نومبر تا ۸، نومبر ۱۹۸۷ء

تبلیغی بھائیوں کے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مرکز سے کتب لے کر دو جگہوں پر بک سٹال لگائے۔ ۸ رفقاء نے ڈیوٹی دی۔ کچھ افراد نے کیمپ میں آکر دعوت سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ پروگرام چونکہ ایسے علاقوں میں ہوئے جن میں رفقاء کی تعداد تو کافی ہے لیکن وہ تنظیم میں ابھی نئے ہی شامل ہوئے ہیں لہٰذا کوشش کی گئی کہ رفقاء میں درسِ قرآن مجید کی صلاحیت پیدا ہو۔ تہجد کی عادت پڑے جسمانی ورزش سے مستعدی پیدا ہو اور آیاتِ قرآن اور احادیث نبوی ﷺ یاد کرنے کی رغبت پیدا ہو۔ گجرات میں اللہ کے فضل وکرم سے دو درس قرآن مجید کے حلقے قائم ہوئے ہیں اور عربی زبان سیکھنے کی کلاسیں جاری ہیں۔

فیصل آباد : ۴، دسمبر تا ۱۲، دسمبر ۱۹۸۷ء

فیصل آباد میں جن مقامات پر کیمپ لگانے کی تجویز ہوئی چنانچہ ان کے لئے ہینڈ بل چھپوائے گئے اور پوسٹر بھی تیار کروائے گئے۔ ۳، دسمبر کو جناب شمس الحق اعوان اور جاوید احمد صاحب تشریف لے آئے۔ ۴، دسمبر کو صبح ۱۰ بجے کالج روڈ سمن آباد بالمقابل کالج فار ایجوکیشن کیمپ لگایا۔ نماز جمعہ کے موقعہ پر قریب کی مختلف مساجد میں پروگرام اور منشور تقسیم کئے گئے۔ بعد نماز عصر ٹی بورڈوں کے ذریعے رابطہ مہم کی گئی۔ بعد نماز مغرب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے درس قرآن مجید دیا۔ حاضری ۱۴ افراد تھی جن میں ۹ رفقاء شامل تھے۔ صبح کو قریبی مسجد میں درس قرآن مجید دیا گیا اور پھر مختلف کالجوں میں پروگرام اور تنظیم کے تعارف پر مبنی منشور تقسیم کیا گیا۔ گورنمنٹ ایلیمنٹری کالج آف ایجوکیشن میں ۴۵ منٹ کے لئے تقریر کا موقعہ ملا اور قرآن مجید کے حقوق پر مفصل بحث کی گئی۔ چاروں دن بعد نماز مغرب درس قرآن مجید ہوتا رہا اور تقریباً ایک صد افراد نے شرکت کی۔ صبح کے اوقات میں کچھ طالب علم

کیمپ میں تشریف لاتے رہے لیکن پروگرام بھرپور اس لئے نہ ہو سکے کہ ان دنوں امتحانات تھے اور
فیصل آباد میں کرکٹ میچ ہو رہا تھا ۔

۸ تا ۱۰ دسمبر ماڈل نوالہ ہائی سکول کی گراؤنڈ میں کیمپ لگایا گیا، اسی دوران فیصل آباد کی تنظیم
نے ایک ٹینٹ مزید خریدا جس کے لئے ہم جناب ملک احسان الٰہی صاحب کے ممنونِ احسان ہیں
بعد نمازِ مغرب روزانہ درس قرآن مجید کے ذریعہ دعوت تنظیم اور اسلامی انقلاب کے مراحل زیرِ بحث
رہے۔ نیشنل کالج آف ٹیکسٹائل انجینئرنگ کے طلباء اور قرب و جوار کے حضرات تشریف لاتے رہے۔
انجینئرنگ کالج کے طلباء کے ہاسٹل میں سوال و جواب کی ایک نشست اور ویڈیو کیسٹ کے ذریعے
سورۃ الحدید کا درس ہوا جن میں حاضری ۴۳ - ۴۲ تھی ۔

ماڈل نوالہ ہائی سکول کے طلباء سے صبح کی اسمبلی کے اوقات کے دوران تین دن تک "بندگیٔ
رب ۔ قرآن مجید کے حقوق اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" پر تقریر کا موقع ملا ۔

۹ دسمبر کو مختلف حلقوں کے امراء ۔ نائب امراء اور قیموں کی ماہانہ میٹنگ میں پچھلے ماہ کی
کارکردگی کا جائزہ لیا گیا اور آئندہ کے لئے تجاویز اور مشوروں پر گفتگو ہوئی ۔ حلقۂ لاہور ۔ جنوبی پنجاب
سندھ اور وسطی پنجاب کے علاوہ مرکز سے چوہدری غلام محمد صاحب اور میاں محمد نعیم صاحب بھی دیگر
کچھ ساتھیوں کے ہمراہ تشریف لائے ۔ اسلام آباد سے جناب غلام مرتضیٰ صاحب نے ۵ دسمبر تا ۱۰ دسمبر
کیمپ میں شرکت کی ۔

۱۱ دسمبر تا ۱۲ دسمبر کیمپ نگینہ چوک نزد غلام محمد آباد میں لگایا گیا ۔ حسب معمول بعد نماز مغرب
دروس قرآن مجید ہوتے رہے اور صبح کے اوقات میں آنے والے حضرات سے ملاقاتیں اور تنظیم
کے تعارف کے پروگرام جاری رہے ۔ ان دنوں میں بھی جمعہ کے موقعہ پر مختلف مساجد میں پروگرام
اور تعارفی منشور تقسیم کئے گئے ۔ دروس میں شامل ہونے والے اور تنظیم کے بارے میں تعارف حاصل
کرنے والے افراد کی تعداد ۱۰۰ ۔ ۱۲۰ تک رہی ۔ یہاں بھی دو مساجد میں درس قرآن مجید کے
مواقع ملے ۔ ان تمام دنوں میں رفقاء نے بھرپور شرکت کی اور اکثر راتیں کیمپ میں گزاریں ۔

فیصل آباد کے پروگرام کے دوران ۶ حضرات نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی اور اس طرح
بحمد اللہ فیصل آباد میں رفقاء کی تعداد اب ۳۶ تک پہنچ گئی ہے ۔ اس تعداد کے مدنظر فیصل آباد
میں رفقاء کو پانچ اسروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے ۔ تاکہ رابطہ میں آسانی ہو اور دعوتی کام کو آگے بڑھایا جا

رحمت اللہ بٹر
قیم حلقہ وسطی پنجاب

حلقہ لاہور کی دعوتی و تنظیمی سرگرمیاں

حلقہ لاہور کی تشکیل چند ماہ قبل عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد سے وسط نومبر تک لاہور میں معمول کے دروس ہائے قرآن کے پروگرام ہوتے رہے اور کوئی خصوصی دعوتی پروگرام ترتیب نہیں دیا جا سکا۔ ۱۴ نومبر کو امیر تنظیم اسلامی نے لاہور کے تمام رفقاء کا ایک اجتماع قرآن اکیڈمی میں بلایا اور ایک کریش دعوتی پروگرام کا نقشہ رفقاء کے سامنے رکھا۔ امیر تنظیم نے رفقاء کو آگاہ کیا کہ وہ ایک ماہ کے لیے بیرون ملک دعوتی دورے پر تشریف لے جا رہے ہیں، اور ان کی خواہش ہے کہ اس دوران بھرپور دعوتی کام ہونا چاہیے۔ اس خصوصی پروگرام کے لیے ۶۲ رفقاء نے اپنے نام پیش کیے۔

امیر محترم کی ہدایت کے مطابق فوراً اگلے ہی روز لاہور کے امراء کا اجلاس بلایا گیا اور اس میں مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

(i) ۱۹ نومبر سے دسمبر کے آخر تک ہر جمعرات، جمعہ اور ہفتہ لاہور اور بیرونِ لاہور ایک کیمپ لگانے کا فیصلہ ہوا۔ اور اس میں لاہور کے ایک امیر کی شمولیت لازمی قرار دے دی گئی۔

(ii) دروسِ قرآن کے حلقے علیٰ حالہ چلتے رہیں گے۔

(iii) لاہور کی پانچ تنظیموں میں سے باقی تنظیمیں اسرہ جاتی سطح پر مذاکرے کے پروگرام کریں گی۔

کیمپ پروگراموں کے لئے مرکز سے حلقہ لاہور کے لئے دس ہزار روپے کی گرانٹ دی گئی جس میں سے دو خیمے اور ضرورت کا دوسرا سامان خریدا گیا۔

پہلا پروگرام : ۱۹، ۲۰، ۲۱ نومبر

کیمپ کا پروگرام غربی تنظیم کے امیر کے زیرِ اہتمام فیروز والا میں منعقد ہوا۔

۱۹ نومبر بروز جمعرات بعد نماز عصر تقریباً ۱۷ رفقاء گڑھی شاہو سے فیروز والا روانہ ہوئے۔ مغرب سے عشاء تک کا وقت کیمپ نصب کرنے میں صرف ہوا۔ عشاء سے کچھ پہلے اور بعد کا وقت مشورے، کھانے اور تہجد کے فضائل میں صرف ہوا۔ ۹ بجے رفقاء کی ڈیوٹیاں لگانے کے بعد اجتماعی پروگرام ختم کر دیا گیا۔

۲۰ نومبر : پروگرام کے مطابق رفقاء کو صبح ۴ بجے جگایا گیا۔ ۵ بجے تک کا پروگرام انفرادی

نوافل کے لیئے دیا گیا۔ ۵ بجے کے بعد نماز فجر تک چھوٹے گروپوں میں تعلیمی پروگرام ہوا۔ نماز فجر کے بعد درس حدیث ہوا۔

اگلا اجتماعی پروگرام ناشتہ کے بعد ۹ بجے شروع ہوا۔ ۹ تا ۳۰۔۱۱ بجے مذاکرہ ہوا۔ رفقاء کے علاوہ تقریباً ۱۰ دیگر اصحاب نے شرکت کی۔ ۳۰۔۱۱ بجے تا ایک بجے تک ٹی بورڈ مہم ہوئی جس میں "انقلابی جدوجہد" والا ہینڈ بل تقسیم کیا گیا اور مغرب کے بعد کے وڈیو کیسٹ کے پروگرام کی دعوت دی گئی۔ نماز جمعہ کے وقت مختلف مساجد میں رفقاء نے ہینڈ بل تقسیم کئے (اس کے اوپر نماز مغرب کے بعد کے پروگرام کا وقت اور جگہ کا اندراج موجود تھا۔) اور جہاں ممکن ہوا اعلان بھی کروایا گیا۔ عصر تا مغرب کا وقت اجتماعی پروگرام کے انتظامات میں صرف ہوا۔

نماز مغرب کے بعد کیمپ کے باہر خالی جگہ پر امیر محترم کا سورۃ الحدید کے درس قرآن کا وڈیو کیسٹ دکھایا گیا (آیت ۲۵ تا ۲۵ کا)۔ وڈیو کیسٹ کے پروگرام میں ۵۰ رفقاء سمیت تقریباً ۷۰ افراد شریک ہوئے۔

نماز عشاء کے بعد کھانے اور اگلے دن کے پروگرام کے بارے میں مشورے کے بعد منتخب نصاب والی حدیث حضرت معاذ ابن جبل پڑھ کر سنائی گئی۔

۲۱ نومبر کا پروگرام بھی ۲ تبدیلیوں کے علاوہ گذشتہ روز جیسا ہی رہا۔

یہ دو تبدیلیاں، ایک تو نماز عصر کے بعد انفرادی رابطہ کے گروپ بنائے گئے۔ اور دوسری تبدیلی یہ تھی کہ مغرب کے بعد وڈیو کیسٹ کی بجائے "دین کے جامع تصور" پر بھائی عبدالرزاق کا خطاب ہوا۔ شرکاء کی تعداد رفقاء سمیت تقریباً ۷۰ رہی۔

نماز عشاء کے بعد پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

مذاکرے : (جمعرات ۱۹ نومبر)

اسرہ صدر	۷½ بجے سے ۹ بجے رات	شرکاء کی تعداد	۷
اسرہ علامہ اقبال ٹاؤن	۲½ گھنٹے جاری رہا	" "	۲۰
اسرہ کینٹ	۷½ بجے سے ۱۰ بجے تک	" "	۴۰

وسطی تنظیم کے علاوہ ۲ روزہ دعوتی و تربیتی پروگرام ہوا (یہ پروگرام کریش پروگرام کے طور پر مقامی طور پر پہلے سے طے پایا تھا۔ جس کو حسب مشورہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا گیا)۔

اس پروگرام میں کل ۲۰ رفقاء نے شرکت کی جن میں سے ۹ مکمل پروگرام میں شریک رہے اور ۱۱ جز وقتی تھے۔ یہ پروگرام اندرون لوہاری گیٹ ایک مسجد میں منعقد ہوا۔ اس پروگرام کے تحت ۸ افراد نے بیعت فارم پُر کرکے دیئے اور ان نئے رفقاء کے ساتھ ۲ پرانے رفقاء شامل کرکے ایک نئے اسرے کی تشکیل کی گئی۔

اس دو روزہ پروگرام میں بعد نماز فجر درس۔ دعوتی گشت قبل از دوپہر۔ بعد نماز عصر ۳۰ ویں پارے کی کچھ سورتوں کا ترجمہ مع مختصر تشریح اور بعد نماز مغرب خطاب عام ہوا۔ شرکاء کی کل تعداد معلوم نہیں ہوسکی (تقریباً ۳۰ رفقاء کے علاوہ)

دوسرا پروگرام (۲۶، ۲۷، ۲۸ نومبر)

کیمپ کا پروگرام شرقی تنظیم کے امیر عبدالرزاق صاحب کے زیرِ اہتمام والٹن میں منعقد ہوا اس پروگرام کے لئے اسرہ والٹن نے کافی محنت کی اور پروگرام سے چار روز قبل ہی ہینڈبل چھاپ کر اپنی مہم کا آغاز کردیا

یہ کیمپ مین روڈ سے بالکل قریب ایک رفیق کے گھر کے قریب خالی جگہ پر لگایا گیا۔ کچھ رفقاء ظہر کے بعد ہی پہنچ گئے اور کیمپ عصر سے قبل ہی لگا دیا گیا۔ گڑھی شاہو سے تقریباً ۱۱ رفقاء مغرب کے وقت کیمپ کی جگہ پہنچ گئے۔ اسرہ والٹن کے تمام رفقاء نے بھی کل وقتی شرکت کی۔ نماز مغرب کے بعد مذاکرہ کا پروگرام ہوا جو نماز عشاء کے لئے وقفہ کے بعد بھی جاری رہا۔ رات مشورے، کھانے اور شمائل ترمذی کے مطالعے کے بعد رات کے لئے رفقاء کی ڈیوٹیاں لگائی گئیں۔

۲۷ نومبر: صبح نمازِ فجر سے قبل حسب پروگرام انفرادی و اجتماعی پروگرام۔ نماز فجر کے بعد درس حدیث کیمپ میں ہوا۔

ناشتے کے بعد ۹ بجے دوبارہ مذاکرہ ہوا جو ۱۲ بجے تک جاری رہا۔ رات اور صبح مذاکرے کے پروگرام میں رفقاء کے علاوہ تقریباً ۱۵ دیگر احباب نے شرکت کی۔ مذاکرے کے بعد تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ ۵ احباب نے اپنے نام لکھائے۔

نماز جمعہ رفقاء نے مختلف مساجد میں ادا کی اور رات کے پروگرام میں شرکت کے لئے ٹی بورڈ پر کے ذریعے دعوت دی۔ مغرب کے بعد سورۃ الحدید کا کیسٹ دکھایا گیا۔ شرکاء کی کل تعداد تقریباً

۸۰ تھی ۔ نمازِ عشاء کے بعد سوال وجواب کی نشست رکھی گئی ۔
اگلے روز صبح کے پروگرام میں مذاکرے کی بجائے سورۃ العصر کو بیان کرنے کی رفقاء کو فرداً فرداً مشق کرائی گئی ۔ یہ پروگرام ۳۰-۱۱ بجے تک جاری رہا ۔ اس کے بعد گشت کا پروگرام ہوا ۔ جس میں رات کے پروگرام میں شرکت کی دعوت دی گئی ۔
عصر کے بعد نمازِ مغرب تک دوبارہ گشت ہوا ۔ مغرب کے بعد ڈاکٹر عارف رشید کا خطاب ہوا اور عشاء کی نماز کے بعد پروگرام اختتام پذیر ہوا ۔ خطاب میں شرکاء کی کل تعداد ۵۰ اور ۶۰ کے درمیان تھی ۔

مذاکرے

جمعہ ۲۷/۱۱/۸۷	اسرہ اسلام پورہ	صبح کے وقت	شرکاء کی کل تعداد	۲۰
جمعرات ۲۶/۱۱/۸۷	اسرہ مصطفیٰ آباد	شام کے وقت	" " " "	۳۰

تیسرا پروگرام (۳، ۴، ۵ دسمبر)

حلقہ لاہور کا یہ پروگرام قصور میں منعقد ہوا ۔ اس کے لئے میجر فتح اور میاں نوید صاحبان نے جگہ کے تعیّن کے لئے ۳۰ نومبر کو قصور کا دورہ کیا ۔ اس کیمپ کے لئے امارت کی ذمہ داری میجر فتح کے سپرد کی گئی ۔ نائب امیر کے طور پر دہلی تنظیم کے امیر شیخ حفیظ ساتھ تھے ۔
۳ دسمبر بروز جمعرات گڑھی شاہو سے ۲۰ رفقاء کا قافلہ تقریباً پونے پانچ بجے روانہ ہوا ۔ یہ قافلہ تنظیم کی گاڑی ۔ میجر احسن رؤف صاحب کی پک اپ اور شاہد احمد عبداللہ صاحب کی کار پر مشتمل تھا ۔ ۷ رفقاء بس کے ذریعے قصور روانہ ہوئے ۔
یہ پورا قافلہ تقریباً پونے سات بجے مقررہ جگہ پر پہنچ گیا ۔ خیمے کی تنصیب وغیرہ کے بعد نمازِ عشاء ادا کی گئی ۔ سیرتِ صحابہ کے مطالعہ کے بعد کھانا اور سونے سے پہلے مشورے اور ڈیوٹیاں لگانے کا مرحلہ طے کیا گیا ۔
۴ دسمبر : حسب سابق پروگراموں کے مطابق فجر سے قبل انفرادی اور اجتماعی پروگرام ہوا ۔ نمازِ فجر کے بعد درسِ حدیث ہوا ۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد ۹ بجے تا ۳۰-۱۱ بجے تک مذاکرے کا پروگرام ہوا جس میں صرف رفقاء تنظیم نے شرکت کی ۔ آدھ گھنٹے کے وقفے کے بعد رفقاء کو ۹

مختلف مساجد میں شام کے پروگرام کی تشہیر کے لئے بھیجا گیا۔ یہ تشہیر بذریعہ ٹی بورڈ کی گئی۔ عصر تا مغرب نزدیکی آبادی میں یاد دہانی کے لئے گشت کیا گیا۔ رفقاء نے ایک گروپ نے ہال میں پروگرام دکھانے کے لئے انتظامات کو آخری شکل دی۔ یہ ہال ہمیں انجمن اسلامیہ قصور کے تعاون سے حاصل ہوا۔ اس پروگرام میں کل ۵۰ احباب نے شرکت کی۔ یہ پروگرام وڈیو کیسٹ کی طوالت کے باعث کامیاب نہ ہوا۔

۵ دسمبر: ۵ دسمبر کے پروگرام میں ۲ تبدیلیاں کی گئیں۔ نمازِ ظہر سے پہلے مذاکرے میں رفقاء سے جامع تصور پر بات کرنے کی فرداً فرداً ۰امنٹ کے لئے مشق کرائی گئی اور ٹی بورڈ مہم چلائی گئی۔ نمازِ عصر کے بعد قریبی علاقوں میں یاد دہانی کے لئے گشت کیا گیا۔

خطاب ایک اہلِ حدیث مسجد میں رکھا گیا تھا لیکن چند متعصب اور متشدد نمازیوں کی طرف سے مخالفت کی وجہ سے یہ پروگرام نہ ہو سکا۔ اور رفقاء وہاں سے بغیر کسی کشیدگی پیدا کئے واپس لوٹ آئے۔ نمازِ عشاء کے بعد لاہور واپسی ہو گئی۔ قصور میں ۴ احباب تنظیم میں شامل ہوئے۔

مذاکرے

۴ دسمبر جمعہ　　اُسرہ ٹاؤن شپ　　نمازِ مغرب سے پونے دس بجے تک　　شرکاء کی کل تعداد ۱۷

اس کے علاوہ اسرہ کی سطح پر ویڈیو کیسٹ دکھانے کا پروگرام ۲ اسروں میں منعقد ہوا۔

کیمپ پروگراموں میں کھانے اور سفر کے اخراجات رفقاء نے خود برداشت کئے۔ اس کے علاوہ اکثر مقامات پر رفقاء نے خود کھانا تیار کیا۔ ٹی بورڈوں پر اعلانات کے لئے پوسٹر بھی خود تیار کئے۔ یہ خصوصی اہتمام بھی کیا گیا کہ سفر کے دوران گپ شپ کی بجائے رفقاء سیکھنے سکھانے کا عمل جاری رکھیں۔

(مرتب، ڈاکٹر عبدالخالق)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جوہر
جوشاندہ
نصف صدی سے معیاری
ادویات کا نشان

سرفی کول
SURFICOL
COUGH SYRUP
آپ کا نبض شناس
نصف صدی سے معیاری
ادویات کا نشان

افکار و آراء
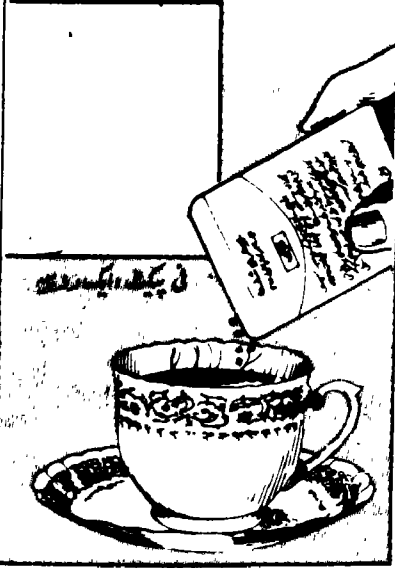
تعدّد ازدواج اور پاکستان ٹیلی ویژن

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب

السلامُ علیکم۔ میں آپ کے مؤقر جریدے کی وساطت سے متعلقہ حکام کی توجہ ایک نہایت ہی اہم معاشرتی مسئلے کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں۔

آج کل ٹیلویژن پر ایک سیریل ڈرامہ "فاصلے" دکھایا جارہا ہے۔ جس کا موضوع دوسری شادی ہے۔ اس ڈرامے کا مقصد یہ نظر آرہا ہے کہ دوسری شادی مردوں کی طرف سے عورتوں پر ایک نہایت ہی ظالمانہ فعل بنا کر دکھایا جائے۔

دوسری شادی اسلامی معاشرے میں نہ صرف یہ کہ شجر ممنوعہ نہیں بلکہ شرعی طور پر جائز' ایک ضرورت اور کئی ایک مسائل کا ٹھوس حل ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں کو چار تک شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے۔ ان شادیوں پر اگر کوئی پابندی ہے تو وہ یہ کہ تمام بیویوں میں انصاف روا رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک بیوی کو تو سر پر اٹھالیا جائے اور دوسری کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اس کے علاوہ اور کسی قسم کی شرط یا پابندی مثلاً عمر' طلاق یافتگی' بیوگی یا معذوری وغیرہ کی قید نہیں' لیکن اگر اس اجازت کو اسوہ رسولؐ کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ازواج مطہرات میں سے صرف حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کنواری تھیں۔ باقی تمام ازواج یا تو بیوہ تھیں یا طلاق یافتہ۔ اس طرح اسوہ رسولؐ کی شکل میں ہمیں ٹھکرائی ہوئی' بے بس اور لاچار عورتوں کو اپنانے کی ترغیب ملتی ہے۔ اور یہ ایک اہم معاشرتی مسئلے کا حل ہے۔ زمانہ امن میں بھی اور زمانہ جنگ میں بھی۔

ذرا سروے کروا کر دیکھئے۔ ہر دس ۱۰ میں (یا شاید اس سے بھی کم) گھر میں آپ کو ایک ایسی دکھی عورت ملے گی جو بیوہ ہوگی' طلاق یافتہ ہوگی' معذور ہوگی یا پھر بڑی عمر کی کنواری ہوگی جو جہیز نہ ہونے یا کوئی تہمت لگ جانے کی وجہ سے بیٹھی ہوگی۔ اور اکثر اوقات ایسی عورتیں ایسے ہی بیٹھی بیٹھی جذبات کی آگ میں جلتے جلتے جان دے دیتی ہیں۔ ایسی عورتوں کو پہلی بیوی کی حیثیت سے نہ سہی دوسری بیوی کی حیثیت سے بھی کوئی اپنانے کیلئے تیار نہیں۔ یہ تو مسئلے کا

صرف ایک پہلو ہے۔ پھر ذرا معاشرے میں ان بد قسمت عورتوں کا استحصال اور ان سے جنم لینے والے مسائل و جرائم کا جائزہ لیں تو مسئلہ کئی گنا گھمبیر ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف ایسے مردوں کا جائزہ لیں جن کو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مالی خوش حالی بخشی ہے بلکہ بڑھی ہوئی جسمانی یعنی جنسی قوت بھی دی ہے۔ تو ان میں سے ایک بڑا طائفہ آپ کو ایسا ملے گا۔ جو ان دونوں نعمتوں کو گناہ کے راستے پر صرف کر رہا ہے۔ ایسے مرد گھر سے باہر کئی کئی عورتوں سے بیک وقت تعلقات رکھتے ہیں' اور بعض تو مستقل داشتائیں رکھتے ہیں جن کو معقول ماہانہ معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ نہ صرف بے شمار مسائل جرائم (مثلاً اغوا' عصمت فروشی' بردہ فروشی' منشیات وغیرہ وغیرہ) کو جنم دیتے ہیں۔ بلکہ گھر سے لاپرواہ ہونے کی وجہ سے بسااوقات ان کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ اس طرح معاشرہ لاتعداد مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ تعدد ازواج (یعنی ایک سے زیادہ شادیاں) ایسے تمام مسائل کا ٹھوس حل ہے۔

بشرطیکہ اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنا اس عمل کا اصل محرک ہو۔

اسلام کی نام لیوا اس حکومت میں ضرورت تو اس امر کی تھی کہ ذرائع ابلاغ خاص کر ریڈیو' ٹیلیویژن (جو کہ مکمل طور پر اسکی دسترس میں ہیں) کو اس معاملے میں لوگوں کی نفسیات کو جو کہ دوسرے غیر مذاہب خاص کر ہندو معاشرے سے بے حد متأثر ہے کو بدل کر سیدھے راستہ پر ڈالا جاتا الٹا ان ذرائع سے اسلامی نظریات کی (نعوذ باللہ) بیخ کنی کا کام لیا جا رہا ہے اسلامی شعائر کو دہریہ' ترقی پسند' اور مغربیت پسند "دانش ور" مٹانے کے درپے ہیں۔ عوام کو تفریح مہیا کرنے کی آڑ میں ان کو سوائے محبت کے اور کوئی موضوع نہیں ملتا۔ اور اس طرح وہ اپنے نظریات کا کھلے عام پرچار کرتے ہیں۔ اور حکومت نے نہ صرف ایسے "دانشوروں" کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے بلکہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مؤثر پشت پناہی بھی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ حالانکہ ان ہی ذرائع ابلاغ سے بے شمار اسلامی موضوعات کی تبلیغ و تحریک کیلئے دلچسپ ڈرامے لکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ماں کی ممتا' والدین کا احترام' بھائی کی قربانی' تاجر کی ایمانداری' ہمسایوں کے حقوق' استاد کا احترام' یتیم کی مدد و دل جوئی' وغیرہ موضوعات کی نہ ختم ہونے والی لسٹ ہے جس پر دلچسپ ڈرامے لکھے اور فلمائے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان موضوعات پر

کسی " دانش ور " کا قلم نہیں اٹھتا۔

کیا ارباب اقتدار میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہے جو اس طرف توجہ دے اور ذرائع ابلاغ پر قابض مذکورہ " دانشوروں " اور ان کے سرپرستوں کو لگام دے۔ یقیناً راقم اس بارے میں مایوس نہیں۔

خیر اندیش۔

کرم الٰہی انصاری ۶۱۰ صدیق سٹریٹ، ساہیوال

نفاذِ شریعت کے علمبرداروں کے نام

قومی اسمبلی اور سینٹ میں پیش کیا جانے والا پرائیویٹ شریعت بل سرد خانے میں چلا گیا بر سر اقتدار پارٹی کے ایک وزیر کے بقول انہوں نے شریعت بل کے غبارے سے ہوا نکال دی اس طرح نفاذ شریعت کے لئے اٹھنے والی ایک اور تحریک اپنے انجام کو پہنچ گئی اب خواہ شریعت محاذ والے ہزار دعوے کریں کہ وہ حکومت کو شریعت بل منظور کرنے پر مجبور کر دیں گے یا حکومت یہ دعویٰ کرے کہ وہ شریعت کے نفاذ میں مخلص ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور شریعت کو ایک بار پھر رسوا کر دیا گیا ہے اور اس معاملے میں دین کے نام لیوا تمام طبقوں اور بر سر اقتدار گروہ کے اخلاص کی حقیقت ایک بار پھر آشکارا ہو گئی ہے۔

جب شریعت بل پیش کیا گیا اس وقت اگرچہ واضح طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حکومت اس بل کا کیا حشر کرے گی ممکن ہے کہ شروع شروع میں حکومتی حلقوں اور اسلام سے بیزار طبقے میں اس بل کی وجہ سے تھوڑی بہت کھلبلی مچی ہو لیکن پیشتر اس کے کہ بر سر اقتدار گروہ اور اسلام دشمن قوتیں اس کے خلاف میدان عمل میں آتیں آئین شریعت کی باتیں کرنے والے نظام مصطفیٰؐ کے نعرے لگانے والے قرآن و سنت کا نظام بپا کرنے کا دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے رہنماء اور اہل جبہ و قبہ اس بل کے خلاف سینہ سپر ہو گئے ایک لیڈر نے کہا کہ یہ بل ہمارے کارکنان کی لاشوں سے گزر کر ہی پاس ہو سکتا ہے کسی نے کہا یہ اپنی موت آپ مر جائے گا کسی نے کہا کہ ملک میں حقیقی جمہوریت نافذ ہو جائے تو خود بخود شریعت کا راستہ ہموار ہو

جائے گا کسی نے بل پیش کرنے والوں کو ایک شخص کا ایجنٹ قرار دیا اور کسی نے کہا کہ یہ ایک غیر قانونی حکومت کو قانونی شکل دینے کی کوشش ہے پھر مختلف فرقوں نے کہا یہ ہمارے مسلک سے ٹکراتا ہے المختصر شریعت کے علمبردار خود شریعت بل کے خلاف صف آرا ہو گئے ایسی صورت میں سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بل کبھی پاس نہ ہو سکے گا اب حکومت کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی اسلام دشمن قوتوں کو کسی فکر کی ضرورت نہ تھی الحاد پسند سیکولر یا مغرب زدہ طبقے کے لئے پریشانی کی کوئی وجہ نہ تھی مغرب پسند خواتین کو کوئی تحریک چلانے کی ضرورت نہ تھی یہ تمام طبقے الام کے نام لیواؤں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آراء دیکھ کر ہنستے رہے حتیٰ کہ شریعت بل کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔

بہت سے لوگ یہ دعویٰ کرتے رہے ہیں کہ اس ملک میں اسلام نافذ ہو ہی نہیں سکتا ان لوگوں کے بقول یہاں پر موجود بے شمار فرقے اور مسالک کسی ایک شریعت پر متفق ہو ہی نہیں سکتے جب بھی شریعت کی تشریح اور نفاذ کا مسئلہ آئے گا مختلف فرقوں کے علماء ایک دوسرے کے خلاف توپوں کے دہانے کھول دیں گے شریعت بل کے حشر نے آج اس دعویٰ کو ایک اٹل حقیقت کی طرح ثابت کر دیا ہے واقعی اسلام کی راہ میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ مختلف فرقوں اور مسالک سے تعلق رکھنے والے علماء اور دینی جماعتیں ہیں جو اس ملک میں کمیونزم سیکولر ازم شیاطینی نظام یا موجودہ خلاف اسلام نظام کو قبول کرنے کو تو تیار ہیں لیکن کسی ایسے اسلام کو برداشت نہیں کر سکتے جو ان کے اپنے فرقے یا مسلک سے ذرا بھی مختلف ہو یا جس میں کسی دوسرے فرقے یا جماعت کی برتری ظاہر ہوتی ہو۔ جب ایسا ہے تو پھر ایسے تمام لوگوں کو چاہئے کہ وہ اسلامی نظام اور نفاذ شریعت کی باتیں کرنا چھوڑ دیں اور یوں اسلام کو مزید رسوا ہونے سے بچالیں۔ متحدہ شریعت محاذ سے تعلق رکھنے والے ممبران قومی اسمبلی و سینٹ اگر شریعت کے نفاذ کے معاملے میں مخلص ہیں تو وہ اس اسمبلی کی سیٹوں سے استعفیٰ کیوں نہیں دیتے جہاں شریعت کی کوئی شنوائی نہیں ہے؟

ڈاکٹر فرخ شہزاد
اے۔ ۸/۹۰ ایف بی ایریا کراچی۔ ۳۸

دین میں ظواہر کی اہمیت

آپ کے عرض احوال میں بات چلی دین میں ظواہر پرستی کی..... کہا گیا تھا کہ بعض دینی حلقوں میں دینداری کے ظاہری خدوخال کو خواہ مخواہ کی اہمیت دی جارہی ہے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ دین میں "غلو" نہیں ہونا چاہئے تو بات اور ہوتی۔ لیکن پتہ نہیں بعض حلقے اس حد تک احساس کمتری کے شکار کیوں ہو جاتے ہیں کہ شعائر اسلام کی اہمیت سے غافل ہیں بلکہ ان کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں اور اس مخالفت کو بھی دینی خدمت سمجھتے ہیں، یہ غالباً دور غلامی کے اثرات بد تھے جو باقیات السئیات کے طور پر ہمارے خمیر میں شامل ہو گئے ہیں۔

ذرا ملاحظہ کیجئے، دور غلامی میں ہمارے انگریز حکمراں مذہباً عیسائی تھے۔ صلیب کا نشان عیسائیوں کے یہاں مقدس ہے مرنے کے بعد بھی قبر پر صلیب بطور تختی لگی ہوتی ہے۔ زندگی میں وہ گلے میں ایک ڈوری کا پھندہ باندھ کے رکھتے ہیں کہ ان کے عقیدے کے مطابق باعث برکت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہندو اپنے گلے میں جنیوڈالتا ہے۔

اب اس پھندے کو خوبصورت بنانے کیلئے اس پر "بو" لگائی گئی اور بعد کو اس کی شکل نیکٹائی (Neck-tie) کی ہو گئی۔ جو آج بھی نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں بطور آرائش استعمال ہو رہی ہے۔ عیسائیوں کے یہاں تو ان کے عقیدے سے متعلق ہے اور متبرک ہے۔ اوروں کے یہاں محض اندھی تقلید۔ یوں کہ انگریز صاحب بہادر اسے زیب تن کرتا ہے تو ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ ایک فضول سی کپڑے کی کتر گلے میں لٹکانے کے خلاف کسی کا قلم نہیں اٹھتا۔ کسی کی زبان نہیں کھلتی اور شرعی داڑھی مونچھ رکھنے کو فوراً تنقید کا نشانہ بنایا جائے گا کہ یہ کیا دقیانوسیت ہے۔

انگریزی میڈیم سکول، جنہیں پہلے انگریز چلاتے تھے۔ ان میں داخلہ مشکل سے ملتا ہے۔ پہلے نام درج کروالیجئے تب مشکل سے سیٹ ملے گی۔ لیکن اس کی یونیفارم بھی ضروری ہے اور اس یونیفارم کا لازمی جزو، عقیدہ عیسائیت میں متبرک گلے کا پھندہ، یعنی نیکٹائی (Neck-tie) ہے۔ اور اب تو اس نیکٹائی کو متبرک سے کچھ زیادہ ہی سمجھا جانے لگا۔

کیونکہ جو ٹائی لگائے وہ "سمارٹ" ہی نہیں عاقل و فہیم اور کھاتے پیتے گھرانے سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اور بعض اعلیٰ مناصب کے عہدہ داروں کیلئے ٹائی باندھنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ دور غلامی کا یہ طوق گردن میں پڑا تو اسلام کا طوق گردن سے اتر کر گر گیا۔ یہ ہے شدت کسر نفسی کی اور احساس کہتری کی۔ شعائر اسلام کا مذاق بلکہ توہین' پردہ دار خواتین کو دقیانوسیت' جہالت اور غلامی سے اور پتہ نہیں کن کن خطابات سے نوازنا علمی ترقی میں شمار ہوتا ہے۔

جو لوگ عقیدۃً مسلمان ہیں۔ ان کے لئے اللہ کا اور اس کے رسولؐ کا حکم ماننا فرض اور نہ ماننا کفر ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس بات کا حکم دیں اسے ماننا۔ (اور بلا چون وچرا ماننا ہی ایمان کی علامت ہے' صرف چون وچرا بھی ایمان کی سرحد سے باہر کر دیتا ہے) اور جس بات سے آپ منع فرمائیں اس سے باز رہنا' ہمارے ایمان کا لازمی جزو ہے۔ شعائر اسلام کے بارے میں متفق علیہ حدیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سن لیجئے کہ آپ نے کیا حکم دیا ("امر بالمعروف") اور کس بات سے منع فرمایا (نہی عن المنکر)

قصوا الشوارب واعفوا اللحی

"مونچھیں کترواؤ اور داڑھی (نہ کترواؤ بلکہ یونہی) رہنے دو۔" اور یہ حکم ہماری پہچان ہے' یعنی شعائر اسلام میں سے متعلق ہے جس کا ہم آئے دن مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اب اس نیم مردہ سنت کو زندہ کرنے کا ثواب بھی لیجئے...... سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ انشاءاللہ

عبدالخالق عبدالتواب' لاہور

عن الحارث الاشعری، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
"امرکم بخمس"
بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

پیلو کی بازیافت
مِسواک سے
ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تک
پیلو کے مؤثر اور مجرّب اجزا پر مشتمل ایک مکمل طبی ٹوتھ پیسٹ پیش کرکے ہمدرد نے
حفظِ دنداں کی دنیا میں بھی اوّلیت حاصل کرلی ہے۔
پیلو صدیوں سے دانتوں کی صفائی اور مسوڑھوں کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔
ہمدرد کی تحقیقِ جدید نے پیلو کے ان افادی اجزاء اور دوسری مجرّب جڑی بوٹیوں سے ایک جامع
فارمولے کے مطابق ہمدرد پیلو ٹوتھ پیسٹ تیار کیا جو پوری طرح دانتوں اور مسوڑھوں
کی حفاظت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
ہمدرد
پیلو ٹوتھ پیسٹ
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
پیلو کے اوصاف مسوڑھے مضبوط، دانت صاف
پاکستان سے محبت کرو۔ پاکستان کی تعمیر کرو
Adarts-HTP-3/85

حدیثِ نبوی

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ الصِّیَامُ وَالْقُرْاٰنُ یُشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ یَقُوْلُ الصِّیَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُہُ الطَّعَامَ وَالشَّھَوَاتِ بِالنَّھَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ وَیَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُہُ النَّوْمَ بِاللَّیْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِیْہِ فَیُشَفَّعَانِ ۔

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اُس بندے کی جو دِن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کریگا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اسکے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اسکو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اسکے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول کی جائیگی (اور اس کیلئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرمادیا جائیگا)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (قرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

مینجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶- امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹- امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ " "
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲- امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ " "

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن- لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

ان شاء اللہ العزیز و بفضلہ تعالیٰ و بعونہ

تنظیمِ اسلامی

کا

تیرھواں سالانہ اجتماع

جمعۃ المبارک یکم اپریل ۸۸ء تا سوموار ۴ اپریل ۸۸ء

طارق آباد ۔ ضلع بہاولنگر

میں منعقد ہو گا

یہ مقام چشتیاں اور بہاولنگر کے درمیان بر لب سڑک واقع ہے اور سمہ سٹہ سے بہاولنگر جانے والی برانچ ریلوے لائن پر بھی مدرسہ نامی ریلوے سٹیشن سے متصل ہے!

●●●●●●

اظہارِ تشکر

گزشتہ شمارے میں ہم نے قارئین سے میثاق کے بارے میں اُن کی رائے ایک سوالنامہ کی صورت میں طلب کی تھی۔ الحمدللہ قارئین نے ہمارے اس اقدام کو پسند کیا اور کثیر تعداد میں اپنی آرا۔ اور مشورے ہمیں ارسال کیے۔ ہم اُن تمام حضرات کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ان تجاویز اور مشوروں کا جائزہ لینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔ جو تفصیلی تجزیے کے بعد اپنی سفارشات مرتب کرے گی۔

اور اگر مناسب سمجھا گیا تو اسے آئندہ کسی قریبی اشاعت میں شائع بھی کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

●●●●●●

ار احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ احوال

ملک خداداد پاکستان جسے عہد حاضر کی ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ بننا تھا' اس میں
پالیس سال سے زیادہ طویل عرصہ گزر جانے کے بعد اب تک اس سمت کیا پیش رفت ہوئی؟
یہ جائزہ حوصلہ افزاء نہیں' ہمت کو پست کر دینے والا ہے تاہم حقائق کا سامنا کئے ہی بنے گی
ور یہ بھی تو ہے کہ جن لوگوں میں بھی اللہ تعالیٰ مایوس ہو کر بیٹھ رہنے کی بجائے کچھ کر گزرنے
کا داعیہ پیدا فرمائے' انہیں مستقبل کے لئے رہنمائی ماضی کے تجربات ہی سے ملے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست کے قالب میں ڈھالنے کا جو تھوڑا بہت کام
ہوا' وہ اس کے قیام کے بعد اولین پانچ سات سال میں ہی ہو پایا تھا۔ بعد میں مثبت کام کم اور
منفی زیادہ ہوا اور قریب کے دس سالوں میں تو سارے کئے کرائے پر پانی پھیرنے کا عمل جاری
رہا ہے۔ نفاذ اسلام کی آڑ میں ایسی طولانی بحث و تکرار کا دروازہ کھول دیا گیا جو حقیقی ارادے کی
عدم موجودگی کے باعث محض وقت کا ضیاع ثابت ہوا اور فضاء میں بے یقینی اور انتشار فکری کا
دھواں چھوڑ گیا۔

پاکستان کے عالم وجود میں آنے کے فوراً بعد واحد قومی جماعت مسلم لیگ تو اندرونی شکست
و ریخت کا شکار ہو گئی۔ ملک گیر دینی جماعتوں پر بھی سکتہ سا طاری تھا۔ علماء کا بڑا اور فعال حصہ
چونکہ عملاً قیام پاکستان کا مخالف رہا تھا چنانچہ انہوں نے لاتعلقی کا طرز عمل اختیار کر لیا۔ ان ک
ایک طائفہ جو تھانوی گروپ پر مشتمل تھا اور جس کی ہمدردیاں تحریک پاکستان کے ساتھ وابستہ
رہیں' اپنی افتاد طبع کے اعتبار سے ہی سیاست سے دور رہتے ہوئے مسند تعلیم و ارشاد کی رونق
برقرار رکھنے کی روش پر قائم رہا۔ زور شور کی سیاست کی عادی ایک اور دینی جماعت..... مجلس
احرار اسلام..... جو پاکستان کی مخالفت میں کسی سے پیچھے نہ رہی تھی' باقاعدہ اعلان کے سا
سیاست سے دست بردار ہو گئی۔ لے دے کے ایک جماعت اسلامی بچی جو اپنی تنظیم ا

تربیت کے زور پر کارکنوں کی ایک کھیپ میدان میں لا سکتی تھی۔ اس جماعت نے زندگی کا ثبوت دیا اور ایک نظریاتی ریاست کے منصّہ شہود میں آ جانے پر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کچھ کر گزرنے کی ٹھانی۔ جماعت اسلامی نے عوام کے دینی جذبات کو تحریک دے کر مطالبہ دستور اسلامی کی مہم اس زور سے چلائی کہ ملک کے در و دیوار اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے بزرگوں کی آرزو کو بھی زبان مل گئی جو مجلس دستور ساز کے نقار خانے میں گویا طوطی کی آواز تھے۔ جماعت اسلامی کا یہ احسان ماننا ملک کے ہر دین پسند شہری پر واجب ہے کہ اس کی کوشش سے ہمارے روشن خیال دستور سازوں کو ایک ایسی رجعت پسندانہ "حرکت" کرنی پڑی جس پر بہت سے سر شرم سے جھک گئے تھے۔ یہ حرکت قرارداد مقاصد کی شکل میں ہماری ریاست کا مشرف بہ اسلام ہونا تھی اور پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی طرف اولین پیش رفت بھی۔

پھر دستور سازی کے جاں گسل مرحلوں کا آغاز ہوا۔ یہ اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا ہی نہ تھا۔ سیاسی مسائل ہی کم گھمبیر نہ تھے کہ اس پر مستزاد نفاذ اسلام کی کڑوی گولی کا نگلنا جو خواہی نہ خواہی قرارداد مقاصد پاس کرنے کے بعد گویا لازم ہو گیا تھا۔ خوئے بد را بہانہ بسیار...... عذر پیش کیا گیا کہ یہاں نافذ کون سا اسلام ہو گا؟۔ بہتر (۷۲) فرقوں کو اسلام کی کس تعبیر پر جمع کیا جائے؟؟۔ ملک کے سنجیدہ و فہمیدہ طبقات کے سامنے یہ سوالات واقعی ناقابل عبور گھاٹیوں کی شکل اختیار کرنے لگے تھے کہ علماء دین نے ایک یادگار کارنامہ انجام دیا۔ جملہ مکاتب فکر کے اکتیس (۳۱) مسلمہ اور مستند اکابر علماء بمقام کراچی جمع ہوئے۔ ان میں اہل سنت کے تمام معلوم و مشہور مسالک (جنہیں فرقوں کا نام دے کر ستم ڈھایا جاتا ہے) کی نمائندگی ہی نہ تھی، شیعہ علماء اور مجتہد بھی بطیب خاطر شامل ہوئے۔ اور بائیس (۲۲) نکات پر مشتمل ایک یادداشت مرتب کی جن میں اسلامی دستور کے اساسی اصولوں پر اتفاق کر کے معترضین کا منہ بند کر دیا گیا۔ یہ ملک میں اسلامی ریاست کے قیام کی جانب دوسری مثبت پیش رفت تھی۔

افسوس کہ قابل ذکر مثبت پیش رفت کا باب یہاں آ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد جو ہے وہ رجعت قہقہری کے سوا کچھ نہیں۔ اس کا رونا رونے پر آئیں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ہم نے دو مثبت باتوں کا ذکر کیا تو دو ہی منفی عوامل بھی بیان کریں گے۔ یہ دو ہی قیامت ڈھا

انہی میں شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہو جائے گی۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اولین مثبت
رفت کا سہرا جماعت اسلامی کے سر ہے' اب یہ کہے بغیر بھی چارہ نہیں کہ اس پیش رفت
ملا شب خون بھی اسی جماعت نے مارا۔ انقلاب قیادت کا نعرہ لگا کر جونہی جماعت اسلامی
ابی میدان میں اتری' ارباب اقتدار کے لئے اس کے مطالبہ دستور اسلامی کے معنی بدل
ے۔ ہم اس معاملے میں جماعت کے خلوص و اخلاص پر کسی شبہے کا اظہار نہیں کرتے'
نے پوری دیانت داری سے یہ سمجھا ہو گا کہ ایک اسلامی ریاست کو چلانے کی اہلیت موجودو
ر قیادت سے زیادہ وہ خود رکھتی ہے لیکن اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی مسلم لیگی قیادت
ں میں دین سے رشتہ اخلاص رکھنے والے بھی شامل تھے' جماعت کی حریف اور مدمقابل بن
ں۔ جماعت اسلامی جس گھن گرج اور توقعات کی بلند پروازی کے ساتھ اس میدان میں
زی اس کا بھرم تو ۱۹۵۱ء میں پنجاب کے پہلے صوبائی الیکشن (جو ملک کا کسی بھی سطح پر پہلا عام
نتخاب تھا) میں ہی کھل گیا لیکن نظریاتی ریاست کے قیام کا خواب ضرور پریشان ہوا۔ اسلام
ں مرغی دو ملاؤں میں حرام ہو کر رہ گئی۔ ہم اقدام کی اس عجلت کو نتیجہ کے اعتبار سے جماعت
ی ہمالیائی غلطی گردانتے ہیں۔ وہ اپنی حکمت عملی کو اپنی اولین مثبت پیش رفت ہی کے تابع رکھ
کر عوام و خواص میں دین کی طرف رجوع کی خواہش کو قوی سے قوی تر کرتی چلی جاتی تو اسے ہر
طبقے سے حمایت حاصل ہوتی' حلیف ملتے' حریف نہیں۔ اسلامی دستور کے اساسی اصولوں
پر علماء کا اتفاق بھی ایک بیش قیمت اثاثہ تھا جس سے امت کے اس حصے میں اتحاد و یکجہتی کے عمل
کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا لیکن انتخابی سیاست نے اس عمل کو بھی معکوس سمت میں ڈال دیا۔ آج
ہمیں فرقہ واریت کی جو عفریت اپنے چاروں طرف پھنکارتی نظر آتی ہے اس میں سب سے بڑا
دخل اسلام کو انتخابی سیاست کا محور بنانے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک سے زیادہ جماعتیں
اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے نکلیں گی تو انہیں یہ واضح کرنا ہو گا کہ ان کے اسلام اور دوسروں کے
اسلام میں کیا فرق ہے۔

ہمارے نزدیک پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام کی جانب پیش رفت کی راہ میں دوسرا
بڑا منفی عامل دینی جماعتوں کا بحالی جمہوریت جیسی تحریکوں میں اتحاد و اشتراک بنا ہے۔ اہل
سیاست نے جب یہ محسوس کیا کہ اقتدار کی کلید عوام کے ہاتھ میں نہیں' کچھ مخفی طاقتوں کی جیب

میں ہے تو انہوں نے محض جمہوریت کی بحالی کو تمام مسائل کا واحد حل جانا اور ہماری مختصر تاریخ میں متعدد مواقع پر اس مقصد کے لئے کثیر الجماعتی اتحاد وجود میں آئے' متحدہ محاذ بنے اور ہمیشہ ہی ایسا بھی ہوا کہ مذہب کے عنصر کو بھی بامر مجبوری ہی سہی' اس میں شامل ضرور کیا گیا' دینی جماعتوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے میں مصلحت تھی کہ لوگ دین کے نام پر ہی کسی تحریک کے لئے قربانی پیش کرتے ہیں۔ لیکن نتیجہ ہر مرتبہ یہ رہا کہ اس ساری محنت اور جدوجہد کا ثمر کوئی اور اڑا لے گیا۔ اسلام کے لئے دی گئی قربانیاں رائیگاں گئیں اور اسلام کی اپیل پہلے سے کم ہو گئی۔ اضافی طور پر دو نقصانات ان تحریکوں میں دینی جماعتوں کی شمولیت کے یہ بھی ہوئے کہ اولاً ہماری ترجیحات میں تقدیم و تاخیر کا معیار متاثر ہوا۔ اسلام کو اپنی اولین ترجیح رکھ کر دینی جماعتیں بحالی جمہوریت اور معاشی انصاف جیسی تحریکوں کو صرف تائید دے کر بھی ان کی تقویت کا سامان کر سکتی تھیں تاہم یوں ان کی منزل کھوٹی نہ ہوتی۔ وہ جمہوریت اور معاشی انصاف کی بات بھی صرف اسلام کے حوالے سے کرتیں تو آج نفع نقصان کا میزانیہ مختلف ہوتا۔ ثانیاً متذکرہ جزوی اور ہنگامی تحریکوں میں دین داروں کو ان سیاسی عناصر سے اتحاد و اشتراک کرنا پڑا جن کا اپنا قبلہ راست نہ تھا۔ دین سے لاتعلق عناصر بلکہ ایسے ایسے سیاست دان علماء کے ہم نشین ہوئے جن کے ملحدانہ خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ یوں دینی جماعتوں نے اپنی شناخت کو ہی مشکوک نہ بنایا بلکہ اپنی ہی صفوں میں سے چنیدہ لوگوں کو اس بات کا جواز بھی فراہم کر دیا کہ وہ خاص فریق انہیں اگر پسند نہیں تو فریق مخالف کی رفاقت اختیار کر لیں۔ اس کی مثالوں سے ہماری سیاسی تاریخ بھری پڑی ہے تاہم ماضی قریب میں جو ہوا وہ اپنی مثال آپ ہی ہے۔ دینی جماعتوں نے مارشل لاء کے خلاف اور بحالی جمہوریت کے حق میں ہر نوع کے سیاسی عناصر کا ساتھ دیا تو انہی میں سے قابل لحاظ تعداد میں اکابرین و زعماء نے مارشل لاء کی گود میں جا بیٹھنا پسند کیا جس میں اختیار و اقتدار کا سرچشمہ ایک ایسا شخص تھا جس کا زہد و تقویٰ انہیں باقی سب باتوں پر بھاری لگا۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی دینی جماعتیں آج بدترین داخلی انتشار کا شکار ہیں۔ ان کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایک ایک دینی جماعت کم از کم دو ٹکڑوں میں تو بٹ ہی گئی ہے' تقسیم در تقسیم کا عمل جاری رہے تو کچھ عجب نہیں۔ "اک دسترس سے تیری حالی بچا ہوا تھا" ...... جماعت اسلامی بظاہر اس تقسیم سے بچ گئی لیکن جہ کے

سے بھی لگے۔ جماعت کا مضبوط نظم آڑے آیا ورنہ وہ داخلی صورت حال ابھی فراموش نہیں کی جاسکی ہوگی جس میں سے اختلاف وافتراق کی خبریں چھن چھن کر باہر آتی رہی ہیں۔
ان حالات میں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ملک کے دینی حلقے گروہی تعصبات سے اپنے ذہن کو آزاد کر کے ٹھنڈے دل سے پاکستان میں اسلامی ریاست کے قیام میں اپنے کردار کا جائزہ لیں۔ گزشتہ تجربات کی روشنی میں اس جانب مثبت پیش رفت کے لئے ایک واضح اور متعین لائحہ عمل تشکیل دیں۔ ہمارے تجزیئے میں اگر انہیں صداقت اور خلوص کی جھلک نظر آتی ہو اور اس کے بنیادی نکات میں واقعیت کا وزن نسبتاً کم درجے میں بھی محسوس ہو تو انہیں سنجیدگی سے مذہبی اور دینی جماعتوں کے ایک ایسے متحدہ محاذ کی داغ بیل ڈالنے کا بیڑا اٹھانا چاہئے جو اس ملک خداداد میں ایک مثالی اسلامی ریاست کے قیام کے لئے پتمار کر کام کرنے کا فیصلہ کرے...... وقتی اور فوری مسائل پر بھی اسلام ہی کے حوالے سے بات کرے' اپنی صفوں میں صرف ان لوگوں کو جگہ دے، جو دین سے فکری اور عملی ہم آہنگی رکھتے ہوں اور حصول مقصد کے لئے روا یا ناروا ہر طرح کی تدبیریں اختیار کرنے اور حب عاجلہ میں "شارٹ کٹ" راستے آزمانے سے پوری طرح پرہیز کرے۔ ہمیں اپنے ہم وطنوں کی دین سے عملی وابستگی کا حال خوب معلوم ہے تاہم اس پہلو سے قدرے دل گرفتگی کے باوصف ہم امید رکھتے ہیں کہ خواص اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں تو عوام میں بھی جلد یا بدیر یہ اجتماعی ارادہ پیدا ہو کر رہے گا کہ انہیں مسلمان جینا اور مسلمان مرنا ہے۔ ہمارا مجوزہ مذہبی متحدہ محاذ اس ارادے کو پیدا کرنے اور اسے صحیح سمت میں لگانے کا کام ہمدردی و دلسوزی سے کرے تو اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ساتھ دے گی اور ہماری آنکھوں کو اس منظر سے ٹھنڈک مل کر رہے گی کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے عطاء کردہ اس قطعہ ارضی میں اسی کا کلمہ بلند ہو۔ اور یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ملک کی بقاء و سلامتی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس شمارے میں مدیر میثاق اور امیر تنظیم اسلامی' جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا وہ خطاب جمعہ شامل ہے جس میں انہوں نے ناروے میں علامہ اقبال مرحوم کے بارے میں صدر آزاد کشمیر جناب سردار عبدالقیوم کی ناروا باتوں پر تفصیلی گفتگو کی۔ تاہم چونکہ سردار صاحب کے جذبات

میں بہہ جانے کا باعث پسر اقبال جناب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کے بعض نظریات بنے تھے لہٰذا ضمنی طور پر کچھ تبصرہ ان پر بھی اس خطاب میں آ گیا ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی تصوراتی سیکولر سٹیٹ کو مثالی اسلامی ریاست کہنا چاہتے ہیں تو شوق سے کہیں لیکن اسے علامہ اقبال سے منسوب کرنے کا ستم براہ کرم نہ ڈھائیں۔ اسلام کے ساتھ سیکولرازم کا رشتہ جوڑنا تو نور اور ظلمت کو یکجا کرنے کے مترادف ہے۔ برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کا مقالہ "اسلام اور سیکولرازم" جو قبل ازیں 'حکمتِ قرآن' میں چھپ چکا ہے، خواہش تو یہ تھی کہ اسی اشاعت میں شامل ہوتا لیکن جگہ نہ ہونے کے باعث آئندہ شمارے میں شامل اشاعت کیا جائے گا، ان شاء اللہ اس موضوع پر اُن بہت سی الجھنوں کو دُور کرنے کا سبب بنے گا جو ہمارے تجدد پسند دانشوروں نے لکھے پڑھے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کر دی ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

"میثاق" کے ادارۂ تحریر کی روحِ رواں اور ہمارے سب سے معمر و محترم ساتھی، جناب شیخ جمیل الرحمٰن، صاحب فراش ہیں۔ لاہور میں اپنی ذمہ داریوں سے انصاف کرتے ہوئے جسم و جاں کی حق تلفی کر کے پچھلے ماہ وہ اپنے گھر کراچی پہنچے تو طبیعت ناساز تھی۔ علامات کی شدت اور نوعیت انہیں امراضِ قلب کے ہسپتال لے گئی اور معلوم ہوا کہ "انجائنا" کا شکار ہیں۔ علاج اپنی جگہ، ان کے لئے سب سے بڑھ کر سوہانِ روح یہ ہدایت ہے کہ ہمہ وقت بستر پر دراز رہیں اور ہر طرح کی جسمانی و ذہنی مشقت سے مکمل پرہیز کریں۔ دواؤں کا استعمال تو جاری ہے لیکن لکھنے پڑھنے کے جو کام انہوں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں انہیں بھی کسی نہ کسی حد تک نبھائے لئے جانے کی کوشش سے باز نہیں آئے۔ بلکہ لاہور آ کر حسبِ سابق کام کرنے کے لئے بھی تڑپتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ عمرِ عزیز کا جو حصہ بھی بچا ہوا ہے وہ دین ہی کے کام میں لگے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہیں کہ انہیں صحت و توانائی اور عمر کی مہلت ملے اور پھر یہ سب کچھ اسی کے دین کی سرفرازی کی سعی میں کام آئے۔ قارئین کرام سے بھی خصوصی درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں بزرگوار شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کو ضرور یاد رکھیں۔

●●●●●

ڈاکٹر اسرار احمد

تذکرہ و تبصرہ

آج بہت طویل عرصے کے بعد 'تذکرہ و تبصرہ' کے عنوان کے تحت قارئین 'میثاق' سے براہ راست مخاطبت کا شرف حاصل کرنے کے لئے قلم ہاتھ میں لیا ہے...... اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری زبان اور قلم سے حق ہی نکلوائے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں حق کے سننے اور قبول کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے۔ آمین!

'جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیمِ اسلامی' تاحال تنظیمِ اسلامی کے سلسلۂ مطبوعات کی ضخیم ترین کتاب ہے (مشتمل بر ۶۵۶ صفحات)۔

راقم نے اس کتاب کا مواد 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' کے فائلوں سے نکال کر اوائل رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ (مطابق اوائل مئی ۱۹۸۷ء) میں مرتب کر دیا تھا۔ رمضان کے آخری عشرے میں سرزمین حرم میں حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو وہاں اس کا مقدمہ ضبطِ تحریر میں آیا۔ الغرض، اواخر جون تک کتاب راقم کی جانب سے برائے طباعت و اشاعت تیار ہو چکی تھی۔ تاہم کارکنانِ مکتبہ نے اس پر دو ماہ مزید لئے...... اور بالآخر جب اواخر اگست میں راقم سے دریافت کیا گیا کہ اسے کتنی تعداد میں طبع کرانا ہے تو خیال آیا کہ عوام کی دلچسپی کی تو یہ چیز ہے ہی نہیں، رہے علماء تو ان کی اکثریت گروہی عصبیت کے حصار میں محصور ہے، پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اتنی ضخیم کتاب بعض حضرات کی قوتِ خرید کے دائرے میں نہ آ سکے، لہٰذا اولاً راقم نے صرف گیارہ صد کا فیصلہ کیا...... لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ یقیناً من جانب اللہ تھا کہ دفعتہً دل کی کیفیت بدلی اور راقم نے تعداد ایک دم دوگنا کر دی یعنی ۲۲۰۰...... اس پر اچھی طرح یاد ہے کہ ناظم مکتبہ بھی قدرے حیران ہوئے تھے تاہم انہوں نے بھی زیادہ پس و پیش

سے کام نہ لیا' اور کتاب دو ہزار دو صد کی تعداد میں تیار ہو کر اواخر ستمبر ۸۷ء میں مکتبے میں آ گئی۔

آج سے لگ بھگ پندرہ روز قبل جب شکاگو سے رفیقِ محترم ڈاکٹر خورشید ملک تشریف لائے اور انہوں نے اس کتاب کے کچھ نسخے بھارت اور کچھ امریکہ لے جانے کی خواہش کے تحت مکتبے سے رابطہ کیا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ کتاب تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کی تحریر کے وقت جبکہ کتاب کی اشاعت کو چار ماہ بھی پورے نہیں ہوئے' مرکزی مکتبے میں کتاب کے کل ۱۶۰ نسخے موجود ہیں' اور زیادہ سے زیادہ اتنے ہی یا کچھ کم و بیش تعداد میں یہ کتاب مختلف شہروں میں تنظیم کے ذیلی مکتبوں میں موجود ہو گی..... گویا چار ماہ سے کم مدت میں اس کتاب کے دو ہزار نسخے قارئین تک پہنچ چکے ہیں!

اس سے چونکہ راقم الحروف کا حوصلہ بڑھا ہے..... اور اس کی ہمت افزائی ہوئی ہے اور اُسے مختلف النّوع مایوسیوں کے "ظُلُمٰتٌ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ" ایسے تہ بر تہ اندھیروں میں امید کی ایک روشن کرن نظر آئی ہے' لہٰذا مناسب محسوس ہوا کہ اس کیفیت میں جملہ رفقائے تنظیم اور قارئین 'میثاق' کو بھی شریک کیا جائے' اسی لئے یہ پوری تفصیل گوش گذار کر دی گئی!

رہا یہ امر کہ اس کتاب کے دو ہزار نسخوں کے دین کا درد رکھنے والے لوگوں تک پہنچ جانے سے کوئی عملی نتیجہ بھی بر آمد ہوتا ہے یا نہیں' اور "علماءِ ربّانیین اور بالخصوص منتسبینِ حضرت شیخ الہند" کے مختلف حلقوں میں سے کسی کی جانب سے بالفعل دستِ تعاون دراز ہوتا ہے یا نہیں' تو اس کا تمام تر تعلق مشیّتِ ایزدی سے ہے کہ "اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَ بِهِمۡ رَبُّهُمۡ رَشَدًا" کے مطابق ملّتِ اسلامیہ پاکستان کے بارے میں اللہ کا فیصلہ کیا ہے۔ اس معاملے میں ہمارے لئے تو صبر و استقامت اور تسلیم و رضا کے سوا کوئی اور راہ نہ ممکن ہے' نہ درست!

کتاب کے بعض قارئین کا یہ شکوہ بعض ذرائع سے راقم تک پہنچا ہے کہ اسے نیوز پرنٹ پر طبع کر کے زیادتی کی گئی ہے۔ اس 'زیادتی' کا پس منظر تو سطور بالا میں سامنے آ ہی گیا ہے' آئندہ کے لئے یہ وعدہ ہے کہ انشاء اللہ اس کا دوسرا ایڈیشن سفید کاغذ پر طبع ہو گا۔

اس کتاب میں راقم الحروف نے اس حقیقت کا نہ صرف اقرار و اعتراف کیا ہے بلکہ بہانگِ
دہل اظہار و اعلان کیا ہے کہ:
ا۔ اگرچہ راقم کو مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم کی بہت سی علمی آراء اور جماعتِ اسلامی
کی قیام پاکستان کے بعد کی مجموعی حکمتِ عملی سے شدید اختلاف ہے...... تاہم راقم کی مساعی اُن کی
'تحریکِ اسلامی' ہی کا تسلسل ہیں!
۲۔ مولانا مودودی مرحوم پر بھی اس تحریک کے اصول و مبادی نہ وحیٔ آسمانی کے طور پر
نازل ہوئے تھے 'نہ وہ اصلاً و کلیتہً' اُن کے اپنے ذہن و فکر کی اختراع تھے...... بلکہ اُن کی اصل
منبت ہے 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور اُن کی قائم کردہ
'حزب اللہ' کی جانب!...... تو اگرچہ راقم کو مولانا آزاد مرحوم کے بھی بہت سے نظریات سے
شدید اختلاف ہے تاہم تحریکِ اسلامی کے اصول و مبادی کے اعتبار سے وہ اپنے آپ کو ۱۹۱۲ء
سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا آزاد مرحوم سے بھی منسلک سمجھتا ہے۔
۳۔ اور چونکہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے...... جو راقم کے نزدیک
چودھویں صدی ہجری کے مجددِ اعظم ہیں...... ایک جانب: مولانا آزاد کے بارے میں مثبت
طور پر یہ فرما کر کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے" اور اُن کے
معترضین کے جواب میں یہ شعر پڑھ کر کہ "کامل اس طبقۂ زُہّاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو
یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!" اُن کے افکار و خیالات اور ان کی مساعی کی تحسین و تصویب فرما
دی تھی اور دوسری جانب: ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی امامتِ ہند کی تجویز کی پرزور تائید ہی نہیں
عملاً اس کی تحریک فرما کر انہیں گویا اپنا 'خرقۂ خلافت' عطا فرما دیا تھا' لہٰذا راقم اپنے آپ کو
حضرت شیخ الہندؒ سے بھی منسلک سمجھتا ہے!

کتاب کی اشاعت سے قبل اس کا مقدمہ 'میثاق' بابت جولائی ۸۷ء میں شائع ہوا تو
مندرجہ بالا نکاتِ ثلاثہ میں سے آخری نکتے کے ضمن میں ایک تنقیدی ہی نہیں تردیدی مضمون
میں مظفر آباد (آزاد کشمیر) کے ایک عالم دین مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی جانب سے
۔ مضمون کے اصل مشمولات سے قطع نظر اُس کا آغاز و اختتام دونوں نہایت تیکھے انداز کے

حامل تھے لیکن اس کے ساتھ جو خط آیا اس کا انداز بہت مختلف تھا۔ جو درج ذیل اقتباس سے ظاہر ہے :

"حضرتِ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے مولانا آزاد کے حق میں امامت کی بیعت کا معاملہ اس سے قبل میثاق کے کئی شماروں میں آگیا ہے۔ آپ کا پختہ موقف ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کو امام الہند کے منصب کے لئے موزوں سمجھتے ہوئے انہیں امام وخلیفہ قرار دے چکے تھے۔ اگرچہ اس موضوع کے حق ومخالفت میں دو رائے موجود رہی ہیں۔ تاہم تحریکِ خلافت کے ضمن میں راقم نے جو واقعات مطالعہ کئے ہیں۔ انہیں ایک مضمون کی شکل میں تحریر کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ یہ خوبی صرف آپ میں نظر آئی ہے کہ آپ اپنے مخالف کی رائے کو بھی اپنے مجلہ میں جگہ دیتے ہیں۔ خدارا مجھے آپ اپنا مخالف نہ سمجھیں بلکہ آپ کا مداح ہوں۔ مجھے حضرت شیخ الہندؒ کی جلالت شان اور مولانا آزاد کی عبقریت کا بھی اعتراف ہے۔ اس کے باوجود تاریخی واقعات کو چھپایا نہیں جا سکتا۔ امید ہے یہ مضمون قارئین میثاق کی نظر سے آئندہ ضرور گذرے گا"۔

اس کے جواب میں راقم نے انہیں لکھوایا کہ "میری خواہش ہے کہ اس کی اشاعت سے قبل آپ سے ملاقات کا اہتمام ہو جائے تاکہ اسی موضوع پر جو مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب کو بھی آپ اس مضمون میں شائع کر سکیں" ...... راقم کا خیال تھا کہ مولانا موصوف نے صرف 'مقدمہ' پڑھا ہے' .... میری رائے جس اساسی مواد پر قائم ہے (جواب کتاب کے باب دوم میں شامل ہے) وہ اُن کی نظر سے نہیں گذرا۔ ملاقات میں یہ چیزیں بھی سامنے آ جائیں گی تو وہ اپنی رائے پر ضرور نظر ثانی کر لیں گے .... چنانچہ ملاقات کے لئے بھی راقم نے یہ لکھوا دیا تھا کہ میں ۱۷ اگست ۸۷ء کو اسلام آباد آ رہا ہوں' اگر آپ وہاں تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمالیں تو بہت اچھا رہے'

اس پر مولانا کا ایک مفصل مکتوب موصول ہوا جس میں سفر سے معذوری کے اظہار کے ساتھ اپنے مضمون کی اشاعت پر شدید اصرار تھا ..... جس میں دوبارہ یہ متحدیانہ انداز بھی موجود تھا کہ "اس مضمون کے سلسلے میں ممکن ہے کہ محترم المقام ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں کچھ

سوالات ابھرے ہوں لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس مضمون کو 'میثاق' میں شائع کر کے ڈاکٹر صاحب اپنے سوالات بھی شائع کر دیں' اس کے بعد تقابل سے صحیح بات خود سامنے آ جائے گی۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ مخلصانہ اور ناصحانہ انداز بھی موجود تھا کہ "ڈاکٹر صاحب تحریک تنظیم اسلامی کے سلسلے میں جو بیعت لے رہے ہیں اس کے حق میں قرآن اور حدیث سے دلائل موجود ہیں (البتہ) اس کے لئے مولانا آزاد کی بیعت بطور امام الہند کا جو شیخ الہند" کے حوالے سے انہوں نے سہارا لیا ہے میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب ایک خلافِ واقعہ بات کا سہارا لے رہے ہیں...... ڈاکٹر صاحب سے دوبار یہاں ملاقات ہوئی ہے۔ موصوف کے خطاب بھی سنے ہیں اور 'میثاق' کے ذریعے روحانی غذا مل جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جس راہ پر گامزن ہیں وہ بڑی کٹھن راہ ہے' بس اللہ کی مدد چاہئے' انہیں اللہ تعالیٰ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا ہے' ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی نصرت فرمائے!" ...... اس خط سے ایک مزید مفید بات جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اپنی اس تحریر کے لئے انہوں نے تمامتر مواد قاضی عدیل احمد عباسی کی تالیف "تحریک خلافت' سے لیا ہے!

اس کے جواب میں راقم نے خواہشِ ملاقات کے مکرر اظہار کے ساتھ اُنہیں تحریر کرا دیا تھا کہ "آپ کا مضمون ان شاءاللہ العزیز 'میثاق' میں شائع ہو گا...... توقع ہے کہ دو تین ماہ تک س کے لئے گنجائش پیدا ہو سکے گی۔" ساتھ ہی انہیں "میثاق" کا وہ پرانا پرچہ بھی بھجوا دیا تھا جس میں راقم کی تحریر "مولانا ابوالکلام آزاد...... جمعیت علماءِ ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن" شائع ہوئی تھی۔

جواباً انہوں نے بھی 'تحریکِ خلافت' کے متعلقہ صفحات کی فوٹو سٹیٹ نقل ارسال کر دی ور رفیق مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے نام خط میں اپنی اس نصیحت کا اعادہ فرمایا کہ......

"اصل بات آپ سے کہنے کے لائق یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خواہ مخواہ مولانا آزاد کے عویٰ امام الہند کا سہارا لیا ہے۔ اس کو ترک کرنا بہتر ہے' شیخ الہند کی شخصیت بجائے خود بڑی ہم ہے۔ ان کے مشن کو اگر جاری رکھا جائے تو قابلِ تحسین ہے اس کے لئے مولانا آزاد کو رمیان میں لانے کی ضرورت نہیں۔"

راقم معذرت خواہ ہے کہ مولانا کے مضمون کی اشاعت میں کچھ زیادہ تاخیر ہو گئی۔ (اُن

سے وعدہ دو تین ماہ کا تھا لیکن فی الواقع تاخیر ۲ + ۳ = ۵ ماہ کی ہو گئی!)...... بہر حال اس اشاعت میں راقم اپنے وعدے کے بوجھ سے سبکدوش ہو رہا ہے! اور مولانا کی تحریر من وعن شائع کی جا رہی ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس مضمون پر مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ، شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ، دہلی، کا مختصر تبصرہ بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ مولانا ان دنوں پاکستان تشریف لائے ہوئے ہیں اور یہ اُن کا فوری اور سرسری تبصرہ ہے'...... ان کا وعدہ ہے کہ وہ دہلی واپسی پر اس موضوع پر ایک مبسوط تحریر مع حوالہ جات عنایت فرمائیں گے!

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے، اسے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ " جماعتِ شیخ الہند" او تنظیم اسلامی " کی صورت میں سامنے آ چکا ہے لہٰذا وہ اس بحث کو جاری رکھنے کا ہرگز خواہش مند نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جب کہروڑپکا (ضلع ملتان) کے مولانا محمد ایاز ملکانوی صاحب کا خ آیا جس میں وہی باتیں دہرائی گئی تھیں جن کی وضاحت کی جا چکی ہے تو راقم نے سکوت ہ مناسب سمجھا۔ لیکن مولانا محبوب الرّحمان صاحب کی تحریر سے اندازہ ہوا کہ مولانا آزا مرحوم کی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء کی سرگذشت کے ضمن میں دو بیعتوں کے مابین خلطِ مبحث کی بناء شدید مغالطہ پیدا ہو رہا ہے جو مولانا محبوب الرحمٰن کی طرح ہو سکتا ہے کہ اور بھی بہت سے حضرات کو لاحق ہوا ہو...... بلکہ اب احساس ہوتا ہے کہ خود مولانا ایاز ملکانوی نے راقم 'امام الباکستان' بننے کی خواہش کی جو پھبتی چست کی تھی اس کی پشت پر بھی یہی غلط فہمی کار فر تھی'...... لہٰذا مناسب ہے کہ اس کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ایک بیعت وہ تھی جس کی اساس پر انھوں نے ۱۹۱۳ء میں 'حزب اللہ' قائم کی۔ اسے بیعتِ امارت تو کہا جا سکتا ہے 'بیعت امامت نہیں! اس لئے کہ اس وقت 'امامتُ الہند' کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ یہ بیعت اصلاً دین کے اجتم تقاضوں کی ادائیگی کے لئے منظم جدوجہد کی خاطر ایک تنظیم یا جماعت کی تأسیس کے لئے تھ اور راقم الحروف تنظیمِ اسلامی اور اس میں شمولیت کی خاطر اس کے امیر سے بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف کا رشتہ اگر جوڑتا ہے تو وہ اس بیعت سے ہے نہ کہ اس دوسری بیعت سے ہے جس

ربعد میں آئے گا! اس 'بیعتِ تنظیم' کے لئے علماء کے کسی نمائندہ اجتماع میں تجویز و تائید
راجتماعی فیصلے (RESOLUTION) کی کوئی ضرورت نہ کبھی پہلے تھی نہ اب ہے! اس لئے کہ اس
ع کی بیعت کی اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ ایک شخص کے دل میں دین کی خدمت کا داعیہ '
راس کی دعوت و شہادت اور غلبہ و اقامت کے لئے تن من دھن وقف کرنے کا جذبہ پیدا
تا ہے ..... اور وہ اللہ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر اولاً خود کمر کس کر کھڑا ہو جاتا ہے اور
رلوگوں کو پکارتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِىٓ اِلَى اللّٰهِ !" تو جو لوگ اس کی صدا پر لبیک
تے ہوئے اس کے اعوان و انصار اور دست و بازو بننا منظور کر لیتے ہیں وہ اُس کے ساتھ اِس
بت کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ایک جمعیت یا جماعت وجود میں آ
اتی ہے جس کے امیر کی حیثیت بنیادی نوعیت کے اعتبار سے بالکل وہی ہوتی ہے جو اُس شخص کی
سے کچھ لوگ فرمانِ نبویؐ کے مطابق کسی سفر کے لئے اپنا امیر بنالیں۔ بہرحال ایسی کسی تنظیم یا
جماعت کے قیام کے بعد اگر اللہ کی تائید و نصرت شاملِ حال رہتی ہے تو تنظیم کو وسعت اور
تحریک کو قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور جس درجہ میں اللہ کو منظور ہوتا ہے کامیابی بھی حاصل ہو
باتی ہے' ورنہ یہ دعوت اور تحریک آئندہ آنے والوں کے لئے کچھ نقوش پا چھوڑ کر ختم ہو جاتی ہے
برِعظیم پاک و ہند میں تیرھویں صدی ہجری میں اس کی نہایت شاندار مثال تحریک
شہیدینؒ کی صورت میں سامنے آتی ہے جو 'بیعتِ شخصی' کی ٹھیٹھ دینی اساس پر برپا ہوئی تھی۔
چودھویں صدی ہجری میں یہی کام نہایت وسیع پیمانے پر 'اگرچہ حالات کے تقاضوں کے مطابق
در پردہ انداز میں حضرت شیخ الہندؒ کر رہے تھے' لیکن اُن کی زندگی کے آخری دور میں اس کا بیڑا
آزادانہ طور پر (INDEPENDENTLY) اور بَرملا انداز میں اٹھایا مولانا ابوالکلام آزادؒ نے
'الہلال' کی زور دار دعوت اور بیعتِ شخصی کی اساس پر 'حزب اللہ' کے قیام کے
ذریعے .... اور پھر جب وہ کچھ عرصہ بعد مختلف اسباب کی بنا پر بددل ہو کر اس نہج سے
دست کش ہو گئے تو اس کے تسلسل کو قائم رکھا مولانا مودودی مرحوم اور اُن کی قائم کردہ
'جماعتِ اسلامی' نے .... اگرچہ اس میں تنظیمی اساس 'بیعتِ شخصی' کو نہیں بلکہ
'بیعتِ دستوری' کو بنایا گیا تھا ...... اور چونکہ راقم الحروف کے نزدیک جماعتِ اسلامی
پاکستان بھی ملکی سیاست اور انتخابات کی دلدل میں پھنس کر اُس اصولی اسلامی تحریک کے راستے

سے منحرف ہو گئی' لہٰذا اُس نے اس خلا کو پورا کرنے کے ارادے سے دوبارہ بیعتِ شخصی کی اساس پر 'تنظیمِ اسلامی' کی بنیاد رکھ دی!

مولانا آزاد مرحوم کے حوالے سے دوسرا اور مشہور تر معاملہ اُس 'بیعتِ امامت' کا ہے جو تجویز ہی کے درجہ میں رہ گئی اور کبھی بالفعل منعقد نہیں ہوئی۔ اس سے ان سطور کے عاجز راقم کی تمام تر دلچسپی یا تو ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے ہے' یا اس اعتبار سے کہ اُسے اِس کے تذکرے میں حضرت شیخ الہندؒ کی سیرت و شخصیت کی عظمت کی جھلک نظر آئی......... ورنہ خود اُس کا' یا اُس کی قائم کردہ تنظیم کا یا اس میں شمولیت کے لئے کی جانے والی بیعت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے!

یہ بیعت اگر بالفعل منعقد ہو جاتی تو اس کے نتیجے میں ہندوستان کی بیسویں صدی عیسوی کی سیاست کا رخ بالکل تبدیل ہو جاتا' اس لئے کہ اس سے جس جہادِ حرّیت کا آغاز فوراً ہو جاتا اُس میں مسلمانوں کا پلڑا فیصلہ کُن حد تک بھاری رہتا' اور چونکہ اس کی قیادت اصلاً علماء کے ہاتھوں میں ہوتی لہٰذا یہ بھی ہرگز بعید از قیاس نہیں ہے کہ اسی جہادِ حرّیت سے آگے چل کر غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کی راہ نکل آتی ...... یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ اپنے مرضِ وفات کے آخری لمحات تک اس کے لئے 'نہایت بے تاب اور شدید آرزومند رہے.........

یہ دوسری بات ہے کہ مشیّتِ ایزدی کے آگے بڑے سے بڑے انسان کی تمنّا و آرزو بھی ؎ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!" کی مصداق بن کر رہ جاتی ہے............ چنانچہ اس معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا اور حضرت شیخ الہندؒ کی نیک آرزوئیں ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن !

اب یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت ہے کہ 'پہلی بیعت یعنی بیعتِ حزب اللہ کے برعکس' اس دوسری مجوزہ بیعت یعنی بیعتِ امامتِ ہند کی بیل کے منڈھے چڑھنے کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں تھا اگر اسے امّت کے سربرآوردہ زعماء اور نمائندہ علماء کے معتدبہ حصّے کی تائید اور پشت پناہی حاصل نہ ہوتی...... بلکہ یہ حقیقت بھی اظہر من الشمس ہے کہ اگر کوئی عظیم شخصیت ابتداء ہی سے اس کی پشت پر نہ ہوتی تو اس تجویز کے باقاعدہ سامنے آنے اور کسی اہم اجتماع میں باضابطہ گفتگو کا موضوع بننے کا بھی کوئی امکان نہ تھا۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ یہ تجویز جمعیت علماءِ ہند

کے دوسرے اجلاس منعقدہ دہلی 'نومبر ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ کی خواہش اور ایماء ہی پر زیر بحث آئی۔

تاہم 'جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' راقم کی اس معاملے سے تمام تر دلچسپی یا تو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے ہے یا حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کی عظمت کے اعتبار سے ورنہ تنظیمِ اسلامی کی بیعت کا اس مجوزہ بیعت سے کوئی تعلق نہیں ہے............ اس لئے بھی کہ راقم نے جس سفر کا آغاز کیا ہے اس کے عزم کا اصل مصدر و منبع اُس کا اپنا احساسِ فرض ہے اور اگرچہ وہ جملہ اکابر و اصاغر اور ہر کہ ومہ سے تعاون کا خواستگار ہے اور بالخصوص اکابر علماء کے تعاون کو تو وہ "کہ ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!" کی سی دلی کیفیت کے ساتھ قبول کرے گا خواہ وہ صرف دعائے خیر اور کلمۂ نصیحت ہی کی صورت میں ہو 'تاہم اُس کا عزمِ سفر نہ کسی معیّن شخصیت یا طبقے کی تصویب پر منحصر ہے 'نہ ہی کسی کے تعاون کیساتھ مشروط ہے۔ بلکہ وہ 'انشاءاللہ العزیز' .... "یَاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ" کی سی کیفیت کے ساتھ غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کے لئے تن 'من 'دھن کے ساتھ جدّوجہد کرتے ہوئے اپنے ربّ کے حضور میں حاضر ہو جائے گا' اور الحمدللہ کہ یہی اُس کے نزدیک اصل اور بڑی کامیابی ہے! (ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ)...... اور اس لئے بھی کہ علماء کرام کی تائید و اتفاق کے ساتھ یہ معاملہ ۱۹۲۰ء میں طے نہ پا سکا جبکہ سوائے ایک خانوادۂ بریلی کے 'برِعظیم ہند و پاک کے جملہ دینی مکاتبِ فکر جمعیت علماءِ ہند کے پلیٹ فارم پر جمع تھے اور حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم ہستی اُس کی محرک و مجوز تھی 'تو آج جبکہ تشتت و انتشار کا عمل بہت آگے بڑھ چکا ہے اور "اِعْجَابُ کُلِّ ذِیْ رَأْیٍ بِرَأْیِہٖ" کا مرض کہیں زیادہ شدّت اختیار کر گیا ہے 'اس کی توقع کسی فاتر العقل انسان ہی کو ہو سکتی ہے!

البتہ جہاں تک اس واقعے کی واقعیت اور حقانیت کا تعلق ہے 'وہ اس عرصے کے دوران راقم پر مزید یقین و اذعان کے ساتھ منکشف ہوئی ہے۔ اس لئے کہ اُس نے مولانا محبوب الرحمٰن صاحب کی تحریر کو دیکھنے کے بعد ایک تو قاضی عدیل احمد عباسی کی تصنیف 'تحریکِ خلافت' کو حرفاً حرفاً پڑھا جو مولانا موصوف کا واحد ماخذ ہے 'اور دوسرے ڈاکٹر ابو سلمان

شاہجہانپوری کی تالیف ' تحریکِ نظمِ جماعت ' کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ' جس سے اس واقعے کے مختلف پہلوؤں پر مزید روشنی حاصل ہوئی۔ اور اگر مناسب فرصت میسر آگئی تو راقم اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج کو تفصیلاً قلم بند کرنے کی کوشش کرے گا۔ تاکہ ہمارے ماضیٔ قریب کی تاریخ کے وہ بعض اہم پہلو مزید نمایاں ہو جائیں جو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے قول کے مطابق "اب تک پردۂ خفا میں تھے!' ..... سرِدست راقم نے مولانا قاسمی مدظلہٗ اور ڈاکٹر شاہ جہان پوری صاحب ہی سے درخواست کی ہے کہ اس موضوع پر تفصیلاً روشنی ڈالیں۔ چونکہ ان دونوں حضرات کا اصل شغل ہی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف ہے ' لہٰذا اُن کے لئے یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے!..... بہرحال جیسے ہی ان حضرات کی جانب سے اس درخواست کے جواب میں کچھ موصول ہوا ہدیۂ قارئین کر دیا جائے گا!

—————(۲)—————

' جماعتِ شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی ' کے مقدّمے میں ' کتاب میں شامل بعض تحریروں اور تقریروں کے پس منظر کی وضاحت کے ضمن میں ایک نوجوان کا ذکر آیا تھا جس کے بارے میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تحریر اور گفتگو کی صلاحیّت کی راہ سے اُمّت میں ایک نئے فتنے کا آغاز بن سکتا ہے ... ہمیں افسوس ہے کہ اس عرصے کے دوران وہ فتنہ پوری قوّت و شدّت کے ساتھ سامنے آگیا ہے اور آج کل اُس کے ہاتھوں ایک قومی روزنامے کے کالموں میں فقہ اسلامی کے مجمع علیہ مسائل اور جلیل القدر فقہاء و محدّثین کی عزّت و آبرو کی دھجیاں بکھر رہی ہیں..... ہمیں اس پر ہرگز کوئی خوشی نہیں ہے کہ اس نوجوان کے بارے میں جو رائے ہم نے بہت پہلے قائم کر لی تھی وہ درست ثابت ہوئی ' البتّہ اس عرصے کے دوران جن حضرات نے لاعلمی اور حسنِ ظن کی بنیاد پر اُن سے راہ و رسم پیدا کر لی تھی اور اس طرح اُن کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن گئے تھے امید ہے کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا اور ہم یہ توقع کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کم از کم اب وہ حضرات اُن سے براءت کا اظہار و اعلان کر دیں....... ہمارا روئے سخن بعض دوسرے علماء کے ساتھ ساتھ ' بالخصوص مولانا سیّد وصی مظہر ندوی (حیدر آباد) کی جانب ہے ' جن سے ہم نے اپنا تنظیمی تعلق اسی لئے منقطع کر لیا تھا کہ وہ اس نوجوان کے نیاز مندوں یا سرپرستوں کے حلقے میں شامل ہو گئے تھے!

اس نوجوان نے روزنامے میں اپنے کالم کا آغاز ایک طرف راقم الحروف اور تنظیم اسلامی اور دوسری جانب مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی 'بیک وقت دونوں کو ہدفِ تنقید و ملامت بنا کر کیا تھا' اور 'اسلامی انقلاب' اور 'اقامتِ دین' کے لئے کی جانے والی مساعی پر مختلف النوع پھبتیاں چست کر کے 'خود کو مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ کی وساطت سے "دبستانِ شبلیؒ" کے وارث و ترجمان کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

اس پر راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی پر کئے جانے والے حملوں کا جواب رفیقِ محترم شیخ جمیل الرحمن صاحب کے قلم سے 'اور مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی پر کئے جانے والے حملوں کا جواب مولانا فتح محمد امیر جماعتِ اسلامی پنجاب کے قلم سے 'اُسی روزنامے میں شائع ہو گیا تھا۔ البتہ 'دبستانِ شبلیؒ' کے ضمن میں راقم نے اپنی ایک پرانی تحریر کے بارے میں ادارۂ 'حکمتِ قرآن' کو ہدایت کر دی تھی کہ اُسے دوبارہ شائع کر دیا جائے تاکہ "دبستانِ شبلیؒ" کے بارے میں بعض اہم حقائق قارئین کے ذہن میں تازہ ہو جائیں۔ یہ تحریر اب سے لگ بھگ بیس (۲۰) سال قبل لکھی گئی تھی اور "میثاق" کے نومبر ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور اس کے ایک ایک حرف کی تصویب و توثیق (تحسین اور استعجاب کے اضافے کے ساتھ) مولانا عبد الماجد دریابادیؒ نے فرمائی تھی۔

راقم کو اُس وقت یہ خیال نہ رہا کہ اس میں مولانا مودودی مرحوم پر تنقید کے ضمن میں چند تند جملے بھی شامل ہیں چنانچہ جیسے ہی ستمبر ۱۹۸۷ء کے "حکمت قرآن" میں یہ تحریر شائع ہوئی او اس پر معروف سندھی صحافی اور دانشور حافظ محمد موسیٰ بھٹو کا خط موصول ہوا جس میں اُس تحریر کے اصل نفسِ مضمون کی تحسین کے ساتھ یہ 'تنبیہہ' بھی شامل تھی کہ :

> "........... 'علی گڑھ اور دیوبند کے مابین چند درمیانی راہیں' پڑھ کر آپ کے علمی مزاج اور تجزیاتی صلاحیت کا اندازہ ہوا اور آپ سے عقیدت میں اضافہ ہوا۔ البتہ مولانا مودودی کی شخصیت اور اُن کے کام کے بارے میں آپ کی رائے میں کچھ جارحیت اور سختی پائی جاتی ہے..........."

تو راقم کی ہدایت پر 'حکمتِ قرآن' کے مرتب نے اگلی اشاعت کے 'حرفِ اوّل' میں محترم بھٹو صاحب کا خط بھی من و عن شائع کر دیا اور حسب ذیل وضاحت بھی شائع کر دی :

"محترم موسیٰ بھٹو کے اس خیال کے بارے میں کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی پرانی تحریروں میں خاصی تلخی پائی جاتی ہے' ہم یہ عرض کریں گے کہ اس وقت ڈاکٹر صاحب کے لئے مولانا کی تحریک اسلامی کے غلط سمت مڑ جانے کا صدمہ تازہ تھا' زخم کی دکھن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی جس کا اظہار ان تحریروں میں ہوا ہے۔ اب اگر ڈاکٹر صاحب مولانا مرحوم کا ذکر تحریر و تقریر میں کرتے ہیں تو انداز تلخی اور تندی کی بجائے تاسف اور حسرت کا سا ہوتا ہے۔ اس معاملے کی وضاحت خود محترم ڈاکٹر صاحب بھی اپنی کتاب "اسلام اور پاکستان' کے دیباچے میں فرما چکے ہیں جو شاید محترم مکتوب نگار کی نظر سے نہیں گزری"۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس کے باوجود جماعت اسلامی کے حلقے کے جرائد نے نہایت تیز و تند ردِّ عمل کا اظہار کیا اور ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور (۲۲ نومبر ۱۹۸۷ء) اور روزنامہ 'جسارت' کراچی نے ایک طویل و عریض مضمون شائع کر دیا جو اپنے انداز و اسلوب کے اعتبار سے "جاٹ رے جاٹ ترے سر پر کھاٹ!" کے جواب میں "تیلی رے تیلی ترے سر پر کولھو!" کا مصداقِ کامل ہونے کے علاوہ خلطِ مبحث اور اصل موضوع سے گریز کرتے ہوئے قارئین کو خواہ مخواہ کے ایچ پیچ میں الجھا دینے کی کوشش کا مظہرِ اتم بھی ہے!

حسنِ اتفاق سے ان ہی ایّام میں دفترِ "میثاق" کی جانب سے پرچے کے مضامین وغیرہ کے بارے میں قارئین کی رائے معلوم کرنے کے لئے جو مراسلہ جاری کیا گیا تھا اُس کے جوابات کے ذریعے بھی بہت سے حضرات کی یہ رائے سامنے آئی کہ مولانا مودودی پر تنقید سے احتراز کرنا چاہئے!

لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر بعض اصولی باتیں گوش گزار کر دی جائیں۔

اس اعتراض کا ایک نہایت سادہ اور عام فہم 'اگرچہ الزامی نوعیت کا حامل 'جواب تو یہ ہے کہ جب مولانا مودودی مرحوم نے خود نہ صرف یہ کہ اپنے جملہ معاصرین پر شدید تنقیدیں کیں بلکہ ع "ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!" کے مصداق اسلاف کو بھی نہ چھوڑا اور جملہ مجدّدین و مصلحین امّت کے علاوہ صحابہ کرامؓ پر بھی جارحانہ تنقیدیں کیں حتیٰ کہ انبیاء کرامؑ کے بارے میں بھی بے باکانہ طرزِ گفتگو سے احتراز نہ کیا تو آخر انہیں وہ کون سا تقدس حاصل ہے جس کا اس درجہ تحفّظ لازمی ہے؟

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ جواب راقم کے حقیقی احساسات اور واقعی جذبات کا آئینہ دار نہیں ہے۔ اس معاملے میں راقم کے مزاج کی تشکیل جن آراء کی اساس پر ہوئی ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ اس دورِ زوال میں جس شخص سے بھی کسی درجے کا کوئی خیر بن آیا ہو اور جو خدمت بھی اس نے دین و ملت کی سرانجام دی ہو اس کا بھرپور اعتراف ہونا چاہئے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کی خامیوں اور غلطیوں کو بھی واضح کر دیا جانا چاہئے تاکہ لوگ مغالطوں میں مبتلا ہونے سے بچ سکیں.......... اور دوسری یہ کہ جیسے سنّتِ رسولؐ کے ضمن میں امت کے تواترِ عمل کو بہت اہمیت حاصل ہے' اسی طرح ملّت کی تجدیدی و احیائی مساعی کا تسلسل بھی نہایت اہمیت کا حامل ہے اور دین و ملت کے ہر نئے خادم کو نہ صرف یہ کہ اسلاف کے ساتھ ذہناً اور قلباً منسلک رہنا چاہئے بلکہ اپنے بزرگوں میں سے جس جس سے بھی اُسے کوئی فیض حاصل ہوا ہو اس کا برملا اعتراف و اظہار کرنا چاہئے!.......... اگرچہ اُن کی جن جن باتوں سے اختلاف ہو انہیں بھی معیّن انداز میں واضح کر دینا چاہئے! تاکہ شخصیت پرستی کی لعنت کا سدّباب ہو سکے!
راقم کے نزدیک اپنے ہم عصر بزرگوں سے کسبِ فیض کے برملا اعتراف و اعلان کی ضرورت و اہمیت امّت کے تواتر و تسلسل' شرافت و مروّت کے تقاضوں اور فرمانِ نبویؐ "مَن لَّمۡ یَشۡکُرِ النَّاسَ لَا یَشۡکُرُ اللّٰہَ" کی تعمیل کے علاوہ اس اعتبار سے بھی ہے کہ اگر کوئی خادم دین و ملت ایسا نہ کرے تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اگر اُس کی مساعی اور خدمات کے نتیجے میں اس کے قدر دانوں اور عقیدتمندوں کا حلقہ پیدا ہو جائے تو اس حلقے میں اُس کے بارے میں یہ تاثر قائم ہو جائے گا کہ اگر وہ خود براہ راست آسمان سے نازل نہیں ہوا تھا کم از کم اس پر آسمان سے براہ راست وحی تو ضرور ہی نازل ہوتی رہی ہے!.......... اور کون نہیں جانتا کہ امت کی تاریخ کے دوران اصلاحی اور احیائی تحریکوں کے مستقل فرقوں کی صورت اختیار کر لینے کا اصل سبب یہی رہا ہے!

ان سطور کے عاجز راقم کی اس سوچ اور اس کے مزاج کی اس ساخت کا نتیجہ ہے کہ اس نے بلا جانب اپنے مطالعہ و فہم قرآن کے پورے حدود اربعہ (یا ابعادِ اربعہ) کو واضح طور پر بیان کر دیا کہ وہ فیض یاب ہوا ہے اوّلاً مولانا مودودی اور مولانا آزاد سے' ثانیاً مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی سے' ثالثاً ڈاکٹر رفیع الدین اور ڈاکٹر اقبال سے' اور رابعاً شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد

عثمانی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے (رحمہم اللہ !) اور دوسری جانب اپنی تحریک و تنظیم کے بارے میں ببانگ دہل اعلان کیا کہ وہ تسلسل ہے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ' جماعت اسلامی ' اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ' حزب اللہ ' کا کہ جسے سندِ تائید و توثیق حاصل ہو گئی تھی حضرت شیخ الہندؒ کی جانب سے !

راقم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب وہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بیان کرتا ہے تو جماعتِ اسلامی کے حلقے کے لوگ اسے دیوبندی حلقے کی "خوشامد" سے تعبیر کرتے ہیں اور جب وہ مولانا مودودی سے اپنی نسبت و تعلق کو نمایاں کرتا ہے تو وہ علماءِ دیوبند کو "جماعتیوں" کی خوشنودی کے حصول کی کوشش نظر آتی ہے ... چنانچہ نتیجہ وہی نکلتا ہے کہ ع "اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش !" اگرچہ اس کا سبب بھی بالکل وہی ہے کہ ع "میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند !" ... چنانچہ راقم اللہ کو گواہ بنا کر اور اس تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اُس کی زبان و قلم سے غلط فہمی کی بناء پر تو یقیناً بہت سی باتیں خلافِ واقعہ صادر ہوئی ہوں گی ' الحمد للہ کہ آج تک اس نے نہ جان بوجھ کر کسی شخص یا حلقے کی خوشنودی کو مطمحِ نظر بنایا ہے نہ ہی کسی کی ناراضگی یا ناخوشی کا لحاظ کیا ہے ! بلکہ اللہ کے فضل و کرم سے ہمیشہ صرف اسی کی رضاجوئی اور اپنے ضمیر کے اطمینان کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اور اُسے اس سے کوئی غرض نہیں رہی کہ کون خوش ہوتا ہے اور کون ناخوش !

ہاں ' لہجے اور اندازِ گفتگو کا معاملہ جدا ہے۔ نظری اور علمی طور پر راقم بھی خوب جانتا ہے کہ داعیانہ انداز میں تیزی و تندی اور فی الجملہ جارحیت نہیں نصح و اخلاص اور دلسوزی و خیر خواہی کو نمایاں ہونا چاہئے ... اور وہ اس ضمن میں مقدور بھر کوشش بھی کرتا ہے تاہم اس میدان میں اُسے اپنے مستقل عجزِ بیان کا بھی برملا اعتراف ہے ...... اور وہ اس امر کا بھی انکار نہیں کرتا کہ وہ وقتی طور پر اشتعال میں بھی آ جاتا ہے۔

چنانچہ مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں اُسے صاف اقرار ہے کہ وہ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک شدید غم و غصے کی ملی جلی جذباتی کیفیت میں مبتلا رہا ہے ' لہٰذا اس کی اُس زمانے کی تحریروں میں اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام کی حد تک ' زیادتی ' کا عنصر شامل رہا ہے ...... اگرچہ اسے پورا اطمینان ہے کہ بحمد اللہ اس دور کی تلخ ترین تحریروں میں بھی کوئی بات نہ خلافِ

واقعہ بیان ہوئی ہے نہ خلافِ حقیقت!

اپنی اس دور کی جُملہ تحریروں کے بارے میں 'الحمد للہ کہ' راقم نے ایک جامع دُستاویز' آج سے ٹھیک پانچ سال قبل قلمبند کر دی تھی جو راقم کی تالیف "اسلام اور پاکستان: تاریخی' سیاسی' علمی اور ثقافتی پس منظر" میں بطورِ مقدّمہ شامل ہے۔ ذیل میں اسے من و عن درج کیا جارہا ہے تاکہ وہ راقم کے تمام ہی خواہوں کی نظر سے گزر جائے' خصوصاً اس لئے کہ ــــ جیسے کہ بعد میں ذکر ہو گا ـ راقم کی اسی دور کی ایک اور تحریر سے دوبارہ شائع کرنے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہے' لہٰذا اس کے ضمن میں یہ تحریر ایک پیشگی وضاحت کا کام دے گی:

"پیش نظر مجموعہ میری چند تحریروں پر مشتمل ہے جو ۶۸ـ ۱۹۶۷ء کے دوران ماہنامہ 'میثاق' لاہور میں "تذکرہ و تبصرہ" کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھیں۔

ان میں میں نے ایک جانب تحریک پاکستان کے تاریخی پس منظر کا جائزہ لیا ہے اور دوسری جانب موجودہ پاک و ہند مسلم معاشرے میں مذہبی فکر کے جو مختلف حلقے پائے جاتے ہیں ان کے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میرے نزدیک ان کا اہم ترین گوشہ وہ ہے جس سے ان عظیم غلطیوں کا سراغ ملتا ہے جن کے باعث ہم اس حد درجہ افسوسناک صورت حال سے دوچار ہیں کہ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس میں ثلث صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

اس ضمن میں لامحالہ بعض شخصیتوں اور جماعتوں کے کردار پر تنقید بھی آئی ہے جس کی زیادہ شدت کا ظہور فطری طور پر ان ہی کے حق میں ہوا ہے جن سے احیاءِ اسلام اور اقامت دین کے ضمن میں سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں۔ تاہم خدا گواہ ہے کہ ان کی توہین و تنقیص نہ اس وقت مقصود تھی جب یہ مضامین لکھے گئے تھے' نہ آج مطلوب ہے' بلکہ اصل معاملہ تب بھی وہی تھا اور اب بھی وہی ہے جو غالب کے اس شعر میں بیان ہوا کہ

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

پیش نظر مجموعے کی اشاعت سے قبل جب میں نے اپنی آج سے پندرہ سولہ سال قبل کی ان تحریروں کا جائزہ تنقیدی نگاہ سے لیا تو الحمد للہ کہ اس امر کا تو پورا اطمینان ہوا کہ ان میں حالات و واقعات کا جو تجزیہ سامنے آیا ہے وہ صدفی صد درست ہے البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ ان میں بعض مقامات پر طرزِ تعبیر اور اندازِ تحریر میں تلخی شامل ہو گئی ہے۔ جو نہ ہوتی تو بہتر تھا۔ گویا اگر میں ان موضوعات پر آج قلم اٹھاؤں تو تجزیہ تو بنیادی طور پر وہی ہو گا لیکن انداز اتنا تلخ نہ ہو گا۔

لیکن اب ان تحریروں سے اس تلخی کو نکالنا نہ ممکن ہے نہ مناسب..... ممکن اس لئے نہیں

کہ وہ ان کے پورے تانے بانے میں بنی ہوئی ہے' اور مناسب یا درست اس لئے نہیں کہ پرانی تحریروں کو اگر پرانی تحریروں ہی کی حیثیت سے شائع کیا جائے تو ان میں رد و بدل تصنیف و تالیف کے اصولوں کے خلاف ہے..... اگر صاحب تحریر کی رائے میں بعد میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہو تو اسے اضافی حواشی کی صورت میں درج ہونا چاہئے یا علیحدہ وضاحت کی شکل میں!

اس ضمن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا۔ جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی انتاہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی لیکن آخر کار اس پر افسوس' ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آگیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بہ تمام و کمال عود کر آئے۔ میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں للذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبین و معتقدین سے معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے۔ (یہ اطلاع جناب عبدالرحیم' ڈپٹی چیف مکینکل انجینئر' کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی ملاقات میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!") جس کی تائید مزید مجھے بفلو میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ' ان کے الفاظ میں "..ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن ..."..... بہر حال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدان حشر میں جب میں ان سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے۔

اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم ماضی کے طرز عمل کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیں اور اس میں نہ کسی کی محبت و عقیدت کو آڑے آنے دیں نہ کسی کے بغض و عداوت کو راہ پانے دیں' بلکہ بے لاگ تجزیہ صرف مستقبل کے لئے سبق حاصل کرنے کے لئے ہو... اور اس اعتبار سے ان شاء اللہ العزیز قارئین کرام ان تحریروں کو مفید پائیں گے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

لاہور' یکم جنوری ۸۳ء

۱۹۷۰ء کے بعد مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی کے بارے میں راقم کے قلبی
ساسات وجذبات اور طرزِ گفتگو اور اندازِ بیان میں جو فرق واقع ہوا ہے' اس میں اوّلین دخل تو
ں کا تھا کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں آرزوؤں اور امنگوں ہی نہیں' امیدوں اور توقعات کے
دوبالا قصر کے ایک دم منہدم ہو جانے کے باعث حد درجہ دل شکستگی کی کیفیت مولانا
حوم پر اور بے چارگی اور مسکنت کی کیفیت جماعتِ اسلامی پر طاری ہو گئی تھی...... چنانچہ یہ
نہ راقم نے بارہا بیان کیا ہے (اور ممکن ہے کہ کہیں تحریر میں بھی آیا ہو) کہ فروری ۱۹۷۱ء
ں حج کے موقع پر جب راقم نے مکہ مکرمہ میں برادرم زبیر عمر صاحب کے مکان پر مولانا
دودی کی اس تقریر کا ٹیپ سنا جو انہوں نے انتخابی شکست پر اپنے ہی حلقے کے بعض صحافی
رات کے ناقدانہ تبصروں کے جواب میں کی تھی تو واقعہ یہ ہے کہ راقم اپنے آنسو بمشکل ہی
ط کر سکا تھا!...... اس کے بعد مسلسل خبریں ملتی رہیں کہ مولانا پر علالت کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے
اس کا بھی ایک فطری اثر طبیعت پر ہوا...... لیکن اس میں کچھ عرصہ کے بعد دوسرا فیصلہ کن
ں یہ شامل ہوا کہ مختلف ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا کی سوچ تبدیل ہو گئی ہے اور اب وہ
تان میں انتخابات کی راہ سے ' اقامتِ دین ' کا کوئی امکان نہیں سمجھتے بلکہ سابقہ انقلابی طرزِ
ہی کی جانب رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ اُن داخلی نفسیاتی حجابات کے باعث
یک طویل عرصے کے فصل و بُعد سے پیدا ہو گئے تھے اور کچھ ان ' اطلاعات ' کی بنا پر کہ
نا پر جماعت کی "بیورو کریسی" نے تہہ بر تہہ پہرے قائم کئے ہوئے ہیں' ان سے براہِ
ت توثیق تو حاصل نہ کی جا سکی۔ (یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۹ء میں راقم اپنے پہلے سفر امریکہ پر
راہش دل میں لئے ہوئے گیا تھا کہ اگر ممکن ہوا تو وہاں مولانا سے ملاقات کروں گا جس کا
اوپر کے حوالے میں آ چکا ہے) البتہ اس کا نتیجہ وہ نکلا جو اوپر ان الفاظ میں سامنے آ چکا ہے
م و غصّے کی کیفیت پر "حسرت اور ہمدردی کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم
احسان مندی کے احساسات بہ تمام و کمال عود کر آئے!"

اس کیفیت میں مزید اضافہ مولانا کے انتقال کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان
ات کے مطابق ہوا کہ "اُذکُرُوا موتَاکُم بالخیر"......اور "لاتَسُبُّوا
سوات فانهم قد افضوا اِلیٰ ماقدّمُوا" یعنی "اپنے فوت شدگان کا ذکر خیر

ہی میں کیا کرو" اور "فوت شدگان کو برا بھلا مت کہو' اس لئے کہ وہ تو اپنے اُن اعمال کے پاس پہنچ ہی چکے ہیں جو انہوں نے آگے بھیجے تھے!" !!

لہٰذا اب اگر کبھی میری تحریر یا تقریر میں مولانا مودودی کا ذکر تنقیدی انداز میں آتا ہے تو وہ صرف شدید ترین ضرورت کے احساس ہی کے تحت آتا ہے اور حتّی الامکان محتاط ترین الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ رہا گذشتہ تحریروں کا معاملہ تو اگرچہ ان کے انداز اور اسلوب کے بارے میں ایک عمومی معذرت میں پانچ سال قبل کر چکا ہوں، تاہم ان کے نفسِ مضمون کے بارے میں بحمد اللہ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔

چنانچہ میری جس تحریر پر جماعتِ اسلامی کا حلقۂ صحافت آتش زیر پا ہوا ہے اس کے بھی نفسِ مضمون (CONTENTS) کی پوری ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا بارِ ثبوت اپنے سر لیتے ہوئے اس کے دلائل و شواہد پیش کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اُس کا حاصل کیا ہو گا؟ اور اس کا فائدہ کس کو پہنچے گا؟ لہٰذا سر دست راقم ان تفاصیل میں جانے کی بجائے جماعت کے احباب کی خدمت میں چند اصولی گذارشات پر اکتفا کر رہا ہے۔

اور وہ یہ کہ جب آپ حضرات کو بھی اقرار ہے کہ مولانا مرحوم نہ فرشتہ تھے کہ بشری کمزوریوں سے مبّرا ہوں، نہ نبی تھے کہ معصوم عن الخطا ہوں۔ تو آپ کسی کی جانب سے اُن کی کسی کمزوری یا غلطی کی نشاندہی پر اس قدر حساسیّت کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں کہ جیسے معترض یا ناقد کو تو چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے اور اپنے ممدوح' کو سُبّوح اور قدّوس ثابت کر کے رہیں گے؟ .... اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالٰی نے مولانا مرحوم کو ذہانت و فطانت بھی وافر عطا فرمائی تھی، اور زبان و قلم کی استعدادات سے بھی پوری فیاّضی سے نوازا تھا...... پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے دین کی خدمت کے جذبے سے سرفراز فرمایا تھا، لیکن اس سب کے باوصف وہ بہرحال انسان ہی تھے اور عام انسانوں ہی کے مانند پیدا ہوئے اور پلے بڑھے تھے چنانچہ انہوں نے بھی اپنے ماحول اور گرد و پیش ہی سے علم و فہم حاصل کیا تھا اور تربیت پائی تھی۔ اور جس طرح ہر انسان اپنے بزرگوں سے کسبِ فیض کرتا ہے اسی طرح انہوں نے بھی قدیم اسلاف کے سا

ساتھ اپنے سے ایک نسل پہلے کے بہت سے اشخاص سے تحریر و انشاء کا اسلوب، فکر و نظر کی
جلا، مقاصد و اہداف کا شعور اور سعی و جہد کا انداز اخذ کیا تھا...... اور ان میں سے کسی چیز میں بھی
اُن کی توہین کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے..... اس پر اگر راقم نے یہ عرض کر دیا تھا کہ مولانا نے
س اخذ و کسب کے ضمن میں اعتراف و اظہار اور تشکّر و امتنان کے ضمن میں بخل سے کام لیا
ہے، تو اس پر اس درجہ مخبوط الحواس ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ:
(۱) راقم کے زمانہ قیامِ ساہیوال کے دروسِ قرآن کے مآخذ میں 'تفہیم القرآن' کے ساتھ
ساتھ 'تدبّرِ قرآن' کا نام بھی ٹانک دیا گیا حالانکہ ساہیوال میں میرے درس قرآن کی مقبولیت
کا زمانہ ۵۶ - ۱۹۵۵ء کا ہے، جب ساہیوال میں تو جماعتِ اسلامی کے ہفتہ وار اجتماع کے علاوہ
ی میرے متعدد دروس ہوتے تھے، ایک ایک ماہانہ درس قرآن کا اہتمام جماعت اسلامی حلقہ
کاڑہ نے اوکاڑہ، عارف والہ اور پاکپتن میں بھی کیا تھا..... جبکہ 'تدبر قرآن' کی تسوید کا
غاز بھی ۱۹۵۹ء میں ہوا......
۲) علامہ نیاز فتح پوری سے مولانا مودودی کے نظریاتی بُعد پر صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے
لئے حالانکہ اس کا موضوع سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اس لئے کہ یہ تو کسی نے کہا ہی نہیں تھا کہ
ولانا کا جنابِ نیاز سے نظریاتی نیاز مندی کا رشتہ ہے۔ بات تو صرف اُن سے اندازِ تحریر اور
سلوبِ انشاء اخذ کرنے اور اس سلسلے میں ان کے زیرِ تربیت رہنے کی تھی، اور اس پر خود مولانا
الاعلیٰ مودودی کے برادرِ بزرگ سید ابوالخیر مودودی کی تحریری شہادتیں موجود ہیں۔
۳) اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے اس دور کے نظریاتی فصل و بعد کا ذکر تو کر
یا گیا جبکہ وہ نیشنلسٹ سیاست کے مرد میدان بن گئے تھے لیکن 'الہلال' اور 'حزب اللہ'
لے دور کا ذکر گول کر دیا گیا جو مولانا مودودی کے دینی فکر ہی نہیں جذبے کا بھی عظیم ترین
منذ و مصدر ہے!
۴) اسی طرح علامہ اقبال کی مدح و ستائش کے ضمن میں تو مولانا کی تحریروں کا انسائیکلو پیڈیہ
تب کر دیا گیا...... حالانکہ، قطع نظر اس کے کہ یہ ساری تحریریں قیام پاکستان کے بعد کی ہیں
ـ بعض جدید مصلحتیں بھی پیدا ہو چکی تھیں'...... اصل سوال ذاتی تشکّر و امتنان اور حضرتِ
مہ کے انتقال پر تعزیتی شذرے کا تھا جسے غتر بود کر دیا گیا۔

(۵) رہے خیری برادران تو یقیناً اُن کے ضمن میں تو اس ناگوار بحث سے ایک ' خیر ' برآمد ہو ہی گیا کہ کم از کم جماعتِ اسلامی کے حلقے نے پہلی بار مسلمانانِ برعظیم ہندو پاک کے اس محسن خاندان کا ذکرِ خیر سن لیا!...... لیکن نامعلوم کیوں چھوٹے بھائی ڈاکٹر عبدالستار خیری کا سن وفات تو درج کر دیا گیا (۱۹۴۵ء) لیکن بڑے بھائی یعنی ڈاکٹر عبدالجبار خیری کے بارے میں یہ بات واضح نہ کی گئی کہ وہ ۱۹۵۵ء تک بقیدِ حیات تھے' شاید اس لئے کہ اصلاً وہی تھے جن کی قائم کردہ جماعت کے دستور سے مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کے اولین دستور کی تدوین میں ' رہنمائی ' حاصل کی تھی...... حتیٰ کہ ان کے بھتیجے جناب حبیب الوہاب خیری کی روایت کے مطابق ۳۹ - ۱۹۳۸ء کے زمانے میں کسی وقت اُن کے ہاتھ پر بیعت بھی کی تھی۔ (خیری صاحب کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں ایک ملاقات کے موقع پر انہوں نے مولانا مودودی سے اس بیعت کا تذکرہ کیا تو انہوں نے تردید نہیں کی تھی) واضح رہے کہ خیری صاحب راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن کے بی بلاک میں مقیم ہیں اور وکالت اور سیاست دونوں میدانوں میں سرگرم ہیں! اور راقم نے ان سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے حالات قدرے تفصیل سے قلمبند فرماویں اس لئے کہ یہ بھی مسلم انڈیا کے اُس دور کی تاریخ کا ایک اہم گوشہ ہے جس سے لوگ جس حد تک بھی آگاہ ہو جائیں اچھا ہے!!...... مزید برآں ڈاکٹر عبدالجبار خیری کی جماعت کے جس دستور کا ذکر ' ایشیاء ' اور ' جسارت ' کے فاضل مضمون نگار نے نہایت طنزیہ تحدّی کے ساتھ کیا ہے ' بحمداللہ اس کا ایک نسخہ بھی ڈاکٹر برھان احمد فاروقی مدظلہ کے پاس موجود ہے!

تاہم راقم اس بحث کو ہرگز بڑھانا نہیں چاہتا اور اس کا مشورہ احبابِ جماعتِ اسلامی کو بھی یہی ہے کہ اصل اہمیت ' شخصیت ' کی بجائے نظریئے اور مقصد کو دیں اور توجہات کا اصل مرکز اور اخذ و ردّ اور ترک و قبول کا اصل معیار اشخاص کی بجائے نظریات اور مقاصد بنائیں .. اس لئے کہ اگر ذرا ذاتی مفادات اور گروہی مصالح کے ' بلیک ہول ' سے نکل کر دیکھا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ وقت کے عظیم دھارے میں سینکڑوں ملتیں اور اقوام تنکوں کے مانند بہی چلی جا رہی ہیں ' پھر ہر ملت و قوم کے بحرِ محیط میں کتنی ہی نظریاتی تحریکوں کی رَوئیں چل رہی ہیں ' پھر ہر نظریاتی تحریک کے جلو میں کتنی ہی جماعتیں اور تنظیمیں برسرِ کار ہیں!

ہر آخری درجے میں ہر جماعت اور تنظیم بہر حال چھوٹے اور بڑے افراد ہی کی محنت و مشقت
ور ایثار و قربانی کی رہینِ منت ہے'...... اب اگر ایک رُخ سے دیکھا جائے تو یقیناً افراد کی بھی بہت
ہمیت ہے اور یہ صد فیصد درست ہے کہ ۔ "افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ۔ ہر فرد
ہے ملت کے مقدر کا ستارا!" ...... لیکن اگر دوسرے رخ سے غور کیا جائے تو نظریاتی سطح پر
صل اہمیت ' تحریک ' کی ہوتی ہے تنظیموں اور جماعتوں ' یا افراد اور شخصیات کی نہیں!......
چنانچہ کسی نظریاتی تحریک کے بحرِ محیط میں شخصیتوں کے بلبلے بھی اٹھتے اور بیٹھتے رہتے ہیں ' اور
جماعتی اور تنظیمی ہیئتیں بھی بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں لیکن اصل ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ
س نظریاتی تحریک کے تسلسل کو برقرار رکھا جائے اور اصل توجہ کو اہداف اور مقاصد پر مرتکز
کر دیا جائے نہ کہ اشخاص یا افراد پر!

چنانچہ ۲۰ویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلامیانِ ہند کے بحرِ محیط میں تین تحریکوں کی لہریں
ٹھنی شروع ہوئی تھیں جنہوں نے رفتہ رفتہ تین مستقل رووں کی شکل اختیار کر لی: ایک قومی و
سیاسی تحریک جس کے جلی اور روشن عنوان کی حیثیت رفتہ رفتہ مسلم لیگ کو حاصل ہو گئی '
دوسری خالص مذہبی اصلاحی تحریک جس کے میدان میں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے اصل
نکا تبلیغی جماعت کا بجنے لگا...... اور تیسرے ' تجدیدی و احیائی تحریک جس کا آغاز تو ہوا تھا
' الہلال ' اور ' حزب اللہ ' سے ' لیکن بعد میں اس کے تسلسل کو قائم رکھا ' ترجمان
القرآن ' اور " جماعت اسلامی ' نے...... جس کے قیام پر اب نصف صدی مکمل ہوا چاہتی
ہے'...... تو کیا فرمان خداوندی "اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ
لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" کے مصداق ابھی وقت نہیں آیا کہ جماعت
کے احباب کسی عظیم شخصیت یا جماعتی ہیئت کے بت کو پوجنے کی بجائے اس اصل تحریک کے
فکار و نظریات اور اہداف و مقاصد کے اعتبار سے جائزہ لیں کہ ۔

کون سی وادی میں ہے؟ کون سی منزل میں ہے؟
عشقِ بلا خیز کا قافلۂ سخت جاں!

پھر جہاں تک شخص مودودی کا تعلق ہے کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جب انہوں نے شعور کی
آنکھ کھولی تو برعظیم ہند و پاک کے طول و عرض میں علم و ادب اور فکر و نظر کے میدان میں علامہ

اقبال اور مولانا آزاد کا طوطی بول رہا تھا ... تو اگرچہ ان کے دینی فکر کی تشکیل میں ان دونوں کا نمایاں حصہ ہے، لیکن خالص احیائی و انقلابی انداز چونکہ صرف مولانا آزاد کا تھا لہٰذا وہ سب سے زیادہ متاثر ان ہی سے ہوئے...... البتہ مختلف جہتوں سے اَخذ و کسب اور اس طرح حاصل شدہ مواد کی تالیف و تدوین پر اپنے ذاتی غور و فکر کے اضافے کے ذریعے اُن کی جو سوچ مرتب ہوئی اُسے انہوں نے اس عام فہم اور سادہ و سلیس اندازِ بیان کے ذریعے وسیع پیمانے پر عام کیا جو انہیں اصلاً جناب نیاز فتح پوری کی صحبت و قرب سے حاصل ہوا تھا ... اور جب وہ ۴۰ - ۱۹۳۹ء میں اپنی اس تحریک کے لئے باضابطہ ہیئتِ تنظیمی کے مسئلے پر غور کر رہے تھے تو اس مرحلے پر انہیں خیری برادران کے قرب و تعلق سے فیض حاصل ہوا جو ایک طویل عرصے تک جرمنی میں قیام کے بعد انہی دنوں واپس آئے تھے اور جنہوں نے وہاں کی مختلف تحریکوں اور تنظیموں، بالخصوص فاشسٹ تحریک کا گہرا مطالعہ کیا تھا!

لہٰذا نہ ان کا فکر وحیٔ آسمانی کے مانند ہر غلطی سے مبرّا اور ہر اعتبار سے کامل تھا۔ نہ ان کی اختیار کردہ ہیئت تنظیمی 'منصوص' یا حرفِ آخر تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے جو قافلہ تشکیل دیا تھا اسے چھ سات سال تک بڑی ہمّت اور استقامت کے ساتھ 'اصولی اسلامی انقلابی' نہج پر چلایا ۔ البتہ چونکہ وہ عام انسان تھے جو فرمان نبویؐ کے مطابق "مرکبٌ عنِ الخطاءِ وَالنسیان" ہوتا ہے لہٰذا ان سے غلطیاں بھی ہوئیں جن میں سے بعض تو ہمالیہ جتنی بڑی بھی تھیں ..... جن میں سے عظیم ترین غلطی تو یہ تھی کہ تقسیم ہند کے موقع پر حالات کی ایک سطحی سی تبدیلی سے دھوکہ کھا کر انہوں نے اپنی مساعی کو "اصولی اسلامی انقلابی تحریک" کی بجائے "اسلام پسند' قومی' سیاسی جماعت" کے رخ پر ڈال دیا..... اور پھر دوسری ہمالیہ ایسی عظیم غلطی ان سے ۵۷ - ۱۹۵۶ء میں سرزد ہوئی جب ان کے بعض قدیم ترین اور مخلص ترین ساتھیوں نے انہیں اس غلطی کا احساس دلانا چاہا تو انہوں نے ان پر "غیر شعوری سازش" کا الزام لگا کر ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ انہیں مجبوراً ایک ایک کر کے جماعت سے علیحدہ ہو جانا پڑا......

راقم کو یقین ہے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کو اپنی ان دونوں غلطیوں کا احساس ہو گیا تھا لیکن افسوس کہ یہ اس وقت ہوا جب وہ عمر کی آخری منزل میں تھے اور صحت اور قوّت

جواب دے چکی تھی'...... چنانچہ معاملہ وہی ہوا کہ ؎

"جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!"

کاش کہ جماعت اسلامی کے احباب...... اور بالخصوص ان کے اصحابِ فکر و نظر اور اربابِ حل و عقد مولانا مودودی کی شخصی عظمت کے احساس اور اُن سے ذاتی محبت و عقیدت کے رشتے کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں اور غلطیوں کا ادراک و شعور بھی حاصل کر سکیں...... اور اس اصل تحریک کے "ماضی' حال' اور مستقبل" پر از سر نو غور کر سکیں جس کے لئے مولانا مرحوم نے اپنی جملہ توانائیاں اور صلاحیتیں وقف کر دی تھیں۔

—————(۳)—————

مولانا مودودی کی پہلی ہمالیہ ایسی غلطی کے بارے میں تو راقم کی مفصل تالیف "تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" موجود ہے جو اس نے ۱۹۵۶ء میں رکن جماعت کی حیثیت میں' جماعت کی پالیسی سے اپنے اختلاف کی وضاحت کے لئے اس جائزہ کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کے لئے لکھی تھی جسے جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ نے اسی غرض سے نامزد کیا تھا .. البتہ دوسری عظیم غلطی پر تا حال خفاء کا نہایت دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔

راقم الحروف نے ۱۹۶۶ء میں آیۂ مبارکہ "وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا" (اس عورت کے مانند نہ بنو جس نے بڑی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا: سورۂ نحل آیت نمبر ۹۲) کے حوالے سے 'نقضِ غزل' کے عنوان کے تحت اس تلخ داستان کو قلمبند کرنا شروع کیا تھا جس کی پانچ ہی قسطیں 'میثاق' میں شائع ہوئی تھیں کہ بعض 'بزرگوں' کے حکم سے اسے بند کر دینا پڑا...... وہ دن اور آج کا دن اس داستان ظلم کے اصل واقعات ماضی کے دبیز سے دبیز تر ہونے والے پردوں میں مستور ہوتے چلے گئے...... نتیجۃً زیادتی کرنے والا تو فتح کے پھریرے اڑاتا رہا...... اور جن پر زیادتی ہوئی تھی وہ تضحیک اور ملامت کا ہدف بنتے چلے گئے......!

بہت عرصے کے بعد' پچھلے دنوں جب مشہور صحافی اور دانشور جناب ارشاد احمد حقانی نے' جو خود بھی "یکے از خارجینِ جماعتِ اسلامی" ہی ہیں...... محترم قاضی حسین احمد صاحب کے

امارتِ جماعت کے منصب پر فائز ہونے کے موقع پر روزنامہ "جنگ" میں طویل سلسلۂ مضامین شائع کیا تو اس کی کسی ابتدائی قسط میں اس تلخ داستان کا سرسری ساذکر بھی آیا... اس پر روزنامہ "جسارت" کراچی میں کسی غیر معروف شخص نے طنز و تمسخر اور تضحیک و استہزاء کا جو انداز اختیار کیا اس نے ایک جانب تو بہت سے پرانے زخموں کو ہرا کر دیا...... اور دوسری جانب پورا اخلاقی جواز فراہم کر دیا کہ ماضی کی اس امانت کو حال کے حوالے کر دیا جائے۔

ویسے بھی ۵۷-۵۶ء کے واقعات پر اب تیس برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے اور دنیا کا عام دستور بھی یہی ہے کہ اتنے عرصے کے بعد انتہائی خفیہ دستاویزات بھی شائع کر دی جاتی ہیں۔ (چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف کے وہ اوراق بھی امید ہے کہ اگلے ہی ماہ منظر عام پر آجائیں گے جنہیں اُن کی وصیت کے مطابق سربمہر کر دیا گیا تھا۔) .... لہٰذا خیال ہو رہا ہے کہ اس داستان کو بھی منظرِ عام پر لے ہی آیا جائے۔ اگرچہ اس کا کوئی قطعی فیصلہ راقم تاحال نہیں کر پایا ہے!

لیکن اگر یہ فیصلہ ہو ہی گیا' تو ظاہر ہے کہ ابتداء ان پانچ اقساط کی دوبارہ اشاعت ہی سے ہو گی جو ۶۷-۱۹۶۶ء میں 'میثاق' میں شائع ہو گئی تھیں' اور چونکہ وہ راقم کے اس دور کی تحریریں ہیں جن کا تفصیلی ذکر اوپر ہو چکا ہے لہٰذا اُن میں حقائق و واقعات کے ساتھ ساتھ "تیر و نشتر" بھی وافر مقدار میں موجود ہیں جن کے ضمن میں پیشگی معذرت کا کام "اسلام اور پاکستان" وہی مقدمہ دے گا جو ۱۹۸۳ء میں ضبطِ تحریر میں آیا تھا اور اوپر من وعن شائع کیا جا چکا ہے

آخر میں دعا ہے۔

اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وارنا الباطل

باطلا وارزقنا اجتنابه

آمین یارب العالمین!

خطابِ جمعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

"آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے"

حالاتِ حاضرہ سے متعلق بعض مسائل پر امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

مرتّب: حافظ خالد محمود خضر

حضرات! یہ غالباً پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ میں ملکی حالات کے ضمن میں تین اہم موضوعات پر اس اجتماعِ جمعہ سے باضابطہ اعلان کے ساتھ خطاب کر رہا ہوں میں تقریباً تینتیس (۳۳) دن ملک سے باہر رہا ہوں اور اس دوران یہ تین اہم چیزیں سامنے آئی ہیں: نمبر (۱) بلدیاتی انتخابات نمبر (۲) ایک بڑی تلخ اور تکلیف دہ بحث جو سردار عبدالقیوم خان صاحب کی اس تقریر کی بنیاد پر پیدا ہوئی ہے جو انہوں نے ناروے میں کی تھی اور نمبر (۳) ایک خاص بونڈز جن کا اجراء واپڈا کی طرف سے ہوا ہے یہ تینوں مسائل ایسے ہیں جن کا میرے نظریات اور میرے فکر سے بھی گہرا تعلق ہے اور ان تینوں ہی کے بعض پہلو ایسے بھی ہیں جن کے ساتھ میرا جذباتی وابستگی کا معاملہ بھی ہے' اس اعتبار سے یقیناً اندیشہ ہے کہ میں توازن قائم نہ رکھ سکوں اور اعتدال کا دامن میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اسی لئے میں جو دعائیں عام طور پر ہر خطاب سے قبل عادتاً کیا کرتا ہوں وہ آج خاص طور پر شعوری اور ارادی طور پر کی ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ ایک طرف میری زبان کی گرہ کو کھول دے اور مجھے بات کو ایسے انداز میں کہنے کی توفیق عطا فرمائے جسے آپ حضرات صحیح طور سے سمجھ سکیں اور دوسری طرف پروردگار ہم سب کو بالعموم اور مجھے بالخصوص اپنی حفاظت اور امان میں رکھے اور شیطانِ لعین اور نفسِ امّارہ کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے اور ہمیں سچ کو سچ ہی کی حیثیت سے دکھائے اور اس کے اتباع کی توفیق اور اعتراف و اعلان کی جرائت عطا فرمائے اور باطل کو باطل ہی دکھائے اور ہمیں توفیق دے کہ اس سے اپنے دامن کو بچا سکیں' آمین۔

سب سے پہلا مسئلہ جو یقیناً قومی سطح پر کافی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے ہماری ملکی سیاست پر کافی دور رس اثرات پڑ سکتے ہیں وہ اس ملک میں ہونے والے حالیہ بلدیاتی انتخابات کا ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ ان انتخابات کا انعقاد اپنی جگہ پر ایک خوش آئند معاملہ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ

مطلق مارشل لاء سے ہم رفتہ رفتہ جمہوریت کی طرف اور ایک نمائندہ حکومت کی طرف تدریجاً پیش قدمی کر رہے ہیں اور اس کے ضمن میں یہ بھی ایک اچھا قدم ہے جو اٹھا ہے...... اور اس ضمن میں میں نے بالکل شروع میں جو بات کہی تھی وہ آپ کو یاد ہوگی کہ اگرچہ مجھے ان ترامیم سے شدید اختلاف تھا جو صدر ضیاء الحق صاحب نے اپنے "اختیارِ خصوصی" کے حوالے سے ۱۹۷۳ء کے دستور میں کر دی تھیں لیکن اس کے باوجود میں نے عرض کیا تھا کہ اس کے تحت بھی اگر انتخابات ہو گئے ہیں اگرچہ غیر جماعتی ہوئے ہیں تب بھی بہرحال یہ اس ملک میں جمہوریت کی طرف بتدریج رجوع کے ضمن میں ایک اچھا قدم ہے اور اس سے یقیناً بہتری کی توقع ہے۔ اور اس کے بعد بھی میں نے اس کا مسلسل اظہار کیا ہے بلکہ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے نوتویں ترمیم کے بل کو بھی خوش آمدید کہا تھا..... کہ بہرحال کسی نہ کسی درجے میں دین اور شریعت کی طرف ایک قدم اس کے ذریعے بھی اٹھ سکتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ کہیں راستے ہی میں اٹک گیا ہے اور اس کے متبادل جو شریعت بل پیش کیا گیا تھا وہ بھی ابھی کسی سرد خانے کے اندر پڑا ہوا ہے اور اس کے منظور ہونے کا بھی بظاہر احوال کہیں کوئی امکان نظر نہیں آرہا۔ بہرحال میرے نزدیک یہ الیکشن کا انعقاد ایک بہت خوش آئند بات ہے۔

موجودہ سیاسی فضا اور اس کا تقاضا

انتخابات کے بعد اس وقت ملک میں جو فضا بن گئی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ مسلم لیگ کے نام سے جو سرکاری پارٹی قائم کی گئی تھی اس کے بارے میں میں نہیں چاہتا کہ آپ کا وقت ضائع کروں۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ عوام میں سے نہیں ابھری بلکہ برگد کے درخت کی ہوائی جڑوں (Adventitious Roots) کی طرح اوپر سے اتری ہے۔ لیکن بہرحال اس وقت ہمارے معاشرے کے جو بھی اجزائے ترکیبی ہیں اور جو بھی Politico-Socio Economic Structure یعنی سیاسی و معاشی ڈھانچہ اس وقت ملک میں قائم ہے...... اس کے اعتبار سے جو بات ہونی چاہئے تھی وہی ہوئی ہے کہ لوگ اس کے گرد جمع ہوئے ہیں' اس وقت اس کے کیمپ میں چہل پہل ہے' رونق ہے۔ یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ اس جماعت نے بھی خواہ اپنی ہیئت ترکیبی اور اپنے نقطۂ آغاز کے اعتبار سے اس کی حیثیت کچھ بھی ہو' یہ محسوس کر لیا ہے کہ جب تک وہ عوامی بہبود کے کوئی کام نہیں کرے گی اب اس ملک میں اس کا آگے چلنا یا برقرار رہنا ممکن نہ ہو گا۔ اور ہم واقعتاً

وس کرتے ہیں کہ بعض میدانوں میں ان کی طرف سے عوامی بہبود کے لئے بھاگ دوڑ اور محنت
وشش ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ بالآخر زود یا بدیر الیکشن جماعتی بنیاد پر ہوں
لے اور پھر یہی عوام کے ووٹ فیصلہ کن ہو جائیں گے۔ لہٰذا اس کے لئے اس جماعت کی طرف
ے بھی عوام کے دلوں کو جیتنے اور ان کا اعتماد حاصل کرنے کی بڑی ہی پختہ کوششیں ہو رہی ہیں۔
رے نزدیک یہ بھی ایک خوش آئند بات ہے اور اس سے اس ملک کے مستقبل کے بارے میں
ے اچھی امید کی صورت سامنے آتی ہے۔

اس فضاء میں یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ عام انتخابات جلد از جلد کرا دیئے جائیں تاکہ اس وقت جو
ا پیدا ہوئی ہے اس سے سرکاری پارٹی کو اس وقت جو بڑی نمایاں کامیابی بعض علاقوں میں
صل ہوئی ہے اندرون سندھ میں بھی اور خاص طور سے پنجاب میں تو اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے
ے لئے عام انتخابات بھی جلد از جلد کرا دیئے جائیں ظاہر بات ہے کہ ایم۔ آر۔ ڈی میں جو
ماعتیں شامل ہیں ان کا تو شروع سے ہی یہ مطالبہ ہے کہ فوری طور پر عام انتخابات کا جماعتی بنیاد
انعقاد ہونا چاہئے اب بعض دوسری جماعتوں نے بھی اس کا مطالبہ کیا ہے۔ آپ کے علم میں
ہے کہ اب جماعت اسلامی کا موقف بھی یہی ہے' چاہے وہ اس کے لئے کوئی تحریک چلانے پر
مادہ نہ ہو کہ اب جماعتی بنیاد پر مڈ ٹرم (Mid - Term) الیکشن ہو جانے چاہئیں اور ان کی
رف سے ۱۹۸۸ء کے بارے میں خاص طور پر یہ بات آئی ہے کہ یہ سال انتخابات کا سال ہونا
اہئے۔ میری ذاتی رائے بھی یہی ہے کہ اب اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ عام انتخابات جس
در جلد ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ اس لئے کہ ایک تو تصویر کا مثبت رخ ہے جو میں نے آپ کے
سامنے رکھا ہے لیکن تصویر کا ایک منفی رخ بھی ہے کہ ان غیر جماعتی انتخابات سے کوئی قومی سوچ
کھنے والے عناصر کو تقویت حاصل نہیں ہوئی اس ضمن میں کراچی اور حیدر آباد کی مثال بہت
مایاں ہے۔ ویسے تو یہ معاملہ کم و بیش ہر جگہ موجود ہے کہ نمائندوں کا چناؤ قومی سوچ' کل
پاکستان فکر اور سوچ کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس میں زیادہ تر ذاتی منفعتیں' ذاتی مصلحتیں اور
اقتدار طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے' یا پھر برادریوں اور لوکل چودھراہٹوں کی کشمکش ہوا کرتی ہے اور
یا پھر جیسا کہ سندھ اور کراچی میں ہوا ہے یعنی لسانی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر لوگوں نے بہت
نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یقیناً یہ ایک تخریبی عمل ہے۔ جو ملک کے مستقبل کے لیے خوش

پاکستان فکر اور سوچ کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ اس میں زیادہ تر ذاتی منفعتیں ' ذاتی مصلحتیں اور اقتدار طلبی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ' یا پھر برادریوں اور لوکل چودھراہٹوں کی کشمکش ہوا کرتی ہے اور یا پھر جیسا کہ سندھ اور کراچی میں ہوا ہے یعنی لسانی اور گروہی عصبیت کی بنیاد پر لوگوں نے بہت نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ یقیناً یہ ایک تخریبی عمل ہے۔ جو ملک کے مستقبل کے لئے خوش آئند نہیں ہے اور جماعتی بنیاد پر عام انتخابات کے انعقاد میں جتنی دیر لگے گی اتنا ہی اس عمل کو تقویت حاصل ہو گی اور اس کی جڑیں اور گہری ہوں گی۔ لہٰذا اس میں حتی الامکان تاخیر نہیں ہونی چاہئے اور جلد از جلد جماعتی بنیادوں پر عام ملکی انتخابات کا انعقاد عمل میں آ جانا چاہئے۔

ان انتخابات کے ضمن میں ایک تیسری بات جو میں عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ جہاں جو لوگ منتخب ہو کر آئے ہیں انہیں بھرپور موقع ملنا چاہئے کہ وہ کام کریں اور اس میں کسی بھی بالاتر سرکاری مشینری کو نہ صوبائی حکومت کی سطح پر اور نہ مرکزی حکومت کی سطح پر کوئی دخل اندازی کرنی چاہئے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں جمہوری روایات کے پروان نہ چڑھنے میں ایک بہت بڑا عمل دخل ان چیزوں کا ہے کہ اگر کسی کے نزدیک کوئی غیر پسندیدہ عنصر کہیں پر کامیاب ہو جاتا ہے تو ہر ممکن طور پر کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا راستہ روکا جائے اور اسے کام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ معاملہ خاص طور پر اگر کراچی اور حیدر آباد میں ہوا تو وہ بڑے خوفناک نتائج کا حامل ہو گا۔ ہمارے سامنے ہندوستان کی تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ وہاں بعض اوقات ایسا ہوا ہے کہ باضابطہ کمیونسٹ پارٹیز' مارکسسٹ پارٹیز نے الیکشن جیت لئے لیکن...... کبھی یہ نہیں ہوا کہ انہیں اقتدار میں آ کر کام کرنے کا موقع دینے میں کوئی بخل سے کام لیا گیا ہو۔ "کیرالہ" میں تو کمیونسٹ حکومت بن گئی تھی۔ ہوتا یہی ہے کہ اس قسم کے لوگ نعروں کے بل پر اقتدار میں آ جاتے ہیں لیکن پھر جب کام کرنے کا موقع آتا ہے تو بات کھلتی ہے کہ کس میں کتنی صلاحیت ہے یا نہیں ہے اور پھر یہ جو حالات معروضی طور پر موجود ہیں ان میں' کتنا کام فی الواقع کیا جا سکتا ہے۔ اور جب کسی جگہ پر بیٹھ کر بالفعل کام کرنے کا موقع آتا ہے تو اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ جذباتی ہنگامہ آرائی سے یا نعروں کے ذریعے سے آنے والے لوگ خود ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کی حقیقت خود ان کے اپنے لوگوں کے سامنے کھل جاتی ہے جنہوں نے انہیں ووٹ دے کر کامیاب کیا ہوتا ہے اور اگر اس کے برعکس روش اختیار کی جائے یعنی انہیں دبایا جائے یا کسی سازشی انداز میں ان کا راستہ روکا جائے تو انہیں ہمدردیاں حاصل ہوتی ہیں۔ پھر اس صورت حال کے جو وسیع تر سطح پر دور رس

نتائج نکلتے ہیں وہ ملک و قوم کے لئے بڑے خوفناک ہوتے ہیں۔ تو ہمیں اس چیز کو سامنے رکھنا چاہئے کہ وہ لوگ کام کریں' آئیں محنت کریں اور درپیش مسائل کو حل کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں۔ اگر وہ کچھ کام کریں گے تو ظاہر بات ہے کہ اس کا فائدہ ملک و قوم کو ہو گا۔

کیا انتخابات کے ذریعے اسلامی نظام کا نفاذ ممکن ہے؟

انتخابات کے بارے میں میرا موقف بارہا آپ کے سامنے آیا ہو گا جو عام طور پر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا' لیکن ذرا سا انہیں ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع مل جائے اور بات ان کے سامنے وضاحت کے ساتھ رکھی جائے تو وہ بالکل دو اور دو چار کی طرح صاف بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک طرف میرا موقف یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام الیکشن کے راستے سے نہیں آ سکتا۔ اس اعتبار سے ہم نے یہ طے کیا ہوا ہے کہ کبھی الیکشن کے میدان کا رخ ہی نہیں کرنا ہے۔ ہماری تنظیم اسلامی کبھی یہ راستہ اختیار نہیں کرے گی۔ دوسری طرف میں انتخابات کے انعقاد کا بھی انتہائی موید ہوں۔ بہت زور کے ساتھ اس بات کا قائل ہوں اور اس کا اعلان کرتا رہا ہوں کہ الیکشن ہوتے رہنے چاہئیں۔ جمہوری فضاء برقرار رہنی چاہئے تو بظاہر اس میں لوگوں کو تضاد نظر آتا ہے حالانکہ کوئی تضاد نہیں ہے۔ ایک سادہ سی مثال سے میں سمجھایا کرتا ہوں کہ دیکھئے دو چیزیں بالکل مختلف ہیں۔ اور ان کے تقاضے بھی یکسر مختلف ہیں۔ ایک مثال سامنے رکھئے کہ ایک ہے کسی شخص کا مسلمان بننا' اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ ایک ہے اس کا زندہ رہنا' اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ زندہ رہنے کے لئے ہر انسان کو غذا' پانی اور ہوا چاہئے۔ ان تینوں میں سے کوئی چیز ختم ہو جائے گی یا منقطع کر دی جائے گی۔ جلد یا بدیر اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ اس عالم مادی میں زندگی سلسلۂ اسباب سے قائم ہے۔ تو یہ تینوں چیزیں اس کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس میں کسی مسلم' ہندو' سکھ' پارسی کی کوئی تمیز اور تفریق نہیں ہے۔ لیکن کسی شخص کو مسلمان بننے کے لئے ایمان کی ضرورت ہے۔ کوئی رتی' ماشہ' تولہ ایمان یہاں ہو گا تو اسی درجے سے اس کے اندر اسلام پیدا ہو گا اور وہ اسلام پر عمل کر سکے گا۔ تو یہ دونوں چیزیں اور ان کے تقاضے مختلف ہیں اور ان میں گنڈمڈ نہیں کرنا چاہئے۔

پاکستان جیسے ملک میں جو تمدنی اعتبار سے ازمنۂ قدیمہ کے اندر نہیں بلکہ دورِ جدید کے ساتھ ہے اس بات کی واقعتہً ضرورت ہے کہ ایک ایسی فضا باقی رہے جس میں لوگوں کو اطمینان ہو کہ ہماری

رائے کو اہمیت حاصل ہے اور ہم پر کوئی اور حکومت نہیں کر رہا ہے۔ اگر کہیں کسی صوبے پر کسی دوسرے صوبے کی حکومت' کسی طبقے پر کسی دوسرے طبقے کی حکومت یا کسی قومیت پر کسی دوسری قومیت کے دباؤ کا احساس ہو تو اس سے بڑے منفی اور بڑے تخریبی جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتائج بڑے خوفناک نکلتے ہیں۔ چنانچہ یہ احساس برقرار رہنا چاہئے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تبدیلیٔ حکومت کا عمل (Process) ایسا ہو جس پر اعتماد ہو کہ یہاں تبدیلی ووٹ سے آتی ہے اور حکومت اور اس کی پالیسیوں کے تبدیل ہونے کا دارومدار لوگوں کی رائے پر ہے۔ اس فضا کا برقرار رہنا اس ملک کے لئے بہت ضروری ہے۔ جو اب ان ملکوں میں شامل ہے جو اس سطح سے مختلف ہو چکے ہیں جہاں بادشاہت یا قبائلی نظام چل رہا ہو یا چل سکتا ہو۔ یہاں میں لفظِ جمہوری جان بوجھ کر استعمال نہیں کرنا چاہتا اس لئے کہ اس کے پھر بہت سے مفہوم ہیں لیکن بہرحال آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان عوامی دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اس عمل میں جتنی بھی رکاوٹیں ڈالی گئی ہیں وہ درحقیقت اس ملک کے لئے بہت تباہ کن ثابت ہوئی ہیں اور اسی کے نتیجے میں ملک دولخت بھی ہوا ہے۔ اور یہ خطرات آئندہ بھی ہیں۔ چنانچہ یہاں انتخابات ہوتے رہنے چاہئیں۔ اور عوام کو یہ محسوس ہونا چاہئے کہ ہمارا معاملا ہمارے ہاتھ میں ہے۔

جہاں تک اسلام کے نفاذ کا تعلق ہے اس کا اس انتخابی عمل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے لئے تو آپ کو عوام کے اندر اور بالخصوص ملک کے پڑھے لکھے' باشعور اور سمجھ دار طبقے (Intelligentsia) میں اس ایمانی کیفیت اور جذبات کو پیدا کرنا ہو گا اور اس احساس کو تقویت دینی ہوگی کہ اجتماعی سطح پر ایک اجتماعی ارادہ (Collective Will) ہمارے معاشرے کے اندر ظہور میں آئے کہ ہمیں مسلمان رہنا ہے' مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ جب تک یہ نہیں ہو گا اس وقت تک اسلام نہیں آسکتا۔ پھر یہ کہ اس کے بعد بھی اسلام لانے کا طریقہ کیا ہو گا؟ تو اس کے لئے ایک انقلابی منہج ہی موثر ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ انتخابات میں تو فیصلہ ووٹوں کی گنتی پر ہوتا ہے۔ ہر شخص کا ایک ووٹ ہے۔ بڑے سے بڑے صاحبِ یقین کا بھی ایک ووٹ ہے اور جو ایمان کی دولت سے تہیٔ محض ہو اس کا بھی ایک ووٹ ہے' فاسق و فاجر کا بھی ایک ووٹ ہے اور متقی اور زاہد کا بھی ایک ووٹ ہے۔ بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی اور عالم کا بھی ایک ووٹ ہے۔ حتیٰ کہ اگر علامہ اقبال بھی زندہ ہوتے تو ان کا بھی ایک ہی ووٹ ہوتا اور ایک بالکل

جاہل جس کو نہ ملکی حالات کا کچھ پتہ ہے اور نہ ہی اسے کسی بھی مسئلے کی کوئی سمجھ اور فہم ہے اس کا بھی ایک ووٹ ہے چنانچہ اسلام کا نفاذ کبھی بھی ووٹ کے ذریعے سے نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے لئے ہمیں انقلابی طریق اختیار کرنا ہو گا جس میں ایک اقلیت اپنے جذبے اور نظریاتی وابستگی کی بنیاد پر مؤثر (Effective) اور فیصلہ کن ہو جاتی ہے۔ اس عمل کے ذریعے سے وہ حق پر ڈٹ جاتی ہے اور پھر انقلاب آتا ہے۔ یہ ایک تفصیلی بحث ہے۔ اس موضوع پر میری پوری کتاب "منہج انقلابِ نبویؐ" کے نام سے منظر عام پر آچکی ہے۔

کراچی اور حیدر آباد کے نئے سیاسی حالات

اس ضمن میں کراچی اور حیدر آباد کے تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ یہ علاقہ دینی قوتوں خاص طور پر جماعت اسلامی کا ایک بہت بڑا سیاسی گڑھ تھا۔ اور یہ عجیب صورت حال ہے کہ یا تو بالکل انتہائی جنوب میں ان کی ایک مستحکم سیاسی حیثیت تھی یعنی کراچی وغیرہ میں یا پھر بالکل شمال میں سوات اور دیر کے علاقہ میں سیاسی سطح پر جماعت اسلامی کی مضبوط حیثیت تھی۔ ان میں سے اب صرف شمال میں ان کی حیثیت مستحکم ہے۔ ان انتخابات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس ملک میں ان کی جو بھی سیاسی بنیاد تھی وہ اب رفتہ رفتہ منہدم ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مسئلہ خاص طور پر ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ قوموں اور تحریکوں کی زندگی میں جو اس قسم کے مواقع آتے ہیں وہ بہت قیمتی ہوتے ہیں اور موقع فراہم کرتے ہیں کہ از سر نو معاملات پر غور کیا جائے کہ یہ ہوا کیا ہے؟ ایک انقلابی اور نظریاتی تحریک کے اثرات کبھی بھی اتنی تیزی سے ختم نہیں ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ مسئلہ کچھ اور ہے یہاں انقلابی اور نظریاتی بنیاد پر نہیں بلکہ کچھ رفاہی کاموں اور کچھ سیاسی نعروں کی بنیاد پر وہ سارا Base فراہم کیا گیا تھا جو اس تیزی کے ساتھ ' Wash out ' ہو گیا ہے ورنہ وہ اگر انقلابی بنیادوں پر ہوتا یا نظریاتی بنیادوں پر ہی ہوتا تو اس کے اندر اتنی تیزی کے ساتھ تبدیلی نہیں آسکتی تھی جس تیزی کے ساتھ اور جتنے نمایاں پیمانہ پر تبدیلی وہاں آئی ہے۔ اس پہلو سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس ملک کے اندر دین کے مستقبل کے بارے میں خلوص اور اخلاص کے ساتھ غور و فکر کرنے والے عناصر اور اس کے لئے کام کرنے والی جماعتوں اور تحریکوں کے لئے یہ ایک اہم لمحۂ فکریہ ہے۔ وہ ذرا خود احتسابی (Self Assessment) کے انداز میں اپنے حالات کا جائزہ لیں۔ اور سوچیں کہ کہیں ہم

سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی ہے پھر اس غلطی کے ازالے کے لئے از سرِ نو کوشش کریں۔

جماعت اسلامی کے لئے دو متبادل راستے

کراچی اور حیدر آباد کا جو معاملہ ہوا ہے اس کے پیش نظر میرے نزدیک جماعت کے لئے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو سیاسی ہے اور اس کے لئے دلائل دیئے جاسکتے ہیں' جیسے کہ اب تک دیئے جاتے رہتے ہیں۔ کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی لکھا ہوا ہے کہ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ چنانچہ یہ اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کے دلائل قرآن مجید میں ان لوگوں کے بھی نقل ہوئے ہیں جن پر عذاب آتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کیا ہے اس میں؟ آتے ہی رہتے ہیں عذاب .... " قَدْ مَسَّ اٰبَائَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ یعنی ہمارے آباؤ اجداد پر بھی کبھی اسی طرح فراخی کے دن آئے تھے' کبھی تنگی کے دن آجاتے تھے' کبھی خوشی کے مواقع آجاتے تھے کبھی غمی کے مواقع آتے تھے۔ ان کا اس سے کیا تعلق ہے کوئی اللہ کی حکمت ہے' اللہ کی طرف سے کوئی تنبیہ ہے یا اس میں ہمارے لئے عذاب کا کوئی پہلو ہے۔ تو یہ چیزیں ہمیشہ سے تھیں۔ اسی طرح اب بھی موقع ہے کہ کہا جائے کہ کوئی بات نہیں۔ ٹھیک ہے۔ سیاسی جنگ ہے۔ اب یہ لوگ آئے ہیں' کام کریں' محنت کریں' کچھ کر کے دکھائیں' ان کے غبارے سے خود بخود ہوا نکل جائے گی' لوگ از خود سوچیں گے اور اگلے الیکشن میں انہیں اپنی رائے تبدیل کرنا پڑے گی۔ ہم از سرِ نو ہمت کر کے' کمر کس کے میدان میں آئیں گے ؏

پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ

کوئی بنیادی تبدیلی لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اندیشہ یہی ہے کہ سوچ یہی ہوگی۔ لیکن اگر وہ اس مسئلہ پر غور کریں اور کچھ سوچ بچار سے کام لیں تو یہ ایک بہت ہی سنہری موقع ہے' جیسا سنہری موقع ۱۹۷۰ء میں آیا تھا۔ اور میری ذاتی اطلاع یہی ہے اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ کم سے کم مولانا مودودی مرحوم اس مرحلے پر اس فیصلے تک پہنچ گئے تھے کہ الیکشن کے ذریعے سے یہاں اسلام نہیں آسکتا۔ لہٰذا ہمیں کوئی متبادل سوچ اور کوئی متبادل راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ لیکن چونکہ وہ علیل تھے' ضعیف تھے' بڑھاپے کی اس سرحد کو پہنچ چکے تھے کہ وہ خود اپنے اس نقطہ نظر کو پوری قوت کے ساتھ Assert نہیں کر سکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس سلسلے میں عملاً کوئی اقدام نہیں کیا۔ لیکن ان کی رائے ۷۰ء کے الیکشن کے بعد یہی تھی۔ اب جماعت کے لئے پھر ایک موقع ہے

اور میں پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ان سے یہ عرض کروں گا کہ وہ جائزہ لیں اور اپنی حکمتِ عملی پر نظر ثانی کریں۔ ایک بڑا کھلا راستہ ہے کہ وہ انتخابی میدان سے قدم پیچھے ہٹالیں اور باعزت پسپائی اختیار کر لیں۔ اور ایک پریشر گروپ کی حیثیت سے صرف اسلام کے لئے اس انداز سے کام کریں کہ ہمیں سیٹیں نہیں چاہئیں' ہمیں اسلام چاہئے' ہمیں کوئی ووٹ نہیں چاہئے' ہم عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ یہاں پر یہ چیزیں اس ملک کے بنیادی نظریہ یعنی اسلام کے منافی ہیں۔ ہم اسلام کے لئے قائم ہونے والے ملک میں یہ سب کچھ نہیں ہونے دیں گے۔ یہ دباؤ وہ ہو گا کہ جو بہت فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

جب جماعت سیٹوں کی کشمکش اور انتخابی تصادم سے بالاتر ہو جائے گی تو مختلف جماعتوں کے اندر جو مخلص عناصر کام کر رہے ہیں انہیں بھی موقع ملے گا کہ وہ سب لوگ سوچیں اور غور کریں۔ اس طرح انہیں بہت بڑی حمایت اس ملک کے اندر حاصل ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ مختلف کیمپوں میں اسلام کے حق میں جو منتشر قوت ہے وہ متحد ہو سکے اور اس پلیٹ فارم پر ایک مشترکہ جدوجہد کی جا سکے' ظاہر بات ہے کہ جب الیکشن کا معاملہ ہوتا ہے تو ایسے تمام عناصر ایک دوسرے کے مدِمقابل ہو جاتے ہیں اور ان کے مابین اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔.. اور پھر جب الیکشن لڑنا ہی ہے تو جب الیکشن نہیں ہو رہے ہوتے تب بھی اعصاب کے اوپر وہی مسلّط ہوتے ہیں۔ ساری پالیسیاں' سارا غور و فکر' ساری گفت و شنید اسی رنگ میں ہوتی ہے اور نگاہ لگی رہتی ہے کہ اس سال ہو سکتا ہے الیکشن ہو جائیں۔ اس سال نہ ہوں تو شاید اگلے سال ہو جائیں۔ ورنہ ۱۹۹۰ء میں تو بہرحال حکومت کہتی ہی ہے کہ ہوں گے۔ اگرچہ پیر پگاڑا صاحب تو کہتے ہی رہتے ہیں کہ ۹۲ء میں یا ۲۰۰۲ء میں۔ واللہ اعلم!..... تو جب تک ایک شعوری' حتمی اور واضح فیصلہ نہیں ہوتا اس وقت تک ہمیں کچھ بنیادی کام بھی کرنا چاہئے' ذرا یہ بھی کر لینا چاہئے۔ لیکن رہے معاملہ وہیں کا وہیں تو اس طرح کی کوئی بھی نیم دلانہ کوشش صورت حال میں کوئی محسوس اور نتیجہ خیز تبدیلی نہیں لا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک دفعہ جی کڑا کر کے یہ کڑوی گولی نگل لی جائے اور اعتراف کر لیا جائے کہ ہم سے خطاء ہوئی ہے ہم نے اس معاشرے سے یہ غلط توقع وابستہ کر رکھی تھی کہ اسلام سے اس کی وابستگی بڑی فیصلہ کن ہے لیکن ہمیں اس نے مایوس کیا ہے۔ بہرحال ہم نے اتنا عرصہ اس میں کام کر کے اور حصہ لے کر دکھا دیا ہے۔ اب اگر معاملہ اس رخ سے نہیں ہوتا ہے تو ہمیں تو اسلام کے لئے جینا اور مرنا ہے اور اس کے لئے جو بھی دوسرا

متبادل راستہ سامنے آتا ہے اس کے لئے ہمیں محنت کرنی ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ حضرات کو شاید یہ بات بری لگے گی لیکن میں پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ دعوت دیتا ہوں اور چونکہ ظاہر بات ہے کہ میرا ایک ماضی کا تعلق جماعتِ اسلامی کے ساتھ ہے تو اگرچہ میں دین کے مستقبل کے ساتھ ایک گہری قلبی' جذباتی' ذہنی اور فکری وابستگی رکھنے والے تمام عناصر سے مخاطب ہوں لیکن اس میں میرا روئے سخن سب سے بڑھ کر جماعت اسلامی کی طرف ہے کہ اسے اس صورت حال سے سبق حاصل کرنا چاہئے اور اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس وقت کو مضبوطی کے ساتھ تھامنا چاہئے اور اپنی پالیسی پر نظرثانی کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہمت دے اور توفیق دے تو ایک بار جرأتِ رندانہ سے کام لیتے ہوئے واضح اعلان کرنا چاہئے کہ ہم اس میدان کے کھلاڑی نہیں ہیں' ہم یہاں کے مقابل نہیں ہیں لڑے جسے لڑنا ہو برادری کی بنیاد پر' پیسے کی بنیاد پر یا کسی اور بنیاد پر ہم تو عام آدمی سے بھی کہتے ہیں کہ وہ اسلام پر کاربند ہو اور جو بھی یہاں بر سرِ اقتدار آجائے گا اس سے بھی مطالبہ ہو گا کہ یہاں اسلام کو نافذ کریں' اسلام کو قائم کریں اور اسی کے حوالے سے ایک انقلابی جدوجہد اتنی 'Broad Based' ہو سکتی ہے کہ پھر وہ فیصلہ کن ہو جائے اور کسی مرحلے پر جا کر کوئی اقدام کا عمل بھی کیا جا سکے' منکرات کو چیلنج کیا جا سکے اور پھر کوئی تبدیلی عملاً اعلیٰ ترین سطح پر اس ملک میں ہو جائے۔ لیکن اس کے بغیر جو کچھ ہو رہا ہے یا اب تک ہوتا رہا ہے اگر اسی نہج پر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی تو کوئی بہتر نتیجہ نکلنے کی امید نہیں ہے۔

سردار عبدالقیوم اور جسٹس جاوید اقبال کا مناقشہ

دوسرا مسئلہ جس کے بارے میں مجھے اظہار خیال کرنا ہے وہ سردار عبدالقیوم خان صاحب کی "ناروے" کی تقریر اور اس پر خاص طور سے لاہور میں شدید ردعمل ہے۔ سردار صاحب کی یہ تقریر ۱۴۔ اگست کے آس پاس کی ہے جب یوم پاکستان کی تقریبات میں شرکت کے لئے سردار صاحب بھی اور جسٹس جاوید اقبال صاحب بھی وہاں گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں دو ایک تقریبات میں ان کا یکجا خطاب بھی ہوا۔ انہی تقریروں میں جو باتیں سامنے آئی ہیں ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے جو اس وقت ملک میں کافی جذباتی مسئلہ بن گیا ہے اور اس کے ضمن میں ہر شخص سوچ رہا

ہے۔ اور میں جب بیرون ملک سے واپس آیا تو آتے ہی یہ مسئلہ میرے سامنے آیا تو میں بھی پریشان ہوا' اس لئے کہ م۔ ش صاحب کی جو دوسری ڈائری تھی بڑی مختصر سی وہ میں نے پڑھی لیکن اس سے کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ میری وطن واپسی سے قبل ان کی ایک تفصیلی ڈائری بھی آ گئی تھی وہ میں نے بعد میں ڈھونڈ کر تلاش کی اور اس کو پڑھا۔ پھر یہ بہت اچھا ہوا کہ "نوائے وقت" نے ان تقاریر کے متن بھی شائع کر دیئے تاکہ پورے کا پورا معاملہ سامنے رہے۔ اگرچہ سردار صاحب کا یہ کہنا ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی کی گئی ہے۔ اور جو فلم ادارہ نوائے وقت کے زیر اہتمام دکھائی گئی ہے اس میں بھی کوئی تبدیلیاں کی گئی ہیں یہ سردار صاحب کی طرف سے بڑا تشویشناک الزام (Serious Charge) ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ تو کسی عدالتی کارروائی کے نتیجے میں ہی معلوم ہو سکتا ہے کہ کیا واقعی ان ویڈیوز میں کوئی دخل اندازی کی گئی ہے یا نہیں اس کا امکان تو موجود ہے لیکن فی الواقع ایسا ہوا ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ نہ آپ کر سکتے ہیں نہ میں کر سکتا ہوں۔

جذباتیت سے گریز ضروری ہے

خود سردار صاحب کی طرف سے اپنی اور جسٹس جاوید اقبال صاحب کی تقاریر کا جو متن شائع ہوا ہے اور جو چیزیں "ادارہ نوائے وقت" کی طرف سے سامنے آئی ہیں اور پھر سردار عبدالقیوم صاحب کی طرف سے مزید وضاحتیں سامنے آئی ہیں ان میں جو چیزیں قدرِ مشترک ہیں' ظاہر ہے کہ وہ کسی بھی اختلاف سے بالاتر ہیں اور ان میں کسی بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے چنانچہ اس پورے مسئلے کو دیکھ کر میری جو بھی رائے بنی ہے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرتا ہوں۔ اس میں میں پھر اللہ تعالیٰ سے پناہ کا طالب ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس میں میری جذباتی وابستگی کو اثر انداز نہ ہونے دے اور میں صحیح صحیح بات کہہ سکوں جیسے کہ میں نے آج خطاب کے آغاز میں بھی خصوصی طور پر دعائیں کی ہیں۔ علاوہ ازیں سورۃ النساء میں بھی فرمایا گیا کہ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ" یعنی اے اہلِ ایمان! عدل اور انصاف کو قوت کے ساتھ لے کر کھڑے ہونے والے اور نافذ کرنے والے بن جاؤ اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ چاہے وہ اللہ کے حق میں گواہی دینا یا حق کی گواہی دینا یا عدل و انصاف کی علمبرداری'...... "وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِكُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ" ......"خواہ

وہ تمہاری ذات کے خلاف جارہی ہو' خواہ تمہارے والدین کے یا اور دوسرے رشتہ داروں کے خلاف"..... یہ بہت اہم بات ہے اور سورۃ المائدہ جو اس کا جوڑا ہے اس میں پھر یہ مضمون آ رہا ہے۔ جیسا کہ میں نے کئی مرتبہ عرض کیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم سے کم دو جگہ ضرور ہوں گے اور اس میں ترتیب عکسی ہوگی اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں فرمایا۔ "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ" ..... یعنی تم اللہ کے لئے کھڑے ہو جاؤ پوری قوت کے ساتھ اور عدل و انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ " وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط" یعنی ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی' اور ذاتی عناد کی وجہ سے تم عدل سے کام نہ لو' جانبداری اختیار کر لو اور عدل کو چھپالو اور حق و انصاف کی گواہی کا اظہار نہ کرو ...... "اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی " دشمنی اور محبت سے بالاتر ہو کر عدل و انصاف کا قول ہو۔ یہی تقویٰ سے قریب تر ہے ..." وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط" اور تقویٰ کی روش اختیار کئے رکھو..... اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔ پھر یہی مضمون سورۃ الانعام میں آیا۔ مصحف میں یہ تین سورتیں اسی ترتیب سے آتی ہیں.... سورۃ النساء' سورۃ المائدۃ' سورۃ الانعام۔ جامع ترین انداز میں فرمایا جس میں سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دونوں کی آیات کا ایک ایک حصہ جمع ہو گیا ہے۔ فرمایا "وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی" "یعنی اور جب بھی تم کسی مسئلے میں زبان کھولو تو عدل سے کام لو' انصاف کرو' خواہ وہ بات تمہارے قرابت داروں کے خلاف جارہی ہو۔ تو اس وقت میں ان ہدایات کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ عرض کر رہا ہوں۔

سردار صاحب کی دو بڑی غلطیاں

میں نے پوری تقاریر حرف بہ حرف پڑھی ہیں جو کچھ کہ نوائے وقت میں چھپا ہے اس کا بھی ایک ایک حرف پڑھا ہے اور پھر جو متن سردار صاحب کی طرف سے تقسیم کئے گئے تھے اس کا بھی ایک ایک حرف پڑھا ہے۔ اب میں ان سب کو لفظاً زیر بحث نہیں لانا چاہتا' نہ ہی اس کا کوئی موقع ہے' لیکن جو میرا نتیجہ ہے وہ میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں میرے نزدیک سردار صاحب سے دو بہت بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک جسے میں غلطیِ اوّل کہہ رہا ہوں اور خاص اس اعتبار

ے کہہ رہا ہوں کہ سردار عبدالقیوم صاحب مجاہدِ اوّل ہیں اور ان کی اس حیثیت پر اگر کسی نے
طعن کیا ہے تو میرے نزدیک زیادتی کی ہے۔ جہادِ کشمیر کے آغاز میں پہلی گولی چلانے کی حقیقت
مجھے معلوم نہیں۔ لیکن اگر واقعتاً یہ سعادت ان کے حصے میں آئی ہے تو یہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے
نہیں عطا کی ہے اور اب اختلاف کے پیش نظر اس پر بھی خواہ مخواہ زبان طعن دراز کرنا' یہ روش
یرے نزدیک انسان کے عدل وانصاف سے دور ہو جانے کا مظہر ہے۔

اس معاملے میں مجاہد اول کی میری دانست میں غلطی اول یہ ہے کہ انہوں نے خواہ مخواہ' بغیر
ی ضرورت کے علامہ اقبال کی ذات اور ان کی شخصیت کو اس بحث کے اندر گھسیٹ لیا حالانکہ
عاملہ تو جسٹس جاوید اقبال صاحب کا تھا اور انہوں نے کوئی بات علامہ اقبال کے کسی حوالے سے
ہیں کی تھی اب محض یہ بات کہ وہ پسرِ اقبال ہیں اس لئے ان کی بات کو اقبال کی طرف منسوب کر
یا جائے یا اس کے حوالے سے بات لازماً علامہ اقبال تک پہنچا دی جائے' اس کی قطعاً کوئی
رورت نہیں تھی! میں ان کی نیت پر حملہ نہیں کرتا' ان کا حمیتِ دینی اور سنتِ رسولؐ کی اتباع کا
ذبہ یقیناً بہت قیمتی ہے لیکن جیسا کہ میں نے خود دو مرتبہ آج اپنی گفتگو میں کہا ہے کہ جذبات ہی
ں اس کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے کہ آدمی جذبات کی رو میں بہہ کر کسی غلط رخ پر چل نکلے۔
نانچہ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انہوں نے خواہ مخواہ جذبات میں آکر ہمالیہ جیسی بڑی غلطی کا
تکاب کیا ہے۔ اس معاملے میں وہ جسٹس جاوید اقبال صاحب کے نظریات پر جتنی چاہتے ڈٹ
ر تنقید کرتے برملا اور علی رؤس الاشہاد کرتے۔ جاوید اقبال صاحب ان کے سامنے موجود تھے
ر اگر بالفرض کسی تقریر میں موجود نہ بھی ہوں تو ناروے میں بہرحال موجود تھے' ان تک بالواسطہ
ت پہنچ سکتی تھی۔ انہوں نے غالباً قائداعظم کی ۱۹۴۷ء کی تقریر کا حوالہ تو دیا بھی تھا لیکن علامہ
بال کا تو کوئی حوالہ نہیں دیا انہوں نے جو کہا وہ ان کا اپنا فکر اور اپنی سوچ ہے۔ اس میں بہرحال
امعین کے درجے میں ایک بات ہو سکتی ہے کہ وہ انہیں جسٹس جاوید کی حیثیت سے نہ دیکھ رہے
وں بلکہ پسرِ اقبال کی حیثیت سے دیکھ رہے ہوں لیکن اس کی وجہ سے یہ ضروری نہیں تھا کہ سردار
احب خواہ مخواہ علامہ اقبال کی ذات یا ان کی شاعری کو وہاں زیر بحث لے آتے اور اس میں پھر
ییناً توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ مرزا محمد منور صاحب نے جو
ن اشعار کہے ہیں اس کا کم سے کم پہلا مصرعہ تو صد فیصد درست ہے۔

ع "تھا ناروے میں آپ کا اسلوب ناروا۔"

یہ یقیناً ان کی دوسری بڑی غلطی ہے۔ جس انداز میں انہوں نے گفتگو کی ہے وہ فی الواقع ناروا تھا۔ گویا کہ وہ خود کسی نہایت بلند سطح (High Pedastal) پر کھڑے گفتگو کر رہے ہیں اور علامہ اقبال کی شخصیت تو ان کی نگاہوں میں بہت نیچے ہے۔ پھر ان کے عدم توازن کا یہ پہلو بھی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اقبال کی شاعری کو قرآن سے جا ملایا۔ اگر واقعتہً صغریٰ کبریٰ جوڑ لیا جائے کہ کچھ لوگ اس وجہ سے علامہ اقبال کے کلام سے صحیح تاثر نہیں لے رہے اور اس کی تاثیر ظاہر نہیں ہو رہی کہ قرآن مجید سے بھی بعض لوگ غلط تاثر اخذ کر لیتے ہیں اور اپنے بارے میں خود قرآن نے کہا ہے کہ "یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِیْ بِهٖ كَثِيْرًا" اس لئے میں رد کرتا ہوں کہ لوگ اقبال کا کلام نہ پڑھیں اس سے تو منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پھر قرآن کو بھی نہیں پڑھنا چاہئے مبادا کہ اسے پڑھ کر کوئی گمراہ ہو جائے۔ یہ ان کا وہ عدم توازن ہے اور جذبات کی رو میں بہہ کر انہوں نے جس انداز میں گفتگو کی ہے۔ اس میں یقیناً توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اور پھر ہمیں تو حضورؐ کی تلقین و تعلیم یہ ہے کہ "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ" یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ اپنے بزرگوں کو معبود بنالیں اور انہیں ہر تنقید سے بالاتر سمجھیں ان پر تنقید کرنا کوئی حرام نہیں ہے، لیکن "اُذْكُرُوْا مَوْتَاكُمْ بِالْخَيْرِ" کا اصول بالعموم یہ ہو گا کہ عام طور پر ان کا ذکر خیر اور بھلائی سے ہونا چاہئے۔ بلکہ اس حدیث کے اگلے ٹکڑے میں تو اس نوعیت کے الفاظ آئے ہیں۔ فَاِنَّهُمْ قَدْ بَلَغُوْا اِلٰى مَا عَمِلُوْا (او کما قال صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی انہوں نے جو عمل کیا تھا اس تک وہ پہنچ چکے۔ اب تم خواہ مخواہ ان کے بارے میں زبان طعن دراز کرو تو اس کا کیا حاصل ہے؟ "تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝" ...... (ترجمہ) "وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کو ان کے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم تمہارے اعمال کا اور جو عمل وہ کرتے تھے ان کی پرسش تم سے نہیں ہو گی۔"

اسلاف سے اختلاف میں احتیاط ملحوظ رہے!

علامہ اقبال سے بعض معاملات میں میں بھی اختلاف رائے کرتا ہوں اور انہی اجتماعات جمعہ میں نے بعض پہلوؤں سے اس کا اظہار بھی کیا ہے لیکن ادب و احترام کے ساتھ اور ان کے مقام اور مرتبے کو سامنے رکھتے ہوئے اسی طرح کسی کو صحابہ کرامؓ سے بھی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن

بہر حال جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ہمارا اہلِ سنّت کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کی نیتوں میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ ان کے معاملے میں "اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْل" کا اصول سامنے رہے گا۔ صحابیؓ سے بھی اجتہادی غلطی ہو سکتی تھی لیکن اسلاف کا ذکر جب بھی ہو خیر کے ساتھ ہو کسی معاملے میں اختلافِ رائے کا اظہار ناگزیر ہو جائے تو اس کا اسلوب نہایت ہی مودب ہونا چاہئے اور ان کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات ہونی چاہئے۔ تو اس پہلو سے سردار صاحب کی تقریر یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ اس میں اس طرح کے جملے بھی ہیں اقبال کے حلقے سے یا اقبال کے پڑھنے پڑھانے والے یا اقبال کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لینے والے کسی ایک شخص کو بھی میں نے نہیں دیکھا کہ وہ دین کے اوپر عمل پیرا ہو اور یہ کہ علامہ اقبال کے کلام سے تاثیر سلب کر لی گئی ہے اور یہ کہ اقبال نے بدعملی کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ اب دیکھئے بدعملی کا لفظ یہاں انتہائی غیر مناسب ہے۔ اگر کہیں کچھ کہنا بھی ہو تو کم عملی یا کم کوشی بھی کہا جا سکتا ہے جیسے اقبال نے لفظ استعمال کیا کہ ؎

نو مید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بےذوق نہیں راہی

ذرا اور اس سے بھی زیادہ سخت بےعملی کا لفظ بھی کوئی انسان لے آئے۔ لیکن بدعملی کا لفظ میرے نزدیک زیادتی ہے۔

پھر اس کے بعد ایک سیدھا سا راستہ سردار صاحب کے لئے کھلا ہوا تھا۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اس راستہ کو اختیار نہیں کیا یعنی ایک چھوٹے سے بیان میں معذرت ہو جاتی۔ اور اس میں بھی وہ پورا الزام جسٹس جاوید اقبال صاحب پر رکھ سکتے تھے کہ انہوں نے ایسی بے سروپا اور اس قدر غلط باتیں کیں کہ میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ اور اپنی حیثیتِ دینی، نظریۂ پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری اور سنّتِ نبویؐ اور اتباعِ نبویؐ کی جو اہمیت میری نگاہ میں ہے اس کے پیشِ نظر میں توازن قائم نہ رکھ سکا اور کچھ ناروا اور نازیبا الفاظ میری زبان سے نکل گئے جس پر میں معذرت خواہ ہوں۔ اگر وہ یہ الفاظ کہہ دیتے اور اسی پر اکتفاء کرتے تو سارا مسئلہ ختم ہو جاتا اور بات آگے نہ بڑھتی اور اب بھی ایک حوالے سے میں نے کوشش کی تھی کہ انہیں یہ پیغام پہنچا دوں۔

میرے نزدیک انہوں نے اہلِ لاہور یا پورے ملک کے سامنے اپنے موقف کے اظہار کا طریقہ بھی غلط اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک اس وقت جو صورت حال ہے اس کے اعتبار سے "جنگ

فورم" کو اس کا مقام بنانا حکمت کے خلاف ہے وہ صاحب حیثیت ہیں' آزاد کشمیر کے صدر ہیں
اور یہاں بھی ان کی نمایاں سیاسی حیثیت ہے وہ کسی ہال میں اہتمام کر کے لوگوں کو وہاں بلا کر کھلم
کھلا اپنی بات ان کے سامنے رکھتے اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتے۔ میں نے خود جنگ
فورم کے اس اجلاس میں جانے کے لئے پاس حاصل کئے تھے تاکہ میں خود براہ راست سنوں اور
چونکہ میں اعلان بھی کر چکا تھا کہ مجھے جمعہ کے اس اجتماع میں اس کے متعلق گفتگو کرنی ہے لیکن
کسی ذریعے سے اڑتی سی یہ بھنک میرے کان میں پڑی کہ جنگ والے مجھے اپنے پینل میں رکھنا
چاہتے ہیں اور مجھے اپنے بعض سابقہ تجربات کی بناء پر یہ معلوم تھا کہ ایسے مواقع پر آدمی اپنی بات
پوری طرح سے کہہ نہیں سکتا اور اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ویسے میری طبیعت بھی ٹھیک
نہیں تھی میں طویل سفر کر کے آیا تھا چنانچہ میں وہاں نہیں گیا۔ اگرچہ یہ بات وہاں غلط بیان کی
گئی ہے کہ مجھے دعوت دی گئی تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہاں اس کی وضاحت کر دوں۔ اگر مجھے
باضابطہ دعوت ہوتی تو میں باضابطہ معذرت کرتا یا وہاں حاضر ہو جاتا۔ لیکن مجھے کوئی باضابطہ دعوت
اس پینل میں شرکت کی نہیں تھی۔ البتہ میرا اپنا ارادہ تھا کہ میں خود جا کر ساری بات سنوں تاکہ
میں اس کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکوں۔ بہرحال میری رائے میں سردار صاحب کو اظہار
رائے کے لئے اپنے طور پر کوئی اور ذریعہ اختیار کرنا چاہئے تھا۔

پھر یہ کہ انہوں نے جنگ فورم میں کوئی ڈھائی تین گھنٹے کی تقریر کی ہے اس کے بعد سوال
جواب بھی ہوئے لیکن اس کا ابھی ایک لفظ بھی چھپا نہیں ہے' جب چھپے گا تو سامنے آئے گا کہ
سوال جواب ہوئے۔ لیکن یہ سارا کھکھیڑ مول لینے سے معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھ رہا
ہے۔ اس کے بجائے بہتر شکل وہی تھی جو میں نے ایک ذریعے سے ایک درخواست کی شکل میں ان
تک پہنچائی بھی تھی کہ آپ ایک مختصر سا بیان دے کر اس معاملہ کو ختم کیجئے اور بسا اوقات ایسا ہوتا
ہے کہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ...... کی شکل بنتی چلی جاتی ہے۔ اور معاملات الجھتے چلے جاتے ہیں
اور اس میں لوگوں کے لئے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال انہوں نے جو بھی مناسب سمجھا
ہے کیا ہے مگر

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔

اپنی پالیسیوں کے بارے میں وہ خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن اس ضمن میں جو میری رائے
وہ میں نے عرض کر دی۔

اپنی پالیسیوں کے بارے میں وہ خود ہی بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن اس ضمن میں جو میری رائے ہے وہ میں نے عرض کر دی ہے کہ یقیناً ان سے یہ دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ایک تو علامہ اقبال کے بارے میں بلاوجہ اور بلاضرورت لب کشائی کرنے کی اور دوسری ان کے متعلق ناروا اسلوب اختیار کرنے کی۔

اقبال - عصرِ حاضر کا ترجمان القرآن

میں یہاں اقبال کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بھی عرض کر دوں اگرچہ آپ حضرات اس سے بخوبی واقف ہیں۔ میری نگاہ میں علامہ اقبال کا مقام بہت بلند ہے اگرچہ میں انہیں نہ تو کوئی ولی اللہ سمجھتا ہوں' نہ ہی اپنے لئے اسوہ اور واجب التقلید اور واجب الاتباع لیکن فکر کے اعتبار سے میرے نزدیک اس عہد حاضر میں ان سے زیادہ قرآن کی صحیح ترجمانی کسی شخص نے نہیں کی۔ میں انہیں اس دور کا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن کے فکر اور قرآن کی حکمت کا شارح اور ترجمان اور وہ بھی اس دور جدید کا۔ اس اعتبار سے کہ اس دور کے علمی مسائل' فلسفیانہ مغالطے اور تمدنی پیچیدگیاں............ یہ اس درجے گھمبیر معاملات ہیں کہ ہر شخص کی سمجھ میں آنے والے نہیں ہیں انہیں وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کی عمران کے اندر بیتی ہو۔ جیسے کہ وہ خود کہتے ہیں ؎ "کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل"

یعنی مجھے اس تہذیبِ حاضر اور تمدنِ نو' فلسفۂ جدیدہ اور نظریاتِ دورِ حاضر کی آگ میں اللہ نے اسی طرح ڈالا ہے جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آتشِ نمرود میں ڈالا تھا۔ اور اقبال اس آگ سے کندن بن کر نکلے ہیں۔ پھر انہوں نے جس اعتماد' وثوق اور گہرے یقین کے ساتھ اسلام کے مؤقف کا دفاع کیا ہے بلکہ صرف دفاع ہی نہیں کیا جارحانہ انداز میں فلسفۂ مغرب پر تنقید کر کے فکر و فلسفہ اور نظریاتی سطح پر اسلام کے لئے مدافعانہ کے بجائے آگے بڑھنے والی ایک پوزیشن فراہم کی ہے۔ یہ کوئی عام کام نہیں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو انہوں نے کیا ہے۔

یہ چار عناصر ہوں تو . . .

اقبال کے مقام سے آگاہی کے لئے پہلے چار چیزیں نوٹ کر لیجئے! اگر کسی شخص میں یہ چاروں

چیزیں جمع ہو جائیں تو وہ تو اس عہد حاضر کا امام بن جائے گا۔ اور امام مہدی ہی شاید وہ شخص ہوں جن میں یہ چاروں چیزیں جمع ہوں گی۔ اس وقت تو ان چار میں سے ایک بھی اگر کسی شخص میں مل جائے تو وہ ہمارے لئے بڑا قابل قدر اور لائق محبت ہے۔ لیکن اس کے بارے میں یہ طرزِ عمل بھی قطعاً درست نہیں کہ بقیہ تین چیزوں کو بھی خواہ مخواہ اس کی ذات میں فرض کر لیا جائے۔ محبت و عقیدت کے غلو میں آنکھیں بند کر لی جائیں اور ان تین چیزوں کے فقدان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن اگر ایک چیز بھی موجود ہے تو ماننا چاہئے کہ اس شخص کی ایک عظمت اور ایک مقام و مرتبہ ہے اور اس پہلو سے اگر اس نے امت کو کوئی فائدہ پہنچایا ہے تو اس کے لئے زیرِ بارِ احسان ہونے کی کیفیت ہونی چاہئے۔

یہ چار چیزیں گن لیجئے۔ یہ ہیں فکرؔ، ذکرؔ، علمؔ اور عملؔ۔ ذکر و فکر کو تو علامہ اقبال نے بھی جمع کیا اور ان سے پہلے مولانا رومؒ نے بھی فرمایا ؎

این قدر گفتیم باقی فکر کُن
فکر گر جامد بود رَو ذکر کُن!

اتنا کچھ ہم نے تمہیں سمجھا دیا باقی اب فکر کرو، سوچ و بچار سے کام لو اور اگر فکر جامد ہو جائے تو جاؤ پھر ذکر کرو۔ ؎

ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشیدِ این افسردہ ساز

جب فکر جامد ہو جاتی ہے اور اسے آگے راستہ نہیں ملتا تو ذکر سے ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جیسے کہ سورج طلوع ہوتا ہے تو ہر چیز کے اندر ایک حرکت و برکت اور چہل پہل نظر آنے لگتی ہے۔ علامہ اقبال بھی کہتے ہیں کہ ذکر و فکر کے اختلاط سے فقرِ قرآنی وجود میں آتا ہے ؎

جُز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است

اور ؎

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر

اور یہ دونوں عاشقِ قرآن بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی۔ مولانا روم کے بارے میں بھی کہا گیا

ہے کہ ؎

مثنویٔ مولویٔ معنوی　　　ہست قرآں در زبانِ پہلوی

ر اقبال نے تو خود بھی کہا ہے کہ ع　گوہرِ دریائے قرآں سُفتہ ام

ہی میں نے قرآن مجید کے دریا میں سے موتی چن چن کر پرو دیئے ہیں۔ اور چن دیئے ہیں لوگوں کے سامنے کہ ان کے حسن و جمال سے مسرور اور بہرہ اندوز ہوں۔ تو دونوں کا کمال یہی ہے۔ س لئے کہ یہی چیز قرآن کہہ رہا ہے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ...... یعنی یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں ایک دوامِ ذکر کہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے، حال میں اللہ کی یاد اور دوسرے فکر۔ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر۔ ہماری بدقسمتی ہے اختلاطِ ذکر و فکر کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ کہیں فکر ہے تو ذکر کی لذت سے سرے سے آشنائی ہی یں ہے اور کہیں ذکر ہو رہا ہے تو انہوں نے فکر کا دائرہ خالی چھوڑ دیا ہے۔ اِلَّا ماشاءاللہ۔

اسی طرح ایک ہے علم اور ایک ہے عمل یعنی علمِ صحیح اور پھر عملِ صحیح۔ ہونا تو چاہئے کہ یہ چاروں ں، علم اور عمل بھی ہو اور ذکر اور فکر بھی ہو۔ میں پھر عرض کر رہا ہوں کہ جس میں یہ چار چیزیں ع ہو جائیں گی وہ امامِ وقت ہو گا۔ ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

ن جب تک وہ شکل نہیں ہو رہی ہے تو اگر اللہ نے کسی کو فکرِ صحیح یا علمِ صحیح دیا ہے تو اسے غنیمت ئے! اب علم اور فکر میں بھی فرق ہے۔ ہمارے علماءِ کرام علم کے خزانے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ں کہ وہ علم کے ڈیمز (Dams) ہیں۔ ان کے ہاں بڑا علم ہے جیسے ڈیمز (Dams) میں ہزاروں فٹ ر پانی کھڑا رہتا ہے۔ لیکن اسے ہماری بدقسمتی کہہ لیجئے کہ یہاں سے استفادے کے لئے راستے ر واسطے (Channels) استوار نہیں ہوئے۔

ر اقبال کی ہمہ گیریت

علامہ اقبال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ فکر کی بہت بلند سطح پر ہیں۔ میں ان کے فکر کا 'اس کی صحت'

جامعیت اور ہمہ گیریت تمام پہلوؤں سے قدر دان ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اپنا دل نکال کر اپنے چھوٹے سے کتابچے "علامہ اقبال اور ہم" میں رکھ دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں انہیں کوئی مفتیِ اعظم مانتا ہوں۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ وہ اللہ کا بندہ خود اس بارے میں اتنا محتاط تھا کہ اس نے کبھی کسی معاملے میں فتویٰ نہیں دیا۔ انہیں انتہائی شدت کے ساتھ احساس تھا کہ شریعتِ اسلامی کی تدوینِ نو ہونی چاہئے اور جو چیزیں ان کے ذہن پر آخری وقت تک مسلّط رہی ہیں ان میں سے ایک چیز یہ بھی تھی لیکن یہ ایک معلوم و معروف حقیقت ہے کہ انہوں نے یہ کام خود یکّہ و تنہا کرنے کی ہمت نہیں کی' اس لئے کہ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ یہ کام تو وہ شخص کر سکتا ہے جس کی پوری زندگی حدیث نبویؐ کے پڑھنے پڑھانے' آئمہ دین اور فقہاء کے استدلات پر تفکر اور حدیث و فقہ اور اصول کی عظیم مجلدات کی عرق ریزی کے اندر گزری ہو صرف قرآن مجید کی گہرائی میں غوطہ زنی وہاں کفایت نہیں کرے گی۔ اسی لئے انہوں نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو متعدد خطوط لکھے۔ مولاناؒ بعض اسباب کی بنا پر دارالعلوم دیو بند چھوڑ کر جا رہے تھے' چنانچہ علامہ اقبال نے یہ موقع غنیمت سمجھا۔ شاید اس سے پہلے بھی کچھ خطوط لکھے ہوں لیکن اس موقع پر تو انہوں نے مولانا کی خوشامد تک کی۔ اور یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے کہ اپنے اس مقام و مرتبہ کے باوجود جس پر انہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ہی میں فائز کر دیا تھا' اس وقت مولانا سے درخواست کی کہ آپ ڈابھیل جانے کے بجائے لاہور آ جائیے ۔ فقہِ اسلامی اور قانونِ اسلامی کی تدوینِ نو کے ضمن میں میں نے جدید نظریات کا مطالعہ کیا ہے' میں بار ایٹ لاء ہوں' فلسفہ قانون سے واقف ہوں اور آپ نے شریعت کی وادیوں کے اندر پوری عمر بسر کی ہے۔ ہم دونوں جمع ہو جائیں تو یہ کام ہو جائے گا۔ لیکن جب وہ نہیں آ سکے تو علامہ نے یہ کام نہیں کیا۔ یہ ضروری ہے کہ انسان کو اپنی حدودِ عمل (Limitations) کا بھی علم ہو کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے' کیا نہیں کر سکتا!۔ وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے! کسی عظیم شخصیت کے لئے ان تمام چیزوں کا جان لینا بہت ضروری ہے ورنہ اگر کسی ایک پہلو سے کوئی بہت عظمت عطا ہو گئی ہو اور وہ دوسرے پہلو سے بھی یہی سمجھے کہ میں اسی مقام و مرتبہ اور اسی درجے پر پہنچ گیا ہوں تو وہ ایک پہلو جس میں اُسے مقام حاصل ہوا ہے اس کی افادیت بھی ختم ہو جائے گی۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے...

جہاں تک اتباعِ شریعت کی کمی ہے تو آخر کون شخص ہے جو اس سے واقف نہیں ہے۔ کوئی شخص یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ نماز نہیں پڑھتے تھے لیکن یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مسجد میں جا کر لوگوں کے ساتھ نماز با جماعت ادا کرنا ان کے معمولات میں نہیں تھا۔ اسی طرح انہوں نے آخری وقت تک داڑھی نہیں رکھی۔ اس پر اگر کسی کو افسوس یا رنج ہے تو وہ اس کو اپنی جگہ پر رکھے۔ ان کی اپنی زندگی میں یہ باتیں ہوتی تھیں اور ہم عصر لوگ ان کے منہ پر یہ تنقیدیں کرتے تھے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس میں بھی ان کی عظمت کا پہلو ہے کہ اس کا کبھی برا نہیں منایا۔ انہوں نے خود بھی کہا کہ ۔

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اب چاہے یہ بات ایک لطیفہ یا مزاحیہ انداز میں کہی گئی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ 'بانگِ درا' کی اس آخری نظم کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اسے ظریفانہ کہا جائے۔ اسے نہ معلوم کیوں 'ظریفانہ کلام' میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ تو بالکل اکبرالٰہ آبادی کا سا انداز ہے کہ عارفانہ خیالات و جذبات کو بڑے سہل اور عام فہم انداز میں پیش کر دینا۔ اس میں جو کمال اکبرالٰہ آبادی کو حاصل تھا اس کی ایک جھلک آپ کو یہاں ملتی ہے۔ اس لئے کہ جب وہ یہ کہتے ہیں ۔

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا

اب یہ کوئی ظریفانہ کلام ہے؟ اس میں تو وہ ایک عظیم حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ اور پھر ان کا وہ شعر ۔

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذّت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا!

حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان کی کاوشوں میں اس کا خونِ جگر شامل نہیں ہوتا وہ نتیجہ خیز نہیں ہوتیں۔ ان اشعار میں حقائق و معارف کا بڑی اعلیٰ و ارفع سطح پر بیان ہے۔

اقبال کے اپنی کم عملی یا بے عملی کے اعتراف کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی روایت ہے کہ مولانا محمد علی جوہرؒ نے علامہ اقبالؒ سے اُن کے منہ پر کچھ بڑا ہی تلخ سا جملہ کہا تھا وہ جملہ تو میں یہاں پر بیان نہیں کرنا چاہتا' یہ بزرگوں کی باتیں ہیں اور علامہ اقبال نے بھی اس کو ایک بزرگ کی طرف سے ایک بات سمجھ کر بہت ہی متانت کے ساتھ لیکن بڑے ہی لطیف پیرایۂ میں ٹال دیا کہ مولانا اگر خود قوّال کو ہی حال آجائے تو وہ قوالی کیسے کرے گا؟ یہ اعترافِ حقیقتِ اقبال کی عظمت ہے اور اس سے ان کا مقام کسی درجے میں کم نہیں ہوتا' اس لئے کہ دورِ حاضر کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ایمان کے ابدی حقائق اور اسلامی نظامِ حیات خصوصاً اس کے اجتماعی پہلوؤں کو انہوں نے جس اعتماد' جس صحت اور جس وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے' میرے نزدیک اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ہے۔ اگرچہ اس میدان کی بعض دوسری شخصیتیں بھی ہیں لیکن ان کی حیثیت ان کے خوشہ چین کی ہے اگر کوئی شخص اقبال سے اس طور پر استفادہ کرے کہ وہاں سے کوئی نکتہ لے اور پھر وضاحت و تفصیل کے ساتھ اور عام فہم انداز میں اسے بیان کرے تو یقیناً اس کے افادہ کا حلقہ وسیع ہو جائے گا اور یہ خدمت بھی یقیناً امّت کے اوپر ایک احسان کے زمرے میں آئے گی۔ بعض حضرات نے اسلام کے سیاسی نظام کے بارے میں وہیں سے اصول مستعار لے کر کافی بلند فکر پیش کیا ہے اور بڑے صحیح انداز میں بات کی ہے لیکن اسلام کے معاشی نظام کے بارے میں ان کی سوچ بہت ہی رجعت پسندانہ ہے۔ اس پہلو سے وہ نہ تو اسلام کی تعلیم ہی کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی انہیں اس دور کے تقاضوں کا کوئی شعور ہی ہو سکا ہے۔

جسٹس جاوید اقبال صاحب سے

علامہ اقبال کے بارے میں آپ حضرات کے سامنے اپنے احساسات بیان کرنے کے بعد اب میں چند باتیں جسٹس جاوید اقبال صاحب کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ان کی دونوں تقریروں میں وہاں جو خیالات ظاہر ہوئے ہیں اگر وہ ان کے اپنے خیالات اور اپنے نظریات ہیں اور وہ واقعتاً ان کا پرچار کرنا چاہتے ہیں تو انہیں عدالتِ عظمیٰ کے بلند منصب کو خیرباد کہہ کر میدان میں آنا چاہئے انہیں چاہئے کہ وہ ہمہ تن اسی کام میں لگیں اور ان کی اپنی دیانتاً جو رائے ہے اسے پیش کریں لیکن اپنی موجودہ حیثیت سے یہ فائدہ نہ اٹھائیں۔ میں آج سوچ رہا تھا کہ ۱۹۵۳ء کی 'تحریکِ ختمِ نبوّت' پر جو کورٹ آف انکوائری (Court of Inquiry) قائم ہوئی تھی اس

میں جسٹس منیر صاحب کا کردار اور رویہ سخت قابلِ اعتراض تھا۔ وہ بات بات پر علماء کی توہین کر رہے تھے اور علماء سے ان کا بغض و عناد ان کے ایک ایک جملے سے ظاہر ہوتا تھا۔ اُس وقت ملک سعید صاحب نے جو جماعتِ اسلامی کے ایک امیر اور "تسنیم" کے ایڈیٹر تھے اور کورٹ میں جماعتِ اسلامی کی طرف سے وکیل تھے 'ایک بات کہی تھی۔ انہوں نے ایک جملہ بڑی دلیری کے ساتھ کہا تھا کہ آپ جو یہ باتیں کہہ رہے ہیں اور نظریات پھیلا رہے ہیں تو اگر آپ واقعی اس کے پرچارک بننا چاہتے ہیں تو موچی گیٹ میں آیئے اور عوام کے سامنے بات کیجئے! آپ کو عدالت کی اس اونچی کرسی کو اس طریقے سے اپنے نظریئے کے پرچار کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ تو میں جسٹس صاحب سے بھی یہ کہوں گا کہ انہیں اپنے نظریات کی تشہیر کے لئے اپنی اس حیثیت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ بہرحال ایک توپسرِ اقبال ہونے کی حیثیت سے ان کا ایک مقام اور مرتبہ ہے وہ تو بہرحال رہے گا اور اس کا فائدہ بھی انہوں نے خوب اٹھالیا ہے۔ پچاس برس سے ان کی کتابوں کی کمائی کھائی جارہی ہے اور انہیں یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اقبال کے کلام کو ہوا اور پانی کی طرح سے عام کر دیں۔ اسی طرح ان کی کوٹھی کی قیمت جو انہیں ملی ہے وہ ظاہر بات ہے کہ پسرِ اقبال ہونے کی حیثیت سے ملی ہے۔ بہرحال یہ تو ایک علیٰحدہ پہلو ہے لیکن کم سے کم یہ کہ ملک کی اعلیٰ ترین عدلیہ کا جو ایک مقام ہے اس سے تو انہیں دست بردار ہو کر کھلم کھلا ایک دانشور کی حیثیت سے دیانتاً جو ان کی آراء ہیں وہ انہیں پیش کرنی چاہئیں اور اس میں جو وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں ٹیلی ویژن پر اظہارِ خیال کا جو موقع مل گیا ہے میرے نزدیک یہ درست نہیں ہے۔

اصل ضرورت قوّتِ ایمانی کی ہے نہ کہ قوّتِ مادّی کی

سردار عبدالقیوم خان صاحب کی جو غلطی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے 'لیکن جو معاملات جسٹس جاوید اقبال صاحب کے ہیں ان کے بارے میں میرے جذبات کچھ کم نہیں ہیں اور اس ضمن میں میں چار نکات کے تحت گفتگو کروں گا:

اوّلاً یہ کہ ان کی گفتگو کی بعض باتیں ایسی ہیں جو یقیناً اعلیٰ فلسفیانہ سطح کی ہیں اور ان کی اچھی تعبیریں بھی ممکن ہیں لیکن ان سے علیٰحدہ ہٹ کر انہوں نے ایک تقریر میں پورا زور اس پر صرف کیا ہے کہ علاّمہ اقبال تو اصل میں قوّت کے قائل تھے اور قوّت سے ان کی مراد تھی مادّی قوّت یعنی سائنس اور

ٹیکنالوجی۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ آج کی دنیا میں کون سا ایسا اندھا انسان رہ گیا ہے جسے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت کا احساس نہ ہو؟ کون بے وقوف آدمی ہوگا جس کے لئے یہ تبلیغ کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا مسلمانوں میں اس چیز کی کمی رہ گئی ہے؟ کیا مسلمانوں کو اتنا ادراک و شعور نہیں ہے؟ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی مسلمانوں نے اپنے لوگوں کو عالمی سطح پر سائنس دانوں کے ہم پلہ اور برابر لا کھڑا کیا ہے؟ کیا ہمارے ایٹمی ماہرین اس وقت پوری دنیا کو سرپرائز دینے کی پوزیشن میں نہیں آگئے ہیں؟ کیا ہم پورے عالم اسلام میں واحد وہ ملک نہیں ہیں کہ جنہوں نے اس معاملے میں اس حد تک پیش رفت کی ہے کہ دنیا یہ سمجھ رہی ہے کہ ہم ایٹم بم بنا رہے ہیں؟۔ ایک چیز کہ جو عام ہے 'کھلی ہے 'واضح ہے 'موجود ہے 'ظاہر بات ہے کہ اس کے پرچار کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ نظریہ ہرگز نہیں تھا۔ اگر یہ اسے ان کی طرف منسوب کرتے ہیں تو غلط کرتے ہیں اسلام نے یقیناً سائنس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے قرآن نے نوع انسانی کو ایک توہماتی دور سے نکال کر حقائق پر توجہ کرنا سکھایا ہے "اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ؕ " یہ یقیناً ایک نئے دور کا آغاز تھا اس نے پرانی مردہ سائنس کو زندہ کیا ہے 'اس میں اضافے ہوئے ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں عالم اسلام کی خدمات ہیں۔ ہمارے ہاں جو سائنسدان اور مفکرین پیدا ہوئے ہیں ان کا احسان یورپ آج تک مانتا ہے۔ وہاں یہ ساری روشنی غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں سے گئی تھی۔

یہ حقیقت اپنی جگہ ہے اور مادّی قوت کی اہمیت مسلّم ہے لیکن اس وقت مسلمانوں کو جس قوت کی ضرورت ہے وہ قوتِ ایمانی ہے۔ اصل میں جو فقدان ہو رہا ہے وہ ایمان و یقین کا ہے ۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے !
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ورنہ دوسرے میدانوں میں کوئی ایسا کمی کا معاملہ نہیں ہے. وہ تو ہم آج ان سے بھی لے کر آ سکتے ہیں جس طرح سے وہ قرطبہ 'غرناطہ اور اصفہانیہ کی یونیورسٹیوں سے لے کر گئے تھے۔ لیکن اگر ہمارے نوجوانوں میں یقین ہوتا تو وہ امریکہ میں جا کر آباد نہ ہو جاتے بلکہ واپس آتے 'چاہے یہاں پر ان کو وہ تنخواہیں نہ ملتیں اور وہ سہولتیں نہ ہوتیں 'لیکن اعلیٰ ترین صلاحیتیں حاصل کرنے کے بعد

وہ وہاں کی آسائشوں اور شاندار مستقبل کے پھندے میں گرفتار ہو کر وہاں نہ بیٹھ رہتے۔ تو اصل فقدان ایمان کا ہے، اصل کمی یقین کی ہے اور دراصل ہم شعورِ سمت (Sense of Direction) گنوا بیٹھے ہیں۔ ع آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف، چنانچہ اصل رونا تو اقبال نے اس کا رویا ہے اور سردار عبدالقیوم خان صاحب نے اگر وہاں بر محل یہ شعر پڑھا تو صحیح پڑھا ہے کہ ؎

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اور ؎

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کیا شے ہے؟ ان چیزوں سے کہیں بلند تر اور ماوراء شے ہے لوح و قلم جس پر بندۂ مومن کو تسلّط اور تصرّف عطا ہوتا ہے۔ بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بنتا ہے ع (ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ) تو یہ بات وہ اقبال کے فلسفے کے حوالے سے نہ کہیں۔ اور پھر یہ کہ ایک بڑی ہی واضح اور معلوم چیز کو اہلِ مغرب کے سامنے پیش کرنے کا اس کے سوا اور کیا حاصل ہے کہ آپ وہاں کے کچھ لوگوں کو خوش کر لیں کہ یہ مسلمان ہماری ٹیکنالوجی سے مرعوب ہیں اور ہماری سائنسی ترقی کی ہیبت ان پر قائم ہو چکی ہے۔ تو یہ معاملہ سر سیّد احمد خان مرحوم میں بھی تھا لیکن میں انہیں قابلِ معافی سمجھتا ہوں چونکہ وہ اُس دور میں تھے جب یہ چیزیں نئی نئی آئی تھیں۔ مغربی تہذیب کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور ہمارا غروب ہو چکا تھا وہ ہمارے فاتح اور حاکم تھے اور ہم مفتوح اور محکوم تھے۔ اس حال میں اگر ایک شخص جو مسلمانوں کا بہی خواہ اور مخلص تھا مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ یا مغربی سائنس سے مرعوب ہو گیا تو وہ قابلِ معافی ہے۔ لیکن آج کے اس دور میں ان چیزوں کا پرچار کرنا میرے نزدیک بالکل غیر موزوں اور بے محل ہے اور اقبال کی طرف اس کی نسبت قطعاً درست نہیں ہے۔

قافلۂ ملت کا حُدی خواں

دوسرے یہ کہ یہ جو کہا گیا کہ علامہ اقبال بین الاسلامی نہیں، بین الانسانی اتحاد کے علمبردار تھے، یہ بات بھی بالکل خلافِ واقعہ ہے۔ جمال الدین افغانیؒ کے بعد اگر کوئی اتحاد بین المسلمین

کا سب سے بڑا علمبردار ہو سکتا ہے تو وہ اقبال ہے۔ میں نے اپنے کتابچہ میں ان کے لئے عنوان قائم کیا ہے "قافلۂ ملّی کا سب سے بڑا حدی خواں" انکے یہ اشعار آپ کہاں لے جائیں گے ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ انسانی اتحاد مقصود و مطلوب ہے لیکن اس کا ذریعہ ہو گا اسلام اور ایمان! یہ ناممکن ہے کہ کفر و الحاد اور ضلالت بھی موجود رہے اور انسانی سطح پر اتحاد بھی ہو جائے اس کا آپ محض خواب دیکھ سکتے ہیں۔ بین الانسانی اتحاد اور انسانی سطح پر یکجہتی صرف اسلام کے اتحاد کی بنیاد پر اور اسلامی یکجہتی کے راستے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "قرآن اور امن عالم" میں واضح کیا ہے کہ اسلام واقعتاً رنگ و نسل کی تقسیموں کو ختم کرنا چاہتا ہے۔

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ

یعنی شرف و بزرگی اور فوقیت و بڑائی کا معیار کردار و تقویٰ کی بنیاد پر ہو' نہ کہ رنگ و نسل' علاقہ و زبان اور پیشہ و جنس کی بنیاد پر۔ جنس کے اعتبار سے یعنی مرد و عورت ہونے کے لحاظ سے بھی کوئی تفریق نہیں ہے۔ اسی طرح پیشہ کے اعتبار سے بھی کوئی اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی جوتی گانٹھ رہا ہو اور وہ کوئی بہت بڑا ولی اللہ ہو اور اللہ کے ہاں اس کا بلند مقام ہو۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اگر وہ بھولے سے بھی اللہ پر کوئی قسم کھا بیٹھے تو اللہ اس کی قسم کی لاج رکھے گا۔ لیکن ان تمام سطحوں سے بالاتر پہلا معاملہ بین الاسلامی اتحاد کا ہے۔

وحدتِ ملّی کے سب سے بڑے حُدی خواں نے اپنے 'خطبات' (Lectures) میں یہ بات تسلیم کی ہے کہ اس وقت کوئی ملّتِ اسلامی بالفعل ایک وحدت کی حیثیت سے موجود نہیں ہے بلکہ جو کچھ ہے وہ مسلمان اقوام ہیں۔ اقبال محض شاعر نہیں تھے۔ ان کی سوچ بڑی عملی' حقیقت پسندانہ اور Pragmatic تھی۔ شاعری میں اس کا امکان موجود ہے کہ جذبے کو ابھارنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا ہو' لیکن اپنی نثر خاص طور پر 'خطبات' میں انہوں نے ساری بات بالکلیہ مسائل سے متعلق کی ہے اور اس میں یہ بات بھی کہی ہے کہ سرِدست اگر مسلمان اقوام کی دولتِ مشترکہ وجود میں آجائے تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ اب یہاں پر کہاں ہے وہ انسانی اتحاد؟ ہاں انسانی اتحاد ہمارا آخری ہدف ہے۔ وہ وقت آئے گا کہ جس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے کہ اس رُوئے ارضی پر نہ تو کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر اور نہ ہی کمبلوں

سے بنا ہوا کوئی خیمہ رہ جائے گا جس میں اللہ کا دین داخل نہ ہو جائے ...... "بِعِزِّ عَزِيْزٍ اَوْ بِذُلِّ ذَلِيْلٍ......" یا تو عزت والے کی عزت کے ساتھ یا کسی ذلیل کی ذلت کے ساتھ......
اور یہ دو شکلیں کیا ہیں؟ یا تو لوگ ایمان لے آئیں گے اور ایک ہی حیثیت میں برابر کے ہو کر رہیں گے ... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ ان میں کوئی اونچ نیچ نہیں...... یا بِذُلِّ ذَلِيْلٍ یعنی جو اسلام نہیں لائے گا پھر اسے نیچے ہو کر رہنا پڑے گا ......يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ...... ○ ...... وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں گے اور چھوٹے بن کر رہیں گے۔ اور بالاتر نظام اللہ کا ہو گا۔

البتہ کسی ایک انسان کو بھی جبراً اس کا عقیدہ یا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ماضی میں کبھی کسی کو اس پر مجبور کیا گیا ہے۔ پوری تاریخ اسلامی اس پر گواہ ہے۔ انسانی سطح پر بھی آخری امکانی حد تک اتحاد کی جو صورت ہو سکتی ہے وہ اسی غلبۂ اسلام کے راستے سے ممکن ہے۔ اس کے سوا کوئی اور عملی راستہ ممکن نہیں ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ بات بھی اگر وہ اقبال کی طرف منسوب کر رہے ہیں تو غلط کر رہے ہیں۔ وہ خود میدان میں آئیں اور کھل کر بات کریں۔ اور اگر ہم مغالطے میں ہیں تو ہمارے مغالطے رفع کرنا ان کا ایک بہت بڑا جہاد ہو گا اور پھر ہم بھی اپنی رائے پر نظرثانی کریں گے۔ لیکن یہ کہ اپنی اس عظیم سرکاری حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کبھی کچھ بات اُدھر، کبھی کچھ بات اِدھر کہہ کر مغالطے پیدا کر دینا در حقیقت مناسب بات نہیں ہے۔ تو وہ یا تو اس معاملے کے اندر اپنے اس پرچار کو بند کریں اور یا اُس عہدے کو خیرباد کہہ کر ایک عام دانشور کی حیثیت سے میدان میں آئیں۔ کھلا میدان ہے۔ یہاں پر کسی کے لئے کوئی قدغن نہیں ہے۔ کھلی آزادیاں ہیں۔ وہ آزادیاں جن کے بارے میں کبھی اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ...... ؎

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

باطل دُوئی پسند ہے‘ حق لاشریک ہے

تیسری بات بھی جو انہوں نے کہی ہے میرے نزدیک بہت خطرناک ہے۔ انہوں نے ایک آئیڈیل کا دُم چھلا لگا کر سیکولرازم کو مشرّف بہ اسلام کرنے کی کوشش کی ہے۔ سیکولرازم کی آپ کتنی ہی نرم سے نرم تاویل کر لیں لیکن کوئی بڑے سے بڑا دانشور بھی اس کا اسلام کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ آپ آئیڈیل کہیں یا کچھ اور کہیں‘ لیکن سیکولرازم سیکولرازم رہے گا۔

سیکولرازم کو لامذہبیت کہنا غلط ہے۔ سیکولرازم نام ہے ہمہ مذہبیت کا...... یعنی تمام مذاہب ایک درجے میں‘ ایک سطح پر۔ اب اس کی عملی شکل ایک ہی ہو سکتی ہے کہ انفرادی معاملات میں ہر ایک مذہب کو کھلی آزادی ہے۔ جو چاہو مانو‘ جو چاہو عقیدہ رکھو‘ جسے چاہو پُوجو‘ جیسے چاہو شادی بیاہ کر لو‘ جیسے چاہو اپنے مُردے کا حشر کرو۔ اسے دفن کرو‘ جلاؤ یا پانی میں بہا دو۔ لیکن یہ آئیڈیل سیکولرازم ہے‘ بالفعل ایسا نہیں ہوتا اس لئے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ اور حکومت کے دوسرے وسائل و ذرائع اکثریت کے تصرّف میں ہوتے ہیں جو انہیں اپنے مذہب کے مطابق استعمال کرتے ہیں‘ نتیجتاً اکثریت کا مذہب غالب رہتا ہے۔ یہی صورت حال ہندوستان میں ہے اگرچہ وہاں اصولی اعتبار سے سیکولرازم ہے۔ اصولی اعتبار سے امریکہ میں بھی آئیڈیل سیکولرازم موجود ہے۔ لیکن بالفعل اس میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی لوگ اکثریت میں ہیں اگر ان کا مذہب کے ساتھ لگاؤ ہے تو سیکولرازم ان کا راستہ نہیں روک سکتا۔ اس لئے کہ سیکولرازم میں اصول یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں شہریوں کی اکثریت کا فیصلہ نافذ ہو گا۔ اس دلیل سے نہیں کہ فلاں مذہب نافذ ہونا چاہئے‘ بلکہ اس میں راستہ یہ نکل آتا ہے کہ اگر اکثریت کی اپنے مذہب کے ساتھ گہری وابستگی ہے تو اس اصول کے تحت بھی وہ اپنے مذہب کو نافذ کروا سکتے ہیں۔

میرے نزدیک قائداعظم کی ۱۱/ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کے اس جملے کی یہی توجیہہ ہے:

"Very soon the Muslims will cease to be the Muslim and the Hindus will cease to be the Hindu, not in the religious sense, because religion is the private affair of the individuals, but in the Political sense."

"بہت جلد (اس ملک میں) سیاسی اعتبار سے نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے گا اور نہ کوئی ہندو ہندو رہے گا‘ مذہبی اعتبار سے نہیں۔ اس لئے کہ مذہب تو افراد کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔"

اس ایک جملہ میں بالکل دوٹوک انداز میں سیکولرزم کا نکتہ موجود ہے' اور اس کی تاویل و توجیہہ بہت مشکل ہے لیکن میری تاویل کے مطابق اس کی تعبیر یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے نتیجے میں درحقیقت ایک ایسا ملک وجود میں آ چکا تھا جس میں عظیم اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اس سیکولر اصول کے تحت ان پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ وہ اپنے نظریات کے مطابق قانون سازی کریں۔ سیکولرازم کا اصول یہی تو ہے کہ بات مذہب کی دلیل سے نہیں' اکثریت کی دلیل سے ہوگی۔ تو اگر کسی ملک کے رہنے والوں کی اکثریت کا اپنے اس مذہب کے ساتھ حقیقی' واقعی' قلبی' ذہنی' اور فکری لگاؤ ہے تو وہ اس راستے سے بھی اور اس چھلنی میں سے بھی چھن کر نظام حکومت کے اندر خود بخود آ جائے گا۔ لہٰذا یہ تاویل ہے جو میں نے کی ہے ورنہ غلام احمد پرویز جیسے عاشق قائداعظم کو بھی یہ ماننا پڑا ہے کہ قائداعظم کے اعصاب اس وقت کچھ جواب دے گئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے فوراً بعد حالات کا ایسا دباؤ اور اتنی مشکلات تھیں کہ ان کے زیر اثر یہ جملے ان کے قلم سے یا ان کی زبان سے نکل گئے۔ میں نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک قائداعظم کے بارے میں یہ تأثر ان کی توہین ہے۔ وہ تو فولادی اعصاب کے انسان تھے اور بڑی سے بڑی سخت مشکل کے اندر بھی ان کے اعصاب میں کبھی اس طرح کا تزلزل پیدا نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک ان کے الفاظ کی یہ تاویل قطعاً غلط ہے کہ انہوں نے نظریۂ پاکستان کے بارے میں اس سے پہلے جو کچھ کہا تھا اس پر خط نسخ پھیر دیا۔ بلکہ اصل تاویل یہی ہے کہ انہوں نے حصولِ مقصد کے لئے دوسرا ذریعہ (Channel) اختیار کیا۔ یعنی ایک دم اسلام' اسلام' اسلام کا ڈھنڈورا پیٹ دینا۔ جبکہ وہ فی الواقع نہ ہو' جیسے کہ اس وقت ہوا ہے اور جو دس سال سے اس ملک میں ہو رہا ہے' اس کے نتائج قائداعظم کے نزدیک زیادہ خوفناک تھے۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ راہ بھائی کہ اب آپ کے سامنے میدان کھلا ہے۔ ہندو اکثریت کی رکاوٹ دور ہو چکی ہے۔ اب آپ کے راستے میں کون سی چیز حائل ہے؟ آپ عوام کو تیار کیجئے۔ آپ لوگوں کے اندر نفوذ کیجئے۔ اجتماعی سطح پر قوم کی رائے اسلام کے حق میں استوار کیجئے۔ قوم کے فیصلہ کن رجحان سے اسلام نافذ ہو جائے گا اور کوئی اس کا راستہ روکنے والا نہ ہو گا۔

جسٹس منیر صاحب کا ذکر آج پہلے بھی آیا تھا۔ جسٹس جاوید اقبال صاحب نے ان کی یاد تازہ کر دی ہے...... انہوں نے بھی اس جملے کے اوپر مورچہ لگایا تھا کہ قائداعظم ایک سیکولر ریاست چاہتے تھے' مذہبی اسلامی ریاست نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ میں یہ عرض کر دوں کہ ان دونوں کے

مابین بڑا فاصلہ ہے۔ قائد اعظم واقعتہً ملّائیت یا پاپائیت (Theocracy) کے مخالف تھے۔
تھیوکریسی کا اقبال بھی مخالف تھا۔ تھیوکریسی کا میں بھی شدید مخالف ہوں لیکن اسلامی ریاست
کا معاملہ ملائیت (Theocracy) اور جمہوریت (Democracy) کے بین بین ہوتا ہے اور اس میں
میں تحسین کا کلمہ کہنا چاہتا ہوں مولانا مودودی مرحوم کے لئے کہ انہوں نے اسلامی ریاست کی
نوعیت کے لئے ان دونوں کے درمیان تھیوڈیموکریسی (Theo-democracy) کی ایک نئی اصطلاح
وضع کی میں اس پر تین چار خطاباتِ جمعہ میں اظہارِ خیال کر چکا ہوں لیکن میرا احساس ہے کہ اب پھر
وقت ہے کہ ان موضوعات پر دوبارہ گفتگو کروں۔ اسلامی ریاست کے بارے میں جو بھی
اشکالات پیدا کر دیئے گئے ہیں اپنی امکانی حد تک ہم اس جنگل کو صاف کرنے کی کوشش کریں
گے۔ اسلام یقیناً نہ ڈیموکریسی ہے، نہ تھیوکریسی، بلکہ یہ تھیوڈیموکریسی (Theo-democracy)
ہے۔ اسلامی ریاست 'خلافتِ عامہ' (Popular Vicegerency) کے اصول پر قائم ہو
گی۔ اعلیٰ ترین جمہوری روایات اور اقدار بھی اس کے اندر شامل ہوں گی۔ حریّت واخوّت
مساوات کا جو اسلامی نظریہ ہے وہ وہاں پر نافذ ہو گا۔ یہی تین الفاظ مغربی جمہوریت میں بھی
استعمال ہوتے ہیں اور کمیونسٹ ممالک بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہمارے پیشِ نظر ان کی
تعبیر ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ چنانچہ سیکولرازم کے ساتھ آئیڈیل کا لفظ لگا کر اسے مشرّف
اسلام نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام اور سیکولرازم میں تباین اور تضاد کی نسبت ہے۔ ان کے مابین
بُعدالمشرقین ہے۔ اسلام یقیناً مذہبی سطح پر سب کو کھلی آزادی دے گا۔ لیکن اسلامی ریاست
کے اجتماعی معاملات سارے کے سارے اسلام کے حوالے سے طے ہوں گے۔ اگر نظریۂ
پاکستان کی کوئی اور تعبیر کسی کے ذہن میں ہو تو بہرحال ہم اس سے اعلانِ برأت ضروری سمجھتے ہیں
چاہے وہ ہماری کتنی ہی محبوب ترین شخصیت کے فرزند ہی کیوں نہ ہوں!

میں سمجھتا ہوں کہ سردار عبدالقیوم صاحب کا ردِّعمل بھی انہی Issues کی بنا پر تھا اور بجا
لیکن وہ اس میں خواہ مخواہ علامہ اقبال کی ذات کو زیرِ بحث لے آئے حالانکہ ان نظریات کی نسبت
سرے سے علامہ اقبال کی ذات اور ان کی فکر کے ساتھ صحیح نہیں ہے اقبال کے تذکرے میں انہوں
نے جو انداز اختیار کیا اس کے بارے میں میں پھر عرض کروں گا کہ مرزا محمد منور صاحب کا وہ مصرعہ
صد فیصد درست ہے کہ ؎

" تھا ناروے میں آپ کا اسلوب ناروا "

اور اب بھی میں ان سے عرض کروں گا کہ اس معاملے کو آگے نہ بڑھائیں۔ ان کا ایک مقام ہے' حیثیت ہے 'صدرِ آزاد جموں و کشمیر ہیں اور اگر مجاہدِ اوّل بھی ہیں تو یہ ایک رتبہ ہے جو اللہ نے انہیں دیا ہے

"یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!"

بہرحال ان کے بارے میں معلومات یہی ہیں کہ متبعِ شریعت ہیں یہ ساری چیزیں قابلِ قدر ہیں۔ وہ بہت آسانی کے ساتھ چند جملے کہہ کر اس معاملے کو ختم کر سکتے ہیں کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہے ورنہ یہ قیل و قال اور قالَ اور اَقُولُ کا سلسلہ چلتا رہا تو بحث الجھے گی اور اس کا حاصل کچھ نہیں نکلے گا۔

واپڈا بانڈز ___ سُود کی ایک نئی ترغیب

انتہائی بدقسمتی ہے اس ملک اور اس قوم کی کہ گزشتہ دس سال سے 'اسلامائزیشن' کے نام پر اس سے دھوکہ کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں میں جسٹس جاوید اقبال صاحب کی بھرپور تائید کرتا ہوں کہ اسلامائزیشن کا موجودہ عمل یقیناً منافقانہ ہے۔ اس کے اندر اسلام کے ساتھ کوئی وابستگی اور وفاداری ہمیں نظر نہیں آتی۔ اور اس کی جو مدافعت کی ہے سردار عبدالقیوم صاحب نے اس سے میں کھلم کھلا اعلانِ برأت کرتا ہوں۔ وہ چاہے ضیاء الحق صاحب کے کتنے ہی مُرشد بن گئے ہوں اور چاہے انہوں نے تواضع میں مرشد کہہ دیا ہو اور انہوں نے انتہائی تواضع سے یہ حیثیت قبول فرمالی ہو اور وہ ان کی وکالت کا جتنا بھی کام کرنا چاہیں کریں' لیکن میں ان کی اس مدافعت سے اعلانِ برأت کرنا چاہتا ہوں اور اس سے بھی اعلانِ برأت کرنا چاہتا ہوں جو الجھی الجھی سی باتیں انہوں نے کی ہیں جیسے کہ قرآن مجید کے بارے میں اگر تجزیہ کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن پڑھنا نہیں چاہئے۔ اسی طریقے سے اسلامی نظام کا لانا کوئی ضروری نہیں ہے..... اس کے بغیر بھی ہمارے اسلام میں کوئی نقص نہیں ہے..... اسلام اور ہے' اسلامی نظام اور ہے..... نہ معلوم وہ کس فکری الجھاؤ کے اندر مبتلا ہیں! کہنا تو یہ چاہئے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کے بغیر ہمارے اسلام میں یقیناً نقص موجود ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ تم کافر ہو اگر تم اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے! کہاں لے جائیں گے قرآن مجید کے اس فتوے کو؟ ...... "وَمَنْ لَّمْ

يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ " آپ اس فلسفے کو لانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام کا مطلب اسلام نہیں ہے۔ ہم پہلے بھی مسلمان تھے' آئندہ بھی رہیں گے' سو برس تک بھی اسلامی نظام نہیں آتا تو مسلمان رہیں گے۔ یہ بات اس طرح کہنے کی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے ہم کسی کو کافر نہیں کہتے لیکن بہر حال ایک کمی کا احساس تو ہو۔ احساسِ زیاں تو باقی رہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس ملک میں اسلام کے بارے میں یقیناً منافقت کا معاملہ ہوا ہے۔ ایک طرف کھلم کھلا دعوے ہو رہے ہیں کہ سود ختم ہو گیا ہے اور دوسری طرف سود کی ترویج جتنی اس دور میں ہوئی کبھی نہیں ہوئی پہلے این۔ ڈی۔ ایف۔ سی بانڈز کا اجراء ہوا جس قدر چاہو کالا دھن لاؤ اور جس طرح چاہو سفید کروا لو اس پر نہ کوئی زکوٰۃ ہوگی' نہ انکم ٹیکس۔ اب اسی نوعیت کے واپڈا بانڈز جاری کئے گئے ہیں جو انکم ٹیکس اور زکوٰۃ سے مستثنٰی ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں تو سب سے زیادہ تحفظ انہی کو دیا جا رہا ہے جنہوں نے کالا دھن سمیٹ رکھا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے ایک بہتر راستہ موجود تھا۔ کالا دھن آپ اسی کو کہتے ہیں نا کہ لوگوں نے جو ٹیکس ادا نہیں کئے اور خلافِ قانون ذرائع سے دولت اکٹھی کی ہے۔ اس طرح غلط طریقے پر ارتکازِ دولت ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بہترین راستہ یہ تھا اور کئی مرتبہ یہاں کے لوگوں نے ایسی تجاویز بھی پیش کی ہیں کہ ایک دفعہ ایک تاریخ مقرر کر دی جائے کہ سب لوگ اس تاریخ تک اپنے اس دھن کو ظاہر کر دیں تو اس میں سے کوئی کٹوتی نہیں ہوگی۔ اگر یہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ سارا دھن معمول کے کاروباری وسائل (Normal Bussiness Channels) میں لگتا اور انہی میں سرمایہ کاری ہوتی تو لوگوں کے لئے کام نکلتے اور روزگار کے مواقع میسر آتے۔ اس طرح وہ تمام دولت گردش میں آ سکتی تھی جو اب تک لوگ اپنے کھاتوں میں ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اور اگر کچھ کرنا تھا کہ کوئی ٹیکس نہیں' کوئی شناخت نہیں' کوئی پوچھ گچھ نہیں کہ یہ کہاں سے آیا' تو سود کی لعنت میں مزید اضافہ کرنے کے بجائے بہتر صورت اختیار کر لی جاتی۔ لیکن اس لعنت میں ہمارے قدم پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے ہی بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور خواہ مخواہ محض لیبل کے طور پر سود

(باقی صہ۲ پر)

سیّد مودودی نے یہ کیا کہہ دیا؟

۵ تا ۱۱۔ اپریل ۱۹۶۹ء

سید مودودی نے کیا فرما دیا ہے۔ یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ہے۔ انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی جائے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہِ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے حصے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جا سکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جا سکے گا۔ دلیل اس کی یوں دی کہ ماضیٔ قریب میں ہندوستان سے انگریز کو بھگانے کے لیے اسے کسی انتخاب میں شکست نہیں دی گئی تھی، بلکہ رابطۂ عوام کے ذریعے ہی بھگایا گیا تھا۔

سیّدِ محترم کے ان خیالات کو بار بار پڑھیئے اور پھر سوچئے، کیا کہہ دیا انہوں نے؟ اس نتیجے پر پہنچے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ جناب سیّد نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے واشگاف کیا ہے اور بھٹک بھٹک کر مایوس ہو جانے والوں یا چل چل کر تھک جانے والوں کو امید سے آگاہ کیا ہے، ذوقِ سفر سے ان کا تعارف کرا دیا ہے۔

الحمدللہ

کہ پندرھویں صدی ھجری کے آغاز پر یکم تا بارہ ربیع الاوّل
پاکستان ٹیلی ویژن نے سیرت النبیؐ کے موضوع پر

رسولِ کاملؐ

کے عنوان سے

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی جو بارہ تقار[یر]

نشر کی تھیں، اب ایک باقاعدہ معاہدے کے تحت ٹیلی ویژن کارپوریشن
سے اُن کی ریکارڈنگ حاصل کر کے اُن تمام تقاریر کا ایک

ویڈیو کیسٹ

تیار کیا جا رہا ہے۔ جو یکم مارچ ۸۸ء تک مارکیٹ میں دستیاب ہو سکے گا (ان ش[اء اللہ])
افادۂ عام کے پیشِ نظر اس کی خصوصی رعایتی قیمت صرف -/۱۵۰ روپے
ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا

اپنی کاپی محفوظ کرانے کے لیے مبلغ -/۱۶۰ روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ
درج ذیل پتے پر روانہ فرمائیں۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

مولانا حمید الدین فراہیؒ

اور حدِ رجم

ڈاکٹر اسرار احمد

[یہ مضمون اگرچہ ماہِ جنوری کے دَوران روزنامۂ نوائے وقت میں شائع ہو چکا ہے لیکن چونکہ وہاں بعض جملے حذف کر دیے گئے تھے جس کے باعث پوری بات سامنے نہیں آسکی تھی، لہٰذا مکمل مضمون ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے]

تقریباً سوا ماہ وطن سے باہر رہ کر واپسی ہوئی تو "نوائے وقت" کے کالموں میں حدِ رجم کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی منفرد اور شاذ رائے کی تائید اور جملہ فقہائے امت کے متفق علیہ موقف و مسلک پر جارحانہ تنقید پر مشتمل بحث دیکھنے میں آئی۔ اس سے قبل مولانا اصلاحی کی رائے پر بہت سے دینی جرائد میں بھی مفصل تنقید شائع ہو چکی ہے اور متعدد کتابیں بھی اس موضوع پر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں..... دوسری طرف مولانا اصلاحی کے دفاع کے ضمن میں بھی "نوائے وقت" کے کالم نگار اپنے ذاتی ماہنامے میں حقِ وکالت ادا کر چکے ہیں۔ راقم کی ذاتی رائے میں یہ بحث ایک قومی روزنامے کے صفحات کے لئے بالکل موزوں نہیں ہے۔ اور اگرچہ ؎ "رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند!" کے مصداق اس معاملے میں کسی کو کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے تاہم فرمانِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ و السلام کے مطابق حقِ نصح کی ادائیگی کے طور پر ادارہ "نوائے وقت" سے ادب کے ساتھ درخواست ہے کہ اس ضمن میں اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے، تاکہ امت کے سوادِ اعظم کے دینی جذبات مجروح نہ ہوں اور اختلافی علمی مباحث تحقیقی اداروں کے علمی جرائد تک محدود رہیں۔

جہاں تک راقم الحروف کا تعلق ہے وہ بنیادی طور پر "فقہیات" کے میدان کا آدمی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک بھی مولانا موصوف کی رائے سے صرف اظہارِ برأت ہی پر اکتفا کی ہے..... (اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اُس کا مولانا کے ساتھ ایک طویل

عرصے کی نیاز مندی کا تعلق بہت سے لوگوں کے علم میں ہے اور وہی مسلسل دس برس تک مولانا کی جملہ تصانیف کی نشرواشاعت کی خدمت سرانجام دیتا رہا' چنانچہ مولانا کی تفسیر "تدبر قرآن" کا اولین ناشر بھی وہی تھا۔ بنا بریں لوگوں کو وہم ہو سکتا تھا کہ شاید راقم بھی اس معاملے میں مولانا کا ہم رائے ہے)...... اور پیش نظر تحریر میں بھی اس مسئلے سے متعلق کوئی علمی بحث مقصود نہیں ہے بلکہ اس ذاتی وضاحت اور اظہار واعلان برأت کے ضمنی مقصد کے ساتھ اس تحریر سے اصلاً مطلوب مولانا اصلاحی کے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ کے بارے میں ایک مغالطے کا ازالہ ہے۔

اب سے لگ بھگ دو اڑھائی ماہ قبل جاوید احمد صاحب نے اپنے ایک کالم میں یہ تاثر دیا تھا کہ حدِّ رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی بعینہٖ وہی تھی جو مولانا اصلاحی کی ہے ... حالانکہ اس سے صرف ایک ڈیڑھ ماہ قبل میں نے ایک ملاقات میں اس مسئلے کے بارے میں مولانا اصلاحی سے براہ راست سوال کیا تھا تو جو جواب مولانا نے مجھے دیا تھا اُس کی رُو سے یہ تاثر ہرگز درست نہیں ہے۔ مجھے امید تھی کہ مذکورہ تحریر مولانا اصلاحی کی نگاہ سے گزرے گی تو وہ خود اس کی مناسب وضاحت فرما دیں گے لیکن سفر سے واپسی پر معلوم ہوا کہ تا حال مولانا کی جانب سے اس بارے میں کامل سکوت رہا ہے۔ اب یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ تحریر مولانا کی نگاہوں سے گزری ہی نہ ہو..... اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے سکوتِ مصلحت آمیز اختیار کیا ہو۔ بہر حال راقم کے نزدیک یہ معاملہ بہت اہم ہے اور اس کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔

میں ذیل میں اپنا سوال اور مولانا کا جواب حتیّ الامکان من وعن نقل کر رہا ہوں۔ اس میں کسی لفظ کے بدل جانے کا امکان تو بہر حال موجود ہے لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ مفہوم بالکل یہی تھا..... یا کم از کم میں نے اُس وقت یہی سنا اور سمجھا تھا!

میرا پہلا سوال تھا: "مولانا! کیا رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی وہی تھی جو آپ کی ہے؟"

مولانا کا جواب تھا: "بھئی اس کے بارے میں مَیں اس کے سوا اور کچھ نہیں جانتا کہ مولانا کے مصحف میں سورۂ نور کے حاشیئے میں یہ الفاظ درج تھے۔ "رجم تحت مائدہ!"

دوسرا سوال: ”تو کیا اس موضوع پر اُن سے آپ کی کوئی تفصیلی گفتگو بھی نہیں ہوئی؟“

جواب: ”نہیں! کوئی گفتگو نہیں ہوئی!“

الحمد للہ کہ مولانا اصلاحی بقید حیات ہیں اور وہ اس گفتگو کی توثیق و تصدیق بھی کر سکتے ہیں اور تردید و تغلیط بھی..... اور مؤخر الذکر صورت کو میں انشاء اللہ ان کے کذب کی بجائے اپنے سوءِ سماعت اور قصورِ فہم ہی پر محمول کروں گا اور بات ہرگز جواب الجواب تک نہیں پہنچے گی..... تاہم اب چونکہ بات پبلک میں آ گئی ہے لہٰذا اس کے بارے میں سکوت ہرگز مناسب نہیں ہے..... بلکہ اس کی وضاحت اور صراحت لازم ہے..... اور اگر مولانا اصلاحی صراحت کے ساتھ شہادت دیں کہ حدِ رجم کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی رائے بھی بعینہٖ وہی تھی جو خود اُن کی ہے..... اور فراہی مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والی کسی دوسری بزرگ شخصیت کی جانب سے اس کے بالمقابل کوئی صراحت موجود نہ ہو تو ہمیں اس مسئلے میں نہ صرف اہلِ سنّت کے جملہ مکاتب فقہ بلکہ اہلِ سنّن اور اہلِ تشیّع سب کی متفق علیہ رائے کی مخالفت پر جو صدمہ مولانا اصلاحی کے بارے میں جھیلنا پڑا ہے وہ مولانا فراہیؒ کے بارے میں بھی برداشت کریں گے، لیکن اگر حقیقت اس کے برعکس ہے تو اس معاملے میں سکوتِ مصلحت آمیز اُس ”کتمانِ شہادت“ کے ذیل میں آئے گا جس پر سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۰ میں شدید وعید وارد ہوئی ہے!

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ مولانا اصلاحی کے مذکورہ بالا الفاظ سے اس امکان کی قطعی اور حتمی نفی نہیں ہوتی کہ مولانا فراہیؒ کی رائے بھی وہی رہی ہو جو مولانا اصلاحی کی ہے، لیکن اس سے مثبت طور پر یہ نتیجہ بھی ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ مولانا فراہیؒ کی رائے فی الواقع وہی تھی۔ اس لئے کہ اس کا امکان ہی نہیں گمانِ غالب ہے کہ مولانا فراہیؒ نے رجم کے ضمن میں سورۂ مائدہ کا حوالہ صرف اس لئے دیا ہو کہ رجم ایسی شدید عبرتناک سزا (جسے اغیار و اعداء ”وحشیانہ“ قرار دیتے ہیں) کے مماثل اور مشابہ سزا کا ذکر وہاں موجود ہے..... جیسے کہ ترجمۃ الباب میں خود امام بخاریؒ نے کیا ہے!

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ جب تک کوئی واضح شہادت موجود نہ ہو مولانا امین احسن اصلاحی کی کسی علمی رائے کے بارے میں نہ یہ سمجھ لینا درست ہے

کہ وہی اُن کے استاذ کا مؤقف بھی رہا ہو گا...... نہ یہ باور کر لینا صحیح ہے کہ وہ فراہیؒ مکتب فکر کی متفق علیہ رائے ہے! اس لئے کہ اولاً خود مولانا اصلاحی نے اپنی تفسیر میں اپنے استاذؒ کی بہت سی آراء سے اختلاف کیا ہے' ثانیاً فراہیؒ مکتب فکر سے متعلق بہت سے اہلِ علم مولانا کی تفسیر پر شدید اعتراضات کر رہے ہیں۔ چنانچہ مولانا فراہیؒ کے سینئر ترین شاگرد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے تلمیذِ رشید مولانا جلیل احسن ندوی اصلاحی مرحوم نے تو نہ صرف یہ کہ مولانا امین احسن کی بعض آراء کو 'جہالت' تک سے تعبیر کیا ہے بلکہ ان پر شدید ذاتی اور شخصی اعتراضات بھی کئے ہیں۔ اور تفسیر "تدبّر قرآن" پر ان کی مفصّل تنقید ماہنامہ 'حیات نو' بلیریا گنج (بھارت) میں سلسلہ وار شائع ہو رہی ہے۔

بنا بریں کسی معاملے میں مولانا فراہیؒ کی اپنی تحریر یا فراہی مکتب فکر کی متفق علیہ شہادت کے بغیر مولانا فراہیؒ کی رائے کے بارے میں حتمی فیصلہ ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ اور امّت کی اجماعی آراء سے اختلاف کے معاملے میں تو قاعدہ کلیہ یہی رہے گا کہ مولانا فراہیؒ کی رائے کو امّت کے اجماعی موقف کے موافق ہی قرار دیا جائے گا' اِلّا یہ کہ کوئی صریح شہادت اس کے برعکس موجود ہو!

بہر حال اس معاملے میں مولانا اصلاحی کو اپنے مرحوم استاذ کا حق ادا کرنے میں جلدی کرنی چاہئے!

اسرار احمد عفی عنہ

۶/ جنوری ۱۹۸۸ء

بقیہ: خطابِ جمعہ

بنکاری کو نفع نقصان میں شرکت (PLS) کا نام دے دیا گیا ہے' حالانکہ وہ بھی سود کا سود ہی ہے اور اس کے اندر بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ڈالا گیا۔

وقت چونکہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا میں اس مسئلے کی تفصیل میں نہیں جا رہا۔ میرے لیے سہولت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس موضوع پر ایک مفصل شذرہ جنوری کے میثاق میں شائع ہو گیا ہے جو آج ہی چھپ کر آیا ہے

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

شیخ الہندؒ اور انتخابِ امام الہند

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تالیف
"جماعتِ شیخ الہند اور تنظیم اسلامی" کے مقدّمے پر

آزاد کشمیر سے مولانا محبوب الرحمٰن کا تنقیدی نوٹ

مجلہ میثاق کا گذشتہ دو اڑھائی سال سے برابر مطالعہ کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے قلم سے زور دار مضامین اُن کے زاویہ سے بے حد مؤثر ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ کئی مضامین میں بھی آزادیٔ ہند کی تحریک کے حوالہ سے حضرت شیخ الہند کی دینی و سیاسی خدمات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ خصوصاً جب شیخ الہند کے حوالہ سے یہ بات سب سے پہلے ہمارے مطالعہ میں آئی کہ حضرت شیخ الہند مولانا آزاد کے لئے امامت سے متفق تھے اور مولانا آزاد کی امام الہند کی حیثیت سے بیعت کے لئے بھی تیار ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی زبان اور قلم سے جب یہ بات نکلی تو علماء کی صف میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس رائے کے حق اور مخالفت میں تاریخی حوالوں سے دلائل دیئے گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے حوصلہ کی داد دینا چاہئے کہ موصوف ابھی تک اپنی اس رائے پر قائم ہیں۔ ملاحظہ ہو میثاق کا حالیہ شمارہ ماہ جولائی ۱۹۹۱ء میں " جماعت شیخ الہند سے تنظیم اسلامی تک " کے عنوان سے صفحہ نمبر ۱۸ کے آخری پیرا میں تحریر فرماتے ہیں۔

" عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہند نے خرقۂ خلافت ' عطا فرمایا ایک شخص کو جو نہ صرف یہ کہ نہ ان کے تلامذہ میں سے تھا نہ حلقہ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا۔ بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا۔ "

" حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا۔ بلکہ بقول خود " گلیم زہد اور ردائے رندی " دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے جرم کا مرتکب تھا۔ اور عجیب اتفاق یہ کہ اس کا نام بھی احمد تھا اگرچہ وہ مشہور ہوا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے یعنی ابو الکلام آزاد "

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہاں حضرت شیخ الہند ایک آئیڈیل ہیں اور بجا طور پر حضرت شیخ الہند اس

مقام کے مستحق ہیں۔ یہ موضوع میثاق کے شمارہ فروری ۱۹۸۵ء اور جنوری ۸۶ء میں بڑی تفصیل سے آ
گیا ہے۔ مجھے یہاں اس بات سے غرض نہیں کہ نظریۂ خلافت و امامت سے مراد کیا ہے۔ مولانا آزاد
اس نظریہ کے محرک کیوں تھے اور اسے کیوں ضروری سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد نے تحریکِ ہجرت اور
بیعتِ امامت میں کیا ربط تلاش کر لیا تھا۔ اور اس نظریہ کے پیش نظر فی زمانہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی بیعت
بحیثیت امیر تنظیم اسلامی لینے میں کس حد تک حق بجانب ہیں۔ لیکن تاریخ کے حوالہ سے یہ بات جو تحریر
میں آئی ہے کہ شیخ الہند مولانا آزاد کی بیعت سے متفق بلکہ مؤیّد تھے۔ اس بارہ میں معلوم کرنا ہے کہ یہ
بات کس حد تک صحیح ہے۔ جس طرح دیگر حضرات نے اس بارہ میں تاریخی حوالوں سے اپنے اپنے نقطۂ
نظر کو پیش کیا ہے اسی طرح آزادئ ہند کے موضوع پر مختلف کتابوں کے مطالعہ کے دوران راقم کو بھی
چند حوالے ملے ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ میثاق ہی کے ذریعہ قارئین کے سامنے پیش کروں۔

تحریک آزادی ہند میں تحریکِ خلافت کو اہم حیثیت حاصل ہے۔ اس موقع پر اس تحریک کے
مقاصد اور خلافت کانفرنس کے قیام وغیرہ سے ہمیں غرض نہیں البتہ اس قدر معلوم کرنا ضروری ہے کہ
ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے قیام کی غرض و غایت جنگ عظیم اول کے اختتام پر مطابق پیمان و عہد
خلافت مرکزیہ اسلامیہ ترکی کو بحال رکھنا تھا۔ اور اس کے ہمراہ اماکن مقدسہ جزیرۃ العرب'
بیت المقدس 'فلسطین 'بغداد 'نجف اشرف کو خلیفہ کے زیرِ نگین رکھا جانا تھا۔ اس موقع پر لندن میں جو
خلیج کانفرنس تین ممالک امریکہ 'برطانیہ 'فرانس پر مشتمل کام کر رہی تھی۔ اس پر مسلمانان ہند کی طرف
سے خلافت تحریک کے ذریعہ دباؤ ڈالنا تھا۔ اس خاطر مسلمانوں کا جو وفد لندن گیا اس کا نتیجہ کیا نکلا اس
کی علیحدہ داستان ہے۔ تاہم مولانا آزاد اس وفد سے بالکل بے نیاز رہے۔ چنانچہ وہ اپنی تالیف "انڈ
ونز فریڈم" میں لکھتے ہیں۔

"وفد وائسرائے سے ملا۔ جس نے عرضداشت پر تو دستخط کر دیئے۔ وفد کے ساتھ میں گیا
نہیں۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ معاملات عرضداشتوں اور وفدوں کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں۔"

حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ ابھی مالٹا میں اسارت کے دن گزار رہے تھے کہ اس دوران تیسری خلافت
کانفرنس کے موقع پر ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء میں ٹاؤن ہال کلکتہ میں ہوئی۔ وہاں مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک نہایت
ہی جامع خطبہ خلافت کے موضوع پر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کانفرنس کے دوسرے دن مولانا ابوالکلام
آزاد نے ایک منصوبہ کی بنیاد رکھی۔ جس کے بارہ میں مولانا کے مقرّب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی؛

اب "ذکرِ آزاد" میں یوں تحریر فرماتے ہیں:۔
"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔
سلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ اپنا دینی فرض سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو
تی ہے اگر قرآن وحدیث سے انھیں بتادیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے۔ اور ان
موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر
کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے۔ اور ہندو مسلمانوں کی متحد قوت سے انگریزوں کو شکست دے دی
ائے۔ مگر امام کون ہو؟
اس منصب کے لئے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چُننا ہو گا۔ ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن
کے ہاتھ بِک نہ سکے۔ ساتھ ہی امام ہوشمند اور حالاتِ زمانہ سے کماحقّہٗ واقف ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے
ولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے۔"
اس دوران معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے آپ کو امامت کا اہل سمجھتے ہوئے اپنی طرف سے
ولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو ماذون و مجاز قرار دیتے ہوئے انھیں اس بات کی اجازت دی کہ وہ مولانا کی
یابت میں لوگوں سے مولانا کے حق میں امام الہند کی حیثیت سے بیعت لیں مولانا ابو الکلام نے اس بات
ی خاطر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو اپنا خلیفہ قرار دیا۔ جس کی عبارت حسب ذیل ہے۔
"اخویم مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے وہ بیعت لینے اور تعلیم وارشاد
وسلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ما ذون و مجاز ہیں۔ جو طالبِ صادق اُن کے ہاتھ پر بیعت کریں گے
نھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ فقیر ابو الکلام غفراللہ لہٗ ۴ شعبان
۱۳۳۸ھ غالباً ۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء۔
مولانا ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ مولانا ابو الکلام نے الفاظ بیعت کا مسوّدہ بھی لکھ دیا وہ حسب ذیل ہے۔
امنت باللّٰہ وبماجاء من عند اللّٰہ و امنت برسول اللّٰہ وبما جاء من
عند رسول اللّٰہ واسلمت واقول اِنَّ صَلوٰتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ
للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا اول المسلمین○
بیعت کرتا ہوں میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بواسطہ خلفاء وتابعین کے اس بات
پر کہ:

۱۔۔۔ اپنی زندگی کی آخری گھڑیوں تک کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے اعتقاد و عمل پر قائم رہوں گا اگر استطاعت پائی۔

۲...... پانچ وقت کی نماز قائم رکھوں گا۔ رمضان کے روزے رکھوں گا۔ زکوٰۃ اور حج ادا کروں گا۔ اگر استطاعت پائی۔

۳۔۔۔ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں نیکی کا حکم دوں گا' برائی کو روکوں گا۔ صبر کی وصیت کروں گا۔

۴...... میری دوستی ہوگی تو اللہ کی راہ میں اور دشمنی ہوگی تو اللہ کی راہ میں۔

۵۔۔۔ اور بیعت کرتا ہوں اس بات پر کہ ہمیشہ زندگی کی ہر حالت میں اپنی جان سے اپنے مال سے اپنے اہل و عیال سے دنیا کی ہر نعمت اور ہر لذت سے زیادہ اللہ کو اور اس کے رسولؐ کو اس کی شریعت کو اس کی امت کو محبوب رکھوں گا۔ اور اس کی راہ میں جو حکم کتاب اللہ و سنت کے مطابق دیا جائے گا۔ السمع و الطاعۃ کے ساتھ اس کی تعمیل کروں گا۔

مولانا آزاد کی ہدایت پر ان کے خلیفہ و نائب نے ہندوستان بھر کے مختلف صوبوں میں مولانا کی امامت کے لئے بیعت کا کام شروع کر دیا۔ مولانا آزاد نے اپنے خلیفہ کے لئے پچاس روپے ماہوار مقرر کر دیئے۔ جبکہ ایک نیک دل مسلمان نے اس کام کے لئے مولانا آزاد کو ایک خطیر رقم مہیا کر دی تھی۔ مولانا ملیح آبادی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اس نسخہ کو آزمایا اور مجرب پایا۔

شیخ الہند مولانا محمود حسن فروری ۱۹۲۰ء کے دوران مالٹا سے رہا ہوئے۔ اور ۸ر جون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہنچے۔ اس سارے عرصہ میں ہندوستان کے طول و عرض میں مولانا ملیح آبادی کے توسط سے مولانا آزاد کی بحیثیت امام الہند بیعت ہو رہی تھی۔ اس موقع پر یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ مولانا آزاد کی امامت کے لئے تمام مسلم حلقوں سے اتفاق حاصل کیا جائے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ۔

"اس کے بعد طے پایا گیا کہ امامت کا مسئلہ پبلک میں لانے سے پہلے اندر اندر مولانا کی امامت کے لئے ملک بھر میں بیعت لینا شروع کر دیا جائے۔ تاکہ جب یہ معاملہ سامنے آئے تو امام کی بیعت واقعہ بن چکی ہو۔ اس سے لوگوں میں رشک و رقابت کا سدِباب ہو جائے گا۔ اور مسلمان ایک امام پر متفق ہو کر ہندوستان کو غلامی سے نجات دلا سکیں گے۔"

حضرت شیخ الہند ہندوستان واپسی پر لکھنؤ مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ہاں تشریف لے گئے۔ اس لئے کہ مولانا عبدالباری فرنگی محل تحریکِ خلافت کے روحِ رواں تھے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے

اس فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے لکھنؤ جا کر ہر دو شیوخ یعنی حضرت شیخ الہند اور مولانا عبدالباری فرنگی محل سے ملاقات کی اور انہیں مولانا آزاد کی بیعت بحیثیت امام الہند کے لئے راضی کرنا چاہا۔ مگر دونوں بات ٹال گئے مولانا عبدالرزاق نے مولانا عبدالباری فرنگی محل کی ایک تحریر نقل کی ہے۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

"مولانا محمود حسن سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے۔ مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں اُن کی امامت سے مجھے اختلاف نہیں ہے بسر و چشم قبول کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ تفریقِ جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں کسی نا اہل کو اکثر اہلِ اسلام قبول کر لیں گے۔ تو وہ لوگ سب سے زیادہ اطاعت گزار فرمانبردار مجھے پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں۔ مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے۔

والسلام..... بندہ فقیر عبدالباری

مولانا آزاد نے مولانا عبدالباری کے اس خط پر یوں رائے دی۔

" یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم " سرِ دست اس قصّہ کو تہہ کیجئے اور کام کئے جایئے۔ پنجاب ' سندھ ' بنگال میں تنظیم مکمل ہے۔ مولانا آزاد اپنے خلیفہ مولانا عبدالرزاق کی کوششوں سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ اور انہیں کام جاری رکھنے کی تاکید کرتے ہیں۔

"بہر حال ہمارا دائرہ عمل مکمل ہو چکا ہے۔ پنجاب ' سندھ و بنگال متحد و متفق ہیں اور اب پوری تیزی سے کام جاری ہو گیا ہے۔ ان لوگوں مولانا عبدالباری ' مولانا محمود حسن اور مولانا حسرت موہانی کے فیصلہ کا انتظار بے سود تھا۔ اور بے سود ہے۔ "

مولانا آزاد کی تحریک کا انجام کیا ہوا۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے علی برادران اور تحریکِ خلافت سے اُن کی وابستگی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس دور میں تحریکِ خلافت جو زور و شور سے جاری تھی۔ اور مولانا محمد علی جوہر ایک وفد کے ہمراہ لندن گئے تھے۔ مولانا محمد علی بات کے بڑے پکے تھے۔ جو بات زبان پر آتی اسے کر گزرنے میں انہیں باک نہ تھا۔ دوسرے کی طرف سے اپنی ذات پر تنقید گوارہ نہیں کرتے تھے۔ جس کے پیچھے پڑتے اُس کو جان بچانا مشکل ہو جاتا۔ مولانا ظفر علی خان جو تحریکِ خلافت میں پیش پیش رہے۔ اُن سے اَن بَن ہوئی تو غدّار تک کہہ دیا۔ دلّی کے سجّادہ نشین اردو

ادب کے مشہور ادیب خواجہ حسن نظامی کے پیچھے پڑ گئے تو زبان و قلم سے لڑائی شروع ہو گئی۔ اس
لڑائی نے دینی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں اضطراب پیدا کر دیا۔ مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کو "ختم
خواجگی" کی دھمکی دے دی۔

مولانا محمد علی کی اس طوفانی طبیعت سے مولانا آزاد پوری طرح واقف تھے۔ وہ ہرگز مولانا محمد علی سے
تصادم مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولانا محمد علی کی لندن سے واپسی ۱۹۲۰ء کے آخر میں ہوئی۔ اس
سے قبل ہی مولانا آزاد نے اپنی امامت کے مسئلہ سے دستبردار ہونے میں عافیت سمجھی۔ مولانا عبدالرزاق
ملیح آبادی نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے:

"لیکن مولانا محمد علی نہایت مستعد لیڈر تھے اور طوفانی طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا اثر بڑی تیزی سے
بڑھ رہا تھا۔ اور مولانا کی امامت ہی کے سبب خود مولانا کی ذات سے سخت مخالف تھے۔ دونوں میں عمر!
رقابت رہی۔ قدرتی طور پر مولانا نے جو از حد معاملہ فہم اور ٹھنڈی طبیعت کے آدمی تھے محسوس کر لیا
علی برادران سے تصادم مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دے گا۔ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ا
برادران کے ساتھ تھا۔ پھر فرنگی محل بھی مخالف تھا۔ گو کہ شیخ الہند کی طرف سے مخالفت نہ تھی
دیوبند کا طاقتور حلقہ بھی مولانا کا طرفدار نہ تھا۔ اس صورت میں مسئلہ امامت کا آخر تک پہنچانا دانشمند
کے خلاف تھا۔ ان حالات میں مولانا آزاد کی امامت کی تحریک ستمبر ۱۹۲۰ء میں ختم ہو گئی۔

یہ ہے مولانا آزاد کے امام الہند بننے کی ساری داستان۔ اس اجمالی تعارف سے واضح ہو گیا ہے
انہوں نے تحریک خلافت کے دوران علی برادران جن سے اُن کی رقابت چلی آ رہی تھی۔ ان سے ا
مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لئے اپنی امامت کا نظریہ پیش کیا۔ اس نظر
ہندوستان کے مختلف صوبوں میں خوب پذیرائی ہوئی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا آزاد کے خ
و ماذون کی حیثیت سے مسلمانوں سے امام الہند کے نام پر بیعت لیتے رہے۔ شیخ الہند کی مالٹا کی اسار
سے رہائی کے بعد ہندوستان میں آمد پر لکھنؤ میں مولانا عبدالباری فرنگی محل کے ہاں مولانا عبدالرزاق
آبادی کی ملاقات کے دوران ہر دو شیوخ نے مولانا آزاد کے امام الہند نظریہ سے اتفاق نہیں کیا۔
سے مولانا آزاد کو ایک طرح کا افسوس بھی رہا۔ پھر ستمبر ۱۹۲۰ء میں نظریۂ امامتِ ہند از خود دم توڑ
قاضی محمد عدیل عباسی اپنی کتاب تحریک خلافت میں رقم طراز ہیں:-

"امامتِ ہند کی تحریک بے سود ہی رہی۔ اور پھر تمام عمر مولانا آزاد نے اس اہم فریضۂ مذہبی کا

ذکر ہی نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شرعی مسئلہ دریائے گنگ وجمن کی لہروں کی نذر ہو گیا۔ اور مولانا کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو "جاہلیت" اور "معصیت" کی زندگی گزارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ تحریکِ خلافت نے وہ کام براہ راست کر دیا جو تحریکِ امامت سے بالواسطہ مولانا کرانا چاہتے تھے۔ اور اسی لئے مولانا نے خاموشی اختیار کر لی۔ "

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد اپنی تحریک تنظیم اسلامی جس کی بنیاد اسی نظریۂ امامت پر ہے۔ جس کا سرا وہ حضرت شیخ الہند سے جوڑتے ہیں بالآخر وہ اپنے عقیدت مندوں کے لشکر سے کس کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے والے ہیں۔ اوپر کے تاریخی حوالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامتِ ہند کا نظریہ دراصل مولانا آزاد کا اپنا اختراع کردہ تھا۔ وہ اپنے تئیں امام الہند بننے کے خواہشمند تھے۔ تاکہ امام کے مرتبہ پر فائز ہو کر اپنے عقیدت مندوں کے لشکر سے ہندوؤں کو ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کریں۔ بالآخر یہ نظریہ چھ سات ماہ زندہ رہ کر خود ہی ستمبر ۱۹۲۰ء میں ختم ہو گیا۔

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ

تبصرہ از مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی مدظلہ

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں امارت اور امامت کی بحث چھیڑ کر اس مسئلہ کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جو اب تک پردۂ خفاء میں تھے اس سلسلہ میں یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے سامنے جب مولانا آزاد کی امارت کا مسئلہ پیش ہوا تو آپ نے اس سے اتفاق کیا۔

شیخ الہند کے نزدیک مولانا آزاد کی آواز ہی وہ صدائے حق تھی جس نے امت کو نیند سے بیدار کیا۔ شیخ الہند نے مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں اس امت کے زوال کے دو سبب دریافت فرمائے 'ایک امت کا باہمی اختلاف اور دوسرا کتاب اللہ سے دوری اور پھر آپ نے یہ دونوں کام شروع کر دیئے۔

جہاں تک دعوت قرآن کا تعلق ہے مولانا آزاد یہ کام شروع کر چکے تھے اور الہلال و البلاغ کی دعوت کا مقصد مسلمانوں کو براہ راست قرآن کریم سے وابستہ کر کے ان کے اندر اتباعِ شریعت کی اسپرٹ پیدا کرنا تھا۔

جہاں تک اتحادِ امّت کا معاملہ ہے' اس کی جائز حد یہ ہے کہ کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہؐ کے دائرہ میں رہتے ہوئے امّت میں فقہی مسائل کے اندر جو اختلاف ہے اس کی شدت ختم ہو جائے اور ہر فقہی مسلک کو حق سمجھا جائے' مولانا آزاد نے اس ضروری اتحاد کے سلسلہ میں بھی جدوجہد شروع کر دی تھی' چنانچہ مولانا آزاد دین کے اندر بدعات وزوائد کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے حالانکہ مولانا کے والد اسی مسلک کے بڑے متشدّد شیخ و پیر تھے لیکن مروّجہ فقہی تقلید کے معاملے میں مولانا کا مسلک شاہ ولی اللہؒ کے مطابق فقہی توسع پر مبنی تھا۔

حضرت شیخ الہند کے یہ تاثرات بھی تاریخ کا ناقابل تاویل حصہ ہیں کہ حضرت شیخ کو اپنے مشن کے سلسلہ میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ قدیم طبقہ سے نہیں تھیں' اسی جذبہ کے تحت شیخ الہند نے علی گڑھ تحریک سے قریبی تعلق قائم کیا اور جامعہ ملّیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ ان احساسات کی روشنی میں مولانا آزاد کی امارت کے بارے میں حضرت شیخ کا خیال کسی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

یہ بات صرف ایک فرضی تخیل کے سوا کچھ نہیں کہ امارت کا شرعی مسئلہ دریائے گنگ و جمن کی لہروں کی نذر ہو گیا اور مولانا آزاد کو دیگر مشاغل نے ادھر توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ دی کہ وہ تمام مسلمانان ہند کو جاہلیت اور معصیت کی زندگی گذارنے کے خلاف آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں (تحریک خلافت ص ۱۴۰)

مولانا آزاد کے اندر مسلمانوں کی شرعی تنظیم کے لئے ایک امیر و امام کے تقرر کا جوش و جذبہ کیوں پیدا ہوا'؟..... اس کا تعلق تحریکِ خلافت کے جوش و جذبہ سے ہے۔

کلکتہ خلافت کانفرنس میں مولانا نے جو خطبہ دیا اس کے مباحث پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا نے ترکی خلافت کے تحفظ کی جدوجہد میں ایک اصول کے تحت حصہ لیا'

انگریزوں کے خلاف ایک منفی جذبہ اس کا محرک نہیں تھا' یہ جذبہ حب علیؓ پر مبنی تھا' بغض معاویہؓ پر نہیں..... اس اصول کا تقاضا تھا کہ خلافتِ عثمانیہ کی حفاظت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی شرعی تنظیم اور اس کے لئے ایک امام وامیر کے نصب کے مسئلہ پر بھی توجہ کی جائے اور یہ مسئلہ ایک مرکزی امیر کے ہوتے ہوئے علاقائی امیر کے نصب کا مسئلہ تھا۔

مولانا کی فراست بھانپ رہی تھی کہ عالمی حالات ایسے ہیں کہ خلافتِ عثمانیہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ پھر اگر خلافت کے سقوط کا حادثہ رونما ہو جائے تو ہندوستانی مسلمانوں کی حد تک ہندوستان کے مذہبی رہنماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ یہاں شرعی تنظیم اور امارت قائم ہو اور مسلمان ذہنی انتشار اور مایوسی سے بھی محفوظ رہیں۔ لیکن مذہبی قائدین کے اختلاف نے مولانا کی اس تجویز کو چلنے نہیں دیا اور صرف دو سال کے بعد خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا حادثہ بھی رونما ہو گیا۔

مولانا آزاد نے اپنی اعتدال پسندانہ طبیعت و خیال کے تحت محتاط روش اختیار کر لی۔ امارت کے مسئلہ میں بھی محتاط ہو گئے اور جب خلافت کے سقوط پر جذباتی لیڈروں کی طرف سے واویلا شروع ہوا تو خلافت کے مسئلہ پر پرجوش خطبہ دینے والا خلافت کی جگہ جمہوری حکومت کے قیام کی توجیہات کرنے لگا اور امت کو مایوسی سے بچانے میں مشغول ہو گیا' خلافت کا سقوط جن ہاتھوں سے ہوا انہیں گمراہ قرار دیتے ہوئے مولانا نے صرف اتنی بات کہی کہ خلافت کا نظام صحیح نہیں رہا ہے اور اس لئے تمام عالم کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کی کوشش کرے (۲۵۶) مولانا محمد علی صاحب کا گروپ عثمانی خلافت کے بعد سلطان عبدالعزیز کو خلیفہ بنانے کی توقع کرنے لگا اور پھر اس سے بھی مایوس ہو گیا لیکن مولانا کی دور اندیشی کامیاب رہی' مولانا اس تحریک سے بالکل الگ رہے اور یہ گروہ بالاخر اس درجہ ناکام و مایوس ہوا کہ لکھنؤ کی آخری خلافت کانفرنس (۱۹۲۷ء) کے صدرِ استقبالیہ مولانا دریا آبادی مرحوم کے الفاظ میں'

"ایک خواب شیریں تھا جسے دیکھنے کے بعد مسلمان عرصہ ہوا اسے بھی بھلا چکے تھے"۔

اسی کانفرنس میں مسلم زعماء نے مسلمانانِ ہند کو تعلیمی اور معاشرتی تعمیر کے کاموں میں لگنے کا مشورہ دیا اور اس راہ میں تمام مسلم اور غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ اشتراکِ عمل کی دعوت

دی (۴۶۷) مولانا آزاد اس فیصلہ سے بہت پہلے اپنے آپ کو اسی راہ پر ڈال چکے تھے جس کا
فیصلہ حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں آخری خلافت کانفرنس نے کیا تھا۔ مولانا آزاد
آزادئ ہند کی تحریک میں مشغول ہو گئے' قید و بند کے مصائب نے مولانا کو گھیر لیا لیکن مولانا
کے دل میں مسلمانان ہند کی شرعی تنظیم سے محروم زندگی کا احساس کانٹے کی طرح کھٹکتا رہا۔

جمعیتِ علماء ہند کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے کہ جمعیتِ علماء کے جلسہ میں جب مولانا
آزاد کی امارت اور بیعت کا مسئلہ زیرِ بحث آیا تو مولانا معین الدین صاحب اجمیری نے سب سے
پہلے اس مسئلہ میں ایک اصولی بحث چھیڑ دی اور ہنگامی بیعت کی نوعیت پر روشنی ڈال کر مسئلہ
ختم کر دیا' سوال بڑا علمی اور فقہی تھا' اس لئے دوسرے اکابرِ علم کے اندر بھی اختلاف کا جوش
پیدا ہو گیا اور مولانا اجمیری کی تائید کی گئی' یہ کس تاریخ کی بات ہے' اس کا حوالہ یہاں میرے
پاس نہیں ہے' اس کے بعد مولانا آزاد اپنی امارت کے معاملے میں محتاط ہو گئے لیکن اصل
مسئلہ کی طرف سے مولانا کا دماغ بے فکر نہیں رہا۔

رانچی کے قیام میں علماء بہار کو اس طرف توجہ دلائی اور مولانا کے رفیقِ خاص مولانا
ابوالمحاسن سجادؒ نے صوبہ بہار میں امارتِ شرعیہ کا نظام قائم کر دیا۔ مولانا انور شاہ صاحب
محدث ہند نے پنجاب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیرِ شریعت کا خطاب دے کر اس وقت
کے اہم ترین دینی مسئلہ یعنی ختم نبوت کے عقیدہ کی حفاظت کے محاذ کو قوت پہنچائی۔

۱۹۳۵ء میں مولانا آزاد نے ترجمان القرآن تحریر فرمائی اور زکوٰۃ کی شرعی تنظیم
(بیت المال) کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے امیر و امام کے نصب کی ضرورت کا اظہار کیا
سورۂ توبہ کی آیت اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ ...... الخ" کی تفسیر میں یہ مسئلہ دیکھا
سکتا ہے۔ اس وقت تک بھی مولانا امام کے نصب کی شرعی اہمیت سے غافل نظر نہیں آتے
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے امارت کے مسئلہ سے دلچسپی لے کر ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ لوگ
ڈاکٹر صاحب پر ناراض ہوں۔ ایک بزرگ نے اپنے مراسلہ میں لکھا ہے۔

"ہمیں اس سے غرض نہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اپنی تحریکِ تنظیمِ اسلامی جس کی بنیاد
اسی نظریہ امامت پر ہے جس کا سرا وہ حضرت شیخ الہند سے جوڑتے ہیں بالآخر وہ اپنے عقیدہ

منددں کے لشکر سے کس کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے والے ہیں"۔

دلی والوں کے محاورہ میں اس اندازِ تحریر کو پھکڑپنا کہا جاتا ہے' بڑے ادب سے ان بزرگوں کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ امارت وامام کا مسئلہ دین کا ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ اس کا تعلق کسی کے خلاف جنگ وجہاد برپا کرنے سے نہیں ہے یہ شرعی اور دعوتی تنظیم کا مسئلہ ہے' تنظیم اسلامی کے قیام کی غرض وغایت کی تفصیلات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے پاکستانی سیاست میں کود پڑنے سے معاشرہ کی اجتماعی تربیت کا جو محاذ ختم ہو گیا تھا ڈاکٹر صاحب اس خلاء کو پر کرنے کی ضرورت سمجھتے ہیں"۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک تنظیم قائم کی وہ اس راہ میں رفاقت کرنے والے حضرات سے وہ رفاقت اور شرعی اطاعت کا عہد وپیاں لیتے ہیں' ممبری کے فارم پر کرنا' یہ جدید طریقہ ہے بیعت کے ذریعہ عہد وقرار مسنون طریقہ ہے' اب وہ اتفاق نہ کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نہ تو جاہلیت کی موت مرنے کا فتویٰ لگاتے ہیں اور نہ پاکستانی اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوئی سازش تیار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خلاف محاذ آرائی کے لئے اہلِ بدعت کو چھوڑ دینا چاہئے' جو حضرات عقیدہ سلف صالحین سے وابستہ ہیں ان کے لئے ڈاکٹر صاحب کی حوصلہ افزائی جس حد تک بھی ہو سکے نہایت ضروری ہے اس مادّہ پرستانہ تہذیب کے عروج وشباب کے دور میں نظامِ حق کے قیام ونفاذ کی ہر جدوجہد قابلِ قدر ہے' اسے نقصان پہنچانا آخرت کی باز پرس کا سودا ہے امیر وامام اور بیعت کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات سے اختلاف کرنے میں بھی اس کا لحاظ رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اصل کام کو نقصان نہ پہنچے۔

اخلاق حسین قاسمی دہلوی مہتمم واستاذ تفسیر جامعہ رحیمیہ شاہ ولی اللہؒ دہلی مقیم اچھرہ لاہور

۳ جنوری ۱۹۸۸ء

عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِیِّ، قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ:
"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ
بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ"
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد وجامع ترمذی)

سات ہفتے وطن سے باہر

امیر تنظیم اسلامی کے حالیہ دَورہ ' ابوظہبی ' لندن اور سعودی عرب کی رُوداد

مرتب : قمر سعید قریشی

کئی ماہ سے ابوظہبی کے رفقاء کا شدید تقاضا تھا کہ امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد ابوظہبی کے دعوتی دَورے کا پروگرام بنائیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ قریباً ایک سال پہلے امیر محترم کو ابوظہبی میں پہلی بار اپنی دعوتِ قرآنی اور انقلابی فکر پہنچانے کا موقع ملا تھا۔ وہ دَورہ الحمدللہ بہت بھرپور اور کامیاب رہا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں وہاں فوراً ہی تنظیم اسلامی کی ایک باقاعدہ شاخ کا قیام بھی عمل میں آچکا تھا۔ ابوظہبی کے رفقاء کی فعالیت اور وہاں کام کے انداز اور اس کی رفتار کو دیکھتے ہوئے امیر تنظیم اسلامی کے لیے رفقاء کے مطالبے کو ٹالنا ممکن نہ تھا۔ اسی دَوران لندن سے طٰہٰ پبلشرز کے جناب افسر صدیقی صاحب کی شدید خواہش بھی سامنے آئی کہ لندن میں ابھی تک چونکہ امیر تنظیم اسلامی کا کوئی باقاعدہ دعوتی پروگرام نہیں ہوا ہے لہٰذا امیر تنظیم کا کوئی بھرپور پروگرام لندن میں بھی رکھا جائے۔ چنانچہ ابوظہبی کے لیے ۱۸ تا ۲۶ نومبر اور لندن کے لیے ۴ تا ۱۱ دسمبر کی تاریخوں کا تعیّن کر لیا گیا۔ سفر کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں کہ اچانک ۱۶ نومبر کو ابوظہبی سے اس اطلاع کی آمد پر کہ حکومت ابوظہبی کی جانب سے ابوظہبی کے پاکستان سنٹر میں پروگرام کی اجازت نہیں مل سکی ہے، پروگرام کچھ کھٹائی میں پڑتا ہوا دکھائی دیا۔ ۱۷ نومبر کا دن اسی غیر یقینی کیفیت میں گزر گیا۔ امیر محترم کی طبیعت بھی سفر پر آمادہ نہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے اسے اللہ کی جانب سے تائیدی رکاوٹ قرار دیا۔ مگر رات ۹ بجے ابوظہبی سے برادر محترم نسیم الدین صاحب نے اس توقع کا اظہار کرتے ہوئے کہ اجازت مل جائے گی، اصرار کیا کہ امیر محترم ضرور تشریف لائیں۔ رفیق محترم جناب قمر سعید قریشی صاحب حسب سابق اس سفر میں امیر تنظیم کے ساتھ تھے۔ اُن کی مرتب کردہ رپورٹ ایک خلاصے کی شکل میں پیشِ خدمت ہے۔

(ادارہ)

۱۸۔ نومبر کی صبح قرآن اکیڈمی سے روانگی ہوئی۔ فلائٹ نصف گھنٹہ تاخیر سے دوبئی کے لئے روانہ ہوئی اور ہم مقامی وقت کے مطابق سوا گیارہ بجے صبح بخیر و عافیت دوبئی پہنچ گئے ہمیں بتایا گیا تھا کہ ویزے کا اہتمام وہیں ایئرپورٹ پر کر دیا جائے گا چنانچہ لاؤنج میں پی آئی اے کے سٹیشن منیجر امیر محترم کے ویزے کے ساتھ موجود تھے۔ مگر ساتھ ہی انہوں نے یہ پریشان کن خبر سنادی کہ راقم الحروف کا ویزا تا حال نہیں پہنچا۔ امیرِ محترم کے لئے چونکہ کوئی رکاوٹ نہیں تھی لہٰذا کاغذی کارروائی سے فراغت کے بعد وہ باہر منتظر رفقاء کے پاس تشریف لے گئے۔ مقامی رفقاء شیشے کی دیوار کے پار سے اشاروں کی زبان میں راقم کا حوصلہ بڑھا رہے تھے لیکن ویزے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ تقریباً گھنٹہ بھر کے بعد برادرم نسیم الدین صاحب نے مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر راقم کے لئے لندن روانگی کا اہتمام شروع کیا ہی تھا کہ ایک شرطہ (سپاہی قسم کا ملازم) یہ نوید لایا کہ راقم کا ویزا کاغذات میں سے مل گیا۔ اُن مقامی احباب سے جو استقبال کے لئے تشریف لائے تھے ملاقات کے بعد اجازت چاہی اور برادرم نسیم الدین صاحب، و عزیزان سرفراز چیمہ صاحب، خالد صاحب کے ہمراہ بذریعہ کار ابوظہبی روانہ ہوئے ڈھائی بجے ابوظہبی پہنچ کر مطعم العرب میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ اور مرکز جمعیت خدام القرآن ابوظہبی آ گئے جہاں مقامی رفقاء سراپا انتظار تھے۔ یاد رہے کہ ابوظہبی میں ہمارے رفقاء نے دفتر کے لئے باقاعدہ ایک فلیٹ حاصل کیا ہوا ہے۔ جہاں انجمن اور تنظیم کا بنیادی لٹریچر اور امیر تنظیم کے دروس و خطبات کے آڈیو اور وڈیو کیسٹوں کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ دینی موضوعات پر عمدہ کتب کی ایک منظم لائبریری کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ یہ دفتر انجمن اور تنظیم کی سرگرمیوں کا اہم مرکز ہے۔ نماز عصر ادا کرنے کے بعد پروگرام کے بارے میں تبادلہ خیال ہوا۔ ہمیں بتایا گیا کہ ہال میں پروگرام کی اجازت تا حال نہیں مل سکی ہے لیکن توقع ہے کہ کل تک اجازت مل جائے گی۔ رات محترم سراج الحق سید صاحب امیر تنظیم اسلامی سندھ جو کہ عمرہ کے لئے سعودی عرب تشریف لے گئے تھے اور سعودی عرب کے متعدد رفقاء بھی حسب پروگرام ابوظہبی پہنچ گئے۔ رات گئے تک مقامی رفقاء اور احباب سے ملاقات و گفتگو رہی۔

۱۹ر نومبر۔ راقم حسب عادت علی الصبح سیر کو نکل گیا۔ وقت کا صحیح اندازہ نہ رہا اور واپسی میں کافی دیر ہو گئی جس کے باعث کافی خجالت کی سی کیفیت کا سامنا کرنا پڑا کہ مقامی رفقاء بہت پریشان تھے۔ صبح سے پروگرام کے اجازت نامہ کا انتظار با جماعت جاری تھا کہ دوپہر کے وقت حتمی انکار کی اطلاع موصول ہو گئی۔ مایوسی اور بددلی کے اثرات رفقاء کے چہروں پر نمایاں تھے خصوصاً مقامی امیر برادرم نسیم الدین صاحب بہت دل شکستہ نظر آ رہے تھے۔ تازہ صورتِ حال پر غور کے لئے امیرِ محترم نے مقامی مشاورت کا اجلاس بعد نماز عصر طلب فرمالیا۔ مغرب تک رفقاء نے اظہار خیال کیا وہ مایوسی اور بددلی جو ابھی تک چہروں پر تھی اسے اب گویا زبان مل گئی تھی۔ نماز مغرب کے بعد امیرِ محترم نے خطاب فرمایا اور رفقاء کی ہمت بندھاتے ہوئے اور متبادل پروگرام کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دی تو ماحول میں بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔ چنانچہ ۲۲ نومبر کو دوبئی اور ۲۳ نومبر کو شارجہ کے لئے پروگرام طے پا گئے۔ اور اگلے روز یعنی ۲۰ نومبر کو ابوظہبی کے رفقاء کے لئے پورے دن کی ورکشاپ کا فیصلہ ہو گیا۔

۲۰ نومبر۔ صبح کی سیر سے قبل راقم برادرم نسیم الدین صاحب کے ہاں حاضر ہوا۔ وہ مردِ درویش ابھی

مصلّے پر بیٹھا تلاوت کی تیاری میں تھا۔ گذشتہ روز کی مایوسی اب ایک نئے عزم میں بدل چکی تھی۔ راقم کو بطور راز بتایا کہ "۲۲ نومبر یعنی صرف ایک دن کے پروگرام کی اجازت کے لئے درخواست دے رہا ہوں" اور پھر ایک عجیب سی کیفیت میں یہ الفاظ ان کی زبان پر آئے کہ "دل نہیں مانتا کہ وہ لوگ مجھے ایک دن کے لئے بھی انکار کر دیں گے۔" صبح ساڑھے آٹھ بجے حسب پروگرام ورکشاپ کا آغاز ہو گیا جو رات سوا گیارہ بجے تک جاری رہا۔ نمازِ جمعہ پاکستان مرکز میں ادا کی۔ شام کو کیپٹن شکیل امیرِ محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ موصوف پاکستان ایئرفورس میں سکواڈرن لیڈر کے منصب پر تھے۔ آج کل ابوظبی ڈیفنس سے منسلک ہیں 'میثاق' کے پرانے قاری اور ابوظہبی میں ہمارے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

۲۱ نومبر۔ صبح ہی سے برادرم نسیم الدین صاحب حسب ارادہ اپنے خفیہ پروجیکٹ میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے موصوف نے یہ خوشخبری سنائی کہ اتوار یعنی ۲۲ نومبر کو پروگرام کے لئے اجازت مل گئی ہے۔ اس موقع پر رفقاء کے جذبات کی جو کیفیت تھی اس کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ وہی رفقاء جو کل تک مایوسی کی تصویر بنے ہوئے تھے آج محسوس ہوتا تھا کہ ان کے اعصاب میں بجلی بھر گئی ہے۔ یہاں تک کہ راقم جیسا غیر کارکن شخص بھی کافی دیر تک اکڑوں بیٹھ کر پوسٹرز وغیرہ کی درستگی میں لگا رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ فارغ ہو کر کمر نے سیدھا ہونے سے انکار کر دیا۔ اور ساتھ ہی ٹانگ کا بھولا ہوا درد بھی عود کر آیا۔ نماز عصر تک نئے موضوع اور پروگرام کے مطابق پوسٹر تیار تھے۔ اخبارات میں اشتہارات اور مساجد میں اعلانات کے مسوّدے بھی تیار ہو چکے تھے۔ رفقاء پیدل' موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں پر پبلسٹی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ رات نو بجے تک یہ ہنگامی پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ ساڑھے نو بجے اجتماعی کھانا ہوا۔ جس کے بعد امیر محترم نے رفقاء سے خطاب فرمایا اور نظم کی اہمیت کے بارے میں رفقاء کو توجہ دلائی۔ امیر محترم کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ کچھ جوشیلے رفقاء کا مقامی امیر کے ساتھ طرزِ عمل تنظیم کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہے۔ امیر محترم نے غزوۂ احد کے حوالے سے بتایا کہ امیر کی معصیت کی سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے فتح کو وقتی شکست میں بدل دیا تھا تاکہ اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے اور آئندہ ایسی غلطی کا اعادہ نہ ہو۔ بعد میں محترم امیر نے رفقاء کے جوش و جذبہ اور لگن کی تعریف فرمائی کہ جس انداز میں ابوظہبی کے رفقاء نے کام کیا ہے وہ بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ گفتگو سوا دس بجے رات سے ساڑھے گیارہ بجے تک جاری رہی آج کی بے پناہ مصروفیت کا اثر امیرِ محترم کی طبیعت پر نمایاں طور پر محسوس ہو رہا تھا۔

۲۲ نومبر۔ الحمدللہ کہ امیرِ محترم کی طبیعت بہتر تھی۔ صبح کے اوقات میں راقم محترم عبدالباری شاہد صاحب کے دفتر میں ملاقات کے لئے گیا۔ موصوف نے اپنی مصروفیات منسوخ کر کے راقم کو وقت دیا جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ رجوع الی القرآن کے پلیٹ فارم پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے موضوع پر کھل کر گفتگو ہوئی۔ دوپہر کو برادرم نسیم الدین صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ پورے پروگرام کی اجازت مل گئی ہے مگر دوبئی اور شارجہ کے پروگرام بھی چونکہ طے ہو چکے ہیں' لہٰذا ابوظہبی میں مزید صرف دو دن پروگرام رکھا جا سکتا ہے...... اسی شام لندن سے محترم افسر صدیقی صاحب کا فون بھی آیا۔

لندن میں پروگرام کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ رات بعد نماز عشاء پاکستان مرکز میں وہ پروگرام تھا جس کے لئے یہ تمام بھاگ دوڑ کی گئی تھی۔ دو سال پہلے کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ پورے علاقہ میں میلہ کا سا سماں تھا۔ اس کے باوجود کہ وقت کی کمی کے باعث مناسب تشہیر نہیں ہو سکی تھی حاضری لگ بھگ دو ہزار تھی۔ دورانِ پروگرام ہی سعودی عرب سے ایک دوست محترم قاری عبدالباسط صاحب بھی تشریف لے آئے۔ موصوف صوبہ سرحد کے دینی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ بریدہ میں ریاض یونیورسٹی کی طرف سے بطور استاد متعین ہیں۔ نہایت منکسر المزاج، صالح اور ذہین و لائق نوجوان ہیں۔ ایک عرصہ سے سعودی عرب میں مقیم رفقاء تنظیم سے رابطہ تھا مگر چند اشکالات کے باعث تنظیم میں باقاعدہ شمولیت ابھی نہیں ہوئی تھی۔ امیر محترم نے اسی غرض سے انہیں ابوظہبی میں ملاقات کی دعوت دی تھی۔ اب الحمدللہ ہمارے قافلہ میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خدمتِ دین کے کام میں تنظیم اسلامی کے لئے ایک اہم ستون ثابت ہوں۔ (آمین) پاکستان مرکز میں پروگرام الحمدللہ بہت بھرپور رہا۔ بعد میں کیپٹن شکیل صاحب کے ہاں پُر تکلف دعوتِ عشائیہ تھی۔ جہاں سے رات ساڑھے بارہ بجے فراغت ہوئی۔

۲۳ نومبر۔ صبح امیر محترم کا زیادہ وقت محترم قاری عبدالباسط صاحب سے گفتگو میں گذرا بعض دیگر حضرات بھی ملاقات کے لئے آئے۔ دوبئی سے محترم عبدالسلام صاحب کا فون پروگرام کو کنفرم کرنے کی غرض سے آ گیا تھا۔ بعد نماز عصر چار گاڑیوں پر مشتمل قافلہ دوبئی روانہ ہوا۔ جہاں ایک مقامی ہوٹل میں قیام تھا۔ رات ساڑھے آٹھ بجے دوبئی سوسائٹی ہال میں پروگرام کا آغاز ہوا۔ موضوع تھا "سیرت النبیؐ کے عملی پہلو"۔ دوبئی کے رفقاء بڑی سرگرمی سے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مصروف تھے۔ تقریباً ایک ہزار افراد امیر تنظیم کے خطاب کو سننے کے لئے جمع تھے۔ اچھا خاصا کشادہ ہال تنگ پڑتا محسوس ہو رہا تھا۔ محترم خلیل بٹکل صاحب پروگرام کے آرگنائزر تھے۔ خدمتِ دین کے جذبہ سے مغلوب انتہائی فعال شخصیت، ان کا تعلق بھارتی ساحلی علاقہ بٹکل سے ہے۔

۲۴ نومبر۔ ناشتہ کی دعوت محترم خلیل بٹکل صاحب کے ہاں تھی۔ دعوت میں بھارت سے محترم ڈاکٹر مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) کے معتمد خاص جناب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی موجود تھے۔ مولانا علی میاں کی خیر خیریت بھی ان کی زبانی معلوم ہوئی۔ بٹکل برادری ہی کے ایک تاجر محترم محمد جعفری صدیق صاحب جنہوں نے دوبئی میں اسلامی طرز کا جدید سکول کھول رکھا ہے، بھی موجود تھے۔ انہوں نے ۱۹۸۵ء میں ابوظہبی میں ہونے والے پروگرام کے وڈیو کیسٹس کے حوالے سے بتلایا کہ ان وڈیو کیسٹوں کو بھارت میں بہت قبولِ عام حاصل ہوا ہے۔ اور ان کے نہایت خوشگوار اثرات بھارت کے دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے مسلمانوں میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ خود ان کی شہادت کے مطابق بعض الٹرا ماڈرن خاندانوں نے ان کیسٹوں سے اس درجے اثر قبول کیا ہے کہ ان مغرب زدہ خاندانوں کی وہ بچیاں جو نیم عریاں لباس پہن کر جاگنگ کیا کرتی تھیں اب اللہ کے فضل و کرم سے مکمل ستر حجاب کی پابندی کے ساتھ سکول و کالج جاتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ مثال ہم پاکستانیوں کے لئے چیلنج ہے۔ جن کے خیال میں آج کے دور میں ستر و حجاب کی پابندی نہایت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ محفل کے اختتام پر

جہ سے محترم ڈاکٹر اظہر زیدی صاحب اور محترم نصرت علی صاحب شارجہ کے پروگرام کے سلسلہ میں
و کے لئے تشریف لے آئے۔ گیارہ بجے محترم جعفری صدیق صاحب کی دعوت پر اُن کا اسکول
ی کے لئے گئے۔ ظہرانہ پھر محترم خلیل بٹکل صاحب ہی کی جانب سے تھا۔ موصوف کی خواہش تھی
دبئ کا پروگرام مزید بڑھا دیا جائے۔ مگر پہلے سے طے شدہ شیڈول کے باعث یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ
یہ ہوا کہ لندن روانگی سے قبل دوبئ میں رات کا قیام رکھا جائے...... شام کو شارجہ میں پاکستان ویلفیئر
ائی ہال میں "انقلاب اسلامی کا عملی طریقہ" کے عنوان سے امیر محترم نے دو گھنٹے تک مفصل
ب فرمایا۔ چھوٹا سا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ہزار کے لگ بھگ موجود افراد نے ڈاکٹر صاحب کے اس
ب کو پوری دلجمعی سے سُنا۔ یہاں ایک پرانے رفیق شاہد محمود سے بھی ملاقات ہوئی جو آج کل دوبئ میں
ہیں۔

راس الخیمہ سے رفقاء گرامی محترم طفیل گوندل صاحب اور محترم اقبال ملک صاحب بھی تشریف
ئے ہوئے تھے۔ میجر امین منہاس صاحب سے تو قارئین 'میثاق' خوب واقف ہیں ' انکے بڑے
حبزادے شاہد منہاس صاحب بھی پروگرام میں شریک رہے۔ عشائیہ کا اہتمام بھی محترم ڈاکٹر اظہر
ں' محترم نصرت علی صاحب اور محترم شاہد منہاس صاحب ہی کی طرف سے تھا۔ شارجہ میں پروگرام
آرگنائزرز بھی یہی احباب تھے۔ فارغ ہوتے ہوتے رات کا ایک بج گیا۔

۲۵۔ نومبر صبح مختلف احباب سے ملاقاتیں رہیں۔ عزیزم شاہد منہاس اور جماعت اسلامی کے
ذمہ دار بزرگ جناب صالح کندی صاحب بھی تشریف لائے۔ ساڑھے نو بجے ابو ظہبی کے لئے
ل ہوئی۔ ابو ظہبی پہنچ کر برادرم نسیم الدین صاحب نے ابو ظہبی میں آئندہ پروگرام کی تفصیلات سے
ہ کیا۔ آج شام پاکستان مرکز میں حقیقت ایمان کے موضوع پر خطاب تھا۔ قریباً ۱۵۰۰ افراد
رام میں شریک تھے۔ راس الخیمہ کے دونوں رفقاء اور دوبئ سے برادرم اقبال چوہدری صاحب
آج ہمارے ساتھ تھے۔ دعوت عشائیہ رفیق محترم عمران بٹ صاحب کے ہاں تھی۔

۲۶۔ نومبر آج بھی صبح کا زیادہ وقت امیر محترم اور محترم قاری عبدالباسط صاحب کے درمیان
وہی میں گزرا۔ عصر کے وقت ونگ کمانڈر سلیم بیگ صاحب اور جنرل امتیاز صاحب ملاقات کے
تشریف لے آئے۔ ان سے مختلف امور پر مفصل گفتگو ہوئی۔ آج پاکستان مرکز میں خطاب کا
موع "ایمان حقیقی اور قانونی" تھا حاضری خوب رہی۔ فراغت حسب معمول نصف شب تک ہوئی۔

۲۷۔ نومبر آج جمعہ مسجد ترکی میں ادا کیا جو ابو ظہبی کی انتہائی خوبصورت اور شاندار مسجد ہے۔
ں پاکستانی سفارت کار محترم انیس پرویز صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ ابو ظہبی میں پروگرام کی
ازت حاصل کرنے میں موصوف کی کاوش کو بھی بڑا دخل حاصل تھا۔ ہم ان کے ممنون احسان ہیں
دعا گو ہیں کہ رب العزت ان کو اجر عظیم عطا فرمائیں۔ شام کو ونگ کمانڈر سلیم بیگ صاحب سے پھر
صل گفتگو رہی اسی شام محترم سراج الحق سید صاحب عازم پاکستان ہوئے اور محترم قاری عبدالباسط
احب نے سعودی عرب کی راہ لی۔ رات شہر کے ایک ہوٹل میں محترم عبدالہادی شاہد صاحب نے اپنے
باب کے تعاون سے تھنکرز فورم (Thinkers Forum) کی جانب سے "دعوت رجوع الی القرآن"

کے ضمن میں ایک پروگرام کا اہتمام کر رکھا تھا صرف منتخب لوگ ہی مدعو تھے۔ امیر محترم نے "امت مسلمہ کے عروج و زوال کا پس منظر اور موجودہ دور میں دین کا کام کرنے کا طریقہ" کے موضوع پر بالکل ہی منفرد انداز میں انتہائی بصیرت افروز اور جامع خطاب ارشاد فرمایا۔ راقم کا اپنا خیال یہ ہے کہ ایسی بھرپور اور متاثر کن تقریر اس سے قبل اس نے بھی نہیں سنی تھی دیگر شرکاء کے تاثرات کا اندازہ تو قارئین خود لگا سکتے ہیں۔

۲۸۔ نومبر دن کا آغاز محترم جی۔ ایم خان صاحب کے ہاں پرتکلف ناشتہ سے ہوا۔ صبح کے اوقات میں مختلف احباب سے ملاقات رہی۔ آج دعوت ظہرانہ رفیق محترم قمر حسن صاحب کے ہاں تھی۔ وہیں سے دوبئی کے لئے روانگی ہوئی۔ دوبئی میں ٹبکل برادری کے ایک اور دوست محترم محمد ابراہیم صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ نماز عشاء کے بعد محترم جعفری صدیق صاحب کے سکول پہنچے جہاں امیر محترم کے درس قرآن کا پروگرام تھا۔ انتظامات بہت عمدہ تھے۔ امیر محترم نے سورۃ الحج کے آخری رکوع کے حوالے سے مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ موسم میں خنکی کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے باوجود حاضری بھرپور تھی۔ امارات میں ہمارے پروگرام کی یہ آخری شام تھی۔

۲۹۔ نومبر دوبئی میں ہمارا قیام محترم جعفری صدیق ٹبکل صاحب کے ہاں تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اعلان کے مطابق وہیں سوال جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ ۲۰ افراد افہام و تفہیم کی غرض سے محفل میں شریک تھے جن میں سے پانچ حضرات نے بیعت کر کے ہمارے قافلہ میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا۔ ساڑھے دس بجے لندن کے لئے ایئرپورٹ روانگی ہوئی۔ حسب سابق محترم ظفر صاحب الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ جہاز دو گھنٹے تاخیر سے روانہ ہوا۔ مگر تاخیر کا اعلان چونکہ جہاز میں سوار ہونے کے بعد کیا گیا لہٰذا وہ وقت بھی جہاز میں گزرا۔ جہاز کے کپتان اعجاز ڈودھی سے تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ میثاق کے مستقل قارئین میں سے ہیں۔ موصوف کے ساتھ خوب گفتگو رہی۔ زیادہ وقت انہی کے کیبن میں گزرا۔ لندن میں شدید دھند کے باعث جہاز کو فرینکفرٹ اترنا پڑا۔ پی آئی اے کی طرف سے فرینکفرٹ شیرٹن میں قیام کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۳۰ نومبر صبح طلوع آفتاب کے بارے میں استفساء پر بھانت بھانت کے جوابات سننے میں آئے۔ [illegible] کے وقت کے تعین میں خاصی دقت پیش آئی۔ بہرحال سوا سات بجے نماز پڑھ ہی لی۔ جو وہاں [illegible] حساب سے فجر کا صحیح وقت تھا۔ ایک طویل اور بے مصرف انتظار کے بعد اللہ اللہ کر کے سوا ایک ب[illegible] لندن روانہ ہوئے۔ لندن ایئرپورٹ سے فارغ ہوتے ہوتے پونے چار بج گئے۔ محترم افسر صد[illegible] صاحب اور عزیزم تنویر الاسلام صاحب ہمیں خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھے۔ لندن میں قیام مح[illegible] افسر صدیقی صاحب ہی کے ہاں رہا۔

یکم دسمبر صبح نو بجے محترم صدیقی صاحب کے دفتر ٹہ پلی روانگی ہوئی۔ راستہ ہی میں پروگر[illegible] کی تفصیلات طے کر لی گئیں۔ رفیق محترم ظہور الحسن صاحب نے فون پر اطلاع دی کہ وہ تھوڑی دیر [illegible] پہنچ رہے ہیں۔ مگر خود گاڑی نہ چلا سکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو گھنٹے بعد پہنچ پائے۔ مولانا عبدالغفار [illegible]

احب کے صاحبزادے، مولانا صہیب حسن بھی ملاقات کے لئے وہیں تشریف لے آئے۔ مغرب
ں ملاقاتوں کی نشست رہی۔ عشاء کے وقت واپس گھر پہنچے تو بہت سے ملاقاتیوں کو موجود پایا۔ امیر
ترم کی ابتدائی تعارفی گفتگو کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ یہ نشست رات دیر تک
اری رہی۔

۲۔ دسمبر۔ آج دن کا زیادہ وقت گھر پر ہی گزرا۔ محترم ظہور الحسن صاحب بھی بمعہ اہلیہ تشریف
لے آئے۔ اسی دوران مشی گن سے رفیق محترم رشید لودھی صاحب کا فون آ گیا۔ محترم افسر صدیقی
احب کی دفتر سے واپسی شام تین بجے ہوئی۔ رات کا کھانا جلد کھا کر لندن یونیورسٹی گئے جہاں سکالرز
ے ایک اجتماع سے امیر محترم کو خطاب کرنا تھا۔ حاضرین میں کم وبیش پچاس سکالرز پی ایچ ڈی کی ڈگری
کھتے تھے۔ امیر محترم نے 'ISLAM TODAY' کے موضوع پر بزبان انگریزی بیس منٹ کا لیکچر دیا۔ امیر محترم
نے اپنے خطاب میں واضح کیا کہ اس وقت اصل ضرورت ایمان کی آبیاری کی ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ
ت کے ایمان کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ آج کا مفکر ایمان کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اسلامی نظام
یات کے بارے میں سوچتا ہے۔ اور یہی ہماری بڑی غلطی ہے۔ پہلے ایمان ہو گا تو بات آگے چلے گی۔
فل میں موجود سکالرز کی اکثریت بے حد متاثر تھی۔ بالخصوص محترم افسر صدیقی صاحب تو بہت خوش
تھے۔ دراصل امیر محترم نے راستے میں کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ انہیں انگریزی پر عبور ہی
اصل نہیں ہے۔ جبکہ محترم صدیقی صاحب کا تبصرہ یہ تھا کہ میں نے آج تک کسی پاکستانی مقرر کو ایسی
ھی انگریزی بولتے نہیں سنا۔ واپسی پر جماعتِ اسلامی لندن کے مرکز ہوتے ہوئے آئے جہاں محترم
شید صدیقی صاحب اور محترم محمد علی کیانی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ محترم کیانی صاحب تفہیم
لقرآن کا ترکی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اور محترم رشید صدیقی صاحب مرکز کے سابق صدر ہیں۔
ولانا مودودی مرحوم کا لندن میں قیام اکثر انہی کے ہاں ہوا کرتا تھا۔

۳۔ دسمبر آج مصروفیت کم تھی۔ محترم صدیقی صاحب سے پروگرام کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی اور
طے پایا کہ اسلامک کلچرل سنٹر میں پہلے دو روز عوامی دلچسپی کے حامل موضوعات یعنی "اسلام اور
پاکستان" اور "اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں۔ کیسے؟" پر گفتگو ہو۔ اور بعد کے ایام میں سورۃ الحدید کا
درس مکمل کیا جائے۔ ۴ دسمبر کے لئے "اسلام اور پاکستان" کا اشتہار اخبار میں دے دیا گیا۔

۴۔ دسمبر نماز جمعہ کے لئے بالہام (BALHAM) کی مسجد میں جانا ہوا۔ جہاں خطبہ جمعہ امیر محترم نے
نگریزی میں دیا۔ یہ مسجد لندن میں تبلیغی بھائیوں کا مرکز ہے۔ حاضری خوب تھی اور نوجوان تو خصوصاً
ڑی تعداد میں تھے۔ بعد کے سوالات سے ان نوجوانوں کی دلچسپی کا اندازہ ہوا۔ نماز جمعہ کے بعد اردو میں
قریباً ڈیڑھ گھنٹہ امیر محترم نے خطاب فرمایا۔ اور دینی جماعتوں کا نام لئے بغیر ان کے کاموں کا ایک
بھرپور جائزہ پیش کیا۔ جہاں اچھے پہلو کی تعریف کی وہاں خامی اور کوتاہی کی نشاندہی بھی کی۔ حاضرین نے
ڑی توجہ سے خطاب سنا۔ اور اسی مسجد میں آئندہ کے لئے ایک اور خطاب کا وعدہ لے کر ہی واپسی کی
جازت دی۔ یہاں سے سیدھے محترم صدیقی صاحب کے دفتر آئے جہاں ایک نومسلم سے ملاقات طے
ھی مگر وہ کسی وجہ سے پہنچ نہ سکے۔ لہٰذا شام کے پروگرام کی تیاری کے لئے گھر واپس آ گئے۔ مغرب
کے بعد پروگرام کی پہلی نشست کے لئے اسلامک کلچرل سنٹر، ریجنٹ پارک کو روانگی ہوئی۔ ٹریفک جام

ہونے کے باعث راستہ ڈیڑھ گھنٹہ میں طے ہوا اور بمشکل نماز عشاء کی رکعت اول میں شامل ہو پائے
نماز عشاء کے بعد پروگرام شروع ہوا۔ امیر محترم کے خطاب کا موضوع تھا "اسلام اور پاکستان
ور کنگ ڈے اور موسم کی سختی کے باعث حاضری بہت زیادہ نہیں تھی۔ تاہم ڈھائی سو کے لگ بھگ
شریک محفل تھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب دو گھنٹوں پر محیط تھا جسے حاضرین نے پوری دلچسپی اور
سے سنا۔

۵۔ دسمبر آج صبح ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ ناشتے کے بعد آئندہ سفر کی بکنگ کے لئے ڈاؤن ٹاؤن
ہوا۔ دن بھر بوندا باندی جاری رہی۔ اندازہ تھا کہ شام کی نشست کی حاضری پر آج کا موسم اثر انداز
گا۔ مگر خلاف توقع شرکاء کی تعداد کل سے زیادہ تھی۔ کم وبیش ۳۵۰ افراد ہال میں موجود تھے۔ خطا
کا موضوع تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا۔ کیوں۔ اور کیسے؟" حاضرین کی دلچسپی کا انداز
کے چہروں کے تاثرات سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ خطاب کے اختتام پر سوال جواب کی نشست کے
آخری دن کا تعین بھی کر دیا گیا۔

۶۔ دسمبر مسجد قریب نہ ہونے کے باعث نماز فجر چونکہ گھر پر ہی ادا کی جاتی تھی لہٰذا کچھ نوجوان مو
غنیمت جانتے ہوئے نماز فجر میں ہمارے ساتھ شریک ہو جاتے تھے۔ عموماً بعد میں گفتگو اور سوال وجو
کا سلسلہ چل نکلتا تھا۔ آج بھی نماز کے بعد اسلام اور پاکستان کے موضوع پر گفتگو رہی۔ نوجوانو
سوالات سے اسلام اور پاکستان کے بارے میں ان کی گہری دلچسپی ظاہر ہو رہی تھی۔ دوپہر ساڑھے
بجے بالہام (PALHAM) کی مسجد روانگی ہوئی۔ مسلمانوں کے دینی فرائض کے موضوع پر ظہر تا عصر امیر
نے مفصل گفتگو فرمائی۔ یہاں حاضری خوب بھرپور تھی۔ مسجد ہی میں محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب
ملاقات ہوئی۔ موصوف کا تعلق بہار سے ہے اور دین کے لئے درد رکھتے ہیں۔ اور اسی جذبہ کے
ہمارے ساتھ کمپنی کرتے رہے۔ سوان سی (SWAN-SEA) سے رفیق محترم صفدر حسین شاہ صاحب بھی
ظہور الحسن صاحب کے ہمراہ تشریف لائے ہوئے تھے۔ بعد عشاء اسلامک کلچرل سنٹر میں آج سورۃ ا
کے درس کا آغاز ہوا۔ اس سورۂ مبارکہ کے ساتھ امیر محترم کو ایک خصوصی قلبی لگاؤ ہے۔ لوگو
دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حاضری مسلسل بڑھ رہی تھی۔ یقیناً اللہ کا خصوصی
ہمارے شامل حال تھا۔

۷۔ دسمبر دن کے اوقات میں کوئی خاص مصروفیت نہ تھی۔ آج شام اسلامک سنٹر روانگی عزیز
الاسلام کے ہمراہ ہوئی۔ نہایت سرگرم کارکن اور نیک سیرت نوجوان ہیں اور اب ہمارے تنظیمی بھا
ہیں۔ آج سورۃ الحدید کا دوسرا درس تھا جس میں نفاق کی حقیقت کا موضوع تفصیل سے زیر بحث
بفضلہ تعالیٰ حاضری کا گراف مسلسل اوپر کی طرف جا رہا تھا۔

۸۔ دسمبر کی صبح محترم ڈاکٹر جمیل لغاری صاحب اور ان کی اہلیہ نے ملاقات کا وقت لے رکھ
محترم لغاری صاحب لندن میں رہائش پذیر ہیں اور میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر محترم
صاحب کے دفتر روانہ ہوئے جہاں ملاقاتوں کا وقت طے تھا۔ سہ پہر دو بجے گھر واپسی ہوئی۔ ا
سنٹر میں آج بعد نماز عشاء حسب پروگرام سورۃ الحدید کا تیسرا درس ہوا حسب معمول حاضری پر نہ
کا اثر تھا اور نہ ہی ور کنگ ڈے کا۔ دلچسپی بدستور قائم تھی۔ درس کے بعد سوال وجواب کی نشست

لئے کوائف فارم تقسیم کئے گئے جن کے ذریعے سوال کرنے والے احباب کا مختصر تعارف بھی مقصود تھا۔ پروگرام سے فارغ ہو کر بیگم و ڈاکٹر جمیل لغاری صاحب کے ہمراہ واپسی ہوئی عشائیہ بھی انہی کے ہاں تھا۔

۹۔ دسمبر آج بھی صبح کے اوقات محترم صدیقی صاحب کے دفتر میں ملاقاتوں کے لئے مخصوص تھے۔ ظہرانہ برادرم تنویر الاسلام کے ہاں تھا۔ جس کے بعد تھوڑا وقت آرام کے لئے مل گیا۔ اسلامک سنٹر میں بحمد اللہ آج سورۃ الحدید کا مطالعہ مکمل کر لیا گیا۔ آج کی نشست بہت بھرپور تھی۔ واپسی پر محترم خرم بشیر صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔ رات انہوں نے ہمارے ساتھ ہی قیام کیا۔ موصوف کا تعلق شیرانوالہ گیٹ لاہور سے ہے۔ امیرِ محترم سے زمانۂ طالب علمی سے ہی متعارف ہیں۔ آج کل برمنگھم میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔

۱۰۔ دسمبر صبح بذریعہ انڈر گراؤنڈ ٹیوب سفر کرتے ہوئے برادرم ظہور الحسن صاحب کے گھر پہنچے۔ شکاگو سے رفیق محترم سید پیر محمد صاحب کے بڑے بھائی محترم سید ہاشم صاحب بھی وہیں ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ یہاں سے مولانا صہیب حسن صاحب کے ہاں جانے کا پروگرام تھا۔ وہاں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کے صاحبزادے مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی سے بھی ملاقات ہو گئی جو ایک طویل عرصے سے لندن ہی میں مقیم ہیں۔ یہیں محترم رشید صدیقی صاحب سے بھی مفصل ملاقات رہی۔ شام تک یہیں قیام رہا۔ مغرب کے بعد ریجنٹ پارک میں پروگرام کی آخری نشست کے لئے اسلامک کلچرل سنٹر روانگی ہوئی۔ آج کا پروگرام سوال وجواب کے لئے مخصوص تھا۔ یہ نشست اڑھائی گھنٹے تک بڑے بھرپور انداز میں جاری رہی۔ تمام سوالات تحریری شکل میں تھے۔ تقریباً چالیس "سوالنامے" وصول کئے گئے۔ یہ خاصا نازک مرحلہ اللہ کے فضل سے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بلا کسی بدمزگی کے طے ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی لندن میں طے شدہ پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

۱۱۔ دسمبر صبح ساڑھے دس بجے ساؤتھمپٹن (Southampton) کے لئے محترم شیر افضل خان صاحب کے ہمراہ روانگی ہوئی۔ موصوف کا تعلق منگورہ سوات سے ہے۔ ساؤتھمپٹن کی چھوٹی سی مسجد میں خطبہ جمعہ انگریزی زبان میں ہوا۔ یہاں امیر محترم نے حکمت و احکام کے موضوع کا انتخاب کیا۔ نماز کے بعد فلنہ بھر اردو میں بھی خطاب ہوا۔ ظہرانہ محترم شیر افضل صاحب کے ہاں تھا۔ چار بجے واپس لندن روانگی ہوئی۔ کچھ آرام کے بعد نماز عشاء کے فوراً بعد محترم صدیقی صاحب کے دفتر کا رخ کیا جہاں ان لوگوں کو ملاقات کی دعوت دی گئی تھی جو تنظیم سے وابستگی کے لئے آمادہ ہو چکے تھے۔ حاضری تو خوب تھی مگر امیر محترم نے جب لوگوں کے سامنے یہ بات واضح انداز میں رکھی کہ خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ جذبات میں کئے گئے فیصلے دیرپا نہیں ہوا کرتے تو خاطر خواہ نتیجہ بر آمد ہوا۔ تاہم اس تنبیہ کے باوجود ۲۰ حضرات اور پانچ خواتین بیعت کر کے تنظیم کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ آج کا عشائیہ محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب کے ہاں تھا۔ رات گئے تک مصروفیت رہی۔

۱۲۔ دسمبر آج کا دن برمنگھم کے لئے مخصوص تھا۔ دو گاڑیوں پر مشتمل چھوٹے سے قافلے میں امیر محترم اور راقم کے علاوہ محترم سید ہاشم صاحب برادرم تنویر الاسلام صاحب محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب، محترم ظہور الحسن صاحب اور محترم ڈاکٹر حافظ میاں اعجاز صاحب بھی شامل تھے۔ برادرم تنویر الاسلام

صاحب نے اپنی ڈرائیونگ کے خوب جوہر دکھائے اور ہم ٹھیک نماز ظہر کے وقت برمنگھم پہنچ گئے نماز
بعد ظہرانہ میں شرکت کی جس میں مقامی حضرات کی بھی ایک بڑی تعداد مدعو تھی۔ برمنگھم کی خوبصورت
مسجد کے ساتھ ہی اسلامک سنٹر قائم ہے اور اس کے ڈائریکٹر محترم ڈاکٹر خالد علوی صاحب ہیں
موصوف جامعہ پنجاب میں استاد رہے ہیں اور نیو کیمپس کی جامع مسجد میں جمعہ بھی پڑھاتے رہے ہیں
اسی سنٹر میں مقامی میڈیکل ڈاکٹرز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام پروگرام ہوا۔ سنٹر کے پچھلے ہال میں ا
محترم کے خطاب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سورۃ الحج کے آخری رکوع کا درس اڑھائی گھنٹے تک جاری رہا
ہال پُر تھا۔ اندازہ ہے کہ قریباً تین سو افراد شریک پروگرام تھے امیر محترم نے آج چونکہ کھڑے ہو
خطاب فرمایا تھا للہٰذا بعد میں کمر میں قدرے تکلیف محسوس کر رہے تھے۔ واپسی کا سفر دشوار رہا۔ مگر
ڈاکٹر میاں حافظ اعجاز صاحب کے ساتھ تمام راستہ خدمت دین کے موضوع پر مفید گفتگو رہی
موصوف نے لندن پہنچ کر تنظیم میں شمولیت کا ارادہ ظاہر کیا اور امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ م
حافظ صاحب بائیوکیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہیں۔ سعودی عرب میں طویل عرصہ تک مقیم رہے۔ ا
یونیورسٹی سے بھی فارغ التحصیل ہیں۔ آج کل لندن میں تقریباً ہمہ وقت دین کے لئے اپنے آپ کو وا
کئے ہوئے ہیں۔

۱۳۔ دسمبر صبح امیر محترم کی طبیعت بہتر تھی۔ اور انہوں نے آج جدّہ روانگی ایک روز کے لئے ملتوی
دی۔ تاکہ لندن میں نئے رفقاء سے تنظیمی امور پر تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ چنانچہ اسی غرض سے امیر
ایک نئے رفیق محترم عبدالعزیز صاحب کے ہاں منتقل ہو گئے' جن کی رہائش گاہ لندن کی نسبتاً مرکزی
" " میں واقع ہے۔ وہاں شام کو رفقاء لندن کا تنظیمی سطح پر پہلا باقاعدہ اجتماع ہوا۔ اس اجتماع
موقع پر رفقاء کی تعداد ۳۴ ہو گئی جن میں ۲۶ مرد اور ۸ خواتین شامل ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہما
ان نئے رفقاء گرامی کو ہمت و استقامت عطا فرمائیں۔ اور اپنے دین کی خدمت کے لئے ان سب کو
فرمالیں۔ (آمین) راقم الحروف محترم صدیقی صاحب ہی کے ہاں سے سیدھا ایئرپورٹ روانہ ہوا۔
سے نیویارک روانگی مقصود تھی۔ محترم صدیقی صاحب اور برادرم تنویر الاسلام ہمراہ تھے۔ ایئرپو
محترم ڈاکٹر علی رضا صاحب' محترم ڈاکٹر میاں اعجاز صاحب اور محترم ظہور الحسن صاحب الوداع کے
لئے تشریف لائے ہوئے تھے۔

۱۴۔ دسمبر دن کا تمام وقت امیرِ محترم کا ملاقاتوں میں گزرا۔ اسی رات امیر محترم عمرے کی غرض
جدہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ جہاں پندرہ دسمبر کی صبح پہنچتے ہی فوراً عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے
۱۶ دسمبر کو مدینہ طیبہ حاضری دی۔ رات کا قیام بھی مدینے ہی میں رہا۔ وہاں رفیق محترم شاہد خلیل
سے بھی ملاقات رہی۔ ۱۷ اور ۱۸ دسمبر کے دن جدّہ میں رفقاء تنظیم سے ملاقات کے لئے مخصوص
امیر محترم سے ملاقات کے لئے پورے سعودی عرب سے رفقاء جدہ میں جمع ہو گئے تھے۔ اس موقع
کے رفقاء کی کوشش تھی کہ اجتماع عام کا اہتمام بھی ہو جائے۔ چنانچہ آخری وقت میں اجازت ا
مسجد تعاون میں ۱۷ اور ۱۸ دسمبر کی شام مسلسل دو نشستوں میں خطاب عام کے پروگرام ہوئے۔ جو
تشہیر نہ ہو سکنے کے باوجود انتہائی بھرپور اور کامیاب اجتماعات رہے۔ روزانہ حاضری کا اندازہ ایک
لگ بھگ تھا۔

۱۹۔ دسمبر کا دن پھر تنظیمی امور کے لئے مخصوص تھا۔ اسی روز کراچی روانگی ہوئی۔ جہاں ۲۰ دسمبر کو تنظیم اسلامی کراچی کے اجتماع میں شرکت کے علاوہ بزرگ رفیق محترم بھائی جمیل الرحمان صاحب کی عیادت فرمائی۔ موصوف ان دنوں صاحب فراش تھے۔ الحمد للہ اب رو بصحت ہیں اس انتہائی مصروف اور تھکا دینے والے دورے کے بعد امیر محترم ۲۱ دسمبر کی صبح اللہ کی تائید و توفیق سے بخیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔ اب کچھ مختصر بیان راقم الحروف کے امریکہ قیام کا بھی ہو جائے کہ یہ بھی اسی سفر کا حصہ تھا۔ راقم ۱۳ دسمبر کی تاریخ ہی میں نیویارک پہنچ گیا۔ ایئرپورٹ پر نیویارک سے ہمارے رفیق محترم الطاف احمد صاحب کے علاوہ رفیق محترم ڈاکٹر خورشید ملک کے بھتیجے عزیزم ڈاکٹر اطہر ملک اپنے دوست عزیزم طارق صاحب کے ہمراہ موجود تھے۔ اسی رات شکاگو روانگی ہوئی۔ جہاں ۱۹ دسمبر تک قیام رہا۔ یہاں راقم کے میزبان حسب معمول برادرم محترم ڈاکٹر خورشید ملک صاحب تھے۔ شکاگو میں قیام کے دوران رفقاء سے انفرادی و اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ تنظیمی امور کے ساتھ Q.S.S کے معاملات بھی زیر بحث آئے۔ ۱۹ تا ۲۲ دسمبر تک مشی گن کے شہر ڈیٹرائٹ میں برادرم رشید لودھی صاحب کے ہاں قیام رہا۔ گزشتہ سفر کے دوران یہاں کچھ احباب نے تنظیم میں شمولیت کی غرض سے بیعت کی تھی۔ مگر ان کے ساتھ باقاعدہ تنظیمی سطح پر کوئی تفصیلی گفتگو نہ ہو سکی تھی۔ حالیہ سفر خاص اسی غرض سے تھا۔ ٹورنٹو سے بھی تقریباً بھی رفقاء وہاں آ گئے تھے۔ چنانچہ ٹورنٹو کے امور بھی تفصیل سے زیر گفتگو آئے۔ ۲۲ دسمبر کا دن رفیق محترم رضا علی بابر صاحب کے ہمراہ گزار کر شام کو راقم نیویارک روانہ ہوا۔ جہاں سے براہ راست پرواز کے ذریعہ ۲۳ دسمبر کی شام جدہ پہنچا۔ جدہ میں قیام برادرم محترم اصغر حبیب صاحب کے ہاں تھا۔ اگلے روز عمرہ کی سعادت حاصل کی ان دنوں ہمارے ایک محترم رفیق جو قرآن اکیڈمی ہاسٹل کے انچارج بھی ہیں، میجر محمود احمد صاحب بھی پاکستان سے عمرہ کی غرض سے تشریف لائے ہوئے تھے۔ ان کی معیت بھی وہاں حاصل رہی۔ ۲۵ دسمبر کو ریاض، الواسع اور طائف وغیرہ سے رفقاء ملاقات کے لئے تشریف لے آئے۔ جدہ کے رفقاء بھی اس موقع پر موجود تھے سعودی عرب کی سطح پر تنظیمی امور زیر بحث رہے۔ ۲۶۔ دسمبر کو دوبارہ عمرے کے لئے مکہ کا رخ کیا اس مرتبہ چار روز حرم مکی میں قیام رہا۔ ۳۰ دسمبر کو واپس جدہ آ کر اگلے روز برادرم فیض اللہ ملک صاحب اور محترم میجر محمود احمد صاحب کے ہمراہ مدینہ منورہ کے لئے روانگی ہوئی۔ شب وہیں گزار کر فجر کے وقت مکہ مکرمہ واپس آئے اور نماز فجر حرم شریف میں ادا کی۔ شام تک جدہ واپس پہنچ گئے۔ یکم اور دو جنوری کے دن تنظیمی امور کے لئے مخصوص تھے۔ ۲ جنوری کی رات کراچی کے لئے روانگی ہوئی۔ اور ۳ جنوری کی شام بخیر و عافیت واپس لاہور پہنچ گیا۔ اس سفر کے دوران ابوظہبی۔ برطانیہ۔ امریکہ اور سعودی عرب کے رفقاء گرامی اور احباب نے جس محبت اور خلوص کا اظہار فرمایا اور قیام کے دوران بالکل گھر کی سی سہولتیں مہیا فرمائیں۔ اس سب کے لئے ہم سب ہی کے فرداً فرداً مشکور و ممنون ہیں بالخصوص ابوظہبی کے رفیق محمد حسن انجم صاحب کا ذکر نہ کرنا احسان ناشناسی ہو گی جو ہماری سہولت کی خاطر اپنے گھر کو چھوڑ کر اپنی اہلیہ اور بچوں سمیت عارضی طور پر جمعیت خدام القرآن کے دفتر کے قریب ایک فلیٹ میں مقیم ہو گئے تھے ہمارا قیام تو دفتر میں تھا لیکن ہمارے طعام کی تمام تر ذمہ داری حسن انجم صاحب نے اپنے سر لی تھی۔ ہماری دعا ہے کہ رب العزت ان سب احباب و رفقاء کا خلوص اور ان کی سعی و جہد کو قبول فرمالیں۔ (آمین)

معمولی کوشش — بہت بڑا اجر

ادارہ 'میثاق' کے ساتھ عملی تعاون کی ایک صورت!

اگر آپ 'میثاق' کے مستقل خریدار ہیں اور اسے اپنے لیے مفید خیال کرتے ہیں تو فطری طور پر آپ کی یہ خواہش بھی ہوگی کہ اسے اپنے حلقۂ احباب میں متعارف کرائیں۔ ویسے بھی نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی روشنی میں کہ "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی کچھ پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے" یہ ہمارا دینی و اخلاقی فریضہ بھی بنتا ہے کہ ماہنامہ 'میثاق' کے ذریعے جو علمی و فکری رہنمائی ہمیں حاصل ہو رہی ہے اُسے عام کرنے کی کوشش کریں۔

آپ کا حلقۂ احباب یقیناً بہت وسیع ہوگا۔ لیکن آغازِ کار کے طور پر آپ اپنے احباب میں سے صرف دو حضرات کو 'میثاق' کا سالانہ خریدار بنا دیجئے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کی ذرا سی کاوش سے کسی شخص کی زندگی کا رُخ بدل جائے، اُس کے باطن میں ایمان کی حرارت پیدا ہوجائے اُس کا تصورِ دین درست ہوجائے اور وہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہوجائے۔ اور اس طرح اس کے نیک اعمال کا ثواب آپ کو بھی برابر ملتا رہے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خیر کی جانب رہنمائی کرنے والا، خیر کا کام کرنے والے کی مانند ہے!"

آپ کی سہولت کے پیشِ نظر سالانہ خریداری کے کوپن منسلک کر دیئے گئے ہیں جن کی مدد سے آپ اپنے عزیز رشتہ داروں یا احباب میں سے کسی ایک یا دو حضرات کے نام ماہنامہ 'میثاق' جاری کرا سکتے ہیں۔ اندرونِ پاکستان اس پر ٹکٹ لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ماہنامہ میثاق جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل

ایک سال / دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرِ تعاون

روپے / ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ----------------------------

پتہ ----------------------------

نوٹ: جو حضرات زرِ تعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے ۔/ ...

سال کے لیے ۔/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ ۔/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے ...

میں اپنے عزیز / دوست کے نام ایک سال / دو سال

ماہنامہ 'میثاق' جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل

ایک سال / دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرِ تعاون

روپے / ایک صد روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ----------------------------

پتہ ----------------------------

نوٹ: جو حضرات زرِ تعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے ...

سال کے لیے ۔/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ ۔/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے ...

اب ۳۰ سے متجاوز ہے اس میں نصف سے زیادہ غیر رفقاء شریک ہوتے ہیں۔

درس کے علاوہ اس پروگرام میں مطالعۂ کتب اور مذاکروں کا پروگرام ہوتا ہے جس سے کہ رفـ

مرکزی انجمن خدام القرآن
ماڈل ٹاؤن
۵۴۷۰۲

منجانب

پتہ

جوابی کارڈ ٹرسٹ پرمٹ نمبر ۱۹-

مرکزی انجمن خدام القرآن
ماڈل ٹاؤن
۵۴۷۰۲

منجانب

پتہ

تنظیم اسلامی حلقہ ملتان کی دعوتی سرگرمیاں

مرتب: مختار حسین فاروقی

'تنظیم اسلامی' جن انقلابی قدروں کی داعی ہے اس منزل اور وادی کی راہیں بڑی کٹھن اور حوصلہ شکن ہیں۔ اپنے 'آج' کو 'کل' کے لئے قربان کر دینا اس راستے کا پہلا قدم ہے۔ 'حبِ عاجلہ' اور فوری مفادات ابنِ آدم کو فکرِ فردا سے بے نیاز کئے رکھتے ہیں۔ ایسے ماحول میں رفقائے تنظیم کے لئے لازم ہے کہ وہ جیسے ہوا اور پانی کی ضرورت کا احساس رکھتے ہیں اسی طرح دعوت اور تربیت کو روحانی زندگی کے لئے ضروری سمجھیں۔ جیسے ہوا اور پانی کے بغیر مادی اور جسمانی حیات کا تسلسل ناممکن ہے بعینہٖ اسی طرح دعوت اور تربیت پر توجہ کے بغیر آدمی کا اس غلط ماحول میں اپنے اسلام اور ایمان کو بچا لے جانا ناممکن ہے۔

حلقہ ملتان کی سرگرمیوں میں بحمد اللہ 'دعوت' اور 'تربیت' ہی دو نمایاں اور اہم گوشے ہیں بلکہ صحیح تر الفاظ میں صرف انہی دو کاموں پر پوری توجہ مرکوز ہے۔

☆ دعوت کے ضمن میں کیسٹوں اور کتابوں کے سٹال اور خطابات عام کے علاوہ مرکز ملتان میں ہفتہ وار اجتماعِ جمعہ بھی ہے۔ رفقاء امیرِ محترم کے کیسٹ اور کتب کے (نماز جمعہ کے بعد مساجد کے باہر) سٹال کا اہتمام کرتے ہیں، جس میں فروخت برائے نام سہی 'تنظیم کی بنیادی دعوت کی ایک خاموش تبلیغ ہو رہی ہے۔

☆ شجاع آباد میں رفیق محترم محمد سعید بھٹہ صاحب جمعرات کی شب تشریف لے جاتے ہیں' مغرب تا عشاء مطالعہ قرآن کی نشست ہوتی ہے' رفقاء اور محنت اور تندہی سے کوشش کریں تو یہ نشست قرآنِ مجید کے ذریعے فرائضِ دینی کے تصور کو اجاگر اور عام کرنے میں بہت مفید ہو سکتی ہے۔

☆ وہاڑی میں ہر اتوار کی شب ڈاکٹر منظور حسین صاحب قیمِ حلقہ تشریف لے جاتے ہیں ملاقاتوں کے علاوہ مغرب تا عشاء منتخب نصاب (۱) کا درس ہوتا ہے۔

☆ مرکزِ ملتان میں جمعہ کی شام عصر تا رات دس بجے ایک اجتماع ہوتا ہے جس میں رفقائے ملتان کے علاوہ دوسرے حضرات بھی تشریف لاتے ہیں۔ اس پروگرام میں مغرب تا عشاء عام درس قرآن ہوتا ہے جس کے لئے ہینڈ بل بھی طبع کرائے گئے ہیں اور ان کو وسیع حلقے میں پھیلایا گیا ہے' نماز جمعہ کے بعد مختلف مساجد میں بھی تقسیم کیا گیا ہے۔ قریبی تعلیمی اداروں اور دفاتر میں بھی تقسیم ہوئے ہیں۔ حاضری الحمد للہ اب ۳۰ سے متجاوز ہے اس میں نصف سے زیادہ غیر رفقاء شریک ہوتے ہیں۔

درس کے علاوہ اس پروگرام میں مطالعۂ کتب اور مذاکروں کا پروگرام ہوتا ہے جس سے کہ رفقا

میں تنظیم کی دعوت کو سمجھنے اور اس کے اظہار پر قدرت حاصل ہو سکے۔ کھانے کی نشست میں رفقاء گھروں سے لایا ہوا کھانا کھاتے ہیں اور یوں یہ وقت خوش اسلوبی سے (بغیر کسی بوجھ اور گھبراہٹ کے) گوناگوں سرگرمیوں میں صرف ہوتا ہے۔

☆ جھنگ میں بھی منتخب نصاب کے درسِ قرآن کی ایک نشست باقاعدگی سے منعقد ہو رہی ہے۔ عمل صالح کی تفاصیل میں سورۂ بنی اسرائیل کے رکوع ۳ اور ۴ پڑھ لئے ہیں۔ سردی کے موسم اور ٹی وی ڈراموں کی وبا کے باوصف نمازِ عشاء کے بعد کی یہ نشست حاضری کے اعتبار سے بہت کامیاب ہے ۳۰۔ ۳۵ احباب شریکِ درس ہیں۔

☆ خطاباتِ عام کے پروگرام میں مجلسِ مشاورت منعقدہ ۵ نومبر کے مطابق آخری پروگرام رحیم یار خان کا تھا جس میں راقم حاضر ہوا۔ ۳ دسمبر بروز جمعرات سوا بارہ بجے پہنچا۔ رانا غلام اکبر صاحب کے ساتھ مغرب تک ملاقاتوں کا پروگرام تھا نماز مغرب کے بعد جامعہ فاروقیہ کی وسیع مسجد کے ہال میں درسِ قرآن کا پروگرام تھا سورۂ حج کی آخری دو آیات کے حوالے سے ہمارے دینی فرائض کی وضاحت اور ضمناً تنظیم کی دعوت سامنے رکھی۔ حاضری بحمد اللہ ۲۰۰ سے متجاوز تھی اور احباب نے پون گھنٹہ توجہ سے گفتگو کو سنا۔

نماز عشاء کے بعد رفقائے رحیم یار خان و صادق آباد کا اجتماع تھا اس میں مقامی طور پر توسیع دعوت اور اس کے راستے میں حائل رکاوٹوں کا جائزہ لیا گیا اور راقم نے اپنے علم و فہم کی حد تک مشورے دیئے۔

۴ر دسمبر بروز جمعہ بعد نماز فجر امانت کالونی رحیم یار خان (جو رانا صاحب کے دو گھروں کے درمیان ہے) سورۂ جمعہ کی آیات کے حوالے سے قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق کی وضاحت کی۔ چالیس کے قریب احباب شریک رہے مسجد کے متولی 'چوہدری...... صاحب' علالت کے باعث تشریف نہیں لا سکے تھے وہ ساتھ ملحقہ اپنے مکان کے کمرے میں سماعت فرماتے رہے۔ مسجد ہذا اور اس کے متولی صاحب تنظیم کے رفقاء کے لئے خصوصی دلچسپی کا باعث ہیں کہ اس مسجد میں خطبہ جمعہ کے طور پر امیر محترم کا آدھ گھنٹے کا کیسٹ سنایا جاتا ہے اور اس کا باقاعدہ مسجد کے باہر ایک مستقل بینر بھی لگا ہوا ہے اس کیسٹ کو سنانے سے پہلے چوہدری صاحب خود غور سے سنتے ہیں الحمد للہ وہ تنظیم کی دعوت سے دن بدن قریب آ رہے ہیں اللہ تعالیٰ وہ دن بھی لائے کہ وہ ہمارے ساتھی بن جائیں۔

جمعہ ہی کے روز صبح ۱۰ بجے یونائیٹڈ ہوٹل میں ایک استقبالیہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں چالیس کے قریب احباب تشریف لائے گفتگو کا موضوع تھا 'اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ کیسے؟' سوا گھنٹہ کی سادہ زبان میں گفتگو کے بعد سوال و جواب کی نشست ہوئی بعد ازاں چائے کی تواضع کے بعد یہ مجلس برخاست ہوئی۔ شرکاء میں معززینِ شہر شامل تھے جس میں بعض مقامی علماء اور سیاسی کارکن نمایاں تھے۔

☆ اواخر دسمبر میں منعقد ہونے والی ہفت روزہ تربیت گاہ ہی نمایاں اہمیت کا حامل پروگرام تھا۔ اسی اہمیت کے پیش نظر ۴ر دسمبر اور ۲۵ر دسمبر کے درمیان کوئی اضافی پروگرام نہیں رکھا تھا۔

امیرِ تنظیم اسلامی سندھ سید سراج الحق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دعوت کے ضمن میں خاص صلاحیتوں سے نوازا ہے گذشتہ ماہِ نومبر میں ان کے دورۂ سعودی عرب و عرب امارات کے دوران وہاں

ں کے طریق تعلیم کی دھوم مچ گئی جس کی صدائے بازگشت مرکزِ تنظیم اسلامی لاہور میں بھی پہنچی۔ اس کا
کہ یہ وہ رابطہ خطوط بنے جو وہاں کے رفقاء باقاعدگی سے مرکز کو ارسال کرتے رہتے ہیں مزید بر آں امیرِ
محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی بھی مغربی ممالک کے سفر کے بعد عمرہ کے لئے سعودی عرب
تشریف لے گئے تو انہیں بھی رفقاء کے تاثرات معلوم ہوئے اس سبب سے سید صاحب کو دورانِ تربیت
کو ڈیڑھ دن کے لئے ملتان تشریف آوری کی دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول فرمالی اور حسبِ پروگرام
شرکت فرمائی۔ پروگرام میں شرکت کے لئے رفقاء جمعہ کی صبح ہی سے مرکز ملتان میں آنا شروع ہو گئے
تھے۔ ہفتہ وار درسِ قرآن جو جمعہ کو مغرب تا عشاء ہوتا ہے اس میں رفقاء و غیر رفقاء کی بھرپور شرکت
تھی جگہ کی تنگی کا احساس ہو رہا تھا۔

درس کے بعد کھانا اور اس کے بعد آٹھ روزہ تربیت گاہ کے نظام الاوقات کی تفصیل شرکاء کے
سامنے رکھی۔ کراچی سے جناب سید سراج الحق صاحب کی آمد کی اطلاع بھی دی گئی اور اتوار کے
خصوصی پروگرام کا اعلان بھی کیا گیا۔

اتوار کے علاوہ نظام الاوقات حسب ذیل رہا۔
بعد نماز فجر ..... درسِ قرآن...... سورۂ حدید.. ضیاء الرحمٰن صدیقی صاحب / عطاء اللہ صاحب
صبح ساڑھے آٹھ بجے سے ایک بجے تک..... مطالعہ کتب 'مذاکرہ' سوال جواب
عصر تا رات ساڑھے نو بجے...... تعلیم عربی۔ مطالعہ کتب
ڈاکٹر صاحب کے ویڈیو کیسٹ کا پروگرام

....

اس پروگرام میں مندرجہ ذیل کتب کا سبقاً سبقاً مطالعہ کیا گیا اور سوال و جواب کی نشستیں
ہوئیں۔

۱۔ دعوتِ دین اور اس کا طریق کار (مولانا امین احسن اصلاحی صاحب)
۲۔ رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب)

پروگرام میں تقریباً ۲۴ رفقاء نے شرکت کی' اتوار کے روز ۳۳ رفقاء کی حاضری تھی جس میں سید
سراج الحق صاحب نے امیر محترم کی کتاب منہج انقلاب نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا مطالعہ اور
مذاکرہ کرایا۔ یہ پروگرام صبح ساڑھے آٹھ بجے سے شام ۸ بجے تک نمازوں اور کھانے کے وقفے کے
بعد تقریباً دس گھنٹے جاری رہا جس کے بعد شرکاء کے تاثرات بڑے دلچسپ تھے۔ ایک رفیق نے لکھا کہ یہ
پروگرام ۳۰ گھنٹے جاری رہنا چاہئے تھا۔ تمام رفقاء کا مشترک احساس تھا کہ اس پروگرام کے بعد وہ نبیٔ
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کے چھ مراحل پہلے سے کہیں بہتر انداز میں سمجھ گئے ہیں اور کسی حد
تک ان کو بیان بھی کر سکتے ہیں۔

....

تربیت گاہ کے متصل بعد یعنی یکم جنوری ۱۹۸۸ء کو حلقہ کے تمام رفقاء کا ایک روزہ اجتماع تھا جس میں
امیرِ محترم بھی تشریف لانے والے تھے۔ یہ پروگرام صبح ۹ بجے شروع ہوا رفقاء کی تعداد ۶۰ کے لگ بھگ

تھی۔ پروگرام میں جائزہ رپورٹ وہاڑی، بہاولپور، لیّہ، ملتان، رحیم یار خان، جھنگ کی دعوتی سرگرمیاں اور آئندہ کے لئے تجاویز شامل تھیں۔

جمعہ کے وقفہ کے بعد مجلس مشاورت کا اجتماع ہوا جس میں آئندہ تین ماہ جنوری، فروری، مارچ کے پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ عصر تا مغرب اجتماع میں حاضری ۹۰ کے قریب تھی۔ آئندہ کے پروگرام کی تفاصیل پر روشنی ڈالی گئی اور بعد نمازِ مغرب امیرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کے لئے انتظامات کا جائزہ لیا گیا۔

مغرب کے بعد اجتماع کے لئے دعوتی کارڈ تقسیم کئے گئے تھے جس میں ملتان کے ان لوگوں کو خصوصی دعوت پر بلایا گیا تھا جو تنظیم کے فکر سے آشنا ہیں اور امیرِ محترم کے دروس و خطابات میں پہلے بھی حاضرباش رہے ہیں۔

اس اجتماع میں امیر محترم نے "تنظیم اسلامی کی دعوت" کے عنوان سے خطاب فرمانا تھا۔ فلائٹ کے مؤخر ہو جانے کی وجہ سے امیر محترم ۸ بجے بعد نماز عشاء تشریف لا سکے۔ مغرب تا عشاء حاضری ۲۵۰ کے قریب تھی مگر شدید انتظار کے باعث کافی لوگ چلے گئے۔ مغرب تا عشاء راقم نے شرکاء کے مختلف سوالات کے جواب دیئے اور تنظیم اسلامی کی دعوت اور انقلاب کے مراحل کو واضح کیا۔

امیرِ محترم کا خطاب سوا آٹھ بجے شب شروع ہوا اور تقریباً سوا گھنٹے کے خطاب میں ڈاکٹر صاحب نے تنظیم کی دعوت کو حاضرین کے سامنے مؤثر انداز میں پیش فرمایا۔ حاضرین کی تعداد دو صد کے لگ بھگ تھی۔ تقریر کے اختتام پر حلقہ ملتان کے پروگراموں کے اعلان اور دس رفقاء کی تنظیم میں شمولیت کی بیعت پر یہ پروگرام بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

....

اس پروگرام کے دوران آٹھ روز کے لئے مرکز ملتان میں خوب چہل پہل اور رفقاء کی آمد و رفت رہی۔ قال اللہ اور قال الرّسول کی صداؤں کے درمیان تنظیم کی دعوتِ انقلاب اور اقامتِ دین کی پکار دلوں کو گرماتی رہی۔ اللہ کرے کہ ہماری یہ حقیر سی کوششیں کسی خطۂ ارضی پر بالفعل اسلامی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوں اور کرنل حیدر ترین صاحب کی یہ دی ہوئی جگہ اور لگایا ہوا یہ پودا ابد الآباد تک نیکیوں کے برگ و بار لاتا رہے تاکہ کرنل صاحب بھی کہہ سکیں کہ ؏

شادم بر عمر خویش کہ کارے کردم

....

برائے توجہ!

قارئین میثاق سے گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں (شکریہ)

ایک مسنون دعا

اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّیَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْکِذْبِ وَاَعْیُنَنَا مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

Adarts-HTP-3/85

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

۳۷

۳

ب المرجب ۱۴۰۸ھ

رچ ۱۹۸۸ء

شمارہ ۵/-

انہ زرِ تعاون ۵۰/-

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا ۱۵/- روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ - امریکی ڈالر یا ۱۰۰/- روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ - امریکی ڈالر یا ۱۵۰/- ” ”
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ - امریکی ڈالر یا ۲۰۰/- ” ”

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون [illegible]

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن [illegible]

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

❀❀❀

جملہ رفقاء و احباب تنظیم مطلع رہیں کہ ان شاء اللہ العزیز

تنظیمِ اسلامی کا تیرھواں سالانہ اجتماع

جمعۃ المبارک یکم اپریل تا سوموار ۴ اپریل ۱۹۸۸ء

بمقام طارق آباد، ضلع بہاولنگر

رفیق مکرم کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر حافظ غلام حید رخان ترین

کی زرعی اراضی پر منعقد ہو گا

یہ مقام بہاول نگر اور چشتیاں کے تقریباً درمیان میں بہاولنگر سے تیرہ اور چشتیاں سے چودہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اسے سڑک بھی لگتی ہے اور ریلوے لائن بھی۔ ریلوے سٹیشن کا نام 'مدرسہ' ہے جو سمہ سٹہ سے بہاولنگر اور امروکا جانے والی برانچ لائن پر واقع ہے۔ سڑک کے ذریعے اس مقام کا فاصلہ لاہور سے براستہ ساہیوال، عارف والا، بہاولنگر تقریباً پونے دوسو میل، ملتان سے براستہ وہاڑی، چشتیاں تقریباً ایک سو تیس میل اور بہاولپور سے براستہ حاصل پور، چشتیاں تقریباً سو میل ہے۔

اجتماع کا پروگرام جمعہ یکم اپریل کو بارہ بجے خطاب جمعہ سے شروع ہوگا
اور سوموار ۴ اپریل کو قبل ظہر اختتام پذیر ہوگا

(تفصیلی ہدایات پشت پر ملاحظہ فرمائیں)

ہدایات برائے رفقاء تنظیم اسلامی

سالانہ اجتماعات جماعتی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں رفتارِ کار کے جائزہ اور اپنے رُخ پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے علاوہ رفقاء کے مابین تعارف اور محبّت و یگانگت پیدا کرنے کے بہترین مواقع ہوتے ہیں۔ تنظیم اسلامی کے مقاصد سے محبّت اور حصولِ مقاصد کی تڑپ کا تقاضا یہ ہے کہ تمام رفقائے تنظیم اس اجتماع میں اپنی ہمہ وقت شرکت کو لازم سمجھیں البتہ اگر کوئی رفیق کسی شدید مجبوری کی بناء پر شرکت سے معذور ہو تو اسے تفصیلی معذرت ارسال کرنی چاہئے۔

○ ...... پہلی باقاعدہ نشست اگرچہ یکم اپریل جمعتہ المبارک بعد نماز مغرب شروع ہوگی تاہم رفقاء کے لئے ضروری ہے کہ وہ صبح دس بجے اجتماع گاہ میں پہنچ جائیں۔ نماز جمعہ سے قبل جناب امیرِ تنظیمِ اسلامی کا خصوصی خطاب عام ہو گا۔

○ ... اجتماع کے دوران تمام رفقاء اجتماع گاہ ہی میں قیام پذیر رہیں گے اس کے لئے حتّی الوسع ضروری انتظامات کئے جائیں گے تاہم موسم کے مطابق بستر اور ذاتی استعمال کی ضروری اشیاء رفقاء ساتھ لے کر آئیں۔ اجتماع کی کامیابی کا انحصار رفقاء کی وسیع القلبی اور باہم تعاون پر ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ شرکاء کے لئے زیادہ سے زیادہ سہولت فراہم کی جائے، تاہم انہیں ایثار و قربانی کے لئے تیار ہو کر آنا چاہئے

○ ...... سالانہ اجتماع کی آخری نشست ۴ر اپریل بروز سوموار قبل از نماز ظہر اختتام پذیر ہوگی

رفقاء و احباب کی رہنمائی اور سہولت کے لئے بہاولپور ریلوے اسٹیشن پر ۳۱ر مارچ دوپہر سے یکم اپریل صبح ۸ بجے تک تنظیم کی جانب سے استقبالیہ کیمپ لگا ہو گا۔ اسی طرح مدرسہ ریلوے اسٹیشن اور طارق آباد کے بالمقابل برلب سڑک یکم اپریل ۱۲ بجے تک رہنمائی کا انتظام ہو گا۔ دفتر تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب، ۲۵۔ آفیسرز کالونی، ملتان میں بھی رفقاء کی رہنمائی اور اجتماعی روانگی کا پروگرام ہو گا۔

اسی طرح مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور سے رفقاء کی اجتماعی روانگی کا پروگرام ۳۱ر مارچ رات کو ہو گا۔

اس قافلہ میں انہی حضرات کی شرکت کا انتظام ہو سکے گا جو ۲۰ر مارچ تک اخراجات آمدورفت (-/۷۵) دفتر میں جمع کرا دیں گے اور ۳۱ مارچ کو رات نو بجے سے قبل مرکزی دفتر پہنچ جائیں گے۔

منجانب ...... چودھری غلام محمد

قیم تنظیم اسلامی

ان شاء اللہ العزیز ——— اسی سال

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام

سالانہ

محاضراتِ قرآنی

جمعۃ المبارک ۲۵ مارچ تا سوموار ۲۸ مارچ ۸۸ء

جناح ہال

میں حسبِ سابق روزانہ بعد نماز مغرب منعقد ہوں گے جن کا مجموعی عنوان :

اسلام کا نظامِ حیات

ہوگا چنانچہ ایک ایک نشست اسلام کے معاشرتی، معاشی، سیاسی اور روحانی نظام کے مختلف پہلوؤں پر مقالات اور تقاریر کے لیے مخصوص ہو گی

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے !"

رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں کہ

اس سال جامع القرآن، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن لاہور میں

ماہ رمضان المبارک کے دوران

دورۂ ترجمۂ قرآن حکیم

کے روح پرور پروگرام میں

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

نماز تراویح کے ساتھ ترجمۂ قرآن بیان فرمائینگے

اِن شاء اللہ

لذتِ ایں بادہ نہ دانی، بخدا تا نہ چشی!

نوٹ: جو حضرات اس پروگرام سے بھرپور استفادے کی غرض سے پورا ماہ قرآن اکیڈمی میں قیام کرنا چاہیں وہ اپنے نام اور مختصر کوائف ابھی سے قرآن اکیڈمی کے ناظم عمومی کے پاس درج کروا کر اپنے قیام کے لیے جگہ محفوظ کروالیں، اس لیے کہ قرآن اکیڈمی میں رہائش کے لیے گنجائش محدود ہے اور اس کے استحقاق کا فیصلہ "پہلے آیئے پہلے پایئے" ہی کی بنیاد پر ہوگا۔ جو حضرات دورانِ قیام اپنے طعام کے اخراجات ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں انہیں پہلے سے اس کی اطلاع دے کر خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا ہوگا۔

المعلن: قمر سعید قریشی، ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

ار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ احوال

پچھلے شمارے کے صفحہ ۶۷ پر ۵ تا ۱۱ اپریل ۱۹۷۶ء کے ہفت روزہ "طاہر" لاہور کے
یہ کا عکس بلا کسی تعارف و تبصرے کے شائع ہوا تھا۔ بعض قارئین شاید اس کے
و سباق کی وضاحت کی ضرورت محسوس کر رہے ہوں، چنانچہ عرض ہے کہ یہ تاثر تو محولہ
تحریر کے طرزِ نگارش، اسلوبِ تخاطب اور نفسِ مضمون سے اخذ کر ہی لیا گیا ہو گا کہ لکھنے
لے صاحب جماعت سے اگر بلاواسطہ متعلق نہ تھے تب بھی اس کے بہی خواہوں، حامیوں،
دوں بلکہ مشیروں میں تو ضرور شامل رہے ہوں گے۔ تحریر کے الفاظ کا مضمون اور
السطور مفہوم کچھ یوں ہے کہ اس وقت تک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور
درپے تجربات اور خداداد شعور و بصیرت کی روشنی میں ان نتائج تک پہنچ چکے تھے کہ

۱ - "انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں" ...... (ربع صدی کے دوران
اعت نے مختلف سطح کے انتخابات میں اپنے جزو ایمان اور عزیز از جان اصولوں کی قربانی دے
می اسلام کے حق میں سمجھی جا سکنے والی کسی ادنیٰ تبدیلی کے جتنے کچھ آثار دیکھ لئے وہ کسی سے
بلہ نہ رہے تھے)

۲ - "جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے، اگر زیادہ
، زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی
ئے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے
ے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو
رانوں پر دباؤ ڈالا جا سکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جا سکے گا" (یہی طریق کار جماعت
لامی نے ابتدا میں اپنایا جو جمہوریت یا آمریت اور آزادی یا غلامی سے بھی مشروط نہ تھا)

اس تحریر کا ربط امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے اسی شمارے میں شامل تذکرہ و تبصرہ

صفحہ ۲۷ پر مذکور اس قلبی واردات سے ہے جو ان پر مکہ مکرمہ میں اپنے دوست زبیر عمر
صاحب کے مکان پر مولانا مودودی کی ایک تقریر کا ٹیپ سن کر گذری۔ امیر محترم کا کہنا
ہے کہ آخری دنوں میں مولانا مرحوم کی سوچ تبدیل ہو گئی تھی اور یہ کہ "اب وہ پاکستان میں
انتخابات کی راہ سے "اقامت دین" کا کوئی امکان نہیں سمجھتے بلکہ سابقہ انقلابی طرز عمل ہی کی
جانب رجوع کرنا چاہتے ہیں"۔ اب آج کی جماعت اسلامی کے نزدیک' جو نفاذ اسلام کے
لئے انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے دست برداری سمجھتی ہے'
امیر محترم کا یہ بیان چونکہ مولانا مرحوم پر ایک بہتان ہے' تہمت ہے۔ لہٰذا ضرورت محسوس
ہوئی تھی کہ ایک مطبوعہ شہادت پیش کی جائے جو ہزاروں کی نظروں سے گزری ہو گی اور بہت
لوگوں کے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ جماعت کے لئے یہ تسلیم کرنا بڑا ہی مشکل ہے کہ اپنے
قافلے کو تازہ اصطلاح کے مطابق تیسری دنیا کے ایک ترقی پذیر ملک کی بے اصول سیاست کی
وادیٔ خار دار میں بھٹکتے دیکھ کر بالآخر قافلہ سالار کا دل پسیج گیا تھا۔ وہ کیسے مان لے کہ انتخابی
سیاست کے کوچے سے مولانا نے واپسی کا ارادہ کر لیا تھا جس کے طواف کا چسکا اس کے
کارکنوں کو..... الاّ ماشاءاللہ...... نیچے سے اوپر تک پڑ چکا ہے ؏

چھٹتی نہیں ہے منہ کو یہ کافر لگی ہوئی

الحمدللہ کہ تنظیم اسلامی نے منہج انقلاب نبویؐ سے رہنمائی اخذ کر کے نہ صرف اپنے
نظم و ضبط کی بنیاد قانونی اور دستوری جماعتوں کے طریقے پر رکھنے کی بجائے انقلابی تحریکوں کی
طرز پر رکھی' بلکہ طریق کار کو بھی اپنے فہم و ادراک کی حد تک سنت سے ماخوذ خطوط پر استوار
کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہفت روزہ "طاہر" میں شائع ہونے والے پیرے کو' جسے ابتدا
میں نقل کیا جا چکا ہے' اگر ہم اپنی تنظیم کی اساسی فکر کے مطابق معمولی حک و اضافے کے ساتھ
دوبارہ لکھیں تو عبارت یوں ہو گی۔

"جمہوریت میں حصولِ مقصد کے لئے مؤثر انقلابی ذریعہ یہ ہے کہ زیادہ سے
زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے' اپنے کارکنوں کی اخلاقی اور دینی تربیت اس
درجہ پختہ کی جائے کہ وہ اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کریں'
قید و بند اور تشدد کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو نظم کی رسّی کو مضبوطی سے تھامے

رہیں اور راہ مستقیم نہ چھوڑیں۔ آبادی کے بڑے حصے میں دین کی اصل دعوت یعنی قرآن مجید کی تعلیم کو عام کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ دینی لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کا قابل لحاظ حصہ ہم خیال ہو جائے گا تو دین کے کسی ایک یا چند ایسے بنیادی اوامر و نواہی کے معاملے میں منظم مزاحمت کر کے حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جا سکے گا جن پر علماء کے کسی بھی مسلک میں اختلاف نہ پایا جاتا ہو' تربیت کی کٹھالی میں سے کندن بن کر نکلے ہوئے کارکنوں کی قربانیاں مسلمانوں کی خاموش اکثریت کو بھی متحرک کر دیں گی اور یوں انہیں جھکنے پر مجبور کیا جا سکے گا"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

(حسن اتفاق سے ان ہی دنوں مولانا سید محمد میاںؒ (والد ماجد مولانا سید حامد میاں مدظلہ) کی تصنیف ریک شیخ الہندؒ" کی ورق گردانی کے دوران" امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک انقلاب کا نہ" کے عنوان سے ایک عبارت نظر سے گزری جس میں ہو بہو وہی نقشہ نظر آیا جو سطور بالا میں بیان ہوا قارئین 'میثاق' اور رفقائے تنظیم اسلامی کے استفادے کے لیے وہ عبارت ایک خوبصورت چوکھٹے کی صورت ان سطور کے متصلاً بعد شامل اشاعت کی جا رہی ہے۔)

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے تیرھویں سالانہ اجتماع کا انعقاد اس بار بھی انہی دنوں میں ہو رہا ہے جو اب کا معمول رہے' یعنی یکم تا چار اپریل۔ تاہم اجتماع کے مقام کو منتخب کرنے میں روائت سے ساہی غیر معمولی انحراف کیا گیا ہے۔ بہاولنگر کے قریب ایک چھوٹی سی بستی میں جو ہمارے بزرگ رفیق کا مقام و مسکن ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں ملکیتی خود کاشت رقبے مالی و سائل کے معاملے میں مناسب فراوانی سے نواز رکھا ہے' دین کے سپاہیوں کا گویا ایک تھلک پڑاؤ ہو گا۔ جس کے شرکاء اپنی عددی قوت' نظم و ضبط' گھن گرج اور "شوکت سلام"[1] کے مظاہرے کے لئے بڑے شہروں کی رونق کے جویا نہیں بلکہ غور و فکر اور دروں

---

[1] جماعت اسلامی نے ایک زمانے میں "شوکتِ اسلام" کے نام سے ایک دن منا کر ملک بھر کے شہروں میں بزعمِ خویش پُر شکوہ جلوس نکالے تھے۔ جن کے اثرات اور ردعمل کا ذکر خاطر بایب پر ناگوار ہو گا۔

بنی کے لئے سابق ریاست بہاولپور کے صحرا میں واقع ایک دور دراز نخلستان کی تنہائی و خاموشی کے متلاشی ہوں گے۔ سال بھر کی محنتوں کے حاصل کا جائزہ لینے اور آئندہ کے لئے ہدف مقرر کرنے کے لئے یہ فضا انشاء اللہ بہت سازگار ثابت ہو گی۔ ہمارے رفقاء تک اجتماع کی اطلاع اور شرکت کی ہدایت اب تک پہنچ چکی ہے اور توقع یہی ہے کہ ہر اس بستی میں جہاں نظم قائم ہے 'اسی کا تذکرہ ہو گا اور منفرد رفقاء اپنی اپنی جگہ تیاری میں لگے ہوں گے' تاہم اس موقع پر ان صفحات کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں کہ ساتھیوں کو یاد دلایا جائے کہ اجتماعیت کی اس اہم ترین علامت میں کیا کچھ مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہے۔ مبادا کوئی ساتھی غیر اہم اور وقتی تقاضوں کے فریب میں گرفتار ہو کر اس کے فوائد کی نعمت سے محروم رہ جائے۔

ہمارے دین کے مزاج میں اجتماعیت اس خوبی سے رچی بسی ہوئی ہے جس کی نظیر کہیں سے ملنا ممکن نہیں۔ دن میں پانچ مرتبہ محلے کی مسجد میں شیر و شکر ہونا' ہر ہفتے بستی کے مرکزی مقامات پر جمع ہو جانا' سال میں دو مرتبہ عیدین کے بڑے اجتماعات اور پھر عالمی سطح پر اجتماعیت کا وہ عظیم مظہر جو ہر سال دنیا بھر سے دین کے نام لیواؤں کو ایک میدان میں کھینچ لاتا ہے۔ اور ان سب میں بلا استثناء قدرِ مشترک ایک ہی بنیادی مقصد اور ایک ہی ضمنی فائدہ ہے۔ مقصد کے اجزاء ہیں ذکر الٰہی' تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفوس' تو ضمنی فائدہ ہر سطح پر باہم میل جول قربت میں اضافے' بُعد کی دوری' اجتماعی معاملات کے جائزے' ملت کو درپیش مسائل کے حل کی تلاش اور امت کے فرضِ منصبی یعنی اعلائے کلمۃ الحق میں حائل مشکلات کا مداوا ڈھونڈنے میں مضمر ہے...... پھر جن لوگوں کو اپنی فلاح و نجاتِ اخروی کی خالص ذاتی غرض سے اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کی نصرت میں اپنا وقت' جان اور مال کھپانے کی توفیق میسر آ گئی ہے وہ تو گویا اپنے رب کے پسندیدہ بندے ہیں۔ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور حق تعالیٰ انہیں اپنی محبت کی نعمت سے نوازتے ہیں۔ انہیں تو ایسے مواقع کی کھوج میں رہنا چاہئے جن میں ان کے لئے اپنی انفرادی کوششوں کو اجتماعی جدوجہد کے ساتھ مربوط کرنا ممکن ہو۔ ویسے بھی۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے' تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں' اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ایک ہی مقصد کو حرزِ جاں بنانے اور ایک ہی لگن کو دل میں بسانے والوں کو اپنے ساتھیوں میں

ج کر جو یہ فرحت بخش احساس ہوتا ہے کہ۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

ں کی قدر و قیمت پر سو تفریحات قربان ' اس کی منفعت سے ہزار کاروبار دنیوی ہیچ اور اس کے
ضوں کے سامنے ساری معذرتیں عذراتِ لنگ۔ ہمارے ساتھی انشاء اللہ اجتماعیت کے اس
دے پر بطیب خاطر لبیک کہیں گے۔

جماعتوں اور تنظیموں کو ایسے ملک گیر اجتماعات کے مواقع روز روز نہیں ملتے۔ ان کے
ظام و انصرام پر انہیں اپنے محدود وسائل اور کارکنوں کی توانائیوں میں سے بھی وافر حصہ صرف
ا پڑتا ہے جس کا حق تبھی ادا ہو سکتا ہے جب وابستگی کا دم بھرنے والے بھی لوگ اپنے آپ
ار و رعایت دیئے بغیر پوری یکسوئی سے اس بات کا جائزہ لیں کہ وہ اس کی حاضری سے کہیں
گریزاں تو نہیں رہے ہیں۔ اپنے گھروں سے نکلنے اور کئی کئی دن باہر لگانے کی ضرورت ہمیں اپنے
مول کے شب و روز میں بھی بارہا پیش آتی رہتی ہے۔ ان کے لئے بھی ہم اپنی ترجیحات میں
و بدل اور مصروفیات میں تقدیم و تاخیر کرتے ہیں ' ایک طرف سے فائدے کے لئے دوسری
ف کا نقصان برداشت کرتے ہیں۔ اللہ کے دین کا کام تو ہماری نجی ضروریات سے بہت
ادہ اہم اور یہ مقصد تو ہماری دنیوی اغراض سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس کے لئے گھروں کا
ام تج دینا اور اپنے معمولات کے حصار سے نکلنا بہت ہی مبارک و مسعود ہے۔ اللّٰھُمَّ
رِکْ لَنَا فِیْہِ۔

اجتماع گاہ میں ہم سب بیک وقت میزبان بھی ہوں گے ' مہمان بھی۔ وہاں کی کلفت کو بھی
نت سمجھنا اور اپنے آرام ' اپنی سہولت پر اپنے ساتھیوں کی آسانی کو ترجیح دینے میں وہ مزا ہو گا
س کی حلاوت میں سے اللہ تعالیٰ ہم سب کو حصہ عطا فرمائے۔ اس میں نظم و ضبط ' حفظِ مراتب
پابندیٔ اوقات بھی ہمارے استفادے کو دوچند کرنے کا باعث ہوں گے اور یہ سب کچھ کسی
ف اور تصنع کے تحت نہ ہو ' خالص رضائے الٰہی کے حصول کے لئے ہو۔ اے اللہ ہمیں
س کی توفیق عطا فرما۔ اللّٰھُمَّ وفقنا لما تحب و ترضٰی..... آمین

❋❋❋❋❋❋❋❋
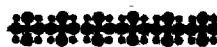
امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے نزدیک انقلاب کا طریقہ

اقتباس از "تحریک شیخ الہندؒ" تالیف مولانا سیّد محمدؒ میاںؒ

(شائع کردہ: مکتبہ محمودیہ، بیت الحمد، جامعہ مدنیہ، کریم پارک - لاہور)

حضرت شاہ صاحبؒ عدم تشدد اور اہنسا کے قائل نہیں تھے۔ وہ فوجی قوت سے انقلاب کے حامی تھے مگر وہ فوجی قوت جس کی تربیت جہاد کے اصُول پر ہوئی ہو جس کی حقیقت دشمن کشی اور غارت گری نہیں بلکہ اس کی حقیقت ہے محنت، جفاکشی، صبر و استقلال، ایثار اور قربانی یعنی اپنی ذات اور ذاتی مفادات کو ختم کرکے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنالینا پھر اس مقصد کے لیے اپنی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دینا۔

یا تن رسد بجاناں ۔۔۔ یا جاں ز تن بر آید

ایسا جہاد پیشہ ور سپاہیوں کی فوجوں سے نہیں ہوتا بلکہ ان رضا کاروں کے ذریعہ ہو سکتا ہے جن کی تربیت خاص طور پر کی گئی ہو جو نصب العین کو سمجھیں۔ نظریات کو اپنے جذبات بنالیں اور اصُول کے سانچہ میں ان جذبات کو ڈھال لیں پھر ان کو کامیاب بنالینے کے لیے اپنے آپ کو تج دینا، ان کی زندگی کا آخری اور محبوب ترین مقصود ہو جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد

مہاجر قومی تحریک کا پس منظر

ایک فکر انگیز تجزیہ

ماہِ جنوری میں مدیر "قومی ڈائجسٹ" جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب نے کراچی کی صورتِ حال، بلدیاتی انتخابات میں ایم کیو ایم کی کامیابی اور قومی سیاست میں ان کے کردار کے بارے میں سات سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ ملک کے متعدد اصحابِ علم و دانش کو ارسال کیا تھا۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس سوالنامے کے جواب میں جو تحریر ارسال کی تھی وہ "قومی ڈائجسٹ" کی حالیہ اشاعت (فروری ۸۸ء) میں شائع ہوئی ہے۔ سندھ اور کراچی کی صورتِ حال کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر وضاحت کے ساتھ "استحکامِ پاکستان اور مسئلۂ سندھ" نامی کتاب میں سامنے آچکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ حالیہ تحریر جو کراچی کی تازہ ترین صورتِ حال خصوصاً ایم کیو ایم کے بارے میں ان کے خیالات کی آئینہ دار ہے، چونکہ ایک اہم قومی مسئلہ سے متعلق ہے لہٰذا اسے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

آپ کے سوالات کے جواب علیحدہ علیحدہ اور ہاں یا نہ کی صورت میں دینا مشکل بھی ہے اور اس صورت میں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان بھی ہے، لہٰذا اپنے "سوالنامے" کا حسبِ ذیل مجموعی جواب قبول فرمائیں:

کراچی اور حیدر آباد کی سیاسی فضا پر مہاجر قومی تحریک کے زیرِ عنوان جو تحریک بالکل غیر متوقع اور ناگہانی طور پر شروع ہو کر دیکھتے ہی دیکھتے طوفانی انداز میں چھا گئی ہے، وہ اپنی اصل کے اعتبار سے منفی ردِ عمل کے ایک پیچ در پیچ سلسلے کی تازہ (اور غالباً آخری) کڑی ہے جسے انگریزی میں 'VICIOUS CIRCLE' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا ہر چکر اگلے کے لئے وجہ جواز فراہم کرتا ہے۔

منفی ردِ عمل کے اس پیچ در پیچ سلسلے کا اولین اور اہم ترین سبب یہ ہے کہ پاکستان کی تح
جس عوامی نعرے پر چلائی گئی تھی یعنی "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!" - - -
قیامِ پاکستان کے بعد اسے واقعیت کا جامہ پہنانے کی جانب کوئی محسوس اور قابلِ لحاظ پیش ر
نہیں ہوئی - - - - اس سے فکری اور جذباتی سطح پر جو خلا پیدا ہوا، اسے لامحالہ مادی ول
اور امنگوں ہی سے پُر ہونا تھا، لہٰذا اس کے نتیجے میں افراد کا زاویۂ نگاہ اور مطمحِ نظر ملّی اور م
سے گر کر تدریجاً ذاتی مفادات و مصالح اور مقامی مسائل و معاملات کی سطح پر مرکوز ہوتا چلا
اور معاملہ فی الواقع وہی ہوا کہ یا تو وہ عالم تھا کہ ع "گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود"
مصداق پورے برعظیم ہند کے مسلمان جغرافیائی و علاقائی اور نسلی و لسانی امتیازات سے با
کر، اور ایک خالص مذہبی قومیت کے مضبوط بندھن میں بندھ کر بنیانِ مرصوص بن گئے
جس کے نتیجے میں قیامِ پاکستان کا "معجزہ" صادر ہوا - - - - یا حالت رفتہ رفتہ یہ ہو
ع "گاہ الجھ کے رہ گئی میرے "توہمات" میں!" کے مصداق اسلام کے نام پر بنے
ملک میں مسلمان صوبائی و علاقائی اور نسلی و ثقافتی قومیتوں میں منقسم ہو کر رہ گئے! جن کے
تنافس و تکاثر اور اس کے ضمن میں کھینچ تان اور چھینا جھپٹی ایک طبعی اور فطری امر ہے!
مشرقی پاکستان کی علیحدگی تک مغربی پاکستان میں یہ رجحانات کچھ دبے دبے سے
لیکن سقوطِ ڈھاکہ کے فوراً بعد یہ سطح پر آ گئے اور رفتہ رفتہ ان کی شدّت بڑھتی چلی گئی۔
ایک جانب "فرزندانِ زمین" (SONS OF THE SOIL) کی اصط
استعمال عام ہوا، اور دوسری جانب یہ بات کثرت سے کہی اور سنی جانے لگی کہ پاکستان :
قومیتیں آباد ہیں: پنجابی، سندھی، پختون اور بلوچ۔
اس پس منظر میں یہ واقعہ بالکل فطری اور منطقی نظر آتا ہے کہ مشرقی پنجاب ک
ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے لوگوں میں یہ ا
پیدا ہوا کہ جیسے ان کے پاؤں تلے تو زمین ہی موجود نہیں! عدم تحفظ کے اس احساس نے
ابتداءً تو بالکل سراسیمہ کر کے رکھ دیا تھا، لیکن جیسے جیسے وقت گزرا ان کے سامنے ا
عمل واضح ہوتی چلی گئی اور وہ یہ کہ اگر انہیں "فرزندانِ زمین" تسلیم نہ کیا جائے، تو
"پانچویں قومیت" کی صورت تو اختیار کر ہی سکتے ہیں - - - - چنانچہ یہی لاوا ایک

ایم کے آتش فشاں کی صورت اختیار کر گیا۔
بہر صورت ' اب معاملہ " یا چٹاں کُن یا چُنیں! " والا بن چکا ہے کہ یا تو پنجابی ' سندھی '
ن اور بلوچ قومیتوں کی بھی نفی کی جائے ' یا پھر کھلے دل کے ساتھ تسلیم کیا جائے کہ
پانچویں قومیت " بھی حرام یا ناجائز نہیں ہے!
منفی ردعمل کے اس پیچ در پیچ سلسلے کا دوسرا سبب جس نے اس میں تلخی کا اصل زہر گھولا
' یہ ہے کہ - - - بعض جغرافیائی عوامل پر مستزاد ایک خاص تاریخی پس منظر کے
ث ' قیام پاکستان کے وقت اس میں شامل ہونے والے علاقوں میں سے بعض زیادہ خوشحال
ترقی یافتہ تھے اور بعض پسماندہ! - - - - چنانچہ بچے کھچے پاکستان کا صوبہ پنجاب
یت مجموعی اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے وسطی اضلاع مختلف اعتبارات سے زیادہ
شحال بھی تھے اور پاکستان کی سول اور ملٹری بیوروکریسی میں بھی ان کا پلڑہ فیصلہ کُن طور پر بھاری
۔ اب اگر ملک میں جمہوریت کو چلنے کا موقع دیا جاتا تو نہ صرف یہ کہ عوام کا اعتماد برقرار رہتا
مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو اطمینان حاصل ہوتا کہ ہمارے حقوق اور
دات کی حفاظت و نگہداشت کے لئے ہمارے نمائندے مرکزی اداروں میں موجود ہیں '
وسیع تر سوچ کی حامل قومی جماعتیں پروان چڑھتیں اور مناسب منصوبہ بندی کے ذریعے
قائی عدمِ توازن کو تدریجاً ختم کر دیتیں - - - - لیکن افسوس کہ ہوا اس کے بالکل
لس! - - - - یعنی مارشل لاء کے پے بہ پے تسلّط نے ملک کے شمالی اور جنوبی صوبوں
ے درمیان رفتہ رفتہ حاکم و محکوم ' اور مستکبرین اور مستضعفین کی سی نسبت قائم کر
ی جس کا ردعمل نہایت خوفناک ہوا اور مشرقی پاکستان کے مانند سندھ اور بلوچستان کی نوجوان
سل میں بھی یہ سوچ عام ہو گئی کہ۔

وفا کیسی ' کہاں کا عشق ' جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

ان میں سے بلوچستان میں تو چونکہ قبائلی اور سرداری نظام رائج تھا اور مڈل کلاس سرے سے
موجود ہی نہیں تھی لہٰذا وہاں کوئی عوامی تحریک شروع نہ ہو سکی بلکہ اس احساسِ محرومی نے گاہ
بگاہ مسلح بغاوت کی صورت اختیار کی جسے قوت کے ساتھ کچلا جاتا رہا - - - - البتہ سندھ کا

معاملہ مختلف تھا ۔ ۔ ۔ ۔ چنانچہ وہاں اولاً قدیم سندھیوں کی نوجوان نسل میں بالکل بنگلہ دیش کے مانند سندھی زبان اور ثقافت کی محکم بنیادوں پر قومیت کی طاقتور تحریک کا آغاز ہوا جس کا رخ شروع میں تو پنجابیوں اور مہاجروں دونوں کے خلاف تھا' لیکن ۱۹۷۲ء کے بعد اس کی قیادت نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مخالفانہ جذبات کا رخ خالصتاً پنجابیوں کی طرف موڑ دیا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن چونکہ پیپلز پارٹی کے عہدِ حکومت میں ملک کی زمامِ کار ایک سندھی کے ہاتھ میں تھی لہٰذا سندھ کی نوجوان نسل کی کچھ نہ کچھ اشک شوئی ہوتی رہی ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد مارشل لاء کے دور میں بھی ضیاء الحق صاحب کے سندھی "رفقائے کار" سندھی نیشنلزم کا ہوّا دکھا کر مراعات حاصل کرتے رہے' لہٰذا سندھ کے اندرونی علاقے میں سیاسی جوالا مکھی تو کئی بار پھٹی لیکن سندھی نیشنلزم کا آتش فشاں تاحال نہیں پھٹنے پایا۔ تاہم اندر ہی اندر اس کی شدّت جس تیزی سے بڑھ رہی ہے اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہے جو اندرونِ سندھ کے حالات سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہے۔

سندھ کے اردو بولنے والے "مہاجرین" میں منفی ردعمل کی اساس پر قومیت کی تحریک کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ ان کی جس نسل نے بالفعل ہجرت کی تھی وہ تو "اسلام" اور "پاکستان" دونوں کی دل وجان سے شیدا تھی۔ اس لئے کہ اس نے اسلام کے نام پر پاکستان کے قیام کی تحریک میں مؤثر کردار ادا کیا تھا لہٰذا اس نے جملہ صدمات کو صبر سے جھیل لیا ۔ ۔ ۔ ۔ پھر جب ان کی پہلی "پاکستانی نسل" جوان ہوئی اور اس نے اپنے لئے روزگار اور ترقی کے دروازے بند پاکر بے چینی محسوس کی تو حسنِ اتفاق سے اس وقت بین الاقوامی منڈی میں انسانی قوت وصلاحیت کی شدید مانگ پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ نسل تقریباً پوری کی پوری ایکسپورٹ ہو گئی اور اندرون ملک کوئی نمایاں ردعمل ظاہر نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ جب مہاجرین کی دوسری نسل میدان میں آئی تو باہر کا بازار بھی ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لہٰذا متذکرہ بالا عوامل کے فطری نتیجے کے طور پر یہ نسل مرنے اور مارنے پر تل گئی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایم کیو ایم کے زیرِ قیادت "مہاجر قومیت" کا آتش فشاں پھٹ پڑا جس سے مختلف النوع تخریبی عناصر نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

اب اگر ان دونوں اسباب کو جڑ بنیاد سے ختم نہیں کیا جاتا' اور حالات کے دھارے کا رخ انقلابی انداز میں نہیں بدلا جاتا - - - - بلکہ صرف وعظ و نصیحت پر اکتفا کی جاتی ہے یا صرف جزوی و وقتی اور نیم دلانہ تدابیر اختیار کی جاتی ہیں تو اس صورت حال کا لازمی اور منطقی نتیجہ پاکستان کی تقسیم (BALKANIZATION) ہے اور اس صورت میں ایم کیو ایم کے سامنے آ جانے کے بعد یہ امر بھی یقینی ہو گیا ہے کہ یہ تقسیم چار ٹکڑوں میں نہیں بلکہ پانچ میں ہوگی۔ اور اتنا خون بہے گا کہ سقوطِ بغداد' سقوطِ غرناطہ اور سقوطِ ڈھاکہ کی داستانیں ماند پڑ جائیں گی (اعاذنا اللہ من ذالک) اور ظاہر ہے کہ آگ اور خون کی یہ ہولی سب سے زیادہ سندھ ہی میں کھیلی جائے گی - - - - - چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جس نے انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کو بھی اپنے نقشۂ کار پر نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح ہندوستان کی تقسیم کے منطقی نتیجے کے طور پر مسلم لیگ کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم قبول کرنا پڑی تھی' اسی طرح سندھ کی پاکستان سے علیحدگی کی صورت میں اس کی تقسیم حتمی اور یقینی ہے' اور یہ منطق کی وہ کاٹ ہے جسے کوئی خواہش یا تمنا نہیں روک سکتی! - - - - بنابریں' اگر کسی کے نزدیک ایم کیو ایم کا ظہور اور استیلاء "شر" کا مظہر ہے تب بھی اسے یہ ماننا چاہئے کہ اس
کے بطن سے کم از کم یہ خیر ضرور برآمد ہوا ہے کہ اب انتہا پسند سندھی قوم پرست بھی اپنے حقوق کی جدوجہد کو
اس طور سے آگے بڑھانے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ پاکستان کی وحدت اور سالمیت برقرار رہے! اس لئے کہ وہ سندھ کی تقسیم کو کسی قیمت پر بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور سندھ کی سالمیت کی ضمانت صرف پاکستان کی سالمیت ہی کے ذریعے مل سکتی ہے!

اور اگر حالات کو سدھارنے کی نیم دلانہ نہیں بلکہ صمیم قلب کے ساتھ کوشش کرنی ہے - - - - تو جیسے لوہے کا پیچ لکڑی میں سیدھا نہیں ٹھوکا جاتا بلکہ اسے گھما گھما کر "کسا" جاتا ہے اور اسی طرح اسے یکبارگی سیدھا نکالا بھی نہیں جا سکتا بلکہ الٹے رخ پر گھما کر ہی "کھولا" جاتا ہے - - - - - اسی طرح اس سمّی چکر (VISCIOUS CIRCLE) کو بھی ایک دم ختم کرنا ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح بھی تدریجاً ہی ہو سکتی ہے - - - - جس کے ضمن میں تین اقدامات بھرپور انداز میں کرنے لازمی ہیں:

ایک یہ کہ قومیتوں کے ذکر پر جس "حساسیت" کا مظاہرہ کرنے کے ہم عادی ہوگئے ہیں اسے ترک کیا جائے اور "تصوریتِ مطلقہ" (ABSOLUTE IDEALISM) کی بلندیوں سے ذرا نیچے اتر کر زمینی حقائق کو تسلیم کرنے والی "واقعیت پسندی" (REALISM) کی بھی کسی قدر عادت ڈالی جائے۔ اور مختلف نسلی، لسانی اور ثقافتی قومیتوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے تشخص کے تحفظ کی ضمانت دی جائے! اس ضمن میں حالات کی سنگینی کے پیش نظر یہ لازم ہے کہ قومی زبان کے ضمن میں یہ فیصلہ کر لیا جائے کہ پاکستان کی سرکاری زبان عربی ہوگی اور پانچویں جماعت سے اس کی لازمی تعلیم کا فوری طور پر آغاز کر کے پندرہ بیس سال کے اندر اندر اس کی ترویج کا منصوبہ بنا لیا جائے ـ ـ ـ ـ اس کے علاوہ صوبائی سطح پر علاقائی زبانوں کی ترویج کے بھارتی فارمولے کو اختیار کیا جا سکتا ہے، خواہ اس کے لئے صوبوں کی لسانی اور ثقافتی بنیادوں پر تشکیل نو کی جائے خواہ بعض صوبوں کو صوبائی سطح پر بھی دو لسانی صوبہ قرار دیا جائے!

دوسرے یہ کہ جمہوریت کو بلا روک ٹوک کام کرنے بلکہ پھلنے پھولنے کا پورا موقع دیا جائے اور ایک جانب قومی سطح پر مارشل لاء سے جمہوریت کی جانب مراجعت کا جو عمل فی الوقت سست رفتاری سے جاری ہے اسے تیز کیا جائے ـ ـ ـ ـ اس لئے کہ اس میں جس قدر تاخیر ہو رہی ہے اتنی ہی ملک کی جڑیں کھد رہی ہیں؟ اور دوسری جانب کراچی کے مخصوص حالات اور گوناگوں مسائل کے پیش نظر ایم کیو ایم کی جو قیادت بلدیاتی سطح پر برسرِ اقتدار آئی ہے اسے نہ صرف یہ کہ کام کرنے کا بھرپور موقع دیا جائے بلکہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں اور جملہ قومی جماعتیں اس کے ساتھ پورا تعاون کریں اور پانی، بجلی اور ٹریفک ایسے گمبھیر مسائل کے حل کے لئے جو اضافی اختیارات انہیں درکار ہوں انہیں مہیا کئے جائیں۔

تیسری اور اہم ترین بات یہ کہ قوم کو اسلام کے اس عالمی غلبے کی جدوجہد کے لئے آمادہ کیا جائے جس کی پیشین گوئی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور اس کے لئے اس کے سامنے فوری طور پر پاکستان میں اسلامی انقلاب کا نصب العین رکھا جائے اور اس طرح گویا اپنے قومی نصب العین سے چالیس سالہ غفلت اور لاپروائی کا بھرپور کفارہ ادا کیا جائے۔ تاکہ ع "بھٹکے ہوئے راہی کو پھر سُوئے حرم لے چل!" اور ع "سُوئے قطار می کشم ناقہ بے

زمام را" والی کیفیت پیدا ہو سکے۔ اس لئے کہ صرف اسی کے ذریعے اتحاد ملی کو بھی فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور چھوٹے موٹے اختلافات کے ضمن میں حدِ اعتدال سے متجاوز حساسیت میں بھی کمی آ سکتی ہے۔

اگر ایسا ہو جائے تو انشاء اللہ العزیز وہ صورت پیدا ہو جائے گی جو علامہ اقبال کے ان اشعار میں بیان ہوئی ہے کہ ۔

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو ہولناک تباہی اور بربادی ہمارا مقدّر بن کر رہے گی اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہم پاکستانی مسلمان ایک عظیم دوراہے پر کھڑے ہیں جہاں سے ایک راستہ ...کستان میں اسلامی انقلاب کی راہ سے اسلام کے عالمی غلبے کی طرف جاتا ہے اور دوسرا سرزمین ...مدہ کی راہ سے پورے برعظیم پاک و ہند سے اسلام اور مسلمانوں کی ملک بدری کی طرف!

اللہ تعالیٰ ہمیں پہلی راہ پر قدم بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط والسلام

خاکسار ڈاکٹر اسرار احمد عُفی عنہ

خطابِ جمعہ
ڈاکٹر اسرار احمد

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

الحمد للّٰہ وکفٰی والصلوٰۃ والسلام علٰی عبادہ الذین اصطفٰی خصوصًا علٰی افضلھم سید المرسلین خاتم النبییّن محمدؐ الامین وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین

امابعد

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝

وقال اللّٰہ تبارک وتعالٰی

وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا ۝

وَقَالَ اللّٰہ عَزَّ وَعَلَا

فَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا ۝

وقال اللّٰہ تعالٰی وسبحانہ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

صدق اللّٰہ العظیم

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ

اللّٰھم ربنا الھمنا رشدنا واعذنا من شرور انفسنا ۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ ۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضٰی آمین یارب العٰلمین!

حضرات! گذشتہ جمعہ کو میں نے "جہاد بالقرآن" کے موضوع پر جس گفتگو کا آغاز کیا تھا اس کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو میں آئندہ جمعہ کو "جہاد بالقرآن" کے ضمن میں ان عملی صورتوں یعنی "Applied Forms" کا ذکر کروں گا جن کی بنیادی و اساسی ہدایت ہمیں قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ملتی ہیں اور جنہیں ہم اپنے دور اور اپنے معاشرے میں "Apply" کر سکتے ہیں۔ نیز یہ بھی عرض کروں گا کہ ان ہدایات کے انطباق کے عملی طریقے اور تقاضے کیا کیا ہیں؟ چنانچہ آج اس موضوع کے عملی پہلو پر گفتگو ہو گی۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے میں اس نتیجے تک پہنچا ہوں کہ ہماری دینی، ملی، قومی، معاشرتی زندگی میں اس وقت پانچ محاذ ایسے ہیں جو جہاد بالقرآن کے شدید طور پر متقاضی ہیں۔ رہا مسلمانوں سے باہر کا دائرہ! وہ تو ابھی بڑی دور کی بات ہے پہلا مسئلہ تو "Physician heals thyself" کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس امت کو پوری نوع انسانی کی ہدایت! رہنمائی کے لیے برپا فرمایا تھا۔ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ "تم وہ بہترین اُمت ہو جس کو نوع انسانی کے لیے نکالا گیا ہے۔" دنیا کی دوسری قومیں اپنے لیے جیتی ہیں لیکن تمہیں ان کے لیے جینا ہے بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے ۔۔۔ کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

ہماری مثال تو اس ساقی کی سی ہے جس کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا جامِ ہدایت تھما دیا ہے اور ایک ایک فردِ نوعِ بشر کو اس سے سیراب کرنا ہماری ذمہ داری ٹھہرائی ہے لیکن میں عرض کر رہا ہوں کہ یہ تو بہت دور کی بات ہے اس وقت یہ خیرِ امت اور امتِ وسط خود کئی طرح کے ذہنی، فکری، اعتقادی، نفسیاتی، جذباتی اور عملی انتشار سے دوچار ہے اور مختلف روگ اسے لگ گئے ہیں۔ یہ اس وقت نہایت مہلک اور مزمن امراض میں مبتلا ہو چکی ہے ۔۔۔۔

اس اعتبار سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ کوئی دو چار سال کی بات نہیں ہے ہمارا یہ زوال اور انحطاط صدیوں پر پھیلا ہوا ایک عمل ہے لہٰذا پہلی اور مقدم ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ملت اور معاشرے کے دائرے کے اندر جائزہ لیں کہ اس وقت وہ کون کون سے فکری، نظریاتی، اعتقادی، نفسیاتی اور عملی اعتبار کے محاذ ہیں جن میں سے ہر ایک کے خلاف ہمیں قرآن مجید

شمشیرِ براں کو ہاتھ میں لے کر نبرد آزما اور صف آرا ہوتا ہے اور قرآن کے ذریعے جن کے صحیح علاج کی ہمیں فکر کرنی ہے۔

محاذ اوّل : جاہلیتِ قدیمہ

اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں اس وقت پانچ محاذ میرے سامنے آئے ہیں۔ سب سے بڑا محاذ جاہلیتِ قدیمہ کا ہے۔ بڑا اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے عوام کی اکثریت کا معاملہ ہے۔ عوام الناس کی بڑی عظیم اکثریت کے اندر جاہلیتِ قدیمہ رچی بسی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے آپ جاہلیتِ قدیمہ کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ قرآن مجید اور احادیث شریفہ کی رُو سے اسلام سے پہلے کے دور کو "دورِ جاہلیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس اصطلاح کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی حقانیت، صداقت اور ہدایت کے برعکس جو کچھ بھی پہلے تھا اور جو کچھ اب ہے وہ "جاہلیت" ہے ـــ جاہلیت کو جہالت کے معنوں میں مت لیجئے گا ـــ یہ خلطِ مبحث ہو جائے گا۔ ویسے جہالت کے بھی عربی میں وہ معنی نہیں ہیں جو ہم اُردو میں استعمال کرتے ہیں۔ اُردو میں ہم ان پڑھ انسان کو جاہل کہتے ہیں۔ یعنی عالِم کے مقابلے میں اردو میں جاہل کا لفظ مستعمل ہے۔ جب کہ عربی میں حلیم کے مقابلے میں جاہل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ایک وہ انسان ہے جو بُردبار ہے، صاحبِ عقل ہے، غور و فکر کرتا ہے، محض جذبات سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ عقل کی رہنمائی میں فیصلے کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ متعین کرتا ہے۔ عقلی دلیل کی بنیاد پر کسی بات کو قبول یا مسترد کرتا ہے۔ یہ ہے حلیم انسان ـــ ایک شخص وہ ہے جو جذباتی ہے، اکھڑ ہے، غیر مہذّب ہے، ناشائستہ ہے، شہوات و جذبات کی رَو میں بہہ جاتا ہے، اس کی عقل پر تعصبات و خواہشات کے پردے پڑے ہوئے ہیں، ہو سکتا ہے کہ ایسا شخص پی۔ ایچ۔ ڈی ہو، ہو سکتا ہے کہ بہت تعلیم یافتہ انسان ہو لیکن اسلام کی رُو سے یہ شخص جاہل ہے۔ جاہل سے جہالت بنے گا لیکن اسی لفظ جہل سے جاہلیہ ایک اصطلاح بنتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے ماورا اور اسلام کے سوا جو کچھ ہے اور تھا وہ جاہلیہ ہے۔

اس جاہلیت کو میں اس وقت دو حصوں میں تقسیم کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ ایک جاہلیتِ قدیمہ ہے۔ یہ وہ جاہلیت ہے جو عرب معاشرے میں اس وقت نہایت غالب عنصر کی حیثیت سے موجود تھی جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ اس جاہلیتِ قدیمہ کے لیے اگر آپ ایک لفظ استعمال کرنا چاہیں گے تو وہ ہے شرک یعنی مشرکانہ اوہام جو توحید کی ضد ہے۔ اور ثانیاً دوسرا اہم لفظ اس کے ساتھ آئے گا جو ایمان بالآخرۃ کے مقابلے میں آتا ہے، وہ ہے شفاعتِ باطلہ کا تصور و عقیدہ ۔ یہ دو چیزیں تھیں جن سے جاہلیتِ قدیمہ مرکب تھی۔ جاہلیتِ قدیمہ میں اللہ کا انکار نہیں تھا۔ اللہ کو وہ مانتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والا شخص اگر گاہ بگاہ بھی ترجمہ دیکھ لیتا ہے تو اس پر یہ حقیقت روشن ہو گی کہ کتنی مرتبہ قرآن نے یہ بات کہی ہے کہ اے نبیؐ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا؟ تو یہ لوگ فوراً پکار اٹھیں گے۔ کہ اللہ نے پیدا کیا ہے۔ وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ اے نبی اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کون برساتا ہے اور مردہ زمین سے نباتات کون اگاتا ہے تو فوراً کہیں گے کہ اللہ ــــ : وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ تو وہ اللہ کے منکر نہیں تھے۔ البتہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور معبودوں کی ایک فوج تصنیف کر رکھی تھی۔ کہیں وہ اللہ کے ساتھ جنّات کو پوجتے تھے۔ کہیں انہوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دے کر ان کے نام پر دیویاں تراشں لی تھیں اور ان کے لیے استھان بنا لیے تھے۔ ان پر چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ وہاں جا کر منتیں مانتے تھے اور دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہ تھا ان کا شرک۔ یہ شرک آج بھی آپ کو اپنے عوام میں بکمال و تمام ملے گا ایک شوشے کا فرق نہیں ہے۔ صرف شکلیں بدل گئی ہیں۔ اس شرک نے صرف ہیئت بدل لی ہے کہ آج پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں سامنے نہیں رکھی جاتی ہیں لیکن قبروں کے ساتھ وہی معاملہ ہو رہا ہے جو اس دور میں بتوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ سر مو فرق نہیں۔ عرسوں کے نام سے یہ جو بڑے بڑے میلے ہوتے ہیں ذرا ان میں جا کر دیکھئے ہوتا

ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے دورِ جاہلیت کے عرب کے میلوں کی روداد یں
پڑھی ہوں تو وہ شاید ان سے کہیں پیچھے رہ جائیں۔ اس جاہلیتِ قدیمہ کا ایک جزو تو
یہ ہے۔

اس جاہلیتِ قدیمہ کا دوسرا جزو کیا ہے؟ وہ ہے شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ۔ دورِ
جاہلیت میں جب ان سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم مانتے ہو کہ اللہ ہی خالق ہے اللہ ہی مالک ہے۔
اسی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اُسی نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے تو فَاَنّٰی
یُؤْفَکُوْنَ[1] اور فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ[2] یہ سب کچھ مان کر کہاں سے اندھے
ہوئے جارہے ہو! کہاں سے پھرائے جارہے ہو؟ کہاں سے تمہیں اُچکا جارہا ہے؟
تمہاری مت کیوں ماری جارہی ہے! — اس کے جواب میں قرآن مجید نے ان کے
خود اقوال نقل کیے ہیں۔ سورۂ یونس میں ان کا یہ قول نقل ہوا۔ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ
شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط ہم ان بتوں کو خالق اور مالک تو نہیں مانتے۔ لیکن ہم ان کو
برگزیدہ ہستیاں ضرور مانتے ہیں جن کے نام پر ہم نے یہ بُت بنالیے ہیں۔ یہ مقربین
بارگاہِ رب العزت ہیں۔ یہ اللہ کے لاڈلے ہیں، چہیتے ہیں، فرشتے جن کو ہم نے دیویاں بنایا
ہے یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور بیٹیاں بہت لاڈلی ہوتی ہیں۔ کوئی لاڈلی بیٹی اگر فرمائش
کرے تو کوئی باپ اس کی فرمائش کو رد نہیں کرتا۔ لہٰذا ہم جو ان بتوں کو پوجتے ہیں تو صرف
اس لیے کہ یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی بنیں گے۔ ہماری شفاعت کریں گے اور
اللہ کے یہاں ہمیں چھڑوالیں گے۔ گویا اللہ کے عدل وانصاف کے آگے یہ روک بن جائیں گے
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ط — اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل عقیدے
سورۂ زمر کی تیسری آیت میں ذکر فرما کر اس کی قطعی طور پر نفی فرمادی۔ وہاں ارشاد ہوتا
ہے۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ط وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ م مَا نَعْبُدُهُمْ

---

[1]: وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ج فَاَنّٰی يُؤْفَكُوْنَ ○ (العنکبوت: ٦١)

[2]: ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ط لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ج فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ ○

الَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ○ —— ترجمہ: "آگاہ رہو، خبردار رہو، دینِ خالص اللہ کا حق ہے۔ ہر نوع کی عبادت واطاعت کا سزاوار اور مستوجب و مستحق صرف اللہ ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے اس کے سوا دوسروں کو اپنا ولی اپنا پشت پناہ، اپنا مددگار، اپنا حامی بنا رکھا ہے اس یقین کے ساتھ کہ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں۔ وہ اللہ کے یہاں ہمارے اور اسکے درمیان عفو ومغفرت کا واسطہ اور ذریعہ بن جائیں اور ہمیں اس کا قرب دلا دیں۔ (مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى) — اے نبی ان کو متنبہ کر دیجیے کہ اللہ ان کے درمیان ان تمام باتوں کا آخرت میں فیصلہ فرما دے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو جھوٹا، منکرِ حق اور ناشکرا ہو"

آخرت میں محاسبہ سے محفوظ رہنے کے لیے یہ تھا ان کا شفاعتِ باطلہ کا تصوّر۔

یہ دو چیزیں یعنی شرک اور شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ اصلاً تو ایک ہی ہے۔ انہیں تصور کے دو رخ کہہ لیجئے میں نے بغرضِ تفہیم انہیں علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ ان دو اجزاء سے مرکب تھی۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ اللہ کے منکر تھے اور نہ آخرت کے منکر تھے۔ اللہ کو مان کر اس کے ساتھ دیوتاؤں اور دیویوں کو مان رہے تھے اور آخرت کو مان کر وہاں شفاعتِ باطلہ کا عقیدہ و تصوّر رکھتے تھے۔ یہ ہے جاہلیت قدیمہ —— اب اگر کوئی شخص چاہے تو اپنی آنکھیں بند کر لے لیکن اس طرح حقیقت تو بدل نہیں جائے گی۔ اور اگر کوئی آنکھیں کھول کر اپنے معاشرے کا تنقیدی جائزہ لے تو اسے صاف نظر آ جائے گا کہ ہمارے معاشرے کی عظیم اکثریت ان دونوں گمراہیوں میں مبتلا ہے۔ اس عظیم اکثریت کا دین ہے کیا؟ اولیاء پرستی کا دین ہے، عرسوں کا دین ہے، تعزیہ پرستی کا دین ہے۔ قبروں پر حاضری اور وہاں چڑھاوے چڑھانے، منتیں ماننے اور دعائیں مانگنے کا دین ہے۔ نماز روزہ تو اس دین میں بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہو جائے تو بڑی بات ہے، لیکن یہ اس عوامی دین کے لزوم میں داخل نہیں ہیں۔ یہ اکثریت اس وہم میں

ہے کہ یہ اولیاء کرام جن کی قبروں پر ہم نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، آخرت میں ہمارے
شفیع بن جائیں گے۔ اور پھر ہمارے سب سے بڑے شفیع خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ہوں گے جن کے ہم نام لیوا ہیں۔ چنانچہ کسی محاسبۂ اُخروی کے خوف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

لہٰذا پہلا محاذ تو یہ جاہلیتِ قدیمہ ہے جس کے خلاف ہمیں تلوار اٹھانی ہوگی۔ لیکن تلوار
کون سی؟ قرآن کی تلوار ــــ اس محاذ پر ابلیس کے اس فریب و اغوا کے لیے قرآن ہی تلوار
کا کام دے گا۔ میں اس موضوع پر علامہ اقبال کے یہ اشعار بارہا آپ کو سنا چکا ہوں جن
میں درحقیقت دو احادیث کی ترجمانی کی گئی ہے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است ــ زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی ! ــ کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی

اس جاہلیتِ قدیمہ کا ذکر قرآن مجید میں نہایت جلی انداز میں ہے چونکہ اس دور میں
شرک غالب تھا اور اصل گمراہی یہی تھی۔ لہٰذا جن حضرات کو بھی قرآن مجید سے شغف ہے
جو حضرات آجکل تراویح میں دورہ ترجمہ قرآن میں شرکت کر رہے ہیں، وہ اس بات
کو جانتے ہوں گے کہ قرآن مجید کا دو تہائی حصہ مکی سورتوں پر مشتمل ہے۔ اور مکی سورتوں
کا سب سے بڑا مضمون یہی ہے۔ بار بار مختلف پیرایوں میں، مختلف اسلوب سے، مختلف انداز
سے اس شرک اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید کی گئی ہے۔ کہیں تمثیلات کے
ذریعے سمجھایا جا رہا ہے۔ کہیں عقلی دلائل کے ذریعے سے سمجھایا جا رہا ہے۔ کہیں ان ہی کے
مسلّمات سے ان پر حجت قائم کی جا رہی ہے۔ گویا کہ سورۂ کہف میں تصریف الآیات کے
ضمن میں جو الفاظ آتے ہیں، وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ
اور ذرا سی ترتیب کی تبدیلی کے ساتھ یہی بات سورۃ الاسراء میں بایں الفاظ آتی ہے:
وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ ــــ یہ الفاظ اس بات
کے اظہار کے لیے آتے ہیں کہ ہم نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا، ہم نے کوئی چیز رہنے نہیں
دی، ہم نے کوئی اندازِ بیان چھوڑا نہیں ہے کہ جس کے ذریعے ہم نے اس ضلالت، اس گمراہی
کی نفی نہ کر دی ہو اور اس کا ابطال نہ کر دیا ہو ــــ اس جاہلیتِ قدیمہ کے محاذ کے لیے ہمیں

سمجھتا ہوں کہ کسی دقیق یا بھاری بھرکم علمی منصوبے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر صرف دورۂ ترجمہ قرآن کی مہم ہمارے معاشرے میں چل جائے تو وہ لوگوں کے عقائد کی تطہیر کے لئے کافی ہو جائے۔ اس کے لیے دقیق و عمیق تفاسیر کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ایک کام عظیم پیمانے پر ہو رہا ہے لیکن کاش وہ کام فضائل اور ضعیف و شاذ روایات بلند تر ہو اور ترجمۂ قرآن کے ساتھ اس کا تعلق قائم ہو جائے کہ ہر مسجد میں فرض نمازوں کے بعد لوگ جمع ہو جائیں اور قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کوئی مستند ترجمہ لوگوں کو سنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ قرآن مجید کے متن کے ساتھ مجرد ترجمہ اس جاہلیتِ قدیمہ کا قلع قمع کرنے کے لیے کافی ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز ــــــ اس کے لیے قرآن حکیم کی حکمت کے اتھاہ سمندر میں غوطہ زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لیے میں مثال دیا کرتا ہوں کہ اگر سمندر میں کہیں تیل گر جائے، تیل کا کوئی ٹینکر سمندر میں پھٹ جائے تو تیل سطحِ سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے۔ بالکل اسی طریقے سے قرآن مجید میں جاہلیتِ قدیمہ کا جو ابطال ہے اس کی جو نفی ہے جو تردید ہے اور توحیدِ خالص کی جو دعوت ہے، اس کے لیے جو استدلال ہے وہ بالکل سطح پر ہے، سامنے موجود ہے۔ اس کے لیے گہرائی میں اترنے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ یہ بات جان لیجیے کہ اس محاذ کے خلاف جب تک قرآن مجید کے ساتھ جہاد نہیں ہوگا تب تک مشرکانہ اوہام اور شفاعتِ باطلہ کے عقیدے کی تردید ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہمارے یہاں فرقہ وارانہ انداز سے ان پر جو تنقیدیں ہوتی ہیں اور ان کی جو نفی کی جاتی ہے، ان سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس طرح تو ضد بڑھتی ہے۔ اس طریقے سے تو ہٹ دھرمی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طور سے تو کدورت اور تلخی مزید پختہ ہوتی ہے ــــ اس لیے کہ پھر وہاں معاملہ ہو جاتا ہے فرقہ وارانہ مفادات کا ــ وہاں معاملہ آ جاتا ہے فرقہ وارانہ عصبیت کا۔ تو اس رنگ میں اور اس انداز میں تردید کرنا اور چند مخصوص چیزوں کو نشانہ بنا کر انہی پر گولہ باری کرتے چلے جانا، اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ وہ تو قرآن مجید نے اس مسئلہ کا جو 'Panoramic View' لیا ہے اور جو اس کا وسیع پس منظر ہے اس کو قرآن حکیم جس قابلِ فہم، بلیغ و فصیح اور بدیہیاتِ فطرت کے تاروں کو چھیڑنے

اے انداز و اسلوب سے بیان کرتا ہے' اس کے مقابل میں کون مسلمان یہ گمان کر
لتا ہے کہ میں اس سے بہتر اور دلنشین انداز اور ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ ان کو
ان کر سکتا ہوں اور اگر گمان کرے تو کیا اس کا ایمان سلامت رہ جائے گا ؟
عاذ اللہ۔ کیا کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس یہ دعوٰی کر سکتا ہے کہ اس کا بیان
یا وہ فلسفہ، اس کے پیش کردہ دلائل قرآن حکیم کی حکمت اور آیاتِ بیّنات سے
یادہ محکم اور روشن ہیں؟ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ — آیاتِ بیّنات تو وہ ہیں، جن
ے متعلق سورۂ حدید میں ارشاد فرمایا گیا۔ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ
مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ "وہ ذات
صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہے جو اپنے بندے (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)
روشن اور واضح آیات نازل فرما رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں
ے آئے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے"۔ رسول کی
ثت اور قرآن حکیم کا نزول اس کی شانِ رأفت اور شانِ رحمانیّت و رحیمیّت کے
ظاہر اتم ہیں۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔

پس اگر ملک گیر پیمانے پر قرآن مجید کے ترجمے کی مہم شروع ہو جائے تو میرے
زدیک یہ ہے پہلے محاذ کے روگ کا مداوا۔ میں نے اس کو نمبر ایک پر اس لیے رکھا
ہے کہ عددی اعتبار سے ہماری ملّت، ہماری قوم کی جو عظیم ترین اکثریت ہے وہ
قیقت اسی جاہلیتِ قدیمہ کا شکار ہے۔

محاذ دوم : جاہلیتِ جدیدہ

یہ جاہلیت جدیدہ کیا ہے! یہ ہے
لحاد۔ اس میں اللہ کا انکار ہے۔ اس میں بعث بعد الموت کا انکار ہے۔ اس
ں مادّے (Matter) سے ماوراء کسی شے کو تسلیم کرنے سے اعراض، احتراز
ور اجتناب ہے۔ اسی جاہلیتِ جدیدہ کے لیے میں ایک لفظ استعمال کرتا رہا
وں اور وہ ہے طبیعیاتی عقل پرستی ' Scientific Rationalism '

اِس جدید دور کی عمر ہے قریباً تین سو برس۔ یورپ کے دو ممالک فرانس ا
جرمنی میں دو تحریکیں بیک وقت شروع ہوئی تھیں۔ ایک تحریک اصلاحِ مذہب ادو
تحریکِ احیاء العلوم۔ بدقسمتی سے اُس وقت یورپ میں عیسائیت کے نام سے جو مذ
تھا اس کا نہایت ظالمانہ و جابرانہ نظام تھا۔ پھر یہ کہ نہایت غیر معقول اور بعید از
انصاف نظام تھا اِس میں ملوکیت (Monarchy) اور پاپائیت ——
(Theocracy) کا گٹھ جوڑ تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں مذہب سے ا
نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک ردِّ عمل کی صورت تھی۔ ایک 'Reaction' تھ
اس پس منظر اور اِس فضا میں جب سائنس کی ترقی شروع ہوئی تو سائنس
کی جڑوں میں الحاد پیوست ہو گیا۔ نقطۂ نظر یہ بن گیا کہ جو چیز 'Verifiable'
نہیں ہے، جس کی ہم توثیق یا تردید نہیں کر سکتے، اس کی طرف کوئی توجہ نہیں
چاہیے لا یعبئو بہ۔ وہ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنا بے سود ہے
ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ ہم یقین کے ساتھ یہ جان سکیں کہ اللہ
یا نہیں ہے تو چھوڑو۔ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم کہہ سکیں کہ مرنے کے
زندگی ہے یا نہیں ہے۔ اس کا ہمارے پاس کوئی سائنسی ثبوت نہیں ہے۔
...... کسی نے موت کی سرحد پار کرنے کے بعد پھر واپس آ کر ہمیں خبر نہیں
لہٰذا اس کو چھوڑیئے۔ خواہ مخواہ کے ڈھکوسلے ہیں۔ کوئی مانتا ہے تو مانے۔ یہ
یہ قابلِ توجہ مسئلہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے کوئی ثابت نہیں کر سکتا کہ ہمارے
جسم میں جو جان (Life) ہے۔ اس کے سوا روح نام کی بھی کوئی
ہے۔ اس کی آج تک کوئی توثیق (Verification) نہیں ہو سکی لہٰذا اس مسئلہ
کو چھوڑو۔ جو چیزیں موجود ہیں، ٹھوس ہیں، قابلِ تصدیق ہیں —— ہمارے
حواسِ خمسہ کے دائرے میں آتی ہیں ان ہی پہ توجہ مرتکز رکھو۔ ....
لہٰذا طبعیاتی، عقل پرستی کا فارمولا یہ بنا کہ اللہ ایک خیالی و تصوراتی چیز ہے جب کہ کائنا
ایک حقیقت ہے۔ روح بھی ایک تصوراتی چیز ہے جب کہ مادّہ اور جسم ایک ٹھوس حقیقت
ہے حیاتِ اخروی بھی اسی قبیل کی شے ہے جب کہ حیاتِ دنیوی ایک حقیقت ہے اور

ہر وقت، ہر لمحہ اور ہر لحظہ سابقہ ہے۔ لہٰذا ماورائے حواس اور خیالی و تصوراتی باتوں پر غور
یا وقت کا زیاں ہے اس کے بجائے ہماری توجہات کا ارتکاز ان چیزوں پر ہونا چاہیئے۔ جو
سوس ہیں، نگاہوں کے سامنے ہیں، حواس کی گرفت میں آنے والی ہیں، قابلِ توثیق
ہیں اور جن سے ہمیں ہر دم واسطہ پڑتا ہے۔ یہ ہے اصل میں اس دور کی جاہلیت کا عنصر
رئی۔ یہ ہے جاہلیتِ جدیدہ ۔

اس موقع پر میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ یہ نہ سمجھیئے گا کہ یہ بالکل نئی جاہلیت ہے۔
بے دبے انداز میں ایک محدود پیمانے پر یہ جاہلیت اُس دور میں بھی موجود تھی۔ یہ
دہ پرستی، یہ الحاد۔ یا اس کے لیے نہایت مناسب لفظ ہوگا دہریت ۔ یہ دہریت بعثت
دی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے وقت بھی موجود تھی۔ میں حیران ہوں کہ قرآن مجید میں
یک ہی جملہ میں اُس قلیل گروہ کے دہریت کے فلسفہ کو اس طریقے سے بیان کر دیا گیا ہے
، دورِ جدید کی ہر نوع کی جاہلیت اور دہریت کی طرف بھی اس میں واضح اشارات موجود
ں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قرآن کلامِ الٰہی ہے جس کے متعلق نبی
رم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس میں پچھلے زمانے کی بھی خبریں ہیں اور آنے
والے زمانے کی بھی۔ قرآن کا ایک جملہ دہریت والحاد کے تمام مکاتیبِ فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔
؛ قَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ۔ بات
تم۔ اس مکتبِ فکر کا قول نقل فرمایا گیا۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ زندگی تو بس ہماری یہی دنیا کی
ندگی ہے یعنی ہم نہیں مانتے کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہے۔ پھر یہ کہ کوئی بالاتر
لاقت یا ہستی نہیں ہے جس کے فیصلے سے ہمارا یہ مرنا اور ہمارا یہ جینا ہو رہا ہو۔ نَمُوْتُ
وَنَحْيَا ۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی زندہ رہتے ہیں ـــــ قرآن مجید میں اس کے
بالکل برعکس حقیقت بیان ہوتی ہے يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ ۔ وہ اللہ ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی
موت دیتا ہے لیکن یہاں نسبت اپنی طرف ہے نَمُوْتُ وَنَحْيَا ۔ ہم خود ہی مرتے ہیں اور
خود ہی جیتے ہیں۔ وہاں نسبت اللہ کی طرف ہے وہ تبارک و تعالیٰ ہے جو موت دیتا ہے
اور زندہ رکھتا ہے۔ یہ کارگاہِ موت و حیات اُسی کی تخلیق ہے اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ

وَ الْحَیٰوۃَ ۔ اس مکتبۂ فکر کا یہ نظریہ آگے بیان ہوا۔ وَ مَا یُھْلِکُنَآ اِلَّا الدَّھْرُ۔ اور ہمیں ہلاک کرنے والی چیز بھی سوائے گردشِ افلاک کے اور کچھ نہیں۔ ایک نظام رواں دواں ہے۔ قوانینِ طبیعیہ ہیں ——— Laws of the Nature ہیں۔ ان کے تحت اس کائنات کا کارخانہ چل رہا ہے۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں، جیتے ہیں، مرتے ہیں۔ کسی بالاتر طاقت اور موت کے بعد دوبارہ وجود اور کسی دوسری زندگی کو ہم نہیں مانتے ——— تو بتایئے کہ اس دور کی جدید جاہلیت اس سے آگے اور کہاں جائے گی؟ بلکہ آج کے دور کے سائنٹیفک ذہن رکھنے والے لوگ تو پھر بھی محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم یقین کے ساتھ کہہ نہیں سکتے کہ یہ باتیں حقیقت رکھتی ہیں یا نہیں! ہم کوئی حتمی حکم نہیں لگا سکتے کہ اللہ ہے یا نہیں! آخرت ہے یا نہیں! حال ہی میں افطاری کے موقع پر ایک صاحب سے گفتگو ہو رہی تھی۔ بڑے پڑھے لکھے شخص معلوم ہوتے تھے۔ سرکاری افسر ہیں۔ انہوں نے یہی بحث چھیڑی اور برٹرنڈرسل کے حوالے سے چھیڑی جو اس دور کے عظیم ترین اور نہایت مسلّمہ فلسفیوں میں سے تھا اور الحاد، دہریت اور مادیت کا جو فلسفہ ہے۔ اللہ، آخرت، روح اور اخلاق کی نفی کا جو معاملہ ہے، اس نے بڑے پیمانے پر اس کا پرچار کیا ہے اور جس مقبول عام اور دلنشین اسلوب و انداز سے کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ ہم کو نہیں ہے۔ اس نے ہماری نئی نسل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اکثریت کے اذہان کو مغلوب کر رکھا ہے ——— تو یہ ہے جاہلیتِ جدیدہ ——— اس کے جراثیم اگرچہ وہاں بھی موجود تھے جیسا کہ میں نے ابھی سورۂ جاثیہ کی ایک آیت کے ابتدائی حصے کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ لیکن یہ چیز وہاں دبی ہوئی تھی۔ اس دور میں شاذ ہی تھے ایسے Perverted Intellectuals ——— ایسے دانشور جن کی ذہنیت مسخ ہو جاتی ہے۔ اُس دور میں ایسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ وہاں جو غالب جاہلیت وہ تھی جس کو میں جاہلیتِ قدیمہ کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ اللہ کو ماننے کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا اقرار اور ان کی پوجا پاٹ اور آخرت کو ماننے کے ساتھ شفاعتِ باطلہ

یا تصوّر اور عقیدہ ــــ یہ تھی ان کی اصل گمراہی ــ اس کے بارے میں، میں عرض کر چکا
ہوں کہ اس کو تو قرآن نے اتنا DISCUSS کیا ہے، اس پر نہایت نمایاں اور واضح
انداز میں اتنی بحث کی ہے اور اس کا ابطال کیا ہے کہ اس پر زیادہ محنت کرنے کی
ضرورت نہیں ہے اس کے لیے ان شاء اللہ ترجمہ قرآن کفایت کرے گا۔

البتہ جاہلیتِ جدیدہ کا معاملہ وہاں بہت کم تھا لہذا اس پر قرآن مجید میں
بحث اس انداز میں نہیں ہے جو جاہلیتِ قدیمہ کے ضمن میں کی گئی ہے لیکن اس
کے لئے بھی یہ رہنمائی ہے ان باصلاحیت، باہمت اور ذہین لوگوں کے لیے جو
اُٹھیں اور پھر قرآن حکیم کی آیاتِ بیّنات میں غوطہ زنی کریں اور جدید اسلوب و انداز
کے ساتھ اس کا ابلاغ و اعلام کریں اس لیے کہ زمانہ بدل گیا ہے، STYLE بدل گیا
ہے۔ جن اصطلاحات میں لوگ بات سمجھتے ہیں، وہ اصطلاحات بدل گئیں ہیں - اگر آپ
بہترین اور مسکت بات کہیں گے لیکن قدیم اصطلاحات میں کہیں گے تو لوگوں کی سمجھ میں
نہیں آئے گی۔ اس کے لیے استدلال آپ کو جدید اصطلاحات میں ڈھال کر پیش کرنا
ہوگا - پھر یہ کہ اس جاہلیتِ جدیدہ کے لیے اس دور میں جو عقلی مواد فراہم کیا گیا ہے،
اس کا ابطال کرنا ہوگا۔ اس کے لیے آپ کو عقلی دلائل لانے ہوں گے۔ اگرچہ ان
تمام کاموں کے لیے اصل تلوار قرآن ہی کی استعمال ہوگی۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا
اس میدان میں محنت کی ضرورت ہوگی اس میں قرآن حکیم میں غوطہ زنی کرنے کے لیے
چند نوجوانوں کو اپنی پوری پوری زندگیاں وقف کرنی ہوں گی - پھر سائنس، جدید
فکر اور فلسفہ بے شمار گوشوں کے اندر پھیل چکا ہے۔ اس دور میں علم الحیاتیات ا،
علم الحیوانات کی طرح کی 'Physical Sciences' بھی ہیں، پھر 'Social Sciences' بھی ہیں،

اس کے متعلق یہ بات جان لیجئے کہ ڈارون
کا فلسفۂ ارتقا اب صرف حیاتیات کے میدان تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ
انسان کے معاشرتی اقدار، تمدنی و تہذیبی فکر حتیٰ کہ فلسفۂ اخلاقیات کو تلپٹ کر کے
رکھ دیا ہے اور ان سب پر ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء کا غلبہ ہو رہا ہے ۔

ان سب پر اس کا تسلط ہے اور یہ فلسفہ انسان کو محض ایک ترقی یافتہ
حیوان کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس فلسفہ نے حیوانی شہوات و داعیات کی
تسکین کے لیے انسان کو حیوانات کی طرح کھلا لائسنس دے دیا ہے۔ چنانچہ
اس زہر کا تریاق فراہم کرنا ہوگا۔ لہٰذا یہاں تو ضرورت ہوگی کہ جاہلیتِ جدیدہ کے
ابطال کے محاذ کے لیے خود اس کے اندر بہت سے محاذ کھولے جائیں۔ ماہرین
نفسیات نے نفسیات (Psychology) کے میدان میں جو گل کھلائے ہیں اور گمراہیاں
پھیلائی ہیں، جن کا سرخیل ہے فرائڈ، جس نے انسان کے تمام محرکاتِ عمل کو جنسی جذبے
کے تابع قرار دیا ہے۔ ان سب کا ابطال کرنا ہوگا۔ پھر عمرانیات (Sociology)
کے میدان میں جو بھی باطل اور گمراہ کن نظریات آئے ہیں، ان سب کا توڑ کرنا ہوگا۔
مارکسزم (MARXISM) اس دور کا سب سے مقبول فکر ہے جس کا اذہان ہی
پر نہیں بلکہ دنیا کے قابلِ ذکر ممالک پر عملاً اس نظامِ فکر کا استیلاء و تسلط ہے
مارکسزم کے متعلق یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ مادیت کا نقطۂ عروج یہ مارکسزم
اور کمیونزم ہے ___ Materialism ہی اپنی انتہاء کو پہنچ کر
Dialectical Materialism کی شکل اختیار کرتا ہے۔ مادیت اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ کر
جدلی مادیت بن جاتی ہے اور جیسے ڈارون کے نظریے نے اخلاقیات، معاشرت، عمرانیات
میں نفوذ کر رکھا ہے ___ اسی طرح مارکسزم کے نظریے نے انسان کے تصورِ اخلاق
کی قدروں کو بدل کر رکھ دیا ہے، انسان کی تہذیب کے تصورات کو بدل کر رکھ دیا
ہے مذہب اور دین کے عقائد کی بنیادیں ڈھا کر رکھ دی ہیں اور اپنے ماننے
والوں کو مکمل طور پر دہریہ و ملحد بنا کر رکھ دیا ہے۔ انسان کے مادرائی عقائد اور
اخلاقی قدریں اس فکر و نظریہ کے تحت آ کر بالکل نیا رخ اختیار کر گئی ہیں۔ الغرض اس
تیسرے محاذ یعنی جاہلیت جدیدہ کی کوکھ سے بہت سے فتنے جنم لے چکے ہیں۔ ان
سب کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔ لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے مقابلے کے لیے
ضرورت ہے کہ بحد تا صلاحت نوجوان اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ باصلاحیت ہونے

ہ ساتھ وہ باہمت، محنتی اور کام میں غرق ہو جانے والے ہوں۔ ایسے نوجوانوں کے
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہے: خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَہٗ۔
میں سے بہترین انسان وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں"۔ قرآن حکیم کے معارف
سے خود بھی بہرہ مند ہوں اور خلقِ خدا کو بھی مستفید کریں"۔۔۔ جاہلیتِ قدیمہ کا ابطال
اکہ میں نے عرض کیا محض ترجمۂ قرآن سے بھی ہو جائے گا۔ لیکن اس جاہلیتِ جدیدہ کے
قرآن حکیم میں غور و تدبر کرنا ہوگا۔ اس کے معانی و مفاہیم کے جواہر کی یافت کے
قرآن میں غوطہ زنی کرنی ہوگی۔

اسی کے لیے ایک طویل حدیث میں جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، الفاظ
ے ہیں۔ وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَآءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ
عَجَائِبُہٗ۔" علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے
س کے لطف و تاثیر میں کوئی کمی آئے گی۔ اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے
لم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا"۔ قرآن مجید کی یہ تین شانیں نبی اکرم نے
س حدیث میں بیان فرمائی ہیں ۔۔ اس میں سے آخری شان میری اس گفتگو سے بہت
بادہ متعلق ہے ۔۔ ایک ہیرے کی کان کا تصور کیجیے۔ جس میں کارکن لگے ہوئے ہیں اور
یرے برآمد کر رہے ہیں لیکن ایک وقت آتا ہے کہ کان ختم ہو جاتی ہے اور ہیرے
ستیاب نہیں ہوتے۔ لیکن قرآن ایسی معدن، ایسی کان نہیں ہے کہ جس کے متعلق کبھی
کہا جا سکے کہ حکمت کے موتی اب اس میں سے مزید نہیں نکل سکتے۔ لَا تَنْقَضِیْ
عجائبہٗ۔ قرآن تو اس اتھاہ سمندر کے مانند ہے کہ انسان جتنی گہرائیوں میں جائے
ا اتنے ہی اعلیٰ درِّ شہوار نکال کر لائے گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیش جاری
و ساری رہے گا۔ اور ہر دور، ہر زمانے کے باطل نظریات کے ابطال کے
لیے قرآن مجید سے ہدایت اور راہنمائی حاصل ہوتی رہے گی۔ لہٰذا اس
دوسرے محاذ کے لیے بھی مورچہ قرآن کی شمشیر ہی ہاتھ میں لے کر لگانا ہے۔
موجودہ دور کے تمام باطل نظریات اور خدا ناآشنا افکار کے ابطال کے لیے

قرآن مجید میں نہایت قاطع براہین موجود ہیں، لیکن یہ ان جواہر اور دُرِ شہوار کے مانند ہیں جو کسی کان یا سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے حصول کے لئے انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا اس کے لئے پتّا مار کر محنت کرنی ہوگی اور قرآن کی حکمت کے سمندر میں غوطہ زنی کرنی ہوگی، جس کی گہرائی کو ناپنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں جس کے حکم و معارف لامتناہی ہیں اور جس سے ہر دور کے فتن کے استیصال اور ہر نوع کے باطل نظریات کے ابطال کے لئے محکم دلائل و براہین کے موتی ملتے رہیں گے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ ــــ پس اس دوسرے محاذ پر یعنی جاہلیتِ جدیدہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھی ہمیں قرآن کی شمشیرِ بُرّاں لے کر صف آرا ہونا ہوگا۔ (جاری ہے)

مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ بانی تبلیغی جماعت کی نظر میں

مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شغف اور جدوجہد کے نتیجے میں گذشتہ ساٹھ ستر سال سے مخصوص انداز میں تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ جاری ہے جس سے باخبر طبقہ بخوبی واقف ہے۔ اس محنت اور جدوجہد کے پیچھے آں محترم ہی کی فکر کارفرما ہے جو عرصۂ دراز کے تعامل سے مزید گہری اور پختہ ہو گئی ہے۔

مسلمانوں کے موجودہ زوال، انحطاط اور دین سے دوری بھی ایک طرح کی 'بیماری' ہے جس کا 'علاج' ہی دراصل آج امت کے اکابرین کے لئے اصل کام ہے اور چونکہ نبی آخرالزماں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کسی خاص خطے، رنگ اور نسل اور زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام روئے ارضی پر آباد نسل آدم علیہ السلام پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس 'بیماری' کے 'علاج' کیلئے بھی نہ کوئی ایک ہی طریقِ علاج مطلوب ہے اور نہ کافی وشافی۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کے طرزِ فکر اور استدلال کو مولانا محمد احتشام الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتابچے کی شکل دی تھی۔ ہمیں حیرت ہے کہ آج سے پون صدی قبل جبکہ ہر طرف انگریز کی غلامی کی ظلمت چھائی ہوئی تھی ایک مردِ خود آگاہ اور خدا مست نے امتِ مسلمہ کی 'بیماری' کی کیسی صحیح تشخیص فرمادی کہ آج بھی اس پر کوئی اصولی اضافہ نہیں کیا جاسکتا ہے (جزوی اضافہ یا تعبیر کا فرق الگ بات ہے)۔ مزید برآں صحیح تشخیص کے بعد 'علاج' بھی تجویز فرمایا اور ایک اصولی رہنمائی دیدی۔

تحریر ہے : " اب جبکہ مقصدِ زندگی واضح ہوگیا اور اصل مرض اور اس کے معالجے کی نوعیت معلوم ہوگئی تو طریقِ علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی ۔ اس نظریے کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاءاللہ نافع اور سود مند ہوگا ۔"

کتنی بصیرت افروز ہے یہ حقیقت کہ جیسے ایک ماہر سرجن اور طبیب کا دوسرے معالج سے مرض کی نوعیت کے بارے میں اتفاق کے باوجود طریقِ علاج میں بالعموم اختلاف ہوتا ہے اور یہ ہمارا روزانہ کا تجربہ ہے ۔ بعینہٖ اسی طرح امّتِ مسلمہ کے ' معالجین ' جو اکابرِ امّت ہیں ان میں طریقِ علاج اور جدّوجہد کی سمت کا فرق نہ غیر فطری ہے نہ پریشان کن ۔

آں محترم کی کتنی عالی ظرفی ہے کہ جس طریق پر انہوں نے اپنی جماعت کو اٹھایا اور چلایا اس پر یقینِ کامل اور غیر متزلزل رسوخ کے باوجود ' دوسرے طریقِ علاج ' کے لئے سینہ کشادہ رکھتے ہیں تحریر ہے :

" ہم نے اپنی نارسا فہم کے مطابق مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک نظامِ عمل تجویز کیا ہے جس کو فی الحقیقت اسلامی زندگی یا اسلاف کی زندگی کا نمونہ کہا جا سکتا ہے ۔ جس کا اجمالی نقشہ آپ کی خدمت میں پیش ہے ۔"

' بیماری ' کی تشخیص میں علاوہ دیگر امور کے جس طرح ' نہی عن المنکر ' کو اجاگر کیا گیا ہے ۔ افسوس کہ وہ چیز آج اس مشن کے علمبرداروں میں نظر نہیں آتی ۔ مثلاً حضرت ابو سعید خدری رضؓ کی مشہور حدیث جس میں نہی عن المنکر کے تین درجے ہیں : ہاتھ سے بُرائی کا روکنا ' زبان سے روکنا اور دل میں بُرا جاننا (اور خود رُکنا) اور یہ دل میں بُرا جاننا ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے ۔ اس کی وضاحت میں تحریر ہے ۔ " اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے پس جس طرح آخری درجہ اضعف ایمان کا ہوا اسی طرح پہلا درجہ

کمالِ دعوت اور کمالِ ایمان کا ہوا "؛ یعنی برائی کا طاقت کے ذریعے روکنا ۔

افادۂ عام کے لئے اس تحریر کا عکس اصل کتاب سے حاصل کر کے (صـ۳ تا صـ۲۳) شائع کیا جارہا ہے ۔ (ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ خَاتَمِ الْاَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِيْنَ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ ؕ

آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل جب دنیا کفر و ضلالت، جہالت و سفاہت کی تاریکیوں میں گھری ہوئی تھی بطحا کی سنگ لاخ پہاڑیوں سے رشد و ہدایت کا ماہتاب نمودار ہُوا اور مشرق و مغرب شمال و جنوب غرض دُنیا کے ہر ہر گوشہ کو اپنے نور سے منور کیا اور ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں بنی نوع انسان کو اس معراج ترقی پر پہنچایا کہ تاریخ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور رشد و ہدایت صلاح و فلاح کی وہ مشعل مسلمانوں کے ہاتھ میں دی جس کی روشنی میں ہمیشہ شاہراہِ ترقی پر گامزن رہے اور صدیوں اس شان و شوکت سے دنیا پر حکومت کی کہ مخالف قوت کو ٹکرا کر پاش پاش ہونا پڑا ۔ یہ ایک حقیقت ہے جو ناقابل انکار ہے لیکن پھر بھی یہ ایک پارینہ داستان ہے جس کا بار بار دہرانا نہ تسلی بخش ہے اور نہ کار آمد اور مفید۔ جبکہ موجودہ مشاہدات اور واقعات خود ہماری سابقہ زندگی اور ہمارے اسلاف کے کارناموں پر بدنما داغ لگا رہے ہیں۔

مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ زندگی کو جب تاریخ کے اوراق میں دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم عزت و عظمت، شان و شوکت، دبدبہ و حشمت کے تنہا مالک اور اجارہ دار ہیں ، لیکن جب ان اوراق سے نظر ہٹا کر موجودہ حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے تو ہم انتہائی ذلت و خواری اور افلاس و ناداری میں مُبتلا نظر آتے ہیں نہ زور و قوت ہے نہ زر و دولت ہے نہ شان و شوکت ہے، نہ باہمی اُخوت و اُلفت ۔ نہ عادات اچھی نہ اخلاق اچھے نہ اعمال اچھے نہ کردار اچھے۔ ہر برائی ہم میں موجود اور ہر بھلائی سے کوسوں دُور، اغیار ہماری اس زبوں حالی پر خوش ہیں اور

ہلا ہماری کمزوری کو اچھالا جاتا ہے اور ہمارا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اسی پر بس نہیں بلکہ خود
ہمارے جگر گوشے نئی تہذیب کے دل دادہ نوجوان اسلام کے مقدس اصولوں کا مذاق اڑاتے
ہیں، بات بات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں اور اس شریعتِ مقدسہ کو ناقابلِ عمل لغو اور بےکار
گردانتے ہیں۔ عقل حیران ہے کہ جس قوم نے دنیا کو سیراب کیا وہ آج کیوں تشنہ ہے؟ جس قوم
نے دنیا کو تہذیب و تمدن کا سبق پڑھایا۔ وہ آج کیوں غیر مہذب اور غیر متمدن ہے۔
ہمایانِ قوم نے آج سے بہت پہلے ہماری اس حالتِ زار کا اندازہ لگایا اور مختلف طریقوں
پر ہماری اصلاح کے لیے جدوجہد کی مگر ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

آج جب کہ حالت بد سے بدتر ہو چکی اور آنے والا زمانہ، ماسبق سے بھی زیادہ پر خطر اور
تاریک نظر آرہا ہے۔ ہمارا خاموش بیٹھنا اور عملی جدوجہد نہ کرنا ایک ناقابلِ تلافی جرم ہے۔
لیکن اس سے پہلے کہ ہم کوئی عملی قدم اٹھائیں ضروری ہے کہ ان اسباب پر غور کریں جن کے
باعث ہم اس ذلت و خواری کے عذاب میں مبتلا کیے گئے ہیں۔ ہماری اس پستی اور انحطاط
کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں اور ان کے ازالہ کی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں لیکن
ہر تدبیر ناموافق و ناکام ثابت ہوئی جس کے باعث ہمارے رہبر بھی یاس و ہراس میں گھرے
ہوئے نظر آتے ہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اب تک ہمارے مرض کی تشخیص ہی پورے طور پر نہیں ہوئی
یہ جو کچھ اسباب بیان کیے جاتے ہیں اصل مرض نہیں، بلکہ اس کے عوارض ہیں۔ پس تاوقتیکہ
اصل مرض کی جانب توجہ نہ ہوگی اور مادۂ حقیقی کی اصلاح نہ ہوگی۔

عوارض کی اصلاح ناممکن اور محال ہے۔ پس جب تک کہ ہم اصل مرض کی ٹھیک
تشخیص اور اس کا صحیح علاج معلوم نہ کر لیں۔ ہمارا اصلاح کے بارے میں لب کشائی کرنا
سخت ترین غلطی ہے۔

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری شریعت ایک مکمل قانونِ الٰہی ہے جو ہماری دینی اور
دنیوی فلاح و بہبود کا تاقیامِ قیامت ضامن ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم خود ہی اپنا مرض
تشخیص کریں اور خود ہی اس کا علاج شروع کر دیں۔ بلکہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم قرآن حکیم

بنا اصل مرض معلوم کریں اور اسی مرکزِ رشد و ہدایت سے طریقِ علاج معلوم کر کے اس
ند ہوں۔ جب قرآنِ حکیم قیامت تک کے لیے مکمل دستور العمل ہے تو کوئی وجہ نہیں
س نازک حالت میں ہماری رہبری سے قاصر رہے۔
مالکِ ارض و سما جل وعلا کا سچا وعدہ ہے کہ روئے زمین کی بادشاہت و خلافت
ں کے لیے ہے۔

اللہ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا
لٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ ۔
(٦

اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح کیے کہ ان کو ضرور روئے زمین کا خلیفہ بنائے گا اور یہ بھی اطمینان دلایا ہے کہ مومن ہمیشہ
الب رہیں گے اور کافروں کا کوئی یار و مددگار نہ ہوگا۔

تَلَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ
یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ﴿فتح ٤٢﴾

اور اگر تم سے یہ کافر لڑتے تو ضرور پیٹھ پھیر کر بھاگتے پھر نہ پاتے کوئی یار و مددگار اور مومنوں
ت اور مدد اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے اور وہی ہمیشہ سربلند اور سرفراز رہیں گے۔

نَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔
نُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ
نْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۞ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ
ہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ۞
منٰفقون ع ١) (آل عمران ع ١٤)

اور حق ہے ہم پر مدد ایمان والوں کی اور تم ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو۔ اور غالب تم ہی رہو گے اگر تم پورے مومن رہے اور اللہ ہی کی ہے عزت اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں کی۔

مذکورہ بالا ارشادات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عزت، شان و شوکت
، سرفرازی اور برتری و خوبی ان کی صفتِ ایمان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر ان کا
ا اور رسولؐ کے ساتھ مستحکم ہے (جو ایمان کا مقصود ہے) تو سب کچھ ان کا ہے اور
وابستہ اس رابطہ تعلق میں کمی اور کمزوری پیدا ہو گئی ہے تو پھر سراسر خسران اور ذلت و
ہے جیسا واضح طور پر بتلا دیا گیا۔

رِ ۞ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۞
نَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

قسم ہے زمانہ کی انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمائش

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ کرتے رہے۔

(العصر) ہمارے اسلاف عزت کے منتہا کو پہنچے ہوئے تھے اور ہم انتہائی ذلت و خواری میں مبتلا ہیں بس معلوم ہوا کہ وہ کمالِ ایمان سے متصف تھے اور ہم اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم ہیں جیسا کہ مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے۔

سَيَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقَى مِنَ الْإِسْلَامِ إِلَّا اسْمُهُ وَلَا مِنَ الْقُرْآنِ إِلَّا رَسْمُهُ۔ یعنی قریب ہی ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اسلام کا صرف نام باقی رہ جائے گا۔ اور قرآن کے صرف نقوش رہ جائیں گے۔

اب غور طلب امر یہ ہے اگر واقعی ہم اس حقیقی اسلام سے محروم ہو گئے جو خدا اور رسولؐ کے یہاں مطلوب ہے اور جس کے ساتھ ہماری دین و دنیا کی فلاح و بہبود وابستہ ہے تو کیا ذریعہ ہے جس سے وہ کھوئی نعمت واپس آئے؟ اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے روحِ اسلام ہم میں سے نکال لی گئی اور ہم جسدِ بے جان رہ گئے۔

جب مصحفِ آسمانی کی تلاوت کی جاتی ہے اور "امتِ محمدیہ" کی فضیلت اور برتری کی علت و غایت ڈھونڈی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس امت کو ایک اعلیٰ اور برتر کام سپرد کیا گیا تھا جس کی وجہ سے "خیر الامم" کا معزز خطاب اس کو عطا کیا گیا۔

دنیا کی پیدائش کا مقصدِ اصلی خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات و صفات کی معرفت ہے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے کہ جب تک بنی نوع انسان کو برائیوں اور گندگیوں سے پاک کر کے بھلائیوں اور خوبیوں کے ساتھ آراستہ نہ کیا جائے۔ اسی مقصد کے لیے ہزاروں رسولؐ اور نبی بھیجے گئے اور آخر میں اس مقصد کی تکمیل کے لیے سید الانبیاء والمرسلینؐ کو مبعوث فرمایا اور اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کا مژدہ سنایا گیا۔

اب چونکہ مقصد کی تکمیل ہو چکی تھی ہر بھلائی اور برائی کو کھول کھول کر بیان کر دیا گیا تھا۔ ایک مکمل نظامِ عمل دیا جا چکا تھا۔ اس لیے رسالت و نبوت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ اور جو کام پہلے نبی اور رسول سے لیا جاتا تھا وہ قیامت تک "امتِ محمدیہ" کے سپرد کر دیا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ اے امتِ محمدیہ! تم افضل امت ہو تم کو لوگوں کے نفع کے لیے بھیجا گیا ہے تم بھلی

...الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط (آل عمران ع ۱۲)

باتوں کو لوگوں میں پھیلاتے ہو اور بُری باتوں سے ان کو روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

...تَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ...يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ ...الْمُنْكَرِ ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o (آل عمران ع ۱۱)

اور چاہیے کہ تم میں ایسی جماعت ہو کہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے اور بھلی باتوں کا حکم کرے اور بڑی بڑی باتوں سے منع کرے اور صرف وہی لوگ فلاح والے ہیں جو اس کام کو کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں "خیرِ اُمم" ہونے کی وجہ یہ بتلائی کہ تم بھلائی کو پھیلاتے ہو اور برائی سے روکتے ...ر دوسری آیت میں حصر کے ساتھ فرمادیا کہ فلاح وبہبود صرف انہیں لوگوں کے لیے ہے ...اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ دوسری جگہ صاف طور پر بیان کر دیا کہ ...ں کام کو انجام نہ دینا لعنت اور پھٹکار کا موجب ہے۔

...نَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ...لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ط ذٰلِكَ بِمَا ...صَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ o كَانُوْا ...يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط ...ئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ o (مائدہ ع ۱۱)

بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر لعنت کی گئی تھی داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریمؑ کی زبان سے یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے حکم کی مخالفت کی اور حد سے نکل گئے۔ جو بُرا کام انہوں نے کر رکھا تھا اس سے ...نہ آتے تھے۔ واقعی ان کا یہ فعل بے شک بُرا تھا۔

اس آخری آیت کی مزید وضاحت احادیثِ ذیل سے ہوتی ہے۔

...) وَفِي السُّنَنِ وَالْمُسْنَدِ مِنْ حَدِيْثِ ...بْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ ...ہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مَنْ ...نَ قَبْلَكُمْ كَانَ اِذَا عَمِلَ الْعَامِلُ ...يْهِمْ بِالْخَطِيْئَةِ جَآءَهُ النَّاهِيْ تَعْزِيْرًا ...قَالَ يَا هٰذَا اتَّقِ اللّٰهَ فَاِذَا كَانَ مِنَ

(۱) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم سے پہلی امتوں میں جب کوئی خطا کرتا تو روکنے والا اس کو دھمکاتا اور کہتا کہ خدا سے ڈر پھر لگلے ہی دن اس کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا۔ گویا کل

الْغَدِ جَالِسَهُ وَاَكِيْلَهُ وَشَارِبَهُ كَاَنَّهُ لَمْ يَرَهُ عَلٰى خَطِيْئَةٍ بِالْاَمْسِ فَلَمَّا رَاٰى عَزَّوَجَلَّ ذٰلِكَ مِنْهُمْ ضَرَبَ بِقُلُوْبِ بَعْضِهِمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ لَعَنَهُمْ عَلٰى لِسَانِ نَبِيِّهِمْ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَتَاْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ السَّفِيْهِ وَلَتَاْطِرُنَّ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا اَوْ لَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ثُمَّ يَلْعَنُكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ۔

(۲) وَفِيْ سُنَنِ اَبِيْ دَاوٗدَ ابْنِ مَاجَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ رَجُلٍ يَكُوْنُ فِيْ قَوْمٍ يَعْمَلُ فِيْهِمْ بِالْمَعَاصِيْ يَقْدِرُوْنَ عَلٰى اَنْ يُغَيِّرُوْا عَلَيْهِ وَلَا يُغَيِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ يَمُوْتُوْا

(۳) وَرَوَى الْاَصْبَهَانِيُّ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزَالُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تَنْفَعُ مَنْ قَالَهَا وَتَرُدُّ عَنْهُمُ الْعَذَابَ وَالنِّقْمَةَ مَا لَمْ يَسْتَخِفُّوْا بِحَقِّهَا قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْاِسْتِخْفَافُ بِحَقِّهَا قَالَ يَظْهَرُ

اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہی نہیں، جب حق عز وجل نے ان کا یہ برتاؤ دیکھا تو بعض کے قلوب کو بعض کے ساتھ خلط کر دیا اور ان کے نبی داؤدؑ اور عیسیٰؑ بن مریم علیہما السلام کی زبانی ان پر لعنت کی اور یہ اس لیے کہ انہوں نے خدا کی نافرمانی کی اور حد سے تجاوز کیا۔ قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے تم ضرور اچھی باتوں کا حکم کرو اور بُری باتوں سے منع کرو اور چاہیے کہ بیوقوف نادان کا ہاتھ پکڑو اس کو حق بات پر مجبور کرو ورنہ حق تعالیٰ تمہارے قلوب کو بھی خلط ملط کر دیں گے اور پھر تم پر بھی لعنت ہوگی جیسا کہ پہلی امتوں پر لعنت ہوئی۔

(۲) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی جماعت اور قوم میں کوئی شخص گناہ کرتا ہے اور وہ قوم باوجود قدرت کے اس کو نہ روکتی تو ان پر مرنے سے پہلے ہی حق تعالیٰ ا عذاب بھیج دیتے ہیں یعنی دنیا ہی میں ان کو طرح طرح کے مصائب میں مبتلا کر دیا جاتا

(۳) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیشہ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اپنے پڑھنے والے کو نف

ـمَلْ بِمَعَاصِى اللهِ فَلَا يُنْكِرُ
لَا يُغَيِّرُ۔

(ترغیب)

۴ عَنْ عَائِشَةَ رَضِىَ اللهُ تَعَالٰى
ـنْهَا قَالَتْ دَخَلَ عَلَىَّ النَّبِىُّ
ـلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
ـرَفْتُ فِىْ وَجْهِهٖ اَنْ قَدْ
ـضَرَهٗ شَيْئٌ فَتَوَضَّأَ وَمَا
ـكَلَّمَ اَحَدًا فَلَصَقْتُ
ـلْحُجْرَةِ اَسْتَمِعُ مَا
ـوْلُ فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ
ـمِدَ اللهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ
ـقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللهَ
ـالٰى يَقُوْلُ لَكُمْ مُرُوْا
ـلْمَعْرُوْفِ وَانْهَوْا عَنِ
ـمُنْكَرِ قَبْلَ اَنْ تَدْعُوْا
ـلَا اُجِيْبَ لَكُمْ وَتَسْأَلُوْنِىْ
ـلَا اُعْطِيَكُمْ وَتَسْتَنْصِرُوْنِىْ
ـلَا اَنْصُرَكُمْ فَمَا زَادَ
ـلَيْهِنَّ حَتّٰى نَزَلَ۔

(ترغیب)

۵۔ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ رض قَالَ قَالَ
ـسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا
ـظَّمَتْ اُمَّتِىْ الدُّنْيَا نُزِعَتْ

دیتا ہے اور اس سے عذاب و بلا دور کرتا ہے
جب تک کہ اس کے حقوق کی بے پروائی
نہ برتی جائے۔ صحابہؓ نے عرض کیا اس کے
حقوق کی بے پروائی کیا ہے؟ حضورِ اقدس ؐ
نے ارشاد فرمایا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی کھلے طور
پر کی جائے پھر نہ ان کا انکار کیا جائے اور نہ
ان کے بند کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۴) حضرت عائشہ رض فرماتی ہیں کہ رسولِ خدا
صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے
تو میں نے چہرۂ انور پر ایک خاص اثر دیکھ کر
محسوس کیا کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے۔
حضورِ اقدس ؐ نے کسی سے کوئی بات نہیں کی اور
وضو فرما کر مسجد میں تشریف لے گئے میں
مسجد کی دیوار سے لگ گئی تاکہ کوئی ارشاد ہو
اس کو سنوں۔ حضورِ اقدس منبر پر جلوہ افروز
ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ لوگو! اللہ
تعالیٰ کا حکم ہے کہ بھلی باتوں کا حکم کرو اور
بری باتوں سے منع کرو مبادا وہ وقت
آجائے کہ تم دعا مانگو اور میں اس کو قبول نہ
کروں اور تم مجھ سے سوال کرو اور میں اس
کو پورا نہ کروں اور تم مجھ سے مدد چاہو اور
میں تمہاری مدد نہ کروں۔ حضورِ اقدس نے
صرف یہ کلمات ارشاد فرمائے اور منبر سے
اُتر گئے حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے

مِنْهَا هَيْبَةُ الْإِسْلَامِ وَإِذَا تَرَكَتِ الْأَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيَ عَنِ الْمُنْكَرِ حُرِمَتْ بَرَكَةُ الْوَحْيِ وَ إِذَا تَسَابَّتْ أُمَّتِي سَقَطَتْ مِنْ عَيْنِ اللهِ۔

(کذا فی الدر عن الحکیم الترمذی)

کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری اُمت دنیا کو قابلِ وقعت و عظمت سمجھنے لگے گی تو اسلام کی وقعت و ہیبت انکے قلوب سے نکل جائے گی۔ اور جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی اور جب آپس میں ایک دوسرے کو سب و شتم کرنا اختیار کرے گی تو اللہ جل شانہٗ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

احادیث مذکورہ پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو چھوڑنا خدا وحدہٗ لاشریک کی لعنت اور غضب کا باعث ہے اور جب امت محمدیہ اس کام کو چھوڑ دے گی تو سخت مصائب و آلام اور ذلت و خواری میں مبتلا کر دی جائے گی اور ہر قسم کی غیبی نصرت و مدد سے محروم ہو جائے گی اور یہ سب کچھ اس لیے ہو گا کہ اُس نے اپنے فرضِ منصبی کو نہیں پہچانا اور جس کام کی انجام دہی کی ذمہ دار تھی اس سے غافل رہی یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو ایمان کا خاصہ اور جزوِ لازمی قرار دیا اور اس کے چھوڑنے کو ایمان کے ضعف و اضمحلال کی علامت بتلایا۔ حدیث ابو سعید خدریؓ میں ہے۔ مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَ ذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔

یعنی تم میں سے جب کوئی شخص بُرائی کو دیکھے تو چاہیے کہ اپنے ہاتھوں سے کام لے کر اس کو دُور کرے اور اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو دل سے۔ اور یہ آخری صورت ایمان کی بڑی کمزوری کا درجہ ہے پس جس طرح آخری درجہ اضعف ایمان کا ہوا۔ اسی طرح پہلا درجہ کمال دعوت اور کمالِ ایمان ہوا۔ اس سے بھی واضح تر حدیث ابن مسعودؓ کی ہے۔ مَا مِنْ نَّبِیٍّ بَعَثَہُ اللہُ قَبْلِیْ

لاكَانَ لَهٗ فِي اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ
ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَيَفْعَلُوْنَ
مَا لَا يُؤْمَرُوْنَ فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ
بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِكَ
مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ (مسلم) یعنی سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ ہر نبی اپنے ساتھیوں
و تربیت یافتہ یاروں کی ایک جماعت چھوڑ جاتا ہے یہ جماعت نبی کی سنت کو قائم
رکھتی ہے اور ٹھیک ٹھیک اس کی پیروی کرتی ہے یعنی شریعتِ الٰہی کو جس حال اور جس
شکل میں نبی چھوڑ گیا ہے، اس کو بعینہٖ محفوظ رکھتے ہیں اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں
آنے دیتے لیکن اس کے بعد شر و فتن کا دور آتا ہے اور ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں
جو طریقۂ نبی سے ہٹ جاتے ہیں انکا فعل ان کے دعوے کے خلاف ہوتا ہے اور
ان کے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے شریعت نے حکم نہیں دیا سو ایسے لوگوں کے
خلاف جس شخص نے قیامِ حق و سنّت کی راہ میں اپنے ہاتھ سے کام لیا وہ مومن ہے اور
جو ایسا نہ کرسکا مگر زبان سے کام لیا وہ بھی مومن ہے اور جس سے یہ بھی نہ ہو سکا اور دل
کے اعتقاد اور نیت کے ثبات کو ان کے خلاف کام میں لایا وہ بھی مومن ہے لیکن اس
آخری درجہ کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں اس پر ایمان کی سرحد ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اب
رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہو سکتا۔

اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو امام غزالیؒ نے اس طرح ظاہر فرمایا ہے:۔

"اس میں کچھ شک نہیں کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دین کا ایسا زبردست رُکن
ہے جس سے دین کی تمام چیزیں وابستہ ہیں۔ اس کو انجام دینے کے لیے حق تعالیٰ نے
تمام انبیاء کرامؑ کو مبعوث فرمایا اگر خدانخواستہ اس کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور اس کے
علم و عمل کو ترک کر دیا جائے تو العیاذ باللہ نبوت کا بیکار ہونا لازم آئے گا۔ دیانت جو
شرافتِ انسانی کا خاصہ ہے، مضمحل اور افسردہ ہو جائے گی۔ کاہلی اور سستی عام ہو جائے گی۔
گمراہی اور ضلالت کی شاہراہیں کھل جائیں گی۔ جہالت عالمگیر ہو جائے گی۔ تمام کاموں میں
خرابی آجائے گی، آپس میں پھوٹ پڑ جائے گی، آبادیاں خراب ہو جائیں گی۔ مخلوق تباہ

و برباد ہو جائے گی اور اس تباہی اور بربادی کی اس وقت خبر ہو گی جب روزِ محشر کو خدائے بالا و برتر کے سامنے پیشی اور بازپرس ہو گی۔"

افسوس صد افسوس! جو خطرہ تھا وہ سامنے آگیا، جو کھٹکا تھا آنکھوں نے دیکھ لیا۔ كَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا ۝ فَإِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

اس سربسز ستون کے علم و عمل کے نشانات مٹ چکے، اس کی حقیقت و رسوم کی برکتیں نیست و نابود ہو گئیں لوگوں کی تحقیر و تذلیل کا سکہ قلوب پر جم گیا۔ خدائے پاک کے ساتھ قلبی تعلق مٹ چکا اور نفسانی خواہشات کے اتباع میں جانوروں کی طرح بے باک ہو گئے۔ روئے زمین پر ایسے صادق مومن کا ملنا دشوار و کمیاب ہی نہیں بلکہ معدوم ہو گیا جو اظہارِ حق کی وجہ سے کسی کی ملامت گوارا کرے۔

اگر کوئی مردِ مومن اس تباہی اور بربادی کے ازالہ میں سعی کرے اور اس سنت کے احیاء میں کوشش کرے اور اس مبارک بوجھ کو لے کر کھڑا ہو اور آستینیں چڑھا کر اس سنت کے زندہ کرنے کے لیے میدان میں آئے تو یقیناً وہ شخص تمام مخلوق میں ایک ممتاز اور نمایاں ہستی کا مالک ہو گا۔

امام غزالیؒ نے جن الفاظ میں اس کام کی اہمیت اور ضرورت کو بیان کیا ہے وہ ہماری تنبیہ اور بیداری کے لیے کافی ہیں

ہمارے اس قدر اہم فریضہ سے غافل ہونے کی چند وجوہ معلوم ہوتی ہیں:۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس فریضہ کو علماء کے ساتھ خاص کر لیا۔ حالانکہ خطابات قرآنی عام ہیں جو امتِ محمدیہ کے ہر ہر فرد کو شامل ہیں اور صحابۂ کرام اور خیر القرون کی زندگی اس کے لیے شاہد عدل ہے:۔

فریضۂ تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو علماء کے ساتھ خاص کر لینا اور پھر ان کے بھروسہ پر اس اہم کام کو چھوڑ دینا ہماری سخت نادانی ہے۔ علماء کا کام راہِ حق بتلانا اور سیدھا راستہ دکھلانا ہے پھر اس کے موافق عمل کرانا اور مخلوقِ خدا کو اس پر چلانا یہ دوسرے لوگوں کا کام ہے اس کی جانب اس حدیث شریف میں تنبیہ کی گئی ہے۔

اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ فَالْاَمِيْرُ الَّذِيْ عَلَى النَّاسِ رَاعٍ عَلَيْهِمْ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُمْ وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى بَيْتِ بَعْلِهَا وَوَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَالْعَبْدُ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ

بیشک تم سب کے سب نگہبان ہو اور تم سب اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے۔ پس بادشاہ لوگوں پر نگہبان ہے وہ اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور مرد اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے، اور اس سے ان کے بارے میں سوال کیا جاوے گا اور عورت اپنے خاوند کے گھر اور اولاد پر نگہبان ہے وہ ان کے بارے میں سوال کی جاوے گی اور غلام اپنے مالک کے مال پر نگہبان ہے، وہ اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جاویگا۔ پس تم سب نگہبان ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال کیا جاویگا۔

اور اسی کو واضح طور پر اس طرح بیان فرمایا ہے۔

قَالَ الدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ (مُسْلِم)

حضور اقدسؐ نے فرمایا دین سراسر نصیحت ہے (صحابہؓ نے) عرض کیا کس کے لیے۔ فرمایا اللہ کے لیے اور اللہ کے رسولؐ کے لیے اور مسلمانوں کے مقتداؤں کے لیے اور عام مسلمانوں کیلیے

اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ یہ علماء کا کام ہے تب بھی اس وقت فضاء مقتضی یہی ہے کہ ہر شخص اس کام میں لگ جائے اور اعلاء کلمۃ اللہ اور حفاظت دین متین کے لیے کمربستہ ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر ہم خود اپنے ایمان میں پختہ ہیں

تو دوسروں کی گمراہی ہمارے لیے نقصان دہ نہیں جیساکہ اس آیت شریفہ کا مفہوم ہے ۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ط	اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص گمراہ ہے اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں
(مائدہ ۔ ع ۱۴)	(بیان القرآن)

لیکن درحقیقت آیت سے یہ مقصود نہیں جو ظاہر میں سمجھا جا رہا ہے اس لیے کہ یہ معنی حکمتِ خداوندیہ اور تعلیماتِ شرعیہ کے بالکل خلاف ہیں۔ شریعتِ اسلامی نے اجتماعی زندگی اور اجتماعی اصلاح اور اجتماعی ترقی کو اصل بتلایا ہے اور امتِ مسلمہ کو بمنزلہ ایک جسم کے قرار دیا ہے کہ اگر ایک عضو میں درد ہو جائے تو تمام جسم بے چین ہو جاتا ہے ۔

بات دراصل یہ ہے کہ بنی نوع انسان خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے اور کمال کو پہنچ جائے اس میں ایسے لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو سیدھے راستے کو چھوڑ کر گمراہی میں مبتلا ہوں تو آیت میں مومنوں کے لیے تسلی ہے کہ جب تم ہدایت اور صراطِ مستقیم پر قائم ہو تو تم کو ان لوگوں سے مضرت کا اندیشہ نہیں جنہوں نے بھٹک کر سیدھا راستہ چھوڑ دیا۔

نیز اصل ہدایت یہ ہے کہ انسان شریعتِ محمدیہ کو مع تمام احکام کے قبول کرے اور منجملہ خداوندی احکام کے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی ہے۔

ہمارے اس قول کی تائید حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے ارشاد سے ہوتی ہے ۔

عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ الصِّدِّيْقِ رضؓ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمْ تَقْرَءُوْنَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ	حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے فرمایا۔ اے لوگو! تم یہ آیت يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ پیش کرتے ہو اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے

إِذَا مُدَاهَنْتُمْ دَمَانِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ إِنَّ النَّاسَ إِذَا رَأَوُا الْمُنْكَرَ فَلَمْ يُغَيِّرُوهُ أَوْشَكَ أَنْ يَعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهِ

ہوئے سُنا ہے کہ جب لوگ خلافِ شرع کسی چیز کو دیکھیں اور اس میں تغیر نہ کریں تو قریب ہے کہ حق تعالیٰ ان لوگوں کو اپنے عمومی عذاب میں مبتلا فرما دے۔

علماء محققین نے بھی آیت کے یہی معنی لیے ہیں۔ امام نوویؒ شرح مُسلم میں فرماتے ہیں:۔

"علماء محققین کا صحیح مذہب اس آیت کے معنی میں یہ ہے کہ جب تم اس چیز کو ادا کر دو جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے تو تمہارے غیر کی کوتاہی تمہیں مضرت نہ پہنچائے گی جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى اور جب ایسا ہے تو منجملہ ان اشیاء کے جن کا حکم دیا گیا امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے پس جب کسی شخص نے اس حکم کو پورا کر دیا اور مخاطب نے اس کی تعمیل نہ کی تو اب ناصح پر کوئی عتاب اور سرزنش نہیں، اس لیے کہ جو کچھ اس کے ذمّہ واجب تھا وہ امر و نہی ہے اس نے اس کو ادا کر دیا۔ دُوسرے کا قبول کرنا اس کے ذمّے نہیں۔ واللہ اعلم"۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عوام و خواص، عالم و جاہل ہر شخص اصلاح سے مایُوس ہو گیا اور انہیں یقین ہو گیا کہ اب مسلمانوں کی ترقی اور انکا عروج ناممکن اور دشوار ہے جب کسی شخص کے سامنے کوئی اصلاحی نظام پیش کیا جاتا ہے تو جواب یہی ملتا ہے، کہ مسلمانوں کی ترقی اب کیسے ہو سکتی ہے جبکہ ان کے پاس نہ سلطنت و حکومت ہے نہ مال و زر اور نہ سامانِ حرب اور نہ مرکزی حیثیت، نہ قوتِ بازو، اور نہ باہمی اتفاق و اتحاد۔

بالخصوص دیندار طبقہ تو بزعم خُود یہ طے کر چکا ہے کہ اب چودھویں صدی ہے

مانہ رسالت کو بُعد ہو چکا۔ اب اسلام اور مسلمانوں کا انحطاط ایک لازمی شئے ہے،
ہں اس کے لیے جدّوجہد کرنا عبث اور بیکار ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جس قدر مشکوٰۃ نبوت
سے بُعد ہوتا جائے گا۔ حقیقی اسلام کی شعاعیں ماند پڑتی جائیں گی لیکن اس کا یہ مطلب
ہرگز نہیں کہ بقاء شریعت اور حفاظت دین محمّدی کے لیے جدّوجہد اور سعی نہ کی جائے
س لیے کہ اگر ایسا ہوتا اور ہمارے اسلاف بھی خدانخواستہ یہی سمجھ لیتے تو آج ہم تک
س دین کے پہنچنے کی کوئی سبیل نہ تھی البتہ جب کہ زمانہ ناموافق ہے تو رفتارِ زمانہ کو
یکھتے ہوئے زیادہ ہمت اور استقلال کے ساتھ اس کام کو لیکر کھڑے ہونے
کی ضرورت ہے۔

تعجب ہے کہ جو مذہب سراسر عمل اور جدّوجہد پر مبنی تھا۔ آج اس کے پیرو عمل
سے یکسر خالی ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید اور حدیث شریف میں جگہ جگہ عمل اور جہد کا سبق
پڑھایا اور بتلایا ہے کہ ایک عبادت گذار تمام رات نفل پڑھنے والا، دن بھر روزہ رکھنے
والا، اللہ اللہ کرنے والا ہرگز اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جو دوسروں کی اصلاح
اور ہدایت کی فکر میں بے چین ہو۔

قرآن کریم نے جگہ جگہ جہاد فی سبیل اللہ کی تاکید کی اور مُجاہد کی فضیلت اور برتری
کو نمایاں کیا۔

لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ مِنَ	برابر نہیں وہ مسلمانوں جو بلا کسی عذر کے
الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِى الضَّرَرِ	گھر میں بیٹھے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ
وَالْمُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ	میں اپنے مال و جان سے جہاد کریں اللہ
اللهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط	تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ
فَضَّلَ اللهُ الْمُجٰهِدِيْنَ	بلند کیا ہے جو اپنے مال و جان سے جہاد
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	کرتے ہیں بہ نسبت گھر بیٹھنے والوں کے
عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ط	اور سب سے اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا
وَكُلًّا وَّعَدَ اللهُ الْحُسْنٰى ط	وعدہ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے مجاہدین
وَفَضَّلَ اللهُ الْمُجٰهِدِيْنَ	کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے اجر

عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ۙ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۙ (النساء ع ۱۳)

عظیم دیا ہے یعنی بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے اور مغفرت اور رحمت، اور اللہ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اگرچہ آیت میں جہاد سے مراد کفار کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا ہے تاکہ اسلام کا بول بالا ہو اور کفر و شرک مغلوب و مقہور ہو لیکن اگر بدقسمتی سے آج ہم اس سعادت عظمیٰ سے محروم ہیں تو اس مقصد کے لیے جس قدر جدّ و جہد ہماری قدرت اور استطاعت میں ہے۔ اس میں تو ہرگز کوتاہی نہ کرنی چاہیے۔ پھر ہماری یہی معمولی حرکت عمل اور جدّ و جہد ہمیں کشاں کشاں آگے بڑھائے گی وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ یعنی جو لوگ ہمارے دین کے لیے کوشش کرتے ہیں ہم ان کے لیے اپنے راستے کھول دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دینِ محمدی کی بقا و تحفظ کا حق تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے، لیکن اس کے لیے ہمارا عمل اور سعی مطلوب ہے۔ صحابہ کرام نے اس کے لیے جس قدر انتھک کوشش کی اسی قدر ثمرات بھی مشاہدہ کیے اور غیبی نصرت سے سرفراز ہوئے، ہم بھی ان کے نام لیوا ہیں اگر اب بھی ہم ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اشاعتِ اسلام کے لیے کمربستہ ہو جائیں تو یقیناً ہم بھی نصرتِ خداوندی اور امدادِ غیبی سے سرفراز ہوں گے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ یعنی اگر تم خدا کے دین کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاؤ گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم خود ان باتوں کے پابند نہیں اور اس منصب کے اہل نہیں تو دوسروں کو کس منہ سے نصیحت کریں لیکن یہ نفس کا صریح دھوکہ ہے جب ایک کام کرنے کا ہے اور حق تعالیٰ کی جانب سے ہم اس کے مامور ہیں تو پھر ہمیں اس میں پس و پیش کی گنجائش نہیں۔ ہمیں خدا کا حکم سمجھ کر کام شروع کر دینا چاہیے۔ پھر ان شاء اللہ یہی جدّ و جہد ہماری پختگی، استحکام اور استقامت

کا باعث ہو گی اور اسی طرح کرتے کرتے ایک دن تقرب خداوندی کی سعادت نصیب ہو جائے گی یہ ناممکن اور محال ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے کام میں جدوجہد کریں اور وہ رحمٰن و رحیم ہماری طرف نظر کرم نہ فرمائے۔ میرے اس قول کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے۔

عن انس رض قال قلنا یا رسول اللہ لا نأمر بالمعروف حتی نعمل بہ کلہ ولا ننھی عن المنکر حتی نجتنبہ کلہ فقال صلی اللہ علیہ وسلم بل مروا بالمعروف وان لم تعملوا بہ کلہ وانھوا عن المنکر وان لم تجتنبوہ کلہ

(رواہ الطبرانی فی الصغیر الاوسط)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم بھلائیوں کا حکم نہ کریں جب تک خود تمام پر عمل نہ کریں اور برائیوں سے منع نہ کریں جب تک خود تمام برائیوں سے نہ بچیں حضور اقدس نے ارشاد فرمایا نہیں بلکہ تم بھلی باتوں کا حکم کرو اگرچہ تم خود ان سب کے پابند نہ ہو اور برائیوں سے منع کرو اگرچہ تم خود ان سب سے نہ بچ رہے ہو۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ ہم سمجھ رہے ہیں کہ جگہ جگہ مدارس دینیہ کا قائم ہونا، علماء کا وعظ و نصیحت کرنا، خانقاہوں کا آباد ہونا، مذہبی کتابوں کا تصنیف ہونا۔ رسالوں کا جاری ہونا، یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے شعبے ہیں اور ان کے ذریعہ اس فرض کی ادائیگی ہو رہی ہے اس میں شک نہیں کہ ان سب اداروں کا قیام اور بقاء ضروری ہے اور ان کی جانب اعتناء اہم امور سے ہے اس لیے کہ دین کی جو کچھ بھی بہت جھلک دکھائی دے رہی ہے وہ انہی اداروں کے مبارک آثار ہیں لیکن پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری موجودہ ضرورت کے لیے یہ ادارے کافی نہیں اور ان پر اکتفاء کرنا ہماری کھلی غلطی ہے اس لیے کہ ان اداروں سے ہم اس وقت منتفع ہو سکتے ہیں جب ہم میں دین کا شوق اور طلب ہو اور مذہب کی وقعت و عظمت ہو۔ اب سے پچاس سال پہلے ہم میں طلب اور شوق موجود تھا اور ایمان

ملک دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے ان اداروں کا قیام ہمارے لیے کافی تھا لیکن آج
ر اقوام کی انتھک کوششوں نے ہمارے اسلامی جذبات بالکل فنا کر دیئے اور
لب و رغبت کے بجائے آج ہم مذہب سے متنفر اور بیزار نظر آتے ہیں۔ ایسی
الت میں ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مستقل کوئی تحریک ایسی شروع کریں جس سے
ام میں دین کے ساتھ تعلق اور شوق و رغبت پیدا ہو اور ان کے سوئے ہوئے جذبات
یدار ہوں، پھر ہم ان اداروں سے ان کی شان کے مطابق منتفع ہو سکتے ہیں ورنہ اسی
ح اگر دین سے بے رغبتی اور بے اعتنائی بڑھتی گئی تو ان اداروں سے انتفاع تو
کنار ان کی بقا بھی دشوار نظر آتی ہے۔

چھٹی وجہ یہ ہے کہ جب ہم اس کام کو لے کر دوسروں کے پاس جاتے ہیں تو
ہ بری طرح پیش آتے ہیں اور سختی سے جواب دیتے ہیں اور ہماری توہین و تذلیل
رتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کام انبیاء کرام کی نیابت ہے اور ان
صائب اور مشقتوں میں مبتلا ہونا اس کام کا خاصہ ہے اور یہ سب مصائب و
کالیف بلکہ اس سے بھی زائد انبیاء کرام نے اس راہ میں برداشت کیں حق تعالی
ارشاد ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ حجر ع ۱	ہم بھیج چکے ہیں رسول تم سے پہلے اگلے لوگوں کے گروہوں میں اور ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا تھا، مگر یہ اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے دعوت حق کی راہ میں جس قدر مجھ کو اذیت
ر تکلیف میں مبتلا کیا گیا ہے، کسی نبی اور رسول کو نہیں کیا گیا۔

پس جب سردارِ دو عالم اور ہمارے آقا و مولے نے ان مصائب اور مشقتوں
تحمل اور بُردباری کے ساتھ برداشت کیا تو ہم بھی ان کے پیرو ہیں اور انہی کا کام
لے کر کھڑے ہوئے ہیں ہمیں بھی ان مصائب سے پریشان نہ ہونا چاہیے، اور تحمل اور
دباری کے ساتھ ان کو برداشت کرنا چاہیے۔

ماسبق سے یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ ہمارا اصل مرض روح اسلامی اور حقیقتِ ایمانی کا ضعف اور اضمحلال ہے ہمارے اسلامی جذبات فنا ہو چکے اور ہماری ایمانی قوت زائل ہو چکی اور جب اصل شے میں انحطاط آ گیا تو اس کے ساتھ جتنی خوبیاں اور بھلائیاں وابستہ تھیں ان کا انحطاط پذیر ہونا بھی لابدی اور ضروری تھا اس ضعف اور انحطاط کا سبب اس اصل شے کا چھوڑ دینا ہے جس پر تمام دین کی بقا اور دارومدار ہے اور وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کے افراد خوبیوں اور کمالات سے آراستہ نہ ہوں۔

پس ہمارا علاج صرف یہ ہے کہ ہم فریضۂ تبلیغ کو اس طرح لے کر کھڑے ہوں جس سے ہم میں قوتِ ایمانی بڑھے اور اسلامی جذبات ابھریں۔ ہم خدا اور رسولؐ کو پہچانیں اور احکام خداوندی کے سامنے سرنگوں ہوں اور اس کے لیے ہمیں وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جو سید الانبیاء والمرسلینؐ نے مشرکین عرب کی اصلاح کے لیے اختیار فرمایا:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط	بے شک تمہارے لیے رسول اللہؐ میں اچھی پیروی ہے۔

اسی کی جانب امام مالک رضی اللہ عنہ اشارہ فرماتے ہیں لَنْ یُّصْلِحَ اٰخِرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا مَا اَصْلَحَ اَوَّلَهَا یعنی اس امت محمدیہ کے آخر میں آنے والے لوگوں کی ہرگز اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہی طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس نے ابتدا میں اصلاح کی ہے۔

جس وقت نبی کریمؐ دعوتِ حق لے کر کھڑے ہوئے، آپؐ تنہا تھے، کوئی آپؐ کا ساتھی اور ہم خیال نہ تھا، کوئی دنیوی طاقت آپؐ کو حاصل نہ تھی، آپؐ کی قوم میں خودسری اور خودرائی انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی تھی، ان میں سے کوئی حق بات سننے اور اطاعت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ بالخصوص جس کلمۂ حق کی آپؐ تبلیغ کرنے کھڑے ہوئے تھے اس سے تمام قوم کے قلوب متنفر اور بیزار تھے، ان حالات میں کون سی طاقت تھی جس سے

ایک مفلس و نادار اور بے یار و مددگار انسان نے تمام قوم کو اپنی طرف کھینچا، اب غور کیجئے کہ وہ آخر کیا چیز تھی جس کی طرف آپ نے مخلوق کو بلایا اور جس شخص نے اس چیز کو پا لیا وہ پھر ہمیشہ کے لیے آپ کا ہو رہا، دنیا جانتی ہے کہ وہ صرف ایک سبق تھا، جو آپ کا مطمح نظر اور مقصود اصلی تھا جس کو آپ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا	بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت
نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا	نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو
يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا	شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے
اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ط	کوئی دوسرے کو رب نہ قرار دے،
(آل عمران ع ۷)	خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر۔

اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے سوا ہر شے کی عبادت اور اطاعت اور فرمانبرداری کی ممانعت کی اور اغیار کے تمام بندھنوں اور علاقوں کو توڑ کر ایک نظام عمل مقرر کر دیا اور بتلا دیا کہ اس سے ہٹ کر کسی دوسری طرف رُخ نہ کرنا۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ	تم لوگ اس کا اتباع کرو جو تمہارے پاس
رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ	تمہارے ربّ کی طرف سے آئی ہے،
دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ط	اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا
(اعراف۔ ع ۱)	اتّباع مت کرو۔

یہی وہ اصل تعلیم تھی جس کی اشاعت کا آپ کو حکم دیا گیا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ	اے محمدؐ! بلاؤ لوگوں کو اپنے ربّ کے
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ	راستے کی طرف حکمت اور نیک نصیحت
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ	سے اور ان کے ساتھ بحث کرو جس طرح
هِيَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّكَ	بہتر ہو، بیشک تمہارا رب ہی خوب جانتا
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ	ہے اس شخص کو جو گمراہ ہو اس کی راہ
عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ	سے وہی خوب جانتا ہے راہ چلنے
بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ (نحل۔ ع ۱۶)	والوں کو۔

اور یہی وہ شاہراہ تھی جو آپ اور آپ کے ہر پیرو کے لیے مقرر کی گئی۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ (یوسف ع ۱۲)	کہہ دو یہ ہے میرا راستہ، بلاتا ہوں، اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر، میں اور جتنے میرے تابع ہیں وہ بھی، اور اللہ پاک ہے، اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔
وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (حم سجدہ ۔ ع ۴)	اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو خدا کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔

پس اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی مخلوق کو بلانا، بھٹکے ہوؤں کو راہِ حق دکھلانا، گمراہوں کو ہدایت کا راستہ دکھلانا نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وظیفۂ حیات اور آپؐ کا مقصدِ اصلی تھا اور اسی مقصد کی نشوونما اور آبیاری کے لیے ہزاروں نبی اور رسول بھیجے گئے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ○ (الانبیاء ع ۲)	اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے کوئی رسول مگر اس کی جانب یہی وحی بھیجتے تھے کہ کوئی معبود نہیں بجز میرے، پس میری بندگی کرو۔

نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور دیگر انبیاء کرامؑ کے مقدس لمحاتِ زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب کا مقصد اور نصب العین صرف ایک ہے، اور وہ اللہ رب العالمین وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات و صفات کا یقین کرنا یہی ایمان اور اسلام کا مفہوم ہے اور اسی لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ یعنی ہم نے جنات اور انسا

(باقی ص ۶۹)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروس قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۱، نشست ۵۲

مباحث عمل صالح

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

(سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں)

(۳)

نحمدہٗ و نصلّی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○ وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا ○ صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ ط ۔

"اور مت قتل کرو اپنی اولاد کو مفلسی اور تنگ دستی کے خوف سے۔ ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی دے رہے ہیں اور دیں گے۔ یقیناً ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔ اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ یہ بہت بڑی بے حیائی اور بہت بری راہ ہے"۔

محترم حاضرین و معزز ناظرین...... میں نے آج آغاز میں 'سورۂ بنی اسرائیل آیت نمبر ۳۲ اور ۳۲ کی تلاوت کی ہے اور ان کا رواں و سلیس ترجمہ آپ کو سنایا ہے۔ ایام جاہلیت یعنی بعثت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے قبل عرب میں یہ قبیح رواج تھا کہ پیدائش کے بعد اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے کہ ان کا خرچ کہاں سے لائیں گے! گویا معاشی محرکات ان کو اولاد جیسے ظالمانہ فعل پر آمادہ کرتے تھے۔ یہاں افلاس کے خوف سے قتلِ اولاد سے روکا

گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ رزق کے ٹھیکے دار تم نہیں ہو بلکہ اس کی پوری ذمہ داری اللہ پر ہے۔ وہی تمہیں رزق دیتا ہے اور وہی تمہاری آئندہ نسلوں کو بھی کھلائے گا۔ اولاد کا قتل ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ گویا یہ فعل کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ ہمارے اکثر علماء کرام نے معاشی محرکات کے تحت منع حمل کی تدابیر کو بھی طبعًا اسی 'نہی' کے حکم میں شامل قرار دیا ہے اور کسی حقیقی و ناگزیر طبی ضرورت کے علاوہ صرف معاشی محرکات کے پیش نظر اسقاطِ حمل کو واضح طور پر قتلِ اولاد کے گناہِ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔

اب آیئے آیت نمبر ۳۲ کی طرف۔ اس آیۂ مبارکہ میں زنا کی جس شدت کے ساتھ ممانعت وارد ہو رہی ہے' وہ لفظ "لَا تَقْرَبُوْا" سے ظاہر ہے اس سے پہلے سورۃ الفرقان میں بھی ذکر آ چکا تھا۔ لیکن نوٹ کیجئے کہ وہاں الفاظ تھے' "وَلَا یَزْنُوْنَ" عباد الرّحمٰن کے اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا گیا کہ "وہ زنا نہیں کرتے" لیکن یہاں اس کی تاکید (EMPHASIS) میں اضافہ ہوا ہے اور نہی کے اسلوب میں حکم فرمایا جا رہا ہے کہ "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی" "زنا کے قریب تک نہ پھٹکو"۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی اور سماجی نظام میں اس سماجی برائی (SOCIAL EVIL) کو ختم کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی ہے...... اور واقعہ یہ ہے کہ بہت دور دور تک قدغنیں لگائی گئی ہیں تاکہ کوئی اس فحش اور بدکاری کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔ اس لئے کہ ہمارے معاشرے میں ہمارے سماج میں عصمت و عفت اور پاک دامنی (CHASTITY) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا ایک اسلامی معاشرے میں ہر ممکن تدبیر اور احتیاط اختیار کی جائے گی کہ اس بدکاری کے جو محرکات ہو سکتے ہیں' اس کے جو اسباب ہو سکتے ہیں' جو اس کے داعیات ہو سکتے ہیں' ان سب کے لئے بندشیں ہوں' قدغنیں ہوں۔

اس کے ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں بھی اور انجیل میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس لفظ زنا کی وسعت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ مجرد وہ فعل نہیں ہے جو اس لفظ سے عام طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں الفاظ آتے ہیں اَلزِّنَا مِنَ الْعَیْنِ آنکھوں کی بھی بدکاری ہے...... اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاتھوں کی بھی بدکاری ہے' پاؤں کی گ

بدکاری ہے' زبانوں کی بھی بدکاری ہے' کانوں کی بھی بدکاری ہے...... حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے یہ تمام اعضاء وجوارح بدکاری میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام راستوں کو بند کیا گیا ہے جن کے باعث انسان کے اس جذبہ میں اشتعال و ہیجان پیدا ہو۔

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم جائزہ لیں کہ یہ حقیقت پسندانہ ہدف معین کرنے کے بعد کہ ہمیں اپنے معاشرے میں عصمت و عفت اور آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرنا ہے اور بدکاری کا سدِّباب کرنا ہے تو کیا تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ —— آگے بڑھنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ قرآن مجید میں جو لفظ زنا آیا ہے اور جس نے ہمارے دین میں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے تو انگریزی زبان میں "FORNICATION"، "ADULTERY" اور "RAPE" ان تینوں الفاظ کا جو مدلول ہے وہ قرآن اور اسلام کی اصطلاح میں اس ایک لفظ زنا میں موجود ہے...... مقصد (OBJECTIVE) معین ہو گیا کہ اس کا استیصال کرنا ہے۔ اب دیکھنا ہو گا کہ اسلام میں اس کے لئے تدابیر کیا کیا اختیار کی گئی ہیں۔

سب سے پہلے مثبت تدابیر کو لیجئے۔ اہم ترین مثبت تدبیر ہے نکاح کو آسان بنانا۔ اس لئے کہ اگر نکاح مشکل ہے' ہزاروں لاکھوں روپے کے انتظام کے بغیر نکاح نہ ہو سکے تو ظاہر بات ہے کہ شہوت کے جبلّی تقاضے کی تسکین کے لئے بدکاری کی طرف رجحان ہو گا۔ جائز راستے کو جب تک کھولا نہ جائے' آسان نہ بنایا جائے تو جس طرح پانی کو بہاؤ کے لئے صحیح راستہ نہیں ملے گا' اس میں رکاوٹ ہو گی تو پانی ادھر ادھر سے اپنا راستہ بنا لے گا۔ اسی طرح جنسی جذبے کی آسودگی کے جائز راستوں کو مشکل بنا دیا جائے گا تو وہ ناجائز راستے تلاش کرے گا۔ لہٰذا اسلامی معاشرے میں زنا کے فعلِ قبیح کو روکنے والا اہم قدم تسہیلِ نکاح یعنی نکاح کو آسان بنانا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کے لئے رسومات (RITUALS) کا کوئی طومار نہیں۔ نہ یہ کوئی نام و نمود کی نمائش اور دھوم دھڑکے کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے یہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ایک ملغوبہ ہے کہ ہم نے کچھ چیزیں تو اسلام کی اختیار کیں اور چونکہ ہماری آبادی کی اکثریت ان ہندوؤں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ہندوستان میں آباد تھے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا یہ نومسلم اپنی سابقہ رسومات' روایات اور رواجات بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ ہماری سماجی رسومات ایک کھچڑی ہے۔ ان میں

ہندوانہ رسومات بھی شامل ہیں اور کچھ اسلامی افعال واعمال کو بھی ہم نے ان میں داخل کر لیا ہے۔ ورنہ یہ دھوم دھڑکا' یہ جہیز دینے کی رسم اور یہ بارات کا تصور جیسے ایک لشکر کہیں فتح کرنے کے لئے جا رہا ہو اور پھر بہت سی دوسری لغو اور فضول رسومات یہ سب کچھ ہندوانہ پس منظر کی حامل چیزیں ہیں۔ اسلام کا معاملہ نہایت سادہ طریق پر ایجاب وقبول ہے۔ اسلام نے شادی کا جشن (CELEBRATION) لڑکے کے ذمہ رکھا ہے۔ وہ دعوت ولیمہ کرے اور اپنی وسعت کے مطابق اپنے اعزّہ واقارب اور احباب کو اپنی خوشیوں میں شامل کرے۔ پس پہلی چیز تو یہ ہے کہ نکاح کے راستے کو آسان بنایا جائے تاکہ کسی بھی نوجوان کا دھیان غلط رخ کی طرف نہ جائے۔

دوسرا مثبت طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جنسی جذبہ کو ہیجان اور اشتعال دینے والی جتنی چیزیں ہیں ان کو سختی سے روک دیا گیا ہے۔ مثلاً شراب ہے' کون نہیں جانتا کہ یہ انسان کے جنسی داعیہ کو اکساتی ہے۔ بعض دوسری منشیات کا اثر بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اسلام ان کو حرام قرار دیتا ہے تاکہ انسان بے خود ہو کر آپے سے باہر نہ ہو جائے اس کی خودی کی گرفت اس کے پورے وجود پر رہے۔ اس کا شعور معطل نہ ہو اور جنسی ہیجان سے شکست نہ کھا جائے۔ بلکہ ہر طرح سے بیدار رہے۔ اسی طرح رقص اور موسیقی کا اسلامی معاشرے میں سدّباب کیا گیا ہے چونکہ یہ بھی جنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرتی ہیں...... اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک ان چیزوں کا سدّباب نہیں ہو گا جن کے متعلق اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے سے بیخ بُن کی طرح اکھڑ جائیں اُس وقت تک زنا کی روک تھام ممکن نہیں ہو گی۔

اس سے آگے بڑھیے کہ اسلام اپنے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو پسند نہیں کرتا بلکہ مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار متعیّن کرتا ہے۔ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى (آیت ۳۳) "اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور سابقہ دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو"۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ضرورت کے تحت بھی عورت گھر سے نہیں نکل سکتی۔ ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت اور اس کے لئے بھی اسی سورۂ مبارکہ میں حکم موجود ہے يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ

آیت ۵۹) "اپنے پورے وجود کو ایک چادر میں لپیٹ کر چہرے پر ایک پلو اس طرح لٹکا لیا
یں تاکہ راستہ آسانی سے دیکھ سکیں اور حجاب کا تقاضا بھی پورا ہو سکے۔ یہاں میں نے
ضرورت کے تحت" کی جس قید کا ذکر کیا ہے وہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی
ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا قَدْ اَذِنَ اللّٰہُ لَکُنَّ اَنْ
تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِکُنَّ "اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے تم اپنی ضروریات کے
لئے گھر سے نکل سکتی ہو"۔ اسی آیت مبارکہ میں بناؤ سنگار اور سج دھج کے ساتھ گھر سے نکلنے کی
ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس فعل کو جاہلیت کا فعل قرار دیا گیا ہے۔
پھر اسی سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۵۳ میں اہلِ ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ اگر تمہیں نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو وَاِذَا
سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ان آیات کے اس حصے میں دو باتیں
خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہیں' ایک یہ کہ اس میں لفظ حجاب آیا ہے جس کے معنی ہر پڑھا لکھا
شخص جانتا ہے کہ "پردہ" کے ہیں دوسری یہ کہ یہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا جا رہا ہے جن کے لئے
ازواجِ مطہرات بمنزلہ روحانی ماں ہیں جو امّہات المؤمنین ہیں کہ ان سے بھی اگر کوئی چیز مانگنی ہو
تو پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ یہ اسلوب اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ اسلام
معاشرتی نظام میں مردوں اور عورتوں کے مابین کیسی کیسی احتیاطیں ملحوظ رکھ رہا ہے۔ لہٰذا
اسلام مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو روکتا ہے۔
اب آگے بڑھیئے لباس کے سلسلے میں ہماری تہذیب و تمدن کی جو روایات بنی ہیں وہ یوں ہی
نہیں بنیں۔ اسلام نے ستر کا تصور دیا ہے اور اس کے لئے مستقل احکام دیئے ہیں یعنی جسم
کے وہ حصے جو ڈھکے رہنے چاہئیں مرد کا بھی ایک ستر ہے اور یہ انسان کی جبلت و فطرت ہے۔
وحشی سے وحشی قبائل کو بھی آپ جا کر دیکھیں تو چاہے ان کا پورا جسم ننگ دھڑنگ ہو لیکن وہ
پتوں سے اپنے جسم کے کچھ حصوں کو چھپاتے ہیں تو یہ تقاضۂ فطرت ہے۔ اسلام کی رو سے مرد
کے جسم میں ناف سے لے کر گھٹنے کے نچلے حصہ تک کا حصہ مرد کا ستر ہے۔ اس پر کسی کی نگاہ
نہیں پڑنی چاہئے۔ یہ ہر حال میں ڈھکا رہنا چاہئے۔ کسی بیٹے کے سامنے باپ کے جسم کا یہ حصہ
نہیں کھلے گا۔ اسی طرح کسی بھائی کے سامنے اس کے بھائی کا یہ حصہ نہیں کھلے گا' یہ ستر
ہے۔ اب عورت کے بارے میں دیکھئے۔ عورت کے بارے میں فرمایا گیا کہ "اس کا پورا جسم
ستر ہے"۔ اسی لئے ہمارے یہاں عورتوں کے لئے لفظ استعمال ہوتا ہے مستورات۔ مستور ستر

سے بنا ہے اس کے معنی ہیں چھپی ہوئی شے۔ اس سے مستثنیٰ ہیں عورت کے جسم کے صرف تین حصے' چہرے کی ٹکیہ' ہاتھ اور ٹخنے سے نیچے پاؤں۔ یہ تین حصے ستر نہیں ہیں۔ باقی پورا جسم ستر ہے۔ سر بلکہ بال بھی ستر میں داخل ہیں' اسی لئے میں نے "چہرے کی ٹکیہ" کہا ہے۔ اب سمجھئے کہ ستر کے کیا معنی ہیں! یہ کہ عورت کے جسم کے ان تین حصوں کے سوا کسی اور حصے پر اس کے بھائی کی نگاہ بھی نہیں پڑنی چاہئے۔ یہ حصے تو ہر حال میں مستور رہیں گے۔ ستر سے آگے کا معاملہ شوہر اور بیوی کے لئے ہے۔ البتہ مرد و عورت میں سے کسی کا کسی اشد اور ناگزیر صورت حال میں ستر کا کوئی حصہ طبیب' ڈاکٹر جراح کے لئے کھل سکتا ہے۔ باقی باپ' بیٹا' بھائی' بہن ان سب کے لئے ستر ہے۔

اسی ستر کے ضمن میں عورت کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا کہ ایسا لباس جس سے بدن چھلکتا ہو یا اس کی رعنائیاں نمایاں ہوتی ہوں ستر نہیں ہے بلکہ ایسا لباس پہننے والی عورتوں کو حضورؐ نے " کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ " قرار دیا ہے یعنی لباس پہننے کے باوجود یہ عورتیں عریاں ہیں۔ صحیح بخاری میں اُمّ المؤمنین حضرت سلمہؓ سے ایک طویل روایت کے آخری الفاظ ہیں: رُبَّ کَاسِیَۃٍ فِی الدُّنیا عَارِیَۃٌ فِی الْاٰخِرَۃِ "دنیا میں اکثر کپڑے پہننے والیاں آخرت میں عریاں ہوں گی"۔ اس حدیث کے اس حصہ کی رُو سے ایسے باریک اور ایسے چست کپڑے پہننے مراد ہیں جن سے جسم چھلکے یا عورت کی رعنائی کی چیزیں نمایاں ہوں۔ ایسی عورتوں کو کپڑے پہننے کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی قرار دیا ہے۔

ایک مزید چیز جو ہماری تہذیب کا جزو ہے' وہ ہماری معاشرت میں قرآن مجید کے حکم کے مطابق داخل ہوئی ہے۔ چونکہ ہماری معاشرت' ہماری تہذیب' ہمارے تمدن کی اساسات کتاب اللہ میں موجود ہیں۔ اس کا تفصیلی ڈھانچہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔ پھر وہ ہماری معاشرتی زندگی میں پیوست ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دوپٹہ کا تصور اور استعمال ہے وہ کہاں سے آیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا حکم ہے۔ سورۂ نور میں فرمایا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ "اور عورتیں اپنے سینے پر اپنی چادروں کے آنچل ڈال لیا کریں یا بکل مار لیا کریں چاہے کسی خاتون نے کرتا پہنا ہوا ہو اور وہ موٹا بھی ہے ڈھیلا بھی ہے۔ ستر تو ہو گیا' جسم تو ڈھک گیا۔ لیکن ابھی مزید کی ضرورت ہے اور وہ دوپٹہ ہے' اوڑھنی ہے جسے اوڑھ کر عورت کا سر' سینہ' کمر سب اچھی طرح ڈھک جائیں۔ اگرچہ اس دور میں مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ہمارا تمدن اس اعتبار سے ایک ملغوبہ بن رہا ہے کہ کچھ اسلامی اقدار بھی ہیں اور کچھ مغربی اقدار بھی آ گئی ہیں اس میں اس وقت ہمارے یہاں کچھ ہندووانہ رسوم و رواج بھی شامل ہیں تو ان سب کے امتزاج سے ہمارے معاشرے میں فی الوقت

ایک عجیب کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہماری نوجوان لڑکیاں جس قسم کا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں وہ اس حکم کے منشاء کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ بات سمجھ لیجئے کہ گھر میں بھی یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ نوجوان لڑکی کا سینہ بغیر دوپٹے کے ہو۔ کون نہیں جانتا کہ عورت کے جسم میں سب سے زیادہ جاذب نظر اس کا سینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حکم دیا جارہا ہے کہ وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ پھر اسی سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۰ میں تمام اہلِ ایمان مردوں اور آیت نمبر ۳۱ کی ابتداء میں تمام مسلمان خواتین کو غضِّ بصر کا حکم دیا جارہا ہے۔ مردوں کے لئے فرمایا قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ "(اے نبیؐ) مومن مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ عورتوں کے لئے فرمایا وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ "اور (اے نبی) مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں"۔ ان آیات میں غضِّ بصر سے مراد نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت ہے یعنی مرد بیوی کے علاوہ کسی محرم خاتون کو اور عورت شوہر کے علاوہ کسی محرم مرد کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھے۔ جب محرموں کے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت کی جارہی ہے تو غیر محرموں کے لئے خود بخود اس پابندی کا وزن بہت بڑھ جائے گا۔ اس قسم کی دیدہ بازی کو حدیث شریف میں آنکھ کے زنا سے تعبیر فرمایا ہے۔ ایک طویل روایت میں ہے اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ وَزِنَاهُمَا النَّظْرُ "آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نظر ہے"۔ ایک اور مشہور حدیث ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرخیل اتقیاء حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا جس کا مفہوم ہے کہ "اے علی، کسی نامحرم پر اچانک اور بلا ارادہ پہلی نگاہ پڑنی معاف ہے لیکن ارادتاً دوسری نگاہ ڈالنا قابلِ مواخذہ ہے" (او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن مجید ہمیں کیا احکام دے رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کیا ہیں۔ ان سب کے جو اثرات ہمارے تمدن پر مترتب ہوئے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ مسلمان عورت کا ساتر لباس کیسے وجود میں آیا! مسلمانوں کے گھروں کی تعمیر کا کیا مزاج بنا۔ ! آج کل کے کوٹھی نما طرزِ تعمیر کے وجود کو پچاس سال ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ورنہ مسلمان چاہے امیر ہوتا تھا چاہے غریب۔ گھر خواہ بڑا ہوتا تھا خواہ چھوٹا۔ اس میں زنانہ اور مردانہ حصے علیٰحدہ علیٰحدہ ہوتے تھے۔ پہلے مردانہ حصہ آئے گا پھر ڈیوڑھی ہو گی اور اس ڈیوڑھی سے آگے زنانہ حصہ ہو گا اور زنانہ حصے کے صحن کے چاروں طرف تعمیر ہوتی تھی اس فنِ تعمیر کا نام تھا ۔ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے زیرِ اثر اپنے تمدن میں اس طرزِ تعمیر کو ترقی اور نشو و نما

(   ) دی ہے۔ الغرض اسلام نے محرکاتِ زنا کے سدِّباب کے لئے جو اقدامات کئے ہیں ان میں سے چند کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کا مقصود کیا ہے! وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَ سَآءَ سَبِیْلًا ○

اب غور کیجئے کہ اس دور میں ایک طرف تو فرائڈ کا نظریہ ہے اور نفسیات کا کون سا طالب علم ہے جو نہیں جانتا کہ اس نے جنس کو کس قدر مؤثر عامل مانا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام تفصیلی ڈھانچہ میں اس کے فلسفہ کی رُو سے جنسی جذبہ کہیں نہ کہیں کارفرما ہے اور کم و بیش اس کے اثرات موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کے فلسفہ کے مطابق اگر ایک باپ اپنی چھوٹی بچی کو پیار کرتا ہے اور ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر اس کو چومتی ہے تو وہ اس کا محرک بھی جنس قرار دیتا ہے۔ اور دوسری طرف ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ اسلام میں حجاب و ستر کی یہ پابندیاں اور قدغنیں شاید ثقافت، تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے پس ماندہ لوگوں کے لئے ہوں گی۔ یہ ہمارا ایک علمی و فکری تضاد ہے۔ جو کچھ فرائڈ نے کہا ہے اگر اس کا دسواں حصہ بھی صحیح ہے چونکہ فرائڈ نے اپنا نظریہ اپنے تجربات و مشاہدات پر رکھا ہے اور یہ گمراہی ہے اور اس میں نہایت مبالغہ ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر اس کا دسواں حصہ بھی صحیح ہے تو جو نظام اسلام نے دیا ہے اس کے بغیر اس کی برائیوں کی روک تھام ممکن نہیں ہے۔

اب میں آخری بات عرض کروں گا کہ یہ مثبت اقدامات کرنے کے بعد اب اسلام منفی قدم اٹھاتا ہے اور وہ ہے تعزیر۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کے باوجود اگر کوئی شخص گندگی میں منہ مارتا ہے، بدکاری میں ملوث ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے، اس کے اندر گندگی گھر کر چکی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے لئے سزا بہت سخت ہے۔ یہاں ایک فرق کیجئے انگریزی میں جسے   کہتے ہیں، یعنی غیر شادی شدہ کسی مرد یا عورت کا اس قبیح فعل میں ملوث ہو جانا۔ اس کی اسلام نے سزا سو کوڑے رکھی ہے۔ لیکن انسان کی عقل و منطق تقاضا کرتی ہے کہ جو شادی شدہ ہونے کے باوجود اس فعل کا ارتکاب کرے تو اسے بہت سخت سزا ملنی چاہئے۔ غیر شادی شدہ کے لئے عقل و منطق کی رو سے کسی قدر رعایت کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے اس لئے کہ اپنی جبلّت یا فطرت کے منہ زور تقاضے کو پورا کرنے کا کوئی جائز راستہ موجود نہیں ہے لہٰذا ایسا فرد غلط رخ پر پڑ گیا تو کچھ نرمی کا مستحق ہے لہٰذا ایسے افراد کے لئے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ لیکن شادی شدہ مرد و عورت کے لئے رجم کی سزا ہے۔ جن کو دینی اصطلاح میں "حد" کہا جاتا ہے یعنی ایسے افراد کو برسرعام سنگسار کر دیا جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت سخت سزا ہے لیکن اس سزا کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ سب سے نمایاں حکمت تو یہ ہے کہ اس سزا سے پورا معاشرہ عبرت پکڑے اور اس قبیح

ل کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ دوسری حکمت یہ نظر آتی ہے کہ شادی شدہ جوڑے میں
ہی محبت و اعتماد کا رشتہ مضبوط رہے' تیسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب و نسب میں
لل واقع نہ ہو۔ البتہ یہاں یہ بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے کہ زنا کی اتنی ہولناک سزا رکھنے
کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اس فعلِ قبیح کی شہادت دینے والے چار عینی گواہ
وجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو اس طور پر انجام دینا کہ چار چشم دید گواہ بھی موجود ہوں
ں فعل کی شناعت و قباحت میں کئی گنا اضافہ کا باعث ہوتا ہے یہ گویا معاشرے کے لئے
رطان کے پھوڑے کے ذیل میں آتا ہے۔ جس سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لئے لازمی
ہے کہ اس کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا جائے .... یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ
سلام کی تاریخ میں رجم کی سزا اقراری مجرموں کو دی گئی ہے۔ یعنی ان افراد کو جن کے ضمیر نے
نی ملامت کی کہ انہوں نے عذاب اخروی سے نجات پانے کے لئے اپنے اس گناہ کا اعتراف
ر کے اس دنیا کی سزا قبول کر لی تاکہ وہ اس سزا کے بعد یہیں پاک ہو جائیں اور آخرت کی
قوبت سے بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے جملہ محرکات سے محفوظ و مامون رکھے۔ ●

بقیہ: مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج

کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ بندہ بن کر زندگی بسر کریں۔
اب جبکہ مقصدِ زندگی واضح ہو گیا اور اصل مرض اور اس کے معالجہ کی نوعیت
معلوم ہو گئی تو طریقِ علاج کی تجویز میں زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی اور اس نظریے
کے ماتحت جو بھی علاج کا طریقہ اختیار کیا جائے گا انشاء اللہ نافع اور سُود مند ہو گا۔

●●●

ڈاکٹر ابصار احمد

اسلام اور سیکولرزم

ایک تحلیلی و تقابلی جائزہ

❀❀❀

پچھلے دنوں سردار عبدالقیوم اور جسٹس جاوید اقبال کے مناقشے کے ضمن میں علامہ اقبال کے حوالے سے جو بحث اخبارات و جرائد کا موضوع بنی رہی ہے، اس میں من جملہ دیگر متنازعہ فیہ امور کے ایک معاملہ سیکولرازم کے بارے میں جسٹس صاحب کی تعبیر کا بھی تھا۔ محترم جسٹس صاحب نے آئیڈیل سیکولرازم کی اصطلاح کے حوالے سے سیکولرازم کو مشرف باسلام اور 'مشرف باقبال' کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ہمارے نزدیک مغالطہ آمیز ہے۔ نہ تو اسلام اور سیکولرزم میں کوئی جوڑ اور توافق ممکن ہے اور نہ فکرِ اقبال کے ساتھ سیکولرزم کی نسبت درست! قارئین کو یاد ہوگا کہ قریباً ۱۲ سال قبل بھی دانشوروں کے ایک مخصوص حلقے کی جانب سے اخباری کالموں کے ذریعے سیکولرزم کو اسلام سے ہم آہنگ ثابت کرنے کی ایک بھرپور کوشش ہوئی تھی۔ اس موقع پر اس حلقے کے ترجمان پروفیسر وارث میر مرحوم تھے۔ انہوں نے بھی اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے نظریات کو اپنا مستدل اور مدار بنایا تھا۔ انہی دنوں محترم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب نے اپنے ایک فکر انگیز مقالے میں، جو ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے زیر اہتمام ایک تقریب 'بیادِ خلیفہ عبدالحکیم' میں پڑھا گیا تھا، سیکولرزم کی اصطلاح کا ہمہ جہت تجزیہ کرتے ہوئے فکرِ اقبال اور فکرِ خلیفہ عبدالحکیم کی روشنی میں ٹھوس علمی انداز میں ان مغالطہ آمیز خیالات کی بھرپور تردید کی تھی جن کے پرچارک اس وقت پروفیسر صاحب مرحوم تھے اور اب انہی کی صدائے بازگشت جسٹس جاوید اقبال صاحب کے بیانات کی صورت

میں سنائی دے رہی ہے۔ یہ مقالہ عرصہ قبل مارچ ۸۷ء کے "حکمتِ قرآن" میں شائع ہو چکا ہے، افادۂ عام کے لئے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

اہلِ علم کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے کہ مختلف تہذیبی، علمی اور ثقافتی الفاظ و تصورات ایک خاص روایت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا ایک مخصوص زبان سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور بالعموم ان کا مفہوم کسی دوسری زبان کے ایک لفظ میں کاملتاً منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ بالفاظِ دیگر اصطلاحات کے معانی و مفاہیم مختلف مباحث کے پس منظر (Context) میں یکساں نہیں رہتے۔ اور یہ حقیقت مختلف تہذیبوں اور نظامہائے افکار کے تقابلی مطالعے میں بدرجۂ اتم واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

میں اس مقالے میں قدرے تفصیل سے اس امر کا جائزہ لوں گا کہ "ریلیجن" یعنی مذہب اور "سیکولرازم" کے الفاظ اور ان کے جملہ مفاہیم کی کیفیت اسلام کے بنیادی اصول فکر کے حوالے سے کیا رہتی ہے اور اس ضمن میں یہ بھی وضاحت کرنے کی کوشش کروں گا کہ آج کل بعض اصحاب علم اور دانش ورکن مغالطوں کا شکار ہو کر اسلام اور سیکولرازم کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور بالکل غلط طور پر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے افکار اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں۔[1]

"ریلیجن" اور "سیکولرازم" کی مغربی فکر میں دوئی اور کسی حد تک نظری و فکری مخاصمت میرے خیال میں ناقابلِ تردید حد تک واضح ہے۔ "سیکولرازم" کی جو تعریف انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس مطبوعہ ۱۹۰۵ء (ایڈیٹر، جیمز ہیسٹنگز) میں دی گئی ہے اس کے مطابق انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں یورپ میں پیدا ہونے والی اس فکری تحریک کے پس پردہ مخصوص سیاسی اور فلسفیانہ محرکات تھے۔ اس کا نقطۂ نظر مذہب کے بارے میں اکثر و بیشتر منفی رہا ہے۔ انسانی زندگی اور ضابطۂ حیات کے بارے میں یہ ایک مکمل نظریہ ہے جس میں مذہبی

---

[1] مثلاً پروفیسر وارث میر اپنے حالیہ سلسلۂ مضامین "نوید فکر" میں سیکولرازم اور جدیدیت کی حمایت کرتے ہوئے خلیفہ عبدالحکیم کو اپنا مؤید اور ہم خیال تصور کرتے ہیں۔

ر مابعد الطبیعاتی معتقدات کی بجائے اصل زور مادی وسائل اور انسانی سوچ پر ہے۔ اگرچہ
لستان میں اس نقطۂ نظر اور "سیکولرازم" کی اصطلاح کو رواج دینے والے سیاسی اور سماجی
رکن جارج جیکب ہولی اوک (۱۸۱۷ — ۱۹۰۶) کی کوشش تھی کہ اس فکر کو صرف سماجی خوشحالی،
ی ترقی اور سیاسی آزادی کے حصول کے لئے استعمال کیا جائے اور عیسائیت دشمنی کو اس
لازمی عنصر نہ خیال کیا جائے۔ لیکن اس کے بعض اہم رفقاء بالخصوص چارلس بریڈلا، چارلس
س اور جی ڈبلیو فٹ مذہبی عقائد کی تردید پر مُصر تھے۔ اور مادی ترقی اور دنیادی خوشحالی
کے لئے ابطالِ مذہب اور الحاد کو ضروری تصور کرتے تھے۔ اس تحریک سے وابستہ افراد کا
یادی فکر یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کا تعلق دو علیحدہ اور مختلف دنیاؤں سے ہے۔
ائنس ہمیں اس مادی دنیا کا علم دیتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز یا ہر وہ علم جس کا تعلق اس آب و گِل
ی دنیا سے ہے، سیکولر ہے اور انسان کو چاہئیے کہ وہ مختلف علوم، انسانی مشاہدات و
تجربات اور عقل و خرد کی بنیاد پر زندگی کا لائحۂ عمل طے کرے اور سیاسی و معاشرتی نظام وضع
کرے۔ سماجی و معاشرتی قوانین کا پہلو پہلے بھی عیسائیت میں نہ ہونے کے برابر تھا۔ کیونکہ
یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رفعِ عیسیٰؑ کے بعد جلد ہی پال نے قوانین کو تعلیماتِ عیسیٰؑ سے
بالکلیہ خارج اور ساقط کر دیا تھا اور مذہب کو صرف چند ناقابلِ فہم عقائد (Dogmas)
تک محدود کر کے عملی زندگی، اخلاق اور قانون سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رکھا تھا۔ چنانچہ اگر
دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو تاریخی طور پر مذہبی یا "ریلیجیس" اور دنیادی یا "سیکولر" کی
تقسیم دنیائے عیسائیت میں پہلے ہی موجود تھی۔ گذشتہ صدی کی سیکولرسٹ تحریک نے
اسے زیادہ علمی اور سائنٹیفک انداز میں زوردار طریقے سے پیش کیا۔ اس میں جہاں ایک طرف
سیاسی جبر و استبداد اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز اٹھائی گئی، وہاں دوسری جانب مذہب
اور مذہبی اندازِ فکر کی بجائے انسانی فکر اور سائنسی منہاج کو دنیادی معاملات و مسائل کے
حل و کشود، ترقی اور سماجی بہتری کے حصول کی کلید قرار دیا گیا۔ اگرچہ سیکولر تحریک سے منسلک
اکثر مفکرین نے وجودِ باری تعالےٰ، آخرت اور دوسرے مذہبی عقائد کی علمی طور پر تردید نہیں
کی، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ انہوں نے ان معتقدات کو مثبت طور پر لائقِ اعتنا اور غور و فکر

کے قابل بھی نہ جانا۔ اور یہ عدم توجہی کا رویہ بھی بڑی حد تک مذہب کی نفی پر منتج ہوا۔
ایک اہم یورپی مفکر C.A. Van Peursen نے سیکولرازم کے نقطۂ نظر پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے اس کے تین اہم عناصر یا نکات کی نشاندھی کی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں :۔

1. Disenchantment of Nature
2. Desacralization of Politics
3. Deconsecration of values

پہلے عنصر کے مطابق کائنات کسی مافوق الفطرت ہستی کی پیدا کردہ نہیں اور نہ ہی اسے کسی اُلوہی ہستی سے وابستہ سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسرے نکتے میں سماجی اور سیاسی مسائل اور قوانین کی مذہبی تقدس سے علیحدگی اور تیسرے نکتے میں اقدار اور بالخصوص اخلاقی اقدار کا بالکلیہ انسانی پسند و ناپسند پر انحصار اور خیر و شر کے مذہبی عقائد سے لاتعلق ہونا بیان کیا گیا ہے۔
گزشتہ صدی میں انگریز مفکر چارلس بریڈلا اور اس کے ساتھیوں کی الحاد پسندی اور اس صدی کے فلسفی ادیب وان پیورسین کی مندرجہ بالا تصریحات کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ پروفیسر وارث میر صاحب کے اس خیال میں کہ " یہ امر واقعی ہے کہ مغرب میں اس اصطلاح سے مذہب دشمنی یا لادینیت کبھی بھی مراد نہیں لیا گیا "۱ کیا صداقت رہ جاتی ہے۔ اسلام، اس کے بنیادی معتقدات اور اساسی فکر کا شعور رکھنے والے ہر شخص کے لئے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ " ریلیجن " اور " سیکولرازم " کے الفاظ اور ان کے مخصوص معانی جو یورپی فکر اور زبانوں سے مختص ہیں، اسلام، عربی اور اسلامی علمی ذخیرے میں قطعاً نہیں پائے جاتے۔ یہ صرف مغربی تعلیم کا اثر اور مغربی تصورات کی سحر کاری ہے کہ ہمارے ملک کے بعض دانشور اور صحافی حضرات بھی اسلام کی وحدت میں مذہب اور سیکولر رویئے کی دوئی کے قائل نظر آتے ہیں۔ یہ حضرات شعوری یا غیر شعوری طور

---

۱ مضمون : نوید فکر، ایک اہم سیاسی اصطلاح کا گمراہ کن مفہوم، قسط نمبر ۱، روزنامہ "جنگ" لاہور

مذہب کا صرف ایک انتہائی محدود اور انفرادی زندگی یا رسمی عبادات (Prayers
and rituals) سے متعلق دنیا سے علیحدہ عیسائیت کا سا تصور رکھتے ہیں جس میں
مائد غیر متحقق، ناقابلِ فہم اور توہمانہ ہوتے ہیں۔ اور کتنا صحیح کہا ہے فرانسس بیکن نے کہ "توہم پرستی
پرستی سے بدتر ہے۔ خدا کی نسبت بے اعتقادی ایسے اعتقاد کی نسبت بہتر ہے جو خدا
ذلیل کرے اور اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ پہلی حالت تو محض بے اعتقادی ہے اور
سری خدا کی تذلیل و تحقیر۔ توہم پرستی بے اعتقادی کی نسبت زود تر بداخلاقیاں پیدا کرتی
ہے۔ توہم پرستی مملکت کے لئے بھی خطرناک ہے۔ کیونکہ اس سے ایسی قوتیں پیدا ہوسکتی ہیں
ملکت کی قوت سے بڑھ کر ہوں۔ اس حالت میں عقلمند مجبور ہوتے ہیں کہ احمقوں کی
ری کریں۔"

سیکولرازم کے محولہ بالا تین مرکزی نکات کا اسلام سے تصادم و تخالف ملاحظہ فرمائیے:
از روئے قرآن زندگی کے حوادث اور کائنات کے مظاہر انسان کو کسی حقیقتِ اَزلی
بر دیتے ہیں۔ یہ آیات یا نشانیاں ہیں ان حقائق کی جو نظر سے اوجھل ہیں لیکن بصیرت پر
نف ہو سکتے ہیں۔ آیاتِ قرآنی کی طرح قرآن نے مظاہرِ فطرت کو بھی آیات کہا ہے۔
کہ یہ تمام نشانیاں ہیں جو ایک حکیم و رحیم خالق کی طرف راہنمائی کرتی ہیں۔ اور اس کا تقاضا
ں ہیں کہ انسان میں وہ نظر پیدا ہو جائے جو منظورِ حقیقی کو براہِ راست دیکھ سکے۔ اہلِ ایمان
صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (يَتَفَكَّرُوْنَ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ آل عمران: آیت ۱۹۱)۔ اس اعتبار سے ایک سائنسدان وہی
رتا ہے جو ایک فطرتِ سلیم رکھنے والا شخص کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں فرق یہ ہے کہ سائنسدان
کا صرف تحقیق و علم اور عملی ایجادات کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا مل عبرت، عرفان
نت اور اثباتِ توحید کے لئے۔ گویا سیکولرازم کے نقطۂ نظر کے برخلاف قرآن میں کائنات
کائناتی واقعات کو ایمانی دعوت کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ ایک سلیم الفطرت

• فرانسس بیکن پیدائش ۱۵۶۱ء وفات ۱۶۲۶ء بحوالہ تاریخ فلسفۂ جدید، جلد اوّل ...

اور صاحب بصیرت انسان کو ساری کائنات صفات خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔
اسلام نے شرک اور اوہام کو ختم کر کے توحید کو غالب کیا اور اس طرح اس ذہن کو فروغ دیا جس نے عالم فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ مسلمانوں کی سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں عقیدہ توحید کی اہمیت کو بریفالٹ اور آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹)[۳] نے بھی واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔

اب آئیے دوسرے اور تیسرے نکتے کی جانب۔ اسلام کے لئے اصلاً قرآنی اصطلاح "دین" مستعمل ہے۔ جس کا مفہوم بہت وسیع اور ہمہ گیر بھی ہے اور نہایت گہرا اور وسیع الذیل بھی۔ تصور خدا اور دیگر ایمانیات سے لے کر انسانی زندگی انفرادیت اور اجتماعیت کے تمام پہلو اس کے اجزا ہیں۔ اخلاقی اقدار کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرت اور ریاست کے اصول بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام دنیائے عیسائیت کے تصور مذہب کے مطابق چند فرسودہ عقائد (Dogmas) اور بے روح رسمی عبادتوں (Rituals) کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب خود بہت سے مغربی مفکرین اور مستشرقین "دین" کے لئے 'A Complete code or way of life, کی مفصل تشریحی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا فکر اس مسئلے پر بالکل واضح اور راسخ العقیدہ جمہور مسلمانوں کے فہم اسلام کی پرزور پیرائے میں تائید کرتا ہے۔ چنانچہ آپ کی اہم تصنیف "اسلامک آئیڈیالوجی" کے ابتدائیے میں درج ذیل سطور لائق توجہ ہیں:

1. Islam was not satisfied with preaching only broad principles, it was considered essential to create a system and a discipline which should embody those principles in individual and social life. It is a complete code of life based on a definite out look on life.

2. The Muslims believe that the essentials of Islam are eternal and so is the system called Shariat. The belief of the auther is that the essential framework of the Shariat too, which can be studied from the teachings of the Quran and the authentic sayings and practices of the

prophet, rests on eternal verities. It is a creed that can never become outworn

اسی طرح علامہ اقبال علیہ الرحمہ پر اپنی ضخیم اور انتہائی وقیع کتاب "فکرِ اقبال" کے صفحہ ۶۸۲ رقم طراز ہیں :

" اسلام دین اور دنیاوی زندگی کی تقسیم و تفریق کا قائل نہیں۔ اس کی وحدت زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ دنیا کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے برتنا ہی دین ہے۔ "

خلیفہ صاحب کے انتقال کے بعد مرحوم جسٹس ایس اے رحمان کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہونے والی کتاب The prophet and His Message کے باب بعنوان "اسلام اور ڈیموکریسی" میں ایک آئیڈیل اسلامی ریاست اور ہیئت اجتماعیہ کے اہم خد و خال فاضل مصنّف نے چودہ نکات میں پیش کئے ہیں۔ جن میں سے مندرجہ ذیل تین موضوع بحث کے اعتبار سے انتہائی اہم ہیں اور جو خلیفہ صاحب کی اصابتِ رائے پر دال ہیں۔

1. Sovereignty belongs to God alone whose chief attributes are wisdom, justice and love. He desires human beings to assimilate there attributes in their thoughts, words and deeds.

2. An Islamic state is not theocratic but ideological. The rights and duties of its citizens shall be determined by the extent to which they identify themselves with this ideology.

3. There shall be no special class of priests in an Islamic society though persons leading better religious life and possessing better knowledge of religious affairs have a ligitimate claim to honour.They shall enjoy no special privileges legal or economic.

اختتامی پیراگراف میں لکھتے ہیں :

These are the fundamentals of an Islamic constitution that are unalterable. No ruler or no majority possesses any right to tamper with them or alter them. This is eternal Islam rooted in the God-Centred humanity.

ہمارے ہاں کے بعض دانشور جو بزعم خویش روشن خیال، بالغ نظر، بیدار مغز اور ترقی پسند

بننا یا کہلوانا چاہتے ہیں قرآن اور نبی اکرمؐ کی تعلیمات میں جمود اور ناگوار قطعیت کے شاکی نظر آتے ہیں۔ لیکن سطور بالا میں خلیفہ عبدالحکیم اسلام کے اساسی احکام کو غیر متبدل (Unalterable) قرار دے رہے ہیں۔ اور جمہور کو بھی ان میں کسی تبدیلی کا مجاز قرار نہیں دیتے۔ اسی طرح یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ قانون، ریاست اور حکومت کے معاملات میں دین کے عمل دخل کا لازمی نتیجہ تاریخی طور پر دنیائے عیسائیت کی تھیوکریسی ہے۔ حالانکہ یہ بات علمی طور پر قطعاً غلط اور لغو ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے اوپر دیئے گئے انگریزی اقتباسات سے بھی اس کی تائید و تصویب ہوتی ہے۔ اردو میں ان کی مزید تشریح خود اُن ہی کے الفاظ میں سُنیئے۔ تاکہ کسی کو میری ترجمانی پر اعتراض کی گنجائش نہ رہے۔ "فکرِ اقبال" کے صفحہ ۶۸۲ پر رقمطراز ہیں:

"اسلام کے نزدیک مملکت وحدت آفرینی کی کوشش اور روحانیت کو عملی جامہ پہنانے کا ایک وسیلہ ہے۔ اسلام فقط انہی معنوں میں تھیوکریسی یا دینی مملکت ہے۔ سلام کو تھیوکریسی کے عیسوی اور مغربی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارے ہاں پاپائے معصوم و آمر اور کلیسا اور پروہتوں کا نظام نہیں جو مغربی انداز کی تھیوکریسی پیدا کرتا ہے۔"

The prophet and His Message کے باب بعنوان Law and Islam. کا درج ذیل اقتباس سلام اور سیکولرازم کے موضوع پر خلیفہ صاحب کا واضح ترین علمی موقف ہے جس کا مطلب بالکل صاف اور ہر ابہام اور شک و شبہ سے بالاتر ہے:

Islam without being a theocracy in the sense in which the West uses this word insisted on the common foundation of religion, morality and law. In Islamic society, law cannot be secular in the sense that it should renounce any connection with religion. For a Muslim religion is an all-comprehensive reality.

Personal morality, social relationship, private law, public law, inter-faith or international relations must be justified or referred back to the fundamentals of Islam.

سیکولرازم کے حامی انسانی زندگی اور معاشرت کے مسائل عقل، سائنس اور سائنٹفک منہاج کے ذریعے حل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر وارث میر صاحب محولہ بالا مضمون میں لکھتے ہیں:

"(سیکولرازم) سے مراد ایک ایسا سیاسی یا معاشرتی نظام لیا جاتا رہا ہے جس کی اساس مذہبی امتیازات اور عقائد کی بجائے سائنس اور عقل پر ہو (اور اسلام سائنس کے خلاف نہیں ہے)"

لاریب، اسلام سائنس اور عقل کے خلاف ہرگز نہیں ہے۔ لیکن کیا اسلام اس کی اجازت دے گا کہ اس کے پیش کردہ واضح دینی تصورات اور صریح احکامات میں بھی آپ اپنی عقل اور سائنس کا استعمال شروع کر دیں۔ اس صورت میں مذہب اور "سائنٹزم Scientism" میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اور کاش کہ پروفیسر صاحب سائنس اور سائنٹیفک منہاج کے بارے میں جدید مفکرین بالخصوص سوشل نقاد تھیوڈر روزاک، وولف، فرانسیسی ماہرین سائنس و اجتماعیات رینے ڈوبوا اور پاک ایلل کے خیالات پڑھ لیں تو ان پر تازہ ترین صورتِ حال کا انکشاف ہو۔ یہ بات گزشتہ صدی کی ہے جب سائنس اور سائنٹفک منہاج کے علمبرداروں کا خیال تھا کہ یہ طریق تحقیق ان کے ہر عقدے اور ہر مسئلے کے حل میں ممد ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس کی ترقی لامحدود ہے اور اس کے ذریعے انسان ایک آئیڈیل معاشرہ اور پُر سکون زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ لیکن موجودہ صدی کے وسط میں دنیا کے عظیم دانشوروں اور اہل سائنس نے اقرار کر لیا ہے کہ یہ سب خوش فہمی تھی۔ سائنس۔ ٹیکنالوجی۔ پروگریس۔ اقتصادی ترقی۔ ڈویلپمنٹ اور جدیدیت پر مشتمل جو لائحہ عمل مغربی فلاسفہ اور اہلِ دانش نے اپنے لئے تجویز کیا تھا، اب بہت سے اہلِ عقل و بصیرت کو دعوتِ فکر دے رہا ہے اور ان کی سوچ میں ایک بنیادی تبدیلی کا متقاضی ہے۔ چنانچہ اب متعدد مفکرین اس امر کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں کہ طبیعی علوم اور سائنٹفک منہاج کو دوبارہ مابعد الطبیعات سے مربوط کیا جائے۔ پچھلی صدی کے سائنسی علمیاتی نظریات میں اقدار، مذہبی جذبات اور مابعد الطبیعاتی افکار کو بالکل فرسودہ اور غیر متعلق تصور کیا گیا تھا لیکن منہاجیات کے موضوع پر گزشتہ دس پندرہ سالوں کے دوران جو اہم مقالات شائع ہوئے ہیں ان میں گزشتہ صدی سے رائج وحدانی اور لاقدری [Value-free or positivistic] قسم کا منہاج شدید تنقید کا نشانہ بنا ہے۔ ان جدید مفکرین کا خیال ہے کہ علم کے منہاج کو وسیع النظری کے ساتھ کسی سوسائٹی کے تہذیبی اور دینی خیالات کو استعمال کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ ان مفکرین میں ریتا فریز، ...

اوپن ہائمر، شوڈنگر اور فرتھ جوف کاپرا کے نام سرِفہرست ہیں۔ اب یہ بڑے پیمانے پر تسلیم کیا جارہا ہے کہ مغربی سائنس، اس کی مادہ پرستانہ تہذیب اور اس کے ملحدانہ علمی منہاج نے انسانیت کے قافلے کو ذہنی امن و سکون اور صحت مند ترقی کی بجائے الٹا نقصان پہنچایا ہے اور تباہی کی طرف دھکیلا ہے۔ یورپ کے بعد اب امریکہ کے بعض دانشور بھی 'جدیدیت' اور 'سائنٹفک ترقی' جیسے تصورات کی محدودیت اور نقائص کے قائل ہوتے جارہے ہیں۔

اور عقلِ انسانی کا معاملہ جس پر سیکولرائزیشن کے حامی تکیہ کرتے ہیں، کیا مختلف ہے؟ بقول علامہ اقبالؒ ؎

'عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے'

کیا فرائڈ نے اس حقیقت کو مبرھن نہیں کر دیا کہ عقل طبیعی یا عقل جُزئی حیوانی سطح اسفل اکثر پست جذبات، مرغوباتِ نفس اور تعصبات کی غلامی کرتی ہے۔ یہ مادیات اور طبیعات میں محصور خردِ انسان کو تشکیک اور تذبذب کی بھول بھلیوں سے نہیں نکال سکتی۔ انسانی عقل کو جو اپنے محدود مشاہدات اور تجربات سے اصولِ حیات اور نظریۂ حقیقت کا استقرار کرنا چاہتی ہے، نہ آدم کی روح ملکوتی اور اس کے لامحدود امکانات کا ارتقا سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ نبی کی نبوت۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور تزکیہ نفس ہی سے عقل میں وہ رُوحانی تنویر پیدا ہوتی ہے جو اسے شہوات کی غلامی اور حیلہ گری سے نجات دلاتی ہے۔ مغرب کی تعلّی آمیز اور مائل بہ الحاد عقلیت ہی سے بیزار ہو کر شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے انسانی عقلِ محدود کو الحاد آفریں، بہانہ جو اور فسوں گر کہا ہے۔ اور اس کی کوتاہ نظری اور حقیقت نارسی کا بیان مختلف پیراؤں میں کیا خوب کیا ہے:

؎ خرد واقف نہیں ہے نیک و بد سے
بڑھی جاتی ہے ظالم اپنی حد سے

؎ علاج آتشِ رُومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

؎ ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے نم ناک نہیں ہے

اور ؎

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری!

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم جو خود علامہ اقبالؒ کی طرح قدیم اور جدید تفلسف میں تربیت یافتہ تھے اور عذاب دانشِ حاضر، سے پوری طرح باخبر اور سوختۂ نارِ افرنگ تھے، اپنی تصانیف میں بتکرار اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ یورپ اور مغربی سائنس کے پاس محدود عقل و خرد کے سوا کوئی ذریعۂ علم نہیں ہے۔ اور خرد کے نظریات ہر دم متغیر اور باہم متصادم رہتے ہیں۔ چنانچہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ خود انہیں علمی و فکری اماں ملی تو عارف رومیؒ کے ' اختلاطِ ذکر و فکر ' میں۔

پروفیسر وارث میر صاحب نے سیکولرازم کا فلسفہ اور استدلال پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر حسین نصر کے افکار پر بھی گرفت کی ہے۔ اس بحث کو کسی دوسری نشست کے لئے مؤخر کرتے ہوئے آخر میں اُن کے ایک خیال کی تصحیح ضروری سمجھتا ہوں۔ پروفیسر صاحب لکھتے ہیں

" مسلمانوں نے دنیاوی ترقی کی خواہش کو مغربیت کا متبادل تصور کر لیا۔ لفظ دنیا سے نفرت ہی لفظ سیکولرازم سے نفرت کی بنیاد بنا۔ "

حقیقت یہ ہے کہ معاملہ صرف الفاظ کا نہیں ان کے مفاہیم اور پس پردہ نظریات کا ہے۔ سطور بالا میں میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیکولرازم کسی طور بھی اسلام کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اسلام دنیاوی اور سائنسی ترقی کے نہ کبھی ماضی میں آڑے آیا ہے اور نہ آج ہے۔ دنیاوی ترقی کا کوئی پہلو اس وقت غیر مطلوب ہے جب وہ مسلمان کو اپنی حقیقت اور باطنی شخصیت کی طرف سے غافل کر دے اور اسے اپنے خالقِ حقیقی سے بھی محجوب کر دے۔

جہاں تک حُریتِ فکر اور ارتقاءِ حیات و تمدنِ انسانی کے پیشِ نظر " خرد افروزی " ، فکرِ نو اور اجتہاد کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ قرآن و سنت نے اس باب میں ہماری سوچ اور ذہن کے عمل دخل اور کارفرمائی کے لئے بڑی کھلی گنجائش فراہم کی ہے۔ ایک طرف دین کے صریح اوامر ہیں جن میں فرض، واجب، سنتِ مؤکدہ اور سنتِ غیر مؤکدہ کی تخصیص

اور درجہ بندی ہے اور دوسری طرف صریح اور منصوص تحریمات ہیں جنہیں مکروہات تحریمی اور مکروہات تنزیہی شامل ہیں جو اگرچہ حرام مطلق نہیں۔ ان دو فصیلوں کے درمیان مباحات کا ایک وسیع دائرہ ہے جہاں مسلمان جمہور اپنے لیجسلیٹو یعنی قانون ساز اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ اجتہادی فکر نو پروفیسر ذاکر میر صاحب کی رائے کے برعکس "سیکولر" نہیں ہوتا کیونکہ صدق دل سے کلمۂ توحید اور اثبات رسالت کے بعد ایک مومن صادق کی سوچ اور نظر قولِ رسولؐ کے مطابق ایمانی اور نورانی ہو جاتی ہے۔ (اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّہٗ یَنْظُرُ بِنُوْرِ اللّٰہِ)۔

جو لوگ اسلام کی اساسات، اس کے تہذیبی ڈھانچے اور متفقہ و مسلّم قانونی پہلو میں ترقی پسندانہ روشن اور بگ ٹٹ جدیدیت کے علمبردار ہیں ان کے علم میں یہ بات رہنی چاہئیے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر دنیائے اسلام میں اسی قسم کا فکری انقلاب لانا چاہتے ہیں جو موجودہ صدی میں بعض "روایت شکن" دانشوروں اور ادیبوں کی تحریروں سے مغرب میں آیا جن میں روڈلف بلٹمان، لون ہوئے فر، پال ٹلک، بشپ آف دولچ جان رابنس، ایلٹائر کی اور دوسرے بہت سے مفکرین اور ادیب شامل ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ان جدید افکار کے زیرِ اثر عیسائیت میں سے ایک مابعد الطبیعاتی مذہبی روایت کی حیثیت سے بچی کھچی روح بھی نکل گئی اور وہ ایک کلچرل "کلٹ" کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ مسیحی دنیا میں اب "ڈیتھ آف گاڈ تھیالوجی" اور خدا کے وجود پر ایمان و یقین کے بغیر کرسچین یقین (Faith) کے موضوع پر کتابیں اور مقالات لکھے جا رہے ہیں۔ اور عملی اعتبارات سے ہر قسم کی اخلاقی و جنسی بے راہ روی کے لئے سندِ جواز فراہم کیا جا رہا ہے۔ ہمارے مسلمان دانشوروں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ عیسائیت کے برخلاف قرآن اور اسلام کی تعلیمات بالکل واضح، فطری اور عقلِ سلیم کے عین مطابق ہیں۔ ان میں متھس (Myths) کا شائبہ تک نہیں جن کے متھ شکنی (Demytholigizing) کے لئے کسی روڈلف بلٹمان کی ضرورت پڑے ::

نقطۂ نظر

ٹی وی اور وی سی آر کی شرعی حیثیت

کے بارے میں دار العلوم دیوبند کا موقف

اسلام زندگی کے ہر شعبۂ حیات میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ عقائد و عبادات کے ضمن میں اس کی تعلیمات حد درجہ اکمل و اتم ہیں جس میں کمی و بیشی کا کوئی امکان نہیں۔ جہاں تک معاشی و معاشرتی معاملات کا تعلق ہے، ان میں بنیادی رہنمائی کے ساتھ ساتھ چند ایسی اصولی ہدایات دے دی گئی ہیں جنہیں ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نئے حالات میں فہم و بصیرت سے کام لیتے ہوئے معاشرتی و معاشی ڈھانچہ کی تفصیلات طے کی جاسکتی ہیں۔

سائنسی ایجادات کے اس دور میں معاشرتی اقدار تیزی سے بدلتی جا رہی ہیں۔ نئی نئی اشیاء روز مرہ زندگی میں دخیل ہوتی جا رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر شے میں خیر و شر کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کا طریقۂ استعمال ہی اس کے خیر یا شر ہونے کی جہت متعین کرتا ہے۔ ٹی وی اور وی سی آر ابلاغِ عامہ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہیں اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اگر ان کو ابلاغِ دین کا ذریعہ بنایا جائے تو مفید اور دور رس نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ بات بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کے غلط استعمال نے معاشرہ میں کتنی بھیانک فضا قائم کر دی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ٹی وی یا وی سی آر کے استعمال کے بارے میں علماء میں ایک سے زائد رائیں موجود ہیں۔

'میثاق' کی اشاعت مئی ۱۹۸۶ء میں مولانا مدنی میاں کا ایک مضمون "ٹی وی اور ویڈیو کیسٹ کی شرعی حیثیت" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا جس میں موصوف نے ٹی وی اور ویڈیو کو بعض شرائط کے ساتھ دیکھنے اور ان کے استعمال کو مباح قرار دیا تھا۔ اس پر چٹاگانگ کے ایک دینی مدرسے "مجمع الطالبین" سے مولانا کبیر احمد صاحب کا خط ہمیں موصول ہوا جنہیں اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ بعدہٗ انہوں نے اس مسئلے سے متعلق دار العلوم

دیوبند کا ایک فتویٰ بھی ہمیں ارسال کیا جس میں مولانا مدنی میاں کی رائے کے بالکل برعکس رائے ظاہر کی گئی تھی۔ یہ فتویٰ چونکہ ایک نہایت مستند دینی دار العلوم سے جاری کیا گیا ہے لہٰذا موضوع اور دار العلوم کی اہمیت کے پیشِ نظر افادۂ عام کیلئے اسے بلا تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے۔ تاکہ یہ نقطۂ نظر بھی وضاحت سے قارئین کے سامنے آجائے۔

(ادارہ)

مولانا مدنی میاں جو ہندوستان کی مشہور خانقاہ کچھوچھا شریف سے تعلق رکھتے ہیں، انہوں نے ویڈیو کیسٹ اور ٹیلی ویژن کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے کہ ان کا دیکھنا ان شرطوں کے ساتھ جائز ہے، کہ ان میں ناجائز تصویروں اور ناجائز مناظر کی نمائش نہ کی گئی ہو ــــــ اس لئے کہ ٹیلیویژن کے اسکرین پر آنے والی تصویریں حقیقتاً تصویر نہیں ہوتیں، بلکہ وہ عکس اور پرچھائیں ہیں، جو نظر آتی ہیں، اور عکس و پرچھائیں کا دیکھنا ہر ایک کے نزدیک جائز ہے، جس طرح آئینہ یا صاف پانی میں انسان یا کسی جاندار کی تصویر چھپ جاتی ہے تو اس کو دیکھنا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ وہ تصویر کوئی ناجائز منظر کشی نہ کر رہی ہو۔ بالکل اسی شرطِ جواز کا لحاظ کر کے ویڈیو کیسٹ کا دیکھنا بھی بروئے شرع و عقل جائز ہے ــــــ رہا یہ شبہ کہ جب یہ عکس ہیں تو پھر ان پر تصویر کا اطلاق کیوں کیا جاتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اطلاق مجازی ہے، ورنہ حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ عکس ہی ہیں، اگر عکس نہ ہوتے تو پھر یہ تصویریں فیتہ میں نظر کیوں نہیں آتی ہیں، جبکہ تصویر ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کو دیکھا جا سکتا، لیکن نہیں دیکھا جا رہا ہے، تو حقیقت ایک طرف یہ ہے کہ ان کو غیر مرئی ہونے کی وجہ سے عکس کہا جائے اور احکامِ عکس ان پر مرتب ہوں اور دوسری طرف مجازی اطلاق یہ ہے کہ ان کو تصویر کہہ کر ناجائز قرار دیا جائے ــــ اب فیصلہ اصول فقہ کی روشنی میں آسان ہے، کہ حقیقت اسی وقت تک ترک نہیں کی جا سکتی، جب تک کہ حقیقت کا استعمال ناممکن نہ ہو جائے۔ اور یہاں حقیقت ناممکن نہیں بلکہ وہی زیادہ مناسب ہے اس لئے مجاز مراد لے کر اس پر حکم عدمِ جواز لگانا غلط ہے۔ ــــ اور جس طرح ٹیپ ریکارڈ کے فیتہ میں آوازیں محفوظ ہیں، تو ان کو سننا اسی شرط کے ساتھ جائز ہے کہ غلط آوازیں نہ ہوں، اسی طرح یہاں بھی یہی حکم اور یہی شرطیں ملحوظ ہوں گی ــــ یہ ہے مولانا مدنی میاں صاحب کے دلائل کا خلاصہ جن پر مولانا کے فتویٰ جواز کا سارا نظام گردش کر رہا ہے۔ پوری تفصیل بلفظہٖ لاہور سے نکلنے والے پرچہ "میثاق" میں موجود ہے، ــــ ذیل پر مولانا کے فتویٰ کا تحقیقی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

بنیادی طور پر حضرت مولانا کا پورا فتویٰ دو اصولوں پر گھوم رہا ہے (۱) اگر جائز مناظر کی عکاسی
کی گئی ہو تو ٹیلی ویژن دیکھنا جائز ہے۔ (۲) یہ مناظر تصویریں نہیں بلکہ عکس ہیں۔
لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اصول ایک صاحب نظر انسان کے نزدیک مخدوش بلکہ باطل
ہیں:
(۱) پہلے اصول کے بارے میں تو صرف اتنا عرض کرنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ جائز و ناجائز مناظر
کی شرط لگانا کیا حالاتِ وقت سے بے خبری یا تجاہلِ عارفانہ کا اثر نہیں ہے؟ کون نہیں جانتا کہ
ٹیلیویژن نشر و اشاعت کے سارے مراکز حکومت کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جس انداز کی نمائش چاہتی
ہے کرتی ہے، کسی خاص اسلامی انسان کے زیر دست نہیں ہیں کہ وہ جائز منظر کشی کرے یا ناجائز
دونوں اختیار اسے حاصل ہوں، ـــــــ اور جب حکومت اس ٹیلی ویژن کے ذریعے عموماً غلط
نمائشیں ہی کرا رہی ہے تو جائز مناظر کی شرط لگا کر احوال اور عام رائے کے خلاف یہ ایک خیالی تشقیق
درمو شگافی نہیں تو کیا ہے؟ ورنہ جو عام طور پر رائج ہے اس کو کون بدل سکتا ہے؟ پھر فتویٰ اسی
کے مطابق ہونا چاہیئے، نہ یہ کہ کوئی ذہنی اور خیالی تشقیق کر کے ... ند کے زندر ہے ہاتھ سے جنت نگی
ــــ کا مصداق بننا چاہیئے۔
یہاں شاید مولانا کی طرف سے یہ کہا جائے کہ اچھا چلو! یہ عام نمائش حکومت کے قبضہ میں ہے۔
لیکن وہ مناظر جن کا تعلق ٹیلی ویژن کے مرکز سے نہیں بلکہ دینی دائروں سے ہے، مثلاً محافلِ وعظ،
مشائخ کے تزکیۂ نفوس کی روحانی مجلسیں، ان کے تلامذہ و مریدین کا حلقۂ ذکر و فکر، مشاہدہ و مراقبہ کا
حسین منظر، مساجد میں نمازیوں کی صف بستہ قطاریں، مدارسِ دینیہ کا تعلیمی ماحول، تدریسی شکلیں، تبلیغی
اجتماعات، گشتی کیفیات اور مناسکِ حج کی ادائیگی کی پر بہار فضا وغیرہ۔ یہ سب دینی و اسلامی تنظیمات
سے متعلق ہیں اور جائز مناظر ہیں، اس کا جواب میں اسی تصویر کے دوسرے رُخ میں دوں گا۔
ان شاء اللہ تعالےٰ!
(۲) آیئے مولانا کا دوسرا اصول بھی دیکھ لیجئے: مولانا نے ان تصویروں کو عکس اور پرچھائیں فرمایا ہے
اور دلیل بھی کتنی جاندار کہ؛
(۱) وہ نظر نہیں آتیں
(۲) اور حقیقت میں وہ عکس ہیں، اسی لئے مجازاً تصویر کا حکم اس پر نہ ہوگا۔
لیکن یہ دنیائے علم کے لئے ایک افسوس ناک حادثہ ہے کہ اتنا بڑا عالم اتنی چھوٹی اور نیچی باتیں کر رہا ہے۔

کیا کسی چیز کا نہ دکھائی دینا اس کے نہ ہونے کی دلیل ہے۔ ہزاروں چیزیں ہیں جو نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ان کے وجود کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اس کی نظیریں علوم وفنون کے ہر شعبہ میں ہیں: **شرعیات** میں دیکھئے کہ دواعیٔ زنا یعنی بوس وکنار جو اسباب زنا ہیں، ان پر وہی حکم لگتا ہے جو زنا کا حکم ہے۔ یعنی رشتۂ مصاہرت ثابت ہو جاتا ہے۔ جبکہ زنا بالفعل موجود نہیں ہے لیکن چونکہ بالقوہ موجود ہے کہ ان اسباب سے جرم زنا کا صدور ہو سکتا ہے، اس لئے ان پر حکم زنا ثابت کیا گیا، اسی طرح ٹیلی ویژن، ویڈیو کیسٹ کے فیتہ پر تصویریں اگرچہ بالفعل نظر نہیں آتی ہیں لیکن بالقوہ ہر وقت نظر آ رہی ہیں۔ اس طرح کہ جب چاہے بٹن دبا دیجئے اور ساری تصویریں ٹیلی ویژن کے اسکرین پر ناچنے لگیں، اس لئے بالقوہ کا حکم وہی ہوگا، جو بالفعل کا ہے ——— **نحویات** میں اس کی مثال لیجئے کہ ضمائر متصلہ جو نظر نہیں آتی ہیں، لیکن تمام اہل فن وہاں پر ضمائر کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے وجود کو مانتے ہیں۔ اسی طرح مفعول مطلق اور مفعول بہ میں بعض مقامات پر افعال بظاہر موجود نہیں ہوتے ہیں لیکن سب لوگ وہاں مخفی و مقدر مانتے ہیں۔

تجربیات کی دنیا میں آئیے! ہوا ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، مگر اس کے وجود کا کوئی انکار نہیں کر سکتا، ہمارے جسم کی کیفیات سرور وغم نگاہوں سے مستور ہیں لیکن ان کے انکار کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ **اعتقادیات** کے باب میں خدائے پاک نظروں سے مخفی ہیں لیکن اس کے وجود کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور **سائنسیات** کی کتاب الٹیئے کہ برقی لہریں نظر نہیں آتیں مگر کوئی ان کے وجود کا انکار نہیں کرتا ——— تو آخر کیا مصیبت ہے کہ زندگی اور علوم وفنون کے ہر شعبہ میں تو کسی چیز کو ماننے کے لئے ظاہری مشاہدہ کو شرط نہیں قرار دیا جاتا، لیکن جب ویڈیو کیسٹ کا مسئلہ آتا ہے، تو اس میں رویت کی شرط لگا دی جاتی ہے۔ جو تمام گوشہ ہائے حیات میں ٹھکرائی جا چکی ہے ——— اب ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ مولانا کی پیش کردہ دلیل کتنی اٹھی توتوں کا مجموعہ ہے۔

رہا یہاں پر حقیقت ومجاز کی بحث چھیڑنا تو واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک مغالطہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لئے کہ حقیقت ومجاز الفاظ کے پیچ وخم اور اطلاقات کے نشیب وفراز ہیں، واقعہ کی دنیا میں حقیقت ومجاز کی بحث آتی ہی نہیں، اصول فقہ میں حقیقت ومجاز کو الفاظ کی قسموں میں بیان کیا گیا ہے، اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ ویڈیو کیسٹ کا مسئلہ امر واقعہ ہے، کوئی لفظی تکرار نہیں ہے، اور اگر بالفرض حقیقت ومجاز کو واقعاتی شعبوں میں بھی جگہ دے دی جائے تو بھی اہل نظر پر مخفی نہیں کہ یہ حقیقت میں تصویریں ہیں عکس نہیں ہیں اور عکس ہونے کی دلیلیں ابھی اوپر بے بنیاد ہو چکی ہیں ——— اس لئے اس کو آئینہ اور پانی پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ آئینہ اور پانی میں عکس آتا ہے، دلیل یہ ہے کہ اس

ں پائداری نہیں ہوتی اور ٹیلی ویژن اور ویڈیو کیسٹ میں تصویریں ہوتی ہیں ۔ دلیل یہ ہے کہ یہ ناپائدار
یں ہوتیں بلکہ جب جس زمانہ میں چاہے، ان تمام مناظر کو کیسٹ کے فیتے پر ٹیلی ویژن کے ذریعہ دیکھا
سکتا ہے ۔۔۔ تو دونوں دو جنسوں کی ہوگئیں، اور تمام اصولین کے یہاں طے ہے کہ قیاس کے
ئے اتحادِ جنس شرط اولین ہے، اس لئے ٹیلی ویژن اور ویڈیو کیسٹ کو آئینہ اور پانی پر قیاس کرنا درست
یں ہے ۔ اسی طرح ویڈیو کا ٹیپ ریکارڈر اور مائیکروفون پر قیاس کرنا بھی غلط ہے ۔ اس لئے کہ ویڈیو کا
لق دیکھنے سے ہے اور مائیکروفون اور ٹیپ ریکارڈر کا تعلق سننے سے ہے ۔ وہاں تصویر ہے اور یہاں
واز ہے ۔ دونوں کو ایک دوسرے پر قیاس کرنا عجیب سانحہ ہے ۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر سخت حیرت درپیش ہے کہ مولانا نے ٹیلی ویژن کی تصویروں پر یہ حکم کس طرح صادر
ما دیا، جو حکم اصل مناظر کا ہوتا ہے ۔۔۔ حالانکہ اصل مناظر کی کیفیات اور ان کی تصویروں کی کیفیات
ں کافی فرق پڑ جاتا ہے، آپ ہی دیکھئے کہ اصل شیر کو دیکھ کر انسان کس طرح ڈر جاتا ہے، لیکن جب اسی
تصویریں دیکھتا ہے تو اس وقت خوف و دہشت کیا معنی ! بلکہ ایک طرح کا کیف و سرور اور تماشائی لذت
دا ہوتی ہے، اسی طرح نمازی جب خود نماز ادا کرتا ہے، یا کسی انسان کو نماز ادا کرتے دیکھتا ہے، تو اس
ت کی کیفیات اور ہوتی ہیں ۔ لیکن جب اسی حالت نماز کی تصویر دیکھتا ہے، تو اس وقت کی کیفیت اور
تی ہے، اصل حالتِ نماز میں نیت عبادت کی تھی، اور اس کی تصویر دیکھنے میں نیت تماشا اور نظارہ کی
ہے، پھر دونوں الگ چیزوں پر ایک دوسرے کو قیاس کیسے کیا جا سکتا ہے !

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ٹیلی ویژن اور ویڈیو میں کسی منظر کا دیکھنا کسی صحیح نیت
ے نہیں ہو سکتا بلکہ یا بہ نیت تماشا یا بہ نیت لہو و لعب ہوگا، تماشا کی نیت میں بھی لہو و لعب کا معنی شامل
ر کسی دینی و مذہبی مناظر کو تماشا، یا کھیل کود، خوش وقتی اور وقت گذاری کے لئے دیکھنا کسی طرح درست
یں ہو سکتا ۔۔۔ اور اگر کسی ایک دو بندۂ خدا کے دل میں خلوص باقی بھی رہے اور لہو و لعب کا
لو اس کے قلب میں نہ بھی آئے، تو چند افراد کے حالات سے مسائل کی تعمیر نہیں ہوتی، بلکہ عامۃ الناس
ے جو حالات ہوتے ہیں ان پر مسائل اور فتاویٰ کی بنیادیں رکھی جاتی ہیں ۔ اس لئے بہر حال یہ لہو و لعب
ہے ۔ اگرچہ اس میں غلط تصویریں نہ ہوں اور لہو و لعب بروئے آیتِ کریمہ اتخذوا دینهم لهوا
لعبا .... الخ حرام ہے ۔۔۔ اور اگر کسی کی یہ نیت نہ بھی ہو تو چونکہ یہ سامانِ لہو و لعب ہیں،
دونوں کا احتمال بہر حال ہے ۔ لہٰذا سداً للباب اس کو ناجائز کہا جائے گا اس لئے کہ ایسے مرحلہ میں فقہاء
نے یہ فیصلہ فرمایا ہے، کہ جانبِ حرام کو ترجیح دی جائے گی ۔ فقہی قاعدہ ہے کہ اذا اجتمع الحلال

والحرام غلب الحرام کہ جب حلال وحرام کا اجتماع ہوجائے توغلبہ حرام کو ہوتا ہے، وفی شرح المنیۃ وان کان مع الجنازۃ نائحۃ اوسائحۃ تزجر وان لم تزجر لا یترک الجنازۃ انتھی ـــــ وفی ردالمختار ولا یترک اتباعھا لاجلھا (ای النائحۃ والسائحۃ) لان السنۃ لا تترک بما اقترن بہ من البدعۃ ویرد الولیمۃ حیث تترک حضورھا لبدعۃ منھا للفارق بانھم لو ترکوا المشی مع الجنازۃ لزم عدم انتظامھا ولا کذلک الولیمۃ انتھی ـــــ دیکھ رہے ہیں! جنازہ چونکہ فرض کفایہ ہے، اس لئے محرمات کے مقام جنازہ پر ہونے کی وجہ سے اس کو ترک نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ پھر انتظام جنازہ کون کرے گا۔ البتہ ان خرافات کے رد کنے کی سعی کی جائے گی، لیکن ولیمہ جو کہ سنّت مرغوبہ ہے، اس کو لغویات کے اختلاط کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے گا، ایک طرف سنّت مرغوبہ کا تقاضا اس کو قبول کرنے کا ہے، اور دوسری طرف لغویات وخرافات کا تقاضا اس کو چھوڑ دینے کا ہے، اس کشمکش کے وقت حرمت کا پہلو غالب قرار دیا گیا ـــــ البحرالرائق میں ہے: لانہ اذا تردد الحکم بین سنۃ و بدعۃ کان ترک السنۃ راجع علی فعل البدعۃ ـــــ سنّت وبدعت میں تردد کے وقت جب سنّت چھوڑی جاسکتی ہے، توجس صورت میں اباحت وبدعت کا تقابل ہو، اس وقت امرِ مباح کو کیوں ترک نہیں کیا جائے گا۔ اسی پر ٹیلی ویژن اور ویڈیو کیسٹ کو سمجھ لیجئے ـــــ طریقۂ محمدیہ کی عبارت سے تو مسئلہ کا فیصلہ ہی ہوجاتا ہے: ثم اعلم ان فعل البدعۃ اشد ضررًا علی ترک السنۃ بدلیل ان الفقھاء قالوا اذا تردد بین کونہ بدعۃ وواجبۃ انہ یفعلہ وفی الخلاصۃ تدل علی خلافٍ ـــ واجب جب منکرات سے مخلوط ہوجائے تو اس وقت علماء کا اختلاف ہوگیا، کہ واجب ادا کرے یا نہ کرے۔ ناظرین غور کریں کہ پھر جب سنّت ومندوب یا مباح میں منکرات، لہویات ولغویات گھس جائیں گے تو کیا اس وقت اس سنّت مباح کا کرنا کسی بھی طرح درست ہوسکتا ہے؟ لیکن مولانا مدنی میاں واجب میں اختلاف کو تو کیا دیکھتے، مباح میں بھی بلاکسی تردد کے فتویٰ دے رہے ہیں کہ جائز ہے حالانکہ یہ اگر فی نفسہٖ مباح بھی ہو لیکن آدمی کو لہو ولعب، منکرات وخرافات تک جا پہنچنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ اور ایسا مباح جو مفضی الی المنکرات ہو وہ از روئے شرع مکروہ تحریمی ہے۔ عالمگیری میں ہے: وکل مباح یؤدی الی ذلک (الی البدعات والمنکرات) لمکروہ۔ اتنی تفصیل کے بعد کون صاحب شعور یہ کہنے کی جرأت کرے گا کہ ویڈیو کیسٹ اور ٹیلی ویژن

دیکھنا جائز ہے۔ اگرچہ اس میں جائز اور نیک مناظر حتیٰ کہ عبادات ہی کا نقشہ پیش کیا گیا ہو، اس لئے کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ اس میں لہو و لعب کا زہر شامل ہے اور یوں بھی عبادات کی نمائش سوائے ہزل و مذاق اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگر نیت، نیتِ ہزل و مذاق نہ بھی ہو تو ایہام ہزل سے کون بچا سکتا ہے! اس لئے اس کو دیکھنا کسی بھی طرح روا نہیں ہونا چاہیئے۔ خواہ سداً للباب ہی سہی۔ فقط واللہ اعلم!

اب میں مولانا مدنی میاں صاحب سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ میری معروضات کو بغور مطالعہ فرمائیں، اور اپنے فتوٰی پر نظر ثانی فرمائیں، یا مجھے ہی میری باتوں، اور میری دلیلوں کا جواب دے دیں تاکہ میں بھی آپ کے مسلک کے سمجھنے کی اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کروں۔ وما علینا الا البلاغ۔

ـــــــــــــــ

ایک رائے

جناب ڈاکٹر صاحب ! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

تازہ میثاق دیکھا۔ میں اس بات کی تائید کرتا ہوں کہ آپ کو ماچھی گوٹھ کے مالۂ وما علیہ پر ضرور قلم اٹھانا چاہیئے، یہ تاریخ اور تحریک دونوں کا ان لوگوں پر قرض ہے جو اس کا ایک حصہ تھے، اگر اور کوئی اس کی ہمت نہیں کرتا تو آپ کو ضرور کرنی چاہیئے۔

والسلام

مخلص

(ڈاکٹر) محمد امین (پی ایچ ڈی)

فیروز پور روڈ ـــــ لاہور

بہار، رنگا رنگ پھولوں، شاداب چہروں اور بیدار آنکھوں کا موسم
پھر بھی کچھ چہرے بے آب اور کچھ آنکھیں بے رونق کیوں؟

موسم بہار میں چہار سُو نئی کونپلیں اور تازہ پھول کھل اٹھتے ہیں اور روئے زمین پر زندگی انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے۔

اس موسم بیدار میں صحت بخش خون چہروں پر حُسن بن کر جھلک اٹھتا ہے اور آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن اگر خون میں فاسد مادے سرایت کر جائیں تو پھوڑے پھنسیوں، مہاسوں اور کئی دوسری جلدی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جس سے چہرے بے آب اور آنکھیں بے شباب نظر آتی ہیں۔

بہار کے موسم میں صافی کا باقاعدہ استعمال فاسد مادوں کو خارج کر کے خون کو صاف اور صحت بخش رکھتا ہے اور یہی صاف خون چہروں پر حُسن بن کر جھلک اٹھتا ہے

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور
پاک پیور®
اور دیسی گھی

PAKPURE
BUTTER
PAKPURE
DESI GHEE

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

ایک مسنون دُعا

اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ
وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّيَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْكَذِبِ
وَاَعْيُنَنَا مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ
الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ 〃 〃
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ 〃 〃

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ○

مولانا سید حامد میاںؒ کی رحلت

ایک روشن خیال اور وسیع النظر عالم دین کے فیوض سے ملک وملت کی محرومی کے اعتبار سے
موت العالم موت العالم" کی مظہرِ اتم تو ہے ہی" ـــــ واقعہ یہ ہے کہ راقم الحروف کے لئے ایک عظیم ذاتی
صدمے کی حیثیت رکھتی ہے، اس لئے کہ جماعتِ شیخ الہندؒ کے باقیات الصالحات کے حلقے میں راقم کے درد
دل کا آشنا، اور اس کے ساتھ ذاتی محبت وشفقت ہی نہیں باضابطہ سرپرستی اور تعاون فرمانے والا اُن سے
بڑھ کر کوئی نہ تھا، اور اگرچہ اس معاملے میں بھی تاریخ نے اپنے آپ کو پوری طرح دہرایا ہے کہ جیسے حضرت
شیخ الہندؒ کی مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ شفقت وعنایت کی روش کو ان کے تلامذہ اور مسترشدین
نے دل سے قبول نہیں کیا تھا، اسی طرح مولانا مرحوم کے شاگردوں اور معتقدین کا حلقہ بھی راقم سے
اجنبیت محسوس کرتا ہے ـــــ تاہم ذاتی طور پر مولانا نے مختلف مواقع پر جس طرح راقم کی جانب سے
مدافعت کا حق ادا فرمایا اس کے بارِ احسان سے راقم کبھی سبکدوش نہ ہو سکے گا ـــــ یہی وجہ ہے
کہ بعض واقفِ حال احباب نے مولانا کی رحلت پر ذاتی طور پر راقم کو تعزیت کا حقدار سمجھا، جس کے
جواب میں راقم نے یہ شعر پیش کیا ؂

يُعَزُّونَ عَنْكَ وَأَيْنَ الْعَزَاءُ ۔۔۔ وَلٰكِنَّهُ عَمَلٌ مُسْتَحَبٌ !!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولاناؒ کے "صدقات جاریہ" یعنی جامعہ مدنیہ اور ان کی اولاد صالح
خصوصاً عزیزان رشید میاں اور محمود میاں سلمہما کو ان کے فیوض وبرکات کو تادیر جاری رکھنے
کی توفیق عطا فرمائے ـــــ اور راقم الحروف اور اس کے رفقاء کو بھی "لَا تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ
وَلَا تَفْتِنَّا بَعْدَهُ" کے زمرے میں شامل فرمائے۔ آمین!

اِک دیا اور بجھا

عجیب اتفاق ہے کہ یہ سطور زیرِ قلم ہوئی ہی تھیں کہ فون پر سردار محمد اجمل خاں لغاری کے انتقال
پُرملال کی خبر ملی۔ اور اس سے بھی عجیب تر اتفاق ہے کہ جب راقم یہ افسوسناک اطلاع رفیقِ مکرم شیخ

جمیل الرحمٰن صاحب کو پہنچانے گیا تو وہ بھی اپنی اسی شمارے میں شامل تحریر کے ان الفاظ کو قلمبند کر کے فارغ ہوئے ہی تھے جن میں ۱۹۶۷ء کی 'قرار دادِ رحیم یار خاں' کے ضمن میں سردار صاحب مرحوم و مغفور کا تذکرہ تھا۔ سردار صاحب کا بھی بہت سے اختلافات کے باوجود آخری وقت تک راقم الحروف کے ساتھ جو تعلقِ خاطر قائم رہا اُس کی بنا پر ان کی رحلت بھی راقم کو ایک ذاتی نقصان محسوس ہو رہی ہے — لیکن ظاہر ہے کہ اس معاملے میں صبر کے سوا کیا چارہ ہے! اللہ تعالیٰ ان کے پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کی اولاد بالخصوص عزیزان نور محمد خاں لغاری اور محمد حمید خاں لغاری سلمہٗ کو اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

——— اسرار احمد، ۲۸ مارچ ۱۹۸۸ء

نذار احمد

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے قارئین ' برادرِ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے سامعین اور خود تنظیم اسلامی کے بعض رفقاء کے ذہن میں بارہا یہ سوال اٹھا ہے کہ ہمارے ہاں جماعت اسلامی کا ذکر اس کثرت سے یوں آتا ہے اور پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ جب بھی یہ ذکر چھڑے ' بات تلخی ' تاسف بلکہ حسرت تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے معدودے چند ہی ایسے ہیں جو خود بھی کسی نہ کسی طور جماعت کے اس قافلے سے منسلک رہے جو ایک زمانے میں اپنی منزل مقصود کی طرف رواں تھا ' ان میں سے بھی صرف وہ ہمارے درد آشنا اور ہمارے کرب کے شناسا ہیں ' نشانِ منزل اب تک جن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا ' بھولے ہوئے مقصد کی طلب اب بھی جنہیں تڑپاتی ہے۔ انہیں یاد ہے سب ذرا ذرا کہ یہ قافلہ آہستہ خرامی کے ساتھ سہی ' چل اسی راستے پر رہا تھا جو تکبیر رب کی جانب جاتا ہے۔ اب وہ قافلے والوں کو دائیں ' بائیں یا معکوس سمت میں زقندیں بھرتے دیکھتے ہیں تو...... شائقین کو بہت بھلا لگنے والا یہ "پی۔ ٹی شو" ' یہ دلچسپ تماشا...... ان کے لئے تفریح نہیں سوہانِ روح بنتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکیں تو تعجب کی کیا بات ہے۔ دل ہی تو ہے ' نہ سنگ و خشت............

ہاں ان لوگوں کی بات الگ ہے ' قفسِ عافیت کے گوشے میں انہیں آرام بہت ہے ' جو اگرچہ ماضی میں مقصد کی اسی لگن ' اسی جنوں کے اسیر اور اسی بے چینی کا شکار تھے لیکن اب عقل کے ناخن لے چکے ہیں۔ پہلے سیلاب بلا میں گردن تک پھنسے ہوئے اس کا رخ موڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے تھے ' اب کنارے بیٹھ کر لہریں گنتے ہیں۔ ان کی گنتی بہت قاعدے قرینے کی ' غیر جذباتی اور معروضی ہے۔ ان کے تبصرے ہلکے پھلکے ہیں ' ان کے دلوں کے تار مروت و رواداری کی مدھر تانیں نکالتے ہیں ' ان کے دہن سے شیریں نغمے ابلتے ہیں۔ ان کا درد منت کش دوا ہوئے بغیر کافور ہو گیا ہے۔ اب تو آرام سے گذرتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ' انہی دنوں ' جمعے کے ایک خطبہ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے خاک و خون

میں غلطاں ہو جانے والے نوجوانوں کی شہادت پر جب گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا
کہ اگرچہ جان ہارنے والے تو اپنی نیت کے مطابق اجر کی مراد انشاءاللہ ضرور پائیں گے تاہم
منکرات کے خلاف جہاد میں بہایا جانے والا خون رائیگاں جا رہا ہے' یہ جماعت اسلامی کے
سیاسی کھیل کو رنگین بنانے سے بڑھ کر کوئی نتیجہ بر آمد نہیں کر رہا' کہ امر بالمعروف و نہی
عن المنکر تو دین کے لئے انقلابی جدوجہد کے سنگ ہائے میل میں سے ہے' دونوں کی سیاست کا
حصہ نہیں۔ اور مشورہ دیا کہ جمعیت کو جماعت کے گھڑے کی مچھلی بن جانے کی بجائے ان
لوگوں سے بھی ربط و تعلق رکھنا چاہئے جو دین کا وہی انقلابی تصور پیش کر رہے ہیں جس کی قبل از
وقت' غیر منظم اور نیم پخت جھلکیاں ان نوجوانوں کی سرگرمیوں سے ملتی رہتی ہیں تو ساتھ ہی
گلہ بھی کیا کہ جمعیت کی بعد کی نسلیں ان کے بھی قریب نہیں پھٹکتیں جب کہ طلبہ کی اس تنظیم کا
انتہائی فعال دور وہ تھا جب وہ خود پنجاب کے ناظم اور پھر پورے پاکستان کے ناظم اعلیٰ
تھے۔ ان کے لکھے ہوئے کتابچے آج بھی جمعیت کے بنیادی لٹریچر کا حصہ ہیں اور انہوں نے
اپنا قابلِ رشک تعلیمی کیریئر اور بے فکری کے دن اس پہ نچھاور کئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے
شدتِ جذبات میں جب یہ شعر پڑھا کہ۔

یہ اور بات کہ تجھ پر نثار کر بیٹھے
عزیز اپنی جوانی کسے نہیں ہوتی

تو دل میں اک ہوک سی اٹھی کہ ان کے سامعین میں اس دردِ نہانی کے رازداں ہیں کتنے ان
معنوں میں تو یہاں "نادانوں" کا مجمع ہے اور۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

اپنی بات چھیڑنے سے پہلے عرض کر دوں کہ میں کسی شمار قطار میں نہیں' زندگی کا بہترین
حصہ مطالباتِ دین سے بے نیازی اور دنیا کمانے میں کھپائے بیٹھا ہوں۔ اور یہ اقرارِ جرم
کے ہزاروں کو اپنی تہی دامنی کا گواہ بھی بنا رہا ہوں لیکن اپنا لڑکپن میں نے بھی جماعت
اسلامی کے اس قافلے میں لڑھکتے گذارا ہے جو اگرچہ رخ بدل چکا تھا لیکن نشاناتِ راہ ابھی اتنے
دور نہ ہوئے تھے کہ نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ خطِ مستقیم سے کوئی لکیر جدا ہوتی ہے تو دونوں

درمیانی فاصلہ بڑھتے بڑھتے ہی بڑھتا ہے، عمارت کی عظمت کے نشانات باقی تھے..... ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے تھے..... اپنی آنکھوں سے جماعت کے ان اراکین کو دیکھا ہے، جن کے قرب میں خیر القرون کے سائے کی ٹھنڈک اور جن کے جذبوں میں جوشِ جہاد کی دہکتی آگ تھی۔ میں نے اپنے شہر منٹگمری..... جواب ساہیوال ہے اور میرے لئے اجنبی..... کا کوئی کھمبانہ چھوڑا جسے ان چار پانچ انچ چوڑی اور لگ بھگ بارہ انچ لمبی کاغذی پٹیوں سے نہ لپیٹ دیا ہو جن پر لکھا تھا "امیدواری حرام ہے" اور "پارٹی ٹکٹ لعنت ہے" ...... وغیرہ۔ سائیکل کے ہینڈل پر دونوں طرف "لئی" کی چھوٹی بالٹیاں ہوتیں جو بہنیں گھر کے آٹے کو ململ سے چھان کر پکا دیتی تھیں۔ کیریئر پر اشتہارات کے بنڈل اور شہر کی دیواریں جنہیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ میں بھی کاغذی پیرہن پہنا دیتا تھا۔ گھی کے استعمال شدہ ڈبوں میں سیاہی ہوتی، ہاتھ میں برش اور مجھے چونکہ کچھ نمبر خوش خطی کے بھی ملتے تھے، لہٰذا مجھ پر یہ ذمہ داری بھی زیادہ ہوتی کہ جماعت کے پیغام سے دیواریں سیاہ کروں۔ شام کو گھر لوٹتا تو ہاتھ پیروں کے علاوہ...... کہ وہ تو ویسے بھی کالے ہیں..... کپڑے بھی کالے ہوتے۔ جماعت کے ترجمان روزنامہ "تسنیم" کا کوئی خاص نمبر آتا تو گلی کوچوں میں اسے لے کر گھومنا اور دو دو آنے وصول کر کے لوگوں کو چپکانا میرے فرائض میں داخل تھا۔ الجزائر کے ایک عالم دین، (مغالطہ نہیں ہو رہا تو شیخ ابراہیم تھے) اور مجاہد آزادی کرنل بودا جماعت کے مہمان بن کر جنگ آزادی کے لئے چندہ جمع کرنے آئے تو منٹگمری کے جلسہ عام کا دن بھر تانگے پر لاؤڈ سپیکر کے ذریعے اعلان بھی کیا اور ساتھ ہی ایک طویل رزمیہ نظم بھی کہی ۔ رات کو کمپنی پارک میں تلاوت قرآن پاک کے بعد میں ہی سٹیج پر آیا۔ گلا بیٹھ چکا تھا لیکن جذبے نے آواز کو جلا بخشی۔ نظم اب بالکل یاد نہیں صرف پہلا شعر حافظے میں محفوظ ہے جو یہ تھا۔

اے الجزائر کی زمیں   خونِ شہیداں کی امیں

انہی دنوں بڑھاپے میں، 'عمر رفتہ کو آواز دیتے' میں نے اپنے ہفت روزہ پرچے "ندا" کا اجرا کیا ہے۔ نئے امیر جماعت اسلامی پاکستان، قاضی حسین احمد صاحب کی خدمت میں انٹرویو کے لئے حاضر ہوا تو میں نے عرض کیا کہ قاضی صاحب! میرے آخری چند سوال آپ کو شاید ذرا ٹیڑھے لگیں لیکن ان کا جواب دیتے ہوئے خیال رکھیئے گا کہ ایسی باتیں آپ سے پوچھنے کا

حق رکھتا ہوں۔ میں نے اولین الیکشن (پنجاب اسمبلی۔ ۱۹۵۱ء) میں ووٹروں کی فہرستوں کی
چھ نقول پکی پنسل سے بنائی تھیں جن کی سختی سے اب لوگ واقف بھی نہیں اور جن سے لکھتے لکھتے
انگلیوں کا پور پور دکھنے لگتا تھا' ہاتھ شل ہو جاتے تھے۔ میرے نویں جماعت کے سالانہ امتحان
ہو رہے تھے' لیکن کتابوں اور تیاری سے بے پرواہ میں جماعت کی پہلی "پنچائتی نظام" کے
تحت انتخابی مہم میں مگن تھا۔ عین پولنگ کے دن بعد دوپہر میرا ایک پرچہ تھا' پہلے سارے پرچے
بھی بغیر تیاری کے دیئے' اس روز امتحانی گتہ ساتھ لے کر پولنگ سٹیشن گیا کہ جب اس کا وقت
ہو گا' وہیں سے سکول چلا جاؤں گا۔ وہاں پرچیاں بناتے بناتے چار بج گئے۔ امتحان کا وقت آیا
لیکن حاشیہ خیال سے بھی نہ گزرا۔ البتہ خیر گزری کہ سکول والوں نے میری معذرت قبول کر
لی اور باقی پرچوں کی اوسط نکال کر مجھے پاس کر دیا ورنہ ایک سال مارا جاتا۔

اس طولانی تمہید سے قارئین کو بے مزا کرنے سے غرض صرف اتنی ہے کہ ہمارے قارئین
اور ساتھی...... اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائیں تو جماعت اسلامی کے متعلقین بھی' کبھی جن
میں ہم میں بھی چاہ تھی۔ انہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو...... ہماری تلخی کو رقابت و محاذ آرائی پر محمول نہ
کریں' ہمارے درد و کرب کا اظہار سمجھیں۔ ہم بے سرو سامانی کی کیفیت میں جس انقلابی
دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اس کا آوازہ بلند کر کے مولانا ابو الکلام آزاد تو زندگی میں ہی مرحوم
ہو گئے' مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے جماعت اسلامی کی قیادت کرتے ہوئے اس میں
مفہوم و معنی کی جان ڈالی اور بڑے ہی قیمتی لوگوں پر مشتمل ایک قافلہ بنا کر اسے عملی جامہ
پہنانے کا عزم کیا تھا۔ لیکن پھر وہ انقلابی دعوت کھو گئی' قافلہ بے مقصدی کی وادیوں میں بھٹکنے
لگا...... جی ہاں!! اپنے ہدف سے ہٹ کر آپ کتنے ہی کارہائے نمایاں انجام دے لیں' کیسی ہی
چابک دستی دکھائیں' بھٹکے ہوئے شمار ہوں گے...... کان جس آوازِ حق سے نا آشنا ہوتے جا
رہے تھے' وہ فضا میں بلند ہونے بھی نہ پائی تھی کہ یہ حادثہ ہو گیا۔

زمانہ بڑے شوق سے سُن رہا تھا
"تمہی" سو گئے داستاں کہتے کہتے

یہ نہ ہوا ہوتا تو آج ہم تنہا بادیہ پیمائی کا شوق پورا کرنے اور آبلہ پائی کا دکھ اٹھانے کی بجائے
جماعت اسلامی کے ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جانبِ منزل رواں ہوتے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا مودودی مرحوم و مغفور کا اپنی حکمت عملی میں بنیادی تبدیلی کا فیصلہ
ور بعد میں جماعت کا اس پر اصرار بدنیتی کا نتیجہ ہے۔ اگر ایسا سمجھتے تو رُوئے سخن ان کی طرف
و ناہی کیوں کہ بقول غالب؎

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

مارے نزدیک یہ تدبیر کی غلطی تھی اور غلطی کی طرف اشارہ کیا جاتا رہے تو کیا عجب کبھی وہ
لادی جال موم ہو ہی جائے جس کے دام میں جماعت کا اصل مقصدِ تاسیس سسک رہا ہے۔
اروں طرف کان لگا کر دیکھتے ہیں تو اب بھی بھانت بھانت کی بولیوں میں سے ایک ہی دعوت
ں دین کے انقلابی تصوّر کا سراغ ملتا ہے لیکن افسوس کہ سیاسی مصلحتوں، انتخابی امنگوں اور
لت کے "عملی" تقاضوں نے اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا...... ہمیں اپنائیت جماعت ہی کے
گوں سے محسوس ہوتی ہے۔ کاش وہ ہمارے دلوں میں جھانک سکتے جہاں انہیں یہ شعر نقش
ملے گا۔

ہر روز ایک تازہ شکایت ہے آپ سے
واللہ! مجھ کو کتنی محبت ہے آپ سے

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جماعت میں اپنی غلطیوں سے اغماض عادتِ ثانیہ،
ن پر اصرار حکمتِ بالغہ اور ان کی پُر پیچ تاویلات ادبِ عالیہ بنتا جا رہا ہے حال ہی میں قیادت میں
مایاں تبدیلی کے بعد تو اس عمل میں برق کی سی تیزی آتی نظر آ رہی ہے۔ کراچی میں شکست
کے تجربے سے اس نے اگر کوئی سبق سیکھا تو یہ کہ اسے اور زیادہ "عوامی" ہو جانا چاہئے۔
'کاروانِ دعوت و محبت" کا خوبصورت لیبل لگا کر جماعت نے اپنی افرادی قوت، مالی وسائل
ور شان و شوکت کے مظاہرے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں دعوت اور محبت نام کی چیزیں
عنقا ہیں، دوسرے سیاسی گروہ اور جماعت اسلامی کی حریف دینی جماعتوں کے ہاتھ ایک اور
شغل ضرور لگ جائے گا۔ پھر دیکھئے اس طوفان ہاؤ ہو اور غوغا آرائی میں کس کا نمبر پہلا رہتا
ہے۔ رہے عوام تو انہیں بغیر ٹکٹ تماشے دیکھنے کو ملیں گے۔ وہ تماشوں کے عادی ہو چکے ہیں
ور بڑے شوق سے منتظر رہیں گے کہ نیا تماشا کدھر سے اور کب دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تماشا ہمیں

جی بہلا لگتا ہے لیکن لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے کہ پچھلی چودہ صدیوں میں اس دور
کاروان دعوت و محبت کے نقوش پا کو چومتے ہوئے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بعثت
کے دسویں سال طائف لے کر گئے تھے اور اس تین رکنی (ایک اونٹ بھی تو اسی کا حصہ تھا
کاروان دعوت و محبت کے اتباع میں جس کا رخ امیرالمؤمنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
قیادت میں بیت المقدس کی طرف تھا' ہزاروں کارواں ہائے دعوت و محبت دنیا
طول و عرض میں بکھرتے رہے ہیں' ان میں سے کسی کے آثار اس تازہ کارواں میں نظر نہ
آتے تو ہمارا اضطراب دوچند ہو جاتا ہے' درد و کرب کی لہریں بے چین کر دیتی ہیں اور حسرت
آتی ہے کہ دین کا ایسا واضح اور اتنا ہمہ گیر تصور رکھنے والے اگر یوں کھلونوں سے بہلنا
کھلونے دے کے بہلانا شروع کر دیں گے تو عوام کالانعام کسے رہنما کریں گے۔

ہمیں دکھ یہ بھی ہے کہ تیس' چالیس' پچاس سال قبل جب ہماری قوم بانجھ نہیں ہوئی تھ
مردانِ کار پیدا ہوتے اور پائے جاتے تھے' جماعت اسلامی کی پکار...... مَن انصاری
اللہ...... پر لبیک کہتے ہوئے جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ اس ملک کی تقدیر بدل سکتے تھے' لیکن انہ
سیاست کی بھول بھلیوں اور انتخابات کی خار دار وادیوں میں بھٹکا کے نڈھال کر دیا گ
انہیں عظمت و عزیمت کے نشان اور دعوت الی اللہ کے مینار بنانے کی بجائے ان کی گرد
میں ووٹوں کے کشکول لٹکا دیئے گئے۔ یہ سب دکھ' یہ پورا درد و کرب اور یہ ساری حسرت جڑ
کر اگر ہم میں تلخی پیدا کر دے تو اس کے سوا کیا عرض کریں کہ۔

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَمِ

مولانا سیّد حامد میاںؒ

ناظم و مہتمم و شیخ التفسیر والحدیث والفقہ جامعہ مدنیہ، راوی روڈ، لاہور

٢ مارچ ٨٨ء کی شب کو اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ معلوم ہوا ہے کہ اسی تاریخ کو نمازِ مغرب کے بعد جب کہ مولانا مرحوم اپنے کمرے میں اکیلے اوراد و وظائف میں مشغول تھے کہ اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔ فوراً طبی امداد کے لئے ہسپتال لے جایا گیا، ڈاکٹروں نے تصدیق کر دی کہ مولانا انتقال فرما چکے ہیں: کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ۔ وفات کے وقت مولانا کی عمر شمسی تقویم سے اکسٹھ اور قمری تقویم سے ترسیٹھ برس کی تھی گویا مولانا مرحوم نے مسنون عمر میں رحلت فرمائی۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ۔

مولانا مرحوم برّعظیم پاک و ہند کے ایک نہایت جیّد عالمِ دین مولانا سیّد محمد میاں رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید تھے۔ ان کے والد مرحوم کو غیر منقسم ہندوستان میں ملک گیر شہرت حاصل تھی۔ مرحوم کافی عرصہ تک جمعیت العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری بھی رہے ہیں۔ درس و تدریس کے علاوہ مولانا صاحبِ قلم بھی تھے۔ بے شمار دینی کتب کے مصنّف تھے۔ جن میں سے دو کتابوں کو، یعنی پہلی کتاب "علمائے ہند کا شاندار ماضی" جو چار جلدوں پر محیط ہے اور دوسری کتاب "علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے" جو دو جلدوں پر محیط ہے، ملک گیر قبولِ عام حاصل ہوا۔ ان کتابوں کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اور ان کو ایک تاریخی دستاویز کا مقام حاصل ہے۔ آج بھی محققین ان سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔

مولانا سیّد حامد میاںؒ نے دینی تعلیم کے حصول کی ابتدا دارالعلوم دیوبند سے کی پھر مرادآباد کے مدرسہ جامعہ قاسمیہ سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ اسی مدرسہ میں مولانا مفتی محمودؒ بھی مولانا حامد میاں کے ہم سبق تھے۔ اس زمانہ سے دونوں بزرگوں میں گہرے مراسم چلے آرہے تھے۔ مولانا مرحوم مفتی صاحب کے علم و تقویٰ کے ساتھ ان کی سیاسی بصیرت سے نہایت متاثر تھے۔ مزید براں

مولانا مرحوم کے اپنے بقول وہ معرفت میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ وہ مولانا مدنیؒ کے خلیفۂ مجاز بھی تھے۔ اپنے دور کے اہل علم میں سے مولانا مرحوم حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کے بہت زیادہ معترف تھے۔ مفتی صاحبؒ کے انتقال کے بعد پاکستان میں ان کے صحیح جانشین کا حق درحقیقت مولانا سید حامد میاںؒ کو حاصل تھا لیکن چونکہ کسی نفسیاتی یا جسمانی عارضہ کی وجہ سے مولانا مرحوم جامعہ مدنیہ سے باہر تشریف لے جانے سے احتراز فرماتے تھے۔ اس لئے جمعیت علماء اسلام کے دوسرے گروپ کی جو مولانا فضل الرحمٰن خلف مفتی محمودؒ گروپ کہلاتا ہے سربراہی مولانا فضل الرحمٰن مدظلہ کو ملی جب کہ مولانا سید حامد میاںؒ کو اس گروپ کے روحِ رواں اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہ کے مشیر اعلیٰ اور مربی کا مقام حاصل تھا۔

مولانا حامد میاںؒ بڑے خلیق، منکسر المزاج اور وسیع القلب عالم دین تھے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و امیر تنظیم اسلامی سے مولانا مرحوم کے بڑے مشفقانہ اور مربیانہ تعلقات تھے۔ مرکزی انجمن کے مقاصد سے ان کے اتفاق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انجمن کے زیر اہتمام جتنی قرآن کانفرنسیں یا محاضرات قرآنی لاہور میں منعقد ہوئے، ان میں دو تین کے علاوہ ہر ایک کے لئے مولاناؒ نے اپنا ایک بیش قیمت عالمانہ مقالہ ضرور عنایت فرمایا لیکن چونکہ مولانا مرحوم جامعہ مدنیہ سے باہر خواہ کہیں تشریف نہیں لے جاتے تھے لہٰذا ان کا مقالہ ان کے صاحبزادے یا انجمن کے کوئی رکن پیش کیا کرتے تھے۔

محترم ڈاکٹر صاحب موصوف نے جب تنظیم اسلامی قائم کی اور اس کے تین سال کے عبوری دور کے لئے جو عارضی دستور مرتب کیا، اس کے بارے میں مولانا مرحوم سے مشورہ لیا۔ مولانا مرحوم نے اس کو نہ صرف پسند فرمایا بلکہ تنظیم کے حلقہ مستشارین میں شمولیت بھی منظور فرمائی۔ اگست ۷۷ء میں جب تنظیم اسلامی کی ہیئت اجتماعیہ کے لئے 'بیعت' کا اختیار کیا گیا تو کچھ عرصہ تک اس کا چرچا عام نہیں ہوا لیکن جب عام ہوا تو جون ۸۲ء میں بیعت کے خلاف لاہور کے اخبارات میں تین علماء کرام کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا جن میں مولانا سید حامد میاںؒ کا نام بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اس وقت بلتستان کے دعوتی دورے کے لئے پابرکاب تھے۔ اس لئے اتنا وقت نہیں تھا کہ ان تینوں علماء سے

ملاقات کر کے اس بیعت کی وضاحت کرتے جو تنظیم میں شمولیت کیلئے لے رہے تھے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب نے مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کی خدمت میں فوری طور پر حاضری دے کر ان کے سامنے اپنا مؤقف بیان کیا تو مولانا مرحوم کی حق پسندی نے اس کو تسلیم کر لیا اور اخبارات کے لئے ایک بیان جاری فرمایا جو میثاق کے شمارے میں شائع ہوا اور جو حسب ذیل ہے۔

توضیحی بیان مولانا سیّد حامد میاں

لاہور کے روزناموں کی اشاعت بابت ۷ رجون ۸۲ء میں جو بیان میرے اور دو قابلِ احترام علمائے کرام کے نام سے شائع ہوا ہے اس کے ضمن میں یہ وضاحت مطلوب ہے کہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی بیعت کسی سیاسی مقصد کے لئے نہیں بلکہ ان ہی دینی مقاصد کے لئے ہے جو احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سلف صالح سے ماثور و منقول ہیں۔ جیسے جہاد فی سبیل اللہ یعنی اللہ کے دین کی نصرت و اقامت کے لئے اجتماعی سعی و جہد کے لئے بیعت۔ سلف سے بعض دوسری بیعتیں بھی ثابت ہیں جیسے حضرت جریر ابن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ اور ہر مسلمان کے ساتھ نصح و خیر خواہی پر بیعت کی۔ چونکہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تنظیمِ اسلامی میں شامل ہونے والے حضرات سے جو بیعت لے رہے ہیں وہ اسی نوعیت کی ہے لہٰذا اس پر شرعی حیثیت سے کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ نفاذ حدودِ شرعیہ کے ضمن میں بھی میں نے ڈاکٹر صاحب سے وضاحت طلب کی ہے اور اُن کی وضاحت سے میرا اطمینان ہو گیا ہے۔ یہ وضاحت خود ڈاکٹر صاحب پریس کے حوالے کر دیں گے۔

سیّد حامد میاں

۸ رجون ۸۲ء (میثاق جولائی ۸۲ء)

اس بیان میں نفاذِ حدودِ شریعت کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب کی جس رائے کا تذکرہ ہے تو اس پر بھی بعض علمائے کرام کی طرف سے اخباری بیانات کے اعتراضات اٹھائے گئے تھے اس کے ضمن میں محترم ڈاکٹر صاحب نے جو بیان اخبارات کو جاری کیا تھا وہ بھی میثاق کے کی شمارے میں شامل تھا جو بہو حسب ذیل ہے

".... اس عرصہ میں خود ڈاکٹر صاحب ایک دن تشریف لے آئے میں نے ان سے بھی بات کی کہ آپکی نیت اس بیعت میں جو آپ لیتے ہیں بیعت جہاد ہے یا کیا؟ کیونکہ اسکی صفات وہ ہیں جو بیعت جہاد کی ہوتی ہیں کہ کوئی کسی سے بھی بیعت ہو وہ آپ سے بھی بیعت کر لے وغیرہ تو انہوں نے کہا میری یہی نیت ہے۔ میں نے جو انکی بات کی تائید کی تھی تو اس وقت مذکورہ بات بھی پیش نظر تھی اور دوسرے وہ واقعات بھی کہ جن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف امور پر بیعت لی ہے اور بیعت جہاد وغیرہ میں مفضول نے افضل سے بیعت لی ہو اسکا ثبوت بھی ہے لاہور ہی میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری سے خود بیعت ہو جانے کے لئے فرمایا اور شاید بیعت بھی ہوتے اور بڑے بڑے لوگ بیعت ہوتے اسی لئے انہیں امیر شریعت کہا جانے لگا۔ یہ بیعت بیعتِ جہاد ہی کی نیت سے تھی چاہے کلمات میں صراحت نہ ہوئی ہو جس کی وجہ حالات تھے۔ اور حکومت کا تسلط ورنہ مولانا انور شاہ صاحب اور بزرگ سے بیعت تھے، صوفیائے کرام کی بیعت اور اسکی اقسام کی بحث تو "القول الجمیل" میں ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نہ کسی سے مرید ہیں نہ مجاز اس لئے وہ یہ بیعت تو نہیں لیتے وہ جو بیعت لیتے ہیں وہ اور قسم کی ہے اور بے ثبوت یعنی بلا دلیل شرعی بھی نہیں کیونکہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت عقبہ بھی لی ہے اس میں اس وقت کے مطابق کلمات تھے۔

امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے جلد دوم میں مختلف قسم کی بیعتیں استنباط کی ہیں۔

(۱) البیعۃ علی السمع والطاعۃ (۲) البیعۃ علی ان لا ننازع الامر اھلہ
(۳) البیعۃ علی القول بالحق (۴) البیعۃ علی القول بالعدل
(۵) البیعۃ علی الاثرۃ (۶) البیعۃ علی النصح لکل مسلم (۷) البیعۃ علی

ان لا نفر (۸) البیعۃ علی الموت (۹) البیعۃ علی الجہاد

(۱۰) البیعۃ علی الھجرۃ نسائی ج م کتاب البیعۃ

غرض ڈاکٹر صاحب کی بیعت یا تو بقول ان کے بیعت جہاد ہی ہے یا اس

قسم کی بیعتوں میں سے کسی قسم کی ہے ......"

(تحریر ۱۷ ؍ دسمبر ۸۲ء)

مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کی وفات اہل پاکستان کے لئے صدمۂ عظیم ہے ہی لیکن ڈاکٹر صاحب کے لئے تو ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ چونکہ علمائے دیوبند میں سے جس عالم دین کی ڈاکٹر صاحب اور ان کی دعوت کو سب سے زیادہ تائید اور سرپرستی حاصل تھی وہ مولانا مرحوم کی شخصیت تھی۔ اس اعتبار سے مولانا مرحوم کے انتقال پر ڈاکٹر صاحب کو انتہائی ذاتی صدمہ ہے۔

مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ کی شخصیت پر اسی شمارے میں محترم جناب قاری سعید الرحمٰن علوی کا مضمون بھی شاملِ اشاعت ہے۔ جس کے مطالعہ سے ان شاء اللہ مولانا کی شخصیت کے بہت سے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے۔ ہم اپنی گذارشات کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنۃ وحاسبہ حساباً یسیراً ۔ آمین یا ربّ العلمین۔

★★★★★

ان شاءَ اللہُ العزیز

مئی ۱۹۸۸ء

کے میثاق کا شمارہ **رمضان نمبر** ہوگا

★★★★★★

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ
رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ
بِیَدِهٖ اُوْدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ
ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی
ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ
(متفق علیہ)
آنحضرت ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے میں پسند کرتا ہوں کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔

جمیل الرحمٰن

قافلۂ تنظیم منزل بہ منزل

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدَانَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَا اَنْ ھَدَانَا اللّٰہُ ط

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ مبین میں یہ ضابطہ بیان فرمایا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط۔ " اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں خود اپنے آپ کو۔" مولانا حالی مرحوم نے اس آیت کی ترجمانی شعر میں اس طرح کی ہے ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

علامہ اقبال مرحوم اپنے دور کے نابغہ روزگار شخصیت تھے انہوں نے اس اصول کی تعبیر یوں کی ہے کہ:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

جلال الدین اکبر کے ہاتھوں برِعظیم پاک و ہند میں ملّی سطح پر جو بگاڑ شروع ہوا تھا۔ اس کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مردِ حق شیخ احمد سرہندی کو مجدد و مصلح بنا کر کھڑا کیا اس لئے کہ الصادق و المصدوق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قولِ مبارک جس کو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام بخاری اور امام مسلم رحمھما اللہ نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے کہ: لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ بِاَمْرِ اللّٰہِ " میری امت میں سے ایک گروہ (ہمیشہ) اللہ کے امر کے ساتھ قائم رہے گا۔" کوئی دور ایسا نہیں ہوگا کہ جس میں علمائے حق و ربّانی کا ایک گروہ ایسا موجود نہ ہو جو خود بھی دینِ حق پر قائم رہے اور خواص و عوام کو بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مطابق حق کی نصیحت و وصیت کرتا رہے جس کے راوی ہیں حضرت ابی رقیہ تمیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ، قِیْلَ مَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ (ترجمہ) " دین تو بس وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے"۔ صحابہؓ نے پوچھا "حضورؐ! کس کی؟" آپؐ نے فرمایا " اللہ کی، اس کی کتاب

کی، اس کے رسولؐ کی اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور عوام سب کی"۔

چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ عالم اسلام میں ہر دور میں ایسے علمائے حق اٹھتے رہے جو اس فریضہ نصیحت کو ادا کرتے رہے۔ لیکن دورِ تبع تابعین کے مشہور عالم، محدث، فقیہ اور حالات کے صحیح نبض شناس حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ کے اس حد درجہ قولِ حق کے مطابق کہ:

وَمَا افسد الدین الا الملوک وَاحبار سوء وَرھبانھا۔

جس کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں بگاڑ پیدا کرنے میں تین عناصر برابر کے شریک ہوتے ہیں:۔ ایک بادشاہ، دوسرے علمائے سوء اور تیسرے نام نہاد صوفی"۔ اسی تگڈم کے گٹھ جوڑ سے اکبر کا "دین الٰہی" ایجاد ہوا۔ اور برعظیم پاک و ہند میں اسلام کا مستقبل شدید ترین خطرے میں پڑ گیا۔ چنانچہ اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے اپنے ایسے بندوں کو کھڑا کر دیا جنھوں نے مردانہ وار اس بے دینی، بے اعتقادی، بدعملی اور فساد کا مقابلہ کیا جن کے سرخیل تھے مجدد الف ثانی حضرت احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل صحیح کہا ہے کہ:

دو ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں　　اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

حضرت مجدد الف ثانیؒ (ہزارویں برس کے مجدد) نے جہاں اکبر کے 'دین الٰہی' کا قلع قمع کیا وہاں نام نہاد اور جاہل صوفیاء کے ذریعہ جو مشرکانہ و مبتدعانہ نظریات و افعال راہ پا گئے تھے، اُن کے آگے توحیدِ خالص کا بند باندھا ۔ حضرت مجدد کے حلقۂ ارادت میں جہاں مخلص علمائے کرام شامل تھے، وہاں حکومتِ وقت کے بہت سے مخلص متوسلین بھی موجود تھے لہٰذا 'دینِ اکبری' درگور ہو گیا۔

لگ بھگ یہی دور ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ایک اور شخصیت کھڑی فرما دی تھی یعنی مولانا عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ جنہوں نے اپنے چند مخلص رفقاء کے تعاون سے برعظیم کے اہلِ علم کی دلچسپیوں کے رُخ کو فقہ کے ساتھ احادیثِ شریفہ کی طرف بھی موڑ دیا۔ ان اللہ کے بندوں کی قربانیوں اور جدوجہد کا نتیجہ محی الدین اورنگ زیب عالمگیر جیسے نیک و صالح بادشاہ کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن عالمگیر کی وفات کے بعد جہاں ایک طرف ملک میں طوائف الملوکی نے جنم لیا اور عظیم مغل سلطنت حصوں بخروں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی، وہاں دوسری طرف علماء کی اکثریت غیر ضروری، لاحاصل اور گمراہ کن منطقی بحثوں میں الجھ گئی اور چند فروعی مسائل فرقہ واریت کے لئے بنیادیں فراہم ہو گئیں۔ جس کی وجہ سے برعظیم میں امت کی وحدت پارہ پارہ

ہونی شروع ہوئی۔

یہی وقت تھا کہ برعظیم پاک وہند میں مسلمانوں کے سامنے دین کی اصل حقیقت کو واضح کرنے اور امت کو ایمان کے حقیقی منبع و سرچشمہ یعنی قرآن مجید کی طرف رجوع و التفات پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسی نابغہ روزگار شخصیت کو اٹھایا — جن کے متعلق محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ "تابعین و تبع تابعین کے دورِ سعید کے بعد ایسی جامع شخصیت پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور حضرت شاہ صاحب درحقیقت دورِ جدید کے فاتح ہیں۔" حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک طرف "اصولِ تفسیر قرآن" پر ایک مختصر لیکن نہایت جامع کتاب تحریر فرمائی — اس سے قبل اس موضوع پر شاید ہی کوئی تصنیف موجود ہو۔ دوسری طرف شاہ صاحبؒ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا جو اس وقت نہ صرف سرکاری زبان تھی بلکہ اہلِ علم و دانش کی بھی یہی زبان تھی۔ اور اس دور میں ہماری دینی کتب یعنی احادیث کے بعض مجموعوں اور فقہ پر اصولی کتابوں کے ترجمے بھی فارسی زبان میں تھے۔ برعظیم میں بسنے والی امتِ مسلمہ دین اور ایمان و یقین کے اس منبع و سرچشمہ سے فیض یاب ہو سکے۔ جو ابد الآباد تک کے لئے ھدیً للناس ہے۔ لیکن اس وقت کے علماء کی اکثریت کا حال یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کے کسی غیر عربی ترجمے کو کفر کے مترادف سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ بعض "نادان و جذباتی" علماء نے حضرت شاہ صاحب کی تکفیر کا فتویٰ بھی دے دیا جس کے نتیجے میں جہلاء کے ایک گروہ نے شاہ صاحب کو شہید کرنے کا باقاعدہ اقدام بھی کیا۔ وہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے سے کام لینا تھا لہٰذا وہ اس سازش سے محفوظ رہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ صاحب کو بڑی بصیرت عطا فرمائی تھی۔ اسی عطائے الٰہی کا یہ ظہور تھا کہ شاہ صاحب پر یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ جنوب مشرق میں خالص ہندوازم کی جو تحریک شیوا جی نے شروع کی تھی جس کے نتیجہ میں مرہٹہ قوم ایک نہایت قوی عسکری طاقت کے طور پر ابھر چکی تھی، جس کے عزائم یہ تھے کہ مغل سلطنت کے مرکز کی کمزوری اور مسلمانوں کی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر مرکز سمیت ہندوستان سے ہر مسلم ریاست کا قلع قمع کر دیا جائے بلکہ ہسپانیہ کی طرح مسلمانوں کو یا تہ تیغ کر دیا جائے یا ہندوستان سے باہر دھکیل دیا جائے — اس وقت زبوں حالی اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ پورے ہندوستان

میں کوئی مسلم ریاست ایسی نہیں تھی جو مراٹھوں کی اس عسکری یلغار کو روک سکتی۔ چنانچہ مراٹھے پونا (مہاراشٹر کے صدر مقام) سے آندھی طوفان کی طرح راہ کی ہر مسلم ریاست کو روندتے ہوئے نام نہاد مغل حکومت کے دارالحکومت دہلی تک پہنچ رہے تھے اور بظاہر احوال یہ نظر آرہا تھا کہ دہلی کا بھی وہ حشر ہونے والا ہے جو ماضی میں بغداد، اصفہان، شیراز اور قرطبہ غرناطہ وغیرہ کا ہو چکا تھا۔

یہ شاہ صاحب رحمہ اللہ ہی تھے کہ انہوں نے افغانستان کے حکمران احمد شاہ ابدالی کو نہایت درد بھرا خط ارسال کیا اور اس کی غیرت وحمیتِ دینی کو جگایا کہ ہند میں مسلمانوں کی کشتی کو بالکلیہ ڈوبنے سے بچاؤ۔ اور اللہ کے یہاں اپنا اجر محفوظ کر لو۔ احمد شاہ ابدالی اپنے سرفروشوں کے لشکر کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے کرتا ہوا پانی پت پہنچا جہاں مراٹھوں کے ساتھ جن کی تعداد افغان فوج کے مقابلے میں کئی گنا تھی وہ معرکہ پیش آیا جو تاریخ میں "پانی پت کی تیسری جنگ" کے عنوان سے محفوظ ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں احمد شاہ ابدالی کے جان نثاروں کے ہاتھوں، جو شوقِ شہادت لے کر مراٹھوں کی عظیم عسکری قوت سے ٹکرانے آئے تھے، مراٹھوں کی یہ قوت پارہ پارہ ہوگئی اور وہ ایسی زبردست شکست و ہزیمت سے دوچار ہوئے کہ ان کی دہشت ختم ہوگئی۔

شاہ صاحبؒ کی دور رس نگاہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ مغربی اقوام جن میں انگریز پیش پیش تھے، ہندوستان میں تجارت کی غرض سے جہانگیر کے دور میں آئی تھیں اور انہوں نے ملک کی مشہور بندرگاہوں پر نہ صرف اپنی تجارتی کوٹھیاں تعمیر کر رکھی تھیں بلکہ ان کی حفاظت کے بہانے قلعے تک تعمیر کر لئے تھے۔ جن میں جدید اسلحہ سے لیس فوجیں بھی جمع ہو رہی تھیں اس وقت بنگال کے حکمران سراج الدولہ شہیدؒ نے انگریز کے عزائم کو بھانپ کر ان کو بنگال سے بے دخل کرنے کے لئے فوجی اقدامات شروع کئے جس کے نتیجے میں ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی ہوئی جس میں انگریزوں کو زبردست فتح حاصل ہوئی۔ انگریز بڑی عیاری دکھا دی اور تدریج سے اپنے پنجۂ استبداد میں ہندوستان کو جکڑ رہا تھا۔ اس کا سامراجی عفریت ایک ایک کر کے مسلم وغیر مسلم، آزاد و خود مختار ریاستوں کو نگلتا ہوا مغل سلطنت کے گرد گھیرا تنگ کرتا چلا آرہا تھا۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی امتِ مسلمہ جس خوابِ غفلت میں مدہوش اور جس دینی و اخلاقی زوال سے دوچار ہیں، اس سے

ڈانے کے لئے اللہ تعالٰی کی طرف سے پے درپے تنبیہِ عذاب کے کوڑے برس رہے
ہیں لیکن ملت؛ خاص پر عمائدین و اکابر کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔ شاہ صاحبؒ کو یہ
بھی اندازہ تھا کہ مغربی اقوام کا صرف عسکری تسلط ہی نہیں ہوگا بلکہ اس کے ساتھ ہی غیر اسلامی
تہذیب ملت کے اذہان قلوب کو مسموم کر دے گا۔ شاہ صاحبؒ نے متعدد کتابیں تصنیف
فرمائیں۔ اور مسلم قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ یہ اٹھارویں صدی کا دور ہے؛ اس میں
شاہ صاحب اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ جس معاشرے اور جس نظام میں تقسیم دولت
کی یہ صورتِ حال ہو کہ جاگیردار، منصب دار، اور زمیندار کے پاس دولت کا ارتکاز ہوتا
چلا جائے اور عوام الناس کو صرف ڈھور ڈنگر سمجھ کر انہیں لڈ وبل کے مقام تک گرا دیا جائے
وہ معاشرہ اور وہ نظام باقی نہیں رہ سکے گا۔ بالآخر وہ زوال سے دوچار ہو کر رہے گا ——
برِّعظیم پاک و ہند میں یہ ہو کر رہا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے برِّعظیم میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے جو پودا لگایا تھا وہ
ملت کے اجتماعی گناہوں کے سبب پوری طرح بار آور تو نہ ہو سکا لیکن کچھ نہ کچھ برگ و بار لاتا رہا
اور راقم تو یہاں تک عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہے کہ برِّعظیم پاک و ہند میں صحیح نہج پر قال اللّٰہ
و قال الرسول کا جو چرچا ہے اور بڑے بڑے عظیم دارالعلوم قائم ہیں ان سب کے فکر کا منبع "فکرِ
ولی اللّٰہی" ہی ہے۔ شاہ صاحبؒ کے فرزندوں میں سے تین وہ جلیل القدر رجالِ دین ہیں
کہ جن کی مساعیٔ جلیلہ کے بارِ احسان سے برِّعظیم کی ملت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ شاہ عبد القادرؒ
اور شاہ رفیع الدینؒ وہ بزرگ ہیں جن میں سے ایک نے اس وقت کی مروّجہ اردو زبان میں قرآن مجید
کا لفظی ترجمہ اور دوسرے نے بامحاورہ ترجمہ کیا۔ اور اس پر مختصر حواشی بھی تحریر کئے۔ آج اردو زبان
میں جتنی بھی مستند تفاسیر متبادر و متعارف ہیں ان سب کا مآخذ یہی دو اوّلین ترجمے ہیں۔ دورِ حاضر
کا کوئی مفسر یہ دعوٰی نہیں کر سکتا کہ اس نے ان ترجموں سے استفادہ نہیں کیا —— شاہ صاحب
کے تیسرے جلیل القدر فرزند شاہ عبد العزیز رحمہ اللہ ہیں جن کے مدرسے اور جن کی تربیت کے نتیجہ
میں ہندوستان کے مجاہدِ کبیر سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دستِ راست شاہ اسمٰعیل
شہید رحمۃ اللہ علیہ تیار ہوئے۔ بلکہ جب سید صاحب اور شاہ صاحب رحمہما اللہ نے سکھوں کے
خلاف جہاد و قتال کا فیصلہ کیا جو پورے پنجاب اور سرحد پر قابض تھے۔ جن کے ہاتھوں
مسلمانوں کی نہ جان و مال اور آبرو محفوظ تھی اور نہ دین اور شعارِ دین۔ ان سکھوں کے مظالم اور

جور و ستم سے وہی بے غیرت و بے حمیّت " نام نہاد مسلمان " محفوظ تھے۔ جنہوں نے ان کی غلامی کا طوق خوشی خوشی اپنے گلوں میں ڈال لیا تھا۔ اس 'سکھا شاہی' میں لاہور کی شاہی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ اس کے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر قرآن مجید کے نسخے بچھ دیئے گئے کہ خالصہ اس پر پاؤں رکھ کر اوپر پہنچتا تھا۔ چنانچہ حضرت سید شہیدؒ نے ان سکھوں سے جہاد و قتال کرنے کے لئے مجاہدین کا جو لشکر تیار کیا' اس میں اکثریت انہی لوگوں کی تھی جو حضرت شاہ ولی اللہؒ' ان کے صاحبزادوں رحمہم اللہ اور ان کے متعدد تربیت یافتہ علمائے ربانی کے زیر تعلیم و تربیت رہے تھے۔ سید شہیدؒ کا منصوبہ یہ تھا کہ سکھوں سے نمٹ کر پنجاب اور سرحد کو مرکز بنا کر مغربی اقوام خاص طور پر انگریزوں کے خلاف جہاد و قتال کیا جائے جس کا نتیجہ مغل سلطنت کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے اور ہندوستان کی آزادی و خود مختاری کو ہڑپ کرنے کے لئے بالکل آزاد تھا۔ لیکن برعظیم کی ملتِ اسلامیہ' برعظیم کی اکثریت دینی و اخلاقی لحاظ سے اس حد تک گر چکی تھی کہ انہوں ہی نے ان مجاہدین کی سکھوں کے لئے جاسوسی کی۔ سکھوں نے مل کر ان پر شب خون مارے۔ بالآخر انہوں ہی کی غداری کے باعث سید احمد بریلویؒ' شاہ اسمٰعیلؒ ان کے بے شمار انصار و اعوان شہید ہوئے اور ان شہداء کے مقدس خون سے بالاکوٹ کی زمین اور دریائے نہار کا پانی لالہ زار ہوا۔

بظاہر شہیدین کی تحریک ناکام ہوئی لیکن ان شہداء کرام کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مقام اور مرتبہ ہے اس سے ہر وہ شخص کسی نہ کسی درجے میں واقف ہے جو دین سے تعلق و شغف رکھتا بلکہ راقم تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہے کہ شہید کے ارفع و اعلیٰ رتبہ سے ہمارے عوام الناس تک بخوبی آشنا ہیں جس کا ثبوت ۵۳ء کی انٹی قادیانی تحریک' ۶۵ء کی بھارت کی یلغار اور ۷۷ء کی تحریک نفاذ نظام مصطفےٰ ہے جس میں ہمارے عوام ہی نے صرف شہادت کے ذوق و شوق میں سینہ تان کر گولیاں کھائی ہیں ــــ بہر حال راقم عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ اس کے نقطۂ نظر سے دنیوی اعتبار سے بھی ناکامی نہیں ہوئی۔ ان شہداء کے مقدس خون کی آبیاری اور ان کی ہڈیوں کی کھاد سے غنچے کھلتے رہے۔ اسی تحریک شہداء کے باقیات الصالحات تھے جن کی مساعی کے نتیجے میں ۱۸۵۷ء میں 'جنگ آزادئ وطن' برپا ہوئی۔ اس جنگ میں پیش پیش اکثریت ان علمائے حق کی تھی جو شاہ ولی اللہؒ کے فکر کے مویدین و تربیت یافتہ اور تحریک شہیدین کے وابستگان میں سے تھے۔ اس جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب بیان کئے جائیں تو گفتگو

پہلے ہی اندازے سے زیادہ طویل ہو رہی ہے مزید طوالت اختیار کرلے گی۔ اس کے لئے حفیظ
جالندھری کا یہ شعر راقم کے خیال میں کفایت کرے گا کہ ؎

دیکھا جو چوٹ کھا کے کمیں گاہ کی طرف — اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

اس جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد مغل حکومت کا آخری ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل
ہو گیا۔ اور ہندوستان براہِ راست تاجِ برطانیہ کی غلامی میں چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں چونکہ
علمائے حق پیش پیش رہے تھے لہٰذا انگریزی حکومت کے ظلم و ستم کا سب سے زیادہ نشانہ وہ بنے۔
بے شمار علمائے حق کو دار پر چڑھا دیا، متعدد علماءِ عظام کو عمر قید کی سزا دے کر کالا پانی یعنی جزائر انڈمان
جلاوطن کر دیا گیا۔

ہندوؤں کی عظیم اکثریت پر انگریز کے تسلط سے کوئی خاص پریشانی طاری نہیں تھی۔ بلکہ ان کے فہیم و
ذہین عناصر حکومت کی اس تبدیلی پر شاداں تھے۔ وہ بھانپ گئے تھے کہ انگریز جب بھی ہندوستان
سے بوریا بستر گول کرے گا تو چونکہ حریت پسندی کا جو دور شروع ہو چکا ہے اس کے پیش نظر اس کا امکان
نظر نہیں آتا کہ انگریز کی غلامی صدیوں پر محیط ہو، پھر چونکہ انگریز کا مزاج "جمہوریت پسند" بن چکا ہے۔
لہٰذا ہندوستان کی حکومت اکثریت ہی کے ہاتھ میں آئے گی اور مسلمان جو اقلیت میں ہونے کے باوجود قریباً
آٹھ سو سال مسندِ حکومت پر متمکن رہے ہیں وہ جمہوری ہندوستان میں ہندو اکثریت کے دست نگر
بن کر رہیں گے۔ چنانچہ انہوں نے بڑھ چڑھ کر انگریز کی وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ اعلیٰ پیمانے پر انگریزی
علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی اور انگریز کی حکومت کے زیرِ سایہ بیوروکریسی پر چھا گئے اور ان کو "نیم حکمرانوں"
کی سی حیثیت حاصل ہو گئی ــــ

ہندو کی اس ذہنیت کو جن مسلم اکابر نے بھانپا ان میں اہم ترین مقام تو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال
کو حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنی اسلامی و ملی شاعری کے ذریعہ سے مسلم خوابیدہ کو غفلت سے بیدار
کرنے کے لئے حدی خوانی کی اور بانگِ درا دی کہ

؎ کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے — وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اور ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

علمائے کرام کے طبقے میں سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ تھے۔ جو ایک طرف

استخلاصِ وطن کے لئے عملاً کوشاں تھے تو دوسری طرف ہندوستان میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے بھی مضطرب و مضطر تھے۔ اسی دور میں ایک نوجوان کے دل میں قرآن حکیم کی عظمت اس کی تبلیغ و دعوت اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بڑی شدت سے پیدا ہوا۔ اللہ نے اس کی تحریر اور تقریر دونوں میں جادو کی سی تاثیر رکھی تھی۔ وہ اگرچہ سکہ بند عالم دین نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو بڑا ذہن رسا ملا تھا۔ اس نوجوان نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے سے اعلائے کلمۃ اللہ کی پکار بلند کی اور مسلمانوں کو للکارا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل اس سے وابستہ ہے کہ وہ قرآن کو امام بنا کر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مجتمع ہو جائیں اور ایک امیر یا امام کی زیر قیادت حکومتِ الٰہیہ کے قیام کے لئے منظم جدّ و جہد کریں۔ اس نابغۂ زمانہ نوجوان کا نام محی الدین احمد جو پوری دنیا میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے مشہور و معروف ہوئے۔ اس نوجوان کی صدا کی تاثیر اور اس کے طرزِ استدلال میں اتنی جان تھی کہ شیخ الشیوخ، استاذ الاساتذہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ جیسے عالمِ بے بدل اور اپنے دور کے یکے از مجدد نے اس نوجوان کو نہایت وسعتِ قلبی اور فراخ دلی سے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا کہ:

"اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اور وہ ہے قرآن اور جہاد۔"

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم نے نہایت معتبر حوالے سے روایت کیا ہے کہ ایک موقع پر چند علماءِ دیوبند نے نہایت احترام کے ساتھ شکایتاً حضرت شیخ الہندؒ سے عرض کیا "حضرت آپ اس نوجوان (یعنی مولانا ابوالکلام آزاد) ۔ جو نہ سکہ بند عالم تھے، نہ وضع قطع کے لحاظ سے "مولوی" تھے) کی بڑی پاسداری کرتے ہیں، بڑا لحاظ رکھتے ہیں تو حضرت نے برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقۂ زہّاد سے اٹھا نہ کوئی! کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے قلب و نظر میں مولانا آزاد مرحوم کی دعوت رجوع الی القرآن اور دعوتِ جہاد کے باعث کتنی وقعت و منزلت تھی۔[1]

شیخ الہندؒ کو ۱۹۱۵ء میں انگریز حکومت نے حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا میں قید کیا۔ ۱۹۲۰ء میں حضرتؒ کو اسارتِ مالٹا سے رہائی ملی۔ ان کے بقول وہ یہ عزم لے کر ہندوستان تشریف

باقی صفحہ ۱۱۷ پر

---

[1] یہ واقعات محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی تازہ ترین تالیف "جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی" میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

تنظیم اسلامی

کے تاسیسی اجتماع (۲۷ تا ۲۸ مارچ ۷۵ء) کی روداد کی تلخیص

۲۷ مارچ ۷۵ء کو نماز عصر کے بعد تنظیم اسلامی کی تاسیس کے لیے طلب کردہ
جتماع کی پہلی نشست میں ۱۰۳ حضرات نے شرکت کی۔ جن میں لاہور، کراچی، سکھر،
ہاول پور، ساہیوال، لائل پور (حال فیصل آباد) شیخوپورہ، گوجرانوالہ اور واہ کے
قامات کے اصحاب شامل تھے۔
اس اجتماع کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے خطبہ مسنونہ اور ادعیہ ماثورہ سے
س تاسیسی اجتماع کا افتتاح کیا۔

افتتاحی خطاب کی تلخیص

"شرکائے گرامی! قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب کے ایک سے زائد بار مطالعہ سے
ارے سامنے اپنے دینی فرائض کا شعور اور دین کا ہمہ گیر تصور واضح ہو چکا ہے اور ہم
اس پر پورا انشراح صدر حاصل ہو چکا ہے کہ اقامت و اظہار دین کی منظم جدوجہد
ر مسلمان پر فرض عین کا درجہ رکھتی ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق
صحیح بنیادوں میں یہ اہم بنیاد ہے کہ ہم اعلائے کلمۃ اللہ فرض کی ادائیگی میں
ت کی اس سنت کا اتباع کریں جو سب سے زیادہ مستند سنت ہے۔ یعنی دعوت و
بلیغ دین اور اس کی اقامت و غلبہ کے لیے جان و مال سے مجاہدہ۔"

ایک بندۂ مسلم کا فرض

"ایک بندۂ مومن کا کام یہ ہے کہ اپنا سب کچھ راہِ حق
میں لا کر ڈال دے، اپنی قوت و صلاحیت اپنی توانائیاں
اپنا مال اور اپنی جان اس کام کے لیے وقف کر دے۔ اس میں کھپا دے تو جیسا

کہ کہا گیا ہے کہ السعی منا والاتمام من اللہ "کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے کسی کام کی تکمیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کا اتمام و تکمیل کو پہنچنا سراسر اللہ کے اذن اور اُس کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ اور اللہ کا اِذن اور فیصلہ اس کی حکمت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے ایک اجل معیّن کر رکھی ہے ہم نہیں جانتے کہ اس نے اپنے دین کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے غلبہ و اظہار کے دورِ ثانی کے لیے کون سا وقت مقرر فرمایا ہُوا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ دینِ حق کے بالفعل قائم اور نافذ ہونے تک ابھی اللہ تعالیٰ کتنے قافلوں کو اُٹھائے، جو کچھ دُور تک چلیں، چند کٹھن منازل طے کریں، اور پھر تھک ہار کر رہ جائیں۔ پھر کوئی دوسرا قافلہ ایک عزمِ نو کے ساتھ مترتّب ہو اور آگے بڑھے اور اس جدوجہد کو کسی خاص حد تک لے جائے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ہم یہ جان گئے ہیں اور یہ جان لینا ہی ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم مسئول ہیں عزمِ مصمم کرنے پر، اور ہم مسئول ہیں سعی و جہد پر، ہم مسئول ہیں اپنی سی کر گزرنے پر۔ اس راہ کے کسی ایک مرحلے کی تکمیل بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔"

پُر صعوبت کام

"یہ راہ جس پر گامزن ہونے کے لیے ہم ایک جذبۂ صادق اور عزمِ صمیم کے ساتھ ایک قافلہ کی شکل اختیار کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، بڑی کٹھن اور پُر صعوبت راہ ہے۔ اور اس پر چلنے کے لیے

ع "چیتے کا جگر چاہیے اور شاہین کا تجسس"

اور بفحوائے آیہ قرآنی" ان ذالك من عزم الامور" بے شک یہ بہت ہی ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

بشارت

"لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بشارت اور خوشخبری بھی پیشِ نظر رکھیے کہ ہمارے ربّ نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے کہ " والذین جٰھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" اور جو لوگ ہماری راہ میں لگیں گے، کھپیں گے، جدوجہد کریں گے ان کو ہم یقیناً اپنے راستوں کی ہدایت دیں گے"، مزید برآں یہ کہ اس راہ میں کھپ جانے

والوں، اپنی جان کی توانائیاں لگانے والوں اور اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی کو صرف کرنے والوں کو اللہ اپنا "انصار" قرار دیتا ہے۔ ایک بندہ عاجز کے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کا رب، اس کا آقا و مالک اور اس کا خالق اسکو "انصاری" یعنی اپنا مددگار قرار دے۔ ذالك فضل الله يوتيه من يشاء"

فرائض کا مقام

"قرآن حکیم ہی سے یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ نوافل کا درجہ فرائض کے بعد ہے اور فرائض کا جو تصور ہمارے ہاں رائج ہو چکا ہے کہ نماز، حج اور زکوٰۃ ہی بس فرائض دینی ہیں تو دراصل یہ اسلام کے قانونی اور فقہی فرائض ہیں اور بلاشبہ صحیح اور حقیقی فرائض ہیں اور حدیث صحیحہ کی رُو سے یہ ارکان اسلام ہیں۔ اور ہر دور اور ہر مرحلے میں اُن کی بجا آوری فرض ہے۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہے کہ ان فرائض کے ضمن میں تمام تفصیلی احکام ہمارے ائمہ و فقہاء نے اس دور میں مدوّن کیے تھے کہ جب اسلام ایک غالب اور عالمگیر قوت کی حیثیت سے دنیا میں موجود تھا اور کرۂ ارضی کے ایک قابل ذکر حصہ میں شریعت اسلامی اور نظام قرآنی بالفعل قائم و نافذ تھا۔ اس غلبہ دینِ حق کے دور میں اقامتِ دین کی سعی و جدوجہد فرائض کی فہرست میں داخل نہیں تھی۔ اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے لیکن اس وقت جب کہ دین غالب نہ ہو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اور خاتم النبیین والمرسلین جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت نافذ نہ ہو ——— اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کا اصول ہمارے تمام دنیوی اُمور میں جاری و ساری نہ ہو۔ احکامِ خداوندی مسلم معاشرے میں پائمال کیے جا رہے ہوں اور سنت رسول کا استہزاء ہو رہا ہو تو اس وقت ان فرض عبادات کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ سب سے مقدم اور سب سے اہم فرض حق کو غالب کرنے کی سعی و جہد کرنا ہے۔ اس جدوجہد اور سعی و کوشش اور کشمکش کے ساتھ نماز ہے تو صحیح نماز ہے، روزہ ہے تو صحیح روزہ ہے، حج ہے تو صحیح حج ہے، زکوٰۃ ہے تو صحیح زکوٰۃ ہے۔ یہ ہے وہ گہرا احساسِ فرض جس نے انہیں آپکو پکارا ہے کہ مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ ــ؟"

ایمان کے رکن

"حاصل کلام یہ ہے کہ جب حق مغلوب ہو تو وہ شخص ہرگز حقیقی دین دار نہیں ہے جس کی توانائیاں دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہوں، چاہے وہ حلال وحرام کی قیود کی پوری پابندیوں کو ملحوظ رکھ کر ہی کمائی کر رہا ہو اور اس کمائی سے وہ حقوق اللہ اور حقوق العباد بھی ادا کر رہا ہو

میرے نزدیک از رُوئے قرآن حکیم جب حق غالب نہ ہو، ایک معاشرے میں اللہ کی شریعت نافذ نہ ہو، دنیوی تمام معاملات، احکام وہدایاتِ خداوندی اور سُنّتِ رسول وخلفاء راشدین مہدیین کے تابع نہ ہوں بلکہ سراسر اس کے خلاف ہوں تو ایک سچے اور حقیقی مسلمان کا اولین فرض بلکہ اس کی غیرت وحمیتِ دینی کا اولین تقاضا اظہار دین حق اور اعلائے کلمۃ الحق اور اَمر بالمعروف نہی عن المنکر کی جدوجہد ہے۔ اگر اوامر واحکام الٰہی کی خلاف ورزی اور پائمال ہونے پر اس کے خون اور اس کی غیرت وحمیتِ دینی میں جوش نہیں آتا۔ اگر نواہی کی ترویج اور پیروی اور سنت رسولؐ کے استہزاء کو دیکھ کر اس میں غم وغصّے کی حرارت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر طاغوتی اور باطل نظام کے بدلنے کے لیے اس میں کوئی داعیہ نہیں اُبھرتا۔ اگر پُرمعصیت ماحول میں اس کا دم نہیں گھُٹتا۔ اور اس پر چین وآرام حرام نہیں ہو جاتا بلکہ وہ اس ماحول میں پاؤں پھیلا کر اور مطمئن ہو کر سوتا رہتا ہے۔ دنیا کی کمائی یا انفرادی زہد وعبادت ہی کافی سمجھتا ہے تو ایسے شخص کو یہ حدیث قدسی پیش نظر رکھنی چاہیے جو ہر اُس مسلمان کو جس کے دل میں ذرے کے برابر بھی ایمان ہے لرزاں وترساں کرنے والی ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ فلاں فلاں بستیوں کو ان کے رہنے والوں سمیت اُلٹا دو" حضورؐ نے فرمایا کہ اس پر حضرت جبرئیل نے عرض کیا کہ پروردگار! ان میں تو تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے چشم زدن کی مدت بھی تیری معصیت میں بسر نہیں کی" آنحضورؐ نے فرمایا کہ "اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اُلٹ ڈالو انھیں پہلے اس

پر پھر دوسروں پر، اس لیے کہ اس کے چہرے کی رنگت کبھی
میری (غیرت اور حمیت) کی وجہ سے متغیر نہیں ہوئی۔"

تواصی بالحق اور اقامت و اظہار دین حق کی جدوجہد سعی کوشش اور کشمکش کے ساتھ دوسرے فرائض دینی کی ادائیگی بلاشبہ موجب اجروثواب ہے جو بلاشبہ ارکان اسلام ہیں۔ اس بات کو مزید سمجھنے کے لیے سورۂ حجرات کی یہ آیت اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ
لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (آیت ۱۵)

"بلاشبہ مومن تو بس وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر کسی شک اور ریب میں نہیں پڑے اور جنھوں نے جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں، پس یہی لوگ (اپنے دعوئ ایمان میں) سچے ہیں۔"

ہماری قوم کے مختلف تصوّرات دین

"ہم نے تنظیم اسلامی کے قیام کا عزم اس بنیاد پر کیا ہے کہ فی الواقع معاشرے میں خالص دین حق کی اقامت کے لیے کوئی ہیئت اجتماعیہ موجود نہیں ہے۔ فی الوقت صورت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے موجودہ مسلم معاشرہ میں اسلام کے نام سے بیسیوں دین چل رہے ہیں۔ یہاں عید میلاد النبیؐ کے جلسوں، جلوسوں، مولود شریف اور محفل میلاد کے نام سے مجلسوں کا بھی ایک دین موجود ہے۔ یہ بھی ایک مکمل دین ہے۔ اس کے اپنے عقائد و نظریات اور ایمانیات ہیں۔ اس عوامی دین میں ارکان دین کی پابندی ہی شاذ ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر ہی کیا! یہاں عرسوں اور سماع کی محفلوں اور قبور پرستی کا بھی ایک دین ہے۔ جس کے معتقدات اور ہیں۔ یہاں تعزیوں، مرثیوں، نوحہ گری، سینہ کوبی کا بھی دین موجود ہے۔ اس دین کے افکار اور عقائد اور ہیں۔ یہاں امام معصوم کے قائلین کا دین اور ہے۔ جس کے ماننے والوں کے ایک فریق امام غائب کے قائل ہیں اور ظہور کے منتظر

ہیں۔ اور ایک گروہ کا ام حاضر و موجود ہے۔ ان دینی تصورات کے حاملین کے نزدیک سود لینا اور دینا، اسمگلنگ میں ملوث ہونا، غلط حسابات رکھنا، حلال و حرام کی تمام قیود کو نظر انداز کر دینا ان کی دین داری میں قطعی کوئی خلل نہیں ڈالتا، بشرطیکہ وہ بعض دینی ظواہر کی پابندی بھی کرتے رہیں اور دینی مدرسوں کو چندہ بھی ادا کرتے رہیں۔ یہاں سیاسی جماعتوں کا دین اور ہے ان کے نظریات و تصورات اور اس کے نزدیک صدارتی نظام کی بجائے پارلیمانی نظام کی بحالی کی جد و جہد کرنا، بالغ رائے دہی کے اصول کو منوانے اور جمہوریت کے قیام کی کوشش کرنا عین خدمتِ اسلام ہے اور ان کے نزدیک مغرب کی لادین جمہوریت کے اصولوں اور طرز پر حزب اقتدار کے مقابلہ میں حزب اختلاف کو منظم کر لینا اور اربابِ اختیار کو اپنی تیز و تند تنقیدوں کا ہدف بنا نا ہی اعلائے کلمۃ اللہ اور افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جابر کے مصداق ہے۔ ملک کے رائے دہندگان کو اپنی پارٹی یا احزابِ اختلاف کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کرنا بحالی جمہوریت، شہری آزادیوں اور بنیادی حقوق کے مطالبات پیش کرنا مہنگائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے رہنا ہی ان کے نزدیک اقامتِ دین کی سعی و جہد کے مراحل میں شامل ہے۔ مبتدعانہ اور مشرکانہ نظریات و عقائد اور رسوم و افعال سے صرفِ نظر کرنا ان سے مداہنت برتنا بلکہ عوام الناس کی خوشنودی کے لیے ان کو سند جواز بخشنا اور ان کو اختیار کر لینا حکمت عملی ہے۔ یہاں صاحبِ اختیار و اقتدار اور حکام ریاست کا دین اور ہے۔ حکومت کی سطح پر چند تہوار منا لینا، قبروں پر چادر چڑھا دینا، مقابر و مزارات کی نگرانی کر لینا اور ان پر طلائی و نقرئی دروازے یا جالیاں نصب کرا دینا خاص خاص مواقع پر اسلام کی قصیدہ خوانی میں بیانات جاری کر دینا اپنے جلسوں جلوسوں میں اسلام زندہ باد کے نعرے لگوا دینا ان کے نزدیک بس اصل دین ہے۔ یہاں ملازم پیشہ مزدوروں اور کاشت کاروں کا دین اور ہے، دانش وروں کا جو مزدکی کے فلسفہ سے متاثر ہیں اور جن کے اذہان و افکار پر اشتراکیت کا تسلط ہے دین اور ہے۔ یہاں جو لوگ یونانی اور ویدک فلسفوں سے مرعوب ہیں ان کا تصوف

کے نام سے دین اور ہے۔ ہمارے اس معاشرے میں مُرجیئہ بھی موجود ہیں جو اس مخصوص نام سے تو متعارف نہیں، لیکن ہمارے سوادِ اعظم کا حال یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک مسلمان گھرانے ہی میں پیدا ہو جانا ——— حالانکہ اس پیدائش میں ان کے اپنے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ——— اور محض زبان سے ایمان کا اقرار کر لینا ہی نجات کے لیے کافی ہے۔"

بعد ازاں ڈاکٹر صاحب نے زیرِ تشکیل تنظیم اسلامی کی خصوصیات کے متعلق فرمایا۔

اہم خصوصیات

" ہماری اس تنظیم کی سب سے اہم اور سب سے عظیم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس " دعوت رجوع الی القرآن " پر قائم ہو رہی ہے۔ اس کا پہلا مرحلہ وہ تھا کہ جب قرآن حکیم کے ذریعہ دعوت و تبلیغ انذار و تبشیر، تذکیر و تزکیہ اور تطہیر افکار و اعمال کا کام انجام دیا گیا۔ لوگوں کے سامنے یہ بات واضح کی گئی کہ منبع ایمان اور سرچشمہ یقین قرآن حکیم ہی ہے۔ علم و حکمت کا خزینہ یہی اللہ کی آخری کتاب ہے۔ موعظۂ حسنہ بھی یہی اور ذکریٰ بھی یہی کتاب اللہ ہے۔ شفاء للنّاس بھی یہی ہے اور دلوں میں حقیقی یقین بھی اس سے پیدا ہوگا۔ تربیت اس سے ہو گی، تعلیم اس سے حاصل ہو گی۔ قلوب میں ایمان کی شمع اس سے فروزاں رہے گی۔ عمل کا داعیہ اسی کی دعوت و تبلیغ سے بیدار ہو گا دنیوی فوز و فلاح اور اُخروی نجات کا ذریعہ بھی یہی کتاب اللہ ہے۔ مزید برآں ہمارے نزدیک قرآن حکیم وحی متلو ہے اور حدیث شریف وحی غیر متلو۔ احادیث صحیح، قرآن مجید سے کوئی جدا چیز نہیں بلکہ وہ قرآن حکیم کی تشریح و تبیین ہیں۔ لہٰذا ہمارا ایمان ہے کہ کتاب و سنت ایک وحدت ہیں۔"

اساسی طریق کار

"اس اساسی خصوصیت سے ایک بات یہ واضح ہو جاتی ہے کہ یہ خصوصیت ہماری دعوت کو دوسری تمام دینی تحریکوں اور دعوتوں سے ممتاز کرنے والی چیز ہے ــ ان شاء اللہ العزیز ہماری تنظیم کا اوڑھنا بچھونا اللہ کی کتاب ہی رہے گی۔ یہی قرآن حکیم ہمارا مرکز و محور ہو گا۔ ہماری ساری جدّ و جہد میں رہنمائی

کا مقام اسی ھدیً للناس کو حاصل رہے گا۔ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مشعلِ راہ ہوگی۔

لیکن یہ بات پیشِ نظر رہنی ضروری ہے کہ یہ اساسی طریق کار ہے۔ دعوت و تبلیغ، اور تزکیہ و تربیت کے لحاظ سے تو قرآن حکیم ہی سب کچھ ہے، لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ دعوت و تبلیغ اور تربیت کے ساتھ تنظیم کا مرحلہ آتا ہے۔ تنظیم کے بعد جہاد کے مراحل شروع ہوتے ہیں۔ ان مراحل میں مدافعت (PASSIVE RESISTANCE) بھی ہے۔ اور اقدام (ACTIVE RESISTANE) بھی ہے۔ اسی میں ہجرت کا مرحلہ بھی آتا ہے جس کا احادیث صحیحہ کی رُو سے ہر اس چیز کو چھوڑ دینا اور ترک کر دینا مراد ہے۔ جو دینِ حق کے مطابق زندگی بسر کرنے میں حارج و مانع ہو۔ چاہے وہ وطن ہو، عزیز و اقارب ہوں، چاہے وہ جاہ و حشمت اور مال و منال ہو۔ قتال اس راہ کی بلند ترین منزل ہے جس میں احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے نقدِ جاں کی نذرگزارنی ہوتی ہے اور یہی معراجِ مومن ہے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

یہ تمام مراحل وہ ہیں جن کے لیے ایک منظم جماعت کی ضرورت ناگزیر ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"انا امرکم بخمس، بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ۔"

لہٰذا تیسری خصوصیت کے طور پر یہ فرمانِ نبوی ہماری تنظیم کی تشکیل میں ہمیشہ پیشِ نظر رہے گا۔"

ہماری ذمّہ داری

"مجھے احساس ہے کہ تنظیم اسلامی کے قیام کا عزم کر کے ایک بہت بڑی ذمّہ داری کا بوجھ میں نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھایا ہے" "من آنم کہ من دانم" حقیقت یہ ہے کہ اگر محاسبۂ اخروی کا شدید احساس نہ ہوتا تو میں یہ ذمّہ داری اٹھانے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہوتا۔ ادائیگی فرض کے احساس ہی نے دراصل مجھے یہ ذمّہ داری اٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔ میں اس بات کو متعدد بار واضح کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے مطالعۂ علم اور میری عقل و فہم کی حد تک یہ طریق بالکل مصنوعی اور تصنع آمیز ہے کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے ایک دعوت دی اس کو قبول کرنے والوں کو جمع کر دیا۔ اب جو حضرات اس دعوت کو قبول کر کے اس کام کو منظم طریقہ پر آگے بڑھانے کے آرزومند ہوں وہ ایک ہیئت اجتماعیہ تشکیل دیں اور اس اجتماعیت کے لیے اپنا سربراہ منتخب کر لیں اور پھر دستور میں کوئی مدّت مثلاً "تین سال یا پانچ سال" مقرر ہو جس کے بعد جماعت کی اکثریت کی آراء سے سربراہ کا انتخاب عمل میں لایا جایا کرے۔ میرے نزدیک یہ صحیح دینی و اسلامی تنظیم کی نہج اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایسی تنظیم جس شخص کی دعوت پر ہیئت اجتماعیہ اختیار کرتی ہے وہی شخص اس تنظیم کا فطری سربراہ ہوتا ہے۔ میرے اس خیال کی بنیاد سورۂ صف کی آخری آیت کا یہ ٹکڑا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" الخ۔ یہی ہماری تنظیم کو دوسری دینی اسلامی جماعتوں کے مقابلے میں ایک بنیادی خصوصیت کا حامل بنا دے گا۔"

"میں آپ سے اس کام میں تعاون کا، نصرت کا اور امداد و اعانت کا طلب گار ہوں اور ساتھ ہی باصرار آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جو میرا ساتھ دے وہ اس بات کو بھی اپنی دینی ذمّہ داری سمجھ کر دے کہ جہاں مجھے غلط ہوتا دیکھے، مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے، مجھے روکے، مجھے ٹوکے، مجھ سے لڑے، مجھ سے جھگڑے، میرا محاسبہ کرے اور کوئی لحاظ رعایت نہ کرے۔ یہ آپ کا حق ہی نہیں بلکہ آپ کا فرض ہوگا۔"

قراردادِ تاسیس اور اُن کی توضیحات کی منظوری

اس پہلی نشست میں جناب ڈاکٹر صاحب کے افتتاحی خطاب کے بعد تنظیم اسلامی کی قرارداد تاسیس اور اس کی توضیحات پیش کی گئیں۔

قرارداد تاسیس

"آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عائد کردہ جملہ انفرادی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات' دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہ' لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جِلا حاصل ہو' ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ ان کے عقائد کی تطہیر ہو' عبادات اور اتباعِ سنّت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے' عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حِس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام امور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور نیک صحبت کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک "اَلدِّین النَّصِیحَہ" کی روح اور "اَلاَقرَبُ فَالاَقرَبُ" کی تدریج ضروری ہے۔ لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اولاً کنبہ و خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہیئے اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامتہ النّاس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امّتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عائد ہے' اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیتِ قدیمہ کے باطل عقائد

رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کُن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں"۔

توضیحات

قرار داد میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات، دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے"!...... اس تصریح کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدّعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسم عبودیّت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان امور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی عملی، اخلاقی اور روحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی، آئندہ جو کام پیش نظر ہے اس کے اصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابل لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجاتِ اخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لئے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہو گا جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اضافہ ہوتا رہے اور زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائضِ دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی ایسی اجتماعی جدوجہد ہرگز جائز نہیں ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کر کے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے!...... چنانچہ پیشِ نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ...... "اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے۔ ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباعِ سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی

زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ بنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے"۔

"دینی جذبات کے جلا" کے لئے قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت مع تدبّر' سیرتِ نبویؐ ور سِیَرِ الصحابہؓ کا مطالعہ' مجالس وعظ کا انعقاد' باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامین موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

"علم میں مسلسل اضافے" کیلئے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام قرآن حکیم اور حدیثِ نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیت قدیمہ و جدیدہ پر اسلام کے نقطۂ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ مندرجہ بالا دونوں امور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جاہلیتِ قدیم و جدید دونوں کے اثرات قلوب و اذہان سے محو ہوں' عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکائے تنظیم کے دینی جذبات کے جلا اور علم میں اضافے کا براہ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہو گی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمالِ انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو۔ چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق' معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورتِ حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز با جماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں۔ دین کی نصرت و حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیۂ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے' یا سنتِ نبویؐ کی محبّت و اہمیت پر دلائل تو ازبر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباعِ نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے' نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سم قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لئے بھی سخت مضر اور مہلک ہے...... لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہو گی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف' اتباعِ سنت کا جذبہ' معاملات میں حلال و حرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھے۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہو گی کہ پیش نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار

سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتباعِ سنت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن نہ ہوں۔

شرکائے جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیاں...... یا بالفاظِ دیگران کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لئے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیرِ صحبت کا مؤثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء گروپس کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں انہیں قرآن و حدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سرِ نو تر و تازہ ہوں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرارداد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ...... "دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَة" کی روح اور "اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَب" کی تدریج ضروری ہے"۔ پیش نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسبِ مقدور و صلاحیت اور بقدر ہمت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیتِ مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہئے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہئے نہ طلبِ جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ، رسولؐ اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آ جائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقامِ نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ...... ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے۔

—————— اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہ راست نتیجہ ہے جذباتِ ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے! حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور اربابِ اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ ان کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اولیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہئے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا در ان حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و پیش وہی ہے جو اصحاب قوت و اختیار کا ' نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ —————— —————— رہا اقتدار کے حصول کی خاطر بر سرِ اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطۂ نگاہ سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کلی اجتناب لازمی و لابُدی ہے۔ ہمارے نزدیک "ائمۃ المسلمین" اور "عامتہم" دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے ' بحالاتِ موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی امید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت ' دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبولِ حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لئے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا ہونا لازمی ہے ' اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمتِ خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمتِ خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادمِ خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولتِ اخلاص سے محروم ہے۔ اس ضمن میں

یہ فرق البتہ ضرور پیش نظر رہنا چاہئے کہ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیرِ عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمتِ خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمتِ خلق کی اجتماعی سکیموں کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلّم ہو' دعوتِ دین کے نقطۂ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیش نظر اجتماعیت میں اصل زور انشاء اللہ اسی پر دیا جائے گا!

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً ایک تدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر (عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ) اپنے اہل و عیال (قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) اور کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) سے ہوتے ہوئے اپنی قوم (يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ) اور پھر پوری انسانیت (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے (اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ) یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت و تخاطب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہو گا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات' اہل و عیال' کنبے قبیلے اور پھر عوام النّاس تک بڑھنا چاہئے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہو گا اس لئے کہ ان کے بارے میں ہم حدیث نبویؐ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ...... الخ کی رو سے براہِ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہو گا اور جہاں جہاں ممکن ہو گا اور وسائل دستیاب ہو سکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کئے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعیّن غیر ضروری ہے۔ حسبِ صلاحیت و استعداد انفرادی و نجی گفتگو، خطاب ہائے عام، خطبات جمعہ اور درسِ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشرو اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ "عامۃُ النّاس کو دین کی دعوت و تبلیغ" کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو "امّتِ مسلمہ پر بحیثیتِ مجموعی عائد ہوتی ہے" ہمارے نزدیک انذار و تبشیر دعوت و تبلیغ اور شہادتِ حق علی النّاس کی جو ذمہ داریاں انبیائے کرام علیہم السلام پر عائد ہوا کرتی تھیں۔ وہ اب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپؐ کی امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہیں اوّل اوّل اس امّت نے "خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ" کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوّۃ کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اس فرضِ منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اتقیاء و صلحاء ذاتی طور پر دور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور امتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی "کتمانِ حق" کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ امت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ محض امت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت حال تشویشناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی باز پرس کا اندیشہ ہے، بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت و ذلت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیانِ باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلّل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادّہ پرستی کے سیلاب کا رخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لئے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلّل و مفصّل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ، اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارت ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر عا

تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے۔ اس لئے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کئے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علمِ دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے۔ اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی منتظم اور مؤثر بند و بست کرے جو عربی زبان' قرآن حکیم اور شریعتِ اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیش نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعۃ کا مقام ہماری دانست میں امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ پیش نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاحِ نفس اور تعمیرِ سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونا چاہیں جو دین کی جانب سے ان پر عائد ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف اُن کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لئے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاح معاشرہ کے لئے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے...... دین کی خدمت نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور انشاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔ اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لئے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیقِ راہ ہی گردانیں گے...... اس تصریح کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم واقعۃً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

اختتامی خطاب کے اہم نکات

قرار دادِ تاسیس اور اس کی توضیحات کی منظوری کے بعد شرائطِ شمولیت اور عہد نامۂ رفاقت نیز تین سال کے عبوری دَور کے لیے دستور طے ہوا۔ چونکہ ان میں وقتاً فوقتاً ترامیم و اصلاحات ہوتی رہیں، لہٰذا ان کو اگلے صفحات میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے جن کو تین سال کے عبوری دَور کے لیے داعیٔ عمومی تسلیم کر لیا گیا تھا حسب ذیل اختتامی کلمات ارشاد فرماتے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ

رفیقو! سارا شکر، ساری تعریف اس اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے جس نے ہماری راہِ حق کی طرف رہنمائی فرمائی اور ہم ہرگز راہ یاب نہ ہوتے اگر وہی اپنے کرم سے ہماری دستگیری نہ فرماتا۔ مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ مجھ جیسی شخصیت کی خشک دعوت اور جھڑکنے اور جھٹکنے والے انداز کے باوجود اللہ کے اتنے مخلص بندے تنظیمِ اسلامی کی رفاقت قبول کر لینے کے لئے جمع ہو جائیں گے۔ اس دعوت الی اللہ سے واقف ہونے سے قبل ہم میں سے اکثر کی دوسروں سے شناسائی نہیں تھی۔ یہ دوسرے سے واقف بھی نہیں تھے۔ ہماری دوستیاں اور قرابت داریاں بھی نہیں تھیں۔ ہم جمع ہوئے ہیں تو دعوت الی اللہ پر۔ کوئی دنیوی غرض ہمارے پیشِ نظر نہیں، کسی قسم کی سیاست بازی ہمیں مطلوب نہیں۔ دینی، سیاسی اور سماجی جماعتوں اور جمعیتوں کی طرح ہماری اس تنظیم میں نہ عہدے ہیں، نہ ووٹ ہیں۔ نہ مجلسِ شوریٰ کی رکنیت کے مواقع ہیں، نہ مجلسِ انتظامیہ کے۔ نہ شہرت کے حصول کا کوئی موقع ہے، نہ وجاہت کا۔ ہم خالصتہً لِلّٰہ اور فی اللہ جمع ہوئے ہیں۔ اللہ ہی کے لئے ہمارا جڑنا ہے اور جس سے بھی ہم جڑیں گے اللہ ہی کے لئے جڑیں گے۔ جس سے ہم اس وقت کٹ رہے ہیں، اللہ ہی کے لئے کٹ رہے ہیں اور آئندہ جس سے بھی ہم کٹیں گے اللہ ہی کے لئے کٹیں گے۔ جو کچھ ہم تنظیم کی مالی اعانت کریں گے وہ اللہ ہی کے لئے کریں گے اور جو کچھ کسی کو دیں گے اللہ ہی کے لئے دیں گے۔ ہمارا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول اور نجاتِ اُخروی ہی ہمارا حقیقی نصب العین ہوگا۔ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اور اسے گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس دعوت اِلیٰ اللہ اور تنظیم قائم کرنے میں فرض کی ادائیگی کی ذمہ داری — اور رضائے الٰہی

حصول کے سوا اور کوئی غرض میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔ چنانچہ پورے احساسِ ذمہ داری اور
اس مسئولیت کے ساتھ آپ سب کو گواہ بنا کر سب سے پہلے میں "تنظیمِ اسلامی"
عہدِ رفاقت اٹھاتا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○

اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنَا رُشْدَنَا وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا !

کیفیات

اُس وقت پورے اجتماع پر ایک گمبھیر خاموشی طاری تھی۔ تمام رفقاء کے چہرے
مار رہے تھے ———— اور اس بات کی شہادت دے رہے تھے
ان کے دلوں میں جذبات کا طوفان اُمڈ رہا ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو
ل رہے ہیں جن کو ضبط کیے بیٹھے ہیں۔ تعارف کی تکمیل کے بعد داعیٔ عمومی
عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی کی ایک ایک شق کو پڑھنا شروع کیا اور تمام رفقاء اس کو
ہراتے رہے۔ اس موقع پر اکثر رفقاء کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں اکثر کی ہچکیاں
ھی ہوئی تھیں اور یہ اللہ کے بندے رضائے الٰہی کے لیے دعوت تجدید ایمان
اور تجدید عہد کے قافلہ کے رفیق بن رہے تھے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

عن الحارث الاشعری، قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:
"اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ
بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجہاد فی سبیل اللہ"
(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

ایک وضاحت

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ "تنظیم اسلامی" نہ عام معنی میں دنیوی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ یہ ایک "ہمہ گیر دینی جماعت" ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلطی ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ اُس "الجماعۃ" کے حکم میں ہے جس میں شمولیت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ" یعنی جو اس سے علیحدہ ہوگا وہ علیحدہ ہی جہنم میں جھونک دیا جائے گا ——— تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہاں "سمع وطاعت" کا خالص اسلامی اور ٹھیٹھ دینی اصول کارفرما رہے گا۔ یہ بات باعادہ اور بتکرار اس لئے عرض کی جارہی ہے کہ ہمارے یہاں بعض مخلص دینی جماعتیں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس شدید غلطی بلکہ عظیم گمراہی میں مبتلا ہوجاتی ہیں کہ وہ "الجماعۃ" کے حکم میں ہیں۔ اس طرح وہ امت کی وحدت کو سخت نقصان پہنچانے اور انتشار، تحزّب اور تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہیں

ہم پورے شعور کے ساتھ اور صمیم قلب سے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ تنظیم اسلامی کو اس سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تنظیمِ اسلامی کے پہلے سالانہ اجتماع کا خلاصہ

تنظیمِ اسلامی، پاکستان کے پہلے سالانہ اجتماع کی پہلی نشست ۲۵ مارچ اور دوسری نشست ۲۶ مارچ ۷۶ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ اس اجتماع میں کُل ۲۷ رفقاء میں سے مرکزی تنظیم سے وابستہ ۳ کراچی کی تنظیم سے وابستہ ۹ سکھر کی تنظیم سے وابستہ ۲ لاہور کی تنظیم سے وابستہ ۴۴ منفرد رفقاء ۶ کُل ۶۴ رفقاء نے شرکت کی۔ دو حضرات نے اس موقع پر عہدِ رفاقت اُٹھایا۔

ڈاکٹر اسرار احمد داعی عمومی
کے افتتاحی خطاب کے اہم نکات

"رفقائے محترم ــــ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ہم اپنے پہلے سالانہ اجتماع میں شریک ہو رہے ہیں۔ اس شرکت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل ہے۔ ہم سب پر اس کا شکر واجب ہے۔ آپ کا یہاں جمع ہونا میرے نزدیک فی سبیل اللہ ہے۔ مقصد کا شعور اور اس کی لگن آپ حضرات کو پاکستان کے مختلف شہروں سے یہاں کھینچ لائی ہے۔ جس میں تائید و نصرتِ خداوندی شامل ہے۔

ہم میں سے اکثر نے ایک سال قبل اور چند رفقاء نے دورانِ سال اپنی آزاد مرضی سے اپنے رب سے تجدیدِ عہد و پیمان کیا تھا اور پورے شعور کے ساتھ اپنی حیاتِ دنیوی کا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ: اِنَّ صَلٰوتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ اسی کو ہم نے اپنی تنظیم کے لئے بطورِ اصول، بطور زادِ راہ اور بطور نشانِ منزل طے کیا تھا اور ایک قافلہ ترتیب دیا تھا۔ اسی کے ضمن میں بطورِ تذکیر میں چند امور آپ کے سامنے آج پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ہماری تنظیم کی تاسیس کا مقصد وحید یہ ہے کہ از روئے کتاب و سنت ہر مسلمان پر، مسلمان ہونے کی حیثیت سے چند اہم دینی فرائض عائد ہوتے ہیں جن کو بجا لانے کی ہر امکانی کوشش کے بغیر نجاتِ اُخروی ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا شعور بعض حضرات کو پہلے سے حاصل ہو۔ بعض کو میرے درسِ قرآن حکیم، خطابات، تحریرات اور بالخصوص مرتب کردہ منتخب قرآنی نصاب

سے حاصل ہوا ہو لیکن جو بات قدرِ مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پر یہ فرض براہ راست عائد ہوتا ہے جس کی ادائیگی کی اس کو فکر کرنی چاہیئے ۔ اس فرض کی ادائیگی کے لئے "تنظیم" ضروری ہے ۔ اور چونکہ فی الوقت پاکستان میں کوئی ایسی ہیئت اجتماعیہ موجود نہیں ہے جو ان دینی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے کوشاں ہو ۔ جو جماعتیں یا جمعیتیں موجود ہیں تو ان میں سے اکثر وقتی و ہنگامی سیاست کے دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں ۔ یا کسی جزوی دینی کام کو کل دین سمجھ لینے کے مغالطہ میں مبتلا ہیں ۔ یا ان کا طریق کار قرآن و سنّت میں بیان کردہ طریق کار اور منہج سے کامل طور پر مطابقت نہیں رکھتا اس کے کسی ایک جُز کو وہ کُل سمجھنے کی غلط فہمی کا شکار ہیں ۔"

رفقائے محترم ۔ اصولی تنظیموں اور جماعتوں کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقاصد کو مستحضر رکھیں ، اس لئے اب میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنے ان مقاصد کو تازہ کریں جن کی بجاآوری کے لئے ہم "تنظیم اسلامی" میں شامل ہوئے ہیں ۔

● اس تنظیم کا پہلا مقصد یہ ہے کہ اس کا ہر رفیق اپنے مقصدِ تخلیق کو ہر وقت اور ہر آن اپنے سامنے رکھے ۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۔ یعنی عبادت رب ۔ یہ عبادت پورے ذوق و شوق اور اپنے خالق کی محبت سے سرشار ہو کر کامل اطاعت کے ساتھ پوری زندگی میں انجام دینی ہے ۔ یہ وہ بنیادی فرض ہے جس کا ہر مسلمان مکلّف ہے اور ہر مسلمان نے اس کو ادا کرنا ہے ۔ اس عبادتِ رب کے بھی دو دائرے یا دو مراحل ہیں ۔

پہلا دائرہ یا مرحلہ ہر مسلمان کی انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہے ۔ جس پر فوری طور پر عمل کرنا فرض ہے ۔ اس کو کسی حال میں ملتوی نہیں کیا جا سکتا ۔ اس میں تاخیر و تعویق ایمان کے منافی ہے ۔ اس معاملے میں ماحول کی ناسازگاری کا عذر اللہ کے ہاں بالکل بے وزن ہوگا ۔

دوسرا دائرہ یا مرحلہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس پر چلنا اسلامی نظام عملاً نافذ کئے بغیر ممکن نہیں ۔ لہٰذا کتاب و سنّت کے تعلیم کردہ طریقِ کار کے مطابق ایک ایسا معاشرہ قائم کرنے کی اجتماعی طور پر عملی جدوجہد ضروری ہے ۔ جس میں اسلامی نظام نافذ ہو سکے ۔ اور جاری و ساری رہ سکے ۔

● اس تنظیم کا دوسرا مقصد ہے شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دینے کی سعی و جہد کرنا ۔ میرے محدود مطالعہ میں قرآن و حدیث میں "شہادتِ حق" کی اصطلاح کہیں استعمال نہیں ہوا ۔ جہاں بھی ذکر ہے وہ شہادت علی الناس سے ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہونے کی حیثیت

سے یہ فرض اُمتِ مُسلمہ پر بحیثیت اُمّت عائد ہوتا ہے۔ چونکہ نبی اکرمؐ خاتم النبیین ہیں اور خاتم المرسلینؐ ہیں اب قیامت تک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دورِ رسالت جاری و ساری رہے گا۔ اور نوعِ انسانی رشد و ہدایت کی محتاج رہے گی۔ لہٰذا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ۲۰ سالہ محنت شاقہ کے نتیجے میں ایک اُمت تشکیل دے کر شہادت علی الناس کا فریضہ اُمّت کے سپرد کر دیا۔ اب یہ اُمّت کا فرض منصبی ہے کہ وہ اپنے قول و عمل سے نوعِ انسانی کے سامنے حق کی شہادت دے۔ اگر اُمت بحیثیت اُمّت اس فرض سے غافل ہو جائے تو از روئے قرآن حکیم جن لوگوں کو بھی اس کے شعور کی توفیق ملے، ان کا فرض ہے کہ وہ منظم ہوں اور اس فرضِ منصبی کو ادا کرنے کی کوشش میں اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں کھپا دیں۔ بمصداق آیاتِ قرآنی: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران: ۱۱۰) (اے اُمت محمدؐ) اب دنیا میں تم بہترین گروہ ہو جس کو انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" اور: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران: ۱۰۴) "تم میں ایک گروہ ایسا ضرور ہونا چاہیئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے، بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکتا رہے۔ جو لوگ یہ (تین) کام کریں گے وہی لوگ ہوں گے جو فلاح پائیں گے۔"

● اس تنظیم کا تیسرا مقصد ہے اظہارِ دینِ حق کی عملی جدوجہد کرنا ۔۔۔ درحقیقت یہ پہلے اور دوسرے مقاصد کا تکمیلی مرحلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اطاعتِ کلّی کے ساتھ عبادتِ رب کے فرض کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک "اسلام بحیثیت حکمران" غالب نہ ہو اور ہماری انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" کا اٹل اصول بلکہ حکم کارفرما ہو۔

اس طرح شہادت علی الناس کا فرض بھی صحیح طور پر اُسی وقت انجام پا سکتا ہے جب اللہ کا دین بہ تمام و کمال قائم و نافذ ہو اور بنی نوعِ انسان اس نظام کے چلتے پھرتے نمونے اور اس کی برکات کا سر کی آنکھ سے مشاہدہ کر سکے۔ لہٰذا اظہارِ دینِ حق کی سعی و جہد پوری اُمت کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں جزیرہ نمائے عرب میں اس دین کی تکمیل فرما دی تھی اور وہ نظامِ عدل عملاً قائم فرما دیا تھا جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصدِ خصوصی تھا۔

اس نظامِ عدل پر خلافتِ راشدہ قائم رہی۔ اس لیئے اس نظام کو " خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کہا جاتا ہے۔ اسی نظامِ عدل کے قیام و نفاذ کے لیئے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین نے اپنی زندگیاں کھپائیں :

یہ ہمارے دینی فرائض کا وہ اجمالی تصور جس کی بنیاد پر ہماری تنظیم کی تاسیس ہوئی اور جس کا پیش منظر اور پس منظر مستحضر رکھنا تنظیم کے ہر رفیق کے لیئے لازمی اور ضروری ہے۔

تنظیم کا طریقِ کار

اب میں "تنظیم اسلامی" کے طریقِ کار کے چند بنیادی اُمور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ یہ امور قرار دادِ تاسیس اور اس کی توضیحات میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں اختصار و اجمال کیساتھ ان کی تذکیر مقصود ہے :

۱۔ ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے لہٰذا ہماری تنظیم کے پیشِ نظر فرد کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجاتِ اُخروی اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے۔ تنظیم کو محض "کارکن" درکار نہیں بلکہ ایسے رفیق مطلوب ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا عبادتِ رب اور اتباعِ سنّت ہو۔

۲۔ دین میں دعوت کے لیئے ایک فطری ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اپنی ذات کی اصلاح کے ساتھ ساتھ بتدریج دعوت کا حلقہ بڑھانا چاہیے۔ اس میں " الاقرب فالاقرب " کے اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کی فطری تدریج یہ ہے کہ اصلاح کا عمل اپنی ذات سے شروع ہو کر بیوی بچے، کنبہ، خاندان، اہلِ محلّہ، بستی، شہر اور ملک اور بعدہٗ بین الاقوامی سطح کی طرف بڑھنا چاہیئے۔

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم)

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ)

۳۔ شہادت علی الناس کے ذیل میں ہماری تنظیم کے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ فلسفہ اور فکرِ جدید کے مادہ پرستانہ اور گمراہ کن نظریات کا قرآن حکیم اور احادیثِ شریفہ کے محکم استدلال سے ابطال کیا جائے۔ جنہوں نے نوعِ انسانی کے فہیم و ذہین لوگوں کے فکر و نظر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور جس نے ہماری اپنی مسلمان نئی نسل کے خرمنِ ایمان و یقین کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ موجودہ دَور کی جاہلیتِ جدیدہ کے ردّ اور ابطال کے لیئے

ایک زبردست علمی تحریک بپا کی جائے۔ ساتھ ہی ساتھ جاہلیتِ قدیمہ پر جو دین کے لبادے میں ملبوس مشرکانہ و مبتدعانہ عقائد و اعمال کی شکل میں امتِ مسلمہ کو گھن کی طرح کھا رہی ہے۔ نہایت حکیمانہ انداز میں تنقید کر کے اصلاح کی سعی کی جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو ــــ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین!!

ناظم عمومی کی مختصر رپورٹ

تاسیسی اجتماع میں ۶۲ حضرات نے عہد رفاقت لیا۔ اس موقع پر یہ بات طے کی گئی کہ کراچی کے حلقۂ تعارف و متاثرین میں سے جو اشخاص عہد رفاقت لے کر تنظیم میں شامل ہوں گے وہ بھی تاسیسی رفقاء میں شمار ہوں گے لہذا تاسیسی اجتماع کے کچھ عرصے بعد داعیٔ عمومی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سکھر اور کراچی تشریف لے گئے سکھر میں دو حضرات اور کراچی میں چھ حضرات نے شمولیت اختیار کی۔ ۷۶-۷۵ ۱۹ء کے پہلے سال کے دوران گوجرانوالہ سے ایک راولپنڈی سے ایک اور لاہور سے ۱۷ حضرات تنظیم میں مزید شامل ہوئے۔ اور اس دوران ان رفقاء میں سے ایک رفیق جناب نعیم الدین صاحب روڈ ایکسیڈنٹ کے باعث رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مزید براں دوران سال دو لاہور کے حضرات کی رفاقت ضعیف العمری کی وجہ سے، ایک رفیق چوہڑکانہ اور ایک ساہیوال سے نو عمری کی وجہ سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ چار رفقاء (کراچی) اور تین رفیق (لاہور) سے عدم دلچسپی کی وجہ سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ علاوہ ازیں چار حضرات (لاہور) اپنی ذاتی مجبوریوں کی وجہ سے از خود تنظیم سے علیحدہ ہو گئے۔

۷۶-۷۵ ۱۹ء کے دوران جولائی ۷۵ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام کوئٹہ میں ایک تربیت گاہ منعقد ہوئی جو بحمد اللہ کافی کامیاب رہی۔ اس تربیت گاہ میں داعیٔ عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے درسِ قرآن بھی دیا اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا اجتماعی مطالعہ کرایا۔ مزید براں جناب مولانا عبد الغفار حسن صاحب مدظلہ العالی نے جو مدینہ یونیورسٹی مدینہ منورہ (سعودی عرب) میں استاذ الحدیث ہیں اور اس وقت پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس تربیتی پروگرام میں شرکت فرمائی اور درسِ حدیث سے شرکاء کو مستفید فرمایا۔

رفتارِ کار کا تجزیہ

داعی عمومی نے تنظیم کی رفتارِ کار کا صحیح تجزیہ اور اپنا حقیقی تاثر پیش کرتے ہوئے فرمایا:

”میرے نزدیک رفتارِ کار نہ اطمینان بخش ہے اور نہ تشویش ناک ہے بلکہ بین بین ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی جگہ یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر ایک سال تک ہم جڑے رہ گئے تو میرے نزدیک یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ تنظیم دنیا کے کٹھن اور مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اجتماعی زندگی ایک ایسے پھول کی مانند ہوتی ہے کہ ذرا تیز ہوا چلے تو پھول کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ اس زندگی میں بڑے مشکل امتحانات آتے ہیں اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف دوسروں کی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ ایک دوسرں کی تقصیروں کو معاف کرنا ہوتا ہے طبیعتوں اور مزاجوں کے اختلافات کی رعایت ملحوظ رکھنی ہوتی ہے اس پر مستزاد یہ کہ تنظیم بھی وہ ہو جو ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر تشکیل پاتی ہو جس میں دنیوی نقطۂ نظر سے کوئی کشش اور دل کشی TEPTATION موجود نہ ہو۔ جس میں نہ عہدے ہوں نہ مناصب، نہ الیکشن کی گھما گھمی ہو نہ جلسے نہ جلوس اور نہ نعروں کی ہاہمی اور ہنگامہ آرائی۔

جس میں اپنا مال کھپانا ہو اور اپنے جسم و جان کی توانائیاں اور صلاحیتیں لگانی ہوں جس میں ان حدود و قیود اور شرائط کی بالالتزام پابندی کرنی ہو جو اصل کے اعتبار سے تو دینی اوامر و نواہی ہیں لیکن عملاً دینی فرائض سے خارج ہیں۔ اور دین دار کہلانے والا طبقہ بھی الّا ماشاءاللہ اس کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا۔ اس پرُفتن دور میں جب کہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی فرماں روائی ہے کوئی مسلمان خالصتاً خوفِ خدا اور محاسبۂ اُخروی کے ڈر سے ان چیزوں کو ترک کر دے یا ترک

کرنے کی خواہش کرے کہ جن کو عامۃ الناس ہی نہیں بڑے بڑے متقی
اور پرہیزگار بلکہ رجال دین تک حرام و ناجائز سمجھنا تو در کنار کسی نوع سے ان
کاموں کو غلط ہی نہیں سمجھتے۔ اور ان کو ھنیئاً مریئاً خیال کرتے ہیں۔ الاماشاءاللہ۔
بڑے ہی ایثار اور قربانی کا کام ہے۔ آج کے اس دور میں انکم ٹیکس کے
غلط گوشوارے داخل کرنا، چنگی، کسٹم اور ڈیوٹی بچانے کی تدابیر اختیار
کرنا۔ امپورٹ اور ایکسپورٹ کے لیے بنکوں سے OVERDRAFT لینا
اور اس پر سود ادا کرنا۔ انشورنس پالیسیاں لینا۔ بچت SAVING کی
ان تمام سکیموں میں سرمایہ لگانا جن میں سود ملتا ہے۔ رشوتیں لینا اور دینا
بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کی ملازمتوں اور آسامیوں پر فائز ہونے کو
اپنے لیے باعث افتخار سمجھنا۔ اپنے مکانوں اور بنگلوں کی تعمیر کے لیے
ہاؤسنگ فنانس کارپوریشنوں سے سودی قرضے حاصل کرنا دینی نقطۂ نظر
سے قابلِ احتساب نہیں رہے۔ ان کاموں سے کسی کے ضمیر میں خلش
تک نہیں ہوتی، ان کی قباحت اور دینی لحاظ سے ان کے حرام ہونے کا
کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ الّا ماشاءاللہ۔ ایسے حالات میں چند
اللہ کے بندوں کا تنظیم اسلامی سے اس عزم کے ساتھ جڑے رہنا کہ
وہ شعوری طور پر ان تمام کاموں کو قطعاً حرام سمجھتے ہیں اور ان سے اپنا دامن
بچائیں گے اور جس کے دامن پر یہ داغ موجود ہوں وہ توبہ اور پشیمانی کے
آنسوؤں سے اس داغ کو دھونے کی کوشش کریں گے، صرف اس لیے
کہ وہ نجات و فلاح اُخروی کے امیدواروں میں جگہ پا سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی
رحمت و مغفرت کے سزاوار قرار پا سکیں۔ میرے نزدیک بہت ہی قابل
قدر کامیابی ہے اس کو UNDER-RATE نہ کیجیے۔ بلکہ گہرائی میں جاکر
تجزیہ کیجیے کہ کامیابی ہے یا نہیں ــــــ

پھر میں ذاتی طور پر اس بات کو جانتا ہوں کہ ہمارے بعض رفقاء میں

عظیم ترین انقلاب آ رہا ہے۔ ان کے مشاغل تبدیل ہو گئے ہیں۔ ان کی بھاگ دوڑ کا محور بدل گیا ہے۔ آپ کو ایسے رفیق بھی ملیں گے کہ جو شاید خود بھی اور ان کا حلقہ اثر بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ان کے منہ پر سنت کے اتباع میں داڑھیاں آجائیں گی۔ گو اس معاملہ میں بعض رفیق ابھی تک ضعفِ ارادہ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ان کا عزم و ارادہ خلوص اور للّٰہیت پر مبنی ہے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کمزوری پر وہ جلد قابو پا لیں گے۔

ہمارے بعض رفیق ہم سے الگ ہو گئے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ ان کی علیحدگی کا آپ کو رنج و ملال ہوگا۔ مجھے بھی اس بات کا شدید افسوس ہے بلکہ میں عرض کروں گا کہ جب کوئی رفیق اپنے کام میں سست ہوتا نظر آتا ہے یا نظم کی پابندی میں ڈھیلا دکھائی دیتا ہے یا کوئی رفیق تنظیم سے جدا ہوتا ہے تو اس کا بڑا گہرا احساس میرے دل پر طاری ہوتا ہے۔ بعض اوقات میرا تاثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی میری ذاتی کمزوری ہے مجھ میں وہ کشش پیدا نہیں ہوئی کہ ان کو خود سے جوڑے رکھتا یا ان کو بھی اسی جذبہ اور جوش سے واقف کرا دیتا جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عنایت کیا ہے۔

بہرحال یہ بات ہم سب کے لیے قابلِ اطمینان ہے کہ "تنظیم اسلامی" کے دستورِ اساسی یا تنظیم کے داعی سے اختلاف کے باعث تاحال کوئی ہم سے جدا نہیں ہوا۔ وہ اس کو حق تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اپنی ذاتی مجبوریوں، رکاوٹوں اور کچھ بندھنوں کے باعث وہ تنظیم کے ساتھ چلنے کی ہمت نہیں پا رہے۔ لیکن ان کی ہمدردیاں، ان کی دلچسپیاں اور ان کا عملی تعاون ایک دوسری شکل (مرکزی انجمن خدام القرآن کے ساتھ تعلق) میں جاری و ساری ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

چند ضروری وضاحتیں

جن تاسیسی رفقاء کو شرائطِ شمولیت کے مطابق اصلاح کی مہلت ملی تھی۔ ان کی عدم کامیابی کے باعث علیحدگی کے معاملہ پر۔ نیز چند سوالات پر داعیِ عمومی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حسبِ ذیل وضاحتیں پیش کیں:

"میں نے کاروباری حضرات کی مشکلات پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا ہے مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ بڑا کٹھن اور مشکل معاملہ ہے۔ میں انتہائی غور و فکر کے بعد بھی خود کو کسی دلیل سے اس کا قائل نہیں کر سکا کہ اس میں "رخصت" کا کوئی پہلو نکالا جا سکتا ہے۔ انکم ٹیکس کے غلط گوشوارے میرے نزدیک دانستہ اور پورے شعور کے ساتھ کذب بیانی اور دھوکہ دفریب کے ذیل میں آتے ہیں جس کو کسی حال میں اس تنظیم کو گوارا نہیں کرنا چاہیئے جو اظہارِ دین کے لیے اُٹھی ہے۔ جس جماعت کا حوالہ دیا گیا ہے وہ آج جس حال کو پہنچی ہے۔ اس میں دوسرے بہت سے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ یہ "صرفِ نظر" بھی شامل ہے۔ ملک میں دینی جماعتوں کی کمی نہیں بڑے بڑے دارالعلوم بھی موجود ہیں۔ عام اصطلاح میں ملک میں متقیوں اور پرہیزگاروں کی بھی کمی نہیں۔ ان ہی کے مالی تعاون سے ملک میں دینی مدارس اور دارالعلوم چل رہے ہیں۔ ان ہی کے دم سے نہایت شاندار مساجد تعمیر ہو رہی ہیں جن میں نہایت قیمتی قالین اور جھاڑ فانوس مہیا ہیں۔ یہ تمام کام ان کاروباری حضرات کے تعاون سے ہوتے ہیں جن میں غالب تناسب ان لوگوں کا ہے جو نمازی، روزہ دار، حاجی اور زکوٰۃ و خیرات ادا کرنے والے ہیں۔ کمی کیا ہے؟ کمی یہ ہے کہ یہ حضرات کاروباری معاملات میں دین کے کسی ضابطے قانون اور حد کے دخل انداز ہونے کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک بنک سے سود پر OVER DRAFT

لے کر اپنے کاروبار کو وسعت دینا، ڈبل حسابات رکھنا۔ غلط انکم ٹیکس کے گوشوارے داخل کرنا۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے لائسنس یا کسی نوع کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے لیے رشوتیں دینا کسٹم بچانے کے لیے داؤ پیچ لڑانا وقت کا تقاضا ہے اور اس کا دین سے سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ حرام و حلال کا کوئی خطِ امتیاز ان کے سامنے نہیں۔ ظاہر ہے کہ سب کچھ ہمارے معاشرے میں موجود ہے "تنظیم اسلامی" کی تاسیس اس لیے عمل میں آئی ہے کہ اس میں شامل ہونے والے رفقاء ان تمام برائیوں خرابیوں سے اپنا دامن بچائیں گے۔ ان کے پیش نظر متاعِ دنیا نہیں بلکہ نجاتِ اُخروی کی فکر ہوگی بعض رفقاء یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بتدریج اصلاح ہوئی ہے اور شریعت بتدریج نازل ہوتی ہے لہذا تنظیم بھی اس معاملہ میں ایک تدریج ملحوظ رکھے۔ لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ یہ دلیل غلط ہے۔ ہمارا ماحول اس ماحول سے بالکل مختلف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس دور میں شریعت کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں لیکن موجودہ صورت، واقعہ تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے شریعت کامل صورت میں موجود ہے لہذا ہمارے لیے مفر اور گریز کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور ہمارے دور میں ایک بنیادی فرق اور ہے جس کا صحیح شعور و ادراک نہ ہونے کی وجہ سے اکثر حضرات ایک انتہائی تباہ کن اور ہلاکت خیز مغالطہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں مبعوث ہوئے وہ خالص مشرکانہ ماحول تھا۔ اس ماحول میں کلمہ شہادت کو قبول کرنا ہی مصائب و شدائد اور بہیمانہ تشدد کو دعوت دینا تھا۔ اس ماحول میں توحید کا اقرار و اعلان رسالت کا اقرار و اعلان اور آخرت کا اقرار و اعلان ہی سب

سے بڑی آزمائش و ابتلاء کی کسوٹی تھی۔ اس ایمان کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے ماریں کھائی ہیں۔ جانیں دی ہیں۔ اس دعوت کی وجہ سے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو طنز و استہزاء کا ہدف بننا پڑا ہے۔ پتھروں کی بارش سہنی پڑی ہے۔ شدید مصائب انگیز کرنے پڑے ہیں۔ معاشی بائیکاٹ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قولِ مبارک کے مطابق جملہ انبیاء و رسل کو جو تکالیف و شدائد برداشت کرنے پڑے تھے۔ وہ سب کے سب حضورؐ کو جو محبوب ربّ العالمین ہیں انگیز کرنے پڑے ہیں۔ پھر حضورؐ کے جانثاروں کو کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ ان کا بھی معاشی مقاطعہ ہوا ہے۔ ایسے جانثار بھی تھے کہ ان کو دینِ حق قبول کرنے کی پاداش میں مادر زاد ننگا گھر سے نکال دیا گیا ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پانے والے نوجوانوں کا یہ حال ہوا ہے کہ ان کی عُسرت دیکھ کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک بے قرار ہو گیا ہے۔

اس دور میں آپ توحید پر وعظ کہیے، رسالت کے دلائل دیجیے۔ آخرت پر تقریر کیجیے۔ آپ کی نکسیر پھوٹنا تو درکنار، آپ کو تحسین و آفرین کا خراج ملے گا۔ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے اس ملک میں آج سے اٹھائیس برس قبل عین انگریز کی فوجی چھاؤنیوں میں اذانیں دی جاتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید و رسالت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ لیکن انگریز کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔

ابتلاء و آزمائش اس دور میں بھی موجود ہے مومنین صادقین کو اس دنیا میں آزمائش اور ابتلا کی بھٹی سے گزارنا اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ ہے۔ قرآن مجید میں جو فرمایا گیا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ

الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ط (سورہ بقرہ ۱۵۵-۱۵۶)

تو کیا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے؟ یا ہم اور آپ اور دنیا کے سارے مسلمان جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔ مخاطب ہیں؟ بلاشبہ یہ خطاب ان مومنین صادقین سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کے انصار بننے کی سعادت حاصل کریں۔ اس زمانہ میں آزمائش حلال وحرام کی پابندی قبول کرنا ہے۔ اگر کسی کا کاروبار انکم ٹیکس کا صحیح گوشوارہ داخل کرنے سے بیٹھ جاتا ہے تو کیا اس کا رزق بند ہو جائے گا؟ آسائشیں بلاشبہ ختم ہو جائیں گی۔ فقروفاقہ بھی آسکتا ہے لیکن وہ بھوکا نہیں مر سکتا۔ ایسا گمان کرنا اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور رزاقیت ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک منڈی، بازار یا مارکیٹ میں ایک اللہ کا ایسا بندہ نکل آئے جو تجدید ایمان توبہ اور تجدید عہد کے زیر اثر تمام غلط کاموں سے مجتنب ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں اس کا کاروبار بند ہو جائے یا انکم ٹیکس کی وصولیابی کے لیے اس کا کاروبار کر لیا جائے یا اسے گرفتار کر لیا جائے تو اس بازار، مارکیٹ یا منڈی میں اس کے اتنے گہرے اثر مترتب ہوں گے کہ ہزاروں وعظ اور سینکڑوں درس قرآن... وہ اثرات اور نتائج مترتب نہیں کر سکیں گے۔ بس اللہ کی ربوبیت اور رزاقیت پر کامل ایمان اور جرأت مومنانہ کی ضرورت ہے۔

اگر کوئی رفیق اس درجہ خود کو حالت اضطرار میں سمجھتا ہے کہ وہ ان پابندیوں کو قبول کرنے سے خود کو مجبور پاتا ہے تو فی الوقت تنظیم کی رفاقت ترک کر دے جب بھی وہ اپنے معاملات کی اصلاح پر قابو پالے تو تنظیم کے دروازے وہ اپنے لیے کھلے پائے گا۔

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اختتامی خطاب کے اہم نکات

تلاوتِ کلامِ پاک اور خطبۂ مسنونہ کے بعد داعی عمومی نے فرمایا:

" حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ جمعہ میں جہاں قرآن مجید کی تلاوت اور تذکیر بالقرآن فرمایا کرتے تھے۔ وہاں بہت سی نصائح بھی فرماتے تھے جن میں یہ نصیحت تو گویا حضور کے معمولات میں شامل تھی کہ: " اُوْصِیْکُمْ وَ نَفْسِیْ بِتَقْوَی اللّٰہِ " " میں تم کو وصیت کرتا ہوں اور اپنے نفس کو بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی " نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا ارشادِ گرامی ہے: " مجھے جوامع الکلم عطا کئے گئے ہیں ":

غور کیجیے تو اسی ایک نصیحت میں کہ " اوصیکم ونفسی بتقوی اللہ " ایک بندۂ مومن و مسلم کی پوری زندگی کے لئے چاہے وہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو یا اجتماعی معاملات سے ایک ربطِ مستقیم کا تعین ہو گیا اور وہ ہے اللہ کا تقویٰ۔ تقویٰ کا اصل دینی مفہوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے توسط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تنگ راستہ میں جس کے دونوں جانب خاردار جھاڑیاں ہیں۔ انسان اپنے آپ کو اور اپنے لباس کو سمٹ سمٹا کر اس احتیاط سے گزرے کہ اس کا دامن کسی کانٹے سے الجھنے نہ پائے۔ اسی طرح اس دنیا میں ہر طرف شیطان نے ترغیبات کے جال اور معصیت کی جھاڑیاں پھیلا رکھی ہیں۔ تو جو بندۂ مومن ان ترغیبات کی خاردار جھاڑیوں سے دامن بچانے کی کوشش کرتے ہوئے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنی زندگی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں بسر کرے تو اس عمل اور رویّہ کا نام تقویٰ ہے۔ ہر انسان کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ اور اس شدنی امر کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اور صرف اس کی ذات سبحانہٗ جانتی ہے کہ کس کو کس وقت اور کہاں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنی ہے۔ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ۔ پھر اس نے اپنے اس اٹل قانون کو بھی وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ موت کا مقررہ وقت ٹل نہیں سکتا وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا اس لئے ہمیں ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اور ہمیں اپنی زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں گزارنے کی فکر کرنی چاہیے چونکہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ کب ہماری مہلت ختم ہو جائے اور ہمارا بلاوا آ جائے۔ یاد رکھیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں زندگی بسر کرنے کی مسلسل سعی و جہد کرتے رہنا ہی دراصل تقویٰ ہے۔ اور اس کی تعلیم اللہ تعالیٰ نے اپنی

کتابِ مبین میں جو ھُدًی لِّلنَّاس ہے متعدد اسالیب سے دی ہے:۔ یاایھا الـذین اٰمنُوا اتقوا اللہ حق تقتہ ولا تموتن الا وانـتم مسلمون (آلِ عمران) اور: فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا وانفقوا خیراً لِاَنفسکم (التغابن) اور: یاایھا الـذین اٰمنوا اتقوا اللہ وَاٰمنوا برسلہ (الحدید)۔ لہٰذا تنظیم کے اس اختتامی اجتماع میں اپنے تمام رفقاء کو اور خود اپنے نفس کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہوں۔ اوصیکم وَنفسی بتقوی اللہ۔

موجودہ دور کے فتنوں میں ایک بڑا فتنہ "معاشی مسئلہ" ہے لوگ دنیا کمانے اور زیادہ سے زیادہ سامانِ تعیش اور آسائشِ دنیا کے حصول میں لگے ہوئے ہیں۔ حلال وحرام کی تمیز معدوم کے درجے میں آگئی ہے۔ جو آسودہ حال ہیں۔ ان پر مزید کمانے کی دھن سوار ہے۔ جو غریب طبقہ سے متعلق ہیں وہ حسد ونفرت کے شکار ہیں۔ حبِ دنیا نے پوری طرح انسانی ذہن پر پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ حُبِّ دنیا کی علامت ہے حبِ مال۔ چونکہ یہی ذریعہ ہے۔ اس عیش وتعیش اور لذات کے حصول کا جس میں نفسِ انسانی مبتلا ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ "عبادت وتقویٰ میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھو اور اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ یہی تعلیم قرآن میں موجود ہے۔ فاستبقوا الخیرات۔ اور نعمتوں اور معاش (روزی) کے معاملے میں اپنے سے نیچے والے کو دیکھو تاکہ تم کو جو کچھ ملا ہے اس پر شکر کرو۔" لیکن آج معاملہ برعکس ہے۔ آج خیر کے کاموں میں سبقت کا فقدان ہے اور ہے بھی تو "ریا" پیش نظر ہوتی ہے۔ جو بھی تگ ودو میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس کا مقصود حصولِ مال نظر آتا ہے۔ آج قناعت عنقا ہے ہر شخص دنیا کمانے میں دیوانوں کی طرح لگا ہوا ہے۔ الا ما شاء اللہ۔ کیا دین اور اس کے احکام، کیسی آخرت اور اس کا احتساب، آج انسان کا وہی حال ہے۔ جس کا نقشہ قرآن حکیم میں سورۃ الھمزہ میں یوں کھینچا گیا ہے کہ اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالاً وَّعَدَّدَہٗ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ از روئے قرآن حُبِّ مال دنیا پرستی ہے، خدا پرستی نہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ○ اور اہلِ ایمان کو متنبہ کر دیا گیا کہ: قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ط وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ

نا سِقِیۡنَ ۝ (سورۂ توبہ)

مال کے پرستاروں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دینار و درہم کا بندہ (عبد) قرار دیا ہے۔
رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے بددعا فرمائی ہے: تَعِسَ عَبۡدُ الدِّیۡنَار
عَبۡدُ الدِّرۡھَمِ "تباہ و برباد ہو دینار کا بندہ اور درہم کا بندہ"

ہم ہر نماز میں پڑھتے ہیں: اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ۔ لیکن اللہ کی ربوبیتِ کاملہ پر ہمارے
ن و یقین کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم از روئے قرآن و حدیث اپنی تنظیم کے رفقاء کے لئے حلال و
م کی حدود و قیود عائد کرتے ہیں تو لوگ تربّص و تردّد میں مبتلا نظر آتے ہیں کہ ہمارے کاروبار اور
رت کا کیا ہوگا؟ ہماری معاش کا کیا ہوگا! ہمارے بال بچوں کی پرورش اور تعلیم کیسے ہوگی؟
ب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ شیطانی فریب ہے، یہ خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے۔ یہ طرزِ فکر
ل اور اللہ کے رب اور رازق ہونے پر ایمان کے منافی ہے۔ اللہ تعالٰے تو اپنی کتابِ مبین
ں واضح طور پر ہر ذی حیات کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرنے کا اعلان فرماتا ہے: وَمَا
ں دَآبَّۃٍ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزۡقُھَا وَیَعۡلَمُ مُسۡتَقَرَّھَا وَمُسۡتَوۡدَعَھَا کُلٌّ فِیۡ
ابٍ مُّبِیۡنٍ (ھود) — لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ چند روزہ زندگی کے آرام و آسائش کے
ہ آخرت سے بے پروا ہوگئے ہیں محاسبۂ اُخروی کی فکر سرے سے موجود ہی نہیں فکر ہے،
ج ہے، منصوبہ بندی ہے، بھاگ دوڑ ہے تو دنیا کمانے کے لئے جس کو قرآن "متاعِ غرور"
ا ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیات از ۳۰ تا ۳۵ ہمارے منتخب قرآنی
اب میں درس نمبر ۲ کی حیثیت سے شامل ہیں۔ یہ درس اس آیت سے شروع ہوتا ہے:۔
ں الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا "بے شک جن لوگوں نے کہا اللہ ہمارا رب
ہ (پالن ہار اور پروردگار) ہے اور اس اقرار و ایمان پر استقلال کے ساتھ جم گئے"۔ تو اللہ تعالیٰ
ن کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے اور ان کو کن کن بشارتوں سے نوازتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالٰے
تا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡھِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ
اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۝ نَحۡنُ
اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمۡ فِیۡھَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ ٥ نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ ٥

پس اُوْصِيْكُمْ وَنَفْسِيْ میں خود کو بھی اور آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ اور رزاقیتِ تامّہ پر پورا پورا توکل رکھیں۔ اپنی معاش کے ذرائع میں حرام و ناجائز کاموں اور ذرائع کو چن چن کر نکالنے کی بھرپور کوشش کریں۔ اس کام میں انشاء اللہ العزیز ہمیں اپنے رب اور خالق کی حمایت و نصرت حاصل ہوگی۔ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ٥

پاکستان میں بہت سی دینی جماعتیں اور جمعیتیں اپنی اپنی فکر کے مطابق کام کررہی ہیں۔ ہماری کسی جماعت و جمعیت سے مخالفت نہیں ہے۔ اختلافات البتہ ہیں۔ اسی لئے ہم نے تنظیم اسلامی کی تاسیس کی ہے۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے ہمیں اپنے جن دینی فرائض کا شعور حاصل ہوا ہے ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے قرآن حکیم سے جو طریق کار اور منہاج ہم پر واضح ہوا ہے اگر اس کے عین مطابق دعوت الی اللہ اور اظہارِ دین حق کا فرض کوئی جماعت یا جمعیت انجام دے رہی ہوتی تو میں اپنی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ میں اس جماعت یا جمعیت کے ساتھ اپنی وابستگی اور معمولی کارکن کی حیثیت سے اس میں شمولیت کو اپنے لئے سعادت سمجھتا۔ جیسا کہ میں اپنی افتتاحی تقریر میں عرض کرچکا ہوں کہ ایک اصولی انقلابی اور دینی تنظیم قائم کرنا اور اس کو صحیح نہج پر چلانا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے۔ لیکن اس کا بیڑا میں نے صرف احساسِ فرض کی ادائیگی کے لئے اٹھایا ہے۔

جز دار اگر کوئی مفر ۔ ہو تو بتاؤ ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں۔

میں اپنے رفقاء کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ ان قائم شدہ جماعتوں، جمعیتوں کے کارکنان، متفقین اور متاثرین سے بحث و مباحثہ کرنے اور الجھنے سے اپنا دامن بچائیں۔ ایسے حضرات کو دعوت پہنچانا اور افہام و تفہیم کے لئے اُن سے مذاکرہ کرنا تو مقصود و مطلوب ہو لیکن جب کج بحثی اور کٹ حجتی کی کیفیت پیدا ہو جائے تو ہمیں فوراً " قَالُوْا سَلٰمًا " پر عمل کرنا چاہیئے۔ ہمیں مثبت طریقہ پر اپنی دعوت خلق خدا تک پہنچانی ہے۔ کسی سے بحث اور مناظرہ کی قطعی کوئی حاجت نہیں ہے۔ یہ طرزِ عمل تنظیم کی دعوت کے لئے مطلب ہونے کے بجائے سمِ قاتل ہوگا۔

یہ نصیحت بھی پیش نظر رکھئے کہ ہمارے ملک میں دو مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ایک مکتبِ فکر اور دوسرا اہلِ حدیث، ان مکاتبِ فکر میں فروعات اور جزئیات میں اختلافات ہیں

بحمد اللہ اصول دین میں کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں ہے ۔ لہٰذا رفقاء کو آپس میں فقہی مسائل
پر بحث دیکھیں سے اپنا دامن بچانا چاہیئے اور عامۃ المسلمین سے بھی ان مسائل پر گفتگو سے پرہیز
کرنا چاہیئے ۔

بعض رفقاء پر اپنی افتادِ طبع کے باعث تنظیم کے نظم کی پابندی گراں گزرتی ہے ۔ میں اپنے
رفقاء کی توجہ عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی کے جزو " د " کی طرف مبذول کراتا ہوں جس
کے الفاظ یہ ہیں :

" خدا کو حاضر و ناظر جانتے ہوئے اور " اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا " کو
پیش نظر رکھتے ہوئے پورے احساسِ مسئولیت کے ساتھ عہد کرتا ہوں کہ اپنے
فرائض دینی کی انجام دہی کے لئے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کہ
اَنَا اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ " کے مطابق " تنظیم اسلامی " کے نظم کی پوری پابندی کروں گا ۔"

نظم کی پابندی اس عہد کی وجہ سے تمام رفقائے تنظیم پر واجب ہے اس کو بلا کانہ سمجھئے بلکہ اپنے
فرائض کا تقاضا سمجھ کر نظم کی پابندی کیجیے ۔

میں آخر میں اپنے رفقاء کو نصیحت کرتا ہوں کہ " تنظیم اسلامی " کا اصل محور اور حقیقی
نصب العین آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے جس کے لئے سورۃ العصر میں چار ناگزیر
امور بیان کر دیئے گئے ہیں :

۱ ۔ ایمان ۲ ۔ عمل صالح ۳ ۔ تواصی بالحق ۴ ۔ تواصی بالصبر

بیک وقت ان چاروں نشانات راہ اُخروی کو پیش نظر رکھنا ہے ۔ اور ان چاروں کا حق
ادا ہوگا ۔ لہٰذا ہر رفیق کو یہ سورۂ مبارکہ ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے اور اس کا آپس میں مذاکرہ
کرتے رہنا چاہیئے ۔ جیسا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے تعامل سے ثابت ہے ۔
میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے دینی فرائض اور فرض عبادات کو ان ہی شرائط کے
ساتھ ادا کرنے کی فکر کیجیے جو قرآن و سنت میں بیان ہوئی ہیں ۔

میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ تلاوتِ قرآن مجید کو اپنا شعار بنائیے کسی مستند ترجمہ اور
تفسیر کی مدد سے اس کا " مطالعہ " بھی کیجیے اور اس پر غور و تدبر بھی ۔ حدیث شریف ، سیرت ؐ
اور سیر صحابہ ؓ کے مطالعہ کو بھی اپنے معمولات میں شامل کیجیے ۔

میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نوافل، خاص طور پر تہجد کا اہتمام کرنے کی کوشش کیجیے۔ ہم بہت ہی کمزور اور بے بضاعت ہیں۔ ہمارے لئے زادِ راہ اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ ہم میں نفلی عبادات کا شوق پروان چڑھے۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کو اپنا شعار بنائیے۔ صبغۃ اللہ اسی طرزِ عمل سے ہم پر غالب آئے گا: قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (سورہ آل عمران)۔

ان معروضات کے بعد میں اس دعا پر یہ گفتگو ختم کرتا ہوں۔

اَللّٰھُمَّ ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہٗ۔

آمین یا ربّ العٰلمین!

بہار کے آثار
صافی
خون صاف
چہرہ شاداب
ADARTS

ایک مسنون دُعا
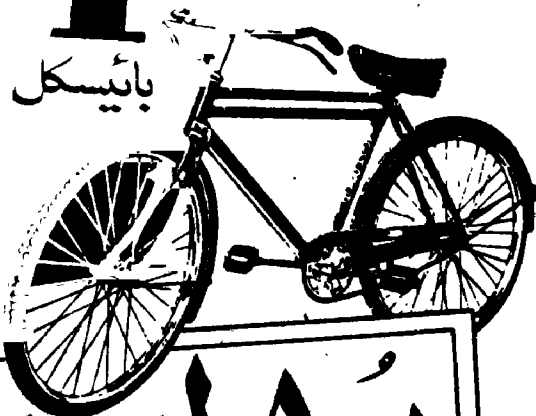
اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ
وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّيَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْكَذِبِ
وَاَعْيُنَنَا مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ
الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھُوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

چند بنیادی و انقلابی فیصلے

تنظیم اسلامی کے دوسرے سالانہ اجتماع کے انعقاد کے لئے مارچ ۷۷ء کی اواخر کی تاریخیں مقرر کر کے اعلان کر دیا گیا تھا لیکن ۷۷ء میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حکومت وقت کی طرف سے کی گئی ناانصافیوں اور دھاندلیوں کے خلاف احتجاجی مظاہروں نے جلد ہی ایک ملک گیر اور ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی جو " تحریک نظام مصطفٰے " کے نام سے موسوم ہوئی اور دیکھتے دیکھتے جنگل کی آگ کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔ اس تحریک کو نہ پولیس کا بہیمانہ تشدد روک سکا اور نہ متعدد بڑے شہروں میں کرفیو اور جزوی مارشل لا کا نفاذ اس تحریک کی راہ میں مزاحم ہو سکا۔ الغرض پورا ملک شدید بدامنی اور بحران کی زد میں آ گیا۔ دریں حالات تنظیم اسلامی کا طلب کردہ دوسرا سالانہ اجتماع ملتوی کرنا پڑا۔ ۴ اور ۵ جولائی ۷۷ء کی درمیانی شب کو فوج نے قومی اور تمام صوبائی اسمبلیوں اور برسرِ اقتدار پارٹی کی حکومتوں کو برطرف کر کے ملک کا نظم و نسق سنبھال لیا اور پورے ملک میں مارشل لا نافذ ہو گیا جس کے باعث ملک کی غیر یقینی اور بدامنی کی فضا میں ایک خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب داعی عمومی نے چند رفقاء کے مشورے سے فیصلہ کیا کہ تنظیم اسلامی کا دوسرا اور تیسرا (مشترکہ) سالانہ اجتماع ۵ تا ۱۱ اگست ۷۷ء لاہور میں منعقد کر لیا جائے اور اس میں تنظیم اسلامی کے عبوری دستور کے بجائے ایک مستقل لائحۂ عمل کا فیصلہ کرا لیا جائے۔ یہ اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ اندازہ نہیں ہو تا تھا کہ آئندہ ملک کے سیاسی حالات کیا رُخ اختیار کریں گے اور امن و امان کی صورتِ حال کیا ہو گی!

اس ہفت روزہ اجتماع میں تنظیم کی قریباً ڈھائی سالہ کارگزاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ نیز قرار داد تاسیس اور اس کی توضیحات اور عبوری دستور کی روشنی میں مستقبل کے لئے تنظیم اسلامی کے لائحۂ عمل اور نظم جماعت کے متعلق حسب ذیل اہم فیصلے کئے گئے:

فریضۂ اقامتِ دین

(۱) اقامتِ دین، شہادت علی الناس اور غلبہ و اظہارِ دین کی سعی و جہد نفلی عبادت یا اضافی نیکیاں نہیں بلکہ ازروئے قرآن و حدیث بنیادی دینی فرائض میں

شامل ہیں۔

اس کے ضمن میں داعی عمومی نے قرآن و حدیث کی روشنی میں جو طویل مدلل خطاب ارشاد فرمایا **اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:**

"آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے 'تنظیم اسلامی' کے تاسیسی اجتماع میں یہ عرض کیا تھا کہ ہماری اس تنظیم کی سب سے عظیم اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اساس دعوت رجوع الی القرآن' کے نتیجہ میں قائم ہوئی ہے' اور درس قرآن حکیم ہی سے ہمارے سامنے یہ بات آئی ہے کہ امت مسلمہ کی تاسیس کی غرض وغایت ہے شہادت علی الناس **بفحوائے الفاظ قرآنی:**

وَ كَذٰلِكَ وَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ آیت ۱۴۳)

"اور اسی طرح ہم نے تمہیں امت وسط بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے!"

یہی مضمون سورۃ الحج کی آخری آیت میں اس عکسی ترتیب کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اس میں رسول کا ذکر پہلے ہے اور امت کا بعد میں۔ فرمایا:

وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (آیت ۷۸)

"اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ جدوجہد کا حق ہے۔ اسی نے تم کو (اس کام کیلئے) منتخب کیا ہے اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت کو تمہارے لئے پسند فرمایا۔ اسی (اللہ) نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے اور اس (قرآن) میں بھی تاکہ رسول تم پر (اللہ کے دین کی) گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو!"

خطبہ حجتہ الوداع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فریضہ شہادت علی الناس' کو کمال حکمت کے ساتھ امت کی طرف منتقل فرمایا۔ چنانچہ کتب احادیث میں مذکور ہے کہ اس خطبہ مبارکہ میں اہم ہدایت دینے کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق اس حج میں شریک تقریباً سوا لاکھ کے مجمع سے دریافت فرمایا:

اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ ؟ لوگو! میں نے خدا کا پیغام' اس کی ہدایت پہنچادی یا نہیں؟ تبلیغ کا حق ادا ہو گیا یا نہیں؟ مجمع نے یک زبان ہو کر جواب دیا:

نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ **بے شک آپ نے پہنچادیا'** امانت ادا فرمادی اور **امت پر حق نصح اور حق خیر خواہی ادا فرمادیا۔**

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ایک بار نہیں تین مرتبہ دریافت فرمائی تاکہ بات پوری طرح واضح اور پختہ ہو جائے۔ صحابہ کرامؓ نے تین بار جواب میں عرض کیا۔ نشھد انک قد بلغت وادیت و نصحت اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں' پھر انگلی اٹھا کر بارگاہ رب العزت میں عرض کیا۔

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ ! (اے اللہ تو بھی گواہ رہے) یہ جملہ تین بار عرض کیا اور ہر بار انگلی سے آسمان اور پھر مجمع کی طرف اشارہ کیا۔ اس سوال و جواب کے بعد نبی آخر الزماںؐ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب فرما کر شہادت علی الناس اور تبلیغ دین حق کی ذمہ داری امت کی طرف منتقل فرما دی اور ارشاد فرمایا:

فلیبلغ الشاھد الغائب اب جو لوگ یہاں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ان لوگوں تک پہنچائیں جو موجود نہیں۔

اسی طرح امت مسلمہ بحیثیت امت تاقیام قیامت شہادت علی الناس اور تبلیغ دین حق کے فریضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ٹھہرا دی گئی

سورۂ آل عمران میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آیت ۱۱۰)

اس آیت مبارکہ میں بھی امت مسلمہ کی تاسیس اور بعثت کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مقرر کیا گیا۔ گویا کہ یہ کام امت پر فرض ہے کہ وہ نوع انسانی کو نیکی کا حکم دیتی رہے' اور برائیوں سے روکتی رہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' شہادت علی الناس ہی کا ایک مظہر اور ایک مرحلہ ہے۔ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے سیاسی قوت ناگزیر ہے' جس سے اقامت دین کا حکم مستلزم ہوتا ہے۔

آگے چلئے! قرآن حکیم میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں تین مقامات (سورۂ توبہ' سورۂ فتح' سورۂ صف) میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ (رسول) اس کو تمام ادیان (نظام ہائے اطاعت اور ہر جنس اطاعت) پر غالب کر دے!"

ہمارے ایمان کا لازمی جزو ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف نبوت ختم نہیں ہوئی ہے' بلکہ حضورؐ کی ذات پر نبوت کی تکمیل ہوئی ہے۔ اب تاقیام قیامت حضور ہی کا دور دعوت و رسالت جاری و ساری ہے اور اب کسی نوع کا کوئی نبی نہیں آئے گا' یہ دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ بنی نوع انسان تو ابھی ہدایت کی محتاج ہے اور دین الحق دنیا کے تمام نظاموں پر ابھی غالب نہیں

ہوا۔ یہ کام تاحال تشنہ تکمیل ہے۔ اس کام کی ادائیگی کی ذمہ داری کس کے کاندھوں پر ہے اس بات کو سورہ صف میں واضح کر دیا گیا چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی امتیازی شان بیان کرنے کے فوراً بعد فرمایا

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ھَلْ اَدُلُّکُمْ عَلٰی تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں، جو تم کو عذاب الیم سے بچائے؟ (پختہ) ایمان رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور جہاد (جدوجہد اور کشمکش) کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ الصف ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین پر مفصل گفتگو تو درس کے موقع پر ہوتی ہے۔ یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصی و امتیازی شان "لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ" کے بعد حضورؐ کی تصدیق کرنے والوں سے مطالبہ کیا جارہا ہے کہ حضورؐ پر ایمان لانے کے تقاضے بھی پورے کرو۔ یعنی غلبۂ دین کیلئے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ یہی راستہ آخرت میں فوز و فلاح اور عذاب الیم سے چھٹکارا دلانے والا ہے۔ پھر آگے اللہ کے دین کے غلبہ کی سعی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنا انصار قرار دیا ہے۔ اس سے زیادہ بلند مقام کا ایک بندۂ مومن تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ اس کو اپنا انصار قرار دے۔ یہ جملہ آیات اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ عبادات مفروضہ (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ بھی ایمان کا لازمی تقاضا بلکہ فرض ہے۔ اس مسئلہ پر میں آگے بھی کچھ عرض کروں گا۔

آگے آیئے! سورۂ حدید مکمل ہمارے منتخب قرآنی نصاب میں شامل ہے اگر یہ درس آپ کے ذہن میں مستحضر ہو تو آپ کی توجہ اس آیت کی طرف مبذول ہوئی ہو گی:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (سورۂ حدید آیت ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ (نظام) عدل پر قائم ہوں، اور لوہا اتارا جس میں جنگ کیلئے بڑی قوت ہے اور لوگوں کیلئے منافع ہیں۔ یہ (سب کچھ) اس لئے (کیا گیا ہے کہ) اللہ واضح کر دے کہ کون اس (اللہ) کو دیکھے بغیر اس (کے دین) کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ تو ہے ہی بڑی قوت والا اور زبردست و غالب!"

اللہ اور اس کے رسول کی نصرت سے مراد اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی اقامت ہے، اس کا

نفاذ ہے جیسا کہ سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں چند اولوالعزم انبیاء کرامؑ کا نام بنام ذکر کر کے آیت کے درمیان میں نزول کی یہ غرض وغایت بیان کی گئی کہ۔ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ "قائم کرو (اللہ کے) دین کو اور اس معاملہ میں اختلاف نہ کرو !"

آگے آیئے! آپ کو معلوم ہے کہ مکمل سورۃ حجرات بھی ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ اس میں اسلام اور ایمان کے فرق پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کے درس میں آیت نمبر ۱۴ اور نمبر ۱۵ کے موقع پر میں یہ وضاحت کیا کرتا ہوں کہ بلاشبہ نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ارکان اسلام ہیں۔ لیکن ان دو آیات کے مطالعے اور اس میں غور و تدبر کرنے سے یہ بات بھی واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ہر ریب و شک سے مبرا اور پاک و صاف قلبی یقین اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد دراصل ایمانِ حقیقی کے دو رکنِ رکین ہیں۔ فرمایا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ

"بلاشبہ مومن تو بس وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر۔ پھر کسی ریب اور شک میں نہیں پڑے اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ پس یہی لوگ (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں!"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا...... "میرے محدود مطالعہ میں قرآن حکیم میں یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان حقیقی کی جامع و مانع تعریف ( ) کی گئی ہے غور کیجئے کہ بات "انما" سے شروع کی گئی ہے جو کلمہ حصر ہے۔ یعنی مومن حقیقی ہونے کیلئے یہ دو اوصاف پائے جانے ضروری ہیں۔ پہلا وصف ریب و تشکیک سے پاک قلبی یقین اور دوسرا وصف جہاد فی سبیل اللہ۔ پھر آیت کے اختتام پر اسلوب حصر اختیار کیا گیا ہے، وہاں فرمایا۔ اولٰئک ھم الصدقون ○ صرف یہی لوگ (یعنی جو لوگ قلبی یقین سے بہرہ مند ہوں اور جن کی مساعی کا ہدف جہاد فی سبیل اللہ ہو صرف وہی اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں۔

دنیا سے برائی کو دور کرنے کی سعی و جہد کا حدیث میں کیا مقام ہے؟ اس کو احادیث شریفہ سے بھی سمجھئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ وَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ وَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (صحیح مسلم)

"جو کوئی تم میں سے کسی برائی کو دیکھے تو چاہیئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (طاقت) سے بدل دے۔ اور اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے (بدل دے) اور اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اسے برا جانے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے!"

اسی حدیث کی ایک دوسری روایت کے آخری ٹکڑے میں اس سے مختلف الفاظ منقول ہوئے ہیں۔ وہاں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ۔ وَ لَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ (صحیح مسلم) "اس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود نہیں ہے۔"

اس حدیث کے اسلوب میں "امر بالمعروف" خود ہی مضمر ہے۔ برائیوں کو اچھائیوں سے بدلنا اس حدیث کا اصل مفہوم ہے۔ اگر صورتحال یہ ہو کہ ایک مسلمان نہ ہاتھ سے برائی کو بدلنے کیلئے جدوجہد کا اپنے اندر داعیہ رکھتا ہو' نہ برائی کو برا کہنے کی ہمت پاتا ہو اور نہ ہی اپنے دل میں برائی کے خلاف نفرت و کراہت کے جذبات رکھتا ہو تو ایسے شخص کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے۔

داعیٔ عمومی نے مزید فرمایا:

"میں نے قرآن حکیم اور احادیث شریفہ سے دین کو سمجھنے کی جو حقیر سی محنت اور کوشش کی ہے، اس کے نتیجہ میں میری یہ پختہ رائے ہے کہ جب دنیا کے قابل ذکر خطۂ زمین پر اسلام ایک غالب اور عالمگیر قوت کی حیثیت سے قائم و نافذ ہو اور یہ ریاست ملکی سطح پر تبلیغ دین اور اقامتِ دین کا فرض انجام دینے میں کوشاں ہو تو اس ریاست میں بسنے والے مسلمانوں پر جہاد و قتال فی سبیل اللہ فرض کفایہ اور اضافی نیکیاں اور نفلی عبادات قرار دی جا سکتی ہیں۔ البتہ اس حال میں بھی ریاست کے اولوالامر کی طرف سے جب بھی جہاد و قتال کیلئے نفیر عام ہو تو ہر بالغ و صحت مند مسلمان کو لبیک کہنا اس کے حقیقی ایمان کا تقاضا ہے۔ لیکن جب دینِ حق مغلوب ہو اور مسلمانوں کی اکثریت رکھنے والے ممالک میں بھی دینِ حق غالب' قائم اور نافذ نہ ہو۔ اللہ کی شریعت' اس کی حدود و تعزیرات' اس کے احکام و امر و نواہی جاری و ساری نہ ہوں۔ تو میرے نزدیک از روئے قرآن و حدیث وہ شخص ہرگز حقیقی دین دار اور مومنِ صادق نہیں ہے جس کا دائرہ صرف انفرادی طور پر عباداتِ مفروضہ کی ادائیگی تک محدود ہو اور جس کی توانائیاں دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہوں۔

لہٰذا میری پختہ رائے ہے کہ اقامتِ دین' شہادت علی الناس' اور غلبۂ و اظہارِ دین کی جدّوجہد نفلی عبادات یا اضافی نیکیاں نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث بنیادی فرائض میں داخل ہیں"

التزامِ جماعت

(۱۱) ان دینی فرائض کی ادائیگی کے لئے **التزامِ جماعت** لازم ہے۔

اس کے ضمن میں داعیٔ عمومی نے اپنے طویل خطاب میں جو نقلی و عقلی دلائل پیش کیے' ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

"ہمارے اذہان کو اس اعتبار سے بالکل مطمئن ہونا چاہئے کہ جب ہم نے قرآن و سنت کی روشنی میں یہ بات پورے شعور کے ساتھ قبول کر لی کہ شہادت علی الناس' دعوت الی اللہ اور اقامت و اظہارِ دینِ حق ہمارے بنیادی دینی فرائض میں شامل ہیں' یہ محض اضافی نیکیاں نہیں ہیں تو اس کا ایک لازمی تقاضا

سامنے آتا ہے کہ ایسی صورت میں جب کہ امت مسلمہ بحیثیت امت ان دینی فرائض کی ادائیگی نہ کر رہی ہو تو مسلمانوں ہی میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو ان فرائض کی ادائیگی کے لئے کمربستہ ہو اور اس جماعت کی تمام مساعی اور جدوجہد کا ہدف دعوت الی اللہ ہو۔ اس جماعت میں شامل افراد ایک طرف خود اپنی انفرادی زندگی کی اصلاح کریں' اپنے اعمال کو شریعت کے مطابق بنانے کی طرف متوجہ ہوں۔ فرض عبادات کو ان کی شرائط کے مطابق ادا کرنے کی سعی کریں۔ اپنے گھروں کو خلاف اسلام رسوم اور رواجات سے پاک کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ دوسری طرف اپنے معاشرے میں "الاقرب فالاقرب" کی تدریج کے ساتھ "تواصی بالحق' ..... اور "اَلدِّیْنُ' النَّصِیْحَۃُ' کا فرض انجام دینے کی فکر کریں۔ یہی وہ بات ہے جو سورۃ العصر اور آیہ بر (البقرہ ١٧٧) کے دروس میں بالخصوص ہمارے سامنے آچکی ہے۔ سورۃ العصر میں فلاح دنیوی اور نجات اخروی کے لئے شرط لازم کے طور پر ایمان' اعمال صالح کے بعد باب تفاعل کے جمع کے صیغے میں تواصوا بالحق فرمایا گیا۔ جو کہ جماعت کے وجود کو مستلزم ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ١٤٣ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ١١٠ اور سورۃ الحج کی آخری آیت (٧٨) میں شہادت علی الناس کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے امت کا لفظ اختیار فرمایا گیا جن کا حوالہ میں پہلی تنقیح پر اظہار رائے کے موقع پر تفصیل سے دے چکا ہوں۔ یہاں میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ان آیات کا اصلاً خطاب بلاشبہ پوری امت سے ہے۔ لیکن اگر امت بحیثیت امت اس فرض کو ادا نہ کر رہی ہو تو اس کے لئے رہنمائی قرآن حکیم اور احادیث میں موجود ہے۔

لزوم جماعت اور قرآن حکیم

داعی عمومی نے فرمایا کہ "ہمارے دین کا مجموعی مزاج خالص اجتماعی مزاج ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں سے سارا خطاب یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے ہوتا ہے۔ یہ اسلوب جماعت و امت کو مستلزم ہے۔ سورۂ بقرۃ کی آیت نمبر ١٤٣ کے پہلے حصے وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّ سَطًا پر میری ایک مستقل تقریر "فریضہ شہادت" کے نام سے موجود ہے۔ پھر سورہ حج کا آخری رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ جس میں آخری آیت وَ جَاھِدُوْا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ الی آخر الایہ...... پر مفصل بحث ہوتی رہی ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ١١٠ کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ پر مختلف دروس قرآن اور تقاریر میں میں اظہار خیال کرتا رہا ہوں۔ لیکن آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سارے حوالے پوری امت مسلمہ پر منطبق ہوتے ہیں۔ میں ان کو تسلیم کرتا ہوں اور اب میں آپ کی توجہ آل عمران کی اس آیت کریمہ (١٠٤) کی طرف مبذول کرتا ہوں جو پوری امت کے اندر ایک چھوٹی امت یعنی جماعت یا گروہ کے وجوب' اہمیت و ضرورت پر دلالت کرتی ہے اور جو اس مسئلہ پر نص قطعی کے مقام کی حامل ہے۔ وَ لْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ

اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ "اور تم میں ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہئے جو نیکی کی طرف بلانے والوں پر مشتمل ہو جو نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہوں اور جو لوگ یہ کام کریں گے، وہی فلاح پائیں گے۔" بڑی امت میں سے اس چھوٹی امت جس کا مقصود و مطلوب صرف دعوت الی الخیر اور معروف کا حکم اور منکر سے روکنا ہو، اس امت میں شامل ہونے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے فلاح کی بشارت دی ہے۔ پھر دیکھئے کہ ہمارے دین میں پنج وقتہ فرض نمازوں کے لئے جماعت کے التزام کی کتنی تاکید کی گئی ہے...... پھر جمعہ کی نماز تو بغیر جماعت کے ادا ہی نہیں ہوتی... یہی حال عیدین کی نمازوں کا ہے...... پھر ہر مسلمان پر سال کے کسی مہینے میں ایک ماہ کے روزے فرض نہیں کئے گئے بلکہ پوری امت کے لئے ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے تاکہ اجتماعیت کی شان قائم رہے۔ حج تو ہے ہی سراسر اجتماعی عبادت...... یہ ہے ہمارے دین کے احکام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے لزوم کا انتظام و انصرام۔

داعی عمومی نے مزید فرمایا۔ اب میں آپ کی توجہ اس حدیث کی طرف مبذول کراتا ہوں۔ جس کو ہم نے بہت عام کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ میں سے اکثر کو یاد ہو گی۔ یہ حدیث جامع ترمذی کی ہے۔ عَنِ الْحَارِثِ الْاَ شْعَرِیؓ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم .۔ امرکم بخمس بالجماعۃ و السمع و الطاعۃ و الھجرہ والجھاد فی سبیل اللہ "حضرت الحارث الاشعریؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ جماعت کا۔ سننے کا۔ ماننے کا اور ہجرت کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا۔"

ایک دوسری روایت میں امرکم بخمس کے بعد الفاظ آئے ہیں۔ اللہ امرنی بھن "اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا۔" یعنی یہ حکم میں خاص اللہ کی طرف سے تمہیں دے رہا ہوں۔ اس حدیث میں ہمارے لئے بڑی رہنمائی ہے لزوم جماعت اس سے ثابت ہوتا ہے۔ پھر اس جماعت میں سمع و طاعت کا نظم (DISCIPLINE) لازم ہے۔ کوئی ڈھیلی ڈھالی انجمن وغیرہ قسم کا ادارہ مطلوب نہیں۔ پھر اس جماعت کے مقاصد اور نشانات منزل بھی متعین کر دیئے گئے ہیں۔ وہ ہیں ہجرت اور جہاد ... دین کی ان دونوں اصطلاحات کے وسیع الاطراف معانی و مفاہیم میں کئی بار بیان کر چکا ہوں۔ اس موقع پر بھی بیان کر دیتا ہوں۔ ایک صحابی نے نبی اکرمؐ سے دریافت کیا۔ ای الھجرہ افضل یا رسول اللہ آنحضورؐ نے جواب دیا۔ ان تھجر ما کرہ ربک یہ کہ "تو ہر اس کام کو چھوڑ دے جو تیرے رب کو ناپسند ہو۔" جہاد کے متعلق آنحضورؐ سے دریافت کیا گیا۔ ای الجھاد افضل یا رسول اللہ جواب میں نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ ان تجاھد نفسک فی طاعۃ اللہ "یہ کہ تو کوشش اور محنت کرے کہ تیرا نفس (تیری خواہشات) اللہ کی طاعت کا خوگر ہو جائے"...... پس اس حدیث میں لزوم جماعت کا حکم بھی موجود۔ اس کی

یت تنظیمی کے لئے رہنمائی موجود اور اس جماعت کی تاسیس کے مقاصد بھی موجود ہیں۔
داعی عمومی نے مزید فرمایا..... میں اپنی امکانی حد تک قرآن مجید اور احادیث شریفہ سے دعوت الی اللہ، اعلائے کلمۃ اللہ، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے لئے جماعت کی ضرورت و اہمیت پابندی کے لزوم پر نصوص آپ کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین کی اصطلاح میں ان کو "نقل" کہا جاتا ہے۔ یعنی کتاب و سنت کے دلائل سامعین و قارئین کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ یکن دلائل کی حکمتوں کو واضح کرنا، اس کے لئے عقل، فکر و نظر اور مشاہدات سے استدلال کرنا بھی دین کے دائرے میں آتا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ جماعت یا تنظیم کی ضرورت اور اس نظم کی پابندی کے زوم پر چند عقلی دلائل بھی آپ حضرات کے غور و فکر کے لئے پیش کر دوں۔
میں سمجھتا ہوں کہ عقلی دلیل ایک جملہ میں بھی بیان ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نتیجہ خیز اور وئی انقلابی و اصلاحی کام بغیر اجتماعیت کے ہوتا ہی نہیں۔ چاہے وہ خیر کے لئے ہو چاہے شر کے لئے، پاہے اسلام کے غلبہ کے لئے ہو چاہے کفر کے غلبہ کے لئے۔ کام ہی کرنا پیش نظر نہ ہو اور اپنے آپ کو ریب میں مبتلا رکھنا ہو تو خوئے بد را بہانہ بسیار والا معاملہ ہو گا۔ اگر آپ واقعتاً کوئی عملی کام کرنا چاہتے ہں تو اس کے لئے تنظیم و جماعت یعنی ایک ہیئت اجتماعیہ کا وجود لابد ہے، لازم ہے، ناگزیر ہے۔ یہ وہ صول ہے جس میں کوئی استثنیٰ (EXCEPTION) سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ محاورہ اپنی جگہ لکل صحیح ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ اجتماعیت انسانی تہذیب و تمدن ہی کا لازمی عنصر نہیں ہے۔ یہ ہر تحریک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وہ اصول ہے جو آفاقی طور پر مسلم ہے۔ یہ لگیر سچائی (UNIVERSAL TRUTH) اور بدیہیات فطرت میں سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عقلی دلیل کے طور اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے۔ اس پر مزید کچھ کہنا بالکل غیر ضروری ہو گا۔ البتہ میں اس موقع پر آپ کی توجہ ں طرف دلاؤں گا کہ جن لوگوں نے اشتراکیت، فسطائیت یا جمہوریت کو اپنا نصب العین، مطمح نظر راپنا مقصود (IDEAL AND GOAL) بنایا۔ انہوں نے اس کے لئے ہیئت اجتماعیہ قائم کی اس میں نظم و ضبط (DISCIPLINE) بہت سخت رکھا۔ چنانچہ دنیوی طور پر ان کی ان مساعی ہی کے نتیجے میں کامیابیوں نے ان ے قدم چومے۔ جن ممالک پر بیرونی طاقتوں کا فوجی اور سیاسی تسلط تھا، انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اجتماعی جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور بالآخر کامیاب و کامران ہوئے۔ حالانکہ ان مقاصد کے لئے ام کرنے والوں کے پیش نظر اور ان کے عقائد میں "آخرت" کا کوئی تصور سرے سے موجود ہی ں۔ جب کہ ہمارے لئے یہ نوید جانفزا موجود ہے کہ اللہ کے دین کے لئے جدوجہد اور قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ دنیا میں اگر ان کے ٹھوس عملی نتائج نہ بھی نکلے تب بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں ان ں نثاروں کا اجر محفوظ رہے گا۔ جیسا قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ مذکور ہے۔
سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات کے درس میں آیت

نمبر ۱۹۵ میں یہ نوید جانفزا ، یہ بشارت اور یہ خوش خبری بایں الفاظ ہمارے سامنے آتی ہے :

"أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝" ... میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا ، خواہ مرد ہو یا عورت ، تم سب ایک دوسرے سے ہو ، پس جنہوں نے معصیت سے) ہجرت (اختیار) کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور جو لڑے اور مارے گئے ہیں ، ان سے ان کے گناہ لازماً دور کر دوں گا اور ان کو لازماً ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں نہریں جاری ہوں گی - یہ (خاص) اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہو گا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے !"

كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ ؕ

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "ہم یہاں غور و فکر کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ یہاں اکثریت و اقلیت سے فیصلے کرنے کا کوئی سوال نہیں ہے میں نے تفصیل سے یہ باتیں اس لئے عرض کی ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے ذہن کے متعلق کوئی ابہام نہ رہے۔ اگر اب تک رہا ہے تو اس کا الزام مجھ پر نہیں ہے میں یہ باتیں تقریروں اور دروس میں کہتا رہا ہوں۔ ان میں سے اکثر باتیں لکھی اور چھپی ہوئی ہیں۔ بالفرض یہ ابہام کسی درجے میں بھی کسی کو رہا ہے تو اسے اب صاف ہو جانا چاہئے۔ کیوں کہ میں نے اپنا ذہن بڑی وضاحت سے بیان کر دیا ہے جو رفیق اس میں اپنے فکر کی جو جمع تفریق جوڑنا چاہے جوڑ لے۔ ہر شخص اپنے فکر کے اعتبار سے اللہ کے ہاں مسئول ہے۔ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ میں کسی کے عمل کا ذمہ دار نہیں اور کوئی میرے عمل کا ذمہ دار نہیں۔ میں نے اپنا ذہن آپ کے سامنے اس لئے کھول کر رکھ دیا ہے تاکہ جو لوگ انشراح صدر کے ساتھ اس فکر کو قبول کر کے ساتھ دیں گے ' ان میں ہم آہنگی رہے گی ورنہ یہی ہو گا کہ قدم قدم پر جس طرح گاڑی NO NO کرتی ہے اسی طرح رفقاء بھی جھجکیں گے۔ ساتھ چلیں گے نہیں۔ لہٰذا بنیادی بات صاف ہو جائے تو انشاء اللہ یہ رکاوٹ نہیں رہے گی۔"

"حاصل کلام یہ ہے کہ میں اپنے محدود مطالعہ کے ذریعہ جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے
زدیک جب اسلام ایک سیاسی قوت و نظام کی حیثیت سے اس ملک میں قائم نہ ہو جو ایک مسلمان کا وطن
ہے تو اس پر جس طرح نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج فرض ہے، اسی طرح اس پر اقامت دین کے لئے
جدوجہد کرنا بھی فرض عین ہے محض فرض کفایہ نہیں۔ اس بات پر میں پہلی تنقیح پر گفتگو کے موقع پر
مفصل اظہار کر چکا ہوں۔ اب بطور خاتمہ کلام اتنا اور عرض کروں گا کہ جب ہم نے دعوت الی اللہ،
اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کو فرض تسلیم کر لیا تو اس کے لئے لازمی و منطقی تقاضے کے طور یہ بھی
تسلیم کرنا ہو گا کہ اس کام کے لئے سمع و طاعت کے اصول پر التزام جماعت بھی فرض ہے۔ جیسا کہ
دوسری تنقیح کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے چند عقلی و نقلی دلائل آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔"

ہیئت تنظیم: بیعت

(ز ز) ایسی دینی جماعت کی ہیئتِ تنظیمی مغرب سے درآمد شدہ دستوری، قانونی،
اور جمہوری طرز کی نہیں بلکہ قرآن و سُنّت اور اسلاف کی روایات سے مطابقت
رکھنے والے بیعت کے اُصُول پر مبنی ہونی چاہیئے۔

داعی عمومی نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے جو تفصیلی اظہار خیال فرمایا اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔
"اب ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ ایسی ہیئت اجتماعیہ یا ایسی دینی جماعت کی "ہیئتِ تنظیمی" کیا
ہو؟ آیا وہ مغرب سے درآمد شدہ دستوری، قانونی اور جمہوری طرز کی ہو جس کا آج کل جماعتوں کی
تشکیل کے لئے عام رواج اور دستور ہے یا وہ بیعت کے مسنون و ماثور اور اسلاف کی روایات سے مطابقت
رکھنے والے اصول پر مبنی ہو..... جس کا حوالہ قرآن مجید میں بھی ملتا ہو اور سنت رسول اللہ علی
صاحبہا الصلوٰۃ و السلام میں بھی۔ جس پر عمل پیرا ہمیں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم بھی
نظر آتے ہیں اور تابعین و تبع تابعین بھی..... جس کا نقشہ ہمیں شہیدین کی تحریک میں نظر آتا ہے۔ یہ
امر واضح ہے کہ خلافت راشدہ تک سیاسی اور مذہبی قیادت ایک وحدت تھی لہٰذا بیعت بھی ایک ہی رائج تھی
لیکن بنو امیہ کے دور میں جب خلفاء تقویٰ کے لحاظ سے اس مطلوبہ معیار کے مطابق نہ رہے جو خلفاء
راشدین میں نظر آتا ہے تو بیعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک بیعت اطاعت خلافت خلیفہ وقت کے
لئے ہوتی تھی اور دوسری بیعت ارشاد کسی مزکی و مربی اور مرشد کے ہاتھ پر ہوتی تھی۔ پھر اس بیعت ارشاد
کے بھی کئی سلاسل وجود میں آ گئے۔ جیسے فقہی مسائل میں چار مسالک فقہ مشہور ہیں۔ ویسے ہی ذاتی
رشد و ہدایت اور تزکیہ نفس کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی چار سلاسل مشہور ہیں۔
یہ بات سمجھ لیجئے کہ ان دو بیعتوں کے رائج ہونے کے اسباب کیا تھے؟ آپ امت کی تاریخ کو دو اہم
ادوار میں تقسیم کیجئے۔ ایک دور تو وہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اس وقت تک ... [illegible]

لیکن شریعت و قانون اسلامی کا ڈھانچہ قائم (INTACT) رہا۔ لہٰذا اہل سنت کے علماء و محققین کا موقف یہ رہا کہ ان حکمرانوں کے خلاف جماعتی شکل میں اٹھنا جائز نہیں ہے۔ ان حالات میں وعظ و نصیحت افہام و تفہیم اور تنقید ہی تواصی بالحق کے فرض کی ادائیگی کے لئے کفایت کرے گی۔ اور سلطان جائر کے سامنے کلمہ حق افضل جہاد قرار پائے گا۔ نبی اکرمؐ کے اس ارشاد کے مطابق کہ اَفْضَلُ الْجِہَادِ کَلِمَۃُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ ..... جتھہ بندی کر کے اور مہم چلا کر یا مسلح تصادم اور بغاوت سے اس کو بدلنے کی کوشش کرنا اہل سنت کے تمام مکاتیب فکر کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ شریعت نافذ اور قانونِ اسلامی رائج ہے۔ **مسلح بغاوت کی صرف اس صورت میں شریعتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام میں اجازت ہے جب خلیفہ یا امیر یا سلطان یا** ملک وقت کفر بواح (کھلے اور صریح کفر) کا حکم دے۔ لیکن اس نقطہ نظر کے خلاف بھی خلافت راشدہ کے بعد ابتدائی دور میں ہمیں مثالیں ملتی ہیں۔ خاص طور پر حضرۃ حسینؓ کا اقدام ہمیں اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ تو اس کے متعلق ہمارے اہل علم کی مختلف آرا ہمیں ملتی ہیں۔ بعض کے نزدیک حضرت حسینؓ کا یہ اقدام صحیح تھا اور بعض کے نزدیک بالکل غلط .. جو غلط کہتے ہیں وہ بھی اسے اجتہادی غلطی قرار دیتے ہیں۔ پھر مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مخلص اور صالح اور متقی حضرات کو اجتہادی خطا پر بھی اجر و ثواب ملے گا اور وہ اکہرا ہو گا۔ کسی مجتہد کی رائے صائب بھی ہو تو اس مصیب مجتہد کو دوہرا اجر و ثواب ملے گا۔

اُمت کا دَورِ زوال

دوسرا دور وہ ہے جب ہمارا دین کا ڈھانچہ بھی قائم نہیں رہا اور پوری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ اس موضوع پر میں "امت مسلمہ کا عروج و زوال" کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھ چکا ہوں جو اکتوبر ۷۴ء کے میثاق میں شائع ہو چکا ہے اور نوائے وقت لاہور میں چھپ چکا ہے۔ اس دور میں نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ اس سے پہلے اس نوعیت کی تنظیمی کوشش ہو نہیں سکتی تھی۔ جب وہ قصر مسمار ہو گیا اور کم و بیش تمام ہی اسلامی ممالک محکوم ہو گئے۔ شریعت اور اسلامی قانون منسوخ کر دیا گیا۔ قاضیوں کی عدالتیں برطرف کر دی گئیں تو ان حالات میں جہاد و قتال کی تحریکیں اُبھرنے لگیں۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی ابھرے طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی کی تحریک ابھری برصغیر پاک و ہند میں سید احمد بریلویؒ کی تحریک ابھری نجد میں محمد بن عبدالوہابؒ کی تحریک اٹھی جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ تمام تحریکیں جہاد و قتال کے لئے برپا ہوئیں۔ یہ تمام تحریکیں بیعت کی بنیاد پر اٹھیں اور ان میں ہمیں بیعت جہاد کی سنت کی تجدید نظر آتی ہے۔

بیعت اور تحریکِ شہیدین

سید احمد بریلویؒ بیعت جہاد و قتال لیتے تھے اور آپ کو پتہ ہے کہ ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد

س نے کی تھی؟ ان میں مولانا عبدالحیٔؒ تھے وقت کے علماء احناف میں چوٹی کے عالم' اور خانوادہ امام الہند شاہ ولی اللہ دھلوی کے چشم و چراغ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ تھے ان کا مرتبہ! اللہ اکبر! جو بیک وقت بید عالم' اعلیٰ پائے کے منطقی و فلسفی اور چوٹی کے مصنف تھے۔ ان کی کتابیں پڑھتے وقت دانتوں پسینہ آتا ہے۔ سید صاحبؒ کبھی فتویٰ نہیں دیتے تھے۔ اہل حدیث سے کہتے تھے کہ مولوی اسمٰعیل سے اور حنفی سے کہتے تھے کہ عبدالحئیؒ سے رجوع کرو۔ مجھ سے تو وہ فتویٰ پوچھو جو کوئی مفتی نہیں بتاتا اور وہ فتویٰ یہ ہے کہ دین کے غلبے کے لیے جہاد و قتال فرض ہے (کوئی اور مفتی یہ بات بتائے تو ویسے بتائے! وہ اس میدان کا مرد ہی نہیں . !) میری معلومات یہ ہیں کہ سید احمد بریلوی بھی باقاعدہ عالم دین نہیں تھے۔ البتہ جوش و ولولہ تھا۔ ذہن و قلب پر جذبہ جہاد و قتال اس طرح مستولی تھا جیسے کسی شخص میں آگ بھری ہوئی ہو۔ میرے بارے میں بھی یہی کہا جاتا ہے کہ یہ عالم دین نہیں ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے۔ میں اگر ہوں تو صرف قرآن کا ایک ادنیٰ طالب علم اور حقیر خادم ہوں......
بہرحال ذکر سید احمد بریلویؒ کا چل رہا تھا وہ صرف بیعت جہاد و قتال لیتے تھے اور جو مجاہدین بیعت ارشاد کے بھی خواہش مند ہوتے تھے ان کو سید صاحب شاہ اسمٰعیل شہیدؒ یا مولانا عبدالحیٔؒ کی طرف رجوع کرنے کے لئے مشورہ دیتے تھے۔

بیعت اور شیخ الہندؒ

ایک رقعہ کے ذریعے ایک رفیق نے اس واقعہ کی طرف توجہ دلائی ہے جو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی مولانا ابوالکلام کے ہاتھ پر بیعت کی دعوت سے متعلق ہے۔ اس وقت میرا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ ویسے میں یہ کوائف تفصیل سے میثاق میں لکھ چکا ہوں۔ یہ تو بالکل ماضی قریب کی بات ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ سن ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماء ہند کے ایک کل ہند عظیم الشان اجتماع میں جس میں ہر مکتب فکر اور ہر مسلک کے چوٹی کے علماء شریک تھے۔ دیوبندی بھی تھے اور بریلوی بھی — ندوی بھی تھے اور فرنگی محلی بھی — اجمیری بھی تھے اور بدایونی بھی — دہلوی بھی تھے اور لاہوری بھی اور اہل حدیث بھی — سب موجود تھے — شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی (صدر جمعیت علماء) نے تجویز پیش کی کہ ہم سب کو جہاد کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیئے۔ حالانکہ مولانا آزاد کو مستند عالم کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یہ شیخ الہندؒ کی

وسعت ظرف اور وسعت قلب ہے - یہ اعلیٰ ظرفی اور قلب کی کشادگی جس کا مظا
شیخ الہندؒ نے کیا تھا مجھے کسی اور عالم دین میں نظر نہیں آتی - شیخ الہندؒ نے جید علما
وقت کے اس عظیم الشان اجتماع میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز پیش
کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا" ا
فرمایا کہ "قرآن اور جہاد - دین تو نام ہی ان دو چیزوں کا ہے جس کی طرف ہمیں اس
نوجوان نے متوجہ کیا" علماء کے اس عظیم اجتماع میں کسی نے بھی "نفسِ بیعت
پر اعتراض نہیں کیا - دو اعتراضات ہوئے پہلا تو یہ کہ بیعت کا مسئلہ اتنا اہم ہے
کہ اس کے متعلق دفعتاً ایک مجلس میں فیصلہ کر لینا صحیح نہیں ہوگا - اس پر غور و فک
کے لئے مہلت اور وقت درکار ہے - دوسرا اعتراض مولانا آزاد کی علمیت کے
بارے میں کیا گیا چونکہ مولانا آزاد کسی دار العلوم سے فارغ التحصیل اور مستند عا
نہیں تھے - ـــــــ بہرحال ان دو اعتراضات کی بنیاد پر مولانا آزاد کے ہاتھ
پر بیعت کی تجویز معرض التوا میں چلی گئی اور اس کے چند ماہ بعد حضرت شیخ ا
کا انتقال ہو گیا - اب شیخ الہندؒ جیسی کوئی زوردار اور مؤثر شخصیت موجود نہ
رہی تھی جو اس تجویز کو لے کر آگے بڑھتی لہٰذا معاملہ ٹھپ ہو گیا -

اس کے بعد مولانا آزاد نے حزب اللہ کے نام سے ایک جماعت
قائم کی اور اپنے طور پر جہاد پر بیعت لینے کا سلسلہ شروع کیا لیکن یہ کام زیا
دیر چل نہ سکا اور اس کے مولانا آزاد ہمہ تن کانگریس سے وابستہ ہو گئے اور ا
کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں اور توانائیوں سے کانگریس نے بھرپور فائدہ اٹھایا

مغربی تصورات کی بالادستی

جماعت اسلامی پہلی جماعت ہے جس میں دستور اور قانون مرتب ہوا اور اس میں کسی حد
جمہوریت کے بعض اصول اختیار کئے گئے - میری رائے میں یہ اس لئے ہوا کہ وہ دور تھا جس میں مغ
تصورات ہمارے ہاں مضبوط قدم جما چکے تھے اور ان تصورات کا لحاظ رکھنا ضروری ہو گیا تھا - یہ
قابل اعتراض بات نہیں ہے یہ ہوتا ہے کہ ہر دور کے تقاضوں کی چھاپ کسی نہ کسی انداز سے لگتی ہ

یہ مغربی افکار و تصورات کی بالادستی کا دور ہے۔ اس کے جو NORM بن گئے ہیں اور جو معیارات قائم ہو
گئے ہیں ان سے صرف نظر کرنا بہت مشکل ہے۔ لوگ بھی انگلیاں اٹھائیں گے کہ لو جی بیعت ہو رہی ہے
یہ تو پیری مریدی کا چکر چل پڑا ہے۔ ڈر تو مجھے بھی رہتا ہے کہ فوراً ہی مذاق شروع ہو جائے گا۔ استہزاء
ہو گا۔ تمسخر ہو گا۔ یگانے بھی کریں گے بیگانے بھی کریں گے۔ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا اہل کتاب جو
یک طرح سے اپنے ہیں یعنی جو توحید، وحی نبوت و رسالت انزال کتب اور آخرت کو ماننے والے ہیں ان
ے بھی اور مشرکین سے بھی جو ان تمام باتوں کو تسلیم ہی نہیں کرتے ان دونوں سے بہت ہی تکلیف اور
یت دینے والی باتیں سننی پڑیں گی۔ ... لیکن بقول شاعر۔ جس کو ہو جان و دل عزیز... اس کی گلی میں
ائے کیوں؟ تمسخر، استہزاء اور طنز برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے تو گھر بیٹھئے اور واقعی کام
ہے تو ان تمام دل آزار باتوں کو سننے کے لئے آمادہ اور تیار ہو" ...

بیعت اور قرآن مجید

عربی میں "البیع" کے معنی فروخت کرنے اور شراء کے معنی خریدنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں
اظ ایک دوسرے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ خرید و فروخت میں بھی چونکہ عہد و معاہدہ
ا ہے۔ اس لئے "بیعت" کے لفظ میں کسی مقصد کے لئے کسی سے عہد و پیمان اور اس کی اطاعت
اقرار کے مفاہیم شامل ہو جاتے ہیں۔ یعنی کسی خاص مقصد کے لئے اپنے آپ کو کسی ایسی ہستی کے
د کرنا اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا جس کا مقام اس کی نظر میں ارفع و اعلیٰ ہو۔ خرید و فروخت کے
عربی کا دوسرا لفظ تجارت ہے۔ یہ دونوں الفاظ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔ سورۂ جمعہ
ے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ "بیع" خرید و فروخت اور تجارت کے لئے استعمال ہوا ہے۔
ذروا البیع) سود کی حرمت اور تجارت کی حلت کے حکم میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے (
احل اللہ البیع وحرم الربوا) انہی معنوں میں قرآن مجید میں لفظ بیع مختلف مقامات
ستعمال ہوا ہے۔ اطاعت کے اقرار اور عہد و پیمان کے لئے اور اپنے آپ کو بالکلیہ کسی کے
لے کرنے کے معانی میں یہ لفظ سورہ توبہ، سورہ فتح اور سورہ ممتحنہ میں استعمال ہوا ہے۔ آخر الذکر
ت میں خواتین کے اسلام قبول کرنے اور عہد و پیمان کرنے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
توبہ میں "البیع" اور شراء دونوں الفاظ اپنی پوری جامعیت کے ساتھ اطاعت کلی کے قول و قرار
عہد و پیمان کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں، فرمایا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
نْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ
لُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ
نَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
لْعَظِيْمُ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ...

بیچے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں قتل کرتے اور قتل ہوتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے اس طرزِ عمل پر پختہ وعدہ ہے تورات میں بھی ' انجیل میں بھی اور قرآن میں بھی۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ کے ساتھ چکالیا ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے " ..... سورۂ فتح میں بیعت کا ذکر بڑے مہتم بالشان طریقے پر آیا ہے۔ نبی اکرمؐ جب عمرے کے لئے چودہ سو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ سے چند منزل دور آپؐ کو معلوم ہوا کہ قریش نے مزاحمت کا عزم کر رکھا ہے اور وہ مارنے مرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ حدیبیہ کے مقام پر آپؐ پڑاؤ فرماتے ہیں اور قریش مکہ سے گفتگو کے لئے پیغامبروں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ آپؐ قریش کو سمجھانے کے لئے حضرت عثمانؓ کو مکہ مکرمہ بھیجتے ہیں۔ خبر ملتی ہے کہ وہؓ شہید کر دیئے گئے۔ جس کے سننے کے بعد آنحضرتؐ سے خون عثمانؓ کے قصاص کی بیعت لیتے ہیں۔ جس پر اللہ تعالیٰ سورہ فتح میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتے ہیں بفحوائے آیت۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ اے نبیؐ! جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے تھے وہ دراصل اللہ سے بیعت کر رہے تھے ' ان کے ہاتھ پر اللہ کا ہاتھ تھا" .... آگے ان بیعت کرنے والوں کو بایں الفاظ مبارکہ بشارت دی جاتی ہے کہ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ○ "اللہ (ان) مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے (اے نبی!) آپ سے بیعت کر رہے تھے۔ اس (اللہ) کو ان کے دلوں کا حال معلوم تھا۔ اسی لئے اس اللہ تعالیٰ نے ان پر سکینت نازل فرمائی۔ اور ان کو قریبی فتح بخشی" حدیبیہ میں یہ بیعت درحقیقت صحابہ کرامؓ کی جان نثار کرنے کی وہ پیشکش تھی۔ جس کے نتیجے میں مومنین کے قلوب پر سکینت کا نزول بھی ہوا اور ان کو "فتحاً قریباً" جس سے مراد صلح حدیبیہ کے بعد اسلام کے پھیلنے کے جو مواقع میسر آئے وہ بھی ہو سکتے ہیں اور فتح مکہ بھی ' بشارت دی گئی اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی سامنے آتی ہے کہ جب مومنین صادقین کی ایک معتدبہ جماعت پورے عزم کے ساتھ اپنے آپ کو بغیر کسی خوف و خطرے کے کسی خطرے کے منہ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور ہرچہ بادا باد پر عمل کا پختہ فیصلہ کر لیتی ہے تو سکینت یعنی اطمینان و نشاط قلبی سے بھی اسے سرشار کر دیا جاتا ہے اور اس کے لئے کامیابی کی بشارت بھی ملتی ہے " ۔

ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا۔

بیعت اور حدیث

میں بیعت کے بارے میں چند حدیثیں ' آپ کو سناتا ہوں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک حدیث ہے جو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ اپنی اپنی صحیح میں لائے ہیں گویا یہ حدیث متفق علیہ ہے۔

ے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ صحابہ کرامؓ سے مختلف اوقات میں بیعت لیا کرتے تھے۔ حدیث کے
الفاظ ہیں۔ وَعَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ "ابن عمرؓ روایت
کرتے ہیں کہ جب ہم رسول اللہؐ سے سمع و اطاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ ہم سے فرماتے کہ جس چیز کی
طاقت رکھو"۔ ایک متفق علیہ حدیث اور سن لیجئے۔ غور کریں گے تو اس حدیث میں ایک خالص
اسلامی تنظیم اور جماعت کا مکمل دستور آپ کو مل جائے گا۔ حدیث ہے۔ عَنْ عُبَادَةَ بْنِ
الصَّامِتِ قَالَ: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ
وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَكْرَهِ وَعَلَىٰ اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَ عَلَىٰ
اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلَىٰ اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ
لَوْمَةَ لَائِمٍ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَعَلَىٰ اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا
كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ (متفق علیہ۔ بخاری و مسلم)

"حضرت عبادۃ بن صامتؓ سے مروی ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم نے تنگی و آسانی، خوشی و ناخوشی (ہر
حالت میں) اطاعت و فرماں برداری اپنی ذات پر (دوسرے کو) ترجیح دینے، اہلیت و صلاحیت رکھنے
والوں سے معاملہ اطاعت میں نہ الجھنے جہاں کہیں بھی ہوں، حق بات کہنے اور اللہ کے بارے میں کسی کی
ملامت کی پروا نہ کرنے رسولؐ سے بیعت کی۔"

"اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں کہ ہم نے رسول اللہؐ سے اس امر پر بیعت کی کہ ہم اہلیت
رکھنے والے لوگوں سے معاملہ اطاعت میں نہیں الجھیں گے الا یہ کہ ان سے ایسا کفر صریح ظاہر ہو جس پر
تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو"۔

عقل اور جذبات دونوں ضروری ہیں

"نظام بیعت کے متعلق میں نے اپنا فکر صحیح کی نشست میں آپ کے سامنے
بالکم و کاست رکھ دیا تھا۔ اور اس مسئلے پر متعدد احادیث اور ان کی تشریح آپ
کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ ——————— میں نے
جب انجمن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو خالص اور ٹھیٹھ اسلامی اصولوں پر ایک
جماعت کی تشکیل کے ارادے کا بھی اظہار کر دیا تھا اور میرے پیش نظر اس سے
بھی بہت پہلے یہ بات تھی کہ اگر اللہ کی تائید و نصرت میرے شامل حال رہی اور
'جماعت' کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو اس کے طریق تنظیم کو بیعت کے اصول پر قائم کرنے

کی بھر پور کوشش کروں گا۔ میں نے یہ رائے محض جذبات سے متاثر ہو کر قائم نہیں کی تھی بلکہ عرصہ دراز تک اس پر غور و فکر کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ میرے نزدیک ہر قابلِ ذکر کام جذبات اور تعقل و تفکر دونوں کے امتزاج سے انجام پاتا ہے۔ عقل اور جذبے کے متعلق بڑی پیاری بات وہ ہے جو خلیل جبران نے کہی ہے یہ کہ "عقل سے روشنی حاصل کرو اور جذبے کے تحت حرکت کرو"۔ لوگ روشنی جذبات سے حاصل کرنا اور عقل کا کام جذبات سے لینا شروع کر دیتے ہیں، تو معاملہ تلپٹ ہو جاتا ہے۔ ہونا یہ چاہیئے کہ عقل سے فیصلہ کیا جائے کہ کدھر جانا ہے! پھر اس راستے پر چلنے کے لئے جذبات سے کام لیا جائے۔ عقل چلنے نہیں دیتی۔ وہ بس یہ بتاتی ہے کہ راستہ ٹھیک ہے۔ چلنے کیلئے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق   اور عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

عقل لبِ بام ہی بیٹھی رہے گی وہ کودنے کے لئے کبھی نہیں کہے گی۔ اس کے لئے عشق یعنی جذبہ درکار ہے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ میں نے محض جذبات میں آ کر یا کسی فوری و وقتی واقعہ اور موقعہ سے متاثر ہو کر کوئی اہم فیصلہ اور اقدام نہیں کیا ہے۔ زندگی کے تمام اہم موڑ انتہائی غور، تعقل و تفکر کے بعد اختیار کئے ہیں اور جس راستے کو بھی اختیار کیا ہے علیٰ وجہ البصیرت اختیار کیا ہے اور جب اسے اختیار کیا ہے تو اس پر پورے جوش و لولے اور جذبے کے ساتھ کام کیا ہے اور محنت کی ہے۔ جب اپنے مطب کو بند کر کے اپنے آپ کو ہمہ وقت و ہمہ تن خدمتِ دین اور دعوتِ اسلامی کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے تو اس مسئلہ پر خوب غور و فکر کیا ہے اور اس کے بعد حجازِ مقدس کی سرزمین پر بیت اللہ کے سامنے بیٹھ کر اللہ کے توکل پر اس کا فیصلہ کیا ہے اور جیسی کچھ بھی توانائیوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کی حقیر سی پونجی میرے پاس ہے وہ پورے جذبے کے ساتھ اسی کام میں لگا دی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ میں نے تعقل سے فیصلے کئے ہیں اور جذبات سے ان فیصلوں کے مطابق کام کیا ہے۔"

قار کو نصیحت اور دعوت

"اب میں اس موضوع پر گفتگو ختم کر کے آپ حضرات سے بطورِ
بیعت کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں - میں نے تین نشستوں میں اپنی قائم
ردہ تین تنقیحات پر جو مفصّل اظہارِ خیال کیا ہے اُس کے ذریعے میں نے اپنا پورا
ہن کسی تحفّظِ ذہنی (MENTAL RESERVATION) کے بغیر آپ کے سامنے
ھ دیا ہے ——— یہ فیصلے تو ان شاء اللہ کل ہوں گے - آج کی رات آپ
ضرات غور و فکر کیجئے -- صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لئے دُعا کیجئے - استخارہ کیجئے - وقت
ال کر باہم افہام و تفہیم اور مشورہ کیجئے - یہ بہت اہم فیصلے ہوں گے - بہت بڑا اقدام
دگا - بیعت کا نظام اختیار کرنے پر استہزا بھی ہوگا - تمسخر بھی ہوگا - مذاق بھی اڑیں گے -
نے بھی اور پرائے بھی طنز کریں گے - سب سے زیادہ نشانہ تو میں خود بنوں گا - الحمد للہ
ں نے اس کے لئے خود کو بہت پہلے سے تیار کر رکھا ہے - اور یہ بھی ہے کہ اگر ہم نے
لط قدم اٹھا دیا تو ہم دین کا مذاق اُڑوانے کے مجرم بن جائیں گے - دو طرفہ معاملہ
ہے - اگر ہم اس کو لے کر چل نہ سکے تو گویا کہ ہم اپنے عمل سے دین کی ذلت و رسوائی
کا ایک اور ٹیکا لگانے کے جُرم کا ارتکاب کریں گے - ان تمام امکانات کو سامنے
رکھیئے اور ان پر غور کیجئے سوچئے اور پھر پورے انشراحِ صدر کے ساتھ فیصلہ کیجئے -
میں نے تو بہرحال جب تنظیم کی تشکیل کا فیصلہ کیا تھا تو "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ"
کی پکار لگائی تھی - جس پر لبیک کہہ کر آپ حضرات تنظیم میں شامل ہوئے ہیں اور
اب پھر میں اسی پکار اور صدا کا اعادہ کرتا ہوں کہ "مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ"
——— میں اب اس دستوری اور قانونی تنظیم کے بجائے بیعت کے ٹھیٹھ دینی
اور مسنون اور ماثور اور سلف صالحین کی روایات کے مطابق نظام پر اس ہیئت
اجتماعیہ کی تشکیل کروں گا اور اس کے لئے میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید پر توکل کرتے
ہوئے خود اپنی ذات کو پیش کرتا ہوں - اب اسی نظامِ بیعت پر تنظیم چلے گی چاہے

ایک ہی رفیق میری اس پکار پر لبیک کہے - میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ میں سے جو حضرات اس اتفاق رکھتے ہوں اور مجھ پر اعتماد کرتے ہوں، وہ میرا ساتھ دیں۔ لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کھلی اجازت دیتا ہوں کہ میں نے اپنی مقرر کردہ تینوں تنقیحات پر جو اظہار خیال کیا ہے - ان ضمن میں کچھ اشکالات کسی کے ذہن میں ہوں تو وہ بلا جھجک اور بلا تکلف پیش کریں میں اپنی استعداد اور امکانی حد تک ان کا جواب دوں گا۔"

سوالات و جوابات

"نبی اکرمؐ اسلام لی جو بیعت لیتے تھے تو اس کے بعد بھی کیا مزید بیعت کی ضرورت باقی رہتی تھی؟" ڈاکٹر صاحب نے جواب میں فرمایا کہ "آپ اس بیعت کو بھول رہے ہیں جس کا قرآن مجید میں بڑے عظیم الشان اہتمام سے ذکر ہوا ہے جسے بیعت رضوان اور بیعت شجرہ کہا جاتا ہے جو ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر ہوئی تھی۔ جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں - لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ - یہ نہ بیعت اسلام تھی نہ بیعت خلافت تھی - یہ اسلام کے اندر ہی ایک بیعت تھی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خون عثمانؓ کا قصاص لینے کے لئے ان تمام صحابہ کرامؓ سے لی تھی جو وہاں موجود تھے ایک خاص مرحلہ در پیش تھا جس کے لئے یہ بیعت لی گئی تھی ویسے جو شخص بھی ایمان لایا تھا وہ جان و مال تو پیش کر ہی چکا تھا - اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ - تو بظاہر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب بیعت کی کیا ضرورت ہے! کیا وہ صحابہ کرامؓ جو آں جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سفر میں گئے تھے اس بات سے واقف نہیں تھے! مزید برآں میں نے جن احادیث کا حوالہ دیا تھا ان میں اکثر احادیث متفق علیہ ہیں یعنی جن کو امام بخاریؒ اور امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں درج کیا ہے - ان سے معلوم ہوا کہ کسی بھی مرحلے پر کسی خاص اور کسی محدود مقصد کیلئے

[illegible]

ہم جو نظام بیعت اختیار کرنے جارہے ہیں وہ اس کے خلاف نہیں ہے یہ نہ بیعتِ اسلام ہے نہ بیعتِ خلافت ہے بلکہ بیعتِ جہاد ہے۔" ایک رفیق نے سوال کیا کہ "جو رفقاء کسی دوسرے بزرگ کے ہاتھ پر بیعتِ ارشاد کر چکے ہیں کیا وہ تنظیم کے نظام بیعت میں شامل ہوسکیں گے اور جو رفقاء اب اس نظام بیعت میں شامل ہوں گے کیا وہ آئندہ کسی دوسرے بزرگ سے بیعتِ ارشاد کرسکیں گے؟" ——— داعی عمومی نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے - ایسا کیا جاسکتا ہے - اور جو رفقاء پہلے ہی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت ارشاد کر چکے ہیں وہ بھی تنظیم کے نظام بیعت میں شامل ہوسکتے ہیں۔" ایک رفیق نے سوال کیا کہ "کیا آپ نے بھی کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعتِ ارشاد کی ہے؟" ——— داعی عمومی نے جواب میں فرمایا کہ "نہیں میں کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوں - میں نے اس مقصد کے لئے بہت سے بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی - لیکن میرا دل نہیں ٹھکا - اور آج تک نہیں ٹھکا — اور اب تو کچھ بہت بھی جواب دے چکی ہے - اب میں قانع ہوچکا ہوں کہ میرا مرشد قرآن مجید ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس حبل اللہ المتین سے وابستہ کیا ہوا ہے - میں اس کو اپنے اوپر اللہ کا بہت بڑا فضل سمجھتا ہوں اور شاید میں ناقدری کا مرتکب ہوں گا اگر میں نے اب کسی اور طرف توجہ دی۔" ایک رفیق نے سوال کیا کہ "کیا آپ بیعتِ ارشاد کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا - "نہیں ایسی بات نہیں ہے - مجھے اس ضرورت کا احساس رہا ہے - میں اس کا قائل رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ اصلاحِ نفس کے لئے کسی ایسے بزرگ سے وابستگی مفید ہوتی ہے لیکن پہلے ایسے بزرگ کی ذات پر علمی اور عملی دونوں اعتبارات سے دل کا ٹھکنا اور مطمئن ہونا ضروری ہے - یہ بیعتِ جہاد سے زیادہ بڑا مسئلہ ہے - بیعتِ جہاد کا معاملہ یہ ہے کہ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے - مجھے کوئی معیاری شخصیت نہیں مل رہی تو جو شخص بھی اس وقت اس کی دعوت دے رہا ہے میں اس کی صدا پر لبیک کہہ رہا ہوں اور اس کے ساتھ تعاون کر رہا ہوں - بیعتِ ارشاد کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کی طرف قلبی

اصلاح کے لئے رجوع کرتے ہیں۔ اس قلبی اصلاح کے معاملے میں بہت ہی زیادہ وثوق اور اعتماد کی ضرورت ہے۔ جب ہی آپ ان بزرگ سے مستفید ہو سکیں گے ورنہ نہیں۔ اپنے آپ کو محض مطمئن کرنے کے لئے کہ ہم نے اصلاح نفس کے لئے کسی کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہوا ہے میرے نزدیک محض ایک خانہ پُری ہے۔ میں اپنا مزاج آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں سطحی کام کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں جو کام کرتا ہوں پوری دلجمعی اور اس میں ہمہ وقت کھپنے کی کوشش کے عزم کے ساتھ کرتا ہوں۔"

ایک ضروری وضاحت

"کل کی نشست میں بیعت کے اختیار کرنے کی بحث کے بعد ایک استصواب پر میں نے عرض کیا تھا کہ نظامِ بیعت کے مطابق تنظیم اسلامی میں شامل ہونے والے رفقاء کو بیعتِ ارشاد کے لئے کسی بزرگ سے بیعت کرنے کی اجازت ہوگی۔ لیکن بعد میں غور و فکر کے بعد ان نتائج پر پہنچا ہوں کہ:

۱۔ جو رفقاء بیعتِ ارشاد کے لئے اگر کسی کے ہاتھ پر پہلے ہی بیعت کر چکے ہوں وہ اگر اب تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے مجھ سے بیعت کرنے کا فیصلہ کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ یہ بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف اور ہجرت و جہاد بیعتِ ارشاد پر فائق و مقدم ہوگی۔

۲۔ جو رفقاء نظامِ بیعت کے تحت آج تنظیم اسلامی میں شمولیت اختیار کریں گے یا جو آئندہ شامل ہوں گے، وہ کسی دوسرے بزرگ سے بیعت ارشاد کرنے سے قبل مجھ سے اجازت لیں گے اور اس امر کو ملحوظ رکھیں گے کہ تنظیم اسلامی کی بیعت ــــ بیعت ارشاد پر فائق و مقدم ہوگی۔

فیصلے

چھ دن کی طویل نشستوں کے بعد حسب ذیل فیصلے ہوئے :

(۱) " اقامتِ دین، شہادت علی النّاس اور غلبہ و اظہارِ دین کی سعی و جہد، نفلی عبادت یا اضافی نیکیاں نہیں بلکہ از روئے قرآن و حدیث بنیادی فرائض میں شامل ہیں !"

(۲) " ان فرائض کی ادائیگی کے لئے التزام جماعت لازم ہے۔"

(iii) آئندہ تنظیم اسلامی کا نظام مغرب سے درآمدہ دستوری، قانونی اور جمہوری کے اصولوں کے بجائے قرآن و سنت سے ماخوذ اور اسلاف کی روایات کے مطابق بیعت کے اصول پر مبنی ہوگا۔ چنانچہ تنظیم اسلامی کے داعی عمومی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج کے بعد سے " امیر تنظیم اسلامی " ہوں گے اور تنظیم میں داخلہ ان کے ساتھ طاعت فی المعروف کی بیعت کا شخصی رابطہ استوار کرنے سے ہوگا۔ اور وہ بحیثیت امیر تنظیم اسلامی اپنے فرائض " اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " اور " شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ " کی قرآنی ہدایات کے مطابق ادا کریں گے۔

(iv) تنظیم اسلامی کا عبوری دستور کالعدم متصور ہوگا اور امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اختیار ہوگا کہ جن رفقاء سے مناسب سمجھیں مشورہ کر کے " شرائطِ شمولیت " میں ایسی لفظی ترامیم کر لیں جن سے 'دستوریت' اور 'قانونیت' کے بجائے ہدایات و رہنمائی کا رنگ پیدا ہو جائے اور تنظیم میں شمولیت کے لئے احادیث سے رہنمائی لے کر بیعت کے لئے مناسب عبارت تجویز کر لیں۔"

مزید طے پایا کہ

(الف) تنظیم اسلامی بحیثیت " تنظیم " انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ نہ ہی کسی امیدوار، یا کسی 'جماعت'، یا کسی 'محاذ' کے لئے تنظیم اسلامی یا اس کے رفقاء کوئی کنویسنگ یا عملی تعاون کریں گے۔

(ب) جہاں تک رفقائے تنظیم کے حق رائے دہی کا تعلق ہے جو ایک دوسرے اعتبار سے ایک امانت کی ادائیگی ہے۔ اس کے ضمن میں طے کیا گیا کہ رفقائے تنظیم اپنا ووٹ کسی ایسے امیدوار کے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جو:

(i) خود بھی پابندِ شریعت ہو ——— اور

(ii) کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کا منشور اسلامی اصولوں سے متصادم ہو۔

صراحتیں:

۱۔ مندرجہ بالا اصول و مبادی میں "انتخابات" سے اصلاً مراد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے وہ انتخابات ہیں، جن کے نتیجے میں کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ایوانات اور حکومتیں تشکیل پاتی ہیں۔ جن کے حیطۂ اختیار میں قانون سازی اور جن کے ہاتھوں میں قوتِ نافذہ کی زمام کار ہوتی ہے۔

۲۔ البتہ ان "انتخابات" کے ذیل میں نیم سرکاری (SEMI-GOVERNAMENT ——) ادارے بھی شامل ہیں، جیسے بلدیاتی اور کونسلوں کے انتخابات وغیرہ۔

۳۔ تنظیم اسلامی "بحیثیتِ تنظیم" ایسے کسی انتخاب میں حصہ نہیں لے گی۔ یہ بات مندرجہ اصول و مبادی میں بصراحت موجود ہے۔ تنظیم کا کوئی رفیق بھی ایسے کسی انتخاب میں ذاتی انفرادی، شخصی حیثیت سے بھی حصہ نہیں لے سکے گا۔ اس کی خلاف ورزی فسخِ بیعت اور اخراج عن التنظیم کی مستوجب ہو گی۔

۴۔ کالجوں، یونیورسٹیوں کی غیر جماعتی یونینوں کے انتخابات میں رفقائے تنظیم انفرادی حیثیت سے حصہ لینے کے مجاز ہوں گے۔ اسی کا اطلاق ٹریڈ یونینوں کے انتخاب پر بھی ہوگا لیکن اس کے لئے رفقائے تنظیم کے لئے لازمی ہوگا کہ وہ امیرِ تنظیم یا مقامی تنظیموں کے امراء سے پیشگی اجازت حاصل کر لیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے ترمیم شدہ شرائط شمولیت پیش فرمائیں جن میں چند رفقاء کے مشورے سے ایسی ترامیم کی گئی تھیں کہ ان کو علمی اور تربیتی مقام حاصل ہو گیا تھا۔

(یہ شرائط صفحاتِ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں)

شرائط شمولیت

ہر عاقل و بالغ شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت' اور خواہ وہ کسی بھی ذات برادری یا نسل سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ وہ رُوئے زمین کے کسی بھی خطے میں رہائش پذیر ہو اس تنظیم میں شامل ہو سکتا ہے' بشرطیکہ وہ:

ا۔ پورے شعور و ادراک کے ساتھ اقرار کرے کہ:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے اسماء و صفات سے ظاہر ہے اور قبول کرتا ہوں اس کے جملہ احکام' اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے!۔ اور اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ یعنی میں یقین رکھتا ہوں اللہ پر' اور اس کے فرشتوں پر' اور اس کی کتابوں پر' اور اس کے رسولوں پر' اور یوم آخر پر' اور تقدیر پر کہ اس کی بھلائی اور برائی سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد جی اٹھنے پر۔

تشریح: اسلام کی اساس ایمان پر قائم ہے اور ایمان کی تعبیر کے لئے ایمان مجمل اور ایمان مفصل کے مندرجہ بالا الفاظ جو سلف سے منقول ہیں' حد درجہ موزوں بھی ہیں اور نہایت جامع و مانع بھی۔ اس لئے کہ ان میں ایمانیات کی تفصیل کے علاوہ دو اہم اور بنیادی نکتے بھی واضح ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان زبانی اقرار (جو اس قانونی ایمان یعنی اسلام کا رکنِ اولین ہے جس پر تمام دنیوی معاملات کا دارومدار ہے اور جس پر اسلامی ہیئتِ اجتماعی کی بنیاد قائم ہوتی ہے) اور تصدیق قلبی (جس پر اس حقیقی ایمان کا دارومدار ہے جس کی بنا پر آخرت میں کوئی شخص مومن قرار پائے گا) دونوں کا مجموعہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ علمی و نظری اور اصولی اعتبار سے ایمان حقیقتاً ایمان باللہ ہی کا نام ہے۔ بقیہ تمام ایمانیات اسی اصل کی فروع اور اسی اجمال کی تفصیل ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت بھی اللہ تعالیٰ کی صفات حکمت و عدل ہی کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت بھی اس کی صفاتِ ربوبیت و ہدایت ہی کی توسیع۔

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا............ وہ "اَلْاَحَد" ہے

یعنی ہر اعتبار سے تنہا اور اکیلا ' چنانچہ نہ کوئی اس کی ذات میں شریک ہے نہ صفات میں
میں نہ اختیارات میں ' نہ اس کا کوئی ہم جنس ہے نہ ہم کفو ' نہ ہم سر ہے نہ ہم پلہ '
ند ' نہ مثل ہے نہ مثال ...... وہ " الصمد " ہے یعنی وہ پورے سلسلۂ کون و مکان
ہے اور موجد بھی ' خالق بھی ہے اور باری بھی ' صانع بھی ہے اور مصور بھی ' اور
عنایت اسے تھامے بھی ہے اور قائم کئے ہوئے بھی۔

وہ پاک اور منزّہ و مبرّا ہے ہر عیب ' ہر نقص ' ہر کمی ' ہر ضعف ' ہر احتیاج ' ہر
کوتاہی سے ' گویا وہ " سبوح " بھی ہے اور " القدّوس " بھی...... اور جا
محاسن و کمالات کا ' اور ہر خیر اور خوبی کا بدرجہ تمام و کمال ' گویا وہ " الغنی "
" الحمید " بھی ' کسی کو کوئی قوت و طاقت حاصل نہیں بجز اس کے اذن و اجاز
وہی " العلی " بھی ہے اور " العظیم " بھی اور " المتعال " بھی ہے اور
" المتکبر " بھی...... سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا ال
اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

اس کی ذات وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اور اس کی ماہیئت اور کنہہ کو کو
سکتا۔ اور اس کی معرفت کی واحد راہ اس کے اسماؤ صفات کے واسطے ہی سے ہے
اچھے نام اسی کے ہیں اگرچہ متعین طور پر اس کے اسماء حسنٰی وہی ہیں جو قرآن اور
میں وارد ہوئے...... اسی طرح وہ تمام صفات کمال سے بتمام و کمال متصف ہے جن
ترین آٹھ ہیں یعنی حیات ' علم ' قدرت ' ارادہ ' سمع ' بصر ' کلام اور تکوین
" الحیّ " بھی ہے اور " القیّوم " بھی اور " السمیع " بھی ہے اور " البا
" عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ " بھی ہے اور " بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ " بھی '
يُرِيْدُ " بھی ہے اور " اِنَّمَا اَمْرُهٗ اِذَا اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلُ
فَيَكُوْنُ " کی شان کا حامل بھی...... مزید بر اں اس کی جملہ صفات اس کی ذات
مطلق و لا متناہی ہیں نہ کہ محدود و مقید ' اور قدیم ہیں نہ کہ حادث اور ذاتی ہیں نہ کہ

فرشتے: وہ برگزیدہ ہستیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نور سے تخلیق فرما
تشخص وجود کے حامل ہیں نہ کہ مجرّد قوائے ' طبعیہ ' ان کا نہ مذکر ہونا معلوم
خدا سے قرب ضرور رکھتے ہیں لیکن الوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ' وہ اللہ کے
کچھ نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم انہیں بارگاہ خداوندی سے ملے ' و

کی تنفیذ بھی کرتے ہیں اور خالق و مخلوق کے مابین پیغام رسانی بھی، چنانچہ وہی انبیاء و رسل تک وحی لاتے ہیں، ان کی تعداد بے شمار ہے لیکن چار بہت مشہور بھی ہیں اور جلیل القدر بھی یعنی حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل علیہم السلام۔

اللہ کی کتابوں میں سے بھی چار ہی معلوم و معروف ہیں، یعنی توراۃ جو حضرت موسیٰؑ کو عطا ہوئی اور زبور جو حضرت داؤدؑ کو عطا ہوئی اور انجیل جو حضرت عیسیٰؑ کو عطا ہوئی اور قرآن جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ جو اللہ کی آخری کتاب اور نوع انسانی کے نام اللہ کا آخری اور مکمل پیغام ہے، جس کے بعد کوئی اور کتاب نازل نہ ہوگی اور جو من و عن محفوظ موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ جبکہ باقی تینوں کتابیں ردّ و بدل اور تغیر و تحریف کا ہدف بن چکی ہیں، گویا اب قرآن ہی ان کا "مصدّق" بھی ہے اور "مہیمن" بھی..... ان کے علاوہ اور بھی بہت سے پیغمبروں کو صحیفے عطا ہوئے جن میں سے کچھ اب دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں، باقی محرّف اور مبدّل ہیں۔

اللہ کے رسول نوع انسانی کے وہ برگزیدہ افراد ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی آدم تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے وقتاً فوقتاً چنا اور پسند فرمایا۔ وہ انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے اور سب گناہ سے پاک یعنی معصوم تھے، ان کی تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے، قرآن مجید میں جن کے نام مذکور ہیں ان کے سوائے کسی اور کو تعین کے ساتھ نبی یا رسول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان میں سے پانچ حد درجہ اولوالعزم اور نہایت عالی مرتبہ ہیں یعنی حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سیّدنا محمد صلّی اللہ علیہ وسلم .... ان میں سے بعض کو بعض پر بعض پہلوؤں سے جزوی فضیلت حاصل ہے، لیکن جملہ انبیاء و رسل پر فضیلت کلّی سیدوُلدِ آدم حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حاصل ہے، جو خاتم النبیّین بھی ہیں اور آخرالرسل بھی۔ اور جن کے بعد وحیٔ نبوّت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کلّی طور پر بند ہوچکا ہے۔

انبیاء و رسل کی تائید و تقویت کے لئے اللہ تعالیٰ عام مادّی ضوابط کو عارضی طور پر معطّل کرکے گویا عادی قانون کو توڑ کر اپنی آیات ظاہر کرتا اور معجزات دکھاتا رہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار معجزے عطا ہوئے لیکن آپؐ کا اہم ترین اور عظیم ترین معجزہ معنوی ہے یعنی قرآن حکیم۔

یوم آخر: وہ دن ہے جس میں تمام انسان دوبارہ زندہ ہوکر عدالت خداوندی میں محاسبے

اور جزا و سزا کے فیصلے کے لئے پیش ہوں گے جس کے نتیجے میں یا جنت میں داخلہ ہو گا یا جہنم میں...... اس دن اقتدارِ مطلق اور اختیار کلی صرف اللہ واحد و قہار کے ہاتھ میں ہو گا۔ نہ کسی کو کسی جانب سے کوئی مدد مل سکے گی، نہ کوئی کچھ دے دلا کر چھوٹ سکے گا، نہ کوئی سفارش ہی خدا کی پکڑ سے بچا سکے گی۔ انبیاء و رسل، صلحاء، ملائکہ و ارواح اور سب سے بڑھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مراتبِ عالیہ کے اظہار و اعلان اور ان کے اعزاز و اکرام کے لئے شفاعت کی اجازت دی جائے گی اور گنہگار اہلِ ایمان کے حق میں ان کی شفاعت قبول بھی ہو گی، لیکن نہ وہ خدا کی مرضی اور منشا کے خلاف کچھ کہیں گے اور نہ ہی خدا کی صفتِ عدل باطل ہو گی۔

تقدیر کے خیر و شر کا من جانب اللہ ہونا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور مخلوقات میں سے کسی کے بس میں نہیں کہ بغیر اس کی اجازت محض اپنے ارادے سے کچھ کر سکے لہٰذا یہاں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے، خواہ وہ کسی کو بھلا لگے یا برا، اللہ کے اذن ہی سے ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو خدا کا عاجز و لاچار ہونا لازم آتا ہے۔ مزید بر آں وہ عَالِمُ مَا کَانَ وَمَا یَکُوْنُ بھی ہے چنانچہ اس پورے سلسلہ کون و مکان میں جو کچھ ماضی میں ہوا، یا حال میں ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہو گا سب اس کے علم قدیم میں پہلے سے موجود ہے، اگرچہ اس کا یہ علم جبر محض کو مستلزم نہیں...... گویا ایمان بالقدر، دراصل اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور علم کے مضمرات اور مقدرات ہی کو ماننے کا نام ہے۔

بعث بعد الموت سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا نفخہ اولیٰ ہو گا جس کے نتیجے میں کائنات کا پورا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا اور سب پر ایک عمومی موت طاری ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ کا اذن ہو گا نفخہ ثانیہ ہو گا اور سب جی اٹھیں گے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا قیام قیامت پیدا ہونے والے آخری انسان تک سب میدان حشر میں جمع کئے جائیں گے۔

ب..... کلمہ طیبہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کے جملہ مضمرات و مقدرات کے فہم و شعور کے ساتھ گواہی دے کہ۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

تشریح ۔۔ ا۔ اس شہادت کے جزو اول کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان اور جو کچھ
ان وزمین میں ہے سب کا خالق ' پروردگار ' مالک اور تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ
' ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ گویا "اَلَا لَہُ
لْقُ وَالْاَمْرُ" اور "لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ"
اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ۔

ا۔ انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی و کارساز ' حاجت روا اور مشکل کشا ' فریادرس اور حامی
ر نہ سمجھے ' کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہے ہی نہیں۔

۲۔ اللہ کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے ' کسی سے تقوے اور خوف نہ
ے ' کسی پر توکل نہ کرے ' کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے ' کیونکہ تمام اختیارات کا مالک
ی ہے۔

۳۔ اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے ' کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے ' کسی کو مدد کے لئے نہ
ے ' کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے
کو ٹال سکتی ہو ' کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں ' خواہ فرشتے ہوں یا
یا اولیاء۔

۴۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے ' کسی کی پرستش نہ کرے ' کسی کو نذر نہ
' اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے رہے
' کیونکہ تنہا ایک اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۵۔ اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ ' مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ تسلیم نہ کرے ' کسی کو باختیار
حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے ' کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے
ن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور
کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں ' کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک اور اپنی خلق کا ایک
جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکیت کا حق نہیں پہنچتا۔
نیز اس عقیدے کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ۔

۶۔ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دستبردار ہو جائے ' اپنی خواہش نفس کی بندگی
ڑ دے اور اللہ کا بندہ بن کر رہے جس کو اس نے الہ تسلیم کیا ہے۔

۷۔ اپنے آپ کو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے ' بلکہ ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان ' اعضاء

اور اپنی ذہنی اور جسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اس کی طرف سے امانت سمجھے۔

۸۔ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے قیامت کے روز اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔

۹۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۱۰۔ اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی اس کا محبوب حقیقی اور مطلوب و مقصود اصلی بن جائے۔

۱۱۔ اپنے لئے اخلاق میں' برتاؤ میں' معاشرت اور تمدن میں' معیشت اور سیاست میں' غرض زندگی کے ہر معاملے صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اس طریقے او ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کی شریعت کے خلاف ہو۔ اس شہادت کے جزو ثانی سے واضح ہو ہے کہ سید ولد آدم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپ عبدیت کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان جملہ اقسام کا کامل سدباب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ امتیں اپنے اپنے انبیاء و رسل کے فر احترام' شدت عقیدت اور غلو محبت کے باعث ملوث ہو گئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپؐ کے فرق مبارک پر ختم نبوت اور ختم رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ کے دست مبارک میں شہنشاہ ارض و سما کی جانب سے اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کا فرمان شاہی بھی۔ گویا سلطان کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ مستند ہدایت نامہ اور ضابطہ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا' وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان کو جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہو اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل طریق بن جائے گویا۔

۱۔ انسان ہر اس تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔

۲۔ اس کو کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لئے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روکنے

دینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسولؐ خدا سے ثابت ہے۔ اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت موقوف نہ ہو۔

۳۔ رسولؐ خدا کے سوا کسی کی مستقل بالذات پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے۔ دوسرے انسانوں کی پیروی کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے تحت ہو' نہ کہ ان سے آزاد۔

۴۔ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے' جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے اختیار کرے' جو اس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے' اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اسے حل کرنے کے لئے اسی سرچشمہ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۵۔ تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی' یا قبائلی و نسلی' یا قومی و وطنی' یا فرقی و گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسولؐ خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آ جائے یا اس کی مدمقابل بن جائے۔

۶۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی بھی معنی میں نبی یا رسول سمجھے نہ معصوم اور نہ ہی کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مومن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہو۔

نیز اسی کے متضمنات کی حیثیت سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ۔

۷۔ یہ تسلیم کیا جائے کہ آپؐ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافت راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا' وہی دین حق' اور "نظام اسلامی" کی صحیح ترین اور واحد مسلمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافت راشدہ فی الواقع "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" تھی۔ اور خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ' عمر فاروقؓ' عثمان غنیؓ اور علی حیدرؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ "خلفائے راشدین و مہدیین" ہیں جن کی سنت آنحضور کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

۸۔ یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام رضوان تعالیٰ علیہم اجمعین جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور آپؐ کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت سے براہ راست فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی من حیث الجماعت پوری امت میں افضلیت مطلقہ کے حامل ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل نہیں ہو سکتا۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے' ان کی تعظیم و توقیر در اصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و توقیر ہے اور ان سے بغض و عداوت اور ان کی تحقیر و توہین در حقیقت آنحضورؐ سے بغض و عداوت اور آپؐ کی تحقیر و توہین ہے..... ان

ے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں لیکن فضیلت کلی متعین طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہ رضؓ میں ایک اضافی درجہ فضیلت حاصل ہے حضرت اصحاب بیعت رضوان کو، پھر ان پر ایک مزید درجہ فضیلت حاصل ہے حضرات اصحاب بدر کو، پھر ان پر ایک اور درجہ فضیلت کے حامل ہیں حضرت عشرہ مبشرہ اور ان میں فضیلت مطلقہ حاصل ہے حضرات خلفاء اربعہ کو اور ان میں افضیلت علیٰ ترتیب الخلافت ہے یعنی افضل بعد الانبیاء بالتحقیق ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضؓ، پھر درجہ ہے حضرت عمر فاروق رضؓ کا پھر مقام ہے حضرت عثمان غنی رضؓ کا اور پھر مرتبہ ہے حضرت علی حیدر رضؓ کا رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین!

مزید بر آں صحابہ کرام رضؓ کل کے کل "عدول" ہیں اور ان کے مابین اختلاف، نزاع نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ خطائے اجتہادی کی بنا پر ہوا۔ چنانچہ مشاجرات صحابہ رضؓ کے باب میں محتاط ترین روش تو یہ ہے کہ "کف لسان سے کام لیا جائے اور کامل سکون اختیار کیا جائے تاہم کوئی حقیقی اور واقعی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو ایک کو "مصیب یعنی صحیح موقف پر اور دوسرے کو "مخطی یعنی راہ خطائے اجتہادی پر تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن کسی کو بھی سب و شتم یا الزام و اتہام کا ہدف بنانا جائز نہیں ہے۔

ج...... ہر قسم کے کفر اور جملہ انواع و اقسام شرک اور تمام رزائل و ذمائم اخلاق سے شعوری طور پر اعلان برات کرے، بایں الفاظ کہ۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ شَيْئًا اَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَ اسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَ تَبَرَّأْتُ مِنَ الْكُفْرِ وَ الشِّرْكِ وَالْكِذْبِ وَالْغِيْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَ النَّمِيْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَ الْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِىْ كُلِّهَا

یعنی "اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تیرے ساتھ کسی کو جانتے بوجھتے شریک کروں اور تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں اگر کبھی بے سمجھے بوجھے ایسا ہو جائے اور میں اعلان برات کرتا ہوں ہر نوع کے کفر سے، شرک سے، جھوٹ سے، غیبت سے، بدعت سے، چغل خوری سے، بے حیائی کے کاموں سے، بہتان طرازی سے اور جملہ نافرمانیوں سے"۔

تشریح...... ایمان کی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کفر حقیقی یا کفر قلبی اور دوسرے کفر قانونی یا کفر ظاہری۔ کفر حقیقی یا کفر قلبی کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری و ناشکری اور اس کی ہر معصیت اور ہر نافرمانی پر ہو جاتا ہے لیکن جہاں تک اس کفر قانونی یا کفر شرعی کا تعلق ہے جس کی بنا پر کسی کی تکفیر کر کے اس کا رشتہ ملت اسلامی سے منقطع کر دیا جائے تو وہ ضروریات دین میں سے کسی کے انکار ہی سے لازم آتا ہے' مجرد بے عملی یا نافرمانی حتیٰ کہ کبائر کے ارتکاب سے بھی لازم نہیں آتا۔

اسی طرح شرک کی بھی بے شمار اقسام ہیں مثلاً بعض شرک اعتقادی ہیں اور بعض صرف عملی، بعض جلی ہیں اور بعض خفی' تاہم جملہ انواع و اقسام شرک کا ایک احصا اور احاطہ اس طرح ممکن ہے کہ ایک شرک فی الذات ہے یعنی یہ کہ کسی کو کسی اعتبار سے خدا کا ہم جنس یا ہم کفو بنا دیا جائے جس کا کامل رد ہے سورہ اخلاص میں۔ دوسرے شرک فی الصفات ہے یعنی کسی کو کسی صفت کے اعتبار سے خدا کا مثل یا مثیل بنا دیا جائے جس کا نہایت مکمل سدباب ہے آیت الکرسی میں اور تیسرے شرک فی الحقوق ہے جس کی جامع ترین تعبیر شرک فی العبادت ہے جس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کوئی خدا سے بڑھ کر یا اس جتنا محبوب و مطلوب ہو جائے اور یہ بھی کہ کسی کو علی الاطلاق مطاع مان لیا جائے یعنی اس کی اطاعت خدا کی اطاعت سے آزاد تسلیم کر لی جائے اور یہ بھی کہ عام مادی قانون اور ظاہری قواعد و ضوابط کے دائرے سے باہر کسی سے استعانت اور استمداد و استغاثہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے اور اسے پکارا جائے (عام مادی قوانین کے تحت بھی اگر کسی کے بارے میں یہ خیال ہو کہ محض اپنی قوت اور ارادے سے کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے تو یہ شرک فی الصفات کی ایک قسم یعنی شرک فی القدرت اور شرک فی التصرف ہو گا۔ مزید برآں شرک کی اسی نوع کے ذیل میں آتے ہیں ریا اور سمعہ بھی اور کسی کے لئے کسی بھی نیت سے ان مراسم عبودیت کو بجا لانا بھی جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں جیسے سجدہ اور نذر!

رذائل و ذمائم اخلاق کی مکمل فہرست دینا ممکن نہیں۔ تاہم انسان ان سے اجتناب کرے جو اوپر بیان ہوئے تو دوسروں کا سدباب خود بخود ہو جائے گا!۔

د...... سابقہ زندگی کے تمام گناہوں پر نہایت الحاح و زاری سے بارگاہ خداوندی میں مغفرت کا طلب گار ہو اور آئندہ کے لئے کامل خلوص و اخلاص کے ساتھ توبہ کرے' ان الفاظ کے ساتھ کہ۔

استغفر الله ربی من کل ذنب اذنبته عمدا
او خطأً سرا اوعلانية و اتوب اليه
من الذنب الذی اعلم ومن الذنب الذی
لااعلم انک انت علام الغيوب و غفار الذنوب

”یعنی میں اللہ سے معافی کا خواستگار ہوں تمام گناہوں پر خواہ میں نے جان بوجھ کر کئے ہوں یا غیر ارادی طور پر' اور خواہ چھپ چھپا کر کئے ہوں خواہ علانیہ طور پر' اور خواہ وہ میرے علم میں ہوں خواہ میرے علم میں نہ ہوں۔ اے اللہ تو ہی تمام غیبوں کا جاننے والا اور تمام عیبوں کی پردہ پوشی کرنے والا اور تمام گناہوں کی بخشش فرمانے والا ہے!“۔

تشریح...... توبہ صرف زبان سے کلمات توبہ کے ادا کر دینے یا ان کے ورد یا وظیفہ بنا لینے کا نام نہیں ہے بلکہ گناہ پر حقیقی ندامت اور واقعی پشیمانی اور معصیت سے کلی اجتناب کے عزم مصمم کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں رجوع کرنے اور گناہ و معصیت کو بالفعل ترک کر دینے کا نام ہے یہ تین شرائط ان کوتاہیوں کے ضمن میں کافی ہیں جو حقوق اللہ کے باب میں ہوں' حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے معاصی کے لئے ایک چوتھی اضافی شرط یہ ہے کہ جس کسی پر زیادتی ہوئی ہو اس کی تلافی کی جائے یا اس سے معافی حاصل کی جائے۔

بنابریں توبہ کی صحت کے لئے لازم ہے کہ جو شخص تنظیم اسلامی میں شمولیت کا خواہاں ہو وہ۔

۱۔ جملہ فرائض دینی کی پابندی اختیار کرے اور تمام کبائر سے فی الفور مجتنب ہو جائے۔ بالخصوص ارکان اسلام کی پوری پابندی کرے۔ چنانچہ نماز قائم کرے (مردوں کے لئے التزام جماعت بھی ضروری ہے)' رمضان المبارک کے روزے رکھے' صاحب نصاب ہو تو باقاعدہ حساب کے ساتھ پوری زکوٰۃ ادا کرے۔ اور صاحب استطاعت ہو اور تاحال حج

بت اللہ نہ کیا ہو تو فوراً نیت کرے اور جلد از جلد فریضہ حج ادا کرے۔

۲۔ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ سے زیادہ اتباع کرے اور ایسی تمام بدعات اور رسومات کو ترک کر دے جن کا ثبوت قرون مشہود لہا بالخیر میں نہ ملتا ہو۔

تشریح ..... ان بدعات و رسومات کا زیادہ زور شادی' بیاہ' پیدائش' عقیقہ' ختنہ' سالگرہ' فوتیدگی اور تہواروں کے مواقع پر ہوتا ہے۔ ان سب میں لازم ہو گا کہ اپنے معاملات کو زیادہ سے زیادہ قرون اولیٰ کے مطابق بنایا جائے اور بعد کے اضافوں کو ترک کر دیا جائے۔

۳۔ اگر کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کے ذیل آتا ہو جیسے چوری' ڈاکہ' سود' شراب' زنا' رقص و سرود' شہادت زور' رشوت' خیانت' جوا اور سٹہ وغیرہ تو اسے ترک کر دے۔

تشریح اس بات کا تو بظاہر احوال کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ لوگ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے خواہاں ہوں جن کی معاش چوری یا ڈاکہ' شراب کی تیاری یا اس کی فروخت وغیرہ' عصمت فروشی یا رقص و سرود ایسے قبیح کاموں سے متعلق ہو تاہم اگر اللہ تعالیٰ ایسے کسی کاروبار سے متعلق کسی فرد کو اصلاح کی توفیق دے تو یہ بھی اس کی رحمت سے بعید نہیں۔ بہر صورت ان تمام کاموں کی حرمت اور قباحت و شناعت ہمارے معاشرے میں معلوم و معروف ہے..... البتہ بعض حرام چیزیں کچھ اس طرح ہمارے معاشرے میں جاری و ساری ہو گئی ہیں کہ عام لوگ یا تو ان کی قباحت سے ہی آگاہ نہیں رہے یا انہوں نے کسی مجبوری کے عذر کی بنیاد پر ان کو اپنے لئے مباح کر لیا ہے۔ ان میں سے مکروہ ترین چیز ہے سود' جس سے باز نہ آنے پر قرآن حکیم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اعلان جنگ کی وعید سناتا ہے اور دوسرے نمبر پر ہے رشوت اور سرکاری حیثیت اور اختیار کا ناجائز استعمال اور ان پر مستزاد ہیں بیع و شرا کی بعض ناجائز صورتیں اور سرکاری محاصل (انکم ٹیکس' کسٹم ڈیوٹی وغیرہ) سے بچنے کے لئے اخفاو کذب بیانی۔

ہمیں خوب اندازہ ہے کہ اس وقت جو خدا ناشناس اور عاقبت نا آشنا نظام پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور پورا انسانی معاشرہ بحیثیت مجموعی جس فساد اخلاق میں مبتلا ہے اس کے پیش نظر ان تمام چیزوں سے کامل اجتناب نہایت مشکل اور صبر آزما کام ہے لیکن تنظیم اسلامی جن مقاصد کے لئے قائم کی جا رہی ہے اس کے پیش نظر لازم ہے کہ اس سے عملی وابستگی کے لئے وہی لوگ آگے بڑھیں جو رخصتوں اور حیلوں پر عمل کرنے کے بجائے عزیمت اور صبر و توکل کو اپنا شعار بنائیں اور ہر اس ذریعہ معاش کو ترک کرنے کی کوشش کریں جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ اس معاملے میں سردست حسب ذیل تصریحات پر اکتفا کی جاتی ہے۔

۱۔ سود لینا اور دینا قطعاً حرام ہیں' لہٰذا بینکوں یا دیگر اداروں سے نہ کوئی رقم کسی بھی غرض کے لئے سود پر قرض لی جا سکتی ہے' نہ سیونگ اکاؤنٹ یا فکسڈ ڈیپازٹ یا نقد رقم پر معینہ منافع کی کسی بھی دوسری صورت میں سرمایہ لگانا درست ہے۔ چنانچہ بینکوں سے صرف عام سروسز جیسے ترسیل زر یا لاکرز سے انتفاع یا زیادہ سے زیادہ کرنٹ اکاؤنٹ رکھنے کی سہولتیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

۲۔ کسی ایسے کاروباری ادارے کی ملازمت بھی درست نہیں ہے' جس میں سود کو غالب عنصر کی حیثیت حاصل ہو جیسے بنک اور انشورنس کمپنیاں۔

۳۔ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔ البتہ کسی ایسی صورت میں کہ کسی ظالم اہلکار یا صاحب اختیار کو اپنا جائز حق وصول کرنے کے لئے کچھ مجبوراً دینا پڑے تو اس کا شمار استحصال بالجبر میں ہو گا رشوت میں نہیں۔ البتہ یہ صرف اسی صورت میں ہو گا کہ نہ کوئی ناجائز انتفاع مطلوب ہو' نہ کسی سرکاری قانون اور پابندی سے بچنا مقصود ہو اور نہ ہی کسی اور کے جائز حقوق پر زد پڑتی ہو۔

۴۔ سرکاری محاصل کے ضمن میں جتنی رعایتیں مروجہ قانون کے اندر اندر ممکن ہوں ان سے بڑھ کر کسی ایسی صورت کو اختیار کرنا درست نہیں جس میں کذب' فریب اور شہادت

ر شامل ہوں۔

۵۔ کاروبار کی مختلف صورتوں میں سے بھی جن جن میں بیع فاسد یا جوئے یا سٹے یا
ار وغیرہ کا عنصر شامل ہو اس سے بچنا لازم ہے

۶۔ اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائداد ہو جو حرام طریقے سے آیا ہو یا جس میں حق
روں کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دستبردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے
پہنچا دے۔ البتہ یہ عمل صرف اس صورت میں کرنا ہو گا جب کہ حق دار بھی معلوم ہوں
رہ مال بھی معلوم و متعین ہو جس میں ان کا حق تلف ہوا ہے۔ بصورت دیگر توبہ اور آئندہ
لئے طرز عمل کی اصلاح کافی ہو گی۔

۷۔ اپنی معاشرت میں جملہ اسلامی احکام کی پابندی کرے خصوصاً ستر اور حجاب کے شرعی
کام پر عمل پیرا ہو۔

۸۔ گہرے احساس ذمہ داری کے ساتھ اعلان کرے کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف
لہ کا ہو کر رہے گا' رضائے الٰہی ہی اس کا اصل مقصود و مطلوب ہو گی اور نجات و فلاح اخروی
احصول ہی اس کا اصل نصب العین ہو گا...... اور جس طرح اس کی نماز اور قربانی صرف اللہ
کے لئے ہو گی اسی طرح اس کے جسم و جان' مال و متاع حتیٰ کہ زندگی اور موت سب اللہ ہی کے
لئے ہوں گے۔ یعنی انی وجهت وجهی للذی فطر السموت والارض
حنیفا وما انا من المشرکین ○ ......اور......ان صلوتی ونسکی ومحیای
ومماتی لله رب العلمین لاشریک له وبذالک امرت وانا اول المسلمین

تشریح ہر ذی شعور مسلمان کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اپنی
پوری زندگی اس کی کامل اطاعت میں دیدے (جو لازماً اطاعت رسولؐ ہی کے واسطے سے ہو
گی!) اسی رویئے کا نام عبادت رب ہے جو ہر انسان سے اللہ کا پہلا مطالبہ ہے اور جس کی طرف
نوع انسانی کو دعوت دینے کے لئے تمام انبیاء و رسل مبعوث ہوئے اور جو از روئے قرآن جنوں
اور انسانوں کا عین مقصد تخلیق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر لازم ہے کہ اپنی صحت و قوت'
فرصت و فراغت' صلاحیت و استعداد' مال و دولت' اور وسائل و ذرائع کا زیادہ سے زیادہ حصہ
تواصی بالحق اور تواصی بالصبر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' احقاق حق اور ابطال باطل'
دعوت الی اللہ اور تبلیغ دین' نصرت خدا و رسولؐ اور حمایت و اقامت دین' اور شہادت حق
علی الناس' اور اظہار دین حق علی الدین کلہ' کے لئے وقف کر دے اور اس کے لئے محنت و

مشقت' انفاق و ایثار' ترک و اختیار' ابتلاو آزمائش' صبرو مصابرت' استقامت مقاومت...... الغرض ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کے جملہ مراحل کے لئے مقدور بھر ہمت عزیمت کی راہ اختیار کرے۔ یہ تمام فرائض ہر مسلمان پر حسب صلاحیت و استعداد اور مطابق وسعت و قوت عاید ہوتے ہیں اور ان کی انجام دہی میں ہی بندے کی وفاداری کا اصل امتحان ہے!

۱۰/ اگست ۷۷ء کو جو عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی مع الفاظ بیعت طے ہوا تھا۔ اس پر بعدہ ترمیم ہوئی۔ لہٰذا اس وقت رائج عہد نامہ رفاقت صفحات ۱۰۴-۱۰۵ پر پیش کیا جا رہا ہے۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا

عقد الرفاقة للتنظيم الاسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ
(صلی اللہ علیہ وسلم)

☐ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ
وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

✪ اِنِّيْ اُعَاهِدُ اللّٰهَ

- عَلٰى اَنْ اَهْجُرَ كُلَّ مَا يَكْرَهُهٗ
- وَاُجَاهِدَ فِيْ سَبِيْلِهٖ جُهْدَ اِسْتِطَاعَتِيْ
- وَاُنْفِقَ مَالِيْ وَاَبْذُلَ نَفْسِيْ

لِاِقَامَةِ دِيْنِهٖ وَاِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ

✪ وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ
اُبَايِعُ الدَّكْتُوْر اِسْرَار اَحْمَد اَمِيْرَ التَّنْظِيْمِ الْاِسْلَامِيْ

- عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْمَعْرُوْفِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ
وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيَّ

- وَعَلٰى اَنْ لَّا اُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ
- وَعَلٰى اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنْتُ

لَا اَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

☐ اَسْتَعِيْنُ اللّٰهَ رَبِّيْ وَاَسْتَقْدِرُهٗ عَلَى الْاِسْتِقَامَةِ
عَلَى الدِّيْنِ وَاِيْفَاءِ هٰذَا الْعَهْدِ

التاریخ ____________

عہد نامۂ رفاقت تنظیمِ اسلامی

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

☐ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اُس کا کوئی ساجھی نہیں۔
اور مَیں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسُول ہیں۔

☐ مَیں اللہ تعالےٰ سے اپنے (آج تک کے) تمام گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں۔
اور (آئندہ کے لیے) خلوصِ دل کے ساتھ اُس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔

✪ مَیں اللہ تعالےٰ سے عہد کرتا ہوں کہ:

- اُن تمام چیزوں کو ترک کر دُوں گا جو اُسے ناپسند ہیں۔
- اور اُس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
- اور اُس کے دین کی اقامت اور اُس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے اپنا مال بھی صَرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا۔

✪ اور اسی مقصد کی خاطر

میں امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے بیعت کرتا ہوں کہ:

- اُن کا ہر حکم سُنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو۔
  — خواہ تنگی ہو خواہ آسانی
  — خواہ میری طبیعت آمادہ ہو خواہ مجھے اس پر جبر کرنا پڑے، اور
  — خواہ دوسروں کو مجھ پر ترجیح دی جائے!
- اور یہ کہ نظم کے ذمہ دار لوگوں سے ہرگز نہیں جھگڑوں گا،
- اور یہ کہ ہر حال میں حق بات ضرور کہوں گا —
  — اور اللہ کے دین کے معاملے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کروں گا۔

☐ میں اللہ ہی سے مدد اور توفیق کا طالب ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کے پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے،

نام ____________

تنظیمِ اسلامی کے لیے مفصّل قواعد و ضوابط اور نئے نظام العمل کی تدوین کے سلسلے میں منعقدہ مرکزی مجلسِ مشاورت کی رُوداد

(چوہدری) غلام محمد ۔ معتمد عمومی

تنظیمِ اسلامی کی مجلسِ مشاورت کا ایک خصوصی اجلاس ۲ ۔ ۳ مارچ ۸۸ء کو قرآن اکیڈمی لاہور میں امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوا ۔ پہلی نشست ۲ مارچ بروز بدھ صبح ۹ بجے شروع ہوئی اور نمازِ ظہر تک جاری رہی ۔ دوسری نشست اسی روز بعد نمازِ عصر تا ۱۱ بجے شب منعقد ہوئی ۔ دوسرے روز ۳ مارچ کو بھی صبح اور شام دو نشستیں ہوئیں اور رات ۱۱ بجے یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا ۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل حضرات شریک ہوئے :

۱ ۔ ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب (کراچی) ۲ ۔ جناب شیخ جمیل الرحمٰن صاحب (کراچی)
۳ ۔ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب (فیصل آباد) ۴ ۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب (جھنگ)
۵ ۔ چوہدری رحمت اللہ بُٹر صاحب (فیصل آباد) ۶ ۔ جناب اقتدار احمد صاحب (لاہور)
۷ ۔ ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (لاہور) ۸ ۔ میجر فتح محمد صاحب (لاہور)
۹ ۔ جناب الطاف الرحمٰن صاحب (لاہور) ۱۰ ۔ مرزا محمد ایوب بیگ صاحب (لاہور)
۱۱ ۔ چوہدری محمد اسحٰق صاحب (لاہور) ۱۲ ۔ سید واحد علی رضوی صاحب (کراچی)
۱۳ ۔ ڈاکٹر غلام حیدر ترین صاحب (ملتان) ۱۴ ۔ میاں محمد یوسف صاحب (فیصل آباد)
۱۵ ۔ جناب شمس الحق اعوان صاحب (وزیر آباد) ۱۶ ۔ میاں محمد یعقوب صاحب (گوجرانوالہ)
۱۷ ۔ جناب محمد نیاز مرزا صاحب (راولپنڈی) ۱۸ ۔ راجہ سردار احمد صاحب (پشاور)
۱۹ ۔ جناب قمر سعید قریشی صاحب (لاہور) ۲۰ ۔ جناب عبدالرزاق صاحب (لاہور)
۲۱ ۔ جناب نجیب صدیقی صاحب (سکھر) ۲۲ ۔ جناب اکرام الحق صاحب (کوئٹہ)
۲۳ ۔ جناب غلام مرتضٰی اعوان صاحب (اسلام آباد) ۲۴ ۔ جناب اشفاق احمد میر صاحب (پشاور)
۲۵ ۔ میاں محمد نعیم صاحب (لاہور) ۲۶ ۔ جناب غلام محمد صاحب (لاہور)

مندرجہ ذیل اراکین مجلس مشاورت شریکِ اجلاس نہ ہو سکے:۔

۱۔ جناب عبدالواحد عاصم صاحب (کراچی) معذرت بوجہ علالت
۲۔ جناب سراج الحق سید صاحب (کراچی) معذرت بوجہ علالت
۳۔ سید برہان علی ہاشمی صاحب (کوئٹہ) معذرت
۴۔ جناب عبدالقادر صاحب (حیدرآباد) بلا اطلاع

اس اجلاس میں نظام العمل کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔ جناب امیر تنظیم نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے اس کے پس منظر اور ضرورت کی وضاحت فرمائی۔ گذشتہ اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ میاں محمد نعیم صاحب دوسرے موزوں حضرات کی معاونت سے ڈرافٹ تیار کریں جو پروگرام کے مطابق ایک ابتدائی ڈرافٹ تیار کیا گیا۔ جو امرائے حلقہ اور بعض دیگر چیدہ رفقاء کو غور و خوض کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد حسبِ پروگرام ۶ر ۔ ۷ر فروری کو یہ حضرات قرآن اکیڈمی لاہور میں جمع ہوئے اور باہم غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد نظام العمل کے مختلف حصوں کا ایک نقشہ بنایا گیا جو کہ بعد ازاں مزید اصلاح کے لیے امرائے حلقہ کی وساطت سے اراکینِ مشاورت کو بھیج دیا گیا۔ امیرِ محترم نے بھی اس کو سرسری طور پر ملاحظہ فرمایا اور بعض خامیوں کی نشاندہی کی۔ اراکینِ مشاورت کو امیرِ محترم کے اس تبصرہ سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا تاکہ انہیں اس نئے ڈرافٹ پر غور و فکر اور اصلاح کرنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ اجلاس میں اراکینِ مجلسِ مشاورت نے ۳۱ ... اظہارِ خیال کیا۔ کئی پہلو زیرِ بحث آئے۔ زبان اور اسلوب کو قابلِ اصلاح اور مجوزہ مشاورتی ... اور نگران ادارے کی تفصیلات کو پیچیدہ خیال کیا گیا۔ مختار حسین فاروقی صاحب نے ڈرافٹ ... مجوزہ مشاورتی حصہ کی وضاحت فرمائی۔ امیرِ محترم نے فرمایا کہ اس ڈرافٹ میں بعض بنیادی با... کا تصفیہ نہیں کیا گیا۔ نظام العمل کی تیاری کے لئے اوّلاً ان امور کو طے کرنا ضروری ہے۔ ا... کے بعد نظام العمل کو مناسب انداز میں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل نہ ہوگا۔ ان امور پر اجلاس ... مفصل بحث ہوئی اور مندرجہ ذیل فیصلے کئے گئے۔

۱۔ (۱) پاکستان میں تنظیم اسلامی کا نظم آئندہ "تنظیم اسلامی پاکستان" کے عنوان سے ہوگا اور اس میں پاکستان کی شہریت رکھنے والے مسلمان ہی شامل ہو سکیں...
(۲) پاکستان کے جو شہری عارضی طور پر بیرونی ممالک میں قیام پذیر ہوں وہ تنظیم اسلا... میں شمولیت کی صورت میں براہِ راست "تنظیم اسلامی پاکستان" ہی ...

میں شامل ہوں گے۔

(۳) دنیا کے دوسرے ممالک کے مسلمان شہری بھی تنظیم اسلامی میں شامل ہو سکیں گے البتہ ان کا نظم اور نظام العمل جداگانہ بنایا جائے گا۔

(۔ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لئے بیعت کی اساس اگرچہ دس سال قبل اختیار کر لی گئی تھی لیکن فی زمانہ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے اس مسنون اساس کے متروک العمل ہونے کے باعث تنظیم اسلامی کو بھی اس کے عملی تقاضوں سے کامل ہم آہنگی کے ضمن میں تدریجی مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ اسی ضمن میں اگرچہ متعدد فیصلے مختلف اوقات میں کئے جاتے رہے ہیں لیکن ان کو باضابطہ ضبطِ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح اگرچہ تنظیم کی قراردادِ تاسیس اور اس کی توضیحات میں بعض تاریخی اسباب کی بنا پر فریضۂ اقامتِ دین کی اہمیت اور اس کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کے قدرے خفی اور غیر نمایاں ہونے کے پیشِ نظر تنظیم کے آٹھویں سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ آئندہ تنظیم اسلامی محض اصلاحی اور دعوتی نہیں بلکہ انقلابی تنظیم ہوگی۔ تاہم ابھی تک یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ تحریری طور پر سامنے نہیں آئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان دونوں امور کو مجوزہ نظام العمل میں صراحت کے ساتھ درج کر دیا جائے۔

اس ضمن میں میاں محمد نعیم صاحب نے اس رائے کا اظہار کیا کہ تنظیم اسلامی کے نصب العین کے طور پر رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی کے حصول کا ذکر ضروری ہے۔ بصورت دیگر اندیشہ ہے کہ ہم ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف نہ چلے جائیں اور رفقائے تنظیم کی نگاہوں سے اصل نصب العین اوجھل ہو جائے اور وہ محض سیاسی یا انقلابی کارکن بن کر رہ جائیں۔

بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ:

(۱) جیسا کہ پانچ سال قبل طے کیا گیا تھا تنظیم اسلامی کی قراردادِ تاسیس مع توضیحات اور " شرائطِ شمولیت " پر مشتمل مفصل تحریر کو آئندہ تنظیم کی آئینی و دستوری اساس نہیں بلکہ اس کے دعوتی و تربیتی لٹریچر کا اہم اور اساسی حصہ سمجھا جائے گا۔

(۲) پانچ سال قبل کے اس فیصلے کی توثیق بھی کی جاتی ہے کہ تنظیم کو انقلابی خطوط پر چلایا جائے گا چنانچہ مجوزہ نظام العمل کی پہلی دفعہ یہ ہوگی:

" تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد قرآن و سنت کی اصطلاح میں اقامت

دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد فی سبیل اللہ اور عام فہم الفاظ میں "حکومت الٰہیہ" کے قیام یا "اسلامی انقلاب" برپا کرنے کے لئے منظم جدوجہد کرنا ہے۔"

(۳) مجوزہ نظام العمل کی دوسری دفعہ حسب ذیل ہوگی۔
"ڈاکٹر اسرار احمد ابن الشیخ مختار احمد المرحوم کو تنظیم اسلامی کے داعی و مؤسس اور تاحیات امیر کی حیثیت حاصل ہے۔ اور ہر وہ مسلمان اس تنظیم میں شامل ہو سکتا ہے جو ان سے تنظیم کے مقصد کے حصول کے لئے سمع و طاعت فی المعروف کی بیعت کرے۔"

(۴) بیعت کے لئے وہی الفاظ مستعمل رہیں گے جو اس وقت رائج ہیں۔

(۵) تنظیم اسلامی کا تنظیمی ڈھانچہ بحیثیت مجموعی علیٰ حالہٖ قائم رہے گا۔ یعنی مرکز، مقامی تنظیمیں، اسرہ جات اور منفرد رفقاء ــــ حلقہ جاتی نظام مرکز ہی کی توسیع شمار ہوگا۔

(۶) خواتین بھی تنظیم اسلامی میں شامل ہو سکیں گی۔ البتہ ان کے لیے بیعت کے الفاظ وہ ہوں گے جو قرآن وحدیث میں "بیعت النساء" کے عنوان سے مذکور ہیں۔ نیز خواتین کا نظم بھی جداگانہ قائم کیا جائے گا۔

ج۔ رفقاء کے مابین درجہ بندی کے موضوع پر مفصل گفتگو ہوئی۔ تین سوالات متعین کر دیے گئے۔ کیا درجہ بندی کی ضرورت ہے؟
اگر ضرورت ہے تو کیا وہ نمایاں ہونی چاہیئے یا مخفی؟
اگر درجہ بندی نمایاں ہونی چاہیئے تو ان مدارج کا کیا نام ہو؟

تمام اراکین مشاورت نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ پانچ حضرات کی رائے یہ ہوئی کہ درجہ بندی کی ضرورت نہیں۔ آٹھ حضرات نے اس کو ضروری خیال کیا تاہم اس کو نمایاں کرنا خلاف مصلحت سمجھا۔ تیرہ حضرات نے علی الاعلان درجہ بندی کو ضروری خیال کیا۔ فیصلہ ہوا کہ تنظیم اسلامی کے رفقاء تین درجات میں منقسم ہوں گے۔

(i) اوّلاً وہ مبتدی رفقاء جو تنظیم اسلامی میں نئے نئے شامل ہوئے ہوں اور ابھی فکری عملی تربیت کے ابتدائی مراحل طے کر رہے ہوں۔

(ii) ثانیاً وہ رفقاء جو ان ابتدائی مراحل کو طے کر کے تنظیم اسلامی کے نظم کے بالفعل

پابند ہو چکے ہوں۔

(iii) ثالثاً وہ رفقاء جو کسی سبب سے اضمحلال کا شکار ہو جائیں اور نظم کی پابندی نہ کر پائیں۔

—— ان درجات کے نام بعد میں متعین کر لیے جائیں گے۔

مشاورتی نظام کے بارے میں (مجلس مشاورت منعقدہ ۲۔۳ مارچ ۸۸ء) کئی نشستوں پر بسیط طویل بحث ہوئی۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب اور میاں محمد نعیم صاحب نے نظام العمل کے تیار کردہ مسودہ میں مجوزہ مشاورتی نظام کی تشریح میں بتایا کہ پیش نظر یہ ہے کہ ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں جن سے تمام رفقاء کو تنظیم اسلامی کے معاملات میں شرکت کا احساس ہو۔ انہیں اظہارِ رائے کے بھرپور مواقع حاصل ہوں اور ان کی تجاویز، اعتراضات اور اشکالات سامنے آتے رہیں۔ مزید برآں ایک معیّن مجلسِ مشاورت بھی ہو جس میں نامزد ذمّہ دار حضرات کے علاوہ منتخب رفقاء بھی شامل ہوں۔ یہ مجلس حسب ضرورت مختلف المیعاد منصوبے بنائے اور ذمّہ دار حضرات اس پر عمل درآمد کریں۔ اور یہ مجلس ایک نگران ادارہ کی حیثیت سے فیصلوں پر عمل درآمد کا جائزہ لیتی رہے —— امیرِ محترم نے ایک اسلامی نظمِ جماعت میں مشاورت کے فلسفے کی تشریح فرمائی کہ بیعت کے نظام پر مبنی جماعتی ہیئت میں اصل دار و مدار امیر کی صوابدید پر ہوتا ہے اور ایسی ہیئت اجتماعیہ میں زیادہ قانونی پیچیدگیوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مشورہ یقیناً بہت اہم ہے لیکن اصلاً یہ امیر کی ضرورت ہے اور اس میں فطری طور پر اوّلیت ان رفقاء کو حاصل ہوگی جو اس کے گرد و پیش موجود ہوں اور عملاً اس کے دست و بازو بن گئے ہوں۔ البتہ ایسے مواقع ضرور ہونے چاہئیں جن میں دوسرے مقامات کے صائب الرائے اور ذمہ دار اور معتمد علیہ حضرات سے بھی مشورہ ہو سکے۔ مزید براں اس امر کا بھی پورا اہتمام ہونا چاہیئے کہ تنظیم کی پالیسی اور رفتار کار کے ضمن میں تمام رفقاء کے تاثرات بھی پہنچتے رہیں اور احتساب و تنقید کا بھی فعّال اور مؤثر نظام برقرار رہے! —— ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب نے مشورے کی اہمیت پر مزید زور دیتے ہوئے کہا کہ اگرچہ فیصلے کا اختیار امیر ہی کو حاصل ہوتا ہے تاہم اسے مشورہ کرنے کا پابند ضرور ہونا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا پابند کیا گیا تھا اگرچہ دورِ نبویؐ میں باقاعدہ مشاورتی ادارہ قائم نہیں ہوا تھا تاہم خلافت راشدہ کے دور میں اس کا بھی اہتمام ہوا اور ہمیشہ کوشش یہ کی گئی کہ فیصلے اتفاق رائے

سے ہوں ___ چودھری رحمت اللہ صاحب بٹر نے مشورے کے لزوم کی تائید
کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہ امیر کی ضرورت ہے اسی لئے شریعت نے اس کو پابند
کیا ہے اگرچہ مجلسِ مشاورت کی متعین شکل ضروری نہیں۔ قمر سعید قریشی صاحب نے
یاد دلایا کہ نظامِ بیعت کے تقاضوں کے تحت ہمارا رُخ اسی جانب رہا ہے کہ بتدریج
ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے کہ مشورہ کی ضرورت قریبی اور فعال رفقاء کے حلقے ہی
سے پوری ہو جائے۔ میاں محمد نعیم صاحب، جناب شمس الحق اعوان صاحب اور شیخ
جمیل الرحمٰن صاحب اور دیگر اکثر اراکینِ مشاورت نے ایک متعین مشاورتی ادارے کی
ضرورت و اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ امیر کے لئے صحیح فیصلہ تک پہنچنے کی مناسب ترین
صورت یہی ہے ___ امیر محترم نے بالآخر بحث کو سمیٹتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ مشورے کی
ضرورت اور اہمیت بالکل واضح ہے۔ کسی بھی تحریک کے چلنے کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے
جب تک اس میں روحِ مشورہ پورے طور پر جاری و ساری نہ ہو۔ ہمارے پیشِ نظر بھی اصلاً
اس روح کو برقرار رکھنا ہے۔ نظامِ بیعت میں باہمی مشورے کے تقاضے غیر قانونی انداز
میں پورے کئے جاتے ہیں ___

اس بحث و تمحیص کے بعد حسبِ ذیل فیصلے کئے گئے:۔

(۱) تنظیم اسلامی کے مقاصد کے حصول کے لئے عملی پیش قدمی کے لئے ضروری فیصلے
امیرِ تنظیم قریبی رفقاء اور ذمہ دار حضرات کے مشورے سے کرتے رہیں گے اور اس
مشاورت میں وہ حسبِ ضرورت امرائے حلقہ، اہم تنظیموں کے امراء اور مشورہ طلب
مسئلہ کی مناسبت سے دیگر صائب الرائے رفقاء کو طلب کر سکیں گے۔

(۲) ایک متعین مجلسِ شوریٰ مرکز کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار حضرات اور امرائے حلقہ
کے علاوہ رفقاءِ تنظیم کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہو گی۔ جس کا اجلاس ایک معیّن
وقفے کے بعد ہونا ضروری ہو گا۔ جس میں اہم امور پر مشورہ ہو گا۔ جس کے ضمن
میں بحث و تمحیص کا پورا موقع دیا جائے گا۔ مزید برآں تنقید اور محاسبے کی بھی کھلی
آزادی ہو گی۔ اس مجلس کے لئے انتخاب میں صرف وہی رفقاءِ تنظیم رائے دے
سکیں گے جو خود نظم کے بالفعل پابند ہوں (بحوالہ فیصلہ "ج" مندرجہ بالا)۔

(۳) تنظیم کے جملہ وابستگان کی آراء سے مستفید ہونے کی خاطر ہر سال ایک اجتماع

منعقد کیا جائے گا جس میں جملہ رفقاءِ تنظیم کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی ہوگی۔ اس اجتماع میں امیرِ تنظیم اور مرکز کے ذمّہ دار رفقاء صرف بحیثیت سامع شریک ہوں گے اور اس کا اصل مقصد رفقاء کی آراء سے استفادہ ہوگا ــــ لہٰذا اس میں کوئی بحث و تمحیص، ردّ و قدح نہ مناسب ہوگی نہ ممکن! ــــ یہ اجتماع کم از کم چار ایام پر محیط ہوگا۔ مزید براں اس میں مرکزی مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے ایسے حضرات کو بھی اظہارِ رائے اور حقِ نصیحت ادا کرنے کا موقع فراہم کیا جائے گا جو بالفعل تو تنظیم میں شامل نہ ہوں لیکن تنظیم کے مقاصد سے فی الجملہ اتفاق رکھتے ہوں اور تنظیم کے ساتھ بالفعل ہمدردی کا تعلق رکھتے ہوں ــــ اس نوع کے اجتماعات کا انعقاد تنظیم کی توسیع کی مناسبت سے حسبِ ضرورت اضافی طور پر حلقہ جات کی سطح پر بھی کیا جا سکے گا۔

●●●●●

بیعت برائے خواتین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

● اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

● اَسْتَغْفِرُ اللهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

● اِنِّيْ اُبَايِعُ الدُّكْتُوْرَ اِسْرَارَ اَحْمَدَ، اَمِيْرَ التَّنْظِيْمِ الاسلامی عَلٰى اَنْ لَّآ اُشْرِكَ بِاللهِ شَيْئًا۔

وَلَا اَسْرِقَ ــــــــــ

وَلَا اَزْنِيَ ــــــــــ

وَلَا اَقْتُلَ اَوْلَادِيْ ــــــــــ

وَلَا اٰتِيَ بِبُهْتَانٍ ــــــــــ

وَلَا اَعْصِيَهٗ فِيْ مَعْرُوْفٍ ــــــــــ

● اَسْئَلُ اللهَ رَبِّيْ الْاِسْتِقَامَةَ عَلٰى هٰذَا الْعَهْدِ

التوقیع (دستخط) ــــــــــــــــــــ

● احمدهٗ واصلی علی رسولہ الکریم ، اما بعد

● فقد بایعتُكِ علی سُنّةِ رسولِ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

● واستغفر اللہ لی و لكِ۔

ــــــــــــــــــــ

شمولیتِ تنظیمِ اسلامی

● میں گواہی دیتی ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکہ و تنہا ہے اور اُس کا کوئی ساجھی یا شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتی ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) اُس کے بندے اور رسول ہیں۔

● میں اللہ سے جو میرا مالک اور پروردگار ہے (اپنی سابقہ زندگی کے) تمام گناہوں کی بخشش کی درخواست کرتی ہوں اور (آئندہ کے لئے) اُس کی جناب میں خلوصِ دل سے توبہ کرتی ہوں (کہ اُس کا کوئی حکم نہ ٹالوں گی)

● میں ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی سے بیعت کرتی ہوں کہ:

——— اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤں گی۔

——— کبھی چوری نہیں کروں گی۔

——— کبھی بے حیائی کا ارتکاب نہیں کروں گی۔

——— کبھی بچوں کو قتل نہ کروں گی۔

——— کبھی بہتان طرازی نہ کروں گی ——— اور

——— کسی بھی بھلے کام کے ضمن میں اُن کے حکم سے سرتابی نہ کروں گی۔

● میں اللہ سے دُعا کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے!

الاسم و العنوان (نام اور پتہ): ____________________

____

● اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) کے درود کے بعد:

● میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی سنت کے مطابق آپ کی بیعت قبول کی

● اور میں اللہ سے اپنے اور آپ کے لئے مغفرت کی دُعا کرتا ہوں۔

———
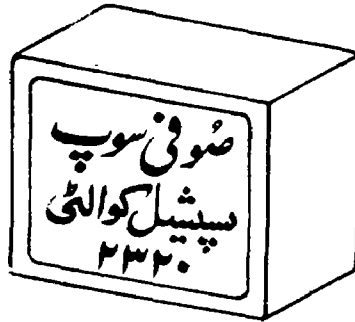
بقیہ: قافلۂ تنظیم منزل بمنزل

...تھے کہ اپنی بقیہ زندگی قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے ــــ ساتھ ہی حضرت نے ...ت العلماء ہند کے ایک کھلے اجلاس میں تجویز پیش کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند قرار ...کر ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی جائے۔ لیکن چند وجوہ سے حضرت کی یہ تجویز اس اجلاس میں ...ور نہ ہو سکی اور غور و خوض کے لئے مجلسِ شوریٰ کے سپرد کر دی گئی۔ اس اجلاس کے قریباً ۲۰ دنوں بعد حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا۔ (تفصیل کے لئے محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی تازہ ترین تالیف ...عت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی" کا مطالعہ مفید رہے گا۔) مجلسِ شوریٰ میں بھی یہ تجویز پاس نہ ہو سکی. ...نچہ مولانا آزاد مرحوم نے علماء کے طرزِ عمل سے بد دل اور مایوس ہو کر اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں ...امِ وطن کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے لئے وقف کر دیں۔

لیکن مولانا آزاد مرحوم نے جو صدا بلند کی تھی اور جو پکار لگائی تھی وہ رائیگاں نہیں گئی۔ اسی ...اثرات تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نوجوان کو اس کام کے لئے کھڑا کر دیا۔ یہ تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ ...ودی مرحوم و مغفور۔ انہوں نے ۱۹۲۸ء میں جب کہ ان کی عمر قریباً ۲۵ برس کی تھی "الجہاد ...الاسلام" جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی۔ پھر ۱۹۳۲ء سے "ماہنامہ ترجمان القرآن" کا اجراء ...جس کے ذریعہ سے دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق بالکل نئے انداز اور مضبوط استدلال ...ساتھ ملک کے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقے کی تطہیرِ افکار کے کام کا آغاز کیا۔

یہ وہ دور تھا جس میں علماء کرام استخلاصِ وطن کی جدوجہد میں انڈین نیشنل کانگریس کے ...نوا اور اس کے فعال معاون و اعوان تھے اور "متحدہ ہندی قومیت" کے زبردست مؤید ...ر وکیل تھے ــــ مولانا مودودی مرحوم نے نقلی یعنی کتاب و سنت اور عقلی یعنی عمرانیات کے مسلمات ...کے دلائل سے "متحدہ قومیت" کے نظریہ پر نہایت مسکت تنقیدیں کیں۔ جس نے مسلمانوں کے ...ہین عناصر کو علمی و فکری طور پر متحدہ قومیت کی خطرناکی کا قائل کر لیا۔ دوسری طرف آزاد ہندوستان ...ں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کی قیادت میں مسلم لیگ کوشاں ...تھی۔ کانگریس میں چونکہ مہا سبھائی ذہن کے حامل ہندو لیڈروں کا تسلط تھا اور وہ اس بات کو ...بھی طرح جانتے تھے کہ انگریزی سامراج کے ہاتھوں عالم اسلام کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کے ...باعث ہندوستان کے صفِ اول کے علماء کرام کے دل و دماغ پر انگریز دشمنی اس طرح مسلط ہے ...کہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی جنگ لڑنے کے بجائے اس برِ عظیم سے

حکومت برطانیہ کا جنازہ جلد از جلد اور ہر قیمت پر نکالنے کو ترجیح دیتے ہیں، اس لئے کانگریس نے مسلم لیگ کے جائز مطالبوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور ان کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ یہ صورتِ حال تھی جس کی وجہ سے مسلم لیگ کو عامۃ المسلمین میں مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی۔ چونکہ ان کو زندگی کے ہر میدان میں ہندو قوم کی تنگ نظری سے روزانہ واسطہ پڑتا تھا۔ جس سے ہمارے علماء کرام قریباً ناواقف تھے۔ کانگریس کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے قائداعظم مرحوم نے علامہ اقبال مرحوم ومغفور کے پیش کردہ مسلمانوں کے ایک جداگانہ ریاست کے تصوّر سے استفادہ کرتے ہوئے مسلم اکثریت کے صوبوں کے لئے آزاد وخودمختار مملکت کا مطالبہ پیش کر دیا جس کے لیے چودھری رحمت علی مرحوم کے تجویز کردہ نام "پاکستان" کو اختیار کر لیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس مطالبہ نے جنگل کی آگ کی صورت اختیار کر لی اور "مسلم قوم پرستی" نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اسلام کے آفاقی پیغام کو پسِ پشت ڈال دیا گیا اور "مسلم قوم پرستی" نے یہ خطرناک صورتِ حال اختیار کر لی کہ بمبئی مسلم لیگ کے بعض 'زعماء' کی زبان پہ یہ گلہ بھی آگیا کہ "مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ مسلمان طوائفوں کو چھوڑ کر غیر مسلم طوائفوں کی سرپرستی کرتے ہیں جب کہ مسلمان طوائفیں زیادہ حقدار ہیں"۔ یہ روایت بالمعنی ہے۔ صحیح الفاظ دیکھنے ہوں تو سیّد مودودی مرحوم کی "سیاسی کشمکش" حصہ سوم مطبوعہ غیر منقسم ہندوستان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ دریں حالات مولانا مودودی مرحوم نے اس مسلم قوم پرستی کے خلاف ترجمان القرآن میں نہایت مدلّل مضامین تحریر فرمائے اور اس کو بھی اسلام کے حق میں اتنا ہی مہلک وخطرناک قرار دیا جتنا متحدہ قومیت کو دیا تھا اور خالص مسلم قوم پرستی کی خطرناکی کو کتاب وسنّت کی روشنی میں نہایت مضبوط دلائل سے ثابت کیا۔ مزید برآں ایک خالص دینی اصولی، صالح جماعت کے قیام پہ ضرورت پر اظہارِ خیال کیا اور اپنے ہم خیال حضرات کو اس جماعت کی تشکیل کی پرزور دعوت بھی دی۔ (یہ تمام مضامین 'سیاسی کشمکش' حصہ سوم میں شامل ہیں) کی مولانا مرحوم کی اس دعوتِ حق نے ملک کے چند علمائے کرام، بہت سے مخلص تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا۔ چنانچہ مولانا مرحوم کی دعوت پر اللہ کے چند مخلص بندوں پر مشتمل ایک اصولی، اسلامی اور انقلابی قافلہ یعنی ۱۹۴۱ء میں جماعتِ اسلامی کی تأسیس ہوئی جس کے امیر مولانا مودودی مرحوم مقرر ہوئے۔ اس جماعت نے جس مؤمنانہ جرأت وعزیمت کے ساتھ اس دور میں راہِ حق کی طرف پیش قدمی شروع کی جب کہ ایک طرف "متحدہ قومیت" کا نہایت شدومد کے ساتھ پرچار تھا۔ جس کی پشت پہ نہ صرف کانگریس کا ہمنوا تمام پریس تھا بلکہ ان علمائے کرام

یا اکثریت کی تائید بھی حاصل تھی جن کو پورے برعظیم میں نہایت احترام اور قدر و منزلت حاصل تھی اور دوسری طرف مسلم لیگ اور قائداعظم مرحوم کی قیادت میں راس کماری سے درۂ خیبر تک نعرہ گونج رہا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ دریں حالات جماعت اسلامی تمام وقتی و ہنگامی قومی سیاسی کشمکش سے اپنا دامن بچا کر اور ہر نوع کے استہزاء و تمسخر کو انگیز کرتے ہوئے اپنی اصولی اسلامی انقلابی دعوت پر مستقیم رہی اور اس نے اصول و حق پسندی کی درخشاں نظائر قائم کیں جس پر جماعت اسلامی کو خراجِ تحسین ادا نہ کرنا بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔

ملک تقسیم ہوا تو جماعت اسلامی بھی لامحالہ دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ جماعت اسلامی کا مرکز چونکہ پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور مشرقی پنجاب میں واقع تھا اور یہ ضلع ہندوستان کو مل گیا تھا لہٰذا جماعت کا اصل مرکز اور مولانا مودودی مرحوم مرکز کے اپنے رفقاء کے ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں مولانا مرحوم نے نہایت مدلل طور پر اس حقیقت کا تجزیہ فرمایا تھا۔
—— اگرچہ اس میں بڑی شدت اور تلخی تھی مگر تجزیہ صدفی صد صحیح تھا کہ جن 'نسلی مسلمانوں' پر مشتمل (یہ اصطلاح مولانا ہی کی اختیار کردہ ہے) اور جن غیر عملی مسلم لیگی زعماء کی قیادت میں 'پاکستان' وجود میں آ بھی گیا تو ایک مسلم ریاست میں تو اضافہ ہو جائے گا لیکن اسلامی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونا امرِ محال ہے۔ نیم کے درخت کے بیج سے جو لوگ آم کے درخت کی توقع کرتے ہیں وہ جنت الحمقاء میں رہتے ہیں۔ مولانا مرحوم کی یہ بات کتنی سچی تھی وہ بیالیس سالہ پاکستان کی تاریخ سے ثابت ہو چکی ہے۔ اس ملک میں جس کا نام 'اسلامی جمہوریہ پاکستان' ہے، آپ کو اسلامی نظام تو درکنار وہ روایتی دینداری بھی ڈھونڈے سے ملے گی جو غیر منقسم ہندوستان میں نظر آتی تھی اور جو اب بھی بھارت میں نظر آتی ہے لیکن کتنی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہی 'نسلی مسلمان' بحیثیت قوم 'حقیقی مسلمان' بن گئے اور پاکستان کے قیام کے قریب چھ ماہ بعد ہی جماعت اسلامی کی طرف سے 'دستورِ اسلامی' کا مطالبہ شروع ہو گیا اور توقع ہے کہ لوگوں کے حافظے میں ت ہوئی ہوگی کہ اس کا آغاز قریباً ان الفاظ سے ہوتا تھا کہ "چونکہ ہم مسلمانوں نے اسلام کے لئے پاکستان بنایا ہے۔ لہٰذا ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ......" یہاں لفظ "ہم" قابلِ غور ہے چونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی مطالبہ پاکستان سے بالکل بے تعلق رہی تھی۔ 'بے تعلق' کا لفظ بطور احتیاط استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے تحریک پاکستان کی تائید و حمایت کبھی نہیں ہوئی۔ بہرکیف یہ اتنی خفی تبدیلی تھی کہ کسی نے اس کو محسوس تک نہیں کیا۔

دستورِ اسلامی تو نہ بن سکا البتہ یہ ضرور ہوا کہ باہر سے جماعتِ اسلامی کے زبردست دباؤ اور اسمبلی میں مسلم لیگ کے ان عناصر کی کوششوں سے جو پاکستان میں واقعی اسلامی دستور کی منظوری کے دل سے خواہاں تھے، جن کی قیادت حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو حاصل تھی قریباً دو سال کی جدوجہد کے بعد "قراردادِ مقاصد" منظور ہوئی اور طے پایا کہ پاکستان کے دستور میں اسی کو رہنما اصول کا مقام حاصل ہوگا۔ گویا اس طرح ریاست کی سطح پر کلمۂ شہادت ادا کر لیا گیا۔

ایک طرف اس کامیابی نے جو قراردادِ مقاصد کی منظوری کی شکل میں حاصل ہوئی تھی، دوسری طرف جس طرح نعروں کی بنیاد پر قیامِ پاکستان میں جذبات کا کافی دخیل ہونے کا تجربہ ہو چکا تھا ان دونوں نے مل کر جماعتِ اسلامی کو اس مغالطے میں مبتلا کر دیا کہ وہ انتخابات کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کر سکتی ہے اور ریاست کے وسائل و ذرائع سے پاکستان میں اسلامی نظام قائم کر سکتی ہے۔ گویا وہ عوام میں تھوڑا سا تعارف اور کچھ مقبولیت حاصل کرنے کے باعث ان غلط فہمیوں میں مبتلا ہو گئی کہ تطہیرِ افکار اور تعمیرِ کردار کا کام مناسب حد تک ہو چکا ہے چنانچہ انتخابات کے ذریعہ کامیابی کے امکانات روشن ہیں۔ چنانچہ جماعتِ اسلامی نے تبدیلیٔ قیادت کا نعرہ لگا کر ملکی انتخابات میں عملی حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کے لئے ایک پنچایتی طریقِ کار وضع کیا گیا اور اسے اس دعویٰ کے ساتھ پیش کیا گیا کہ یہ 'طریقِ کتاب و سنّت' سے قریب تر ہے۔ نیز آزاد امیدوار اور پارٹی ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لینے کو قرآن و حدیث سے دلائل اخذ کر کے انہیں ناجائز ہی نہیں حرام کے درجے تک پہنچا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت سیاسی پارٹی ڈیکلیئر کر دی گئی۔ نتیجتاً اس کے ارکان کی بہت بڑی تعداد کو حکومتی محکموں سے مستعفی ہونا پڑا۔ چند نے جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح جماعت کے فکر اور دعوت کے لئے حکومت کے محکمہ جات میں جو وسیع میدان موجود تھا وہ بند ہو گیا۔ جماعت کے اکابر اور اس کے فعال ارکان میں سے کسی نے سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ جن اصولوں پر جماعت کا قیام عمل میں آیا تھا، یہ طریقِ کار اس سے انحراف ہے۔ ایک صاحب کی جانب سے اس تبدیلی کی طرف ترجمان القرآن کے ذریعے توجہ دلائی گئی تو جواب دیا گیا کہ ایک شارٹ کٹ نظر آ رہا ہے جس کے ذریعے سے اسلامی نظام کے قیام کی طرف پیش قدمی ہو سکتی ہے اگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو جماعت اس کو چھوڑ کر پھر اپنے اصولی و انقلابی طریق کار کی طرف مراجعت کر لے گی۔ لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی اصولی و انقلابی تحریک اپنے موقف کو ترک کر کے وقت سے پہلے انتخابی سیاست میں کود پڑتی ہے تو وہ اپنے خاص مز

ہی وجہ سے ملکی سیاسیات پر اثر انداز ہونے کے بجائے خود اس کے مزاج میں انفعالی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے باعث وہ نہ انقلابی تحریک رہتی ہے اور نہ اسے بالکلیہ سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ وہ نیمے دروں اور نیمے بروں والی کیفیت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نہایت دکھ کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ اپنے اصولی و انقلابی نہج سے انحراف کی وجہ سے جماعت اسلامی جہاں نہ حقیقی معنی میں اسلامی انقلابی تحریک رہی نہ وہ بالکلیہ سیاسی جماعت کی پوزیشن حاصل کر سکی۔ اور ۱۹۵۸ء کے بعد سے روز بروز ملکی سیاست کی زلف گرہ گیر میں مبتلا ہو کر اپنے تاسیسی اختیار کردہ اصولوں کی قربانی دیتی اور سیاست کے صحرا تہیہ میں گم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ جناب جنرل ضیاء الحق صاحب کے مارشل لاء کے دور میں ان کے ساتھ اشتراک کیا کہ یہاں تک اشتراک کیا کہ جماعت نے باقاعدہ اپنے نمائندوں کو وزراء کی حیثیت سے مارشل لاء حکومت میں شامل کرا دیا جب کہ مارشل لاء حکومت کے متعلق جماعت کا مضبوط موقف یہ رہا تھا کہ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی دربان مالکِ مکان کو بے دخل کر کے مکان پر قابض ہو جائے۔ کسی دوسری سیاست جماعت نے اس غلطی کا ارتکاب نہیں کیا بلکہ ان کے وابستگان میں سے جس کسی نے جنرل صاحب کی حکومت میں شمولیت اختیار کی تو اسے اپنی جماعت کی رکنیت سے علاحدہ کر دیا۔

الغرض جماعت اسلامی کی قیادت نے جس راستے کو شارٹ کٹ اور محض وقتی تجربہ کے طور پر اختیار کیا تھا اسے مستقل طور پر اس طور پر اختیار کر لیا کہ اس سے رجوع کرنے کے بجائے اس کی قیادت نے ۱۹۵۸ء میں اپنے صفِ اوّل کے اکابر کو انتخابی سیاست کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا۔ اس طرح جماعت اسلامی کے انتقال و انحراف موقف کے باعث پاکستان میں خالص اسلامی انقلابی نہج پر کام کرنے والی کوئی تحریک موجود نہیں رہی۔ علماءِ کرام کا بڑا طبقہ دار العلوموں میں درس و تدریس میں مشغول رہا۔ اور ایک طبقہ ملک کی انتخابی سیاست میں معروفِ عمل رہا۔

فروری ۱۹۵۷ء میں جب جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع ماچھی گوٹھ نے جماعت کی انقلابی طریق کو چھوڑ کر انتخابی پالیسی اختیار کرنے پر صاد کیا تو اس کے بعد پالیسی کے اس اختلاف سے بددل ہو کر جو اکابر و اصاغر جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے ان میں سے اکثر نے اپنے طور پر اسلامی انقلابی تحریک کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی کوشش کی لیکن

ایک تو کوئی اصولی و انقلابی تحریک برپا کرنے اور اصولی دینی جماعت قائم کرنا آسان کام نہیں ہے
دوسری اصل بات یہ تھی کہ ابھی ایسی جماعت کا قیام اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی میں طے نہیں تھا لہٰذا ہر
کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ البتہ تقریباً ساڑھے دس سال بعد اس کے آثار پیدا ہوئے اور
محترم جناب سردار اجمل خاں صاحب لغاری، محترم جناب شیخ حکیم سلطان احمد صاحب اور محترم ڈاکٹر
اسرار احمد صاحب کی باہمی مشاورت اور مساعی کی بدولت اوائل ستمبر ۱۹۶۷ء میں رحیم آباد خاں میں
قریباً چالیس افراد پر مشتمل ایک اجتماع مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع
میں اکثر و بیشتر وہ حضرات شریک ہوئے تھے جو ۱۹۵۷ء ماچھی گوٹھ کے سالانہ اجتماع کے بعد
جماعت اسلامی سے اس کی انتخابی سیاسی پالیسی سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہوئے تھے۔ اس
اجتماع کے لئے ایک قرار دادِ تاسیس اور اس کی توضیحات ڈاکٹر صاحب نے مرتب کی تھیں جو
کچھ حک و اضافہ کے ساتھ اس اجتماع میں منظور کرلیا گیا تھا تاکہ مجوزہ ہیئت اجتماعیہ کے اصول
مبادی واضح ہوجائیں اور بعد میں تعبیر میں اختلاف کا زیادہ امکان نہ رہے۔ "تنظیم اسلامی" کے
نام سے ایک دینی جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ اس مجوزہ تنظیم کا ایک تفصیلی ڈھانچہ
کا دستور، اس کے قواعد و ضوابط اور شرائطِ شمولیت کی ترتیب کے لیے سات حضرات پر مشتمل ا
سب کمیٹی بھی تشکیل دے دی گئی تھی جو جماعتِ اسلامی سے مستعفی ہونے والے چھ اکابر اور ڈاکٹر
صاحب پر مشتمل تھی۔

لیکن بظاہر بعض دنیوی اسباب کی بنا پر مگر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کے مطابق
وقت اس دینی تنظیم کے عملاً اور بالفعل قیام کا مرحلہ مقدر نہیں تھا لہٰذا دستور ساز سب کمیٹی کے
اجلاس تک کی نوبت نہیں آئی اور یہ معاملہ تعویق ہی میں نہیں پڑا بلکہ ختم ہوگیا۔

(راقم نے یہ سطور ختم ہی کی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب مدظلہ خاکسار کے کمرے میں اس اطلاع کے
تشریف لائے کہ ابھی فون پر کراچی سے اطلاع ملی ہے کہ سردار اجمل خاں لغاری کا انتقال ہوگیا
اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ اور اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ)

لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے عاجز بندے ڈاکٹر اسرار احمد کو یہ سعادت عطا فرمائی
(یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ O) (آل عمران: ۷۴) کہ ہو
نے اپنی بے بضاعتی کے شعور و ادراک کے باوصف خالصتہً اللہ کی نصرت و تائید کے بھر
پر اور اپنے دینی فرض کے احساس کے پیشِ نظر ۱۹۶۸ء کے اوائل سے لاہور میں چند حلقہ ہا

العہ قرآن قائم کئے اور ایک منتخب قرآنی نصاب کے ذریعہ سے جس کی بنیاد سورۃ العصر ہے ،
رت رجوع الی القرآن شروع کی تاکہ اقامت دین کی جدوجہد کے لئے ایک ہیئت اجتماعیہ
تشکیل کی راہ ہموار ہو سکے ۔ یہ دعوت قریباً ساڑھے چار سال بعد ۱۹۷۲ء میں انفرادی سعی و
ششں کے دائرے سے نکل کر پہلے مرحلہ کے طور پر ایک اجتماعی ادارے " مرکزی انجمن
ام القرآن لاہور" کے تحت منظم ہوئی ۔ انجمن کی قرار دادِ تاسیس کی توضیحات میں ڈاکٹر صاحب
موف نے اپنے حقیقی مؤقف کو بایں الفاظ بیان کیا :

> " اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی کا خواب امّتِ مسلمہ میں 'تجدیدِ ایمان' کی عمومی تحریک کے بغیر شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا اور اس کے لئے لازم ہے کہ اوّلاً منبع ایمان و یقین یعنی قرآنِ حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کی جائے ۔"

گویا مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تشکیل دراصل سمع و طاعت کے ٹھیٹھ اسلامی اصول
مبنی ایک اسلامی جماعت کے قیام و تشکیل کی تمہید تھی ۔ ہر کام کے لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے
ب خاص وقت مقرر ہوتا ہے چنانچہ ستمبر ۷۵ء کے اجتماع رحیم یار خاں میں "تنظیم اسلامی"
کے نام سے جس دینی جماعت کے قیام کے عزم کا بیج زمین میں بویا گیا تھا اس کی کونپل بفضلہٖ
مالیٰ اس طور پر پھوٹی کہ مرکزی انجمن کے زیر اہتمام ایک اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ (منعقدہ
ام جولائی تا ۲۱ جولائی ۱۹۷۲ء جس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس وقت تک کے مرتب کردہ
مطالعۂ قرآنِ حکیم کے منتخب نصاب' کا درس دیا تھا) کے اختتامی اجلاس میں "تنظیم اسلامی"
کے قیام کے عزم کا بایں الفاظ اعلان فرمایا :

> " اب بہت غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد محض اللہ کی تائید و توفیق پر توکل اور بھروسہ پر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ میری زندگی میں یہ کام صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان شاء اللہ العزیز احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق ہی عملاً میری زندگی کا اصل مقصود ہوں گے اور میری بہتر اور بیشتر مساعی بالفعل دعوتِ دین اور خلقِ خدا پر دینِ حق کی جانب سے اتمامِ حجت میں صرف ہوں گے ۔ گویا " اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " ۔
> اور اس کی دعوت میں اپنے تمام عزیزوں ، دوستوں اور تمام جاننے والوں حتیٰ

کہ بزرگوں تک کو دوں گا اور پھر جو لوگ اس راستے پر ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں، انہیں ایک نظم میں منسلک کر کے ایک ہیئت اجتماعیہ تشکیل دوں گا جو ان مقاصدِ عالیہ کے لئے منظم جدّوجہد کر سکے ۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ "۔

اس عزمِ تنظیم کے اعلان کے بعد قریباً آٹھ ماہ کا وقت لاہور، کراچی، سکھر اور چند دوسرے مقامات کے دوروں اور حضرات سے تبادلۂ خیال اور مشوروں میں گزرے جو دعوت رجوع الی القرآن سے متاثر ہو کر قریب تر آ ئے تھے ۔ اسی عرصہ کے دوران ڈاکٹر صاحب موصوف حج بیت اللہ اور زیارتِ حرم نبوی علیٰ صاحب الصلوٰۃ والسلام سے بھی شاد کام ہوئے ۔ بعد ازاں ۲۷، ۲۸، مارچ ۱۹۷۵ء کو لاہور میں منعقدہ اجتماع میں "تنظیم اسلامی" کے نام سے دعوتِ عبادتِ رب اور شہادت علی الناس اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ کے لئے ایک نئی اسلامی جماعت کے قیام کا فیصلہ ہو گیا ۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اور مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

تنظیم اسلامی کے اس تاسیسی اجتماع منعقدہ ۲۷، ۲۸، مارچ ۱۹۷۵ء میں طے کیا گیا تھا کہ تنظیم اعتبار سے پہلے تین سال عبوری دور شمار ہوں گے ۔ اس دوران مقدور بھر سعی کی جائے گی کہ تنظیم کی دعوت ــــ دعوت تجدیدِ ایمان ــــ توبہ اور تجدیدِ عہد ــــ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دی جا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں شامل ہو سکیں ۔ اس عرصہ کی تکمیل پر ایسے تمام لوگوں کا ایک عا اجتماع طلب کیا جائے گا جو "تنظیم اسلامی" کے لئے مستقل دستور طے کرے گا ۔

تین سال کے عبوری دور کے لئے تاسیسی اجتماع میں ایک عارضی دستور، شرائطِ شمولیت و عہدنامۂ رفاقت بھی منظور کر لیا گیا تھا نیز طے کیا گیا تھا کہ چونکہ جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ اس کے اصل داعی ہیں لہٰذا تنظیم اسلامی کے مستقل دستور کی تدوین و تصویب تک موصوف ہی کو تنظیم اسلامی کے 'داعی عمومی' کی حیثیت حاصل ہو گی اور موصوف اس عبوری دور کی حد تک بغیر کسی متعین ضابطہ مجلسِ شوریٰ (یا مشاورت) یا مجلسِ منتظمہ کے " اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " کے وسیع تر اصول کے تحت تنظیم کے معاملات کو بھی چلائیں گے اور اس کی دعوت کو بھی زیادہ سے زیادہ وسیع تر حلقوں تک پہنچانے کی کوشش کریں گے ۔

قافلۂ تنظیم منزل بمنزل خالص توفیق، تائید و نصرتِ الٰہی سے تیرہ سالہ زندگی کا سفر کرتا ہوا
[چو]دھویں سال میں داخل ہو رہا ہے — راقم کی موجودگی میں تنظیم اسلامی کے قیام کے فیصلے کی اطلاع
[جنا]ب محترم مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کو ڈاکٹر صاحب نے پہنچائی تو مولانا نے فرمایا کہ "عزیزم تم
[ن]ے ایک بہت بڑی ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے جس کی میں خود اپنے اندر خواہش و
[ار]ادہ کے باوجود ہمت نہ کر پایا۔ میں صمیم قلب سے تمہاری کامیابی کے لئے دعاگو ہوں۔ میرے نزدیک
[اس] زمانہ ایک اصولی دینی تحریک برپا کرنا "میںڈکیوں کی پسیری" تولنے کے مترادف ہے۔ اللہ تمہارا
[حام]ی و ناصر ہو۔ میں یہی دعا کر سکتا ہوں۔ میرے کسی مشورے کی ضرورت ہو تو تمہارے لئے میرے
[گھ]ر کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا" (روایت بالمعنی) — راقم کو ۱۹۷۱ء کی آخری سہ ماہی سے ڈاکٹر
[صا]حب کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ اس سولہ سالہ زندگی کے تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ایک اصولی
[انق]لابی جماعت کی تاسیس اور اس کو چلانے کے لئے صبر ایوبی کے ساتھ ساتھ چیتے کے جگر اور
[شا]ہین کے تجسس، کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نصرت بھی تب ہی حاصل ہوتی ہے جب
[کو]ئی شخص اللہ تعالیٰ پر کامل توکل کے ساتھ اس راہ میں قدم رکھے۔ بحمد اللہ ڈاکٹر صاحب اس
[صع]وبت راہ میں اسی تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے ثابت قدم رہے۔ ۱۹۷۷ء میں تنظیم اسلامی کی
[ہی]ئت اجتماعیہ کے لئے بیعت مسنون طریق یہ جانتے ہوئے اختیار کیا گیا کہ اس کا اس دور میں ہر جہار
[ط]رف سے استہزا و تمسخر ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ جو کام خلوص و اخلاص سے کیا جائے
[و]ہ اس میں برکت عطا فرماتا ہے۔ یہ اسی ربِّ کریم کا فضل ہے کہ ۱۹۷۵ء میں جو قافلہ ۶۲ افراد پر مشتمل
[ت]رتیب پایا تھا جس نے ۱۹۷۷ء میں بیعت کا نظام اختیار کیا تھا آج بفضلہٖ ایک ہزار سے بھی
[مت]جاوز افراد پر مشتمل ہے اور یہ کارواں قدم بقدم رواں دواں ہے۔ بیعت کرنے والے رفقاء
[میں] متوسط درجے کے افراد کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی بھی قابلِ ذکر تعداد شامل ہے

وما النصر الا من عند اللہ

اس اشاعتِ خاص کا عاجز مرتب ۲۴ نومبر ۸۷ء کو لاہور سے چند دنوں کے لئے کراچی کے لئے
[روا]نہ ہوا تھا۔ دورانِ سفر ہی میں محسوس ہوا کہ انجائنا کی پرانی تکلیف عود کر رہی ہے۔ کراچی پہنچ کر
[اس] نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ دوسرے ہی دن ہسپتال میں داخل ہونا پڑا اور وہاں سے فارغ

ہو کر قریباً ڈھائی ماہ معالجین کی ہدایت پر بغرض آرام بہت سے مشاغل کو ترک کر کے کراچی ہی میں مقیم رہنا پڑا۔ قریباً سوا تین ماہ کی لاہور سے غیر حاضری کے بعد یکم مارچ ۸۸ء کو اصلاً تنظیم اسلامی کی مجلسِ مشاورت میں شرکت کے لئے اور ثانیاً اپریل کے "میثاق" کے رمضان نمبر کی تیاری کے لئے لاہور حاضر ہوا۔ اس اشاعتِ خاص کے لئے امیرِ محترم کے کراچی کے دورۂ ترجمۂ قرآن (رمضان المبارک ۸۶ء) کے دوران افتتاحی تقریر اور خطباتِ جمعہ کی منتقلی کا کچھ کام کراچی ہی میں کر لیا گیا تھا۔ ارادہ تھا کہ مارچ کے مہینہ میں بقیہ کام کی تکمیل لاہور میں ہو جائے گی اور اللہ کو منظور ہوا تو یہ اشاعتِ خاص یکم اپریل تک شائع ہو جائے گی۔ لیکن ۵ مارچ کو امیرِ محترم نے ارشاد فرمایا کہ "تنظیم کے تیرھویں سالانہ اجتماع کے موقع پر تنظیم سے متعلق ایک اشاعتِ خاص یکم اپریل تک اور رمضان نمبر وسط اپریل تک شائع کرنے کی کوشش کرو"۔ چنانچہ امیرِ محترم کی اس خواہش کے احترام کے پیشِ نظر اس عاجز نے دونوں کی تیاری کے لئے کام شروع کر دیا۔ جس کا ایک نتیجہ موجودہ نمبر کی صورت میں پیشِ خدمت ہے۔ اس عاجز کو اعتراف ہے کہ اس نمبر کے لئے جو نقشہ امیرِ محترم نے بیان فرمایا تھا جس کے خطوط ذہن میں تیار بھی ہو گئے تھے۔ اس عاجز کی پورے طور پر طبیعت حاضر نہ ہونے کے باعث اس نقشہ اور ان خطوط پر یہ نمبر تیار نہ ہو سکا۔ تاہم راقم کو توقع ہے کہ اس غیر معیاری شمارے کے مطالعہ سے بھی ان شاء اللہ قارئین کے سامنے تنظیم اسلامی کے اصول و مبادی، خصائص اور اس کا طریقۂ کار کچھ نہ کچھ واضح طور پر سامنے آجائے گا۔ نیز اس کی منزل بمنزل پیش رفت کا بھی تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا۔

اس نمبر کی تیاری میں اس عاجز کے ساتھ ادارۂ میثاق کے معاون جناب مولانا شیخ رحیم الدین صاحب (رفیقِ تنظیم) نے جو تعاون کیا ہے اس کے لئے خاکسار ان کا ممنون بھی ہے اور ان کے لئے اجر و ثواب کا دعا گو بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی بھرپور اعانت حاصل نہ ہوتی تو یہ ضخیم نمبر وقت پر تیار ہونا انتہائی مشکل تھا۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

احقر

جمیل الرحمٰن عفی عنہ

۲۸/۳/۸۸

قال علیہ الصلوٰۃ والسلام
كَلِمَتَانِ حَبِيبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ
خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ
ثَقِيلَتَانِ فِى الْمِيزَانِ
سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ
سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ
حضور علیہ السلام نے فرمایا:
دو بول ایسے ہیں جو اللہ تعالے کو بہت پسند ہیں جو زبان پر بہت آسان،
لیکن میزانِ عمل میں بہت بھاری ہونگے ——— (وردہ یہ ہیں)
۱: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ
۲: سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ

مولانا سیّد حامد میاںؒ

جذبۂ جہاد سے سرشار ایک عظیم دینی رہنما

محمد سعید الرحمٰن علوی

۲ر مارچ کو دوپہر سے قبل مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ تعالیٰ زندگی میں پہلی بار دل کے شدید حملہ کا شکار ہو کر دوپہر کے لگ بھگ میو ہسپتال پہنچائے گئے یہ حادثہ احقر کے علم میں نہ تھا کیوں کہ عوامی رابطہ اور اخبارات کا دیکھنا واجبی سا ہے' بہر طور ۳ر مارچ کو عصر کے بعد مکرم قاری محمد عبدالقیوم صاحب تشریف لائے تاکہ ہسپتال جا کر مولانا کی بیمار پرسی ہو سکے' جب کہ وہ تھوڑی دیر قبل جوار رحمت میں پہنچ چکے تھے اور قاری صاحب کو ابھی علم نہ تھا ابھی ہم کھڑے ہی تھے کہ ایک دوست نے آ کر اس عظیم حادثہ کی اطلاع دی جس کے سننے کے لئے ہم ذہنی طور پر تیار نہ تھے لیکن ظاہر ہے کہ مشیتِ الٰہی کے سامنے دم مارنے کی بھی گنجائش نہ تھی' زبانوں پر بے اختیار "کلمۂ ترجیع" جاری ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ان کی شخصیت' سراپا' خوبیاں اور کمالات آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور ہم لوگ مغرب کی نماز پڑھتے ہی جامعہ مدنیہ پہنچ گئے۔ مولانا کا قائم کردہ یہ مدرسہ' اس کے درودیوار' اس کے اساتذہ و طلبہ سبھی سوگوار تھے۔ غم و اندوہ میں ڈوبے ہوئے' مولانا کے معتقدین' متعلقین اور احباب بھی ٹکڑیوں میں کھڑے پریشانی کا شکار تھے .... جمعیت علماء اسلام جس کے ایک دھڑے کے مولانا امیر تھے۔ اس کے دوسرے دھڑے کی اگلی صبح مینار پاکستان پر کانفرنس تھی' اس لئے اس کے صوبائی اور مرکزی قائدین لاہور میں تھے' بلکہ اجلاس ہو رہا تھا جب یہ حادثہ ان حضرات کے علم میں آیا' وہ سبھی لوگ اجلاس ملتوی کر کے جامعہ مدنیہ پہنچے' تعزیت کی' غم کو ذاتی غم سمجھ کر پریشان حال واپس لوٹے ... اگلی صبح (۴ر مارچ جمعہ کا مبارک دن) یونیورسٹی گراؤنڈ میں مولانا کا جنازہ ہوا۔ اس گراؤنڈ نے بڑے جنازے دیکھے ہیں..... ہم نے اس میں پہلا جنازہ حضرت مولانا احمد علی کا دیکھا۔ وہ مرد درویش جو تن تنہا لاہور آیا تھا... اس کا جنازہ نہیں تھا' پورا لاہور سوگوار تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ لاہور کی بالغ آبادی کا ہر دوسرا فرد گھر سے نکل آیا ہے' زندگی میں ان سے اختلاف رکھنے والے

بھی اشکبار تھے' پھر اس گراؤنڈ میں خاندان غزنویہ کے گل سر سبد ابو بکر غزنوی کا جنازہ مولانا عبید اللہ انور کی معیت میں پڑھا..... پھر خود مولانا کا جنازہ پڑھا اور آج سید صاحب کا جنازہ تھا..... آہ ثم آہ..... اہلِ علم' اہلِ دل اور اہلِ صلاح دنیا سے جا رہے ہیں..... اب اس دھرتی کی پیٹھ پر اکثریت ان کی ہے جو بقول کسے "مکھی چوس" ہیں۔ ؎

"ڈاتا داتا مر گئے' پیچھے رہ گئے مکھی چوس" (پنجابی) اہل علم کا اٹھنا تو بڑا ہی صدمہ ہے اللہ تعالیٰ کے آخری نبی علیہ الصّلوٰۃ و التسلیم نے اہلِ علم کے اٹھ جانے کو زوالِ علم سے تعبیر فرمایا' جس کے بعد جہلاء کا دور ہو گا جو بن جانے بوجھے فتوے دے کر اپنے ساتھ دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے..... سید صاحب لاہور کی بزم علم کے ایک دمکتے موتی اور گوہر شب چراغ تھے۔ دیوبند..... وہی دیوبند جس کی خاک پاک سے گزرتے ہوئے حضرت مجدد الف ثانی اور امیر سید احمد شہید رحمہما اللہ تعالیٰ کو علم کی خوشبو آئی تھی..... وہی دیوبند جو شریف خانوادوں کا گہوارہ ہے..... جس پر ۱۸۵۷ء کے بعد چند نفوسِ قدسیہ نے اعتماد علی اللہ کی دولت سے سرشار' غریب عوام کے تعاون سے ایک مدرسہ علمی کی شکل میں ایک علمی تحریک بپا کی۔ اسی دیوبند کی دھرتی پر سید صاحب پیدا ہوئے۔ تقسیم ہند سے لگ بھگ ۲۱ر ۲۰ برس قبل والد گرامی مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ تعالیٰ تھے عالم باعمل' صاحب تقویٰ و صلاح' امام العصر مولانا سید انور شاہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد عزیز' شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا سید سجاد بہاری' مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی' مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا نور الدین بہاری۔ مولانا معین الدین اجمیری' مولانا نثار کان پوری' مولانا عبد الحامد بدایونی' مولانا داؤد غزنوی' اور مولانا حفظ الرحمٰن رحمہم اللہ تعالیٰ کے قافلہ کے فرد مجاہد جماعت' جمعیت علماء ہند کے ناظم اور متعدد علمی اور تاریخی کتابوں کے کامیاب مصنف و مؤلف... انہی مولانا محمد میاں کے گھر سید حامد میاں پیدا ہوئے..... گویا علمی' دینی اور مجاہد گھرانے سے ان کا خمیر اٹھا.... ظاہر ہے کہ ان کے علم کی تکمیل دیوبند میں ہی ہونا تھی..... سو وہی ہوئی۔ مولانا سید حسین احمد ان کے استاذ حدیث تھے' مولانا کے فرزند گرامی مولانا اسعد مدنی' مولانا عبید اللہ انور' مولانا عبید اللہ (جامعہ اشرفیہ) ایسے حضرات ان کے رفیقِ درس و ہم سبق تھے۔ سلوک کی بیعت بھی مولانا مدنی سے تھی اور خوش قسمتی سے سلوک میں ان کے مجاز بھی تھے..... مجاہد علماء کی ایک اور یادگار مولانا عبد الحق مدنی مراد آبادی رحمہ اللہ تعالیٰ سے مولانا کو نسبت فرزندی حاصل تھی کہ آپ کی بڑی اہلیہ محترمہ (آپ کے جانشین برادر عزیز سید رشید میاں سلمہ

تعالیٰ کی والدہ ماجدہ ان کی صاحب زادی ہیں..... ان متعدد نسبتوں نے انہیں عجیب سانچہ
ڈھال دیا تھا..... علم تھا تو پختہ 'تدریس کا ملکہ تھا تو خوب 'گفتگو تھی تو اس میں ٹھہراؤ' دھیما
اور استدلال کی قوت 'وضع داری 'رکھ رکھاؤ۔ اگلے وقتوں کی شرافت 'ان میں خوب خوب
تقسیم ملک کے بعد پاکستان آنے پر جس قسم کی کٹھن 'پُر مشقت اور مشکلات سے بھری
رگی سے ان کو دوچار ہونا پڑا' اس کی وجہ سے عزم 'ہمت 'حوصلہ اور استقامت ان میں خوب
ہو گیا تھا اور اب حال یہ تھا کہ گہرے غور و فکر 'تدبر اور سوچ و بچار کے بعد جو رائے قائم کر
تے اس سے انہیں ہٹانا ممکن نہ تھا۔
لاہور میں آئے تو جامعہ اشرفیہ سے تدریسی رابطہ ہو گیا..... جامعہ کے عظیم بانی مولانا مفتی
حسن رحمہ اللہ تعالیٰ تو ٹیکسلا کے قریب کے ایک قصبہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن مدت سے
تسر میں علم و عرفان کی تقسیم کے بعد مہاجرت کی زندگی اختیار کرنا پڑی 'مسلم لیگی حلقوں سے
رے روابط کے سبب خدمتِ دین کے لئے نیلا گنبد کے معروف علاقہ کی ایک عظیم الشان
مارت متروکہ اوقاف سے میسر آ گئی تو مسندِ علم بچھا کر بیٹھ گئے۔ جلیل القدر اساتذہ کی کھیپ
بسر آئی 'جامعہ ابتدا ہی میں چمکنے لگا' ان اساتذہ میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ
یے محدث و مفسر بھی تھے جو سید حامد میاں صاحب کے استاد بھی تھے۔ سید صاحب نے کچھ
رصہ تدریس کی لیکن بالآخر علیٰحدگی اختیار کرنا پڑی کہ ان کا سیاسی ذوق و مسلک اربابِ جامعہ
سے مختلف تھا' اس اور دوسرے اسباب نے علیٰحدگی پر مجبور کیا۔ پھر مختلف مراحل سے گزرتے
ہوئے مسلم مسجد چوک انار کلی کا دور آیا' اس مسجد پر سید صاحب کے وجود سے بہار رہی۔
تراویح میں وہ قرآن سناتے 'حدیث کا درس ہوتا قرآن و سنت کے طلبہ اور متلاشیانِ حق کھنچے
چلے آتے قرآن پڑھنے میں سوز و گداز تھا' درس میں علم کے چشمے ابلتے' زبان صاف اور
شیریں 'افہام و تفہیم کا ملکہ خداداد' ہر طرف ان کے چرچے ہونے لگے۔ موجودہ نعمت کدہ
ہوٹل کے مالک اور بعض دوسرے حضرات ان کے خاص اہلِ تعلق میں سے تھے پھر جب ان کی
کاوشوں سے اس مسجد میں حکمت قاسمیہ کے وارث مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ کی
تقریریں ہوئیں تو بدعات و رسومات کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس شہر میں ہلچل مچ گئی' مدتوں
سے پھیلائی ہوئی غلط فہمیاں 'علماءِ حق کے خلاف پروپیگنڈا چھٹنے لگا۔ انہی حضرات کی کاوشوں
سے کریم پارک کا وہ قطعۂ زمین فراہم ہوا جس پر اب جامعہ مدنیہ قائم ہے.....
حضرت الامام مولانا محمد عبداللہ درخواستی زید مجدہم نے اس ادارہ کا سنگ بنیاد رکھا' انہیں

مولانا سے بہت تعلق تھا اور مولانا ان کا جی جان سے احترام کرتے...... سبب یہ تھا کہ مولانا درخواستی قافلۂ حریت کے حدی خواں تھے...... قدیم سے علمی، روحانی اور مجاہدانہ روابط تھے...... یہ سلسلۂ تعلقات مدتوں قائم رہا جس کے درمیان "سیاست" نے بالآخر لکیر کھینچ دی...... فیاحسرتا! تاہم حضرت درخواستی مولانا کے جنازہ میں شریک ہوئے اور مولانا کے فرزند عزیزی رشید میاں کے لئے رومال بھیج کر اور دعائیں دے کر اپنی عظمت و بڑائی کا سکہ منوایا...... حضرت مولانا احمد علی جب تک حیات رہے، وہ غایت درجہ مولانا کی سرپرستی فرماتے۔ جامعہ اشرفیہ سے علیحدگی کے بعد مولانا لاہوری کے دست شفقت نے مولانا کو سہارا دیا اور ایک موقع پر لاہور کے ایک دینی لیکن سرمایہ دار خاندان کے شدید حملہ سے آڑے آئے مولانا لاہوری"...... وہ اپنے تینوں فرزندوں کے ساتھ چوتھا فرزند سید صاحب کو شمار کرتے احقر نے مولانا عبید اللہ انور اور سید صاحب کے مابین محبت و تعلق کی کئی یادگار محفلیں دیکھیں افسوس کہ پاکستانی سیاست نے اس رشتۂ محبت و تعلق کو بھی درھم برھم کر دیا کریم پارک میں جامعہ مدنیہ کی بنیاد اس وقت رکھی گئی جب یہ علاقہ گویا جنگل اور دلدل تھا لیکن سید صاحب کے حوصلہ، مولانا درخواستی کی سرپرستی اور مخلص رفقاء کے تعاون نے جنگل میں منگل کی کہاوت سچ کر دکھائی۔ اب جامعہ ایک خوبصورت مدرسہ کی شکل میں موجود ہے وقت کے اکابر نے اس کو اپنے قدومِ میمنت لزوم سے نوازا۔ عظیم اساتذہ نے تدریس کے فرائض انجام دیئے، دے رہے ہیں، لاتعداد طلبہ نے کسب فیض کیا اور خود سید صاحب نے بخاری شریف جیسی کتاب کا بار بار درس دے کر، نہ معلوم کتنی بار اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلوات اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا ہوگا اور کتنی بار انہیں درود شریف پڑھنے کی سعادت میسر آئی ہوگا

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست، تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"۔ مولانا کا خاندانی تعلق جیسا کہ عرض کیا ایسے گھرانے سے تھا جو علم و فضل کا مالک ہونے کے ساتھ مجاہد بھی تھا پھر ایسے اساتذہ سے واسطہ پڑا جو میدانِ جہاد کے سپاہی نہیں قائد و رہنما تھے...... اس لئے جذباتِ حریت اور جذبہ جدوجہد ان میں ظاہر ہے کہ موجود تھا، اسی لئے وہ پاکستان میں اہل حق کے وارثوں (جو افسوس کہ باہمی نزاعات سے اپنی طاقت برابر کمزور کر رہے ہیں) سے متعلق رہے یعنی علمائے اسلام سے ان کی دلچسپی رہی، ایک طویل عرصہ جمعیت کے مرکزی خازن رہے، اہم معاملات میں صائب مشورہ دینا اور حوادث و مصائب میں ڈھارس بندھانا انہی کا کام تھا، وہ حضرت شیخ

د مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرز پر انقلابی عمل کے قدر دان تھے ہی' اسی انداز سے
کرنے کے بھی خواہش مند تھے...... ایک دور میں جب کہ احقران سے اور جمعیت کے
گوں سے بہت قریب تھا' انہوں نے مجھے اس طرف توجہ دلائی کہ میں جمعیت کے بزرگوں کو
رخ سے کام کرنے کی درخواست کروں۔ امارت کے لئے بھاگ دوڑ اور جماعتی سطح پر
ی عدالتوں کا قیام ایسے منصوبے فی الحقیقت اسی جذبہ کی صدائے باز گشت تھی جو افسوس کہ
کے بگڑتے ہوئے حالات' اور روایتی جمہوری جدوجہد کی نذر ہو کر رہ گئے...... ۱۹۷۷ء کے
ابات اور پھر تحریک کے زمانہ میں انہوں نے اپنے مرکز میں قائم رہ کر خاصی خدمات سرانجام
ں' تحریک کا نتیجہ مارشل لاء کی شکل میں سامنے آیا تو قومی اتحاد تتر بتر ہو گیا۔ مولانا نورانی اور
غر خان اپنی جماعتوں سمیت الگ ہو گئے پیر پگاڑا کی مسلم لیگ بن پوچھے حکومت میں شریک ہو
۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے ما بقی اتحاد بھی شامل ہو گیا جس کا مجھ سمیت بعض لوگوں کو
دید صدمہ تھا اور مجھے مسرت ہے کہ حضرت میاں عبدالہادی صاحب دین پوری
مہ اللہ تعالیٰ ہم جیسے کمزور لوگوں کے حمایتی تھے اور اس قدم کو ناپسند فرماتے...... بھٹو
احب کی پھانسی کے بعد ضیاء الحق کو سول وزراء کی غالباً ضرورت نہ رہی اس لئے سول وزراء
لگ ہو گئے یا کر دیئے گئے تو سیاسی قوتوں نے ایک نئے اتحاد کی نیو اٹھانا شروع کی' اسی مرحلہ پر
ولانا مفتی محمود انتقال کر گئے تو جمعیت علماء اسلام اختلاف کا شکار ہو کر رہ گئی' مولانا سید حامد
یاں ان لوگوں کے حامی تھے جو پاکستان پیپلز پارٹی کو ساتھ لے کر چلنے کے خواہش مند
تھے جیسے تیسے پی۔ پی کو ساتھ لے لیا گیا لیکن جمعیت دو حصوں میں بٹ گئی سید صاحب
الے حصے کے امیر مولانا سراج احمد دین پوری قرار پائے اور پھر سید صاحب اس منصب پر فائز
ہوئے اور وفات تک اس منصب پر فائز تھے...... یہ بات تسلیم ہے کہ اس دوران انہوں نے
خاصی ہمت کا مظاہرہ کیا۔ ایم۔ آر۔ ڈی اور اہل سیاست کے لئے ان کا مدرسہ ہی سب کچھ
تھا۔ اجتماع' اجلاس جو ہوا یہاں ہوا اور مولانا نے اس سلسلہ میں ہر صعوبت برداشت کی......
عوامی سطح پر مدرسہ کی معاونت کے سلسلہ میں انہیں بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا لیکن
انہوں نے طے شدہ نظم کو اپنایا کچھ عرصہ قبل انہوں نے رائے ونڈ روڈ پر تبلیغی جماعت کے
عالمی اجتماع گاہ کے عین سامنے مین روڈ پر وسیع قطعہ اراضی حاصل کیا۔ جہاں ایک عظیم الشان
ادارہ بنانے کا عزم تھا ابتدائی درجہ کا مکتب شروع بھی ہے وہ تو اب اس دنیا میں نہیں لیکن امید
ہے کہ ان کے ورثا' اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے' اس مرحلہ سے سرخرو نکلیں گے! اس وقت دو

مسائل بڑی اہم نوعیت کے ہیں...... ایک جمعیت میں ان کے جانشین کا مسئلہ' دوسرے مدر
کے معاملات' جمعیت نے عارضی طور پر یہ ذمہ داری مولانا عبدالکریم آف بیرلاڑ کانہ کے پ
کی ہے جو نائب امیر اول تھے' چند ماہ میں دستوری طور پر نیا انتخاب ہو گا...... اللہ تعالیٰ بہتریٰ
سبیل پیدا کر دے جب کہ مدرسہ کے سلسلہ میں جو مولانا کی گویا اصل کمائی تھی.... حضرت موا
خان محمد مجددی نقش بندی کو سرپرست اور عزیزی رشید میاں کو امیر اور سید محمود میاں کو نائ
امیر بنایا گیا ہے۔ ماشاءاللہ دونوں بھائی عالم ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں جملہ بہن بھائیوں سمیہ
محبتِ باہمی کی دولت سرمدی سے نوازے' ہمت و حوصلہ دے تاکہ وہ اپنے جلیل المرتبت باپ
اس محنت کو اس کے شایان شان طریق سے نہ صرف سنبھالے رکھیں بلکہ آگے بڑھائیں مو
کے رفقاء' معاونین اور مخلصین پر اب زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ادارہ کے
ایثار و قربانی کا مظاہرہ کریں محترم ڈاکٹر اسرار ا
صاحب سے مولانا کے تعلق خاطر سے ایک دنیا واقف ہے ایک موقعہ پر لاہور کے بعض علماء
ڈاکٹر صاحب کے خلاف انتہا پسندانہ اقدامات کے لئے بھاگ دوڑ کی تو مولانا نے اپنے تدبر
سلامتی طبع سے اس کو ناکام بنایا جو اہل علم کی شان ہے ...امید ہے کہ یہ تعلق بھی اسی انداز
قائم رہے گا اور مولانا سے وابستگی کے بعض مدعی لاطائل اور بے مقصد مضمون نویسی کے بجا
امت و ملت کی اجتماعی بہتری کے لئے کوشاں ہوں گے رب العزت مولانا کو عظیم درجا
سے نوازے ع

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اِغتَنِمْ خَمسًا قَبلَ خَمسٍ شَبَابَكَ قَبلَ هَرَمِكَ وَ صِحَّتَكَ قَبلَ سَقَمِكَ وَغِنَاكَ قَبلَ فَقرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبلَ شُغلِكَ وَحَيوٰتَكَ قَبلَ مَوتِكَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔ جوانی کو بڑھاپے کے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے۔ اور تونگری کو فقیری سے پہلے۔ فراغ البالی کو مشغولیت سے پہلے اور زندگی کو موت سے پہلے۔

اِن شاء اللہ العزیز

ماہنامہ **'میثاق'** کا آئندہ شمارہ

رمضان المبارک کی مناسبت سے

ایک خصوصی نمبر پر مشتمل ہوگا

جس میں علاوہ دیگر مضامین کے

فضیلتِ ماہِ رمضان سے متعلق محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی چار تقاریر شاملِ اشاعت کی جائیں گی

رمضان المبارک
کا
بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر
قرآنِ مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفۃً پیش کیجیے۔

نوٹ

اس کتابچے کا انگریزی، عربی، فارسی اور اب سندھی زبان میں بھی ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ اس کے حقوق اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے۔

فہمِ قرآن
اور
خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں —
ڈاکٹر اسرار احمد
کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف
قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ
(سورہ الفاتحہ تا سورہ الکہف)
ضرور مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ٥ عمدہ کتابت ٥ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۲ روپے

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ـــــ اور
بعثتِ محمدیؐ کی تمامی و تکمیلی شان ـــــ نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ـــــ
ایسے اہم موضوعات پر
ڈاکٹر اسرار احمد
کی
حد درجہ جامع تصنیف
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت
کا مطالعہ کیجیے
اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ طباعت ○ قیمت فی نسخہ
مرکزی انجمن خدام القرآن ○ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

۳۷

۵

مان المبارک ۱۴۰۸ھ

ئی ۱۹۸۸ء

شمارہ ۷/-

انہ زرتعاون ۵۰/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا — ۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ ” ”

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ ” ”

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۲۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن - لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شاہراہ فاطمہ جناح لاہور

اس شمارے کی قیمت ۷/-

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وارداتِ قلب

(شیخ) جمیل الرحمٰن

یکم فروری ۸۸ء کی صبح بعد فجر راقم سطور کے عاجز راقم نے معمول کے مطابق مطالعۂ قرآن کی غرض سے مصحف کھولا تو سورۃ البقرہ کا ۲۳واں رکوع سامنے تھا۔ یہ پورا رکوع حکمت و احکام صیام سے متعلق ہے۔ مطالعے سے فارغ ہو کر راقم دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اسی رات یعنی یکم اور دو فروری کی درمیانی شب خواب میں دیکھا کہ ماہنامہ "میثاق" کا "رمضان نمبر" شائع ہوا ہے اور راقم اس کا مطالعہ کر رہا ہے۔ صبح کو یہ خواب ذہن پر مستولی تھا۔ خیال آیا کہ ابھی رمضان المبارک کی آمد میں قریباً ڈھائی ماہ کی مدت باقی ہے۔ کیلنڈر دیکھا تو ۱۸ اپریل ۸۸ء کو یکم رمضان کی متوقع تاریخ درج تھی۔ ذہن نے اس نمبر کے لئے تانا بانا بننا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی فرمائی اور دل اس بات پر جم گیا کہ دو سال قبل رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ مطابق مئی جون ۱۹۸۶ء میں جب امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے کراچی میں ناظم آباد بلاک نمبر ۵ (پاپوش نگر) کی جامع مسجد میں دورہ ترجمہ قرآن کا جو عظیم الشان اور انتہائی پر مشقت کام اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے انجام دیا تھا، تو اس موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف نے روزہ اور رمضان کی مناسبت سے کئی خطابات ارشاد فرمائے تھے۔ مثلاً ۳۰ شعبان کی شب کو "استقبال رمضان المبارک" کے موضوع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت جامع حدیث کے حوالے سے خطاب ہوا تھا۔ اسی طرح دورۂ ترجمہ قرآن سے قبل سورۃ بقرہ کے ۲۳ ویں رکوع کی چھ آیات کی روشنی میں ایک نہایت مبسوط، جامع اور پر تاثیر خطاب ارشاد فرمایا تھا۔ مزید برآں امیر محترم نے رمضان المبارک کے تین جمعوں میں ناظم آباد کی تین مختلف جامع مسجدوں میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" "حقیقت دعا" اور "اعتکاف و لیلۃ القدر کی مسنون عبادات" کے موضوعات پر

بالترتیب ارشاد فرمائے تھے۔ خیال آیا کہ ان سب کو ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر کے ان خطابات کے مجموعے اور رمضان المبارک سے متعلق چند دوسری اہم چیزوں پر مشتمل اپریل ۸۸ء کے "میثاق" کے شمارے کو اشاعت خاص "رمضان نمبر" کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت یہ تجویز امیر محترم' بھائی اقتدار صاحب اور عزیزم حافظ عاکف سعید سلمہ کو بذریعہ خطوط بھیج دی۔ کیسٹوں کے اپنے اسٹاک کا جائزہ لیا تو بحمد اللہ امیر محترم کے افتتاحی خطاب اور پہلے جمعہ کے خطاب کے کیسٹس موجود تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے اور اس کی نصرت و تائید کے بھروسے پر اسی دن سے افتتاحی خطاب کی منتقلی کا کام شروع کر دیا۔ بعد دوسرے اور تیسرے جمعوں کے خطابات کے کیسٹس بھائی عبدالواحد عاصم سے منگا لئے گئے۔ لاہور نے اثبات میں جواب آنے میں کچھ دیر ہوئی لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جواب آنے تک راقم افتتاحی خطاب کی منتقلی کا کام ختم کر کے پہلے جمعہ کے خطاب کی منتقلی کے کام کا آغاز کر چکا تھا۔ حالانکہ طبیعت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی اور معالج صاحب نے ہر نوع کے جسمانی و ذہنی کام کرنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دی تھی لیکن یہ اسی رب کریم کا خاص فضل ہے کہ ۲۸ر فروری تک دونوں خطابات کی منتقلی اور ان پر نظر ثانی کا کام مکمل ہو چکا تھا اور طبیعت میں کوئی غیر معمولی خرابی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یکم مارچ کی صبح کو بھائی واحد علی رضوی کے ساتھ شالیمار سے روانہ ہو کر اسی رات کو لاہور پہنچا۔ ۲ر اور ۳ر مارچ کو مجلس مشاورت میں شرکت رہی۔ ۴ر مارچ کو جمعہ تھا۔ ۵ر مارچ کو امیر محترم نے میثاق کے تنظیم نو کے سلسلے میں جس خواہش کا اظہار فرمایا تھا' اس کا ذکر "میثاق" کے گذشتہ شمارے میں کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ امیر محترم کی خواہش کے احترام میں اسی روز سے دونوں شماروں کیلئے کام شروع کر دیا' اور ۲۰ر مارچ تک بحمد اللہ رمضان نمبر سے متعلق بقیہ دو خطابات بھی ٹیپ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر لئے گئے۔ ساتھ ہی تنظیم اسلامی سے متعلق خصوصی اشاعت کا کام بھی جاری رہا۔ اس میں شامل اپنے مضمون کا آخری حصہ ۲۸ر مارچ کو رقم ہوا اور "رمضان نمبر' کے لئے یہ سطور آج ۳۰ر مارچ کو قلم بند کی جا رہی ہیں۔ اس مجوزہ نمبر کا مکمل خاکہ بھی آج مرتب کر کے عزیزم میاں عاکف سعید سلمہ کو دے دیا ہے۔ فللہ الحمد و المنۃ توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق و نصرت سے عزیزم میاں عاکف سلمہ اس اشاعت خاص کو تیاری کے جملہ مراحل سے گزار کر ۱۷یا۱۸ر اپریل تک پریس بھجوا دیں گے اور ۲۲ر اپریل یعنی چوتھے پانچویں روزے کے آس پاس یہ اشاعت قارئین کرام کے ہاتھ

میں ہوگی۔ انشاء اللہ العزیز۔

راقم محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ امیر تنظیم اسلامی کے جو دروس قرآن حکیم اور خطابات ٹیپ سے منتقل کیا کرتا رہا ہے ان پر نظر ثانی اور لفظی اصلاح نیز نوک پلک کی درستگی کا کام عزیزم میاں عاکف سلمہ انجام دیا کرتے تھے' لیکن وہ فروری سے ادارۂ "ہفت روزہ ندا" کو بھی وقت دینے لگے ہیں۔ ہم قرآن اکیڈیمی کے اعزازی فیلو کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں قرآن کالج اور اکیڈیمی میں شعبہ درس و تدریس کی نگرانی' مزید بر آں شعبہ نشر و اشاعت کی نگرانی اور حکمت قرآن و "میثاق" کی تدوین و ترتیب کی ذمہ داری تاحال انہی کے کاندھوں پر ہے۔ انہوں نے اپنے اوقات کار کو اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ صبح قریباً ساڑھے آٹھ بجے سے ایک بجے تک اپنا وقت اکیڈیمی کے کاموں کو اور بعد از دوپہر ہفت روزہ ندا کو دیتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن بعد نماز مغرب ایک تنظیمی اُسرے میں ان کا ہفتہ وار درس بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا راقم کے اتارے ہوئے امیر محترم کے دروس قرآن اور خطابات پر نظر ثانی' ان کی اصلاح اور ان کی تسوید کے کام کے لئے مناسب وقت دینا ان کے لئے مشکل ہو گیا تھا۔ چنانچہ امیر محترم کی اجازت سے انہوں نے اس کام کا بڑا حصہ قرآن اکیڈیمی کے دوسرے فیلو اور رفیق تنظیم حافظ خالد محمود خضر کے سپرد کر دیا جو اکیڈیمی کی لائبریری کے انچارج ہیں اور ان کے سپرد چند تدریسی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ راقم کو اس تجربہ سے بڑی دلی مسرت حاصل ہوئی کہ جہاں ان میں بحمد اللہ دروس و خطابات ٹیپ سے منتقل کرنے کی صلاحیت موجود ہے' وہاں راقم کے منتقل شدہ دروس و خطابات پر نظر ثانی' اصلاح و تہذیب کی بھی قابل اعتماد اہلیت و استعداد موجود ہے۔ چنانچہ رمضان المبارک کے خصوصی نمبر سے متعلق امیر محترم کے جو خطابات راقم نے ٹیپ سے اتارے تھے' ان پر نظر ثانی کا کام وہ انجام دے رہے ہیں اور اب تک انہوں نے جتنا کام کیا ہے اسے دیکھ کر راقم کو قلبی اطمینان ہوا کہ راقم کی جگہ پر کرنے والے بفضلہ تعالیٰ راقم سے کہیں بہتر با صلاحیت کارکن تنظیم میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں دو باتوں کا ذکر آیا ہے ایک "ہفت روزہ ندا" کا اور دوسرے امیر محترم کے دروس و خطابات پر نظر ثانی کرنے کے کام کا۔ راقم اس معاملہ میں چند ضروری اور اہم باتیں عرض کرنا چاہتا ہے۔ پہلی "ندا" سے متعلق ہے۔ جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ "ندا" کا اجرا مالی منفعت کے لئے عمل میں آیا ہے' وہ شدید غلط فہمی اور مغالطے میں مبتلا ہیں۔ شاید یہ بات تنظیم کے بعض رفقاء کے تحت الشعور میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے "ندا" کے ساتھ

ان کا معاملہ قابل شکایت حد تک بے اعتنائی کا ہے۔ راقم کو اس میدان کا کچھ نہ کچھ تجربہ ہے۔ اس پر فتن دور میں کوئی شخص مالی منفعت کے نقطہ نظر سے کوئی پرچہ وہ بھی ہفت روزہ معیاری پرچہ نکال کر دو ممکنہ طریقوں سے پنپ سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہمارے معاشرے میں بد ذوقی کا جو رجحان جڑیں پکڑا ہوا ہے وہ اسے مزید بگاڑنے کے لئے نیم عریانی ہی نہیں بلکہ خالص عریانی کی تشہیر کا کام کرے اور اس طرح اس بد ذوقی کی مارکیٹ اور میدان میں اپنی جگہ پیدا کر سکے۔ دوسرے یہ کہ وہ حکومت وقت میں سے کسی اعلیٰ مقتدر یا اس کے کسی حواری کا 'IMAGE' قائم کرنے کا کام کرے۔ ان کی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کو اپنا معمول بنالے۔ پھر غور طلب بات یہ ہے کہ بھائی اقتدار کو کون نہیں جانتا کہ وہ بحمد اللہ ایک معقول نفع بخش کاروبار کے مالک ہیں اور مالی حیثیت سے آسودہ حال اور مطمئن ہیں بلکہ ان کی شعوری کوشش ہے کہ وہ اپنے کاروبار سے محض نگرانی کا تعلق رکھیں اور بقیہ وقت اور اپنی توانائیاں تحریک اور دعوت کے لئے وقف کر دیں۔ چنانچہ اس کام کے لئے انہوں نے قلم ہاتھ میں لینے کے کام کو ترجیح دی۔ چونکہ اس کا ان میں ذوق بھی ہے اور ماضی بعید کا کافی عملی تجربہ بھی ہے۔ انہوں نے قریباً تیں پینتیس سال بعد قلم اپنے ہاتھ میں پکڑا ہے۔ "میثاق" میں "عرض احوال" کے زیر عنوان اب تک جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس پر وہ شیر خاں بنی مرحوم جیسے صاحب ذوق سے جو ابوالکلام آزاد مرحوم کی طرزِ نگارش کے عاشق اور مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، مرتضٰی خاں میکش مرحومین اور ان کے ہم عصر اہل قلم اور معیاری صحافیوں کے اسلوب تحریر کے دل دادہ تھے، خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ یہی کیفیت سردار اجمل خاں مرحوم کی تھی جو ۲۸ر مارچ ۸۸ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے ہیں۔ اللھم اغفر لھم وارحمھم وحاسبھم حسابا یسیرا۔ مزید بر آں ان کو اپنے ہم عصر صحافیوں سے بھی داد اور خراج تحسین ملا۔ اقتدر بھائی اپنے تجربے کی بنیاد پر جانتے ہیں کہ کسی تحریک کا فکر محض اس کے اپنے آفشل آرگن کے ذریعہ سے ذہین و فطین افراد بالخصوص ان افراد تک پہنچنا انتہائی مشکل ہے جو کسی نہ کسی جماعت میں منسلک ہونے کے باعث ایک نوع کی جماعتی عصبیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے افراد کے فکر و نظر اور قلب و ذہن پر دستک دینے کے لئے ایسے بے شمار جرائد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس مخصوص اصولی و انقلابی دعوت کے انصار و اعوان تو ہوں لیکن ان کے پرچوں پر اس فکر کی حامل جماعت کا لیبل لگا ہوا نہ ہو تاکہ وہ غیر محسوس طریق پر ملک کے ذہین و فطین اور مخلص لوگوں کے ذہن و قلب میں اس تحریک پر غور و فکر کرنے کے لئے راہ پیدا

کر سیں۔ جب تک "ندا" جیسے متعدد پرچے صحافت کے میدان میں نہیں آئیں گے، تنظیم اسلامی کا فکر اور اس کی دعوت ایک خاص ذہن کے افراد تک محدود رہے گی اور اس میں توسیع کے امکانات کم ہوں گے۔ راقم ذاتی تجربہ کی بناء پر عرض کرتا ہے کہ محض تحریک کے مفاد میں اور اس کو وسیع پیمانے پر غیر محسوس طریق سے پھیلانے کے لئے اقتدار بھائی نے "ندا" کا اجراء کیا ہے۔ اس کام پر وہ جتنی توانائیاں لگا رہے ہیں، جان کھپا رہے ہیں، اپنا پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں وہ قابل رشک ہی نہیں قابل تقلید ہے۔ لہٰذا راقم میثاق کے قارئین بالخصوص تنظیم اسلامی کے رفقاء کی خدمت میں پوری دلسوزی س عرض کرتا ہے کہ وہ "ندا" کے ساتھ سوتیلے پن کے سلوک کے بجائے وہ سلوک کریں جو خاص اپنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ پرچہ پوری طرح اگر اپنے پیروں پر کھڑا نہ بھی ہو سکے۔ تو اس پر پانی کی طرح پیسہ نہ بہے کہ پانی آنے کے سوتے ہی جواب دے جائیں۔ ع

"شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات"

دوسری بات اس شمارے میں شامل خطابات کے متعلق راقم کو یہ عرض کرنی ہے کہ آپ ان خطابات میں مضامین کی بے حد تکرار پائیں گے۔ تکرار کلام کا عیب ہوا کرے لیکن بعض اوقات کسی بات کو قلب وہ ذہن، شعور و ادراک اور فکرو نظر میں جاگزیں (HAMMER) کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہوتی ہے پھر چونکہ یہ علیحدہ علیحدہ خطابات ہیں لہٰذا ان میں تکرار کا ہونا قدرتی عمل ہے لہٰذا قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ اس تکرار کا اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ فرمائیں گے تو اسے بڑی حد تک مفید مطلب پائیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

راقم کو اپنے اس مضمون کا عنوان نہیں سوجھ رہا تھا۔ کبھی ذہن میں گذارش احوال واقعی" آیا کبھی "تعارف مقصد" کبھی کوئی اور لیکن کسی پر دل نہیں ٹھکتا تھا۔ بعض لوگوں کو شاید یہ بات پسند نہ آئے کہ

خاکسار اس مضمون میں دو مرتبہ اپنے خوابوں کا ذکر کر رہا ہے لیکن امر واقعہ کے اظہار میں کیا باک! لہٰذا عرض ہے کہ مندرجہ بالا عنوان کا اشارہ بھی خاکسار کو خواب ہی میں ہوا ہے و ما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

آخر میں راقم کو اپنے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔ میری علالت کا تذکرہ اقتدار بھائی نے فروری کے میثاق کے عرض احوال میں کر دیا تھا۔ اللہ کے فضل و کرم اور مخلصین کی دعاؤں کے طفیل خاکسار کی طبیعت بہتر ہے گو پوری طرح بحال نہیں ہوئی ہے عمر کا بھی تقاضا ہے جو بہترویں (۷۲) سال میں داخل ہو گئی ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ خاکسار کو ذہن میں رکھ کر یہ دعا فرمایا کریں کہ ....

اللھم من احییته منا فاحییه علی الاسلام و من توفیته منا فتوفه علی الایمان۔ آمین یارب العالمین۔

کچھ عرصہ سے امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی والدہ ماجدہ بیمار ہیں قارئین کرام سے ان کی صحت کے لئے دعا کرنے کی بھی درخواست ہے ....

اذھب الباس رب الناس و اشف انت الشافی لا شفاء الا شفاؤک شفاء لا یغادر سقما اور اللھم اشفھا و ارحمھا۔ آمین یارب العالمین۔

بیرونی ممالک میں مقیم رفقاء و احباب نوٹ فرمالیں!

- ازراہِ کرم مکتبہ انجمن کی کتب، کیسٹس، ماہنامہ 'میثاق' اور ماہنامہ 'حکمت قرآن' کے ضمن میں رقوم بینک ڈرافٹ کی شکل میں ارسال فرمائیں۔ اور ڈرافٹ صرف اور صرف "مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے نام (ٹائیٹل) سے بنوایا کیجئے۔
- جرائد کے سلسلے میں خط و کتابت کرتے ہوئے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔
- بھارت میں انجمن کی مطبوعات اور کیسٹس کی خریداری اور زر تعاون کے سلسلے میں درج ذیل پتے پر رابطہ فرمائیں۔

ANJUMAN KHUDDAMUL QURAN,

4-1-444, 2nd FLOOR BANK STREET,

HYDERABAD 500001 (INDIA)

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شَهْرُ رَمَضَانَ
الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ
هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی
وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ
فَلْیَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی
سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ۖ یُرِیْدُ
اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ
الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا
اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ

(البقرة:۱۸۵)

رمضان کا مہینہ ہے
جس میں قرآن اتارا گیا
لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق
و باطل کے امتیاز کے کھلے دلائل کے ساتھ،
سو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو وہ
اس کے روزے رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو
تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تعالیٰ
تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے ساتھ سختی
نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہے کہ تم تعداد پوری کرو
اور اللہ نے جو تمہیں ہدایت بخشی ہے اس پر اس کی
بڑائی کرو اور تاکہ تم اس کے
شکر گزار بنو۔

البقرہ : ۱۸۵

عظمتِ صیام و قیامِ رمضان

رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ میں کراچی میں دورہ ترجمۂ قرآن کے آغاز پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کا افتتاحی خطاب

ترتیب و تسوید: (شیخ) جمیل الرحمٰن

خطبہ مسنونہ کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے سورہ بقرہ کی آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸ یعنی تیئسویں رکوع کی تلاوت کی۔ پھر ادعیہ مسنونہ و ماثورہ پڑھنے کے بعد فرمایا:

* * *

معزز حاضرین و محترم خواتین۔

آج ہم اللہ کے نام سے اور اس کی نصرت و تائید کے بھروسہ پر اس پروگرام کا آ
کر رہے ہیں جو ہم نے اس رمضان المبارک کے قریباً پورے ماہ کے لئے طے کیا ہے۔ طے
پروگرام کے مطابق دورۂ ترجمان قرآن کا آغاز انشاء اللہ العزیز کل سے شروع ہو گا۔ ا
طریق کار یہ ہو گا کہ چار رکعات تراویح میں قرآن حکیم کا جتنا حصہ پڑھا جانا ہو گا۔ ہم قر
مجید سامنے رکھ کر پہلے اس کا اس طور پر مطالعہ کریں گے کہ میں متن کے ساتھ ساتھ ت
کروں گا اور جہاں ضرورت ہو گی وہاں مختصر تشریح و توضیح بھی کرتا رہوں گا۔ اس طرح چ
رکعات سے قبل یعنی ہر تراویح میں قرآن مجید کے تلاوت کئے جانے والے حصے کا ترجمہ اور
تشریح ہمارے سامنے آتی رہے گی۔ اس کا بہت مفید اور نہایت افادیت والا پہلو یہ ہے ک

کی قرآن کا جتنا حصہ پڑھا جائے گا اس کے اکثر و بیشتر ترجمے اور مضامین و مفاہیم سے سامعین
کی ذہنی مناسبت قائم رہے گی اور اس طور پر انشاء اللہ یہ تراویح کی نماز ہمارے لئے نور علیٰ نور کا
مصداق بن جائے گی۔ پچھلے دو سالوں میں ہم لاہور میں قرآن اکیڈمی کی مسجد جامع القرآن میں اسی
طور پر دورۂ ترجمہ قرآن کر چکے ہیں اور الحمد للہ یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے۔ لوگوں نے ہماری
توقعات سے بڑھ چڑھ کر بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس میں شرکت کی۔ شہر کے بعض
معروف فزیشن' سرجن' پروفیسر' وکلاء اور تاجر حضرات کے علاوہ عام پڑھے لکھے لوگوں کی
ایک بڑی تعداد غایت درجے کے دلی اشتیاق اور پابندی کے ساتھ اس میں مستقل طور پر شریک
رہی۔ اور اکثر ایسا ہوتا تھا' خاص طور پر آخری عشرے میں کہ بلا مبالغہ جامع القرآن کے وسیع و
عریض ہال میں اور پھر صحن میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی اور کچھ حضرات کو واپس جانے
پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ہماری معلومات کی حد تک اس طرح ہر چار رکعات تراویح سے قبل ان
رکعتوں میں پڑھے جانے والے قرآن کے مکمل حصے کے ترجمے کا مختصر تشریح و توضیح کے ساتھ
بیان' برصغیر پاک و ہند میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور اس کی سعادت قسام ازل نے
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نصیب میں رکھی تھی[1] ـــــ حقیقت یہ ہے کہ اس
فضل و احسان پر ہم اللہ تعالیٰ کا کماحقہ شکر ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

اس سال کے رمضان المبارک میں دورۂ ترجمہ قرآن کے لئے کراچی کے احباب کا اصرار
تھا کہ اسے کراچی میں رکھا جائے۔ خود میری بھی خواہش تھی کہ اس کام کو اہل کراچی سے
متعارف کرایا جائے۔ اس ضمن میں فاران کلب کے ارباب حل و عقد نے جگہ اور دوسرے
انتظامات کی پیش کش کی تھی' لیکن جگہ وسعت کے لحاظ سے ناکافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد اس
جامع مسجد ناظم آباد نمبر ۵ کے منتظمین اور محترم خطیب صاحب سے رجوع کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ
ان حضرات کو جزائے خیر سے نوازے کہ انہوں نے بڑی خوشی سے مسجد کا اوپر والا ہال جس میں
ہم اس وقت بیٹھے ہیں' اس کام کے لئے عنایت فرما دیا۔ اور دیگر ضروریات فراہم کرنے کے
سلسلہ میں بھرپور تعاون کیا۔ اس مسجد میں جو سات آٹھ حفاظ تراویح میں قرآن مجید سنائیں
گے۔ ان کے لئے گراؤنڈ فلور پر انتظام ہے اور کسی جگہ بھی لاؤڈ اسپیکر استعمال نہیں ہو گا تاکہ
ہمارے اس پروگرام میں خلل واقع نہ ہو..... اللہ تعالیٰ ان حضرات کے اس بیش بہا دینی تعاون

---

[1] لاہور کے پہلے دورۂ ترجمہ قرآن کی تفصیلی روداد اگست ۸۴ء کے ماہنامہ میثاق میں شائع ہو چکی ہے۔

کو قبول فرمائے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کے آغاز سے قبل یہ بہت مناسب موقع ہے کہ ہم رمضا
المبارک کے استقبال کے لئے آج وقت صرف کریں تاکہ اس ماہ کی برکات سے صحیح طور
مستفید ہونے کے لئے ہماری کچھ ذہنی تیاری ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے آج کے شرکا
میں ایک چار ورقہ پمفلٹ تقسیم کیا گیا ہے' اس کے صفحہ چار پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک
خطبہ درج ہے۔ ہم آج تبرک کے طور پر اور رمضان المبارک کی عظمت و افادیت سے
واقفیت کے لئے اس خطبہ مبارکہ کا لفظاً مطالعہ کریں گے۔

امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خطبہ حضرت سلمانؓ فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اپنی کتاب
شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ حضرت سلمانؓ فارسی راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے یہ خطبہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا تھا۔

اب آپ چشم تصور سے یہ دیکھیے کہ آج سے چودہ سو برس قبل مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام
رضوان اللہ علیہم اجمعین جمع ہیں اور ان کے سامنے رمضان المبارک کے بیان کے لئے نبی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

امام بیہقی روایت کرتے ہیں!

عن سلمان الفارسی قال خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم فی اخر یوم من شعبان فقال...... "حضرت سلمان فارسی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں
ایک خطبہ دیا' اس میں ارشاد فرمایا"...... "یایہا الناس قد اظلکم شہر عظ
...... "اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے"...... "ظل" سایہ کو کہ
ہیں۔ گویا رمضان کا سایہ شعبان کی آخری تاریخ سے پڑنا شروع ہو جاتا ہے...... شہ
مبارک۔ "یہ مہینہ بڑا بابرکت ہے......" شہر فیہ لیلۃ خیر من الف
شہر۔ "اس (مبارک) مہینہ میں ایک رات (شب قدر) ہے جو ہزار مہینوں سے ب
ہے"...... حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں قرآن مجید کی سورۃ القدر کی طرف اشارہ ہو
کہ انا انزلنا فی لیلہ لقدر ○ وما ادراک ما لیلۃ القدر ○ لی
القدر خیر من الف شہر ○ "ہم نے اس (قرآن) کو شب قدر میں نازل
ہے۔ اور (اے نبی!) آپ کیا سمجھے کہ شب قدر کیا چیز ہے! (یہ) شب قدر (خیر و برک
میں) ہزار مہینوں سے بہتر ہے"...... خطبہ میں حضورؐ نے آگے ارشاد فرمایا۔ جعل ال

صیامہ فریضۃ و قیام لیلہ تطوعا...... "اللہ نے اس مہینہ کا روزہ رکھنا فرض ٹھہرایا ہے اور اس کی رات میں قیام کرنے (یعنی تراویح) کو نفل قرار دیا ہے" ...... اس بات کو میں آگے چل کر وضاحت سے بیان کروں گا کہ نماز تراویح کی کیا اہمیت ہے' اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے' اور پھر یہ کہ رمضان المبارک کی راتوں کے قیام کی اصل روح کیا ہے! اس کا قرآن مجید کے ساتھ ربط و تعلق اور اس کی عظیم ترین افادیت کیا ہے!! البتہ اس وقت پھر نوٹ کر لیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ میں الفاظ ہیں! جعل اللہ صیامہ فریضۃ و قیام لیلہ تطوعا۔ ظاہر بات ہے کہ قیام اللیل تو ہر شب میں نفل ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ مبارکہ سے صاف متبادر ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں قیام الیل کی خصوصی اہمیت و فضیلت ہے۔ اگرچہ فرضیت نہیں ہے' لیکن اللہ کی طرف سے اس کا تطوع اور اس کی مجعولیت ثابت ہے۔ چونکہ دونوں کے ساتھ فعل "جعل اللہ" آیا ہے...... آگے فرمایا۔ من تقرب فیہ بخصلۃ من الخیر کان کمن ادی فریضہ فیما سواہ۔ "جو کوئی بھی اس مہینہ میں نیکی کا کوئی کام کر کے اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کرنا چاہے گا تو اسے اس کا اجر و ثواب اتنا ملے گا جیسے دوسرے دنوں میں کسی فرض کے ادا کرنے پر ملے گا۔" یعنی مسنون و نفلی نیکی اس ماہ مبارک میں اجر و ثواب کے اعتبار سے عام دنوں کے فرض عبادت کی ادائیگی کے مساوی ہو جائے گی...... اور ومن ادی فریضۃ فیہ کان کمن ادی سبعین فریضہ فیما سواہ۔ "اور جو کوئی اس مہینہ میں فرض ادا کرتا ہے تو اس کو دوسرے زمانہ کے ستر فرض ادا کرنے کے برابر ثواب ملے گا" ...... گویا اگر ہم اس ماہ مبارک میں ایک فرض نماز ادا کرتے ہیں تو غیر رمضان کی ادا کردہ ستر فرض نمازیں ادا کرنے کے برابر ثواب پانے کے مستحق ہو جاتے ہیں...... آگے فرمایا۔ وھو شھر الصبر والصبر ثوابا الجنہ۔ "اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر و ثواب جنت ہے۔" اس مہینہ میں ایک بندہ مومن بھوک پیاس برداشت کرتا ہے' جائز طریقہ سے اپنے جنسی جذبہ کی تسکین سے بھی اجتناب کرتا ہے' لوگوں کی کڑوی کسیلی اور ناخوشگوار باتوں پر خاموشی اختیار کرتا ہے غیبت و زور سے بچتا ہے۔ یہ تمام کام اور اسی نوع کے نواہی سے بچنا سب صبر کے مفہوم میں شامل ہیں' اور اس صبر کا بدلہ جنت ہے۔ حدیث شریف کے اس ٹکڑے میں جہاں بشارت ہے وہاں بڑی فصاحت و بلاغت ہے...... آگے فرمایا۔ وشھر المواساۃ "اور یہ آپس کا

ہمدردی اور دمسازی کا مہینہ ہے"......اس لئے کہ جس کسی کو بھی بھوک پیاس کا تجربہ نہیں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ کسی بھوکے پیاسے انسان پر کیا بیتتی ہے۔ اس مہینہ میں اسے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ بھوک کسے کہتے ہیں اور پیاس کیا ہوتی ہے! اس طرح یقیناً دل میں انسانی ہمدردی کا ایک جذبہ بیدار ہوتا ہے...... آگے فرمایا۔ وشھر یزاد فیہ رزق المومن۔ "اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن کے رزق میں اضافہ ہوتا ہے۔" اس میں برکت ہوتی ہے۔ آگے ارشاد ہوا۔ من فطّر فیہ صائما کان لہ مغفرۃ لذنوبہ وعتق رقبتہ من النار۔ "جو کوئی اس مہینہ میں کسی روزہ دار کا روزہ (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرائے گا، اس کے لئے اس کے گناہوں کی مغفرت بھی ہوگی اور اس کی گردن کا آتش دوزخ سے چھٹکارا پالینا بھی ہوگا"......

آگے فرمایا۔ وکان لہ مثل اجرہ۔ "اور اسے اس روزہ دار کے برابر اجر و ثواب بھی ملے گا"۔ من غیر ان ینتقصُ من اجرہ شیئ۔ "بغیر اس کے کہ اس (افطار کرنے والے روزے دار) کے اجر میں سے کوئی بھی کمی کی جائے"...... آپ حضرات کو معلوم ہو گا کہ حضرت سلمان فارسی رضؓ ان فقراء صحابہ کرام رضؓ میں سے تھے جن کے پاس اموال و اسباب دنیوی نہ ہونے کے برابر تھے اور جن پر عام دنوں میں بھی فاقے پڑتے تھے۔ ان اصحابؓ کو اتنی مقدرت کہاں حاصل تھی کہ وہ کسی روزہ دار کو افطار کرا سکتے۔ چنانچہ اسی حدیث شریف میں آگے آتا ہے کہ۔ قلنا یا رسول اللہ لیس کلنا یجد ما یفطر بہ الصائم" ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں سے ہر ایک کو تو روزہ دار کا روزہ افطار کرانے کی استطاعت نہیں ہے (تو کیا ہم اس اجر و ثواب سے محروم رہیں گے؟")۔ حضرت سلمان فارسی رضؓ کی اس بات پر حضورؐ نے جو جواب ارشاد فرمایا اسے حضرت سلمان فارسیؓ آگے بیان کرتے ہیں کہ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعطی اللہ ھذا الثواب من فطر صائما علی مذقۃ لبن او شربۃ من ماء۔ "تو رسول اللہؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا" یہ ثواب اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھی عطا فرمائے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسی پر یا صرف پانی کے ایک گھونٹ ہی پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے گا"......یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ ہمارے یہاں اس دور میں کھانے پینے کی اشیاء کی جو افراط ہے اس وقت اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت اگر فقراء صحابہ کرام رضؓ میں سے کسی کو افطار کے لئے

کہیں سے کچھ دودھ مل جاتا تھا تو وہ اس میں پانی ملا کر لسی بنالیا کرتے تھے۔ اور کوئی رفیق ایسا بھی ہو جسے یہ بھی میسر نہیں تو اگر وہ اسے اس لسی میں شریک کر لے تو اس وقت کے حالات میں یہ بھی بہت بڑا ایثار تھا۔ ہم کو آج کھانے پینے کی جو فراوانی ہے اس کے پیش نظر ہم حضورؐ کے اس ارشادِ مبارک کی حکمت کو صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ ان فقرائے صحابہ کرام رضؓ پر کئی کئی دن کے فاقے پڑتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرا یہ حال ہوتا تھا کہ کئی کئی دن کے فاقے سے مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی' لوگ یہ سمجھتے تھے شاید مجھ پر مرگی کا دورہ پڑا ہے اور لوگ آکر اپنے پاؤں سے میری گردن دباتے تھے۔ شاید اس دور میں یہ بھی مرگی کا علاج سمجھا جاتا ہو..... پھر یہ کہ وہاں پانی کے بھی لالے تھے' پانی بھی بڑی قیمتی شے تھا۔ بڑی دور سے اسے کنوؤں سے کھینچ کر لانا پڑتا تھا۔ ماحول کے اس تناظر میں سمجھئے کہ حضورؐ کے ارشاد مبارک کا اصل منشاء و مدعا کس نوع کے ایثار و قربانی کے جذبے کو پیدا کرنے کی طرف تھا کہ لوگ اپنی ذات اور اپنی ضروریات کے مقابلے میں اپنے کمزور بھائیوں کی ذات اور ان کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھیں۔ یہ بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے..... یہاں ایک ضمنی بات یہ سمجھ لیجئے کہ جدید دور کی عربی میں لبن دہی کو اور حلیب دودھ کو کہا جاتا ہے۔ آگے چلئے حضورؐ کے ارشاد کا سلسلہ جاری ہے' حضورؐ فرماتے ہیں۔ وَمَنْ اَشْبَعَ صَائِمًا سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِي شُرْبَةً لَا يَظْمَاُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ "اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائے گا اسے اللہ تعالیٰ میرے حوض (یعنی حوضِ کوثر) سے ایسا سیراب فرمائے گا کہ (میدانِ حشر کے مرحلہ سے لے کر بقیہ تمام مراحل میں) اس کو پیاس ہی نہیں لگے گی تا آنکہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا"۔ آگے چلئے' ابھی نبئ رحمتؐ کا ارشاد مبارک جاری ہے' غور سے سنئے اور پڑھئے' فرمایا حضورؐ نے۔ وَهُوَ شَهْرٌ اَوَّلُهُ رَحْمَةٌ ۔ "اور یہ مہینہ وہ ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ یعنی پہلا عشرہ اللہ کی رحمت کا ظہور"۔ وَاَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ ۔ "اور اس کا درمیانی حصہ یعنی دوسرا عشرہ مغفرت خداوندی کا مظہر ہے"۔ وَاٰخِرُهُ عِتْقٌ مِنَ النَّارِ ۔ "اور اس کا آخری حصہ یعنی تیسرا عشرہ تو گردنوں کو آتشِ دوزخ سے چھڑا لینے کی بشارت اور نوید سے معمور ہے"۔ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَمْلُوْكِهٖ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ وَاَعْتَقَهٗ مِنَ النَّارِ ۔ "اور جو کوئی اس مہینہ میں غلام و خادم اور زیر دستوں کی مشقت میں تخفیف اور کمی کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے

آتشِ دوزخ سے آزادی عطا فرمائے گا۔

حضرت سلمان فارسی رضؓ کی روایت کردہ اس حدیث شریف کی رو سے یہ وہ خطبہ مبارکہ ہے جو نبی اکرمؐ نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا۔ اس سے آپ حضرات کو بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضورؐ نے کس طرح یہ چاہا کہ لوگ اس عظمت والے اور برکت والے مہینہ سے مستفیض و مستفید ہونے کے لئے ذہناً تیار ہو جائیں۔ اس لئے کہ جب تک کسی شخص کو کسی چیز کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور نہ ہو، اس وقت تک انسان اس سے صحیح طور پر اور بھرپور استفادہ کر ہی نہیں سکتا۔ اب آیئے سورۃ البقرۃ کے تئیسویں (۲۳) رکوع کی طرف جو چھ آیات پر مشتمل ہے اور میں نے شروع میں اس پورے رکوع کی تلاوت کی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ ان آیاتِ مبارکہ کے بارے میں کچھ عرض کروں۔

سب سے پہلی بات یہ سمجھ لیجئے کہ روزے کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ ہے کہ اس سے متعلقہ مضامین، تمام احکام اور اس کی ساری حکمتیں قرآن مجید میں اس مقام پر یکجا ہو کر آگئی ہیں۔ اس کا اولین حکم کیا تھا! ابتدائی رعایتیں کیا تھیں! آخری حکم کیا آیا! کتنی رعاتیں برقرار ہیں! کون سی رعایت ساقط ہو گئی! روزے کے تفصیلی احکام کیا ہیں! روزے کی حکمت کیا ہے! روزے کا دعاء سے کیا ربط و تعلق ہے! روزے کی عبادت رزقِ حلال سے کس طور پر مربوط و متعلّق ہے روزے کی عبادت کے لئے ماہِ رمضان المبارک کا انتخاب کیوں ہوا! پھر اس رمضان المبارک کی مناسبت سے صوم کے ساتھ اضافی پروگرام کیا ہے! اور اس طرح جو دو آتشہ اور نورٌ علیٰ نور پروگرام بنتا ہے اس کا حاصل کیا ہے! یہ تمام مضامین اور موضوعات اس مقام پر چھ آیات میں آگئے ہیں۔

آپ کے علم میں ہے کہ نماز جو ارکانِ اسلام کی رکنِ رکین ہے، جسے حضورؐ نے عماد الدّین اور قرۃ عینی فرمایا ہے، اس کا یہ معاملہ نہیں ہے۔ آپ کو نماز کا ذکر قرآن مجید میں متفرق مقامات پر منتشر ملے گا۔ ارکانِ نماز قیام رکوع سجدے کا ذکر بھی ترتیب سے کسی ایک جگہ نہیں ملے گا۔ بلکہ بعض جگہوں میں ترتیب میں بھی فرق ہو گا۔ پھر وضو اور تیمم کا ذکر کہیں اور ہو گا۔ اوقات نماز کا بیان متعدد اسالیب سے مختلف سورتوں اور آیتوں میں اشارات و کنایات میں ملے گا۔ صلوٰۃِ خوف کا ذکر کہیں اور ملے گا۔ الغرض نماز کے متعلق ساری باتیں آپ کو کہیں ایک جگہ نہیں ملیں گی۔ پھر صلوٰۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا ذکر آپ کو قرآن مجید میں کثرت سے مختلف مقامات پر نظر آئے گا۔ لیکن زکوٰۃ کا نصاب، مقادیر کا تعیّن اور ادائیگی کی مدّت

کر پورے قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ اس کے جملہ تفصیلی احکام ہمیں سنت و حدیث
شریف میں ملیں گے۔ اسی طرح سے حج کا معاملہ ہے۔ سورۃ البقرۃ کے دو رکوع اور سورۃ الحج
کے دو رکوع تو وہ ہیں، جن میں قدرے تفصیل سے مناسکِ حج کا ذکر ہے۔ پھر سورۂ آل
عمران میں حج کی فرضیت بیان ہوئی ہے۔ سورۃ البقرہ کے انیسویں (۱۹) رکوع میں سعی بین
الصفا والمروۃ کا ذکر ہے۔ تو حج کا ذکر بھی قرآن مجید میں آپ کو کم از کم چار جگہ ملے گا۔ لیکن
صوم یعنی روزے کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہمت کر کے ان چھ آیات کو سمجھ لے تو گویا ارکانِ
اسلام میں سے ایک رکن یعنی صوم کے بارے میں جو کچھ قرآن حکیم میں آیا ہے، اس کا علم اسے
حاصل ہو جائے گا۔ تو یہ ہے صوم کا خصوصی معاملہ۔ اس پر آپ اپنی توجہات کو مرتکز
رکھیں گے تو انشاء اللہ العزیز آپ محسوس کریں گے کہ بہت بڑی دولت کا خزانہ ہاتھ آیا
ہے۔ ابتداء ہی میں یہ بات بھی جان لیجئے کہ ان آیات میں ایک بہت بڑا تفسیری اشکال ہے۔ یہ
مقام مشکلات القرآن میں سے ہے اور اس کے ضمن میں مختلف تفسیری آراء ہیں۔ ان میں سے
جس رائے پر میرا دل ٹھکا ہے، وہ سلف میں بھی موجود ہے اور خلف میں بھی موجود ہے، لیکن
متداولہ اُردو تفاسیر میں عام طور پر اس کا ذکر نہیں ہے، لہٰذا وہ رائے نگاہوں سے اوجھل ہے۔
وہی بات اس وقت میں آپ کے سامنے رکھوں گا، لیکن اس کے لئے تمام دلائل دینا اس وقت
ممکن نہیں ہو گا چونکہ اس وقت ان آیات کا مفصّل درس پیشِ نظر نہیں ہے۔ وہ رائے یہ ہے
کہ اس رکوع کی جو پہلی دو آیات ہیں یہ رمضان کے روزے سے متعلق نہیں ہیں بلکہ ابتداء میں
جب نبی اکرمؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپؐ نے مسلمانوں کو ہر مہینے میں ایامِ بیض کے تین
روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی۔ ایّامِ بیض سے مراد ہیں روشن راتوں والے دن، یعنی
تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں راتوں سے ملحق دن۔ ان تین دنوں کے روزوں سے متعلق
ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم کے طور پر ان دو آیات میں آگئی۔ یہ ایک رائے ہے اور
میں اسے ہی بیان کر رہا ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کے علاوہ دوسری آراء بھی
ہیں۔ لیکن میرا دل اسی پر مطمئن ہوا ہے۔ اس موقع پر میں آپ کو بتاتا چلوں کہ جب میں
میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا اُس وقت اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں قرآن مجید کے غور و تدبّر کے
ساتھ مطالعہ کی رغبت پیدا فرمائی تو اسی مطالعہ اور غور و فکر کے نتیجہ میں ان دو آیات کے متعلق
وجدانی طور پر میری یہ رائے بن گئی تھی کہ ان کا تعلق ایام بیض کے تین روزوں سے ہے۔ جن
کا اہتمام دورِ نبوی سے تا حال نفلی روزوں کی حیثیت سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس وقت جو بھی

اردو تفاسیر میرے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں، ان میں مجھے یہ رائے نہیں مل رہی تھی۔
اچانک ایک روز میری نظر سے ماہنامہ زندگی رامپور (بھارت) میں (جو جماعت اسلامی ہند کا ترجمان تھا) ایک مضمون گزرا جس میں ایک صاحب نے مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی اس رائے پر تنقید کی تھی کہ سورۃ البقرۃ کی آیات نمبر ۱۸۳۔ ۱۸۴ (یعنی تیئسویں (۲۳) رکوع کی پہلی دو آیات) کا تعلق رمضان المبارک کے روزوں سے نہیں، بلکہ ایامِ بیض کے تین روزوں کی فرضیت سے ہے جو ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد نفل کے طور پر رہ گئے ہیں۔ یہی رائے میری تھی۔ تو مجھے اس مضمون سے تقویت حاصل ہوگئی کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ جن کو بیہقیٔ وقت کہا گیا ہے کی بھی یہی رائے ہے...... امام بیہقیؒ کا شمار اپنے دور کے ائمۂ محدثین میں ہوتا ہے۔ لہٰذا میرے لئے "متفق گردید رائے بو علی با رائے من" والا معاملہ ہوگیا۔ اس طرح بڑی مضبوط دلیل میرے ہاتھ آگئی۔ اگرچہ مضمون نگار نے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے پر تنقید کی تھی کہ بڑی بودی، کچی اور بے بنیاد بات ہے جو شاہ صاحبؒ نے کہہ دی، لیکن جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا کہ مجھے اپنی وجدانی رائے کی تائید میں حضرت شاہ صاحبؒ کے حوالہ سے ایک دلیل مل گئی۔ اس کے کافی عرصہ کے بعد جب میں نے امام فخرالدین رازیؒ کی تفسیر "تفسیر کبیر" کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ انہوں نے بہت سے ان تابعینؒ کے ناموں کے حوالے سے جو مفسّرینِ قرآن کی حیثیت سے مشہور ہیں، اسی رائے کا اظہار کیا ہے کہ ان دو آیات (۱۸۳۔ ۱۸۴) کا تعلق ان تین دن کے روزوں کی فرضیت کے حکم سے ہے جو اب ایامِ بیض کے نفلی روزے کہلاتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ رائے سلف میں بھی موجود تھی اور ہمارے اس دور میں حضرت انور شاہ کاشمیریؒ جیسے جیّد عالم، محدّث، مفسّر اور فقیہہ کی بھی یہی رائے ہے۔ چنانچہ مجھے اس رائے کو بیان کرنے میں اب کوئی باک نہیں رہا۔ اور اب میں اسے اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔
جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ ان آیات کا تعلق ماہ رمضان کے روزوں سے نہیں ہے بلکہ ان تین دن کے روزوں سے ہے جن کی ہدایت نبی اکرمؐ نے دی تھی۔ اس میں چند رعایتیں بھی رکھی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ اگر ان تین دنوں میں بیمار ہو تو کوئی سے اور تین دنوں میں رکھ لو۔ اگر تم سفر پر ہو، تو بعد میں ان کی قضا ادا کر سکتے ہو۔ ایک رعایت مزید تھی۔ اور اس کا تعلق اسلام کی حکمت تشریعی سے ہے کہ لوگوں کو تدریجاً خوگر بنایا گیا ہے اور چونکہ اہل عرب روزے سے واقف ہی نہیں تھے " صوم کی عبادت جانتے ہی نہیں تھے۔ حضرت

براہیمؑ کی طرف منسوب کر کے وہ جن روایات کی پابندی کرتے تھے اور جسے وہ دینِ حنیف لیتے تھے' اس میں روزہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس روزہ سے مانوس کرنے کے لئے ابتداء میں یہ عایت بھی رکھی گئی کہ اگر تم صحت مند ہونے کے باوجود اور مقیم ہونے کے باوصف روزہ نہ کھو تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو' یہ اس کا فدیہ بن جائے گا۔ اس کے بعد جب رمضان کے وزے والی آیت (آیت نمبر ۱۸۵) نازل ہوئی تو پہلی دو رعایتیں تو علیٰ حالہٖ برقرار رہیں کہ اگر بھی بیمار ہو یا مسافر ہو تو قضا کر سکتے ہو' ۔ تعداد بعد میں پوری کر لو..... لیکن وہ جو تیسری مزید عایت فدیہ ادا کرنے کی تھی' وہ ساقط ہو گئی۔

اس کے بارے میں امام رازیؒ نے یوں لکھا ہے' یہ فقہی اصطلاحات ہیں کہ پہلے روزے کا جوب "علی التخییر" تھا کہ تمہیں اختیار ہے کہ روزہ رکھو یا اس کے فدیہ کے طور پر ایک سکین کو کھانا کھلا دو۔ اب "علی التعیین" ہو گیا کہ معیّن روزہ لازم ہے' فرض ہے جو ہر سلمان کو رکھنا ہو گا۔ یہ ہے اصل میں تین آیات (آیات ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵) میں ربط لی ایک شکل۔ جس کے متعلق میں نے عرض کیا کہ سلف میں بھی یہ رائے موجود ہے اور ہمارے دور میں حضرت انور شاہ کاشمیریؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ آگے ارشاد فرمایا۔ یَاَ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ ۔ "اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا" ۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ عام طور پر "صیام" کا ترجمہ "روزے" کر دیا جاتا ہے" یعنی جمع کے صیغہ میں جو درست نہیں ہے۔ صیام دراصل صوم کی جمع نہیں ہے' بلکہ مصدر ہے۔ صَامَ۔ یَصُوْمُ ۔ صَوْماً و صیاماً..... صوم اور صیام دونوں مصدر ہیں۔ جیسے قام 'یقوم قیاماً۔ میں قیام مصدر ہے۔

عربوں کے یہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے اب ذرا اسے بھی سمجھ لیجئے۔ عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لئے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس مقصد کے لئے نہایت قیمتی جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں " اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے۔ پھر وہ گھوڑے کے مقابلہ میں تیزی سے اپنا رخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لئے ان گھوڑوں

سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے۔ ان کے منہ پر ایک توبڑا چڑھا دیتے تھے اس عمل کو وہ صوم کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ صائم کہتے تھے، یعنی یہ روزہ سے ہے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھوڑا بھوک پیاس برداشت نہ کر سکے اور جی ہار دے اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرہ میں پڑ جائے گی اور اسے تو زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لئے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر ان گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے تھے اور ان گھوڑوں کا منہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے تاکہ ان کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ لُو کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے۔ تاکہ کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا سوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صرصر کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے سوار کی مرضی کے مطابق مطلوبہ رخ برقرار رکھے اور اس سے منہ نہ پھیرے۔ تو عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اور جس پر وہ صوم کے لفظ یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے، اس مشق کے متعلق گویا اب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے گھوڑوں کو تم جو روزہ رکھواتے ہو، وہ تم خود بھی رکھو۔ تم پر بھی یہ فرض کر دیا گیا —— ساتھ ہی فرمایا۔ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ۔ "تم سے پہلے جو امتیں تھیں، جیسے ان پر روزہ فرض کیا گیا تھا ویسے ہی تم پر بھی فرض کیا گیا ہے"۔ چونکہ عرب کے لوگ روزے کے عادی نہیں تھے تو پہلی بات سمجھانے کے انداز میں یہ فرمائی گئی کہ یہ تمہارے لئے نیا حکم ہے، کوئی نئی مشقت نہیں ہے۔ یہ حکم پہلی امتوں کو بھی مل چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا فرضیت کے لحاظ سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ تعداد، زمانہ اور آداب و شرائط کے اعتبار سے نہیں ہو سکتا چونکہ یہ بات ہم کو معلوم ہے کہ شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور سابقہ انبیاء و رسل کی شرائع میں فرق رہا ہے۔

دوسری بات یہ سمجھائی گئی کہ تمہیں اس مشقت و تکلیف میں ڈال کر اللہ تعالیٰ کو کوئی مسرت حاصل نہیں ہوتی، معاذ اللہ! اس میں تمہارے لئے مصلحت ہے۔ اور وہ کیا ہے! لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ "تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے"۔ گویا روزے کی مصلحت ہے تقویٰ۔ تقویٰ کے معنی اور مفہوم کو جان لینے سے یہ مصلحت اور حکمت بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ "تقویٰ" کے معنی ہیں بچنا۔ قرآنِ مجید نے اس میں اصطلاحی مفاہیم پیدا کئے یعنی اللہ کے

حکام کو توڑنے سے بچنا، حرام سے بچنا، معصیت سے بچنا، یہ تقویٰ ہے۔ آپ کو معلوم ہے
ہمارے نفس کے بہت سے تقاضے ھیں۔ مثلاً پیٹ کھانے کو مانگتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی
حلال چیز کھانے کو نہیں ہے تو اگر کوئی مسلمان اس بھوک کے ہاتھوں مجبور ہو جائے تو حرام میں
منہ مار بیٹھے گا۔ لہٰذا اس میں یہ عادت ڈالی جائے کہ آخری حد تک بھوک پر قابو پانے میں
کامیاب رہے۔ اسی طرح پیاس کو کنٹرول میں لائے، شہوت کو کنٹرول میں رکھے۔ ساتھ ہی
نفس کی ان خواہشات پر قابو پانے کی مشق حاصل ہو جو دین کے منافی ہوں۔ لہٰذا طلوعِ فجر سے
غروبِ آفتاب تک کھانے پینے اور تعلقِ زن و شو سے کنارہ کشی
کرنے کی جو مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کا مفاد ہے ضبطِ نفس — ایک
بندۂ مومن کو اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے کے تقاضوں پر قابو پانے اور کنٹرول میں رکھنے کی
مشق ہو جائے اور عادت پیدا ہو جائے۔ یہ ساری گفتگو خاص طور پر پورے ماہِ رمضان المبارک
سے متعلق ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہماری تقویم قمری ہے جس کے نویں مہینے کو رمضان کہا
جاتا ہے۔ ہر برس قمری اور شمسی سال میں دس گیارہ دن کا فرق واقع ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ قمری
مہینوں اور شمسی مہینوں کے موسموں میں مطابقت نہیں ہوتی۔ لہٰذا قمری تقویم کے مطابق گھوم
پھر کر رمضان کا مہینہ سال کے ہر موسم میں آتا رہتا ہے۔ مئی سے جولائی تک ہمارے ملک
کے اکثر و بیشتر علاقوں میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ ایسے گرم موسم میں پیاس سے حلق میں جو
کانٹے چبھتے ہیں اس کا عملی تجربہ خاص طور پر روزہ رکھنے کے بعد ہوتا ہے۔

لیکن چاہے سامنے بہترین مشروبات موجود ہوں۔ اگر آپ روزے سے ہیں تو ان کو پی
نہیں سکتے۔ اس لئے کہ اللہ کی اجازت نہیں ہے۔ کھانے کی مرغوب چیزیں موجود ہیں لیکن آپ بھوک اور نقاہت کے باوجود
نہیں کھا سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے بیوی موجود ہے۔ دن
میں اپنی شہوت کو جائز طور پر پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نہیں کرتے، کیوں؟ اس لئے کہ اللہ نے
ممانعت کر رکھی ہے۔ اب سوچئے کہ ایک مقررہ وقت سے لے کر ایک مقررہ وقت تک آپ
اگر اللہ کی حلال کردہ چیزیں پورے تیس دن اس لئے استعمال نہیں کر رہے کہ اللہ نے اس کی
اجازت نہیں دی تو اس سے آپ کے اندر ایک مضبوط قوت ارادی کے ساتھ یہ استطاعت اور
استعداد پیدا ہونی چاہئے کہ بقیہ گیارہ مہینوں میں بھی تقویٰ کی روش پر مستقیم رہیں۔ لہٰذا پورے
رمضان کے روزے دراصل تقویٰ کی مشق ہے۔ صوم کی فرضیت کے ساتھ "لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُونَ" ایک چھوٹا سا فقرہ ہے، لیکن غور و تدبّر کیا جائے تو یہ دو لفظی جملہ بڑا ہی پیارا،

نہایت عجیب اور بڑی جامعیت کا حامل ہے۔ اس کے اندر روزے کی ساری ظاہری و باطنی اور انفرادی و اجتماعی فضیلتیں آ گئیں۔ اور یہ بات روزِ روشن کی طرح مبرہن ہو گئی کہ روزے کا مقصود حصولِ تقویٰ ہے' بالخصوص نفس کا تقویٰ...... یعنی اللہ کی محبّت کے شوق اور اللہ کی نافرمانی کی سزا کے خوف سے اللہ کے اوامر و نواہی پر استقلال کے ساتھ مستقیم رہنے کے لئے اپنے نفسِ امّارہ کو قابو میں رکھنے کی تربیت اور ٹریننگ حاصل کرنا۔ اس کے لئے ہمارے دین کی معروف و جامع اصطلاح ہے "تزکیہ"۔

بات سمجھانے کے لئے اگر دورِ جدید کے مشہور ماہر نفسیات فرائڈ کی اصطلاحات استعمال کروں تو وہ یوں ہو گا کہ اپنی ' IDD' یا ' LIBIDO' کو کنٹرول میں رکھنے کی مشق۔ فرائڈ نے کہا ہے کہ انسانی شخصیت کی تین سطحیں ہیں۔ سب سے نچلی سطح کے لئے وہ ' IDD' یا ' LIBIDO' کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یعنی شہوانی' نفسانی اور حیوانی تقاضے اور داعیات...... دوسرے ' EGO' یعنی مَیں' انا' انانیت یا خودی...... تیسرے 'SUPER EGO' یعنی انائے کبیر' اس سے اس کی مراد اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ اگر خودی کمزور ہے تو گویا انسان اپنے حیوانی نفس کا تابع ہے اور اگر خودی مضبوط ہے تو یہ ضبطِ نفس کا کام کرے گی۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اگر آپ گھوڑے پر سوار ہیں اور باگیں کمزور ہیں تو گھوڑا آپ پر حاوی ہے...... وہ جب چاہے گا آپ کو پٹخ دے گا یا آپ کو اپنی مرضی سے جدھر چاہے گا لے جائے گا۔ اور اگر آپ قوی ہیں اور گھوڑے پر قابو یافتہ ہیں تو یہ گھوڑا آپ کا مطیع ہے۔ آپ جدھر جانا چاہیں گے وہ آپ کو لے جائے گا۔ تو جس طریقہ سے راکب اور مرکب کا معاملہ ہے۔ یعنی انسان جو گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑا جو انسان کی سواری ہے' اسی طرح ہماری خودی اور ہمارے نفس کا معاملہ ہے۔ ہماری خودی راکب ہے اور نفس اس کا مرکب۔ خودی کمزور ہو گی تو نفس کے بس میں آ جائے گی' نفس جو چاہے گا حکم دے گا اور پورا کرا لے گا۔ گویا ہم اس کے تابع ہیں اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے ہیں...... اگر خودی مضبوط ہے' انا مضبوط ہے اور نفس پر قابو یافتہ ہے تو یہ نفس انسان کے لئے نیکیاں' بھلائیاں اور خیر کمانے کا ذریعہ بن جاتا ہے...... اب یہاں ایک بات کا اور اضافہ کر لیجئے کہ غیبت' جھوٹ' فحش باتیں' بدزبانی اور دل آزاری وغیرہ قسم کے گناہوں سے بچنے کی قرآن و حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ لیکن حدیث شریف میں خاص طور پر روزے کی حالت میں ان گناہوں سے بچنے کی مزید سخت تاکید آئی ہے کہ اگر روزے دار نے ان گناہوں سے اجتناب نہیں کیا تو اس روزے

ے فاقے اور رات کے قیام میں محض رت جگے کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا......
اس کے ضمن میں چند احادیث شریفہ میں انشاء اللہ آگے بیان کروں گا۔
اب پھر متن کی طرف رجوع کیجئے۔ پہلی آیت واضح ہو گئی۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ

اے اہلِ ایمان! تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں (امتوں) پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے (تم متقی بن جاؤ) اب اگلی آیت اسی کے ساتھ ہے گویا اسی کا ضمیمہ یا اسی کی تشریح ہے اس میں تمہید ہے کہ گھبراتے کیوں ہو؟

"گنتی کے چند دن ہی تو ہیں!" میں نے ترجمہ میں جو انداز اختیار کیا ہے، وہ اس لئے کہ یہاں جو لفظ "معدودات" آیا ہے، تو اس وزن پر جمع قلت آتی ہے اور جمع قلت کا اطلاق نو سے کم پر ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ دلیل ملتی ہے کہ یہ یقیناً ایامِ بیض کے تین روزوں سے متعلق ابتدائی حکم ہے۔ انتیس یا تیس دن کے روزے تو "ایام معدودات" شمار نہیں ہو سکتے۔ ان کو گنتی کے دن تو نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ یہ بھی درحقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ وہی رائے قوی ہے کہ ابتدا میں جو تین دن کے روزے فرض کئے گئے تو وہ انسان کے نفس پر اتنے بھاری گزرنے والے نہیں تھے، لہٰذا ہمت دلانے، ڈھارس بندھانے اور تسلی دینے کے لئے فرمایا۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ "گنتی کے چند دن ہی تو ہیں۔" پھر اس میں مزید رعایت بیان فرمائی۔ "فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ "پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔" آگے فرمایا۔ وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ؕ..... "اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (پھر نہ رکھیں) تو ان کے ذمہ (ایک روزہ کا) فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے۔" اس رعایت کا تعلق بھی ایامِ بیض کے روزوں سے تھا۔ آگے تشویق دلائی۔ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ ؕ "پھر جو اپنی خوشی سے زیادہ نیکی کمائے تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔" اس کے معنی یہ ہوئے کہ روزہ بھی رکھو اور ایک مسکین کو کھانا بھی کھلاؤ تو کیا کہنے! یہ نورٌ علیٰ نور والا معاملہ ہو گا۔ آگے ارشاد ہوا۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ "اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم سمجھ سے کام لو"۔ اس سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ رعایت خصوصی ہے ورنہ پسندیدہ یہی ہے کہ

ایک مسکین کو روٹی دینے کے فدیہ کے طور پر کھانا کھلانے کی بجائے خود روزہ رکھو۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تم کو رعایت تو دی ہے لیکن اگر تم سمجھ سے کام لو تو تم خود جان لو گے کہ روزے میں کتنی حکمت ہے، کتنی مصلحت ہے، کتنی برکت ہے۔ اس کی کیا عظمت ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں۔ تو اگر تم یہ سب باتیں سمجھ لو گے تو یقیناً تم روزہ ہی رکھو گے۔ میرا جو کچھ بھی تھوڑا بہت مطالعہ اور غور و فکر کا معاملہ ہے تو میرے نزدیک ان حضرات کی رائے قوی ہے جو ان دو آیات کو ابتدائی طور پر فرض ہونے والے ایّامِ بیض کے تین روزوں سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ ان آیات میں صومِ رمضان کا حکم نہیں ہے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیّت کا حکم بعد میں آیا ہے، جس کے بعد ایّامِ بیض کے روزے نفل کے درجے میں رہ گئے۔

اب آگے اس نوع کی تیسری آیت آتی ہے جو کچھ عرصہ کے بعد نازل ہوئی، لیکن مضمون کی مناسبت سے اس کو اور بقیہ تین آیات کو اسی مقام پر شامل کر دیا گیا جیسے سورۃ المزّمّل کے متعلق قرآن مجید کا ہر قاری جانتا ہے کہ یہ مکی سورت ہے، لیکن اس کا دوسرا رکوع جو صرف ایک آیت پر مشتمل ہے، وہ بعد میں مدنی دور میں نازل ہوا ہے۔ اور مضمون کی مناسبت سے یہ آخری آیت سورۃ المزّمّل کے ساتھ رکھ دی گئی ہے۔ اسی طریقے سے یہاں زمانی اعتبار سے اگلی آیت اور پچھلی دو آیات میں بُعد ہے لیکن، جیسا میں نے ابھی عرض کیا کہ موضوع کی مناسبت سے اُسے پہلے حکم کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔

اب اگلی آیت کے مطالعہ کی طرف توجہات کو مبذول فرمایئے، ارشاد ہوتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا۔" هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ۔ یعنی لوگوں کے لئے ہدایت و رہنمائی بنا کر اور یہ ہدایت و رہنمائی بھی گنجلک، مبہم یا پہیلیوں کے انداز میں نہیں، بلکہ بڑی روشن اور بہت واضح، اور حق و باطل میں فرق و تمیز کر دینے والے کھلے اور مضبوط دلائل کے ساتھ۔ یہ ہیں قرآن حکیم کی متعدد شانوں میں سے تین اہم ترین شانیں جو یہاں بیان ہوئیں کہ یہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرنے والی کتاب ہے، یہ الھدیٰ ہے۔ یہ بیّنات پر مشتمل ہے اور یہ الفرقان ہے، حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کتاب ہے۔ آگے فرمایا: فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ۔ "پس جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینہ میں موجود ہو اس پر لازم ہے کہ وہ اس ماہ کے روزہ رکھے۔" یہاں کلمۂ "فا" دونوں جگہ فرضیت کا فائدہ دے رہا ہے۔ اب یہ صومِ رمضان کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس آیتِ مبارکہ میں "شهر

الشّہر " کے الفاظ نہایت قابلِ توجہ ہیں۔ یعنی رمضان کے مہینے کا پالینا۔ یہاں یہ بات جان لیجئے کہ کرۂ ارض پر ایسے منطقے بھی ہیں جہاں چاند شروع مہینہ میں ظاہر ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح ایسے خطے بھی ہیں جہاں سورج ہی طلوع نہیں ہوتا یا برائے نام طلوع ہوتا ہے اور وہاں پر گھڑی کے حساب سے نماز ادا کی جاتی ہے۔ لہٰذا وہاں تقویم (جنتری) سے حساب کر کے رمضان کے مہینے کے روزے رکھنے فرض ہوں گے۔ " شہود الشّہر " میں یہ بات شامل ہے۔ یہ اعجازِ قرآنی ہے کہ وہ ایسے الفاظ لاتا ہے' جن سے استدلال کر کے ہر منطقے اور خطے کے مسائل کے لئے حل نکالے جاسکتے ہیں۔

اب ایک اور اہم بات پر غور کیجئے کہ روزوں کے لئے کوئی سا بھی مہینہ چنا جا سکتا تھا۔ روزے جس مہینے میں بھی رکھے جاتے ضبطِ نفس کی مشق کا مقصد پورا ہو سکتا تھا۔ ان روزوں کے لئے ماہ رمضان کا انتخاب کیوں ہوا! اس کا جواب شروع ہی میں دے دیا گیا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ یہ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے' جس میں دن کے روزے کے ساتھ نبی اکرمؐ نے قیام اللیل کو تطوّع اور مجعول من اللہ قرار دیا ہے' جیسا کہ ہم حضرت سلمانؓ فارسی کی روایت میں پڑھ آئے ہیں۔ اس روایت کو تو امام بیہقیؒ اپنی کتاب " شعب الایمان " میں لائے ہیں۔ اب ذرا قیام اللیل کی اہمیت کو جاننے کے لئے اُمّت کے دو جلیل القدر آئمۂ حدیث امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کی وہ حدیث بھی سن لیجئے جو ان دونوں اماموںؒ نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے۔ کتب احادیث میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا جو مرتبہ و مقام ہے' مجھے اسے بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے' چونکہ ہر وہ شخص اس سے ناواقف اور لاعلم نہیں رہ سکتا جو دین سے تھوڑا بہت بھی شغف رکھتا ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

> مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (متفق علیہ)
>
> " جس نے روزے رکھے رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ' بخش دیئے گئے اس کے تمام سابقہ گناہ۔ اور جس نے (راتوں کو) قیام کیا رمضان میں ایمان و احتساب کے ساتھ بخش دیئے گئے اس کے جملہ سابقہ گناہ۔ " (بخاری و مسلم)

آپ نے دیکھا صحیحین کی اس حدیث کی رُو سے صیام اور قیام بالکل ہم وزن اور متوازی و مساوی ہو گئے! اس حدیث میں "قام" کا جو لفظ آیا ہے جس کا ترجمہ میں نے "راتوں کو قیام" کیا ہے تو اس کے لئے بطورِ دلیل میں آپ کو حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی حدیث سناتا ہوں۔ اس حدیث کو امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے "شعب الایمان" میں روایت کیا ہے۔ حضرت عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ

"روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سُنے گا!)۔ روزہ عرض کرے گا : اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما (اور اس کے ساتھ مغفرت و رحمت کا معاملہ فرما!)۔ اور قرآن کہے گا کہ : میں نے اس کو رات کے سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما (اور اس کے ساتھ بخشش اور عنایت کا معاملہ فرما!) چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندہ کے حق میں قبول فرمائی جائے گی (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا!) اور خاص مراحمِ خسروانہ سے اس کو نوازا جائے گا۔"

اس حدیثِ شریفہ سے بات بالکل منقح اور مبرہن ہو گئی کہ حضرت سلمان فارسیؓ کی حدیث میں جس قیام کا ذکر ہے، اس سے اصل مراد اور اس کا اصل مدّعا و منشاء یہ ہے کہ رمضان کی راتیں یا ان کا زیادہ سے زیادہ حصّہ قرآن مجید کے ساتھ بسر کیا جائے۔ یقیناً اب آپ لوگ سمجھ لیں گے کہ میری اس رائے کی بنیاد کیا ہے کہ پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہونی چاہئے۔ اس حدیث سے نہ صرف یہ مترشح ہوتا ہے کہ افضل عمل یہ ہے کہ رمضان کی

پوری رات قرآن مجید کے ساتھ گزرے' بلکہ اس حدیث کی رُو سے یہ بات وجوب کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ میں آپ حضرات کو دعوت دیتا ہوں کہ اس حدیثِ شریفہ کے الفاظ پر غور کیجئے۔ صیام و قیام کا ہم وزن اور متوازی معاملہ ہے کہ نہیں؟ روزے میں آپ کتنا وقت گزارتے ہیں' اس نقطۂ نظر سے صیام و قیام کے متوازی الفاظ پر پھر غور کیجئے۔ کیا الفاظ کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ جس طرح دن روزے کی حالت میں گزارا ہے' اُسی طرح رات قرآن کے ساتھ گزاری جائے...... قرآن کی تلاوت قیام یعنی صلوٰۃ کے ساتھ افضل ترین ہے اور بیٹھ کر اس کا مطالعہ بھی بہت بابرکت ہے۔ یہی معاملہ متفق علیہ روایت کا بھی ہے جو میں اس حدیث سے قبل آپ کو سنا چکا ہوں جس میں ایمان و احتساب کے ساتھ صیام و قیام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام پچھلے گناہوں کی مغفرت کی بشارت دی ہے۔ پس ان احادیث سے دین کی روح یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر واقعتاً اس ماہِ مبارک کی برکتوں اور عظمتوں سے استفادہ کا عزم اور ارادہ ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ دن کا روزہ ہو اور پوری پوری رات قرآن کے ساتھ بسر ہو۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے یہ نرمی رکھی ہے کہ اسے فرض نہیں کیا۔

شاید آپ کو بھی یہ بات معلوم ہو کہ ہمارے یہاں یہ روایت جاری رہی ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ کے متعلق میرے علم میں یہ ہے کہ ان کی حیات میں ان کی خانقاہ میں پورے رمضان المبارک میں تراویح میں دو دو اور تین تین ہزار آدمی شریک ہوتے تھے۔ معلوم نہیں ہو سکا کہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے یا نہیں۔ وہاں کا معمول یہ نہیں تھا' جس سے ہم واقف اور جس کے ہم عادی ہیں کہ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں بیس تراویح اور بعد کے تین وتر پڑھے اور فارغ ہو گئے۔ بلکہ اس خانقاہ میں معمول یہ تھا کہ ہر چار رکعاتِ تراویح کے بعد آدھا آدھا گھنٹہ' پون پون گھنٹہ وقفہ ہوتا تھا۔ جس میں لوگ مختلف اشغال میں مصروف ہو جاتے تھے۔ کچھ لوگ اذکار و اوراد میں لگ جاتے تھے۔ کچھ علیٰحدہ علیٰحدہ ٹکڑیوں میں بٹ جاتے تھے جن میں وعظ و نصیحت ہوتی تھی۔ کچھ لوگ قرآن مجید سے جو اگلی چار رکعتوں میں پڑھا جانا ہے' متن کی تلاوت کر رہے ہوتے۔ اس کے بعد پھر کھڑے ہو کر اگلی چار رکعتیں پڑھی جاتیں۔ ہر تراویح کے دوران پورے رمضان میں یہ دستور رہتا تھا اس طرح ساری رات قرآن مجید اور ذکر و وِرد میں گزرتی تھی۔ یہ اس نقشہ پر عمل کی ایک صورت ہے جو ان دو احادیث کے مطالعہ سے سامنے آتا ہے۔ اگر خلوص و اخلاص اور للّٰہیت کے ساتھ یہ عمل ہو اور جو لوگ یہ کام کریں تو شاید وہ ان بشارتوں کے مستحق بن جائیں جو ان دو حدیثوں میں ہمارے

سامنے آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان خوش بختوں میں شامل فرمائے جن کا ذکر ان احادیث میں ہے۔

اسی مقصد کے حصول کے لئے ہم نے یہ پروگرام بنایا ہے کہ رات کا بڑا حصہ اس عبادت میں صرف ہو اور چونکہ بدقسمتی سے ہماری مادری زبان عربی نہیں ہے لہٰذا ہم نے دورۂ ترجمۂ قرآن کو صلوٰۃ التراویح کے ساتھ ساتھ شامل کیا ہے تاکہ سامعین کا کسی نہ کسی حد تک قرآن مجید کے الفاظ کے معانی کے ساتھ ذہنی ربط قائم ہو سکے۔ اس طرح یہ پروگرام انشاء اللہ دو آتشہ اور نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمت اور توفیق دے کہ ہم اس عزم اور ارادے کو پورا کر سکیں اور دعا ہے کہ دن کے صیام اور رات کے قیام کی بدولت اللہ تعالیٰ صیام و قرآن کو قیامت کے دن ہمارا شفیع بنا دے۔

اب پھر آیت نمبر ۱۸۵ کی طرف رجوع کیجئے۔ رمضان کے روزے کے لئے حکم آیا کہ تم میں سے جو بھی اس مہینہ میں موجود ہو وہ لازماً روزہ رکھے۔ اب پورے ماہ کے روزوں کی فرضیت کا حکم آ گیا۔ ایامِ بیض کے روزوں کے لئے جو دو رعایتیں تھیں وہ برقرار ہیں۔

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ

"اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر لے"۔

لیکن وہ رعایت جو ایامِ بیض کے حکم کے ساتھ دی گئی تھی کہ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے' اس رعایت کو منسوخ اور ساقط کر دیا گیا۔ البتہ یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ اس رعایت کو قرآن مجید نے منسوخ و ساقط کیا ہے' لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص حالات میں اس کو قائم رکھا ہے' جیسے کوئی شخص بہت بوڑھا ہو گیا ہو اور اب اس میں روزہ رکھنے کی بالکل استطاعت ہی باقی نہ رہی ہو' کوئی دائمی مریض ہو جسے اب شفا کی کوئی توقع ہی نہ رہی ہو۔ مثلاً کوئی ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج میں ہے یا کوئی ذیابیطس کا دائمی مریض ہو گیا ہے اور اس کے صحت یاب ہونے کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی پر ایسے مختلف عوارض و امراض کو قیاس کر لیجئے۔ ایسے لوگوں کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رعایت برقرار رکھی ہے کہ وہ فی روزہ ایک مسکین کو دو وقت کا پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں۔ کھانے کی جگہ اناج کی مقدار اور چند دوسری شرائط کا بھی تعین کیا گیا ہے۔ الغرض خاص حالات میں اس رعایت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی رکھا ہے۔ اہلِ سنت کے نزدیک یہ بات اصولاً طے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اختیار ہے کہ آپؐ قرآن کے خاص کو عام اور قرآن کے عام کو خاص کر سکتے

ہیں۔ قرآن کے حکم پر اضافہ فرما سکتے ہیں اور قرآن کے حکم کی تبیین میں مزید حکم دے سکتے ہیں۔ یہ منکرین سنت کی گمراہی ہے کہ وہ حضورؐ کی سنت اور آپؐ کے احکام کو دین میں حجت نہیں مانتے۔ حالانکہ بعض احادیثِ صحیحہ میں بصراحت آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "یہ نہ سمجھنا کہ کھانے پینے کی صرف وہی چیزیں حرام ہیں جن کا قرآن میں ذکر ہے۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کی حرمت کا میں تمہیں حکم دے رہا ہوں"۔ یا جیسے قرآن مجید میں حکم آیا کہ ایک شخص بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں نہیں رکھ سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مزید عام کر دیا کہ پھوپھی بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں۔ اس وقت میں نے چند مثالیں اس لئے دی ہیں کہ اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ اشکال ہو کہ حضورؐ نے بوڑھوں اور دائمی مریضوں کے لئے رمضان کے روزے کے فدیہ کو برقرار کیسے رکھا، تو وہ اشکال رفع ہو جائے اور یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں شامل ہیں اور ان کا آپؐ کو حق حاصل ہے۔

آگے چلئے، ابھی آیت نمبر ۱۸۵ ہی کا سلسلہ جاری ہے، فرمایا یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ۔ "اللہ تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لئے دشواری و سختی اور تنگی نہیں چاہتا"۔ یعنی یہ ساری رعایتیں اور سہولتیں جو بیان ہوئیں اس سے مقصود اللہ کو بندوں کے حق میں آسانیاں فراہم کرنا ہے، نہ کہ دشواریاں، سختیاں اور تنگیاں۔ لہٰذا بیماری یا سفر کی وجہ سے جو روزے قضا ہو جائیں، بعد میں ان کی تکمیل کر لو۔ یہاں یہ بات سمجھ لیجئے کہ یہ نیکی اور تقویٰ کا غلط تصوّر ہے کہ ایک سو چار ڈگری کا بخار ہے روزہ چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ سفر پر جا رہے ہیں اور روزوں کا اہتمام و التزام بھی ہو رہا ہے۔ یہ درحقیقت اپنے اوپر تشدد ہے اور یہ بھی ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رعایتیں دی ہیں، آپ ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ اکثر لوگوں کو خواہ مخواہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ آج کل کا سفر بھی کون سا مشکل سفر ہے۔ حالانکہ آپ کو کیا پتہ کہ آپ کراچی سے لاہور کے لئے ریل میں چلے اور راستہ میں گاڑی کسی معمولی پلیٹ فارم پر پانچ چھ گھنٹے کے لئے رک گئی۔ اب آپ کیا کریں گے؟ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ آج کل کے سفر میں بھی کس طرح کی تکالیف آ سکتی ہیں۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے رعایت دی ہے تو کسی کا اس سے استفادہ کرنے کو ہرگز گھٹیا بات نہ سمجھئے بلکہ اس کے لئے اصول دے دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد مبارک ہے: یَسِّرُوْا . وَلَا تُعَسِّرُوْا ۔ (متفق علیہ : عن انس بن مالک)
"لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرو، سختی اور تنگی پیدا نہ کرو" ۔ صحیح احادیث میں آتا ہے کہ نبی اکرمؐ ایک سفر پر جا رہے تھے ۔ دیکھا کہ کچھ لوگ بیہوشی کے عالم میں پڑے ہوئے ہیں اور لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں ۔ دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا کہ یہ لوگ روزے سے تھے اور دھوپ کی تمازت سے ان پر غشی طاری ہو گئی ۔ تو حضورؐ نے فرمایا: لَیْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّیَامُ فِی السَّفَرِ ۔ (رواہ النسائی : عن ابی مالک الاشعری)
"سفر میں روزہ رکھنا نیکی کی بات نہیں ہے" ۔ یہ در حقیقت اپنے اوپر تشدد ہے جو اللہ کو پسند نہیں ہے ۔ جہاں رعایت دی ہے وہاں اس رعایت سے فائدہ اٹھایئے ۔ اس موقع پر ایک بات اور سمجھ لیجئے کہ بلاغتِ قرآنی کا یہ ایک عام اسلوب ہے ۔ لہٰذا آیت کے اس حصہ میں یُسر و عُسر کا معاملہ صرف صیام پر موقوف نہیں ہے ۔ ہر حکم کی تہہ میں بندوں کے حق میں رحمتیں اور مصلحتیں ہی ملیں گی ۔ جہاں کوئی دشواری یا معذوری پیش آئے وہاں کوئی نہ کوئی مناسب و متناسب رعایت یا رخصت رکھ دی گئی ہے ۔ اب آیت کی طرف پھر رجوع کیجئے اور دیکھئے کہ یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ کے فوراً بعد فرمایا: وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ یہ رعایتیں ہیں، لیکن چھوٹ نہیں ہے ۔ یہ اس لئے رکھی گئی ہیں تاکہ بعد میں تم تعداد پوری کر لو ۔ تعداد بہرحال پوری کرنی پڑے گی ۔ یہ نہیں ہے کہ آپ فدیہ دے کر روزہ رکھنے سے بچ جائیں ۔ یہاں صیغہ امر کا ہے ۔ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ ۔ یہاں حرف لام، لامِ تاکید و لزوم ہے ۔ یعنی لازم ہے کہ بعد میں تعداد پوری کرو..... آگے فرمایا وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ
"اور تاکہ تم اپنے رب کی تکبیر کرو ۔ اس کی کبریائی کا اظہار کرو اس پر کہ جو اس تعالیٰ نے تمہیں راہ راست دکھائی، جو ہدایت تمہیں عطا فرمائی اور تم شکر گزار بن کر رہو"

یہ تکبیر کیا ہے اور یہ شکر کیا ہے؟ وہ یہ کہ تم کو اندازہ ہو، آگہی ہو، شعور و ادراک ہو کہ یہ قرآن اللہ کی کتنی عظیم نعمت اور کتنی بڑی دولت ہے! اب یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اس نعمت اور دولت کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کب اور کیسے ہو گا ۔ یہ بات سطوت و عظمتِ قرآن سے متعلق ہے ہمارے غور و فکر کے لئے اس آیت میں ایک اہم نکتہ ہے ۔ اس مقام پر قرآن مجید کو "ھُدًی لِّلنَّاس" فرمایا گیا ہے ۔ یعنی اسے تمام انسانوں کے لئے ہدایت قرار دیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سورۃ البقرہ کے بالکل آغاز میں اسی قرآن کے متعلق فرمایا جاتا ہے ۔ ھُدًی

لِلْمُتَّقِيْنَ "یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے"۔ اب ان دونوں باتوں میں جو ربط و تعلق ہے' اسے سمجھنا ہو گا۔ قرآن مجید میں بذاتہٖ اور فی نفسہٖ تو ہدایت کا سامان پوری نوعِ انسانی کے لئے موجود ہے' لیکن اس سے ہدایت وہی حاصل کرے گا جس میں تقویٰ کی کچھ نہ کچھ رمق اور تلاشِ حق کی کچھ نہ کچھ طلب موجود ہو'یہ چیز ابوجہل میں نہیں تھی چنانچہ وہ خالی رہا۔ وہ قرآن کی ہدایت سے استفادہ نہیں کر سکا اور اس سے محروم رہا۔ ابولہب کیوں محروم رہا؟ اس لئے کہ اس میں بھی نہ تو تقویٰ کی کوئی رمق تھی اور نہ ہی خدا ترسی کا مادہ تھا۔ گویا ہدایت کی طلب ہی موجود نہیں تھی۔ تو جب تک طلب موجود نہ ہو کوئی استفادہ کیسے کرے! جیسے آپ کو معلوم ہے کہ جب تک پیاس نہ لگے' اس وقت تک آپ کو پانی کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں پیاس لگی ہوئی ہو اور پھر پانی کا ایک گھونٹ ملے تو معلوم ہو گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ اگر پیاس کے باعث جان پر بنی ہو تو بڑے سے بڑا بادشاہ بھی ایک گھونٹ پانی کے عوض اپنی پوری سلطنت دینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ شدید بھوک لگی ہوئی ہو تو سوکھی روٹی بھی پراٹھا معلوم ہو گی۔ لیکن اگر بھوک نہیں ہے تو آپ چاہے سامنے شیرمال رکھ دیجئے' اس کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہو گی ـــــــ پس معلوم ہوا کہ جب تک طلب نہ ہو اس وقت تک کسی شے کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ طلب پیدا کرنے کے لئے تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔ اس روزے سے تمہارے اندر تقویٰ ابھرے گا۔ اب اس تقویٰ کی پونجی کو لے کر رات کو اپنے رب کے حضور کھڑے ہو جاؤ اور اب تمہارے قلب پر اس قرآن کا نزول ہو۔ یہ بارانِ رحمت' یہ بارشِ جان افزا جب تم پر برسے گی تب تم کو احساس ہو گا کہ یہ کتنی عظیم نعمت ہے' کتنی بڑی دولت ہے۔ اور اللہ کا کتنا بڑا انعام اور احسان ہے کہ اس نے ہمیں یہ کلام پاک عطا فرمایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ ہماری اصوات اور حروف و الفاظ میں مصحف کے اندر لکھی ہوئی اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام ہمارے سامنے ہے۔ اس قرآن کے ذریعہ سے ہمیں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ وہ ہم سے کلام فرما رہا ہوتا ہے اور ہم اس سے مناجات کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جو بڑے پیارے اور دل نشین الفاظ میں علامہ اقبال نے ان اشعار میں کہی ہے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ‌‌‌ ‌‌ ‌ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست اُو ‌ ‌ ‌ زندہ و پائندہ و گویاست اُو
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود ‌ ‌ ‌ جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

(مفہوم) ...... "اس کتاب کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے،
اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!
یہ ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا کلام ہے۔ لہٰذا اسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی
اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی۔
یہ کتابِ حکیم جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے اندر ایک
انقلاب برپا ہو جاتا ہے اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لئے
پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آجاتی ہے!"

آپ کو اس قرآن عظیم کی عظمت کا اگر کچھ اندازہ کرنا ہو تو اس تمثیل پر غور کیجئے جو سورۃ الحشر میں بیان ہوئی ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ "اگر ہم نے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتار دیا ہوتا (اور انسان کی طرح اس میں سمجھنے کا جوہر رکھا ہوتا) تو تم دیکھتے کہ وہ جھک جاتا اور پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے"۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ "اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ (اپنے رویّہ اور اپنی حالت پر) غور و فکر کریں"۔ اب دیکھئے وہ مساوات (EQUATION) مکمل ہو گئی کہ قرآن مجید سے استفادہ کے لئے شرطِ لازم بھی تقویٰ ہے اور روزے کا مقصد بھی تقویٰ ہے۔ لہٰذا روزے سے تقویٰ حاصل کیجئے اور رات کو قرآن کی بارش اپنے اوپر برسائیے۔ تاکہ آپ کے اندر جو آپ کی روح ملکوتی ہے وہ اس سے نشوونما حاصل کرے۔ وہ روح جو اللہ نے پھونکی تھی۔ بفحوائے الفاظ قرآنی "وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِىْ (الحجر ۲۹)"۔ پس ہمارا ایک حیوانی وجود ہے اور ایک روحانی وجود ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ آدمی زادہ طرفہ معجون است از فرشتہ سرشتہ وَز حیواں
اس روحانی وجود سے ہم غافل رہتے ہیں۔ جبکہ حیوانی وجود کی بابت ہمیں ہر شے کی خبر ہے۔ پیٹ کھانے کو مانگتا ہے تو ہم دوڑ دھوپ کرتے ہیں۔ کوئی اور تقاضا ابھرتا ہے تو اس کو پورا کرنے کے لئے تگ و دو کرتے ہیں۔ لیکن روح سے غفلت رہتی ہے، وہ بے چاری سسکتی رہتی ہے، کمزور اور لاغر ہوتے ہوتے بے جان ہو جاتی ہے۔ اس رمضان نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ عام دنوں کے عمل کو پلٹ دیا۔ یعنی اس حیوانی وجود یعنی جسم کے تقاضوں کو ذرا دباؤ، ان میں کمی کرو، دن میں بطن و فرج کے تقاضوں پر پابندیاں اور قدغنیں لگاؤ۔ رویّہ، اخلاق اور

معاملات میں خاص طور پر چوکس اور چوکنے رہو۔ ان کے ضمن میں دین کے اوامر و نواہی پر شعوری طور پر عمل پیرا ہو۔ اللہ نے آسودگی اور خوشحالی دی ہے تو ہاتھ کو مزید کشادہ کرو۔ حاجت مندوں، مسکینوں اور فقراء کے زیادہ سے زیادہ کام آؤ تاکہ حیوانی جبلتوں کا بوجھ روح پر سے کم ہو۔ پھر روح کی غذا کی طرف شعوری طور پر متوجہ ہو جاؤ اور وہ روحانی غذا کلامِ ربّانی ہے۔ بات کو مزید سمجھ لیجئے، ہمارا جسم کہاں سے بنا؟ مٹی سے! مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ یہ جسد خاکی زمین سے آیا ہے۔ چنانچہ اس کی غذا بھی اُسی سے حاصل ہوتی ہے۔ ہماری تمام ضروریاتِ زندگی کی فراہمی زمین سے ہوتی ہے۔ بطور مثال غذا اور خوراک کو لے لیجئے، وہ کہاں سے آتی ہے۔ گندم اور دوسری اجناس کہاں سے آتی ہیں! آپ جو گوشت کھاتے ہیں، وہ کہاں سے بنا ہے! اس بکری نے بھی تو زمینی نباتات کھائی ہیں جن سے گوشت بنا ہے۔ یہی دودھ کا حال ہے۔ الغرض ہمارے وجودِ حیوانی کے لئے ساری ضروریات وہیں سے فراہم ہوتی ہیں جہاں سے ہمارا یہ وجودِ حیوانی خود آیا ہے۔ اور جو ہماری روحِ ربّانی ہے، روحِ ملکوتی ہے یہ اس عالمِ خاکی کی شے نہیں ہے۔ یہ عالمِ ناسوت سے متعلق نہیں ہے۔ یہ عالمِ علوی سے ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" یہ روح عالمِ ملکوت سے آئی ہے، اُسی کی طرف اسے لوٹنا ہے۔ یہ روح امرِ رب ہے۔ "قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" اور امرِ رب کی تقویت کا سامان کلامِ رب ہے۔ وہ بھی وہیں سے آیا ہے۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عظمت و مقامِ قرآن کو اور اس کے حبل اللہ ہونے کی حیثیت کو بیان فرمایا ہے۔ معجم طبرانی کبیر میں حضرت جبیرؓ ابنِ مطعم سے روایت ہے کہ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرۂ مبارک سے بر آمد ہوئے، آپؐ نے دیکھا کہ مسجد نبوی کے ایک کونے میں کچھ لوگ بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں اور پڑھا رہے ہیں۔ تدریس و تدرّس کا سلسلہ جاری ہے۔ حضورؐ کے چہرۂ انور پر بشاشت اور خوشی کے آثار ظاہر ہوئے۔ حضورؐ ان کے پاس چل کر تشریف لے گئے اور ان صحابۂ کرامؓ سے سوال کیا:
اَلَيْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَآءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ "کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں؟ اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟"۔
حضرت جبیرؓ آگے روایت کرتے ہیں کہ قُلْنَا بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ "ہم

نے عرض کیا' یقیناً ایسا ہی ہے 'اے اللہ کے رسول'' ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کی اس تصدیق وشہادت کے بعد فرمایا۔ فَاَبْشِرُوْا فَاِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُہٗ بِیَدِ اللّٰہِ وَطَرَفُہٗ بِاَیْدِیْکُمْ ''پھر تو خوشیاں مناؤ' اس لئے کہ اس قرآن کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے'' ۔ آگے ارشاد ہوا: فَتَمَسَّکُوْا بِہٖ فَاِنَّکُمْ لَنْ تَھْلِکُوْا وَلَنْ تُضِلُّوْا بَعْدَہٗ اَبَدًا۔ ''پس اسے مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھو' اگر تم نے ایسا کیا تو اس کے بعد تم نہ کبھی ہلاک ہو گے اور نہ کبھی گمراہ'' ۔ اس حدیث شریف میں گویا حبل اللہ کی شرح موجود ہے کہ یہ قرآن حکیم ہے۔ اب اگر اس حدیث کے ساتھ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک مرفوع حدیث اور شامل کر لی جائے تو قرآن مجید کے حبل اللہ ہونے کی بات بالکل واضح اور مبرہن ہو جائے گی۔ وہ روایت کرتے ہیں: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے'' ۔

بہرحال اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ قرآن مجید' یہ کلام ربانی روح کے تغذیہ وتقویت کا سبب ہے۔ اب جبکہ اس روح کو اس کی اصل غذا ملے گی تو وہ اس سے از سرِ نو قوی اور توانا ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو گی اور ''اپنے مرکز کی طرف پرواز'' کا نقشہ پیش کرے گی تو تمہارے قلب کی گہرائیوں سے اللہ کے شکر کا چشمہ ابل پڑے گا۔ پھر اس شکر کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا بڑا پیارا بیان اگلی آیت نمبر (۱۸۶) میں ہے۔ فرمایا: وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ''اور اے نبی! جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں (تو آپؐ کہہ دیجئے) میں نزدیک ہی ہوں'' ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال وجواب ایک علیحدہ سی بات ہے۔ صیام کے احکام کے ضمن میں کیسے آ گئی! لیکن غور کیجئے تو صاف سمجھ میں آ جائے گا کہ جب صیام وقیام کے نتیجے میں ایک بندۂ مومن کی روح کو جلا ملی اور جب اس کے قلب میں شکر کا جذبہ ابھرا تو اس کا عین تقاضا ہے کہ تعلق مع اللہ کے جوش وولولہ میں شدت پیدا ہو۔ طبیعت میں اللہ سے مانگنے' اسی سے سوال کرنے' اسی کے آگے ہاتھ پھیلانے' اس کے سامنے گڑگڑانے' اس سے استغفار کرنے' اس سے عفو ومغفرت طلب کرنے' اس کی طرف رجوع کرنے اور اپنی خطاؤں' معصیتوں اور لغزشوں سے توبہ کرنے

کے جذبات موجزن ہوں۔ گویا اب بندہ اللہ کی طرف ہمہ تن اور پوری یک سوئی سے متوجہ ہوا۔ اب فطری طور پر دل میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ میرا رب مجھ سے کتنا دور ہے؟۔

لہٰذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے کہ اے نبی جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کریں تو میری طرف سے ان سے کہہ دیجئے۔ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط۔ "کہ میں نزدیک ہی ہوں......" یہ ہے ایک بندۂ مومن کے ہمہ تن متوجہ ہونے کا نتیجہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوب نبیؐ کی زبانی کہ جن کو مشرکین و کفارِ مکہ تک الصادق اور الامین جانتے اور مانتے تھے، اہل ایمان کو اپنی قربت کی یقین دہانی کرا رہا ہے۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری اور بیماری ہماری غفلت ہے۔ ہماری توجہ اللہ کی طرف نہیں بلکہ دنیا کی طرف اور اپنے نفس کی طرف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جانا ہی درحقیقت ہماری ہدایت کا اصل راز ہے۔ جب روح کو کلامِ ربانی سے اَز سرِ نو تقویت حاصل ہوتی ہے اور وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اسے بہت قریب پاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط۔ "اے نبی' جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو ان کو بتا دیجئے کہ میں قریب ہوں' کہیں دور نہیں ہوں[1]...... اپنے رب کو ڈھونڈنے کے لئے اس سے مناجات کرنے کے لئے اس سے راز و نیاز کرنے کے لئے' اس سے عرض و معروض کرنے کے لئے' اس سے طلب کرنے کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہے' وہ بالکل قریب ہے۔ اور اگلی بات فرمائی۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب مجھے پکارے" ...... یہ تو تم ہو کہ ہماری طرف رخ نہیں کرتے اور متوجہ نہیں ہوتے۔۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں!
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں!

پھر یہ تو ہر شب کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سمائے دنیا پر

---

[1] "اللہ تعالیٰ بندوں سے کتنا قریب ہے! اس کے ضمن میں سورۂ قٓ (جو مکی سورۃ ہے) کی آیت نمبر ۱۶ کے یہ الفاظ مبارکہ "وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ○" اور اللہ کی معیت کے لئے سورۃ الحدید (جو مدنی ہے) کی آیت نمبر ۴ کے یہ الفاظ مبارکہ "وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ" پیش نظر رہیں۔

نزول فرماتے ہیں اور پھر ایک صدا ہوتی ہے' ندا لگتی ہے۔
هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَيُعْطٰى؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ فَيُسْتَجَابُ لَهٗ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَيُغْفَرُ لَهٗ؟..... "ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی پکارنے والا کہ اس کی دعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی گناہوں سے مغفرت چاہنے والا کہ اس کی مغفرت کی جائے۔" (رواہ مسلم۔ عن ابی ہریرہؓ)..... تو ہم اللہ سے غائب ہیں وہ تو غائب نہیں۔
میں نے دسویں جماعت میں عربی کے کورس میں ایک نظم پڑھی تھی' اس کے چند اشعار بڑے پیارے ہیں:

أَغِيبُ وَذُو اللَّطَائِفِ لَا يَغِيبُ ۔۔۔ وَأَرْجُوهُ رَجَاءً لَا يَخِيبُ
كَرِيمٌ مُنْعِمٌ بَرٌّ لَطِيفٌ ۔۔۔ جَمِيلُ السِّتْرِ لِلدَّاعِي مُجِيبُ
فَيَا مَلِكَ الْمُلُوكِ أَقِلْ عِثَارِي ۔۔۔ فَإِنِّي عَنْكَ أَنْأَتْنِي الذُّنُوبُ

"میں غائب ہو جاتا ہوں وہ صاحب الطافِ کرم تو غائب نہیں ہوتا' میں نے اس سے ایسی آس لگا رکھی ہے جو یاس میں نہیں بدلتی۔ وہ کریم ہے' عطا کرنے والا ہے' نہایت مہربان ہے' لطیف ہے' بڑی خوبصورتی سے پردہ پوشی کرنے والا ہے' پکارنے والے کی دعا قبول کرنے والا ہے۔ پس اے بادشاہوں کے بادشاہ! میری لغزشوں سے در گزر فرما' مجھے تو میرے گناہوں نے تجھ سے دور کر دیا!"

اللہ سے دُوری کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ وہ تو ہر جگہ ہر آن موجود ہے۔ ہماری توجہات کسی اور طرف ہیں۔ آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ○ "میں نے متوجہ کر لیا ہے اپنے چہرے کو اسی (اللہ) کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین۔ سب سے یکسو ہو کر اور میں نہیں ہوں مشرکوں میں سے۔" یہ دوسری بات ہے کہ یہ الفاظ کہہ دینے کے باوجود اللہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ توجہ اپنے حساب کتاب میں رہتی ہے' دماغ اپنے دنیوی معاملات ہی کی چکی میں پستا رہتا ہے۔
اس آیۂ مبارکہ کی طرف دوبارہ توجہ فرمائیے: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ..... اب رمضان و قرآن اور صیام و قیام' ان سب کا جو مشترک نتیجہ نکلے گا' وہ یہ ہے کہ تمہاری روح بیدار ہوگی' تقویت پائے گی اور اللہ کی طرف متوجہ ہوگی۔ تو اس کے لئے

خوشخبری ہے کہ میں کہیں دور نہیں ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کے لئے کہیں بیابانوں میں جانے کی اور پہاڑوں کی غاروں میں تپسّیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو تمہارے بالکل قریب ہی ہوں گویا۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

تمام قدیم مذاہب میں اللہ کے ساتھ بندوں کے ربط و تعلق کا مسئلہ ہمیشہ ایک لاینحل گتھی بنا رہا ہے۔ اکثر مذہبوں نے تو اللہ کو اتنا دور اور بندوں سے اتنا بعید فرض کر لیا ہے کہ اس تک براہِ راست رسائی گویا ممکن ہی نہیں چنانچہ ایسے تمام مذاہب نے اللہ کے دربار تک رسائی کیلئے بے شمار واسطے اور وسیلے گھڑ لئے ہیں اور ناقابل فہم مشرکانہ نظام بنا لئے ہیں۔ قرآن نے اس وہم کو دور کر کے صاف صاف بتا دیا ہے کہ تم جسے دور سمجھ رہے ہو' وہ دور نہیں ہے' تمہارے بالکل قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کیلئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے' جب چاہو اور جہاں چاہو اس سے ہم کلام ہو جاؤ۔ اقبال نے اپنی ایک نظم میں نقشہ کھینچا ہے کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ یہ جو میرے دربان بن کر بیٹھ گئے ہیں کہ ان کو خوش کئے بغیر مجھ تک رسائی نہیں ہو سکتی' یہ سب ڈھکوسلہ ہے۔ ان کو ہٹا دو' میرا دربار ہر ایک کیلئے ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ یہاں کسی کیلئے کوئی قدغن نہیں' خلوص و اخلاص کے ساتھ جب اور جہاں چاہو مجھے پکارو اور مجھ سے جو چاہو مانگو۔ علامہ کا شعر ہے:

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

یہ نہیں ہے کہ تمہاری دعا کسی پوپ' کسی پادری' کسی پروہت' کسی پجاری' کسی پنڈت یا کسی پیر ہی کی وساطت سے مجھ تک پہنچ سکتی ہے! دیکھئے عجب اتفاق ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان حائل ہونے والے سب مہاپرشوں کے نام "پ" ہی سے شروع ہوتے ہیں تو ان سب خود ساختہ واسطوں اور وسیلوں کو درمیان میں سے ہٹا دو۔ اللہ کا ربط و تعلق بندے کے ساتھ براہِ راست ہے۔ یہاں کسی واسطے کی ضرورت ہے ہی نہیں! اس تعلق کے مابین حجاب ہم خود ہیں۔ ہماری حرام خوری ہے جو حجاب بنی ہوئی ہے۔ ہماری غفلتیں ہیں جو حجاب بنی ہوئی ہیں۔ اپنی غفلتوں کا پردہ چاک کیجئے اور آج اللہ کی جناب میں توبہ کیجئے! وہ ہر آن' ہر لحظہ تمہاری دعا کو سننے والا ہے۔ وہ ہمیشہ ہی قریب رہتا ہے اور رمضان میں تو اس عموم میں خصوص پیدا ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ آیتِ مبارکہ کے اس حصہ میں ہمارے لئے کتنی بشارت'

تسلی، تسکین اور راحت کا سامان رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں انسان کیلئے کتنی آزادی کا پیغام ہے! آپ کو معلوم ہے کہ دنیا میں انسانی حقوق کے منشور (MAGNACHARTA) کی بہت دھوم ہے، جبکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا میگنا کارٹا اور کوئی نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق، اس سے فریاد، اس سے استغاثہ، اس سے حاجت روائی کی درخواست میں کوئی "پ" سے شروع ہونے والا، جن کی فہرست میں گنوا چکا ہوں، حائل نہیں ہے۔

میں صوفیائے کرام کے سلسلۂ ارشاد کی نفی نہیں کر رہا۔ کوئی خداترس مرشد ہو، جو قرآن و سنت کی روشنی میں تزکیۂ نفس کرنے اور صحیح طور پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے صراط مستقیم پر چلانے والا ہو تو کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کی قرآنی ہدایت کے مطابق ایسے مرشدین سے ضرور فیض حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن ہمارے یہاں پیری مریدی کا جو عام اور غلط تصور رائج ہے اس کے اعتبار سے میں اس کی نفی کر رہا ہوں۔

یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ہمیں خوش خبری دی جا رہی ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ آپ کو معلوم ہو گا کہ دعا کیلئے وضو بھی شرط نہیں، آپ حالات ناپاکی میں بھی دعا مانگ سکتے ہیں۔ دعا پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ آپ ہر حال میں اپنے رب کے حضور دستِ سوال دراز کر سکتے ہیں۔

البتہ ایک بات ملحوظ رہے۔ آیت کے اس حصہ میں پکارنے والے کی ہر پکار سننے اور جواب دینے کا ذکر ہے۔ یہاں یہ شبہ لاحق نہ ہو کہ ہر دعا کے قبول کرنے کا حتمی وعدہ بھی ہے۔ بیچارے بندے کو کیا خبر کہ وہ جو دنیوی چیز اللہ سے مانگ رہا ہے، اس میں اس کیلئے خیر ہے یا شر! کون سی شے اس کے حق میں مفید ہو گی اور کون سی مضر! دعائیں وہی قبول ہوں گی جو اللہ کی رحمت و حکمتِ مطلقہ کے منافی نہیں ہوں گی۔ لیکن نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خوش خبری دی ہے کہ بندۂ مومن کی کوئی دعا نہ رد ہوتی ہے، نہ ضائع۔ وہ جس چیز کیلئے دعا کرتا ہے اگر وہ اللہ تعالیٰ کے علمِ کاملہ میں بندے کے حق میں مفید ہوتی ہے تو اسے وہی عطا کر دی جاتی ہے۔ یا پھر اس سے بہتر چیز عنایت ہو جاتی ہے۔ یا پھر اللہ رب الکریم اس دعا کو بندے کے حق میں نیکی قرار دے کر اس کے اجر و ثواب کو آخرت کے لئے محفوظ فرما لیتا ہے۔ اس دعا کے عوض اس کے نامہ اعمال میں سے بہت سی برائیوں کے داغ دھو دیئے جاتے ہیں۔ الغرض بندۂ مومن کی کوئی دعا ضائع نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی صورت میں قبول ہوتی ہے۔

اب اس آیت مبارکہ کا اگلا حصہ پڑھئے۔ اس میں دو شرطوں کا بیان آرہا ہے۔ پہلی یہ کہ۔ "فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي" اور دوسری یہ کہ "وَلْيُؤْمِنُوا بِي"۔ ان دونوں کو سمجھنا ہو گا۔ پہلی شرط میں فرمایا کہ میرے بندوں کو بھی چاہئے کہ میرا حکم مانیں، میری پکار پر لبیک کہیں۔ میں جب پکاروں فوراً حاضر ہو جائیں، جس چیز کا حکم دوں بجالائیں، جس کام سے اور جس چیز سے روک دوں، رک جائیں۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي "بس انہیں بھی چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں"۔ یکطرفہ معاملہ (ONEWAY TRAFFIC) نہیں چلے گا۔ آپ کو قرآن مجید میں یہ بات متعدد جگہ ملے گی کہ اللہ تعالیٰ یک طرفہ معاملہ نہیں فرماتا۔ جیسے سورۃ البقرہ میں فرمایا أَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ "اور تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے"۔ اور جیسے سورۂ ابراہیم میں فرمایا لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ "اگر تم ہمارا شکر کرو گے تو ہم تمہیں اور زیادہ نعمتیں دیں گے اور اگر تم نے ناشکری کی تو پھر ہمارا عذاب بھی بڑا سخت ہو گا"۔

اور جیسے سورۂ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں فرمایا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ "اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا"۔ تم اللہ (کے دین) کی مدد نہ کرو بلکہ اس کے دشمنوں سے سازباز کرو، اس کے باغیوں سے یارانہ گانٹھو اور چاہو کہ اللہ تمہاری مدد کرے تو یہ نہیں ہو گا!۔ ہاں اس کا ارشاد ہے کہ اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ "فاذکرونی اذکرکم"۔ اور ایک حدیثِ قدسی میں تو بڑے پیارے الفاظ آتے ہیں کہ "اگر میرا بندہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ اور اگر میرا بندہ میرا ذکر محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے کہیں اعلیٰ محفل میں، ملا اعلیٰ، ملائکہ مقربین کی محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں"۔ تو دوطرفہ معاملہ ہو گا۔ اسی طریقہ سے اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری دعائیں قبول کروں تو تم بھی میری پکار پر لبیک کہو۔ ولیؤمنوابی۔ "اور انہیں چاہئے کہ مجھ پر ایمان پختہ رکھیں" اس آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ مبارکہ پر۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ "تاکہ ان پر فوز و فلاح اور رشد و ہدایت کی راہیں کھل جائیں اور یہ ان راہوں پر گامزن ہو جائیں"۔

اگلی آیت (نمبر ۱۸۷) میں روزے سے متعلق احکام ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ابتدائی حکم آیا تھا کہ "تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا"۔ اب شریعت موسوی میں سحری کا کوئی نظام نہیں تھا۔ رات کو سو جاؤ تو روزہ شروع۔ اور روزے کے دن کے علاوہ شب میں بھی تعلقِ زن و شو کی اجازت نہیں تھی۔ یہ دو شرطیں بڑی کڑی تھیں۔ صحابہ کرامؓ کو یہ مغالطہ تھا کہ شاید یہ پابندی ہمارے یہاں بھی ہے۔ لیکن چونکہ کوئی واضح حکم بھی نہیں تھا لہٰذا کوئی نہ کوئی رات کو بیوی کے ساتھ ہم بستری کر بیٹھتا تھا' لیکن دلوں میں یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ہم نے غلط کام کیا ہے' گناہ کا ارتکاب کر لیا ہے۔
اس پس منظر میں احکام دے دیئے گئے کہ اس اعتبار سے تمہارا روزہ یہود کے روزے سے مختلف ہے۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ "حلال کیا گیا تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ہم بستری اور ان سے تعلق قائم کرنا"۔
هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ "وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو"۔ جیسے انسان کے لباس اور اس کے جسم کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوتی۔ ایسے ہی میاں بیوی کے درمیان' جیسا کہ ہم جانتے ہیں' کوئی پردہ نہیں۔ یہ بڑے لطیف انداز میں تعلق زن و شو کی تعبیر ہے۔
آگے ارشاد فرمایا عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ "اللہ خوب جانتا ہے کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے"۔ یہ بڑا بلیغ پیرایہ ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص بکری کا گوشت کھا رہا ہے' لیکن اسے شک ہے کہ شاید یہ سؤر کا ہے' تو وہ گناہ گار ہو گیا۔ کیونکہ جیسے ہی اسے شک ہوا تھا کہ یہ خنزیر کا گوشت ہے' اسے رک جانا چاہئے تھا۔ اگر وہ اس شبہ کے باوجود کھا رہا ہے تو اپنے آپ سے خیانت کر رہا ہے۔ مفہوم یہ ہوا کہ اگرچہ فی نفسہٖ روزے کی شب میں تعلق زن و شو جائز تھا لیکن جس کا یہ خیال تھا کہ یہ ناجائز ہے' پھر بھی کر بیٹھا' وہ تو گناہ گار ہو گیا۔ اب تسلی دی جا رہی ہے کہ۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ اس حصہ میں اللہ کے فضل و کرم کا بیان ہے۔ "اس نے تم پر نظرِ عنایت کی اور تمہاری خطا کو معاف کر دیا"۔ آگے قانون واضح فرما دیا کہ یہ حرام اور ناجائز ہے ہی نہیں۔ تم خواہ مخواہ کے شک اور وہم میں مبتلا رہے۔ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ "اب تم (روزے کی راتوں کو بلا روک ٹوک) مباشرت کر سکتے ہو اور (خواہش کرو' حاصل کرو) تلاش کرو جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دیا ہے"۔ اس سے مراد اولاد بھی ہے جو اللہ تعالیٰ اس

لق زن و شو کے نتیجہ میں عطا فرماتا ہے۔ اور تسکین بھی ہے لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا یہ بھی اللہ کی
طا کردہ نعمت ہے جو اللہ نے انسان کیلئے رکھی ہے۔ دوسری رعایت یہ ہے کہ۔ وَكُلُوْا
اشْرَبُوْا "اور کھاؤ پیو"۔ رات کے وقت کھانے پینے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ البتہ ایک حد
ر رہے' وہ ہے۔ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ
مِنَ الْفَجْرِ ۔ "یہاں تک کہ رات کی کالی دھاری سے صبح کی سفید دھاری تم کو صاف
ھائی دینے لگے' ممیّز ہو جائے"۔ یہ وہ وقت ہے جسے ہم پو پھٹنا کہتے ہیں۔ جب ایک لکیر سی
رق میں نظر آتی ہے۔ یہ گویا طلوع فجر ہے۔ اس وقت تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔ یہ
ری ہے جس کی صرف اجازت ہی نہیں بلکہ تاکید ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
امی ہے۔ تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِيْهِ بَرَكَةً "سحری ضرور کیا کرو اس لئے کہ اس میں
ی برکت ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین در حقیقت یہ
ری ہی مابہ الامتیاز شے ہے پھر اس میں بڑی وسعت رکھی گئی ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی مسلمان
ی کھا رہا ہے۔ ایک نوالہ اس کے منہ میں ہے اور ایک ہاتھ میں ہے اور شک ہو گیا ہے کہ
ید پو پھٹ گئی ہے' تب بھی وہ اس برکت کو پورا کر لے۔ اس میں تشدّد اور سختی سے منع کیا گیا
۔ گویا اس طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا
يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ کی تبیین اور تشریح فرما رہے ہیں۔ آگے فرمایا۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ
اِلَى الَّيْلِ "پھر روزے کو پورا کرو رات تک" اہلِ سنّت کے تمام فقہی مکاتب کے
زدیک غروب آفتاب کے معاً بعد رات شروع ہو جاتی ہے۔ یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سنت سے ثابت ہے۔ اس بارے میں احادیث شریفہ میں ہمیں حضورؐ کی یہ تاکید ملتی ہے کہ
طار میں جلدی کیا کرو' اس میں برکت ہے۔ اس میں تاخیر مناسب نہیں ہے۔ اہل تشیّع
ے یہاں معاملہ مختلف ہے لیکن ہمارے لئے صحیح عمل یہی ہے کہ سنت کے مطابق غروب
فتاب کے فوراً بعد افطار کر لیا جائے۔ اس آیت کے آخری حصے میں حکم آیا کہ۔ وَلَا
تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ "اور اگر تم مسجدوں میں اعتکاف کی
ت میں ہو تو رات کو بھی تعلقِ زن و شو کی اجازت نہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف ماہ
مضان المبارک کی ایک خصوصی عبادت ہے۔ حضورؐ رمضان کے آخری عشرے میں
عتکاف فرمایا کرتے تھے۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور بڑی عظیم نفلی عبادت
ہے اس کے تفصیلی احکام بھی سنت ہی سے ملتے ہیں۔ اعتکاف کی برکات اور حکمتوں

کے متعلق موقع ملا اور اللہ کو منظور ہوا تو پھر کبھی تفصیل سے کچھ عرض کروں گا۔ یہاں حالت
اعتکاف... مباشرت کی قطعی ممانعت وارد ہو گئی۔ البتہ بیوی مسجد میں آسکتی ہے گفتگو کر سکتی ہے مشورہ کر
سکتی ہے۔ آگے فرمایا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا۔ "یہ اللہ کی مقرر کردہ
حدود ہیں' ان کے قریب بھی مت جانا" ۔ تجاوز کرنا تو دور کی بات ہے' وہ تو کھلی معصیت
ہے۔ فرمایا جارہا ہے کہ حدود کے قریب بھی نہ پھٹکنا' ذرا فاصلے پر ہی رہنا۔ اس بات کو نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت بلیغ اسلوب سے سمجھایا اور واضح فرمایا ہے

کہ ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے۔ اللہ نے جو چیزیں حرام کر دی ہیں وہ اس کی
محفوظ چراگاہ کے مانند ہیں۔ کوئی چرواہا اپنے گلّے کو اگر آخری حد تک لے جائے گا تو کبھی کوئی
بھیڑ بکری چھلانگ لگائے گی اور اس ممنوعہ چراگاہ میں داخل ہو جائے گی۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ کچھ
فاصلے پر رہو۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ
اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ "اس طرح اللہ اپنی آیات کی لوگوں کے لئے
وضاحت فرماتا ہے' اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے' تاکہ وہ اس کے احکام کی خلاف
ورزی سے بچیں۔ تقویٰ اختیار کریں" ...... یہاں اس رکوع کی پانچویں آیت ختم ہوئی۔ پہلی
آیت ختم ہوئی تھی ان الفاظ پر لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ یہ آیت ختم ہوتی ہے لَعَلَّهُمْ
يَتَّقُوْنَ ○ پر۔ اس سے بھی آپ رمضان کے پورے پروگرام کا تقویٰ سے جو گہرا تعلق
ہے اس کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

اس رکوع کی آخری آیت کا بظاہر رمضان کے روزوں سے تعلق معلوم نہیں ہوتا' لیکن
حقیقت میں بہت گہرا تعلق ہے۔ اس لئے کہ دو مقامات پر بڑے شدومد سے روزوں کی غایت
تقویٰ بیان فرمائی گئی ہے۔ اس کے متعلق سوچنا پڑے گا کہ اس تقویٰ کا "معیار" کیا ہے اور
اس کا عملی ظہور کس طور سے ہو گا! کیا تقویٰ کا تعلق کسی خاص قسم کی وضع قطع سے ہے! کیا
تقویٰ کسی خاص شکل وصورت کا نام ہے کہ داڑھی رکھ لی ہے' وہ بھی "شرعی مقدار" کے
مطابق؟ اور ازار ٹخنوں سے اونچا پہننے کا اہتمام ہے؟ تو کیا اس طرح تقویٰ کے تقاضے پورے
ہو گئے؟ معاذ اللہ ان چیزوں کی نفی نہیں ہے۔ جو چیز بھی سنت کے مطابق ہے' وہ اپنی جگہ
نورانی ہے اور یقیناً ہمارے لئے قابل قدر ہے۔ میں نے یہ اندازِ گفتگو آپ لوگوں کو چونکانے
کے لئے اختیار کیا ہے چونکہ اصل تقویٰ یہ چیزیں نہیں ہیں۔ اصل تقویٰ کیا ہے؟ وہ

اکلِ حلال! اکلِ حلال ہے تو تقویٰ ہے' یہ نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے۔ چاہے کتنی ہی شکل و صورت اور وضع قطع ان چیزوں کے مطابق بنالی گئی ہو جن کو عام طور پر "تقویٰ" سمجھا جاتا ہے وہ اصل تقویٰ نہیں ہے۔ عبادتوں کے کتنے ہی ڈھیر لگالئے گئے ہوں اور ہر سال عمرے پر عمرے اور حج پر حج کئے جا رہے ہوں تو یہ بھی اصل تقویٰ نہیں ہے۔ یہ اہم بات سمجھنے کی ہے۔ میں پہلے آپ حضرات کو بتا چکا ہوں کہ روزے میں آپ حلال چیزیں کیوں نہیں کھاتے! تعلقِ زن و شو قائم کیوں نہیں کرتے! اس لئے کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔ لیکن روزے کی حالت میں آپ دوسرے نواہیٔ شریعت کا ارتکاب کر رہے ہیں تو آپ نے درحقیقت روزہ رکھا ہی نہیں۔ یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا۔ یہ فتویٰ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ حضورؐ نے فرمایا:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ۔ (بخاری' ابو داؤد' ترمذی : عن ابی ہریرہ) "جو شخص روزے کی حالت میں جھوٹ بولنا اور اس پر عمل کرنا نہیں چھوڑتا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" محض بھوکا پیاسا رہنے سے کیا حاصل؟ یہ روزہ تو نہ ہوا کہ روزہ رکھا ہوا ہے اور کاروبار میں اور عام بات چیت میں دھڑلے سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے اور جُوا کھیل رہے ہیں۔ تاش' شطرنج' کیرم یا اسی نوع کی خرافات کا شغل ہو رہا ہے۔ کوئی ٹوکے تو جواب ملتا ہے کہ "روزے کو بہلایا جا رہا ہے"..... "غیبت" از روئے قرآن مجید کیا ہے؟ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا! روزہ رکھ کر حلال جانور کا حلال گوشت تو کھا نہیں رہے اور بے محابہ غیبتیں کر کر کے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھا رہے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ..... یہ روزہ کہاں ہوا! یہ فاقہ ہے' روزہ نہیں! یہ میرا یا کسی مولوی کا نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صَوْمِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ ...... "کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کو اپنے روزے سے بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔" تو اگر فی الواقع روزہ رکھا ہوا اور اس کے نتیجے میں تقویٰ پیدا ہو تو اس کا معیار اور اس کی کسوٹی ہے **اکلِ حلال!**

چنانچہ اس رکوع کی آخری آیت میں فرمایا:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے مت کھاؤ" یعنی حرام طریقوں سے ایک دوسرے کے مال ہڑپ نہ کرو۔

وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ "اور اپنے اموال کو (رشوت کے طور پر اور ناجا
طریقوں سے دے دلا کر) حکام تک پہنچنے کا ذریعہ مت بناؤ" ۔ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّ
اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ "کہ اسطرح لوگوں کے مال کا کچھ حصہ جا
بوجھتے ناحق اور گناہ سے ہضم کر جاؤ" ۔ یعنی ایسا نہ کرنا کہ حکام کو رشوت دی اور کسی کا
اپنے نام کرا لیا۔ ———————— قاضی کو کوئی رشو
دی اور کسی کی زمین کی ڈگری اپنے نام کرالی۔ سرکاری اہل کاروں کو رشوت دی اور کسی
مال کھا گئے۔ گویا یہ رشوت حرام کی ایک بڑی نمایاں شکل ہے۔ اس آخری آیت کے دو
ہیں۔ پہلے حصہ میں تو حرام کاروبار سے اور دیگر حرام طریقوں سے آمدنی کی کلی ممانعت
گئی۔ جیسے سودی لین دین، سٹہ اور اسی قبیل کے تمام ناجائز ذرائع سے کمائی کی نفی ہو گ
دوسرے حصہ میں حکام تک رسائی کیلئے رشوت کو ذریعہ بنانے اور لوگوں کے مال ناحق
ناجائز طریقوں سے ہڑپ کرنے سے مجتنب اور باز رہنے کی خاص طور پر تاکید ہو گئی اور روز
اور رمضان کے احکام کے ساتھ اس آیت کو رکھ کر گویا یہ رہنمائی دے دی گئی کہ جان ل
اصل تقویٰ یہ ہے۔ اگر حرام خوری سے باز نہ آؤ تو پھر چاہے تم عبادات کے ڈھیر پر ڈھیر لگا لو
تقویٰ حقیقی نہیں ہو گا بلکہ تقویٰ کا بہروپ ہو گا۔ وہ تمہاری کچھ رسومات ہیں جن کا تم نے ط
باندھ رکھا ہے، وہ حقیقی عبادات سرے سے ہیں ہی نہیں!

اس آیت مبارکہ اور ان احادیث سے جو ابھی پڑھی گئی ہیں یہ بات واضح ہو جاتی ہ
تقویٰ کا حقیقی معیار **اکلِ حلال** ہے۔ اکلِ حلال کی اہمیت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ
وسلم کی ایک حدیث کا مزید مطالعہ کر لیجئے۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ
ہیں اور اسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ حدیث مبارک کے الفاظ ہیں کہ ر
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا

"بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ صرف پاک چیزیں ہی قبول کرتا ہے"

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کی دو آیات تلاوت فرمائیں
میں رسولوں اور مومنوں کو اکل حلال کا حکم دیا گیا ہے۔ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِ
السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ "پھر حضورؐ نے ایک آدمی کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر طے کر
آتا ہے۔ اس کے بال پراگندہ اور غبار آلود ہیں"

فرض کیجئے کہ کوئی شخص آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے دور دراز سے حج کے لئے نکلا ہے اور بہت طویل سفر کر کے عرفات تک پہنچا ہے۔ آج کل تو آپ ہوائی جہاز سے تین چار گھنٹے میں جدہ اور آگے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکہ مکرمہ پہنچ جاتے ہیں پھر حج کے مناسک کی ادائیگی کے لئے جو سہولتیں اس دور میں میسا ہیں' ان سے متمتع ہو کر اگر واپسی کی جلدی ہو تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ میں حج کے تمام مناسک سے فارغ ہو کر آرام سے اپنے شہر واپس پہنچ سکتے ہیں۔
لیکن ذرا اس دور کا تصور کیجئے کہ کوئی شخص فَجٍ عَمِیْق (دور دراز کی راہوں) سے آیا ہے۔ اسے تو مہینوں کی مسافرت طے کرنی پڑی ہے۔ اس کا جو حلیہ بنا ہو گا اسے چشمِ تصور میں لایئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ یَمُدُّ یَدَہٗ اِلَی السَّمَاءِ یَارَبِّ یَارَبِّ "یہ شخص آسمان کی طرف اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھا کر پکار رہا ہے اے میرے پروردگار' اے میرے مالک و آقا" ۔ وَ مَطْعَمُہٗ حَرَامٌ وَّ مَشْرَبُہٗ حَرَامٌ وَّ مَلْبَسُہٗ حَرَامٌ وَّ غُذِیَ بِالْحَرَامِ "حالانکہ اس کا کھانا بھی حرام کا' پینا بھی حرام کا' لباس بھی حرام کا اور اس کا جسم حرام کی غذا سے بنا ہے" ۔ اس شخص کے بارے میں حضورؐ فرماتے ہیں:
فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لِذٰلِکَ؟ "تو ایسے شخص کی دعا کیسے قبول کی جائے؟"
یہ حرام خوری اس کے اور اس کے ربّ کے درمیان حجاب بن گئی ہے۔ اس کی دعا قبول ہو تو کیسے ہو؟ ۔ ایک وضاحت پیشِ نظر رہے کہ یہاں جس حرام کا ذکر ہے اُس سے کھانے پینے کی وہ چیزیں مراد نہیں ہیں جو نصوصِ قطعی سے حرام ہیں بلکہ وہ حرام خوریاں ہیں جن کا آج کل عام رواج ہے اور جن کے حرام ہونے کا خیال اِلّاماشاء اللہ لوگوں کو ہی رہ گیا ہے۔ اس رکوع کی یہ آخری آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس نے ہمارے سامنے حقیقی تقویٰ کا ایک معیار رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان تمام نواہی اور منکرات سے بچ سکیں جن سے ہمارا دین ہمیں بچانا چاہتا ہے اور صحیح تقویٰ اختیار کرنے کے لئے ہمارے دلوں میں طلب صادق پیدا فرمائے اور اس پر پوری زندگی مستقیم رہنے کے لئے ہماری نصرت فرمائے۔
آمین یاربّ العالمین

اقول قولی ھذاو استغفراللہ لی ولکم ولسائر المسلمین
و المسلمات

حدیثِ رسولؐ

وَعَنْ

عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

قَالَ: بَايَعْنَا رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ

فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ

وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا

وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيهِ بُرْهَانٌ،

وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری و مسلم)

مفہوم: حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی کہ:

ہم ہر حالت میں اللہ اور رسول اور ان لوگوں کی جن کو امیر مقرر کیا گیا ہو بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ خواہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی اور خوشی کی حالت میں بھی اور ناپسندیدگی کی حالت میں بھی اور اُس صورت میں بھی جب کہ دوسروں کو ہمارے مقابلے میں ترجیح دی گئی ہو۔ امیر سے جھگڑا نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ امیر سے کھلا ہوا کفر سرزد ہو۔ اُس وقت ہمارے پاس دلیل ہوگی کہ ہم اُس کی بات نہ مانیں اور جہاں کہیں بھی ہوں گے حق بات کہیں گے۔ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

قرآن حکیم کے حقوق اور اس کے عملی تقاضے

ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب جمعہ

۱۶ رمئی ۱۹۸۶ء

بمقام: جامع مسجد ناظم آباد بلاک نمبر ۵ کراچی

ترتیب وتسوید: (شیخ) جمیل الرحمٰن

الحمد للہ وکفی والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفی خصوصاً علیٰ خاتم النبیین محمدن الامین وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین — امابعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ (البقرۃ: ۱۸۵)

— صدق اللہ العظیم —

وقال النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم : یَاَھل القرآن لاتتوسدوا القرآن واتلوہ حق تلاوتہ من اٰناءِ اللیل والنھار وافشوہ وتغنّوہ وتدبروا فیہ لعلکم تفلحون۔

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْلِیْٓ اَمْرِیْ ہ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ ہ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ ہ

اَللّٰھُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتَنَا فِیْ قُبُوْرِنَا وَارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّھُدًی وَّرَحْمَۃً اَللّٰھُمَّ ذَکِّرْنَا مِنْہُ مَا نَسِیْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْہُ مَا جَھِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَہٗ اٰنَآءَ الَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّھَارِ وَاجْعَلْہُ لَنَا حُجَّۃً یَّارَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ط ــــ آمین !

ہ

معزز حاضرین ۔ اگرچہ میرا یہ خیال تھا کہ میں آج عظمتِ قرآن کے موضوع پر گفتگو کروں لیکن بعد میں مجھے خیال آیا کہ یہ مضمون زیادہ تر علمی نوعیت کا ہے، جب کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہدایات و تعلیماتِ قرآنیہ کے کچھ عملی پہلو ہمارے سامنے آئیں ۔ اگر علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور عمل میں ترقی نہ ہو تو یہ مفید ہونے کے بجائے الٹا نقصان دہ ہو سکتا ہے ۔ ویسے بھی ہمارے دین کا مزاج یہ ہے ــــ اور یہ مزاج صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بہت نمایاں تھا ــــ کہ وہ علمی نکات کی طرف زیادہ نہیں جاتے تھے بلکہ قرآن مجید کے عملی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتے تھے ۔ چنانچہ آپ کے علم میں ہوگا کہ ہمیں اس بات سے روکا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں بحث کریں بلکہ حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے انعامات و احسانات پر زیادہ غور کیا کرو ۔ اللہ کی ذات پر غور کرو گے اور اس کی کُنہ تک پہنچنے کی کوشش کرو گے تو فتنہ میں مبتلا ہو جاؤ گے ۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ اور اس کی صفاتِ کمال پر بھی اجمالی ایمان زیادہ مفید ہے ۔ مثال کے طور پر اللہ سمیع و بصیر ہے ۔ وہ سنتا بھی ہے اور دیکھتا بھی ۔ لیکن کیسے سنتا ہے اور کیسے دیکھتا ہے ؟ جہاں اس چکر میں پڑے گمراہ ہو جاؤ گے ۔ اللہ الحیّ ہے ــــ وہ زندہ ہے لیکن اس کی حیات اور زندگی کیسی ہے ! جہاں اس کو متعین کرنے کی کوشش کرو گے گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ گے ۔ صحیح اور محتاط طرزِ عمل اور

لیہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کی نعمتوں پر غور کرو۔ اس کی آیاتِ آفاقی و انفسی پر تفکر و تدبر کرو اور اس سے آگے بڑھ کر اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرو۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ روش صحیح نہیں ہے کہ حضورؐ کی عظمت کو زیادہ شد و مد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور آپؐ جو مشن لے کر تشریف لائے تھے اس پر ہماری توجہ کم رہے تو یہ عملی اعتبار سے مناسب نہیں ہوگا۔ آپؐ کی حقیقی عظمت تو ہمارے وہم و خیال سے بھی بالاتر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس پر زیادہ بت لسانی صرف کریں تو کہیں نہ کہیں توہین کے مرتکب ہو جائیں۔ اس لئے کہ کسی کی عظمت بلند تر ہو اور اسے کم تر بیان کریں تو یہ گویا ایک نوع کی توہین ہے اور ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی عظمت جس قدر اعلیٰ و ارفع ہے وہ ہمارے تخیل و توہم سے ماوراء ہے۔ اس میں محنت کریں گے اور قوتِ بیان صرف کریں گے تو ہو سکتا ہے کہ لینے کے دینے پڑ جائیں۔ اصل طرزِ عمل ہونا چاہیے کہ سوچا جائے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارا نسبت و تعلق درست ہے یا نہیں! حضورؐ کے دامن سے صحیح وابستگی ہے یا نہیں! حضورؐ کے ہم پر کیا حقوق ہیں اور ہم انہیں کس حد تک ادا کر رہے ہیں! آج سے لگ بھگ چودہ سال قبل میں نے اسی مسجد میں ایک تقریر کی تھی جس کا موضوع تھا کہ "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی بنیادیں کیا ہیں!" وہ تقریر بعد میں ہمارے ایک بزرگ رفیق نے ٹیپ سے اتار کر شائع بھی کرا دی اور الحمد للہ کہ تا حال اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور وہ قریباً پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچ چکی ہے۔ اس کتاب کا موضوع یہی ہے کہ ہماری نجاتِ اُخروی کا دار و مدار اصلاً اس پر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں درست ہوں اور حضورؐ کے ساتھ ہمارا تعلق صحیح ہو۔

یہی معاملہ قرآن مجید کا ہے۔ قرآن مجید کی عظمت کا موضوع بھی یقیناً بہت اہم ہے۔ خود قرآن مجید میں قرآن کی عظمت کا بیان مختلف اسالیب اور مختلف پیراؤں میں آیا ہے۔ کہیں تمثیل کے پیرائے میں فرمایا: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط "اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ (پہاڑ) دب جاتا، پھٹ جاتا اللہ کے خوف سے"۔ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ "اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں"۔ قرآن کی عظمت کا صحیح ادراک تمہارے لئے ممکن نہیں ہے، کوئی تصور کر سکتے ہو تو اس مثال سے کرو۔ قرآن میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے

ود اپنے اس کلام پاک کی مدح فرمائی ہے۔ جیسے سورۂ یونس میں فرمایا: يَآاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (۵۷، ۵۸) "اے لوگو! تمہارے پاس آگئی ہے نصیحت تمہارے رب کی طرف سے اور (تمہارے) سینوں میں جو روگ ہیں ان کی شفا اور ہدایت و رحمت اہل ایمان کے حق میں۔ (اے نبی! صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ یہ (قرآن) اللہ کے فضل اور اس کی رحمت کا مظہر اتم ہے۔ پس اس (انعام و احسان) پر خوشیاں مناؤ (کہ اللہ نے قرآن جیسی نعمت تمہیں عنایت فرمائی)۔ جو چیزیں لوگ جمع کرنے (کی فکر اور کوشش) میں لگے رہتے ہیں یہ (قرآن) ان سے کہیں زیادہ قیمتی شے ہے۔" اس کے علاوہ متعدد مقامات پر یہ مضمون وارد ہوا ہے۔ میں تمہیداً عرض کر چکا ہوں کہ اس وقت مجھے "عظمت قرآن" کے موضوع پر گفتگو نہیں کرنی۔ میں نے آغاز میں سورۃ البقرہ کی جو آیت مبارکہ تلاوت کی ہے اس میں رمضان کا ذکر ہے، روزے کی فرضیت کا ذکر ہے، قرآن کے بیّنہ ہونے کا ذکر ہے۔ اس قرآن کے ھُدًی لِّلنَّاس ہونے کا ذکر ہے۔ اس قرآن کے حق و باطل اور صحیح و غلط میں فرق و تمیز کرنے والی کتاب ہونے کا ذکر ہے۔ پھر اس آیت مبارکہ کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوا ہے: وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ اس دو لفظی حصہ میں نزول قرآن کا مقصد اور اس کی غایت یہ بیان فرمائی کہ "اور تاکہ تم (اس لازوال نعمت پر) اللہ کا شکر ادا کرو"۔ قرآن کا شکر کیا ہے! یہ کہ ہم قرآن کی ہدایات، تعلیمات، احکام، اوامر و نواہی کی پیروی کریں اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو ان تمام چیزوں کا پابند بنائیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اور اس طرح قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی فکر کریں۔ مجھے آج اسی کے ضمن میں گفتگو کرنی ہے۔

یہ بات بھی جان لیجئے کہ آپ جو روزہ رکھ رہے ہیں، یہ بھی آپ قرآن کا حق ادا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر ۱۸۵ کے آغاز میں فرمایا گیا: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ پھر قرآن کا تعارف ان الفاظ مبارکہ سے کرا دیا گیا کہ یہ "هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ" ہے۔ پھر حکم دیا گیا کہ "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ط"۔ آپ کی اسی مسجد میں شعبان کی آخری شب کو میری مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ اس موقع پر اختصار سے عرض کرتا

ہوں کہ اس مقام پر قرآن مجید کو "ھدًی للناس" فرمایا گیا ہے کہ یہ ہدایت ہے پوری نوعِ بشر کے لیے جبکہ سورۃ البقرہ کے آغاز میں قرآن کو "ھدًی للمتقین" قرار دیا گیا ہے۔ کہ یہ ہدایت ہے خدا ترس لوگوں کے لیے۔ جن میں تقویٰ ہی نہیں، خدا کا خوف ہی نہیں وہ اس کتابِ مبین سے کیا استفادہ کریں گے؟ چنانچہ اس سے ابوجہل استفادہ نہیں کر سکا، ابولہب اور ولید بن مغیرہ استفادہ نہیں کر سکے۔ جب کہ قرآن ان کی اپنی زبان میں نازل ہو رہا تھا اور اس ہستی پر نازل ہو رہا تھا جس کی بے داغ سیرت و کردار ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ جسے یہ خود الصادقؐ اور الامینؐ قرار دے چکے تھے لیکن پھر بھی محروم کے محروم رہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

حسنؓ ز بصرہ بلالؓ از حبش، صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبیست!

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جن میں خود میلان اور رجحان نہیں ہے اور جن کے دلوں میں راہِ حق کی جستجو اور طلب نہیں ہے، وہ اس 'ھدًی للناس' سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کتاب سے استفادہ کے لیے تقویٰ، خدا ترسی اور راہِ حق کی طلب کی کوئی نہ کوئی رمق ہونی ضروری ہے۔

اب اس بات کو بالکل الجبرا کے فارمولے کی طرح ذہن میں جما لیجیے کہ قرآن اصل میں تو پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت ہے لیکن اس سے استفادہ کی شرط تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے کہ اس ماہِ مبارک میں روزہ رکھو جس میں قرآن نازل فرمایا گیا —— اس ماہ کی برکات سے صحیح طور پر مستفیض ہونے کے لیے دن میں روزہ رکھو۔ اور اس روزے کے ذریعہ سے تقویٰ کی کوئی رمق حاصل ہوئی ہے تو رات کو اللہ کے حضور اس پونجی کو لے کر کھڑے ہو جاؤ کہ اس پر کلامِ الٰہی کی بارش برسے۔ گویا زمین تیار کر لی گئی ہے اور تیار زمین پر بارش برسے تو اس بارش کا فائدہ ہے۔ اگر زمین پر ہل نہیں چلایا، بیج نہیں ڈالا تو بارش آئی اور گئی۔ اس زمین کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم نے اس روزہ کے ذریعے سے اپنے دل کی زمین کو کچھ تیار کیا ہے، اس میں تقویٰ کی کچھ رمق پیدا کی ہے تو اب قیام اللیل کا اہتمام و التزام کرو، تاکہ بارانِ رحمت کا نزول ہو، یعنی کلامِ الٰہی تمہارے قلب پر نازل ہو۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

جب قرآن انسان کے قلب پر اترتا ہے تو درحقیقت یہ اس دل میں جذب ہوتا ہے جس دل میں تقویٰ کا ہل چل چکا ہو تو قرآن اس میں بہار لے آتا ہے۔

اس آیت میں آگے کچھ رعاتیں دی گئیں کہ بیمار ہو یا سفر میں ہو تو تعداد دوسرے دنوں میں پوری کرلو۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، سختی نہیں چاہتا لیکن تعداد پوری کرنی ہوگی: " وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ "۔ آگے ارشاد ہوا کہ: " وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ " اور اللہ نے جو ہدایت تمہیں عطا کی ہے اس پر اللہ کی تکبیر کرو۔ " وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ " اور تاکہ تم شکر کرسکو

میں " وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ " کے حوالے سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں سمجھنا ہے کہ "شکر" کیا ہے؟ اگرچہ ہم یہ لفظ بولتے ہیں اور یہ اردو زبان میں عام مستعمل ہے۔ اور لفظ شکریہ تو ہماری زبان پہ بار بار آتا ہے۔ مہذب انسان کی تو یہ عادتِ ثانیہ ہوتی ہے کہ وہ ہر مہربانی پر شکریہ ادا کرتا ہے۔ لہٰذا تہذیبی و تمدّنی زندگی میں یہ "شکریہ" بہت اہم ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ پوری طرح سمجھا جائے کہ "شکر" درحقیقت کسے کہتے ہیں؟۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی عظیم تصنیف "مفردات القرآن" میں قرآن میں استعمال ہونے والے ایک ایک لفظ کے اصل مادہ (ROOT) اور اصل مفہوم پہ بحث کی ہے۔ لفظ "شکر" پر ان کی بحث بڑی پیاری ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ شکر کے تین درجے ہیں۔ پہلا ہے "شکر بالقلب"۔ یعنی پہلے کسی کے احسان کا احساس اور شعور تو ہو۔ اس احسان، انعام اور نعمت کی قدر و قیمت کا اندازہ تو ہو۔ کسی نے آپ کے ہاتھ پہ ہیرا رکھا اور آپ نے اسے محض کانچ کا ایک ٹکڑا سمجھا تو آپ اس کا کیا شکریہ ادا کریں گے؟ آپ کو اس ہیرے کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہیں ہے۔ لہٰذا نعمت کا شکر بقدرِ معرفتِ نعمت ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ کسی نعمت کی قدر و قیمت کا جتنا ادراک و شعور ہوگا، اتنا ہی آپ اس نعمت کا شکر ادا کرسکیں گے۔ لہٰذا شکر کا پہلا درجہ اور مرحلہ شکر بالقلب ہے دوسرا درجہ اور مرحلہ ہے "شکر باللسان"۔ یعنی دل میں جو جذباتِ شکر ابھرے ہیں، اب وہ زبان پہ آئیں گے، الفاظ کا جامہ اختیار کریں گے اور آپ اپنے محسن و منعم کا زبان سے شکریہ ادا کریں گے۔ اور شکر کا تیسرا درجہ اور مرحلہ ہے "شکر بالجوارح"۔ یعنی اپنے پورے وجود سے شکر کرنا۔ یہ شکر کیا ہے؟ اس کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ "شکر" دراصل یہ ہے کہ اس نعمت کا حق ادا کیا جائے۔ اگر نعمت کا حق ادا نہیں کیا تو یہ بھی ناشکری ہے۔ میں اس کی تفہیم کے لیے سادہ ترین مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی بچے کو اس کے والد کوئی اعلیٰ کتاب لاکر

تحفے میں دیتے ہیں۔ وہ بچہ مہذب ہے، کلچرڈ ہے، وہ فوراً "THANKS DADDY" تو کہہ دیتا ہے۔ اس تحفہ پر اباجان کا زبان سے تو شکریہ ادا کر دیتا ہے، لیکن پھر اس کتاب کو الماری میں رکھ دیتا ہے، کھولتا نہیں، اس کا مطالعہ نہیں کرتا۔ تو بتائیے کہ کیا اس نے شکر کیا؟ حقیقت میں اس نے ناقدری اور ناشکری کی، کفرانِ نعمت کیا۔ باپ نے کتاب اس لئے لاکر دی تھی کہ بچہ پڑھے تو اس کے علم و فہم میں وسعت اور معلومات میں اضافہ ہو۔ لیکن اس بچے نے کتاب سے یہی مقصد حاصل نہیں کیا۔ زبان سے تو شکریہ ادا کر دیا، حقیقت میں اپنے وجود سے شکریہ ادا نہیں کیا۔ گویا نعمت کا حق ادا کرنا آخری درجہ کا شکر ہے۔

اب اس کے حوالے سے سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن جیسی کتاب دی ـــ اب دیکھئے میں نے ابھی جو مثال دی ہے اس سے بڑی پیاری مناسبت پیدا ہوگئی۔ جیسے باپ نے بچہ کو کتاب لاکر دی، ایسے ہی ہمارے آسمانی باپ نے ہمارے لئے کتاب اتاری ـــ آسمانی باپ کا لفظ انجیل میں آتا ہے اور اس اعتبار سے بُرا نہیں ہے کہ جیسے باپ اولاد کی پرورش کرتا ہے، ویسے ہی اللہ تعالیٰ آسمانی باپ ہے۔ ربّ العالمین ہے۔ تمام جہانوں کا پروردگار اور پالن ہار ہے ـــ تو ہمارے پروردگار نے ہمیں کتاب دی اس لئے کہ ہم اس سے ہدایت اخذ کریں، اسے ہم اپنا امام اور راہنما بنائیں۔ اس سے اپنے سینوں کو آباد کریں، اس سے ہم اپنے قلوب و اذہان کو روشن کریں، اس کی تعلیمات سے استفادہ کریں۔ اس کتاب سے خالق و مالک کی معرفت حاصل کریں، اسؑ کی صفاتِ کمال کا ادراک کریں، اس کی توحید کو پہچانیں، اس کی مرضیات کا شعور و فہم حاصل کریں، اسؑ کے اوامر و نواہی سے آگاہ ہوں اور اس پوری کائنات بالخصوص انسان کی تخلیق کے مقصد کو جانیں ـــ لیکن اگر ہم نے اس کتاب کو بند کرکے رکھ چھوڑا اور اسے گاہے بگاہے چوم لیا، یا یہ اگر کہیں ہاتھ سے گر گیا تو اس کے ہموزن گندم صدقہ کر دی یا بچی کو اس کا اعلیٰ سے اعلیٰ نسخہ جہیز میں دے دیا۔ یا یہ کہ بہو جب پہلی بار گھر میں داخل ہو رہی ہے تو اس پر قرآن کا سایہ کر لیا ـــ تو کیا قرآن کے یہ حقوق ہیں؟ کیا قرآن ہمیں ان کاموں کے لیے دیا گیا تھا ـــ؟

میں نے لاہور میں ۱۹۶۶ء کے اواخر میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر دعوت رجوع الی القرآن کا کام شروع کیا اور متعدد علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کئے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کو قبولِ عام حاصل ہوا ـــ تو مسجد خضرا سمن آباد کے منتظمین

کی طرف سے مجھے اس مسجد میں خطابِ جمعہ کی دعوت ملی ۔ اس زمانہ میں یہ علاقہ کی سب سے بڑی مسجد تھی ۔ میں نے ۱۹۶۸ء کے اوائل سے اس کام کا آغاز کر دیا اور اس مسجد میں پہلے دو جمعوں میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر تقریریں کیں ۔ اس طرح مسجد خضراء قریباً دس سال تک پورے پاکستان کے لیئے دعوت رجوع الی القرآن کا مرکز بنی رہی۔ مجھے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے اس مسجد کو کیسے قبول فرمایا! مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس مسجد کا سنگِ بنیاد مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے رکھا تھا ۔ اس مردِ درویش نے ارضِ لاہور میں چالیس برس تک درسِ قرآن دیا اور ارضِ لاہور کی فضا کو قرآن حکیم کی برکات سے مستفیض فرمایا اور قرآنی تعلیمات کی روح کو عام کیا ۔ اب آپ دیکھئے کہ ان چیزوں میں کس قدر مناسبت ہوتی ہے ۔ ظاہر بین نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت نہیں ہوتی لیکن جن کی نگاہ حقائق پر اور باطن پر ہے وہ ان چیزوں کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ چنانچہ جس مسجد کا سنگِ بنیاد اس اللہ کے بندے کے ہاتھوں رکھا گیا تھا جو داعئ دعوتِ رجوع الی القرآن تھا۔ تو اس میں جب میں نے خطابِ جمعہ شروع کیا تو اسی موضوع سے کیا کہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کیا ہیں" ! جب کہ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد اُنؒ کے دستِ مبارک سے رکھا گیا تھا ۔

اس موضوع پر تقریر کرتے کا اُس وقت میرے ذہن میں خیال کیوں آیا! اس کی بھی بظاہر ایک وجہ تھی ۔ وہ صدر ایوب کا دورِ حکومت تھا ۔ آپ میں سے اکثر کو یاد ہوگا کہ صدر ایوب کے دورِ حکومت میں مختلف جشن منائے جانے کا رواج شروع ہوا تھا۔ جیسے جشنِ خیبر، جشنِ مہران اور جشن فلاں فلاں جو دراصل ثقافت کے نام پر بے حیائی کے فروغ کے لیئے محافلِ رقص و سرود کا مختلف عنوانوں سے انعقاد تھا ۔ انہوں نے اپنے آخری دور میں مذہبی اور دینی مزاج کے لوگوں کو رشوت بھی دی تھی کہ ایک "جشنِ نزولِ قرآن" بھی سرکاری سطح پر منالیا جائے یعنی ہمیں ثقافت کے نام پر اپنی من مانی کرنے دو ۔ تم اپنے ذوق کی تسکین کے لیے قرأت کی محافل منعقد کر لیا کرو، سرکاری سطح پر سونے کے تاروں سے چالیس من وزنی قرآن مجید تیار کرالو ۔ نزولِ قرآن کا جشن منالو ۔ تاکہ دینی و مذہبی ذہن کے لوگ مطمئن ہو جائیں کہ ہمیں بھی کچھ دیا گیا ہے ۔ اس تناظر میں اس وقت میں نے کہا تھا کہ کیا قرآن مجید کے حقوق یہ ہیں ؟ کیا صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے سونے کے تاروں سے قرآن مجید لکھا تھا ! ۔ صحابہ کرامؓ نے تو اس قرآن کو اپنے سینو

میں جذب کیا تھا۔ اسے اپنی سیرتوں کا جزو بنایا تھا۔ صحابہ کرامؓ تو ان راستوں پر چلے تھے جو قرآن نے انؓ پر واضح کیے تھے۔ اُنؓ میں کوئی ایسا بھی نہیں تھا جس کے پاس پورا قرآن کتاب کی شکل میں موجود ہو۔ اس دَور میں یہ طباعت واشاعت کے لوازمات کہاں تھے!! اور کہاں تھے یہ آرٹ پیپر! کاغذ ہی دستیاب نہیں تھا، آرٹ پیپر کا کیا سوال! اور کہاں تھیں یہ روپہلی و سنہری اور خوش نما جلدیں! لیکن قرآن انؓ کے دلوں پر نقش تھا۔ اُنؓ کی شخصیتوں کا جزوِ لاینفک بن چکا تھا اور اُنؓ کے پورے وجود میں سرایت کر چکا تھا۔ یہ تھا قرآن کا حق جو انہوں نے ادا کیا تھا۔ عالَم یہ تھا کہ کسی کے پاس ہڈی پر لکھی ہوئی چند سورتیں تھیں۔ اونٹ کے شانے کی ہڈی چوڑی بھی ہوتی ہے اور ہموار بھی۔ اس پر لکھتے تھے۔ یا جھلیوں پر لکھتے تھے یا کسی کو کاغذ میسر آگیا تو اس پر چند سورتیں لکھی ہوئی تھیں ــــ لیکن اس قرآن نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس قرآن نے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ وہ ہمہ گیر انقلاب کہ آج بھی جب اس کی یاد تازہ کی جاتی ہے تو آدمی دنگ رہ جاتا ہے کہ بیس برس کے مختصر ترین عرصہ میں آج سے چودہ سو سال قبل اتنا عظیم و ہمہ گیر انقلاب!! ــــ اور آج چالیس من وزنی قرآن زیارت کے لیے رکھا ہوا ہے جس کے حروف سونے کے تاروں سے لکھے گئے ہیں۔ تو کیا یہ ہے قرآن کا اصل مصرف؟

وقت کی کمی کے پیشِ نظر میں اختصار کے ساتھ عرض کروں گا کہ ہر مسلمان کے ذمّہ قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں۔ اگرچہ معاملہ بقدرِ استطاعت اور بقدرِ صلاحیت و استعداد ہوگا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ "اللہ تعالیٰ ہر انسان کو اس کی وسعت کے مطابق ذمّہ دار اور مکلّف ٹھہراتا ہے۔" تاہم یہ بات سامنے رہنی لازمی ہے کہ ہمارا یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے کہ ہم حصولِ دنیا کے لیے تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں اور اس تگ و دو میں ہماری استعداد و استطاعت اور اہلیت و صلاحیت کا بھرپور اور نتیجہ خیز مظاہرہ ہوتا ہے، لیکن دین کے لئے ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ذرا غور کیجیے اور انصاف فرمائیے کہ اگر صلاحیت و اہلیت نہیں ہے تو دنیوی کاموں میں کیسے ظاہر ہو رہی ہے! تمہارے کاروبار چمک رہے ہیں، تم اپنے پروفیشن میں نام پیدا کر رہے ہو۔ تم میں وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے ایک نہیں، دو دو تین تین مضامین میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ لیکن ان کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ عربی سیکھتے اور براہِ راست قرآن پڑھتے اور سمجھنے کی کوشش کرتے۔ ایسے لوگوں کا عدمِ صلاحیت و اہلیت کا عذر اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ ہاں واقعتہً کسی میں استعداد نہ ہو، وہ پیدائشی غبی اور کند ذہن ہو یا بیچارا

حالات کی وجہ سے اَن پڑھ رہ گیا ہو تو ایسے لوگوں سے ان ہی اعتبارات سے مواخذہ ہوگا لیکن اگر آپ میں صلاحیت و استعداد موجود ہے اور آپ نے اس کا رُخ کسی اور طرف موڑ دیا ہے اس کی ذمّہ داری آپ پر ہے ۔ تاہم اصولاً یہی کہا جائے گا کہ :

ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن مجید کے
پانچ حقوق عائد ہوتے ہیں ۔

میں نے یہ حقوق قرآن و سنّت سے ماخوذ کیے ہیں ' اور وہ یہ ہیں :

- سب سے پہلا یہ کہ اسے مانو جیسے اسے ماننے کا حق ہے ۔
- دوسرا یہ کہ اسے پڑھو جیسے کہ اسے پڑھنے کا حق ہے ۔
- تیسرا یہ کہ اسے سمجھو جیسے کہ سمجھنے کا حق ہے ۔
- چوتھا یہ کہ اس پر عمل کرو جیسے کہ عمل کا حق ہے ــــ اور
- پانچواں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچاؤ جیسے اسے پہنچانے کا حق ہے ۔ اس لئے کہ بحیثیتِ اُمتی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارا یہ فرض منصبی ہے ۔

یہ پانچ حقوق ہیں جن کو میں نے نہایت سادہ انداز میں پیش کیا ہے ۔ اب میں ان میں سے ہر ایک کی اختصار کے ساتھ وضاحت کر دوں گا ۔ ویسے بحمد اللہ اس موضوع پر میرا کتابچہ موجود ہے جن حضرات کے دلوں میں قدرے تفصیل جاننے کا اشتیاق پیدا ہو' ان سے میں گذارش کر دوں گا کہ وہ اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں ۔

پہلا حق : اس پر ایمان لاؤ !

میں نے قرآن مجید کے یہ جو پانچ حقوق بیان کئے ہیں' ان میں سے ہر ایک کے لئے قرآن مجید اور سنّتِ رسول علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی اصطلاحات ہیں ۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے درجات ہیں ــــ ماننے کی اصطلاح کیا ہے ! **ایمان** ۔ اب اس ایمان یعنی ماننے کے بہت سے درجے ہیں ۔ کہاں حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایمان اور کہاں ہم میں سے کسی کا ایمان ! ؏ چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک ! ــــ حالانکہ ہے تو ایمان ہی لیکن درجے مختلف ہیں ۔ البتّہ ایمان کے دو درجے سمجھنے بہت ضروری ہیں ۔ ایک ماننا ہے قانونی درجہ میں کہ ہم نے زبان سے اقرار کر لیا کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے ۔ ایک ماننا ہے دل کی گہرائی سے جس سے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ یہ واقعتہً اللہ کا کلام ہے ۔ اصل میں یہ ماننا یہ ایمان مطلوب ہے ۔ اقرار باللسان تو ہمیں خود بخود حاصل ہو گیا چونکہ ہم مسلمانوں میں پیدا

ہو گئے۔ لہٰذا ہم زبان سے مانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ لیکن اس ماننے سے نہ اس کی طرف ہمارا التفات ہے، نہ توجہ ہے، نہ ہم اسے پڑھتے ہیں نہ ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا کیا سوال! بس ایک کتابِ مقدس کے طور پر اسے مان لیا ہے۔ لیکن جب آپ دل کی گہرائی سے اور تصدیق بالقلب کی کیفیت سے مانیں گے کہ یہ واقعی اللہ کا کلام ہے۔ تو پھر آپ کے دل میں اس کی عظمت پیدا ہوگی اور اس کی قدر و منزلت اور اہمیت کا شعور حاصل ہوگا۔ اس تصدیقِ قلبی کے بغیر اگلا قدم نہیں اٹھ سکے گا۔ اگر آپ کو اس کے کلام اللہ ہونے پر یقینِ قلبی ہی حاصل نہیں ہے تو آپ کاہے کو اسے پڑھنے پر وقت لگائیں گے! اس کو سمجھنے پر کاہے کو اپنی صلاحیتیں کھپائیں گے! کاہے کو آپ اس پر عمل کا کھکیڑ مول لیں گے اور کاہے کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری سنبھالیں گے! لہٰذا سب سے پہلے تو یقین کی ضرورت ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اب یہاں ایک عملی سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ یقین کیسے پیدا ہو؟ اس کا جواب میں نے اپنے کتابچہ میں دیا ہے۔ لہٰذا جن حضرات کو دلچسپی ہو وہ اس کا مطالعہ ضرور کر لیں۔

دوسرا حق: اس کی تلاوت کرو!

اب آئیے دوسرے حق کی طرف۔ "اُسے پڑھو جیسے کہ اسے پڑھنے کا حق ہے"۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ (البقرہ: ۱۲۱) "وہ لوگ جنہیں ہم کتاب دیتے ہیں وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسے کہ اس کی تلاوت کا حق ہے"۔ اس کا کیا مفہوم ہے! حقِ تلاوت کیا ہے! سب سے پہلے یہ کہ قرآن مجید کے حروف کے مخارج صحیح ادا ہو رہے ہوں۔ اس کا نام تجوید ہے۔ کبھی یہ ہماری تعلیم کا نقطۂ آغاز ہوا کرتا تھا۔ ہر مسلمان بچہ سب سے پہلے نورانی قاعدہ یا یسرنا القرآن پڑھا کرتا تھا۔ ان کے ذریعے سے اسے قرآن کے حروف کی شناخت اور ان کے مخارج کا صحیح علم اور ساتھ ہی قرآن مجید کے رموز و اوقاف کا صحیح علم حاصل ہوتا تھا۔ ان سب کو سمجھ کر قرآن کو پڑھنا — یہ پہلا اور ابتدائی حق ہے۔ پھر یہ کہ اس کا جتنا زیادہ سے زیادہ حصہ یاد کیا جا سکتا ہے اسے یاد کیا جائے۔ حفظِ قرآن کا الحمدللہ ہمارے یہاں پھر چرچا ہوا ہے اور اکثر لوگ اپنے کسی نہ کسی بچے کو بچپن میں ضرور حفظ کرا دیتے ہیں بہت سے کھاتے پیتے گھرانوں میں بھی یہ روایت پڑ گئی ہے۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ بقسمر

کے وقت جو شہر ہندوستان میں رہ گئے ہیں ان میں سے پانی پت، ٹونک، سہارن پور اور بہت سے دوسرے شہر ایسے تھے جن میں یہ خصوصی روایت تھی کہ ہر خاندان کم از کم ایک بچے کو ضرور حفظ کراتا تھا جیسے انڈونیشیا میں ماضی قریب تک یہ روایت قائم رہی ہے کہ شادی کے فوراً بعد نوبیاہتا جوڑے حج کے لئے جاتے تھے۔ حج کے لئے بہترین عمر یہی جوانی کی عمر ہے اور پھر ابھی بال بچے بھی نہیں ہیں کہ گھر میں دل پڑا رہے اور دورانِ حج میں وہ یکسوئی حاصل نہ ہو سکے جو مطلوب ہے۔ بہرحال ہمارے یہاں بھی تقسیم سے قبل یہ روایت رہی ہے کہ قریباً ہر خاندان میں ایک حافظ ہوتا تھا اور اس گھر کو منحوس سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی حافظ نہ ہو۔ گو اب یہ صورتِ حال تو باقی نہیں رہی تاہم بفضلہٖ تعالیٰ چند برسوں سے بعض مخلص حضرات اور اداروں کی کوششوں سے حفظِ قرآن کا کافی چرچا ہے۔ لیکن میں دوسرے حفظ کی بات کر رہا ہوں کہ ہر مسلمان یہ سمجھے کہ میرا اصل سرمایہ وہ قرآن ہے جو میرے سینے میں محفوظ ہے ایک پارہ ہو، دو تین ہوں یا اس سے زیادہ ہوں، ان کی حفاظت کرتا رہے اور مزید اضافے کے لیے کوشاں رہے۔ اس حفظِ قرآن سے کوئی مسلمان محروم نہ رہے۔ مجھے بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ بات عرض کرنی پڑ رہی ہے کہ ہماری مساجد کے اکثر و بیشتر حضرات کا حال یہ ہے کہ قرآن کے چند مقامات اور گنتی کی سورتوں کے سوا کچھ یاد نہیں ہے۔ جہری نمازوں میں انہی کو بار بار دُہرالیا جاتا ہے۔ اِلاماشاءاللہ صاحبِ ذوق لوگ بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس اعتبار سے یہ بڑی محرومی ہے کہ قرآن کے حفظ میں اضافہ کے ذوق میں حد درجہ کمی ہو چکی ہے۔

پھر تلاوتِ قرآن کا ایک حق یہ بھی ہے کہ اسے اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ خوش الحانی سے پڑھا جائے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: زَیِّنُوا الْقُرْاٰنَ بِاَصْوَاتِکُم "قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کیا کرو۔" اس معاملہ میں کوتاہی پر تنبیہہ بھی فرمائی: مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ فَلَیْسَ مِنَّا "جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں" (ابوداؤد) ___ پھر اس کے آداب ہیں۔ تلاوت کے لیے باوضو دوزانو ہو کر قبلہ رُخ بیٹھیے۔ مصحف کا ادب اور اس کی تعظیم کیجئے ___ تلاوت کی ابتدا تعوذ سے کیجیے ___ البتہ ان آداب کے ضمن میں یہ بات جان لیجیے کہ جب تلاوت حصولِ ثواب یا تذکر کی نیت سے کی جا رہی ہو تو ان آداب میں سے کسی میں بھی کمی بیشی نہیں ہوگی لیکن اگر تعلیم و تعلم یا درس و تدریس کے لیے قرآن پڑھا جائے، مثال کے طور پر جو بچے ناظرہ پڑھ رہے ہوں یا حفظ کر رہے ہوں، ان کو علماء کرام نے ان پابندیوں سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ پھر یہ کہ تلاوت کا معمول ہونا چاہیے۔ اللہ توفیق دے تو روزانہ زیادہ سے زیادہ حصہ کی تلاوت کریں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین روزانہ قرآن کی ایک منزل تلاوت

کر کے سات دن میں ایک قرآن ختم کیا کرتے تھے۔ جب کچھ عرصہ گزر گیا اور ہمارے ذوق و شوق اور جوش و جذبے میں کمی آگئی تو قرآن مجید کو تیس پاروں میں تقسیم کیا گیا کہ چلیے روزانہ ایک پارہ پڑھ کر ہر مہینہ میں قرآن ختم کر لیا جائے۔ ماضی قریب میں ہمارے یہاں کثرت سے اس کا معمول تھا۔ مجھے اپنے بچپن کی بات یاد ہے کہ اکثر مسلمان یہ کوشش کرتے تھے کہ ایک پارہ کی روزانہ تلاوت کر لیں لیکن آج کل اگر آپ کی روزانہ کی مصروفیات میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے کہ آپ روزانہ ایک پارے کی تلاوت کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے تو بر سبیل تنزل آپ پونا پارہ پڑھیے، نصف پڑھیے، پاؤ پڑھیے، ایک رکوع ہی پڑھ لیجیے لیکن اس کو زندگی کا معمول بنائیے۔ آپ کا کوئی دن تلاوتِ قرآن سے محروم نہ رہے ـــــ یہ تمام چیزیں " یَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ " میں شامل ہیں۔

تیسرا حق: اسے سمجھو اور اس پر غور و فکر کرو!

اب آئیے تیسرے حق کی طرف۔ " قرآن کو سمجھیے جیسے کہ اسے سمجھنے کا حق ہے " اس سمجھنے کے بھی دو درجے خاص طور پر قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک سمجھنا ہے نصیحت اخذ کرنے کے لیے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں کہتے ہیں: " تذکر بالقرآن " یعنی قرآن سے ہدایت و نصیحت حاصل کر لینا۔ اور ایک درجہ ہے 'تدبر قرآن' یعنی قرآن پر غور کرنا۔ اب سمجھیے کہ غور کسے کہتے ہیں! یہ لفظ غار سے بنا ہے۔ عربی میں غار کہتے ہیں زمین میں بہت گہرے گڑھے کو۔ غور کرنے سے مراد ہوگا کہ قرآن کی گہرائیوں میں اترا جائے۔ علامہ اقبال نے اسے یوں تعبیر کیا کہ ؎ " قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں " یہ قرآن علم و عرفان کا اتھاہ اور ناپیدا کنار سمندر ہے۔ اس میں غوطے لگاؤ، اس کے علوم و عرفان، اس کے معارف و معانی اور حقائق و مفاہیم کے موتی و جواہر کی جستجو کرو اور ان کو نکال کر لاؤ۔ پس جان لیجیے کہ قرآن فہمی کے یہ دو درجے ہیں۔ ایک ہے تذکر اور ایک ہے تدبر۔ تذکر کے لیے قرآن بہت آسان ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ القمر میں اللہ تعالیٰ نے چیلنج کے انداز میں چار بار فرمایا: وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَهَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ۝ (آیات ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰) یعنی ہم نے ذکر کے لیے نصیحت و یاد دہانی کے لیے اور ہدایت اخذ کرنے کے لیے قرآن کو آسان کر دیا ہے۔ تو ہے کوئی اس یاد دہانی سے فائدہ اٹھانے والا اور اس سے نصیحت اخذ کرنے والا! اس تذکر بالقرآن کے لیے صرف ایک چیز ضروری ہے وہ یہ کہ اتنی عربی آپ کو آنی چاہیے کہ جب آپ قرآن پڑھیں تو اس کا ایک سادہ سا مفہوم روانی کے ساتھ آپ کے قلب پر اترتا اور اسے منور کرتا چلا جائے ـــــ اس لیے کہ جب آپ ترجمہ کی مدد سے پڑھتے ہیں تو تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اصل تاثیر نہیں رہتی، اگرچہ علم تو حاصل ہوتا ہے [illegible]

قرآن کا جو اثر انسان کے جذبات پر پڑنا چاہیئے ترجمہ اور حواشی کی طرف بار بار رجوع کرنے سے اس تاثیر کا تسلسل برقرار نہیں رہتا۔ قرآن کی تاثیر سے جذبات میں جوار تعاشس برپا ہونا چاہیئے اور قرآن کو آپ کے باطن کی گہرائیوں میں اتر کر آپ کے قلب کے تاروں کو جو چھیڑنا چاہیئے تو وہ تار نہیں چھڑتے ــــ یہ ضرور ہے کہ ترجمہ اور حواشی کی مدد سے قرآن پڑھتے سے معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن تھوڑی بہت عربی آتی ہو اور تسلسل کے ساتھ تلاوت ہو تو اس کی اپنی تاثیر ہے۔ البتہ کوئی اشکال محسوس ہو یا کوئی ثقیل یا نامانوس لفظ آجائے تو ترجمہ اور حواشی کی طرف رجوع کرنا مفید ہوتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات بھی جان لیجیے کہ قرآن مجید نہایت سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔ یہ عربی مبین ہے، یعنی روشن عربی۔ بلکہ اسے ادب کی اصطلاح میں سہلِ ممتنع کہنا درست ہوگا کہ انتہائی آسان الفاظ میں، انتہائی اعلیٰ مضامین و مفاہیم ادا کیے جائیں۔ لہٰذا میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ تذکر بالقرآن کے لئے عربی کی اس قدر تحصیل ضروری ہے کہ قاری قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ خود سمجھ سکے۔ اسے مشکل نہ سمجھئے۔ عربی زبان کو خواہ مخواہ ہوّا بنا دیا گیا ہے جب کہ یہ بڑی سائنٹفک زبان ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ اسے بہت جلد سیکھ سکتے ہیں جنہوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کیا ہو یا ڈاکٹری اور انجنیرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کئے ہوں لیکن اس کے لئے لگن اور ضرورت کا شدید احساس ناگزیر ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں اور تجربات کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ تذکیر، نصیحت اور یاد دہانی حاصل کرنے کے لیے اس شخص کے لئے قرآن بڑی سادہ کتاب ہے، جس نے عربی زبان کی صرف و نحو کے چند بنیادی اصول سیکھ لیے ہوں اور ان کی تمیز حاصل کر لی ہو۔ اس لیے کہ قرآن کا اصل موضوع اور اساسی مضامین فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہیں اور قرآن کو بامعنی پڑھتے ہوئے ایک سلیم الفطرت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے باطن میں مستور بدیہیات سے واقف ہو رہا ہے اور اپنی فطرت کی آواز کو دل کے کانوں سے سن رہا ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا طرزِ استدلال منطقی نہیں ہے۔ وہ آفاق و انفس کی نشانیوں سے انسان کو جگاتا اور اسے حقائق سے آگاہ کرتا ہے۔ پھر یہ کہ مشکل مضامین کو نہایت سادہ اور دل نشین مثالوں کے ذریعے سے آسان بنا کر قلب پر اثر ڈالتا ہے۔ اس پر نُورٌ علیٰ نُور قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور سلاست کی وہ معراج ہے جس کے سامنے عرب کے نامی گرامی شعراء، خطبا اور ادبا، سرنگوں ہو گئے تھے اور انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

البتہ تدبّرِ قرآن وہ شے ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے

بارے میں یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: وَلَا یَشْبَعُ مِنْہُ الْعُلَمَاءُ "اور اہلِ علم اس (کتاب) سے کبھی سیر نہیں ہوسکیں گے" اور وَلَا یَخْلَقُ عَنْ کَثْرَۃِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ۔ "اور نہ کثرت (تکرار) تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف کے خزانے) کبھی ختم ہوسکیں گے"۔ علماء حقانی اس قرآن پر غور و تدبر کرتے رہیں گے۔ اس کام میں ساری ساری عمریں لگادیں گے۔ کتنے ہی امام رازیؒ، امام زمخشریؒ اور ان کے پائے کے بے شمار مفسرینِ قرآن آئیں گے جو یہ کہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوں گے کہ "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔ قرآن مجید میں کتنے ہی مقامات ایسے آئیں گے کہ بڑے بڑے فضلاء، علماء اور مفکرین گھٹنے ٹیک دیں گے اور یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ: اِعْلَمْ اَنَّ ھٰذَا الْمَقَامَ مَقَامٌ غَامِضٌ عَمِیْقٌ مُھِیْبٌ "ہوشیار ہو جاؤ کہ یہ مقام بہت مشکل ہے، بہت گہرا ہے، بہت غامض ہے بہت پُرہیبت ہے"۔ امام رازیؒ کو یہ کہنا پڑ رہا ہے تو "تا بہ دیگراں چہ رسد!"۔ اس کی ایک مثال میں نے اپنے کتابچے میں دی ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ "میں نے صرف سورۃ البقرہ پر آٹھ سال تک تدبر کیا ہے"۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ انہیں نہ عربی سیکھنی تھی اور نہ صرف و نحو پڑھنے کی ضرورت تھی۔ عربی ان کی مادری زبان تھی اور ان کی خطابت اور زبان دانی کا چرچا تھا۔ اور انہیں شانِ نزول کی روایات کی چھان بین کرنے کی بھی کوئی احتیاج نہیں تھی۔ وہ تو خود اس ماحول میں رہ رہے تھے، جس میں قرآن نازل ہو رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت قرب رکھتے ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر فقیہہ الامت کے فرزند ہیں۔ لیکن صرف سورۃ البقرہ پر تدبر اور غور و فکر میں آٹھ سال لگاتے ہیں۔ اب آپ اندازہ کیجیے کہ پورا قرآن سورۃ البقرہ سے بارہ گنا ہے، تو کسی کی سوا سو برس کی عمر ہو تو شاید وہ اس طریقے سے قرآن پر قابلِ لحاظ حد تک تدبر کرسکے۔ میں پھر بھی یہ عرض کروں گا کہ اتنی عمر صرف کرکے بھی کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے قرآن کے معانی آخری حد تک جان لیے ہیں اور میں نے اس کی تہہ تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ لیکن بایں ہمہ قرآن نے اپنے محلِ تدبر ہونے کو بایں الفاظ مبارکہ خود واضح کیا ہے:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ مُبٰرَكٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○

(ص: ۲۹) "یہ قرآن ایک بڑی بابرکت کتاب ہے جو ہم نے (اے نبیؐ!) آپ کی طرف نازل فرمائی ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر (و تفکر) کریں اور تاکہ ہوش مند لوگ نصیحت حاصل کریں"۔ آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دونوں اصطلاحات آگئیں، یعنی تدبرِ قرآن

اور تذکر بالقرآن، جن کا میری گفتگو کے اس حصّہ سے تعلق ہے۔ پھر قرآن پر عدم تدبر کا گلہ ان الفاظ میں خود قرآن میں موجود ہے: أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ (النساء: ۸۲) "کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟" پھر یہی شکوہ سورہ محمدؐ میں بایں الفاظ وارد ہوا ہے۔ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ۝ (آیت: ۲۴) "کیا یہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟ یا دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں؟" — قرآن حکیم پر تدبر اور غور و فکر کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ اس کام کے لئے لوگ اپنی زندگیاں لگا دیں، کھپا دیں۔ یہ اتنا عظیم ترین کام ہے کہ اس کو ظاہر فرمانے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ

"تم میں سے بہتر لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔"

یعنی قرآن کی تعلیم و تعلّم کو اپنی زندگی کا اوّلین مقصد بنا لو، اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرو، اس کو اپنا CAREER بنا لو۔ اس سے اعلیٰ کام کوئی نہیں۔ یہ روایت صحیح بخاری کی ہے اور اس کے راوی خلیفۂ راشد ذو النورین حضرت عثمان ابن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ جن رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت سے عرشِ الٰہی تھرا اٹھا تھا۔ پس نوٹ کر لیجیے کہ قرآن کے سمجھنے کے دو درجے ہو گئے۔ ایک تذکر بالقرآن اور دوسرا تدبر قرآن۔

چوتھا حق: اس پر عمل کرو!

اب آئیے چوتھے حق کی طرف۔ "قرآن پر عمل کرو جیسے کہ عمل کا حق ہے۔" ظاہر بات ہے کہ عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں، بلکہ وہ علم سخت ترین بازپرس کا باعث بن جائے گا جس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ ایسا علم کسی درجہ میں بھی نفع کا ذریعہ بننے کے بجائے الٹا نقصان کا موجب بن جائے گا۔ اس لئے کہ علم کے مطابق عمل ہونا لازم ہے[1] اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] "الاتقان فی علوم القرآن" کے حوالے سے مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ نے "مبادی تدبر قرآن" میں روایت نقل کی ہے کہ: "ابو عبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھنے پڑھاتے تھے جیسے حضرت عثمانؓ ابن عفان اور عبداللہؓ ابن مسعود وغیرہ کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے تو آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورۃ کے حفظ میں وہ برسوں لگا دیتے تھے۔"

نے فرمایا: مَا اٰمَنَ بِالْقُرْاٰنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ (ترمذی) "جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرالے وہ قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتا"۔ گویا وہ جھوٹ بولتا ہے کہ میرا قرآن پر ایمان ہے۔ چنانچہ قرآن خود دوٹوک فیصلہ سناتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ○ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ ...... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (المائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷) "اور جو کوئی فیصلہ نہ کرے اس کی نازل کردہ شریعت کے مطابق تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں ..... تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں ..... تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو اللہ کی نازل کردہ کتاب، شریعت اور قوانین وضوابط کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ تین بڑے جرائم کا مرتکب قرار دیا ہے۔ پہلا یہ کہ وہ کافر ہیں۔ ان کا یہ فعل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ظالم ہیں۔ اگر یہاں ظلم کے لغوی معنی مراد لیے جائیں تو ان کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے۔ اللہ کے احکام عدل وقسط پر مبنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس سے ہٹ کر ہر فیصلہ ظلم قرار پائے گا۔ اور یہ ایک نوع کا شرک ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ فسق کے معنی ہیں اپنی جائز حدود سے تجاوز کرنا، مراد ہے اللہ کی نافرمانی کرنا ـــــ ان آیات کے سیاق میں قرآن سے پہلے نازل کردہ دو کتبِ الٰہی تورات وانجیل کا ذکر ہے۔ آیت ۴۷ کے متصلاً بعد اڑتالیسویں آیت میں نزولِ قرآن کا ذکر ہے: وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ط "اور (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) اب ہم نے آپ پر بھی کتاب برحق نازل کی ہے (یعنی قرآن مجید) جو ان کتابوں کی جو پہلے سے موجود ہیں تصدیق کرنے والی ہے اور ان کی محافظ بھی ہے۔ پس جو کچھ اللہ نے آپ پر نازل کیا ہے۔ آپ اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اور جو حق آپ کے پاس آچکا ہے اسے چھوڑ کر لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں"۔

سورۃ المائدہ میں باعادہ وتکرار یہ بات فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نازل فرمایا ہے وہ اس لئے نازل فرمایا ہے کہ اس کے مطابق فیصلے کرو۔ قرآن اس لئے نازل فرمایا کہ اس پر مبنی نظام قائم کرو۔ اس کے مطابق تمام جھگڑے نمٹاؤ۔ شریعت اس لئے نازل فرمائی کہ اس پر عمل پیرا ہو۔ اگر انفرادی واجتماعی معاملات میں قرآن پر عمل نہیں اور نہ عمل کا ارادہ

ہے تو قرآن کو اللہ کی کتاب ماننا، اس کی تلاوت کرنا اور اسے سمجھنا بیکار ہوجائے گا۔ میری اس بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو اقوال مبارک سے سمجھیئے۔ پہلا قول ہے: اَلْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ "قرآن یا تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا۔
یعنی اگر تمہارا عمل اس کے مطابق ہوگا تو تمہارا شفیع بنے گا۔ بصورت دیگر تمہارے خلاف مستغیث بن کر کھڑا ہوگا اور دعویدار ہوگا کہ اے اللہ! یہ شخص مجھ پر ایمان رکھنے کا مدعی تھا۔ میری تلاوت کرتا تھا، مجھے سمجھنے کے لئے وقت صرف کرتا تھا۔ لیکن اس نے میری ہدایات و تعلیمات پر نہ عمل کیا اور نہ عمل کرنے کا عزم وارادہ کیا۔ دوسرا قول مبارک ہے: اَکْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُھَا۔ "میری امت کے منافقین کی بڑی تعداد قراء پر مشتمل ہوگی"۔ یہاں قاری سے مراد عالم ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جو قاری ہوتا تھا وہی عالم بھی ہوتا تھا۔ ہمارے یہاں اس وقت جو تقسیم نظر آتی ہے کہ قاری اور ہے، عالم اور ہے، جو تجوید جانتا ہو اور قرآن کی خوش الحانی سے قرأت کرتا ہو، وہ ہمارے نزدیک قاری ہے، چاہے وہ عربی بالکل نہ جانتا ہو۔ وہاں اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ عالم ہی کو قاری کہتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری امت کے منافقین میں اکثریت قراء یعنی علماء کی ہوگی۔ ایسا کیوں ہوگا؟ اس لئے کہ سب سے زیادہ علم ان کے پاس ہوگا۔ اور اگر علم کے مطابق عمل نہ ہوا تو "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ"، کی زد میں سب سے پہلے وہی آئیں گے۔ جس بے چارے کا علم تھوڑا ہے اور اس نے اس کے مطابق عمل کرلیا تو وہ اللہ کے یہاں کامیاب ہوجائے گا۔ لیکن جو علم کے لحاظ سے کوہ ہمالیہ ہے لیکن عمل کے اعتبار سے کچھ نہیں تو وہ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی زد میں آرہا ہے کہ "اَکْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُھَا"۔ اللہ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھے۔ لہٰذا سلامتی کی راہ ایک ہی ہے کہ قرآن کا جتنا بھی علم حاصل ہو اس پر حتی الامکان فوری طور پر عمل شروع کردیا جائے۔
لیکن اس عمل کے بھی دو درجے ہیں۔ ایک انفرادی عمل کا دائرہ ہے۔ اللہ نے حکم دیا کہ نماز پڑھو۔ یہ آپ پڑھ سکتے ہیں۔ یہ تو انگریز کے دورِ استعمار میں بھی پڑھی جاتی تھی اور اس حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی۔ جو چاہے پڑھ سکتا تھا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ماہِ رمضان کے روزے رکھو۔ آپ رکھ سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہوں، ہندوستان میں ہوں خالص اور کٹر کافروں میں ہوں، تب بھی رکھ سکتے ہیں۔ کوئی پابندی نہیں، یہ آپ کا ذاتی فعل ہے۔ ایسے ہی اللہ نے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نصاب اور مقادیر مقرر

فرمادیں، آپ آج بھی اُسے ہر قسم کے ماحول میں ادا کر سکتے ہیں۔ کوئی قانون اس راہ میں حائل نہیں ہوگا ۔۔۔ اب میری بات غور سے سماعت فرمائیے۔

احکامِ شریعت کا ایک دائرہ ہر مسلمان کے انفرادی عمل اور اس کی نجی زندگی سے متعلق ہے۔ اس انفرادی عمل کے لئے ہر مسلمان ہر وقت اور ہر آن مکلف ہے۔ اگر عمل نہیں کر رہا تو اس کے پاس کوئی عذر نہیں ہے۔ یہ فسق ہے، نافرمانی ہے، عصیان و عدوان ہے۔

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمارا ماحول ٹھیک نہیں تھا۔ یا ہمارے یہاں اسلامی نظام قائم نہیں تھا اس لئے وہ بے عمل رہا۔ اگرچہ نظام قائم نہیں لیکن آپ نماز تو پڑھ سکتے ہیں۔ جہاں مسجدیں نہیں وہاں گھر میں پڑھ سکتے ہیں مسلمان معاشرہ موجود نہیں لیکن بہرحال روزہ تو تمہیں رکھنا ہے۔ اگر تم صاحبِ نصاب ہو تو معاشرے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مستحقین تک زکوٰۃ تو پہنچا سکتے ہو۔ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی پابندی کرنا تو تمہارا ذاتی فعل ہے کہ تم حرام کھاتے ہو یا اس سے اجتناب کرتے ہو۔ عورتوں کو ان کا حق وراثت ادا کرتے ہو یا رواج کے نام پر اور غیر مسلموں کی تقلید میں اللہ کے قانونِ وراثت کو پائے مال کرتے ہو۔ اس سے تمہیں کون روکتا ہے اسی طرح تم داڑھی رکھتے ہو کہ نہیں رکھتے یہ خالصتہً تمہارے ذاتی معاملات ہیں۔ اس کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔ تمہارا حال تو بقول علاّمہ اقبال یہ ہے کہ ؎

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدّن میں ہنود!
یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

یا تم نے داڑھی کو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت نہیں سمجھا اور بہت بڑے دھوکہ میں رہے یا تم نے یہ سمجھا کہ سنّت پر عمل ضروری نہیں ہے۔ یہ بہت بڑی گمراہی اور بہت بڑی ضلالت ہے ۔۔ اس دور کے بڑے بڑے فتنوں میں سے ایک بہت بڑا فتنہ انکارِ سنّت کا فتنہ ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ خالص انفرادی عمل ہے۔ اس کی جواب دہی ہر ایک کو کرنی ہے۔ دین کا جو یہ حصّہ ہے تو اس میں کسی رعایت کا سوال ہی نہیں ہے۔ اسی انفرادی عمل کے دائرے میں ایک نہایت اہم معاملہ اور آتا ہے جس سے ہم روز بروز نہ صرف غفلت برت رہے ہیں بلکہ نہایت ڈھٹائی کا وطیرہ اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ہے ستر و حجاب یعنی پردے کا مسئلہ ۔۔۔ اور تمام تمدّنی طور طریقوں میں مساواتِ مرد و زن اور ہر میدان میں عورتوں کا مردوں کے شانہ بشانہ حصّہ لینے کا مکروہ ہی

نہیں، قرآنی احکام اور سنت کے خلاف طرز عمل ـــــ اگر اللہ نے پردے کا حکم دیا ہے، ستر وحجاب کے احکام نازل کئے ہیں، اور مرد و عورت کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار کا تعین فرمایا ہے تو تاحال کوئی ایسا آرڈی نینس آپ پر نافذ نہیں ہوا کہ آپ کو قانوناً ان اوامر کی خلاف ورزی اور نواہی پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور ہونا پڑے۔ حکومت کی سطح پر اور مغرب زدہ طبقات کی طرف سے تحریص و ترغیب اور تشویق کا جو سیلاب ذرائع ابلاغ کی صورت میں آیا ہوا ہے، اسے تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیجئے۔ ہم فی الوقت اس معاملہ میں آزاد ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کے مختار ہیں۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال نے پردے کے خلاف آرڈی ننس جاری کر دیا تھا اور برقعہ یا چادر اوڑھنا ممنوع قرار دے دیا تھا لیکن قریباً پچاس سال کی تاریخ گواہ ہے کہ ترکوں نے من حیث القوم اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کی اُس وقت سے تاحال مخالفت و مزاحمت اور مقاومت جاری ہے، جب کہ آج بھی وہاں ان لڑکیوں کو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے نکالا جا رہا ہے جو چہروں پر نقاب ڈال کر آتی ہیں ـــ رضا شاہ پہلوی اوّل و دوم نے بھی ایران میں آرڈی ننس کے ذریعہ سے پردہ اور ستر وحجاب کے قوانینِ شریعت کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ خود ختم ہو گئے اور اب ایران میں پردہ اور ستر وحجاب کا جس قدر اہتمام ہے شاید ہی کسی دوسری مسلمان مملکت میں ہو۔ ایک ہم ہیں کہ یہاں ایسا کوئی آرڈی ننس موجود نہیں ہے، پھر بھی آپ کے گھر میں پردہ نہیں ہے اور ستر وحجاب کے اسلامی قوانین آپ کے گھروں میں پامال ہو رہے ہیں تو اس کی پوری ذمہ داری آپ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ سے اس بارے میں بڑی سخت باز پرس ہو گی۔ چونکہ ایسا کوئی آرڈی ننس موجود نہیں ہے کہ خواتین برقعے اتار دیں۔ بے حجاب سڑکوں پر، مارکیٹوں میں، تفریح گاہوں میں گشت کریں۔ یہ لعنت ہم نے خود اپنے اوپر مسلط کی ہے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ جس کے پاس چار پیسے ہو گئے اس کے گھر کی خواتین نے برقعہ اتار پھینکا۔ گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ برقعے کی "لعنت" صرف غریب کے لئے ہے۔ یہ ہم نے اپنے طرزِ عمل سے ثابت کیا ہے۔ جس کو مالی حیثیت سے آسودگی حاصل ہوئی، اس نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ پردے اور ستر وحجاب کے شرعی احکام کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اسی لئے میں کہا کرتا ہوں اور یہ بات بہت سوں کو بڑی ناگوار گزرتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو مہاجر کہتے ہیں۔ لیکن ہم دنیا کے مہاجر تھے، دین کے مہاجر نہیں تھے۔ اگر خالصۃً دین کے لئے ہجرت کی ہوتی تو یہ نقشے نظر نہ آتے کہ وہ گھرانے جن کی عورتوں کی حفیظ جالندھری کے اس مصرع کے مصداق یہ کیفیت

تھی کہ "چشمِ فلک نے آج تک دیکھی نہ تھی ان کی جھلک" جن کا دستور یہ تھا کہ اوّل تو باپردہ ڈولیوں میں آنے جانے کا التزام تھا، لیکن اگر تانگوں میں بیٹھنا ہو تو نہ صرف یہ کہ برقعوں سمیت بیٹھتی تھیں بلکہ ان تانگوں کے چاروں طرف چادریں تنا کرتی تھیں۔ وہ ہی خواتین اور وہ ہی گھرانے ہیں جن کی بہو بیٹیاں، پوتیاں اور نواسیاں آج سڑکوں پر بے حجاب ہی نہیں، نیم عریاں لباس میں گھومتی پھرتی نظر آرہی ہیں۔ ایسی عورتوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی رہتی ہیں۔ نبی اکرمؐ کے الفاظ ہیں:

رُبَّ كَاسِيَةٍ فِي الدُّنْيَا عَارِيَةٌ فِي الْآخِرَةِ

"بہت سی کپڑے پہننے والیاں آخرت میں ننگی ہوں گی" (بخاری: عن ام سلمہؓ)

لباس تو پہنا ہوا ہے لیکن اتنا باریک ہے کہ اس سے جسم جھلک رہا ہے یا لباس تنگ ہے کہ عورت کے لطیف جسم کے دلفریب اعضا نمایاں ہو کر دعوتِ گناہ دیتے ہیں یا وہ اعضاء جیسے سینہ کا بالائی حصہ، گردن، چہرہ، سر اور پورے کے پورے بازو کھلے ہوئے ہیں جن کا ڈھانپنا از روئے قانون ضروری ہے۔ تو یہ ننگی ہیں۔ ننگی عورتیں آج برسرِ عام گھوم پھر رہی ہیں، اور یہ تمام خواتین مسلمان کہلاتی ہیں۔ بہرحال یہ بھی انفرادی عمل ہے۔ اس کے بارے میں ہرگز ہرگز یہ عذر قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ ہمارے ساتھ یہ مجبوری تھی یا وہ مجبوری تھی۔ یہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ اگر آپ کا اپنے گھر پر قابو نہیں ہے تو پھر آپ بحیثیت مرد گھر کے قوام اور حاکم نہیں ہیں، محکوم ہیں ــــ اور محکومی سے آزاد ہونے کی کوشش کرنا، محکومی کے بندھن توڑ دینا ایک مردِ حُر کی شان ہوتی ہے۔

لیکن اس سے آگے عمل کا ایک دائرہ اور ہے۔ وہ دائرہ یہ ہے کہ قرآن کے بعض تشریعی احکام وہ ہیں کہ جب تک نظام نہ بدلے ان پر عمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا، یہ آپ نہیں کاٹ سکتے۔ غیر شادی شدہ مرد و عورت پر زنا کی حد یہ ہے کہ ان پر سو سو کوڑے برسائے جائیں۔ یہ سزا آپ نہیں دے سکتے۔ شادی شدہ مرد یا عورت کے زنا میں ملوث ہونے کی حد رجم یعنی سنگسار کرنا ہے۔ یہ کام آپ نہیں کرسکتے۔ قتلِ عمد میں مقتول کے ورثا کے ہاتھ میں فیصلہ کا حق ہے کہ وہ چاہیں تو معاف کردیں، چاہیں تو خون بہا میں کوئی رقم لے کر چھوڑ دیں اور چاہیں تو قصاص میں اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں۔ آپ از خود یہ فیصلے نہیں کرسکتے۔ اسی طرح قتلِ ناحق کی دیت کا معاملہ ہے اور دوسرے بھی قوانین ہیں جن پر انفرادی طور پر کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ قوانین ملک کے اجتماعی نظام سے متعلق ہیں۔ ان کا نفاذ اسی وقت ہوسکتا ہے۔ جب حکومت کی سطح پر فیصلے ہوں ــــ اسی طریقے سے سود

کی حرمت کا معاملہ ہے ۔ اس سے آپ انفرادی طور پر تو بچ سکتے ہیں اور جس حد تک بھی بچ سکیں ، یہ آپ پر واجب ہی نہیں فرض ہے ۔ البتہ ملک کے اقتصادی نظام کو سود کی غلاظت سے پاک کرنا انفرادی طور پر ممکن ہی نہیں ہے ۔ اس کا تعلق بھی ملک کے اجتماعی نظام سے ہے ۔ اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ایک زمانہ وہ آئے گا کہ کوئی شخص چاہے سود سے بچ جائے لیکن سود کے غبار سے نہیں بچ سکے گا ۔ یہ تو جب ہی ممکن ہوگا جب الصادق والمصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو جائے اور ان شاء اللہ یہ ہو کر رہے گا ۔ آج کوئی دعوٰی نہیں کر سکتا کہ وہ سود کے غبار سے بچا ہوا ہے ۔ لیکن یہ تو کر سکتا ہے کہ ساری عمر کرائے کے مکان میں رہے اور سودی قرضہ لے کر بنگلہ اور کوٹھی نہ بنائے ۔ لیکن کتنے ہی حاجی ہیں اور کتنے ہی مسجدوں کے متولی اور منتظمین ہیں ، جنہوں نے سودی قرضے لے کر بلڈنگوں پر بلڈنگیں کھڑی کر رکھی ہیں ۔ اور بنک کے سود سے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا کاروبار جمایا جا رہا ہے ۔

بہرحال آپ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جن اسلامی احکام و قوانین پر نظام کے بدلنے کی صورت ہی میں عمل درآمد ہو سکتا ہے اور ہم اس معاملہ میں مجبور ہیں تو اس کی تلافی کی کیا صورت ہوگی ! وہ یہ ہے کہ غیر اسلامی نظام کو بدلنے کی کوشش کرو ! اگر جدّوجہد کر رہے ہو ، تن من دھن لگا رہے ہو ، وقت صرف کر رہے ہو ، توانائیاں اور توتیں کھپا رہے ہو ۔ تب تو اللہ کے یہاں بری ہو جاؤ گے اور یہ کہہ سکو گے کہ اے رب ، جو کچھ ہمارے بس میں تھا اس سے ہم نے دریغ نہیں کیا —— لیکن اگر یہ کام ، یہ جدّوجہد ، یہ سعی و کوشش نہیں کر رہے اور اسی ماحول میں زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور اپنے معیارِ زندگی کو زیادہ سے زیادہ بلند کرتے اور رمال دار ہی نہیں خالص سرمایہ دار بننے میں روز و شب صرف ہو رہے ہیں ۔ ساری بھاگ دوڑ ، ساری تگ و دو ، ساری توجہات دنیا کمانے میں صرف ہو رہی ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ دین کے اس حصّہ پر جس کا تعلق اجتماعی نظام سے ہے ، عمل پیرا نہ ہونے کے بھی اللہ کے یہاں آپ مجرم قرار پائیں گے —— یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے کہ نظام کو بدلنے کی سعی و کوشش کا طریق کار کیا ہے ! اس ضمن میں " استحکام پاکستان " کے عنوان سے میرے جو مضامین قسط وار روزنامہ جنگ میں شائع ہوئے تھے ، وہ اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں[1] ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے " اسلامی انقلاب " کے منہج کے کچھ نہ کچھ خدوخال

---

[1] الحمد للہ اس کا دوسرا حصّہ بھی " استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ " کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے (ادارہ)

آپ حضرات کے سامنے آسکتے ہیں۔ علاوہ ازیں میری دس تقاریر "منہجِ انقلابِ نبوی" یعنی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اجمالی مطالعہ، فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے، کے موضوع پر ماہنامہ میثاق میں شائع ہو چکی ہیں اور ان کے کیسٹس بھی موجود ہیں[1]۔ میں نے اسلامی انقلاب کا جو طریق و منہج سیرتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ کے نتیجہ میں اخذ کیا ہے، اور جو حضورؐ ہی کی سیرتِ مطہرہ سے مستنبط کیا ہے اسی کو میں نے ان تقاریر میں بیان کیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی ایک سلسلۂ مضامین اس موضوع پر شروع کروں گا کہ پاکستان کے موجودہ حالات میں عملاً اسلامی انقلاب کو برپا کرنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منہجِ انقلاب سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے اور احادیثِ شریفہ سے وہ کون سی اصولی ہدایات ہمیں ملتی ہیں، جن کو اس دور میں روبعمل لایا جا سکتا ہے[2]۔ اس وقت ان کے بیان کرنے کا نہ محل و موقع ہے اور نہ وقت۔ البتہ اصولی طور پر یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ عمل بالقرآن کے ذیل میں ایک عمل انفرادی ہے۔ اس پر ہر دم، ہر لحظہ، ہر آن ہر مسلمان مکلّف ہے، میں بھی مکلّف ہوں اور آپ بھی۔ عمل نہیں کر رہے تو ہم میں سے کوئی بھی عدالتِ خداوندی میں کوئی عذر پیش نہیں کر سکتا۔ ہاں عمل بالقرآن کے ضمن میں اجتماعی نظام سے متعلق جو حصے ہیں، ان پر اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ نظام نہ بدلے۔ نظام بدلنے کا نام ہی انقلاب ہے۔ اس انقلابِ اسلامی کو برپا کرنے کی جدّوجہد کرنا، اس کے لئے سعی و کوشش کرنا، اس کے لئے محنت و مشقت جھیلنا، اس کے لئے تن من دھن لگانا۔ یہ چیزیں گویا قائم مقام ہو جائیں گی، دین کے ان حصوں پر عمل کرنے کی جن پر غیر اسلامی نظام کے مسلّط و مستولی ہونے کی وجہ سے عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ علیم بالذاتِ الصدور ہے۔ اگر ہم اس کے دین کی اجتماعی نظام پر اقامت کے لئے خلوص دل سے اور صحیح نہج پر جدّوجہد کرتے رہیں گے تو توقع ہے کہ وہ غفور و رحیم ہماری ان مساعی کو نظام سے متعلق حصوں پر عمل پیرا نہ ہونے کے عذر کے طور پر قبول فرما لے گا۔

پانچواں حق: اسے دوسروں تک پہنچاؤ!

اب آیئے پانچویں اور آخری حق کی طرف۔ ماننے، پڑھنے، سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ قرآنِ مجید کا ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد یہ حق بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اسے پھیلائے اور اسے دوسروں تک پہنچائے۔ اس کے لئے قرآن حکیم کی اصل اور جامع اصطلاح "تبلیغ" ہے۔ اس تبلیغ کے ضمن

---

[1] الحمدللہ یہ دس تقاریر اسی عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں (ادارہ)

[2] الحمدللہ یہ سلسلۂ تقاریر ماہنامہ میثاق میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے کیسٹس بھی موجود ہیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ بھی جلد کتابی شکل میں شائع ہو جائیں گی (ادارہ)

میں خاتم النبیین، سید المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں اپنے آخری خطبہ میں یہ ذمہ داری امت کو منتقل فرمائی۔ آپؐ نے پہلے تو سوال کیا: اَلَا ھَلْ بَلَّغْتُ؟ "لوگو! میں نے پہنچا دیا کہ نہیں؟" اور پورے مجمع نے جواب میں عرض کیا: اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ "(حضورؐ!) بے شک ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حقِ تبلیغ ادا فرما دیا، حقِ امانت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی کا حق ادا کر دیا"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سوال تین مرتبہ دہرایا ــــ اور تین دفعہ جواب لے کر پھر آپؐ نے آسمان کی طرف اپنی انگشتِ مبارک اٹھا کر تین مرتبہ فرمایا: اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ۔ "اے اللہ! تو بھی گواہ رہنا" ــــ یہ مان رہے ہیں کہ میں نے ترا پیغام، ترا کلام، ترا دین ان تک پہنچا دیا۔ پھر ان لوگوں سے جو حجۃ الوداع کے موقع پر موجود تھے اور جن کی تعداد بعض روایات میں سوا لاکھ تک آئی ہے مخاطب ہو کر فرمایا:

فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ

"اب پہنچائیں وہ لوگ جو یہاں موجود ہیں ان لوگوں
تک جو موجود نہیں ہیں"

اس لئے کہ میری رسالت صرف تمہارے لئے نہیں ہے۔ میں تو پوری نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ پوری نوعِ بشر تک قرآن کی تبلیغ میری ذمہ داری ہے۔ میں نے تم تک پہنچا دیا۔ اب میری طرف سے تم ذمہ دار ہو کہ اسے بنی نوعِ آدم تک پہنچاؤ۔ تبلیغِ قرآن کی یہ ذمہ داری ہے جو نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے سپرد فرما کر الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی۔ اس تبلیغِ قرآن کی ذمہ داری کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس درجہ عام کیا اور ہلکا کیا ہے کہ ارشاد فرمایا: بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً۔ "پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!"۔ یہاں "عَنِّیْ" کا لفظ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ انگریزی میں 'on my behalf' جو مفہوم ادا کرتا ہے بالکل وہی مفہوم "عَنِّیْ" کا ہے ــــ اس حدیث کے ضمن میں لوگوں کو کچھ مغالطے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کا بیان کرنا، اس کو پھیلانا اور اس کی تبلیغ کرنا تو صرف ان علماء کرام کا کام ہے جنہوں نے چودہ یا سترہ علوم پڑھ رکھے ہوں۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اصل میں چودہ یا سترہ علوم واقعتہً ضروری ہیں لیکن ان کے لئے جو مسندِ افتاء پر بیٹھے ہوں۔ جنہیں فتاویٰ دینے ہوں کہ کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے! کیا حلال ہے کیا حرام ہے! فلاں مسئلہ میں شریعت کا کیا حکم ہے! فلاں الجھن میں شریعت کیا حل بتاتی ہے! نکاح و طلاق کے احکام کیا ہیں! وراثت

کے قوانین کیا ہیں ! مضاربت و مشارکت کے قواعد و ضوابط کیا ہیں ! اور بہت سے وہ تشریعی و فقہی مسائل جن سے لوگوں کو تمدنی زندگی میں بار بار سابقہ پیش آتا ہے ۔ یہ بہت بڑی، بہت بڑی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس کی اہمیت کی وضاحت کے لئے یہ بات نہایت زور دے کر کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی حدیث اور فقہ کا ماہر نہیں، قرآن و حدیث کے ناسخ و منسوخ سے واقف نہیں، مختلف ائمۂ فقہ کی آراء سے ناواقف ہے اور ان کے دلائل کو نہیں جانتا تو وہ کسی مسئلہ میں فتویٰ کیسے دے سکے گا ۔! اس کے لئے صرف و نحو اور لغت میں مہارت کی بھی ضرورت ہے ۔ پھر علم تفسیر و تاویل اصولِ تفسیر، اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ جیسے علوم پر جب تک انسان کی نظر نہ ہو وہ فتویٰ دینے کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کوئی دیتا ہے تو بڑی جسارت سے کام لے رہا ہے ۔ بہت بڑی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے رہا ہے ۔ علم کے بغیر اور لاعلمی کی بنیاد پر کوئی فتویٰ دے دینا درحقیقت اپنے آپ کو بڑے فتنہ میں ڈالنا ہے ۔ یہ تمام احتیاطیں فتویٰ دینے کے لئے ملحوظ رکھنی ضروری ہیں، تبلیغ کے لئے نہیں تبلیغِ قرآن کے لئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام اجازت ہے کہ جس نے ایک آیت اچھی طرح سمجھ لی ہے، وہ ایک آیت پہنچائے " بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً " یہ ارشاد اسی عموم کو واضح کرتا ہے ۔ جس نے آگے بڑھ کر ایک سُورت سمجھ لی ہے، وہ ایک سُورت پہنچائے ، اسے عام کرے ۔ یہ عمل جب تک عوامی سطح پر نہیں ہوگا، ہمارے معاشرے کی اور ہمارے عوام کی قرآن مجید سے جو دوری ہے اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ لہٰذا دعوت و تبلیغ کی بات اور ہے اور فتویٰ کی بات دوسری ہے۔ یہی اعتراض لوگ کبھی ہم پر کر دیتے ہیں، کبھی تبلیغی جماعت والوں پر کر دیتے ہیں کہ یہ لوگ درسِ قرآن یا تبلیغِ دین کے لئے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں جبکہ یہ لوگ علومِ دینیہ سے واقف نہیں ہیں اور دینی مدارس سے فارغ التحصیل نہیں ہیں۔ حالانکہ وہ فتویٰ نہیں دے رہے ہوتے بلکہ وہ تو لوگوں کو خیر کی تلقین کرتے ہیں، نصیحت کرتے ہیں ۔ بھلائی کی طرف بلاتے ہیں، عبادتِ رب کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ علم بتا دے کہ فلاں بات تم نے صحیح نہیں کہی ہے تو وہ اصلاح کر لیتے ہیں لہٰذا اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی حرج اور مضائقہ نہیں ۔ بلکہ عوامی سطح پر دعوت الی القرآن اور دعوت الی الخیر اس دور کی شدید ترین ضرورت ہے ۔ اور اس کے لئے بہت بڑے پیمانے پر منظم ہو کر کام کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے ۔ لیکن حال یہ ہو گیا ہے کہ نہ خود کچھ کرو اور نہ کسی اور کو کرنے دو ۔ اس کا سارا نقصان کس کا ہوگا ! تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ امّت کے بگاڑ میں اضافہ ہوگا۔ تمہارا جو کچھ بگڑے گا وہ آخرت میں جا کر بگڑے گا ۔ وہاں جو جواب دہی کرنی ہوگی ۔ اس کو سوچ لینا ۔ دنیا میں تو کچھ بگڑتا

ہیں۔ نہ خود کچھ کرو، نہ کسی دوسرے کو کرنے دو۔ یہ اعتراضات عموماً وہی لوگ کرتے ہیں جو خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجئے کہ دعوت و تبلیغ، فتوئی سے بالکل علیحدہ شے ہے۔ چنانچہ قرآن کی طرف دعوت دیجیے۔ قرآن کی تبلیغ کیجیے۔ اس کے لئے کوئی لمبے چوڑے علوم و فنون کی ضرورت نہیں۔ قرآن ناظرہ پڑھنا آتا ہے تو ناظرہ سکھاؤ۔ ترجمہ سیکھ لیا ہے تو ترجمہ سکھاؤ اور کچھ مزید وضاحتیں تمہارے سامنے ہیں تو ان کو عام کرو۔ البتہ یہ احتیاط لازم و لابد ہے کہ کوئی شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ نہ کہے۔ آخر ہماری امت میں مفکرین گزرے ہیں، محدثین گزرے ہیں اور بڑے بڑے مفسرین گزرے ہیں۔ پھر بحمد اللہ ہمارے اس دور میں بھی متعدد ایسے علماءِ عظام گزرے ہیں۔ جنہوں نے اردو میں قرآن حکیم کی تفاسیر کا بیش بہا اور بیش قیمت سرمایہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ کیا مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ نے ساری تفاسیر کا خلاصہ اپنی تفسیر معارف القرآن میں بیان نہیں کر دیا؟ یا صاحب روح المعانی نے عربی کی تمام تفاسیر کا عطر اپنی تفسیر میں پیش نہیں کر دیا! آج ہمارے لئے کتنی سہولت ہے: آج ہمارے پاس صحابہ کرامؓ، تابعین اور سلف کے مفکرین و مفسرین کے تفسیر قرآن کے ضمن میں مستند اقوال موجود ہیں۔ ان بزرگان دین کے حوالے سے کہو جو کچھ کہنا ہو۔ ہر پڑھے لکھے مسلمان پر خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت لازم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانِ مبارک کی تعمیل میں کہ "بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً"، چراغ سے چراغ جلائے۔ ایک آیت سیکھ لی ہے، اُسے دوسروں تک پہنچائے۔ اللہ توفیق دے تو عربی کی ناگزیر حد تک تحصیل کرے اور پھر شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کا ترجمہ اور اس پر شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سمجھ لے اور انہیں عام کرے۔ جو مزید گہرائی میں جانا چاہتا ہے اور فقہی مسائل کو بھی جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے وہ مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ کی تفاسیر 'معارف القرآن' سے استفادہ کرے۔ جدید ذہنوں تک قرآن کا پیغام پہنچانا ہو اور اس کی دعوت پہنچانا مقصود ہو تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی 'تفہیم القرآن' اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم و مغفور کی 'تفسیر ماجدی' سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے نظام اور اس کے اندرونی نظم بالخصوص سورتوں کے باہمی ربط و ضبط اور تعلق کو سمجھنے کا ذوق و شوق ہو تو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر 'تدبر قرآن' اس کے لئے مفید ہو گی ـــــ اس موقع پر یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ کسی ایک شخص کی تفسیر آپ کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ قرآن حکیم کے اتنے متعدد پہلو ہیں کہ سب پر بیک وقت عمیق نظر ڈالنا اور ان پر تدبر و تفکر کرنا کسی ایک شخص کے لیے ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ہر شخص اپنے

زاج اور اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن کو دیکھتا ہے۔ مثلاً اس وقت میرے سامنے ایک میز رکھی ہوئی ہے۔ جو حضرات داہنی طرف بیٹھے ہیں، وہ ایک زاویہ سے اِسے دیکھ رہے ہیں اور اس کا ایک نقشہ ان کے ذہن میں قائم ہو رہا ہے۔ جو لوگ بائیں طرف بیٹھے ایک دوسرے زاویہ سے اِسے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ذہن میں اس کی تصویر کچھ اور ہے۔ اور جو حضرات سامنے بیٹھے ہیں اور سامنے سے میز کو دیکھ رہے ہیں انہیں ایک تیسرے زاویہ سے اس کی شکل کچھ اور نظر آ رہی ہے۔ اگرچہ میز ایک ہی ہے لیکن زاویۂ نگاہ کے فرق کی وجہ سے کسی کو اس کا کوئی ایک حصّہ زیادہ واضح طور پر نظر آ رہا ہے اور کسی کو کوئی دوسرا حصّہ۔ اسی طرح قرآن مجید ایک ہی ہے۔ لیکن جب اہل علم مختلف زاویوں (Angles) سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی کے سامنے کوئی ایک پہلو اور کسی کے سامنے کوئی دوسرا پہلو زیادہ نمایاں ہو کر آتا ہے۔ جس شخص کے دل میں دعوت رجوع الی القرآن اور تبلیغ قرآن کا کماحقہٗ فریضہ انجام دینے کا شدید داعیہ بیدار ہو اس کا کام یہ ہوگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پہلوؤں کو جمع کر لے ـــــ بہرحال حسبِ صلاحیت و استعداد کسی بھی درجہ میں قرآن کو عام کرنا اور پھیلانا اور اسے دوسروں تک پہنچانا ہر امتیٔ محمد علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کا فرض منصبی ہے۔

الحمد للہ میں نے جو بات عرض کی تھی کہ ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت و استعداد قرآن مجید کے پانچ حقوق عاید ہوتے ہیں۔ پہلا: ایمان و تعظیم، دوسرا تلاوت و ترتیل، تیسرا تذکّر و تدبّر، چوتھا حکم و اقامت اور پانچواں تبلیغ اور دعوت الی القرآن۔ بفضلہٖ تعالیٰ و عونہٖ میں نے اپنی امکانی حد اور مقدور کے مطابق ان کو اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اب میں اس حدیث شریف کی تشریح و توضیح بیان کرنا چاہتا ہوں جو میں نے آغاز میں آپ حضرات کو سنائی تھی۔ آپ دیکھیں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ساری باتیں جامعیت کے ساتھ اس ایک حدیث میں بیان فرما دی ہیں۔

یہ حدیث حضرت عبیدہ مُلیکی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے اور اسے امام بیہقیؒ اپنی کتاب "شعب الایمان" میں لائے ہیں۔ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نوع کا خطبہ ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں: يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ "اے قرآن والو!" جن لوگوں نے یہ حدیث پہلی بار سُنی ہو اُن کو یہ طرزِ تخاطب عجیب لگا ہوگا۔ یہ خطاب ہم وزن ہے اس خطاب کے جو قرآن یہود و نصاریٰ کو دیتا ہے۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ۔ مجھے اس اعتبار سے یہ حدیث بڑی پیاری

لگتی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مخاطب ہو کر فرمایا : یَا اَھْلَ الْقُرْآن "اے قرآن والو!" سبحان اللہ، کتنا پیارا خطاب ہے جو اُمتِ مسلمہ کو ملا۔ میں اپنی بعض تقاریر میں عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ ہماری بہت سی غلطیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے غاصبانہ طور پر اپنے لئے "اہل القرآن" کا نام اختیار کر لیا ہے، ہم نے بھی اُن کو اسی نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ نام انہوں نے انکارِ سنت و حدیث پر پردہ ڈالنے کے لئے اختیار کیا ہے۔ ان کا اصل نام ہونا چاہئے "منکرین سنت اور منکرین حدیث"۔ یہ ہماری بڑی نادانی ہے کہ ہم نے اُن کے اس غاصبانہ قبضے کو تسلیم کر لیا اور ان کو یہ نام الاٹ کر دیا جب کہ حقیقت میں "اہل القرآن" وہ نہیں ہیں، ہم ہیں۔ اس حدیث شریف کے ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔ کتنے بلیغ ہیں یہ الفاظ جن میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے جو حقوق عاید ہوتے ہیں، ان کا کمال اختصار مگر جامعیت کے ساتھ احاطہ کر لیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا : یَا اَھْلَ الْقُرْآن لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ۔ "اے اہلِ قرآن! قرآن کو تکیہ مت بنا لینا"۔ اس میں کتنی بلاغت و فصاحت ہے۔ حضورؐ خود فرماتے ہیں "اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ" "میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں" اور میں سمجھتا ہوں کہ فصاحت و بلاغت کی معراج ہے ان الفاظ مبارکہ میں کہ "لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ" کیا معنی! ایک تو آدمی تکیہ پر سہارا لیتا ہے لہٰذا ایک مفہوم تو یہ ہوا کہ اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو محض ایک ذہنی سہارا نہ بنا بیٹھنا کہ ہم قرآن کو ماننے والے ہیں۔ ہمارا وطیرہ ہے کہ بس اپنے ذہن میں اس کتاب کی تقدیس کا ایک خانہ کھول رکھا ہے اور اسے اچھے سے اچھے جزدان میں لپیٹ کر رکھ چھوڑا ہے۔ کہیں قسم کھانے کی ضرورت پڑ جائے، چاہے وہ جھوٹی قسم ہو تو اس کتاب اللہ کے حوالہ سے کھالی جائے اور جھوٹی شہادتوں کے لئے اس کی آڑ لے لی جائے۔ ہدایت حاصل کرنے کے لئے مطالعۂ قرآن خال خال ہی رہ گیا ہے۔ حصولِ ثواب کے لئے اس کی تلاوت کے التزام و اہتمام میں روز بروز کمی آ رہی ہے اور اب تو تلاوت کا زیادہ مصرف ایصالِ ثواب ہی سمجھ لیا گیا ہے۔ بقول علامہ اقبال قرآن سے اتنا تعلق رہ گیا ہے کہ ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست   کہ از یٰسینِ او آساں بمیری

جب کہ قرآن پر ایمان سے بڑی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُن کو ادا کرنے کی فکر کریں نہ کہ اسے محض ایک ذہنی سہارا بنا لیا جائے —— دوسرا مفہوم یہ ہوا کہ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے۔ تو اے اہلِ قرآن! اس قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ جیسے سورۃ البقرہ

میں یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا گیا ہے : نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ (آیت ۱۰۱) "جن لوگوں کو (اللہ کی طرف سے) کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اپنی پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا" ۔ یعنی وہ اس سے بے نیاز اور بے پروا ہو گئے ۔ تو اے اہلِ قرآن! تم ایسا ہرگز نہ کرنا ۔ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ ' میں یہ دونوں مفہوم آ گئے ۔ اس طرزِ عمل سے بچنا ہے تو پھر کیا کرنا ہے! اب وہ سنئے، حضورؐ نے آگے ارشاد فرمایا: وَاتْلُوهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۔ "اس کو پڑھا کرو، اس کی تلاوت کیا کرو، جیسے اس کی تلاوت کا حق ہے، رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ دوسری بات کیا فرمائی! وَافْشُوهُ ۔ "اسے پھیلاؤ، اسے عام کرو"۔ یہ لفظ کیا ہے! آپ افشائے راز استعمال کرتے ہیں ۔ راز افشار ہو گیا یعنی راز کھل گیا، راز کی بات تھی عام ہو گئی، اس کا چرچا ہو گیا ۔ حضورؐ نے وہ لفظ استعمال فرمایا: "افْشُوهُ" اس قرآن کو عام کرو، اسے پھیلاؤ، اسے دوسروں تک پہنچاؤ اور چہار دانگِ عالَم کو اس کے نور سے منور کر دو ۔ تیسری چیز کیا فرمائی! وَتَغَنَّوْهُ ۔ اس کے دو معانی بیان کئے گئے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ قرآن کو غنا کے ساتھ، تغنی کے ساتھ پڑھو، خوش الحانی کے ساتھ پڑھو ۔ میں اس کے ضمن میں آپ کو دو حدیثیں سنا چکا ہوں ۔ ایک یہ کہ : زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ ۔ دوسری یہ کہ ؛ مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا ۔ اس کے دوسرے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں کہ اس قرآن کے ذریعے سے غنی ہو جاؤ، مستغنی ہو جاؤ ۔ کسی کے سامنے اپنی احتیاج کے لئے دستِ سوال دراز نہ کرو ۔ قرآن سب سے بڑی دولت ہے، اس دولت سے دامن بھر لو، اللہ تمہیں غنی کر دے گا ۔ آخری بات کیا فرمائی ؛ وَتَدَبَّرُوا فِيهِ ۔ " اور اس (قرآن) میں تدبر کرو ۔ اس کی گہرائیوں میں غور و فکر کرو، اس کے معانی کے سمندر میں غوطہ زنی کرو ۔ میں اقبال کا یہ مصرع آپ کو سنا چکا ہوں کہ "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان"۔ جتنی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرو گے، علوم و معارف اور عرفان کے اتنے ہی قیمتی خزینے ملیں گے ۔ وَتَدَبَّرُوا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ " اور قرآن میں تدبر کرو، غور و فکر کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ، بامراد ہو جاؤ، کامران ہو جاؤ ۔ فوز و فلاح سے ہمکنار ہو جاؤ "۔ میں صمیمِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین یا ربَّ العٰلمین!

اب صرف ایک بات اور عرض کرنی ہے ۔ میں نے کئی بار اپنے کتابچے کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان ہے ۔ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"۔ الحمد للہ یہ کتابچہ تا حال کئی ایڈیشنوں کی صورت

میں قریباً دو لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ اس کے تراجم انگریزی عربی اور فارسی میں بھی شائع ہو چکے ہیں[۱]۔ اس کتابچے کے بارے میں اس وقت مجھے ایک خاص بات عرض کرنی ہے کہ ۱۹۷۰ء کے اواخر میں جنرل یحییٰ خاں کے دورِ حکومت میں جب پاکستان میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن ہونے والے تھے، مجھ پر جمعیت علماء اسلام کی طرف سے شدید دباؤ پڑ رہا تھا کہ میں کرشن نگر (حال اسلام پورہ) کے حلقہ سے جہاں میری رہائش اور مطب تھا، جمعیت کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصّہ لوں۔ میں نے بڑی معذرت کی لیکن بزرگوں کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ ادھر مجھے جماعتِ اسلامی کے ایک بزرگ کی طرف سے یہ اشارہ بھی ملا کہ اس حلقۂ انتخاب سے میں اگر جمعیت کے ٹکٹ پر کھڑا ہوا تو جماعت اس حلقہ میں اپنا کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ اب میرے لئے شدید امتحان کا مرحلہ آ گیا۔ میں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ فوراً پاکستان سے باہر چلا جاؤں تاکہ بزرگوں کے اصرار سے بچ سکوں۔ اللہ تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور میں حجازِ مقدس چلا گیا۔ اس طرح مجھے ۷۰ء کا پورا رمضان مدینہ منورہ میں گزارنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔ آج بھی اس کی یادیں ہیں جن سے کبھی کبھی اپنے دل و دماغ کو معطر کر لیتا ہوں۔ آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔ ان کا معمول تھا کہ وہ ہر رمضان میں آخری عشرے میں مسجد نبویؐ میں اعتکاف کیا کرتے تھے۔ میں نے ان کی خدمت میں اپنے اس کتابچے کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ پیش کیا اور ان سے استدعا کی کہ میں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانا چاہتا ہوں، آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور اگر کوئی غلطی نظر آئے تو اس کی اصلاح فرما دیں، میں اس کی اصلاح کر لوں گا۔ میں مولانا نور اللہ مرقدہٗ کا بڑا احسان مند ہوں کہ انہوں نے حالتِ اعتکاف میں مسجد نبوی (علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں اسے بالاستیعاب پڑھا اور صرف ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی۔ میں نے اس کے مطابق اپنے فقرہ کو بدل دیا۔ مجھے آپ حضرات کو یہ بتانا ہے کہ پہلے ایڈیشن کے بعد سے جو بڑی محدود تعداد میں شائع ہوا، اب تک جو کتابچہ چھپتا رہا ہے اور پھیلتا رہا ہے، اس کے ایک ایک لفظ کو بحمد اللہ مولانا بنوری مرحوم و مغفور کی تصدیق و تصویب کی سعادت حاصل ہے۔

میں آپ کو دعوت دوں گا کہ مسلمانوں میں قرآن مجید، فرقانِ حمید کی طرف توجہ اور التفات پیدا

---

[۱] الحمد للہ اس کا سندھی ترجمہ بھی انجمن خدام القرآن سندھ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ پشتو میں ترجمہ کا کام ہو رہا ہے۔ مزید برآں انگلینڈ اور امریکہ و کناڈا میں بھی چند دینی ادارے اس کا انگریزی ترجمہ اپنے طور پر شائع کر چکے ہیں۔ (ادارہ)

کرنے کے لیے اس کتابچے کو ذریعہ بنائیے، اسے خود بغور پڑھئے اور دوسروں تک پہنچائیے۔
یہاں مبادا آپ کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ میں کتاب فروشی کر رہا ہوں، معاذ اللہ۔ اس کا کوئی حق تصنیف نہ میرا محفوظ ہے، نہ انجمن خدام القرآن کا نہ تنظیم اسلامی کا۔ میری ہر تصنیف و تالیف ہوا اور پانی کی طرح عام ہے۔ میری ہر کتاب پر لکھا ہوتا ہے کہ اس کو شائع کرنے کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے۔ اس کو آپ چھاپئے، کوئی ادارہ چھاپے، مفت تقسیم کرے یا قیمت پر فروخت کرے، میری اور انجمن کی طرف سے کوئی قانونی اور اخلاقی پابندی سرے سے عائد نہیں ہے۔ میں غالباً ۱۹۸۷ء میں جب پہلی بار دعوتی دورے پر امریکہ گیا تھا تو شکاگو میں جو بلیک مسلم ہیں ان کی ایک تنظیم ہے جس کے امیر وارث علی جاہ ہیں جو الحمد للہ صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ تو میں نے ان کو اس انگریزی ترجمہ مطالعہ کے لئے دیا تھا۔ دوسری ملاقات میں انہوں نے اس کتاب کی تحسین کی اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ اسے اپنی تنظیم کی طرف سے شائع کیجئے اور میرے نام کے بغیر شائع کیجئے۔ مبادا یہاں کے لوگوں کے لئے یہ بات حجاب بن جائے کہ کسی پاکستانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔
میری تمنا اور آرزو تو یہ ہے کہ یہ فکر عام ہو۔ مسلمان میں اعتصام اور تمسک بحبل اللہ کا جذبہ از سرِ نو بیدار ہو اور وہ رسولِ خاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس آلۂ انقلاب کو ہاتھ میں لے کر دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ میری حقیر سی توانائیاں اسی مقصد کے لئے لگ رہی ہیں۔ اور اسی کے لئے میں امسال آپ کے شہر کراچی میں یہ رمضان گزارنے اور تراویح کے دوران دورۂ ترجمۂ قرآن کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ میں یہ کام اپنے توشۂ آخرت کے پیش نظر انجام دے رہا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ اس کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی پر میرا کامل ایمان ہے، جس کے راوی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے خلیفۂ راشد امیر المؤمنین فاروقِ اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ـــ اور جسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتٰبِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ اٰخَرِیْنَ " اللہ تعالیٰ اس کتاب عزیز (کے اعتصام و تمسک) کی بدولت کچھ قوموں کو رفعت و عزت اور سربلندی سے نوازے گا۔ اور اس (کتاب کو ترک کرنے) کے باعث کچھ قوموں کو ذلت و نکبت سے دوچار فرمائے گا"۔ علامہ اقبال نے جوابِ شکوہ کے ایک شعر میں اس حدیث کی ترجمانی کی ہے جسے ایک لفظ کے تصرف کے ساتھ آپ کو سناتا ہوں ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور "ہم" خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

آج پوری دنیا میں مسلمان جس انحطاط اور ذلّت و نکبت سے دوچار ہیں اور ضلالت و گمراہی کے اندھیارے ہمیں جس طرح ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے رہے ہیں تو اس کا اصل سبب مہجوریٔ قرآن اور ترکِ قرآن ہے۔ ورنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں امّت کو پیشگی متنبہ فرما گئے تھے اور حضورؐ کے خطبہ کے آخری الفاظ یہ تھے کہ:

وَقَدْ تَرَكْتُ فِيكُمْ مَا إِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهِ فَلَنْ تَضِلُّوا أَبَدًا كِتَابَ اللهِ

(مسلم شریف)

"(مسلمانو!) میں یقیناً تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ کر جارہا ہوں جس کا سررشتہ اگر تم مضبوطی سے تھامے رہوگے تو تم ابدالآباد تک گمراہ نہ ہوسکوگے اور وہ چیز ہے کتاب اللہ"۔

بَارَكَ اللهُ لِي وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيمِ وَنَفَعَنِي وَإِيَّاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ ۔

ایک سال / دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرِ تعاون پچاس روپے / ایک صدر روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ------------------------------------

پتہ ------------------------------------

نوٹ: جو حضرات زرِ تعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے -/۶۰ روپے اور دو سال کے لیے -/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ -/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

کوپن برائے سالانہ خریداری

میں اپنے عزیز / دوست کے نام ایک سال / دو سال کے لیے ماہنامہ 'میثاق' جاری کرانا چاہتا ہوں۔ ازراہِ کرم درج ذیل پتے پر ایک سال / دو سال کے لیے 'میثاق' جاری کر دیجئے۔ زرِ تعاون پچاس روپے / ایک صدر روپے بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ ارسالِ خدمت ہے۔

نام ------------------------------------

پتہ ------------------------------------

نوٹ: جو حضرات زرِ تعاون چیک کی صورت میں بھیجنا چاہیں وہ ازراہِ کرم ایک سال کے لیے -/۶۰ روپے اور دو سال کے لیے -/۱۱۰ روپے کا چیک بھیجیں، اس لیے کہ -/۱۰ روپے بنک چارجز کے طور پر منہا کر لیے جاتے ہیں۔

آپ حضرات کو یقیناً معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے ۲۳ ویں رکوع میں روزے کا حکم بھی آیا ہے ...... اس کی حکمت کا بیان بھی ہے اور روزے کے تفصیلی احکام بھی آئے ہیں۔ انہی کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جس کی میں نے آج اولاً تلاوت کی ہے کہ و اذا

دعا کی حقیقت

رمضان ۱۴۰۶ھ میں ڈاکٹر اسرار احمد کا دوسرا خطاب جمعہ

* * *

الحمدللہ وکفیٰ والصلوٰۃ والسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ خصوصاً علی افضلھم وخاتم النبیین محمد الامین وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین

اما بعد فقد قال اللہ تبارک وتعالیٰ

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝

وَقَالَ اللہُ عَزَّ وَجَلَّ

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ۝

صدق اللہ العظیم

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

وقال صلی اللہ علیہ وسلم : اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ

اوکما قال صلی اللہ علیہ وسلم

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي ۔

آپ حضرات کو یقیناً معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے ۲۳ویں رکوع میں روزے کا حکم بھی آیا ہے ...... اس کی حکمت کا بیان بھی ہے اور روزے کے تفصیلی احکام بھی آئے ہیں۔ انہی کے ذیل میں یہ آیت مبارکہ وارد ہوئی ہے جس کی میں نے آج اولاً تلاوت کی ہے کہ و اذا

سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ط "اور (اے نبیؐ) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (انہیں بتادیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں!"... کہیں دور نہیں ہوں - اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "میں جواب دیتا ہوں (اور قبول کرتا ہوں) ہر دعا کرنے والے کی دعا کا جب بھی وہ مجھے پکارے" (جب بھی مجھ سے دعا کرے) فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ "تو چاہئے کہ وہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں، یعنی میرے احکام کو مانیں اور تسلیم کریں" - وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ "اور مجھ پر پختہ ایمان اور یقین رکھیں" - لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ "تاکہ وہ رُشد و فوز سے ہمکنار ہوں" - بظاہر اس آیتِ مبارکہ میں نہ روزے کا ذکر ہے نہ رمضان کا، لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ہر باشعور ہستی کے کلام میں ربط کا ہونا ضروری ہے۔ اور غیر مربوط کلام کسی باشعور ہستی کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جس سے بڑھ کر باشعور اور حکیم ہستی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ کلام ربط سے خالی ہو! جن لوگوں نے ربط و تعلق آیات پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی، واقعہ یہ ہے کہ وہ حضرات قرآن مجید کی حکمت و معرفت کے ایک بہت اہم پہلو سے محروم رہ گئے۔ یقیناً قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ پر علم و حکمت اور معرفت و عرفان کا ایک بیش قیمت موتی ہے۔ لیکن جیسے آپ کسی ہار میں موتیوں کو پروتے ہیں تو اس کے نظم و ترتیب سے ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید پر غور و فکر کے ضمن میں ضروری کہ انسان دو باتوں کو ملحوظ رکھے۔ ایک یہ کہ آیت کے الفاظ پر اپنی توجہات کو اس طرح مرتکز کر دے جیسے کسی نہایت لطیف اور خفیف ترین شے کے مشاہدے کے لئے مائیکرو سکوپ کو فوکس (FOCUS) کر دیا جاتا ہے۔ آیت کے ایک ایک لفظ پر غور و فکر کا حق ادا کیا جائے اور ان کی تراکیب پر تدبّر و تفکر کر کے انہیں خوب اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر اس کا سیاق و سباق ملاحظہ کیا جائے اور اس ربط و تعلق سے آیتِ زیرِ غور میں جو نئے معنی اور نئی معرفت کا سراغ ملتا ہے اسے تلاش کیا جائے۔

سورۃ البقرہ کے ۲۳ویں رکوع میں ہم دیکھتے ہیں کہ پہلی آیت میں مجرّد روزے کا حکم اور اس کی حکمت کا بیان ہے (يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ) دوسری آیت میں ابتدائی احکام ہیں۔ تیسری آیت میں رمضان المبارک کا ذکر ہے اور اس پورے مہینے کے

روزوں کی فرضیت کا بیان ہے (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ...الخ (اس آیت پر میں شعبان کی آخری شب کو اور پچھلے جمعہ کو ناظم آباد کی مسجد میں تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ اس آیت کے بعد پھر یہ آیتِ مبارکہ وارد ہوتی ہے۔ جو اس وقت زیرِ گفتگو ہے پھر اس سے اگلی آیت میں روزے کے تفصیلی احکام آتے ہیں۔ جو اس رکوع کی طویل ترین آیت ہے۔ درمیان میں جو یہ موتی ٹکا ہوا ہے' اب ہم اپنی توجہات اس پر مرتکز کرتے ہیں۔

پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کا اصل مضمون کیا ہے! اس میں دعا کی عظمت سامنے آ رہی ہے اور یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں اللہ کی طرف توجہ اور انابت پیدا ہو جائے اور اس کے دل میں اپنے رب سے تقرب حاصل کرنے کا ایک جذبہ ابھرے' تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایسے شخص کو سب سے پہلے تو یہ خوشخبری دیجئے کہ تمہارا رب کہیں دور نہیں ہے۔ اس رب سے ہم کلام ہونے کے لئے کہیں جنگلوں میں جا کر دھونی رمانے' کہیں پہاڑوں کی کھوؤں میں جا کر ڈیرا لگانے یا کہیں برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا کر تپسیائیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کے دوسرے تمام مذاہب میں خدا کا جو بھی تصور رہا ہے' اسی کے ساتھ یہ تصور بھی رہا ہے کہ خدا سے قرب حاصل کرنے کے لئے آبادیوں کو چھوڑنا' گھر گرہستی سے ترکِ تعلق اور تجرّد کی زندگی ضروری ہے۔ چنانچہ آبادیوں اور گھروں کی آسائشوں کو چھوڑو' کہیں جنگلوں میں جاؤ' کہیں غاروں اور کھوؤں میں خاص آسنوں کے ساتھ بیٹھ کر پرماتما سے لو لگاؤ' کہیں ہمالیہ کی کسی برفانی چوٹی پر جہاں سرد ہوائیں چل رہی ہوں' ننگے بدن بیٹھو یا کہیں کسی گڑھے میں اپنے آپ کو دفن کرو۔ یہ سو طرح کے جتن ہیں جو انسان اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اس سے قرب حاصل کرنے کے لئے کرتا رہا ہے۔ انسان یہ ساری مشقیں اپنی دانست میں کسی اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے جھیلتا ہے اور وہ ہوتا ہے اپنے تصوّرِ خدا کے مطابق اپنے خدا کا قرب حاصل کرنا۔ یہ انسان کی ایک فطری اور طبعی خواہش ہے۔

خواہ وہ اپنے رب کو صحیح طور پر پہچان نہ پایا ہو اور اس کی توحید کا بھی اسے صحیح ادراک نہ ہو سکا ہو' لیکن فطرتِ انسانی میں اپنے پیدا کرنے والے سے قرب و تعلق قائم کرنے کا جذبہ طبعی اور فطری طور پر موجود ہے۔ جیسے انسان کو بھوک لگتی ہے۔ چاہے وہ جانتا نہ ہو کہ یہ بھوک کیا شے ہے لیکن اسے اس کا احساس بہرحال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس بھوک کا احساس نوزائیدہ بچے

کو بھی ہوتا ہے جو بھوک کی وجہ سے روتا ہے اور جب روتا ہے تو ماں اسے دودھ پلاتی ہے۔ یہ اصل میں اس کی جبلّت اور فطرت ہے۔ چنانچہ جس طریقے سے انسان میں اپنی مادی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تقاضوں کا شعور اس کے اندر سے ابھرتا ہے' ایسے ہی ایک روحانی پیاس بھی انسان کے اندر سے ابھرتی ہے۔ بہتوں میں یہ کم ابھرتی ہے اور بہت سوں میں زیادہ ابھرتی ہے۔ بہت سے لوگ اس دنیا میں اتنے مشغول ہو جاتے ہیں اور اپنے حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ انہیں اپنی روح کی پکار سنائی نہیں دیتی' یا وہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ لیکن کوئی انسان' انسان ہونے کے ناتے اس سے بالکل محروم نہیں ہے۔ یہ پیاس اندر سے ابھرتی ہے اور یہی پیاس ہے جو لوگوں کو جنگلوں میں لے جاتی ہے۔ یہی پیاس تھی جس نے گوتم بدھ کو اپنے محل سے نکال کر نہ معلوم کن کن جنگلوں کی خاک چھنوائی اور اسے کن کن منیوں اور رشیوں کے پاس لے گئی اور اس سے کس کس کی جوتیاں سیدھی کرائیں۔ اس نے یہ سب کس لئے کیا؟ وہ کپل وستو کا راجکمار تھا۔ محل میں اسے تمام آسائشیں اور ہر طرح کا آرام حاصل تھا۔ لیکن اس کے دل میں مکتی کے حصول اور دکھ سکھ کی حقیقت جاننے اور اپنے تصور کے مطابق اپنے ایشور کا گیان دھیان حاصل کرنے کا ایک جذبہ ابھرا اور وہ اپنے محل' اپنی جوان بیوی اور شیر خوار بچے کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ فطرت کی ایک پیاس تھی جس نے اس سے یہ سب کچھ چھڑوا دیا۔ یہ فطرت کی پکار ہی تھی جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو ایران سے نکال کر شام کے مختلف علاقوں میں لے گئی' جہاں وہ مختلف راہبوں کی خدمت کرتے رہے۔ ان کے دل میں اپنے رب کی معرفت کی ایک پیاس تھی' تو جس کے دل میں یہ پیاس ایک سچی پیاس کی حیثیت سے ابھر آئے تو اسے اس وقت تک چین نہیں آ سکتا جب تک اس کی اس پیاس کی سیری کا کوئی بندوبست نہ ہو جائے۔

اب اس آیتِ مبارکہ کا رمضان اور اس کے روزوں کے حکم و فرضیت سے جو ربط و تعلق ہے' اسے اسی موقع پر واضح کر دوں۔ روزے کی حکمت بیان فرمائی گئی لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اور رمضان میں ان کی فرضیت کی دوسری حکمت بیان فرمائی وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اب غور کیجئے کہ ہمارے اندر جو ملکوتی روح ہے اور اس کی جو پیاس ہے' وہ ہمارے جسمانی و حیوانی اور جبلی تقاضوں کے تلے دبی رہتی ہے۔ ہم کاروبارِ دنیا میں منہمک رہتے ہیں۔ ہم دنیا کی آسائشوں اور کام و دہن کی لذتوں میں مستغرق رہتے ہیں۔ بھوک لگی تو

کھانا کھالیا' پیاس لگی تو پانی پی لیا۔ جنسی جذبے نے جوش مارا تو جائز طریقہ سے اس کی تسکین کر لی۔ ان تقاضوں کو پورا کرنے میں انسان اس قدر منہمک رہتا ہے کہ روح کی پیاس اسے محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن رمضان کے روزوں کا پروگرام درحقیقت یہ ہے کہ پورے مہینے کے لئے معمولات کو الٹ دیا گیا ہے' اب دن میں بھوک اور پیاس برداشت کرو' جنسی خواہش کی تسکین پر قدغن لگاؤ۔ پھر رات کو جبکہ آرام واستراحت کا شدید ترین داعیہ ابھرتا ہے حکم ہوتا ہے کہ قرآن کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نفس کے جتنے تقاضے ہیں' ان کی مخالفت ہو رہی ہے۔ دن میں بھوک' پیاس اور جنسی تقاضے کی مخالفتیں آپ نے چودہ پندرہ گھنٹے برداشت کیں۔ اب جو یہ بند کھلا اور آپ نے اپنے پیٹ کو بھرا تو اس کے بعد حکم ہو گیا کہ کھڑے ہو جاؤ اور صلوٰۃ العشاء کے بعد ہر مسلمان صلوٰۃ التراویح ادا کرے' جس کا اہل سنت کے تین فقہی مسالک میں بیس رکعات کا نصاب مقرر ہے۔ اور میں اپنی پہلی تقریر میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ کم سے کم نصاب ہے۔ ورنہ مطلوب یہ ہے کہ رمضان کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصّہ قرآن مجید کے ساتھ جاگ کر گزارا جائے۔ اگر ہمیں وہ شان نصیب نہیں ہوتی جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ابتدائی شان تھی کہ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا تو اس کی کچھ مشابہت اور اس کا کوئی عکس تو ہمارے اندر رمضان المبارک کی راتوں میں آ جائے۔ بہرحال نماز عشاء کے بعد گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی اضافی مشقت بھی اس وقت ہے جب طبیعت پر کسل کا شدید ترین غلبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ سب کیا ہے! اسے میں نے ایک لفظ سے تعبیر کیا کہ یہ ' REVERSAL ' ہے۔ گیارہ مہینے جو عمل (PROCESS) جاری رہتا ہے اس میں ' REVERSE GEAR ' ہے جو اس طور پر رمضان میں لگایا گیا ہے کہ اپنے نفس اور کام و دہن کے تقاضوں کو دباؤ۔ جب یہ دبتے ہیں تو اندر سے روح کی پیاس ابھرتی ہے۔ جب یہ ابھرے تو پہلی خوشخبری دی گئی کہ جان لو کہ تمہارا ربّ تمہارے بالکل قریب ہے۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط

واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے یورپ کی تاریخ پڑھی ہے' وہ جانتے ہیں کہ انسانی حقوق کے لئے جو کشمکش وہاں ہوئی۔ انسان نے اپنے سیاسی حقوق حاصل کرنے اور مطلق العنان بادشاہوں کے چنگل اور جاگیرداروں کے شکنجے سے نجات پانے کے لئے وہاں جو جدّوجہد کی ہے اور پاپائیت کے منحوس اور بدترین نظام کا جو جُوا ان کے کاندھوں پر رکھا ہوا تھا' اس سے

رستگاری پانے اور آزادی حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی ہیں ان کا تاریخ انسانی کے اہم ترین اور ناقابلِ فراموش واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ یہ وہ نشاناتِ راہ ہیں جن پر چل کر حقوق انسانی کا منشور وجود میں آیا ہے۔ جبکہ میرے نزدیک اس آیت مبارکہ کی رو سے جو بات ہمارے سامنے آئی ہے یہ سب سے بڑا انسانی حقوق کا منشور (MAGNACHARTA) ہے کہ انسان کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ تمہارا رب تم سے دور نہیں ہے۔ بلکہ نقشہ یہ ہے کہ۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار ۔۔۔ جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

یہ ہے بندے کا معاملہ اپنے رب کے ساتھ...... رب تو ہر دم ' ہر آن مائل بہ کرم رہتا ہے۔ رب تو ہم سے غافل نہیں ہے۔ ہم ہی اس سے غافل اور غائب ہو جاتے ہیں۔ عربی کا یہ شعر میں نے بارہا اپنی تقاریر میں سنایا ہے جو میں نے دسویں جماعت کے کورس میں پڑھا تھا کہ۔

اَغِیبُ وَ ذُو اللَّطَائِفِ لَا یَغِیبُ ۔۔۔ وَ اَرْجُوْہُ رَجَاءً لَا یَخِیبُ!

میں غائب ہو جاتا ہوں۔ وہ ہستی جو ذو اللطائف ہے وہ تو غائب نہیں ہوتی۔ وہ تو ہر آن اور ہر جگہ موجود ہے۔ وہ تو منتظر رہتی ہے کہ میرا بندہ میری طرف متوجّہ ہو۔ یہ تو ہم ہیں جو اس کی طرف رخ نہیں کرتے۔ ہم نے اس سے پیٹھ موڑی ہوئی ہے۔ ہم نے اس دنیا کو اپنا محبوب اور مطلوب بنالیا ہے اور دولت کے پجاری بن گئے ہیں۔ ہم ہیں جو اپنے نفس کی غلامی میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم اس ذو اللطائف ہستی کی طرف رخ کب کرتے ہیں! حدیثِ قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ میرا بندہ اگر میری طرح چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ میرا بندہ میری طرف بالشت بھر آتا ہے تو میں اس کی طرف ہاتھ بھر آتا ہوں۔ میرا بندہ اگر مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں۔ میرا بندہ اگر میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس سے بہت اعلیٰ محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ یعنی ملائکہ مقربین کی محفل میں اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے کا ذکر فرماتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی کی ترجمانی جوابِ شکوہ میں اس طرح کی ہے کہ۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

لیکن اگر بندے میں یہ پیاس ابھر آئے تو جب چاہے ' جہاں چاہے اللہ سے ہم کلام ہو جائے۔ جہاں کوئی حاجب نہیں ' کوئی دربان نہیں۔ اس کی بھی علامہ اقبال نے بہترین تعبیر کی ہے۔

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

ر حقیقت ہماری غفلت ہے' ہماری نادانی ہے۔ کچھ ہوشیار لوگوں کی چالاکی ہے کہ وہ ن بنا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اگر تم کو اپنے رب سے ہم کلام ہونا ہے تو پہلے نذر ونیاز یہاں کرو۔ ہماری مٹھیاں گرم کرو۔ ہم اس کے دربار کے حاجب اور دربان ہیں اور ہم جس ۔ کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے ہوئے ہیں' ان بزرگ کی بزرگی کی اللہ کے یہاں بڑی رسائی ۔ تمہاری درخواست اللہ کے یہاں ان کے ذریعہ سے پہنچ سکے گی اور ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہا۔ پہلے ہمیں خوش کرو' ہماری مٹھی گرم کرو تو تمہارا کام بنے۔

یہ نہ سمجھئے یہ ساری لوٹ کھسوٹ اور یہ جابرانہ استحصال صرف سیاسی سطح پر ہوتا ہے۔ بلکہ ت تو یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی جو سب سے بڑی 'EXPLOITATION' ہوتی ہے وہ مذہب سیدان میں ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں سورۃ التوبہ میں بالکل واشگاف کر دیا ہے۔ فرمایا: یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ رُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ یَصُدُّوْنَ نْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ط (آیت ۳۴) "اے اہلِ ایمان! اکثر علماء و مشائخ کا حال یہ کہ وہ لوگوں کے مال باطل طور طریقوں سے کھا جاتے ہیں اور اللہ کی (توحید کی) راہ سے ں کو روکتے ہیں" ۔ مذہب کے نام پر باطل اور ناجائز طریقوں سے لوگوں کے اموال ہڑپ نے کے لئے سارے نظام بنائے گئے ہیں کہ یہ دیوی دیوتا ہیں' یہ ان کے مندر استھان ہیں' ن کے بت ہیں اور یہ ان کے پروہت ہیں' یہ ان کے پجاری ہیں' یہ پنڈت ہیں...... کوئی پیر نب ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ ان کی فلاں فلاں بزرگوں سے نسبت ہے...... کہیں پادری یا ہ صاحب ہیں' جو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے بیٹے مسیحؑ کے چہیتے ہیں۔ ان کی خدمت کرو گے' کو راضی رکھو گے' ان کی نازبرداریاں اٹھاؤ گے' تب ہی ایشور تک رسائی ہوگی۔ ان کو ں کرو گے تب ہی اللہ خوش ہوگا۔ ان کو راضی رکھو گے تب ابن اللہ تمہارے کام آئیں ،۔ عجیب بات یہ ہے اور میں حیران ہوا کرتا ہوں کہ مذہب کے نام پر جو استحصالی نظام ہیں ں یہ صرف "پ" ہی ہے جو آپ کو ملے گا۔ حتیٰ کہ پادری کے لئے جو انگریزی لفظ 'PRIEST' ہے وہاں بھی یہ "پ" موجود ہے۔ اسی "پ" کی گردان آپ کو ہر جگہ نظر ئے گی۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ عربی زبان میں "پ" ہے ہی نہیں۔ اس نے تو اس "پ"

یا ایسی جڑ کاٹی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو اللہ کا دین ہمیں دے کر تشریف لے گئے ہیں' اس نے اس تصور کی بالکلیہ نفی کر دی۔

اب آیت کی طرف پھر رجوع کیجئے' فرمایا وَ اِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ اِنِّیْ قَرِیْبٌ "اور (اے نبیؐ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو (بتادیجئے کہ) میں بہت قریب ہوں"۔ یعنی جب بندے کو اپنے رب سے ہم کلام ہونے کی سچی اور حقیقی پیاس پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے قلب کی گہرائی سے واقعتاً اپنے رب سے مناجات کرنے اور اپنی غفلت پر پشیمان ہو کر اس سے توبہ و استغفار کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے تو وہ اپنے بندے سے دور نہیں' قریب ہی ہوتا ہے۔ اُس کا در اُس کی طرف رجوع کرنے والوں کے لئے ہمیشہ کھلا ہے۔ اس کے ضمن میں مجھے حضورؐ کی ایک حدیث یاد آرہی ہے کہ اسلام میں توبہ کا دروازہ کس درجہ کھلا رکھا گیا ہے حدیث شریف کے الفاظ ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ "یقیناً اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی توبہ قبول کرتا ہے جب تک موت کا گھنگھرو نہ بولنے لگے"۔ یعنی جب تک عالمِ نزع طاری نہ ہو جائے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگرچہ کسی کے کوہ احد جتنے گناہ ہوں۔ اسی مفہوم کی سرمد نے یوں ترجمانی کی ہے۔

باز آ' باز آ' ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبروبت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما درگہِ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی' باز آ

اگر اس سے پہلے تم سو بار بھی توبہ کر کے توڑ چکے ہو' تب بھی پروا نہ کرو۔ آج اگر خلوص و اخلاص کے ساتھ پھر متوجہ ہو گے تو یہ بار گاہ وہ ہے جو کبھی بند نہیں ہوتی۔ اس پر کوئی حاجب اور دربان نہیں۔ سچی پشیمانی اور خلوص کے ساتھ رجوع کرو۔ اس ارادہ کے ساتھ اللہ سے توبہ کرو کہ اے اللہ! میں شرمسار ہوں' پشیمان ہوں' تجھ سے مغفرت کا طلب گار ہوں۔ اے اللہ! اب تک جو زندگی غفلت میں گزری ہے' گناہوں میں بسر ہوئی ہے اسے تو معاف فرما دے۔ اب میں از سرِ نو تجھ سے عہد کر رہا ہوں' پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ' پورے عزم کے ساتھ کہ اے پروردگار! میں اب تیرے حکم کے خلاف نہیں چلوں گا اور تیری مرضی کے مطابق زندگی بسر کروں گا۔ تو نے جو کرنے کو فرمایا ہے' وہ کروں گا اور جس سے بچنے کا حکم

دیا ہے اس سے بچوں گا۔ تجھ پر ایمان پختہ رکھوں گا۔

چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس آیت کا اگلا حصہ یہی ہے جو اس وقت میں نے عرض کیا ہے فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ "انہیں بھی تو چاہئے کہ میرا کہنا مانیں" ...... یک طرفہ معاملہ نہیں چلے گا کہ تم مجھ سے اپنی منوانا چاہو اور میری مانو نہیں۔ مجھے اپنی احتیاجیں سنانا چاہو اور میری بات سنو ہی نہیں۔ مجھ سے تم چاہو کہ میں تمہاری مدد کروں اور تم میرے دشمنوں کی مدد کرو اور ان کے ساتھ ساز باز کرو۔ تم میرے باغیوں کے ساتھ وفاداریوں کا رشتہ استوار کرو اور میرے نافرمانوں کے نقشِ قدم کو اپنے لئے نشانِ راہ بناؤ یہ نہیں ہو گا۔ دو طرفہ معاملہ ہو گا فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ۔ "تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا"۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ "تم اللہ کی مدد کرو گے' اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ ○ "اور تمہارے قدم جما دے گا" اللہ کی مدد کیا ہے؟ اس کے دین کی خدمت! اس کے دین کی اقامت کے لئے تن من دھن لگانا! باقی اللہ ہم سے روزی نہیں چاہتا۔ سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے نوعِ انسان سے فرمایا گیا: لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ "(اے نبیؐ) ہم آپ سے روزی طلب نہیں کرتے بلکہ ہم آپ کو رزق دیتے ہیں"۔ سورۃ الذاریات (آیات ۵۶ تا ۵۸) میں یہ اٹل بات فرمادی: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ "اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو نہیں پیدا کیا۔ مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں"۔ عبادت اور دعا کا باہم ربط و تعلق 'میں آگے قدرے تفصیل سے بیان کروں گا۔ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ○ "میں ان (جن و انس) سے رزق کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ اس کا خواہاں ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں' پلائیں" ...... اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○ "تحقیق اللہ تو خود ہی رزاق ہے' روزی رساں ہے' بڑی قوت والا ہے' بڑا زبردست ہے"۔ .. ہاں اس کے دین کا جھنڈا اٹھاؤ۔ اس کو سربلند کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگاؤ تو پھر جو دعا کرو گے اسے ہم قبول کریں گے' تمہاری جو پکار ہو گی اس پر تم ہمیں موجود پاؤ گے ...... ایک حدیث شریف میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں تَجِدْهُ اَمَامَكَ "تم اسے اپنے سامنے موجود پاؤ گے"۔ وہ کہیں دور ہے ہی نہیں۔ جیسے سورۂ قٓ میں فرمایا: نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○ "ہم تو انسان کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں" ...... سورۃ الحدید میں فرمایا: هُوَ

مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط "وہ (اللہ) تمہارے ساتھ موجود ہوتا ہے' جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو" ...... یہ تو تمہاری بے التفاتی اور عدم توجہی ہے کہ تم ہماری طرف رخ نہیں کرتے۔ تمہارے دل کے سنگھاسن پر ہماری محبت کے بجائے کسی اور کی محبت براجمان ہے' تمہارے دل پر تو حُبِّ جاہ' حُبِّ شہرت اور زر' زمین اور زَن کی محبتوں نے ڈیرے جما رکھے ہیں۔ اگر دل کو ان محبتوں سے پاک کر کے میری محبت سے آباد کر لو تو جہاں تم ہو' وہاں میں ہوں۔ حدیثِ قدسی میں یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ پھر ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ میں اپنے بندے کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ میں اپنے بندے کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اپنے بندے کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔

اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں"۔ اجابت اور استجابت کے معنی قبول کرنے کے بھی ہیں۔ سورۃ الشوریٰ میں آپ کو یہ آیت ملے گی۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ ○ (آیت ۴۷) "اپنے رب کی پکار کو قبول کر و اس سے پہلے پہلے کہ وہ دن اللہ کی طرف سے آن دھمکے کہ اس دن کو لوٹانے والا کوئی نہیں ہو گا۔ اس دن نہ کوئی تمہارا پشت پناہ ہو گا اور نہ ہی تمہاری طرف سے کوئی انکار کرنے والا ہو گا"۔

اس آیتِ مبارکہ سے ثابت ہو گیا کہ استجابت کے معنی "قبول کرنا" ہیں۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّكُمْ "لبیک کہو اپنے رب کی پکار پر' مانو اپنے رب کے مطالبہ کو"۔ اور سورۃ البقرہ کی زیرِ گفتگو آیت میں فرمایا فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ "ان کو بھی تو چاہئے کہ میری پکار کو سنیں' میری بات کو قبول کریں"۔ ہمارے ربّ کی پکار کیا ہے؟ اس کے ضمن میں تین چیزیں خاص طور پر گن لیجئے۔ پہلی پکار ہے۔ اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ "اپنے رب کی بندگی کرو"۔ ہمہ تن اللہ کے بندے بن جاؤ اور پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاؤ یعنی اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً "اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ"۔ اسلام میں جزوی داخلہ اللہ کو قبول نہیں ہے۔ آنا ہے تو پورے آؤ' ورنہ دفع ہو جاؤ۔ ہماری کوئی احتیاج نہیں ہے' احتیاج تمہاری ہے۔

دوسری پکار یہ ہے کہ ہماری ایک امانت تمہارے پاس ہے۔ وہ امانت جو ہم نے پہلے عطا کی تھی اپنے محبوب بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ انہوںؐ نے اس امانت کا حق ادا کر دیا' اسے تم تک پہنچا دیا۔ انہوںؐ نے حق تبلیغ ادا کر دیا اور اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے گواہی لے گئے۔ "اَلاَ ھَلْ بَلَّغْتُ؟" اور سوا لاکھ کے مجمع نے حجۃ الوداع میں اقرار کیا۔ اِنَّا نَشْھَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّیْتَ وَ نَصَحْتَ "بے شک حضورؐ ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے حق تبلیغ ادا فرما دیا اور آپؐ نے حق امانت ادا فرما دیا اور آپؐ نے حق نصیحت ادا فرما دیا"۔ یہ گواہی لے کر آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ اب یہ ذمہ داری میرے کاندھوں سے اتر کر تمہارے کاندھوں پر آگئی ہے لہٰذا اب جو یہاں موجود ہیں پہنچائیں ان کو جو موجود نہیں ہیں۔ اس لئے کہ میری رسالت صرف تمہارے لئے نہیں ہے بلکہ پوری دنیا اور پوری نوع انسانی کے لئے ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلاَّ کَافَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ط لہٰذا دوسری پکار ہوئی کہ توحید کی خود بھی گواہی دو اور اس کی دعوت کو عام کرو اور قرآن کے پیغام کو پوری نوعِ بشر تک پہنچاؤ..... اور تیسری پکار یہ ہے کہ میرے دین کو قائم کرو۔ میرے کلمہ کو سربلند کرو۔ وَکَبِّرْہُ تَکْبِیْرًا ○ اس کی بڑائی کرو' اس کی بڑائی قائم کرو جیسے کہ بڑائی کی جاتی اور قائم کی جاتی ہے۔ وہ نظام بالفعل قائم اور نافذ کرو جس میں 'SUPEREME AUTHORITY' صرف اللہ کو تسلیم کیا جائے۔ اسی کا دین قائم اور غالب ہو جائے اور اس سے اوپر کوئی نہ رہے۔ تیسری پکار یہ ہے کہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو لگاؤ' کھپاؤ اور اپنی صلاحیتوں کو صرف کرو۔

یہی بات ہے جو آیتِ زیر گفتگو میں فرمائی جارہی ہے۔ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ..... انہیں بھی چاہئے کہ میرا کہنا مانیں' میری پکار پر لبیک کہیں۔ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ..... اور یہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے جو پونجی درکار ہے' وہ ایمان کی پونجی ہے۔ جس شخص کو اللہ پر ایمان و یقین اور توکل ہے اور اللہ کی مدد و نصرت پر بھروسہ ہے وہی اللہ کی پکار پر لبیک کہہ سکے گا اور اس کے احکام کی تعمیل کر سکے گا۔ اس آیت مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ ○ "تاکہ لوگ رشد و ہدایت کی راہ پر آجائیں"۔ یعنی روزہ' اللہ کی تکبیر' اس کا شکر' اس سے تعلق' اس سے دعا اور مناجات' یہ تمام امور وہ ہیں کہ اگر ایک بندۂ مومن ان کا خلوص و اخلاص کے ساتھ اہتمام کرے تو وہ راہِ حیات اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو

سکتا ہے۔

بہرحال یہ ہے وہ آیتِ مبارکہ جس کے ذریعہ سے ہمارے سامنے یہ بات آجاتی ہے کہ دعا کا روزے اور رمضان کے دوگونہ پروگرام سے کیا تعلق ہے! ۔ میں رمضان کو اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ روزہ تو دن کا ہے۔ اور رات کو در حقیقت رمضان کا پروگرام ہے۔ رمضان کیا ہے! شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ۔ "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے" ...... چنانچہ یہ رات کی تراویح' یہ رات کا قیام' یہ قرآن مجید کا سننا' سنانا اور اس کا سمجھنا' یہ اصل میں رمضان کا حق ہے۔ ورنہ روزے تو خواہ کسی مہینے کے فرض ہو جاتے ان کی برکات تو وہی رہتیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ دو آتشہ پروگرام بنایا کہ دن کا روزہ ہو اور رات کا قیام۔ تاکہ دونوں کا نتیجہ یہ نکلے کہ تمہارے اندر اپنے رب کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کی پیاس ابھرے۔ اللہ کے ساتھ محبت اور اس کی معرفت کا ایک جذبہ دل میں جوش مارے۔ اور جب یہ کیفیت ہو جائے تو اے نبیؐ 'ان کو میری طرف سے خوشخبری دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں اور پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔ پس یہ بھی میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر پختہ ایمان رکھیں تاکہ رشد و ہدایت سے ہمکنار ہوں۔

اس آیتِ مبارکہ کی جو اہمیت ہے' اسے میں مزید چند آیات کے حوالے سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سورۃ المومن کی ایک آیت عام طور پر خطبۂ اول کے اختتام پر پڑھی جاتی ہے۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ○ (آیت ۶۰) اس اعتبار سے یہ بڑی جامع آیت ہے کہ اس میں دعا اور عبادت کا ہم معنی اور مترادف ہونا بالکل واضح اور ظاہر و باہر ہو جاتا ہے۔ اس آیتِ مبارکہ کے دو حصے ہیں اور ہمیں ان دونوں حصوں کے مابین جو ربط و تعلق ہے اسے بھی جاننا ہو گا۔ پہلے حصے میں فرمایا۔ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ط "اور تمہارے رب نے یہ فرمایا کہ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا"۔ ایک حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی پیاری وضاحت فرمائی ہے۔ کہ دنیا میں اگر کسی سے کچھ مانگا جائے تو بالعموم انسان کو ناگوار ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے سخی کا حال بھی یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک سوال کیا اس نے پورا کر دیا' آپ نے دوسرا سوال کیا' وہ بھی اس نے پورا کر دیا لیکن اگر سوال کا سلسلہ دراز ہوا تو ایک حد تک آکر اس کے

ماتھے پر بھی بل پڑ جائیں گے۔ لیکن اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے اور اس سے جتنا مانگا جائے' اتنا ہی وہ خوش ہوتا ہے اور جتنا مانگا جائے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بے حساب دیتا ہے۔ آپ اللہ سے دعا کرتے ہیں' اس سے مانگتے ہیں تو اس لئے کہ آپ کو یقین ہوتا ہے کہ وہ آپ کی دعا سنتا ہے' آپ کی تکلیف کو رفع کر سکتا ہے' آپ کی احتیاج کو پورا کر سکتا ہے۔ اس طرح آپ کی طرف سے اللہ کے سمیع ہونے اور اس کے علیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیر ہونے کے یقین کا اقرار و اظہار ہوتا ہے۔ یہی چیزیں در حقیقت ایمان کا لُبِّ لباب ہیں۔ اب اگر ہماری شخصیتیں مسخ ہو گئی ہوں اور ہمارے اخلاقی تصور میں فساد پیدا ہو گیا ہو تو یہ بات دوسری ہے۔ ورنہ آپ سوچئے کہ اگر کوئی شریف شخص کسی سے کوئی درخواست کرے کہ میرا یہ کام کر دیجئے' اور وہ اس کام کو کر دے تو کیا وہ یہ نہیں سمجھے گا کہ اگر اس نے میری کوئی تکلیف رفع کی ہے یا میری کوئی ضرورت پوری کی ہے اور آڑے وقت میں میرا ساتھ دیا ہے تو مجھ پر بھی اس کا کوئی حق قائم ہو گیا ہے...... ہر شریف اور بامروّت انسان کا یہ ردِّ عمل لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ اللہ سے دعا کریں گے' اس کی استعانت کے طالب ہوں گے تو اگر آپ کی شخصیت مسخ نہ ہوئی ہو تو خود بخود آپ کے دل میں یہ جذبہ ابھرے گا کہ آپ اپنے محسن کے شکر گزار بنیں۔ چنانچہ دعا کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ آپ میں عبدیت پیدا ہو۔ آپ یہ سمجھیں کہ آپ پر اللہ کا یہ حق ہے کہ آپ اس کا ہر حکم تسلیم کریں۔ چونکہ آپ اس سے دعا کر رہے ہیں۔ اس سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا معقول' فطری اور منطقی تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کی بندگی اختیار کریں۔ چنانچہ اب دیکھئے کہ آیتِ مبارکہ کے اس حصہ کا دوسرے حصہ سے کتنا گہرا ربط و تعلق قائم ہو گیا ہے۔ اس ربط کی تفہیم کے لئے ہم پوری آیتِ مبارکہ کا دوبارہ مطالعہ کرتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ ۝...... "اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھے پکارو (مجھ سے دعا کرو) میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ یقیناً وہ لوگ جو میری عبادت سے استکبار کرتے ہیں (یعنی تکبر کی بنا پر میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں) یہی لوگ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر" ...... آپ نے دیکھا کہ اس آیۂ مبارکہ میں دعا اور عبادت کس طرح ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دعا در حقیقت اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے اور مناجات کرنے کے مظہر کے ساتھ ساتھ اس کی بھی دلیل ہے کہ آپ اسے حاضر ناظر تسلیم کرتے ہیں' اسے القدیر سمجھتے ہیں' اسے السمیع جانتے ہیں' اسے مشکل کشا اور حاجت روا مانتے ہیں۔ اسے الرّحمٰن الرّحیم تسلیم کرتے ہیں۔ اسے فریاد رس اور عادل و منصف سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبال کا ا غلباً تیسرا یا چوتھا لیکچر " .MEANINGS OF PRAYER " کے موضوع پر ہے۔ یعنی اسلام میں دعاء کا مفہوم کیا ہے! ان کے لیکچرز کی زبان خاصی مشکل ہے لیکن یہ لیکچر نسبتاً آسان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " دعا کا اصل مفہوم یہ ہے کہ ہماری انائے صغیر اس انائے کبیر کے روبرو ہو جائے' ہم اللہ سے خطاب کر رہے ہوں " ...... دیکھئے ایک ہے غائبانہ ذکر یا ' PASSIVE ' ذکر۔ جیسے ہم سبحان اللہ' الحمد للہ اور اللہ اکبر کا ورد کرتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کا ذکر ہے لیکن اس میں اللہ سے خطاب نہیں ہے۔ اس میں مکالمہ اور مخاطبہ والی بات نہیں ہے۔ لیکن جب آپ کہتے ہیں۔ اِیَّا کَ نَعْبُدُ وَ اِیَّا کَ نَسْتَعِیْنُ۔ "اے اللہ' ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے۔ " تو اس میں اللہ سے خطاب ہے۔ یہاں ہماری انائے صغیر (FINITE EGO) روبرو آ جاتی ہے انائے کبیر (INFINITE EGO) کے۔ یہ جو بالمشافہ بات ہو رہی ہے' یہ در حقیقت فکر کی معراج (CLIMAX) ہے۔ یہ ' ACTIVE ' ذکر ہے۔ اس میں اللہ کو مخاطب کر کے اس کو یاد کیا جا رہا ہے۔

دعا کے ضمن میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے رب سے کن چیزوں کی دعا کرنی چاہئے۔ اختصار سے عرض کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں ایک طرف تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہاں تک تلقین فرمائی ہے کہ اگر جوتی کا تسمہ بھی در کار ہو تو اللہ سے مانگو۔ یعنی یہ کہ حقیر سے حقیر شے بھی اللہ ہی سے مانگو اور بڑی سے بڑی شے بھی اسی سے مانگو۔ اس میں گویا تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ کسی اور سے کچھ نہ مانگو۔ تمہارے لئے اتنی بڑی بارگاہ کھلی ہوئی ہے اس بارگاہ سے کیوں نہیں مانگتے؟ تمام انسانوں کے دل اس کی انگلیوں کے مابین ہیں۔ وہ تمہاری ضرورت جس کے ذریعے سے چاہے گا پوری کر دے گا۔ تم کیوں اپنے جیسے انسان کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے اپنی انسانیت کو رسوا کرتے ہو؟ آپ نے کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلایا تو گویا اپنی عزت نفس کا دھیلا کر دیا۔ لہٰذا جو کچھ بھی مانگنا ہو اللہ سے مانگو۔ اللہ اس ضرورت کو کس کے ذریعے سے پورا کرے گا یہ وہی جانتا ہے۔ کوئی چیز اس کے دائرہ اختیار سے

باہر نہیں ہے۔ سورۃ الکہف میں دو یتیم بچوں کے مکان کی دیوار کا ذکر آیا ہے جو بوسیدگی کی وجہ سے گر رہی تھی۔ ان کے والدین نیکوکار تھے۔ انہوں نے کچھ پونجی اپنے یتیم بچوں کے لئے اس دیوار کے نیچے گاڑی ہوئی تھی تاکہ بچے جب بڑے ہو جائیں تو ان کے کام آئے۔ وہ دیوار گرا چاہتی تھی کہ اس کو بچانے کے لئے حضرت خضر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں اللہ کے احکام کی تنفیذ کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے محافظت کرنے والے نہ معلوم کہاں کہاں موجود ہیں! ہم تو جانتے تک نہیں۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ "تیرے رب کے لشکروں کو کون جانتا ہے سوائے اس کے"۔ وہ جس کے ذریعے سے چاہے گا تمہاری ضرورت کو پورا کرا دے گا۔ لہٰذا کسی سے کچھ نہ مانگو اور جو کچھ مانگنا ہے اسی سے مانگو۔

لیکن جیسے معرفت اور ہدایت کے مختلف درجے ہیں لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ○ "البتہ تم کو چڑھنا ہے سیڑھی پر سیڑھی"۔ یہ تو ایک ایسا مسلسل عمل ہے کہ آپ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ آج مجھے کُل ہدایت حاصل ہو گئی۔ اسی طرح دعا کے بھی درجات ہیں۔ چنانچہ دعا کے ضمن میں بلند ترین درجہ یہ ہے کہ اللہ سے کچھ نہ مانگو سوائے ہدایت اور استقامت کے...... دنیا کی کوئی شے اللہ سے نہ مانگو۔ اس لئے کہ تمہیں کیا پتہ کہ جو کچھ تم اللہ سے مانگ رہے ہو، وہ حقیقت میں تمہارے لئے خیر ہے یا شر ہے۔ وہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے عَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ۔ ۲۱۶) یعنی ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں ناپسند ہو اور تم اللہ سے اسے اپنے سے دور کر دینے کی دعا کرو حالانکہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور اس کے حصول کے لئے اللہ کے حضور گڑگڑا کر اور ماتھا رگڑ کر دعا کرتے رہو اور حقیقت میں وہی چیز تمہارے لئے موجب شر ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے...... پھر سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا۔ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ○ (آیت ۱۱) "اور انسان خیر مانگتے مانگتے اپنے لئے شر مانگ بیٹھتا ہے چونکہ انسان جلد باز ہے"...... انسان حقیقت کو نہیں دیکھتا جبکہ اللہ تعالیٰ حقیقت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا اس سے مانگنے کی اصل چیز ہے ہدایت۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ "اے اللہ، اے ہمارے رب، ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت عطا فرما۔"

اَللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنَا فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَتَوَلَّنَا

فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِيمَا اَعْطَيْتَ وَقِنَا شَرَّ مَاقَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ وَلَا يَعِزُّ مَنْ عَادَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوْبُ اِلَيْكَ[۱]

"اے اللہ تو ہماری رہبری فرما ان لوگوں میں جن کی تو نے رہبری کی ہے اور ہمیں عافیت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے عافیت دی ہے اور ہمیں دوست بنالے ان لوگوں میں جن کو تو نے دوست بنالیا ہے اور ہمیں برکت دے اس چیز میں جو تو نے ہمیں عطا کی ہے اور ہمیں ہر اُس برائی سے بچالے جو تو نے مقدر کر رکھی ہے۔ کیونکہ تو ہی فیصلہ کرتا ہے اور تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ تیرا دوست ذلیل نہیں ہو سکتا اور تیرا دشمن عزیز نہیں ہو سکتا۔ اے ہمارے رب! تو برکت والا ہے اور بلند و برتر ہے۔ ہم تجھ سے مغفرت چاہتے ہیں اور ہم تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

پھر اللہ سے استقامت طلب کی جائے۔ اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَقُلُوْبَنَا عَلٰى دِيْنِكَ وَعَلٰى طَاعَتِكَ۔ "اے اللہ ہمارے قدموں کو اور ہمارے دلوں کو اپنے دین پر اور اپنی اطاعت پر جمادے۔" پھر اللہ سے ہدایت میں افزونی اور علم میں اضافہ کی دعا کیجئے۔ سورہ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا○ (آیت ۱۱۴) "اور (اے نبی!) کہا کیجئے کہ اے میرے رب، میرے علم میں اضافہ فرما۔" اللہ سے علم نافع کی دعا کیجئے۔ سلام پھیرنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دعائیں مانگا کرتے تھے۔ اس میں یہ دعا بھی ہوتی تھی۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَّعَمَلًا مُّتَقَبَّلًا وَّرِزْقًا طَيِّبًا۔ "اے اللہ، میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، نفع دینے والے علم اور مقبول ہونے والے عمل اور پاک اور حلال روزی کا۔" اور اللہ سے مانگنے کی چیز ہے فہم و فراست۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ اَرِنِيْ حَقِيْقَةَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ "اے اللہ، مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ فی الواقع وہ

---

[۱] حدیث میں آتا ہے کہ یہ دعا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن ابن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو صلوٰۃ الوتر میں پڑھنے کی خاص طور پر تلقین فرمائی تھی۔ (مرتب)

ہیں۔ "ظاہر تو سب ہی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن مجھے ہر شے کی اصل حقیقت پر مطلع فرما! شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا ہے!

تو اللہ سے وہ نظر مانگئے جو اشیاء کی حقیقت تک پہنچے۔ اس دعاء کو حرز جان بنایئے کہ۔ رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْهَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (ال عمران۔ ۸) "اے رب ہمارے 'نہ پھیر یو ہمارے دلوں کو جبکہ تو ہمیں ہدایت دے چکا اور ہم کو اپنے خاص خزانہ فضل سے رحمت عنایت فرما۔ بے شک تو ہی ہے سب کچھ دینے والا۔"

اب ایک راز کی بات سمجھ لیجئے۔ انسان معرفت الٰہی میں جتنا بڑھتا چلا جائے گا' اتنا ہی اس کا دعا کا دائرہ تنگ ہوتا چلا جائے گا...... کیا معنی؟ یہ کہ اللہ سے کیا دولت مانگے؟ کیا اولاد مانگے؟ کیا دنیا کی کوئی چیز مانگے؟...... ہمیں کیا پتہ کہ وہ ہمارے حق میں خیر ہے یا شر ہے!

دعا کے باب میں اولیت پر تو وہ دعا رہ جائے گی جس کا نام دعائے استخارہ ہے' جس کے بارے میں صحابہ کرامؓ کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ دعا ایسے سکھائی اور تلقین فرمائی جیسے قرآن مجید کی سورتیں سکھاتے اور تلقین فرماتے تھے۔ وہ دعا یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِیْرُکَ بِعِلْمِکَ وَاَسْتَقْدِرُکَ بِقُدْرَتِکَ وَاَسْئَلُکَ مِنْ فَضْلِکَ الْعَظِیْمِ فَاِنَّکَ تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ اَللّٰهُمَّ اِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا لَامْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اُمْرِیْ فَاقْدِرْهُ لِیْ وَیَسِّرْهُ لِیْ ثُمَّ بَارِکْ لِیْ فِیْهِ وَاِنْ کُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذَا الْاَمْرَ شَرٌّ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَعَاقِبَةِ اَمْرِیْ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَاصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدُرْلِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ کَانَ ثُمَّ اَرْضِنِیْ بِهٖ (بخاری)

"اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے بھلائی مانگتا ہوں اور تیری قدرت کے ذریعہ سے قدرت چاہتا ہوں...... اور مانگتا ہوں تیرے فضل عظیم سے۔ چونکہ تو ہی قادر ہے میں قادر نہیں ہوں اور تو ہی جانتا ہے اور میں نہیں جانتا۔ اور تو ہی علام

الغیوب ہے۔ "اے میرے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین، میری معاش اور انجام کار کے اعتبار سے میرے لئے اچھا ہے تو اسے تو میرے قابو میں کر دے اور اس کو میرے لئے آسان بنا دے۔ پھر اس میں میرے لئے برکت عطا فرما۔ اور اگر تیرے علم کامل میں یہ کام میرے لئے دین و دنیا اور انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، شر ہے تو اس کام کو تو مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے اور میرے لئے بھلائی مقرر فرما دے جہاں کہیں بھی وہ ہو اور پھر مجھے اس سے خوش فرما دے۔"

جیسے کہ میں نے عرض کیا کہ ہدایت اور معرفت کی طرح دعا کے بھی درجے ہیں۔ چنانچہ اصولی بات تو یہ ہوگی کہ اگر مانگنا ہی ہے تو اللہ سے مانگو۔ یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ تک اسی سے مانگو۔ لیکن اللہ سے مانگنے کی اعلیٰ وارفع چیزیں دوسری ہیں۔ توپ سے مکھیاں نہیں مارا کرتے۔ یہ دعا بہت بڑی توپ ہے۔ اس سے بڑی شے کا شکار کرو، اس کے ذریعے یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں کیا مانگ رہے ہو! دنیا کی حقیر چیزیں مانگ کر تم نے دعا جیسی موثر شے ان پر صرف کر دی۔ دعا تو اعلیٰ وارفع چیزوں کے لئے ہونی چاہئے۔ وہ ہدایت کے لئے ہو، دین کے علم اور اس کے فہم کے لئے ہو اور دین پر عمل پیرا ہونے اور اس پر استقامت و ثبات کے لئے ہونی چاہئے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ توفیق طلب کرنی چاہئے کہ اپنا تن من دھن اس کے دین کی سرفرازی و سربلندی کے لئے لگا دیا جائے۔ اس سے اس کے دین کا جھنڈا سربلند کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کی ہمت طلب کی جائے۔ اللہ سے شہادت کی موت مانگئے۔ اس لئے کہ خود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آرزو کی ہے۔ والذی نفس محمد بیدہ لوددت ان اغزو فی سبیل اللہ فاقتل ثم اُحیٰی ثم اغزو فاقتل۔ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) میری یہ تمنا اور خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور میں پھر اللہ کی راہ میں جہاد کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔"

اور حضورؐ کا ایک ارشاد گرامی یہ بھی ہے کہ جو (مسلمان) اس حال میں مرا کہ نہ تو اس نے (اللہ کی راہ میں) جنگ کی اور نہ اس کے دل میں اس کی تمنا ہی پیدا ہوئی۔ فقد مات علی شعبة من النفاق ○ تو اس کی موت نفاق کے ایک شعبہ پر ہوئی..... چنانچہ اللہ

سے مانگنے کی چیزیں جذبہ جہاد اور شوق شہادت ہیں۔ [1]

بہرحال گفتگو چل رہی تھی سورۃ المومن کی آیت نمبر ۶۰ پر۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ دعا اور عبادت ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں۔ میں نے آغاز میں جن آیات مبارکہ کی تلاوت کی تھی' ان میں سورۂ مریم کی چار آیات (۴۷ تا ۵۰) بھی شامل تھیں۔ وقت کی محدودیت کے باعث میرے لئے ان کی توضیح و تشریح کا موقع نہیں۔ چنانچہ میں ان آیات کا ترجمہ بیان کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ان آیات کے ذریعہ سے جو بات میں آپ حضرات کو سمجھانا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ یہاں بھی دعا اور عبادت کو ہم معنی اور مترادف کے طور پر لایا گیا ہے۔ گویا دعا اور عبادت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ان آیات کا پس منظریہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو دعوتِ توحید دی' جو اپنے ملک کے مشرکانہ نظام حکومت میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ خود بت تراش بھی تھے اور سب سے بڑے مندر کے پروہت بھی تو باپ نے نہایت سختی سے انہیں جھڑک دیا اور حکم دیا کہ فوراً میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں تم کو سنگسار کر دوں گا۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور اس موقع پر آں جنابؑ نے جو الوداعی کلمات کہے' ان کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں بایں الفاظ بیان فرمایا ہے۔

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیۡکَ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَکَ رَبِّیۡ ؕ اِنَّہٗ کَانَ بِیۡ حَفِیًّا ○ وَ اَعۡتَزِلُکُمۡ وَ مَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ ۫ۖ عَسٰۤی اَلَّاۤ اَکُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا ○ فَلَمَّا اعۡتَزَلَہُمۡ وَ مَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ۙ وَہَبۡنَا لَہٗۤ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ ؕ وَ کُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا ○ وَ وَہَبۡنَا لَہُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَ جَعَلۡنَا لَہُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا ○

---

[1] صحیح بخاری میں منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ طلب شہادت کے لئے کثرت یہ دعا مانگا کرتے تھے جو قبول بھی ہوئی اور آپؓ مدینتہ النبیؐ میں ایک مجوسی غلام کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلک واجعل موتی فی بلد رسولک "اے اللہ! تو مجھے اپنے راستہ میں شہادت کی موت عطا فرما اور میری موت تیرے رسولؐ کے شہر میں واقع ہو"۔ (مرتّب)

(ترجمہ) " (باپ کی جھڑکی اور اظہار غیظ و غضب کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے کہا) اچھا تو آپ کو میرا سلام (میں الگ ہو جاتا ہوں 'پھر بھی) میں اپنے رب سے آپ کی مغفرت کی دعا کروں گا۔ بے شک وہ مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں سے بھی کنارہ کرتا ہوں اور ان (ہستیوں) سے بھی جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔ پھر جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور ان (بتوں) سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجا کرتے تھے کنارہ کش ہو گیا تو ہم نے اسے اسحٰق اور (اسحٰق کا بیٹا) یعقوب عطا فرمایا اور ہر ایک کو نبی بنایا اور اپنی رحمت سے نوازا۔ اور ان کو سچی ناموری عطا کی "۔

ان آیات سے بھی یہ بات مزید موکد ہو گئی کہ دعا اور عبادت ہم معنی ہیں۔ جس کو تم نے واقعتاً اپنا معبود مانا ہے 'اسی سے دعا کرو گے۔ اسی کو حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارو گے۔ اسی سے فریاد کرو گے اور اسی کی دہائی دو گے۔

میں نے اس موقع پر سورۃ المومن کی ایک 'اور سورۂ مریم کی چار آیات کے حوالے سے دعا اور عبادت کا جو ربط و تعلق بیان کیا ہے، بعینہ یہی نقشہ ہے سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت کا۔ سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں ہیں 'پہلی تین میں اللہ کی حمد و ثنا اور تمجید ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اب چوتھی آیت مرکزی آیت ہے۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ " (اے رب!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے "۔ ۲۔ استعانت کے معنی ہیں مدد مانگنا استعانت 'استدعا' استمداد 'استنصار اور استغاثہ عربی مبین کے ایسے الفاظ ہیں جن سب میں مدد مانگنے کا مفہوم مشترک ہے اور یہ دعا ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ ساری چیزیں در حقیقت صرف اللہ کے لئے ہیں۔ سورۃ الفاتحہ کی مرکزی آیت میں عبادت و استعانت دو چیزیں بالکل یک جان ہو گئیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○

احادیث نبویؐ حکمت قرآنی کا عظیم ترین خزانہ ہے۔ گویا قرآن حکیم کا جو لب لباب اور

۲۔ عربی زبان میں فعل مضارع میں زمانہ حال اور زمانہ مستقبل دونوں شامل ہوتے ہیں۔ (مرتّب)

جوہر ہے وہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوٹے چھوٹے ارشادات اور فرمودات میں مل جائے گا۔ بالکل سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق۔ آپؐ نے فرمایا۔ الدعاء مخ العبادۃ "دعا عبادت کا مغز ہے"۔ بلکہ لفظ "مخ" میں مغز کے علاوہ گودا، جوہر اور لب لباب کے مفاہیم بھی موجود ہیں۔ دوسری حدیث میں تو یہ پردہ بھی اٹھا دیا، ارشاد فرمایا۔ الدعاء هو العبادۃ۔ "دعا ہی اصل عبادت ہے"۔ جس سے تم دعا کر رہے ہو وہی تمہارا معبود ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کو پکارا ہے تو وہ ہی آپ کا معبود ہے، چاہے آپ زبان سے کہہ رہے ہوں لا الہ الا اللہ۔ "ہم اللہ کے سوا کسی اور کو معبود نہیں مانتے"۔ لیکن اگر آپ نے کہا "یا علی مدد" تو آپ نے علیؓ کو اپنا معبود بنالیا۔ آپ علیؓ کی پرستش اور بندگی کر رہے ہیں، چاہے آپ اس کا اقرار کریں، چاہے نہ کریں۔ توحید کا تقاضا یہی ہے کہ استدعا، استعانت، استمداد، استنصار، استغاثہ یہ صرف اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی دعاؤں کو صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات بابرکات کے لئے خالص کرلیں۔

اس موضوع کے اور بہت سے پہلو ہیں جن کا احاطہ آج کی نشست میں ممکن نہیں ہے۔ ان پر انشاء اللہ العزیز آئندہ کبھی گفتگو ہو گی۔ البتہ دعا کے ضمن میں ایک عملی بات بیان کرنا چاہوں گا۔ وہ عملی بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کوئی دعا کبھی بیکار یا رائیگاں نہیں جاتی۔ دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے لیکن اس کی مقبولیت کی تین مختلف شکلیں ہیں۔ پہلی یہ کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگتا ہے وہ اگر اللہ تعالیٰ کے علم کامل میں اس کے لئے خیر ہے تو وہ اسے وہی چیز عطا فرما دیتا ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اگر اللہ کے علم کامل میں یہ ہے کہ میرا بندہ لاعلمی میں مجھ سے ایسی چیز مانگ رہا ہے جو اس کے حق میں مفید نہیں ہے۔ جیسے آپ کا بچہ آپ سے چاقو مانگے تو آپ اسے چاقو نہیں دیتے۔ آپ کو پتہ ہے کہ اسے اس کا استعمال نہیں آتا اور یہ نادانی میں اپنا ہاتھ کاٹ بیٹھے گا۔ اسی طرح اگر اللہ کے علم کے مطابق یہ چیز اس بندے کے حق میں مفید نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں بندے کو وہ چیز عطا فرما دیتا ہے جو اس کے حق میں واقعتاً مفید ہو۔ تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی شے بھی اس وقت بندے کو دینا اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ میں نہیں ہے تو اللہ اس دعا کو بندے کے لئے توشۂ آخرت بنالیتا ہے۔ آخرت میں وہ دعا اس بندے کے لئے اجر و ثواب کا ذریعہ بن جائے گی۔

أَقُولُ قَوْلِي هٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللهَ لِيْ وَلَكُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

روحِ اعتکاف
اور
عظمتِ لیلۃ القدر

رمضان ۱۴۰۶ھ میں ڈاکٹر اسرار احمد کا تیسرا خطاب جمعہ

***

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى خُصُوْصًا عَلٰى اَفْضَلِهِمْ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدِ نِ الْاَمِيْنِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ ۔ اَمَّا بَعْد فقال الله تَبَارَكَ وَتَعَالٰى

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ـ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (البقرہ)

صدق الله العظيم

رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۙ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ۙ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ۙ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ۔

حضرات! آج رمضان المبارک کی بیس تاریخ ہے۔ اور آپ کے علم میں ہے کہ اکیسویں شب سے مسنون اعتکاف کا آغاز ہوتا ہے۔ گویا آج شام ہی سے اس عظیم عبادت کے لئے مساجد میں اعتکاف کی نیت سے وہ لوگ مقیم ہو جائیں گے جنہیں اللہ کی طرف سے خصوصی توفیق میسر آئے گی۔ مزید یہ نوٹ کیجئے کہ آنے والے جمعہ کو، جو اس ماہ مبارک کا آخری جمعہ ہو گا، رمضان المبارک کی ستائیسویں تاریخ ہوگی اور اس تاریخ کو قمری حساب سے پاکستان کے قیام کو ٹھیک چالیس برس ہو جائیں گے۔ یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ رمضان المبارک کی وہ ۲۷ویں شب جس میں پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا تھا، وہ بھی جمعہ ہی کی شب تھی۔ میں آج کی نشست میں انہی دو باتوں کے حوالوں سے کچھ عرض کروں گا۔

میں آج یہ سوچ رہا تھا کہ امسال رمضان المبارک کے دوران تین جمعوں میں میری کراچی میں موجودگی رہی۔ لیکن ان تین جمعوں کو مجھے تین مختلف مساجد میں کچھ بیان کرنے کا موقع ملا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کہیں ایک جگہ بھی بات پوری بیان نہیں ہو سکی۔ چونکہ وقت محدود ہوتا ہے، لیکن میں نے یہ ترتیب اپنے سامنے رکھی تھی کہ پہلے جمعہ کو ناظم آباد بلاک نمبر ۵ کی مسجد میں سورہ بقرہ کے تئیسویں رکوع کی اس تیسری آیت پر گفتگو کی جس میں رمضان المبارک کی عظمت اور ماہ رمضان کے روزے کی فرضیت کا ذکر ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ الٰی قولہ تعالیٰ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ طویل آیت ہے۔ میں نے اس کے حوالہ سے عرض کیا تھا کہ اس ماہ مبارک کی عظمت کی اساس یہ ہے کہ یہ نزول قرآن کا مہینہ ہے اور اس کا پروگرام دو گونہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ جس میں ایک تو فرض ہے یعنی دن کا روزہ اور ایک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اگرچہ فرض تو قرار نہیں دیا، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ترغیب و تشویق کے ذریعہ سے اس کی طرف امت کو توجہ دلائی ہے اور اس کا خصوصی اہتمام کرنے کی تاکید فرمائی ہے یعنی قیام اللیل کا پروگرام۔ رات کو اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑے ہو کر اس کے کلام کو سننا۔ اس کی ایک معین مقدار بیس رکعات صلوٰۃ التراویح کی شکل میں اگرچہ حضورؐ سے ثابت نہیں ہے لیکن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اکابر صحابہؓ کے مشورے سے یہ نظام مقرر کیا اور یہ تواتر کے ساتھ امت میں چلا آ رہا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر لوگ ساری رات نہ جاگ سکیں تو عربی کے ایک محاورے "مَالَا يُدْرَكُ كُلُّهٗ لَا يُتْرَكُ كُلُّهٗ" کے مصداق نماز عشاء

کے بعد کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹہ قرآن کے ساتھ جاگیں۔ لیکن فی الواقع مطلوب یہی ہے کہ تمام رات اسی کیفیت میں بسر ہو۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ ۔ " ترجمہ "جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے گئے اور جو رمضان (کی راتوں) میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لئے) اس کی بھی اگلی پچھلی خطائیں بخش دی گئیں۔ " اسی طرح آپؐ کا فرمان ہے۔ "روزہ اور قرآن آخرت میں بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔ روزہ عرض کرے گا اے رب میں نے اس شخص کو دن کے وقت کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تو اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ اور قرآن یہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں نے تیرے اس بندے کو رات کے وقت سونے سے روکے رکھا لہٰذا اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشارت دیتے ہیں کہ "پھر روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی۔ "

اب آپ غور کیجئے کہ جیسے روزے کی بندش صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کی ہے۔ دو چار گھنٹے کی نہیں ہے۔ ویسے ہی مطلوب یہ ہے کہ رمضان المبارک کی پوری رات اس عالم میں بسر ہو کہ قرآن مجید کے ساتھ ہر مسلمان کا از سرِ نو ایک ذہنی و قلبی ربط و تعلق قائم ہو جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن حکیم کی عظمت منکشف ہوگی اور قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا عزم دل میں پروان چڑھے گا۔

دوسرے جمعہ میں ناظم آباد نمبر ۴ کی جامع مسجد میں حاضری کا موقع ہوا۔ وہاں میں نے سورہ بقرہ کے تئیسویں رکوع کی چوتھی آیت کے متعلق کچھ عرض کیا تھا۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ "(اے نبی) میرے بندے جب آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو ان سے کہہ دیجئے کہ میں قریب ہی ہوں اور میں ہر دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں، قبول کرتا ہوں۔ البتہ انہیں بھی چاہئے کہ میری بات سنیں، میرے احکام پر عمل پیرا ہوں: " فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ...... "میری پکار پر لبیک کہیں" اور وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ اور مجھ پر ایمان رکھیں" ...... لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ "تاکہ وہ کامیاب اور راہ یاب ہو سکیں" کامیابی اسی راستہ سے حاصل ہوگی۔

محض دعائیں مانگنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ یعنی اس کا دوسرا رخ کیا ہے! یہ کہ تم بھی تو میری باتیں مانو' تو میں تمہاری مانوں گا۔ جیسے قرآن میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا۔ فَاذْكُرُونِيٓ اَذْكُرْكُمْ ۔ "تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد کروں گا" ۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے' اللہ تمہاری مدد کرے گا" ...... تو گزشتہ جمعہ میں اس آیت کے حوالے سے گفتگو ہوئی تھی۔

میں چاہوں گا کہ آج کے خطاب میں یہ بات مزید واضح کروں کہ اللہ کی وہ پکار کیا ہے! جو حضرات میرے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن میں شرکت کر رہے ہیں تو ان کے سامنے اللہ کی پکار بار بار آ رہی ہے اس کی پہلی پکار یہ ہے کہ خود میرے مخلص بندے بن جاؤ اور میرے لئے اپنی اطاعت کو خالص کر لو۔ فَاعْبُدُ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۔ دوسری پکار یہ ہے کہ میری دعوت کو عام کرو۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ "بلاؤ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ اور عمدہ نصیحت اور وعظ کے ساتھ اور ان (منکرین) کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہترین ہو۔ اور میری تیسری پکار یہ ہے کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ ۔ "میرے دین کو قائم کرو۔" میں نے دین اس لئے تو نہیں دیا کہ صرف اس کی مدح کرتے رہو' محض Lip Service کرتے رہو۔ میں نے قرآن اس لئے تو نہیں اتارا کہ صرف اس کی تلاوت کرا کرو۔ قرآن تو اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی تمہیں نظام عدل قسط عطا فرمایا ہے تا کہ تم اس کو قائم کرو' نافذ کرو۔ اگر یہ نہیں کرتے ہو تو تم "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" کے مجرم گردانے جاؤ گے کہ "کیوں وہ کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔"

اگر آپ اپنا جائزہ لینا چاہیں کہ رمضان المبارک کی برکات سے آپ کو بھی کوئی حصہ ملا ہے نہیں ملا تو اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیجئے اور 'Self Assessment' کیجئے' جیسے انکم ٹیکس میں آج کل یہ طریقہ رائج ہے۔ جائزہ لیجئے کہ کیا واقعی اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کا کوئی جذبہ ابھرا ہے! واقعی دل میں یہ عزم' اور ارادہ پیدا ہوا ہے کہ اللہ کے احکام پر ہمہ تن کاربند رہوں گا۔ اس کا کوئی حکم نہیں ٹالوں گا' اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا! کیا واقعی یہ داعیہ ابھرا ہے کہ اللہ کا دین جو ہمارے پاس امانت کے طور پر ہے اور ہمارے کاندھوں پر اس کی ذمہ داری ہے کہ ہم اسے دوسروں تک پہنچائیں گے' اس کی تبلیغ کریں گے' اس کی دعوت دیں گے! کیا واقعی یہ جذبہ ابھرا ہے کہ ہم تن من دھن لگا دیں گے' گردنیں کٹوا دیں گے

لیکن اللہ کے دین کو غالب کریں گے! اگر یہ ہوا ہے تو مبارک ہے۔ پھر تو آپ نے رمضان المبارک سے صحیح استفادہ کیا ہے۔ اور اگر نہیں ہوا تو برا نہ مانئے گا' یہ نیکیاں کمانے اور تقویٰ حاصل کرنے کا موسم بہار آیا اور چلا گیا۔ اس سے آپ نے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ ایک رسم ہے جو ادا کر لی گئی۔ فاقے ہیں جو کر لئے گئے ہیں۔ حقیقت میں یہ روزے نہیں ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان سنا رہا ہوں۔ کَمْ مِنْ صَائِمٍ لَیْسَ لَہٗ مِنْ صَوْمِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ ۔ "کتنے ہی روزے دار ایسے ہیں جنہیں اپنے روزے سے سوائے بھوک اور پیاس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔ ماہ رمضان کے دو عشرے آج مکمل ہو رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس شعر کا مصداق بن رہے ہوں۔

اس آرزو کے باغ میں آیا نہ کوئی پھول
اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے

تو یہ بہار کے دن نکلے جا رہے ہیں۔ اب اس ماہ مبارک کا آخری عشرہ رہ گیا ہے۔ اللہ توفیق دے تو اب بھی موقع ہے کہ ان دس دنوں سے بھرپور استفادہ کریں اور آگ سے بچنے کا سامان کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کے آخری دن جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس کے آخر میں یہی الفاظ آتے ہیں۔ وَھُوَ شَھْرٌ اَوَّلُہٗ رَحْمَۃٌ وَاَوْسَطُہٗ مَغْفِرَۃٌ وَاٰخِرُہٗ عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ ۔ یعنی اس ماہ رمضان کے تین عشرے ہیں۔ پہلا رحمت ہے' دوسرا مغفرت ہے اور تیسرا جہنم سے نجات پانے کا ذریعہ ہے۔ گویا یہ آخری عشرہ گردن کو آگ سے چھڑا لینے کا بہترین موقع ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس عشرے کی برکات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اس آخری عشرے میں ایک خاص عبادت ہے۔ جسے یوں سمجھنا چاہئے کہ وہ رمضان المبارک کے پورے پروگرام کا نقطۂ عروج ہے۔ جس طرح ہر چیز تدریجاً ترقی کرتی ہے اور ایک نقطۂ عروج و کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح رمضان المبارک کے پروگرام کا بھی ایک عروج ہے اور وہ عروج ہے **اعتکاف** ...... اللہ کے فضل و کرم سے اب پھر اعتکاف کا چرچا اور اس کا شوق بڑھ رہا ہے۔ نوجوان بھی بڑی تعداد میں اس مسنون عبادت کو بڑے ذوق و شوق سے ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر اس اعتکاف کی اصل حقیقت نگاہوں کے سامنے نہ ہو تو نہ اس کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ اس سے صحیح طور پر استفادہ ممکن ہوتا ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ اعتکاف درحقیقت ارتکاز توجہ کا نام ہے۔ کسی حقیقت پر توجہ کو مرتکز کرنا' یہ ہے

اعتکاف کا اصل حاصل...... قرآن مجید میں اس کا ذکر یا تو سورۃ البقرہ کے تیئیسو یں رکوع کی پانچویں آیت میں آیا ہے جس میں رمضان اور روزے کے معاملات زیر بحث آئے ہیں۔
"وَلَا تُبَاشِرُوْ هُنَّ وَاَنْتُمْ عَا كِفُوْنَ فِي الْمَسَاجِد ط۔" یا پھر سورہ بقرہ کے پندرہویں رکوع میں اس کا ذکر موجود ہے کہ ہم نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام سے عہد لیا کہ تم ہمارے اس گھر (بیت اللہ) کو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک صاف رکھنا۔ وَعَهِدْنَا اِلَى اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمَاعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○
مزید بر آں سورۃ الحج میں بھی یہ لفظ قریباً اسی سیاق و سباق میں وارد ہوا ہے۔ باقی یہ لفظ قرآن میں کثرت سے بت پرستوں کے لئے آیا ہے۔ آپ میں سے بہت سے لوگ یہ سن کر یقیناً حیران ہوں گے لیکن میں آگے وضاحت کر دوں گا۔ سورہ اعراف میں فرمایا۔ وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ۔ پھر سورہ انبیاء میں ایک مرتبہ' سورہ طٰہٰ میں دو مرتبہ یہ لفظ بت پرستوں کے لئے استعمال ہوا۔ مزید یہ کہ سورۂ شعراء میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَا كِفِيْنَ ○ "ان کافروں نے (حضرت ابراہیمؑ سے) کہا ہم ان مورتیوں کو پوجتے ہیں پھر سارے دن انہی کے پاس لگے بیٹھے رہتے ہیں۔" بت پرستوں کا یہ اعتکاف کیا ہے! ہندی کے دو الفاظ آپ میں سے اکثر حضرات نے سن رکھے ہوں گے گیان اور دھیان "گیان" کہتے ہیں معرفت کو اور "دھیان" ہے توجہ کا ارتکاز 'یعنی جسے بھی اپنا معبود مانا ہے اس سے لو لگانا...... ہوتا یہ ہے کہ انسان اس حیاتِ دُنیوی میں کسی عقیدے کو ذہناً قبول تو کر لیتا ہے کہ یہ بات صحیح ہے 'لیکن اس کی طرف اس کی کامل توجہ نہیں رہتی۔ پیٹ کا دھندا ہے بال بچوں کی پرورش اور تعلیم کی فکر ہے اور بہت سے ذاتی' نجی اور گھریلو مسائل اسے گھیرے رکھتے ہیں۔ نتیجۃً زندگی کے اصل حقائق اس کے سامنے نہیں رہتے۔ اقبال کے اس خوبصورت شعر میں انسان کی اسی گمشدگی کا بیان ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

مومن وہ ہوتا ہے جو اسی دنیا میں رہتے ہوئے اس سے بالاتر ہو کر رہتا ہے۔ یہ مصرع بے اختیار زبان پر آرہا ہے کہ ع "بازار سے گزرا ہوں' خریدار نہیں ہوں"...... مومن کی اصل

دلچسپیاں اس دنیا سے وابستہ نہیں ہوتیں۔ اس کا دل کہیں اور اٹکا ہوتا ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرش عظیم کے نیچے پناہ دے گا' اس حال میں کہ کہیں اور سایہ نہیں ہوگا۔ سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِي ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّاظِلُّهٗ۔ ان سات میں ایک کی کیفیت ان الفاظ میں بیان ہوئی۔ رَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ۔ "وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا رہتا ہے۔" مسجد سے نکلتا تو ہے' ضروریات زندگی کے لئے کاروبار دنیا میں حصہ بھی لیتا ہے لیکن اس میں اسے دلی انہماک حاصل نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنا دل مسجد ہی میں چھوڑ جاتا ہے۔ مجبوراً باہر نکلتا ہے لیکن گوش بر صدائے اذان رہتا ہے۔ چنانچہ جیسے ہی کانوں میں اذان کی آواز پڑی' دھندا بند کیا اسے چھوڑا اور مسجد کی طرف لپکا۔ لیکن ہماری کیفیت تو یہ ہے کہ دل تو دنیا سے لگا ہوا ہے اور ہماری پوری کی پوری توجہ دنیا اور اس کے جھمیلوں میں الجھی رہتی ہے۔ تو رمضان کے پروگرام کی معراج یہ ہے کہ انسان آخری عشرے میں دنیا سے کٹ جائے۔ پہلے دو عشروں میں تم نے دن کا کھانا پینا چھوڑا' بھوک اور پیاس برداشت کی۔ رات کا زیادہ حصہ قرآن' نوافل اور ذکر و اذکار کے ساتھ جاگتے رہے۔ اب اس کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ آخری عشرے میں دنیا سے کٹ جاؤ۔ دس دن کے لئے اللہ کی چوکھٹ پر آکر بیٹھ جاؤ۔ دن میں روزہ رکھو اور رات کے زیادہ سے زیادہ حصہ میں اللہ کی یاد میں اپنے آپ کو گم کر دو تاکہ انسان کا جو روٹین بن جاتا ہے' وہ ٹوٹے۔

آپ کو معلوم ہے کہ انسان اپنے روزمرہ کے معمولات کا غیر شعوری طور پر بھی اس طرح عادی ہو جاتا ہے کہ ایک روٹین بن جاتی ہے اس کا ایک چکر آپ سے آپ چلتا رہتا ہے۔ اس روٹین کو دس روز کے لئے توڑو اور آؤ اللہ کے گھر میں آکر بیٹھو' آؤ اس سے لو لگاؤ۔ یہ ہے دراصل اعتکاف کا مقصود! اصل محرومی یہ ہے کہ جو حضرات ہر سال مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں ان کی اکثریت اس کی روح سے واقف نہیں ہے۔ اعتکاف کے لئے مسجد میں مقیم ہیں' لیکن گپیں بھی ہو رہی ہیں' دنیوی گفتگوئیں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ باتیں حرام نہیں ہیں۔ کوئی آپ سے ملنے آئے اور اگر ضرورت ہو تو آپ سے کوئی مشورہ بھی کر لے' اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن ایک ہے کسی چیز کا جائز ہونا اور ایک ہے اس کی اصل روح۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس اعتکاف کی اصل روح یہ ہے کہ ان دس دنوں کے لئے انسان اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں سے منقطع کر لے۔ انسان پر اس دنیا کے مسائل کا جو

غلبہ رہتا ہے اس سے اپنے آپ کو آزاد کرے۔ اب توجہات کا رخ دنیا سے ہٹا کر اپنے
مالک کی طرف موڑ لے۔ اگر اعتکاف میں بھی اہل و عیال ' مال و منال اور کاروبار کی فکر ذہن و
قلب پر مسلط رہی اور یہاں بیٹھ کر بھی تمام معاملات کے لئے ہدایات جاری ہوتی رہیں ' تو خود
سوچئے کہ مسجد میں معتکف ہونے کا کیا فائدہ ہوا؟ آدمی سفر پر جاتا ہے تو وہاں سے بھی
ٹیلی فون ' ٹیلی گرام اور ٹیلیکس کے ذریعہ سے یہ کام کرتا ہی رہتا ہے۔ تو اگر یہی کام وہ اعتکاف
کی حالت میں بھی کرتا رہے تو کیا فرق واقع ہوا؟ اعتکاف فرض تو ہے نہیں کہ ہر حال میں ادا کرنا
ہے ' خواہ طبیعت آمادہ ہو یا اس پر جبر کرنا پڑے۔ نماز چونکہ فرض ہے اس لئے بہر حال ادا
کرنی ہے چاہے حالت نماز میں کتنے ہی وسوسے آئیں ' اس سے مفر نہیں۔ لیکن نفل نماز کے
بارے میں تو مسئلہ یہ ہے کہ اگر طبیعت آمادہ ہو ' اس میں نشاط ہو ' دل لگتا ہو تو ادا کرو۔ اس کو
زبردستی اپنے اوپر فرض نہ کر لو۔ یہی معاملہ اعتکاف کا ہے۔ اگر طبیعت اس کی پابندیاں قبول
کرنے پر آمادہ ہو تو اعتکاف کیجئے! یہ فرض نہیں ہے۔ البتہ مسنون ہے اور نبی اکرمؐ اس کی
بڑی پابندی فرمایا کرتے تھے ۔ اس کی اصل روح ہے تَبَتُّلٌ اِلَی اللّٰہِ۔ جیسے سورۂ مزمل
میں حضورؐ سے فرمایا گیا۔ وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا ○ (آیت
نمبر ۸) "اور ذکر کئے جاؤ اپنے رب کے نام کا۔ اور چھوٹ کر چلے آؤ اسی کی طرف سب سے
الگ ہو کر۔ " چنانچہ اعتکاف میں اللہ کا ذکر ہو ' اس کی یاد کو دل میں نقش کا لحجر بنانے کی
شعوری کوشش ہو۔ اس سے دعا ہو ' استغفار ہو ' قرآن مجید کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہو ' اس
پر تدبر ہو۔ الغرض ان ایام کے لئے یکسر نئے معمولات ہوں۔ میں اس موقع پر اختصار سے
عرض کروں گا کہ حج میں بھی اسی طور سے معمولات کو بدلنے کا معاملہ ہوتا ہے۔ حج کے متعلق
آپ حضرات نے یہ الفاظ تو سنے ہوں گے کہ اَلْحَجُّ اَلْعَرَفَۃُ" ۔ حج کا رکن رکین
وقوف عرفہ ہے۔ اگر وہ فوت ہو گیا تو حج نہیں ہوا۔ باقی کوئی رکن رہ جائے تو اس کا بدل ہے
اس کی قضا ہو سکتی ہے ' اس کے لئے دم دیا جا سکتا ہے ' اس کے لئے روزے رکھے جا سکتے
ہیں۔ لیکن اگر وقوف عرفہ نہیں ہوا تو حج نہیں ہوا۔ یہ اس کی شرط لازم ہے۔ جن لوگوں کو حج کی
سعادت نصیب ہوئی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں عجیب حکمت رکھی گئی ہے کہ جس طرز کی
عبادت کے لوگ عادی ہو چکے ہوتے ہیں ' وہ وہاں بند کر دی گئی ہے۔ عرفہ میں کوئی نماز
نہیں۔ ظہر کے ساتھ ہی عصر پڑھ کر عرفہ میں داخل ہونا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بہت
سے لوگ عرفات میں جا کر نماز ظہر و عصر پڑھ لیتے ہیں۔ پھر یہ کہ سورج غروب ہونے

رأبعد عرفہ سے روانگی ہے لیکن مغرب کی نماز وہاں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ مغرب کی
ماز کافی تاخیر سے مزدلفہ میں جا کر ادا کرنی ہوتی ہے اور اس کے فوراً بعد عشاء کی نماز ادا کی جاتی
ہے اب یہ بظاہر عجیب بات ہے۔ لوگ تو ہر نماز اس کے وقت پر پڑھنے کے عادی ہو چکے ہوتے
ں۔ ظہر اپنے وقت پر' عصر اپنے وقت پر اور ادھر سورج غروب ہوا ادھر مغرب کی نماز کے
لئے کھڑے ہو گئے۔ وہاں آپ سورج غروب ہونے سے قبل عرفہ سے جا نہیں سکتے۔ جو لوگ جاتے
ں وہ غلط کرتے ہیں۔ یہ فرق کیوں ہے؟ تاکہ وہ معمول (ROUTINE) والی عادت جو
راج کا جزو بن گئی ہے' اسے ختم کر کے' اس کے برعکس کام کرایا جائے۔ وقوف عرفہ کی
مل حکمت یہ ہے کہ اگر واقعی اللہ کی طرف انابت ہے تو لوگ وہاں اللہ سے زیادہ سے زیادہ
ما کریں۔ جس طرح چاہیں اسؑ سے مناجات کریں' اس سے ہم کلام ہوں۔ اسؑ کی طرف
میان ہو' اسؑ سے لو لگائیں' اس سے عفو و مغفرت طلب کریں۔ یہ ہے وقوف عرفہ کی اصل
رض وغایت۔

یہی ہے اس اعتکاف کی اصل روح کہ آدمی اپنے معمولات سے منقطع ہو کر اللہ کے گھر
ں آ کر ڈیرا لگا لے۔ وہ ہو اور اس کی تمام تر توجہات کا مرکز و محور اللہ کی یاد بن جائے۔ ہر آن
ں سے لو لگی رہے اور دس دن تک عملاً یہ نقشہ ہو کہ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا
وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ اللہ ہی کی یاد ہو کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور کروٹ کے بل لیٹے بھی۔ اللہ
کے ذکر سے آپ کے قلب کو وہ اطمینان' راحت اور سکون ملے گا جس کے سامنے ساری دنیا
ہے۔ خود باری تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ
بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○..... "جو لوگ ایمان لائے
ران کے دل اللہ کی یاد سے اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ دل اللہ ہی کی یاد سے
مینان و سکون پاتے ہیں۔" دل مضطر ذکر الٰہی کے ذریعے ہی مکروہات دنیا کے تکدر سے
ل ہو کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی۔

منتشر رہتا ہے مکروہاتِ دنیا سے بہت
اس دلِ مضطر کو یا اللہ اطمینان دے!

درحقیقت اعتکاف کی مسنون عبادت کا مقصود ہی یہ ہے کہ مکروہات اور مسائل دنیا سے
تعلق منقطع کرو اور اللہ سے لو لگاؤ' اسی کی طرف توجہات کا ارتکاز کرو۔ اس سے مناجات
رو' اس سے مغفرت طلب کرو' اس سے پچھلے گناہوں کی معافی چاہو۔ اللہ تعالیٰ ان سب

حضرات کو جو آخری عشرے کے لئے مساجد میں معتکف ہو رہے ہیں' توفیق عطا فرمائے کہ اعتکاف کی اس مسنون عبادت کا حق ادا کریں۔

معتکف حضرات کو اس مسنون عبادت کے اجر و ثواب کے ساتھ ایک عظیم عبادت کی سعادت بلا تکلف نصیب ہو جاتی ہے' جس کی فضیلت کے بیان میں قرآن مجید کی ایک مکمل سورۃ مخصوص ہے۔ یعنی لیلۃ القدر یہ وہ رات ہے جس میں قرآن مجید لوح محفوظ سے سمائے دنیا پر نازل کیا گیا تھا۔ بعد میں دعوت توحید جن مراحل سے گزرتی رہی' انہی اعتبارات سے اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن مجید کو حضرت جبرئیل علیہ السلام قلب محمدی علیٰ صاحبہ الصّلوٰۃ و السلام پر نازل فرماتے رہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی ترتیب نزولی اور ہے اور جو مصحف ہمارے ہاتھوں میں ہے اسی ترتیب اور یہ مصحف کی ترتیب لوح محفوظ کے مطابق ہے اور اسی ترتیب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید امت کو دے کر اس دنیا سے الرفیق الاعلیٰ کی طرف مراجعت فرمائی تھی۔

حضورؐ نے شعبان کی آخری تاریخ میں رمضان المبارک کی عظمت سے متعارف کرانے کے لئے جو خطبہ دیا تھا' اس خطبے میں الفاظ آتے ہیں: شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ اَلْفِ شَهْرٍ اس لیلۃ القدر کے متعلق دوسری احادیث صحیحہ میں آتا ہے کہ یہ رات آخری عشرے کی طاق راتوں میں سے ہوتی ہے۔ ان میں اسے تلاش کرو۔ معتکف حضرات کو اس رات کی تلاش میں خاص تکلف و اہتمام نہیں کرنا ہو گا۔ وہ انشاء اللہ اس رات کی برکات کو پالیں گے۔ اس رات کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے یہ رات نصیب ہو جائے تو میں اس میں اپنے رب سے کیا دعا مانگوں......

تو آپؐ نے انؓ کو یہ دعا تلقین فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ

"اے اللہ' بے شک تو بہت معاف فرمانے والا ہے اور معافی کو پسند فرماتا ہے پس تو مجھے بھی معاف فرما دے"

اس دعا کی عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبوب ترین زوجہ محترمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس کی تلقین فرمائی تھی۔ لہٰذا ان راتوں میں ہم میں سے ایک کو یہ دعا کثرت کے ساتھ پڑھنی چاہئے۔

ایک بات مزید عرض کر دوں کہ رمضان کے آخری عشرے کے مسنون اعتکاف ۔

علاوہ اعتکاف کی ایک نفلی شکل بھی ہے۔ آپ ایک دن ' ایک رات ' ایک گھنٹہ حتیٰ کہ پانچ منٹ کا بھی اعتکاف کر سکتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں تو اعتکاف کی نیت کر لیں۔ اب آپ نے جتنے وقت کی نیت کی ہے ' اتنا وقت بس اللہ سے لولگانی ہے۔ باقی ہر نوع کی دنیوی باتیں چھوڑ دینی ہیں۔ یہ نفلی اعتکاف ہے۔ میرے ماں باپ قربان ' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے حق میں اتنے شفیق ' اتنے رؤف اور اتنے رحیم تھے کہ اتنے مختصر وقت کے لئے اعتکاف کی نیت اور اس پر صحیح عمل پر بھی ہمیں اجر و ثواب کی بشارت دے گئے ہیں۔

رمضان المبارک اس قرآن کے نزول کا مہینہ ہے۔ روزوں سے ہمارے اندر تقویٰ اس لئے پیدا کرنا مقصود ہے کہ تقویٰ نہیں ہو گا تو قرآن سے استفادہ نہیں کر سکو گے یہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ہے۔ دن میں روزہ رکھو۔ رات کو قرآن کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جاگو۔ اس سے تمہارے دل کے اندر انابت پیدا ہو گی ' رجوع پیدا ہو گا۔ خشوع پیدا ہو گا۔ قرآن کی عظمت تم پر منکشف ہو گی۔ پھر جب یہ خشوع انتہا کو پہنچ جائے تو آخری عشرے میں سب سے منہ موڑ کر آؤ اور اللہ کے گھر کے کسی کونے میں اللہ سے لو لگانے کے لئے دھونی رما کر بیٹھ جاؤ۔ اس سے مناجات کرو ' دعائیں کرو ' اس کی کتاب مبین کی تلاوت کرو اور ان ذرائع سے اس سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرو..... یہ ہے اعتکاف کی مسنون عبادت کی روح اور اس کی اصل غرض و غایت۔ اللہ تعالیٰ ہر معتکف کو ان روحانی برکات سے بہرہ مند فرمائے۔

دوسری بات میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا اگلا جمعہ ستائیس رمضان المبارک کو آ رہا ہے۔ اس تاریخ کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت "پاکستان" کے نام سے قائم ہوئی تھی۔ لیکن ہم نے اپنی بد عملی اور ناہنجاری کے باعث اسے آج سے ساڑھے سولہ سال قبل دولخت کرا دیا۔ موجودہ پاکستان وہ نہیں ہے جو ۴۷ء میں قائم ہوا تھا۔ ہمارا ایک بازو ہم سے ٹوٹ چکا۔ اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے ' بہت بڑا حادثہ ہے اور بہت بڑی سزا ہے جو ہمیں اللہ کی طرف سے ملی۔ ہم نے اللہ سے اور خلقِ خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔" لیکن ہم نے اس عہد کی خلاف ورزی کی۔ مادی اعتبار سے ہم نے چاہے کتنی ترقی کی ہو ' لیکن واقعہ یہ ہے کہ دینی اور اخلاقی لحاظ سے ہماری حالت بڑی دگرگوں ہے۔ عالم یہ ہے کہ قیام پاکستان کے وقت جو تھوڑی بہت دینی اور اخلاقی اقدار ہماری قوم میں موجود تھیں ' ان کا بھی دیوالیہ نکل چکا ہے اور ہم روز بروز دینی و اخلاقی اعتبارات سے

انحطاط سے دوچار ہوتے اور پستی میں گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ سے کئے ہوئے عہد کی خلاف ورزی کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ ہماری سرحدوں پر کئی اطراف سے خطرات منڈلا رہے ہیں۔ پھر سب سے بڑا خطرہ باہر سے نہیں' اندر سے ہے۔ قرآن کریم میں سورۃ انعام میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط (آیت نمبر ۶۵) یا تو آسمان سے عذاب نازل ہوتا ہے' آندھی آ گئی' طوفان آ گیا' کوئی طوفانی بارش آ گئی۔ کوئی سائیکلون آ گیا۔ اسی طرح کی کوئی اور آسمانی آفت آ گئی۔ یا ہمارے قدموں سے کوئی عذاب پھوٹ پڑے۔ زلزلہ آ جائے' خسف ہو جائے' زمین میں دھنسا دیا جائے' جیسے قارون کو اس کے محل سمیت دھنسا دیا گیا تھا۔ جس طریقہ سے عامورہ اور ثمود کی بستیاں تباہ کی گئیں۔ اور جس طرح زمین سے چشمہ پھوٹا تھا جس کے پانی اور آسمان کی بارش نے مل کر طوفان نوح کی شکل اختیار کر لی تھی۔ عذاب کی دو شکلیں تو یہ بیان ہوئی کہ آسمان سے نازل ہو یا زمین سے نکلے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا عذاب ہے۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ کو نہ آسمان سے کچھ نازل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور زمین سے کچھ نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کیا ہے! وہ بدترین عذاب ہے۔ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط...... "تمہیں ہی گروہوں میں تقسیم کر دے اور آپس میں ٹکرا کر ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی طاقت کا مزا چکھا دے"۔ آسمان یا زمین سے عذاب بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں..... ایک دوسرے کی طاقت آپس میں آزماؤ۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ایک دوسرے کا گریبان ہو۔ ایک دوسرے کے خنجر ایک دوسرے کے سینے میں پیوست ہو جائے۔ ایک دوسرے کے گھر خود جلائیں' ایک دوسرے کو خود ہی ذبح کریں..... عذاب کی یہ شکل پہلے مشرقی پاکستان میں آئی۔ مسلمان کے ہاتھوں مسلمان کی جان گئی' عزت گئی' آبرو گئی۔ سکھر میں ایک صاحب نے اپنی آپ بیتی مجھے سنائی کہ ہم سترہ افراد تھے جن کو مکتی باہنی کے لوگوں نے پکڑ لیا تھا۔ یہ غنڈے نہیں تھے چونکہ ہمیں باندھنے والوں نے وضو کیا اور نفل ادا کئے اور دعا کی کہ اے اللہ' ہم ان کو قتل کر رہے ہیں' تو جانتا ہے کہ یہ ظالم ہیں' انہوں نے ہمارا خون چوسا ہے' انہوں نے ہمارے حقوق غصب کئے ہیں۔ اس کے بدلے ہم انہیں قتل کر رہے ہیں۔ اس دعا کے بعد شوٹ کیا ہے۔ راوی بھی ان سترہ افراد میں شامل تھے۔ ان کو گولی نہیں لگی' لیکن وہ مردہ بن کر گر پڑے۔ اس طرح بچ گئے اور کسی نہ کسی طرح پاکستان آ

ے۔ یہ بدترین عذاب کی شکل ہے۔ یہ الفتنۃ الکبریٰ ہے اور یہ ہمارے یہاں نمودار ہوا۔
ں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اس بچے کھچے پاکستان میں حالات اسی رخ پر جا رہے
ں۔ خاص طور پر سندھ اور اس کا بھی نہیں پاکستان کا عروس البلاد کراچی آتش فشاں کے
انے پر کھڑا ہے۔ کراچی میں پٹھان اور بہاریوں کے درمیان نہایت خونیں اور خوفناک
ادم ہو چکا ہے۔ چھوٹے چھوٹے عذابوں کا مزا اللہ ہمیں چکھا رہا ہے کہ ہم اب بھی ہوش میں
بائیں۔ ایک منی بس میں پندرہ سولہ افراد کو جنہوں نے زندہ جلا یا تھا۔ وہ جلانے والے کون
ے! جلانے والے بھی مسلمان اور جلنے والے بھی مسلمان...... اس کے بعد سے روزانہ کسی نہ
ں علاقے اور بستی سے مختلف گروہوں میں مسلح تصادم کی خبریں آ رہی ہیں۔ اسی رمضان
ے اوائل میں ان لڑائیوں کی وجہ سے بعض علاقوں میں کرفیو لگ چکے ہیں۔ یہ ایک بڑے طوفان
یش خیمہ ہیں[1]۔ یہ اُسی عذاب کے آثار ہیں جو مشرقی پاکستان میں اپنی پوری شدت سے آ
ہے۔ یہ عذاب کے کوڑے ہماری پیٹھوں پر کیوں برس رہے ہیں۔ معاذ اللہ اللہ تو ظالم
ں ہے۔ صلوٰۃ التراویح میں آپ نے یہ آیات سنی ہوں گی۔ سورہ آل عمران میں فرمایا۔
ا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○ (آیت نمبر ۱۱۷) یہی مضمون
ہ اعراف کی آیات نمبر ۱۶۰ - ۱۶۲ اور ۱۷۷ میں ہے۔ مزید برآں بہت سی سورتوں میں
ں کا ذکر ہے۔ سورہ یونس کی آیت نمبر ۴۴ میں یہ بات بڑے واضح انداز میں فرمائی۔
اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○
مارے اپنے کرتوت ہیں، ہماری بداعمالیاں ہیں بقول شاعر ع "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ
ت"۔ ہمیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے یہ اللہ کی تنبیہات ہیں۔ یہ سب
ں ہے! اسے ایک جملہ میں سمجھ لیجئے۔ جس وعدے پر ہم نے یہ ملک بنایا تھا ہم نے اس کا ایفا
ں کیا۔ وعدہ خلافی کی ہے۔ ہم نے غداری کی ہے۔ ہم نے اسلام کے لئے یہ ملک بنایا تھا۔
ں ہم نے زبانی کلامی باتوں کے علاوہ اسلام کے نفاذ اور اسلامی نظام کے قیام کی طرف قطعی
ں قدمی نہیں کی۔ بلکہ ترقی معکوس کی ہے۔ دینی اور اخلاقی حیثیت سے بحیثیت قوم و ملت
وز بروز گرتے چلے جا رہے ہیں۔ اب اگر ہم اس خوفناک صورت حال سے بچنا چاہتے ہیں

---

[1] خیال رہے کہ یہ تقریر ۳۰ر مئی ۸۶ء کو کی گئی تھی۔ اس کے بعد کراچی جس باہمی مسلح تصادم اور آگ و خون کے دریا سے مسلسل گزر رہا ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ان حالات پر ہر دردمند دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ (مرتب)

تو اس کا واحد علاج ایک ہی ہے کہ ایک طرف خود اپنی انفرادی زندگیوں پر اسلام کو نافذ کریں، دوسری طرف اللہ کے دین کو عملاً اس ملک میں قائم کرنے کے لئے صحیح نہج پر جدوجہد کریں[1]۔ اگر ہم اس کام کے لئے بیڑا اٹھالیں تو ہماری بگڑی بن سکتی ہے۔ اللہ کا وعدہ ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ○ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمادے گا"۔ اللہ کی مدد سے مراد کیا ہے! اللہ کے دین کو قائم و نافذ کرنے کی ہمہ تن، ہمہ وجوہ، ہمہ وقت جدوجہد کرنا...... جگر مراد آبادی نے اس مفہوم کی بڑی دلنشین انداز میں ترجمانی کی ہے ؎

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمالے اور پاکستان کو اسلام کا گہوارہ بنادے تاکہ ہم دنیا کو پاکستان کے ذریعہ سے اسلام کی برکات سے روشناس اور واقف کراسکیں اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَائِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

---

[1] اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کی نہایت فکر انگیز تحریر "استحکام پاکستان" کے نام سے دو جلدوں میں مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ملک کے حالات اور اسلامی انقلاب کی ضرورت کو سمجھنے کے لئے انشاء اللہ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ نہایت مفید ہو گا۔

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيمَانًا وَاحْتِسَابًا

غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيمَانًا وَاحْتِسَابًا

غُفِرَلَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

(ترجمہ) جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے اور جو رمضان (کی راتوں) میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں۔

(الحدیث)

Adarts-CAR-2/88

مولانا سیّد حامد میاںؒ کی وفات پر "اوّل وہلے میں"

مولانا افتخار احمد فریدی، مراد آباد (بھارت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا سید حامد میاں صاحب دیوبندی ثم مراد آبادی ثم لاہوری کی وفات و جدائی نے دل کو تڑپا دیا مسلسل دعا مانگ رہا ہوں اُن کے لئے درجات عالی، اُن کے مشن کی سلامتی و بقا، اُن کے خانوادے میں جوڑ و محبت کے ساتھ جامعہ مدنیہ کی خدمت کے لئے خوب قبول فرمائے۔ مولانا کے والد صاحب مولانا محمد میاں صاحبؒ کی زندگی کا بڑا حصہ مراد آباد مدرسہ شاہی میں گذرا تعلیم و تدریس، دعوت و جہاد، تاریخ ملت پر ان کا بڑا کام ہے تقسیم وطن کے بعد قتل گاہوں میں خدمت و غم گساری میں زندگی کے آخر تک لگے رہے۔

حضرت مولانا حامد میاں صاحبؒ کا درس و تربیت و تعلیم و تدریس سب مراد آباد ہی میں ہوئی۔ خانوادۂ شیخ الہندؒ میں شادی ہوئی۔ مولانا عبدالحق مدنیؒ ناظم مدرسہ شاہی مراد آباد کی صاحبزادی سے۔ ان کی خوش دامن حضرت شیخ الہندؒ کی بھتیجی ہیں جو دیوبند میں مقیم ہیں۔

دیوبند کی زمین سے جو علم و دین، جہاد کا کام لیا گیا اس میں کارفرما سادات و صدیقی و عثمانی خانوادے ہی کارفرما رہے جو غیبی نظام کے ساتھ دیوبند میں بسائے گئے تھے۔ شیخ الہند کے جانشین شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے تربیت پا کر حضرت مدنیؒ کی نسبت عالی کی نمائندگی کے لئے حق تعالیٰ نے خطۂ پاکستان کو نوازا۔ زندگی بھر ملت پاکستان کی دینی خدمت میں لگے رہے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی خدمت قرآن تنظیم اسلامی کی بھی رہبری فرماتے رہے۔ مجھ حقیر و فقیر کو بھی کچھ فرماتے رہے تھے۔ ان کے آخری خط کی فوٹو کاپی ارسال کر رہا ہوں بندہ بھی ان سے درخواست کرتا رہا حضرت والد صاحبؒ کے حالات زندگی لکھنے کے لیے۔ معلوم ہوا ہے کہ کچھ لکھے تھے۔ اگر مل جائیں تو انہیں بھی میثاق میں دیدیجئے گا۔

والسلام

محروم خادم افتخار فریدی۔ مراد آباد

مکتوب گرامی مولانا سید حامد میاںؒ بنام مولانا افتخار احمد فریدی

محترمی و مکرمی ! دام مجدکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ جو ۲۴ اگست کا تحریر فرمودہ ہے موصول ہوا۔ میرا خیال ہے کہ اس ارادہ میں کہ کسی وقت آپ اپنے ملفوظات جمع کریں۔ وقت گزرتا جارہا ہے۔ اس کے بجائے آپ روزانہ ایک کاپی پر اپنے ہاتھ ہی سے ایک صفحہ لکھتے رہیں۔ جو یاد آئے لکھ دیا جائے اور تاریخ ڈال دی جائے۔ یہ روزنامچہ مجموعہ تاریخ و احوال چاہے غیر مرتب ہو کہ کبھی کسی کا اور کبھی کسی کا حال لکھا گیا لیکن نہایت مفید اور دلچسپ ضرور ہوگا اور کسی بھی وقت افراد و شخصیات کے حالات یکجا بالترتیب کوئی بھی جمع کر دے گا اس کی ایک فوٹو کاپی بھی پابندی سے کراتے رہیں تو بہت بہتر ہو۔ وہ کسی معتبر آدمی کے ہاتھ یہاں آجایا کرے تو رسائل میں شائع ہوتی رہے گی ۔ ان شاء اللہ ! اللہ تعالیٰ ہمارے اور آپ کے اوقات میں برکت عطا فرمائے ۔

دعاؤں کا خواست گار حامد میاں ۱۷ اکتوبر ۸۷

ASIA

ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

زنگ سے محفوظ اچھا معیار اور مناسب دام
پستول مارکہ

وننزل من القرآن ما هو شفاء
ورحمة للمؤمنين

حدیثِ نبوی

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلصِّيَامُ وَالْقُرْاٰنُ يُشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَقُوْلُ الصِّيَامُ اَیْ رَبِّ اِنِّیْ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهَوَاتِ بِالنَّهَارِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ وَيَقُوْلُ الْقُرْاٰنُ مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ فَشَفِّعْنِیْ فِيْهِ فَيُشَفَّعَانِ -

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے (یعنی اُس بندے کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو اُس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کریگا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، آج میری سفارش اسکے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا کہ: میں نے اسکو رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، خداوندا آج اسکے حق میں میری سفارش قبول فرما۔ چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اُس بندہ کے حق میں قبول کی جائیگی (اور اس کیلئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائیگا)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۷

شمارہ ۶

شوال المکرم ۱۴۰۸ھ

جون ۱۹۸۸ء

فی شمارہ -/۵

سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۲۵ سعودی ریال یا -/۱۱۵ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶۔ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹۔ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ ″ ″
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲۔ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ ″ ″

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ فون: ۸۵۲۶۱۱، ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسرار احمد

عرضِ احوال

"میثاق" کے گزشتہ دو شماروں کے مانند پیشِ نظر شمارہ بھی ایک "خصوصی اشاعت" کی حیثیت رکھتا ہے جس کا مقصد ہفت روزہ "ندا" لاہور کا تعارف ہے، جس کا اجراء ہماری دعوت اور تحریک کے ضمن میں ایک اہم پیش رفت کا مظہر ہے۔

کسی جریدے کا اس اہتمام سے تعارف عام حالات میں بھی ذوقِ سلیم پر گراں گزرنے والی بات ہے۔ "ندا" کا معاملہ اس اعتبار سے مزید نزاکت کا حامل ہے کہ اس کے مدیر اور فی الوقت "مالک" (اگرچہ آئندہ کے "متولّی") راقم الحروف کے چھوٹے بھائی ہیں!

معاملے کی اس نزاکت اور حسّاسیّت کے پورے شعور و ادراک کے باوصف یہ "جسارت" اس لئے کی جا رہی ہے کہ دعوت اور تنظیم کے میدان میں اتر کر راقم اب سے بہت پہلے اپنے آپ کو تنقید و ملامت ہی نہیں، طنز و استہزاء تک کے لئے کھلے طور پر پیش (EXPOSE) کر چکا ہے، اگر دعوت اور تحریک کے مصالح متقاضی ہوں تو اس معرضِ تنقید و تمسخر کی ایک کھڑکی مزید کھول دینے میں ہرگز کوئی مضائقہ نہیں! اس لئے کہ بقول فیض۔

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں، بجز داغِ ندامت!

"مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" ...... اور اس کی ذیلی انجمنیں، اور "تنظیم اسلامی پاکستان" اور اس کے بیرونِ ملک حلقے جس دعوت اور تحریک کے لئے سرگرمِ عمل ہیں، اُس پر اللہ تعالیٰ کا نہایت عظیم فضل و احسان یہ ہے کہ اس کے مبنیٰ و مدار، اور مرکز و محور ہونے کی حیثیت کلیۃً قرآن حکیم کو حاصل ہے۔

چنانچہ اس میں...... بحمد اللہ...... نہ تو کسی مفکر یا مصنف کی تصانیف کو اساسی لٹریچر کی حیثیت حاصل ہے' نہ اس کے داعی اور مؤسس کا مزاج اور اسلوب صحافیانہ رہا[1] ...... اور نہ ہی اس نے ترقی پسند ادب کی تحریک کی نقالی میں افسانوں' ڈراموں اور خاکوں یا نظموں اور ترانوں کو اپنے فکر کی اشاعت کا ذریعہ بنایا' جس میں لامحالہ بعض ممدوحین کے لئے محبت و عقیدت اور مخالفین کے لئے نفرت و حقارت کے ضمن میں مبالغہ آمیزی در آتی ہے اور رفتہ رفتہ طنز و طعن' اور تمسخر و استہزاء کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے' جو دین کی دعوت و تبلیغ کے یکسر منافی ہے۔

بلکہ اس کے برعکس' اس تحریک و تنظیم کے دائم و قائم "لٹریچر" کا مقام صرف قرآن حکیم کو حاصل رہا اور اسی کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کو اس کی ریڑھ کی ہڈی اور اس کے امتیازی شعار اور نمایاں علامت کی حیثیت حاصل رہی...... اور اس کے داعی اور مؤسس کے قلم پر اکثر و بیشتر تو گرہ ہی لگی رہی' (چنانچہ اس کے باوجود کہ وہ گزشتہ بائیس سال سے ایک ماہنامے کا "مدیر مسئول" ہے' وہ صحافی حضرات کے مانند معیّن وقت پر یا حسبِ فرمائش کبھی ایک حرف بھی نہ لکھ سکا...... اور اس طویل عرصے کے دوران جو معدودے چند تحریریں اس کے قلم سے "صادر" ہوئیں ان میں بھی روایتی مضمون نگاری اور معروف انشاپردازی یا صحافیانہ انداز کے بجائے جذبات کی "آمد" اور وارداتِ قلبی کا رنگ نمایاں ہے) ...... البتہ حضرت موسیٰؑ کی دعا "وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ" ...... اور عروس القرآن' سورۃ الرحمٰن کی ابتدائی آیات "اَلرَّحْمٰنُ ○ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ○ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ○" کے مصداق اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے اُس کی زبان کو

---

[1] واضح رہے کہ "صحافت" ہرگز نہ کوئی برا مشغلہ ہے نہ گھٹیا پیشہ' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ جدید معاشرہ اور ریاست کی ایک ناگزیر ضرورت اور اہم خدمت ہے...... چنانچہ یہ سطور بھی ایک "صحیفے" کے تعارف ہی کے لئے سپردِ قلم کی جا رہی ہیں...... لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر کسی تحریک کا داعی اور مؤسس بنیادی طور پر "صحافی" ہو تو اس میں واقعیت کی بجائے جذباتیت' اور حقیقت پسندی کے بجائے رومانویت کے در آنے کا خطرہ نہایت شدید ہوتا ہے...... اور اس کے زیرِ قیادت لوگ زمین پر چلنے کے کم' اور ہوا میں اڑنے کے زیادہ عادی ہو جاتے ہیں...... اس موضوع پر شیخ محمد اکرام مرحوم نے اپنی تالیفِ لطیف "موجِ کوثر" میں جو پتے کی باتیں کہی ہیں وہ قارئینِ "میثاق" کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے اسی شمارے میں شائع کی جا رہی ہیں!

"بیانِ قرآن" کے لئے اس حد تک کھول دیا کہ اس کا "درسِ قرآن" ہی ایک پوری دعوت و تحریک کی اساس اور روحِ رواں بن گیا۔ "ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوا لْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○"

یہ 'بلاشبہ' اس دعوت و تحریک پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل و احسان ہے...... اور اسے خواہ ایک لاکھ میں ایک یا اس سے بھی کمتر درجہ میں یعنی ایک کروڑ میں ایک کے تناسب ہی سے سہی' بہرحال نسبت حاصل ہے "اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا" کے ساتھ اس لئے کہ بفحوائے الفاظ قرآنی "يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ" انقلابِ نبویؐ کا اساسی منہاج کل کا کل قرآن حکیم ہی کے گرد گھومتا ہے...... فللہ الحمد والمنّة

ہماری تحریک کی اسی امتیازی خصوصیت کا ایک مظہر یہ ہے کہ تنظیم اسلامی کے عام رفقاء ہی نہیں' اس کے نہایت فعّال کارکنوں' حتیٰ کہ ذمہ دار ترین حضرات کا مزاج بھی' بحمد اللہ' یہ بنا ہے کہ درسِ قرآن کی محفل میں تو وہ بلا تکان گھنٹوں بیٹھ سکتے ہیں...... اور خصوصاً راقم کے درس میں تو وہ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کر سکتے ہیں خواہ وہ درس اُن ہی آیات کا ہو جن پر وہ راقم ہی کے متعدد بیان پہلے بھی سن چکے ہوں' ...... لیکن سیاسی تبصروں اور تجزیوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی خواہ وہ خود راقم ہی کے قلم سے نکلے ہوں!

یہ چیز جہاں ایک جانب موجبِ اطمینان اور لائقِ امتنان ہے' وہاں دوسری جانب ایک انقلابی تحریک کے تقاضوں کے اعتبار سے تشویش انگیز بھی ہے' اس لئے کہ ایک انقلابی تحریک کے تو عام کارکنوں کے لئے بھی لازم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ملکی بلکہ عالمی اور بین الاقوامی سطح پر موجود الوقت حالات و واقعات اور ان کے پس پردہ کار فرما عوامل و محرکات سے پوری طرح واقف اور باخبر ہوں' رہے ذمہ داریوں کے حامل اور رہنمائی کے منصب پر فائز لوگ تو ان کے لئے تو لابدّ منہ ہے کہ ان کا ہاتھ حالات کی نبض پر ہو اور انہیں ذہنی و فکری اور عملی و سیاسی دونوں میدانوں میں کار فرما اور نبرد آزما قوتوں کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہو۔

بنابریں' کچھ عرصہ سے اس امر کا احساس نہایت شدت کے ساتھ ہو رہا تھا کہ ہماری دعوت اور تحریک کو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے جس مقام تک پہنچا دیا ہے' اُس کا تقاضا ہے کہ ایک ہفت روزہ جریدہ ہمارے اساسی خیالات و نظریات کی اشاعت اور مختلف ملی و

ملکی مسائل میں ہمارے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے موجود ہو' جوان مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک اور تنظیم سے منسلک لوگوں کو واقعاتِ عالم اور حوادثِ ملکی کے بارے میں صحیح اور مستند معلومات بھی بہم پہنچائے اور اُن کے ضمن میں بصیرتِ باطنی بھی پیدا کر سکے!

راقم کے نزدیک یہ بھی سرتاسر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم...... اور ہماری دعوت و تحریک کے ضمن میں اسؐ کی تائید و تیسیر کا مظہر ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کوئی مصنوعی کوشش کرتے اور لمبی چوڑی اجتماعی منصوبہ بندی کرتے جس میں لامحالہ زرِ کثیر کے صرف کے علاوہ تکلّف اور "آورد" کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا ہے' اور گوناگوں قسم کے تنظیمی و انتظامی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے اس کا ایک شدید داعیہ برادرِ عزیز اقتدار احمد کے دل میں پیدا فرما دیا' جسؐ کے نتیجے میں بالکل فطری طریق اور خالص "آمد" کے انداز میں ہفت روزہ "ندا" منصّۂ شہود پر آگیا...... جس کے ان سطور کی تحریر کے وقت تک' بحمداللہ' دس شمارے نہایت آب و تاب اور حد درجہ پابندئ وقت کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں!

عزیزم اقتدار احمد نے تو نہ اپنے ارادے کا اظہار براہِ راست میرے سامنے کیا' نہ ہی اس کے سلسلے میں مجھ سے کوئی مشورہ لیا...... غالباً اُن کے نزدیک معاملہ ع "در کارِ خیر حاجتِ ہیچ استخارہ نیست!" والا تھا۔ بہرحال میرے کانوں تک جب اس کا ذکر بالواسطہ طور پر پہنچا' تو ذہن نے غیر ارادی طور پر نام کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اولاً ذہن "اذان" کی جانب منتقل ہوا' لیکن معلوم ہوا کہ اس نام سے ڈیکلریشن پہلے سے جاری شدہ ہے' دوسرے نمبر پر "ندا" کا نام ذہن میں آیا۔ اور اس کے ساتھ ہی علامہ اقبال مرحوم کا یہ قطعہ نگاہوں کے سامنے آگیا کہ۔

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

چنانچہ "وَاِنِّی سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ" کے مصداق اس جریدے کا نام بھی راقم الحروف کا رکھا ہوا

ہے اور اس کی لوح پر درج قطعہ بھی راقم ہی کا تجویز کردہ ہے...... اور اس جریدۂ نوزائیدہ کے ضمن میں ان سطور کی تحریر سے پہلے تک راقم کا واحد تعاون یا حصہ (CONTRIBUTION) یا تو یہ ہے' یا یہ کہ ڈیکلریشن کے حصول میں دفتری سرخ فیتے کے قطع کرنے میں راقم نے بھی اپنے بعض احباب سے تعاون حاصل کیا۔ فجزاھم اللّٰہ عنّا خیر الجزاء!

سطور مندرجہ بالا وسطِ رمضان مبارک میں سپردِ قلم ہوئی تھیں۔ ان کے بعد اس تحریر کا دوسرا حصہ قلم سے صادر ہونا شروع ہوا جس کے افتتاحی الفاظ حسب ذیل ہیں۔

"...... ندا' کے ساتھ ساتھ کچھ تعارف "صاحبِ ندا' کا بھی مناسب ہے..... کچھ اس سبب سے کہ اس کے بغیر خود "ندا' کا تعارف بھی نامکمل ہے'...... اور کچھ اس بنا پر کہ برادرِ عزیز اقتدار احمد نے "ندا' کے دسویں شمارے میں جو چند جملے راقم کے بارے میں تحریر کئے ہیں' ان سے پرانی یادوں کے بہت سے دریچے وا ہو گئے' اور اپنی خاندانی زندگی کے بہت سے بھولے بسرے واقعات کی فلم پردۂ ذہن پر چلنے لگی...... اور یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ یہ حقائق و واقعات تنظیمِ اسلامی کے رفقاء و احباب کے علم میں آنے ضروری ہیں..... اس لئے کہ "بیعت' کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں داعی کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا "مبایِعین' کے علم میں ہونا مناسب اور مفید ہی نہیں نہایت ضروری ہے!"

لیکن جب اس موضوع پر قلم نے چلنا شروع کیا تو اگرچہ رمضانِ مبارک کی خصوصی کیفیات اور خصوصاً دورۂ ترجمہ قرآن کی مصروفیات کے باعث رفتار بہت کم رہی تاہم بات طویل ہوتی چلی گئی...... اور ادھر عشرۂ آخر کی گہماگہمی نے قلم ہاتھ سے رکھوا دیا۔ چنانچہ یہی طے پایا کہ اس حصے کی اشاعت کو مؤخر کر دیا جائے۔

سردست پیش نظر اشاعت میں "ندا' کے بارہ شماروں سے جو "انتخاب" شائع کیا جا رہا ہے' اس کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

(۱) "مقاصد و عزائم" کے عنوان کے تحت صاحبِ "ندا' کی دو تحریریں شائع کی جا رہی ہیں..... ایک تو ان کا وہ خطبۂ استقبالیہ جو انہوں نے صحافیوں کی ایک تنظیم کے نومنتخب

شدہ صدر کے اعزاز میں اپنی جانب سے دی جانے والی دعوتِ افطار میں پڑھا تھا اور جس میں انہوں نے اپنا مختصر تعارف خود اپنے قلم سے کرایا ہے...... اور دوسرے "ندا کی صدا" جس میں "ندا" کی مستقل پالیسی علامہ اقبال مرحوم کے ان دو اشعار کے حوالے سے بیان کی گئی ہے' جو راقم الحروف نے "ندا" کی پیشانی کے لئے تجویز کئے ہیں۔

(۲) پھر "ملک و ملت" کے عنوان کے تحت اولاً دو اداریئے شاملِ اشاعت ہیں' جو صاحبِ "ندا" کے اپنے قلم سے ہیں یعنی ایک "ملت کا اصل المیہ" اور دوسرے "خبردار' دشمن تاک میں ہے!" ...... اور پھر دو سیاسی و اقتصادی تجزیئے "ندا" کے قلمی معاونین کے تحریر کردہ ہیں' جن میں سے ایک جو کراچی کی خوفناک صورت حال کے بارے میں ہے واقعۃً تجزیاتی شاہکار کا درجہ رکھتا ہے...... اور اس میں ہرگز کسی تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ تجزیہ نگار جناب عبدالکریم عابد ہیں' جو نہایت پختہ کار اور منجھے ہوئے صحافی ہونے کے علاوہ تحریکِ اسلامی کے قافلے کے پرانے شریکِ سفر ہیں۔ اور ان کی "ندا" کے ساتھ مستقل قلمی معاونت "ندا" کے مستقبل کے لئے یقیناً بہت امید افزا ہے۔

(۳) اس کے بعد "تحریک و تنظیم" کے عنوان کے تحت...... اولاً تنظیمِ اسلامی کے ایک دیرینہ رفیق اور تحریکِ اسلامی کے پرانے کارکن قاضی عبدالقادر کی تحریر کردہ تنظیم کے تیرھویں سالانہ اجتماع کی نہایت دلچسپ رُوداد ہے جس کے لئے عنوان علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر سے مستعار لیا گیا ہے کہ ؎

کونسی وادی میں ہے' کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں؟

ثانیاً...... راقم الحروف کا ایک مفصل انٹرویو ہے جو جناب عبدالکریم عابد اور برادرم محبوب سبحانی نے لیا تھا جو اسلامی جمعیت طلبہ کے دور میں میرے نہایت قریبی اور معتمد ترین ساتھی رہے تھے'...... یہ دونوں تحریریں تو ظاہر ہے کہ ویسے بھی براہِ راست "میثاق' کے دائرۂ موضوعات' میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ریکارڈ کو درست رکھنے کی غرض سے "قاضی حسین احمد کو شاید یاد نہیں!" کے عنوان سے محترم شیخ جمیل الرحمٰن کی تحریر شامل کی جارہی ہے جس میں محترم قاضی صاحب کی اس رائے کی تردید کی گئی ہے کہ مولانا مودودی مرحوم اپنی عمر کے آخری دور میں پاکستان میں اقامتِ دین کے مقصد کے حصول کے لئے انتخابی طریق کار سے بددل یا مایوس نہیں ہوئے تھے!

(۴) "محبت و خدمتِ قرآن" کے عنوان سے اولاً مصر کے ایک اہم فوجی رہنما جنرل فتحی رزق کا تبصرہ شاملِ اشاعت ہے جو انہوں نے راقم کی تالیف "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے عربی اور انگریزی دونوں تراجم کے مطالعے کے بعد مدیر "ندا" سے ایک نجی ملاقات میں کیا تھا۔ راقم جنرل صاحب کے اس تبصرے سے خاص طور پر اس لئے متأثر ہوا کہ انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر بالکل وہ بات ارشاد فرمائی ہے جو اس طویل حدیث کے آخر میں وارد ہوئی ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی عظمت نہایت وضاحت اور جامعیت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔

اس لئے کہ اس حدیث شریف کے آخری الفاظ بھی یہی ہیں کہ "مَنْ دَعٰی اِلَیْهِ فَقَدْ هُدِیَ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" ...... اللہ سے دعا ہے کہ وہ راقم الحروف اور اس کے ان جملہ رفقائے کار کو اس مژدۂ جانفزا کا واقعی مصداق بنا دے جنہوں نے تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی کو اپنی بہترین صلاحیتوں اور قوتوں کا مصرف قرار دے لیا ہے! "آمین" ...... اس کے علاوہ اس حصے میں "روزوں کے دن اور تراویح کی راتیں" کے عنوان سے مدیر "ندا" کی وہ تحریر شامل ہے جس میں انہوں نے قرآن اکیڈمی میں دورۂ ترجمۂ قرآن کے کیف آور اور روح پرور تأثرات بیان کئے ہیں ...... اور آخر میں "عاشقِ قرآن" کے اس خطاب پر مدیر "ندا" کے تأثرات شاملِ اشاعت ہیں جو ملک کے معروف صحافی جناب مجیب الرحمٰن شامی نے راقم کو اسی دورۂ ترجمۂ قرآن کے تأثر کے تحت عنایت فرمایا جس میں وہ حیرت انگیز پابندی کے ساتھ شریک رہے تھے ...... مدیر "ندا" کے انہی تأثرات کے ذیل میں راقم کے بارے میں وہ چند جملے آگئے ہیں جو اس مفصّل تحریر کا اصل سبب بنے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے اور جو ان شاء اللہ "میثاق" کی آئندہ اشاعت میں ہدیۂ قارئین کر دی جائے گی۔

(۵) آخر میں "تلخ و شیریں" کے عنوان سے "جناب خواہ مخواہ در آمدی" کی دو تحریریں شامل کی جا رہی ہیں جو انہوں نے "جناب جاوید احمد الغامدی" اور ان جیسے چند لکھنے والوں کی ان تحریروں کے "جوابِ آں غزل" کے طور پر سپردِ قلم کی ہیں جن کے ذریعے یہ حضرات راقم الحروف کی کردار کشی بلکہ بزعمِ خویش "بیخ کنی" کی کوشش فرما رہے ہیں ....

واقعہ یہ ہے کہ ہمیں یہ سلسلہ ہرگز پسند نہیں ہے لیکن سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ثابت ہے کہ جب معاملہ اصولی اختلاف اور علمی تنقید سے بڑھ کر ذاتی ہجو کی صورت اختیار کر لے تو دعوت و تحریک کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے جواب میں "قُلْ وَ

رُوحُ الْقُدُسِ مَعَکَ" کی روش اختیار کی جائے!

اس اشاعت کے ذریعے چونکہ "ندا' کا ایک جامع (COMPREHENSIVE) تعارف کرانا مقصود تھا لہٰذا "تلخ و شیریں" کے یہ دو نمونے بھی پیش کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ ان شاء اللہ "میثاق" کے صفحات اس قال و اقول سے مبرّا رہیں گے اس لئے بھی کہ یہ موضوع "میثاق" کی سطح سے فروتر ہے.......... اور اس لئے بھی کہ "غامدی صاحب" کے جواب کے لئے "در آمدی صاحب" کا قلم اور "ندا" کے صفحات کافی ہیں!

ان سطور کی تحریر کے وقت تک الحمدللہ کہ "ندا" کے تیرہ شمارے پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ اور اس تین ماہ کے عرصہ میں ہر شخص جانتا ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ ملک کے صحافتی حلقوں سے اپنا لوہا منوا لیا ہے بلکہ اس کا شہرہ بیرونِ ملک بھی ہو گیا ہے جس کا تازہ ترین مظہر یہ ہے کہ لندن میں' مستقبل قریب میں منعقد ہونے والی' ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ مدیر "ندا" کو بھی پہنچا ہے۔ گویا اب وہ اپنا تعارف آپ ہی ہے'..... اور فی الوقت یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اس کے تعارف کے لئے "میثاق" کی ایک خصوصی اشاعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے لیکن چونکہ اس کا فیصلہ راقم نے ڈیڑھ ماہ قبل کر لیا تھا اور اس کی تیاری بھی مکمل ہو چکی ہے لہٰذا اسے شائع کیا جا رہا ہے..... تاکہ ایک بار راقم الحروف اور تنظیمِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والے پورے حلقے میں اس کا مکمل تعارف ہو جائے ..... اس کے بعد معاملہ بالکلّیہ "ندا" اور اس کے قارئین کے مابین ہو گا!

یہ باتیں اصلاً تو اس طویل تحریر میں پورے پسِ منظر کے ساتھ آئیں گی۔ اس وقت بر سبیلِ تذکرہ عرض ہے کہ برادرِ عزیز اقتدار احمد سلمہ' بحمداللہ معاشی طور پر "ندا" یا "محمد حمید احمد پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ" کے ذریعے کسی مالی منفعت کے حصول سے کلیۃً مستغنی ہیں۔ اور بمصداق "کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے!" کے مصداق ان کے لئے بھی صحافت ذریعۂ معاش ہرگز نہیں ہے........... ویسے بھی انہوں نے راقم کی تجویز پر اسے ایک وقف کی شکل دے دینے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔

ثانیاً..... ان کی صحت ہرگز قابلِ رشک نہیں ہے' انہوں نے زندگی میں مختلف اعتبارات سے شدید مشقتیں جھیلی ہیں اور اب جب کہ وہ عمر کے چھٹے دہے میں قدم رکھ چکے

ہیں 'انہوں نے ایک ہفت روزہ کے اجراء کے ذریعے شدید محنت و مشقت کا ایک نیا باب کھول لیا ہے ' پچھلے دنوں ان کی صحت اچانک بہت خراب ہو گئی تھی۔ تحقیق و تفتیش کے نتیجے میں جو مرض سامنے آیا ہے وہ بھی ایک تشویش کا پہلو لئے ہوئے ہے اگرچہ ابھی مزید تفتیش و تشخیص کا سلسلہ جاری ہے .... تاہم راقم رفقائے تنظیم اسلامی سمیت اپنے تمام بزرگوں اور خیر خواہوں 'اور جملہ رفقاء و احباب سے مستدعی ہے کہ وہ آں عزیز کی صحت کے لئے دعاء فرمائیں۔ اس لئے کہ دعاء کی تاثیر کے ضمن میں تو یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ "لَا يُرَدُّ الْقَضَاءُ اِلَّا بِالدُّعَاءِ" ....

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

خاکسار
اسرار احمد عفی عنہ
۲۸ مئی ۸۸ء

برِعظیم پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے چند

صحافی داعی

اور ان کی قیادت و سیادت کا ایک مشترک وصف

از: شیخ محمد اکرام مرحوم

(ماخوذ از 'موجِ کوثر' صفحہ ۲۸۹ تا ۲۹۱)

قومی روایات کے تسلسل ٹوٹنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کا اثر بہت بڑھ گیا۔ علی گڑھ تحریک کے بڑے سرگروہ سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک اربابِ عمل تھے۔ وہ اسلامی تاریخ کے قدیم سرگروہوں کی طرح صاحب السیف نہ تھے، لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ انتظامی معاملات میں گزرا تھا۔ انہیں آدمیوں اور واقعات کا گہرا ذاتی تجربہ تھا، جس سے ان کے نقطۂ نظر میں واقعیت پسندی غالب تھی اور ٹھوس، تعمیری کام کرنے کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا۔ نئے دور کے سب سے مقبول راہنما تین نوعمر اخبار نویس تھے ــــ مولانا محمد علی جوہر ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد، مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر الہلال اور مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار۔ تینوں اسلامی ہندوستان کے سب سے بڑے جرنلسٹ تھے۔ ان کا عملی تجربہ تھوڑا تھا اور واقعات سے انہیں اتنا اُنس نہیں تھا، جتنا الفاظ سے یا خیالات سے۔ لیکن ان کے ہاتھ میں ایک بے پناہ طاقت تھی ــــ قلم ــــ اور چونکہ اب قومی تاریخ کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا، وہ اپنے زورِ قلم سے جس طرف چاہتے، قومی خیالات کا رخ بدل دیتے۔

اصحاب قلم کے ہاتھ میں قومی خیالات کی باگ چلے جانے کے کئی دلچسپ نتائج

برآمد ہوئے، لیکن شایان ہیں سب سے اہم یہ تھا کہ قوم پہ ایک خیالی رنگ چھا گیا۔ اکبر نے سرسید کی وفات پہ کہا تھا ؎

نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا ہے

کہنے والے اور کرنے والے میں کئی باتیں مختلف ہوتی ہیں۔ بعض تو بالکل ظاہر ہیں، لیکن ایک عمیق فرق یہ ہے کہ کہنے والے کو کام کی مشکلات اور راہ کی دشواریوں کا وہ احساس نہیں ہوتا جو کرنے والے کو ہوتا ہے اور جب وہ "کرسی ادارت" پر بیٹھ کر قوم کے لئے لائحہ عمل تجویز کرتا ہے تو عام طور پر اس کا طائرِ خیال ان بلندیوں پر پرواز کرتا ہے، جہاں انسانی عمل کی رسائی نہیں بلکہ جن کا وجود بالعموم فقط اس کے نہاں خانۂ دماغ میں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں جب راہنمائی کے فرائض اربابِ قلم کے ہاتھ میں آئے تو یہی ہوا۔ قومی زندگی کا راستہ معیّن کرتے وقت یہ باتیں نظرانداز ہو گئیں کہ قوم کی خاص ضروریات اور راہ کی خاص مشکلات کیا ہیں؛ ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں جو اچھی یا بُری صلاحیتیں، خوبیاں یا کمزوریاں دکھائی تھیں وہ کیا تھیں؛ قوم میں کس چیز کی کمی اور کس چیز کی افراط ہے؟ یہ اہم باتیں نظر سے اوجھل ہو گئیں اور قومی ترقی کی راہ معیّن کرتے وقت فقط خیالی اور نظری اصولوں کا دھیان رہا اور ان میں جو کوئی جس قدر زیادہ مشکل الحصول اور ناقابلِ عمل ہوتا اسی قدر اس پر زیادہ زور دیا جاتا۔ ؎

ہرچہ از سرمایہ کاست، در ہوس افزودہ ایم

نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اصول شاذ و نادر ہی صفحۂ قرطاس سے عمل و حقیقت کی دنیا میں منتقل ہوتے اور قول و فعل اور خیال و عمل کے درمیان ایک عظیم خلیج حائل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوئی کہ خواب تو ہندوستان میں "حکومتِ الٰہیہ" قائم کرنے کے دیکھے جاتے اور عملی استعداد کا یہ عالم ہوتا کہ کاغذ کی کمیابی کے زمانے میں پچاس صفحے کا ایک رسالہ "ترجمان القرآن" جاری نہ رہ سکتا۔

(بشکریہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)

Monthly
DINI MADARIS
New Delhi-110002

ماہنامہ دینی مدارس نئی دہلی

گزشتہ دنوں شیرِ میوات جناب علی محمد صاحب پاکستان تشریف لائے تو ان کی وساطت سے ماہنامہ دینی مدارس نئی دہلی کا فروری ۸۸ء کا شمارہ دیکھنے میں آیا —— اس کے سرورق پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تالیف "تفہیماتِ الٰہیہ" کا ایک اقتباس دیکھ کر دل نے بہت خوشی محسوس کی۔ تو ارادہ ہوا کہ اس مسرت میں قارئینِ "میثاق" کو بھی شریک کیا جائے، چنانچہ اس کا عکس ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے —— اس خوشی کے ساتھ اس جریدے کے ذریعے یہ دو انتہائی افسوسناک اور رنج دہ اطلاعات بھی ملیں کہ دارالعلوم دیوبند کے بعد اب جمعیتِ علماء ہند بھی شکست و ریخت کا شکار ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہ تبلیغی جماعت ایسی غیر سیاسی تنظیم بھی مستقبل کی امارت و امامت کے باب میں گروہ بندی اور تفرقہ بازی کی زد میں ہے۔ فواحسرتاً دیا اسفاً جمعیت علماء ہند کی موجودہ قیادت کے بارے میں مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے خلف الرشید مولانا انظر شاہ صاحب کی ایک عبارت کا عکس بھی افسوس کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے —— رہا قضیۂ امارت تبلیغی جماعت تو اس سے غضِ بصر اور صرفِ نظر ہی مناسب ہے۔

خاکسار اسرار احمد

حضرتِ امام شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے
ایک الہامی کشف میں فرمایا
"ایک وقت آئے گا کہ ہندوستان کی اکثریت کے شرفاء
اسلام قبول کریں گے اور تاتاریوں کی طرح اس قوم کے
ہاتھ میں بھی توحیدِ اسلامی کا پرچم ہوگا" تفہیمات الٰہیہ ص۲۰۳

جمعیۃ علماء جسم بیمار نہیں بلکہ ایک لاش ہے جنھیں چند مرید و معتقد اس طرح اٹھائے پھر رہے ہیں جیسا کہ قابیل ہابیل کی لاش کو مدفن کی تلاش میں حیران و پریشان لئے پھرتا تھا۔

مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد نہ صرف جمعیۃ علماء ہند ختم ہو گئی بلکہ ملت مخلصانہ قیادت سے محروم ہے، "مشاورت" ایک شمع فروزاں کی طرح سامنے آئی لیکن تیز و تند جھونکوں نے اسے خاموش کر دیا اب اس کی حقیقت جسم بے جاں سے زیادہ نہیں مسلم مجلس کا دائرہ اولاً محدود ہی تھا لیکن ڈاکٹر فریدی مرحوم کے ساتھ اس کا قصہ بھی نمٹ گیا، مسلم پرسنل لاء نے اپنا دائرۂ کار محدود رکھا ہے، رہی جمعیۃ العلماء تو وہ جسم بیمار نہیں بلکہ ایک لاش ہے جنھیں چند مرید و معتقد اس طرح اٹھائے پھر رہے ہیں جیسا کہ قابیل ہابیل کی لاش کو مدفن کی تلاش میں حیران و پریشان لئے پھرتا تھا، بابری مسجد کے قضیہ سے متعلق اولاً تو کوئی سلجھی ہوئی قیادت سامنے نہیں آئی جو کچھ نام نہاد قیادت کی تشکیل ہوئی وہ بھی وقتی و عارضی ہے اور یہ اظہار حقیقت اگرچہ گراں گزرے تاہم بلا خوف لومۃ لائم عرض ہے کہ اس خاص قیادت نے کسی سوجھ بوجھ کا ثبوت نہیں دیا۔ بعضوں نے اپنے قائدانہ کردار کی تعمیر تو بعض نے اپنی دکان قیادت کی رونق کے لئے ملت کو کھلونا بنا رکھا ہے۔ جب فضا سکون پذیر ہوتی ہے یہ کوئی شوشہ چھوڑ کر از سر نو سطح کو تلاطم پذیر کر دیتے ہیں اور مسئلہ کو نہ عقل سے حل کرنا چاہتے ہیں نہ گرہ کشائی کے لئے مطلوب اخلاص ان کے دامنوں میں ہے۔ ایسے پراگندہ و مایوس کن ماحول میں نئی ملی قیادت کی ضرورت اہم فرض بن کر سامنے آگئی یہ تازہ قیادت مخلصین کا اجتماع ہو نہ کہ سیاسی طالع آزماؤں کا یہ قیادت کو سیاسی عروج کا زینہ نہ بنائیں بلکہ ملی خدمات کا تاج محل تیار کریں مومنانہ فراست ان کے جلو میں ہو تدبر و تدبر ان کے جیب و دامن میں، یہ لگاتار محنت کے قطب مینار ہوں، ایثار و قربانی ان کا امتیاز ہو نہ حکومت متسلطہ کے خیمہ بردار ہوں اور نہ سو نصیبی اس کے مخالف بلکہ ملک و ملت کی بہتری ان کا ایمان ہو۔ اس طرح کی قیادت جب وجود پذیر ہو گی حقیر کی تمام تر توانائیاں اس کے لئے وقف ہوں گی۔ ان شاء اللہ اس وقت ذرہ ذرہ نعرہ زن -
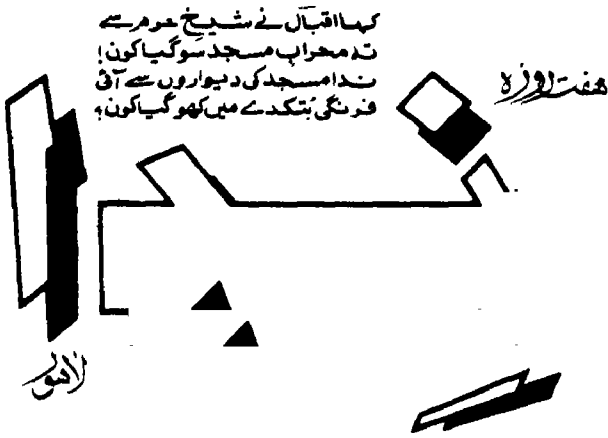
حضرت مولانا انظر شاہ زاد مجدہ بیت الحکمت دیوبند

انتخاب

کہا اقبال نے شیخِ حرم سے
تہ محراب مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟
ہفت روزہ
لاہور

شمارہ: ۱ تا ۱۲

استقبالیہ

سی پی این ای کے صدر اور مدیرانِ جرائد کی خدمت میں

اقتدار احمد

جناب صدر، معزز مدیران جرائد، صحافیان عظام اور
اضرین کرام۔

السلام علیکم!

میں کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کے
مدیداروں اور آپ سب کا ممنون ہوں، جنہوں نے ایک
یسے شخص کو شرف میزبانی بخشا، جو دور بیٹھے چوتھائی صدی اس
روان صحافت کی گرد کو ہی دیکھتا رہا اور جمعہ جمعہ آٹھ دن
تے ہیں کہ انگلی کٹا کے شہیدوں میں شامل ہوا ہے۔
زات! مجھے پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس کی چیرہ دستی کا
ی تجربہ تو نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ اپنے پرچے کا
یکلریشن لینے کے لئے مجھے منزل ہفت خواں طے کرنی
ی، تاہم اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ قانون قلم پر تلوار کی طرح لٹکا
ہے اور آزادی صحافت کی نیلم پری اس سے سہمی سہمی رہتی
۔ مدیران جرائد کی کونسل نے اس کالے قانون کی منسوخی
لئے اب تک جو پاپڑ بیلے ہیں، اس پر میں انہیں خراج
ین پیش کرتا ہوں، ان کا جہاد ابھی جاری ہے اور امید کی جا
ی ہے کہ بالآخر ان کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوں
۔

جناب صدر! ایک محاذ پر تو آپ داد شجاعت دے ہی رہے
ں۔ ایک اور محاذ آپ کی توجہ کا طالب ہے۔ چھوٹا منہ بڑی
ت ہے لیکن اگر اسے سن کر پلّے باندھ لیا جائے تو ملک و قوم
ے حق میں ایک نیک فال ہوگی۔ غلط یا صحیح، میرا مشاہدہ یہ ہے
ہمارے مدیران جرائد جو ملک و ملت کی رہنمائی کے منصب
لہ پر فائز ہیں اور اپنے اپنے ذریعۂ ابلاغ کے ذریعے نظریاتی
بنیادوں پر اس قوم رسولِ ہاشمیؐ کے کردار کی تعمیر کا رفیع الشان
کام انجام دے سکتے ہیں، الا ماشاء اللہ عوامی
خواہشات کے پیچھے چل نکلے ہیں۔ وہ طلب و رسد کے ایک
دائرۂ خبیثہ (VICIOUS CIRCLE) میں محصور ہو گئے
ہیں۔ گھٹیا مواد کی طلب کے جواب میں رسد کا جو انتظام وہ
کرتے ہیں، اس سے طلب میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ ہی
جانے یہ سلسلہ کہاں تک دراز ہوتا چلا جائے۔ پھر یہ بھی دیکھنے
میں آ رہا ہے کہ اخبار اور رسالہ بیچنے کی دوڑ میں ہمارے معزز
مدیران جرائد دینی، اخلاقی اور مشرقی قدروں کو پیروں تلے
روندے دے رہے ہیں۔ وہ ان روایات کو بھی طاق نسیاں کی
زینت بنانے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں جو ربع صدی قبل تک
ہمارے صحافیوں کو جان سے زیادہ عزیز تھیں۔ اپنے سیاسی
رجحانات اور انداز فکر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی ہمارے یہ بزرگ
اپنے قارئین کو وہ مواد دیتے تھے جو ان کی تعلیم و تربیت اور
باخبری کے لئے ضروری سمجھتے اور اس بات کے لئے فکر مند نہ
تھے کہ قاری کیا چاہتا ہے۔ جناب صدر اور معزز مدیران
جرائد میری گستاخی معاف فرمائیں تو عرض کروں گا کہ رفتہ
رفتہ چھپے ہوئے لفظوں کا تقدس ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اخبارات کا
اعتبار اٹھ رہا ہے، CREDABILITY کو بہت ضعف پہنچ چکا
ہے۔ ازراہ کرم ادھر بھی توجہ مبذول کیجئے۔ اس صورت
حال کو ختم کرنا اور اخبارات و جرائد کے کردار اور مقام کی بحالی
بھی آپ کے مشن کا حصہ ہے۔

آپ اس دائرۂ خبیثہ کو توڑنے کے لئے اپنے معزز اراکین
میں سے کسی ایک کو بھی اس بات پر آمادہ کرلیں کہ ملک و ملت

ں بہتری کے لئے وہ ایثار اور قربانی کا راستہ اپنا لے تو نہ صرف
یک اچھی روایت قائم ہو گی بلکہ مسابقت کی دوڑ میں بھی وہ تیزی
اقی نہ رہے گی جو قوم کے اخلاق و کردار کو تھکا کر مار رہی ہے۔
للہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں ہی نعم البدل کی توقع اور آخرت
یں اجر کی امید اس پر مستزاد۔

اب کچھ اپنے اور اپنے ہفت روزے "ندا" کے بارے
یں بھی عرض کر دوں کہ ۔۔ پھر التفات دل دوستاں رہے
رہے۔ بطور صحافی میرا قد آپ میں سے ہر مہمان سے پست
ہے' میں نے ۷۰ - ۱۹۵۹ء میں چند ماہ قلم قبیلے کی باقیات
الحات میں سے ایک مرحوم و مغفور صحافی' ملک نصر اللہ خاں
زیز کے سایۂ عاطفت میں صحافت کے ابتدائی سبق لئے تھے
لن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا۔ ان دنوں میں یونیورسٹی
ء کالج کا طالب علم بھی تھا۔ ملک صاحب فرمایا کرتے تھے کہ
اں! تم کہاں قانون کے چکر میں پڑو گے' یہاں ڈیرہ لگاؤ'
یں پکا صحافی بنا دوں گا۔ انہوں نے اپنا ہفت روزہ ایشیا میرے
رو کیا' جسے کوثر نیازی صاحب انہی دنوں داغ مفارقت دے
ئے تھے۔ اس زمانے میں صحافت میں بھوک بہت تھی' چھوٹی
ری تنخواہیں بھی قسطوں میں ملتیں۔ مجھے ایک کاروبار میں
لت کا موقع مل گیا اور میں نے قلم چھوڑ کر بیلچہ ہاتھ میں لے
وہ بھی علامہ مشرقی مرحوم و مغفور والا نہیں' خر کاروں
اس کے بعد ستائیس سال کا طویل عرصہ میں نے لکھا
ر' لیکن بزبان انگریزی اور وہ بھی
COMMERCIAL CORRESPONDAI یا
TECHNICAL SPECIFICATION کی شکل

۔ ڈیڑھ سال پہلے ایک عظیم ذاتی المیے نے میرے
ہو ذہن کی چولیں ہلا دیں۔ کاروبار سے جی اچاٹ ہو گیا اور
، میں نے اپنے باقی بیٹوں کے حوالے کر کے اپنے بڑے
، محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے مشن میں عملاً ان کا ساتھی بننے کا
۔ کیا جسے رسمی طور پر میں کئی سال پہلے ہی قبول کر چکا تھا ...
، جا کر پتا چلا کہ اس راہ کی سختیاں' جو عام کارکنوں کو
درپیش ہیں' بڑھاپے میں اور کمزور صحت کے ساتھ میر
لئے جھیلنا آسان نہیں۔ محسوس ہوا کہ ایک مورچے میں ابھی
جگہ خالی ہے' اگر قلم ہی دوبارہ سنبھال لوں تو شاید اپنی عاقبت
سنوارنے کا کچھ سامان کر سکوں گا۔ تو حضرات گرامی!

یہ ہے وہ مختصر افسانہ جسے آپ چاہیں اور "چچا چھکن نے رسالہ
نکالا" کا عنوان بھی دے لیں تو مجھے اعتراض نہ ہو گا۔ تاہم
میں اس راستے کی صعوبتوں سے بے خبر نہ تھا۔ ہمارے ہاں ان
دنوں روزناموں کے جو تیور ہیں' ان کی موجودگی میں ماہناموں
کو بھی دشواری کا احساس ہوتا ہے' ہفت روزوں کا ذکر ہی
کیا - - اور پھر اپنے ہفت روزے میں جس مال کا خوانچہ میں
نے لگایا' اس کے گاہک اب ملتے کہاں ہیں؟ - - بایں ہمہ'
صاحب صدر! آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ ملکی صحافت میں
سیاسی ہفت روزوں کا ایک کردار ہے' جو انہیں تندئ باد
مخالف میں بھی .. نبھانے کی فکر کرنی چاہئے۔

اس روایت کو دم توڑنے نہیں دینا چاہئے۔ اس سلسلے میں ایک
اور لطیف نکتہ واقفان حال کے لئے پیش کر رہا ہوں۔ میرے
بھائی' ڈاکٹر اسرار احمد اپنے فکر اور انقلابی طریقہ کار کا رشتہ مولانا
ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور سے
جوڑتے ہیں اگرچہ اول الذکر مرحوم و مغفور وہ' جو کچھ کہ وہ
۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک تھے اور ثانی الذکر وہ' جو کچھ کہ وہ
۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تھے۔ اور میرے قلم کا' دور دراز
کا سہی' کوئی تعلق ہے تو ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم و مغفور
سے' جو "حزب اللہ" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر
بیعت کر چکے تھے۔ اللہ کی شان ہے کہ آج کان بیعت
ارشاد و سلوک کے سوا کسی بیعت سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔
تشکیل جماعت کے لئے' رسم دنیا سے منہ موڑ کر' بیعت کا
مسنون طریقہ اپنانا طنز و استہزاء کا موضوع بنتا ہے ع
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں ..... یوں ہم دونوں
بھائیوں کی کاوشوں کے ڈانڈے' نسبت و تناسب کے بغیر'
الہلال اور البلاغ والے مولانا آزاد پر آکر مل جاتے ہیں۔

بعد کے کانگرسی رہنما اور بھارت کے مرکزی وزیر تعلیم سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ...... آپ کے سامنے تاریخ کا ایک اور ورق پلٹتا جاؤں، جس پر وقت نے دھول ڈال دی ہے۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز جماعت اسلامی میں شرکت کے بعد مولانا آزاد کے پاس دعوت شمولیت لے کر پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ اول تو مودودی صاحب کی استعداد سے میں واقف نہیں اور ثانیاً میں ان کی جماعت میں شامل ہوا تو پالیسی میں دوں گا وہ الٹے پیروں واپس آگئے یہ بزرگوں کی باتیں تھیں، ہم خوردوں کی سمجھ میں شاید نہ آئیں بس ریکارڈ درست کر لیا جائے۔

آخر میں میں آپ حضرات کو گواہ بنا کر اپنے اللہ سے عہد کرتا ہوں کہ میرے پرچے "ندا" نے جو انداز اپنایا ہے اسے برقرار رکھوں گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے توفیق عطا کرے کہ کوئی ترغیب و تحریص یا تخفیر و استہزاء میرے پائے استقلال میں لرزش نہ آنے دے اور میں کسی ادنیٰ درجے میں سہی، ان روایات کا چراغ پھر سے روشن کر سکوں جو ہمارے بزرگ صحافیوں نے قائم کیں کہ بقول اقبال علیہ الرحمۃ ؎

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کے لئے

اگرچہ اس کام میں مجھے جو تعاون ملا، بسرو چشم قبول کروں گا، لیکن میں اپنے قلم کو مالی منفعت کے لئے استعمال نہ کروں گا۔

جناب صدر! آپ کی اجازت سے، میں ذکر کرنا چاہوں گا کہ میرا مرحوم بیٹا، محمد حمید احمد، جو ڈبل MATH کے ساتھ بی ایس سی کرنے کے بعد، نہ صرف میرے کاروبار کا ایک ستون بنا بلکہ قرآن اکیڈمی میں شعبہ دینی علوم میں دو سال لگا کر، اپنی موت کے وقت تیسرے سال کی ENGINEERING CLASS کا طالب علم بھی تھا اور ساڑھے چوبیس سال کی عمر میں، سڑک کے حادثے میں لقمۂ اجل بننے سے پہلے اپنی آخری کلاس ATTEND کر کے گیا تھا۔ اسی کے نام پر میں نے وہ پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی بنائی ہے، جو ہفت روزہ "ندا" کے نفع، نقصان کی ذمہ دار ہے اور ضروری قانونی کارروائی کے بعد، میں اسے ایک ٹرسٹ کی شکل دے دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

میں ایک بار پھر آپ سب کا تشریف لانے اور میری باتیں سننے پر، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

(ماخوذ از شمارہ ۹)

عن عثمانؓ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ

"ندا" کی صدا

کہا اقبالؔ نے شیخِ حرم سے
تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون!
ندا مسجد کی دیواروں سے آئی
فرنگی بتکدے میں کھو گیا کون؟

"ندا" کے سرورق پر شاعرِ مشرق اور مصورِ پاکستان کا یہ قطعہ درج تو ہے لیکن اتنا باریک اور غیر نمایاں کہ ہمیں خود محسوس ہوا کہ ملت کے حدی خواں کی یہ آواز، جس میں رمز بھی ہے طنز بھی، کانوں تک پہنچنے سے رہ نہ گئی ہو، "ندا" جس کی صدائے بازگشت ہے۔ ہم نے پچھلے دو شماروں میں اپنے قارئین کو یہ موقع تو فراہم کیا ہے کہ وہ خط کا مضمون بھانپ لیں، لفافہ دیکھ کر! لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاف بات کی جائے...... اشاروں کنایوں کی چلمن کی اوٹ کیوں۔

امت مسلمہ آج وطن اور نسل کے فرق و امتیاز کے بغیر، پوری دنیا میں ایک ہی مرض کی ہلاکت خیزی کا شکار ہے۔ اور وہ مرض ہے خود فراموشی۔ خود فراموشی کی علامات سونے سے پیدا ہوں یا کھونے سے، علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے جسے خود اقبالؔ نے خودی کا نام دیا۔ فلسفۂ خودی کو یاروں نے مطلب و معانی کے سَو سَو جامے پہنائے لیکن اللہ بھلا کرے سید نذیر نیازی کا، جنھوں نے زبانِ شاعر سے سنی ہوئی اس وضاحت کی روایت بیان کر کے حقیقت کو پردوں سے نکال باہر کیا کہ اقبالؔ کی "خودی" سورۂ حشر کی آیت ۱۹ سے ماخوذ ہے جس کا رواں ترجمہ یوں ہے کہ ان لوگوں میں مت شامل ہو جاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا، سو اللہ نے بھی ان سے فراموشی کو رویہ اختیار کر لیا اور ایسے ہی لوگ تو فاسق ہیں۔

اپنے مقصود و مطلوب کو بھول بیٹھنا اپنے آپ کو بھول جانا ہے بلکہ اس سے بھی بڑی اذیت۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قرب اور اس کی رضا کا حصول ہی ہماری اصل غایت تخلیق ہے۔ اللہ ہی ہمارا مقصود و مطلوب ہے جسے بُھلا کر ہم نے اپنے مہربان اور رحیم و کریم خدا سے گویا کہہ دیا ہے کہ وہ بھی ہمیں بھول جائے، ایسے میں "ہم تجھے بھولے ہیں

یکن تو نہ ہم کو بھول جا" کی دعا شاعرانہ خیال آفرینی تو ہے 'اللہ کے اپنے وضع کردہ قاعدے قانون سے مطابقت
نہیں رکھتی۔
ماری مسجدوں کو رونق دینے والے اور منبر و محراب کو زینت بخشنے والے محو خواب ہیں۔ زندہ و متحرک دین کے
گوں میں اتر جانے والے تقاضوں سے بے خبر تو فقط اللّٰہ ھُو' اللّٰہ ھُو' اللّٰہ ھُو۔ زمانہ چال قیامت کی چل گیا
ہے' دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی' اسے اب وضو اور طہارت کی برکات سنا کر مسلمان نہیں کیا جا سکتا۔ باطل
ظریات کے مضبوط تانے بانے کو اسلام کے انقلابی فکر کی ضرب کلیمی سے ہی توڑا جا سکتا ہے۔ حاملان دین کو
م اللہ کے گنبد سے نکل کر علوم و افکار جدیدہ کے لوہے کو حکمت قرآنی کی کاٹ پر رکھنا ہو گا۔ علمائے دین کی
دمت میں "ندا" بصد ادب عرض کرتا رہے گا کہ اُدھر بھی توجہ فرمائیں اور اِدھر بھی دیکھیں کہ ان کی امامت میں
ماز کے لئے صف بستہ ہونے والے' ان کے اہل خانہ اور ہمسائے "مذہب" کی رسوم ادا کر کے "دین" کے
طالبات سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ حکمت و احکام کتاب کی تعلیم اور نفوس کا تزکیہ نبی خاتمؐ کے نائب و وارث ہونے
حیثیت میں ان کا اولین فریضہ ہے۔ وہ یہ کام کریں تو معاشرے اور ابلاغ عامہ کی لوریاں لوگوں کو مست نہ کر
یں گی' ان میں دین کا وہ علم و شعور اور اس کے لئے وہ حمیت و غیرت پیدا ہو گی کہ یہاں دین حنیف کو مذاق کا
وضوع نہ بنایا جا سکے گا' اسے کھیل نہ سمجھ لیا جائے گا۔ آپ نے اسلام کی "غربت" کے زمانے میں شعائر دینی
کونوں کھدروں میں بیٹھ کر ہی سہی' محفوظ رکھا اور ہم تک پہنچایا تو اس عظیم احسان پر ہم آپ کے شکر گزار ہیں
ن خدارا اب وقت کے تیور پہچانیئے' تہذیب و تمدن کے تیز و تند دھارے کا رخ دیکھئے جس میں اسلاف کی
نت خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہی ہے۔
ران اہل دانش' علوم جدید کی تعلیم سے آراستہ و پیراستہ اور تازہ فلسفہ ہائے حیات کی باریکیوں کے شناسا دوستوں
بزرگوں سے "ندا" درخواست کرتا رہے گا کہ مغرب کے سحر میں کھو نہ جائیں۔ مانا کہ افکار مغرب کی چکاچوند
نکھوں کو خیرہ کئے دیتی ہے۔ یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔ آپ ہی کھو گئے تو ہم جیسے
ستہ الناس منزل کا سراغ کیسے پائیں گے۔ آپ جیسے ستاروں کو نشان راہ دکھانے والے ہم میں موجود ہیں' پھر
ہم کسی مرد راہ داں کو ترستے ہیں۔ فقہ کی موشگافیوں اور فرقہ واری علامات سے بیزاری آپ میں بددلی پیدا کر
ی ہے تو انہیں فی الحال طاق نسیاں میں رکھ دیجئے اور منبع حکمت و ہدایت کی طرف رجوع کیجئے' قرآن حکیم کا
ی نیّت سے مطالعہ کیجئے کہ اس سے آپ کو رہنمائی مطلوب ہے۔ یہ عظیم کتاب جسے معاند اور دشمن بھی علم کا
انہ اور "انقلابی لٹریچر" مانتے ہیں' صرف انہی لوگوں کو استفادے کی ضمانت دیتی ہے جو اسے طلب ہدایت کے
ے حرز جاں بنائیں۔ آپ دیکھیں گے کہ علم و فلسفہ کے عقدے کیسے وا ہوتے ہیں' فکر کی گرہیں کیسے کھلتی ہیں'
ی مسائل کتنے آسان ہو جاتے ہیں اور فرقہ واریت کیسے تحلیل ہو جاتی ہے۔
بنیاد پرستی" سے خائف انسانیت کے مغربی اجارہ دار' ان کے بظاہر حریف بباطن حلیف مشرقی دوست اور

ہندی و یہودی مہاجن لرزہ براندام ہیں کہ دنیائے اسلام میں احیاء کی لہر اٹھ رہی ہے۔ ان کے صنم خانوں میں کہیں بھونچال نہ آجائے' چھوٹے بڑے بت منہ کے بل گر نہ پڑیں لیکن اے "ندا" کے مخاطب بزرگو اور دوستو! آپ کے یہی لیل و نہار رہے' آپ بھی بے مقصدیت کے صحرائے تیہہ میں بھٹکتے رہے' فکر چھوڑ کر ذکر میں مگن رہے' خدا کو فراموش کر کے خود فراموشی کے طلسم میں پھنس گئے اور پتھر کے بت ہو گئے تو یہ لہر دب کے رہ جائے گی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے عروج کا یہ بحر ظلمات اسے نگل لے گا۔ جو جسم انسانی کو تو فردوس بریں سے ہم کنار کرنے کی کوشش میں ہے لیکن اس میں مستور روح ربانی جس سے سہمی جاتی ہے .... "ندا" کی کوشش ہو گی کہ اس کی نحیف آواز میں اپنی آواز ملانے والے قارئین کا ایک حلقہ بھی پیدا ہو جائے۔ بس یہی ہماری ندا ہے

ع

!اور درویش کی صدا کیا ہے!

(ماخوذ از شمارہ ۳۳)

ملّت کا اصل المیہ

مدیر "ندا" کے قلم سے

دنیا کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ایک ارب سے زائد انسانوں پر مشتمل ملت اسلامیہ جسے کفر کی ملت واحدہ کے مقابلے میں جسد واحد ہونا چاہئے تھا' نہ صرف ٹکڑوں اور ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے بلکہ باہم دگر آویزش کے باعث نقصان مایہ اور شماتتِ ہمسایہ کا شکار بھی ہے۔ حال کی تاریخ میں مجاہدین افغانستان نے اگر ایک روشن باب کا اضافہ کیا تو پڑوس میں ہی تقریباً اتنے ہی عرصے سے جاری ایران عراق جنگ ایک متوازی تاریک باب رقم کر رہی ہے اور دونوں کا مستقبل شکوک و شبہات کی بے یقینی میں جیسے دھندلایا ہوا سا ہے' وہ الگ۔ قبلہ اول کو اغیار کے غاصبانہ قبضے میں گئے اکیس (۲۱) سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا ہے اور اس کی بازیافت کی کوئی امید بر نہیں آتی۔ فلسطینیوں کو غلامی اور غریب الوطنی کا داغ اٹھاتے چالیس سال ہونے کو آتے ہیں اور ان پر افتاد بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے' کمی کے کوئی آثار نہیں۔ چالیس لاکھ کشمیری مسلمانوں کو آزادی و خودمختاری دلاتے دلاتے ہم نے ان کے طوق غلامی کو زیادہ بھاری ہی نہیں کروا ڈالا' اس مملکت خداداد کو بھی دولخت کرا بیٹھے جسے دنیا کی سب سے بڑی اقلیم مسلم ہونے کا اعزاز اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نقطہ آغاز ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی اس کثیر تعداد کا بہت بڑا حصہ بظاہر آزاد و خودمختار اور ذرائع و وسائل سے مالا مال ہے لیکن کفر و الحاد کی علم بردار قوتوں کی فکری' علمی اور تہذیبی غلامی کا جوا بدستور اس کی گردن پر رکھا نظر آتا ہے۔

ان دنوں کوئی ایسی نئی بات تو نہیں ہوئی جو ہمیں اس رونے کو لے بیٹھنے پر مجبور کرتی تاہم اتفاق سے ۲۱ اپریل کا دن جو ملت کے حدی خواں علامہ اقبالؒ کی یاد تازہ کر دیتا ہے' رمضان المبارک میں آیا اور دونوں کا تعلق کتاب ہدایت یعنی قرآن حکیم سے بہت گہرا ہے۔ ادھر فکرِ اقبال کے مجاوروں نے حسبِ دستور عرس منایا اور ان کے فکر کے حوالے سے ملّائیت اور تصوف کے لتّے تو لئے لیکن یہ نہ بتایا کہ ان کے پیغام کا خلاصہ یہ تھا کہ۔

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندہ ای
در بغل داری کتابِ زندہ ای

یعنی اے امتِ مسلمہ تو قرآن سے دوری کے باعث ذلیل و خوار ہو رہی ہے۔ تیرا گردشِ زمانہ سے شکوہ بجا نہیں۔ تجھے تو شبنم کی طرح زمین پر گرا پڑا نہیں ہونا چاہئے تھا جبکہ ایک زندہ و پائندہ کتاب تیری بغل میں ہے۔ اور اُدھر رمضان المبارک میں قرآن حکیم کا پڑھنا اور سننا تو گلی گلی ہو رہا ہے لیکن محض ثواب کی خاطر۔ اس سے روشنی اور رہنمائی کی طلب اور امید رکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

یہ نعرہ کہ ملتِ اسلامیہ کی اساس ایک اللہ' ایک رسول اور ایک کتاب پر ہے' سب کانوں کو آشنا لگتا ہے لیکن کتنے ہیں جو اس کے مضمرات پر غور کرنے کی زحمت بھی اٹھاتے ہوں۔ توحیدِ الٰہی تو ملتِ اسلامیہ ہی کی نہیں وحدتِ انسانیت کی بھی بنیاد ہے اور پھر ان دیکھے خدا کو ماننے والوں کی اقوام غیر میں بھی کمی نہیں۔ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنا مشن مکمل کر کے انسانیت کو جنتِ ارضی کا ایک نمونہ دکھا کے' پیچھے آنے والوں کے لئے اپنے نقوشِ پا چھوڑ کر اور نبوت و رسالت کا دروازہ بند کر کے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ ہاں ایک کتاب

وہ چھوڑ گئے ہیں اور وضاحت فرما کے گئے ہیں کہ اس کی شکل میں تمہارے لئے میں حبل اللہ المتین 'اللہ کی ایک مضبوط رسی چھوڑے جارہا ہوں 'اسے مضبوطی سے تھامے رہو گے تو فلاح پاؤ گے ورنہ اسلام اور مجھ سے نسبت تمہارے کسی کام نہ آئے گی۔ اللہ کی وہ مضبوط رسی قبول صورت لکھائی چھپائی میں اور خوش شکل جلدوں میں ہر مسلمان گھرانے میں موجود ہے لیکن افسوس کہ ملتِ اسلامیہ کی اصل 'محسوس اور موجود اساس ہی کو ہم چھوڑ بیٹھے اور متبادل اساسات کی تلاش میں اندھوں کی طرح ٹامک ٹوئیے مار رہے ہیں۔ ہمارا ماضی اور بزرگوں کا ورثہ شاندار ہے اور دشمن بھی اس کی عظمت کے قائل ہیں لیکن اپنا حال اور اپنی کمائی ناگفتہ بہ۔ وجہ اس تغیرِ حال کی واحد ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

قرآن سے دوری اور مہجوری ہی ملتِ اسلامیہ کا اصل لیہ ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کے زعماء' مفکرین اور انشوروں نے اتحاد وتقویتِ ملت کے سینکڑوں ٹونے ٹوٹکے آزما کے دیکھ لئے ہیں۔ قومیت' وطنیت 'نسل' زبان' ادی وسائل' ترقی کے زینے' رابطے' کانفرنسیں' جمہوریت' شتراکیت غرض کون سا حربہ ہے جو استعمال نہیں ہو چکا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ نیم حکیموں کے نسخوں اور پیروں فقیروں کی جھاڑ پھونک سے یہاں کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

سلم ممالک میں جن لوگوں کے ہاتھوں میں زمامِ کار ہے 'وہ اور توسب کچھ کرنے کو تیار ہیں 'کوئی بات نہیں منظور تو وہ رجو الی القرآن ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ انہیں " اعتصمو بحبل اللّٰہ جمیعًا و لا تفرقوا ہی سے ہے۔ وہ سب مل کر اللہ کی رسّی کو تھام لیں تو پھر تفرقہ کیسا۔ رسّی تو انہیں یک جان کر دے گی 'بنیان مرصوص بنا دے گی افسوس کہ انہیں در در بھیک مانگنا بھلا لگتا ہے 'اگر حجاب آتا۔ تو ایک ہی دروازے سے جس پر دھرنا مار بیٹھیں تو بے طلب ملے گا اور اغیار کے آگے دریوزہ گری سے گلو خلاصی الگ۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی انقلابی دعوت ان کے ذاتی مفادات گالی کی طرح لگتی ہے۔

دنیا بھر میں جہاں جہاں احیائے اسلام کی بات ہو رہی۔ وہاں بھی بات تب ہی بنے گی جب دعوت واصلاح کا ذریعہ ا انقلاب کا آلہ قرآن ہو گا۔ اسی سے وہ رنگ ملے گا' صبغۃ اللہ 'جو ہر گورے کالے کو یک رنگ کر دے اور اسی کی زبان ذریعہ ابلاغ ہے جس سے نیل کے ساحل سے لے کر تا خاک کاشغر سب ایک ہی بولی بولنا شروع کر دیں گے۔

آئیے رجوع الی القرآن کا آوازہ بلند کریں۔ اسی طرف لوگوں کو دعوت دیں۔ اور اسی کو اپنا لائحہ عمل بنائیں یہی ہمارا امام ہے 'یہی نور وہدایت 'یہی رحمتِ الٰہی اور یہ دلیل وحجت۔ اس کی طرف بلانے میں وہ لکیریں بھی ہمارے درمیان حائل نہیں جنہیں جدید ہو لیٹکل سائنس میں ملّ سرحدیں کہا جاتا ہے۔ اے اللہ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فر

(ماخوذ از شمارہ ۹)

●●●●●●●●

خبردار! دشمن تاک میں ہیں

سچ پوچھئے تو اپنے سب سے بڑے دشمن ہم خود ہیں۔ وطن عزیز کے استحکام کی واحد اساس۔ اسلام۔ سے دوری ہم نے جانتے بوجھتے اتنی بڑھائی کہ اب یہ خلیج شاید ہی پاٹی جا سکے۔ آسائشوں اور نعمتوں کی جو بارش اللہ تعالیٰ نے اس غریب ملک کے امیر باسیوں پر بطور آزمائش کی' اسے ہم نے اپنی حرمستوں کا انعام سمجھا اور آج اس کے شکرانے میں ہم مادیت کے غلیظ ترین شرکِ معنوی میں پوری طرح ملوّث اور جدید ٹیکنالوجی کی دجّالیت کا آسان ہدف بنے ہوئے ہیں۔ اس ملک خداداد کی بقا و سالمیت کو سب سے مہیب خطرہ ہمارے اپنے کرتوتوں سے ہے۔

لیکن باہر سے بھی خیر کی خبریں نہیں ملتیں۔ راوی چین نہیں لکھتا ہے۔ ہم کبوتر کی طرح بلّی کے خطرے کے مقابلے میں آنکھیں بند کر لیں ' شتر مرغ کی مانند دشمن سے دفاع میں سر ریت میں دے بیٹھیں اور کچھوے کے سے انداز میں اپنے خول میں مقید ہو کر اپنے آپ کو محفوظ و مامون سمجھنے لگیں تو اور بات ہے' ورنہ خطرات کا شعور و ادراک حفاظتی تدابیر اور دفاعی حکمت عملی کی اولین شرط سمجھی جاتی ہے۔ حکومت کو اپنے ذرائع اور وسائل کی بدولت ان خطرات کی بہت بہتر آگہی اور واقفیت حاصل ہو گی جن کی بو عام لوگ بھی سونگھ رہے ہیں' تاہم پیش بندی میں سنجیدہ دوڑ دھوپ کے آثار نظر نہیں آتے یا قوم کو اتنا بالغ نظر نہیں سمجھا جا رہا کہ اعتماد میں لے لیا جائے۔

معاہدۂ جنیوا کے نتیجے میں جو تبدیلیاں متوقع ہیں اور علاقے کی صورت حال جو نقشہ پیش کر سکتی ہے' اس کا ایک حسین اور امید افزا مرقع تو خود ہمارے اس شمارے میں تجزیئے کے طور پر شامل ہے جس پر ہم اپنے رفیق کار سے تو یہی کہتے ہیں کہ ؏

تری آواز مکّے اور مدینے

لیکن دوسری طرف اہل نظر جن خدشات اور اندیشوں کا برملا اظہار کر رہے ہیں وہ بھی کم لائق توجہ نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ روسی ریچھ قابو میں آئے ہوئے شکار پر سے اپنی گرفت اس آسانی کے ساتھ ڈھیلی نہیں چھوڑا کرتا اور پھر اس علاقے پر غلبہ و تسلط اور اس کے گرم ساحلوں تک رسائی کا خواب صرف روسی کمیونسٹوں نے نہیں دیکھا' زاروں کے زمانے سے ان کی رال اس پر ٹپک رہی ہے۔ خلیج کی اہمیت نے بعد میں اس کی دلکشی میں جو چار چاند لگا دیئے وہ الگ۔ روس مجاہدین کی سرفروشی کے طفیل اپنی افواج قاہرہ کو بے نیلِ مرام واپس لے جانے کی جو سبکی اور ہزیمت اٹھا رہا ہے' اس کا داغ جدا۔ کچھ عجب نہیں کہ روسی قیادت خود ہی اس معاملے میں باہمی بحث و نزاع میں الجھ پڑے' افغانستان سے سرخ فوج کی واپسی کھٹائی میں پڑ جائے اور روس اپنے پنجے اس علاقے میں پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے گاڑنے کا فیصلہ کر لے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ روس اپنے حواری اور لے پالک ڈاکٹر نجیب اللہ کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا جا رہا ہے یا اس کی بقا و سلامتی کے لئے اس نے اتنی ٹھوس منصوبہ بندی کی ہے جس پر کٹھ پتلی حکومت کو بھی اطمینان کا اعلان اور خود اعتمادی کا اظہار کرنا آسان ہو گیا۔ اسی اشاعت میں افغانستان کی دہشت گرد اور سفّاک خفیہ تنظیم "واد" کے بارے میں جو حقائق اور اعداد و شمار ایک مربوط مقالے کی شکل میں دیئے جا رہے ہیں' ان میں کچھ بھی صداقت ہے تو ہمارے لئے اپنی غیر محفوظ شمال مغربی سرحد کی طرف سے اطمینان کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ پھر باخبر حلقوں کی طرف اٹھائے جانے والے اس سوال کا بھی کوئی تسلی بخش جواب اب تک نہیں ملا ہے کہ سفارتی تعلقات کی چالیسویں سالگرہ منانے میں گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ مسلمانوں کی اس نوزائیدہ ریاست سے روسی مخالفت و مخاصمت اور بغض و عناد کی چالیس

سالہ تاریخ آنِ واحد میں حرفِ غلط کیسے ہو جائے گی۔

ادھر ہماری طویل جنوب مشرقی سرحد کے اس پار ہندو رام راج کا ناگ پھنکار رہا ہے۔ حالیہ سیاسی تبدیلیوں سے ہمارے لئے حالات کی سازگاری کے تھوڑے بہت جو امکانات پیدا ہوتے ہیں، وہ اس کی بے قراری اور پیچ و تاب میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ پاکستان کے نرم پیٹ "سندھ" میں جو لاوا پک رہا ہے اور جس کی طرف سے اعراض و اغماض ہماری حکومت کی مستقل روش ہے، بھارت کو "سندھ کارڈ" استعمال کر ڈالنے کی ایک قائم و دائم دعوت ہے۔ پنجاب میں سکھوں کے ہاتھوں پریشانی اٹھاتے ہوئے وہ بار بار اپنی خفت مٹانے کے لئے ہم پر الزام کا پتھر لڑھکاتا، دانت پیستا اور جارحیت کے بہانے ڈھونڈتا رہا ہے۔ ہم کشمیر کے ذکر پر آہ بھی بھرتے ہیں تو اسے ناگوار گزرتا ہے اور سیاچن کی جھڑپوں پر واویلا کرتے ہوئے وہ ہمارے اہم اور حساس شمالی علاقے کے بارے میں کھل کر جن عزائم کا اظہار کرتا ہے ان کا مفہوم کوئی راز نہیں۔ اس کا ارادہ بہت سے دیگر اہم مقاصد کے حصول کے علاوہ ہمارا زمینی رابطہ اس ہمسائے سے کاٹ دینے کا بھی ہے جس کی قابلِ اعتماد دوستی اور آڑے وقت میں معاونت پر ہم ایک حد تک تکیہ کر سکتے ہیں۔

روس اور بھارت سے خوشگوار تعلقات کا ماحول ہماری لاکھ ضرورت سہی، علاقے میں امن و سلامتی کی فضا کا اس پر انحصار بھی بجا لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ع میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح۔ روس ہمارے لئے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ تلاش کر بھی لے تو بھارت ہمارے لئے اپنی اس ازلی دشمنی کا سیلابِ بلا کس کے گھر لے جائے گا جو اسے گھٹی میں پلائی گئی ہے۔ ہزار سالہ شکست کا بدلہ لے کر بھی "جگرِ لالہ" میں ٹھنڈک نہیں پڑی۔ ہمارا وجود اس کی طبعِ نازک پر ایک مستقل بوجھ ہے جس سے چھٹکارا پانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دے گا۔

دشمنوں کے درمیان بتیس دانتوں میں زباں کی طرح گھرے ہوئے پاکستان کا مجازی ملجا و ماوا امریکہ ہے جو اپنی وفاؤں کا یقین دلاتے نہیں تھکتا۔ چلئے ع ہمیں یقین ہوا، ہم کو اعتبار آیا۔ اس کی محبت و دل جوئی کی ادائیں اور اقتصادی و دفاعی امداد (خیرات یا قرض؟) صرف افغانستان کے قضیئے کی وجہ سے نہ تھی، ایران سے ہاتھ دھونے کے بعد خلیج سے وابستہ اس کے مفادات کے تابع بھی ہے لیکن حالات کا نقشہ بدلتے کیا دیر لگتی ہے اور پھر اس کی اپنی خارجی حکمتِ عملی بھی تو داخلی سیاسی تبدیلیوں کی زد پر رہتی ہے۔ خلیج کی جنگ اور علاقے میں موجود تناؤ جو سعودی عرب اور ایران کے تعلقات میں حالیہ ابتری کے باعث بڑھ سکتا ہے، اس کے اثرات بھی ایران سے ہماری محبت کے باعث پاک امریکی دوستی پر مثبت نہیں ہوں گے۔

غرض اگر ہم یہ سمجھیں اور قوم کو احساس دلائیں کہ دشمن ہماری تاک میں ہیں تو یہ "شیر آیا، شیر آیا۔ دوڑنا" کا سا جھو غل غپاڑہ نہیں، امرِ واقعہ ہے۔ لیکن دوسری طرف اپنا حال دیکھتے ہیں تو فکرمندی اور تشویش دوچند ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی فوج کی وفاشعاری، جاں نثاری اور بہادری پر کوئی شبہ نہیں شک ہے تو اس کی اعلیٰ قیادت کی صلاحیتوں پر جو عرصے سے متفرق کاموں میں کھپے رہنے اور اختیار و اقتدار کے مزے لینے کے باعث پہلے سے بھی زیادہ ناقابلِ اعتماد ہو گئی ہیں۔ ہمارے جوانوں کی ہمت نے تو کبھی بھی جواب نہیں دیا۔ نہ ۱۹۶۵ میں، نہ سقوطِ ڈھاکہ کے سانحہ میں اور نہ کسی اور امتحان کے وقت۔ وہ سیاچن میں آج بھی جاں فروشی کی نئی داستانیں رقم کر رہے ہیں، شدائد کو جھیلنے کے نئے ریکارڈ قائم کر رہے ہیں ہماری مونچھ کبھی نیچی ہوئی تو فوجی قیادت کے ہاتھوں، جس کی دلچسپیاں نئے نئے میدان تلاش کرنے کی عادی ہو چکی ہیں ملکی سیاست میں اپنے "کردار" کا اسے دوسری باتوں سے زیادہ خیال رہتا ہے۔ اور تو اور ملکی ذرائع و وسائل اور حیثیت کے تناسب سے ہماری بہت بڑی فوج کو ایک کل وقتی چیف آف آرمی سٹاف بھی میسر نہیں، ایک "ڈبل" سے کام چلایا جا رہا ہے۔

ہمارے اس گوشۂ عافیت ۔ پاکستان ۔ کا اللہ ہی حافظ

(ماخوذ از شمارہ ۱۰)

کراچی
جو ایک بھیانک انجام کی طرف بڑھ رہا ہے

فسادات کی دس وجوہات ——— اور
اصلاحِ احوال کے لیے دس ہی تجاویز

عبدالکریم عابد

کراچی کے تازہ فسادات نے یہ خیال غلط ثابت کر دکھایا
ہے کہ شہر کراچی میں نفرت کے گھاؤ مندمل ہو گئے ہیں اور رفتہ
رفتہ از خود ٹھیک ہو جائیں گے اس کے برعکس یہ بات ثابت ہوئی
ہے کہ ہمارا مقابلہ معمولی نوعیت کے زخموں سے نہیں خطرناک
ناسوروں سے ہے اور یہ معمولی مرہم پٹی سے ہرگز ٹھیک نہیں ہو

اور کراچی کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن بہت جلد یہ واضح ہو گیا
کہ اس طرح کی تبدیلی لاحاصل رہی ہے اور آج بھی کراچی میں
امن و امان کی صورتِ حال حکومت کے کنٹرول سے باہر ہے۔
تازہ فسادات کا اہم پہلو یہ ہے کہ ان کا دائرہ پہلے کی نسبت کافی
وسیع اور زیادہ عمیق ہے، پہلے دو تین علاقوں تک گڑبڑ محدود تھی

قومی اسمبلی کے رکن اور بہاریوں کے ایک رہنما آفاق شاہد نے یہ رائے دی ہے کہ تازہ فسادات اگر پورے ملک میں نہیں تو سندھ میں نیا مارشل لا لگانے کی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ قاضی حسین احمد، پروفیسر غفور، لیاقت بلوچ، مولانا نورانی، مولانا فضل الرحمٰن بھی یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سب کچھ حکمراں طبقہ کی اپنی سازش ہے۔ نامعلوم کار سوار اور سکوٹر سوار انتظامیہ کے آدمی ہیں جو پُراسرار انداز سے آتے جاتے ہیں۔

سکتا ان کے لئے ایک بہت بڑے اور بہت ماہرانہ آپریشن کی
ضرورت ہے۔ لیکن حکمرانوں نے سمجھا تھا کہ پرانی سندھ کابینہ
سے غوث علی شاہ کو نکال دیا جائے اور اس کابینہ کے سینئر وزیر
اختر قاضی کو وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر ترقی دے دی جائے تو سندھ

اب شہر کے سولہ تھانوں میں کرفیو نافذ ہے اور بقیہ علاقے بھی
خوف اور کشیدگی کا شکار ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ پورا ہفتہ
صنعتی تعطل اور کاروباری جمود کا رہا کراچی کے سٹاک ایکسچینج کے
کام نہ کرنے کی وجہ سے سارے ملک میں بازارِ حصص بند پڑے

رہے صنعتی اور تجارتی اشیاء کی ترسیل پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کراچی میں عام ڈاک تک کی تقسیم ناممکن ہو گئی اور ڈاک کے چار سو سے زیادہ مراکز میں سے صرف بیس ڈاک خانوں کی ڈاک تقسیم ہوئی۔ فسادات کے بعد شہر میں نئے مہاجر کیمپ بن گئے ہیں۔ سکولوں اور دوسری بڑی عمارتوں میں مختلف علاقوں کے خانماں برباد مہاجرین مقیم ہیں اور اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے بہتر حالات کے انتظار میں ہیں' تاکہ ان لُٹے پٹے شکستہ اور جلے ہوئے مکانوں کو پھر سے ٹھیک کیا جا سکے۔ فسادات میں جانی اور مالی نقصان سے زیادہ ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ قومی سیاسی جماعتوں اور خود ایم کیو ایم اور پنجابی پختون محاذ کے رہنماؤں

اس فساد میں دو بھارتی ایجنٹوں اور تین افغان "واد" ایجنٹوں کی گرفتاری کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے اور اہم انکشافات کی توقع دلائی گئی ہے۔

نے اس عرصہ میں مختلف لِسانی گروہوں کے درمیان جذبۂ مفاہمت کو پروان چڑھانے کے لئے جو کوششیں کی تھیں وہ سب رائیگاں گئیں اور شہر کے مختلف علاقے آج پہلے سے بھی زیادہ لِسانی نفرت اور کشیدگی کے زہر میں ڈوبے نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسلی فسادات اب اس شہر کا مقدر ہیں اور یہ عذاب ان پر مُسلط رہے گا۔ کیونکہ فسادات نے نہ تو ندامت' شرمساری اور توبہ کے احساسات بیدار کئے ہیں اور نہ اپنے انجام کے بارے میں کسی کے اندر گہرے تفکّر و تدبر کا شائبہ نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس مہاجر آبادیوں میں پٹھانوں کے مظالم کی داستانیں ہیں اور پٹھان حلقوں میں مہاجروں پر سبّ و شتم ہے' نفرت کی دو دھاری تلوار ہے جو وُحدت اور اخوت کو کاٹ رہی ہے۔ کرفیو کی پابندیوں کا اس نفرت کی لہر پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا اور یہ زہر زیرِ زمین جانے کے بعد مزید طاقتور

ہو جائے گا۔ مگر یہ سب کچھ کیوں ہے؟ کراچی ایک بدترین انجام کی جانب کیوں بڑھا چلا جا رہا ہے؟ اور یہ کیسے ہو گیا کہ کراچی کے کاسمو پولیٹن شہر کی کاسمو پولیٹن فضا اچانک نسلی اور لِسانی عصبیتوں کی آگ میں بھسم ہو گئی! اس کا ذمہ دار کون ہے اور اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے؟

قومی اسمبلی کے رُکن اور بہاریوں کے ایک رہنما آفاق شاہد نے یہ رائے دی ہے کہ تازہ فسادات اگر پورے ملک میں نہیں تو سندھ میں نیا مارشل لا لگانے کی سازش کا ایک حصہ ہیں۔ قاضی حسین احمد' پروفیسر غفور' لیاقت بلوچ' مولانا نورانی' مولانا فضل الرحمٰن بھی یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ سب کچھ حکمران طبقہ کی اپنی سازش ہے۔ نامعلوم کار سوار اور سکوٹر سوار انتظامیہ کے آدمی ہیں جو پُراَسرار انداز سے آتے ہیں اور فائرنگ کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد فساد شروع ہو جاتا ہے اور پولیس' انتظامیہ موقع پر پہنچنے سے گُریز کرتی ہے۔ یہی کہانی ہے جو وقفہ وقفہ سے دہرائی جا رہی ہے۔ اس کا مقصد حالات کو خراب کر کے نئے مارشل لا کے لئے جواز فراہم کرنا ہے۔

ایک دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مہاجر پٹھان جھگڑا دراصل سُنی شیعہ جھگڑے سے شروع ہوا اور "سوادِ اعظم" جو پٹھانوں پر مشتمل تھا اس کے خلاف شیعہ مہاجروں میں رَدِّ عمل ہوا اور بہت جلد وہ لڑائی مہاجر پٹھان لڑائی میں تبدیل ہو گئی یا تبدیل کر دی گئی۔ اب شیعہ فرقے کے فوجی تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں جو اس جھگڑے کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ پٹھان کے منفی وجود کے مقابلے میں مہاجر کا منفی اتحاد قائم رہے اور وہ اس اتحاد کا حصہ اور اس کے روحِ رواں بنے رہیں۔

تیسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ منشیات فروش اور اسلحہ فروش ایک منظم مافیا ہیں' یہ جان بوجھ کر فسادات کراتے ہیں۔ اس سے ان کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ امن و امان کی دَرہم بَرہم صورتِ حال میں وہ اپنے بچاؤ کے ٹھکانے قائم کر لیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ پختون عصبیت کو جگا کر اپنے لئے پناہ گاہیں تلاش کر لیتے ہیں اور پولیس یا انتظامی مشینری فسادات کے

دنوں میں بدحواسی کا شکار ہوتی ہے۔ ان دنوں میں ایک توان
کی اسلحہ فروشی خوب زوروں پر چلتی ہے دوسرا وہ ہنگاموں سے
فائدہ اٹھا کر اپنے مال کے حمل و نقل کے لئے سہولتیں حاصل
کر لیتے ہیں۔ جب بھی انتظامیہ کی توجہ اس مافیا کی جانب ہوتی
ہے یہ نسلی فساد پیدا کر کے اس توجہ کو اپنی طرف سے ہٹا لیتے ہیں
اور حکومت کی مشینری انہیں چھوڑ کر فسادات کی روک تھام
اور پکڑ دھکڑ کے کاروبار میں لگ جاتی ہے۔

چوتھا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فسادات اس شہر پر پولیس مُسلّط کرتی
ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مہاجروں کو جو "پنجاب پولیس"
کی مخالفت میں آواز اٹھاتے رہتے ہیں' سزا دینا اور سبق سکھانا
چاہتی ہے۔ اس غرض کے لئے وہ منشیات فروشوں اور اسلحہ
فروشوں کی مافیا کو کھلی چھوٹ دیتی ہے' جیسی کہ علی گڑھ کالونی
میں دی گئی تھی اور اس بار بھی ایسی ہی چھُوٹ اس مافیا کو مہاجر
بستیوں میں حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ سے مہاجروں کا بڑا
جانی و مالی نقصان ہوا۔ خاص طور پر پہاڑیوں کے مورچوں سے
جو حملے کئے گئے وہ کافی نقصان اور بھگدڑ کا سبب بنے۔
"پنجاب پولیس" اس لئے بھی فسادات چاہتی ہے کہ فسادات
کے دوران اور بعد میں پولیس کو سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کی
پکڑ دھکڑ کرنے' ان کو مار پیٹ کر اپنی بھڑاس نکالنے اور ان
سے بھاری رشوتیں وصول کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس
لئے جب تک کراچی کی یہ پولیس ہے کراچی کے لوگ خواہ ہزار
کوشش کریں وہ امن سے نہیں رہ سکتے۔

حکومت کے حلقوں کی جانب سے بار بار جو بات کہی جاتی
ہے وہ پانچواں نقطۂ نظر ہے کہ ان فسادات میں غیر ملکی ایجنٹوں کا
حصہ ہے یہ ایجنٹ افغان خفیہ تنظیم "واد" کے بھی ہیں اور
بھارتی تنظیم "را" کے بھی جس کا مرکز راجستھان میں قائم ہے
اور یہ تنظیم سندھ' کراچی کے بارے میں اپنے خصوصی منصوبہ پر
عمل کر رہی ہے۔ اس فساد میں دو بھارتی ایجنٹوں اور تین افغانی
"واد" ایجنٹوں کی گرفتاری کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے اور اہم
انکشافات کی توقع دلائی گئی ہے۔ حکومت کا یہ بھی کہنا ہے کہ
اندرونِ ملک کے ملک دشمن عناصر کا بھی ان فسادات میں ہاتھ
ہے جو نظریۂ پاکستان' اسلامی وحدت اور ملکی سالمیت کو تباہ کرنا
چاہتے ہیں۔ یہ عناصر مختلف لسانی گروہوں اور تنظیموں کی
صفوں میں گھُس کر فسادات کے لئے موقع کے منتظر رہتے ہیں
اور وقت آنے پر کام دکھاتے ہیں انہیں بیرونی ذرائع سے بڑی
بڑی رقمیں بھی مل رہی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایجنٹوں اور ملک
دشمنوں کو پکڑا کیوں نہیں جاتا؟ اس سوال کا کوئی جواب
حکومت کے پاس نہیں ہے۔

چھٹا نقطۂ نظر اس بات کا مدعی ہے کہ یہ سب کچھ جناب جی
ایم سید اور جئے سندھ کے ایک گروپ کی کارستانی ہے۔ جس
زمانے میں سندھی' بلوچی نیشنلسٹ جیوے سندھ بلوچستان'
بھاڑ میں جائے پاکستان کے نعرے لگا رہے تھے اور مہاجروں

جی ایم سید نے مہاجروں سے اتحاد کا فلسفہ پیش کیا اس فلسفہ کی رو سے یہ طے پایا کہ مہاجر قوم پرستی کو بڑھاوا دیا جائے اور اسے پنجابیوں' پختونوں کے خلاف کھڑا کیا جائے کیونکہ مرکز سے لڑنے کی طاقت سندھ کی دیہی آبادی میں نہیں۔

کے خلاف غلیظ زبان میں اظہارِ خیال کر رہے تھے' عین اس
وقت جی ایم سید نے مہاجروں سے اتحاد کا فلسفہ پیش کیا اس
فلسفہ کی رو سے یہ طے پایا کہ مہاجر قوم پرستی کو بڑھاوا دیا جائے
اور اسے پنجابیوں پختونوں کے خلاف کھڑا کیا جائے کیونکہ مرکز
سے لڑنے کی طاقت سندھ کی دیہی آبادی میں نہیں ہے' شہری
آبادی ہی یہ جنگ لڑ سکتی ہے' اس لئے ہمیں اس سے اتحاد کرنا
چاہئے۔ اس فلسفۂ اتحاد پر پلیجو' حمیدہ کھوڑو اور جام ساقی'
جی ایم سید سے ناراض ہو گئے' لیکن وہ اپنے مختصر سے گروپ
کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے۔ پہلے اس کام کے لئے

محمود الحق عثمانی کے سندھ یونی بورڈ کو استعمال کیا اور بعد میں الطاف حسین دستیاب ہوگئے اور ایم کیو ایم ابھر کر آگئی۔ ایم کیو ایم کے ذریعے مہاجر نوجوانوں میں پنجابیوں اور پٹھانوں کے خلاف جذبات پیدا کر دیئے گئے ہیں' دوسری طرف پنجابی پختون اتحاد کے جذبات ہیں ان کا ٹکراؤ فساد کو جنم دیتا رہے گا۔

ساتواں نقطہ نظریہ ہے کہ اصل میں سیاست سے نظریہ اور نصب العین کی روح غائب ہوگئی ہے اور صرف عصبیتوں کا کھیل باقی رہ گیا ہے۔ ایم کیو ایم نے اس عصبیت کے نتیجے میں بلدیاتی کامیابی ضرور حاصل کر لی لیکن اس کی کوشش کے باوجود عصبیتوں کی سیاست ختم نہیں ہو رہی ہے' کیونکہ جن بوتل سے باہر آگیا ہے اور کسی بھی جگہ کوئی معمولی لڑائی یا حادثہ پھیل کر ایک بڑے فساد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایم کیو ایم اور پنجابی پختون اتحاد دونوں ہی اب امن چاہتے ہیں اور امن کی تلقین کر بھی رہے ہیں۔ لیکن لوگوں کو نفرتوں کی جو شراب پلا دی گئی ہے اس کا نشہ اپنا کام دکھاتا ہے اور ذرا سی بات فساد کے لئے بہانہ بن جاتی ہے۔ ایک بڑے شہر میں چھوٹے موٹے جھگڑے اور حادثات معمولی ہیں مگر یہاں ایک معمولی جھگڑا اور حادثہ بھی ایک فساد کو جنم دے دیتا ہے۔

> **ہماری بیورو کریسی کا خیال ہے کہ کراچی ایک بڑا شہر ہے اسے بنیادی طور پر غیر سیاسی رہنا چاہئے کیونکہ اگر یہ سیاسی ہوگیا تو ہمارے لئے ملک پر حکومت کرنا مشکل ہوجائے گا**

آٹھواں نقطہ نظریہ ہے کہ ہماری بیورو کریسی کا خیال ہے کہ کراچی ایک بڑا شہر ہے اسے بنیادی طور پر غیر سیاسی رہنا چاہئے کیونکہ اگر یہ سیاسی ہوگیا تو ہمارے لئے ملک پر حکومت کرنا مشکل ہو جائے گا اور ملک میں انقلاب آجائے گا اس لئے کراچی کو غیر سیاسی رکھنے کی ہر تدبیر پر عمل کیا جائے اور جو تدبیر بیورو کریسی کی سمجھ میں آئی ہے وہ لڑاؤ اور حکومت کرو ہے۔ بیورو کریسی ہی ہے جو شیعہ سنی جھگڑے سے لے کر مہاجر پنجابی مہاجر جھگڑے تک ہر طرح کے جھگڑوں کی سرپرست ہے اور ہر فسادی گروہ کی سرپرستی کرتی ہے۔ اس سرپرستی میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ گروہ جس کی نکیل بیورو کریسی کے ہاتھوں میں ہوتی ہے بے مہار ہو جاتے ہیں اور بے قابو ہو کر جو جی چاہے کر گزرتے ہیں۔ بیورو کریسی تھوڑا فساد چاہتی ہے لیکن یہ بڑا فساد برپا کر کے مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔

نواں نقطہ نظریہ ہے کہ وہ دن لد گئے جب حکمراں بیورو کریسی لوگوں کو لڑاتی تھی اور خود متحد رہتی تھی اب فسادات کی ہڈیوں پر ان کے درمیان کتے بلیوں کی سی لڑائی ہے۔ بیورو کریسی ایک متحد ادارہ نہیں رہا یہ خود ہر طرح کی گروہ بندیوں اور عصبیتوں کا شکار ہے اور عصبیت و مفاد طلبی کی بنیاد پر اپنی لڑائیوں کو عوام میں منتقل کر رہا ہے۔ بیورو کریسی کا ہر حصہ دوسرے حصوں کو ناکام بنانے سے دلچسپی رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی چاندی اسی وقت ہو سکے گی جب دوسرا گروہ ناکام ہو۔ یا محض اپنے جذبۂ عصبیت یا جذبۂ انتقام کی تسکین کے لئے وہ ایک دوسرے کو ناکام بناتے ہیں۔ اسی طرح بیورو کریسی کے تحت کراچی شہر کو دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ اس بیورو کریسی کے آمرانہ اور مطلق اختیارات شہر کے انتظام اور امن و امان کو درہم برہم کئے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اب اس بیورو کریسی میں وہ پہلے جیسی اہلیت بھی نہیں ہے اس کے ہاتھ پاؤں جلد پھول جاتے ہیں یہ فوراً بدحواس ہو جاتی ہے اور ہر دباؤ کے آگے جھک جاتی ہے۔

دسواں نقطہ نظریہ ہے کہ عالمی مغربی سامراج یہ سمجھتا ہے کہ آج نہیں تو کل اس سارے خطے کی نئی تقسیم ناگزیر ہو جائے گی۔ ہندوستان' پاکستان' ایران' افغانستان ان سب ممالک کی ٹوٹ پھوٹ اور تشکیلِ جدید لازمی ہے۔ اس ضمن میں کراچی اور جنوبی سندھ کو ایک الگ خطہ کی حیثیت سے قا

رکھنے کی ضرورت ہوگی اور اس ضرورت کی تکمیل کے لئے یہ
بتدائی نوعیت کے حالات ہیں جو پیدا کر دیئے گئے ہیں اور بعد
یں جب بھی ضرورت ہوگی ان حالات کے تحت یا ان سے فائدہ
ٹھا کر ساحلِ سندھ کی ایک نئی حکومت بنائی جا سکتی ہے' جو
غربی سامراج کے محفوظ فوجی' تجارتی اور صنعتی اڈہ کے طور پر
ب کے لئے قابل قبول بھی ہوگی۔ ممکن ہے اس خیال میں
ر حقیقت بھی ہو' لیکن ہمارا قومی شعار یہ ہے کہ کار بد تو ہم
ود کرتے ہیں اور لعنت دوسروں پر بھیجتے ہیں۔

کراچی کے فسادات کے ضمن میں یہ سب باتیں عام طور پر
ی جاتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک بات مکمل سچائی نہیں
ے اور سب باتیں مل کر بھی اصل حقیقت کو واشگاف نہیں
رتی ہیں کیونکہ مذکورہ دس وجوہات کی بنا پر فسادات یا عصبیتوں
ے پھیلاؤ میں مدد تو مل سکتی ہے لیکن اگر عصبیت ہی نہ ہو اور
ادی ذہن کی جگہ تعمیری' مثبت اور صالح ذہن ہو تو وہ ان کے
ات قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ اگر بحیثیت مجموعی
اشرے میں صحت مندانہ ذہن کا غلبہ ہے اور روح و ذہن بیمار
یں ہیں اور توانا ہیں تو بیماری اور ہلاکت کے یہ جرثومے وجود
ھنے کے باوجود عوام میں جڑ پکڑ نہیں سکتے۔ بنیادی خرابی جو پیدا
ئی ہے وہ اس سے ہوئی ہے کہ قومی سیاسی جماعتوں کو نہ کام
نے دیا گیا اور نہ انہوں نے ٹھیک طرح سے کام کیا۔ اس
ح جو خالی خانے پیدا ہوئے ان پر جن بھوتوں کا قبضہ ہو گیا۔
اگر ہم واقعی کراچی کو امن اور مفاہمت کا شہر بنانا چاہتے ہیں
ں کے لئے ضروری ہے کہ

) وہ لوگ جو طاقت کا سرچشمہ بنے ہوئے ہیں اس خیال کو
سے نکال دیں کہ ایک اور مارشل لا یا نیم مارشل لا مسئلہ کا
ہے۔ حقیقت میں کراچی کی ساری خرابی اور تباہی مارشل لا
یدا کردہ ہے اور مارشل لا ہی کے دنوں میں یہ سب کچھ
یا۔ مارشل لا یا نیم مارشل لا کی حکومت کی بجائے سندھ اور
چی کے مسئلہ کا قوی اور دیرپا حل یہ ہے کہ فوراً نئے الیکشن
ئے جائیں۔ اگر سارے ملک میں ممکن نہیں تو کم از کم سندھ
لی کو فوراً توڑ کر جماعتی بنیاد پر نئے الیکشن ہوں اور حقیقی
جمہوریت بحال کی جائے تاکہ صوبے کو اور کراچی کو ایک باوقار
اور حقیقی جمہوری اسمبلی اور حکومت مل سکے' جس میں واقعی
نمائندہ لوگ موجود ہوں۔

(۲) مولوی حضرات کو اپنی فرقہ پرستانہ روش ترک کرنی
چاہئے۔ اس روش کے سبب بھی نوجوانوں کے ذہن سے نظریۂ
پاکستان اور حقیقی اسلامی اخوت کی اہمیت اوجھل ہو گئی۔ فرقہ
وارانہ کشمکش سے اگر ایک طرف اقلیتیں اپنا مفاد سیکولر سیاست
اور نیشنلزم میں تلاش کرتی ہیں تو دوسری جانب اکثریت
کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا اور وہ آخر کار احساس محرومی کے
سبب اپنے آپ کو بدنصیب اور ستم رسیدہ خیال کر کے منفی
سیاست کی جانب چل پڑتی ہے۔

(۳) منشیات فروشوں اور اسلحہ فروشوں کے لئے خصوصی
سماعت کی عدالتیں بنائی جائیں۔ ان عدالتوں کے ذریعہ فوری
کارروائی کے بعد سزائے موت ہونی چاہئے۔ عدالتیں تو قائم
کر دی گئی تھیں مگر وہ بھی کچھ دنوں کے بعد ٹھپ ہو کر رہ
گئیں۔ اس مافیا کے خلاف جنگی بنیاد پر کارروائی ہونی چاہئے اور
کوئی ہرج نہیں ہے اگر فوج کو یہ ٹاسک تفویض کیا جائے۔

(۴) کراچی کی پولیس کو کراچی کے معاملات سے بالکل
الگ کر دیا جائے۔ پنجاب کے ملازمین کو فوراً پنجاب واپس بلایا
جائے اور مقامی لوگوں سے پولیس ملازمین کی بھرتی ہو اور مقامی
پولیس بلدیہ کی تحویل میں دی جائے۔ اس سے خود پنجاب کے
دانشوروں اور مدیران اخبارات نے بھی مکمل اتفاق کا اظہار کیا
ہے کہ کراچی ہی نہیں ہر شہر میں پولیس نظام بلدیہ کی تحویل میں
ہونا چاہئے اور کراچی کے حالات تو خاص طور پر اس اقدام کا
تقاضا کر رہے ہیں۔ نوائے وقت اور جسارت نے اپنے اداریوں
میں بھی کراچی پولیس کو کراچی بلدیہ کے حوالے کرنے کا
مشورہ دیا ہے۔

(۵) غیر ملکی ایجنٹ یا ملک دشمن عناصر کراچی میں سرگرم
ہیں تو انہیں پکڑنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور حکومت خود
بتائے کہ وہ اپنی ذمہ داری کتنے عرصے میں پوری کرے گی؟ کیا
اس ذمہ داری کا خیال اس وقت آئے گا جب اوجڑی کیمپ کی

طرح ہر چیز جل کر خاکستر ہو جائے گی؟

(۶) ایم کیو ایم میں جئے سندھ گروپ کا کوئی اثر تھا تو اب یہ اثر بہت کمزور پڑ گیا ہے اور انتخابی عمل کے نتیجے میں ایک بڑی قیادت اور کارکنوں کی سطح پر نوجوانوں کی قوت سامنے آئی ہے جو جئے سندھ تحریک کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتی لیکن کراچی کے شہری مسائل بالخصوص پولیس اور ٹرانسپورٹ کے مسائل نوجوانوں کے ذہن میں آگ بھڑکاتے ہیں۔ حکومت کو ان مسائل کی طرف توجہ دینی چاہئے اور خود ایم کیو ایم کو الیکشن کے بعد کے مجہول اور گم سم کردار کو ختم کر کے واضح طور پر شہری مسائل کے لئے آواز بلند کرنی چاہئے اور بلدیہ کے لئے اختیارات اور فنڈز کا زور و شور سے مطالبہ کرنا چاہئے۔ کراچی کے عوام کو کالاباغ ڈیم یا پنوں عاقل کی چھاؤنی کی مخالفت سے کچھ نہیں ملے گا انہیں تو اپنے حقوق اور مفاد کے لئے لڑنا چاہئے اور ایم کیو ایم کو اس لڑائی کا مظہر بننا ہو گا اور پنجابی پٹھان کا

ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہئے۔

(۹) کراچی شہر پر بیورو کریسی کے ذریعہ حکومت کا طریقہ مزید خوفناک نتائج کو جنم دے گا۔ اس طریقے کو ختم کر کے نئے الیکشن کرا کے کراچی پر کراچی کے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکمرانی کی جائے۔ بیورو کریسی کا ادارہ اب ویسے بھی بیکار ہو گیا ہے اور کراچی جیسے پیچیدہ اور گنجلک شہر میں یہ کسی مصرف کا نہیں رہا۔ اس کے بجائے خود مختار کارپوریشنوں کے ذریعے شہر کا انتظام کیا جائے۔ کراچی کارپوریشن کے اختیارات بڑھائے جائیں ٹرانسپورٹ کی ایک کارپوریشن بنائی جائے جس سے ٹرانسپورٹ کے جھگڑے ختم ہو سکیں اور عوام کو سرکاری ٹرانسپورٹ مل سکے جس کے کارکن شائستہ اور جلد مشتعل ہونے والے نہ ہوں۔ مقامی لوگوں کو روزگار دینے کی طرف خاص توجہ دی جائے کیونکہ کراچی کے نوجوانوں کی بے روزگاری نے خطرناک شکل اختیار کر لی ہے۔

(۱۰) قومی سیاسی جماعتوں کے کام میں رکاوٹ نہ ڈالی

کراچی کی ساری خرابی اور تباہی مارشل لا کی پیدا کردہ ہے

کراچی شہر پر حق تسلیم کرنا ہو گا۔ ویسے بھی ایک صنعتی شہر کے لئے محنت کش طبقہ ضروری ہے اور پنجابی کاریگر پٹھان مزدور خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جو پاکستان کو حاصل ہے۔

(۷) ایم کیو ایم کے لئے وقت آ گیا ہے کہ وہ صاف طور پر جی ایم سید سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے اور کہے کہ ہم ان کے فلسفوں پر نفرین بھیجتے ہیں۔ ایم کیو ایم کو اپنی بنیاد مہاجر عصبیت کی بجائے شہری مسائل کو بنانا چاہئے اور ایم کیو ایم کو نئی شکل دے کر اسے عام شہریوں کا متحدہ محاذ بنانا چاہئے یا کم سے کم اسے تمام اہل کراچی کے لئے قابل قبول بنانا چاہئے۔

(۸) پنجابی پختون اتحاد کو بھی ایم کیو ایم سے مفاہمت کے لئے بے جھجک ہو کر قدم آگے بڑھانا چاہئے۔ کچھ قدم اٹھائے بھی گئے تھے اور اس کا اچھا نتیجہ نکلا لیکن حقیقی مفاہمت کے لئے یہ ضروری ہے کہ پنجابی پختون اتحاد منشیات فروشوں اور اسلحہ فروشوں کو اپنے دامن میں جگہ نہ دے اور مفاہمت کرنا ہے تو فسادی عناصر کو فساد پھیلانے کا کوئی موقع نہ دے۔ اس میں

جائے۔ نئے الیکشن سے انہیں نئی زندگی ملے گی اور نظریہ نصب العین کی حرارت جو ہمارے معاشرہ سے غائب ہو گئی ہے اسے صرف قومی سیاسی جماعتیں ہی دوبارہ پیدا کر سکتی ہیں اور یہ جماعتیں ہی ملک کو اور ملک کے عوام کو جوڑنے کا ذریعہ ہیں۔ اس بنا پر صوبہ سندھ میں فوری الیکشن وقت کا اہم ترین تقاضا ہیں۔ اختر قاضی کی کابینہ کے متعلق پہلے ہی سے پیش گوئی کر دی گئی تھی کہ اسے اگرچہ لا اینڈ آرڈر کی بحالی کے لئے لایا گیا ہے لیکن یہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو گی کیونکہ موجودہ صوبائی کابینہ اور موجودہ صوبائی اسمبلی بالکل جعلی ادارے ہیں۔ سندھ کے عوام نے الیکشن ۸۵ء میں ووٹ نہیں دیئے تھے اور جہاں دیئے تھے وہاں بھی صورت حال بدل چکی ہے اس لئے نئے الیکشن سے جو حکومت بنے گی وہی ایک طاقتور حکومت ہو گی اور بحالی امن کے لئے کچھ کر سکے گی۔

(ماخوذ از شمارہ ۱۲)

دارالحکومت میں بجٹ کا موسم

مشکلات اور مہنگائی کا سال شروع ہونے والا ہے

بیورو رپورٹ

پچھلے ہفتے دارالحکومت اسمبلی معطل کر کے نئے انتخابات کرانے کے فیصلے سمیت طرح طرح کی لرزا دینے والی افواہوں اور اطلاعات سے گونجتا رہا' لیکن اصل خبر بس اتنی ہے کہ مشکلات اور مہنگائی کے نئے سال کا آغاز ہونے والا ہے ۔ ایک پورا عشرہ بے دریغ قرضے سمیٹنے کے بعد اب آخر کار وہ وقت آ پہنچا ہے جب قرضے لے کر بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اب ٹیکس لگانا ہوں گے اور اگر ٹیکس وصول نہیں ہوں گے تو اربوں روپے کے نوٹ چھاپنے ہوں گے۔ دونوں صورتوں میں ماہرین کا اندازہ یہ ہے کہ امسال مہنگائی کا عفریت منہ پھاڑ کر آگے بڑھے گا اور کم آمدنی والے طبقے کی زندگی میں نئی مشکلات کا زہر گھول دے گا۔

بتایا جا رہا ہے کہ ۱۸۰ ارب روپے کے بجٹ کے لئے جو جون کے پہلے ہفتے میں پیش کیا جانے والا ہے' دس ارب روپے سے لے کر ۱۶ ارب روپے تک کم پڑ رہے ہیں جو نئے ٹیکسوں سے پورے کئے جائیں گے۔ لیکن ماہرین کا اندازہ یہ ہے کہ حکومت کو اس سے بھی زیادہ یعنی تقریباً ۲۰ ارب روپے درکار ہوں گے اور چونکہ ایک ایسے وقت میں جب قوم ٹیکس دینے کے لئے تیار نہیں اور ٹیکس وصول کرنے کا نظام ایسا ہے جس میں وصول کرنے والا سرکاری واجبات سے زیادہ اپنے "منافع" پر نظر رکھتا ہے' یہ ٹیکس آسانی سے وصول نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا نوٹ چھاپنا ہوں گے اور افراط زر جو اس وقت پندرہ فیصد کو جا پہنچا ہے' امسال اور زیادہ تیزی سے بڑھے گا۔

پچھلے سال کا تلخ تجربہ حکومت کے ذہن میں تازہ ہے جب ۷۵ ارب روپے کا بجٹ پیش کیا گیا لیکن اتنا واویلا مچا کہ دفاعی ٹیکس واپس لے کر اس کا سائز کم کرنا پڑا اور اسے ۱۶۵ ارب روپے تک لانا پڑا۔ (اگرچہ بعد ازاں یہ بتدریج ۱۷۷ ارب روپے کو جا پہنچا) ۔ اس نئے ٹیکس پر وزیر خزانہ جگ ہنسائی کا موضوع بنے' لہٰذا اب کی بار چھ وزراء کی ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے جو بجٹ کے سلسلے میں تجاویز مرتب کر رہی ہے۔ دارالحکومت کے سیاسی حلقے کہتے ہیں کہ یہ ایک طرح سے وزیر خزانہ یلیین وٹو پر عدم اعتماد کا اظہار بھی ہے' لیکن خود گھبرائے ہوئے وزیر خزانہ نے اس عدم اعتماد کو قبول کر لیا ہے۔ سیاسی پنڈت اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اگلے چند مشکل ہفتے گزارنے کے بعد' وزیر خزانہ اپنے اس مشکل منصب سے الگ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا جی بہلانے کو انہیں کوئی دوسری وزارت پیش کر دی جائے۔

غیر ترقیاتی اخراجات کا مسئلہ

جنرل محمد ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے بعد سے پچھلے گیارہ سال میں ملک کے غیر ترقیاتی اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور یہی مسئلہ اس وقت ملک کی اقتصادیات پر تلوار بن کر لٹک رہا ہے۔ اعداد و شمار کے الجھاؤ میں پڑے بغیر سادہ سی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۷ء تک ہم اپنے یہ اخراجات (دفاع' ایڈمنسٹریشن وغیرہ) نہ صرف اپنے بجٹ سے پورا کر لیتے تھے بلکہ سات سے گیارہ فیصد رقم ترقیاتی اخراجات کے لئے بچ رہتی

تھی۔ ترقیاتی منصوبوں کے لئے مزید رقم ہم قرضوں کی صورت میں حاصل کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ اس میں زیادہ اعتراض کی بات نہ تھی۔ ۱۹۷۸ء سے شروع ہونے والے پانچویں پنجسالہ

۲۶۵ ارب روپے تمام درآمدات پر سیلز ٹیکس بڑھا کر وصول کئے جائیں گے' جبکہ ۴ ارب روپے ملک میں مختلف قسم کی صنعتی پیداوار پر ساڑھے بارہ فیصد کی شرح سے سیلز ٹیکس عائد کر کے حاصل کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ ۵۰ کروڑ روپے تعلیمی اداروں میں پرائمری سے اوپر کی سطح پر تعلیمی فیس میں اضافے سے حاصل ہوں گے' ۵۰ کروڑ روپے آبپاشی میں رعایتیں ختم کرنے سے بچیں گے اور ایک ارب روپے کی دوسری رعایتیں (سبسیڈیز) ختم کی جائیں گی۔

منصوبے کے مرحلے میں ایک طرف تو یہ اخراجات اس قدر بڑھے کہ سارا بجٹ ہی نگل گئے' دوسری طرف اس منصوبے کا ڈیڑھ سال مکمل ہوتے ہی ہمارے علاقے میں ایک ایسی بنیادی تبدیلی آ گئی جس نے نہ صرف ہماری اندرونی سیاست اور خارجہ پالیسی کو بنیادی طور پر متاثر کیا بلکہ ہماری اقتصادی زندگی میں بھی اس نے غیر معمولی تغیرات پیدا کر دیئے۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں وزارت خزانہ کی جیب خالی تھی اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ملک کے مالی معاملات کیسے چلائے جائیں۔ حالت یہ ہو چکی تھی

کہ اگلے سال کی چاول کی پوری فصل گروی رکھ کر' بینک آف کریڈٹ اینڈ کامرس (بی سی سی آئی) سے ایک سو ملین کا قرضہ حاصل کرنے کی بات چیت جاری تھی اور یہ قرض ۱۴ فیصد سود پر حاصل کیا جانا تھا' جو شاید پاکستان کی تاریخ میں سب سے بڑی شرح سود ہوتی..... لیکن اچانک یہ ہوا کہ روس نے افغانستان میں اپنی فوجیں داخل کر دیں' روٹھا ہوا امریکہ اور بے اعتنائی میں مبتلا مغربی یورپ' مشرق وسطی اور جاپان جیسے ممالک فوراً ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ اگلے چند سالوں میں امریکہ بہادر' عالمی بنک' بین الاقوامی مالیاتی فنڈ' جاپان' سعودی عرب اور کویت نے ہمیں اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنی آسانی سے قرضے فراہم کئے کہ نہ صرف ملک کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی' بلکہ ایسی آسان شرائط پر شاید ہی کبھی کسی کو قرضے ملے

جونیجو حکومت جسے اقتدار منتقل نہیں کیا گیا بلکہ اقتدار میں محض شریک کیا گیا ہے' معاشی معاملات میں اس سے کہیں زیادہ کمزور اور انحصار کرنے والی حکومت ہے جتنی کہ وہ سیاسی معاملات میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی اقتصادی پالیسیوں پر آج بھی وہ لوگ اثر انداز ہو رہے ہیں جنہوں نے ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک بہترین وسائل کو بدترین طریقے سے ضائع کیا۔

ہوں گے۔ غلام اسحٰق خاں کی قیادت میں منصوبہ بندی کرنے والے حکمرانوں نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ سے حاصل کئے گئے ۱۷ بلین ڈالر

امریکہ سے وسیع تر امدادی پروگرام کے تحت حاصل ہونے والے ۲۰۰۲ء۳ر بلین ڈالر اور دوسرے ملکوں سے حاصل ہونے والی امدادی رقوم ایک آسان اور پُر سہولت راستہ اختیار کرنے پر صرف کی جانے لگیں۔ وفاقی اخراجات بڑھائے گئے' سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور مراعات میں اضافہ ہوا' نئے ڈویژن' اضلاع اور تحصیلیں وجود میں آئیں۔ سرکاری ملازموں کی تعداد حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ بڑھی اور یوں غیر ترقیاتی اخراجات سوا ارب روپے کے لگ بھگ ہوگئے۔ باخبر ذرائع کے مطابق ۸۹۔ ۱۹۸۸ء کے بجٹ میں یہ اخراجات ۱۳۸ر ارب روپے ہوں گے۔ اس میں دفاع کے لئے ۵ء۴۵ ارب' ایڈمنسٹریشن کے لئے ۵ء۱۴ر ارب' سبسیڈیز (مختلف اشیاء کی رعایتی قیمتوں) کے لئے ۵ء۸ر ارب' قرضوں کی ادائیگی کے لئے ۴ء۴۷ر ارب' بلدیاتی اداروں اور دوسری گرانٹس کے لئے ۸ر ارب اور مختلف سماجی و اقتصادی سروسز کے لئے ۵ء۳۴ر ارب روپے مختص ہوں گے۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ وزارت خزانہ کے اندازوں کے مطابق اگلے سال ۵ء۱۲۶ر ارب روپے کی آمدن متوقع ہے۔ اب ترقیاتی اخراجات کو تو ایک طرف رکھئے' خود غیر ترقیاتی اخراجات کے لئے مزید ساڑھے گیارہ ارب روپے کی ضرورت ہے اور یہی وہ اصل سوال ہے جو اس وقت مسلم لیگی حکومت کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ جس کے لئے صلاح ومشورے ہو رہے ہیں' کمیٹیاں بن رہی ہیں اور نسخے تجویز کئے جا رہے ہیں۔ وزارت خزانہ کے ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق حکومت آئندہ مالی سال کے دوران ایک ارب روپے رعایتوں میں کمی اور ٹیکس کی وصولی کا نظام بہتر بنا کر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ۵ء۶ر ارب روپے تمام درآمدات پر سیلز ٹیکس بڑھا کر وصول کئے جائیں گے' جبکہ ۴ر ارب روپے ملک میں مختلف قسم کی صنعتی پیداوار پر ساڑھے بارہ فیصد کی شرح سے سیلز ٹیکس عائد کر کے حاصل کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ ۵۰ر کروڑ روپے تعلیمی اداروں میں پرائمری سے اوپر کی سطح پر تعلیمی فیس میں اضافے سے حاصل ہوں گے' ۵۰ر کروڑ روپے آبپاشی میں رعایتیں ختم کرنے سے بچیں گے اور ایک ارب روپے کی دوسری رعایتیں (سبسیڈیز) ختم کی جائیں گی۔ عالمی بنک اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کا اصرار ہے کہ ملک میں بجلی' گیس اور پٹرول کی قیمتیں بڑھائی جائیں اور ریل کے کرایوں میں اضافہ کیا جائے۔ نئے سال کا بجٹ اگر یہ اضافے اپنے ساتھ نہیں لائے گا تو کچھ عرصے کے بعد یہ قیمتیں بڑھا دی جائیں گی کہ ہم اقتصادی اعتبار سے انحصار کی جس راہ پر چل نکلے ہیں' اس میں ان اداروں کا دباؤ قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ٹیکسوں کے علاوہ دوسرے شعبوں سے حکومت کو اگلے سال ۲۵ر ارب روپے کی آمدن متوقع ہے' یہ پچھلے سال کے مقابلے میں اس لئے کم ہوگی کہ اطلاعات کے مطابق ٹیلی فون اور ٹیلی کمیونیکیشنز کے نظام کو سرکاری کنٹرول سے آزاد کر کے ایک خود مختار کارپوریشن کی صورت دی جا رہی ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ۸۹۔ ۱۹۸۸ء کے دوران حکومت ۴۴ء۳ ارب روپے کے قرضے لینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس میں سے ۵۲ء۷ر ارب بنکوں سے اور ۹۲ء۲۹ر ارب دوسرے ذرائع سے حاصل کئے جائیں گے۔ مرکزی حکومت خود مختار کارپوریشنوں سے کہے گی کہ وہ خود بھی ایک ارب کے وسائل پیدا کریں۔ اس طرح اندرونی ذرائع سے ۴۴ء۳۸ر ارب روپے کے وسائل پیدا کرنے کے بعد ۵ء۱۱ر ارب روپے کا خسارہ پورا ہو سکے گا اور ترقیاتی اخراجات کے لئے ۲۷ر ارب روپے کی رقم فراہم کی جا سکے گی۔ اگلے بارہ ماہ میں حکومت بیرونِ ملک سے ۵ء۱۵ر ارب روپے کے قرضے حاصل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس طرح کل ۵ء۴۲ر ارب روپے کے ترقیاتی منصوبے بنائے جا سکیں گے۔

ان اعداد و شمار کا احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد ماہرین یہ رائے دیتے ہیں کہ غیر ترقیاتی اخراجات اس سے کہیں زیادہ ہوں گے' جتنے کہ بجٹ میں دکھائے جا رہے ہیں (دوسری مدوں کے علاوہ گزشتہ سالوں میں لاء اینڈ آرڈر کے ضمن میں

اٹھنے والے اخراجات میں غیر معمولی اضافہ ہوا' جہاں سوال صرف تنخواہوں کا نہیں ہوتا) اندازہ ہے کہ اس طرح حکومت کو اس ضمن میں مزید دس سے لے کر اٹھارہ ارب روپے تک کی ضرورت ہوگی۔ اس طرح بجٹ کا کل خسارہ ستر ارب روپے تک جا پہنچے گا۔ اس میں ۷۶ء۵ ارب روپے کے بنکوں کے قرضے' ۳۰ ارب روپے کے دوسرے قرضوں اور ۱۵ء۵ روپے کے غیر ملکی قرضوں کے باوجود ۲۰ ارب کا خسارہ موجود رہے گا جو پورے بجٹ کا تقریباً دس فیصد ہوگا اور یہ بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہوگا جس کی پاکستان کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ خسارہ کہاں سے پورا ہوگا؟ ماہرین کہتے ہیں کہ نئے نوٹ چھاپنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا اور افراطِ زر میں جو اس وقت ۵ء۱ فیصد کی شرح کو پہنچ گیا ہے' اگلے سال غیر معمولی اضافے کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سے لامحالہ قیمتیں بڑھیں گی اور عام آدمی کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔

پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے' قابو سے باہر ہو جائے گی۔ اس پس منظر میں حکومت ایک ایسی جگہ آن کھڑی ہے' جہاں ایک کے سوا سارے راستے تنگ ہیں اور یہ زرعی ٹیکس کے نفاذ کا راستہ ہے۔ کچھ عرصہ قبل اس سلسلے میں ایک مغربی یونیورسٹی کے ماہرین کی مدد سے اس موضوع پر مفصل رپورٹ مرتب کرائی گئی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق شہری آبادی پر جو ٹیکس لگائے جا چکے ہیں' اگر اتنے ہی ٹیکس زراعت پر لگائے جائیں تو نہری علاقے میں بہتر قسم کی زمین کے ایک ایکڑ پر ۲۱۳۰ روپے ٹیکس عائد کرنا ہوگا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر چھوٹے کاشتکاروں کو ٹیکس میں چھوٹ دینے کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ساڑھے بارہ ایکڑ اراضی تک کو مستثنیٰ قرار دے دیا جائے' تب بھی حکومت کو کروڑوں نہیں' اربوں روپے کی آمدنی ہوگی۔ ماہرین اس نکتے پر بھی زور دیتے ہیں کہ اگر صنعتوں کو فروغ دینا مقصود ہو تو ان پر ایک حد سے زیادہ ٹیکس نہیں لگائے

نئے نوٹ چھاپنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے گا

عجب نہیں کہ ملک کی سیاسی زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوں۔ جونیجو حکومت نے اب تک اخبارات اور سیاسی جماعتوں کو آزادیاں دے کر ملک میں کشیدگی کم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اگر اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہولناک حد تک اضافہ ہوا تو کیا یہ کمزور حکومت اپنا دفاع کر سکے گی؟

زرعی ٹیکس کا مسئلہ

اس صورت حال میں گزشتہ کئی سال سے ماہرین اس سوال پر غور کر رہے ہیں کہ کیا زرعی ٹیکس اس مسئلے کا علاج نہیں ہے۔ ایک ترقی پذیر معیشت میں نئے ٹیکس لگانا ایک مجبوری ہے۔ اس وقت قومی زندگی میں کوئی ایسا شعبہ موجود نہیں' جہاں آسانی سے نئے ٹیکس لگائے جا سکیں۔ ملک کی صنعت' درآمدی اشیاء اور شہری آبادی اب مزید ٹیکسوں کی متحمل نہیں۔ مختلف جائزوں اور مطالعوں سے یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ اگر کسٹم ڈیوٹی میں اضافہ کیا گیا تو سمگلنگ جو

جاتے۔ جاپان' جنوبی کوریا' تائیوان اور سنگاپور کی صنعتی ترقی میں اس عنصر کا بڑا دخل ہے۔ پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری حد سے زیادہ ٹیکسوں کے نتیجے میں تباہی کی ایک مثال ہے۔ ماہرین کو یقین ہے کہ اس صورت حال میں بعض زرعی ٹیکس نافذ کرنا ہوں گے۔

حکومت کی مشکل یہ ہے کہ وہ ان جاگیرداروں کو ناخوش کرنا نہیں چاہتی جو اقتدار کے کھیل میں ہمیشہ مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ملک کی قومی اسمبلی میں زرعی ٹیکس ہی ایک ایسا نکتہ ہے' جس پر حکومت اور اپوزیشن کے جاگیردار عناصر میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ ۸۶ - ۱۹۸۵ء کے بجٹ پر بحث کے مرحلے میں ڈاکٹر محبوب الحق نے جو اس وقت وزارت خزانہ کے منصب پر فائز تھے' زرعی ٹیکس کی حمایت کی تو انہیں بیگم عابدہ حسین سمیت اپوزیشن کے ارکان کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک

اپوزیشن پارٹی کے وائس چیئرمین نے ' جو اب مسلم لیگ میں شامل ہو چکے ہیں ' قومی اسمبلی کے ایوان میں کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا کہ اگر زرعی ٹیکس نافذ کیا گیا تو ملک میں غدر برپا ہو جائے گا۔ پنجاب اسمبلی چند ماہ قبل اس موضوع پر ایک قرارداد منظور کر چکی ہے ' جس میں کہا گیا ہے کہ یہ صوبوں کا مسئلہ ہے اور مرکز کو زرعی ٹیکس کے نفاذ کا کوئی اختیار نہیں۔

اگرچہ اس پس منظر میں زرعی ٹیکس کا نفاذ بہت مشکل دکھائی دیتا ہے تاہم وزارت خزانہ کے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس سلسلے میں کئی متبادل تجاویز زیر غور ہیں۔ ان ذرائع کے مطابق زرعی آمدنی پر ٹیکس نافذ کرنے کے لئے جس جرأت اور عوامی تائید کی ضرورت ہے ' اس سے تو یہ حکومت محروم ہے لیکن ایک قسم کا لینڈ ٹیکس نافذ کیا جاسکتا ہے جس سے ۵۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ آمدن متوقع ہے۔

اقتصادی ماہرین کہتے ہیں کہ جونیجو حکومت ' جسے اقتدار نقل نہیں کیا گیا بلکہ اقتدار میں محض شریک کیا گیا ہے ' معاشی معاملات میں اس سے کہیں زیادہ کمزور اور انحصار کرنے والی حکومت ہے جتنی کہ وہ سیاسی معاملات میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی اقتصادی پالیسیوں پر آج بھی وہ لوگ اثرانداز ہو رہے ہیں جنھوں نے ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک بہترین وسائل کو بدترین طریقے سے ضائع کیا۔ جن کے دور میں باڑہ مارکیٹوں کے نام سے پورے ملک میں ایک متوازی سیاہ معیشت (بلیک اکانومی) وجود میں آئی اور پاکستان پر بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے دباؤ میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ ان لوگوں کے ہوتے ہوئے جاگیردار ارکان اسمبلی پر انحصار کرنے والی مسلم لیگی حکومت آزاد اقتصادی پالیسیاں اختیار نہیں کر سکتی۔

حکومت اقتصادی معاملات میں بتدریج بے دست و پا ہوتی جارہی ہے۔ وہ عالمی اداروں کے سامنے بے بس ہے ' جاگیرداروں کے سامنے بے بس ہے ' ایک حد تک افسر شاہی کے سامنے بے بس ہے اور کمزور ہونے کی وجہ سے نہ تو نئے ٹیکس عائد کر سکتی ہے اور نہ بنیادی تبدیلیاں لاسکتی ہے۔ اس صورت حال میں یہ معاملہ سیاسی اصلاحات کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور سیاسی میدان میں بنیادی تبدیلیوں یعنی فوج اور افسر شاہی سے عوام کو اقتدار منتقل کئے بغیر معیشت کو صحت مند راستے پر استوار کرنے کا خواب نہیں دیکھا جاسکتا۔ موجودہ تناظر میں جب غیر ترقیاتی اخراجات میں اضافہ ناگزیر دکھائی دیتا ہے اور بھارت اور روس ایسے ملکوں کی ہمسائیگی کے سبب آپ وفاقی بجٹ میں تخفیف کرنے کے لئے آزاد نہیں ہیں ' نئے وسائل کی تلاش اور بنیادی تبدیلیوں کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

آج کی دنیا میں ایک ملک کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لئے روپے ' انرجی اور ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس وافر مقدار میں انرجی موجود ہے اور نہ وسائل لیکن ہمارے پاس ایک ایسا وسیلہ موجود ہے جو ان دونوں کی تلافی کر سکتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جس کی زمین زرخیز ہے اور جس میں دریا بہہ رہے ہیں ' دس کروڑ آبادی کے ایسے انسانی وسائل موجود ہیں ' جنہیں منظم کیا جائے تو اقتصادی زندگی میں انقلاب آسکتا ہے۔ یہ لوگ محنتی ہیں اور سیکھنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی ہنرمندی کی تعریف کی جاتی ہے لیکن ملک کے اندر اس وسیلے سے استفادہ کرنے کی کبھی بھی لمبی مدت کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ ہمیں اپنی زراعت اور صنعتوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ ماہرین کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہم عہد جدید کی ٹیکنالوجی کو اپنی اقتصادی زندگی میں جذب نہیں کر سکتے۔

یہ کام کون کرے گا؟ فوجیوں ' افسروں اور جاگیرداروں کی حکومت یہ کام نہیں کر سکتی۔ وہ لوگ جو مفاہمت اور مصالحت کی پیداوار ہیں ' معاشرے میں انقلاب انگیز تبدیلیوں کی بنیاد کیسے رکھ سکتے ہیں اس کے لئے سیاسی جماعتوں ہی کو آگے بڑھنا ہو گا۔ بدقسمتی سے سیاسی پارٹیوں نے اس میدان کو سب سے زیادہ نظرانداز کیا ہے جو ان کی سب سے زیادہ توجہ کا محتاج تھا۔ ملک کے سامنے اس کے سوا کوئی راہ نہیں کہ سیاسی جماعتیں اقتصادی ماہرین کی مدد سے اپنے معاشی منشور مرتب کریں۔ وہ رائے عامہ کو ملک کے بنیادی معاشی حقائق کی تعلیم دیں اور بتائیں کہ اقتدار ملنے کی صورت میں وہ کونسی بنیادی

(باقی صفحہ ۵۷ پر)

معدے کی تیزابیت ، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے
لیکوڈ
گیسٹوفل
معدے کی تکالیف میں آرام کے لیے
گیسٹوفل ہمیشہ گھر میں رکھیے
Gesto fil
تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD - 6

ایک رپورتاژ

قافلۂ سخت جاں

تنظیم اسلامی پاکستان کے تیرھویں سالانہ اجتماع کے تاثرات
بہاولنگر کے نواحی علاقے میں کاروانِ انقلابِ اسلامی کا پڑاؤ۔

قاضی عبدالقادر - کراچی

عشقِ بلاخیز کے اس قافلۂ سخت جاں کو ابھی نجانے کتنے جاں گسل مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔ ہاں اپنے نفس سے مجاہدہ اور اپنے گھر، خاندان سے کشاکش تو شروع ہو ہی چکی ہے اور بہت سے خوش بخت اس کی بلاخیزی کے مقابلے میں چٹان بن کر دکھا بھی چکے ہیں لیکن اصل سخت جانی تو اس قافلے والوں کی یہ ہے کہ جماعت سازی کے دستوری اور جمہوری طرز کو چھوڑ کر، جو رسمِ دنیا ہے، انہوں نے بیعت کی سنّت کو زندہ کیا اور بیعت بھی ارشاد و سلوک کی نہیں، سمع وطاعت فی المعروف کی۔ پھر بیعت کرنے والے جاہل دیہاتی نہیں، ان میں فکر و نظر کی اعلیٰ صلاحیتیں اور مروّجہ تعلیم کی اونچی سے اونچی ڈگریاں رکھنے والے بھی موجود ہیں۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رُکی۔ بہاولپور کا اسٹیشن آگیا تھا۔ ہم چھ رفقاء سلیپر کمپارٹمنٹ میں بھائی عبدالخالق کی امامت میں نماز فجر ادا کر رہے تھے۔ سامان ہم نے پہلے ہی باندھ لیا تھا۔ سلام پھیرتے ہی جلدی میں سامان لے کر پلیٹ فارم پر اترے۔ جہاں قیم تنظیم اسلامی میاں محمد نعیم مع چند رفقاء کے دیدہ و دل فرش راہ کئے ہمارے استقبال کو موجود تھے۔ ہمارے علاوہ تیز گام کی دوسری بوگیوں میں مزید رفقاء تھے۔ محترم امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، امیر تنظیم اسلامی سندھ سید سراج الحق اور امیر تنظیم اسلامی حیدر آباد عبدالقادر صاحب بھی اسی گاڑی سے اترے۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کراچی، میرپور خاص اور حیدر آباد کا دورہ کر کے حیدر آباد سے اسی گاڑی میں سوار ہوئے تھے جب کہ ہم لوگ کراچی سے آرہے تھے۔ کراچی سے دوسرا اور بڑا قافلہ بہاؤالدین ذکریا ایکسپریس سے آرہا تھا۔

یہ اپریل کی یکم تاریخ اور جمعہ کا مبارک دن تھا۔ بہاولپور سے کوئی ایک سو میل کے فاصلہ پر چشتیاں اور بہاولنگر کے درمیان موضع طارق آباد میں آج سے تنظیم اسلامی پاکستان کا سہ روزہ تیرھواں (١٣) سالانہ اجتماع شروع ہو رہا تھا۔ ملک کے کونے کونے سے تنظیم اسلامی کے جیالوں کے قافلے سوئے طارق آباد رواں دواں تھے۔ اس سے قبل اکثر سالانہ اجتماعات ماڈل ٹاؤن لاہور میں واقع قرآن اکیڈمی کی عمارت میں منعقد ہوئے، جس کی تنگیٔ داماں کو وسیع کرنے کے لئے سو سو جتن کرنے پڑتے تھے، لیکن اس بار اسے شہری ہنگاموں سے دور صحرا کی کھلی فضاؤں میں منعقد کرنے کا نیا تجربہ کیا جا رہا تھا۔

تنظیم کے کارکنوں نے ملتان اور بہاولپور کے ریلوے اسٹیشنوں پر کیمپ قائم کر دیئے تھے جہاں سے رفقاء کو بذریعہ بس اور ویگن طارق آباد بھیجا جا رہا تھا۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جن کے چہرے پر کئی روز کے مسلسل سفر کی وجہ سے نقاہت کے باوجود ایک شادابی سی کھیل رہی تھی، مع چند رفقاء کے طارق آباد روانہ ہو گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم لوگوں

کے لئے بھی ویگن کا انتظام ہوا اور ہم میاں محمد نعیم کی پُر تکلف چائے پی کر، جس میں ان کی محبت اور خلوص کی مٹھاس بھی تھی، عازم طارق آباد ہوئے۔

طارق آباد کیا تھا، چند کچے مکانوں کا ایک گاؤں بلکہ محض ایک ڈیرہ۔ جہاں ملتان میں مقیم ہمارے محترم و بزرگ رفیق کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر غلام حیدر ترین کی زرعی اراضی تھی۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ ایک چھوٹے سے جگہ پر

> **ایک وضاحت**
>
> یہ بات اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ "تنظیم اسلامی" نہ عام معنوں میں دینی یا سیاسی جماعت ہے نہ محدود مفہوم میں مذہبی تنظیم بلکہ ایک ہمہ گیر دینی جماعت ہے لہٰذا اگرچہ یہ خیال کرنا تو غلط ہی نہیں عظیم گمراہی ہوگی کہ یہ "الجماعۃ" کے حکم میں ہے جس میں شریعت اسلام میں داخلے اور جس سے علیحدگی کفر کے مترادف ہے اور جس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّار" یعنی جو اس سے علیحدہ ہوا وہ علیحدہ ہو کر جہنم میں جھونک دیا جائے گا ——— تاہم اس کے نظم کو عام معاشرتی و ثقافتی انجمنوں یا طبقاتی و پیشہ ورانہ تنظیموں یا سیاسی و قومی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کی پابندی پر بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہاں "سمع و طاعت" کا خالص اسلامی اور خالصۃً دینی اصول کارفرما ہے گا۔ یہ بات بار بار اور بتکرار اس غرض کی جا رہی ہے کہ ہمارے یہاں بعض مخلص دینی جماعتیں کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس شدید غلطی بلکہ عظیم گمراہی میں مبتلا ہو جاتی ہیں کہ وہ "الجماعۃ" کے حکم میں ہیں۔ اس طرح وہ امت کی وحدت کو سخت نقصان پہنچانے اور انتشار، تحزب اور تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بن جاتی ہیں۔
>
> ہم پورے شعور کے ساتھ اور صمیم قلب سے دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ تنظیم اسلامی کو اس سے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

رہائش وغیرہ کیلئے کچھ تعمیرات کی ہوئی تھیں جہاں وہ اپنی کاشت کاری کی نگرانی کے لئے آ کر ٹھہرا کرتے ہیں۔

استقبالیہ پر کارکن بہت مصروف تھے۔ جگہ جگہ سے قافلے آ رہے تھے اور ہر ایک کو اپنا اندراج کرا کے بیج حاصل کرنا تھا۔ جس پر ہر رفیق کے نام اور مقام کے علاوہ رہائش گاہ پر اس کے بستر کیلئے نمبر الاٹ کیا گیا تھا۔ یہ بیج ہر ایک کو اپنے سینے پر آویزاں کرنا تھا۔ جس سے بیک نظر معلوم ہو جاتا کہ رفیق کا نام کیا ہے، کہاں سے تعلق ہے اور رہائش گاہ میں کہاں ٹھکانا ہے۔ کچھ اسٹیکر بھی دیئے جا رہے تھے جو ہر رفیق کو اپنے سامان کے ایک ایک نگ پر چپکانا تھا۔ اسٹیکر پر بھی رفیق کا نام مقام اور بستر کا نمبر درج تھا تاکہ سامان کی گمشدگی کی صورت میں متعلقہ رفیق کو پہنچایا جا سکے۔

بذریعہ ریل آنے والے رفقاء "مدرسہ" نامی اسٹیشن پر اترتے تھے جہاں سے اجتماع گاہ ریلوے لائن ہی کے کنارے کوئی دو کلومیٹر پر ہو گی۔ اجتماع کے پنڈال سے رہائش گاہ کا فاصلہ کوئی پانچ فرلانگ ہو گا۔ کھیتوں کے درمیان ایک چوڑی اور سیدھی پگڈنڈی انہیں ملاتی تھی۔ استقبالیہ کے ضروری اندراجات کے بعد رفقاء کو سامان کے ساتھ گاڑیوں میں رہائش گاہ پر پہنچایا جا رہا تھا۔ بعض رفقاء اپنا سامان کاندھوں پر اٹھائے تبلیغی بھائیوں کی طرح رہائش گاہ کی جانب رواں دواں تھے۔ ہم نے سامان کے ساتھ یہ فاصلہ ایک ٹریکٹر پر طے کیا۔ کار، بس، ریل گاڑی، ہوائی جہاز اور بحری جہاز میں تو بہت بیٹھے ہیں لیکن ٹریکٹر پر بیٹھنے کا زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا۔

رہائش گاہ کیا تھی۔ دو طویل متوازی بیرکیں تھیں جنہیں ہمارے کرنل صاحب نے غالباً پولٹری فارم کے لئے حال ہی میں بنایا تھا کیونکہ سوائے چھت کے چاروں طرف جالیاں ہی جالیاں لگی تھیں۔ اور اس کے افتتاح کا شرف بجائے مرغیوں اور مرغوں کے ہمیں حاصل ہوا تھا۔ یہ مرتبۂ بلند مُرغان نو گرفتار کے لئے تھا۔ انتظامات بہت عمدہ تھے۔ نیچے گھاس ڈال کر اوپر دریاں بچھادی گئی تھیں اور پورا فرش دیسی "فوم" کا ہو گیا۔ ہر ستون پر بستر نمبر درج تھے۔ دونوں بلاکوں کو (اے) اور (بی) کا نام دیا گیا۔ ستونوں کی لائن کا ایک نمبر ہوتا یعنی ایک دو تین وغیرہ۔ اور پھر ہر لائن میں بستروں کے نمبر ہوتے تھے۔ مجھے ۷/۴/ا۔ اے نمبر بستر الاٹ ہوا تھا۔ یعنی بلاک "اے" میں ستونوں کی لائن نمبر ایک کا بستر نمبر ۴۷۔ اپنی جگہ کا قبضہ حاصل کر کے سب سے پہلے ہم نے اپنا بستر بچھا دیا اور سامان کو ٹھکانے سے رکھا۔ رہائش گاہ کے ساتھ ہی ٹیوب ویل تھا جس میں سے پنجتنالی کی جوئے آب جاری تھی۔ اور یہیں سے وضو وغیرہ کرتے تھے۔ قریب ہی کثیر تعداد میں عارضی بیت الخلاء بنائے گئے تھے۔ مرکز سے سرکلر کی صورت میں رفقاء کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اپنے ساتھ بستر اور ضروری کپڑوں کے علاوہ، پلیٹ، چائے کی پیالی، گلاس اور لوٹا ضرور لائیں۔ لیکن یہاں بھی فاضل پلیٹوں اور لوٹوں وغیرہ کا

کچھ انتظام تھا جو "سرکاری" کہلائے جانے لگے۔

قافلے آرہے تھے اور ناشتہ کر رہے تھے۔ طعام گاہ کے ناظم اور ان کے ساتھی مستعدی سے کام کر رہے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ ایک دوسرے سے نئی نویلی ملاقاتیں تھیں یا پھر تجدیدِ ملاقات۔ آپس میں تعارف ہو رہا تھا۔ بذریعہ سڑک' ریل اور ہوائی جہاز (براہ ملتان و بہاولپور) سے آنے والے تمام رفقاء اور احباب کی مجموعی تعداد تقریباً سات سو تھی جو چار اپریل کی دوپہر یعنی اجتماع کے اختتام تک یہاں قیام پذیر رہے۔ لاہور کے تقریباً دو صد رفقاء اور احباب پانچ بسوں کے ذریعہ یہاں پہنچے۔ یہ بسیں چار روز تک یہیں کھڑی رہیں اور انہی سے وہ لوگ واپس گئے۔ ایک سو کے قریب حضرات کراچی سے آئے۔ اور باقی چار صد رفقاء واحباب ملک کے مختلف شہروں یعنی حیدر آباد' سکھر' دادو' کوئٹہ' رحیم یار خان' ملتان' وہاڑی' بورے والا' بہاولپور' شجاع آباد' فیصل آباد' گوجرانوالہ' وزیر آباد' گجرات' راولپنڈی' اسلام آباد' پشاور' سوات اور دیگر متفرق مقامات سے تشریف لائے تھے۔ بیرون ملک سے اٹھارہ ساتھی شریک ہوئے جن میں امریکہ' برطانیہ' سعودی عرب' ابوظہبی اور ہندوستان سے آنے والے شامل ہیں ان کے علاوہ بہاولنگر' چشتیاں اور نواحی مقامات سے روزانہ تقریباً ڈیڑھ دو سو حضرات خطاب عام میں شریک ہوتے رہے۔

سالانہ اجتماع کا آغاز نماز جمعہ سے ہونا تھا۔ اجتماع گاہ چار دیواری کے اندر ایک بڑے پنڈال میں واقع ہے۔ اجتماع گاہ کے باہر استقبالیہ کیمپ' مکتبہ' قرآن کالج کا اسٹال فرسٹ ایڈ کا خیمہ لگائے گئے ہیں۔ ان میں متعین ہر کارکن اپنے کام میں معروف اور مگن ہے۔ نماز جمعہ کے فوراً بعد محترم امیر تنظیم

"ایک بندۂ مومن کا کام یہ ہے کہ اپنا سب کچھ راہِ حق میں لاکر ڈال دے' اپنی قوت وصلاحیت اپنی توانائیاں اپنا مال اور اپنی جان اس کام کے لئے وقف کر دے۔ اس میں کھپا دے تو جیسا کہ کہا گیا کہ "السعی مناو الاتمام من اللہ" کوشش کرنا ہمارے ذمہ ہے کسی کام کی تکمیل کر دینا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اس کام کا اتمام و تکمیل کو پہنچنا سراسر اللہ کے اِذن اور اس کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ اور اللہ کا اذن اور فیصلہ اس کی حکمت کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لئے ایک اجل معین کر رکھی ہے ہم نہیں جانتے کہ اس نے اپنے دین کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے غلبہ و اظہار کے دور ثانی کے لئے کون سا وقت مقرر فرمایا ہوا ہے۔ ہم کو نہیں معلوم کہ دینِ حق کے بالفعل قائم اور نافذ ہونے تک ابھی اللہ تعالیٰ کتنے قافلوں کو اٹھائے' جو کچھ دور تک چلیں' چند کٹھن منازل طے کریں اور پھر تھک ہار کر رہ جائیں۔ پھر کوئی دوسرا قافلہ ایک عزم نو کے ساتھ مرتب ہو اور آگے بڑھے اور اس جدوجہد کو کسی خاص حد تک لے جائے ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ البتہ ہم یہ جان گئے ہیں اور یہ جان لینا ہی ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مسؤل ہیں عزم مصمم کرنے پر اور ہم مسؤل ہیں سعی وجہد پر' ہم مسؤل ہیں اپنی سی کر گزرنے پر۔ اس راہ کے کسی ایک مرحلے کی تکمیل بھی ہمارے بس میں نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق اور اس کی حکمت پر منحصر ہے"۔

امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد کے تاسیسی اجتماع۔ مارچ ۱۹۷۵...... میں افتتاحی خطاب سے

اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا خطاب عام تھا جس کا عنوان تھا "پاکستان میں اسلامی انقلاب 'کیا؟ کیوں؟ اور کیسے"۔ یہ خطاب ڈھائی بجے شروع ہونا تھا لیکن ادھر ایسا ہوا کہ بہاولنگر کے کچھ احباب نے محترم ڈاکٹر صاحب سے وہاں کی جامع مسجد میں نماز جمعہ سے قبل خطاب کی درخواست کی جو موصوف نے خیالِ خاطرِ احباب سے منظور فرمالی۔ چنانچہ وہاں سے واپسی میں کچھ تاخیر ہو گئی اور یوں یہ خطاب کوئی ساڑھے تین بجے شروع ہو سکا کچھ حضرات جو نواحی علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ انتظار کر کے چلے گئے محترم ڈاکٹر صاحب کو اس کا شدید احساس ہوا اور موصوف نے اس کی بہت معذرت کی۔

لاہور سے جو احباب پانچ بسوں میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے اپنی بسوں کے استعمال کی یہ شکل نکالی کہ خطاب عام سے قبل دو بسیں چشتیاں اور تین بسیں بہاولنگر بھیج دی جاتی تھیں۔ جہاں بس اڈہ پر بینر لگادیئے گئے تھے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطاب بمقام طارق آباد کیلئے فلاں وقت یہاں سے مفت بسیں روانہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ لوگ وہاں پہنچ جاتے اور تینوں دن اسطرح بسیں بھر بھر کر آتی رہیں۔ خطاب کے بعد یہی بسیں انہیں واپس بہاولنگر اور چشتیاں پہنچاتی رہیں۔ تنظیم اسلامی کے سالانہ اجتماع اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خطاب عام کے پوسٹر ملک کے دیگر شہروں کے علاوہ بہاولپور ڈویژن کے تمام شہروں اور قصبات میں اور ضلع ساہیوال اور ضلع ملتان میں کثرت سے چسپاں کئے گئے تھے۔ کوئی شہر' کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں ان سے خالی نہ تھا۔

جمعہ کی نماز سے قبل کھانا کھایا۔ دو بجے جمعہ کی نماز ہوئی جو چودھری رحمت اللہ بُٹر نے پڑھائی۔ ساڑھے تین بجے محترم ڈاکٹر صاحب بہاولنگر سے تشریف لائے۔ اس دوران کیسٹ سے قرأت نشر ہوتی رہی۔ ساڑھے تین بجے محترم ڈاکٹر صاحب کا خطاب شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ترتیب کی رو سے مجھے آج اپنے سہ روزہ خطابِ عام کے پہلے حصہ یعنی اسلامی انقلاب کیا؟ پر تقریر کرنی تھی لیکن اس کی بجائے ترتیب بدل کر میں آج "اسلامی انقلاب کیسے؟" پر تقریر کروں گا۔ "اسلامی انقلاب کیا؟" پر کل اور "اسلامی انقلاب کیوں؟" پر پرسوں تقریر ہو گی۔ انشاء اللہ۔ "اسلامی انقلاب کیسے؟" کی وضاحت فرماتے ہوئے محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ:

اس کے لئے ایک مضبوط انقلابی جماعت کا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک ایسی جماعت جو پورے طور پر نظم و ضبط کی عادی اور ایک امیر کے اشارے پر بڑے سے بڑا قدم اٹھانے کی خوگر ہو۔ ڈھیلی ڈھالی انجمنوں اور جماعتوں کے ذریعے یہ بھاری پتھر نہیں اٹھایا جاسکتا۔ سورۃ الفتح کے آخری رکوع کے حوالے سے اس انقلابی جماعت کے نمایاں اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے امیر محترم نے واضح کیا کہ یہ جماعت جو۔ "ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن" کی سی شان کی حامل ہو' ایسے افراد پر مشتمل ہونی چاہئے جو انفرادی تزکئے کے مراحل سے گزر چکے ہوں اور اس دین اسلام کو پہلے اپنے وجود پر پوری طرح نافذ کر چکے ہوں' جسے پوری دنیا میں

سیرتِ مطہرہ سے اخذ کردہ
مراحل انقلاب اسلامی:
دعوت، تنظیم، تربیت
صبرِ محض، اقدام اور تصادم

غالب کرنے کے ارادے سے انہوں نے انقلابی جماعت میں شمولیت اختیار کی ہے۔ اس کے بغیر غلبہ اسلام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ انقلابی جدوجہد کے مراحل کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ سیرت مطہرہ کے مطالعہ سے اسلامی انقلابی جدوجہد کے چھ مراحل سامنے آتے ہیں۔ پہلا مرحلہ انقلابی نظریئے یعنی توحید کی دعوت و اشاعت کا ہے۔ دوسرا مرحلہ تنظیم کا ہے یعنی اس نظریئے کو قبول کرنے والوں کو ایک جماعتی نظم میں منسلک کرنا' تیسرے مرحلے کا عنوان ہے تربیت' یعنی جماعت کے شرکاء کی تربیت اور ان کا تزکیہ کرنا اور انہیں آئندہ کے مشکل مراحل کے لئے تیار کرنا' چوتھے

مرحلے کو "صبر محض" کا نام دیا گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ابتدا میں یہ انقلابی جدوجہد عدم تشدد کے اصول پر ہو گی۔ پوری مکی زندگی میں مسلمانوں کو ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ انقلابی جماعت کی زندگی میں یہ مرحلہ بہت اہم ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ اس وقت تک چلے گا جب تک اتنی قوت اور طاقت فراہم نہیں ہو جاتی کہ آگے بڑھ کر اقدام کا خطرہ مول لیا جا سکے۔ جب جماعت اتنی مضبوط ہو جائے اور اس کا حجم اتنا ہو جائے کہ باطل نظام سے ٹکر لی جا سکتی ہو تو پھر یہ انقلابی جدوجہد "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہو جائے گی۔ اس وقت نظام باطل کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ کر سانپ کو بل سے نکالا جائے گا جس کے نتیجے میں آخری اور چھٹا مرحلہ یعنی مسلح تصادم کا آغاز ہو جائے گا۔ حضورؐ کی زندگی میں اس مرحلے کا آغاز غزوۂ بدر کی صورت میں ہوا اور اس کے بعد چھ سال کے اندر اندر مکہ فتح ہو گیا' دین اسلام کو خطۂ عرب میں فیصلہ کن فتح حاصل ہو گئی۔ امیر محترم نے اس دور میں اسلامی انقلاب کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ موجودہ حالات میں جو بھی انقلابی جدوجہد کے لئے میدان میں آئے گا اسے مذکورہ بالا پانچ مراحل سے لامحالہ گزرنا ہو گا۔ اسلامی انقلاب کا واحد راستہ یہی ہے۔ البتہ چھٹے مرحلے یعنی مسلح تصادم کے معاملے میں جدید زمانے کے حالات کے پیش نظر کچھ فرق واقع ہو جائے گا۔ خصوصاً اسلامی معاشرے میں غلبہ اسلام کی جدوجہد میں ممکنہ حد تک مسلح تصادم کے مرحلے سے گریز کیا جائے گا۔ ان حالات میں قرآن و حدیث ہی کی ہدایات کے مطابق "نہی عن المنکر" کی بنیاد پر اقدام کیا جائے گا اور عدم تشدد پر کاربند رہتے ہوئے اور ہر ظلم و تعدی کو برداشت کرتے ہوئے یہ مرحلہ طے کیا جائے گا۔ ایران کی مثال کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ جس طرح وہاں نہتے عوام نے اپنی قربانیوں کے ذریعے ایک جابر کا تختہ الٹ دیا تھا' اسی طرح کسی بھی انقلابی جماعت کو اسلامی معاشرے میں رہتے ہوئے اپنی قربانیوں کے ذریعے اسلامی انقلاب لانا ہو گا۔ یہی راستہ ہے جو قرآن و حدیث کے مطالعے سے سمجھ میں آتا ہے۔

عصر کی نماز کے وقفے کے کچھ بعد محترم ڈاکٹر صاحب کی یہ تقریر ختم ہوئی۔ اعلان کیا گیا کہ مغرب سے قبل احباب رات کا کھانا تناول فرمالیں تاکہ بعد نماز مغرب رفقاء کا خصوصی سیشن شروع کیا جا سکے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ ہم کراچی والے جو رات کا کھانا نو بجے سے قبل کھانے کے عادی نہیں' شام ساڑھے پانچ بجے کیا کھائیں اور کیسے کھالیں جب کہ ابھی دو بجے دوپہر کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے۔ امیر محترم کی تقریر ہاضمہ کا چورن تو نہ تھی کہ تین گھنٹے میں کھانا ہضم ہو جاتا۔ بہرحال اس اندیشہ سے کہ رات کو اجتماع کے بعد پھر کچھ کھانے کو ملنے کا امکان نہ تھا' اسی وقت جو کچھ کھایا جا سکتا تھا نوش جاں کیا۔ اور اس وقت زہر مار کر کے کچھ کھا لینا بہتر ہی ہوا ورنہ رات بھر پیٹ میں چوہے دھما چوکڑی مچاتے اور آنتیں قل ھو اللہ پڑھتیں۔

بستیوں اور بازاروں سے دور اس جگہ اجتماع رکھنے کے بڑے فائدے ہوئے۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لوگوں کے طعام وغیرہ کے جو عام معمولات تھے وہ دگرگوں ہوئے اور شاید یہ بھی تربیت کا حصہ تھا۔ دور دور تک کوئی بستی نہ تھی جہاں کوئی شخص کوئی کھانے کی چیز خرید سکتا یا چائے ہی پی سکتا۔ قریب ترین جگہ دو کلو میٹر دور "مدرسہ" کا اسٹیشن تھا جہاں چائے نما کوئی چیز مل سکتی تھی۔ چنانچہ کراچی سے چائے کے چاہنے والے دو ایک احباب نے آنکھ بچا کر ایک آدھ بار وہاں جا کر چائے سے "تسکین قلب" حاصل بھی کی۔ لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ وہاں سے ایک کپ چائے پی کر جو واپس آئے تو تھکن سے مزید دو کپ کی طلب عود کر آئی۔ یوں پھر کسی کو وہاں جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اب "حکم حاکم مرگ مفاجات" والی کیفیت تھی۔ لاہور یا کراچی میں اجتماع ہوتا تو اس شہر کے لوگوں کی ایک خاصی تعداد جزوی شرکت ہوتی یعنی وقفوں میں اپنے گھر' دفتر یا کاروبار کے بھی کچھ چکر لگا لئے جاتے لیکن اب تو کچے دھاگے سے بندھے آئے تھے سرکار مرے' اب جائیں تو کہاں جائیں۔

مغرب کے بعد خصوصی سیشن شروع ہوا۔ یہ تعارفی نشست تھی۔ مختلف شہروں کے امراء نے اپنے ہاں سے آنے

والے رفقاء واحباب کی تعداد بتائی اور مختصر تعارف کرایا۔ یہ نشست رات گئے تک جاری رہی۔

۲ اپریل ہفتہ کے دن نمازِ فجر رہائش گاہ ہی پر ادا کی گئی ۔ بلاک اے اور بی کے درمیان جو جگہ تھی وہ نماز کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ شرکاء کی تعداد منتظمین کے اندازوں سے

تقی الدین نے مختصر درس دیا۔ فجر کی نماز کے بعد حسب پروگرام اسی جگہ پر ڈاکٹر عبدالسمیع نے منتخب نصاب حصہ دوم کا درس دیا۔ ناموں کے ساتھ "ڈاکٹر" کا اضافہ قارئین کو پریشان نہ کرے۔ امیر محترم ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ بعد میں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے امتیاز سے ایم۔ اے

"مجھے احساس ہے کہ تنظیم اسلامی کے قیام کا عزم کر کے ایک بہت بڑی ذمہ داری کا بوجھ میں نے اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھایا ہے "من آنم کہ من دانم" حقیقت یہ ہے کہ اگر محاسبہ اُخروی کا شدید احساس نہ ہوتا تو میں یہ ذمہ داری اٹھانے کے لئے ہر گز آمادہ نہ ہوتا۔ ادائیگی فرض کے احساس ہی نے دراصل مجھے یہ ذمہ داری اٹھانے پر آمادہ کیا ہے۔ میں اس بات کو متعدد بار واضح کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے مطالعے، علم اور میری عقل وفہم کی حد تک یہ طریق بالکل مصنوعی اور تصنع آمیز ہے کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ وہ لوگ جو میری دعوت کو قبول کر کے اس کام کو منظم طریقہ پر آگے بڑھانے کے آرزومند ہوں وہ ایک ہیت اجتماعیہ تشکیل دیں اور اس اجتماعیت کے لئے اپنا سربراہ منتخب کر لیں اور پھر دستور میں کوئی مدت مثلاً "تین سال یا پانچ سال" مقرر ہو جس کے بعد جماعت کی اکثریت کی آراء سے سربراہ کا انتخاب عمل میں لایا جایا کرے میرے نزدیک صحیح دینی و اسلامی تنظیم کی نہج اس سے بالکل مختلف ہے۔ ایسی تنظیم جس شخص کی دعوت پر ہیت اجتماعیہ اختیار کرتی ہے وہی شخص اس تنظیم کا فطری سربراہ ہوتا ہے۔ میرے اس خیال کی بنیاد سورہ صف کی آخری آیت کا یہ ٹکڑا ہے کہ "من انصاری الی اللہ" یہ بھی ہماری تنظیم کو دوسری دینی اسلامی جماعتوں کے مقابلے میں ایک بنیادی خصوصیت کا حامل بنادے گا"۔

"میں آپ سے اس کام میں تعاون کا، نصرت کا اور امداد و اعانت کا طلب گار ہوں اور ساتھ ہی باصرار آپ سے عرض کرتا ہوں کہ جو میرا ساتھ دے وہ اس بات کو بھی اپنی دینی ذمہ داری سمجھ کر دے کہ جہاں مجھے غلط ہوتا دیکھے، مجھے سیدھا کرنے کی کوشش کرے مجھے روکے، مجھے ٹوکے، مجھ سے لڑے، مجھ سے جھگڑے، میرا محاسبہ کرے اور کوئی رورعایت نہ کرے۔ یہ آپ کا حق ہی نہیں بلکہ آپ کا فرض ہو گا"۔

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کے تاسیسی اجتماع مارچ ۱۹۷۵ء میں افتتاحی خطاب سے۔

بہت زیادہ ہو گئی تھی چنانچہ وہ احباب جنہیں رہائش کے لئے مخصوص اے اور بی بلاک میں جگہ نہ مل سکی انہوں نے "اللہ کے گھر" میں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔

نمازِ فجر سے قبل امیر تنظیم اسلامی کراچی جناب ڈاکٹر

(اسلامیات) کیا۔ کچھ عرصہ ایلوپیتھی دواؤں سے لوگوں کا علاج کرتے تھے 'اب لگ بھگ بیس سال ہونے کو آئے کہ وہ شغل ترک کر کے دعوت رجوع الی القرآن کے کام میں ہمہ وقت معروف ہیں۔ قرآن مجید سے سینوں کے روگ دور

کرتے اور تنظیم اسلامی کے اس قافلے کے میرِ کارواں ہیں۔
ڈاکٹر تقی الدین نے جرمنی سے کیمیا میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا اور پھر پاکستان آ کر درسِ نظامی کی تکمیل کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسمیع بی۔ ڈی۔ ایس ہیں دانت جماتے اور اکھاڑتے ہیں۔
درس کے بعد ناشتہ کیا گیا اور اس کے بعد رفقاء کرام رہائش گاہ سے اجتماع گاہ روانہ ہو گئے۔ وہی پانچ فرلانگ کا فاصلہ۔ ٹولیوں میں پیدل رفقاء کی روانگی دیدنی تھی۔ آپس میں باتیں کرتے ہوئے' دل کی باتیں' تنظیم کی باتیں' بھائیوں کی باتیں' آئندہ کام کی باتیں پانچ فرلانگ گویا پلک جھپکتے گزر جاتے اور اجتماع گاہ آ جاتی۔ نماز ظہر تک رفقاء کی خصوصی نشست رہی۔ مختلف مقامات کے کام کی رپورٹیں سنائی جاتی رہیں۔ سندھ خصوصاً دادو سے آنے والے پرانے سندھی بھائیوں کا خصوصی تعارف کرایا گیا۔ پچھلے دنوں محترم ڈاکٹر صاحب سندھ کے اندرونی اضلاع کے دورہ پر تشریف لے گئے تھے جن میں دادو اور میہڑ جیسے مقامات بھی شامل تھے۔ جنے سندھ تحریک کے یہ مرکزی علاقے ہیں۔ ڈاکوؤں کی کمین گاہیں بھی انہی علاقوں میں ہیں۔ تحریک کے لحاظ سے یہ علاقے بنجر سمجھے جاتے تھے جہاں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب کو یہاں کے دورہ کے درمیان خوشگوار حیرت انگیز تجربات ہوئے۔ یہاں نہ صرف موصوف کے دروس و تقاریر میں لوگوں نے اچھی خاصی بڑی تعداد میں شرکت کی بلکہ کچھ بھائی ایسے بھی نکل آئے جنہوں نے محترم ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے دینِ حق کے غلبہ کی جدوجہد کے لئے کمر ہمت کس لی۔ گویا۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اور یہ نمی انتقامی عمل اور نعرہ بازی کی سیاست سے نہیں بلکہ پتہ ماری کے کام اور قرآنی انقلابی عمل ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اس وقت پورے اجتماع پر ایک گھمبیر خاموشی طاری تھی۔ تمام رفقاء کے چہرے تمتمار ہے تھے۔ اور اس بات کی شہادت دے رہے تھے کہ ان کے دلوں میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے ہیں۔ جن کو وہ ضبط کئے بیٹھے ہیں۔ تعارف کی تکمیل کے بعد داعئ عمومی نے عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی کی ایک ایک شق کو پڑھنا شروع کیا اور تمام رفقاء اس کو دہراتے رہے۔ اس موقع پر اکثر رفقاء کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر تھیں اکثر کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ اللہ کے بندے رضائے الٰہی کے لئے دعوت تجدید ایمان توبہ اور تجدیدِ عہد کے قافلہ کے رفیق بن رہے تھے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

(تاسیسی اجتماع کے آخری اجلاس کی کیفیات کی ایک جھلک)

قدیم سندھ کے یہ سپوت اپنا تعارف کیا کرا رہے تھے اپنی کھٹ مٹھی اردو سے رس گھول رہے تھے مٹھی بھر اسلام کے یہ سپاہی جنہوں نے اپنا مال و متاع اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتیں یہاں تک کہ اپنی جان بھی اسلام کی سربلندی کیلئے قربان کرنے کا عہد کیا ہے' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان ہی کے ذریعہ سندھ کے قدیم دیہی علاقوں میں دین کیلئے ایک نئی لہر دوڑا دے۔ اور سندھ پھر سے ایک نیا باب الاسلام بن جائے۔ ہمارے یہ پرانے سندھی بھائی اپنا تعارف کرا رہے تھے اپنے عزائم کا اظہار کر رہے تھے اور ہماری نم آنکھوں اور لرزاں لبوں سے یہ دعا نکل رہی تھی۔

ضمیرِ لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّہ ذرّہ کو شہیدِ جستجو کر دے

اس سیشن کے بعد نمازِ ظہر اور پھر قیام گاہوں کی طرف چپ راست، چپ راست۔ جاتے ہی دسترخوانوں پر لگا کھانا تیار ملتا تھا۔ طعام گاہ کے ناظم لاہور سے ہمارے نہایت فعال رفیق میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد تھے جو نہایت درویش صفت انسان ہیں، اندر سے بھی اور باہر بھی۔ ۔ ۔ یقین نہیں آتا کہ چند ماہ پہلے تک وہ میجری وردی پہنتے تھے۔ انہوں نے انتہائی نظم و ضبط کے ساتھ کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ صبح سے رات تک وہ اس کام میں لگے رہتے۔ ذرا بھی تھکن کے آثار نہیں۔ آرام کرتے بھی ہیں یا نہیں یا کہاں کرتے ہیں کسی کو معلوم نہیں۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا۔

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

کھانے کا انتظام دو شفٹوں میں کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ اگر "اے" بلاک کے لوگوں کو کھانا پہلے ملتا تو دوسری بار "بی" بلاک والوں کو پہلی بار۔ کسی کی حق تلفی نہیں۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں۔

کھانے کے بعد اعلان ہوا کہ جو لوگ گنّے کھانا یا چوسنا چاہتے ہیں وہ رہائشی بلاکوں کے پیچھے چلے جائیں۔ دیکھا کہ کرنل صاحب نے ایک بڑی ٹرالی میں گنّوں کا انتظام کیا تھا۔ اب رفقاء ہیں اور ہاتھوں میں گنے کے ہتھیار۔ چالیس پچاس قدم دور نہر بہتی ہے۔ بہت سے رفقاء گنے لے کر وہاں پہنچ گئے۔ ساتھیوں کی رفاقت، نہر کا کنارہ، گنے اور گپ شپ۔ ایک عجیب دل نواز منظر تھا۔

ظہر تا عصر کھانے اور آرام کا وقفہ تھا۔ عصر کے بعد امیر محترم۔ کا "اسلامی انقلاب کیا؟" کے موضوع پر عام خطاب تھا۔ حسب معمول چشتیاں اور بہاولنگر سے بسیں بھر بھر کر آئیں۔ عصر کی نماز اجتماع گاہ میں ادا کی گئی۔ امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

اگرچہ "اسلامی انقلاب" کی اصطلاح دور جدید کی اصطلاح ہے اور قرآن و حدیث میں ان معنوں میں اس لفظ کا استعمال ہمیں نظر نہیں آتا، جن میں یہ آجکل مستعمل ہے تاہم چونکہ اسی مفہوم کی حامل کچھ دیگر اصطلاحات قرآن و حدیث میں مل جاتی ہیں لہٰذا ان دنوں ابلاغ عامہ کے پیش نظر اگر اسلامی انقلاب کی اصطلاح کو اختیار کر لیا جائے تو اس میں کوئی بڑی قباحت نہیں ہے۔ لیکن کوشش یہی ہونی چاہئے کہ لوگوں کو انہی اصلاحات سے مانوس کیا جائے جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً قرآنی اصطلاح "تکبیر رب" اسی مفہوم کو ادا کرتی ہے جو "اسلامی انقلاب" سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ تکبیر کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ زبان سے اللہ کی کبریائی کا اعلان کیا جائے بلکہ اصل تکبیر تو یہ ہوگی کہ وہ نظام قائم کیا جائے جس میں اللہ کی کبریائی کو فی الواقع تسلیم کیا جاتا ہو۔ اسی کا نام اسلامی انقلاب ہے۔ اسی طرح قرآن کی ایک اصطلاح ہے "اقامت دین" جو سورۃ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۴ سے ماخوذ ہے۔ ہمارا دین تو ایک مکمل نظام ہے یہ صرف مسجد کا مذہب نہیں، چنانچہ پورے نظام دین کو بالفعل قائم کرنے کا نام "اقامت دین" ہے اور یہی کچھ مفہوم "اسلامی انقلاب" کا بھی ہے۔ اسی مفہوم کی ایک اصطلاح "اظہار دین" بھی ہے جو سورۃ صف میں وارد ہوئی اور اس کا مفہوم بھی دین کو پورے نظام پر غالب کر دینا ہے۔ ذخیرۂ احادیث میں "اعلاء کلمۃ اللہ" کی ایک اصطلاح ملتی ہے وہ بھی یہی مفہوم ادا کرتی ہے، یعنی اللہ کے کلمے کو سربلند کر دینا۔ بالفاظ دیگر وہ نظام قائم کر دینا جس میں اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کیا جاتا ہو اور اسی کی شریعت نافذ العمل ہو۔ ان تمام اصطلاحات کا مدلول ایک ہی ہے اور جب ہم "اسلامی انقلاب" کی اصطلاح

اسلامی انقلاب قرآنی اصطلاح نہیں
دورِ جدید کے مترادفات میں سے ہے

استعمال کرتے ہیں تو ہمارا مفہوم وہی ہوتا ہے جو قرآن و حدیث کی مذکورہ بالا اصطلاحات سے سامنے آتا ہے۔ "اسلامی انقلاب کیا؟" کی مزید وضاحت کرتے ہوئے امیر محترم نے کہا

کہ اسلامی انقلاب سے مراد اس نظام عدل و قسط کا قیام ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نوع انسانی کو عطا ہوا اور جس کا عملی مظاہرہ دورِ خلافت راشدہ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ یعنی وہ نظام جس میں انسانی حریت اور انسانی مساوات کو اعلیٰ ترین شکل میں جمع کر دیا گیا تھا۔ انسانی حریت کا یہ عالم تھا کہ ایک بڑھیا بھی سرِ راہ خلیفہ وقت کو ٹوک دیتی اور خلیفہ کے ایک آرڈیننس پر سخت تنقید کر سکتی تھی۔ خلیفہ نے نہ صرف اس کی

کے یکساں مواقع نہیں ہیں اور سیاسی حقوق کے معاملے میں عدل و انصاف نہیں تو وہ ہرگز اسلامی انقلاب کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

نماز مغرب کا وقفہ ہوا اور اس کے بعد بھی خطاب جاری رہا عشاء تک یہ سلسلہ رہا۔ عشاء کی نماز کے بعد خصوصی سیشن ہونا تھا لیکن ادھر امیرِ محترم تھک کر چور ہو گئے تھے اور ادھر اپنا حال بھی مختلف نہ تھا۔ چنانچہ امیرِ محترم نے اعلان فرمایا کہ کل صبح نمازِ فجر

عقدُ الرِّفاقةِ لِلتَّنظیمِ الاسلامی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ
وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ
صلی اللہ علیہ وسلم

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ
وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا

○ اِنِّیْ اُعَاهِدُ اللّٰهَ

- عَلٰی اَنْ اَهْجُرَ كُلَّ مَا یَكْرَهُهٗ
- وَاُجَاهِدَ فِیْ سَبِیْلِهٖ جُهْدَ اسْتِطَاعَتِیْ
- وَاُنْفِقَ مَالِیْ وَاَبْذُلَ نَفْسِیْ

لِاِقَامَةِ دِیْنِهٖ وَاِعْلَاءِ كَلِمَتِهٖ

○ وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ
اُبَایِعُ الدُّكْتُوْرَ اِسْرَارَ اَحْمَدَ اَمِیْرَ التَّنْظِیْمِ الْاِسْلَامِیْ

- عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْمَعْرُوْفِ

فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ
وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیَّ

- وَعَلٰی اَنْ لَّا اُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ
- وَعَلٰی اَنْ اَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا كُنْتُ

لَا اَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

مُسْتَعِیْنًا اللّٰهَ رَبِّیْ وَمُسْتَمِدًّا مِّنْهُ عَلَی الْاِسْتِقَامَةِ
عَلَی الدِّیْنِ وَاِیْفَاءِ هٰذَا الْعَهْدِ

التاریخ ________

التوقیع ________

عہد نامہ رفاقت تنظیم اسلامی

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں۔
اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے اپنے آج تک کے تمام گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور آئندہ کے لیے خلوصِ دل کے ساتھ اس کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔

○ میں اللہ تعالیٰ سے عہد کرتا ہوں کہ :

- ان تمام چیزوں کو ترک کر دوں گا جو اسے ناپسند ہیں۔
- اور اس کی راہ میں مقدور بھر جہاد کروں گا
- اور اس کے دین کی اقامت اور اس کے کلمہ کی سربلندی کے لیے اپنا مال بھی صرف کروں گا اور جان بھی کھپاؤں گا۔

○ اور اسی مقصد کی خاطر
میں امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے بیعت کرتا ہوں کہ :

- ان کا ہر حکم سنوں گا اور مانوں گا جو شریعت کے دائرے سے باہر نہ ہو۔

خواہ تنگی ہو خواہ آسانی
خواہ میری طبیعت آمادہ ہو خواہ مجھے اس پر جبر کرنا پڑے اور
خواہ دوسروں کو مجھ پر ترجیح دی جائے۔

- اور یہ کہ نظم کے ذمہ دار لوگوں سے ہرگز نہیں جھگڑوں گا۔
- اور یہ کہ ہر حال میں حق بات ضرور کہوں گا

اور اللہ کے دین کے معاملے میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کروں گا۔

میں اللہ ہی سے مدد اور توفیق کا طالب ہوں کہ وہ مجھے دین پر استقامت اور اس عہد کو پورا کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

نام ________

پتہ ________

شکایت کو پورے سکون سے سنا بلکہ اپنی غلطی بھی تسلیم کی اور مساوات اس درجے کی کہ اگر کسی نے خلیفہ وقت کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا تو نہ صرف یہ کہ خلیفہ بھی عام انسانوں کی طرح عدالت میں حاضر ہوا بلکہ عدالت میں اس کے ساتھ کسی قسم کا کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ محض نماز کمیٹیاں اور زکوٰۃ فنڈ قائم کر دینے کا نام اسلامی انقلاب نہیں ہے۔ اگر کسی نظام میں سماجی سطح پر مساوات نہیں ہے، معاشی سطح پر روزگار

قیام گاہ کی بجائے اجتماع گاہ میں ادا کی جائے اور اس کے فوراً بعد رفقاء کا خصوصی سیشن شروع ہو جائے گا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ رفقاء کرام کے ان خصوصی اجلاسوں میں ان احباب کی شرکت پر کوئی پابندی نہیں تھی جو ابھی تک باقاعدہ رفیق نہیں بنے۔ عشاء کے بعد اجتماع گاہ سے قیام گاہوں کو واپسی، کھانا اور سونے کی تیاری۔ سونا عموماً دیر ہی سے ہوتا تھا کیونکہ بہت سے رفقاء آپس میں دیر تک گفتگو کرتے رہتے۔ ظاہر ہے کہ

اس طرح کے مواقع پھر کہاں نصیب ہوتے ہیں۔

راتیں بڑی فراخدلی سے چاندنی بکھیر رہی تھیں۔ پورے چاند کی راتیں تھیں چاروں طرف خاموش کھیت تھے' ایک طرف نہر میں آہستہ آہستہ پانی بہہ رہا تھا۔ عجیب منظر تھا' ہم شہر میں رہنے والوں کو ایسے منظر کہاں نصیب ہوتے ہیں

خاموش ہیں کوہ ودشت ودریا
قدرت مراقبہ میں ہے گویا
فطرت بےہوش ہو گئی ہے
آغوش میں سب کے سو گئی ہے
تاروں کا خاموش کارواں ہے
یہ قافلہ بے درا رواں ہے

رات کے پچھلے پہر جب انسان یہ منظر دیکھتا ہو تو کیوں نہ اس کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوں۔

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا میرا وضو ہو' نالہ میری دعا ہو

اور پھر ان گنہگار آنکھوں نے کتنے ہی رفقاء کو ایسے مبارک وقت میں اپنے ربّ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے اور مناجات کرتے دیکھا۔ گویا وہ سوئے گردوں نالۂ شب گیر کے سفیر بھیج رہے تھے۔ اقبال نے کہا ہے کہ۔

واقف ہو اگر لذّتِ بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریّا سے بھی یہ خاکِ پراسرار

اور

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

فجر کی نماز سے قبل رفقا قیام گاہ کے پنڈال کی جانب رواں دواں تھے امیر تنظیم اسلامی بھی جو قیام گاہ میں رفقا کے ساتھ ہی زمین پر بستر لگائے ہوئے تھے' اجتماع گاہ تک کا پانچ فرلانگ کا فاصلہ پیدل ہی طے کر رہے تھے۔ نماز فجر کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے منتخب نصاب حصہ دوم کا درس دیا اور اس کے بعد اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ نو بجے تک مختلف مقامات کی رپورٹیں اور کام کا جائزہ لیا جاتا رہا۔ بیرونی ممالک سے جو حضرات تشریف لائے تھے' ان کا خصوصی تعارف ہوا اور انہوں نے بیرون ملک اپنے ہاں کی رفتار کار سے آگاہ کیا۔ نو بجے ایک گھنٹے کا وقفہ ہوا جس میں ناشتہ کیا گیا۔ اجلاس دوبارہ شروع ہوا ظہر تا عصر کھانا اور آرام کا وقفہ ہوا۔ آج کھانے کے بعد گنے کی بجائے نمکین لسی سے تواضع کی گئی۔ بعد عصر حسب معمول امیر محترم کا تیسرا خطاب عام "اسلامی انقلاب کیوں؟" کے موضوع پر ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ:

غلبۂ اسلام کے لئے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض اور واجب کے درجے میں ہے۔ سورۃ شوریٰ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب فرماتے ہوئے تمام مسلمانوں کو دین کے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اللہ کا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ یہ دین مغلوب رہنے کے لئے نہیں آیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ انقلابی جدوجہد کے نتیجے میں خطۂ عرب کی حد تک دین اسلام قائم ونافذ ہو گیا تھا۔ آپؐ کے بعد صحابہؓ پوری دنیا میں اسلام کے غلبے کے مشن کو لے کر نکلے اور اس کرۂ ارضی کے ایک قابل ذکر حصے پر اللہ کے کلمے کو سربلند کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد کی تاریخ بہت تلخ ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنا یہاں مقصود بھی نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اگر دین قائم وغالب ہے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کی محافظت کریں اور اسے قائم رکھنے کی سرتوڑ کوشش کریں۔ لیکن اگر کسی خطے میں اللہ کا دین سربلند نہیں ہے تو اس میں بسنے والے مسلمانوں کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ غلبہ اسلام کے لئے اجتماعی جدوجہد کریں اور اس وقت تک جدوجہد ترک نہ کریں جب تک اللہ ہی کا کلمہ سربلند نہیں ہو جاتا۔ اہل پاکستان کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہوئے امیر محترم نے کہا کہ مسلمانان پاکستان کے لئے تو اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کرنا یوں بھی ضروری ہے کہ یہ ان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے اور اس کی "ترکیب" ہی کچھ ایسی

ہے کہ اس کے استحکام کے لئے سوائے اسلام کے اور کوئی اساس یا بنیاد موجود نہیں ہے۔ لہٰذا پاکستان کی بقا کا تو دارومدار ہی اسلامی انقلاب پر ہے۔ ہم اہل پاکستان کا معاملہ تو یہ ہے کہ

اسلامی انقلاب کی ضرورت اور پاکستان کی بقاو سلامتی ہم معنی ھیں

کے دیئے ہوئے بظاہر مختلف بیانات میں بھی بڑی خوبی سے تطبیق پیدا کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان سب کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے۔ یہ کہ پاکستان اسلام کے باعث وجود میں آیا' اسلام کے لئے ہی مانگا گیا تھا اور اب اسلام ہی اس کے استحکام کا واحد ذریعہ ہے۔ البتہ اسلام کے نام پر اب تک ملک میں جو کچھ ہوتا آیا ہے وہ مثبت کی بجائے منفی نتائج پیدا کرنے کا باعث بنا اور اب بھی کسی کا ارادہ حقیقی اسلام کے نفاذ یعنی پاکستان کو بچا

حدیثِ رسولؐ

وَعَنْ
عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ
قَالَ: بَايَعْنَا رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم
عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ
فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ
وَعَلَى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا
وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ، إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ
مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ،
وَعَلَى أَنْ نَقُولَ بِالْحَقِّ أَيْنَمَا كُنَّا، لَا نَخَافُ فِي اللهِ
لَوْمَةَ لَائِمٍ (بخاری ومسلم)

ہے "کافر نتوانی شد' ناچار مسلماں شو!" (اس موضوع پر وہ چونکہ اپنے خیالات مفصل انداز میں "استحکام پاکستان" نامی کتاب میں قلمبند کر چکے ہیں لہٰذا یہاں محض اشارات ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے) تاہم اس درد کا ذکر بے جا نہ ہو گا جو امیر محترم اس سرزمین کی بقاو سلامتی کے لئے رکھتے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اس کی ضمانت اگر کسی طرح مل سکتی ہے تو وہ حقیقی اسلام کا نفاذ ہی ہے۔ وہ پاکستان کے محرکات کے بارے میں زعماء

لینے کا ہے تو اسے سمجھ لینا چاہئے کہ جمہوری عمل اور ووٹوں کی سیاست سے اسلام ہرگز نہ آئے گا۔ اس کے لئے تو انقلابی عمل ہی درکار ہے۔ مروجہ سیاسی طریقوں اور انتخابات کے ذریعے نظام کی چھوٹی موٹی خرابیاں اور نظام کو چلانے والے ہاتھ تو بدلے جا سکتے ہیں 'نظام نہیں بدلا جا سکتا۔ فرسودہ نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور ایک نئے نظام کی داغ بیل ڈالنے کیلئے انقلاب ضروری ہے۔

خطابِ عام کے بعد سوالات و جوابات کی نشست ہوئی۔ سوالات تحریری طور پر کئے گئے تھے۔ آج چونکہ وقت کم تھا اس لئے باہر سے شریک ہونے والوں کے سوالات کے جوابات دیئے گئے اور فیصلہ ہوا کہ مقیم رفقا و احباب کے سوالات کے جوابات کل دیئے جائیں گے۔ آج کے چند سوالات خاصے تیکھے بھی تھے۔ لیکن امیرِ محترم نے نہایت تحمل سے جوابات دیئے۔ اگلا روز چونکہ اجتماع کا آخری دن تھا اس لئے امیرِ محترم نے اعلان فرمایا کہ کل پھر نمازِ فجر اجتماع گاہ ہی میں ادا کی جائے گی اور اس کے فوراً بعد کارروائی شروع ہو جائے گی۔ ناشتہ نہیں ملے گا بلکہ اجتماع کے اختتام پر یعنی گیارہ بجے کے قریب امریکہ

والوں کی زبان میں برنچ (BRUNCH) ملے گا جو ناشتہ اور دوپہر کے کھانے کو ملا کر بنتا ہے۔ گویا یہی ناشتہ یہی کھانا۔ ہم نے بھی سوچا کہ ٹھیک ہی تو ہے۔ امیر محترم ایک ایک کس بل نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم کراچی والے جو دن میں کئی کئی بار چائے کے عادی ہیں' انہیں ... روز تو ضرور صبح شام چائے ملی بعد میں صرف ایک وقت۔ صبح کو۔ باقی سارا وقت اللہ اللہ خیر صلّا۔ اب جو اجتماع کے آخری روز نمازِ فجر کے بعد کارروائی

شروع ہوئی تو جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا پیٹ میں چوہوں کی دوڑ اور آنتوں کا بار بار قل ھو اللہ کا ورد بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ احساس ہوتا تھا کہ ہم کتنے آرام طلب ہو گئے ہیں جو لوگ جہاد کا علَم اٹھائے ہوں' انہیں سہل پسندی کہاں زیب دیتی ہے۔ اچھا کیا امیرِ محترم نے کچھ جھنجوڑ تو دیا! تحریک سہل انگاری نہیں' محنت و مشقت چاہتی ہے۔ وہ تو خون جگر مانگتی ہے کیونکہ۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

تحریک کے کارکن کی زندگی تو ایک انقلابی کی زندگی ہوتی ہے ہم جب یہ کہتے ہیں کہ ہمارا طریق کار انقلابی ہے تو معمولی کارکن سے ذمہ دار حضرات تک سب کے معمولات زندگی میں انقلاب کا پَرتو ہونا چاہئے۔ ان کی نقشہ تو یہ ہونا چاہئے کہ۔

اس کی امیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دلنواز
نرم دم گفتگو' گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

وہ جان دیں تو اللہ کی راہ میں دیں اور شہید کہلائیں اور زندہ رہیں تو غازی کی طرح' ایک انقلابی کی طرح' صورت خورشید جیس کہ اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے 'اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ تڑپنے پھڑکنے کی توفیق مانگیں اور پلٹنا جھپٹنا ان کا شعار ہو۔

آج اجتماع کا آخری دن ہے۔ فجر کی نماز اجتماع گاہ میں ہوئی اس کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا منتخب نصاب کا درس اور پھر اجتماع کی کارروائی۔ معلوم ہوا کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ رات بھر علیل رہے ہیں۔ دل سے ان کی صحت کی لئے دعائیں نکلیں۔ اس دوران کچھ اور معمول کی کارروائی ہوئی۔ نو بجے کے قریب امیرِ محترم تشریف لائے اضمحلال طاری تھا۔ رفقا کے سوالات کے جوابات دیئے کچھ مزید کارروائی کے بعد امیرِ محترم کی دعا پر اجتماع ختم ہوا۔ سالانہ اجتماع کے آخری اجلاس کے اختتامی لمحات میں دعا سے پہلے امیر محترم نے ان نئے ساتھیوں سے بیعت لی جنہوں نے انقلاب اسلامی کے اس کارواں میں شامل ہونے کا فیصلہ کر کے گویا اپنے آپ کو امیر تنظیم اسلامی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ متعدد چادروں کو گرہ دے کر دور تک پھیلا دیا گیا۔ ایک سرا امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد کے ہاتھ میں تھا اور چادر کے طول میں دونوں جانب بیٹھے ان لوگوں نے اسے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا جو عہد و پیمان کی اس ڈور میں پروئے جانے کے خواہاں تھے۔ ان کی تعداد ایک سو کے لگ بھگ تھی۔ دو تین زیادہ یا تین چار کم۔ پھر بیعت کے الفاظ ان سب نے امیر محترم کے اتباع میں دہرائے۔ حاضرین میں سے پرانے رفقا نے بھی ان کی آواز میں اپنی آواز شامل کر لی۔ یہ الفاظ ان کے دلوں پر لکھے ہوئے ہیں لیکن زبان کو ان کے ورد سے تازہ کر لینے میں اپنا ہی فائدہ ہے۔

اس سے بھی قبل ہمارے میزبان کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر

غلام حیدر ترین نے رفقاء کرام کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ان کی زمینوں کو اجتماع کی زینت بخشی۔ کوتاہیوں پر معذرت کی۔ حالانکہ موصوف نے سات سو سے زائد شرکائے اجتماع کے جملہ اخراجات قیام و طعام برداشت کرنے کے علاوہ اپنی ضعیفی کے باوجود شب و روز رفقاء کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ یہ بوڑھا مجاہد جوانوں سے تیز نکلا۔ انہوں نے اپنی زمینوں کی پیشکش کی کہ تنظیم چاہے تو یہاں اپنا "رائے ونڈ" بنا لے یا کوئی تربیت گاہ یا قرآن کالج۔ یہ ان کا بہت بڑا ایثار ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ آمین! سالانہ اجتماع کے ناظم جناب مختار حسین فاروقی تھے۔ انہوں نے بھی انتظامات انتہائی خوش اسلوبی سے کئے اور دن رات لگاتار کام میں لگے رہے۔

اور لیجئے اجتماع ختم ہو گیا۔ یہ تین روز پلک جھپکنے میں گزر گئے۔ ابھی تین روز قبل ہی تو ہم ملک کے گوشہ گوشہ سے کھنچ کر یہاں آئے تھے... ایک مقصد کی خاطر..... اللہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر، اللہ کے جھنڈے کو دوسرے تمام جھنڈوں سے بلند رکھنے کے لئے، روحانی غذا حاصل کرنے کی غرض سے۔ پچھلے کام کا جائزہ اور آئندہ کام کے منصوبے بنانے کے لئے۔ اور اب ہم جدا ہو رہے ہیں..... مصافحے ہو رہے ہیں، معانقے ہو رہے ہیں، پلکوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

محبت کا زمزمہ بہہ رہا ہے... خدا کے لئے یہ الفت..... خدا کے لئے یہ محبت..... خدا کے لئے یہ ملنا..... خدا کے لئے یہ جدا ہو جانا..... نہیں نہیں، خدا کی عظمت کے لئے کام کرنے والے کبھی جدا نہیں ہو سکتے، وہ مل کر رہیں گے، ان کی دوستیاں برقرار رہیں گی..... اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی... یہ اللہ کا وعدہ ہے..... وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے لئے محبت کی اور اس کے دین کی عظمت کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دی، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے عرش کے سائے تلے جگہ

دے گا۔ ان کے لئے نور کے منبر ہوں گے..... میرے دوستو! کیا ان سے بڑے درجات کا تصوّر بھی کیا جا سکتا ہے؟..... مجھے نبی اکرمؐ کا وہ ارشاد یاد آ رہا ہے کہ

"خدا کے لئے محبت کرنے والوں میں اگر ایک مشرق میں رہتا ہو گا اور دوسرا مغرب میں تو خداوند تعالیٰ ان کو قیامت کے دن جمع کر کے کہے گا کہ وہ شخص یہ ہے جس سے تو محبت رکھتا تھا"۔

اور خدا کی رحمت ہو نبی اکرمؐ پر جنہوں نے ہم تک اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان پہنچایا۔

"اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، کہاں ہیں وہ جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے تھے آج کے دن میں انہیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا اور آج کے دن سوائے میرے سائے کے اور کوئی سایہ نہیں ہے"۔

اور یہ فرمان بھی

"جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں ان کے لئے آخرت میں نور کے منبر ہوں گے اور انبیاء و شہداء ان پر رشک کریں گے"۔

اجتماع گاہ سے رفقاء اب قیام گاہوں کی طرف آ رہے ہیں برنچ یعنی بڑا ناشتہ تیار ہے۔ ناشتہ کیا، کھانا ہے۔ سامان پیک کیا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے سے ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ پھر مصافحے ہو رہے ہیں، پھر معانقے ہو رہے ہیں۔ بسیں تیار ہیں، واپس لے جانے کے لئے۔ اور لیجئے ہم بھی اپنی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ گاڑی چل دی اور اپنے پیچھے ان زمینوں ان صحراؤں، ان کھیتوں کو سوگوار چھوڑ گئی۔

تری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

تحریک کے یہ جگر گوشے 'میرے یہ محترم رفقا' میرے یہ عزیز ساتھی' میرے یہ دینی بھائی جو اس اجتماع سے ایک جذبۂ جواں لے کر گئے ہیں۔ اب ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل جائیں گے 'توبہ کی منادی کرنے کے لئے۔

اٹھو! قرآن کی انقلابی دعوت اور توبہ کی منادی کا کام لے کر اٹھو۔ یوحنا اور مسیح علیہ السلام کی طرح توبہ کی منادی کے لئے...... دیکھو توبہ کا دروازہ کھلا ہے...... آؤ مل کر

منادی کریں...... توبہ کی

منادی کریں...... استغفار کی

منادی کریں...... اللہ سے اپنے تعلق کو استوار کرنے کی

منادی کریں...... نبی اکرمؐ سے اپنی نسبت کے حقیقی تعلق کو جوڑنے کی

منادی کریں...... خلافِ اسلام کاموں سے اجتناب کی

منادی کریں...... سرکشی اور نافرمانی سے بچنے کی

منادی کریں...... اللہ کی راہ میں جہاد کی

منادی کریں...... اسلامی انقلاب کی

منادی کریں...... دینِ حق کے قیام کی خاطر نقدِ جان کا نذرانہ بارگاہِ رب العزت میں پیش کرنے کی۔

(ماخوذ از شمارہ ۸)

بقیہ : صاحبِ میزان

ایک اور خیال خواہ مخواہ سر اٹھا رہا ہے۔ صاحبِ میزان نے تراویح کو کبھی پہلے اپنی ترازو میں کیوں نہ رکھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسے عمل کو قبولِ عام اور تواتر و دوام حاصل ہوتا رہا جس کے لئے دین میں کوئی بنیاد موجود نہ تھی اور وہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے۔ ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی پریشانی کا اصل باعث "رات بھر ترجمہ قرآن سنانے کی مجلس" جیسی کوئی چیز ہو جو ان کے پڑوس میں رمضان المبارک میں ہر شب ان ایوانوں کو رونق بخش رہی ہے جن کے بارے میں پچھلے دنوں انہوں نے لکھا تھا کہ ـــــ ع

دیکھنا ان بستیوں کو تم' کہ ویراں ہو گئیں

(ماخوذ از شمارہ ۱۱)

بقیہ : بجٹ کا موسم

تبدیلیاں بروئے کار لائیں گی۔ صرف ایک ایسی حکومت ہی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتی ہے جو اپنے ووٹروں سے تبدیلیوں کی اجازت اور اختیار لے کر آئی ہو۔

اگر ایسا نہ ہوا تو پاکستان کی اقتصادی زندگی ایک ایسی دلدل میں جا پھنسے گی جہاں حکومت آخر ایک مفلس اور غیر مؤثر ادارہ بن کر رہ جائے گی۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورت میں پورا ملک کراچی شہر کا منظر پیش کرنے لگے گا' جہاں لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے حکومتی ایوانوں کی بجائے کہیں اور ہوتے ہیں۔ خدا پاکستان کو اس روزِ بد سے محفوظ رکھے۔

(ماخوذ از شمارہ ۱۲)

پاکستان کے مسائل کا واحد حل — اسلامی انقلاب

سندھ کو جبر کے ذریعے ساتھ نہیں رکھا جا سکتا

جماعتِ اسلامی اب ایک اسلام پسند قومی سیاسی جماعت ہے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے "ندا" کے پینل کا انٹرویو

اسلامی فکر اور نصب العین کی جانب ایک نئی پیش رفت اور اگلا قدم ڈاکٹر اسرار احمد کی شخصیت میں جھلکتا ہے۔ افغان مسئلہ ہو یا سندھ کا مسئلہ' اسلامی انقلاب کا نظریہ اور لائحہ عمل ہو یا پاک بھارت تعلقات اور امور خارجہ کے معاملات' تمام امور میں وہ ایک واضح اور مربوط فکر رکھتے ہیں۔ اُن کی سوچ میں تازگی بھی ہے ندرت بھی' اور گیرائی بھی' گہرائی بھی۔ سیاست پر ان کی گفتگو بے باکانہ اور تحفظات سے بالا ہوتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ خود مروّجہ عملی اور انتخابی سیاست سے الگ تھلگ ہیں اور اس میں فریق بننے کو اپنے مشن کے لئے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ جب یہ صورت حال ہو تو سیاست کا غیر جانبدارانہ اور دیانتدارانہ جائزہ لینا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس دیانت' خلوص اور غیر جانبداری کے باعث ڈاکٹر صاحب کی فکر میں کمال درجہ کی حقیقت پسندی پائی جاتی ہے۔ پان اسلام ازم اور اسلامی انقلاب کی تمام تر رومانویت کو اپنی شخصیت اور فکر میں سموئے رکھنے کے باوجود انہوں نے اس رومانویت کو حقائق سے ہم آہنگ کرنے کا فن سیکھ لیا ہے۔ ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ شخصیات کی محبت یا عداوت کے مرض میں گرفتار نہیں ہیں اور اپنی شخصی مخالفت پر بھی غصے کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا انداز اصولی اور نظری ہے۔ اس انٹرویو میں بھی ان کا یہی انداز کار فرما ہے۔ اس کے ساتھ ہی چند چونکا دینے والی باتیں بھی انہوں نے کیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ احیائے اسلام کی تحریک کو از سرِ نو پرانی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں پچھلی تحریکوں کی غلطیوں اور ناکامیوں کا انہوں نے پوری گہرائی کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ انٹرویو قارئین کے لئے نہ صرف فکر انگیز ہو گا بلکہ یہ انہیں ایک نئی تحریک اور تجاویز کی جانب متوجہ بھی کرے گا۔

...............عبدالکریم عابد

سوال...... وزیر اعظم جونیجو نے مسئلہ افغانستان پر جو گول میز کانفرنس طلب کی تھی اس سے اس مسئلہ پر کچھ فائدہ ہوا؟

جواب...... گول میز کانفرنس افغانستان کے لئے تو بے کار تھی اس بارے میں اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا البتہ اس کانفرنس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حکومت اور حزبِ اختلاف کے

درمیان برف پگھلی ہے آپس میں رابطہ قائم ہوا ہے اور شاید یہی اس کانفرنس کا مدعا تھا۔

سوال .... غالباً مسئلہ افغانستان کو بہانہ بنایا گیا اصل مقصد ہی یہ تھا کہ حزبِ اختلاف سے رابطہ قائم کیا جائے شاید جو بے بگی کے کھیل کے لئے اس کی ضرورت تھی، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب.... ممکن ہے ایسا ہو، بہرحال حکومت اور حزبِ اختلاف میں رابطہ مفید بات ہے آئندہ بھی یہ ہونا چاہئے اور اس کو نتیجہ خیز بنانا چاہئے۔

سوال.... جونیجو حکومت مسئلہ سندھ پر بھی ایک کُل جماعتی کانفرنس طلب کرنے پر غور کر رہی ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب.... اس طرح کی کانفرنس ضرور ہونی چاہئے۔ یہ یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگی اوپن ڈائیلاگ ضروری ہیں میں نے ۶۹ء میں میثاق کے اداریہ میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستان کو ہم زبردستی اپنا محکوم نہیں رکھ سکتے انہیں موقع دینا چاہئے کہ وہ بحث و تمحیص کے بعد اور سارے نفع نقصان کو سمجھ کر اپنی آزادی سے فیصلہ کریں کہ پاکستان میں انہیں رہنا ہے یا نہیں سندھ کا معاملہ ذرا مختلف ہے وہ مشرقی پاکستان کی طرح ہم سے بالکل الگ اور دور نہیں ہے پھر بھی کسی علاقہ کی آبادی کی مرضی کے خلاف اسے اپنے ساتھ نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لئے جبر کے ساتھ سندھ کو پاکستان کا حصّہ رکھنے کی کوشش غلط ہوگی ہمیں سندھ کی قیادت کو موقع دینا چاہئے کہ وہ اپنا اظہار کرے۔

سوال..... سندھ کا مسئلہ کس طرح پیدا ہوا اس کا پس منظر کیا ہے؟

جواب.... سندھ کے مسئلہ کی جڑ بنیاد وہی ہے جو پورے پاکستان کے مسئلہ کی ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلام کے نام پر ایک ملک بنایا لیکن اسلام کا صرف نام ہی نام تھا نہ تحریک پاکستان میں اور نہ اس کے بعد اصل اسلام کبھی سامنے آیا آج بھی اسلام ایک موثر قوت کے طور پر موجود نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ پاکستان کا کوئی نظری جواز اسلام کے سوا نہیں بنتا۔ اس لئے اسلام کا نام لیا جاتا ہے لیکن اسلام ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے والا معاملہ ہے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بھارت میں کانگریس ایک مضبوط جماعت کے طور پر آزادی کے بعد موجود تھی اس کے رہنما اور کارکن تجربہ کار اور آزمائشوں سے گزرے ہوئے لوگ تھے بھارت کے برعکس پاکستان میں مسلم لیگ کوئی جماعت نہیں تھی یہ ایک تحریک تھی اور قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی جماعت تحلیل ہوگئی بھارت نے دو اور کام فوراً کر لئے ایک یہ کہ زمینداری نظام کو ختم کیا۔ جب کہ ہمارے ہاں برائے نام اصلاحات کی گئیں اور زمینداری، جاگیرداری نظام کو مضبوط کیا گیا۔ دوسرا یہ کہ بھارت نے فوراً ہی دستور بنایا اور اس کے مطابق تمام امُور انجام پانے لگے ان تین چیزوں کی وجہ سے بھارت کو سنبھلنے اور پنپنے کا موقع مل گیا ورنہ وہاں بھی کوئی متحد رکھنے والی قوت نہیں تھی اور نہ ایک قوم تھی لیکن آئینی اور سیاسی اقدامات نے ممکنہ انتشار کو روک دیا جب کہ ہمارے ہاں اول تو آئین بنا ہی نہیں، جب بنا تو بنتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ بار بار کے مارشل لاء اور طول طویل مارشل لاء میں جن صوبوں کی نمائندگی فوج میں نہیں تھی ان میں احساسِ محرومی کا ابھرنا فطری تھا سندھ کے مسئلہ میں ایک امتیازی چیز زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ قدیم سندھی اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اردو کی بالادستی مان لیں اور جب پاکستان بنا ہے اُس وقت آغا خاں، زاہد حسین اور دوسرے بھی خواہوں نے مشورہ دیا کہ عربی کو قومی زبان بنانا چاہئے لیکن مولوی عبدالحق نے زاہد حسین کو بھرے جلسہ میں آڑے ہاتھوں لیا اور اردو والوں نے اردو کے حق میں اپنی عصبیت کا مظاہرہ کیا ورنہ عربی سرکاری زبان بنائی جاتی تو کم از کم اردو سندھی جھگڑا کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔

سوال.... کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بھٹو دور میں سندھ والوں

جبر کے ساتھ سندھ کو پاکستان کا حصہ رکھنے کی کوشش غلط ہوگی۔

روس سے ترکستانی علاقے میں اسلام کی دبی ہوئی چنگاریاں موجود ہیں

کی بالادستی قائم ہو گئی تھی اور سندھیوں نے خوب جی بھر کر فائدے اٹھائے اور اپنے ہر احساسِ محرومی کا ازالہ کر لیا اور آج بھی سندھ میں نہ صرف سندھیوں بلکہ جئے سندھ والوں کی حکومت ہے اور وہ تمام فائدے سمیٹ رہے ہیں؟

جواب ۔ میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ نے بھٹو دور میں بہت فائدہ حاصل کیا اور بھٹو دور سے بھی بڑھ کر جنرل ضیاء الحق کے دور میں حاصل کیا کیونکہ اس دور میں جئے سندھ کی تحریک موجود تھی اور سندھیوں میں جن لوگوں نے صدر ضیاء سے تعاون کیا انہوں نے اس تحریک کے دباؤ کو ظاہر کے خوب خوب فائدے سندھ کے لئے حاصل کئے اور اپنے تعاون کی بھرپور قیمت وصول کی لیکن بہرحال مارشل لاء اور اس کی طوالت عام آدمی کی نفسیات پر اثر انداز ہوئی۔ میں نے تو ۸۰ء میں صدر ضیاء سے کہا تھا کہ سیاسی عمل کو روکنا اس ملک کے لئے اقدام خودکشی ہے اور ۸۲ء میں تو انہیں ایک خط میں یہ تاریخی جملہ بھی لکھا ہے اور خدا اس جملہ کو سچ ثابت نہ کرے کہ ۷۱ء میں پاکستان کو ایک زانی، شرابی شخص نے دولخت کیا اور اس کے بعد کہیں ایسا نہ ہو کہ مستقبل کا مورخ یہ لکھے کہ پاکستان کے مزید حصے بخرے اور بلقانائزیشن ایک نمازی، زاہد اور پرہیزگار شخص کے ہاتھوں انجام پذیر ہوا"

سیاسی عمل کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

سوال ۔ کراچی کی صورتِ حال کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب ۔ میرا خیال ہے کہ کراچی کی صورتِ حال میں شر سے خیر کا ایک پہلو نمودار ہو رہا ہے اور ایک نئی توازن قائم کرنے والی قوت کا ظہور ہوا ہے اگرچہ ایم کیو ایم کی جئے سندھ نے بھرپور تائید و حمایت کی ہے اور اسے بیدار کرنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے لیکن جب ایم کیو ایم بن گئی تو یہ اب ان کے منشا کے مطابق نہیں چل رہی ہے۔ انہوں نے پنجاب کے خلاف بنائی تھی لیکن ایم کیو ایم والے جئے سندھ کی حکمتِ عملی کے برعکس پنجابیوں کی بجائے پٹھانوں سے الجھ پڑے ابھی وہ اس غلطی کو درست کر رہے تھے کہ نئی باتیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں اور مجموعی طور پر یہ بات سامنے آئی ہے کہ اگر پاکستان کی تقسیم پر زور دیا گیا تو سندھ بھی تقسیم ہو جائے گا اس لئے اگر ایک سندھ چاہئے تو ایک پاکستان بھی رکھو اور مجھے یقین ہے کہ پرانے سندھی کسی قیمت پر سندھ کی تقسیم نہیں چاہتے اس لئے لازماً متحدہ پاکستان کے دائرہ میں اپنے مطالبات رکھنے ہوں گے اور مسائل کا حل تجویز کرنا ہو گا۔ میرے خیال میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ ایم کیو ایم کو کام کرنے کا

بلّی کا خطرہ

سوال ..... نئے انتخابات کے متعلق آپ کا کیا اندازہ ہے؟

جواب...... نئے انتخابات ضروری ہیں اور جلد بھی ہو سکتے ہیں۔ لیکن کوئی بلّی بھی چھپٹا مار سکتی ہے۔ خدا کرے کہ کوئی ریورس گیئر نہ لگے اور ہم جمہوریت کے راستے پر آگے بڑھ سکیں۔

۸۲ء کی طرح ۸۸ء میں بھی اپنے اس خدشے کا میں دوبارہ اظہار کرتا ہوں اور میرے خیال میں اس خطرے کا تدارک صرف

موقع فراہم کریں اور اسے کسی ایجی ٹیشن کی طرف جانے پر مجبور نہ کریں اور مسائل کے حل کے لئے ان کو اختیار دیں۔

نئے انتخابات پر کوئی بلّی چھپٹا نہ مار دے۔

سوال..... صوبائی خود مختاری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب..... صوبائی خود مختاری ضروری ہے اور ہمیں اب آئیڈیلزم کی بلند سطح سے نیچے اترنا ہو گا وحدتِ ملّی کا پرانا تصور موجودہ حالات میں نہیں چل سکتا اس لئے قومیتوں کو بھی تسلیم کرنا ہو گا اور علاقائی زبانوں کو بھی۔

سوال..... صوبائی خود مختاری میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے صوبے یک لسانی نہیں ہیں اِن میں مختلف نسلوں اور زبانوں کے لوگ ہیں اگر صوبائی خود مختاری کے نام پر کسی ایک گروہ کو تمام تر طاقت دے دی جائے تو دوسرے گروہ محرومی کے احساس کا شکار ہوتے ہیں ہنگامے کرتے ہیں اور مرکز کی طرف دیکھتے ہیں۔

جواب اصل چیز سیاسی عمل ہے یہ ہو گا تو ہر گروہ کے حقوق و مطالبات سامنے آئیں گے اور کوئی کسی کو دبا نہیں سکے گا ہمارے سامنے ہندوستان کی مثال ہے جہاں انگریز کے بنائے ہوئے صوبے چل نہیں سکے اور صوبوں کی نئی تقسیم کرنی پڑی لیکن پاکستان میں معلوم نہیں کیوں صوبوں کو ایک مقدّس درجہ دے دیا گیا ہے سیاسی عمل کا اجراء ہو تو صوبوں کی تشکیل بھی اس کے مطابق ہو گی۔ مجھے یاد ہے کہ غفار خان کا ایک بیان آیا تھا کہ اگر میانوالی کا ایک ضلع صوبہ سرحد کو دے دیا

اور مرکز میں تو میرے خیال میں عربی کو قومی زبان بنالیا جائے تو ساری کشیدگی ختم ہو جائے گی اور عربی کو قومی زبان بنانے کا سب سے بڑا حامی خود سندھ رہا ہے۔ داؤد پوتا نے اس کے لئے وہاں تحریک چلائی ایک شمسی صاحب ہیں انہوں نے بیس پچیس سال پہلے پمفلٹ لکھے کہ عربی قومی زبان ہونی چاہئے بروہی صاحب نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی اگر عربی قومی زبان ہو تو عالم اسلام سے بھی ہمارا رابطہ ہو گا لیکن ہم نے ہمیشہ مسائل کو بہت چھوٹے پیمانوں سے دیکھا ہے شعور کی گہرائی و پختگی کے ساتھ کسی مسئلہ کا حل تجویز نہیں کیا گیا۔

سوال ..... یہ بات ظاہر ہے کہ سندھ کی حکومت حالات کنٹرول کرنے میں ناکام رہی ہے اس کی اسمبلی بھی اب غیر نمائندہ چیز ہے اس لئے کیوں نہ سندھ میں نئے الیکشن ہوں اس وقت یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ سندھ میں فرد یا افراد کی تبدیلی سے معاملہ چلانے کی کوشش کی جائے۔ کیا اس طرح کچھ بہتری ہو گی؟

جواب .. میرے خیال میں جو حالات سندھ میں ہیں اس میں نئے الیکشن ضروری ہیں میں نے ریفرنڈم کو دستوری فراڈ قرار دیا تھا اور ۸۵ء کے الیکشن کو آئینی اور قانونی نہیں سمجھتا میرے خیال میں تبدیلی صرف یہ ہوئی کہ کھلے مارشل لاء کی بجائے ڈھکا اور چھپا مارشل لاء آ گیا تاہم جمہوریت کی جانب

معلوم نہیں کیوں پاکستان میں صوبوں کی حدود کو تقدس دے دیا گیا

جائے تو ہم اپنی ساری تحریک ختم کر دیں گے اور میں نے اس کے جواب میں بیان جاری کیا تھا کہ خدا کے لئے میانوالی سرحد کے حوالے کرو اسی طرح اگر ڈیرہ غازی خان وغیرہ کے لوگ بلوچستان میں جانا چاہتے ہیں تو اس پر ہمیں اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ بھارت میں نئے صوبے آخر بنے ہیں اور بہار کا صوبہ دو لسانی صوبہ ہے یعنی وہاں صوبائی زبان کے طور پر اردو اور ہندی دونوں تسلیم کی گئی ہیں یہی صورت سندھ کی بھی ہو چکی ہے کہ وہ دو لسانی صوبہ ہے صوبہ میں سندھی اردو دونوں زبانیں

تدریجی طور پر آگے بڑھنے کی کوئی بھی مخالفت نہیں کرے گا اور جو حالات اس وقت سندھ میں ہیں اس کی بناء پر اس صوبہ میں نئے الیکشن سندھ کے حالات کو بہتر بنانے کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ اس لئے اس طرح کے الیکشن کی حمایت کی جا سکتی ہے۔

سوال..... کیا یہ مناسب ہو گا کہ پورے پاکستان میں پہلے صوبوں کے انتخابات ہوں اور بعد میں مرکز کے انتخابات کرائے جائیں؟

جواب...... نہیں اس تجویز سے مجھے اتفاق نہیں ہے انتخابات سارے ملک میں ۱۹۷۳ء کے آئین کو موثر بنانے کے لئے ہونے چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے تو کم از کم سندھ میں ضرور الیکشن کرا دیا جائے۔

سوال ..... سندھ میں کنفیڈریشن کی تحریک کے متعلق آپ کی کیا اطلاعات ہیں؟

جواب ..... میری اطلاعات اور مشاہدہ کے مطابق سندھ میں جئے سندھ تو ہے لیکن کنفیڈریشن کی کسی تحریک کا زور نہیں اور کنفیڈریشن والوں نے خود ہی مان لیا ہے کہ ہم نے لفظ استعمال کر کے غلطی کی ہے۔ اصل چیز وفاقی یونٹوں کے اختیارات ہیں اس پر تصفیہ ہونا چاہئے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہمیں یونٹوں کو کافی اختیارات دینے ہوں گے۔

سوال...... بھارت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ پاکستان کی منڈی پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

جواب...... اچھے تعلقات کے لئے یہ قیمت بھی ہمیں دے دینی چاہئے۔ ہماری منڈی پر پہلے ہی غیروں کا قبضہ ہے۔ اگر بھارت سے جاپان وغیرہ کے مقابلے میں سستا مال حاصل ہوتا ہو تو اس سے خریدنے میں کیا حرج ہے ایسی صورت پیدا کرنی چاہئے جس سے بھارت کو ہمارے وجود سے کچھ منفعت حاصل ہو اور تعلقات بڑھ سکیں۔ تعلقات کی بہتری اس نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے کہ ہم ایک نظریاتی ملک ہیں اور اپنی نظریاتی یلغار بھارت پر کر سکتے ہیں۔ وہاں کروڑوں مسلمان بھی ہیں جو نظریاتی طور پر متحرک کئے جا سکتے ہیں۔ یہ آہنی پردہ (IRON CURTAIN) جو ہم نے ڈال رکھا ہے اسے ختم کرنا چاہئے

ولی خاں کی سیاست

سوال...... ولی خاں کی سیاست کے بارے میں آپ کا تاثر کیا ہے؟

جواب...... میرا خیال ہے کہ ولی خاں ایک شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ گذشتہ آٹھ نو سال سے وہ شدید کرب کے عالم میں ہیں۔ ان کے پختونستان کے خواب بکھر گئے' وہ اپنے ہی صوبہ میں اجنبی ہیں اور ایک مایوس سیاستدان کی طرح الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہیں۔

سوال ..... بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت پر آپ کا کیا مشورہ ہے؟۔

جواب...... میں تو بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا قائل ہوں۔ مجلسِ شوریٰ کے دو اجلاسوں میں شرکت کی تھی اور وہاں بھی یہی کہا تھا کہ امن کی جارحیت (PEACE OFFENSIVE) جاری رہنا چاہئے۔ میں نے کہا تھا کہ خارجہ پالیسی بھٹو کی بنائی ہوئی ہے۔ البتہ آپ اس پر اچھی طرح چل رہے ہیں۔ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا ہر اعتبار سے ہماری ضرورت ہے۔ امریکہ ہمارے لئے کچھ کرتا ہے تو بھارت روس کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے حق میں نہیں۔

اور آمدورفت' تجارت اور دوسرے معاملات میں روابط بڑھانے چاہئیں۔ بھارت میں ہندو نفسیات پر پاکستان سے ایک خوف مسلط ہے کیونکہ سارے فاتحین پاکستانی علاقوں سے آتے رہے ہیں۔ ہندو خوف زدگی کا ایک طویل تاریخی پس منظر ہے اور ہمیں ہندو کی بالادستی قبول کئے بغیر باہمی تعلقات کے ذریعہ ہندو کے اس خوف کو ختم کرنا ہو گا۔

سوال...... روس کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت ہونی چاہئے؟۔

جواب...... نہ اس کی دوستی اچھی' نہ اس کی دشمنی اچھی۔ معمول کے تعلقات درکار ہیں۔ زیادہ گرمجوشی کا اظہار یا اسے مشتعل کرنا دونوں غلط ہیں۔ اگر ایک اسلامی افغانستان بنتا ہے

تو یہ بھی ہمارے اور روس کے درمیان بفر بنے گا۔ یہ طے ہے کہ ہمیں مجاہدین کی مدد کرنی ہے اس لئے ہم روس سے دوستی کی زیادہ امید نہیں کر سکتے۔

سوال...... جہاد افغانستان کے متعلق آپ کا موقف کیا ہے اور مسئلہ افغانستان کے سلسلہ میں آئندہ کیا صورت حال درپیش رہے گی؟

جواب...... میرے خیال کے مطابق مجاہدین تین طرح کے افراد پر مشتمل ہیں۔ ایک وہ جو پہلے ہی سے اسلام کے احیاء اور دین کے غلبہ کے لئے کام کر رہے تھے۔ کیمونسٹوں کے قبضہ کام ہو رہا تھا لیکن جب صورت حال میں اچانک تبدیلی آئی اور پہلے کیمونسٹوں نے قبضہ کیا پھر ان کی مدد کے لئے روسی فوج آگئی تو احیائے اسلام کی جدوجہد کے سلسلہ میں دعوت، تبلیغ اور اصلاح کا کام کرنے والوں کو مسلح مزاحمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔

جہاد افغانستان میں دوسرا طبقہ علماء کا ہے جو اگرچہ پہلے کسی تحریکی انداز سے کام نہیں کر رہے تھے لیکن درس و تدریس اور دوسرے معمولات کی ادائیگی میں مصروف تھے اور نئی صورت حال میں اس طبقہ کو بھی سر بکف ہو کر میدان جہاد میں آنا پڑا۔

کالاباغ ڈیم کا مسئلہ

سوال... کالاباغ ڈیم کے متعلق آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواب...... میں اس کے تیکنیکی پہلوؤں سے ناواقف ہوں۔ ابھی جب میں سندھ گیا تھا تو مجھے بتایا گیا کہ کئی سندھی فنی ماہرین بھی اس کے مخالف ہیں۔ جماعت اسلامی کے سندھی اخبار "آباد کار" میں ایک فنی ماہر کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں اعداد و شمار کے ساتھ ڈیم کی مخالفت کی گئی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ اس مضمون کا ترجمہ مجھے فراہم کیا جائے۔ میں اسے اپنے ماہنامہ "میثاق" میں شائع کروں گا۔ ویسے میرے خیال میں یہ ڈیم ہمارے لئے کتنا ہی مفید اور ناگزیر کیوں نہ ہو، رائے عامہ کو نظرانداز کر کے اسے نہیں بنانا چاہئے۔ میرے خیال میں جب ملک میں صحیح جمہوریت ہوگی تو یہ جمہوری حکومت اور جمہوری فضا ڈیم کے مسئلہ پر زیادہ اچھی طرح غور کرنے کے لیے موزوں ہوگی۔

سے پہلے اور ظاہر شاہ کے زمانے سے ہی ان کی جدوجہد جاری تھی۔ اور درحقیقت یہ لوگ اسلام کی اس عالمی احیائی تحریک کا ایک حصہ ہیں جو سارے عالم اسلام میں تقریباً ایک ہی وقت میں نمودار ہوئی تھی۔ جیسا کہ نعیم صدیقی صاحب نے اپنے ایک شعر میں اس تحریک کے بارے میں کہا تھا کہ کہیں واضح ہے، کہیں مبہم۔ کہیں یہ اونچے سُروں میں ہے اور کہیں مدھم کیفیت کے ساتھ۔ لیکن احیائے اسلام کی یہ تحریک ساری دنیائے اسلام میں تھی اور افغانستان میں بھی تھی۔ اس کے لئے

اس جہاد میں شامل تیسرا طبقہ وہ ہے جو کسی خاص دینی فکر یا روایتی مذہبی ذہنیت کا تو حامل نہیں لیکن افغان قوم کی مزاجی حریت کی بنا پر یہ آزادی پسند ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ آزادی پر حملہ کیا گیا ہے تو یہ میدان میں آگیا، اور حدیث نبوی کے مطابق مسلمان اپنے جان و مال کی حفاظت کے لئے جنگ کرے تو یہ بھی جہاد ہے۔ اس اعتبار سے انہیں بھی مجاہد کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک افغان مہاجرین کا تعلق ہے یہ بھی سب ایک

صحیح جمہوری فضا میں کالاباغ ڈیم کے مسئلے پر بہتر انداز میں غور ہو سکے

طرح کے نہیں۔ ان میں ایک طبقہ مجاہدین اور شہداء کے لواحقین کا ہے' دوسرے وہ پناہ گزین ہیں جو اپنے دیہاتوں کے اجڑنے اور کھیتوں بازاروں کی بربادی کے سبب نقل مکانی پر مجبور ہو گئے کیونکہ ان کی معاش ختم ہو گئی تھی۔ تیسرے میرے خیال میں کچھ مفت خورے بھی ہیں۔ مثلاً پاوندے وغیرہ' جو پہلے بھی ہر سال یہاں آتے اور مشقت سے روزی حاصل کرتے تھے۔ اب اس طرح کے لوگوں کے لئے معاش کی ایک آسان صورت نکل آئی ہے۔ اس لئے وہ یہاں آ گئے۔ چوتھے سمگلروں' اسلحہ فروشوں ہیروئن فروشوں کا طبقہ ہے اور پانچواں گروہ کے جی بی کے ایجنٹوں اور تخریب کاروں کا ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک اندازہ یہ سامنے آیا تھا کہ کُل افغان مہاجر آبادی میں تین فی صد ایجنٹ اور تخریب کار ہیں۔ ممکن ہے اتنے زیادہ نہ ہوں لیکن ایک اچھی خاصی تعداد ان کی بھی ضرور ہے۔

آئندہ کیا ہو گا؟

افغانستان کا مستقبل مجھے یہ نظر آتا ہے کہ یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا اور ایک نئی طویل کشمکش ان مجاہدین کو کرنا ہو گی۔ اس کشمکش میں عالمی اسلامی احیائی تحریک کے حامی غالباً تنہا ہوں گے کیونکہ روایتی مذہبی ذہنیت کے لوگ ظاہر شاہ یا اس طرح کی کسی اور شخصیت پر متفق ہو کر صلح کر لیں گے۔ دوسرے عام لوگ بھی اس کشمکش سے دستکش ہو سکتے ہیں اور آئندہ کی جنگ کا سارا بوجھ اسلامی تحریک کے علمبرداروں اور حامیوں پر ہو گا۔ ان کی آئندہ ضرورت پولرائزیشن یا زیادہ مؤثر اتحاد کی ہو گی۔ اس وقت یہ سات تنظیموں میں منقسم ہیں اور مل جل کر کام کر رہے ہیں لیکن آنے والے دنوں میں حالات کا تقاضا یہ ہو گا کہ وہ واحد تنظیم بنیں' ایک نظم میں آئیں اور ایک حزب اللہ بنیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ اتحاد ان میں ضرور ہو گا اور جو تجربہ انہوں نے حاصل کیا ہے اور جو صلاحیتیں پیدا کر لی ہیں' ان کی بنا پر یہ اپنی جدوجہد کو جاری رکھ سکیں گے اور انشاءاللہ اسلامی افغانستان آخر کار غیر اسلامی افغانستان پر فتح یاب ہو کر رہے گا۔ لیکن اس سلسلہ میں مسلمانان عالم کو بھی اپنی ذمہ داری پوری کرنی ہو گی کیونکہ آئندہ مغربی امداد کا متاثر ہونا ضروری ہے۔ سوپر پاور کی طاقت اور اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ افغانستان کی جنگ جب شروع ہوئی تھی تو مجاہدین کو سوپر پاور کی اعانت حاصل نہیں تھی بلکہ امریکہ والے روسی اقدام پر حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کریں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ افغان قوم میں مزاحمت اور مقاومت کا جذبہ ہے تو انہوں نے بھی ڈٹ کر امداد کی اور سٹنگر میزائل نے تو سارا قصہ ہی ختم کر دیا اور یہ فیصلہ کن ثابت ہوئے۔ پھر بھی اصل فیصلہ کن چیز افغانیوں کا اپنا عزم و ایمان تھا۔ اب ظاہر ہے کہ آئندہ مغربی امداد نہیں ہو گی یا بہت کم ہو گی اور بالواسطہ ہو گی۔ مجاہدین کو خدا پر اور اپنے آپ پر بھروسہ کرنا ہو گا۔ لیکن یہ سارے عالم اسلام اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ چاہنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان مجاہدین کی امداد کے لئے جو کچھ کر سکتے ہوں کریں۔ مجاہدین کو واقعی سخت مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا کیونکہ کمیونسٹ افغانستان زرخیز علاقے میں ہو گا۔ مزار شریف اس کا مرکز ہو گا اور اسلامی افغانستان میں مجاہدین کے زیر قبضہ علاقے بنجر اور سنگلاخ ہوں گے لیکن یہ اصل میں چیلنج ہی تو ہے جو کسی قوم یا گروہ کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرتا اور متحرک کرتا ہے۔

سوال یہ اسلامی افغانستان پاکستان پر کس طرح اثر انداز ہو گا؟

جواب پاکستان کو اس سے بہت سہارا مل جائے گا ہماری مغربی سرحد کی حفاظت کی ایک شکل پیدا ہو جائے گی پاکستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کے لئے بھی یہ اسلامی افغانستان تقویت کا باعث ہو

جہاد افغانستان جاری رہے گا۔ وہ اسلام کے احیائی عمل کا حصہ ہے

گا۔

سوال... کیا یہ ممکن نہیں کہ اسلامی افغانستان کے مجاہدین افغانستان کے ساتھ متعلقہ پاکستانی علاقوں پر بھی قبضہ کرلیں تاکہ فوجی کاروائی میں انہیں آسانی رہے؟

جواب... مجھے اس سارے علاقہ کی قبائلی تقسیم اور اس کے مضمرات کا علم نہیں ہے آزاد قبائلی علاقہ کو دیکھا ہے لیکن ڈیورنڈلائن کے پار کی صورت حال کا کچھ زیادہ پتہ نہیں مگر میرا خیال ہے کہ پاکستان کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہو گا اور اگر کچھ ہو گا بھی تو اس میں ہرج نہیں اس سے پاکستان اور اسلامی

کرے۔

سوال... افغان مسئلہ پر صدر ضیاء الحق نے دباؤ کا جس طرح مقابلہ کیا ہے وہ قابلِ تعریف نہیں؟

جواب... واقعی بڑی ہمت کی ہے۔ اگرچہ صدر ضیاء الحق اور میرے درمیان فکری بُعد ہی نہیں شدید اختلاف بھی ہے لیکن اس معاملے میں ان کی تحسین کئے بغیر نہیں رہ سکتا انہوں نے بہت حوصلے کا مظاہرہ کیا ہے اور وزیر اعظم جو نیجو نے بھی ہر حال کوئی غیر معقول رویہ اختیار نہیں کیا انہوں نے مسئلے کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور عبوری حکومت پر ان

بہاریوں کا مسئلہ

سوال... بہاریوں کے مسئلہ کیلئے کیا ہونا چاہئے؟

جواب... بہاریوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر آپ انہیں پنجاب میں آباد کریں گے تب بھی وہ رفتہ رفتہ کراچی پہنچ جائیں گے۔ صدر اپنے سندھی دوستوں کو اس پر آمادہ نہیں کر سکے کہ وہ بہاریوں کو قبول کریں اس لئے وہ ابھی تک نہیں آسکے ہیں اور ان کی آمد کسی سیاسی تصفیہ کے ساتھ ہی ممکن ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ پاکستانی ہیں اور انہیں پاکستان لانا ہماری ذمہ داری ہے۔

افغانستان کی ایک کنفیڈریشن وجود میں آسکتی ہے اور پان اسلام ازم کے خواب کو نئی تعبیر مل سکتی ہے۔

سوال... افغانستان کی موجودہ صورت حال میں حکومت پاکستان کو کیا کرنا چاہئے۔

جواب... حکومت پاکستان نے جو کچھ کرنا تھا وہ کر لیا اب اس پر کچھ پوچھنا بے کار ہے ہم اس لئے بھی کچھ نہیں کہہ سکتے کہ نہ ہمارے پاس صحیح معلومات ہوتی ہیں نہ حکمت عملی سے باخبر رکھا جاتا ہے اس لئے عام جلسوں میں کھڑے ہو کر بڑی بڑی باتیں کرنا بے فائدہ ہے ہم صرف یہ دعا کرتے رہے ہیں کہ خدا ہمارے "ڈی فیکٹو" ارباب اختیار کو صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا

اصرار صحیح تھا۔

سوال... روس اگر کسی معاہدہ کے بغیر اپنی فوجیں نکا لے جاتا ہے اور کوئی تصفیہ نہیں ہوتا تو کیا صورت رہے گی؟

جواب... میں نے عرض کر دیا ہے کہ افغانستان کو ا

ایک طویل کشمکش سے گزرنا ہے ہمارے ہا ں پہلے بڑ گھبراہٹ تھی یوں محسوس ہو رہا تھا کہ قدموں تلے زمین نکل ہے جنرل صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ ہمارا منہ کالا ہوا ہے لیک ریگن انتظامیہ پر امریکی رائے عامہ اثر انداز ہوئی ہے "امر سینٹ کی قرارداد نے اثر دکھایا ہے اور ریگن انتظامیہ نے پال بدلی ہے سٹنگر میزائل بے شک بند ہو جائیں گے روس

امریکہ میں کچھ نہ کچھ ضرور مل پایا ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ مجاہدین کی قوت تحلیل ہو سکے یا انہیں نظرانداز کر دیا جائے جو بات سامنے آئی ہے وہ یہی ہے کہ دونوں فریق امداد جاری رکھیں گے اور جنگ چلتی رہے گی یہ البتہ ضرور ہے کہ ایک نیا چیلنج پیدا ہوا ہے اس سے مجاہدین کو اور ہمیں نپٹنا ہو گا مجاہدین کو خاص طور پر اپنی اہلیت کا ثبوت دینا ہو گا۔

سوال یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ جہادِ افغانستان کے اثرات روس کے اندر مسلم ریاستوں پر بھی ہوئے ہیں اور وہاں اسلامی تحریک اٹھ رہی ہے۔

جواب ہمیں زیادہ خوش فہم نہیں ہونا چاہئے لیکن ان اثرات کی بالکل نفی بھی نہیں کی جا سکتی افغانستان تاریخ کا اہم واقعہ ہے ایک سوپر پاور کو اپنی توہین اور تذلیل برداشت کرنا پڑی ہے روس نے ابتداء میں ترکستانی علاقے سے ہی فوج بھیجی تھی اور یہ رابطہ روس کے لئے مہنگا ثابت ہوا ان علاقوں میں تین چار نسل پہلے زبردست اسلامی اثرات تھے ان کی دبی ہوئی

سوال جماعت اسلامی سے علیحدگی کے وقت اس کے متعلق آپ کا جو تجزیہ تھا، کیا آپ اسے اب بھی درست سمجھتے ہیں؟۔

جواب صد فیصد درست۔ میرا تجزیہ تھا کہ جماعت اسلامی اصولی اسلامی انقلابی جماعت کی بجائے اسلام پسند قومی سیاسی جماعت میں تبدیل ہو گئی اور سیاست میں اس حد تک اور اس طرح سے ملوث ہو گئی ہے کہ اس کا بنیادی کردار ہی تبدیل ہو گیا ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے سیاست ایک مقدس چیز ہے اور کوئی باشعور مسلمان غیر سیاسی نہیں ہو سکتا لیکن سیاست کے دو پہلو ہیں نظری اور عملی۔ پھر عملی سیاست بھی دو طرح کی ہے 'ایک انتخابی سیاست دوسری انقلابی سیاست۔ جب آپ کسی نظام کو صحیح سمجھتے ہوں اور اس میں جزوی تبدیلیاں چاہتے ہوں تو انتخابی سیاست اپنا سکتے ہیں لیکن جب نظام کی تبدیلی مقصود ہو تو انقلابی سیاست کے سوا چارہ نہیں۔

سوال کیا جماعت اسلامی کی سابقہ حیثیت بحال ہو

بہاریوں کو پاکستان لانا ہماری ذمہ داری ہے۔

چنگاریاں ضرور موجود ہوں گی آج سے کئی سال پہلے جب افغانستان کا مسئلہ بھی نہیں تھا تو یہ رپورٹیں سامنے آئی تھیں کہ روس میں نقش بندی سلسلہ کے تصوّف کو فروغ حاصل ہو رہا ہے (اس موقع پر عبدالکریم عابد نے بتایا کہ تونسہ شریف کے سجادہ نشین مرحوم خواجہ نظام الدین تونسوی اکثروبیشتر روس جاتے تھے اور میرے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ "وہاں ہمارے مریدوں کا حلقہ ہے ان کے لئے وہاں جانا پڑتا ہے" محبوب سبحانی نے بتایا کہ لاہور میں پانی والا تالاب میں بھی ایک صاحب تھے جو تصوّف کے سلسلہ کے تھے اور اس ضمن میں روس جایا کرتے تھے) ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں زیادہ خوش فہم نہیں ہونا چاہئے اثرات ضرور ہیں اور وہ اپنے وقت پر شاید کسی کام آئیں۔

سکتی ہے؟۔

جواب میرے خیال میں نہیں۔ قاضی حسین احمد صاحب کے آنے کے بعد مجھے کچھ امید ہوئی تھی کیونکہ وہ مزاجاً انقلابی ہیں۔ افغان مجاہدین سے بھی تعلق رہا اور انقلابی باتیں بھی کرتے رہے ہیں لیکن اندازہ ہوا کہ جب ایک جماعت کسی خاص پٹڑی پر بہت آگے چلی جائے تو واپسی مشکل ہوتی ہے۔ مولانا مودودی شاید یہ کام کر سکتے تھے لیکن ان پر جب یہ انکشاف ہوا کہ انتخابی راستہ غلط تھا تو اس وقت ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے تھے اور وہ کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے تھے۔ تاہم اگر جماعت میں تبدیلی کا کوئی امکان ہے تو وہ اس ایک فیصلے سے پیدا ہو گا کہ جماعت یہ طے کر لے کہ آئندہ وہ انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے گی۔ یہ ایک فیصلہ سارے رخ اور

انداز کی تبدیلی کا سبب ہو سکتا ہے۔ اگرچہ شوریٰ میں یہ بات ہوئی ہے کہ ہر الیکشن میں حصّہ لینا کچھ ضروری بھی نہیں ہے' تاہم الیکشن سے گریز یا انتخابی سیاست سے قطع تعلق کے فیصلے کے لئے جرأت رندانہ کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ فیصلہ جماعت کی پوری چالیس سالہ تاریخ پر خط تنسیخ پھیرنے کے مترادف ہو گا۔

سوال جب جماعت اسلامی بار بار الیکشن میں حصّہ لے گی اور ہر بار شدید ناکامی سے دوچار ہو گی تو کیا آخر کار وہ الیکشن سے الگ رہنے کا فیصلہ نہیں کرے گی۔

جواب اگر وہ بار بار الیکشن ہارتی ہے تو پھر کسی کام کی بھی نہیں رہے گی اور ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ چونکہ بار بار الیکشن ہمارے ملک میں ہوتے ہی نہیں' اس لئے جماعت کو ہر نیا کے ساتھ معیار بھی بدلتا چلا گیا لیکن ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا۔

سوال آپ کے نزدیک پاکستان کے موجودہ مسائل کا بنیادی حل کیا ہے؟۔

جواب بنیادی حل تو اسلامی انقلاب ہے مگر اس کی طرف ہماری کوئی مؤثر قوت یا حیثیت رکھنے والی جماعت متوجہ نہیں ہے۔ سب نے انتخابی سیاست کو اختیار کر لیا ہے حالانکہ اگر ہمیں پاکستان کا دیرپا قیام اور استحکام مطلوب ہے اور اسے کسی کا طفیلی ملک رکھنے کی بجائے ایک آزاد اور باوقار پاکستان بنانا ہے تو یہ اسلامی انقلاب کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر اسلامی انقلاب نہیں آئے گا تو پاکستان نہیں بچ سکے گا۔ خوش قسمتی سے افغانستان کے حالات نے ہمارے لئے اسلامی انقلاب کی ایک سبیل بھی پیدا کی ہے۔ میں خود جب افغانستان گیا تو وہاں

متناسب نمائندگی

سوال کیا آپ متناسب نمائندگی کے حامی ہیں؟

جواب میں تو انتخابات کا آدمی ہی نہیں۔ یہ میدان میرے دائرہ کار سے خارج ہے لیکن متناسب نمائندگی میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کی آراء کو اہمیت دینا ہے تو متناسب نمائندگی اس کیلئے اچھی چیز ہے۔

صدمہ برداشت کرنے کے لئے لمبا وقفہ مل جاتا ہے۔

سوال جماعت نے ایک زمانے میں یہ طے کیا تھا کہ خود امیدوار نہیں بنیں گے اور اپنے اپنے علاقوں سے اچھے اشخاص کو امیدوار بنا کر پیش کریں گے۔ کیا یہ تجربہ چل سکتا ہے؟۔

سواب یہ تجربہ اس وقت بھی نہیں چلا جب حالات آج سے اچھے تھے۔ اصل میں جماعت نے تدریجاً پسپائی اختیار کی۔ پہلے طے کیا ہم تنہا چلیں گے اور سہروردی اور ممدوٹ وغیرہ کی جانب سے انتخابی اتحاد کی تجویز کو رد کیا۔ پھر جب دیکھا کہ تنہا نہیں چل سکتے تو دستوری نکات کے لئے علماء کا متحدہ محاذ بنایا۔ اس سے بھی کام نہیں چلا تو خالص سیاسی متحدہ محاذ بنا کر جمہوریت کی تحریک چلانے پر آ گئے۔ ہر پسپائی

جلال الدین حقانی سے ملاقات ہوئی تھی اور میں ان سے بہت متاثر ہوا۔ مجھے اس پر حیرت ہوئی کہ ہمارے اردگرد تاریخ ساز واقعات ہو رہے ہیں اور ہم ان سے بے خبر بیٹھے ہیں۔ افغانستان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ روس میں امام شامل اور لیبیا میں عمر مختار کی تحریک نے کیا تھا۔ افغانستان میں اسلامی خصوصیات رکھنے والوں کا منظم ہونا اور فوجی انداز اختیار کرنا معمولی بات نہیں۔ یہ ایک بڑی خوش آئند چیز ہے۔ اس کا اثر پاکستان پر بھی ہو گا لیکن پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے ایک تو ہم عدم تشدد پر کاربند رہنے کو ضروری سمجھتے ہیں' دوسرے یہ کہ جو حالات اس وقت ملک میں ہیں' ہمیں بہرحال ان کا لحاظ کرنا ہو گا۔ قومیتوں کا مسئلہ اور علاقائی مسائل کو ہمیں تسلیم کرنا ہو گا۔ ان کو سامنے رکھے بغیر کسی نے کوئی روڈ

رول چلانے یا جبر و تشدد کی کوشش کی تو اس سے ملک اور اسلامی انقلاب کو نقصان پہنچے گا۔

سوال آپ کا اسلامی انقلاب کے لئے لائحہ عمل کیا ہے۔

جواب دو مرحلے ہیں، پہلے مرحلے میں ایک منظم مربوط اور ایمان و اخلاص سے بھرپور قوت کی فراہمی جو اسلام کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر سکے۔ دوسرا مرحلہ ایک مزاحمتی تحریک کا ہے جو برائی کو قوت سے مٹانے کے لئے سامنے آئے یعنی نہی عن المنکر بالید کے اصول پر عمل پیرا ہو۔ مروجہ نظام کے منکرات یا اس کی برائیاں خود کوئی چیز نہیں، وہ اپنے نظام کی پیداوار ہیں۔ لیکن مزاحمتی تحریک کے لئے ہم بطور علامت کچھ برائیوں کو یا کسی ایک برائی کو منتخب کریں گے اور اس کے خلاف اپنی قوت کا مظاہرہ کریں گے۔ مگر تشدد یا توڑ پھوڑ نہیں ہوگا پرامن رہ کر مظاہرے کریں گے یا پکٹنگ کریں گے، ترک موالات کریں گے۔

سوال منظم، مربوط اور ایمان و اخلاص سے بھرپور طاقت آپ کس طرح فراہم کریں گے؟

جواب ہمارے سامنے سیرت نبویؐ ہے۔ ہم اس پر عمل کرتے ہوئے دعوت، تنظیم اور تربیت کے طریق کار کو اپنائیں گے۔ دعوت کے سلسلہ میں ہم نے یہ اصول اختیار کیا ہے کہ اس کی بنیاد کسی شخص یا اس کے لٹریچر پر نہ ہو بلکہ قرآن پر ہو۔ قرآن کے ذریعے قرآنی دعوت دی جائے اور توحید کے اصول کے سماجی مضمرات کو عیاں کیا جائے۔ مثلاً اصول توحید کے نتیجہ میں سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات اور یہ کہ ملکیت تامہ یعنی حقیقی مالک صرف خدا ہے۔ انسان صرف ملکیت کا امین ہے اور حاکمیت مطلقہ خدا کی ہے یعنی خلافت کا تصور ہم اسلامی انقلاب کے لئے ایک مضبوط تنظیم بھی ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ڈھیلا ڈھالا نظم انقلاب کے لئے نہیں چل سکتا۔ اس لئے ہم نے بیعت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ بیعت سمع و طاعت فی المعروف پر ہوگی اگرچہ مشاورت ہم ضرور کریں گے لیکن فیصلے سروں کی گنتی سے نہیں ہوں گے اور امیر یا سربراہ کو فیصلے کا مکمل اختیار ہوگا۔ مجھے ایک حدیث میں اپنی تنظیم کا پورا دستور مل گیا ہے کہ "ہم اطاعت کریں گے، خواہ ہمیں حکم پسند ہو یا نہ ہو اور خواہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے لیکن ہم حق بات ضرور کہیں گے"۔ اس حدیث مبارک میں مشاورت کی روح پوری طرح آگئی ہے اور یہی طریق کار ہمارا ہوگا۔ تربیت کے سلسلہ میں بھی اصل تربیت اس وقت ہوتی ہے جب آدمی خود اسلامی اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ وہ جوں ہی اس راہ میں قدم اٹھاتا ہے، اس کے نتیجے میں معاشرتی تصادم سے دوچار ہوجاتا ہے۔ مثلاً اکلِ حلال پر اکتفا کرنا یا معاشرتی شرعی قوانین کی پابندی کرنا۔ ان میں آدمی کا اپنے گھر سے، اپنے خاندان سے، اپنے معاشرہ سے تصادم ہوتا ہے اور یہی تصادم تربیت کا اصل ذریعہ ہے۔

سوال اسلامی انقلاب کے لئے یہ اسلامی قوت کب تک فراہم ہوسکے گی۔

جواب اس کا انحصار دعوت دینے والوں کی صلاحیت پر بھی ہے اور معاشرہ کی صلاحیت پر بھی اگر معاشرہ مردہ ہو تو سو سال تک کام کا کوئی نتیجہ نہیں ظاہر ہوگا اور معاشرہ میں جان ہو تو جیسا کہ حضورؐ کے زمانے میں ہوا تھا، ہماری زندگیوں میں بھی یہ قوت فراہم ہوسکتی ہے لیکن ہمیں جلد بازی سے نہیں سوچنا چاہئے۔ وہ تین چار نسلیں بھی اس کام میں لگ جائیں تو لگے رہنا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی زبان سے امر بالمعروف جاری رکھنا چاہئے یعنی اچھائی اور نیکی کی طرف دعوت اور اس سلسلہ میں جو آزمائشیں پیش آئیں، خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہنا چاہئے۔ جب لسانی و زبانی دعوت کے ذریعہ قوت جمع ہوجائے گی تو منکرات کے خلاف قوت کے ساتھ مظاہرے کریں گے

ہماری تنظیم کی بنیاد سمع و طاعت فی المعروف پر ہے۔

پاکستان کے مسائل کا بنیادی حل اسلامی انقلاب ہے۔

اور اس مرحلے میں مار کھاؤ اور ہاتھ نہ اٹھاؤ کے اصول پر عمل کرنا ہو گا۔

ہماری تنظیم کی بنیاد جس طرح سمع وطاعت والی حدیث پر ہے ویسے ہی ہمارے طریق کار کی بنیاد بھی ایک حدیث پر ہے جس میں ایمان کی تین حالتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک برائی کے خلاف دل میں نفرت رکھنا' دوسری زبان کے ذریعہ اس کے خلاف اظہار کرنا اور تیسری اسے ہاتھ سے اور قوت سے روکنا۔ ہم ایمان کے اس تیسرے درجے کے مظاہرہ کے لئے تنظیم

خواہش ہی ہو سکتی ہے' عملاً یہ محال ہے۔ کیونکہ ہر دینی جماعت ایک زندہ وحدت (LIVING ORGANISM) کے طور پر ہوتی ہے اس کا ایک "برین ٹرسٹ" ہوتا ہے' ایک قیادت ہوتی ہے' ایک نفسیات ہوتی ہے' کچھ مادی امور اور مفادات ہوتے ہیں۔ اس لئے اشتراک اور اتحاد محال ہے۔ البتہ آپ اپنا کام جاری رکھیں تو ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ ہر جماعت اور ہر حلقے میں جو مخلصین کے گروہ ہیں' وہ آپ کے ساتھ آ جائیں۔ فرقہ وارانہ یا مکاتب فکر کے اختلافات کی رکاوٹ بھی مسلسل

ایرانی انقلاب کیا ہے

سوال ایران کے اسلامی انقلاب کے متعلق آپ کا کیا تجزیہ ہے؟

جواب میرے تجزیہ کے مطابق یہ شیعہ اسلام کا ایک جارحانہ (MILITANT) اظہار اور اُبھار ہے میں اسے انقلاب بھی نہیں کہوں گا کیونکہ اس میں حقیقی انقلاب کی علامات موجود نہیں۔ دراصل پاکستان اور ایران میں فرد واحد یعنی بھٹو اور شاہ ایران کے خلاف نفرت نے تحریکوں کو جنم دیا۔ پاکستان میں اسے کامیاب بنانے کیلئے اس پر نظام مصطفیٰ کا لیبل چسپاں کر دیا گیا اور ایک مولوی یعنی مفتی محمود مرحوم و مغفور کو اس کا سربراہ بنایا گیا۔ ایران میں بھی یہی ہوا۔ لیکن وہاں مولوی منظم تھے۔ ان کا ایک مضبوط ادارہ تھا۔ اور فوج کے خلاف عام نفرت تھی۔ اس لئے مولویوں کے ادارہ نے "ٹیک اوور" کر لیا جبکہ یہ کام پاکستان میں فوج نے کیا۔ لیکن ایرانی مولویوں کا ذہن چونکہ پرانا تھا اس لئے وہ معاشی انقلابی اصلاحات کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکے۔ ایران کا انقلاب بہرحال اپنی توسیع چاہتا ہے اور اسے اپنی مارکیٹ عراق اور پاکستان ہی نظر آتی تھی۔ عراق سے جنگ چھڑ گئی ہے لیکن پاکستان کے ساتھ تعلقات میں ابھی کوئی سنگین مسئلہ پیدا نہیں ہوا اور خدا کرے کہ یہ صورت قائم رہے۔

قائم کریں گے اور جب ایمان کے اس درجے کا مظاہرہ ہو گا تو انقلاب آ سکے گا۔

سوال...... اس اسلامی انقلاب کے لئے مختلف دینی جماعتوں سے کیا اشتراک عمل نہیں ہو سکتا؟

جواب...... اس کی خواہش تو کی جا سکتی ہے لیکن صرف

کام سے ختم ہو جاتی ہے۔ حضور اکرمؐ کے زمانے میں بھی عیسائی اور یہودی موجود تھے اور حضورؐ کو ان سے تعاون کی توقع بھی تھی لیکن سب سے بدتر مخالف یہی لوگ نکلے۔ اس کے باوجود انہیںؐ کامیابی ہوئی۔ اگر وہ فرقہ وارانہ عداوت ختم ہو سکتی تھی تو آج ابھی مسلمانوں کے اندر کی فرقہ واریت اسلامی

انقلاب کی راہ میں مستقل رکاوٹ نہیں ہے۔ مسلسل کام کرتے رہنے سے اس رکاوٹ کا بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔

سوال   اسلامی انقلاب معاشی دائرہ میں کیا انقلاب لا سکتا ہے؟

جواب   سب سے بڑا انقلاب تو معاشی دائرہ میں ہی آئے گا۔ سرمایہ کاری کی فضا کو برقرار رکھ کر سرمایہ داری کو ختم کرنا قرآن اور اسلام کا ہدف ہے۔ جہاں تک زمینداری نظام کا تعلق ہے 'امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ وغیرہ کے نزدیک مزارعت ناجائز ہے۔ لیکن چونکہ ملوکیت کا دور چل پڑا تھا اس لئے فقہا نے قانون ضرورت کے تحت غیر حاضر مالک اراضی کے لئے مزارعت کو تسلیم کر لیا جس طرح ہم مارشل لاء میں بہت سی غلط باتیں مان لیتے ہیں 'ایسے ہی دور ملوکیت کی وجہ سے مزارعت کے سلسلہ میں اسلام کے اصل قوانین نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پھر ہمارے ہاں تو قاضی ثناء اللہ امرتسری یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہاں زمین کی ملکیت ہے ہی نہیں۔ برصغیر کی زمین مفتوحہ ہے۔ اس لئے یہ خراجی زمین ہے اور حکومت کی ملکیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت ساری زمین کو سرکاری ملکیت قرار دے کر نیا بندوبست اراضی جو قوم کے مفاد میں ہو' نافذ کر سکتی ہے۔ میں برسوں سے یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن اخبار والے اسے تو اہمیت نہیں دیتے' پردہ وغیرہ کے متعلق باتوں کو زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔

(ماخوذ از شمارہ مئی)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ٥

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

جمیل الرحمٰن

قاضی حسین احمد کو شاید یاد نہیں

"ندا" کے پچھلے شمارے میں امیر جماعت اسلامی پاکستان، جناب قاضی حسین احمد کا جو انٹرویو ہم نے شائع کیا شاید اس کے مقطع میں آ پڑی تھی سخن گسترانہ بات، کہ ہمارے ایک مہربان قلمی معاون کا یہ مراسلہ آ پہنچا۔ جمیل الرحمٰن بھولا والے (۲۴ر جاپان مینشن نمبر ۲، پریڈی سٹریٹ۔ کراچی - ۳) علیل رہے اور اسی باعث تا حال ہمیں ان کا قلمی تعاون میسر نہ ہوا تھا۔ لیکن اس انٹرویو نے ان کے قلم کو تحریک دی۔ وہ "گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہوئے تو ہیں" ۔ اگست ۱۹۴۵ء سے اگست ۵۸ء تک جماعت اسلامی کے رکن رہے اور اب تنظیم اسلامی کے رفیق سفر ہیں۔ جماعت اسلامی کے ساتھ عمر عزیز کے تیرہ سال گزارنے کے بعد انہیں اتنا حق تو ضرور حاصل ہوا ہے کہ کچھ اپنی بھی کہیں۔ ان ہی کی تحریر بلا تبصرہ یہاں دے رہے ہیں کیونکہ ع ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی .... مدیر

آپ نے محترم قاضی حسین احمد، امیر جماعت اسلامی پاکستان کا انٹرویو پوری صحافیانہ دیانت داری سے اپنے قارئین تک پہنچایا ہو گا۔ تاہم مجھے محترم قاضی صاحب کے اس بیان سے اختلاف ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور نے کسی جماعتی پلیٹ فارم اور کسی فورم سے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہو کہ مولانا مرحوم ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے نتائج سے بد دل ہو کر اس فیصلے پر پہنچ گئے تھے کہ انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ میں آپ کو ہفت روزہ "طاہر" لاہور کی اشاعت ۵ر تا ۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء کا ایک افتتاحیہ بھیج رہا ہوں جو مولانا مرحوم کے خیال کی صدائے بازگشت تھی اور ماہنامہ "میثاق" لاہور کے فروری ۱۹۸۸ء کے شمارے میں جس کی نقل شائع ہوئی ہے۔ براہ کرم اسے شامل اشاعت کیجئے۔

محترم قاضی صاحب کی خدمت میں مودبانہ عرض ہے کہ انہوں نے اپنے انٹرویو کے اس حصہ میں مغالطہ دینے کی یا تو دانستہ کوشش کی ہے یا عدم واقفیت کی بنیاد پر غیر دانستہ طور پر ان کی اس بات میں مغالطہ شامل ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں راقم ایک تفصیلی مضمون لکھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ البتہ فوری طور پر قاضی صاحب مدظلہ کی خدمت میں اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ کہیں دھواں دیکھ کر ہی یہ حکم لگایا جاتا ہے کہ وہاں آگ لگی ہوئی ہے۔

ہماری معلومات کے مطابق ہفت روزہ "طاہر" لاہور جماعت اسلامی کے موئیدین و متفقین کا پرچہ تھا۔ اس نے مولانا مودودی مرحوم کے بیان سے منسوب کر کے جب لکھا ہے کہ "سید مودودی نے کیا فرما دیا؟ یہ کہ انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں۔ اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جا سکتا ہے ... ' تو اس میں لازماً صداقت ہے۔

اس ضمن میں راقم مولانا سید وصی مظہر ندوی (موجودہ ایم۔ این۔ اے) جو ۵۸ء سے ۸۰ء تک جماعت کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے ہیں، کے ایک انٹرویو کی طرف محترم قاضی حسین احمد کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے جو ملک کے موقر اور

کثیر الاشاعت روزنامہ "نوائے وقت" میں مئی ۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا موصوف نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا۔

"مولانا مودودی بھی بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچ چکے تھے (کہ

سیّد مودودی نے کیا فرمادیا ہے — یہ کیا کہہ دیا انہوں نے ہے — انتخابات اسلامی انقلاب کا واحد ذریعہ نہیں ہیں، اور وضاحت اس کی یوں کی کہ جمہوریت میں اور بھی بہت سے ذرائع ہیں جن سے کام لیا جاسکتا ہے، اگر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہم خیال بنایا جائے، اس راستے میں آنے والی رکاوٹوں کی پرواہ نہ کی جائے، قید و بند کی صعوبتیں بھی درپیش ہوں تو راہِ مستقیم نہ چھوڑی جائے۔ آبادی کے بڑے حصے میں زیادہ سے زیادہ لٹریچر پھیلایا جائے۔ جب آبادی کی کثیر تعداد ہم خیال ہو جائے گی، تو حکمرانوں پر دباؤ ڈالا جاسکے گا اور انہیں جھکنے پر مجبور کیا جاسکے گا۔ دلیل اس کی یوں دی کہ ماضیٔ قریب میں ہندوستان سے انگریز کو بھگا لے کے لیے اسے کسی انتخاب میں شکست نہیں دی گئی تھی، بلکہ رابطۂ عوام کے ذریعے ہی بھگایا گیا تھا۔

سیّد محترم کے ان خیالات کو بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے، کیا کہہ دیا انہوں نے؟ اس نتیجے پر پہنچے بغیر چارہ نہیں رہے گا کہ جناب سیّد نے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے، اسے واشگاف کیا ہے اور بھٹک بھٹک کر مایوس ہو جانے والوں یا چل چل کر تھک جانے والوں کو امید سے آگاہ کیا ہے، ذوقِ سفر سے ان کا تعارف کرا دیا ہے۔

انتخابات کے ذریعہ سے اسلامی نظام کا قیام عمل میں نہیں آ سکتا) دسمبر ۷۵ء کی جماعت کی شوریٰ میں شدید علالت کے باوجود بیس منٹ کی جو مختصر تقریر انہوں نے کی تھی، اس میں انہوں نے صاف صاف کہا تھا کہ میں نے بالغ رائے دہی کی وکالت کی ہے لیکن میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ میری غلطی تھی اور یہ امت کی قسمت کو جاہلوں کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تقریر میں انہوں نے یہ بات بھی کہی تھی کہ اس ملک میں آج تک کوئی شخص بھی انتخابی طریقے سے برسرِ اقتدار نہیں آیا بلکہ جو شخص نمبر دو پر کھڑا تھا اسی نے جگہ سنبھال لی۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ میں اس بات کی زیادہ وضاحت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ نمبر دو پر کھڑے ہونے سے میری مراد کیا ہے؟ مولانا مودودی کی یہ تقریر شوریٰ کی کاروائی میں مکمل طور پر درج ہے"

اگلے سوال کے جواب میں مولانا وصی مظہر ندوی نے حسب ذیل جواب دیا۔

"میری پاس شواہد موجود ہیں کہ مولانا مرحوم اپنی زندگی کے آخری دنوں میں جماعت کی موجودہ قیادت سے قطعاً مایوس ہو چکے تھے۔ ایک بار تو نوبت یہاں تک آئی کہ مولانا مودودی کو ان قائدین کے خلاف اخبارات میں بیان جاری کرنا پڑا جس میں انہوں نے میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ لوگ جماعت اسلامی کو چلانے کے لئے لیڈر بنائے گئے ہیں جماعت کو ختم کرنے کے لئے نہیں۔ جماعت کے رہنماؤں نے اس بیان کو KILL کرانے کی بے حد کوشش کی لیکن وہ بعض اخبارات میں شائع ہو ہی گیا"۔

"ہفت روزہ طاہر لاہور" کی مذکورہ اشاعت میں غالباً اسی بیان کا حوالہ ہے بہرحال راقم نہایت ادب کے ساتھ محترم قاضی حسین سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہے کہ کیا اس دور میں جماعت اسلامی نے مولانا مرحوم کے اس بیان کی کوئی تردید شائع کی تھی؟ یا کوئی ایسی بات اشاعت پذیر ہوئی تھی جس میں اس امر کا اظہار کیا گیا ہو کہ مولانا مرحوم نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ اس بیان کی مولانا کی طرف نسبت غلط ہے! اگر قاضی حسین صاحب قبلہ ایسی کوئی شہادت اخباری سطح پر فراہم کر سکیں تو مستقبل کے مورخ کو "جماعت اسلامی" کی صحیح تاریخ اور اس کے مختلف اقدامات کے بیان میں بڑی مدد ملے گی۔

(ماخوذ از شمارہ ۳۶)

"مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق"
اور ـــــ جنرل فتحی رزق

ہمارے وہ بھائی بھی قرآن مجید کا یہ حق تو اپنے اوپر واجب سمجھتے ہیں جنہوں نے اس کتاب ہدایت کو کبھی کھول کر نہیں دیکھا' کہ اسے چوم چاٹ کے گھر میں کسی اونچی جگہ پاک صاف ریشمی کپڑے کے غلاف میں لپیٹ کر رکھنا چاہئے لیکن اس کا حق ادا صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب اس پر ایمان رکھا جائے' اس کی باقاعدہ اور بلا ناغہ تلاوت کی جائے' اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے' سمجھ کر دوسروں تک پہنچایا بھی جائے اور پھر اس پر نیک نیتی اور ارادے کی پختگی کے ساتھ عمل کیا جائے۔
ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے انہی پانچ حقوق کی' دو اور دو چار کی طرح سمجھ میں آنے والی اور دل میں اتر جانے والی تشریح سالہا سال پہلے اپنی ایک تقریر میں کی تھی جو بعد میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ چھوٹی سی کتاب اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی اور اس کا ترجمہ انگریزی' عربی' فارسی' سندھی اور پشتو میں بھی ہو چکا ہے۔

رمضان المبارک کو قرآن مجید سے جو خصوصی نسبت ہے' اس کے حوالے سے برکتوں والے اس مہینے میں مذکورہ کتاب کو وسیع پیمانے پر پھیلایا جاتا ہے۔ اس کتابچے پر علماء' رجال دین' اہل قلم اور عام پڑھنے والوں نے جن آراء کا اظہار کیا' وہ اپنی جگہ۔ میں تو

Gen. Fathy Rizk

Ex. Minister Of Industry

37, TALAAT HARB STREET, CAIRO
CABLE : UNICONSULT CAIRO

TEL. { B. 74650
DLE. 49944

یہاں ایک تاثر بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ قیامِ سعودی عرب کے دوران میری ملاقات مصری جنرل فتحی رزق سے رہی جو میرے سعودی دوست کی بہن کے خسر تھے اور کچھ دن ارضِ پاک میں گزارنے کے لئے وہاں آئے ہوئے تھے۔ وہ جنرل نجیب کے ساتھیوں میں سے اور اُس وقت بھی مصری فوج میں جنرل کے رینک پر اور "کوارٹر ماسٹر جنرل" کے اہم و حساس عہدے پر فائز تھے جب جمال عبدالناصر محض ایک کرنل تھے۔ تاہم اپنے پختہ دینی مزاج کے باعث وہ شاہ فاروق کا تختہ الٹے جانے پر جنرل نجیب کے ساتھیوں میں شمار ہوتے تھے۔ انقلاب کے بعد کرنل ناصر نے جب جنرل نجیب کو بھی اپنے راستے سے ہٹا دیا تو جنرل رزق کا "کیو۔ ایم۔ جی" جیسے کلیدی منصب پر فائز رہنا ان کے اصل ارادوں کے آڑے آتا تھا۔ چنانچہ انہیں "ترقی" دے کر وزیر پیداوار بنا دیا گیا اور یوں فوج سے ان کی چھٹی

ہو گئی۔ اُن دنوں وہ قاہرہ میں مشاورت کا نجی کاروبار چلا رہے تھے۔
میری ان کے ساتھ طویل نشستیں اور لمبی چوڑی گفت و شنید رہی۔ دین کا درد انہیں بہت بے چین رکھتا اور مسلمانوں کی زبوں حالی انہیں بھی بہت کھلتی تھی۔ میں نے اسی سیاق و سباق میں اپنے بھائی 'ڈاکٹر اسرار احمد' کے کام کا ذکر کیا لیکن ان کے تعارف کے لئے میرے پاس ان کی وہ بنیادی کتابیں موجود نہ تھیں جن سے ان کا فکر اور طریقہ کار واضح ہوتا ہے اور جو میں انہیں مطالعے کے لئے دیتا تو میرا کام آسان ہو جاتا۔ حسن اتفاق سے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا انگریزی اور عربی ترجمہ میرے پاس موجود تھا' وہ دونوں میں نے ان کو پیش کر دیئے۔ اگلے روز تشریف لائے تو چہرے بشرے پر بشاشت تھی۔ از سر نو مجھ سے اپنے بھائی کے کام اور ان کی تحریک کے بارے میں تفصیلات معلوم کیں جیسے پہلے وہ میری یہ باتیں سنی ان سنی کرتے رہے ہوں اور گہرے تاثر کے ساتھ کہنے لگے "سیدؒ اقتدار! میں نے یہ کتاب انگریزی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ میں پورے شعور اور اطمینان سے یہ گواہی دیتا ہوں کہ اسے لکھنے والا شخص کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب اس کی راست روی کی ضامن رہے گی" (اقتدار احمد)

(ماخوذ از شمارہ ۸)

روزوں کے دن اور تراویح کی راتیں

رمضان المبارک کے دن اور اس کی برکتوں والی راتیں پاکستان میں تو گزاری ہی ہیں' ان کا نقشہ حرمِ مکی' حرمِ نبویؐ' جدہ' لیبیا' لبنان اور مصر میں بھی دیکھا۔ بشرط زندگی ماہ مبارک کے باقی شماروں میں ان کا ذکر بھی ہو گا۔ اس موقع پر عملی افادیت کے اعتبار سے رمضان میں شب بسری کے اس منظر کی لفظی تصویر پیش کرنا چاہوں گا جو لاہور میں جامع قرآن اکیڈمی (۳۶۔ کے بلاک۔ ماڈل ٹاؤن) میں گذشتہ تین سال سے دیکھنے کو مل رہا ہے۔ شاید کسی پڑھنے والے کے شوق کو مہمیز لگے اور وہ اسی سال اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے پہنچ جائے۔

قرآن اکیڈمی کی مسجد میں عشاء کی اذان دوسری مساجد کے مقابلے میں آدھ پون گھنٹہ تاخیر سے ہوتی ہے۔ جماعت کے بعد موکدہ سنتیں پڑھتے ہی لوگ جانب قبلہ ان متعدد الماریوں کا رخ کرتے ہیں جن میں مصحف کے سینکڑوں نسخے موجود رہتے ہیں۔ آن واحد میں مسجد کے ہال اور صحن میں درجنوں پست اور لمبے لمبے بنچ پھیل جاتے ہیں جو عام مساجد میں بھی تلاوت کے لئے قرآن مجید کو رکھنے کی غرض سے استعمال ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ مصحف کے ساتھ ہی اپنی اپنی نوٹ بکس اور قلم بھی کھول کر مستعد ہو بیٹھتے ہیں۔ اب ڈاکٹر اسرار احمد اللہ کا نام لے کر تراویح کی پہلی چار رکعتوں میں پڑھے جانے والے قرآن کریم کے حصے کا ترجمہ اور مختصر تشریح اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ شان نزول' زمانہ نزول اور اس سے مضمون کی مناسبت واضح ہوتی اور اللہ کے رفیع الشان کلام کا ربط' معنی اور مفہوم ہی ذہن میں محفوظ نہیں ہو جاتا بلکہ پوری پوری آیات کچھ دیر کے لئے ہی سہی' حافظے میں بیٹھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد مشینی پھرتی سے لوگ بنچ ایک کونے میں رکھتے اور نماز کے لئے کھڑے ہو کر قرآن مجید کا وہی حصہ چار تراویح میں ایک خوش الحان حافظ سے سنتے ہیں جو الفاظ مبارکہ کے موتی اس روانی اور خوبی سے قرات کے ملکوتی ترنم میں پروتے ہیں کہ ایک ایک نگ الگ الگ شمار ہو سکے۔ آواز کا زیر و بم بھی معانی سے مناسبت رکھتا ہے اور سننے والوں کے کان ہی آواز نہیں سنتے' دل و دماغ بھی پیغام ربانی وصول کر رہے ہوتے ہیں کہ چند منٹ پہلے ہی وہ اس کا مفہوم اپنی زبان میں سن چکے ہیں۔ ہر چہار رکعت سے پہلے یہ عمل دہرایا جاتا ہے۔ پہلی آٹھ رکعت کے بعد پندرہ منٹ کا وقفہ کیا جاتا ہے جس میں قرآن اکیڈمی کی طرف سے چائے کا الگ انتظام ہوتا ہے اور خوش حال طبقے سے تعلق رکھنے والے نمازی اپنی تھرمس الگ لاتے ہیں۔ حلقوں میں بیٹھ کر لوگ ایک دوسرے کی تواضع اپنے اپنے مخصوص مشروبات سے (بلکہ ماکولات سے بھی) کرتے اور اگلی بارہ رکعت کے لئے توانائی ذخیرہ کر لیتے ہیں

جس میں مزید کوئی وقفہ نہیں ہو گا۔ بیانِ قرآن اور تراویح کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے' رات بھیگتی جاتی ہے' ماحول میں خاموشی کا راج ہو جاتا ہے اور کانوں کو ایک ہی نغمہ سنائی دیتا ہے جسے ع۔ روح سنے اور روح سنائے۔

صبح کاذب جوں جوں نزدیک آتی ہے کلام ربانی کی شان و شکوہ میں حلاوت اور تاثیر بڑھتی جاتی ہے۔ دماغ تکان اور نیند کے غلبے سے جتنے بوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں دلوں کی کھڑکیاں اتنی ہی زیادہ وا ہوتی جاتی ہیں۔ اس کیف و سرور کا بیان الفاظ میں ہو تو کیسے جو صرف محسوس کی جا سکنے والی چیز ہے۔ بیس تراویح یوں مکمل کر کے اور تین وتر با جماعت پڑھ کر جب لوگ فارغ ہوتے ہیں تو سحری کا وقت ختم ہونے میں بس اتنا وقت باقی ہوتا ہے کہ بھاگ دوڑ کے اپنے اپنے گھر پہنچیں اور روزے کی نیت سے پہلے کچھ کھا پی لینے کی سنت تازہ کر لیں۔

یہ معمول جامع قرآن اکیڈمی میں گذشتہ تین سال سے جاری ہے۔ پہلے دو سال ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے یہ کٹھن کام خود کیا' تیسرے سال ان کے شاگرد ان رشید نے لاہور شہر میں قرآن اکیڈمی سمیت تین چار جگہ اسے پھیلایا اور اس سال ڈاکٹر صاحب خود ہی جامع قرآن اکیڈمی میں یہ بھاری پتھر پھر اٹھا رہے ہیں۔ پورے ماہ مبارک میں قرآن کے ساتھ رات گزارنے کا یہ انداز میری محدود معلومات کی حد تک تو کہیں اور اپنایا نہیں جا رہا۔ اگر کہیں ایسا ہو رہا ہے تو مبارک ہے' مسعود ہے اور مطلوب بھی ہے۔ رمضان میں شب بسری کا یہ ڈھنگ اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکن روح کی پیاس رکھنے والوں کو بہت بھایا جو تراویح کے عام انداز سے' جس کے باعث الحمد للہ کہ ہمارے شہروں کے گلی کوچے عشاء کے بعد گھنٹہ پون گھنٹہ تلاوت سے گونجتے تو رہتے ہیں' تشنگی محسوس کرتے اور اِلّا ماشاء اللہ ان کی افادیت سے مایوس ہو کر اس اجتماعی نفلی عبادت کو ترک ہی کر بیٹھے تھے۔ (اقتدار احمد)

(ماخوذ از شمارہ ۔

عَنْ اَبِیْ رُقَیَّةَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسٍ الدَّارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ
اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:۔

"اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ"

قُلْنَا: "لِمَنْ؟" ـــــــــ قَالَ
"لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ"

ـــــــ (رواہ مسلم) ـــــــ

ایک عاشقِ قرآن

بلحاظ حیثیت و مرتبہ محترم اور عمر کے اعتبار سے عزیزم مجیب الرحمٰن شامی ملک کے معروف صحافی اور ہمارے مہربانوں میں شامل ہیں۔ وہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد ' ان کے انقلابی فکر اور ان کی جماعت "تنظیم اسلامی" سے بڑی حد تک متعارف ہیں اور بالعموم ان سب کے بارے میں اچھی ہی رائے رکھتے ہیں لیکن اپنی وسیع المشربی اور روایتی رواداری کے باعث "اندھیرے اجالے وہ چوکتے بھی نہیں" ۔ ان کی کمین گاہ کی طرف سے ڈاکٹر صاحب موصوف کو طنز (اور بعض اوقات استہزاء بھی) کے تیروں کا اکثر سامنا رہتا ہے۔ انہیں مذہبی ' دینی ' سیاسی ' صحافتی اور حکومتی حلقوں میں غیر معمولی طور پر یکساں رسائی حاصل ہے چنانچہ اس طرز عمل کی وجہ سمجھ میں بھی آتی ہے۔ وہ قرآن اکیڈمی سے سکونتی قرب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اکثر جہری نمازیں اسی کی مسجد میں پڑھتے اور ان دنوں وہاں رمضان المبارک کی راتوں کی بہار لوٹ رہے ہیں۔ برادر محترم کے دورۂ ترجمہ قرآن پر ان کا تاثر موقر روزنامہ نوائے وقت کے جلسہ عام میں پڑھا (جس کا متعلقہ حصہ اسی صفحے پر نقل کیا جا رہا ہے) تو صاف محسوس ہوا کہ یہ تحریر صحافی شامی کی نہیں ' اس مجیب الرحمٰن کی ہے جو ان کے اندر مستور ہے اور جو شدت احساس سے مغلوب ہو کر تصنع اور بناوٹ ہی سے نہیں ' رائج الوقت صحافت کی مصلحتوں سے بھی بغاوت پر اتر آیا ہے۔

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم داعی و عاشق قرآن ' ڈاکٹر اسرار احمد ' سے قریبی تعلق اور نسبت رکھتے اور ان کی مدح میں کچھ کہتے رسم و دستور زمانہ کے مطابق ' برے لگتے ہیں ورنہ ان کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں ' بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا۔ ان کے لئے تو ہم محاورتاً نہیں واقعی گھر کے بھیدی ہیں ہی متعدد مذہبی پیشواؤں اور دین کے داعیوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کے مواقع بھی وافر ملے لہٰذا تقابل اور موازنے کی استعداد بھی رکھتے ہیں۔ ہم سے بہتر کسے معلوم ہے کہ اگر وہ دنیا کمانے اور منصب و جاہ کی طلب میں اپنی توانائیاں صرف کرتے تو آج ان کا شمار اس ملک کے چوٹی کے چند افراد میں ہوتا۔ انہیں بھی اللہ نے چار ہونہار بیٹوں اور پانچ سعادت مند بیٹیوں سے نوازا ہے۔ بیٹے ذہانت و فطانت اور قابلیت میں کسی سے کم نہیں۔ مروج تعلیم میں بھی پیچھے نہ رہے۔ اعلیٰ وارفع ڈگریوں کے لئے باہر بھی جا سکتے ہیں لیکن ایک چھوٹے کو چھوڑ کر جو ہنوز لڑکپن میں ہے ' تینوں باپ کے ساتھ ہمہ وقت و ہمہ تن اس کے مشن کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ دو قرآن کے پورے حافظ ہیں اور تیسرا بھی آدھا نہیں تو ایک تہائی ضرور ہو گا۔ آج قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ہر روز جو محفل یک شب جمتی ہے ' اس میں باپ اگر عشق و فہم قرآن کے موتی بکھیرتا ہے کہ یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر اور اسی سے فقیری میں ہے وہ امیر تو ایک بیٹا تراویح میں کلام ربانی کو پڑھتا اور ان موتیوں کو لحن داؤدی کی لڑی میں پروتا ہے۔ دوسرا ایم بی بی ایس ہونے کے باوجود اگرچہ اسی محفل کی آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ اور متعلقہ انتظامی امور کی نگرانی کرتا ہے ' تاہم اگر وہ بھی قرآن سنانا شروع کرے تو (جیسے بقول لتا "جی" مہدی حسن خاں کے گلے میں بھگوان بولتے ہیں) اس کے گلے میں باذوق سامعین کو مرحوم و مغفور شیخ خلیل حصری بولتے محسوس ہوں۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی بیٹیاں لاہور کالج فار ویمن میں تعلیم حاصل کر سکتی تھیں لیکن ان میں سے کسی نے اگر سکول کا منہ دیکھا بھی تو

پانچویں جماعت تک۔ بعد میں ایف۔ اے کی "اعلیٰ تعلیم" سب نے نوکرانیوں کے بغیر گھر کو سنبھالتے' بچے شرعی پردے میں رہ کر پڑھتے اور پرائیویٹ امتحان دے کر حاصل کی۔ ان کی شادیاں بھی بڑے گھروں میں کی جا سکتی تھیں جن سے اثرورسوخ میں اضافہ ہوتا لیکن ان رشتوں کا واحد معیار دین کے انقلابی فکر سے ذہنی اور عملی ہم آہنگی کو رکھا گیا۔ یہ سب باتیں عاشقِ قرآن کی زندگی کے صرف ایک پہلو کے بارے میں ہیں۔ اس کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچا ہو تو بات بہت لمبی ہو جائے گی اور ع ہم کہیں اور سنا کرے کوئی

ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے قوم کی محرومی پر جس کے ارباب حل و عقد نے اس عاشقِ قرآن کا گلا گھونٹنے میں اپنی سی کوئی کسر نہ رہنے دی۔ اس آواز کو بند کر کے چھوڑا جو ملک میں ہی نہیں' سرحد پار کر کے سکھوں تک کے دلوں میں بھی گھر کر رہی تھی۔ وزارت اطلاعات کی وہ فائلیں آخر ایک روز تو کھلیں گی جن میں اخبارات کو لیفٹننٹ جنرل مجیب الرحمٰن کے "ڈائریکٹیوز" منقل ہیں کہ اس شخص کی کردار کشی کی جائے یا پھر ذکر ہی نہ ہو۔ اعلیٰ ترین سطح پر کی گئی اس سازباز کا پردہ کبھی تو چاک ہو گا جو اس کے مقابلے میں بظاہر مماثل شخصیات کو کھڑا کرنے اور اسی کی طرح کے نظر آنے والے ادارے کھولنے کے لئے ہوتی رہی تاکہ کسی بہانے اس کی قرآنی دعوتِ انقلاب کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹے۔ زمانے کا چلن ہمیشہ یہی رہا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

کیسی گھٹیا سوچ تھی ان حیلہ سازوں کی۔ لیکن انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کی ذات کا کیا بگاڑ لیا؟ انہیں اللہ تعالیٰ اپنی نیت میں خالص اور اپنے ارادوں میں مستحکم رکھے۔ دنیا میں ستائش کی تمنا اور صلے کی آرزو نہ انہیں پہلے تھی اور نہ انشاء اللہ آئندہ کبھی ہو گی۔ انہیں حرص تھی تو یہ کہ قرآن کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ اس کے لئے جو وسائل انہیں میسر ہیں' ان کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ وہ اپنا اجر کما لے جائیں گے اور کیسی قابلِ رشک ہے یہ کمائی!

(ماخوذ از شمارہ ۱۸)

صاحبِ میزان

کوئی بولے تو اپنا بول پہلے ہم سے تُلوائے

خواہ مخواہ در آمدی

لاہور کے ایک موقر اردو روزنامے میں ایک صاحب
ں معاملات دینی میں اپنے رسوخ پر بڑا مان ہے' ایک
ن نصب کئے یوں تن کے بیٹھے ہیں جیسے زبان حال سے کہہ
ہوں کہ زنہار! جو کوئی دین کے معاملے میں علم کا دعویٰ
ے' قبل اس کے کہ ہم سے اس کی سند حاصل کی جا چکی
گویا ع

کوئی بولے تو اپنا بول پہلے ہم سے تُلوائے

رمضان المبارک میں تراویح' ختمِ قرآن اور دورۂ ترجمہ
ن کا غلغلہ ہوا تو انہیں یاد آیا کہ "اوہو! اس سارے سلسلے
میری اجازت تو شامل ہی نہیں"۔ پھر کمال مہربانی سے
ں نے تراویح کی تو اجازت دے دی کہ گیارہ پڑھ لو
ں حدیث دوست آٹھ جمع تین وتر ہی پڑھتے ہیں)' یا ۲۳
لے جاؤ (پاکستان میں اہلسنت کے باقی مسالک کے لوگ
جمع تین پڑھتے ہیں) اور بہت ہی "اوکھے" ہو تو جاؤ
بس پڑھو۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کسی سخی سے واسطہ پڑا
تاہم کسی خاص تعداد کو متعین کرنے کا پروانہ وہ ہرگز
ی نہ کریں گے کہ اس کے لئے دین میں کوئی بنیاد موجود
۔ "خواہ مخواہ" کو دین کے علم میں بس شُدبُد ہی حاصل
لہٰذا ان کی دلیل کا کوئی توڑ تو اس کے پاس موجود نہیں۔
اتنی بات ضرور اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے
ب سنی ہے کہ میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہ ہو گی۔ سو
وہ دیکھتا ہے کہ گیارہ رکعت اور ۲۳ رکعت میں صرف
ن ہی موجود نہیں بلکہ پوری امت میں اس پر عمل کا تواتر بھی
جاتا ہے۔ قرآن مجید کو پورے ماہ مبارک کی تراویح میں پورا
پڑھنے اور بڑے اہتمام سے ختم کرنے کا طریقہ بھی ہمیشہ سے
رائج چلا آ رہا ہے تو وہ سخت پریشان ہو جاتا ہے کہ چودہ صدیاں
لوگوں نے خواہ مخواہ مشقت اٹھائی۔ کاش یہ میزان بہت پہلے
نصب کی جا چکی ہوتی۔

ویسے صاحبِ میزان کا "لاسٹ نیم" اور "خواہ مخواہ"
کے نام کا آخری حصہ ہم وزن اور ہم قافیہ ہے۔ عجب نہیں کہ
وطن مالوف یعنی بلادِ عرب میں ہم دونوں کے قبیلے ایک
دوسرے کے پڑوسی رہے ہوں۔ وہاں کا معمول بھی یہی سننے
میں آیا ہے جو کچھ ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ مسجد حرام ہو یا مسجد
نبوی' دونوں جگہ تراویح کی بیس جمع تین رکعتوں کا تعین بھی
ہے اور ان میں قرآن حکیم ختم کرنے کا دستور بھی قدیم زمانے
سے چلا آ رہا ہے۔ گونہ مشکل وگرنہ گونہ مشکل۔ "خواہ
مخواہ" کو خواہ مخواہ کی مصیبت میں ڈال کر صاحبِ میزان کو کیا
ملا۔ وہ اگر یہ سمجھے کہ صاحبِ میزان ڈنڈی مار رہے ہیں تو مشکل
اور اس نتیجے پر پہنچے کہ آج تک قال اللہ اور قال الرسول کو
اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے والے سب لوگ دین کی بنیادوں سے
ناواقفِ محض تھے تو مشکل۔

لیکن نہی عن المنکر تو دکھتی رگ کو چھیڑنا ہے جس سے گدگدی نہیں ہوتی، تاؤ آتا ہے

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ شوریٰ ہے سوار

خواہ مخواہ درآمدی

سرراہے کسی بھلے آدمی کی حس شامہ کے استقبال کو جس کیلئے "مین ہول" سے بدبو کا بھبکا اٹھے گا اسے وہ "گٹر" نہ کہے تو اور کیا کرے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر مین ہول "گٹر" نہیں ہوتا۔ سو اگر ڈاکٹر اسرار احمد نے بھی موجودہ صحافت کو "گٹر" کہا تھا تو موقر روزنامہ نوائے وقت کے کالم نویس کو ان کی بات آج گالی بن کر کیوں لگی۔ کہیں اس کی وجہ یہی تو نہیں کہ ان کے چھوٹے بھائی 'اقتدار احمد سلمہ نے اسی شہر لاہور سے ایک صاف ستھرا ہفت روزہ نکال کر دکھا دیا۔ "خواہ مخواہ" بھی مسجد دارالسلام ہی ڈاکٹر صاحب کے خطبات جمعہ کا باقاعدہ سامع ہے۔ اسے معلوم ہے کہ صحافت کو یہ نام انہوں نے بہت پہلے دیا تھا اور اس وقت تک ان کے برادر خورد نے صحافت میں قدم نہیں رکھا تھا۔

لاہور میں اخبارات کا کون قاری نہیں جانتا کہ سنجیدہ قومی صحافت کے اس تالاب کے جل کو کس مچھلی نے گندا کیا۔ نوائے وقت سے تو ایک گلۂ محبت آمیز ہے کہ اس نے حمید نظامی مرحوم کی سی اصول پسندی اور استقامت سے کام نہ لیا اور دوسروں کی دیکھا دیکھی اس کا گٹر بھی اُبلنے لگا اور "سرراہے" لکھنے والے معزز کالم نویس کو شاید یاد ہو کہ ڈاکٹر اسرار احمد نے جب بھی اس موقر روزنامے کو مخاطب کیا تو ان کے تخاطب میں حسرت اور نیازمندی کے جذبات ملے جلے تھے۔ یہ معزز کالم نویس ڈاکٹر صاحب پر کچھ زیادہ ہی کرم فرما رہے ہیں لیکن وہ تو بہت پہلے سے اپنی دعوت کے اس مرحلے میں داخل ہونے کے انتظار میں تھے۔ مذاق 'ٹھٹھا مخول اور چٹکیوں میں اڑایا جانا اس راہ کا پہلا سنگ میل ہے جس پر وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر چل نکلے ہیں۔ سرراہ چلتے پھرتے لوگ ہوں یا شیش محلوں میں بیٹھنے والے' شوق سے مشق ستم کریں' انہیں شکایت نہ ہو گی کیونکہ ع

جتنے وہ کرم فرماتے ہیں' سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

اپنے خطبات جمعہ میں ڈاکٹر صاحب ہر موضوع پر تو کھل کر نہیں بولتے البتہ جوق در جوق آ کر مسجد دارالسلام میں نماز ادا کرنے والوں کو دین کی حکیمانہ تعلیمات سے بھی روشناس کراتے ہیں اور کبھی کبھار ملک کے حالات پر اپنی رائے سے آگاہ بھی کر دیتے ہیں کہ انہیں بھی وطن کی اتنی ہی فکر ہے جتنی کسی اور بھی خواہ کو ہو سکتی ہے۔ وہ مروجہ سیاست کے میدان میں اترنے سے پرہیز کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس نے رمز و کنایہ اور داؤ پیچ سے واقف نہ ہوں۔ اصل سبب یہ ہے کہ وہ انقلابی سیاست کے قائل ہیں۔ پاکستان میں ضرورت نظام چلانے والے ہاتھ بدلنے کی نہیں' خود نظام کو بدلنے کی ہے اور یہ تبدیلی انقلابی جدوجہد سے واقع ہو سکتی ہے' انتخابی سیاست سے نہیں۔ "خواہ مخواہ" نے بھی وہ خطبہ سنا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نے پیر' پنڈت' پروہت اور پادری کا ذکر کیا۔ ان (سرراہے کے کالم نگار کے بقول) صفات کے حرف "پ" سے شروع ہونے اور "پ" کے عربی حروف تہجی میں موجود نہ ہونا محض ایک ضمنی بات تھی' ایک لطیفہ سمجھ لیجئے ورنہ بات تو انہوں نے بہت دل لگتی کہی تھی کہ ع کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے۔ (لیجئے "پردے" میں بھی وہی "پ" آ گئی۔ اب اس میں "خواہ مخواہ" کا کیا قصور!)۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اتنے نزدیک ہیں کہ سرگوشیاں بھی سنتے اور دعائیں قبول فرماتے ہیں۔ کسی واسطے اور وسیلے کو درمیان میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں شرط

صرف یہ ہے کہ تم اپنی کہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی بھی تو سنو۔ یہ لطیف نکتہ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو اور وہ صرف "پ" کی گردان کو پنجاب بلکہ پاکستان تک بڑھا لے تو قصور کہنے والے کا نہیں، سننے والے کا ہے کہ وہ اسے "درفنطنی" قرار دے کر اپنی سوجھ بوجھ کا ثبوت دے رہے۔

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

رہی یہ بات کہ برادر خورد کو خود ڈاکٹر اسرار احمد نے صحافت کے "گٹر" میں کودنے کا مشورہ دیا تھا تو جہاں تک "خواہ مخواہ" کو علم ہے مشورہ تو نہیں دیا البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ارادے میں آڑے نہیں آئے۔ شاید انہیں یہ اعتماد ہو کہ بقول کالم نگار ان کا "مقتدی" (اور سرا ہے کا کالم نویس جگر تھام کے بیٹھے کہ مقتدی ہی نہیں "مرید")۔ کا قلم اتنا منہ زور نہیں کہ جائز و ناجائز اور روا و ناروا کی سب حدیں پھلانگ جائے گا۔ اور حضور! یہ "جذبہ برخورداری" کسی کو کیوں برا لگے۔ آج بیٹا اپنے باپ کی نہیں سنتا، کوئی چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کا ایک نیک کام میں ساتھ دے اور اتباع کرے تو واقعی یہ اخباری شہ سرخی کا موضوع ہے، لیکن برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی شوریٰ لوگوں کو خواہ مخواہ تکلیف میں

ڈالے دیتی ہے رہے

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ شوریٰ ہے سوار

ان اعصابی مریضوں سے اظہار ہمدردی ہی کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ "خواہ مخواہ" کا جی ان "تو کون؟ میں خواہ مخواہ" قسم کے حضرات سے یہ پوچھنے کو چاہتا ہے کہ بھائی! تنظیم اسلامی کی مجلس شوریٰ کے ارکان کے غم میں آپ کیوں دبلے ہوئے جاتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا امیر جانے۔ ہاں ان میں سے کوئی آکر آپ کے ہاں پرچہ گزارے کہ دوڑنا، لینا! ہمارے مشوروں کو نہ سنا جاتا ہے، نہ مانا جاتا ہے تو ضرور آپ ان کی مدد کو پہنچئے۔ آخر تو آپ خدائی فوجدار ہیں۔ آپ کے ملک میں، جماعتوں اداروں میں اور ہر سطح کی اجتماعیت میں شورائیت جیسے جاری و ساری ہے اور شیر اور بکری جس طرح ایک گھاٹ سے پانی پی رہے ہیں، اس کے ہوتے ہوئے کس کی مجال ہے جو مشورے کی روح کو مجروح بلکہ مجروح سلطان پوری کرے۔ "خواہ مخواہ" کو تو اتنا پتا ہے کہ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی مشہور عالم مجلس شوریٰ پر تو نوائے وقت کے کالم نویسوں نے کوئی "پوائنٹ آف آرڈر" نہیں اٹھایا تھا، ان کے پیٹ میں اگر مروڑ اٹھتا ہے تو ڈاکٹر اسرار احمد کے شورائی نظام پر۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ بھلے مانسو! شورائیت کی شکل سب جگہ ایک سی نہیں ہوتی۔ ایک ملک کا شورائی نظام کسی تحریک کی مشاورت سے مختلف ہوتا ہے۔ تحریک میں نہ اقتدار و اختیار کی تقسیم کا مسئلہ ہوتا ہے، نہ منفعت اور فوائد میں سے حصہ لینے کا۔ جدوجہد، ابتلاء اور آزمائش سے گزرتی تحریکوں میں اور خاص طور پر ایسی اجتماعیت میں جو کسی ایک پکارنے والے کی پکار پر وجود میں آئی ہو، پاسداری مشاورت کے پیمانے جدا ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کو اس سے کیا؟ آپ تو یہ دیکھئے کہ پکارنے والے، پکار، پاسداری اور پیمانے میں پھر چار "پ" جمع ہو گئی ہیں!

(ماخوذ از شمارہ ۱۲)

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا

اور پیغمبر کہیں گے کہ اے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا

(الفرقان - ۳۰)

"قرآن کے نور سے منور ہر رات شب برات ہے"

ماہِ رمضان المبارک کے دوران قرآن اکیڈمی میں منعقد ہونے والے دورۂ ترجمۂ قرآن کے پروگرام پر تنویر قیصر شاہد کا ایک تاثراتی مضمون جو روزنامہ 'امروز' کے ۱۶ رمئی ۸۸ء کی اشاعت میں طبع ہوا۔

یہ قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور کی مسجد ہے۔

۲۵ رمضان المبارک کی شب! عشاء کی اذان ہو چکی ہے موذن منادی کر چکا ہے کہ آ جاؤ اللہ کی طرف تاکہ تم فلاح پا جاؤ اللہ کے بندے' مختلف مکاتب فکر و مسالک سے تعلق رکھنے والے جوق در جوق قرآن اکیڈمی کی طرف لپکتے چلے آ رہے ہیں کوئی کار میں آیا ہے تو کوئی موٹر سائیکل پر سوار چلا آ رہا ہے' پیدل آنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ ذوق و شوق سے مغلوب ہو کر سبھی اللہ کے حضور حاضری دینے آ رہے ہیں۔ باپردہ خواتین کی بھی ایک کثیر تعداد امنڈتی چلی آ رہی ہے۔ ان کے لئے علیحدہ انتظام کیا گیا ہے۔ مسجد کا اندرونی وسیع ہال آہستہ آہستہ بھرتا چلا آ رہا ہے۔ آخری صفیں بھی اب پر ہو چکی ہیں اب صحنِ مسجد کی صفوں پر نمازی قطار در قطار بڑے نظم کے ساتھ اکٹھے ہو رہے ہیں۔

عشاء کی سنتیں ادا کی جا چکیں تو تکبیرِ اقامت بلند ہوئی فرض نماز کے لئے جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔ امام صاحب کی پر تاثیر پر سوز تلاوتِ قرآن مقتدیوں کے کانوں کو ہی متوجہ نہیں کر رہی دل میں گداز بھی پیدا کر رہی ہے۔ کیوں نہ ہو امام دو رکعتوں کا روائتی نہیں' ایک عاشقِ قرآن ہے۔ خشوع و خضوع کے ساتھ رکوع ہو رہے ہیں۔ سب حاضرین اپنی پیشانیاں مسجودِ حقیقی کے حضور جھکا رہے ہیں۔

فرض عشاء ختم ہو گئے ہیں۔ سب مقتدی بقیہ سنت و نوافل کی ادائیگی میں کھڑے ہو گئے ہیں مسجد کا ہال مکمل طور پر بھر چکا ہے اور باہر صحن بھی لبالب ہے میں نوافل سے فارغ ہو کر تھوڑی دیر کے لئے باہر صحن میں آیا' جو نمازیوں کی کثرت کی وجہ سے تنگیٔ دامن کا شکوہ کر رہا تھا۔ واپس مسجد کے ہال میں آ گیا ہوں اور پھر رات کے پونے دس بجے کے قریب وہ داعی قرآن اپنے سادہ و سفید لباس میں ملبوس' اپنی سادہ اور درویشانہ مسند پر جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ سارے ہال اور صحن میں موجود سینکڑوں انسان بڑے سکون اور اشتیاق سے مسجد کی ان

اطراف میں پھیل جاتے ہیں جہاں قرآن حکیم کے بے شمار نسخے رکھے ہیں۔ لوگ باری باری قرآن شریف کا ایک ایک نسخہ اٹھا کر اپنی اپنی جگہوں پر بڑے مؤدب انداز میں بیٹھے چلے جا رہے ہیں۔ ایک ہجوم عاشقاں ہے لیکن کیا مجال کہ کوئی ایک نفس بھی نظم و ضبط کی حدود کو پامال کر دے۔ بڑی محبت و ارادت کے ساتھ سینکڑوں انسانوں کے ہاتھوں میں مصحف کے نسخے ہیں۔
اور نظریں اس شخص پر مرکوز ہیں جو ان کے سامنے ایک چھوٹی سی چوبی تپائی پر بڑی تقطیع کا ایک قرآنی نسخہ کھولے بیٹھا ہے رنگ گہرا سانولا' داڑھی بھری ہوئی اور مصفا سفید بادل کی مانند! یہ مخدومی ڈاکٹر اسرار احمد ہیں جن کے انوکھے' منفرد اور دین کی حکمت کے عین مطابق انداز تراویح میں شرکت کے لئے یہ سینکڑوں انسانوں کا ہجوم یہاں امنڈ آیا ہے۔ سب کے دلوں میں ایک ہی جوت جگی ہے۔ سب ایک ہی آرزو سے مغلوب ہیں۔ یہ جوت' یہ آرزو کیا ہے؟ قرآن کو سمجھا جائے مقدور بھر' اپنے اپنے ظرف کے مطابق یہ جوت خود ڈاکٹر اسرار احمد نے ہی ان کے دلوں میں جگائی ہے۔ یہ کرشمہ ان کے اخلاص کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ لوگ ساری ساری رات' سحری کے وقت تک' یہاں قرآن ایک ایسے شخص کی زبانی سنتے آتے ہیں جس کے نام کے ساتھ بھاری بھرکم القابات نہیں۔
ساری دنیا میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں اور اسلامی اقدار اور اصول و ضوابط کے مطابق زندگی گزارنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ہیں رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ ہی وہاں وہاں تراویح میں قرآن سنایا جاتا ہے۔ تراویح میں قرآن سننے اور سنانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ قرآنی احکام جو اللہ نے مسلمانوں کے لئے نازل فرمائے ہیں۔ ان کی تجدید ہو جائے بھولا ہوا سبق پھر سے یاد ہو جائے کہ قرآن نازل بھی اسی ماہ میں ہوا تھا' لیکن افسوس کہ اس بھولے ہوئے سبق کو یاد کرنے سے آج کل پورے عالم اسلام کے ایک بڑے حصے میں محض یہ مراد لی جا رہی ہے اور بہت عرصہ لی جاتی رہی کہ بس قرآن حفاظ نے یاد کر لیا اور رمضان شریف کے مہینے میں مقتدیوں کو سنا دیا۔ حفاظ کی ایک کثیر تعداد بھی واقف نہیں' مقتدیوں کی عظیم اکثریت بھی نہیں جانتی کہ جن آیاتِ مبارکہ کی تلاوت کی جا رہی ہے' ان کے مطالب کیا ہیں' ان میں معرفت و حکمت کے کیسے کیسے موتی پروئے گئے ہیں' احکام ہیں تو کیا کیا؟؟ بس ایک مشین کی طرح حفاظِ کرام کی زبان چلتی ہے اور لوگ رکوع و سجود کر کے واپس گھروں کی راہ لیتے ہیں۔ غنیمت ہے کہ ہماری بستیوں کے گلی کوچے اللہ کے کلام سے گونجتے تو رہتے ہیں۔ ثواب بھی بہر حال اس عبادت کا ضرور ملتا ہے لیکن یہ رکوع و سجود اور سماعتِ قرآن روح سے خالی اور اسی نسبت

سے افادے میں بھی کم ہی رہتی ہے۔ قرآن مجید سے مہجوری ایک بہت بڑی کمی تھی لیکن الحمد اللہ کہ خدا نے اپنے بندے ڈاکٹر اسرار احمد کو یہ توفیق ارزاں فرمائی کہ انہوں نے اس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا کہ رمضان شریف کے دوران تراویح میں قرآن لوگوں کو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ یوں سنایا جائے کہ بھولے ہوئے سبق کی ایک بار پھر دہرائی ہو جائے۔ کام بڑا کٹھن ' صبر آزما اور مشکل تھا لیکن ان کی دعوت پر جو سراسر اخلاص پر مبنی تھی ' لوگوں نے لبیک کہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کے بے شمار پروانے ان کے گرد جمع ہونے لگے ' ان کے کان قرآن کے روحانی نغموں کے لئے گویا ترسے ہوئے تھے۔

قرآن کے بھولے سبق کو پھر سے یاد کرنے اور اس سے آشنائی حاصل کرنے کے لئے آج شب بھی قرآن اکیڈمی میں محترمی ڈاکٹر اسرار احمد کے ارد گرد قرآن کے متوالوں کا ایک انبوہِ کثیر جمع تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی کھنک دار آواز میں اعلان کرتے ہیں آج چھبیسویں پارے کی سورۂ ق سے آغاز کیا جائے گا لیکن اس سے قبل انہوں نے گزشتہ شب پڑھی گئی سورت کا خلاصہ بیان فرما دیا تاکہ آج کی سورت کے مضامین سے ربط قائم ہو جائے۔ اسلامی ریاست ' اسلامی معاشرہ اور شہری حقوق اس کے بڑے بڑے موضوعات ہیں۔ لوگ ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک ایک لفظ ' ایک ایک فقرے کو حرزِ جاں بنا رہے ہیں اور پھر سورۂ ق کا آغاز ہوتا ہے ہر طرف قرآن کھل گئے۔ بعض لوگوں نے چھوٹی چھوٹی نوٹ بکس بھی نکال لی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پر خلوص اور پاٹ دار آواز میں قرآن کے پر شکوہ اور عظیم الفاظ رواں ہو گئے ہیں۔ ساتھ ساتھ ترجمہ ہو رہا ہے جہاں جہاں ضروری سمجھتے ہیں ' آیاتِ مبارکہ کی شان نزول اور تھوڑا سا تاریخی پس منظر بھی بتاتے جا رہے ہیں تاکہ سامعین کو قرآن سے مناسب طور پر مستفید ہونے کا موقع مل سکے۔ ان کا لب و لہجہ صاف اور واضح ہے۔ ہر آدمی کو پوری بات واضح طور پر سنائی دیتی اور مقدور بھر سمجھ میں آ رہی ہے۔ بعض مواقع پر تھوڑی دیر کے لئے ڈاکٹر صاحب توقف کرتے ہیں۔ یہ ان کی گفتگو کی مخصوص علامت ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب وہ کوئی خاص بات کہنے والے ہیں جس کی طرف گہری توجہ کی ضرورت ہے۔ سب حاضرین ان کے مزاج سے آشنا ہیں ' اس لئے بھی ہمہ تن گوش ' نظریں ان کے چہرے پر گاڑے ہوئے ان الفاظ کو غور سے سننے کو زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے ہیں کہ مبادا یہ قیمتی الفاظ ان تک پہنچنے سے رہ نہ جائیں۔ بعض اوقات یہی الفاظ جو ڈاکٹر صاحب کے گہرے تدبر و تفکر کا نتیجہ ہیں ' سامعین کو بھی زیرِ نظر سورۃ کا حاصل اور مرکزی خیال محسوس

ہوتے ہیں۔

سورۂ "ق" ختم ہو گئی ہے۔ لوگ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اٹھتے ہیں اور اپنے اپنے قرآن شریف اور چھوٹے چھوٹے بنچوں کو ان کی مخصوص جگہ پر رکھ رہے ہیں، کوئی بدنظمی نہیں، کوئی شور نہیں۔ صفیں ترتیب میں کھڑی ہو گئی ہیں۔ اب چار رکعت تراویح میں حافظ صاحب قرآن مجید کا جو حصہ پڑھیں گے، وہی ہے جس کا ترجمہ، مختصر تفسیر اور جس میں مستور حکمت و دانائی ڈاکٹر صاحب پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ اب جو قرآن پڑھا جانے لگا ہے، وہ مقتدی سامعین کے لئے اجنبی اور سر کے اوپر سے گزر جانے والا نہیں کہ ترجمہ پہلے سنا جا چکا ہے اب تفہیم میں آسانی ہو گئی ہے اور رب ذوالجلال کے محکم کلام کو سمجھنے کا حق بھی ایک حد تک ادا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ حافظ صاحب کا ٹھہر ٹھہر کر قرآن پاک کی تلاوت کرنے کا انداز بڑا ہی دلکش ہے۔ وہ بھی ایک ایک لفظ کو اس کی پوری معنویّت اور شکوہ کے ساتھ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ مقتدیوں میں اکثریت پڑھے لکھے لوگوں کی ہے، ترتیلِ قرآن کا صحیح لطف بھی یہی لوگ اٹھا رہیں۔

چار تراویح ختم ہو گئی ہیں۔ اب پھر قرآن کھل گئے ہیں، ڈائریوں کے اوراق وا ہو گئے ہیں۔ ترجمۂ قرآن پر سر دھنے جا رہے ہیں اور لوگ بھی جنہیں آج پہلی بار یہاں آنے کا موقع ملا ہے، کفِ افسوس مل رہے ہیں کہ رمضان شریف کے پہلے دن ہی یہاں کیوں نہ آ گئے!! جہاں جہاں اللہ کی رحمتوں کا تذکرہ آ رہا ہے، سبحان اللہ سبحان اللہ کے ورد سے لب تر ہو جاتے ہیں اور جہاں وعید آتی ہے، آنکھیں خشیت الٰہی سے نم آلود ہو جاتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہی مقصدِ سماعِ قرآنی ہے جو ہم نے پس پشت ڈال رکھا تھا۔ سوچتا ہوں اللہ نے اپنے بندے کو کیسی قابلِ رشک توفیق سے نوازا ہے کہ خود بھی قرآن پڑھتا ہے سمجھتا ہے، سمجھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرتا ہے، قرآن سیکھتا ہے اور بغیر کسی معاوضے، لالچ اور دنیوی منفعت کے لوگوں کو بھی قرآن سکھاتا ہے، سمجھاتا ہے اور کتابِ مبین سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسولؐ کا ارشاد ہے۔ "تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھانے کی کوشش کرتا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب کی زبانی ترجمہ قرآن جس سلیس اور عام فہم انداز میں ادا ہوتا ہے اسی کے باعث بعض آیات مبارکہ تو یوں لگتی ہیں جیسے سننے والوں پر ان کا نزول آج ہی ہوا ہے اور خاص انہی کے لئے ہوا۔ شاید یہی اعجاز قرآن ہے اور مولانا رومؒ نے بھی یہی کہا ہے کہ قرآن ان لوگوں کو

سمجھانا جو اس سے شناسا نہیں بلاشبہ ایک کٹھن مرحلہ ہے' اس کے لئے گہرے تدبر' صبر' حوصلے اور اپنے معاشرے کی ذہنی حالت پر آ کر بات کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ گویا ایک عالم دین جس نے معاشرے میں اسلامی انقلاب بپا کرنے کا عہد کیا ہو' اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اعلیٰ پائے کا مدبر' صابر' حوصلہ مند اور ماہر نفسیات ہو۔

تراویح کی پہلی آٹھ رکعتیں ختم ہو گئی ہیں قرآن الماریوں اور علیحدہ جگہوں پر رکھے گئے بنچوں پر ادب سے رکھ دیئے گئے ہیں۔ اب پندرہ منٹ کا وقفہ ہے لوگ مشروبات و ماکولات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ چائے کا انتظام اکیڈیمی کی طرف سے بھی کیا گیا ہے لوگ بڑے منضبط انداز میں شائستگی سے چائے وغیرہ پی رہے ہیں۔ خوشحال طبقہ گھر ہی سے تھرموس وغیرہ میں چائے اور شربت کا انتظام کر کے لایا ہے۔ گھروں سے لائی ہوئی خورد و نوش کی چیزیں ایک دوسرے میں تقسیم ہو رہی ہیں۔ کیسی دلکش محفل ہے کیسا دلفریب اور روح افزا منظر ہے۔ میری نظروں کے سامنے ان محفلوں کا نقشہ پھر رہا ہے جن میں رونق صرف ذکر الٰہی سے ہوتی تھی وہ لوگ یاد آ رہے ہیں جن کا اوڑھنا۔ بچھونا تعلیمات قرآنی تھیں' جن کی زندگیاں قرآنی تھیں' جن کی زندگیاں قرآنی تعلیمات کا چلتا پھرتا مرقع تھیں۔ مجھے یہاں ہال میں' ہال سے باہر بچے بھی نظر آ رہے ہیں۔ جو اپنے والدین کے ساتھ اس نورانی مجلس میں آئے ہیں۔ یقین واثق ہے انشاءاللہ جب یہ پورے تناور درخت بن جائیں گے تو ان کی زندگیوں میں بھی قرآن کسی نہ کسی درجے میں ضرور موجود ہو گا انہیں اسلامی معاشرے کے صالح نوجوان بنایا جاسکتا ہے۔

صحن مسجد کے کونے میں مجھے ایک مرد ضعیف نظر آیا ساٹھ ستر اوپر عمر ہو گی' میں قریب گیا اور سلام عرض کیا انہوں نے بڑی شفقت سے سلام کا جواب دیا اور مجھے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا' چھوٹے سے چینی مگ میں وہ چائے نوش کر رہے تھے۔ ہاتھ تھوڑے تھوڑے کانپتے جسم کی جلد ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ کر لٹک رہی تھی آنکھوں کے نیچے گوشت کی ننھی ننھی تھیلیاں تھیں لیکن چہرے پر ایک نورانی جلال تھا۔ میں نے ادب سے کہا "بزرگوارم! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟"

"جھنگ سے۔"

"جھنگ سے؟ اتنی دور سے خاص اسی مقصد سے؟"

"جی جھنگ سے آیا ہوں۔" وہ بولے اور یہاں ایک رشتہ دار کے ہاں قیام پذیر ہوں'

چند روز گزرے تھے کہ میرے ایک شاگرد نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تراویح کے منفرد انداز کا ذکر کیا۔ بس یہی سن کر یہاں آگیا ہوں اور جو امیدیں لے کر آیا تھا ان سے کہیں زیادہ پایا۔ بزرگ تھوڑی دیر کے لئے رکے' کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی ایک چسکی لی اور بولے۔

"بیٹے! میں گیارہ سال سے ایک گورنمنٹ ڈگری کالج کا پرنسپل رہا ہوں' برسوں کیمونزم کے جال میں پھنسا رہا۔ جہالت و ضلالت کی تاریکیوں میں بڑی ٹھوکریں کھائیں ریٹائرمنٹ سے چند سال قبل لندن میں تھا کہ ایک یہودی انگریز کی ایک چھوٹی سی بات سے میرے کیمونسٹ وجود سے اصلی مسلمان کھمبی کی طرح نکل آیا بس اسی دن سے واپسی کا سفر شروع کر لیا تھا اپنے اصل کی طرف! تھوڑا عرصہ پہلے میں نے ڈاکٹر صاحب کی مختصر مگر نہایت مئوثر کتاب "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" پڑھی اور میرے تو گویا چودہ طبق روشن ہو گئے۔ میں نے نہ جانے کتنی مرتبہ اس چھوٹی سی کتاب کو پڑھا ہے رمضان شریف شروع ہوا تو اپنے شاگرد کے کہنے پر یہاں چلا آیا وہ ڈاکٹر صاحب کے حلقے میں شامل ہے۔ "

اتنے میں دوبارہ ڈاکٹر صاحب اپنی مسند پر تشریف لے آئے تھے۔ میں نے بھی بھاگ کر قرآن مجید اٹھا لیا۔ رات کا نصف حصہ گزر چکا تھا' شب کی جوانی ڈھلنے پر آ رہی تھی اس پر سکون ماحول میں ڈاکٹر صاحب کی پر شکوہ آواز میں قرآن کے ایمان افروز ترجمے کی گونج پوری فضا میں تیر رہی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہ تین چار گھنٹے مسلسل اور وہ بھی روزانہ بلاناغہ قرآن کے مشکل مقامات اور دقیق متن پر اس روانی سے گفتگو کرتے ہیں جیسے دوستانہ ماحول میں ٹیبل ٹاک کر رہے ہیں' ان کی استقامت کی داد دیئے بغیر انسان نہیں رہ سکتا۔ آواز جس طرح رات دس بجے گونجتی تھی' اب آدھی رات کے بعد بھی اس میں شمہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ ان کے صاف اور واضح اندازِ تکلم و تخاطب میں قرآن کا ابدی نغمہ ہر دل پر ویسے ہی نازل ہوتا محسوس ہوتا جیسے علامہ اقبال نے فرمایا۔

تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی' نہ صاحبِ کشاف

حاضرین کے چہرے بھی تر و تازہ ہشاش بشاش اور تھکن کے آثار سے عاری شمع محفل اگر پوری طرح ضو فشاں رہے تو پروانوں کی وارفتگی میں کیسے اور کیونکر کمی آ سکتی ہے؟ بعض لوگوں پر دن کی مصروفیات کے باعث غنودگی طاری ہونے لگتی ہے تو بھاگ کر ٹھنڈے پانی سے وضو کر

آتے ہیں اور پھر پوری توجہ سے سماعت قرآن میں محو ہو جاتے ہیں۔
صبح کاذب کے آثار ہویدا ہونے لگے ہیں۔ سورۂ رحمان جسے حضورؐ نے عروس القرآن کا خوبصورت لقب عطا فرمایا' کا ترجمہ ہو رہا ہے۔

"تم اللہ کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

گھڑی کی سوئیاں صبح کے سوا دو بجے کا اعلان کر رہی ہیں۔ قرآن اکیڈمی میں پچیسویں روزے کی تراویح چار ساڑھے چار گھنٹے کے بعد ختم ہو گئی ہیں۔ لوگ گھروں کو جانے لگے ہیں۔ میں بھی باہر نکلا۔ یوں لگا جیسے لوگ عید کی نماز پڑھ کر واپس جا رہے ہوں۔

گھر واپس آتے ہوئے راستے میں مجھے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی بات بڑی یاد آ رہی تھی۔ فرماتے ہیں۔ "میں چھوٹا سا تھا۔ صبح صبح روزانہ قرآن کی تلاوت کرتا تھا۔ ایک روز والد صاحب آئے اور فرمانے لگے تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔ خاصے دن گزر گئے ایک روز جبکہ میں تلاوت قرآن میں مگن تھا' والد صاحب میرے پاس آئے اور بولے۔ بیٹا! قرآن پڑھتے ہوئے خیال کرو کہ یہ بس تم پر نازل ہو رہا ہے۔"

شیخ نور محمد اپنے فرزند ارجمند کو جو نصیحت کرنا چاہتے تھے' اس کی عملی تفسیر میں قرآن اکیڈمی میں دیکھ کر آ رہا ہوں۔ یہ نور کی ایک بہتی گنگا تھی۔ فیضِ عام جاری تھا اور صلائے عام تھی کہ جو چاہے آ کر فائدہ اٹھائے۔

واعتصموا بحبل الله جميعا ولا تفرقوا

فون: ۲۰۲۱۶۶
آصف آٹوز
AA
امپورٹر: ہوز کلمپ آئل گیج، ٹمپریچر گیج، ہارن اینڈ شو لائٹ چائنہ
۶ نظام آٹو مارکیٹ بادامی باغ لاہور
ہول سیل ڈیلر: اے ون آٹو کیبلز

افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ کی ڈاکٹر اسرار احمد سے ملاقات

تنظیم اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت کی جانب سے اخبارات کے لیے جاری کردہ اطلاع

لاہور : ۲۰ مئی ۔ آزاد اسلامی افغانستان کی عبوری حکومت کے سربراہ جناب احمد شاہ احمدزئی نے آج لاہور میں امیر تنظیم اسلامی پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد سے ایک خصوصی ملاقات میں احیائے اسلام اور افغانستان میں ایک مثالی دینی ریاست کے قیام پر تبادلۂ خیال کیا ۔ جناب احمد شاہ عرب ممالک کے دورے سے واپسی پر آج علی الصبح دوبئی سے لاہور پہنچے اور ائیرپورٹ سے ہی انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد سے رابطہ قائم کرلیا تھا۔ چنانچہ صبح چھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک وہ ڈاکٹر اسرار احمد اور ماڈل ٹاؤن میں ان کی قرآن اکیڈمی کے مہمان رہے اور نو بجے کی فلائٹ سے پشاور روانہ ہوگئے ۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے جناب احمد شاہ کو مجاہدین کی طویل اور صبر آزما جد وجہد پر ہدیۂ تبریک پیش کیا اور امید ظاہر کی کہ ان کی قیادت میں افغانستان کا پورا علاقہ بہت جلد ایمان و یقین اور جذبۂ جہاد سے سرشار افغانوں کے زیرِ نگیں ہوگا اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے آغاز کا شرف شاید اسی خطّے کے نصیب میں ہے۔ انہوں نے اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ افغانستان میں اسلامی ریاست کے قیام سے پاکستان میں حقیقی دین کے غلبے کے لئے کام کرنے والوں کو تقویت ملے گی تاہم یہاں بھی دین کے خادموں کا یہ فرض ہے کہ اپنی کوششوں کو تیز تر کردیں اور اپنے افغان بھائیوں کی نہ صرف ہر طرح کی اخلاقی و مادّی مدد کریں جس کی ضرورت اگلے مرحلے میں انہیں زیادہ محسوس ہوگی جب امریکہ " بنیاد پرست " اسلام کو جڑ پکڑتا دیکھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لے گا ۔ بلکہ پاکستان میں بھی دین کے لئے انقلابی جد وجہد کے ذریعے جوابی طور پر ان کی تقویت کا باعث بنیں ۔ انہوں نے جناب احمد شاہ کو علامہ اقبالؒ کا فارسی کلام بھی پیش کیا جس میں اس نظم کی طرف انہوں نے اپنے مہمان کی توجہ خاص طور پر مبذول کرائی جس میں علامہ نے جمال الدین

افغانی کی زبانی روس کو ایک معنی خیز پیغام دیا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں سے بھی کہا گیا ہے کہ قرآن مجید کو ایک زندہ کتاب سمجھیں اور اسی کی انقلابی فکر کو تبدیلی کا ذریعہ بنائیں ۔

جناب احمد شاہ نے قرآن اکیڈمی جیسے اداروں کی ضرورت پر زور دیا جن کی رہنمائی انہیں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام کے دوران قدم قدم پر محسوس ہو گی کیونکہ بقول ان کے طویل جہاد کے معرکے شب و روز سر کرتے ہوئے انہیں اس بات کا موقع نہیں ملا کہ ایمان کی منادی اور دعوت جہاد کو عام کرنے کے علاوہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی نظام کے لئے تحقیقی کام کی ابتدا بھی کر سکیں ۔ اس کے لئے وہ دنیا بھر کی مسلمان حکومتوں اور اجتہادی کوششوں میں معروف دین سے مخلص اداروں کے تعاون کے محتاج ہیں ۔ انہوں نے اس امکان کو بالکل رد کر دیا کہ وہ روسیوں یا اُن کے حواریوں کو شمالی افغانستان میں کمیونزم کا کوئی اڈہ باقی رکھنے کا موقع دیں گے ۔ انہوں نے کہا کہ ان کا جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ان کے ملک کا ایک انچ بھی اغیار کے زیر اثر ہے ۔ بلکہ وہ تو روس کے شکنجے میں ساٹھ سال سے گرفتار ان علاقوں تک بھی رسائی کریں گے جو ماضی میں مسلمانوں کی تہذیب کا گہوارہ اور دین کے علوم کا مرکز رہے ہیں ۔

ملاقات کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس مرد کہستانی میں احمد شاہ ابدالی کے ساتھ صرف نام کی مشابہت ہی نہیں پائی جاتی، اسلام کے لئے مر مٹنے کا وہی عزم اور حوصلہ بھی موجود ہے ۔ تاہم انہوں نے کہا کہ احمد شاہ احمد زئی ہوں یا گلبدین حکمت یار یا ان کا کوئی اور ساتھی، مستقل انتظامات کے بعد جس کسی کے کاندھوں پر افغانستان کی ایک اسلامی ریاست کے طور پر تعمیر نو کی ذمہ داری کا بوجھ آیا، ہماری توقعات اس سے یہی کچھ ہوں گی اور ہماری دعائیں اور عملی تعاون سب کے لئے یکساں ہو گا ۔

یاد رہے کہ جناب احمد شاہ احمد زئی پچھلے دنوں بھی ڈاکٹر اسرار احمد سے ملاقات کے لئے لاہور آنے اور محاضرات قرآنی میں شرکت کی خواہش رکھتے تھے لیکن جنیوا سمجھوتے کی پیش رفت اور متعلقہ مسائل میں حد درجہ انہماک کے باعث اپنی خواہش پوری نہ کر سکے ۔ وہ ڈاکٹر اسرار احمد کی انقلابی دعوت اور بیعت سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کی بنیاد پر جماعت سازی سے حال ہی میں واقف ہوئے اور بعد میں اگرچہ ان کی باہم دو سرسری ملاقاتیں ہوئیں تاہم وہ ایک خصوصی نشست اور تفصیلی گفتگو کی ضرورت تاحال محسوس کر رہے تھے ۔

●●●●●●

ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورتِ حال کے بارے میں

تنظیم اسلامی کی قراردادیں

مرتب: اقتدار احمد

تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت نے جس کا باقاعدہ اجلاس امیر تنظیم 'ڈاکٹر اسرار احمد' کے زیر صدارت تین دن جاری رہا، تنظیم کی رفتار کار اور آئندہ کام کے نقشے پر سوچ بچار کے علاوہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی صورت حال کا جائزہ بھی لیا اور گہرے غور و خوض کے بعد درج ذیل قرار دادیں اتفاق رائے سے پاس کیں۔

ا - افغانستان میں آٹھ سال سے جاری جہاد میں اگرچہ ایسے لوگوں نے بھی حصہ لیا جن کا محرک جذبۂ حریت اور دفاع وطن تھا تاہم ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو پہلے سے ہی اپنے ملک میں دین کے غلبے کی غیر مسلح جدوجہد میں مصروف تھے اور جنہوں نے کفر و الحاد کی اس تازہ یلغار کو روکنے کے لئے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ لیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان مبارک کے مطابق اول الذکر لوگوں کی جدوجہد کو بھی جہاد اور اس میں جانیں دینے والوں کو شہید قرار دیتے ہیں تاہم مؤخر الذکر مجاہدین نے قتال فی سبیل اللہ کا اعلیٰ و ارفع اعزاز حاصل کیا اور ان کے شہداء کا مرتبہ قابل رشک ہے۔ تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت محسوس کرتی ہے کہ ان کا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ انہیں نہ صرف دشمن کے حواریوں کو اپنے ملک سے نکالنا ہے بلکہ وہاں ایک مثالی اسلامی ریاست بھی قائم کر کے دکھانی ہے جس کے خطوط ان کے اعلان کردہ مجوزہ ملکی آئین سے واضح ہوتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی جدوجہد کے اس مشکل تر مرحلے میں اپنے تعاون کا یقین دلاتے ہیں' ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور امداد و اعانت کی جو شکل بھی ہمارے لئے ممکن ہوئی اسے ان تک پہنچانے میں ہم دریغ نہ کریں

کے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ان کی جدوجہد پاکستان میں اسلامی انقلاب کے لئے ہماری کوششوں کی تقویت کا باعث بنے گی اور ہماری حقیر کوششیں انشاءاللہ ان کے لئے سہارا ہوں گی۔

۲ - پاکستان کی شہ رگ' کراچی میں آئے دن کی خوں ریزی کے پس منظر میں مہاجر قومی محاذ اور پنجابی پختون اتحاد کے مابین مفاہمت کو تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت ایک نیک فال قرار دیتی ہے اور دونوں گروہوں سے درخواست کرتی ہے کہ اب وہ اپنی صفوں میں موجود شرپسندوں کی سرکوبی پر ہی اکتفانہ کریں بلکہ ان ملکی وغیر ملکی تخریب کاروں پر بھی کڑی نظر رکھیں جو اچانک فساد کی آگ بھڑکا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ امن وامان برقرار رکھنے میں صوبائی انتظامیہ کی ناکامی تو شک وشبہ سے بالا ہے تاہم یقین کیا جاسکتا ہے کہ اگر باشعور شہری خود چوکس رہنے کا فیصلہ اور عزم کرلیں تو مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون بہنے کا یہ نامسعود سلسلہ خاتمے پر آسکتا ہے جو عذاب الٰہی کی ایک شکل ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں توبہ اور رجوع الی اللہ کی ایک مہم بھی چلانی چاہئے جو ہمارے مسائل کا اصل حل اور سارے امراض کا شافی علاج ہے۔

۳ - تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت سندھ کے حالات پر گہری تشویش کا اظہار کرتی ہے۔ وہاں بے چینی کا لاوا بدستور پک رہا ہے جس میں اضافے کے لئے تو بہت سی قوتیں مصروف عمل ہیں لیکن ازالے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ تنظیم اسلامی سندھ کے اسلام دوست عوام سے اپنی استطاعت کی حد تک رابطے بحال رکھنے کی کوشش کر رہی ہے اور اسی کا مشورہ سب محب وطن جماعتوں کو دیتی ہے' تاہم کرنے کا اصل کام حکومت کے بس میں ہے۔ ہماری تشویش اس مشاہدے سے دوچند ہو جاتی ہے کہ حکومتِ وقت اس طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ باب الاسلام سندھ کی شکایات دور کرنے کی غرض سے بلا تاخیر سیاسی اور جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات کرائے جائیں تاکہ عوام کے حقیقی نمائندے مل بیٹھ کر شکایات کی حقیقت اور ان کا قابل قبول اور ممکن العمل حل تلاش کریں۔ اس کام میں جتنی دیر ہوئی' ملکی سالمیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کا باعث ہوگی۔

۴ - تنظیم اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس مشاورت جسدِ ملت کے دکھتے ہوئے

عضو، فلسطین کا درد محسوس کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے اس کے درماں کی دعا کرتی ہے اور ایک طرف پاکستان سمیت دنیا کی سب مسلمان حکومتوں کو یاد دلانا چاہتی ہے کہ اگر آج انہوں نے امت کے ایک حصے کے مصائب و شدائد پر بے حسی اور خاموشی کا رویّہ اختیار کیا تو کل کسی دوسرے حصے پر بھی افتاد پڑ سکتی ہے اور یہ کہ اگر وہ محض رسمی طور پر نہیں بلکہ مل جل کر دنیا کی بڑی طاقتوں پر واقعی زور ڈالیں تو صیہونیوں کو ان کی بہیمانہ حرکتوں سے باز رکھا جا سکتا ہے' تو دوسری طرف اپنے مصیبت زدہ فلسطینی بھائیوں سے توقع رکھتی ہے کہ وہ بھی اپنی سعی و جہد اور بعض عالمی طاقتوں پر تکیہ کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو مضبوط کریں تو رنج والم کی یہ چٹان سرک جائے گی اور اس کا جو اجر انہیں آخرت میں ملے گا وہ خالص نفع ہو گا۔

۵ - تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت بھارت میں آئے دن بھڑک اٹھنے والے ان فرقہ وارانہ فسادات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے جن میں مشقِ ستم ہمیشہ مسلمان بنتے ہیں۔ مجلس کا دکھ یہ محسوس کر کے اور بڑھ جاتا ہے کہ اہلِ پاکستان آزادی کے ثمرات سے بھرپور فائدہ اٹھاتے اٹھاتے یہ بات بالکل فراموش کر بیٹھے ہیں کہ یہ نعمتیں انہیں جن لوگوں کی قربانیوں کے طفیل میسر ہوئیں ان کا ایک قابلِ لحاظ حصہ اب تک یرغمالی ہے۔ ہم اس حقیقت پر یقین کامل رکھتے ہیں کہ اگر پاکستان میں صحیح معنوں میں ایک اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا ہوتا تو بھارت میں رہ جانے والے مسلمان اپنے آپ کو بے یار و مددگار نہ سمجھتے اور عالمِ بے بسی میں یوں غارت گری کا شکار نہ ہوتے۔ بھارتی مسلمانوں کے مصائب و آلام ہمیں اپنے اس ارادے میں مزید پختہ کرنے کا باعث بنتے ہیں کہ پاکستان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کو تیز تر کیا جائے۔

عَنِ الحَارِثِ الاَشعَرِیّ، قَالَ، قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیہِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُکُم بِخَمسٍ

بِالجَمَاعَۃِ وَالسَّمعِ وَالطَّاعَۃِ وَالھِجرَۃِ وَالجِھَادِ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

ہر محفل کا میزبان خصوصی
رُوح افزا
خدمت خلق رُوح اخلاق ہے
ADARTS
HMD-6/87

افہام وتفہیم

اقتدار احمد

ایک خط اور اس کا جواب

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب • اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اپریل ۸۸ کا میثاق پورا ایک ماہ لیٹ ملا۔ بلکہ مارچ، اپریل اور مئی کے شمارے اکٹھے موصول ہوئے اس میں معلوم نہیں ادارے کی سستی ہے یا آپ کے رفیق تنظیم کی بہرحال اپریل کے شمارے سے حسب عادت "عرض احوال" پہلے پڑھنا شروع کیا اس سے قبل بھی کئی شماروں میں میرے لئے وضاحت طلب امور تھے لیکن اس بار آپ نے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ میری تحریر میں اگرچہ کچھ بھی قوت نہیں لیکن پھر بھی میرے جذبات واحساسات کی ترجمانی ضرور ہوگی۔

عرض یہ ہے کہ "عرض احوال" میں ایک ایسی بات سامنے آئی کہ جسے پڑھ کر میرا دل خون کے آنسو رویا کہ "ڈاکٹر صاحب نے جمعہ کے ایک خطبہ میں اسلامی جمعیت طلبہ کے خاک وخون میں غلطاں ہو جانے والے نوجوانوں کی شہادت پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ جان ہارنے والے تو اپنی نیت کے مطابق اجر کی مراد انشاءاللہ ضرور پائیں گے تاہم منکرات کے خلاف جہاد میں بہایا جانے والا خون رائیگاں جا رہا ہے۔ یہ جماعت اسلامی کے سیاسی کھیل کو رنگین بنانے سے بڑھ کر کوئی نتیجہ بر آمد نہیں کر رہا"

میں انتہائی ادب واحترام کے ساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو رنج وغم کرنے کے لئے کس نے مجبور کیا تھا۔ ایک طرف آپ انہیں شہید کا درجہ دے رہے ہیں اور دوسری طرف ان کے خون کو رائیگاں کہہ رہے ہیں۔ آپکا شمار ماشاءاللہ ملک کے صف اول کے اہل علم اور دانشور حضرات میں سے ہوتا ہے کیا آپکی نظر میں ایک شہید کا خون رائیگاں چلا جاتا ہے۔ اگر ایک نوجوان کے ذریعہ کسی تعلیمی ادارے میں انقلاب آجائے وہاں سے برائیاں بوریا بستر لپیٹنے لگیں وہاں سے رقص وسرور کی محفلوں کا خاتمہ ہو جائے وہاں طوائفوں کا آنا جانا بند ہو جائے اگر ایک

نوجوان کے ذریعہ کئی اور نوجوان اسلامی انقلاب کے شیدائی ہو جائیں تو میرے خیال میں یہ سودا مہنگا سودا نہیں۔

دنیا کے عارضی مستقبل کو داؤ پر لگا کر اگر مستقبل تابناک ہو جائے تو یہ جدوجہد ضائع تو نہیں ہوئی۔ اگر اس دنیا میں ڈاکٹر نہ بن سکے تو ان نوجوانوں کے لئے آخرت میں بلند درجات ہیں۔

براہ کرم اس پر ذرا تفصیلاً روشنی ڈالیں اور آپ نے یہ جو فرمایا کہ " جماعت اسلامی کے سیاسی کھیل کو رنگین بنایا جا رہا ہے" تھوڑی سی اسکی بھی وضاحت فرمائیں کہ اس سے بذات خود " جماعت اسلامی " کو کیا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔ میرے خیال میں تو یہی فائدہ ہے کہ اس کے نوجوان ابدی زندگی میں سرخرو ہو رہے ہیں ورنہ دنیاوی لحاظ سے کسی بھی جماعت کے نوجوانوں کے سروں کی فصلیں کٹنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ محترم میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنے سیاسی کھیل کو رنگین بنانے کی خاطر (لیکن آپ کے لئے تو سیاست شجر ممنوعہ ہے) یا اپنی تنظیم میں چمک دمک پیدا کرنے کی خاطر اپنے کسی بیٹے کا خون بہا پسند فرمائیں گے اور وہ بھی جو رائیگاں جا رہا ہو۔

براہ کرم اپنی انتہائی مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان گذارشات کی وضاحت فرمائیں۔ نوازش۔ امید کرتا ہوں کہ میثاق کے ذریعہ ہی انکا جواب مل سکے گا لیکن اگر آپ یہ کڑوی کڑوی باتیں دل کو چھبنے والی گذارشات شائع نہ کرنا چاہیں تو براہ راست ضرور لکھیں۔

والسلام ، دعاگو اور دعاؤں کا طالب نذیر احمد کمبوہ

جوابی مکتوب

جناب کمبوہ صاحب وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آپ کا گرامی نامہ محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے نام موصول ہوا۔ آپ نے "عرض احوال" کے بعض مندرجات کی وضاحت مکتوب الیہ سے طلب کی ہے۔ در آں حالیکہ وہ تحریر میرے قلم سے نکلی تھی اور اس پر میرا نام درج بھی تھا۔

آپ نے پوچھا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو (اسلامی جمعیت طلبہ کے خاک و خوں میں غلطاں

ہو جانے والے نوجوانوں کی شہادت پر رنج و غم کرنے پر) کس نے مجبور کیا ہے۔ تو عزیزم مجبور باہر سے تو کسی نے نہیں کیا۔ البتہ ان کے اندر شہید ہونے والے نوجوانوں جیسے بیٹوں کا ایک مسلمان باپ بیٹھا ہے' اس نے اکسایا تھا۔ ویسے بھی جو تعلق انہیں اسلامی جمعیت طلبہ سے رہا ہے اس کی وجہ سے جمعیت کے نوخیز کارکن بھی انہیں اپنے بیٹے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ شہید کے خون کا کام آنا اور رائیگاں چلے جانا دو الگ الگ باتیں ہیں اور ان کی وضاحت اس تحریر میں بھی موجود تھی۔ شہید کا خون اس کے اپنے کام تو یقیناً آیا اور جب یہ عرض کر دیا گیا تھا کہ وہ تو اپنی نیت کے مطابق اجر کی مراد انشاءاللہ ضرور پائیں گے تو اس پہلو سے ان کے خون کے رائیگاں جانے کا جسے اندیشہ ہے وہ فی الحقیقت جان ہارنے والے نوجوانوں کی نیت پر شبہ کر رہا ہے۔ ایسا ڈاکٹر صاحب نے نہ اپنی تقریر میں کہا اور نہ اس تحریر پر یہ الزام جڑا جا سکتا ہے جس پر آپ کو اعتراض ہے۔ البتہ نیک نیتی سے بھی ایک ایسے بظاہر نیک مقصد ہی کی خاطر خون دیا جائے جس کے خدوخال واضح نہ ہوں اور جس کا لائحہ عمل ان خطوط پر استوار نہ ہو جو نیکی اور بدی کی تشریح کرنے والے ہادی' ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمائے ہیں' تو اس مقصد کے حوالے سے وہ خون رائیگاں جاتا ہے۔ میں اپنی بات کو مزید واضح کر دوں کہ ایسی صورت میں شہید کے لئے تو اس کا بہایا ہوا خون کام آیا' مقصد کے لئے وہ مفید نہ ہوا' رائیگاں گیا۔

ایک چھوڑ دس نوجوانوں کے ذریعہ بھی کسی تعلیمی ادارے میں انقلاب نہیں آ سکتا۔ آپ اصلاح اور انقلاب کا فرق تو سمجھتے ہوں گے۔ کوئی تعلیمی ادارہ ہو' دفتر ہو' گلی کوچہ ہو یا معاشرے کی کوئی اور اکائی' اس میں علیحدہ سے کوئی اصلاح تو ہو سکتی ہے' الگ سے انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ انقلاب تو پورے معاشرے اور اس کے پورے نظام میں لایا جاتا ہے اور جب ایسا ہو جائے تو اس کے اثرات معاشرے کی سب اکائیوں میں از خود اترتے چلے جاتے ہیں۔ ذرا ہمیں یہ تو لکھئے کہ آج تک کی جدوجہد کے نتیجے میں کس تعلیمی ادارے میں "انقلاب" لایا جا سکا ہے۔ آپ نے اس خون کے ذریعے جماعت اسلامی کے سیاسی کھیل کو رنگین بنانے کی وضاحت طلب کی ہے تو مختصر بات عرض کئے دیتا ہوں' مزید تفصیل طلب نہ کیجئے ورنہ بات دور نکل جائے گی۔ دیکھئے اس کام کی بھی جسے آپ انقلاب لانا کہہ رہے ہیں ذمہ داری بنیادی طور پر اس جماعت پر ہی عائد ہوتی ہے۔ نوجوان طالب علم بھی معاشرے کا حصہ ہیں' انہیں اس ذمہ داری سے بالکل فارغ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن حصہ رسدی یہ بوجھ ان پر نسبتاً کم آتا ہے۔ پھر

یہ بھی خیال فرمایئے کہ تعلیمی اداروں میں جو منکرات آگھسے ہیں وہ معاشرے سے ہی آئے ہیں جہاں وہ زیادہ منہ زوری اور زیادہ ہمہ گیری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں تو برائی کی کچھ شاخیں پہنچی ہیں، شجر خبیثہ کا تنا اور جڑیں معاشرے میں گہری اتری ہوئی ہیں اور ہمارے ملک کے پورے نظام میں پھیلی ہوئی ہیں جہاں انقلاب برپا کئے بغیر تعلیمی اداروں میں اصلاح کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہمارا خیال یہ ہے..... اور آپ کو بصیرت اور دلیل کی بنیاد پر اس سے اختلاف کا حق حاصل ہے..... کہ یہ کام جماعت اسلامی کے کرنے کا ہے جو وہ نہیں کر رہی۔ وہ نظام کو تبدیل کرنے کے انقلابی عمل میں اپنی توانائیاں صرف کرنے کی بجائے، جزوی تبدیلیوں اور محض نظام چلانے والے ہاتھ بدلنے کے لئے انتخابی بھاگ دوڑ میں مصروف ہے جسے ہم سیاسی کھیل کہتے ہیں۔ لوگ سیاسی کھیل کے لئے بھی خون دیتے ہیں، لیکن دین والوں کو ایسی قربانیاں بہت اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے دینی چاہئیں۔

آخر میں آپ نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے بیٹوں کا (جو چاروں میرے بھتیجے اور دو داماد بھی ہیں) طعنہ دے کر گویا ہمیں تاؤ دلانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر صاحب تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول مبارک کو بار بار دہراتے اور اس پر یقین کامل رکھتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اس حالت میں موت آئی ہو کہ شہادت کی آرزو اس کے دل میں موجود نہ تھی تو وہ ایک طرح کے نفاق کی حالت میں مرا۔ اللہ تعالیٰ انہیں، ان کے بیٹوں کو، مجھے اور میرے بیٹوں کو شہادت کی موت نصیب فرمائے۔ آمین..... فی الحال تو ڈاکٹر صاحب کے بیٹے دنیا کمانے اور مادی ترقی کے جھنڈے گاڑنے کی بجائے بس ان کے مشن میں ان کے ساتھی ہیں..... لیکن ذرا ویسے ہی آپ سے یہ ضرور درخواست کروں گا کہ مجھے اپنی جماعت کے اکابرین کے ان بیٹوں کی فہرست سے مطلع فرمایئے اب تک جنہوں نے شہادت کا لباس فاخرہ زیب تن کیا، یا پھر مجھ سے پوچھئے کہ ان کی غالب اکثریت دین کے بنیادی اور خالص نجی تقاضوں سے بھی بے نیاز، اپنے آباء کے کام سے ناتا توڑے اور مال و دولت دنیا کے بتان وہم و گماں کے سحر کا شکار ہو کر پورے کرۂ ارضی پر دیوانوں کی طرح ماری ماری پھرتی ہے اور دین سے جن کا تعلق بس "فیشن" کی حد تک ہے۔

والسلام

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا دورۂ سندھ

مرتب: مجیب صدیقی

اسلامی انقلاب کی اصطلاح اب غیر مانوس نہیں رہی ہے' بلکہ اب یہ سمجھی جانے لگی ہے' لوگ چونکتے نہیں بلکہ اب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح اب دوسروں کی زبانوں سے بھی دہرائی جانے لگی ہے۔ جو لوگ انتخابی طریقۂ کار کو اپنائے ہوئے ہیں جب ان کے دل کو ٹٹولا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بات تو وہی ٹھیک ہے اور راستہ تو انقلابی راستہ ہی ہے جس پر چل کر اسلامی نظام کا قیام ممکن ہے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام انجام پا سکتا ہے۔ انقلاب کے تصور میں توڑ پھوڑ' الٹ پلٹ' کشت و خون کا رنگ خود بخود پایا جاتا ہے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے سکھر شہر میں ایک ایسے عوامی جلسے میں اسلامی انقلاب کی وضاحت شروع کی جو سراپا گوش بنا سن رہا تھا۔ اتنا پر سکون اور بھرپور جلسہ کبھی کبھار ہی دیکھنے میں آتا ہے یہ جلسہ سکھر شہر کے عین وسط' یعنی قلب شہر میں منعقد کیا گیا تھا۔ آپ نے فرمایا ہمارے انقلاب کا تصور انقلاب نبوی کے مشابہ ہو گا۔ کیونکہ ہمیں رہنمائی وہیں سے لینی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلامی انقلاب کی تیاری کے ضمن میں سیرت و کردار کی تعمیر' ایمان کی آبیاری کے ذریعے ایسے نفوس تیار کرنے ہیں جن کی ترجیحات آرائش دنیا نہیں بلکہ آخرت کی کامیابی ہو اور ان کی معتدبہ تعداد کے بغیر نہی عن المنکر بالید کا تصور ممکن نہیں۔

پاکستان کے موجودہ حالات کا بھرپور جائزہ لیتے ہوئے اور اس میں بر سر اقتدار قیادت کے ماضی و حال کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے' فرمایا کہ اس ملک کی بقا کا انحصار صرف اسلام نہیں بلکہ حقیقی اسلام میں ہے' جو واقعتاً لوگوں کے مسائل حل کرے اور عدل و قسط کا نظام جاری کرے۔ پاکستان کے چالیس سالہ دور میں جو تجربے ہوئے ہیں اس کے پیش نظر یہ تصور بھی غلط ہو گیا کہ کوئی مرد حق اٹھے گا اور وہ بزور شمشیر دین حق کو نافذ کر دے گا۔ یہ محض تمنائیں ہیں اور جو لوگ ایسی تمناؤں اور آرزوؤں کے سہارے جیتے ہیں اب ان کی آنکھ کھل جانی چاہئے۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید ارشاد فرمایا۔ جو لوگ جمہوریت کی گاڑی میں سوار ہو کر اسلام کی منزل تک پہنچنے کے خواب دیکھا کرتے تھے ان کے خواب بھی ہوا میں تحلیل ہو گئے ہیں وہ اس استحصالی نظام کے شکنجے میں سے جمہوریت کو بھی نہیں نکال سکتے تو پھر اسلام تو دور کی بات ہے۔

اب وہ آخری طریقہ انقلاب کا ہے۔ جو میرے نزدیک اسلامی نظام برپا کرنے کی واحد صورت ہے۔ آپ نے ان مراحل کا تفصیل سے جائزہ لیا اور پاکستان کی کشتی جس گرداب میں آ گئی ہے۔ انقلاب کے حوالے سے ضمنی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ لیکن اصل تقریر کا محور و مرکز اسلامی

انقلاب کے مراحل کی تفصیلات نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کی روشنی سے بیان کیں
سکھر کے عوام جلسے تو آئے دن سنتے رہتے ہیں لیڈران کرام آتے ہیں گھن گھرج پیدا کر کے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس نوعیت کی تقریر انہیں سننے کو نہیں ملتی جس میں تعلیم و تربیت کے ساتھ عمل پر ابھارا جاسکے اور واضح منزل کی نشاندہی کی جائے محض جذباتی انداز میں نہیں بلکہ دلائل کے ساتھ انہیں ذہنی طور پر مطمئن کیا جاسکے۔ اس تقریر نے لوگوں پر گہرا اثر چھوڑا' راقم الحروف نے جلسے میں شریک ہونے والے متعدد افراد سے تاثرات معلوم کئے' جس میں بھرپور تائیدی انداز پایا' مختلف مکاتب فکر کے لوگوں نے اس تقریر کو سراہا۔ بات یہ تھی کہ لوگ اختلافی مسائل پر مسلسل تقریریں سن سن کر بیزار ہو چکے ہیں۔ ایک دوسرے سے برسرپیکار مقررین اب توجہ کا مرکز نہیں رہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ انہیں اخلاص کے ساتھ بات سمجھائی جائے اور ایسا انداز فکر پیدا کیا جائے جس سے امت میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو' یہی وجہ ہے کہ اس تقریر کو صرف پسند ہی نہیں کیا گیا بلکہ داد و تحسین کے جملے بھی سنے گئے۔ تقریر کے دوران لوگوں کا ہمہ تن گوش ہونا دیدنی تھا۔

تقریر کی کامیابی اور اس کے اثرات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نوجوانوں کا ایک گروپ امیر محترم سے ملنے کے لئے بے چین تھا۔ دوسرے دن چونکہ یہیں سے لاڑکانہ جانا تھا اس لئے واپسی پر ملاقات طے ہوئی ان نوجوانوں نے اپنے طور پر دعوت نامے چھپوا کر تقسیم کئے۔ مسجد سے اعلان کیا اور ایک بھرپور پروگرام مرتب کر لیا۔ لاڑکانہ میہڑ اور دادو سے واپسی پر جب ہم لوگ اپنے مستقر پر پہنچے تو یہ منتظر گروپ امیر محترم کو اپنے ساتھ لے جانے پر اڑ گیا۔ امیر محترم کو اس دورہ کی آخری تقریر روٹری کلب میں کرنی تھی وقت بالکل کم تھا نوجوان مصر تھے۔ آخر امیر محترم نے ان سے وعدہ فرمایا کہ آپ لوگوں کے لئے خاص طور پر ایک دن کا وقت نکال کر سکھر آؤں گا اس شرط کے ساتھ کہ وہ انہیں پورا دن دیں گے وہ مطمئن ہو گئے۔

سکھر کا جلسہ ۱۳ مارچ کو منعقد ہوا تھا۔ ۱۴ مارچ کی صبح ناشتہ پر علماء کرام کو مدعو کیا گیا تھا' خاص کر متوسلین شیخ الہند' تاکہ ان کا تعارف امیر محترم سے کرایا جاسکے اور کچھ دیر ان کے ساتھ رہا جائے تاکہ اس فصل و بعد میں کمی آئے جو خواہ مخواہ پیدا ہو گئی ہے۔ چند علمائے کرام کے علاوہ اکثر علمائے کرام نہیں آئے' بعض دوسرے دانشور حضرات بھی اس موقع پر شریک تھے۔

لاڑکانہ ۱۴ مارچ بعد دوپہر لاڑکانہ کے لئے روانہ ہوئے تنظیم کے رفقاء بھی ہمراہ تھے۔ لاڑکانہ میں اسٹیشن سے متصل جامع مسجد میں بعد نماز عشاء تقریر ہوئی۔ موضوع وہی اسلامی انقلاب تھا جس کے نشیب و فراز کی تفصیلات امیر محترم نے اپنے خصوصی انداز میں بیان کیں۔ مسجد شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر تھی وہی لوگ اس جلسے میں شریک تھے جو ارادہ کر کے سننے کے لئے تشریف لائے تھے ڈاکٹر' وکیل اور سیاسی بصیرت کے حامل لوگ اس تقریر میں سامعین کی حیثیت سے شامل تھے۔ لاڑکانہ شہر سیاسی سوجھ بوجھ کا شہر کہلاتا ہے۔ ویسے تو اب سندھ کا ایک ایک گاؤں سیاسی بیداری کا مخزن بن گیا ہے۔

امیر محترم نے فرمایا ایک درد ہے جو مجھے یہاں لے کر آیا ہے' میری تقریر کا موضوع نہ تو مذہبی فرقہ واریت ہے اور نہ مروجہ سیاست۔ از روئے قرآن ہمارا سب سے بڑا مقصد کیا ہے؟ اگر سوچ کا رخ

صحیح ہو تو پوری زندگی کا سفر صحیح راستے پر ہو گا ورنہ نہیں ہمارا اصل مسئلہ آخرت کی نجات ہے جبکہ ہم نے روٹی کپڑا اور مکان سمجھا ہوا ہے۔ اسلام اور قرآن کی رو سے میرا اور آپ کا مسئلہ روٹی کپڑا اور مکان نہیں بلکہ نجات اخروی ہے۔ یاد رکھیں زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ خدا کا انکار کرنے والے تو اس دنیا میں مل جائیں گے مگر موت کا انکار کرنے والا اس دنیا میں کوئی نہیں ملے گا۔ یہ زندگی عارضی ہے 'فانی ہے' غیر یقینی ہے۔ یہی ایمان کا خلاصہ ہے۔

فکر و نظر کا اصل فساد اور کجی صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم نے دنیا کو چن لیا ہے اور پسند کر لیا ہے اور آخرت کو پیچھے ڈال دیا ہے۔ امیر محترم نے فکر و نظر کے فساد اور اس کی اصلاح پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

آج کل سندھ میں حقوق کا بڑا چرچہ ہے۔ یہ مسئلہ صرف سندھ کا نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے نقشے پر عموماً پس ماندہ ممالک اس سے دوچار ہیں۔

حقوق و فرائض کا ذکر کرتے ہوئے امیر محترم نے فرمایا جس معاشرے میں غلط نظام رائج ہو جائے وہاں انسان حیوان بن جاتا ہے۔ ہر ظالمانہ نظام کو اکھاڑ پھینکنا اسلام کا تقاضہ ہے۔ یہی فکر ولی اللھی ہے فک کل نظام۔ اللہ نے ترازو اتاری ہے یہ میزان وعدل اس لئے اتاری ہے کہ جس کا جو حق ہے وہ اس میزان سے تل کر ملے۔ اور جان لیجئے کہ جمہوریت میں جس کی لگام وڈیروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے حق دار کو حق کبھی بھی نہیں ملے گا۔ اس کے لئے اسلامی انقلاب کی ضرورت ہے۔ ایسا انقلاب جو اس ظالمانہ نظام کو بیخ دین سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ اس کے مراحل کتنے ہیں۔ وہ گن گن کر آپ نے بتائے۔

مسجد کے باہر مکتبہ لگایا گیا تھا۔ لوگوں نے مکتبہ میں دلچسپی کا اظہار کیا ہمارے رفقائے تنظیم اسلامی کا منشور اور بعض دوسرے ہینڈ بل تقسیم کئے منشور کا سندھی ترجمہ بھی موجود تھا جو تقسیم ہوا۔

لاڑکانہ...... ۱۵ مارچ کی صبح لاڑکانہ کی ایک مشہور شخصیت جناب گدا حسین مہیر صاحب نے امیر محترم و رفقاء تنظیم کو ناشتہ پر مدعو کیا تھا۔ کچھ دوسرے اصحاب بھی موجود تھے۔ جناب گدا حسین صاحب لاڑکانہ کی رائس کارپوریشن کے صدر ہیں اور مشہور سماجی و سیاسی شخصیت ہیں آپ دین کے کاموں میں دلچسپی لیتے ہیں اس سے قبل جب لاڑکانہ میں امیر محترم کا پروگرام رکھا گیا تھا آپ نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا تھا۔ مگر انتظامیہ نے لاڑکانہ میں امیر محترم کا داخلہ بند کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ پروگرام نہ ہو سکا۔

گفتگو جہاں دوسرے موضوعات پر ہوتی رہی وہاں امن و امان کا مسئلہ جس نے عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا ہے۔ خاص طور پر موضوع سخن رہا۔ سندھ کی حکومت ڈاکوؤں کی سرکوبی میں ناکام رہی ہے۔ اس ناکامی نے ہر شخص کو پریشان کر رکھا ہے۔ محض بیان دینے سے نہ خطرہ ٹل سکتا ہے نہ ڈکیتیاں بند ہو سکتی ہیں مگر انتظامیہ ہے کہ بیان سے کام چلا رہی ہے۔

میہڑ... میہڑ کا شہر لاڑکانہ اور دادو کے درمیان ہے۔ یہ شہر بھی کئی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے سیاسی میدان کے اعتبار سے لاڑکانہ سے کم نہیں۔ اس چھوٹے سے شہر میں تمام جماعتیں موجود ہیں

اور اپنا بھرپور کردار ادا کرتی رہتی ہیں اس میں شامل نوجوان بڑے پرجوش ہیں۔ یہاں ڈاکوؤں سے بھی کئی معرکے ہوئے ہیں۔ یہ شہر سندھی کاز کے تحفظ کے لئے ایک قلعہ کا کام دیتا ہے۔

ہم لوگ ساڑھے گیارہ بجے میہڑ پہنچ چکے تھے جلسہ مدرسہ دارالقرآن کی بڑی مسجد میں رکھا گیا تھا۔ اس مدرسے کے مہتمم جناب سعید احمد صاحب ہیں جو مسلکاً اہلحدیث ہیں جبکہ یہ مدرسہ مسلک دیوبند پر قائم ہوا تھا ان کے چھوٹے بھائی جناب قاری رشید احمد صاحب بڑے فعال بڑے متحرک ہیں ان دونوں بھائیوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا خیر مقدم کیا۔ مسجد کے صحن میں شامیانے لگائے گئے تھے۔ شہر میں پروگرام کے پوسٹر پہلے ہی لگ چکے تھے اور اعلان بھی ہو رہا تھا۔ میہڑ میں تنظیم کا کوئی کارکن نہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ انتظامات کارکنوں کی ایک کھیپ کر رہی ہے اور تھا بھی ایسا ہی کہ یہ مخلص لوگ دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار تن من دھن سے انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔

سندھ کی قدیم ثقافت کو جس میں یہاں کی مہمان نوازی کو بڑی شہرت حاصل ہے چشم سر سے دیکھا اخلاص و محبت کے یہ پیکر ہمارے لئے چشم براہ تھے اور چشم تصور ماضی میں ان کے آباؤاجداد کو دیکھ رہی تھی جو اسی طرح کے دین کی خدمت کے جذبے سے سرشار برصغیر میں اسلام کے داعی بنے تھے۔ مگر حالات نے تاریخ کے اوراق پر ایسی گرد جمادی کہ ہماری نئی نسل اپنے اسلاف کے کردار اور کارناموں سے بے بہرہ ہو کر رہ گئی۔ اس شہر میں امیر محترم کی پہلی بار آمد تھی لیکن ہم میں سے کسی نے بھی اجنبیت محسوس نہیں کی بالکل عہد رسالت کے صحابہ کرامؓ کی محبت و الفت کا نظارہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اپنے ہی گھر آئے ہوئے ہیں یہ حقیقی احساس ہم سب کے دل میں موجزن تھا کچھ علمائے کرام پہلے ہی سے منتظر تھے۔ امیر محترم کے پہنچتے ہی لوگوں کی آمد شروع ہو گئی اور ملاقاتیں سوال و جواب اور حال واحوال کے تبادلے اس ابتدائی کارروائی میں شامل رہے۔

لاڑکانہ میہڑ اور دادو میں اس دورہ کا پروگرام جناب غلام محمد سومرو صاحب نے بنایا تھا آپ ہی کی انتھک محنت سے یہ پروگرام کامیاب ہوا۔ غلام محمد سومرو صاحب کا گاؤں بھی میہڑ سے دس میل کے قریب ہے وہاں پہلے ہی ایک حلقہ بن چکا ہے۔ وہاں سے بھی کئی افراد شریک جلسہ رہے۔

ہمیں بتایا گیا کہ میہڑ کے پرجوش نوجوانوں نے پہلے اپنی برہمی کا اظہار کیا تھا لیکن جب انہیں جواب دیا گیا کہ آپ کو ہر قسم کے سوالات کرنے کی اجازت ہو گی اور آپ لوگ یقیناً ڈاکٹر صاحب سے مل کر خوشی محسوس کریں گے لیکن سوالات آپ کو لکھ کر دینے ہوں گے تو اس پر وہ راضی ہو گئے پھر انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ سپاسنامے میں ہم ان تمام مسائل کا احاطہ کریں گے جو آپ کو مطلوب ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی تقریر انہی مسائل کے گرد ہو گی۔

ظہر کی نماز ڈیڑھ بجے ادا کی گئی اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی جناب قاری رشید احمد صاحب جو اس جلسہ کے ناظم تھے سپاسنامہ پیش کیا اور اپنی مختصر تقریر میں ان تمام مسائل کا ذکر کیا جس کا چرچہ عوام و خواص میں ہے۔ امیر محترم نے منتظمین کا شکریہ ادا کیا اور پہلی بار اپنی آمد اور اس پرتپاک خیر مقدم پر اپنے گہرے احساس کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ کاش میں سندھی زبان جانتا ہوتا تو دل کے صحیح جذبات آپ تک پہنچ سکتے۔ زبان کا تعلق اتنا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس علاقے میں انبیاء کو بھیجا اس

کو اسی زبان میں بھیجا تا کہ بات سمجھانے میں حجاب نہ رہے میں مشکل ضرور محسوس کر رہا ہوں لیکن امید کرتا ہوں کہ میرے دلی جذبات آپ تک ضرور رسائی حاصل کریں گے سپاسنامے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ میرے لئے نئے نہیں ہیں ان خیالات کا اظہار میں تفصیل سے استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ نامی کتاب میں کر چکا ہوں اور وقتاً فوقتاً خطبہ جمعہ میں اس کا اعادہ کرتا رہتا ہوں۔ لوگ بڑے شوق و انہماک سے تقریر سن رہے تھے سپاسنامے کی کچھ باتیں تحریر کر دوں تا کہ آپ اس کے تیور اور تیکھے پن کو محسوس کر سکیں۔

کیا کچھ اس قوم پر گزری پاکستان کا کونہ کونہ جانتا ہے۔ ظالم چلے گئے مگر مظلوم باقی ہیں۔ سندھ پاکستان کا خالق ہے۔ پاکستان سندھ کا خالق نہیں ہے۔ وقت کے جابر ہندو اور انگریز کی غلامی سے اس لئے نکلے تھے کہ اسلام کا مزہ چکھیں گے مگر ہمیں کیا ملا کلاشن کوف' بارود اور بم ملے۔ ڈاکوؤں کی آڑ میں یہاں لوگوں کو مارا جاتا ہے۔ فوجی ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں سندھ میں زمین دی جاتی ہے سندھ کے مزدور لو ۲۰ روپے یومیہ دیئے جاتے ہیں اور پنجاب سے لائے ہوئے مزدور کو ۴۵ روپے دیئے جاتے ہیں ہماری زمینوں سے غیر مقامی افراد کے تسلط کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے۔ ہم آپ سے پوچھتے ہیں۔

امیر محترم نے فرمایا۔ میرے نزدیک ہمارا آپ کا سب کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ آخرت کی نجات ہے اپنے رب کو راضی کرنا ہے۔ ہمارا دین دین فطرت ہے۔ جس طرح حنفی' شافعی' مالکی اور حنبلی مسالک ہیں دین نہیں ہیں اسی طرح قومیتیں ہیں اس کی نفی اسلام نے نہیں کی ہے۔ کوئی قوم پرست یہ نہ کہے گا کہ جتوئی جتوئی نہ رہے سومرو سومرو نہ رہے حقوق و فرائض کا توازن اللہ نے اپنے دین کی شکل میں دیا ہے۔ جس معاشرے میں تقسیم دولت کا نظام غلط ہو جاتا ہے اس میں یہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں یہ غلط معاشی تقسیم دو دھاری تلوار کی طرح ہے اس غلط تقسیم کی کاٹ دونوں طرف ہوتی ہے اس غلط تقسیم سے کچھ لوگ حیوان کی سطح پر پہنچ جاتے ہیں۔ دن بھر کی مشقت کے بعد بھی انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا اور کچھ لوگ اپنے عیش و عشرت کی وجہ سے معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اسلام کا بنیادی عقیدہ توحید ہے۔ توحید میں ملکیت کی پوری پوری نفی ہو جاتی ہے۔ ہر شے کا مالک اللہ ہے۔ انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ امانت ہے وہ اسی کی مرضی کے مطابق خرچ کر سکتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے آپ نے شرک اور اقسام شرک کی مختصر وضاحت کی اور لوگوں کو اس سے خبردار کیا اسلام اگر آتا ہے تو وہ ہر ایک کے ایک ایک حق کو ادا کرے گا۔ اسلام تو اپنے مال کی حفاظت میں لڑ کر مرنے والے کو شہید کہتا ہے اور یہ بات اپنی جگہ صد فیصد درست ہے کہ اسلام انتخاب سے نہیں بلکہ انقلاب سے آئے گا جب اسلام نہیں آتا حقوق میں عدل و توازن نہیں ہو سکتا۔ ہمیں اپنی تمام صلاحیت اسی انقلاب کو لانے میں صرف کرنی چاہئے تا کہ اسلام کے عادلانہ نظام کو اس سرزمین پر رائج کیا جا سکے جس سے حق دار کو اس کا حق مل سکے۔ اسلام کا عملی نمونہ بنو یعنی اسے اپنے اوپر نافذ کرو جب تک اسے اپنے اوپر نافذ نہیں کرو گے گاڑی آگے نہیں بڑھے گی۔

تقریر کا یہ انداز میہڑ والوں نے پہلی مرتبہ سنا تھا جس میں دعوت الی اللہ کے ساتھ دعوت جہاد اور جہاد کی ابتدا اپنی ذات سے جہاد' اپنے نفس سے جہاد' معاشرے کے بگڑتے ہوئے چلن سے جہاد اور سب سے مشکل کام اس نوعیت کا جہاد ہے۔ دوسرے سے ٹکرا جانا تو آسان ہے اپنے آپ سے ٹکرانا

بہت ہی مشکل کام ہے۔ ورنہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ مقررین حضرات دوسروں سے ٹکرانے کا نعرہ بلند کر کے داد حاصل کرتے ہیں اور سامعین کو جذبات کے گرداب میں چھوڑ کر رخصت ہو جاتے ہیں یہاں حاصل اس کے برعکس تھا۔ سب سے پہلے سب سے پہلا مطالبہ خود سے جہاد کرنا تھا۔ یہ بات ہر اس شخص پر شاق گزرے گی جو اپنے دل کو ٹٹولے گا اور اس سے سوال کرے گا۔ امیر محترم کی تقریر ساڑھے تین بجے تک جاری رہی تمام مسائل پر بھرپور تبصرہ انقلاب اسلامی کے حوالے سے ہوا۔ منتظمین جلسہ نے تمام سامعین کے کھانے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ صبح ہی سے دیگوں کی قطاریں بتا رہی تھیں کہ دعوت سماعت کے ساتھ دعوت طعام بھی ہے۔ اپنی مصروفیت کو چھوڑ کر آنے والوں کا اکرام اس طرح کیا جاتا ہے۔

کھانے کے بعد سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی۔ امیر محترم نے پیش آنے والے تمام سوالوں کے جوابات دلائل کے ساتھ اپنی تقریر میں دے دیئے تھے۔ لیکن تحریر شدہ سوالات کے جوابات دیئے گئے اور بظاہر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ سبھی مطمئن ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

جلسہ گاہ کے چاروں طرف بینر لگائے گئے تھے جس میں دعوتی کلمات درج تھے جب کہ جلسہ گاہ کے باہر مکتبہ لگایا گیا تھا۔ کتابوں میں لوگوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا اور خاص خاص موضوعات پر کتابیں خریدیں۔ سوالوں اور جوابوں کی نشست زیادہ دیر نہ چل سکی اس لئے کہ شافی و کافی جواب تقریر میں مل چکا تھا اس کے بعد عصر کی اذان بعد طعام ہوئی۔ لوگوں کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ امیر محترم کو حالانکہ وہ قصر نماز کے پابند تھے مگر لوگوں نے اصرار کر کے انہیں نماز پڑھانے کے لئے کہا اس طرح امیر محترم نے اپنی قصر نماز میں جماعت کی اور بقیہ نے اپنی نماز مکمل کی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ہمیں مغرب سے قبل دادو پہنچنا تھا اس لئے کہ دادو میں خطاب بعد نماز مغرب رکھا گیا تھا۔

دادو مغرب سے متصل ہم دادو پہنچے' امیر محترم کو کچھ دیر بھی آرام کا موقع نہیں ملا تھا۔ تقریر کی مشقت کے ساتھ سفر کی تکان' مگر گلا جواب دے چکا تھا' لیکن حسب پروگرام تقریر کرنی تھی دادو میں تقریر کا انتظام لوکل بورڈ کی مسجد میں کیا گیا تھا ہمارے کارکن مسجد میں پہنچتے ہی بینر آویزاں کرنے لگے اور مسجد کے باہر مکتبہ بھی لگا لیا گیا۔

مغرب بعد امیر محترم نے خطاب شروع کیا' آپ نے فرمایا پہلی بار حاضری کا موقع ملا ہے۔ لیکن سندھ کے حالات سے کبھی ہم نے صرف نظر نہیں کیا۔ بلکہ جس انداز میں' میں نے ان مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اور اس کے لئے جو حل تجویز کیا ہے۔ وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ میرے غور و فکر کے نتیجے میں ان تمام مسائل کا حل اسلامی انقلاب میں ہے۔ اسلامی انقلاب کیا ہے اور وہ کس طرح برپا ہو گا۔ اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمیں اللہ کی بندگی اختیار کرنی ہو گی پوری بندگی ادھوری نہیں۔ اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہو گا۔ پہلے اپنے وجود پر اس نظام کو نافذ کرنا ہو گا جب تک ہم اس بات پر تیار نہیں گاڑی آگے نہیں چلے گی۔ دنیا کے دوسرے انقلابات کا حوالہ دیتے ہوئے سیرت نبویؐ سے تقابلی مطالعہ پیش کیا۔ امیر محترم تھکے ہوئے تھے مگر زیر بحث موضوع کو تشنہ نہ چھوڑا بلکہ سیر حاصل گفتگو کی' حاضرین میں علماء کرام کے علاوہ وکلاء اور دوسرے دانشور حضرات بھی موجود تھے یہ تقریر ۹ بجے تک جاری رہی اس کے بعد عشاء کی نماز ادا کی گئی۔

ہمارا قیام شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر جناب میجر میر محمد لغاری صاحب کے یہاں تھا موصوف نے رات کے کھانے پر ڈاکٹر صاحبان ' وکلاء حضرات ' علماء کرام اور معززین شہر کو مدعو کیا تھا آپ کے مکان کی چھت پر سب جمع تھے۔ امیر محترم کے ساتھ سوال و جواب کی نشست شروع ہوئی۔ یہ نشست اپنی افادیت کے اعتبار سے منفرد تھی۔ ذہنوں کے اشکلات سامنے آتے رہے اور انہیں تسلی بخش جواب ملتے رہے۔ اسلامی انقلاب کے حوالے سے بہت سے گوشے وا ہوئے اور سامعین نے محسوس کیا کہ یقیناً انقلاب ہی واحد راستہ ہے جو ہمارے تمام مسائل کا حل ہے۔ بعض سوالات خالص سیاسی نوعیت کے تھے۔ ان میں سے بعض حقوق سے متعلق تھے۔ سبھی کے جوابات امیر محترم نے پر سکون انداز میں دلائل سے دیئے یہ مجلس ہر اعتبار سے کامیاب اور مفید رہی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے طعام کی نشست ہوئی۔

ایک بات عرض کرتا چلوں کہ امن و امان کا مسئلہ یوں تو پورے سندھ کا مسئلہ ہے مگر اس کا نقطہ عروج میہڑ اور دادو کے علاقے ہیں۔ امیر محترم جس وقت مسجد میں اسلامی انقلاب کے مراحل بیان کر رہے تھے اس وقت مسجد کے عقب سے کچھ فاصلے پر گولیاں چل رہی تھیں اور آواز کی لہریں فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں جب میں نے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ یہ معمول میں شامل ہے صبح کو معلوم ہوا کہ ڈاکو دو افراد کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔

صبح درس قرآن کے لئے امیر محترم سے جناب منظور احمد سومرو صاحب مہتمم مدرسہ دار الفیوض مسجد جیون شاہ نے وعدہ لے لیا تھا اور ناشتے کا بھی اہتمام کیا تھا۔ یہ درس بعد نماز فجر شروع ہوا۔ امیر محترم نے سورۃ مدثر کی ابتدائی تین آیات تلاوت فرمائیں اور انہی کے حوالے سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ اس مسجد میں روزانہ درس قرآن ہوتا ہے ' یہ بات بڑی بابرکت ہے مجھے بھی لطف درس قرآن سے ہی حاصل ہوتا ہے نہ کہ تقریر سے حضورؐ نے سارا کام قرآن ہی سے کیا ہے۔ انذار اسی سے ' تبشیر اسی سے ' تزکیہ اسی سے ' تربیت اسی سے ' تبلیغ اسی سے ' آپؐ کی دعوت کا محور و مرکز قرآن تھا امراض سینہ کے لئے شفا ہے۔ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی اسی میں ہے یہ آیات جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ابتدائی دور کی آیات ہیں۔ اے کمبل میں لپٹنے والے صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو جایئے لوگوں کو ڈر سنایئے اور اپنے رب کی کبریائی بیان کیجئے۔ انذار کیا ہے؟ تصور آخرت...... یہ زندگی ختم ہو کر رہے گی۔ ایک ایک عمل کا حساب دینا ہو گا اچھے عمل کے بدلے جنت اور برے عمل کا انجام آگ کا دھکتا ہوا گڑھا جس کا نام دوزخ ہے۔ پھر رب کی کبریائی کیا ہے۔ رب تو خود بڑا ہے۔ اسے بڑا کرنے کا مفہوم کیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا...... آپ غور کریں کہ ہر سطح پر ہم نے اپنے رب کو چھوٹا کر رکھا ہے۔ ایک طرف نفس کی خواہش ہے دوسری طرف اللہ کا حکم اگر ہم نے نفس کی پیروی کی تو گویا ہم نے نفس کو اللہ کے مقابلے میں بڑا کیا۔ اسی طرح رسم و رواج ہے۔ کہ ہم اللہ کے حکم کے علی الرغم اس کی پیروی کرتے ہیں۔ پھر ہماری زندگی کے ہر گوشے میں اللہ کہاں بلند ہے؟ عدالتوں میں کس کا نظام چل رہا ہے؟ اللہ کا یا بندوں کا؟ ہمارا معاشی ' سیاسی ' اقتصادی نظام اللہ کے بتائے ہوئے قانون کے تحت ہے یا بندوں کے بنائے ہوئے قانون کے تحت؟ اللہ کی کبریائی کہاں ہے؟ کیا پارلیمنٹ میں ہے؟ ایوان صدر میں ہے؟ ہمارے معاشرے میں ہے؟۔

قرآن مجید کی دعوت کا ہدف یہی ہے کہ ہر گوشے میں اللہ کی کبریائی بلند ہو۔ اسی کا نام اسلامی انقلاب ہے۔ یہی دعوت دین ہے یہی دعوت الی اللہ ہے اسی کی طرف میں لوگوں کو بلا رہا ہوں۔ ہماری تمام سعی وجہد کا مرکز و محور یہی اسلامی انقلاب کے لئے کام کرنا ہے اور اسی کی میں لوگوں کو دعوت دیتا ہوں۔ اصل کام یہی ہے اسی میں آخرت کی نجات ہے۔

خطاب بار ایسوسی ایشن دادو ..... دادو کی بار ایسوسی ایشن نے گیارہ بجے کا وقت دیا ہوا تھا' وقت مقررہ پر ہم بار پہنچ گئے' وکلاء نے امیر محترم کا خیر مقدم کیا۔ افتتاحی کلمات میں امیر محترم کو خطاب کی دعوت دی۔

امیر محترم نے پاکستان کی اساس کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بقا کے لئے اسلام کو ناگزیر قرار دیا۔ پاکستان کی وحدت صرف اسلام سے قائم رہ سکتی ہے۔ اس کو جوڑنے والی شے صرف اسلام ہے اس کا وجود اسلام کے نام پر ہوا اب اگر اسے قائم رہنا ہے تو حقیقی اسلام کو قائم کرنا ہو گا۔ ورنہ اس کے بقاء کا کوئی جواز نہیں چالیس سال گزرنے کے باوجود نہ اسے دستور نصیب ہوا ہے نہ اس کی گاڑی جمہوریت کی پٹڑی پر چل رہی ہے۔ بار ہال میں دو تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک قائداعظم کی اور اس کے بالمقابل ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی۔ قائداعظم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے حریت و مساوات کو بروئے کار لاتے ہوئے دنیا کے سامنے پیش کر سکیں اگر مسلم لیگ اپنی تحریک کے درمیان اسلام کا نام نہ لیتی تو برصغیر کا مسلمان اس کے گرد جمع نہ ہوتا۔ مسلم لیگ ایک جماعت نہ تھی ایک تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان حاصل ہونے کے بعد تحریک ختم ہو گئی اور قیادت کا خلا پیدا ہو گیا۔ اس کے برعکس کانگریس ایک جماعت تھی۔ اس کی قیادت تربیت یافتہ افراد کے ہاتھوں میں تھی جو سرد و گرم سے گزر کر اوپر آئے تھے۔ انہوں نے بھارت کی قیادت سنبھالی' دستور بنایا اور اس کی گاڑی کو جمہوریت کی پٹڑی پر رواں دواں کر دیا۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ میری جیب میں کھوٹے سکے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر محترم نے فرمایا' بھٹو صاحب بھی ایک تحریک لے کر اٹھے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ان کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے چاروں صوبوں کو مطمئن کر کے ایک دستور پر دستخط کرا لئے تھے مگر عددی اکثریت کے بل پر دستور کا جو حلیہ بگڑا ہے وہ کسے معلوم نہیں اسے موم کی ناک بنا لیا گیا تھا اپنی مرضی سے جدھر چاہتے موڑ لیتے تھے۔ نعرہ انہوں نے حریت و مساوات کا لگایا تھا مگر ان دونوں چیزوں کی جو مٹی پلید کی گئی سب کے سامنے ہے۔ انہوں نے بھی انہی وڈیروں اور جاگیرداروں کا سہارا لیا۔

اس ملک کی بقا کا انحصار اسلام کے نفاذ پر ہے۔ زبانی کلامی اسلام نہیں نہ ضیاء الحق صاحب کا اسلام۔ اس شخص نے اپنے دور میں اسلام کو جتنا نقصان پہنچایا ہے مجموعی طور پر تمام ادوار کو ملا کر اتنا نقصان نہیں پہنچا۔ یہاں حقیقی اسلام انتخاب سے نہیں آئے گا بلکہ انقلاب سے آئے گا۔ آپ نے انقلاب کے مراحل تفصیل سے بیان کئے اور دوران گفتگو ان مسائل کو بھی سموتے گئے جو اس وقت سندھ میں طوفان بن کر ابھر رہے ہیں۔ تقریر کے بعد معمول کے مطابق سوالات کی باری تھی فضا میں گردش کرنے والے تمام سوالات کے جوابات تقریر میں دے دیئے گئے تھے پھر بھی وکلاء نے کچھ

سوالات پوچھے۔

تنظیم کے رفقاکی طرف سے بار کے وکلاء کی خدمت میں تین کتابوں کے سیٹ پیش کئے گئے ایک استحکام پاکستان 'ایک استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ اور تیسری کتاب اسلام کا معاشی نظام (سندھی ترجمہ) چائے کی تواضع کے بعد ایک بجے کے قریب ہم دادو سے رخصت ہوئے۔

دادو اور میہڑ سے ہٹ کر یعنی درمیانی سڑک سے ہٹ کر ایک بستی ہے جو بہاولپور کہلاتی ہے یہاں ایک بڑی مسجد اور مدرسہ قائم ہے۔ اس کے مہتمم جناب مولانا نثار احمد صاحب اور ان کے صاحب زادے جناب انیس احمد صاحب میہڑ کے خطاب میں شریک تھے۔ مولانا پیرانِ سالی کے باوجود ملنے کے لئے چل کر تشریف لائے تھے۔ یہ ان کی عنایت تھی۔ امیر محترم ان سے مل کر بہت خوش ہوئے انتہائی سادہ منکسر المزاج حق کے جویا 'اخلاص کا پیکر' دل میں اسلام کا درد اور ملت کی فلاح کا جذبہ موجزن ہے۔ آپ نے امیر محترم سے اپنے ہاں آنے کا وعدہ لے لیا اس لئے وقت کی کمی کے باوجود بھی وہاں حاضری دی گئی۔ مولانا کا اصرار تھا کہ وہاں بھی کچھ بیان ہو جائے لوگ منتظر ہیں 'امیر محترم اس فرمائش کو نہ ٹال سکے اور نصف گھنٹے کا بیان ہوا۔ آپ نے وہی دعوت جس کا علم لے کر اٹھے ہیں بستی والوں کو دی اور انتہائی اختصار کے ساتھ کرنے کے اصل کام کی طرف توجہ دلائی۔ مولانا محترم کے صاحب زادے انیس احمد صاحب نے جو میہڑ کے خطاب سے متاثر ہی نہیں شرمسار تھے 'امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کے لئے کہا۔ اس طرح تقریر کے بعد بیعت کی تقریب ہوئی انیس احمد صاحب کے ساتھ گاؤں کے دوسرے سترہ افراد نے بیعت کی لوگوں کے اس جذبے کو دیکھ کر مجمع میں ایک صاحب اپنے آنسوؤں کو قابو میں نہ رکھ سکے اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ وضو خانے کی طرف چلے گئے۔ امیر محترم نے بیعت کے بعد دعا فرمائی۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو تین بج چکے تھے 'ہمیں جلد واپس سکھر پہنچنا تھا کیونکہ روٹری کلب والوں نے ایک تقریب ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔

امیر محترم بہت زیادہ تھک چکے تھے گلا پہلے ہی متاثر تھا اس تقریر نے رہی سہی کسر نکال دی اور آواز مزید بھاری ہو گئی۔ فکر تھی کہ سکھر کا پروگرام کیسے ہو سکے گا ہم لوگ آٹھ بجے کے قریب سکھر پہنچے دن بھر کے سفر نے تھکا دیا تھا نماز فجر کے بعد سے مسلسل سفر اور تقریریں تھیں اس لئے کہ آرام میسر نہ آ سکا تھا۔

پھر سکھر روٹری کلب اور جے سیز روٹری کلب والوں کو اطلاع دی گئی کہ ہم نو بجے حاضر ہو سکیں گے اس ایک گھنٹہ کے درمیان نماز عشاء ادا کی گئی اور ٹھیک نو بجے ہوٹل انٹر پاک کے ہال میں موجود تھے میرا خیال تھا امیر محترم تبرک کے طور پر مشکل سے چند الفاظ کہہ سکیں گے۔ حاضرین میں جج صاحبان 'وکلاء' دانشور اور معززین شہر موجود تھے۔ روٹری کلب کے صدر نے امیر محترم کو خطاب کی دعوت دی۔

جو لوگ مشن لے کر چلتے ہیں وہ اپنی بات پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے نہ ان پر مشقت گراں گزرتی ہے۔ نہ تھکاوٹ ان کا راستہ روکتی ہے۔ ان کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اللہ کے بندے اس پیغام کو ہوش و گوش سے سن لیں۔ کیا عجب ان میں سے کوئی اس راہ کا ساتھی بن جائے ہمسفر بن جائے اور اس ذریعے دعوت کو قوت حاصل ہو۔

امیر محترم نے خطاب شروع کیا تو گلے کی حالت دیدنی تھی مگر جوں جوں وہ اپنی بات ایک ترتیب سے بیان کرتے گئے ان کی آواز صاف ہوتی چلی گئی۔ آپ نے فرمایا' فلسفہ انقلاب کے حوالے سے میں اپنی بات آپ کے سامنے رکھوں گا میں نے سیرت نبوی کا مطالعہ اسی انداز میں کیا ہے' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب ایک جامع انقلاب ہے۔ تاریخ انسانی میں یہ واحد انقلاب ہے جو ایک فرد سے شروع ہو کر اسی کی زندگی میں تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے ورنہ دنیا میں جتنے انقلاب آئے اس میں فلسفہ دینے والی کوئی دوسری شخصیت ہے اور انقلاب لانے والی دوسری شخصیت' ماضی قریب میں اس کی مثال روس اور فرانس کی ہے۔ اصطلاحی طور پر انقلاب کے معنی بنیادی تبدیلی کے ہیں۔

انسانی زندگی کے دو گوشے ہیں انفرادی اور اجتماعی۔ انفرادی زندگی کے بھی تین گوشے ہیں "سماجی نظام"۔ "معاشی نظام"۔ "سیاسی نظام" کوئی بھی انقلاب اجتماعی زندگی کے ان تین گوشوں میں سے کم از کم ایک گوشے کو چھیڑتا ہے۔

کوئی بھی انقلاب پہلے ایک نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ کو جو لوگ قبول کرتے ہیں انہیں منظم کیا جاتا ہے۔ پھر ان کی تربیت ہوتی ہے۔ جب ایک معتدبہ تعداد اکٹھی ہو جاتی ہے تو وہ موجودہ نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑتا ہے۔ اس پورے فلسفے کو شرح و بسط سے بیان کرنے کے بعد انقلاب نبوی کی تفصیلات بیان کیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انقلابی نظریہ۔ نظریہ توحید پیش کیا۔ اس توحید کے بھی تین گوشے ہیں۔

۱۔ سماجی نظام کی یکسانی' کوئی گھٹیا نہیں' کوئی بڑھیا نہیں' رنگ' نسل کے اعتبار سے کوئی اعلیٰ وادنیٰ نہیں۔

۲۔ اختیار صرف اللہ کا ہے انسانی اختیار کا ہر گوشہ شرک ہے۔

۳۔ ملکیت صرف اللہ کی ہے انسان محض امین ہے۔

ہجرت کا ذکر ہوا تو اس ضمن میں وہ اہم بات جس کا عموماً تاریخ دان بھی سرسری طور پر گذر گئے ہیں ذکر کیا آپ نے فرمایا ہجرت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اہم اقدام ہوا ہے قریش کی معاشی ناکہ بندی۔ گویا شہ رگ پر حملہ تھا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام نے صرف مدافعانہ جنگ لڑی ہے۔ وہ مرعوب ذہنی کا شکار ہیں اقدام ہمیشہ انقلابی پارٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔

یہ اہم تقریرات گیارہ بجے تک جاری رہی۔ اس کے بعد صدر مجلس نے اعلان کیا کہ کھانے کے بعد سوال وجواب کی نشست ہوگی۔ سوالات کوئی خاص اہمیت کے حامل نہ تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب فارغ ہو کر اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے تیز گام کے ذریعے لاہور واپسی ہونی تھی۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ سارے پروگرام خیر وخوبی کے ساتھ انجام پائے۔ اس دورے کے روح پرور مناظر کا نقشہ کھینچنا اس عاجز کے بس کا روگ نہیں اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔

اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو دین کا حقیقی فہم عطا فرمائے...... فنعم المولیٰ و نعم النصیر

●●●●●

افکار و آراء

ایک آرزُو . . . . .

دُعا ہے کہ پوری ہو جائے

تنظیم اسلامی پاکستان کا تیرھواں سالانہ اجتماع جس بھرپور انداز سے ہُوا وہ منزل کی طرف پیش رفت کی ایک اطمینان بخش علامت ہے۔ کتنے مبارک تھے وہ چار دن جن میں تنظیم کے رفقاء ملک کے دور دراز کونوں اور بیرون ملک سے ضلع بہاول نگر کے ایک دیہاتی مقام طارق آباد میں جمع ہو گئے تھے۔ اجتماع کی یہ جگہ تنظیم کے رفیق جناب کرنل (ریٹائرڈ) حافظ غلام حیدر ترین صاحب کی ذاتی جاگیر ہے۔ یہاں پر یکم اپریل ۱۹۸۶ء تا ۴ اپریل تیرھواں سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔

اجتماع میں فرائض دینی یعنی عبادتِ رب شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے سلسلہ میں یاددہانی اور تذکیر کے ساتھ ساتھ انفرادی کردار سازی پر زور دیا گیا۔ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مسلسل شام کی تین نشستوں کے ارشادات سے مستفید ہونے کے لئے قرب و جوار اور دور کے مقامات سے سامعین تشریف لاتے تھے۔ تمام پروگرام نہایت مربوط طریقہ سے ہوتے رہے۔ لیکن میں......

ہاں میرے ذہن کی دنیا پر ایک خیال مستقل چھایا ہوا تھا۔ جب میں ان وسیع کھیتوں اور خوبصورت دیہاتی ماحول کی طرف دیکھتا تھا جو "یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی" کا مسکن معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ خیال اپنے پنجے اور مضبوط کرتا جاتا تھا۔ جب اس خطّہ کے جغرافیہ پر غور کیا۔ وسیع میدانی کھیت جن کی جنوبی طرف ریلوے لائن اور بڑی شاہراہ گزرتی تھی۔ شمال میں ایک نہر رواں دواں تھی۔ اس لئے دو اہم اور بنیادی ضروریات پانی اور ذرائع مواصلات بھی اللہ تعالیٰ نے اس ٹکڑے کو مرحمت فرمائی تھیں ــــ اس اجتماع کے لئے کرنل صاحب کا وسیع حجرہ ہی نہایت خوبصورتی کے ساتھ سجا کر اجتماع گاہ میں تبدیل کیا گیا تھا۔ بھرپور مصروفیات کے باوجود میں اپنے اُس تخیّل سے اپنے کو نہ چھڑا سکا اور آخر کار تنظیم کے ایک محترم رفیق جناب میجر (ریٹائرڈ) محمود احمد خاں صاحب سے اس وقت ذکر ہی کر دیا جب ہم صبح کی نشست کے بعد اُن کی گاڑی میں واپس اقامت گاہ جا رہے تھے۔ ہماری گفتگو کچھ ایسی تھی۔

س : میجر صاحب! ذہن میں ایک خیال اُبھرا ہے کہ کیوں نہ ہماری تنظیم کا ایک ایسا مرکز ہو جو لوگوں کے لئے ایک مرکزی مرجع بنے؟

میجر صاحب : ہاں خیال تو اچھا ہے ۔ کیونکہ قرآن اکیڈمی اب اس وسعت پذیر دعوت کا "لوڈ" نہیں اٹھا سکتی ۔

میں : اور ہاں جناب قرآن اکیڈمی ایک شہری ماحول ہے جہاں دور دراز کے علاقوں سے لوگوں کو دعوت دے کر لانا بسا اوقات نہایت مشکل ہو جاتا ہے ۔

میجر صاحب : ہاں ٹھیک ہے ۔

میں : ایک مسجد ہو ، اس کے ساتھ ملحقہ اقامت گاہیں ہوں ۔ پانی کا بندوبست ہو اور اس مرکز کے ساتھ کشادہ میدان ہوں جو بوقت ضرورت اپنی فراخی کے باعث اجتماع کا "بار" اٹھا سکے ۔

میجر صاحب : ہاں وہاں پر ہمارے سالانہ یا ششماہی اور اسی طرح دیگر اجتماعات ہوں ۔

میں : اور ہاں جناب ہم اسی طرح ملک کے کونے کونے سے لوگوں کو اجتماع میں یا تربیت گاہیں آنے کی دعوت دیا کریں جیسے تبلیغی حضرات اپنے اجتماعات کے موقع پر رائے ونڈ کے لئے کر رہے ہیں ۔

میجر صاحب : خیال نیک ہے اور بظاہر قابل عمل بھی ۔

میں : اس مرکز میں ہمارے اکابرین رفقاء کی ایک ٹیم موجود ہو ۔ جو عبادت رب ، شہادت علی الناس اور اقامت دین کے موضوع پر ، آئے ہوئے احباب کی تعلیم و تعلم کا اہتمام کرتی رہے ۔

میجر صاحب : خدا کرے کہ عملی طور پر ایسا کچھ ہو جائے ۔

میں : میجر صاحب ! اور امیر محترم نے دوران تقریر سندھ کے حوالہ سے تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی تو فرمایا کہ سندھ بشمول یہ علاقہ جو پنجاب کا زیریں علاقہ ہے پاکستان کے قلب کے مترادف ہے ۔

میجر صاحب : اور یہی خطہ ہے پاکستان کا جس میں بہت بڑا Potential ہے مردم آفرینی کا ۔

اقامت گاہ پہنچنے پر جب میں اپنے بستر پر آرام کرنے لیٹ گیا تو میرے ذہن کے پردے پر اس عظیم مرکز کا ایک واضح خاکہ ابھر آیا جہاں لوگ جوق در جوق آتے اور جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے ۔ اور میرے سامنے غیر شعوری طور پر جاگزیں شدہ وہ عظیم تربیتی دعوتی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لئے مرکز اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ موجود تھا ۔

میں سوچتا رہا کہ اگر اس دعوت نے پھیلنا ہے تو ایک کھلا میدانی اور قابل رسائی مرکز اس کے لئے ناگزیر ضروریات میں سے ایک ہے جو تنظیم کی دعوت کو سمجھنے کے لئے عوام الناس کے لئے مرجع ہو ۔ خیال مزید پختہ ہوتا گیا اور اس کے لئے دل ہی دل میں دعائیں مانگتا رہا ——— اور .. اور

میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ جب اختتامی نشست میں الوداعی کلمات کہتے ہوئے رفیق محترم اور ہمارے میزبان جناب کرنل (ریٹائرڈ) ڈاکٹر حافظ غلام حیدر خان ترین صاحب نے یہ اعلان کر ہی دیا کہ یہ زمین یہ در و دیوار یہ درخت یہ کھیت اور یہ سب کچھ اللہ کی ملکیت اور میرے ساتھ امانت ہے۔ تنظیم اسلامی جیسا چاہے اسے اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ اور دعوت دین حق کے لئے استعمال کر سکتی ہے۔ اُن کی پُر خلوص پیشکش پہ رفقاء کی زبانوں سے اُن کے لئے دعائے خیر کے کلمات جاری تھے۔ کیوں نہ ہو ان کا خلوص اس اجتماع کے اہتمام اور میزبانی کے فرائض کی ادائیگی سے صاف چھلک رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور میری یہی تمنا پوری ہو کہ میرا تخیل حقیقت کا روپ دھارے:

آمین یا رب العلمین

محمد فہیم ۔ باجوڑ صوبہ سرحد

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۷
شمارہ ۷
ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ
جولائی ۱۹۸۸ء
فی شمارہ -/۵
سالانہ زرِ تعاون -/۵۰

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر
اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید

سالانہ زرِ تعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۵۰ روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیویَن ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ " "
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ " "

ترسیلِ زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

افتداراحمد

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارا یہ موقف قارئین پر پوری طرح واضح ہے کہ اسلام اور شریعت کی طرف ہر پیش رفت اگرچہ ہمارے نزدیک مبارک و مسعود ہے تاہم ایسی کوئی تبدیلی دین حق کے قیام و نفاذ کا راستہ ہموار نہیں کر سکتی۔ دین کے بکمال و تمام غلبے کا واقعہ تاریخ انسانی میں صرف ایک بار ظہور پذیر ہوا اور اگر اللہ تعالیٰ کے صادق و مصدوق رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ایک بار پھر روئے ارضی پر قیام کی نوید ہمیں نہ دی ہوتی تو ہر گز نہ مانتے کہ انسانیت ایک بار پھر معراج کا شرف حاصل کرے گی اور اس انعام سے دوبارہ بھی نوازی جائے گی..... تاہم یہ طے ہے کہ دنیا میں جب کبھی ایسا ہوا اسی انقلابی طریقۂ کار سے ممکن ہو گا جس کی پوری پوری شرح اسوۂ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام میں موجود ہے۔ شرط محض اس کے اسی خاص مقصد اور نقطۂ نظر سے مطالعہ کی ہے..... وہ دن طلوع ہو کر رہے گا جب مسلمانوں کی ایک جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش پا پر چلتے ہوئے اس منزل مراد تک پہنچ چکی ہو گی..... ہم اس میں شامل ہوں گے یا نہیں' ایک علیحدہ بات ہے..... ہمارا کام تو اس منزل کی سمت میں سفر کرتے چلے جانا ہے..... منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو فہو المراد' راہ میں ہی کام آ گئے تب بھی خسارے کا سودا نہیں ؏

گر جیت گئے تو کیا کہنا' ہارے بھی تو بازی مات نہیں

وطن عزیز میں اللہ کے کلمے کی صحیح معنوں میں سربلندی اور دین حق کے شایانِ شان اظہار کے لئے ہمارا چھوٹا سا قافلہ اپنی سی کوشش میں مصروف ہے..... اپنے لائحہ عمل کے خطوط ہم نے توفیق الٰہی کے طفیل منہج انقلاب نبوی سے ہی متعین کئے ہیں..... اسے سمجھنے کے لئے تو ہمیں یقیناً خاصی محنت کرنی پڑی تاہم پاکستان کی اکتالیس سالہ تاریخ کے سرسری مطالعہ نے ان نتائج پر ہمارے اطمینان اور وثوق میں خاطر خواہ اضافہ کیا جو سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام سے ہم نے اخذ کئے ہیں۔

پاکستان جس مشکل سے دوچار ہے' اس کا سامنا دوسرے مسلمان ممالک کو نہیں..
یہ ملک خداداد اسلام کے نام پر اور اسی کی ایک مثالی ریاست بننے کی غرض سے وجود میں آیا تھا..... اس نسبت اور اس مقصد کا اعلان ہمارے عوام نے بھی کیا اور خواص نے بھی..... تاہم ہماری پے در پے غلطیوں نے اب اسلام کو ہمارے لئے نسبت کو نبھانے اور عہدوپیان کو پورا کرنے کی ذمہ داری تک محدود نہیں چھوڑا' ہماری مجبوری اور واحد وجۂ جواز بنا دیا ہے..... اس صورتحال کی مزید شرح کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ کم از کم ہمارے حلقے میں اس کی کوئی ضرورت ہے کہ یہ قوم ؏

کافر نتوانی شد' ناچار مسلماں شو

کی سی صورتحال سے دوچار ہے۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد سے ملک میں سیاسی عمل اور جمہوریت کو جیسے تعطل میں ڈالا گیا اور اس کے جو ہولناک نتائج اب نوشتۂ دیوار ہیں' وہ اس وقت موضوع بحث نہیں..... بات محض نفاذ اسلام کے حوالے سے ہو رہی ہے.......... پچھلے گیارہ سال سے یہاں نظام مصطفیٰ کے نعرے کی بازگشت سنی جا رہی ہے..... نفاذ اسلام کا انقلابی تصور تو خود نعرہ لگانے والوں میں بھی موجود نہ تھا' تاہم بعد کے زمانے میں ان صاحب نے بھی جن کے اقتدار مطلق کے لئے ایک سیاسی غدر نے موقع پیدا کیا جسے محض مصلحت کے اتباع میں تحریک نظام مصطفیٰ کا نام دے دیا گیا تھا' لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ وہ اور ان کے رفقائے کار یہاں اسلام کا نفاذ انقلابی طریقے سے نہیں' تدریجی انداز میں کریں گے..... ہم تو سمجھتے تھے اور آج بھی سمجھتے ہیں کہ انقلاب ہی واحد چارۂ کار ہے لیکن ایک بالفعل موجود نظام کے محافظوں سے یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی تھی کہ وہ اسی شاخ پر آری چلا دیں گے جس پر ان کا آشیانہ ہے' وہ اپنے نظام کو انقلاب سے تلپٹ کرنا منظور نہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے تدریج کا نسخہ آزمانے میں عافیت سمجھی کہ ؏

باغباں بھی خوش رہے' راضی رہے صیاد بھی

اسلام کی کچھ برکات کا ظہور بھی ہو جائے اور مفادات پر ضرب بھی نہ پڑے .....
اس لائحہ عمل کے اب تک جو نتائج نکلے' سب کے سامنے ہیں کہ کسی ادنیٰ پیش رفت کا کیا سوال انحطاط اور پسپائی کی رفتار تیز تر ہو گئی..... اب پھر نئے عزم کے ساتھ جس کے خلوص کا فیصلہ ہم بہرحال نہیں کر سکتے' تدریجی عمل کو "ٹاپ گیئر" میں ڈالنے کا اعلان کیا گیا ہے تو اس بات پر غور مناسب ہوگا کہ تدریجی عمل سے بھی اسلام کی کچھ خوبیوں کو معاشرے میں سمونے کا ارادہ اور جذبہ صادق ہوتا تو یہاں ہونا کیا چاہئے تھا۔

اولین ضرورت اس بات کی تھی کہ نظام مصطفیٰ کے نعرے نے جیسی کچھ گرمی دلوں کے نہاں خانوں اور خارجی فضا میں پیدا کی تھی ' اسے نہ صرف برقرار رکھا جاتا بلکہ بڑھانے اور ایک متعین و مثبت رخ پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ..... اس کام میں ذرائع ابلاغ اور مساجد سے بہت مفید کام لیا جا سکتا تھا ..... ریڈیو اور ٹی وی کے موثر ترین ذرائع تو تھے ہی حکومت کے قبضے میں ' اخبارات و جرائد میں بھی فحاشی اور عریانی کا سیلاب پہلے یوں جھاگ نہیں اڑا رہا تھا جیسے آج ہماری آنکھوں کے سامنے اڑا رہا ہے .... انہیں حکومت اشتہارات اور کاغذ کے کوٹے جیسی ترغیبات کے ذریعے بڑی آسانی سے زیر دام لا سکتی تھی ..... ان ترغیبات سے اپنے بے جواز اختیار و اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے انہیں استعمال کیا جا سکتا تھا تو یہ کام لینے میں بھی کیا قباحت تھی کہ وہ عوام الناس میں موجود مذہب سے جذباتی وابستگی کو دینی شعائر عملی طور پر اپنانے کا ایک موثر داعیہ بنانے کی کوشش کرتے .... مساجد کو اگر قرآن مجید کی تعلیم و تدریس کے لئے استعمال کرنے کا انتظام کیا جاتا تو یہ ایک طرف فرقہ واریت کے زہر کا تریاق بنتا اور دوسری طرف غیر محسوس طور پر دین کی مبادیات کی طرف التفات اور ایمان کے شجر طیبہ کی آبیاری کا باعث ہوتا ... ذرائع ابلاغ اور مساجد کی مشترکہ مساعی سے اگر معاشرے کی قلب ماہیت نہ ہوتی تو اتنا ضرور ہو سکتا تھا کہ اہل وطن کی ایک کثیر تعداد میں مسلمان جینے اور مرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ..... دین کو اپنانے اور غیر دین کو ترک کرنے کا اجتماعی ارادہ کسی نہ کسی درجے میں ضرور کار فرما نظر آتا ...... نظام تعلیم میں فوری طور پر بنیادی اور صحت مند تبدیلی نہ بھی لائی جا سکتی تو اتنا تو کیا ہی جا سکتا تھا کہ اس کا صرف قبلہ راست کر دیا جاتا اور اس میں کچھ رنگ مقصدیت کا شامل ہو جاتا ... دانشوروں کے اس طبقے کو جس نے نئی نسل کو دین سے برگشتہ کرنے اور معاملات دین میں ابہام و تشکیک پیدا کرنے میں بڑا ہی موثر کردار ادا کیا ہے ' راہ راست پر نہ لایا جا سکتا تو یہ تو کیا ہی جا سکتا تھا کہ انہیں تعلیم و ابلاغ کے ان شعبوں سے ہٹا دیا جاتا جو قوم کی ملکیت ہونے کے باوجود پوری طرح ان کے تصرف میں تھے ....

دوسرا کم سے کم لازمہ تدریجی عمل کا یہ تھا کہ حکمران ..... اور بات صاف کرنے کے لئے یہ کیوں نہ کہا جائے کہ جنرل محمد ضیاء الحق ..... دین کو اپنی ذات اور اپنے گھر میں نافذ کرتے ..... ہم مذہب کی بات نہیں کرتے جس کے مظاہر جنرل صاحب کی زندگی میں پہلے سے موجود تھے ' دین کا ذکر کر رہے ہیں جس سے زندگی کا کوئی پہلو مستثنیٰ نہیں رکھا جا سکتا ..... ان کے گھر میں بھی ستر و حجاب کا نظام اس حد تک ضرور نافذ ہوتا جہاں تک جملہ نقطہ ہائے نظر

میں اتفاق پایا جاتا ہے...... ان کے آس پاس وہ لوگ پائے جاتے جن کی زندگیاں دین کے مزاج سے قریب تر نظر آتیں اور ان کی رسم و راہ بھی ان حلقوں سے ہوتی جو ہدایت کے اسی چشمے سے فیضیاب ہوتے...... جنرل صاحب کو اپنے عہدہ اور منصب کی رعایت سے ملک کا رسم و رواج جو غیر معمولی تزک و احتشام 'کروفر' مراعات 'تحفظات اور وسعت مالی دیتا تھا' ان سے وہ رضا کارانہ دستبردار ہوتے...... عمر بن عبدالعزیزؒ کی روایات کی تجدید تو شاید آج کے زمانے میں آسان نہ ہوتی لیکن اس سے بہت کم ایثار کا مظاہرہ ان کی طرف سے ہوتا تو حکومت میں ان کے رفقائے کار کم و بیش ان کی پیروی پر مجبور ہوتے۔ خدا ترسی 'احساس ذمہ داری' توکل اور قناعت و سادگی کا یہ چلن اوپر سے اتر کر نچلی صفوں میں غیر محسوس انداز میں اثر و نفوذ پیدا کرتا چلا جاتا...... بین الاقوامی سطح پر پاکستان اور اس کے حکمران یا حکمرانوں کو عزت و وقار کا وہ بلند مقام ملتا جس کی رفعت سے ملک اور دین کے دشمنوں کے دل دہلنے لگتے اور اسلام پھبتیوں کا نشانہ بننے کی بجائے اس شرف کا حقدار ٹھہرتا جو اللہ کی جناب میں اسے حاصل ہے۔

بد عنوانی کی جو ان گنت اقسام معاشرے کی رگوں میں اتر گئی ہیں اور جنہوں نے لوگوں کی عظیم اکثریت کے اخلاق و کردار کا دیوالہ نکال دیا اور اقدار کے ڈھانچے کو زمین بوس کر کے چھوڑا ہے 'ان کا انسداد بھی اوپر کی سطح سے شروع ہوتا تو اثرات کی ضمانت دی جا سکتی تھی...... ایوانہائے اقتدار سے اگر دیانت 'امانت اور پاک دامنی کی داستانیں فضا میں پھیلتیں تو کج روی کی گرد خود بخود بیٹھتی چلی جاتی...... حرام خوری کے راستے جن میں سود جیسی نجس چیز کا کھانا بھی شامل ہے' بند کرنے کی کوشش کی جاتی تو ہمارے کردار کی بہت سی خباثتوں کی جڑیں سوکھنی شروع ہو جاتیں...... سود کو جب تک اور جس حد تک برقرار رکھنا مجبوری ہوتا' رکھا جاتا لیکن اعتراف گناہ اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کا سلسلہ جاری رکھنے کے ساتھ اس عزم کی پختگی کا قول و عمل سے اظہار ہوتا کہ مجبوری کی شدت میں ذرا بھی کمی آئی تو اس لعنت سے چھٹکارا پانے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ ہو گی...... معیشت کی اس ام الخبائث کو صرف نام بدل کر جائز قرار دینے کی کوئی کوشش نہ ہونی چاہئے تھی۔

اسلامی نظام حیات کے جس شعبے کو بھی نفاذ شریعت کے لئے منتخب کیا جاتا' اس میں قانون سازی نقائص سے پاک ہوتی...... اللہ کے عطا کردہ احکام کو آج کی قانونی زبان کا جامہ پہناتے ہوئے اُس سے زیادہ مہارت استعمال کی جانی چاہئے تھی جو مروجہ برطانوی قوانین میں پائی جاتی ہے...... اور پھر اس کی تنفیذ میں رخنوں کو بھی بند کیا جاتا...... ان قوانین کے ساتھ

دوسرے متوازی قواعد و ضوابط کو یکسر منسوخ کر دیا جاتا تاکہ دوئی لوگوں کے لئے بچاؤ کے راستے نہ نکال سکتی۔ اولین ترجیح اسلام کی تعزیرات اور حدود کے نفاذ کو ہی ملنی چاہئے تھی، جیسے کہ ملی لیکن یوں نہیں کہ وہ محض طنز و مزاح کا موضوع بن جائیں اور ان پر عمل در آمد اور اجرا کی ایک نظیر بھی قائم نہ ہو..... اس نظام کو پوری دلی آمادگی اور ارادے کی بھرپور قوت سے اپنایا جاتا تو ہمارا فاسد معاشرہ اس کے اثرات قبول کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا...... کیا اس بات میں کسی کو شبہ ہے کہ فیصلوں کی تاخیر اور سزاؤں کی نرمی نے ہمارے ہاں مجرموں کو وہ شہ دی ہے جو جرم کے تمام داعیات سے بھی قوی ہے..... اور یہ کہ جرائم نے معاشرے کے فساد کی رفتار کو دن دونا رات چوگنا کیا اور اس حال کو پہنچا دیا ہے کہ وہ اسلام کی اعلیٰ اقدار کو تو کیا دنیا میں رائج پست تر معیارات بھی قبول کرنے کو تیار نہیں.......

سطور بالا میں ہم اسلام کے تدریجی نفاذ کی چند ہی ترجیحات کا ذکر کر پائے ہیں..... یہ موضوع اتنا تفصیل طلب ہے کہ جتنا کچھ بھی کہا جائے کم ہے جبکہ ہمیں میسر صفحات کی تعداد محدود ہے..... تاہم اتنا تو ضرور ہو گیا ہو گا کہ قارئین کو اندازہ ہو کہ یہ بات کس طرح اور کون سے رخ کو بڑھائی جانی چاہئے تھی اور سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ اگر نیت نیک ہوتی اور ارادہ میں پختگی پائی جاتی تو متذکرہ بالا چند قدم اٹھانے کے بعد آگے کا راستہ کھلتا چلا جاتا اور ایسے لوگ تلاش کئے بغیر ملتے چلے جاتے جو اس سفر میں ارباب حکومت کا دست و بازو بننے کو سعادت شمار کرتے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

"میثاق" کے اس شمارے میں ملک غلام علی صاحب کے اس جواب کو نقل کیا جا رہا ہے جو انہوں نے این آئی ٹی یونٹس کے بارے میں ایک سوال پر ترجمان القرآن کے تازہ شمارے میں دیا ہے۔ ملک صاحب ہمارے واجب الاحترام بزرگ ہیں، فقہ اسلامی میں کام کرتے ایک عمر گذار چکے ہیں اور صدر ضیاء کی طرف سے قائم کردہ شرعی عدالت میں بطور جج بھی کام کرتے رہے ہیں۔ ...پھر انہوں نے سوالی کو سرسری جواب دے کر ٹرخانے کی بھی کوشش نہیں کی بحقیق کا حق ادا کیا ہے..... ان کے اس خیال سے اختلاف کی گنجائش نہیں رہی کہ این آئی ٹی کی شکل میں کی گئی سرمایہ کاری بھی سود کی آلودگی سے پاک نہیں...... جیسا کہ انہوں نے خود

بھی صراحت کی ہے' ہم سمیت عام لوگ نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ کے بیان پر اعتماد کرتے ہوئے یہ سمجھتے رہے کہ چونکہ ٹرسٹ سرمایہ کاروں کی رقوم کو اچھی شہرت رکھنے والی کمپنیوں کے حصص خریدنے پر لگاتی اور ان حصص سے حاصل کردہ منافع کو اپنے اخراجات وضع کر کے یونٹ ہولڈروں میں تقسیم کرتی ہے' لہٰذا ان پر ملنے والے منافع میں سود کا عنصر شامل نہیں افسوس کہ یہ خیال باطل ثابت ہوا...... اب شاید لوگوں کو کوئی بھی ایسا ذریعہ دستیاب نہیں رہا جس میں وہ حرام سے بچتے ہوئے اپنی بچت کو لگا کر کم از کم اس قدر فائدہ حاصل کر سکیں جو زر کی کم ہوتی قدر کا اثر زائل کر دے یا وہ اس چھوٹ سے جائز فائدہ اٹھا سکیں جو انکم ٹیکس کا قانون بچت پر دیتا ہے ع

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

●●●

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت: -/ صفحات: (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

خطابِ جمعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

نفاذِ شریعت آرڈیننس

ایک ہمہ پہلو جائزہ

تلخیص و ترتیب: عاکف سعید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ آج کل ہمارے ملک کے طول و عرض میں نفاذ شریعت آرڈیننس مجریہ ۱۵ جون ۱۹۸۸ء موضوعِ بحث و نزاع بنا ہوا ہے اور مختلف حلقوں کی جانب سے اس کے بارے میں متضاد آراء سامنے آ رہی ہیں بلکہ سننے میں یہاں تک آ رہا ہے کہ بعض حلقے اس آرڈیننس کی مخالفت میں مظاہرے کرنے اور اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرنے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں چنانچہ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ آرڈیننس کسی ہنگامہ پرور سیاسی مہم کی بنیاد بن جائے اور نتیجۃً ملک میں سیاسی محاذ آرائی کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔

تائید اور مخالفت

جہاں تک اس آرڈیننس کی تائید یا مخالفت کا تعلق ہے تو ہماری معلومات کی حد تک اس کی مخالفت میں تو بڑی قوی اور توانا آوازیں بلند ہوئی ہیں اور بہت اہم گوشوں سے بلند ہوئی ہیں، لیکن تاحال کسی قابلِ ذکر دینی جماعت کی طرف سے اس کی تائید میں کوئی آواز نہیں اٹھی۔ اس کی تائید کرنے والے یا تو وہ سرکاری یا نیم سرکاری ادارے ہیں جو سرکاری گرانٹ سے چلتے ہیں اور یا وہ چند علماء و مشائخ ہیں جنہوں نے انفرادی حیثیت میں اس کی تائید میں بیانات دیئے ہیں...... البتہ اس کی مخالفت کرنے والوں میں: (۱) تمام وہ سیاسی جماعتیں پیش پیش ہیں جو سیکولر مزاج کی حامل ہیں، جن میں پیپلز پارٹی اور تحریک استقلال نمایاں ہیں۔ (۲) اسی طرح

مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین کی جانب سے بھی شدت سے اس آرڈیننس کی مخالفت کی گئی ہے۔ (۳) تیسرے نمبر پر اُن تمام مذہبی سیاسی جماعتوں کی جانب سے بھی اس کی مخالفت کی جارہی ہے جو شریعت بل کی مخالف تھیں۔ ان میں مسلک اہل حدیث سے علامہ احسان الٰہی گروپ' دیوبندی مکتب فکر سے جمعیت علماء اسلام مولانا فضل الرحمٰن گروپ اور بریلوی مکتب فکر سے مولانا نورانی کی جمعیت علماء اسلام شامل ہیں۔ (۴) مزید بر آں متحدہ شریعت محاذ میں شامل بعض اہم جماعتیں اور تنظیمیں بھی اس آرڈیننس کی مخالفت کرنے والوں میں شامل ہیں۔ ان میں نمایاں ترین معاملہ جماعت اسلامی کا ہے جس نے اس آرڈیننس کو پورے طور پر مسترد کر دیا ہے اور اسے اسلام کی جانب پیش رفت کی بجائے پسپائی قرار دیا ہے۔ ہماری رائے میں متحدہ شریعت محاذ کی جانب سے اس معاملے میں متفقہ موقف سامنے آنا چاہئے تھا۔ اس معاملے میں مختلف جماعتوں نے انفرادی حیثیت میں اپنے موقف کا اعلان کر کے جس بے اصولی کا ارتکاب کیا ہے اس کے نتیجے میں یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہو گا کہ متحدہ شریعت محاذ اصولی طور پر اب معدوم کے درجے میں آچکا ہے اور اس کی "طبعی موت" کو اس میں شریک جماعتوں کی جانب سے سند توثیق حاصل ہو چکی ہے...... جمعیت علماء اسلام مولانا درخواستی گروپ کے بعض اکابر کی جانب سے بھی اس بل کی مخالفت میں آواز بلند ہوئی ہے۔ اگرچہ باضابطہ طور پر ان کا موقف ان کے آئندہ اجلاس کے بعد ہی سامنے آئے گا۔ البتہ متحدہ شریعت محاذ میں شریک اہل حدیث اور بریلوی علماء نے آرڈیننس کی بعض کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بحیثیت مجموعی اسے خوش آمدید کہا ہے۔

جہاں تک اُن دینی سیاسی جماعتوں کا تعلق ہے جنہوں نے نہ صدر ضیاء کے ریفرنڈم کو قبول کیا' نہ دستور میں ان کی من مانی ترامیم کو قبول کیا اور نہ ہی غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے والے الیکشن اور اس کے نتیجے میں بننے والی اسمبلی کو قبول کیا' تو ان کی طرف سے اس آرڈیننس کی مخالفت کی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن وہ دینی جماعتیں جو متحدہ شریعت محاذ میں شریک رہی ہیں ان کی جانب سے اس کی مخالفت کسی طور سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا موقف صریحاً ناقابل فہم ہے اور ابھی تک ان کی جانب سے اپنے موقف کے حق میں واضح قسم کے دلائل بھی سامنے نہیں آئے۔ جماعت کے سر کردہ افراد کے بعض بیانات سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ ان کی مخالفت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ یہ آرڈیننس شریعت بل کے ہم پلہ نہیں ہے اور اس میں شریعت بل کا بہت کم حصہ شامل ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس

آرڈیننس کا شریعت بل سے تقابل اصولی طور پر درست نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ شریعت بل کی خاطر اسمبلی اور سینٹ کی چند سیٹوں تک کی قربانی دینے کو تیار نہیں تھے تو اس شریعت بل کا نام لینا اور اس کی بنیاد پر اس آرڈیننس کو مسترد کر دینا آپ کے لئے ہرگز روا نہیں ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ اُس موقع پر بھی میں نے تنظیم اسلامی کی جانب سے شریعت محاذ میں شریک تنظیم کی حیثیت سے اپنے اس موقف کو پوری شدت سے سامنے رکھا تھا کہ اگر آپ حضرات تحریک نہیں چلا سکتے اور شریعت بل کی خاطر اسمبلی کی سیٹوں تک کو قربان نہیں کر سکتے تو ہمارے پاس بہرحال اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ اسے "نشستند و گفتند و برخاستند" میں ضائع کریں۔ ہم صرف اُسی وقت اس محاذ میں عملی حصہ لیں گے جب آپ باضابطہ تحریک چلانے کا اعلان کریں گے۔ اس وقت تک صرف ہماری تائید اور دعائیں آپ حضرات کے ساتھ ہیں' عملی شرکت سے آپ ہمیں معذور سمجھئے۔

مفتی محمد حسین نعیمی اور قاضی عبداللطیف صاحب کی جانب سے اس نفاذ شریعت آرڈیننس کی تائید بھی سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے کہ ان حضرات کا موقف بھی شروع سے یہ رہا ہے کہ اگر آپ لوگ تحریک نہیں چلا سکتے تو پھر ہمیں شریعت بل کے مطالبے میں لچک پیدا کرنی ہوگی اور اس کا جتنا حصہ بھی حکومت تسلیم کرے اس پر قناعت کرنی ہوگی۔ چنانچہ اس موقع پر اگر انہوں نے موجودہ آرڈیننس کی تائید کی ہے تو یہ ان کے سابقہ مؤقف سے پورے طور پر مطابقت رکھتی ہے۔

ہمارا موقف

ہمارا موقف اس معاملے میں شروع سے یہ رہا ہے' اور اسے ہم نے متحدہ شریعت محاذ میں شرکت کے وقت بھی کھول کر بیان کر دیا تھا جو اخبارات میں شائع بھی ہو گیا تھا' کہ جہاں تک ہمارا سیاسی مؤقف ہے وہ اُن سیاسی جماعتوں کے ساتھ ہے جو ریفرنڈم کو فراڈ قرار دیتے ہیں اور دستوری ترامیم کو کلی طور پر مسترد کرتے ہیں گویا اس معاملے میں ہمارا موقف وہی ہے جو علامہ احسان الٰہی ظہیر مرحوم یا مولانا فضل الرحمٰن یا مولانا نورانی میاں کا تھا' لیکن اس سب کے باوصف جہاں تک شریعت کا معاملہ ہے' اس کی جانب پیش رفت اگر کالے چور کی جانب سے ہوگی تو اسے بھی ہم خوش آمدید کہیں گے اور اسی بنیاد پر ہم نے متحدہ شریعت محاذ میں شمولیت اختیار کی تھی..... اب بھی ہمارا موقف بالکل یہی ہے کہ ہم اس نفاذ شریعت آرڈیننس کو شریعت کی جانب ایک مزید پیش رفت سمجھتے ہیں اور اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ یہ آرڈیننس بے سروپا بھی ہے

اور ناقص بھی، لیکن چونکہ بہرحال یہ شریعت کی جانب ایک قدم ہے لہٰذا ہم اسے خوش آمدید کہتے ہیں اور اس کی مخالفت کو کسی طرح بھی جائز نہیں سمجھتے...... یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آرڈیننس کو محض خوش آمدید کہنا اور اس کی عملی تائید کرنا دو جدا جدا باتیں ہیں۔ اور جہاں تک اس شخصیت کی تائید کا تعلق ہے جس نے یہ آرڈیننس نافذ کیا ہے تو یہ بالکل ہی الگ معاملہ ہے..... چنانچہ ہم اسے خوش آمدید ضرور کہتے ہیں، لیکن ہماری تائید چند شرائط کے ساتھ مشروط ہے، جن کی وضاحت آگے آئے گی۔

دستورِ پاکستان اور شریعتِ اسلامی

پاکستان کی دستوری و قانونی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے کہ اس ملک میں شریعت کی جانب پیش رفت کا آغاز "قرار دادِ مقاصد" سے ہوا تھا۔ اس قرارداد میں اللہ کی حاکمیت کے اصول کو ملک کی اعلیٰ سیاسی سطح پر متفقہ طور پر منظور کیا گیا تھا اور بلاشبہ یہ شریعت کی جانب ایک بہت اہم مثبت پیش رفت تھی۔ اگرچہ اس میں یہ کمی رہ گئی تھی کہ "لا الٰہ الا اللہ" کا مفہوم تو پورے طور پر موجود تھا لیکن "محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضوں کو اس میں واضح طور پر نہیں سمویا گیا تھا...... پھر ۱۹۵۶ء میں دستوری سطح پر ایک پیش رفت ہوئی اور دستور کے رہنما اصولوں میں یہ دفعہ شامل کی گئی کہ "اس ملک میں قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں کی جاسکے گی۔" نفاذِ شریعت کے ضمن میں یہ نہایت موزوں اور مثبت دفعہ تھی لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس دفعہ کی حیثیت محض 'DIRECTIVE PRINCIPLE' کی تھی، اسے 'OPERATIVE CLAUSE' کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔

پھر جناب ضیاء الحق صاحب نے اپنے دورِ اقتدار میں ایک قدم اور بڑھایا اور اسے جزوی طور پر OPERATIVE قرار دیا..... اس کا کریڈٹ بہرحال انہی کو جاتا ہے اور اگرچہ ہمیں اس پہلو سے ان کے اس اقدام پر شدید اعتراض تھا کہ انہوں نے عائلی قوانین اور مالی قوانین جیسے اہم معاملات کو شریعت کورٹس کے دائرہ سے مستثنیٰ قرار دے کر دین و شریعت کے ساتھ کسی درجے میں بھی مخلصانہ معاملہ نہیں کیا تھا بلکہ ہماری رائے میں اس اقدام سے وہ اُس وعید کا ہدف بن رہے تھے جو سورۃ البقرہ میں ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے کہ "کیا تم کتاب و شریعت کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو۔ تو تم میں سے جو اس حرکت کا ارتکاب کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی اس کا مقدر بنے اور آخرت میں اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔" تاہم اس تمامتر نقص کے

باوجود بھی ہماری رائے میں اسے نفاذ شریعت کی جانب پیش رفت ہی میں شمار کیا جائے گا۔ اس کے بعد نویں ترمیم کا بل اسمبلی میں پیش ہوا۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ ہم نے اسے بھی خوش آمدید کہا تھا اور اسے نفاذ شریعت کی راہ میں مثبت پیش رفت قرار دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور وہ بل کہیں فائلوں میں دب کر رہ گیا۔ اب حالیہ آرڈیننس کے ذریعے چونکہ عائلی قوانین کو بھی ہائی کورٹس کے دائرہ کار میں شامل کر دیا گیا ہے لہٰذا ہم اسے بھی شریعت کی جانب ایک مثبت پیش رفت سمجھتے ہیں...... اور ہمارے نزدیک اگر اس آرڈیننس کے پس منظر اور اسے نافذ کرنے والی شخصیت کے معاملے کو درمیان سے ہٹا دیں تو ہماری رائے میں عدالتوں کو یہ اختیار مل جانا کہ وہ کسی بھی قانون کے بارے میں' دلائل سننے کے بعد' اس کے خلاف قرآن و سنت ہونے کا فیصلہ سنا سکیں' ایک اہم مثبت پیش رفت ہے۔

"بے سروپا" اور ناقص آرڈیننس

لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری رائے یہ بھی ہے کہ یہ ایک بے سروپا اور ناقص آرڈیننس ہے۔ یہ بے سر اس اعتبار سے ہے کہ اس کے سر پر دستور مسلّط ہے اور یہ اپنا سر دستور سے اونچا نہیں کر سکتا ع "چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے" ۔ یہی سبب ہے کہ فیڈرل شریعت کورٹ اور ہائی کورٹس میں ثنویّت (DUALITY) کا معاملہ برقرار رکھا گیا ہے حالانکہ چاہئے تو یہ تھا کہ شریعت کورٹس ختم کر کے تمام معاملات براہ راست ہائی کورٹس کے دائرہ اختیار میں دے دیئے جاتے اس لئے کہ شریعت کورٹس کا مقام وہ نہیں ہے جو ہائی کورٹس کا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں آئین ہی رکاوٹ بن کر حائل ہوا ہے۔ اسی طرح یہ معاملہ کہ اگرچہ ہائی کورٹس کے لئے فیصلے کی مدت (۶۰ دن) معین کر دی گئی ہے لیکن سپریم کورٹ کے لئے وقت کی کوئی حد طے نہیں کی گئی' ظاہر کرتا ہے کہ آئین کی جانب سے کچھ رکاوٹیں بہرحال موجود ہیں اور اس کا اظہار خود وزیر مذہبی امور کی جانب سے بھی برملا ہو چکا ہے...... اس آرڈیننس کے پیروں نہیں ہیں کہ اس کے لئے کوئی مضبوط بنیاد موجود نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک عارضی دور کے صدارتی آرڈیننس کی ہے جو پورے طور پر آئندہ اسمبلی کے رحم و کرم پر ہے...... اس اعتبار سے اس کی مثال بکری کے اس نوزائیدہ بچے کی سی ہے جس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی ہوتی ہیں...... اور یہ آرڈیننس ناقص اس پہلو سے ہے کہ مالی معاملات میں اصلاح کی کوئی سنجیدہ کوشش اس میں نظر نہیں آتی بلکہ محض دکھاوا معلوم

ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ کہ مالی معاملات میں شریعت کے فیصلے سے پہلے سے طے شدہ معاملات متاثر نہیں ہوں گے اور ماضی کے تمام سودی لین دین معاہدوں کے مطابق برقرار رہیں گے' قرآن و سنت کے منشا کے صریحاً خلاف ہے...... جہاں تک بین الاقوامی مالیاتی معاملات کا تعلق ہے اس میں کسی درجے میں عذر موجود ہے لیکن اندرون ملک جہاں آپ کو اختیار حاصل ہے' کسی شے کی حرمت کے فیصلے کے بعد سابقہ معاملات کو برقرار رکھنا کتاب و سنت کی واضح نفی ہے۔ یہ دراصل سرمایہ داروں اور سود خوروں کو مطمئن کرنے کا ایک حربہ معلوم ہوتا ہے کہ مطمئن رہو تمہارے مفادات پر آنچ نہیں آئے گی۔ حالانکہ قرآن کا صریح فیصلہ ہے کہ سود کی حرمت کے اعلان کے بعد صرف راس المال واپس کیا جائے گا' سود فی الفور ختم کرنا ہو گا۔ بہرحال اس آرڈیننس کے ذیل میں ہماری تائید و حمایت اس معاملے کے ساتھ مشروط رہے گی کہ مالی معاملات میں فوری طور پر ضروری اصلاح کی جائے اور اس سے متعلق شریعت کے فیصلوں کو سابقہ معاہدات اور معاملات پر بھی مؤثر قرار دیا جائے۔

صدر ضیاء الحق کا ماضی

اب ذرا ایک جائزہ اس پہلو سے ہو جائے کہ وہ شخصیت جو اس کا کریڈٹ لے رہی ہے کیا واقعتاً یہ کریڈٹ اسے پہنچتا ہے اور کیا اس کے لئے یہ زیبا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اسلام کا شیدائی اور فدائی قرار دے!...... ہمارے نزدیک فدائیت کا یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ صدر صاحب آج پہلی بار اس دعوے کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں آئے بلکہ ان کا سابقہ ریکارڈ ہمارے سامنے ہے۔ اگرچہ کسی سے سوءِ ظن رکھنا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے لیکن کیا کریں کہ پورا گیارہ سالہ دور اقتدار ان کے دعوے کی تکذیب کرتا نظر آتا ہے۔ گیارہ برس پیچھے جائیے' سب سے پہلے تو انہوں نے وہ تین سالہ ابتدائی نہایت قیمتی وقت ضائع کر دیا جب ۷۷ء کی تحریک نظام مصطفیٰؐ کا جوش و جذبہ بھرپور طور پر عوام میں موجزن تھا۔ اس موقع پر اگر شریعت کا نفاذ کر دیا جاتا تو کسی کو اس کے خلاف آواز اٹھانے کی جرات نہ ہوتی' اس لئے کہ ایک عظیم عوامی دباؤ پشت پر موجود تھا۔ اس کے بعد بھی پانچ برس انہیں ایسے ملے کہ جس کے دوران وہ مقتدر اعلیٰ بلکہ نعوذ باللہ "قادر مطلق" تھے۔ اور واقعتاً انہیں وہ اختیارات حاصل تھے جو کسی ملک کے کسی سربراہ کو حاصل نہیں ہوتے' لیکن یہ پورا عرصہ نہایت نیم دلانہ انداز میں گزارا گیا۔ شریعت کورٹ بنائی تو عائلی قوانین تک کے معاملے میں اس کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ حالانکہ انسانی زندگی کے کسی اور گوشے کے بارے میں قرآن و سنت میں اتنی تفصیلی

ہدایات نہیں ملتیں جتنی عائلی معاملات میں ہدایات دی گئی ہیں لیکن صدر صاحب کا عذر یہ تھا کہ "خواتین کو کون مطمئن کرے گا۔" اناللہ وانا الیہ راجعون...... نفاذ شریعت کا دوسرا بہت بڑا موقع ان کے لئے وہ تھا جب وہ سول حکومت کو اقتدار میں شریک کر رہے تھے۔ اس وقت انہوں نے جس انداز میں سودے بازی کی' آٹھویں ترمیم جس طور سے نو منتخب نمائندوں سے منظور کروائی جس کے ذریعے مارشل لاء کے دور کے اپنے تمام اقدامات کے لئے تحفظ فراہم کیا' شریعت کے اتنے ہی فدائی تھے تو وہ وقت تھا کہ ان سے اگر نفاذ شریعت کا بل بھی منظور کراتے تو وہ پارلیمینٹ ہر حال میں اسے قبول کرتی' اس لئے کہ اقتدار کی جھلک نظر آنے لگی تھی اور لیلائے اقتدار سے ہمکنار ہونے کے لئے ہمارے وہ نمائندے بہت بے چین تھے جنہوں نے الیکشن لاکھوں بلکہ کروڑوں کے صرف سے جیتا تھا۔ اگر اس موقع پر شریعت کی بالادستی تسلیم کرالی جاتی تو آج اس آرڈیننس کے پاؤں بہت مضبوط ہوتے...... اسی طرح اگر ضیاء الحق صاحب واقعتاً نفاذ شریعت کے معاملے میں مخلص ہوتے تو بعد میں اسمبلی میں اپنے اثرات اور اثرو رسوخ کے بل پر شریعت بل کو بھی کسی نہ کسی قابل قبول شکل میں منظور کرا سکتے تھے' اس لئے کہ ارکان اسمبلی میں بہرحال ان کی ایک مضبوط لابی موجود تھی اور کچھ نہ سہی تو کم از کم اُس ترمیم شدہ شریعت بل ہی کو نافذ کرانے کے لئے عملی کوشش فرماتے جس کی جونیجو حکومت نے پیش کش کی تھی۔ اس پس منظر میں اگر کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اصل میں اس کا پورا کریڈٹ وہ خود لینا چاہتے تھے تو یہ بات بے بنیاد بھی نہیں ہے۔

بلکہ اس تناظر میں ان لوگوں کی رائے کو تقویت ملتی ہے جن کے خیال میں یہ نفاذ شریعت آرڈیننس صرف اپنے دور اقتدار کو طول دینے کا ایک حربہ اور ذریعہ ہے۔

توبہ کی شرائط

لیکن اس سب کے باوجود یہ بات بعید از امکان قرار نہیں دی جا سکتی کہ ہو سکتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے فی الواقع توبہ کی توفیق دے دی ہو اس لئے کہ درِ توبہ ہر شخص کے لئے کھلا ہے اور موت کے واضح آثار کے آغاز سے پہلے پہلے توبہ کی قبولیت کی نبویؐ نوید ہر شخص کے لئے موجود ہے۔ چنانچہ اگر وہ واقعتاً توبہ کریں تو ہمیں ان کی توبہ پر شک کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ لیکن صحیح توبہ کے لئے لازم ہے کہ : اولاً وہ معصوم انداز میں اسلام کے شیدائی بننے کی بجائے اپنی خطاؤں کا برملا اعتراف کریں اور علی رءوس الاشہاد اللہ کی جناب میں توبہ کریں۔

ثانیاً اپنے عمل میں فوری اصلاح کریں۔ اس لئے کہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر عمل صالح کو توبہ کی دلیل کے طور پر لایا گیا ہے۔ عمل میں اصلاح کے ذیل میں اگر وہ دو باتوں کا اہتمام کریں تو ہم یہ باور کرنے کو تیار ہیں کہ انہوں نے صحیح توبہ کی ہے۔ ایک یہ کہ موجودہ دستور نے انہیں بحیثیت صدر مملکت جو غیر اسلامی اختیارات اور مراعات دی ہیں' ان سے فوری طور پر رضا کارانہ دستبردار ہو جائیں۔ یہ درست ہے کہ آپ آئین میں ترامیم کرنے کے مجاز نہیں ہیں لیکن خلافِ اسلام اختیارات و مراعات سے از خود دستبردار ہونے میں آپ کے لئے کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ اپنی ذات پر اسلام کو نافذ کرتے ہوئے اس سنتِ موکدہ کا التزام کیجئے جس کا ترک آپ کے اپنے منتخب کردہ علماء کے نزدیک بھی گناہ کبیرہ کے درجے کو پہنچتا ہے۔ داڑھی کے معاملے میں آپ جس عالم سے چاہے فتویٰ لیں جواب آپ کو ایک ہی ملے گا۔ اسی طرح اپنے گھر میں ستر و حجاب کے احکام نافذ کیجئے اور اس کے ساتھ ساتھ جن لوگوں کو آپ موجودہ عبوری حکومت میں آگے لا رہے ہیں اور انہیں اہم ذمہ داریاں سونپ رہے ہیں' انہیں بھی شریعت کے ان احکام کا پابند بنائیے۔

ثالثاً یہ کہ مالی معاملات کے ضمن میں فوری طور پر ضروری ترمیم کیجئے اور ان معاملات میں شریعت کے فیصلوں کو سابقہ معاہدات و معاملات پر بھی موثر قرار دیجئے اس لئے کہ اس معاملے میں رعایت "مداہنت فی الدین" کے ذیل میں آئے گی...... اور رابعاً...... اگرچہ ہماری شرائط میں یہ آخری شرط ہے لیکن پاکستان کی سالمیت کے اعتبار سے اہم ترین ہے...... یہ کہ خدارا اس اقدام کو جمہوری اور دستوری عمل سے انحراف کا ذریعہ نہ بنائیے۔ اس لئے کہ اگر اس اقدام کو جمہوریت کی گاڑی کو پٹڑی سے اتارنے اور مارشل لاء کی راہ ہموار کرنے کا ذریعہ بنا لیا گیا تو شدید اندیشہ ہے کہ سندھ کے حالات کے پیش نظر پاکستان کی سالمیت کے اعتبار سے یہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہو گا۔ سندھ میں سندھی اور غیر سندھی میں کشیدگی اس آخری درجے کو پہنچ چکی ہے جو کبھی ہندو مسلم معاشرے میں ہُوا کرتی تھی۔ کسی شخص کا محض اس بنیاد پر قتل کر دیا جانا کہ وہ غیر سندھی ہے اور اس کا تعلق مہاجروں' پٹھانوں سے ہے' انتہائی خوفناک صورت حال کی علامت ہے۔ ان حالات میں اگر طاقت کے استعمال پر انحصار کیا گیا تو اس کے نتائج بھی نہایت ہولناک ہوں گے۔ اس صورت حال کا صرف ایک ہی ممکن حل ہے اور وہ ہے سیاسی عمل کا اجراء۔ گویا معروف جمہوری اصولوں کے مطابق ایک صاف ستھرا الیکشن ہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

بہرکیف یہ وہ شرائط اور تقاضے ہیں کہ ان کو اگر صدر صاحب پورا کرتے ہیں تو ہم یہ تسلیم کر لیں گے کہ انہوں نے واقعتاً صحیح توبہ کی ہے' تب ہماری تائید بھی انہیں حاصل ہوگی لیکن اگر وہ ان سے گریز کی روش اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ نفاذ شریعت آرڈیننس کی شکل میں انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے وہ کوئی مخلصانہ کوشش نہیں ہے بلکہ اپنے ذاتی مفادات کو تحفظ دینے اور اپنے دور اقتدار کو طول دینے کا ایک حربہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں برے انجام سے اپنی پناہ میں رکھے اور ان لوگوں کو جن کے ہاتھ میں اس ملک کی زمام کار ہے صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

سیاست وردی اتار کر

حالات کے پیش نظر یہ بات بھی خارج از امکان نہیں ہے کہ صدر صاحب کسی وقت بھی خود سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کا اعلان فرما دیں۔ سردار عبدالقیوم صاحب اور جنرل (ریٹائرڈ) فضل حق صاحب کے بیانات اس جانب واضح اشارات دے رہے ہیں' اور حقیقت تو یہ ہے کہ صدر صاحب کو نہ صرف سیاست میں آنے کا پورا حق حاصل ہے بلکہ اس کی اہلیت بھی پورے طور پر ان میں موجود ہے۔ لیکن میدان سیاست میں راست داخلے کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ فوجی وردی اتار کر اس کوچے میں قدم رکھیں بصورت دیگر یہ اعتراض باقی رہے گا کہ وہ سیاست کے پردے میں اپنی فوجی حیثیت کو بروئے کار لا رہے ہیں...... انہیں یہ حق بجا طور پر حاصل ہے کہ اپنی سیاسی جماعت بنائیں' کوئی انہیں نہیں روکے گا۔ آخر کنونشن لیگ بھی ایک دن میں بن گئی تھی' لہٰذا ان کے لئے بھی جماعت بنانے کا پورا امکان موجود ہے لیکن ان سے گزارش یہی ہے کہ وہ وردی اتار کر آئیں اور سیاست کو سیاست کے انداز میں کریں۔ اپنی صلاحیت اور اہلیت کو راست انداز میں بروئے کار لائیں اور اگر وہ اس میدان میں آ کر تحریک پاکستان کے جذبے کو دوبارہ سیاسی سطح پر زندہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ ہمیں توقع ہے کہ اس صورت میں انہیں بھرپور عوامی تائید بھی حاصل ہو جائے گی اور وہ مضبوط بنیاد بھی فراہم ہو جائے گی جس کا ابھی تک فقدان نظر آتا ہے۔

سرکاری مفتی کا عہدہ

آخر میں ایک گذارش مجھے علماء کرام کی خدمت میں بھی کرنی ہے اور وہ یہ کہ ان کے لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ دین کے مفاد کے پیش نظر سرکاری مفتی یا ڈپٹی اٹارنی کے

عہدے قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ اس میں یقیناً بعض اعتبارات سے ان کے لئے بظاہر کشش کے کچھ پہلو موجود ہیں لیکن مجھے شدید اندیشہ ہے سرکاری مفتی کا لفظ ہمارے معاشرے میں بہت جلد ایک گالی بن کر رہ جائے گا۔ اس لئے کہ علماء کرام کی صفوں میں جہاں نہایت مخلص اور متدین رجال دین کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا وہاں علماء سوء کی موجودگی بھی ایک تلخ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے اور اس نوع کے چند افراد بھی اگر اس کوچے کو بدنام کرنے کا باعث بن گئے تو معاشرے میں علماء کا رہا سہا وقار و احترام بھی خطرے میں پڑ جائے گا...... ویسے بھی میری رائے میں اس حیثیت میں علماء کرام اسلام کی کچھ زیادہ خدمت نہ کر پائیں گے۔ اس لئے کہ سرکاری مفتی کا کام صرف سفارشات پیش کرنا ہے' اسے تنفیذِ فیصلہ کا کوئی اختیار حاصل نہ ہو گا...... اور جہاں تک سفارشات پیش کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام علماء سرکاری منصب کی تہمت اٹھائے بغیر بھی کر سکتے ہیں...... انہیں قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مسئلے میں قرآن و سنت کے منشاء کے اظہار کے لئے عدالت میں جا کر اپنے دلائل پیش کریں...... اس کے لئے سرکاری مفتی کا لبادہ اوڑھنا میرے نزدیک قطعاً غیر ضروری ہے...... بلکہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ حد درجہ بلیغ اور پُراز نصیحت الفاظ پیش نظر رہیں کہ "تم نے مفت پایا ہے' مفت تقسیم کرو" تو ہر اعتبار سے مناسب اور معقول روش یہی معلوم ہوتی ہے کہ یہ کام خدمتِ دین کے جذبے کے ساتھ کسی دنیاوی اجر کی امید کے بغیر کیا جائے...... میری دانست میں سرکاری مفتی یا ڈپٹی اٹارنی کا عہدہ قبول کرنے کی بجائے علماء کے لئے شرعی عدالتوں میں وکالت کا راستہ اختیار کرنا زیادہ موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے...... اس لئے کہ وکیل کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موکل کے لئے قانون میں موجود ممکنہ گنجائش تلاش کرے اور اسے ماہرانہ مشورہ دے...... چنانچہ وہ اپنی مہارت اور محنت کے عوض میں اس سے فیس وصول کرتا ہے۔ علماء بھی اگر اپنی فقہی و قانونی مہارت کو اس طور سے بروئے کار لائیں تو میری رائے میں یہ ہر اعتبار سے صاف ستھرا اور مناسب طریقہ ہے اور اس میں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی...... لیکن علماء کرام کے لئے سرکاری مفتی یا ڈپٹی اٹارنی کا عہدہ قبول کرنا نہ صرف یہ کہ مجھے اسلاف کی روایات کے خلاف معلوم ہوتا ہے بلکہ مآل کار کے اعتبار سے مجھے اس میں خدمت دین کی بجائے تنقیصِ دین کا پہلو زیادہ نظر آتا ہے...... اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا صحیح شعور عطاء فرمائے اور صحیح فیصلوں تک پہنچنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

❁❁

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے

بعض ذاتی اور خاندانی کوائف

اُن کے اپنے قلم سے!

—— (قسطِ اوّل) ——

'میثاق' کا گزشتہ شمارہ 'ندا نمبر' تھا۔ جس کے 'عرضِ احوال' میں امیرِ تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ہفت روزہ 'ندا' کے اجراء کا پس منظر اور تنظیمِ اسلامی کی دعوت و تحریک کے ضمن میں اس کی اہمیت پر اظہارِ خیال کیا تھا۔ اس کا اختتام حسبِ ذیل الفاظ پر ہوا تھا۔

"... ندا کے ساتھ ساتھ کچھ تعارف "صاحبِ ندا" کا بھی مناسب ہے... کچھ اس سبب سے کہ اس کے بغیر خود "ندا" کا تعارف بھی نامکمل ہے، اور کچھ اس بنا پر کہ برادرِ عزیز اقتدار احمد نے "ندا" کے دسویں شمارے میں جو چند جملے راقم کے بارے میں تحریر کیے ہیں، ان سے پُرانی یادوں کے بہت سے دریچے وا ہو گئے، اور اپنی خاندانی زندگی کے بہت سے بھُولے بسرے واقعات کی فلم پردۂ ذہن پر چلنے لگی۔ اور یہ احساس شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ یہ حقائق و واقعات تنظیمِ اسلامی کے رفقاء و احباب کے علم میں آنے ضروری ہیں اس لیے کہ "بیعت" کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں داعی کی زندگی کے اہم حالات و واقعات کا "مبایعین" کے علم میں ہونا مناسب اور مفید ہی نہیں نہایت ضروری ہے۔!"

محترم امیرِ تنظیم نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو بات طویل ہوتی چلی گئی۔ اور وہ اس کی اشاعت کے بارے میں متردّد بھی ہوئے لیکن تنظیم کے بہت سے سینئر اور ذمّہ دار رفقاء کا خیال ہے کہ اس کی اشاعت ضروری ہے۔ اس لیے کہ بہت سے رفقاء کے ذہنوں میں بعض سوالات موجود ہیں یا انہیں اُن سے اپنی دعوتی مساعی کے ضمن میں سابقہ پیش آتا ہے، اس تحریر سے 'انشاء اللہ' ایسے بہت سے سوالات کی وضاحت ہو جائے گی —— بہرحال اس کی قسطِ اوّل تو حاضر ہے۔ رفقاء و احباب دعا کریں کہ امیرِ محترم اس کی تسوید مکمل کرلیں۔

(ادارہ)

ہمارے خاندان کا مولانا مودودی مرحوم کی تصانیف اور ان کی دعوت و تحریک سے اولین تعارف بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے ذریعے ہوا۔ جنہوں نے اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کے دوران جماعت اسلامی کے لٹریچر کو نہ صرف پڑھ لیا تھا' بلکہ اپنی محنتی طبیعت کے مطابق ان کے مفصل نوٹس تیار کر کے گویا اسے اچھی طرح ہضم بھی کر لیا تھا... ۱۹۴۷ء کے وسط میں وہ تعلیم سے فارغ ہوئے' اور پھر تین چار ماہ تقسیم ہند کے حوادث سے دوچار رہنے کے بعد اسی سال کے اواخر میں ایک جانب محکمہ نہر میں ایس ڈی او کے عہدے پر فائز ہو گئے اور دوسری جانب جماعت اسلامی کے رکن بن گئے!

جماعت سے تعلق کے ضمن میں ان کے ساتھ ایک عجیب حادثہ یہ پیش آیا کہ جب حکومت نے جماعتِ اسلامی کو سیاسی جماعت قرار دے کر سرکاری ملازمین کے لئے اس کی رکنیت ممنوع کر دی تو انہوں نے اپنی ذاتی اور خاندانی مجبوریوں کے باعث رکنیت سے استعفیٰ دے دیا... لیکن ۱۹۵۱ء میں جب جماعت نے پنجاب کے انتخابات میں زور شور سے حصہ لیا تو وہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکے اور انہوں نے اپنی ذاتی کار انتخابی مہم میں استعمال کے لئے جماعت کے حوالے کر دی' جس کی پاداش میں وہ سرکاری ملازمت سے برخواست کر دیئے گئے!...... بعدازاں شدید محنت و مشقت اور اپنی فنی مہارت و قابلیت کے بل پر اپنی آزاد معیشت کو استوار کرنے کے بعد وہ دوبارہ جماعت کے رکن بنے تو اس بار جماعت کی پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں جو شدید اختلاف ۵۷ - ۱۹۵۶ء میں رونما ہوا تھا اس کا شکار ہو گئے اور نہایت مایوس اور بددل ہو کر دوبارہ علیحدہ ہو گئے اور اس بار ان کی مایوسی اور بددلی اتنی شدید تھی کہ انہوں نے باضابطہ استعفیٰ تحریر کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی!

وہ دن اور آج کا دن' ان کی جملہ صلاحیتیں اپنے فن اور کاروبار کے لئے وقف ہو کر رہ گئیں..... اور اگرچہ پالیسی کے اختلاف کے ضمن میں ان کی رائے صدفی صد راقم کی رائے کے مطابق تھی' چنانچہ اجتماع ماچھی گوٹھ میں جو چند ووٹ راقم کو ملے تھے ان میں سے ایک ان کا بھی تھا..... لیکن اس کے بعد ان میں تحریکی داعیہ دوبارہ کبھی پیدا نہ ہو سکا' اور اس معاملے میں انہوں نے' غالباً اپنے داخلی جذبات کو دبانے ہی کی خاطر' اپنے آپ پر ایک مصنوعی لاابالیانہ انداز طاری کر لیا' جس نے بعدازاں ان کی طبیعت ثانیہ کی حیثیت اختیار کر لی۔

عارضی سا ابال آیا تھا جس کی بنا پر انہوں نے جماعت اسلامی کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کی ایک نشست کے لئے بڑے جوش و خروش اور جذبہ و شوق کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ لیکن انتخابات کے نتائج نے انہیں پہلے سے بھی زیادہ مایوس اور بد دل کر دیا...... چنانچہ کچھ اسی مایوسی اور بد دلی' اور کچھ بعض دوسری نفسیاتی پیچیدگیوں کے باعث وہ راقم کی دعوت و تحریک کے ساتھ' اس سے نظری طور پر بہت حد تک متفق ہونے کے باوجود تا حال عملاً منسلک نہیں ہو پائے!

....

یہ بھی یقیناً راقم پر اللہ تعالیٰ کے عظیم فضل و احسان کا مظہر ہے کہ اس کے باقی تینوں حقیقی بھائی' واحد حقیقی چچا زاد بھائی سمیت' اُس کے مشن میں عملاً شریک و شامل اور تنظیم اسلامی سے باضابطہ منسلک ہیں۔

ان میں سب سے چھوٹے یعنی ڈاکٹر ابصار احمد سے رفقائے تنظیم و انجمن' اور قارئین "میثاق" و "حکمت قرآن" بخوبی واقف ہیں' اس لئے کہ وہ تنظیم اسلامی میں باضابطہ شامل ہونے کے ساتھ ساتھ قرآن اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر اور "حکمت قرآن" کے اعزازی مدیر بھی ہیں۔

عمر میں ان سے بڑے ہمارے واحد عم زاد مظفر احمد منور ہیں جو کراچی یونیورسٹی کے انتظامی شعبے سے منسلک اور تنظیم اسلامی کراچی سے وابستہ ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک وہ نہایت فعال کارکن تھے۔ لیکن اولاً اپنی والدہ مرحومہ کی شدید اور طویل علالت' پھر اپنی اہلیہ کی ناسازئی طبع اور پھر اپنے ایک چھوٹے بچے کی پریشان کن علالت کے باعث اگرچہ زیادہ فعال نہیں رہے..... تاہم نظم کی پابندی میں ہرگز کوئی کوتاہی نہیں کرتے!

ان سے بڑے یعنی برادرم وقار احمد اگرچہ نہایت کم گو ہونے کے باعث زیادہ نمایاں نہیں ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ چوالیس پینتالیس برس کی عمر میں' جوان بچوں کے باپ اور دو نواسوں کے نانا ہونے کے باوجود' اور ایک معروف تعمیراتی فرم کے ڈائریکٹر اور کاروباری اعتبار سے نہایت مصروف ہونے کے باوصف انہوں نے جس طالب علمانہ شان کے ساتھ قرآن اکیڈمی کا دو سالہ تعلیمی کورس امتیازی حیثیت میں مکمل کیا' وہ ان کی سعادت' دین کے ساتھ لگن اور راقم کے مشن کے ساتھ گہری وابستگی کا بیّن ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اُن کی زبان کا "عقدہ" کھول دے اور اُن کی طبیعت کی جھجک دور

فرمادے توانشاءاللہ وہ قرآن حکیم کے درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے میدان میں نہایت نمایاں خدمت سرانجام دے سکیں گے۔ (جس کا آغاز انہوں نے 'بحمد اللہ' اپنے بچوں اور بچیوں کو عربی زبان اور ترجمۂ قرآن کی تدریس کی صورت میں کر بھی دیا ہے۔)

ان میں سب سے بڑے '...... اور مجھ سے متصلاً چھوٹے ہیں مدیر "ندا" برادرم اقتدار احمد 'جن کے ساتھ حقیقی بھائی ہونے کے اساسی رشتے پر مستزاد راقم کے چار مزید رشتے قائم ہو چکے ہیں 'یعنی ان کی دو بچیاں میرے دو بیٹوں کے گھروں کی زینت ہیں اور میری دو بچیاں ان کی بہوئیں ہیں 'لیکن ان جملہ رشتوں سے اہم تر معاملہ یہ ہے کہ وہ میرے نہایت دیرینہ معاون اور رفیق کار ہیں 'اور تحریک اسلامی کے ساتھ ان کا تعلق بھی تقریباً اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود میرا!

....

چنانچہ جن دنوں راقم میڈیکل اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے اسلامی جمعیت طلبہ کا فعال کارکن تھا' وہ بھی ہائی اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے سرگرم کار تھے۔ اور ۵۱۔ ۵۰ کی انتخابی مہم میں بھی انہوں نے انتھک کام کیا تھا ... اور دسمبر ۵۱ء کی اُس دس روزہ تربیت گاہ میں بھی شرکت کی تھی جو راقم نے بحیثیت ناظم جمعیت لاہور منعقد کی تھی اور جس کے نہایت دوررس اثرات خود راقم کی شخصیت اور بعد کی زندگی کے رخ پر مترتب ہوئے تھے!

۵۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کچھ خاندانی حالات اور زیادہ تر ذاتی نفسیاتی الجھنوں کے باعث نہ صرف یہ کہ ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا بلکہ کچھ عرصہ وہ نہایت شدید نفسیاتی بحران کا شکار رہے۔ راقم کو نہایت شدت کے ساتھ احساس تھا کہ ان کی نفسیاتی الجھنوں کے پیدا ہونے میں کچھ حصہ الفاظ قرآنی "اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" (سورۂ صٓ : ۲۴) اور فارسی مقولے "سگ باش برادر خورمباش!" کے مصداق ہم بڑے بھائیوں ...... بالخصوص راقم کا بھی تھا۔ لہٰذا راقم نے اس کی تلافی اور ان کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کی اور ان ہی مساعی کے سلسلے کی ایک کڑی کے طور پر سردار محمد اجمل خان لغاری مرحوم و مغفور کے ساتھ اپنے ذاتی مراسم اور رسوخ کو بروئے کار لا کر مولانا محمد ایوب صاحب کی صاحبزادی سے ان کی شادی کا اہتمام کیا۔ (مولانا ان دنوں سردار صاحب کے یہاں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے! اور جماعت اسلامی کے

ساتھ فعال وابستگی رکھتے تھے۔) اور بحمد للہ! اس کے نہایت صحت مند نتائج ظاہر ہوئے......
اور نہ صرف یہ کہ آنعزیز کی زندگی کی گاڑی صحیح پٹڑی پر پڑ گئی بلکہ پھر انہوں نے اپنی تعلیمی کمی کی بھی بھرپور تلافی کی..... اور گیارہ ماہ کے اندر اندر تین امتحان پاس کر لئے 'اولاً ادیب فاضل' پھر ایف اے اور پھر بی اے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے لاہور کا رخ کیا اور ایک جانب اسلامیہ کالج سول لائن میں ایم اے انگلش کے لئے اور دوسری جانب لاء کالج میں ایل ایل بی میں داخلے کے لئے آزمائشی ٹیسٹ دیئے 'اور دونوں میں کامیابی حاصل کر کے بالفعل داخلہ ایل ایل بی میں لے لیا..... اور اس کے ساتھ ساتھ اولاً ڈیڑھ دو ماہ روزنامہ "تسنیم" اور بعد ازاں ہفت روزہ "ایشیا" میں کام کرنا شروع کر دیا اور مؤخر الذکر کے سلسلے میں تو اتنی کامیابی حاصل کر لی کہ ملک نصر اللہ خاں مرحوم و مغفور نے اپنی آپ بیتی پر مشتمل ایک کالم کے سوا باقی پورا پرچہ ان کے حوالے کر دیا۔ اور انہوں نے بھی چھ ماہ کے اندر اندر اس کی اشاعت میں معقول اضافہ کر کے دکھا دیا۔

....

اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے بھائی جان کی شدید محنت اور مشقت کے صلے میں ان کے کاروبار میں برکت عطا فرمادی تھی اور ان کی تعمیراتی فرم کا کام کافی وسعت اختیار کر گیا تھا۔ جس کے لئے انہیں معاون ہاتھ درکار تھے۔ چنانچہ ان کی دعوت پر عزیزم اقتدار احمد نے بقولِ خود قلم ہاتھ سے رکھ کر بیلچہ تھام لیا۔ اور الحمد للہ کہ اس میدان میں بھی ان کی طبعی ذہانت نے جلد ہی اپنا لوہا منوالیا۔ بعد میں بھائی جان نے ان کے 'اور ان سے چھوٹے بھائی عزیزم وقار احمد کے لئے 'جنہوں نے بی ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا' پرائیویٹ ٹیوشن کے ذریعے سول انجینئرنگ کی تعلیم کا اہتمام بھی کر دیا۔ جس کے نتیجے میں انہیں اس کاروبار کے ضمن میں عملی مہارت کے ساتھ ساتھ فنی بصیرت بھی حاصل ہو گئی..... اور اس طرح یہ دونوں چھوٹے بھائی پیشہ اور کاروبار کے اعتبار سے مستقلاً اس "شاہراہ" پر گامزن ہو گئے جس کا "افتتاح" بھائی جان نے کیا تھا!

....

اس دوران میں خود راقم الحروف ۱۹۵۷ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت اور جماعت کی ڈسپنسری کی ملازمت کو خیرباد کہنے کے بعد از سرنو اپنی معاشی زندگی کی بنیاد استوار کرنے اور

تحریکی وابستگی کی نئی راہیں متعین کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا...... چنانچہ تین چار سال کی محنت کے نتیجے میں ایک جانب اس نے منٹگمری (حال ساہیوال) میں اپنا ذاتی مطب مستحکم (ESTABLISH) کر لیا تھا اور دوسری جانب کچھ عرصہ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے "بزرگوں" کے کوچوں کا طواف کرنے' اور بالآخر کسی نئی تعمیر و تشکیل کے ضمن میں ان سے مایوس اور بددل ہو جانے کے بعد' ذاتی سطح پر منٹگمری ہی میں "حلقۂ مطالعۂ قرآن" اور "دار المقامہ" کے نام سے ایک ہاسٹل کے قیام کے ذریعے اپنے مقصد زندگی کی لگن اور تحریکی جذبے کی تسکین کا سامان فراہم کر لیا تھا۔ اس ہاسٹل کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ کالج میں زیر تعلیم طلبہ کے لئے دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ اور الحمد للہ کہ برادر عزیز مظفر احمد منور اور برادرم ڈاکٹر ابصار احمد کے فکر و نظر کی داغ بیل اسی ہاسٹل میں پڑی اور اُن کی زندگی کا رخ یہیں متعین ہوا۔

میں اپنی ان مصروفیات میں پوری طرح مگن اور مطمئن تھا کہ اچانک بھائی جان کی جانب سے مجھے بھی اپنے کاروبار میں شرکت کی دعوت موصول ہوئی۔ خود اپنے بارے میں اس "اعتراف" کے ساتھ کہ "میرے پاس فنی صلاحیت اور مہارت تو موجود ہے' تنظیمی اور انتظامی صلاحیت بالکل نہیں ہے" اور میرے بارے میں اس "مغالطے" کے باعث کہ "تمہیں اللہ نے یہ صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی ہیں!" ... اس سلسلہ میں انہوں نے ایک جانب والدین سے بھی سفارش کرائی اور دوسری جانب خود مجھ پر ترپ کا یہ پتہ آزمایا کہ "تم اپنی میڈیکل پریکٹس کے ساتھ دعوت اور تحریک کا کام کیسے کر سکو گے؟ بہتر یہ ہے کہ کچھ دن اس کاروبار میں وقت لگا کر اس کے انتظامی ڈھانچے کو استوار کر دو' پھر ہم تمہیں دین کے کام کے لئے مستقل طور پر "فارغ" کر دیں گے!" ..... تحریک اسلامی کے ساتھ میری شدید جذباتی وابستگی نے مجھے اس دلیل کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا.... اور میں نے بھی ان کی دعوت قبول کر لی۔ چنانچہ میں قریشی کنسٹرکشن کمپنی لمیٹڈ کا حقدار بھی بن گیا' اور اس کا ڈائریکٹر اور جنرل منیجر بھی! اور میرے ذاتی مطب نے بھی اسی کمپنی کی جانب سے ایک خیراتی ہسپتال (WELFARE CLINIC) کی حیثیت اختیار کر لی۔

لیکن جلد ہی راقم نے محسوس کر لیا کہ یہ تو "دامِ ہمرنگ زمین" ہے۔ اس لئے کہ اولاً یہ کام جس قدر محنت اور توجہ کا طالب ہے اس کے پیش نظر اندیشہ ہے کہ کہیں میں مستقل طور پر

سی میں "گم" ہو کر نہ رہ جاؤں...... مزید بر آں یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ اعلیٰ معیار زندگی کی
بیڑیاں پاؤں میں مستقل طور پر نہ پڑ جائیں' ثانیاً ہم دونوں بھائیوں کے مزاج اور انداز کار کا
فرق قدم قدم پر پیچیدگیوں کا باعث بن رہا تھا۔ جس سے فوری طور پر ذہنی کوفت اور وقت اور
صلاحیت کے ضیاع کے علاوہ یہ اندیشہ بھی موجود تھا کہ کہیں مستقبل کے اعتبار سے لینے کے
دینے نہ پڑ جائیں کہ کہاں تو مقصد یہ تھا کہ احیائے اسلام کے لئے مشترک جدوجہد کریں گے
کہاں یہ کہ باہمی اخوت کا رشتہ بھی مجروح ہو جائے!

بنابریں' میں نے کاروبار میں شرکت کے بعد جلد ہی واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن چونکہ یہ
پورے خاندان کا مسئلہ بن گیا تھا اور اس میں ہم چار بھائیوں کے علاوہ ایک بہنوئی بھی شامل تھے
لہٰذا اس شراکت کو ختم کرنے میں کچھ وقت لگا۔ اور اگرچہ اس کے دوران بھائی جان مجھے ہر
طرح سمجھاتے رہے کہ میں علیحدگی اختیار نہ کروں لیکن میرا حال یہ تھا کہ اس "دام همرنگ
زمین" سے نکلنے میں مجبوراً جو تاخیر ہو رہی تھی اس کا ایک ایک لمحہ سوہان روح بن گیا تھا۔ مجھے
اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار بھائی جان نے فرمایا۔ "اسرار تم ذرا محنت کر لو تو میں تمہیں یقین
دلاتا ہوں کہ تم ہشتم خاں سے بڑے کنٹریکٹر بن سکتے ہو۔" (یہ نام میں نے تو پہلی بار ان ہی کی
زبان سے سنا تھا' لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب کوئی کروڑ پتی قسم کے ٹھیکیدار تھے۔)
جس کا جواب میں نے یہ دیا تھا کہ "بھائی جان مجھے یہ کام کرنا ہی نہیں ہے۔ مجھے اگر پیسہ ہی
بنانا مقصود ہوتا تو اللہ نے جو "پیشہ" مجھے عطا فرمایا تھا (یعنی میڈیکل پریکٹس) وہ بھی کچھ ایسا برا
نہ تھا!"

بہرحال راقم ۱۹۶۵ء میں کراچی سے رسی تڑا کر (جہاں ۶۲ء میں اسی کاروبار کے سلسلے میں
منتقلی ہو گئی تھی اور جہاں مزار قائد اعظم کے قریب اس کوٹھی میں قیام رہا تھا جس میں بعد میں
پیپلز پارٹی کا سنٹرل سیکرٹریٹ قائم ہوا۔) سیدھا لاہور پہنچا' اس لئے کہ ع "کچھ اور چاہیے
وسعت میرے بیاں کے لئے!" کے مصداق کسی انقلابی دعوت و تحریک کا آغاز ملک کے کسی
"ام القریٰ" ہی سے ہو سکتا تھا...... اور اُس وقت میں نے اپنی زندگی کے اس عجیب و غریب
حادثے پر نگاہ بازگشت ڈالی تو یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ الفاظ قرآنی "لَقَدْ جِئْتَ عَلٰی
قَدَرٍ یّٰمُوْسٰی" کے مصداق اس پورے معاملے میں یہ حکمت خداوندی اور مشیت ایزدی
مضمر تھی کہ مجھے ساہیوال سے اکھاڑ کر لاہور لے آیا جائے...... اور یہاں اپنی زندگی کے نئے

سفر کے آغاز کے لئے ابتدائی سرمایہ بھی فراہم کر دیا جائے۔

چنانچہ کاروبار سے علیحدگی پر جو خطیر رقم میرے حصے میں آئی' اس سے میں نے:

(۱) ایک دو منزلہ مکان کرشن نگر لاہور میں خریدا جس میں اتنی گنجائش موجود تھی کہ رہائشی ضروریات بھی پوری ہو جائیں' اور مطب بھی قائم ہو سکے' (۲) "دارالاشاعت الاسلامیہ" قائم کیا جس کے تحت سب سے پہلے میری اپنی تالیف "تحریک جماعت اسلامی' ایک تحقیقی مطالعہ" شائع ہوئی' اور پھر مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اور تفسیر "تدبر قرآن"...... اور میرے ابتدائی دعوتی کتابچوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

(۳) ماہنامہ "میثاق" جاری کیا' جو کچھ عرصے سے بند تھا چنانچہ اس کے ضمن میں کچھ سابقہ واجبات بھی مجھے ادا کرنے پڑے!

الغرض' اس طرح مجھے اپنی زندگی کے اُس نئے سفر کے آغاز میں کوئی دقت نہیں ہوئی' جس کے اہم نشانات راہ ہیں: ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تأسیس' اور اس کے تحت قرآن اکیڈمی کا قیام...... اور ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کی تأسیس اور اس عنوان کے تحت اقامتِ دین کیلئے ایک انقلابی جدوجہد کا آغاز!

....

انگریزی زبان کے ایک مشہور مقولے[ل] کا حاصل یہ ہے کہ علیحدگیاں ہمیشہ تلخیوں کو جنم دیتی ہیں...... ہماری کاروباری علیحدگی بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہ رہ سکی' اور بھائی جان کے ضمن میں تو وہ صورت پوری شدت کے ساتھ پیدا ہو کر رہی جس کا اندیشہ میری علیحدگی کے اسباب میں داخل تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ ایک طویل عرصے تک تعلقات نہایت کشیدہ رہے۔ خود عزیزم اقتدار احمد کے ساتھ اگرچہ کوئی براہ راست تلخی تو پیدا نہیں ہوئی' لیکن غیر محسوس طور پر مغائرت کے پردے حائل ہوتے چلے گئے۔ (اور اس میں بھی' جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا' اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم حکمت مضمر تھی!)

ہماری کاروباری علیحدگی جس انداز میں ہوئی' اس کے نتیجے میں برادرم اقتدار احمد کو ایک مستحکم کاروباری ادارے کے مالک و مختار ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی' اور اس طرح اُن کی ذہانت اور صلاحیت کو بھرپور طور پر بروئے کار آنے کا موقع ملا۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک

ل "PARTINGS ARE ALWAYS PAINFUL"

میں کہ انہوں نے اپنی خداداد لیاقت اور شدید محنت و مشقت کے نتیجے میں نہایت شاندار کامیابی حاصل کی اور اس میدان میں فتح و کامرانی کے بہت سے بلند اور نمایاں جھنڈے نصب کئے۔ (اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی سطح میں جو نمایاں فرق و تفاوت پیدا ہوا' اس نے ہمارے مابین مغائرت کے پردوں کو مزید دبیز کر دیا!)

(جاری ہے)

ADARTS HMD-6-87

ایک مخلصانہ سرزنش

تمباکو نوشی کو 'نہی عن المنکر' میں سرِ فہرست ہونا چاہیے!

رحیم یار خان کے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب راقم الحروف کے دیرینہ کرم فرماؤں میں سے ہیں۔ انجمن خدام القرآن سے تو وہ عرصے سے باضابطہ منسلک ہیں، لیکن تنظیم اسلامی میں تاحال شامل نہیں ہوئے۔ تاہم تنظیم کے ساتھ نصح و اخلاص اور خیر خواہی و خیر اندیشی کا گہرا رشتہ رکھتے ہیں اور گاہے بگاہے راقم کو خیر خواہانہ تنقیدوں اور مخلصانہ نصیحتوں سے نوازتے رہتے ہیں ـــــ اس سال تنظیم اسلامی کا جو سالانہ اجتماع طارق آباد (نزد بہاول نگر) میں منعقد ہوا، اس میں نہ صرف یہ کہ ہمہ وقت اور ہمہ تن شریک رہے بلکہ نہایت مستعدی اور تن دہی کے ساتھ مریضوں کی خدمت میں بھی لگے رہے ـــــ حال ہی میں ان کا ایک مفصل مکتوب موصول ہوا ہے جس کا اکثر و بیشتر تو حسب سابق ناقدانہ تبصروں اور خیر خواہانہ مشوروں پر مشتمل ہے ـــــ جس سے اصلاً راقم کی راہنمائی مقصود ہے ـــــ البتہ اس کے آخر میں "نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!" کے مصداق ایک تلخ و تند مگر مخلصانہ 'سرزنش' بھی ہے جس میں خطاب تو اگرچہ راقم ہی سے ہے لیکن مطلوبہ اصلاح کا دائرہ وسیع تر ہے ـــــ لہٰذا اسے افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جا رہا ہے ـــــــــ اسرار احمد

"...... آپ سمع و طاعت کی بیعت کو گھر پر کیوں نہیں آزماتے؟ ...... صاحب آپ کے بزرگ اور انتہائی عزیز رفیق ہیں۔ بھائی ...... صاحب تو بھائی بھی ہیں اور دوست بھی۔ آپ اچھے "پیر" ہیں آپ کے مرید خودکشی پر تلے ہوئے ہیں اور آپ انہیں روکتے نہیں، سگریٹ کے

نشہ ہونے میں کسے کلام ہے ! — اور اسلام میں ہر نشہ آور شے حرام ہے ۔ اس کے زہر ہونے میں کسے شبہ ہے ! اور اب تو "PASSIVE SMOKING" کے نقصانات بھی واضح اور مبرہن ہو چکے ہیں ۔ پاس بیٹھنے والے اس بدبودار دھوئیں کو برداشت کرنے پر ہی مجبور نہیں ہوتے بلکہ اس کے زہریلے اثرات سے "فیض یاب" ہونے پر بھی مجبور ہوتے ہیں ۔ دین کی سطح پر اسے حرام نہ کہئے کہ مفتی اور مولوی بھی اس نشے کے اسیر ہیں، اخلاقی لحاظ سے کتنی بڑی برائی ہے ! شریف آدمی کسی کو اذیت نہیں دیتا کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا اور سگریٹ نوش بے قصور لوگوں کو اذیت بھی دیتا ہے اور نقصان بھی پہنچاتا ہے ۔ پھر بھی وہ معزز ہے ۔ شریف ہے ۔ میں اگر مفتی ہوتا تو اس برائی کو نہی عن المنکر میں سرفہرست رکھتا ۔ افیمی، شرابی اور املی (بھنگی) صرف اپنا نقصان کرتا ہے ۔ سگریٹ نوش تو اپنے ساتھ رہنے والوں اور اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بھی نہیں بخشتا ۔ یہ ڈھٹائی ہی نہیں غنڈہ گردی ہے ۔ شاید الفاظ نامناسب معلوم ہوں لیکن سگریٹ نوشی کی برائی اتنی سنگین ہے کہ اس کے خاتمے کے لئے شدید ترین نفرت کا اظہار ضروری ہے ۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں آپ شیخ ...... صاحب کو ANGINA کے ہاتھوں اور .... صاحب کو "POLYCYTHEMIA" کے ہاتھوں کرب و اذیت میں مبتلا رہنے کے لئے اس لئے چھوڑے رکھیں گے کہ روایتی مروّت اور شائستگی کا تقاضا ہے ۔ حالانکہ حقیقی مروّت اور شائستگی ان بیماریوں کے سبب کو سختی سے روکنے میں ہے ۔ ان کا آپ پر حق ہے کہ آپ انہیں دوٹوک الفاظ میں نوٹس دیں ۔ ورنہ ان کی خودساختہ اور پرداختہ بیماری کے لئے آپ بھی عند اللہ جواب دہ ہوں گے اور یہ حقیر پر تقصیر آپ کے خلاف گواہی دے گا ۔"

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہُدیٰ

درس ۱۱۱، نشست ۵۳

مباحثِ عمل صالح

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

(سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۳۳ تا ۴۰ کی روشنی میں)

(۲)

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ـــــ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّہٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَھْدِ ۚ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا ۝ وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ؕ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ۝ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا ۝ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۝

"اور مت قتل کرو اس جان کو جس کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو تو اس کے ولی کو ہم نے (قصاص کا) اختیار دیا ہے پس اسے چاہئے کہ وہ قتل میں حد سے تجاوز نہ کرے چونکہ اس کی مدد کی گئی ہے..... اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طور پر جو اس کے حق میں بہترین ہو یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائے اور عہد کو پورا کرو بلا شبہ عہد کے بارے میں باز پرس ہو گی' جواب دہی کرنی ہو گی۔ اور جب ماپ کر دو تو پورا ماپ کر دو اور جب تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو' یہی اچھا طریقہ ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی خوب ترین ہے۔ اور کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔ یقیناً آنکھ' کان اور دل ان میں سے ہر ایک کی پرسش ہوتی ہے۔ اور زمین پر اکڑ کر مت چلو۔ تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی پہاڑ کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔ ان عام امور میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ یہ وہ دانائی اور حکمت کی باتیں ہیں جو (اے نبی!) آپؐ کے رب کی طرف سے آپؐ پر وحی کی گئی ہیں اور دیکھنا "اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ ٹھہرا بیٹھنا ورنہ تم بھی ملامت زدہ اور راندہ درگاہ ہو کر جہنم میں جھونک دیئے جاؤ گے"۔

محترم حاضرین و معزز ناظرین۔

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کے دروس کا سلسلہ ان مجالس میں ہفتہ وار چل رہا ہے' اس کے حصہ سوم' جو عمل صالح کے مباحث پر مشتمل ہے' کا سبق نمبر چار ہمارے زیر مطالعہ ہے۔ یہ سبق سورۃ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع پر مشتمل ہے۔ گذشتہ تین نشستوں میں ان دو رکوعوں کی دس آیات (از ۲۳ تا ۳۲) کا مطالعہ ہم مکمل کر چکے تھے۔ پھر چونکہ تیسرے رکوع کی پہلی آیت (نمبر ۲۳) کے اس ابتدائی حصے وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ' کا چوتھے رکوع کی اس آخری آیت سے گہرا ربط و تعلق ہے کہ اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ..... الخ، تو اس کا بھی ہم نے ساتھ ہی مطالعہ کر لیا تھا۔ ان دونوں رکوعوں کا اول و آخر ایک ہی ہے یعنی التزام توحید اور اجتناب عن الشرک۔ گویا جس طرح ایک فرد نوع بشر کی سعادت عقیدۂ توحید پر منحصر ہے' اسی طرح انسانی اجتماعیت کی صلاح اور فلاح کا دارومدار بھی توحید ہی پر ہے۔ چونکہ توحید محض عقیدہ (DOGMA) نہیں ہے بلکہ پورے ایک نظام فکر اور ایک نظام اجتماعیت کی اساس ہے جس پر ایک صالح تمدن وجود میں آتا ہے اور ایک صحت مند معاشرت' منصفانہ معیشت اور عادلانہ

حکومت رُوبعمل آتی ہے۔

اس سبق کی پہلی نشست میں تمہید کے طور پر میں نے عرض کیا تھا کہ سورۂ بنی اسرائیل کا زمانہ نزول ہجرت سے قریباً ایک سال قبل واقعہ معراج کے ظہور پذیر ہونے کے ساتھ ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں توحید' معاد' نبوت اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل کے ساتھ ساتھ اخلاق وتمدن اور تہذیب ومعاشرت کے وہ بڑے بڑے اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر زندگی کے مکمل نظام کو قائم کرنا دعوت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مقصود تھا۔ گویا اس سورۂ مبارکہ میں اسلام کا منشور شامل تھا جو اسلامی ریاست کے قیام سے ایک سال قبل اہل ایمان کے سامنے بالخصوص اور اہل عرب کے سامنے بالعموم پیش کیا گیا تھا۔ اس سورۂ مبارکہ کی زیر درس آیات کے بارے میں حبر الامۃ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ قول بھی آپ کو سنا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں توراۃ کی وہ پوری تعلیم درج فرمادی ہے۔ جو شریعت موسوی کا جزو اعظم تھی۔ ان آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے وہ اوامر ونواہی بیان فرمادیئے جو ایک صالح معاشرہ کے لئے اساس کا درجہ رکھتے ہیں۔ ہم پچھلی نشستوں میں توحید پر کاربند رہنے کی تاکید' والدین کے ساتھ حسن سلوک بالخصوص ان کی ضعیفی کے دور میں ان کے ساتھ رحمت وشفقت کا حکم' پھر دیگر اعزہ واقارب اور معاشرے کے مساکین اور فقراء کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید' پھر اسی ذیل میں تبذیر کی شدید مذمت وممانعت' ساتھ ہی بخل اور اسراف دونوں سے بچنے اور میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ مزید برآں مفلسی کے خوف سے قتل اولاد کی سختی سے ممانعت اور زنا جیسے گھناؤنے معاشرتی جرم کی شناعت اور اس کے قریب تک نہ پھٹکنے کی تعلیم وہدایت بھی نہایت پر زور تاکیدی اسلوب سے ہمارے سامنے آچکی ہے۔

آج ہم جن آیات کا مطالعہ کریں گے ان میں یہی سلسلۂ مضمون مزید آگے بڑھتا ہے۔ چنانچہ یہاں ایک صالح معاشرت کے ضمن میں کچھ مزید احکامات کا بیان ہے۔ یعنی (۱) قتل ناحق کی ممانعت۔ (۲) یتیم کے مال کی حفاظت۔ (۳) عہد وقول وقرار کی پابندی۔ (۴) ماپ تول میں کمی بیشی سے اجتناب۔ (۵) صحیح علم کی پیروی اختیار کرنا اور اوہام سے بچنا۔ (۶) تکبر اور غرور سے احتراز...... یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس پورے سلسلہ اوامر ونواہی اور ان تفصیلی ہدایات کو یہاں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہ ہیں وہ باتیں جو حکمت کے قبیل سے ہیں' یہ دانائی اور فکری بلندی کی باتیں ہیں' جو ایک صالح معاشرے کی تعمیر

کے ضمن میں بندوں کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نازل فرمائی ہیں۔
اس سلسلۂ ہدایات کے اختتام پر پھر وحدت الٰہ اور توحید فی الالوہیۃ کا خصوصیت سے ذکر کر کے اشارہ کر دیا گیا کہ اجتماعیات انسانی کے مزید ارتقاء کے نتیجے میں جب ریاست (STATE) وجود میں آئے گی تو ایک صحیح اسلامی ریاست کی اساس حاکمیت خداوندی (DIVINE SOVEREIGNTY) کے اصول ہی پر قائم ہو گی اور اس کی صحت و درستگی کا تمام تر دارومدار حاکمیت غیر اللہ کی کامل نفی ہی پر ہو گا...... ساتھ ہی اس انجام بد سے بھی متنبہ کر دیا جس سے اللہ کے ساتھ کسی نوع کے شرک کرنے والوں کو آخرت میں سابقہ پیش آکر رہے گا۔ ان چند تمہیدی باتوں اور سابقہ اسباق کی تعلیمات کے اعادے کے بعد آیئے ہم آج کے سبق کا مطالعہ کریں۔
ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ "اور مت قتل کرو اس جان کو جس کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ"..... قتل ناحق کی ممانعت سورۃ الفرقان میں بھی وارد ہو چکی ہے، جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں اس اضافہ کے ساتھ یہ بات آئی ہے کہ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا۔ "اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو تو اس کے ولی کو ہم نے (قصاص کا) اختیار دیا ہے"۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ اسلامی قانون کا ایک منفرد معاملہ ہے کہ قاتل کو گرفتار کر کے مقتول کے ورثا کے حوالے کر دیا جائے۔ یعنی شریعت اسلامی میں اصل اختیار مقتول کے ورثاء کو حاصل ہے۔ وہ اختیار کیا ہے! یہ کہ ورثاء اگر چاہیں تو قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اگر چاہیں تو اپنے مقتول کا خون بہا لے کر قاتل کو آزاد کر سکتے ہیں اور وہ اگر چاہیں تو جان کے بدلے جان لینے کا فیصلہ بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی عفو، دیت اور قصاص یہ تینوں راستے (OPTIONS) ان کے لئے کھلے ہیں۔ اسلامی حکومت پابند ہے کہ ورثاء ان تینوں میں سے جس کا بھی انتخاب کریں، اس کے مطابق عمل درآمد کرے۔ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت حکمت پر مبنی نظام ہے۔ اس لئے کہ جب کسی قاتل کو مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم پر لا کر کھڑا کر دیا جائے تو مقتول کے ورثاء کے جذبات میں جو اشتعال ہوتا ہے ان میں خود بخود کافی حد تک کمی آجاتی ہے، دشمنی کے جذبات آپ سے آپ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں کہ ہمارے عزیز کا قاتل اب ہمارے رحم و کرم پر ہے........... اب اگر وہ معاف کر دیں تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ایسے واقعۂ قتل کے باعث دو خاندانوں کے مابین

جو اختلاف، تکدر اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے وہ کس طرح اب محبت اور مؤدت میں بدل جائے گی۔ ورنہ جوابی خون اور جوابی قتل کا سلسلہ جو ہمارے دیہاتی برادری اور قبائلی معاشروں میں اب بھی شدت کے ساتھ موجود ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتا، اسے اسی طرح نہایت صحت مندانہ طریقے پر کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

پھر اگر ورثاء دیت لے کر قاتل کی جان بخشی کر دیں یا جان کے بدلے جان لینے کا فیصلہ کریں اور طویل عدالتی کارروائی کے بجائے فیصلہ کا اختیار انہیں حاصل ہو جس کو استعمال کرتے ہوئے وہ قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کرنے کا خود فیصلہ کریں اور حکومت صرف اس فیصلہ کی تعمیل (EXECUTION) کی حد تک اپنا فرض انجام دے تو یہی وہ طریقہ ہے جو مقتول کے ورثاء کے زخموں پر مرہم رکھنے کا باعث ہو گا اور یہ انصاف کے تقاضوں کو بطریق احسن پورا کرے گا۔ الغرض اس اسلامی قانون میں انسانی معاشرت کے لئے بے شمار حکمتیں اور برکتیں مستور ہیں..... آگے مقتول کے ورثاء کے لئے ایک اخلاقی تاکید آئی ہے فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ "پس وہ (یعنی مقتول کا ولی) قتل کرنے میں حد سے تجاوز نہ کرے"...... یعنی مجرم کو ایذا دے دے کر قتل کرنا، اعضا کاٹ کاٹ کر جان لینا ناپسندیدہ فعل ہے۔ اگر قاتل کی جان لینی ہی درکار ہے تو معروف طریقے پر لے لی جائے۔ آگے فرمایا اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا۔ "بے شک اس کی مدد کی گئی ہے"۔ اس میں مقتول کے ولی کے لئے ہدایت ہے کہ چونکہ اسلامی حکومت نے قصاص کے معاملہ میں اس کی مدد کی ہے اس لئے اس کے جائز نہیں ہے کہ بدلہ لینے میں حد سے تجاوز کرے۔ مثلاً قاتل کے ورثاء میں سے کسی کو قتل کر دے یا مقتول کو ایذا دے کر جان سے مارے۔

آگے حکم آیا وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ۔ "اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو مگر اس طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائے"۔ یہاں وہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو بدکاری کی ممانعت کے لئے استعمال کیا گیا ہے کہ "وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى" ایک انداز یہ ہو سکتا تھا کہ لَا تَاْكُلُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ۔ "یتیم کا مال مت کھاؤ، ہڑپ نہ کرو"...... لیکن تاکید میں زور پیدا کرنے کے لئے فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس شدت کے ساتھ عمل کیا کہ اگر کسی کی تحویل میں کوئی یتیم ہوتا تھا تو وہ اس کا مال اس طرح علیحدہ رکھتا تھا کہ اس کی ہنڈیا روٹی تک

کر دی جاتی تھی۔ مبادا اس کے کھانے میں سے کوئی لقمہ میرے پیٹ میں چلا جائے۔ اس سے ظاہر بات ہے کہ معاشرے میں تنگی اور دقت پیدا ہوئی اور یتیم کے ساتھ ایک نوع کی مغائرت پید ہونے کا احتمال ہوا۔ چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ کی عنایت و شفقت کا ظہور ہوا اور سورۃ البقرہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ "(اے نبی!) آپ سے پوچھتے ہیں یتیموں کے بارے میں۔ کہہ دیجئے ان کی اصلاح کا کام بہتر ہے اور اگر تم ان کا خرچ (اپنے خرچ کے ساتھ) ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں"...... یہ بالکل علاحدہ کر دینا مقصود نہ تھا۔ اصل چیز جو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ ان کا مال ناجائز طریقے پر ہڑپ نہ کر جاؤ۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طرز عمل کیا تھا اور وہ کس طرح قرآن مجید کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کیا کرتے تھے۔

اسی آیت میں تیسرا حکم آ رہا ہے جو ایفائے عہد اور قول و قرار کی پابندی سے متعلق ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ مضمون بار بار آیا ہے۔ آیتِ بِرّ میں نیکو کاروں کے وصف کے طور پر یہ آیا تھا: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا سورۃ المومنون اور سورۃ المعارج میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○ لیکن نوٹ کیجئے کہ یہاں یہ ایک نرالی شان کے ساتھ آیا ہے۔ جب دو انسان یا دو گروہ باہم کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو اس کے ضمن میں یہاں جو رخ پیش کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صرف دو افراد یا دو جماعتوں کے درمیان معاہدہ نہیں ہے بلکہ ہر معاہدے میں ایک تیسرا فریق شامل ہے اور وہ ہے اللہ۔ فرمایا گیا۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ○ یقیناً ہر عہد، ہر قول و قرار، ہر میثاق اور ہر معاہدے کی باز پرس ہو گی" یعنی وہ فریق ثالث بطور گواہ اس معاہدے میں شامل ہے۔ وہ محاسبہ کرے گا۔ عہد کی خلاف ورزی کرنے والے کو اس کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی۔ یہی بات ہے جو قرآن مجید میں بایں الفاظ مبارکہ وارد ہوئی ہے۔ اَللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ۔ "اللہ گواہ ہے میرے اور تمہارے مابین"..... لہٰذا جب بھی کوئی معاہدہ ہو، کوئی قول و قرار ہو، کوئی عہد ہو تو یہ شعور و ادراک ہونا چاہئے کہ یہ معاملہ صرف ہم دو فریقوں کے مابین نہیں ہے، اس میں تیسرا فریق بطور گواہ موجود ہے اور اس کے سامنے ہمیں جواب دہی کرنی ہے اور وہ اللہ ہے تبارک و تعالیٰ۔

اگلا حکم ماپ اور تول میں کمی کرنے کی ممانعت پر مشتمل ہے۔ ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک سورۃ کا نام ہی سورۃ المطففین ہے۔ جس کے آغاز میں یہ مضمون نہایت پر جلال انداز میں آیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۝ أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ یہاں جس لفظ ویل سے سورۂ مبارکہ شروع ہوئی اس کے لفظی معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں۔ لیکن بعض روایات کے مطابق "ویل" جہنم کی ایک ایسی وادی کا نام بھی ہے کہ جس سے خود جہنم بھی پناہ مانگتی ہے۔ چنانچہ یہاں اس جہنم کی وعید سنائی جارہی ہے ان لوگوں کے لئے جن کا حال یہ ہے کہ جب ماپ اور تول کر کوئی چیز لیتے ہیں تو پوری لیتے ہیں لیکن جب ماپ یا تول کر کسی کو دیتے ہیں تو اس میں کمی کر دیتے ہیں۔ آگے تجزیہ کر کے اس عمل کا سبب بیان فرمایا گیا ہے کہ در حقیقت یہ لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ آپ خود سوچئے کہ ایک شخص تولتے ہوئے ہاتھ کی غیر محسوس حرکت کے ذریعے ڈنڈی مارتا ہے تو بظاہر یہ معمولی سا عمل ہے، لیکن تل کی اوٹ میں پہاڑ ہوتا ہے۔ اس کے اس عمل کا تجزیہ کیجئے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ اسے یقین نہیں ہے کہ اللہ موجود ہے، اسے یقین نہیں ہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا اسے یہ یقین نہیں ہے کہ مجھے مرنے کے بعد پھر جی اٹھنا ہے اور اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور وہاں مجھے اپنے ایک ایک عمل، ایک ایک فعل، ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ فرمایا: أَلَا يَظُنُّ أُولَٰئِكَ أَنَّهُم مَّبْعُوثُونَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ "انہیں یہ احساس نہیں ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا بڑے دن کو یعنی قیامت میں۔" "يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ جس دن وہ کھڑے ہوں گے جہانوں کے پروردگار اور آقا کے سامنے" ...... یہاں سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو آگے بڑھایا گیا کہ تم سمجھتے ہو کہ تم نے ذرا سی ڈنڈی مار کر کچھ نفع حاصل کیا ہے۔ حالانکہ ماپ اور تول صحیح رکھنے میں ہی در حقیقت برکت ہے۔ اسی طرز عمل میں خیر ہے۔ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۝ انجام کار کے اعتبار سے یہی چیز بہتر ہے۔

اگلی آیت میں ایک اور نہایت اہم مضمون آیا ہے جس کا ہماری تہذیب و تمدن اور ثقافت پر واقعۃً بہت گہرا اثر مرتب ہوا ہے اور وہ یہ کہ: وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ "کسی ایسی چیز کے پیچھے مت لگو جس کے لئے تمہارے پاس علم نہیں ہے"۔

یعنی اوہام وظنون کی پیروی کرنا' خواہ مخواہ کے توہمات کو دل میں جگہ دینا' اس کے بجائے تمہارا موقف علم پر قائم ہونا چاہئے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنی مشہور کتاب "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" کے پہلے لیکچر میں اس بات کو بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے کہ جدید تہذیب کا ایک تو ظاہری ڈھانچہ ہے جس کے بارے میں وہ اپنے اردو کلام میں فرماتے ہیں کہ ؏

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی

اور انگریزی میں وہ اپنے لیکچر میں اسے "THE DAZZLING EXTERIOR OF THE WESTERN CIVILIZATION" یعنی "مغربی تہذیب کا چکاچوند خارج" سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اس تہذیب کا جو "INNER CORE" یعنی باطن ہے وہ در حقیقت قرآن مجید ہی کا عطا کردہ ہے۔ وہ باطن یا 'INNER CORE' کیا ہے! اس کا مرکز و محور ہے سائنسی نقطۂ نظر! یعنی یہ کہ انسان کا نقطۂ نظر علم پر مبنی ہو۔ وہ توہمات کو قبول نہ کرے' تحقیق کرے۔ حقیقت کو جانچے اور پرکھے اور اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

یہ روح قرآن نے پیدا کی تھی ورنہ توہمات کا دور کبھی ختم نہ ہوتا.....

اس کے ضمن میں یہ آیت بڑی اہم ہے کہ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ○۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جو استعدادات رکھی ہیں۔ مثلاً سماعت ہے' بصارت ہے' پھر قلب و ذہن کی قوتیں ہیں' جن میں تفقّہ ہے' تفکر ہے' استدلال اور استنباط کرنے کی اہلیت ہے۔ یہ تمام صلاحیتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ انسان ان سے بھرپور طور پر استفادہ کرے۔ اگر وہ ان کو تو معطل اور بیکار رکھ چھوڑے اور توہمات پر اپنا موقف قائم کرے تو یہ انتہائی ناقدری کی بات ہے اور اس معاملے میں اس سے بازپرس ہو کر رہے گی۔ یہاں یہ نکتہ بھی نہایت قابل لحاظ ہے کہ اس آیت میں "فواد" کا لفظ آیا ہے جس کا عام طور پر ترجمہ قلب ہوتا ہے۔ قرآن مجید جہاں تعقل کو وظیفۂ عقل مانتا ہے وہاں وہ قلب کو بھی ذریعہ تفقہ قرار دیتا ہے کہ اس قلب میں بھی سوجھ بوجھ اور تفقہ کی صلاحیت موجود ہے۔ فرمایا گیا۔ لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ "ان کے دل ہیں لیکن وہ اس سے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔" اسی طرح سورۃ الحج کی آیت نمبر ۴۶ میں دل کے لئے یعقلون بھی آیا ہے۔ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا۔ معلوم ہوا کہ ایک تعقل اور تفقّہ وہ ہے جو انسان اپنے ذہن سے کرتا ہے اور ایک تفقّہ و تعقل کا عمل وہ ہے کہ جس کا محل قلب ہے۔ ابن خلدون کا مشہور مقولہ ہے کہ العلم علمان علم

الابدان وعلم الادیان...... علم تو بس دو ہی ہیں۔ ایک علم الابدان اور دوسرا علم الادیان...... ابدان سے مراد ہیں مادی اشیاء (PHYSICAL OBJECTS) ان کا علم ہمیں حواس ظاہری یعنی سمع و بصر اور لمس وغیرہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ گویا قوت سامعہ ' باصرہ '' لامسہ ' ذائقہ اور شامّہ کے ذریعے انسان کو مادی اشیا کا علم حاصل ہوتا ہے اس علم کا نام علم الابدان ہے۔ اور دوسرا علم ہے علم الادیان (REVEALED KNOWLEDGE) جو وحی و رسالت کے ذریعہ سے نوع انسانی کو حاصل ہوا ہے۔ علم تو بس یہی دو ہیں۔ باقی جو کچھ ہے وہ توہمات کے قبیل سے ہے۔ ہماری تہذیب و تمدن میں ' OCCULT SCIENCES '(پراسرار علوم) کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ ان کے لئے " SCIENCES " کا لفظ کیسے استعمال ہو گیا! لیکن غلط العام کے طور پر ایسا ہو جاتا ہے۔ لیکن جان رکھئے کہ دست شناسی ' اور ستارہ شناسی وغیرہ کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے مؤکد انداز میں فرمایا ہے کہ جس کسی نے کسی نجومی کی پیشین گوئی کی تصدیق کی اس نے اس تعلیم کی نفی کی جو میں لے کر آیا ہوں۔ اس لئے کہ یہ چیزیں انسان کو توہمات میں الجھا کر عمل سے دور لے جانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کا طرز عمل اور رویہ ایسے واضح علم پر مبنی ہو جو صحیح عمل کو جنم دے سکے۔

اگلی آیت میں تکبر کی مذمت کا مضمون آ رہا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یہ مضمون سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بعینہ انہی الفاظ میں آیا تھا۔ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا۔ "اور زمین میں اکڑ کر مت چلو۔" یہی مضمون سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف کے ضمن میں وارد ہوا ہے جس کا مطالعہ اس سے قبل ہم کر چکے ہیں۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا۔ "اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر تواضع و فروتنی سے چلتے ہیں" ...... لیکن یہاں سورۃ بنی اسرائیل میں یہی مضمون ایک منفرد اسلوب میں آیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ تکرارِ محض قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے۔ کوئی نیا پہلو ' کوئی نیا انداز ' کوئی نئی بات یقیناً ہو گی۔ یہاں وہ دلنشین پیرایۂ بیان ہے جو قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ یعنی اس کی فصاحت اور اس کی بلاغت جس کے آگے عرب کے نامور شعراء و خطباء عاجز و سرنگوں ہو گئے تھے...... غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ انسان میں تکبر کا ظہور دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جب وہ زمین پر چلتا ہے تو اکڑ کر اور زمین پر زور زور سے پاؤں مارتا ہوا چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی گردن کو اکڑا

کرا ونچا کرتا ہے۔ پھر اسی گردن کو اونچا کرنے میں ممد ہو جاتے ہیں اونچے اونچے طرّے۔ اب یہاں دیکھئے کہ کتنے پیارے اور دلنشین انداز میں نفی کی گئی ہے کہ تم کتنے ہی پیر مار مار کر چلو تم ہماری زمین کو پھاڑ نہ سکو گے۔ اِنَّکَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ ۔ اور کتنی ہی گردن اونچی کر لو ہمارے پہاڑوں کی بلندی تک نہ پہنچ پاؤ گے۔ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝

یہ ہیں وہ سماجی و معاشرتی ہدایات جو اوامر و نواہی کی صورت میں ان دو رکوعوں میں بڑی جامعیت سے ہمارے سامنے آگئی ہیں۔ ہم نے اس سبق کی پہلی نشست میں ان سب کا ایک اجمالی جائزہ لیا تھا۔ اس کے بعد کی تین نشستوں میں سلسلہ وار ان پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی اور آج کی نشست میں یہ سبق بحمد اللہ ختم ہو رہا ہے۔ ان تمام اوامر و نواہی کے اختتام پر فرمایا۔ کُلُّ ذٰلِکَ کَانَ سَیِّئُہٗ عِنْدَ رَبِّکَ مَکْرُوْھًا ۝ "یہ تمام چیزیں جو تمہارے سامنے آئی ہیں' ان میں جو برائی کا پہلو ہے وہ تمہارے رب کو سخت ناپسند ہے۔"

غور کیجئے کہ ان سب میں برائی کا پہلو کیسے ہے اور کیا ہے! یہاں یا تو احکام و اوامر ہیں کہ یہ کرو۔ تو ان احکام پر عمل نہ کرنا یا ان کی ادائیگی میں تقصیر یا کوتاہی کا ارتکاب کرنا برائی کے ذیل میں آتا ہے۔ یا نواہی آئے ہیں یعنی بعض کاموں سے منع کیا گیا ہے کہ یہ مت کرو۔ ان کا ارتکاب کرنا بھی یقیناً برائی کا کام شمار ہو گا۔ پس مثبت اور منفی انداز کو جمع کر لیجئے تو یہ جتنے امور بیان ہوئے ہیں' ان میں جو برائی کے پہلو ہیں وہ تمہارے رب کو نہایت ناپسند ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ان آیات کے مخاطب کون ہیں! وہ ہیں اہل ایمان۔ ان کے لئے اس سے بڑی کوئی دلیل ہو سکتی ہے نہ اس سے بڑی کوئی اپیل کہ یہ یہ چیزیں تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔ اگر تمہیں یقین ہے اللہ پر۔ اور تمہیں یقین ہے اس کے حضور میں حاضر ہونے پر تو جان رکھو کہ یہ چیزیں اسے پسند نہیں ہیں لہٰذا تم بھی ان سے گریز کرو۔

اس پوری بحث کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔ ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ط۔ " (اے نبیؐ) یہ ہیں وہ باتیں جو آپؐ کے رب نے آپؐ پر وحی کی ہیں از قسم حکمت" یہ ہے ملکوتی دانائی۔ یہ دانائی انسان کے ذہن کی رسائی سے بلند تر ہے۔ انسان کوتاہ نظر ہے۔ اگر کسی اہم معاملے کا کوئی ایک گوشہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا' جیسے ہم کہتے ہیں کہ ایک آنچ کی کسر رہ گئی' تو اس سے معاشرے میں جو عدم توازن پیدا ہو گا وہ پورے معاشرے میں فساد برپا کر دے گا۔ لہٰذا ان تمام چیزوں کو ایک وحدت کی حیثیت سے سمو کر صرف وحیٔ الٰہی ہی ہمیں عطا فرما سکتی ہے۔ یہاں ذرا تقابل کیجئے ہمارا سبق نمبر ۳ جو سورۃ لقمان

کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا' اس کا آغاز ہوا تھا لفظ حکمت سے۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ط۔ اور اس رکوع کے اکثر مضامین وہی تھے جو ان آیات میں بھی آئے چنانچہ ان ہی مضامین کو ان آیات میں ایک نرالی شان کے ساتھ ' نئے انداز سے اور نئے اسلوب سے لانے کے بعد اختتام ہوا۔ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط۔ یہ ہے حکمت و دانائی اور اس حکمت کی جو قدر و قیمت ہے اس کے بارے میں سورۃ البقرہ میں فرمایا۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط۔ "جسے حکمت عطا ہو گئی اسے تو خیر کثیر عطا ہو گیا" ...... اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس حکمت میں سے حصہ وافر عطا فرمائے۔ اس سلسلہ اوامر و نواہی کو جہاں حکمت سے تعبیر کیا گیا وہاں اس آیت کا اختتام پھر توحید کے بیان پر ہو رہا ہے۔ یہ مضمون اس سبق کے بالکل آغاز میں بھی آیا تھا چنانچہ یہ بات وضاحت سے بیان کی جا چکی ہے کہ چونکہ ایک اسلامی معاشرے کی اساس اور بنیاد ہی توحید ہے اور اس کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا لہٰذا ان آیات کے اول و آخر توحید ہی کا بیان ہے۔ فرمایا۔ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○ "اور اللہ کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنانا کہ تم جھونک دیئے جاؤ جہنم میں ملامت زدہ اور دھکے دیئے جا کر۔"

اب جو باتیں آج عرض کی گئی ہیں' ان کے بارے میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں

سوال و جواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! قتل ناحق کی تشریح فرمایئے گا۔

جواب...... ہمارے اس سلسلہ دروس میں یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں آ چکا ہے۔ میں آج اسی کا اعادہ کئے دیتا ہوں۔ اسلامی قانون کی رو سے انسان کو صرف چار صورتوں میں قتل کیا جا سکتا ہے۔ ایک اس کافر کو جو حربی ہو۔ یعنی صرف وہ کفار جن سے جنگ DECLARE ہے۔ باضابطہ اعلان جنگ ہے۔ انہی کو قتل کیا جا سکے گا غیر حربی کافر کو نہیں۔ اگر اسلامی ریاست میں کوئی ذمی ہے تو اس کی جان بھی بالکل اسی طرح محترم ہے جیسے کسی مسلمان کی ہے۔ دوسرے یہ کہ قتل عمد کا ارتکاب کیا گیا ہو تو جان کے بدلے جان کے اصول کے تحت مقتول کے ورثا اگر اصرار کریں تو قاتل کی جان لے لی جائے گی۔ تیسری صورت ہے کہ اسلامی ریاست کا کوئی شادی شدہ فرد' کوئی شادی شدہ شہری اگر زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کی بھی جان لی جائے گی اور اس کی ایک معین شکل ہے رجم...... چوتھی اور

آخری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان مرتد ہو کر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کو چھوڑ دیتا ہے تو اسے باغی قرار دے کر قتل کیا جائے گا۔ اسلامی قانون میں کسی انسان کی جان لینے کی یہ چار شکلیں ہیں جن کو احادیث میں بحق اسلام قرار دیا گیا ہے۔ ان کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی صورت ہو گی وہ قتل ناحق شمار ہو گی۔

سوال...... ڈاکٹر صاحب کیا تکبر ایک نفسیاتی مرض نہیں ہے؟

جواب...... یقیناً تکبر ایک نفسیاتی مرض ہے۔ لیکن مرض خواہ وہ جسمانی ہو خواہ نفسیاتی ہو' اس کے علاج کی طرف توجہ دی جانی چاہئے۔ چنانچہ جن امراض کے بارے میں قرآن مجید اپنے آپ کو شفا قرار دیتا ہے ان کا تعلق قلوب و اذہان کے امراض اور جدید اصطلاح میں نفسیاتی امراض سے ہے۔ سورۃ یونس میں فرمایا۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْجَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ط۔ "اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت بھی آ گئی ہے اور سینوں کے اندر جو امراض ہوتے ہیں ان کے لئے شفاء بھی آ گئی ہے۔ پس میں سمجھتا ہوں کہ دلوں میں جہاں حب مال ہے۔ حب دنیا اور حب جاہ ہے' وہاں تکبر بھی ایک بہت بڑا نفسیاتی ذہنی اور قلبی مرض ہے۔ اس کے ازالے کے لئے بھی قرآن مجید کی تعلیمات اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔

حضرات! آج اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمارے اس مطالعۂ قرآن حکیم کا سبق نمبر ۱۳ مکمل ہو گیا ہے۔ اس میں ہمارے سامنے ایک اسلامی معاشرے کے خدوخال نمایاں طور پر آ گئے ہیں۔ ہم نے پاکستان اس لئے بنایا تھا بقول قائد اعظم کہ ہم اپنی تہذیب' اپنی ثقافت اور اپنے تمدن کو پاکستان میں رائج کر کے دنیا کے لئے ایک نمونہ بنائیں گے۔ ہم نے پاکستان تو حاصل کر لیا لیکن جس مقصد کے لئے اسے حاصل کیا تھا اس کی منزل بہت دور ہے۔ تاحال اس کی طرف ہماری صحیح طور پر پیش قدمی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ہم میں سے ہر ہر فرد کا خواہ وہ خواص سے تعلق رکھتا ہو خواہ عوام سے۔ خواہ وہ برسراقتدار طبقے سے تعلق رکھتا ہو' خواہ عامتہ الناس سے یہ دینی فریضہ ہے کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا ہم نے اللہ اور خلق خدا سے جو وعدہ کیا تھا اس کو پورا کرنے کے لئے ہر ممکن جدوجہد کریں۔ ہم نے آج کے سبق میں پڑھا ہے کہ۔ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً ○۔ اگر ہم نے ایفائے عہد کے لئے خلوص کے ساتھ سعی و جہد نہ کی تو یقیناً ہم سب سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بازپرس ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پاکستان کے قیام کے حقیقی مقصد کی طرف صحیح طور پر پیش قدمی کی توفیق عطا فرمائے۔

—

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک فکر انگیز خطاب

(دوسری اور آخری قسط)[1]

محاذِ سوم : بے یقینی

ہمارے معاشرے میں معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو بحمد اللہ شعوری سطح پر جاہلیت قدیم اور جدیدہ دونوں سے بچے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی بیماری ایک تیسری نوع کی بیماری ہے اور وہ ہے بے یقینی کی بیماری۔ یعنی مثبت طور پر جو یقین ہونا چاہیے انہیں وہ میسر نہیں ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ محض منفی چیزوں سے اگر آپ نے خود کو بچا بھی لیا تو اس سے آپ کے اخلاق و کردار پر اور آپ کی زندگی کے رُخ پر کوئی فیصلہ کن اثر مترتب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مثبت طور پر یقین نہ ہو۔ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۴ کے درس کے ضمن میں مَیں نفاق اور ایمان کے بارے میں یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ ان دونوں کو یوں سمجھیے کہ نفاق ایک منفی قدر (MINUS VALUE) ہے اور ایمان ایک مثبت قدر (PLUS VALUE) ہے۔ پھر اس مثبت قدر میں درجہ بدرجہ اضافہ ہوتا ہے۔ ایک میرا اور آپ کا ایمان ہے، ایک صحابہ کرامؓ عشرہ مبشرہ اور بالخصوص انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ایمان ہے تو یوں سمجھ لیجئے کہ یہ معاملہ لامحدود درجے (PLUS INFINITY) تک چلتا جائے گا۔ اسی طرح نفاق کا معاملہ ہے۔ اس کا آغاز بھی ہے اور اس کا تیسرا درجہ بھی ہے جہاں پہنچ کر یہ ٹی بی کے مرض کی طرح لاعلاج ہو جاتا ہے۔ نفاق اور ایمان کے مابین ایک اور مقام ہے جسے میں 'ZERO LEVEL' سے تعبیر کرتا ہوں۔ مَیں نے جس تیسرے طبقے کا ذکر کیا ہے، بدقسمتی سے اس کی اکثریت اسی سطح پر کھڑی ہے۔ یعنی کوئی منفی چیز بھی نہیں ہے، نہ جاہلیت قدیمہ ہے نہ جاہلیتِ جدیدہ۔ کم از کم شعوری سطح پر نہیں ہے۔ لیکن مثبت طور پر یقین محکم والا ایمان

---

[1] ربط مضمون کے لیے مارچ ۸۸ء کا 'میثاق' ملاحظہ فرمائیے

بھی نہیں ہے اور اس کی طرف کوئی پیش قدمی بھی نہیں ہو رہی۔ تو ضرورت اسی یقینِ محکم اور ایمانِ کامل والے ایمان کی ہے جیسے کہ علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

یقین پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

ایمان جب یقین کی شکل اختیار کرے گا جب ہی تو اس میں ایک قوت پیدا ہو گی جب ہی وہ شخصیت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالے گا۔ اور پوری شخصیت کی کایا پلٹ دے گا۔

سورۃ الحجرات ہی کی آیت نمبر ۷ میں صحابہ کرامؓ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ "اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب کر دیا ہے اور اس کو تمہارے دلوں کے اندر مزین کر دیا ہے"۔ نورِ ایمان نے تمہارے دلوں کو منور کر دیا ہے۔ یہ ایمان اللہ کے فضل و کرم سے تمہارے دلوں میں راسخ اور جاگزیں ہو گیا ہے۔ جب تک یہ کیفیت نہ ہو، ایمان کے اثرات انسان کے سیرت و کردار، معاملات اور عملی رویے پر مترتب نہیں ہوں گے۔ اب اس بے یقینی کا علاج کہاں سے لایا جائے! اس کا دارو کہاں ملتا ہے!

علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اسی قرآنِ حکیم کی آیاتِ بینات ہی سے اس بے یقینی کا علاج ہو گا۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں

یقین والے ایمان کا اصل ذریعہ (SOURCE) قرآن ہے۔ اگرچہ اس کا ایک ذریعہ اور بھی ہے۔ لیکن وہ ثانوی ہے۔ صاحبِ یقین کی صحبت سے بھی یقین والا ایمان پیدا ہوتا ہے ع صحبتِ صالح تُرا صالح کند۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صاحبِ یقین کے قرب کی مثال ایسے ہے جیسے آگ کی ایک بھٹی دہک رہی ہو، آپ اس کے قریب جائیں گے تو حرارت آپ کو پہنچ کر

ہے گی۔ یہ قانونِ طبعی ہے۔ برف کی سل کے پاس بیٹھیں گے تو برودت تو آپ سے آپ پہنچے
ں۔ تو اگر کسی کے دل میں یقین والے ایمان کی شمع روشن ہے تو آپ اگر اس کے قریب رہیں
ئے اس کی صحبت سے فیض اٹھائیں گے تو آپ کو بھی یقین کی دولت ملے گی۔ لیکن میں اس کو
نوں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہمیں پہلے یہ طے کرنا پڑے گا کہ وہ صاحبِ یقین کہاں سے آئے
ا! تو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ ایسے صاحبِ یقین پیدا کرنے کا واحد ذریعہ بھی قرآن حکیم
ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت میں یہ دوں گا کہ دنیا کے سب سے عظیم صاحبِ یقین جن سے
ا کوئی صاحبِ یقین ہو ہی نہیں سکتا۔ خاتم النبیینؐ، سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔
رآن مجید میں سورۃ الشوریٰ کی آخری سے پہلے والی آیت یعنی آیت نمبر ۵۲ میں نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے ایمان و یقین کا تجزیہ کر کے بتا دیا گیا کہ حضورؐ کو ایمان و یقین کہاں سے ملا! ارشاد فرمایا گیا:

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ۔

"(اے نبیؐ!) اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک رُوح (یعنی یہ قرآن مجید) آپؐ کی طرف وحی کیا ہے (اس سے پہلے) آپؐ کو معلوم نہ تھا کہ کتاب کسے کہتے ہیں اور ایمان کیا ہوتا ہے"!

یعنی آپ تو اُمّی تھے۔ اُمیّوں میں پیدا ہوئے۔ نہ تورات کے پڑھے ہوئے، نہ انجیل
کے پڑھے ہوئے۔ معروف معنوں میں آپؐ بالکل پڑھے لکھے نہیں تھے۔ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ
نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ "لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا جس
کے ذریعے سے ہم ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں"۔ اور اب جبکہ
آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاملِ قرآن بن گئے تو: وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔
"اور اب آپؐ یقیناً نوعِ انسانی کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیں گے"۔

نزولِ وحی سے قبل حضورؐ کے ایمان کی ماہیت

یہاں مجھے تھوڑی سی وضاحت کرنی ہوگی مبادا مغالطہ ہو جائے۔ یہاں اشکال پیدا
ہوتا ہے کہ کیا حضورؐ وحی کے نزول سے قبل مومن نہیں تھے؟ اسی نوع کی ایک بحث ہمارے یہاں

حضورؐ کے آباء و اجداد کے بارے میں بھی چلتی ہے کہ کیا جناب عبداللہ، جناب عبدالمطلب، جناب آمنہ کو ہم کافر یا مشرک کہیں گے ؟ یہ بحثیں عوامی سطح پر ہوتی ہیں اور اس میں بڑی جذباتیت آجاتی ہے۔ تو جان لیجئے کہ قرآن مجید میں سورۃ النور کی آیات نور کے ذریعہ یہ بتاتا ہے کہ نورِ ایمان کے دو اجزائے ترکیبی ہیں ایک نورِ فطرت اور ایک نورِ وحی۔ نورِ فطرت کی مثال صاف شفاف روغن کی ہے جو گویا بھڑکنے کے لیے بیتاب ہوتا ہے چاہے دیا سلائی ابھی اس کے قریب نہ آئی ہو، جیسے پٹرول۔ تو درحقیقت انسان کی فطرت میں ایمان کا نور بالقوہ (POTENTIALLY) موجود ہوتا ہے البتہ اس پر پردے پڑجاتے ہیں۔ بعض لوگوں کے وہ پردے اتنے دبیز اور بھاری ہوتے ہیں کہ اُٹھائے نہیں اُٹھتے۔ نورِ وحی بھی آکر اُن لوگوں کے اِن پردوں کو چیر کر دل کے اندر جو نورِ فطرت کا روغن ہے۔ اس تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ایسے لوگ نورِ ایمان سے محروم رہ جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ شخص جس کے قلب پر کوئی حجاب نہیں یعنی سلیم الفطرت اور سلیم القلب انسان۔ (بفحوائے الفاظ قرآنی: اِذْ جَآءَ رَبَّہٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ) تو اس کے پاس جیسے ہی نورِ وحی آتا ہے تو یوں سمجھئے جیسے کہ آئینے کے سامنے روشنی آگئی "لہٰذا" نورِ وحی سے اس کا آئینہ قلب جگمگا اُٹھتا ہے۔ تو یہ ہے مثال نورِ فطرت اور نورِ وحی کی۔ اسی کو سورۃ النور میں نُورٌ عَلٰی نُورٍ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم یوں کہیں گے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں ایمان بالقوہ یا 'DORMENT FORM' میں تو موجود تھا۔ لیکن اس کو تحریک وحی سے ملی، وحی نے اُسے متحرک کیا، اُسے 'ACTUALISE' کیا، یہ ہے مفہوم اِن الفاظِ مبارکہ کا:

مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰہُ نُوْرًا نَّھْدِیْ بِہٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات جن کے متعلق صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ یہ آیات حضورؐ کو شبِ معراج میں اُمت کے لیے بطور تحفہ خاص عطا ہوئی تھیں یہ ان میں سے پہلی آیت میں قرآنِ حکیم پر پہلے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان لانے کا ذکر ہے اور پھر صحابہ کرامؓ کے ایمان لانے کا: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

دلکش ترین ایمان کس کا ہے؟

اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بڑی پیاری حدیث مشکوٰۃ شریف کے آخری باب "باب ثواب ھذہ الامۃ" میں شامل ہے۔ اس حدیث کو حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں۔ چشم تصور سے دیکھیے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مجلس میں رونق افروز ہیں۔ آپؐ صحابہؓ سے سوال کرتے ہیں: اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَیْکُمْ اِیْمَانًا۔ "مجھے بتاؤ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے؟" اعجب 'عجیب' سے اسم تفضیل ہے۔ اردو میں 'عجیب' کا لفظ حیران کن یا غیر معمولی بات کے لیے مستعمل ہے لیکن عربی میں عجیب دل کو لبھانے والی شے کو کہتے ہیں یعنی دلکش اور دل خوش کن چیز۔ سورۃ الاحزاب میں یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ فرمایا گیا: وَلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُھُنَّ "اور چاہے ان کا حسن آپؐ کے دل کو کتنا ہی لبھانے والا کیوں نہ ہو" سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوا: وَاِذَا رَاَیْتَھُمْ تُعْجِبُکَ اَجْسَامُھُمْ۔ "اور جس وقت آپؐ ان کو دیکھتے ہیں تو ان کے بدن آپ کو خوش لگتے ہیں"۔ تو حضورؐ نے صحابہؓ سے دریافت فرمایا کہ تمہارے نزدیک سب سے زیادہ دلکش، دل کو لبھانے والا اور حسین ایمان کس کا ہے؟ یہ بھی حضورؐ کی تعلیم و تربیت کا ایک انداز ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: "فرشتوں کا" حضورؐ نے اس کو رد فرما دیا: "وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ" وہ ایمان کیسے نہیں لائیں گے جبکہ وہ اپنے ربّ کے پاس ہیں۔ ان کے لیے تو غیب کا پردہ حائل نہیں ہے۔ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اس میں کون سا کمال ہے؟ پھر صحابہؓ نے عرض کیا: فَالنَّبِیُّوْنَ "پھر نبیوں کا ایمان ہے!"

حضورؐ نے فرمایا: وَمَا لَھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ وَالْوَحْیُ یَنْزِلُ عَلَیْھِمْ۔ "وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے جبکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے!" انبیاءؑ پر اللہ کا فرشتہ وحی لے کر نازل ہوتا ہے۔ انہیں غیب کی خبروں سے مطلع کرتا ہے پھر اللہ ان کو اپنی نشانیوں میں سے کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کراتا ہے۔ لہٰذا وہ کیسے ایمان نہیں لائیں گے اور ان کا ایمان 'اعجب' کیسے ہوگا! تیسری بار صحابہ کرامؓ

نے بڑی ہمت و جرأت کر کے اور ڈرتے ڈرتے عرض کیا: فَنَحْنُ "پھر ہم ہیں۔ ہمارا ایمان اعجب ہے۔ حضورؐ نے اس کو بھی ردّ فرمادیا: وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ وَاَنَا بَيْنَ اَظْهُرِكُمْ۔ "تم کیسے ایمان نہ لاتے جب کہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں"۔ یعنی اللہ کی سب سے بڑی نشانی اور اس کا سب سے بڑا معجزہ تمہارے سامنے ہے۔ تم کو میرے دیدار اور میری صحبت کا فیض حاصل ہے۔ میری ذات سے جن برکات کا ظہور اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا جو نزول ہو رہا ہے وہ تمہارے سامنے ہیں۔ انتہائی قلیل تعداد اور بے سروسامان ہونے کے باوجود اللہ کی نصرت و تائید سے تمہیں مشرکین و کفار پر جو فتوحات حاصل ہو رہی ہیں' ان کا تم اپنی چشم سر سے ہر لحہ مشاہدہ کرتے ہو۔ میں نے بنفسِ نفیس تمہیں توحید کی دعوت پہنچائی ہے' تم پر قرآن مجید کی تبلیغ اور اس کے معارف و حِکَم کی تبیین کی ہے' تو تم کیسے ایمان نہ لاتے!۔ اب حضورؐ خود جواب ارشاد فرماتے ہیں: اِنَّ اَعْجَبَ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِيْمَانًا "میرے نزدیک تو سب سے زیادہ حسین' دلربا' دلکش اور حسین ایمان اُن کا ہوگا: لَقَوْمٌ يَكُوْنُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ "وہ لوگ جو میرے بعد ہوں گے"۔ يَجِدُوْنَ صُحُفًا فِيْهَا كِتَابٌ۔" ان کو تو اوراق ملیں گے جن میں ایک کتاب (قرآن مجید) درج ہوگی"۔ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِيْهَا۔" وہ اس کتاب پر ایمان لائیں گے"۔ یعنی وہ نہ میرے دیدار سے شادکام ہوتے' نہ انہوں نے میری صحبت سے فیض اٹھایا، نہ انہوں نے ان برکات، معجزات، نزولِ رحمت اور نصرتِ الٰہی کا بچشم سر مشاہدہ کیا لیکن وہ اس قرآن پر ایمان لانے کے ذریعے سے ان تمام حقائق کونیہ و تشریعیہ پر ایمان لائیں گے جو میں لے کر آیا ہوں۔ اس مقام پر ایک اہم بات کی وضاحت ضروری ہے یہاں افضلیت کی بات نہیں ہو رہی۔ انبیاء کے بعد افضل ترین ایمان لاریب صحابہ کرامؓ ہی کا ہے۔ یہاں حسین و دلکش ایمان کی بات ہو رہی ہے۔ ان کے ایمان کی جنہوں نے نہ اللہ کی سب سے عظیم نشانی یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ انور کا دیدار کیا اور نہ دنیا کے عظیم ترین مربی و مزکی کی صحبت سے مستفیض ہوئے۔ لیکن انہوں نے نورِ ایمان قرآن مجید سے حاصل کیا جو درحقیقت منبع و سرچشمۂ ایمان ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ نور قرار دے رہا ہے: جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا۔ تو ایک سند قرآن مجید سے اور ایک سند حدیث شریف

سے کافی ہے۔ معلوم ہوا کہ بے یقینی کے اس روگ کا واحد علاج قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی بے یقینی کو ختم کرنے والی واحد تلوار ہے۔ چنانچہ بے یقینی کے خلاف بھی "جہاد بالقرآن" کرنا ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چارہ کار نہیں۔!

محاذِ چہارم:

نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات

اس دور میں نفس پرستی اور شیطانی ترغیبات کا محاذ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ضمن میں عام لوگوں کی نفس پرستی اتنی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس لیے کہ اس کا سبب تو وہی ہے جس پر جاہلیت قدیمہ، جاہلیتِ جدیدہ اور بے یقینی کے محاذوں کے ضمن میں گفتگو کے دوران اشارات ہو چکے ہیں، اور پھر اس نفس پرستی کا تعلق زیادہ تر افراد کی اپنی ذاتی زندگی سے ہے لیکن ہمارے یہاں ایک طبقہ ایسا بھی ہے، جس نے اسے باقاعدہ ایک منظم ادارے (INSTITUTION) کی شکل دے رکھی ہے اور کلچر اور ثقافت کے نام پر منکرات و فواحش کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ ایک مسلمان کے دل میں اباحیت اور منکرات سے جو بُعد اور نفور ہوتا تھا اور حرام چیزوں کے خلاف دل میں جو جذبۂ نفرت ہوتا تھا اسے ثقافتی طائفوں، ریڈیو اور ٹی وی ڈراموں، راگ و رنگ کی محفلوں اور تعلیمی، کاروباری، دفتری اور صنعتی اداروں میں مرد و زن کے مخلوط طریق کار کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔ اور اس سارے نظام کو ایک طرف اباحیت پسند طبقے اور دوسری طرف خود سرکاری سطح پر سرپرستی حاصل ہے۔ اس کو تہذیب، ثقافت، فنونِ لطیفہ اور مرد و زن کی مساوات کے خوشنما نام دیے گئے ہیں۔ اب بے پردگی، نیم عریانی، خواتین کی رنگین و مزیّن تصاویر کو تہذیب و تمدن کی ناگزیر ضرورت قرار دیا گیا ہے۔ اور اس طرح عورت کو چراغِ خانہ سے شمعِ محفل اور اس سے بڑھ کر اشتہاری جنس بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ہمارے اخبارات و رسائل (اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ) اور دوسرے ذرائع ابلاغ اس میں مسابقت کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں اس کو وقت اور زمانے کا تقاضا سمجھ لیا گیا ہے۔ دین تو ایک طرف، ہماری جو معاشرتی تہذیبی اور

مجلسی اقدار تھیں، ان سب کو بھی پامال کیا جا رہا ہے۔ جو لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں وہ اگرچہ اقلیت پر مشتمل ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کا ذرائع ابلاغ پر پوری طرح غلبہ اور تسلط ہے۔ اس اقلیتی گروہ نے کچھ وقتی تقاضوں اور کچھ لوگوں کے دینی رجحان کے پیش نظر ان ذرائع ابلاغ کا کچھ حصہ اسلامی اور دینی پروگراموں کے لیے بھی مخصوص کر رکھا ہے جو اکثر و بیشتر محض بہلاوے اور دکھاوے کے لیے ہوتے ہیں اور بڑی چابکدستی اور ہوشیاری یہ برتی جاتی ہے کہ کہیں کوئی ایسا کام نہ ہو جائے کہ ان ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک دین کا حقیقی پیغام پہنچ جائے۔ مبادا اعجاز قرآنی لوگوں کے اذہان و قلوب میں نفوذ کر کے ان کو مسخر کر لے۔ وہی احتیاط خوف جس کا اظہار علامہ اقبال مرحوم نے اپنی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبان سے اس طرح کرایا ہے ؎ عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

لہٰذا سرکاری ذرائع ابلاغ میں دین و مذہب کے نام سے جو پروگرام رکھے جاتے ہیں یا اخبارات و رسائل میں جو صفحات مختص کیے جاتے ہیں ان میں بظاہر احوال کوشش یہ ہوتی ہے کہ غیر محسوس طریقے سے انتشار (CONFUSION) کو ہوا دی جائے۔ چنانچہ کوئی مشرق کی بات کہتا ہے تو کوئی مغرب کی بات لکھتا ہے۔ کوئی شمال کی بات کہے تو اگلا جنوب کی بات کرے۔ تاکہ دین و مذہب کے بارے میں نفسیاتی الجھاؤ اور ذہنی انتشار بڑھتا چلا جائے۔ پھر بالفرض کوئی مؤثر بات آ ہی جائے تو فوری طور پر اس کے متصلاً بعد کچھ ایسے پروگرام رکھ دیئے جائیں جن کے ذریعے یہ اثرات زائل ہو جائیں، ذہن سے محو ہو جائیں یعنی

ع چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب

پھر ان تمام ذرائع ابلاغ و وسائلِ ابلاغ کے کرتا دھرتا ان خواتین کے بیانات، مضامین، انٹرویوز، تصاویر اور خبروں کو انتہائی نمایاں کرتے ہیں جو مغرب زدہ اور اباحیت پسند ہیں اور ہمارے ملک میں انتہائی اقلیت میں ہیں۔ لیکن تاثر یہ دیا جاتا ہے گویا ہمارے ملک کی خواتین کی اکثریت اسی طرز فکر کی حامل خواتین کی ہے۔ جن کے نزدیک دین و مذہب اور ہماری تہذیبی و معاشرتی اقدار پرکاہ کے برابر بھی وقعت اور حیثیت نہیں رکھتیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی عظیم اکثریت ان دین پسند خواتین پر مشتمل ہے جن کے نظریات ان

مغرب زدہ خواتین کے نظریات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن معاملہ چونکہ یہ ہے کہ ع "ولیکن قلم در کفِ دشمن است"۔ لہٰذا خواتین کے اس قلیل ترین طبقے کو وسائل ابلاغ کے ذریعے اس طرح 'PROTECT' اور نمایاں کیا جاتا ہے گویا پاکستان میں بسنے والی تمام خواتین اسی نظریہ وخیال کی حامی ہیں۔ یہ ہے اس جہاد کا چوتھا محاذ۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محاذ پر ہم کیا کر سکتے ہیں!

کشتۂ شمشیرِ قرآں شُکنی

ان ذرائع ابلاغ سے معاشرے میں نفس پرستی کا جو نفوذ ہو رہا ہے اور انسان کی سوچ رجحانات ومیلانات کو جو غلط رُخ پر ڈالا جا رہا ہے اس سے مقابلے کے لیے بھی ہمارے پاس ڈھال اور تلوار قرآن ہی ہے۔ میں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے اس عزم کو بہت عام کیا ہے جس کا حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں اظہار کیا تھا:

> "میں وہیں (مراد ہے اسارتِ مالٹا) سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کر دوں کہ قرآن کریم کو لفظاً ومعناً عام کیا جائے۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے۔۔۔"

لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے حقانی وربانی جو اپنا تعلق امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہما اللہ سے قائم کرنے کو اپنے لیے موجبِ اعزاز وافتخار سمجھتے ہیں۔ وہ فقہی وکلامی تعبیر اور استنباط کی بحثوں سے صرفِ نظر کر کے ایک منظّم تحریک کی شکل میں حضرت شیخ الہندؒ کے عزم کو عملی شکل دینے کے لیے کمرِ ہمّت کس لیں۔ شہر شہر، محلہ محلہ، کوچہ کوچہ، قریہ قریہ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کریں اور قرآنِ مجید، فرقانِ حمید کی شمشیرِ برّاں کے ذریعے نفس پرستی اور اباحیت پسندی کے خلاف جہاد کریں اور اس سیلاب کے آگے سدِّ ذوالقرنینی بن جائیں۔ یہی پیغام اس مردِ قلندر نے

آج سے قریباً نصف صدی قبل دیا تھا جس کو بجا طور پر حکیم الامت کہا جاتا ہے یعنی ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم و مغفور۔ ان کا پیغام تھا ؂

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم　　تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم!
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن　　نکتۂ شرعِ مبیں را فاش کن

"اے وہ شخص جسے حاملِ قرآنِ عظیم ہونے پر فخر ہے۔ آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے۔ ؟ اٹھو اور دنیا میں دینِ حق کے اسرار و رموز اور عرفان و فیضان کو عام کرو اور شریعتِ اسلامی کے حِکَم و عِبر کی نشر و اشاعت کے لیے سرگرمِ عمل ہو جاؤ۔" یہ ہے علامہ مرحوم کا پیغام حاملِ قرآن اُمت اور بالخصوص علمائے حق کے لیے۔ بفضلہٖ تعالیٰ ملک کا کوئی قابلِ ذکر شہر ایسا نہیں ہے، جس میں غالب اکثریت ایسے علماء کرام کی نہ ہو، جن کا امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ یا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین جیسے اکابر سے ارادت و عقیدت کا تعلق نہ ہو، آخر الذکر بھی درحقیقت ولی اللٰہی اور دیوبند کے مکتبِ فکر سے وابستہ رہے ہیں اور تھانوی مکتبِ فکر ہو یا ندوی، یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں۔ اسی طرح مسلکِ سلفی کا تعلق تو براہِ راست حضرت شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ جیسے غازیؒ و مجاہد اور شہید اور امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی سے قائم ہے۔ اگر ہمارے یہ علماء عظام منظم ہو کر عوامی درسِ قرآن کی تحریک برپا کر دیں تو اِن شاء اللہ العزیز نفس پرستی، اباحیت پسندی، اور خدا ناآشنا ثقافت و فنونِ لطیفہ کے نام سے جو زہر ہمارے معاشرے میں پھیلایا جا رہا ہے اس کا سدِّ باب بھی ہو جائے گا اور جیسے جیسے قرآن حکیم اُمت کے اذہان و قلوب میں نفوذ اور سرایت کرے گا تو نتیجۃً ذرائع ابلاغ پر قابض اباحیت پسند قلیل طبقہ یا تو اپنا رویہ تبدیل کرنے یا اسلام کے سچے خادموں کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ البتہ اس کے لیے ناگزیر شرط یہ ہے کہ تمام انواع کے فقہی و کلامی اختلافات و تاویلات سے دامن بچایا جائے اور قرآن حکیم کا انقلابی پیغام عامۃ الناس تک پہنچایا جائے اگر اس احتیاط کو ملحوظ نہ رکھا گیا تو ابلیس کا وہ مشورہ کارگر ہو گا جو اس نے اپنی شوریٰ میں بقول علامہ اقبال پیش کیا تھا کہ : ؂

ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے　　یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

ذہن وفکر کی تطہیر اور سیرت وکردار کی تعمیر کی اساس اور نفس پرستی کے سیلاب کے آگے کوئی چیز اگر سد اور بند بن سکتی ہے تو وہ صرف اور صرف قرآنِ مجید ہے۔ اباحیت ونفس پرستی کے قلع قمع کے لیے اگر ہمارے ہاتھ میں کوئی تیغ بے زنہار ہے تو وہ قرآنِ مجید ہے۔ علامہ اقبال کے یہ اشعار میں نے بارہا آپ کو سنائے ہیں۔ انہیں پھر پیش کر رہا ہوں۔ یہ اشعار میرے مفہوم ومطلوب کو آپ کے اذہان وقلوب میں منتقل اور جاگزیں کرنے میں بہت ممد ومعاون ہوں گے۔

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است　　زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی　　کشتۂ شمشیر قرآنش کنی

"ابلیس کو ہلاک کر دینا ایک نہایت مشکل کام ہے اس لیے کہ اس کا بسیرا نفسِ انسانی کی گہرائیوں میں ہے۔ بہتر صورت یہ ہے کہ اُسے قرآنِ حکیم کی حکمت وہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے۔"

واقعہ یہ ہے کہ آج ہماری ملی وقومی زندگی کے شعور کی گہرائیوں میں آرٹ کونسلز، ثقافتی طائفوں کے مبادلوں، راگ ورنگ کی محفلوں، رومانی ڈراموں، افسانوں اور لٹریچر اور ٹیلی ویژن کے مختلف 'CULTURAL SHOWS' نے ڈیرا لگا رکھا ہے۔ ہمارے ملک کی اعلیٰ ترین سطح کی شخصیتیں اس میٹھے زہر کی سرپرستی کر رہی ہیں۔ ان سے نبرد آزما ہونا آسان کام نہیں ہے۔ بہتر شکل یہی ہے کہ قرآن کی تلوار سے اُن اربابِ اختیار کو مسلمان بنانے کی کوشش کی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت اور شہوانیت تو ہمارے نفس کے اندر ہی ہیں۔ شیطان ان نفسانی خواہشات وداعیات کو بھڑکاتا ہے، انہیں مشتعل کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرتا۔ چنانچہ آخرت میں جب فیصلے چکا دیئے جائیں گے تو جو لوگ دنیا میں شیطان کے دجل وفریب کا شکار ہوتے تھے وہ اس کو ملامت کریں گے۔ شیطان اس کا جو طویل جواب دے گا اُسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ ابراہیم میں نقل فرمایا ہے۔ اس جواب میں وہ کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۭ

"میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ میں نے اس کے سوا اور کچھ نہیں کیا کہ تمہیں اپنے راستے کی طرف بلایا۔ (اسے خوش نما، دلفریب اور تمہارے نفس کے لیے لذت کوش بنا کر پیش کیا) تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔ یہاں نہ میں تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتا ہوں (اور تمہارے کام آ سکتا ہوں) اور نہ ہی تم میری فریاد رسی کر سکتے (اور میرے کام آ سکتے ہو)۔"

معلوم ہوا کہ شیطان اپنے راستے کو بہت مزین کر کے انسان کو اس کی طرف بلاتا ہے پھر انسان کے نفس میں، اس کے پورے وجود میں اس کی دعوت خوش نما زہر بن کر سرایت کر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زہر کے لیے تریاق بھی وہ درکار ہے جو پورے وجود میں سرایت کر سکے اور پھر جس میں حلاوت اور تاثیر بھی ہو۔ ایسا کوئی تریاق سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں ہے

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یہ قرآن اگر کسی کے اندر اتر جائے تو اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے اور فرد کے اندر کا یہ انقلاب ایک بین الاقوامی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

محاذِ پنجم

فرقہ واریت

ہمارا پانچواں محاذ جس پر ہمیں جہاد بالقرآن کرنا ہے وہ فرقہ واریت، تشتت، انتشار اور باہمی اختلافات کا محاذ ہے۔ یہ عناصر وحدتِ امت کو صدیوں سے دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ انہی کے باعث دولتِ عباسیہ ختم ہوئی اور سقوطِ بغداد کا سانحہ پیش آیا۔ انہی کی وجہ سے بغداد کے گلی کوچوں میں اہل سنت کے دو گروہ دست بگریباں ہوئے، تلواریں بے نیام ہوئیں اور خون کی ندیاں بہائی گئیں۔ سلطنتِ ہسپانیہ کے زوال و انحطاط اور پھر کامل سقوط کے عوامل میں جہاں قبائلی عصبیتیں کارفرما تھیں وہاں اس تباہی میں فقہی و کلامی اختلافات

ائل دخل بھی تھا۔ اور اب محسوس ہو رہا ہے کہ یہ اختلافات سلطنتِ خداداد پاکستان کے لیے بھی
وز بروز زیادہ سے زیادہ نازک اور خطرناک صورت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پچھلے دنوں
خبارات نے اس نازک مسئلہ پر اداریے لکھے اور تشویش کا اظہار کیا جو بالکل صحیح اور درست تھا۔
اضی قریب میں بادشاہی مسجد کے ایک مبینہ واقعہ بلکہ محض افواہ پر معرکہ آرائی کی جو تکلیف دہ صورتِ حال
ہی تھی، یہ چنگاری جنگل کی آگ بن سکتی تھی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے طور پر اس کا اندازہ لگا سکتا ہے
کہ یہ آگ ہمارے لیے کتنی ہولناک اور تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ فرقہ واریت کا بارود اب بھی ہمارے
یہاں موجود ہے، کوئی شر پسند گروہ اس کو کسی وقت بھی دیا سلائی دکھا سکتا ہے۔ اس نازک صورتِ حال
یں ہماری ملی و سیاسی زندگی اور ہمارے وطن کے مستقبل کے لیے جو خطرات مضمر ہیں، میں اس وقت
ان کے بارے میں بات نہیں کر رہا۔ پھر یہ کہ فی الوقت صورتِ حال جس ہلاکت خیزی کے دہانے
تک پہنچی ہوئی ہے اس کے اسباب و علل کے متعلق بھی میں اس وقت کچھ عرض نہیں کروں گا۔
اس وقت مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس کا علاج صرف تشویش ظاہر کرنے سے تو نہیں ہو جاتے
گا، محض پریشان ہونے سے تو کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مثبت کام کرنا ہو گا۔ اس
کے لیے بھی جہاد کرنا ہو گا اور اس جہاد کے لیے بھی قرآن ہی واحد تلوار ہے۔

اعتصام کن کہ حبل اللہ اوست

فرقہ واریت کے اس عفریت کا سر قلم کرنے کے لیے، اس کا قلع قمع کرنے کے لیے
اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے واحد تلوار صرف قرآن ہے۔ یہی سبق ہم کو سورۃ آل عمران
کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظِ مبارکہ میں ملتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا
تَفَرَّقُوْا۔ تمام مفسرین اور تمام علماءِ عظام کا اس امر پر اجماع ہے کہ یہاں حبل اللہ سے مراد
قرآن مجید ہے اور یہ رائے متعدد احادیثِ صحیحہ کی روشنی میں قائم کی گئی ہے۔ آیتِ مبارکہ کے
اس حصے سے علامہ اقبال مرحوم نے جو کچھ اخذ کیا ہے وہ میں آگے بیان کروں گا۔ اس وقت
میں اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر سناتا ہوں جو ہمارے موجودہ حالات پر منطبق ہوتا ہے۔ فرماتے
ہیں۔ ؏

صوم ہے ایمان سے، ایمان غائب صوم گم

یعنی آدمی روزہ تو ایمان ہی کے تقاضے کے تحت رکھ سکتا ہے۔ خاص طور پر موجودہ موسمِ گرما کے یہ روزے۔ جب ایمان ہی نہیں رہا تو صوم تو آپ سے آپ گیا۔ پھر اس کا التزام و اہتمام کیسے ہوگا! اگلا مصرع نہایت قابلِ توجہ ہے ؎

قوم ہے قرآن سے، قرآن رخصت قوم گم

مسلمانوں کی ملّی اور قومی شیرازہ بندی قرآن سے ہے۔ قرآن درمیان سے ہٹ گیا یا آپ کی توجہ قرآن سے ہٹ گئی تو نتیجہ ایک ہی ہوا۔ یعنی وحدتِ ملّی کا شیرازہ بکھر گیا۔ اسے اقبال نے اس طرح تعبیر کیا ہے ؎

یا مسلماں مُرد یا قرآں بمرد!

یا مسلمان مر چکا ہے یا معاذ اللہ قرآن مر چکا ہے۔ اقبال دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ قرآن تو زندہ و پائندہ ہے، لیکن مسلمانوں کی توجہ مر چکی ہے۔ قرآن سے ان کا شغف اور التفات ختم ہو چکا ہے۔ چنانچہ علامہ مرحوم نے مسلمانوں کو چونکانے کی غرض سے یہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔ عظمتِ قرآن کے بیان میں علامہ کے یہ اشعار بھی انتہائی قابلِ توجہ ہیں:

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　　این کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں وہم پیدا ست اُو　　　　زندہ و پائندہ و گویاست اُو

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　　　عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست

"اس قرآن کے بارے میں جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اُسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں! حقیقت یہ ہے کہ یہ محض کتاب ہی نہیں ہے کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذاتِ حق سُبحانہٗ و تعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اُسی کی مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی۔ اور یہ کتاب جیتی جاگتی اور بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی ہے۔ اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں۔"

لیکن مسلمانوں کا اس کتابِ الٰہی، اس ہدًی للناس، اس فرقانِ حمید، اس نسخۂ شفا کے ساتھ کیا سلوک و رویّہ باقی رہ گیا ہے اس کا نوحہ اقبال اس طرح کرتے ہیں ؎

بآیاتش ترا کارے جز این نیست!　　　　کہ از یاسینِ اُو آساں بمیری!

"لیکن افسوس کہ اے مسلمان! تجھے اس قرآن کی آیات سے اب اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ اس کی سورۃ یاسین کے ذریعے موت کو آسان کرلے۔"

علامہ کے یہ اشعار بھی میں بارہا اپنی تقریر و تحریر میں پیش کرچکا ہوں جن میں انہوں نے بڑی دل سوزی کے ساتھ ہماری ذلت و خواری، ہمارے انتشار، ہماری آپس کی چپقلش اور تنازعات کی تشخیص بھی کی ہے اور علاج بھی تجویز کیا ہے ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی　　　شکوہ سنج گردش دوراں شدی

اے چو شبنم بر زمین افتندۂ　　　در بغل داری کتاب زندۂ

حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے رہائی کے بعد پوری دنیا کے مسلمانوں کی دینی و دنیوی تباہی و بربادی کا جہاں ایک سبب "قرآن کو چھوڑ دینا" قرار دیا تھا وہاں دوسرا سبب "آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی" بھی بیان کیا تھا۔ عوامی درسِ قرآن کے حلقے قائم کرنے کے عزم کے ساتھ ساتھ اس ارادہ کا بھی اظہار کیا تھا کہ "مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو ختم کرنے کے کام میں بھی وہ اپنی باقی زندگی صرف کریں گے۔ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ جو اس روایت کے راوی ہیں انہوں نے اس پر اس طرح تبصرہ فرمایا تھا کہ "حضرتؒ نے ہمارے زوال و انحطاط کے جو دو سبب بیان کیے تھے، غور کیا جائے تو یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہمارے اختلافات اور باہمی جنگ و جدال کا سبب بھی قرآن کو ترک کر دینا ہی ہے۔" ان دو اکابر کا اس پر کامل اتفاق نظر آتا ہے کہ مسلمانوں کی اصلاح اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم یا کم از کم ان کی شدت کو کم کرنے اور ان میں اعتدال پیدا کرنے کا واحد ذریعہ اعتصام بالقرآن ہے۔

علامہ اقبال نے اسے جس پرشکوہ انداز میں ادا کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے فرماتے ہیں ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است　　　پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست　　　اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

یعنی وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں۔ ہمارا یہ وجود مٹی ہے ہاں اس میں دل ہے، جس کی دھڑکن اس کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہمارا

قلبِ زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے ۔ اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامو کہ یہی
حبل اللہ ہے ۔ یہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے ۔ اور سہ

چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانند غبار آشفتہ شو

اے ملّتِ اسلامی ! اب بھی وقت ہے کہ تو اپنے آپ کو تسبیح کے موتیوں کی طرح
قرآن کے رشتے میں بیندھ لے اور پرو لے ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک
اور دھُول کی مانند پریشان و منتشر اور ذلیل وخوار رہ ۔

میرا تأثر یہ ہے اور میں اسے تقریر میں بھی اور تحریر میں بھی برملا ظاہر کرتا رہا ہوں کہ ماضی قریب
میں قرآن کی عظمت اور مرتبہ و مقام کا انکشاف جس شدّت کے ساتھ علامہ اقبال پر ہوا ، شاید ہی
کسی اور پر ہوا ہو ۔ علاّمہ مرحوم نے اپنی شاعری بالخصوص فارسی شاعری میں نہایت دل گداز ، مؤثر
اور تیر کی طرح دل میں پیوست ہو جانے والے مختلف اسالیب سے ملّتِ اسلامیہ کو جھنجوڑا ہے
اور اسے دعوت دی ہے کہ دین و دنیا کی فوز و فلاح چاہتے ہو تو قرآن کو تھامو ۔ یہی تمہارے اتحاد
اور تمہارے عروج کا واحد ذریعہ ہے ۔ ان کا یہ شعر آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے سہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن !
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن !

" تو اگر مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے ، تمنّا اور آرزو رکھتا ہے تو اچھی طرح
جان لے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیات کی بنیاد قرآن پر قائم کرے " ۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہمارے سامنے پانچ محاذ ہیں جن کے خلاف منظم ہو کر جہاد بالقرآن
کے لیے کمر کسنے کی ضرورت ہے ۔ آپ میں سے اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اسی جہاد کے لیے میں
نے اپنا ' PROFESSION ' تج دیا ۔ مَیں اپنی زندگی کے بہترین دن اسی کام میں لگا چکا ہوں
اب تو بڑھاپے میں قدم رکھ چکا ہوں ۔ ع " شادم بر عمرِ خویش کہ کارے کردم " ۔ الحمد للہ میری
زندگی کے جو بہترین ایام تھے وہ اس جہاد بالقرآن میں بسر ہوتے ہیں ۔ میرے شب و روز اور
میری صلاحتیں اور توانائیاں دروسِ قرآن ، تقاریرِ خطباتِ جمعہ ، انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے

قیامِ قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کے انعقاد۔ قرآنی تربیت گاہوں کے انصرام، قرآنی سلسلۂ اشاعت کے انتظام، قرآن کے پیغام پر مشتمل مطبوعات کی اشاعت اور ملک کے مختلف شہروں کے دعوتی دوروں میں لگی ہیں۔

اور الحمد للہ قرآن کا پیغام لے کر میں دوسرے ممالک میں بھی گیا ہوں۔ چراغ روشن کیے ہیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا ہے کہ کمر کسیں اور اس جہاد بالقرآن کے لیے میدان میں آئیں۔ ظاہر بات ہے کہ کام کے نتائج ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے۔ آپ کے اسی شہر لاہور میں، میں نے یہ کام چھ سال تن تنہا کیا، کوئی ادارہ نہیں، کوئی تنظیم نہیں، کچھ نہیں۔ مطب بھی کر رہا تھا اور یہ کام بھی کر رہا تھا۔ وہ جو حسرت موہانی نے کہا تھا ؏ ہے مشقِ سخن جاری اور چکی کی مشقت بھی، تو یہ دونوں چیزیں میرے لیے بھی جاری تھیں پھر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن قائم ہوئی اور بقول اقبال ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

بہرحال میرا اور انجمن کا کام اسی جہاد بالقرآن کے گرد گھومتا رہا ہے۔ آج میں نے اس پورے کام کو پانچ محاذوں کی شکل میں مرتب کر کے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے ورنہ یہ باتیں تو میں نے بارہا کہی ہیں۔ میں ان کو مختلف موضوعات وعنوانات کے تحت اور مختلف پیرایوں میں بیان کرتا رہا ہوں۔

آج مجھے آپ حضرات سے یہ کہنا ہے کہ رمضان المبارک کے جمعہ کی اس مبارک ساعت[1] میں کچھ غور کیجیے، کچھ سوچیے، کچھ اپنے گریبانوں میں جھانکیے۔ میں عرض کروں گا کہ ہمارا پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص یہ معین (ASSESS) کرے کہ میں قرآن کریم کے اعتبار سے کس مقام پر کھڑا ہوں! میں قرآن پڑھتا ہوں! میں قرآن پر غور و تدبر کرتا ہوں! قرآن سے مجھے کتنا شغف اور تعلق ہے! پھر یہ کہ قرآن کا جو حکم سامنے آجائے کیا بے چوں وچرا اُسے مان لیتا ہوں!! کیا قرآن کے پیغام کو آگے پہنچانے کا کوئی ارادہ، کوئی عزم میرے اندر ہے! اس ضمن میں من تن دھن سے کوئی خدمت میں نے آج تک کی ہے! یہ خود احتسابی ضروری ہے

---

[1] واضح رہے کہ یہ تقریر رمضان المبارک ۱۴۱۰ھ کے ایک مبارک جمعے کے موقع پر کی گئی تھی (مرتب)

انسان پہلے خود اپنا جائزہ لے۔ پھر فیصلہ کرے کہ بحیثیت مسلمان اس کو قرآن مجید کے جو حقوق ادا کرنے ہیں، اس کام کے لیے اس کے دل میں کتنی لگن، تڑپ، ولولہ اور حوصلہ ہے! اگر نہیں ہے تو شعوری طور پر اس کے لیے کوشاں ہو۔ یہ بھی نہ کر سکے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منائے۔ میں نے ۱۹۶۸ء میں "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر تقریر کی تھی۔ اس میں قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے، پہلا یہ کہ اسے مانا جائے۔ دوسرا یہ کہ اُسے پڑھا جائے۔ تیسرا یہ کہ اُسے سمجھا جائے۔ چوتھا یہ کہ اس پر عمل کیا جائے اور پانچواں یہ کہ اُسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ یہ تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ ان حقوق کے حوالہ سے اپنا محاسبہ خود کیجئے کہ کیا ہم اُن کو ادا کر رہے ہیں! نہیں کر رہے ہیں تو آج ہی یہ عزم کر کے اُٹھیے کہ ہم اِن شاء اللہ ان حقوق کو ادا کریں گے۔

یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ میں نے قرآن مجید کے پانچ حقوق گنوائے تھے اور آج میں نے پانچ ہی محاذ آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں جو ہماری اپنی ملت کی اصلاح اور اس کی دینی و ملی زندگی کو سنوارنے کے لیے جہاد بالقرآن کے متقاضی ہیں۔ یہ تو ہماری جدوجہد کا پہلا مرحلہ ہے۔ ہمیں تو اس قرآن کی شمشیر بے زنہار، تیغ براں کو ہاتھ میں لے کر پورے کرۂ ارضی پر کفر، شرک، الحاد، دہریت، اباحیت، شیطنت اور ان کے ذریعے پیدا ہونے والے تمام امراض کا قلع قمع کرنا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ

کے مصداق اس کام کو اپنی ذات سے شروع کیجئے۔ پھر کمر کسیے کہ جہاد بالقرآن کے ذریعے پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے اپنی بہترین توانائیاں، اپنی بہترین صلاحیتیں، اپنے بہترین اوقات وقف کریں گے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ توفیق اور ہمت دے تو پوری زندگی اِسی کے لیے وقف و مختص رہے گی بفحوائے آیت قرآنیہ:

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو نیز تمام مسلمانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اَقُوْلُ قَوْلِیْ ھٰذَا وَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ لِیْ وَلَکُمْ وَلِسَآئِرِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ

آمین یارب العالمین

مجاہدِ کبیر

مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ

—— مولانا عبدالکریم پاریکھ ——

الحمدلله الذی جعل لکل شیئی سببا وانزل علی عبده کتابا عجبا فیه من کل شیئی حکمة و نبا والصلوة والسلام علی سیدنا محمد اشرف الخلیقته عجما و عربا وازکاهم حسبا ونسبا وعلی آله واصحابه واز واجه واهل بیته اجمعین و سلم تسلیما ودائما ابدا کثیرا والحمدلله رب العلمین۔ ط

علمی اور عملی دونوں اعتبار سے اپنے چھوٹے ہونے کا سخت احساس ہوتا ہے۔ جب ہمارے سلف صالحین (اللہ ان کی قبور کو نور سے بھر دے اور ان کے درجات بلند فرمائے) کے کام، اسلوب اور کوششوں کا جائزہ خود اپنی اصلاح کی غرض سے لینے کی نوبت اور ضرورت پیش آتی ہے ـــــ۔ بلاشبہ آج سائنس ٹیکنالوجی اور دیگر مادی ترقیوں نے بے شمار تکالیف کو راحت میں تبدیل کر دیا ہے۔ لیکن پھر بھی جب کبھی ایمان کے ان عظیم ستونوں کی طرف نظر اٹھتی ہے تو اپنی کم مائیگی بے بسی اور اس بات کا احساس اور اعتراف شدت سے ہونے لگتا ہے کہ "ہم سے کچھ نہ ہو سکا!"۔

رُشد و ہدایت کا ایک بلند مینار...... یہ احقر کیا اور اس کی بساط کیا ایک جاں باز مجاہد، معمار ملت حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ "بانی مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ" کی ذات باکمال پر قلم کو جنبش دے سکے۔ مگر محترم بزرگوار حضرت مولانا محمد مسعود شمیم صاحب (ناظم مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ) کے حکم سے فرار کی جرأت نہ کر سکا، جب کہ انہوں نے حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوئؒ کی وفات کے سو سال پورے ہونے پر یہ حکم نامہ جاری فرمایا کہ "آپ اس تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں"۔

دستاویزی ثبوت...... مجاہد کبیر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اللہ کے ان مخلص، منتخب اور مجاہد بندوں میں سے ہیں جن کی انتھک کوششوں سے ہندوستان میں اب بھی دین حنیف کے ستون قائم ہیں اور ملت اسلامیہ الحمدللہ زندہ ہے۔

جوں ہی انگریزی سلطنت کے شکنجے نے اس ملک کو اسیر کیا سب سے زیادہ بے چینی اور اضطراب حلقہ علماء میں پھیلا' اور اللہ کے عالم بندے قرطاس و قلم، تعلیم و تعلم اور تدریس و تربیت کے دائرے سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور ہتھیار اٹھا کر ملک کے عوام کو انگریزی اقتدار کے پنجے سے نکالنے کی مہم میں لگ گئے۔ حالات کا تجزیہ کرنے والا ہر عاقل شخص یہ ماننے پر مجبور ہے کہ انگریزوں نے ملک کی باگ ڈور مسلمانوں سے چھینی تھی اور چونکہ نظام تعلیم بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا جو اقتدار کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس طرح اہل ایمان کو اب یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ ایک تازہ دم عیسائی قوم جو ایک طرف ہتھیار بند' ہوشیار اور فن حرب کے آلات سے لیس تھی تو دوسری جانب ان کے ساتھ مسیحی پادریوں کی ایک بھیڑ تھی جو بگڑے ہوئے دین مسیح کے وارث ہونے کے ناطے اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے حدود ملک میں پھیل گئی۔ اور عیسائیت کی تبلیغ میں سرگرم ہو گئی۔ اللہ نے علماء حق کو کھڑا کیا اور یہ علماء ربانی ہی تھے جنھوں نے مسیحی پادریوں کا منہ پھیر دیا۔ اور اس طرح انگریزی اقتدار کی بنیاد ہلادی' جس کے سبب آگے آنے والے انقلابی دستوں کا راستہ ہموار ہوا اور اس طرح ان کو استخلاص وطن کی تحریک میں علماء حق سے زیادہ قربانیاں دینے کی ضرورت و نوبت نہیں آئی اور بہت تھوڑی مدت اور محنت کے بعد یہ ملک انگریزی اقتدار سے آزاد ہو گیا۔ لیکن علماء حق کی قربانیاں' ان کی تدابیر خلوص اور ترکیب و تدبیر کے ساتھ نصرت الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو ۱۹۴۷ء تو کیا ۲۰۴۷ء تک بھی ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔

خون سے رنگین داستان...... یہ حق ہے کہ آزادئ وطن کی جدوجہد میں علماء ربانی کے پورے پورے قافلے شہید ہوئے۔ ہزاروں ہزار پھانسی پر چڑھا دیئے گئے اور بظاہر اتنی قربانیوں کا فی الفور کوئی نقد نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ لیکن قدرت اور تاریخ نے ان قربانیوں کو نوٹ کر رکھا تھا کہ وقت آنے پر آئندہ نسلوں کو ان قربانیوں کا کامیاب نتیجہ دنیا میں مل جائے گا۔ جبکہ اہل حق علماء کرام اپنا اجر پانے اپنے رب کے دربار حاضر کر دیئے گئے۔

مجاہد کبیر..... اسی لشکر کے ایک مجاہد کبیر' عالم ربانی اور مجاہد اسلام کا نام نامی حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ ان کے حالات کا تذکرہ کرنے سے پہلے

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات قرآنی سے ابتدا کی جائے۔

شہادت قرآن مجید

مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَیْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا ○ لِیَجْزِیَ اللّٰهُ الصّٰدِقِیْنَ بِصِدْقِهِمْ ... الخ (سورۃ الاحزاب آیت ۲۳-۲۴)

ترجمانی...... "ایمان والوں میں بہت سے ایسے دلیر مرد بھی ہیں۔ جو اللہ کو دیئے ہوئے اپنے قول میں سچے اترے اور ان میں کچھ تو ایسے ہیں جو راہ خدا میں جان دینے کی نذر و منت پوری کر چکے اور ابھی کچھ انتظار میں ہیں کہ جیسے ہی موقع ملے اپنی جان کی بازی لگا دیں گے اور جان نثاری کے حوصلے اور قول میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آنے دی۔ اب جو اپنے قول میں سچے ثابت ہوئے تو ان کے صدق کا بدلہ اللہ انہیں ضرور عطا فرمائے گا"۔

قوی استدلال...... بلاشبہ یہ آیت دور اول کے ان مجاہدین صادقین کے حق میں نازل ہوئی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانباز ساتھی بن کر مورچوں پر ڈٹے رہے تو اپنا اجر پا چکے اور شہید ہوئے تو جنت میں جا پہنچے لیکن قیامت تک کے لئے اٹھنے والے مجاہدین راہِ حق کے لئے بھی اس آیت کریمہ میں بشارت موجود ہے۔

کوئی حرج نہیں کہ مجاہد کبیر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی (رحمتہ اللہ علیہ) کو بھی ہم اسی قافلے کے ہم مقصد لوگوں میں شمار کر کے اپنے لئے نمونہ بنائیں۔

حضرت اقدس مولانا موصوفؒ کی حیاتِ مبارکہ بھی ان ہی اوصاف سے بھری پڑی ہے جو ان آیات بینات کے مصداق اولوالعزم اہل ایمان کے بتائے گئے ہیں۔

لافانی حقیقت...... حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحبؒ کے زمانے کو دیکھنے کے لئے انقلاب ۱۸۵۷ء والے پرفتن دریچے میں جھانکنا ہوگا۔ حضرت کیرانوی کا جہاد بالسیف والقلم، عیسائی پادریوں کے ساتھ لکھے تاریخی مناظرے۔ اس ضمن میں حضرت کی نوادر زمانہ اور نایاب و بے نظیر تصانیف کا وہ معرکۃ الآراء ذخیرہ کہ جو راہ روان حق کے لئے اسلام دشمن عناصر خصوصاً عیسائی حضرات کے ہر وار سے بچنے کے لئے ایک مضبوط ڈھال کا کام دے گا پھر اس مرد مجاہد کا پاپیادہ کیرانہ سے دہلی اور دہلی سے دشوار گزار سفر جبکہ برٹش حکومت نے ان کو باغی قرار دے کر گرفتاری کا وارنٹ جاری کر رکھا تھا۔ پھر اللہ کے راستے

یں ہجرت والی سنت رسول کی سعادت سے مشرف ہو کر حرم مقدس میں حضرت کیرانوی کی
نجانب اللہ قبولیت اور نصرت و پذیرائی نیز مدرسہ صولتیہ کی تاسیس و قیام۔ پھر ایک طویل
رت تک مدرسہ ہذا کی خدمات، یہ تمام واقعات ان کی بھرپور مجاہدانہ زندگی کی عکاسی کرتے
ہیں۔

شاطرِ زمانہ پادری فنڈر...... ہندوستان میں اسلام پر حملۂ عیسائیت کے سلسلے میں
لمی اور عملی جہاد کا ایک مستقل محاذ قائم کرنا۔ نیز پادری فنڈر جیسے شاطرِ زمانہ عیسائی مبلغ کے
ساتھ تاریخی مناظرے کر کے دشمن کو اسی کے ہتھیار سے مجروح و مغلوب کر کے فرار پر مجبور
کر دینا اور اس عظیم کام کو انجام دینے کے لئے اس سبجیکٹ کے ماہر ایسے کارکنوں کی ٹیم کو
ٹھا کھڑا کر دینا یہ حضرت کیرانوی کا کارنامۂ تاریخی ہے۔ جبکہ عیسائی پادری مسلم علماء حضرات
کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے خلاف تقاریر کر کے مسلمانوں میں خوف و ہراس کا ماحول
پیدا کر چکے تھے۔ پادریوں کے اس جارحانہ مشن کو حضرت کیرانوی کی لطیف اور مضبوط تدبیر
نے یکسر بے کار اور غیر موثر بنا کر رکھ دیا۔

گھریلو حالات...... مجاہد کبیر مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے والد ماجد کا اسم گرامی
مولوی خلیل اللہ تھا۔ اجداد کا اصل وطن پانی پت تھا۔ آپ ۱۲۳۳ھ، ۱۸۱۸ء میں پیدا
ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کیرانہ میں حاصل کر کے علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لئے دہلی تشریف لے
گئے۔ ۱۲۵۰ ہجری میں آپ کے والد مولوی خلیل اللہ صاحب دہلی میں مہاراجہ ہندو راؤ بہادر
کے میر منشی مقرر ہوئے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی دن میں تعلیم حاصل کرتے اور رات میں
والد محترم کی خدمت میں رہتے اور راجہ کو اکبر نامہ بھی سناتے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مولانا اپنی علمی
پیاس بجھانے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ ۱۲۵۶ھ میں موصوف کی شادی ان کی خالہ کی صاحب
زادی سے ہوئی۔ اسی دوران مہاراجہ ہندو راؤ نے آپ کو اپنا مشیر مقرر کیا اور آپ کے والد کو
جائیداد کی نگرانی اور دیکھ بھال پر مقرر کیا۔

۱۲۷۰ھ میں مولانا موصوف کا ایک سالہ بیٹا فوت ہوا اور کچھ ہی عرصے بعد آپ کی اہلیہ
محترمہ عارضۂ دق میں مبتلا ہو کر چل بسیں پھر آپ کے والد صاحب بھی جلد ہی اللہ کو پیارے ہو
گئے، چنانچہ آپ نے اپنی جگہ پر اپنے چھوٹے بھائی مولوی محمد جلیل صاحب کو ملازم رکھوا کر
ملازمت سے علیحدگی اختیار فرمائی اور وطن کیرانہ پہنچ کر درس و تدریس کے ساتھ تردید
عیسائیت کی خدمت میں مصروف ہو گئے۔

تلوار اور قلم...... حضرت مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ان جانباز مجاہدین میں سے ہیں۔ جنہوں نے زندگی کا ہر لمحہ خدمت حق کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ایک طرف تو حق کو پھیلانے اور پہنچانے کی مؤثر خدمات انجام دیں، تو دوسری جانب اپنی زبان اور قلم سے "دین اسلام" کا دفاع کیا۔ لہٰذا حضرت کا شمار ان چند بزرگان دین میں ہوتا ہے جنہوں نے بیک وقت قلم اور تلوار دونوں میدانوں میں اپنے جوہر دکھلائے ہوں۔ ایک محاذ پر تو عیسائیت کے تابڑ توڑ حملوں کا دفاع کیا اور دوسری جانب ہندوستان کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کی خاطر تلوار لے کر میدان کارزار میں کود پڑے۔ اور الحمدللہ دونوں میدانوں میں جہد و عمل کی بے نظیر مثالیں اور حقائق چھوڑ گئے، جو آنے والی ہر نسل کے لئے یقیناً INSPIRATION کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

فنڈر کا فریب...... عیسائی مشنری پادری فنڈر کی تصنیف "میزان الحق" نے وہ شبہات و تلبیسات پیدا کئے کہ مسلمانوں میں کرب و اضطراب پھیل گیا، جس میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا۔

حضرت کیرانوی نے فوراً بھانپ لیا کہ اسلام پر عیسائی یلغار کا اس وقت تک مؤثر مقابلہ نہ ہو سکے گا جب تک پادری فنڈر سے عام مجمع میں فیصلہ کن مناظرہ کر کے عیسائی مذہب کی کمر نہ توڑ دی جائے تاکہ عوام کے دل و دماغ پر خوف و ہراس کے جو بادل چھا گئے ہیں وہ یکسر دور ہو جائیں اور عوام جان لیں کہ برہان اور فرقان کے مقابلے میں عیسائیت کس قدر کمزور ہے۔

شیخ رفاعی خولیؒ کی گواہی...... مؤرخین نے مناظرے کی روداد لفظ بہ لفظ نقل کر دی ہے۔ اللہ نے اپنی مدد خاص سے مولانا اور ان کے معاونین کو غلبہ عطا فرمایا اور تین نشستوں ہی میں عیسائی پادری فنڈر نے روپوشی میں عافیت سمجھی۔

اس مناظرے کی عالمگیر شہرت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ کے شیخ رفاعی خولی تحریر فرماتے ہیں۔ "میں نے اس مناظرے کا حال ان بے شمار لوگوں سے سنا جو اس مناظرے کے بعد حج کے لئے آئے۔ یہاں تک کہ یہ بات تواتر معنوی کی حد تک پہنچ گئی کہ پادری فنڈر اس میں مغلوب ہوا تھا۔" ؎۵

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ مناظرے کی تفصیل اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ حضرت کیرانوی کو اللہ تعالیٰ نے علوم اسلامیہ کے علاوہ دیگر سماوی کتب و مذاہب پر بھی خاصا

؎۵ البحث شریف علی ہامش "اظہار الحق" جلد اول صفحہ ۵ مطبوعہ استنبول۔

عبور عطا فرمایا تھا۔ یہ مناظرہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے تین برس قبل ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں منعقد ہوا تھا۔

فرنگی اقتدار سے ٹکر...... بہت ممکن ہے کہ علماء کی جماعت کو فرنگی اقتدار سے ٹکر لینے میں ان آیات شریفہ میں بہت حوصلے، ہمت اور اجر کا سامان نظر آیا ہو۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَئُوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

(سورۃ التوبۃ : آیت ۱۲۰-۱۲۱)

ترجمہ..... "سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو بھی مصیبت جھیلنی پڑی ہو" پیاس کی، تھکان کی اور بھوک کی۔ اور ان کے قدم اٹھانے سے دشمن جب غصے میں آکر آگ بگولا ہوئے ہوں۔ اور دشمن پر ٹوٹ کر انہوں نے جو کچھ چھینا جھپٹی کی ہو اور ان کی پٹائی کر دی ہو۔ ان سب کاموں پر ان کے نامۂ عمل میں نیکی لکھ لی گئی۔ بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیتا اور اس مہم میں جو کچھ بھی چھوٹا بڑا خرچ انہیں کرنا پڑا، اور جس میدان اور گھاٹی میں انہیں قدم رکھنے پڑے۔ ان سب کاموں کو لکھ لیا گیا۔ تاکہ ان کے ہر اچھے عمل کا بدلہ انہیں دے دیا جائے۔"

تاریخی حقائق......۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی دراصل انگریزوں کے ذریعے اس ملک کے عوام پر سو سالہ راج کے درمیان کئے جانے والے ظلم و تشدد کے خلاف رد عمل کے طور پر نفرت اور بے زاری کا لاوا تھا۔ جو کسی باضابطہ اسکیم کا پابند نہ تھا مگر اچانک پھوٹ پڑا۔ انگریزی فوج میں ہندوستانیوں کی اکثریت تھی جو یکسر باغی ہو گئی۔ جس کی وجہ سے ملک کے عوام کو بھی غلامی سے نجات کی کرن نظر آئی اور نتیجتاً ملک کے مختلف حصوں میں مختلف محاذ قائم ہوئے اور ہر علاقے میں اس جہاد کا ایک امیر مقرر ہوا۔ چنانچہ تھانہ اور کیرانہ کا بھی ایک محاذ بنا اور مجاہدین کی جماعت مدافعت اور مقابلہ کرتی رہی۔

تابناک ستارے...... تھانہ بھون میں حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حافظ ضامنؒ شہید، حضرت مولانا قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی وغیرہم حضرات نے شاملی میں انگریزی فوج پر حملہ کر کے تحصیل شاملی کو فتح کر لیا۔

دوسری طرف کیرانہ اور اس کے گردونواح میں حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب امیر اور چودھری عظیم الدین سپہ سالار تھے اس زمانے میں عصر کی نماز کے بعد مجاہدین کی تنظیم و تربیت کے لئے کیرانہ کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجا کر تا اور اعلان ہوتا۔ "

"ملک خدا کا اور حکم مولوی رحمت اللہ کا۔ "

مشتعل حکمراں کے مقابل استقامت کی چٹان...... کیرانہ کے محاذ پر بظاہر شکست کا امکان نہ تھا مگر بعض "ابن الوقت" ابنائے وطن کی زمانہ سازی 'نیز مخبروں کی سازش نے حالات کا رخ بدل دیا۔ کیرانہ میں انگریز فوج اور توپ خانہ داخل ہوا محلّہ دربار کے دروازے پر توپ خانہ نصب کیا گیا اور محلّہ دربار کا محاصرہ کرنے کے بعد گھر گھر تلاشی لی گئی' اس لئے کہ کسی مخبر نے اطلاع دی تھی کہ مولانا کیرانوی دربار میں روپوش ہیں۔ کیرانہ کے قریب پنجیٹھ مسلمان گوجروں کا گاؤں ہے۔ حضرت مولانا اپنی باقی ماندہ جماعت کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ خود گاؤں کے لوگ مجاہدین کی جماعت میں شامل تھے۔ اسی دوران گورا فوج کا ایک گھڑ سوار دستہ پنجیٹھ کے رخ پر پڑا۔ کیرانہ اور پاس پڑوس کے حالات کی اطلاع حضرت موصوف کو ملتی رہتی۔ چنانچہ گاؤں کے مکھیا کو جب گورا فوج کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے فوراً جماعت کو بکھیر دیا اور مولانا سے درخواست کی کہ آپ "کھرپا" لے کر گھاس کاٹنے کے لئے کھیت میں چلے جائیں۔

مولانا خود فرمایا کرتے کہ "انگریز فوج اسی کھیت کی پگڈنڈی سے گزر رہی تھی جہاں میں گھاس کاٹ رہا تھا اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑاڑ کر کنکریاں میرے جسم پر لگ رہی تھیں اور میں ان کو اپنے پاس سے گزرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ " فوج نے گاؤں کا محاصرہ کیا۔ تلاشی لی مگر مولانا کا پتہ نہ چلنا تھا نہ چلا۔ آپ کے خلاف فوجداری مقدمہ چلا' وارنٹ جاری ہوا اور مفرور باغی قرار دے کر ہزار روپے انعام کا اعلان ہوا۔ حضرت مولانا کی جائیداد ضبط کر کے کوڑیوں کے داموں نیلام کرا دی گئی۔

جسمانی ریاضت...... حضرت کیرانوی پیدل دہلی روانہ ہوئے۔ یہ وقت آپ کے لئے سخت آزمائش کا تھا۔ ایمانی عزم اور ہمت و استقلال کے ساتھ جے پور اور جودھ پور کے

ہیبت ناک جنگلوں کو پاپیادہ عبور کرتے ہوئے بندر گاہ سورت پہنچے۔ سال میں ایک جہاز ہوا کی موافقت کے زمانے میں سورت سے جدہ جایا کرتا تھا۔ اور ہجرت کرنے والا ترک وطن کے ساتھ ہی دنیاوی رشتوں اور تعلقات کو زندگی میں ہی منقطع کر دیتا۔ طویل اور دشوار گزار بری اور بحری سفر کی مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیلتے ہوئے یہ مرد مجاہد اپنی جان پر کھیل کر اس مقدس سرزمین پر وارد ہوا کہ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں "مَنۡ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا" کی بشارت دے رکھی ہے۔

منزل مقصود...... حضرت مولانا حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی مولانا کیرانوی سے پہلے ہی ہجرت فرما کر مکہ معظمہ پہنچ چکے تھے۔ صبح صادق کے قریب رحمت اللہ کیرانوی کی حرم شریف میں حاضری ہوئی اور حضرت مہاجر مکی کے ساتھ طواف قدوم اور سعی فرما کر مولانا مکی کے ڈیرے رباط داؤدیہ پر قیام کیا۔

حضرت کیرانوی رحمتہ اللہ علیہ کا علمی مقام...... شیخ العلماء سید احمد دحلانؒ جو شافعی المسلک تھے، مسجد حرام میں درس دیا کرتے تھے۔ شریف مکہ ان کا بڑا ادب واحترام کیا کرتا۔ ایک دفعہ کسی مجلس درس میں شیخ نے دوران تقریر حنفیہ کے دلائل کو کمزور بتلاتے ہوئے اپنے مسلک کو ترجیح دی۔ مجاہد اسلام رحمت اللہ کیرانوی نے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس مسئلے پر تشفی چاہی۔ تھوڑی سی گفتگو میں شیخ العلماء تاڑ گئے کہ یہ شخص طالب علم نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ العلماء کی دعوت پر حضرت اپنے رفیق مولانا مہاجر مکی کے ہمراہ دوسرے دن شیخ کے گھر مدعو کئے گئے۔

دورانِ گفتگو ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ساتھ عیسائیوں کی سرگرمیوں کے قلعے مسمار کرنے میں اہل ایمان کی شاندار کامیابیوں کا ذکر آگیا۔ شیخ نے اس پر بے حد خوشی کا اظہار فرمایا۔ اور اسی مجلس میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کو مسجد حرام میں باقاعدہ درس کی اجازت دے دی۔ کیرانوی شیخ سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ چنانچہ اپنی تصنیف "اظہار الحق" کے مقدمے میں شیخ احمد دحلان کا تذکرہ بہت ہی محبت اور احترام کے ساتھ فرمایا ہے۔

تمغۂ سلطانی اور اظہار الحق کی تکمیل...... ادھر ہندوستان میں حضرت مولانا کیرانوی کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانے کے بعد پادری فنڈر جرمنی، سوئٹزرلینڈ اور انگلستان ہوتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا اور یہ چرچا مشہور کر دیا کہ ہندوستان میں عیسائیت کی فتح اور اسلام کی

شکست ہو چکی ہے۔ نیز ہندوستانی مسلمان عیسائیت قبول کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں قسطنطنیہ سے سلطان عبدالعزیز خاں مرحوم کا فرمان امیر مکہ شریف عبداللہ پاشا کے نام آیا کہ "حج کے لئے ہندوستان سے جو علماء اور باخبر حضرات آئیں ان سے پادری فنڈر کے مناظرے اور ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے خاص حالات معلوم کر کے ارباب خلافت کو مطلع کیا جائے۔" امیر مکہ نے شیخ العلماء سید احمد دحلان سے اس کا تذکرہ کیا۔ موصوف نے فرمایا "جس عالم سے یہ مناظرہ ہوا ہے وہ خود مکہ مکرمہ میں موجود ہے"۔ بس یہی چیز حضرت کیرانوی کی سلطان کی طرف سے قسطنطنیہ طلبی کا موجب بنی۔ پادری فنڈر کو جونہی کیرانوی کی آمد کی اطلاع ملی وہ قسطنطنیہ سے فرار ہو گیا۔ چنانچہ حکومتِ عثمانیہ نے اس عظیم فتنے کو روکنے کے لئے عیسائی مشنریوں کو مقید کیا اور ان کی کتب پر پابندی کے علاوہ سخت احکامات جاری فرمائے۔

۱۸۶۴ء میں حضرت رحمت اللہ کیرانوی کی قسطنطنیہ میں شاہی مہمان کی حیثیت سے حاضری ہوئی۔ اکثر بعد نماز عشاء سلطان عبدالعزیز خاں حضرت کیرانوی کو شرف باریابی عطا فرماتے۔ علماء اور وزراء کی مجلس میں حضرت سے تفصیلی گفتگو ہوتی۔ سلطان مرحوم نے حضرت مولانا کی جلیل القدر دینی خدمات اور مجاہدانہ صفات کی قدر اور ہمت افزائی فرماتے ہوئے زریں خلعت کے ساتھ تمغۂ مجیدی دوم اور گراں قدر ماہانہ وظیفہ سے سرفراز فرمایا۔

سلطان کی خواہش پر حضرت نے "اظہار الحق" ۱۲۸۰ھ میں چھ ماہ کی مختصر مدت میں تصنیف فرما کر سلطان کی خدمت میں پیش فرمائی۔

قسطنطنیہ سے حجاز مقدس واپسی پر حضرت کیرانوی نے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں کے مروجہ طریقۂ درس و تدریس میں بقدرِ ضرورت ترمیم و اصلاح فرمائی۔ پھر بھی اطمینان نہ ہوا تو یہ طے کیا کہ یہاں ایک ایسے دار العلوم کا سنگ بنیاد رکھا جائے جو خانۂ کعبہ کی مرکزیت کے شایانِ شان ہو۔ دنیا کی مختلف زبانیں جاننے والے علماء اس مدرسے کے مدرس ہوں اور ایک ایسا نصابِ تعلیم ہو جو بیک وقت دینی اور دنیوی ضروریات کو پورا کرتا ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ تقاضا غالب ہوا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مٹی ہوئی دینی درسگاہ کا سرزمینِ حرم پر دوبارہ قیام ہو۔ چنانچہ مکہ معظمہ کے اس پہلے مدرسے کی پہلی تاریخی اور بنیادی اپیل کچھ اس طرح ہے۔

"حمد و نعت کے بعد عرض ہے کہ اکثر اہل توفیق ہندیوں کی ہمت سے حرمین شریفین زادھما اللہ شرفاً بعض بعض خیر کے کام مثلاً رباطیں اور سبیلیں تیار ہو گئی ہیں۔ پر اب

تک کوئی مدرسہ ان کی طرف سے یہاں نہیں ہے۔ اور کاموں سے بھی یہ کام بڑا خیر کا کام ہے۔"

مدرسۂ صولتیہ کی تاسیس...... رمضان المبارک ۱۲۹۰ھ کی اس اپیل پر جہاں اور لوگوں نے لبیک کہہ کر ماہانہ چندہ دینا شروع کیا ان کا ذکر تو الگ ہے۔ مگر کلکتہ کی ایک اولوالعزم خاتون "صولت النساء بیگم صاحبہ" کے حصے میں اللہ تعالیٰ نے مدرسۂ صولتیہ کی تاسیس مقدر فرمادی۔ اس شریف بیوہ خاتون کے ہمراہ ان کی بیٹی اور داماد بھی عازم حج بن کر مکہ مکرمہ وارد ہوئے۔ موصوفہ کے داماد اکثر مسجد حرم میں حضرت مولانا کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے۔ ہر نیک دل اور صاحب حیثیت مسلمان کی یہ دلی خواہش ہوتی کہ وہ حرمین شریفین میں مسلمانوں کی رفاہ عام کا کوئی نیک کام کر کے صدقہ جاریہ کا ذریعہ چھوڑ جائے۔ بس یہی جوش اور جذبہ اس نیک دل خاتون کے سینے میں موجزن تھا' جس کا اظہار جب ان کے داماد نے حضرت کیرانوی سے فرمایا تو آپ نے جواب دیا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں رباطوں اور مسافر خانوں کی کمی نہیں ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت ایک مدرسے کی ہے۔ مکہ مکرمہ میں کوئی مستقل مدرسہ نہیں ہے۔ مشیت ایزدی اور علم الٰہی میں یہ سعادت اور فخر اس بیوہ خاتون کا حصہ تھا۔ اس لئے مجاہد کبیر حضرت کیرانوی نے ان کے اس ایثار کی بہترین یادگار کی نشانی کے طور پر مرکز اسلام کی اس اولین دینی درس گاہ کا نام "مدرسہ" صولتیہ" رکھا۔ شعبان ۱۲۹۱ھ میں مدرسہ وجود میں آیا اور ابتدائی مشکلات اور رکاوٹیں جو ہر نیک کام میں کسی نہ کسی درجے میں مانع ہوتی ہیں' ان سے نمٹنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانوی کے خلوص اور استقلال کو قبول فرماتے ہوئے آئندہ کے لئے راستہ صاف فرمادیا۔

مجاہدِ کبیر کی زریں اصلاحات...... مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران حضرت رحمت اللہ کیرانوی نے وہاں کی بہت سی سماجی اور معاشی اصلاحات میں حصہ لیا۔ مثلاً

(۱) دینی تعلیم کا ایک خاص نہج و نظم قائم فرمایا اور مکہ مکرمہ میں باضابطہ دینی تعلیم کی طرح ڈالی۔

(۲) جب عثمان نوری پاشا نے سلطان عبدالحمید کی اجازت سے صحن حرم میں اپنے شاہی کتب خانے کو حجاج کی سہولت کے پیش نظر منہدم کرایا تو حضرت مولانا نے اس کے ملبے سے مدرسۂ صولتیہ کے قریب ایک مسجد تعمیر کروائی جس کا تاریخی نام "خانۂ رحمت" ہے' جو آج تک وہاں موجود ہے۔

(۳) مدرسۂ صولتیہ کے طرز پر حجاز مقدس میں دیگر مدارس قائم کئے۔

(۴) حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں مکہ مکرمہ میں ڈاک کی تقسیم کا نہ تو مستقل نظام تھا اور نہ ہی ڈاک خانہ تھا۔ مولانا نے اس سلسلے میں کوشش فرمائی۔ جس کو مولانا کے بعد مولانا محمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جاری رکھا اور سلطان عبدالحمید کو متوجہ فرما کر باب الوداع پر ڈاک خانہ تعمیر کروایا۔

(۵) "نہر زبیدہ" جو گردشِ ایام کی بدولت قابلِ مرمت ہو چکی تھی اور جس کی وجہ سے ساکنانِ حرم کو پانی کی دقت تھی۔ اس کی مرمت کا بیڑا اس جانباز مرد مجاہد کے ساتھ چند اہل خیر حضرات نے اٹھایا اور اس طرح حضرت مولانا اور ان کے رفقاء کی کوششوں سے نہر زبیدہ کا صدقۂ جاریہ دوبارہ جاری ہوا۔

جلیل القدر تصانیف...... حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف زیادہ تر رد عیسائیت کے موضوع پر ہیں۔ جیسے۔

(۱) ازالۃ الاوھام۔ اس کتاب کی تالیف چل رہی تھی کہ حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سخت بیمار ہوئے۔ یہاں یہ ذکر بے جانہ ہو گا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خواب میں تشریف لا کر بشارت دی کہ اگر "ازالۃ الاوھام" مرض کی وجہ ہے تو وہی باعثِ شفاء ہو گی۔

(۲) ازالۃ الشکوک (۳) اعجازِ عیسوی

(۴) اوضح الاحادیث (۵) بروق لامعہ

(۶) معدل اعوجاج المیزان (۷) تقلیب المطاعن

(۸) معیار التحقیق [1]

بے چین روح...... مدرسۂ صولتیہ کے قیام کے بعد حضرت مولانا کے قسطنطنیہ کے دو مزید سفر سلطان عبدالحمید خاں کی دعوت اور خواہش پر ہوئے۔ تیسرا اور آخری سفر تو سلطان نے حضرت کی آنکھوں کے علاج اور آپریشن کی غرض سے کروایا۔ نیز اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ آپ مستقلاً سلطان کی مصاحبت میں یہیں شاہی محل میں قیام فرمائیں۔ لیکن

---

[1] تصانیف کی فہرست فرنگیوں کا جال۔ از جناب امداد صابری صفحہ ۲۳۷ - ۲۳۸ نیز ایک "مجاہد معمار" صفحہ ۲۷ - ۲۸ سے ماخوذ ہے......

زت کیرانوی رحمتہ اللہ علیہ کے اس جواب نے سلطان کو لاجواب کر دیا کہ "اعزاء اور
رب کو چھوڑ کر ترک وطن کر کے خدا کی پناہ میں اس کے دروازے پر آکر پڑا ہوں۔ وہی
ج رکھنے والا ہے۔ آخری وقت میں امیرالمومنین کے دروازے پر مروں تو قیامت کے دن
ر کو کیا منہ دکھاؤں گا"۔

حجابات اٹھ گئے...... اللہ کی قدرت کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کیرانوی رحمتہ اللہ علیہ
ے اس قول کو قبول فرمالیا۔ چنانچہ اسلام کا یہ سچا سپہ سالار جید عالم دین مجاہد فی سبیل اللہ ۷۵
ل کی عمر میں ۲۲ رمضان المبارک ۱۳۰۸ھ میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اور جنت المعلی
ں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے جوار میں صدیقین و شہداء کے زمرہ میں مدفون
ا۔

||

رفقاءِ تنظیم اسلامی کے لیے

مجوّزہ تربیتی و تنظیمی نصاب کا مختصر خاکہ

کچھ عرصہ سے تنظیم اسلامی کے رفقاء کے لئے کسی ایسے تربیتی نصاب کی ضرورت کا احساس شدت سے محسوس ہو رہا تھا جس کے ذریعے رفقاء اوّلاً تنظیم اسلامی کے مقاصد سے روشناس ہوں اور طریقِ کار کے بارے میں انشراحِ صدر حاصل کریں اس کے بعد بتدریج ان مقاصد کے حصول کی طرف پیش قدمی کرتے چلے جائیں۔ زیرِ نظر نصاب اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔ اس کے تین مراحل ہیں:

۱۔ برائے رفیق مبتدی۔ تنظیم اسلامی کی رفاقت کا آغاز تنظیم اسلامی کے مقاصد کے تعارف اور ان کے حصول کی خاطر بیعتِ جہاد سے ہوتا ہے۔ رفیق مبتدی کی اوّلین ضرورت یہ ہے کہ وہ تنظیم اسلامی کے مشن کی تفصیلات کو پوری طرح سمجھے۔ نظم کی اہمیت اور جماعتی زندگی کے تقاضوں کا شعور حاصل کرے۔ رفقائے تنظیم سے ربط و ضبط رکھے۔ اپنے اوقات اور وسائل اسی مقصد میں لگانے کی امنگ سے سرشار ہو۔ عبادات میں ذوق و شوق اور اہتمام کی کیفیت نصیب ہو۔ وہ خود جس کو حق سمجھ چکا ہے اس پر پوری دلجمعی سے عمل پیرا ہو۔

۲۔ برائے رفیق منتظم (حصہ اوّل) ابتدائی مرحلہ کے بعد اب ایک رفیق منتظم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام متذکرہ بالا پہلوؤں کے اعتبار سے ایک بلند تر مقام پر ہو۔ دین کے فہم میں اسے مزید گہرائی حاصل ہو۔ نظم و ضبط کا خوگر ہو اور جماعتی ضروریات کے لئے اوقات و وسائل زیادہ لگائے۔ عبادات کا ذوق و شوق اور اہتمام ترقی کرے جس حق پر خود عمل کر رہا ہے اس کی دعوت و تبلیغ کرے۔ اس طرح اس کے گرد و پیش ایک کشمکش کی فضا قائم ہو گی جس میں صبر و استقامت سے وہ عملی تربیت حاصل کرے گا۔

۳۔ برائے رفیق منتظم (حصہ دوم)۔ اس مرحلہ میں پیشِ نظر یہ ہے کہ متذکرہ بالا تعلیمی و عملی مشاغل ایک رفیق کے معمولات کا حصہ اور زندگی کا جزوِ لاینفک بن جائیں۔ عبادات اور اتباعِ سنت میں مزید اہتمام کے ساتھ غیر اسلامی اعمال و رسوم سے اعلانِ برأت کرے۔ اپنی زندگی سے تمام منکرات اور محرمات

کو خارج کرے اور اسی کی دعوت معاشرے میں شد و مد سے پیش کرے۔

تربیتی نصاب کے ایک مرحلہ سے گذرنے کے لئے ایک اوسط درجہ کے رفیق کو چھ ماہ لگ سکتے ہیں۔ صلاحیت و استعداد اور عزم و ارادہ کے مطابق یہ عرصہ کم و بیش ہو سکتا ہے۔ اس نصاب کی بنیاد پر رفقاء کی درجہ بندی کی جائے گی اور اس سے بطریق احسن گذرنے پر اس شدہ رفقاء کو ذمہ داریاں تفویض کی جائیں گی۔ ان تربیتی مراحل کے دوران اور بعد میں بھی رفقاء کی پیش رفت۔ صلاحیتوں اور تفریغ اوقات کی بنیاد پر وقتاً فوقتاً ایسے پروگرام ترتیب دیے جاتے رہیں گے جن میں رفقاء کے علمی اور عملی ارتقاء کا یہ سلسلہ جاری رہے۔

تربیتی و تنظیمی نصاب برائے رفیق مبتدی

۱۔ نماز پنجگانہ کی باجماعت ادائیگی کا اہتمام۔

۲۔ قرآن مجید کی صحیح تلاوت کے لئے محنت۔ اگر ناظرہ نہیں پڑھا تو اس کا اہتمام۔

۳۔ تلاوت قرآن مجید ــــــ بلاناغہ ایک مقررہ نصاب کے مطابق مثلاً ربع پارہ یا کم و بیش۔

۴۔ اپنی وضع قطع اور دیگر معاملات میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا التزام۔ مثلاً داڑھی۔ لباس (پاجامہ ٹخنوں سے اوپر) وغیرہ۔

۵۔ مطالعہ لٹریچر:

(i) تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد اور دوسری دینی جماعتوں سے مابہ الامتیاز۔

(ii) امیر تنظیم اسلامی کا سوانحی خاکہ ــــــ خانگی و معاشی حالات۔

(iii) فرائض دینی کا جامع تصور۔

(iv) مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق۔

(v) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں۔

(vi) اشاعت خصوصی "میثاق" بموقع سالانہ اجتماع ۸۸ء (خلاصہ روداد تنظیم اسلامی)

(vii) ماہنامہ میثاق

۶۔ مندرجہ ذیل کیسٹس کے ذریعے مضامین کی تفہیم

(i) حقیقتِ جہاد (کیسٹ نمبر ۱۱۴، ۱۱۵)

(ii) تقرب الٰہی بذریعہ فرائض و نوافل ۔ (کیسٹ نمبر ۸۲، ۸۲)
(iii) اسلامی انقلاب کے مراحل ۔
(iv) اسلامی تحریک کے کارکنوں کے اوصاف ۔ (کیسٹ نمبر ۲۰۰)

۷ ۔ مندرجہ ذیل اجتماعات میں شرکت کی پابندی کرے ۔

(i) ہفتہ وار درس قرآن ۔
(ii) ہفتہ وار اجتماع اسرہ ۔
(iii) مرکزی یا علاقائی مرکز میں ششماہی سہ روزہ اجتماع ۔

منفرد رفقاء کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ مرکز / علاقائی مرکز سے ہفتہ وار تحریری رابطہ رکھیں ۔ یا ماہانہ ایک دفعہ ملاقات کے لئے تشریف لائیں ۔ اور ششماہی سہ روزہ اجتماع میں شریک ہوں

۸ ۔ تفریغ اوقات (ترغیب و تشویق)

مقامی یا علاقائی سطح پر ترتیب دیئے ہوئے دعوتی پروگراموں میں ماہانہ دو دن کے لئے شرکت کی کوشش کرے ۔

۹ ۔ تعمیر سیرت و کردار اور تقرب الٰہی کی شعوری کوشش کے لئے درج ذیل اہتمام کرے ۔

(i) باطنی بیماریوں مثلاً تکبر ۔ حسد ۔ تعصب ۔ غیبت ۔ بیجا غصہ سے اجتناب کے لئے وقتاً فوقتاً اپنا خصوصی جائزہ لیتا رہے ۔
(ii) اذکار مسنونہ مثلاً خصوصی اوقات میں درود شریف ' استغفار اور تیسرے کلمہ کا ورد ۔
(iii) ادعیہ ماثورہ کا اہتمام ۔ مثلاً مسجد میں داخل ہونے اور نکلنے کی دعائیں ۔ کھانا کھانے اور کھانے سے فارغ ہونے کی دعائیں ۔ سونے اور سو کر اٹھنے کی دعائیں ۔ بیت الخلاء جانے اور نکلنے کی دعائیں ۔ سفر پر روانگی کی دعا —— یہ دعائیں معمولات کا حصہ بن جانی چاہئیں ۔

۱۰ ۔ ماہانہ اعانت کی ادائیگی کا اہتمام ۔

تربیتی تنظیمی نصاب برائے رفیق مبتدی کے ضمن میں بعض وضاحتیں

۱ ۔ تمام رفقائے تنظیم اسلامی کو اس نصاب سے باقاعدہ گزرنا چاہیے ۔ ابتدأ رفقاء کے مابین

کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہے ۔

۲ ۔ ایک اوسط درجہ کے رفیق کے لئے اس نصاب سے گزرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کا اندازہ کیا گیا ہے۔ لیکن صلاحیت و استعداد اور عزم و ارادہ کے مطابق اس عرصہ میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ پرانے رفقاء کے لئے یہ بالکل آسان اور پہلے سے معمولات کا حصہ محسوس ہوگا۔ تاہم اس نصاب سے شعوری طور پر دوبارہ گزرنا اور تفصیلات کو از سرِ نو ذہن میں تازہ کرنا انتہائی مفید ہوگا۔ ان شاء اللہ العزیز وہ ایک ماہ کے دوران ہی اس کو کما حقہٗ عبور کر سکیں گے۔ جو رفقاء سنجیدگی سے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش نہیں کریں گے وہ سالہا سال اسی نصاب میں گزاریں گے۔

۳ ۔ قرآن مجید کی صحیح تلاوت سے یہاں مراد یہ نہیں ہے کہ تجوید و قرأت کے تمام قواعد و ضوابط کو ملحوظ خاطر رکھا جائے ۔ بلکہ فی الحال یہ موٹی موٹی غلطیوں (لحن جلی) سے پاک ہو یعنی زیر زبر پیش جزم تشدید کا خیال رکھنا ۔ قرآن مجید کے الفاظ کو چھوٹا یا بڑا کر کے نہ پڑھا جائے بعض حروف کا مخرج اگر صحیح نہ ہو تو عبارت کا مفہوم بدل سکتا ہے۔ مثلاً ق اور ک ۔ ت اور ط ___ ان سے واقفیت حاصل کی جائے ۔ اور صحیح پڑھا جائے ۔

۴ ۔ مطالعہ لٹریچر کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہے کہ تنظیم اسلامی کے قیام کا مقصد اور دوسری دینی جماعتوں سے مابہ الامتیاز اور امیر محترم کے سوانحی خاکہ کے موضوعات پر معلوماتی کتابچے مرتب کئے جا رہے ہیں۔ ان کا مطالعہ مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ بقیہ مجوزہ کتابچے ہمارے لٹریچر کا مستقل حصہ ہیں اور مہیا ہو سکتے ہیں ۔ ان کا مطالعہ مشکل نہیں ۔ ہر جگہ ایسے لوگ موجود ہیں جو سالہا سال سے ان موضوعات پر امیر محترم کے طویل خطابات سنتے رہے ہیں ۔ مقامی طور پر ایسے گروپ بنائے جا سکتے ہیں جن میں پرانے باصلاحیت رفقاء اجتماعی مطالعہ کروائیں ۔ علاوہ ازیں ان موضوعات پر سوالنامے بھی تیار کئے جائیں گے جن کی مدد سے ان مضامین کو سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ اس کے باوجود اگر مشکلات درپیش ہوں گی تو ان کا حل بھی تلاش کر لیا جائے گا ۔

۵ ۔ اس نصاب میں شامل کیسٹس کے بارے میں ایسا نظام وضع کیا جائے گا جس سے تمام رفقاء ان کیسٹس سے استفادہ کر سکیں ۔ ان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے کتابچوں کی شکل میں مرتب بھی کیا جا رہا ہے ۔ ان موضوعات پر سوالنامے بھی تیار کئے جا رہے ہیں ۔

(باقی ص۹۶ پر)

رفتارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا سہ روزہ دورہ کوئٹہ

مرتب: سید برہان علی

۱۵ر جون ۱۹۸۸ء کا دن رفقائے تنظیم اسلامی کوئٹہ کے لئے انتہائی پُر مسرت اور خوش آئند تھا کہ تقریباً ڈھائی سال کے وقفہ کے بعد امیر محترم کوئٹہ تشریف لانے والے تھے۔ اگرچہ ماضی میں امیر محترم ہر سال کم از کم ایک یا دو مرتبہ کوئٹہ کا دورہ فرماتے رہے تھے۔ لیکن گزشتہ دنوں آپ کی خرابیٔ صحت اور بعض دیگر ناگزیر معروفیات و حالات کی وجہ سے وقفہ طویل ہو گیا۔ امیر محترم کو خود بھی اس امر کا شدت کے ساتھ احساس تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے یہ قرض چکانے کی خاطر رفقائے کوئٹہ کے اصرار پر تین روز کی معروفیات صرف کوئٹہ کے لئے وقف فرما دیں جس کے لئے ہم ان کے انتہائی شکر گزار ہیں۔ امیر محترم کا یہ دورہ راقم الحروف نے لاہور میں مشاورت کے موقع پر ۲۳ر جون کو طے کیا تھا۔ اور فوری طور پر اس کی اطلاع کوئٹہ کے رفقاء کو کر دی تھی۔ انتظامات کے لئے چونکہ وقت محدود تھا۔ لٰہذا رفقاء اطلاع ملتے ہی اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔

مشورہ میں یہ طے کیا گیا کہ اس مرتبہ پوسٹر نہ لگائے جائیں۔ کیونکہ کچھ احباب کا خیال تھا کہ یہ ایک غیر اخلاقی حرکت ہوتی ہے جس پر لوگ بہت برا مناتے ہیں۔ لٰہذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ماضی کے برعکس اس مرتبہ کپڑے کے بینرز پر زیادہ توجہ دی جائے۔ نیز امیر محترم کے دورہ کی تشہیر کے لئے اخبارات اور لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ اعلانات سے زیادہ تر مدد لی جائے۔ چنانچہ پروگرام کے لئے کثیر تعداد میں بینرز تیار کرا کر نمایاں مقامات پر لگائے گئے۔ اور تین روز تک لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ شہر میں اعلانات کرائے گئے۔ علاوہ ازیں تاریخ مقررہ سے دس روز قبل سے وقفہ وقفہ کے ساتھ اخبار میں امیر محترم کے دورہ کا پروگرام خبر کے طور پر دیا گیا۔ ماضی میں امیر محترم کے پروگرام خواہ وہ دو دن کا ہو یا تین دن کا مسجد طوبیٰ میں ہوا کرتے تھے لیکن اس مرتبہ اُس ڈگر سے ہٹ کر مختلف مقامات پر پروگرام ترتیب دیئے گئے۔

بہرحال آمدم بر سر مطلب امیر محترم مورخہ ۱۵ر جون ۱۹۸۸ء بروز بدھ تقریباً دو بجے کوئٹہ

پہنچ گئے۔ قیام و طعام کی سعادت تنظیم اسلامی کوئٹہ کے امیر جناب اکرام الحق کے حصہ میں آئی۔ ان کا گھر شہر کے بالکل وسط میں ہے۔ انہوں نے بڑے ایثار کے جذبہ کے تحت اپنے تمام اہل خانہ کو گھر کی اوپر کی منزل میں منتقل کر دیا اور نچلا حصہ ہمہ وقت تا اختتام پروگرام تنظیمی مقاصد کے لئے وقف کر دیا۔ اس سلسلہ میں جو زحمت اکرام الحق صاحب کے اہل خانہ کو اٹھانی پڑی اور جس طرح کہ انہوں نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے۔ اُس کے لئے ہم اُن سب کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں اور دعا ہے کہ رب العزت انکو اسکا زیادہ سے زیادہ اجر عطا فرمائے۔ امیر محترم نے کوئٹہ پہنچنے کے بعد کچھ دیر آرام فرمایا۔ شام ۵ بجے تمام رفقاء امیر محترم سے ملاقات کی خاطر جمع ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کچھ وقت آپ کی صحبت میں گزارا۔ بعد ازاں نماز عصر ادا کی اور تمام رفقاء اپنے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے روانہ ہوئے۔

بدھ یعنی ۱۵ر جون کو امیرِ محترم کو جامع مسجد جیل روڈ۔ ہدّہ میں " دینی فرائض کے جامع تصور " کے موضوع پر بعد نماز مغرب خطاب فرمانا تھا۔ ہدہ کا علاقہ آج سے کچھ عرصہ قبل کوئٹہ کا مضافاتی علاقہ تصور ہوتا تھا۔ اور یہاں کی آبادی نسبتاً کم تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن کوئٹہ شہر کے پھیلاؤ کے نتیجہ میں نہ یہ اب مضافاتی بستی ہے اور نہ ہی کم تعلیم یافتہ افراد کا مسکن' بلکہ اب یہ کوئٹہ شہر کا ہی ایک گنجان آبادی والا حصہ ہے اور یہاں کے باسی زیور تعلیم سے آراستہ ہیں۔ مذکورہ مسجد اس علاقہ کی سب سے بڑی اور انتہائی خوبصورت اور دیدہ زیب جامع مسجد ہے۔ امیر محترم کا اس مسجد میں خطاب نہایت مدلل تھا جس کو سامعین کی کثیر تعداد نے سنا اور بہت متاثر ہوئے۔ اگرچہ اُسی روز صدر مملکت کی نفاذِ شریعت کے سلسلہ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تقریر کا اعلان ہو چکا تھا اور تقریر کا وقت بھی تقریباً وہی تھا جو ہمارے پروگرام کا تھا۔ خیال تھا کہ اُس کی وجہ سے ہمارا پروگرام بہت زیادہ متاثر ہو گا۔ اور ہوا بھی 'لیکن شرکاء کی تعداد کو دیکھ کر وہ احساسِ خوف جاتا رہا جو کہ قبل از پروگرام باعث پریشانی تھا اس بات کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گی جو اس پروگرام کی کامیابی کے ضمن میں بھرپور تعاون اور کوششیں مسجد کی انتظامیہ نے کیں اور خصوصی طور پر مسجد کے خطیب مولانا رحمت اللہ خان صاحب نے۔ ہمارے رفقاء سے بھی زیادہ انہوں نے بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ پروگرام کے دوران انہوں نے بجلی کا ڈبل فیز کنکشن لیا۔ تاکہ لوڈشیڈنگ کی صورت میں پروگرام متاثر نہ ہو۔ اس سلسلہ میں ہم اُن کے انتہائی شکر گزار اور ممنون ہیں اور اللہ تعالیٰ سے اُن کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ تعاون علی البر و التقویٰ کے ضمن میں ان حضرات نے جو کاوشیں کیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کو قبول فرمائے۔ آمین۔

امیر محترم کے دورۂ کوئٹہ کی خبر جس روز اخبار میں شائع ہوئی تو NIPA کے ادارہ کے
سربراہ نے تنظیم سے رابطہ قائم کر کے بڑی شدومد کے ساتھ خواہش ظاہر کی کہ ان کے ادارہ
میں امیر محترم کا ایک لیکچر ترتیب دیا جائے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ لیکچر بدھ کے روز ہی ہونا
چاہئے کیونکہ کورس میں شامل افسران کی بروز جمعرات صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد کے لئے
روانگی ہے۔ باہمی گفت وشنید کے بعد راقم الحروف نے ان کا پروگرام بروز جمعرات صبح سوا آٹھ
بجے طے کر کے امیر محترم کو مطلع کر دیا تھا۔ چونکہ فلائٹ کا وقت سوا گیارہ بجے تھا۔ لہٰذا
پروگرام کا وقت ۸ بجے مقرر کرنے سے ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت بخوبی نکل آیا۔ چنانچہ امیر محترم نے
ٹھیک سوا آٹھ بجے اپنے لیکچر کا آغاز فرمایا جو کہ ادارہ کی طرف سے ہی دیئے گئے موضوع پر تھا۔
بعد ازاں آپ نے شرکاء کے سوالات کے سیر حاصل جوابات دیئے۔

'NIPA' سے فارغ ہونے کے بعد امیر محترم بغرض ملاقات و عیادت رفیق محترم جناب
چودھری محمد یوسف صاحب کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ موصوف امیر محترم کے سابقہ
میزبان ہیں۔ گزشتہ سالوں کے دوروں کے دوران امیر محترم کا قیام اُن کے ہاں ہی ہوتا تھا۔
چند ماہ پیشتر ایک ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں ان کی ٹانگ پر شدید چوٹیں آئیں جس کی وجہ سے وہ
تاحال صاحب فراش ہیں۔ آپ انتہائی خوش اخلاق' ملنسار اور شفیق و خداترس انسان ہیں۔
حکومت بلوچستان میں اہم ذمہ داریوں' بہ شمول ایڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر فائز رہ چکے ہیں
اور حال ہی میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ اور سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے
کہ موجودہ دورہ کے دوران سالار قافلہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر تنظیم اسلامی کوئٹہ کے ننھے
سے قافلہ میں اقامتِ دین کی کٹھن اور پر صعوبت راہوں میں جان' مال' اوقات کھپانے کے
لئے شامل ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو استقامت عطا فرمائے۔ آمین۔

کوئٹہ تنظیم کے رفقاء کی شدید خواہش تھی کہ کسی طرح امیر محترم کا ایک پروگرام گورنمنٹ
سائنس کالج آڈیٹوریم میں طے پا جائے۔ یہ ایک بہت اچھا ہال ہے۔ شہر کے وسط میں واقع
ہے۔ اس ہال میں ادارہ منہاج القرآن کے زیر اہتمام ڈاکٹر طاہر القادری کا باقاعدہ درس ہوتا
ہے جو پہلے ہر ماہ اور آج کل دو ماہ میں ایک مرتبہ ہوتا ہے۔ ہم نے جب اپنے طور پر امیر محترم
کے پروگرام کے لئے اس کے حصول کی کوشش کی تو ناکامی ہوئی۔ لیکن چودھری محمد یوسف
صاحب' جن کا ذکر ابھی اوپر ہوا ہے' نے سیکرٹری محکمہ تعلیم سے اس کی منظوری حاصل کر لی۔
جس کے لئے ہم سب لوگ اُن کے انتہائی شکر گزار و ممنونِ احسان ہیں۔

گیارہ بجے امیر محترم چودھری صاحب کی رہائش گاہ سے واپس اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے
جہاں تمام رفقاء جمع تھے جنہوں نے امیر محترم کی معیت میں ایک بجے تک کا وقت گزارا۔ امیر
محترم نے تنظیمی امور و نظم کی پابندی کی اہمیت پر گفتگو فرمائی اور رفقاء کو تلقین فرمائی کہ وہ ذہنی
پابندی و فرائض کی ادائیگی کے جذبہ کے تحت اپنے اوقات دعوت دین کے لئے صرف کریں
اور اس سلسلہ میں ہرگز تساہل سے کام نہ لیں۔ نیز نظم کی پابندی کو اپنا شعار بنائیں۔ بعد ازاں
نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد امیر محترم نے رفیق محترم خاور قیوم صاحب کے دولت خانہ پر
ماحضر تناول فرمایا۔ اگرچہ امیر محترم نے اس کو پسند نہیں فرمایا۔ آپ کی خواہش تھی کہ تمام
رفقاء کے ساتھ بیٹھ کر ہی کھانا کھایا جائے۔ لیکن چونکہ خاور صاحب پہلے سے اس کا انتظام کر
چکے تھے۔ لہٰذا بادل ناخواستہ امیر محترم ان کی رہائش گاہ پر تشریف لے گئے۔ شام ۵ بجے کے
بعد دوبارہ رفقاء نے امیر محترم سے ملاقات کی اور اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر روانہ ہو گئے۔ سائنس کالج
آڈیٹوریم کے خطاب کے لئے تمام رفقاء نے خصوصی سرگرمی کے ساتھ کام کیا۔ مذکور
آڈیٹوریم کو بینرز، جس میں تنظیم کی دعوت اور مختلف آیات قرآنی واحادیث کے بینرز تھے
رکھا تھا۔ نیز پلے کارڈز جو اس موقع پر تیار کئے گئے تھے، جا بجا لگائے گئے تھے۔ نیز کالج کے
احاطہ میں نماز مغرب اور نماز عشاء کی جماعت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ بعد نماز مغرب امیر محترم
نے خطاب کا آغاز فرمایا۔ آپ نے سورۃ المدثر کی ابتدائی تین آیات اور سورۃ الضحیٰ کی آیات
کے حوالہ سے سیرت نبوی کی روشنی میں اقامت دین کی جدوجہد کے طریقہ کار کی بھرپور
وضاحت فرمائی۔ سامعین کی خاصی تعداد (تقریباً چار صد سے زائد) موجود تھی جنہوں نے بڑی
دلچسپی اور انہماک کے ساتھ خطاب سنا۔ امیر محترم نے واضح اور دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ دین
الٰہی کے نفاذ کی کوششیں صرف اور صرف اُسی صورت میں بار آور ہو سکتی ہیں جب کہ سیرت کی
روشنی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق کار کی پیروی کی جائے۔ کچھ حضرات نے
خطاب کے دوران سوالات بھیجے جن کا جواب آپ نے خطاب مکمل کرنے کے بعد دیا۔ نماز
عشاء کے ساتھ ہی ساتھ اس محفل کا اختتام ہوا۔

جمعرات کی طرح جمعہ کے روز بھی امیر محترم کی مصروفیات بھرپور رہیں کیونکہ اس دن بھی
امیر محترم کے دو خطابات تھے ایک خطاب جمعہ اور دوسرا حسب معمول بعد نماز مغرب۔ خطاب
جمعہ کے لئے مسجد طوبیٰ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ تمام رفقاء نے جا کر خود مسجد میں انتظامات کئے
ٹھیک ساڑھے بارہ بجے امیر محترم کا خطاب شروع ہوا۔

جس میں آپ نے سورۃ الجمعہ کے حوالے سے فضائل جمعہ بھی بیان فرمائے نیز سورۃ الصف کے حوالے سے دین حق کے غلبہ کے لئے ایک سمع و طاعت والی جماعت کی ضرورت کی اہمیت بیان فرمائی۔ مسجد میں بھرپور حاضری تھی۔ مسجد سے باہر اطراف کی سڑکوں پر صفیں بچھا کر شامیانے لگائے گئے تھے۔ جہاں بالکل جگہ خالی نہ تھی بعد نماز امیر محترم نے آرام فرمایا اور رفقاء شام کے پروگرام کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ جمعہ کے روز شام کے پروگرام کے لئے کواری روڈ پر واقع مسجد بلال کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس مسجد میں بھی شرکاء کی حاضری بڑی اچھی رہی اور لوگ نہایت ذوق و شوق کے ساتھ امیر محترم کو سننے کے لئے آئے۔ جس بھرپور انداز میں مسجد کی انتظامیہ نے اور خصوصی طور پر مسجد کے خطیب صاحب نیز انتظامیہ کمیٹی کے رکن جناب خوشدل خان نے اس سلسلہ میں جو تعاون فرمایا وہ قابل رشک و تعریف تھا۔ ہم تمام رفقاء کوئٹہ تنظیم تہہ دل سے اُن کے شکر گزار و ممنون احسان ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین کے لئے ان کی پر خلوص کاوشوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور ان کو اجر عظیم سے نوازے۔ آمین۔

امیر محترم نے یہاں پر سورۃ آل عمران کی آیات ۱۰۲ تا ۱۰۴ اور منتخب احادیث کے حوالہ سے مسلمانوں پر واضح فرمایا کہ فلاح پانے کے لئے کیا کچھ کرنا مطلوب ہے۔ نیز غلبۂ دینِ حق کے لئے جدوجہد کن خطوط پر ہونی چاہئے۔ امیر محترم کا خطاب نہایت جامع اور مدلل تھا۔ جس کے اثرات شرکاء کے چہروں سے ظاہر ہو رہے تھے۔ یوں اس پروگرام کے ساتھ ہی جمعہ کے دن کی مصروفیات کا بھی اختتام ہوا۔

چونکہ ہفتہ کے روز امیر محترم نے لاہور واپس روانہ ہونا تھا اور فلائٹ کا وقت ساڑھے گیارہ بجے تھا۔ لہٰذا اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بعد نماز فجر تا ۹ بجے خصوصی ملاقات کی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا تاکہ خطابات کے دوران اگر کوئی اشکال یا سوال پیدا ہوں تو ان کے بارے میں امیر محترم سے دریافت کیا جا سکے۔ بہرحال چونکہ یہ وقت ایسا تھا کہ اکثر و بیشتر لوگوں کے سونے کا وقت تھا۔ لہٰذا اس میں کوئی خاص تعداد میں لوگ شریک نہ ہو سکے۔ البتہ رفقاء تمام موجود تھے اور کچھ لوگ جو اس مقصد کے لئے تشریف لائے تھے۔ امیر محترم نے ان سے تعارف حاصل کیا۔ ان سے گفتگو فرمائی اور ان کے سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا رفقاء کا یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ ایک لمبے عرصے کے بعد ان کو جو قرب اپنے رہبر کے ساتھ حاصل ہوا ہے اب وہ جدائی کے لمحات کی جانب گامزن ہے۔ چنانچہ تقریباً دس بجے تمام رفقاء نے اپنے امیر کو الوداعی سلام کیا اور آپ لاہور روانگی کے لئے عازم ایئرپورٹ

ہوئے۔ ایئرپورٹ پر کوئٹہ تنظیم کے امیر جناب اکرام الحق' رفقائے محترم خاور قیوم صاحب شاہد اسلام صاحب و راقم الحروف نے امیرِ محترم کو خدا حافظ کیا۔

امیر محترم کے دورہ کے دوران کوئٹہ میں رفقاء کی قلیل تعداد نے جس جانفشانی اور لگن کے ساتھ کام کیا' یہ اُن ہی کا حصہ تھا۔ تمام انتظامات انہوں نے بھرپور انداز میں کئے۔ علاوہ ازیں ایک نکتہ جو اوپر تحریر میں نہیں آیا وہ یہ کہ اس دورہ کے لئے خصوصی طور پر پلے کارڈ بنائے گئے تھے جو تنظیم کی دعوت اور پروگرام کی تشہیر کا ذریعہ بھی تھے۔ رفقاء نے شہر کے مختلف حصوں میں پھرائے اس لحاظ سے یہ سب لوگ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ دعا ہے کہ رب العزت ان سب کو دن کا مجاہد اور رات کا راہب بنائے۔ اور صحت و تندرستی سے نوازے۔ آمین۔ یہاں رفیق محترم خاور قیوم صاحب کا ذکر نہ کیا جائے تو یقیناً ناانصافی ہوگی کہ ان کی خوبصورت گاڑی امیر محترم کے لئے ہر وقت "سٹینڈ بائی" (STAND BY) رہی۔ امیر محترم تمام پروگراموں کے لئے ان ہی کی گاڑی میں تشریف لے گئے۔ پٹرول بھی انہوں نے اپنا ہی استعمال کیا اور ڈرائیو بھی خود ہی کی۔ اور یوں رفقاء کو ایک اضافی انتظام سے بچایا۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبہ ایثار و انفاق کو قبول فرمائے اور اُن کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین۔

اور اب آخر میں اس دورہ کا ثمر جو ہمیں نصیب ہوا وہ ہمارے تین قیمتی ساتھی ہیں جنہوں نے انصار اللہ بننے کا فیصلہ فرمایا اور امیر محترم کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر تنظیم اسلامی کوئٹہ کے مختصر سے قافلہ میں گرانقدر اضافہ فرمایا۔

دعا ہے کہ مولائے کریم ان کو ان کے فیصلہ پر ثابت قدم رکھے اور ہمارے لئے تقلید کا باعث ہوں۔ آمین۔

ہمارے سعودی عرب کے رفیق محترم جناب رحمانی صاحب بھی اس دورہ میں امیر محترم کے ہم رکاب تھے۔ کوئٹہ کے قیام کے دوران ان کے ساتھ بڑی قربت رہی ماشاء اللہ تمام رفقاء کے ساتھ فوراً ہی گھل مل گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسوں پرانی شناسائی ہے۔ دینی بھائیوں کا آپس میں میل جول ایسا ہی ہونا چاہئے۔ البتہ ہم ان کی خاطر خواہ مدارت نہ کر سکے جس کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ امید ہے کہ وہ پھر کبھی ہمیں خدمت کا موقع فراہم فرمائیں گے۔

XXXXX

این، آئی، ٹی، یونٹس

سوال :- کسی زمانے میں تحریک اسلامی کے رہنما ..... نے رحیم یار خاں میں فرمایا تھا کہ گورنمنٹ نے ان کو سُود سے پاک کر دیا ہے۔ اب میں آپ سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اس کی وضاحت فرمادیں کہ این آئی ٹی یونٹ کا کام اب بھی سُود سے پاک ہے۔ کیا میں تحریک اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے ان کو خرید سکتا ہوں یا اس میں سُودی کاروبار کا اندیشہ ہے۔

جواب :- آپ کا استفسار دربارۂ خریداری این آئی ٹی یونٹ جناب قاضی حسین احمد صاحب امیر جماعتِ اسلامی کو موصول ہوا تھا جو انہوں نے برائے جواب میرے سپرد فرما دیا تھا۔ اس ادارے کے مختصر مطبوعہ اعلانات اور تعارفی لٹریچر وغیرہ میں یہی درج ہوتا ہے کہ یہ ادارہ سُود سے پاک منافع تقسیم کرتا ہے۔ لیکن اس دعوے کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ اس کی بیلنس شیٹ اور مفصل سالانہ رپورٹ بھی دیکھ لی جائے۔ اس رپورٹ کے حصول میں تاخیر ہو گئی جس کے باعث آپ کے استفسار کا جواب بروقت تحریر نہ ہو سکا۔ اب این، آئی، ٹی کی ۱۹۸۷ء کی سالانہ مطبوعہ رپورٹ دستیاب ہوئی ہے، جس کے مطالعہ سے درج ذیل معلومات فراہم ہوتی ہیں:

۱ـــ اس ادارے میں جمع شدہ سرمایہ کا ۸۳/ا فیصد مختلف بنکوں اور سُودی مالیاتی اداروں (الائیڈ بنک، حبیب بنک، مسلم کمرشل بنک، نیشنل بنک EQUITY PARTICIPATION FUND وغیرہ) کے سُودی حصص کی خریداری میں صرف ہوا ہے اور ان پر متعین فیصد سُود وصول کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا نام منافع رکھ دیا گیا ہے۔

۲ـــ ادارے کے جملہ سرمایہ کے ۲/۳۹ فیصد سے میوچل فنڈ سرٹیفکیٹ خریدے گئے ہیں۔ یہ سرٹیفکیٹ آئی، سی، پی فنڈ کی خریداری میں سرمایہ کاری کے نام پر حاصل ہوتے ہیں، جس میں بنکوں کے سُودی حصص شامل ہیں۔

۳ـــ پی، ٹی، سی (PARTICIPATION TERM CERTIFICATE) کے نام سے سرمایہ کا ۶/۳۳ فیصد پی، ٹی، سی، تمسکات کی خریداری میں لگایا گیا ہے، اگرچہ

میں شراکت یا مضاربت کے شرعی اصول کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سودی اضافے کا فقط نام بدل دیا گیا ہے۔

۴۔ مارک اَپ سسٹم کے تحت سرمایے کا ۲۳/۰۷ فی صد مختلف صنعتی یا کاروباری اداروں میں لگایا گیا ہے۔ مارک اَپ میں جس منافع کا اعلان کیا جاتا ہے اس کے لیے جواز کی دلیل ایک خاص قسم کے معاہدۂ خرید و فروخت سے فراہم کی جاتی ہے جسے فقہی اصطلاح میں بیع المرابحہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مگر مارک اَپ میں صاحبِ مال کو یہ معلوم تک نہیں ہوتا کہ اس کے سرمایے سے کیا چیز کس قیمت پر خریدی اور بیچی جا رہی ہے۔ چہ جائیکہ وہ چیز اس کی ملک یا قبضے میں آئے اور وہ اسے نفع پر فروخت کی اجازت فریقِ ثانی (بنک یا کاروباری ادارے) کو دے۔ یہ ساری کارروائی بالکل جعلی اور فرضی حیلہ بازی ہوتی ہے، جو سود کی حرمت کو حلت میں بدلنے کے لیے کی جاتی ہے۔

۵۔ پی، ٹی سرٹیفکیٹ کی طرح تمسکات کی ایک دوسری قسم ہے جو ٹی، ایف، سی (ٹرم فنانس سرٹیفکیٹ) کے نام سے معروف ہے۔ ان تمسکات میں بھی نام کا فرق ہے ورنہ عملاً اور حقیقتاً ان میں اور سودی لین دین میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ ٹرم فنانس سرٹیفکیٹ کی خریداری میں این آئی، ٹی کا ۹۴/۱ فی صد سرمایہ ۱۹۸۷ء میں لگایا گیا ہے۔

ان جملہ تفصیلات سے یہ امر ثابت ہے کہ این آئی، ٹی کے جمع کردہ سرمایے کا تقریباً ۲۹ فی صد اب بھی سودی کاروبار میں لگایا گیا ہے۔ لہٰذا اس ادارے کا یہ اعلان بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے کہ اس ادارے کی سرمایہ کاری سود سے پاک منافع کی ضامن ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ٹرسٹ کے ڈائریکٹروں کی بڑی تعداد بنکوں اور اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ہے اور ٹرسٹی نیشنل بنک آف پاکستان ہے۔ چنانچہ میری تحقیق کے مطابق اس ادارے کے یونٹ خریدنا شرعاً جائز نہیں۔

اگر ہمارے بعض محترم بزرگوں اور علمائے کرام نے این، آئی، ٹی کے حصص کی خریداری کو جائز کہا تھا تو غالباً اس بنا پر تھا کہ اس ادارے کے منتظمین نے یہ اطمینان دلایا تھا کہ اس ادارے کے کاروبار میں جن سودی اجزا کی نشاندہی کی گئی تھی، ان کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔
(ط - ع)

(بشکریہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" جون ۱۹۸۸ء)

خطوط ونکات

فَاِنْ یَّکْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَکَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّیْسُوْا بِهَا بِکٰفِرِیْنَ

جناب ڈاکٹر اسرار صاحب! السلام علیکم

اللہ کرے آپ کی صحت بہتر ہو۔ میں یہاں ہوسٹن میں پچھلے ۱۲ سال سے رہ رہا ہوں۔ ۲ سال پہلے میرے ایک دوست نے آپ کے کچھ کیسٹ سننے کو دیئے۔ ان کے سننے کے بعد اللہ پاک کا بہت کرم ہے کہ مجھ کو تھوڑا سا دین سے لگاؤ ہو گیا ہے۔ میرا کام اس قسم کا ہے کہ اکثر ۶ گھنٹے دن میں آفس میں آپ کی تقریر سنتا رہتا ہوں۔ میں ایک انجینئرنگ کمپنی کے ساتھ ڈرافٹنگ اینڈ ڈیزائننگ کرتا ہوں۔ اپنے کان میں ہیڈ فون لگا کر آپ کی تقریر باقاعدگی سے سنتا رہتا ہوں۔ میرے پاس آپ کی تقریروں کے تقریباً ۶۰۰ کیسٹ ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے میرے بھائی چار سو کیسٹ پاکستان سے لے کر آئے ہیں۔ اور میرے ایک بھائی پاکستان سے آپ کی تقریر جو کہ آپ جمعہ کو کرتے ہیں بھیج دیا کریں گے۔

یہ خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا جس طرح مجھ میں تھوڑا سا دین کا لگاؤ ہو گیا ہے اسی طرح اگر میں اپنے بھائیوں کو یہ کیسٹ دوں تو شاید ان پر بھی اس کا ضرور اثر ہو گا۔ میرا ارادہ یہ بالکل نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کا کوئی منافع لوں۔ اس سلسلہ میں آپ سے اجازت چاہوں گا اور میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ ایک ہفتہ کے لئے ہوسٹن آئیں۔ میں انشاء اللہ آپ کا سارا انتظام کروں گا۔ آپ نے یہ جو دین کا کام شروع کیا ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دیں۔ آپ نے جیسے گنہگاروں کو سیدھی راہ دکھا دی

بڑی عنایت ہو گی اگر آپ دو لائن لکھ کر مجھے بھیج دیں اور اپنے آنے کے متعلق تائم میں آپ کو ٹکٹ وغیرہ بھیج دوں گا۔ دعا کریں۔ یہ کام جو میں شروع کر رہا ہوں اللہ اس کو کامیاب کرے

آپ کا بیٹا

اعجاز حق

بمبئی (بھارت) میں دعوت رجوع الی القرآن کا تعارف

محترمی مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

السلام علیکم

قبل از رمضان آپ کی خدمت میں ایک خط ادھورے پتہ پر روانہ کیا تھا۔ چونکہ اب تک اس کا جواب نہیں آیا یہی سمجھتا ہوں کہ آپ کو وہ خط نہیں ملا۔ بڑی تلاش وجد وجہد کے بعد ایک کیسٹ پر تنظیم اسلامی کا اور قرآن اکیڈمی کا صحیح پتہ ملا۔ امید ہے ان شاء اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ خط آپ کے ہاتھوں تک پہنچے گا بلکہ اپنے آپ کو پڑھوائے گا بھی۔

گذشتہ ڈیڑھ سال قبل غفلت میں ڈوبی ہوئی امت مسلمہ میں دینی شعور بیدار کرنے کے لئے مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے بمبئی کے مضافات میں اقراء اسلامک لائبریری کی بنیاد ڈالی۔ اس قلیل عرصہ میں ہم اب تک ہزار سے زائد کتابیں جمع کر چکے ہیں۔ نیز ہر سنیچر کو درس قرآن کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اس رمضان سے اسلامک کیسٹ سیریز کا اجراء کیا گیا ہے جس کے لئے ہمیں آپ کی مدد درکار ہے۔

جب سے آپ کے کیسٹ ہم نے سنے ہیں اور لوگوں کو سنوائے ہیں تو بس اب کسی اور کا بیان سننے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔ آپ اس امتِ مسلمہ کے لئے ایک بڑا کام کر رہے ہیں۔ امید ہے آپ اسے جاری رکھیں گے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ آپ کو اجرِ عظیم عطا کرے اور قرآن اکیڈمی کے پروجیکٹ کو کامیاب کرے۔

ہم اپنی لائبریری کے لئے آپ کے وہ تمام کیسٹ اور لٹریچر حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اب تک منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ہم اس کا خرچ برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن شرح تبادلہ کی صورت کیا ہو اور یہ کیسٹ اور لٹریچر بذریعہ پوسٹ بھیجے جائیں گے یا کسی درمیانی واسطے کے معرفت؟۔ ہندوستان کے دور افتادہ آپ کے بھائی آپ کی توجہ اور عنایت کے مستحق ہیں امید ہے آپ ہم سے رابطہ قائم رکھیں گے تاکہ مستقبل قریب میں آپ کے دیگر اسلامی پروجیکٹ اور پروگرام سے ہند کے مسلمان بھی استفادہ کر سکیں۔

وما علینا الا البلاغ

دعاؤں کا طالب

احقر: معین الدین ڈولف

جامعہ اسلامیہ قاسم العلوم میانوالی سے ایک خط

مکرمی جناب ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'۔ امید ہے کہ آپ نے خیریت سے روزے اور تراویح کو احسن طریقہ سے پورا کر کے عید کر لی ہوگی۔ لہٰذا میری طرف سے عید کی مبارک ہو۔

مجھے آپ کو ڈاکٹر لکھنے سے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے اس لئے کہ آپ کی شخصیت اس سے واضح نہیں ہوتی۔ صحیح وصف وہی ہوتا ہے جس سے موصوف کی صحیح طریقہ سے وضاحت ہو سکے۔ اس لئے میرے لئے آپ کا جامع وصف مفکرِ قرآن ہی ہو سکتا ہے۔ چونکہ عوام میں آپ ڈاکٹر کے تخلص سے پہچانے جاتے ہیں اس لئے میں نے بھی آپ کو ڈاکٹر صاحب کے وصف سے مخاطب کیا ہے۔ مجھے آپ کے کام سے پورا اتفاق ہے کہ جب تک قوم قرآن کریم کے قریب نہ ہوگی اس وقت تک یہ گمراہی کے اندھیروں سے نہیں نکل سکتی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، جب مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند پہنچے تو انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ "میں کافی تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ مسلمانوں کی بقا صرف قرآن کریم کی تعلیم ہی سے وابستہ ہے" لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ کام اجتماعیت کے بغیر مشکل ہے' اس کام کے لئے ایک مضبوط جماعت کی ضرورت ہے جو کفر اور الحاد کے طوفان کے مقابلہ میں چٹان بن کر اس طرح کھڑی ہو کہ اس پر کسی برائی کا حملہ کرنا ناممکن ہو۔ اور یہ صرف قرآن کی تعلیم ہی سے مضبوط ہو سکتی ہے اگرچہ میرا تعلق سید مودودی کی جماعت سے ہے لیکن میں ہر اس شخص کی تائید کرتا ہوں جو اس اندھیر نگری میں شمع جلانے کیلئے کوشش کرتا ہے۔ اس وقت آپ جیسے انسان مبارکباد کے مستحق ہیں جو الحاد و کفر کی سخت تند و تیز اندھیروں میں ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ جب تک اہلِ حق متحد نہیں ہوں گے اس وقت تک برائی کا مقابلہ کرنا مشکل ہوگا۔

میں نے آپ کا قیمتی وقت اس لئے لیا ہے کہ موجودہ برائی اور بدی کی طغیانی میں انسان کا اکیلا رہتے ہوئے بچنا بہت ہی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو کامیاب کرے۔ مجھے امید ہے کہ جناب مجھے اپنی نیک دعاؤں میں شریک کریں گے۔

دعاگو

علی محمد مظاہری' میانوالی
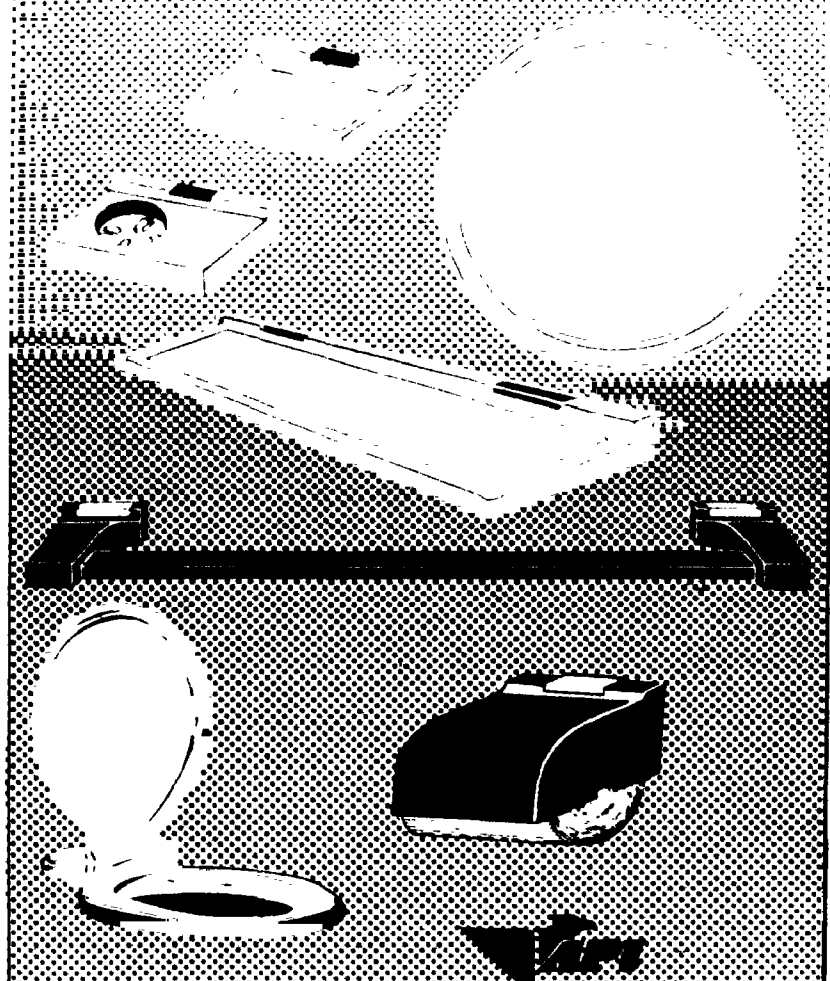
افکار و آراء

تبلیغ اور جہاد

—— ابن الاسلام محمد یونس قریشی

اسلامی تعلیمات تمام دنیا کے لوگوں تک پہنچانے اور اسلام کا علم ساری دنیا پر بلند کرنے کے دو طریقے ہمیں ملتے ہیں۔ ایک تبلیغ اور دوسرا جہاد۔

تبلیغ کا معیار (Ideal) ہمارے سامنے تبلیغ طائف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طائف میں اسلام کی تبلیغ کی تو وہاں کے سرداروں نے اور لوگوں نے اسے نہ مانا اور اُلٹا آپ پر پتھر پھینکے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی جس میں آپ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یا اللہ تو مجھ سے راضی ہے تو مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں۔

اللہ نے آپ کی نصرت کے لئے آسمان سے فرشتے بھیجے۔ مگر آپ نے یہ امید ظاہر کی کہ ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کی آنے والی نسلیں اسلام قبول کریں۔

فرشتے آج بھی ہماری مدد کے لئے اتر سکتے ہیں بشرطیکہ آج ہم بھی تبلیغ کا حق ادا کریں۔ ہماری تبلیغ اپنے معیار یعنی طائف کی تبلیغ کے جتنے قریب ہوگی اتنا ہی زیادہ اثر ہوگا۔

ہمارے عمل، ہمارے اخلاق بھی اگر اچھے ہوں گے تو یہ بھی خاموش تبلیغ ہوگی اور دوسرے مذاہب کے لوگ ہم سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف آئیں گے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جاں نثاروں کے ساتھ میدان میں اترتے ہیں تو ہزاروں کی تعداد میں دشمن کو شکست دیتے ہیں کہ آج تک اس کی مثال نہیں ملتی۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فرشتے مسلمانوں کی نصرت اور اطمینانِ قلب کے لئے اترتے ہیں۔

آج اگر ہم بھی جہاد کا حق ادا کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ فرشتے نہ اتریں ہماری مدد کے لئے۔

اب ہمارا جہاد جتنا اپنے آئیڈیل اپنے معیار کے قریب ہوگا اتنا ہی اثر زیادہ ہوگا۔

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ تبلیغ کے ساتھ اور جہاد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے حضور دعا مانگتے ہیں۔ صبح جنگ ہونی ہے تو رات کو امیرِ لشکر گڑگڑا کر اپنے رب کے حضور دعا مانگتا ہے۔

اور پھر صبح اللہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے اور ان کے اطمینانِ قلب کے لئے فرشتے بھیجتا ہے۔
جہاد بڑے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے گویا اسلام کے لئے جو جد و جہد کی جائے گی وہ جہاد ہے۔
آج ہم مسلمان اسی لئے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں کہ ہم نے تبلیغ اور جہاد کو چھوڑ دیا ہے اور بعض نے ان دونوں میں سے ایک کو اپنایا اور دوسرے کو چھوڑ دیا ہے۔
حالانکہ جہاں تبلیغ کی ضرورت ہو وہاں تبلیغ کی جانی چاہیئے اور جہاں جہاد کی ضرورت ہو وہاں جہاد کرنا چاہیئے اور یہ تمام کام صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کرنا چاہیئے۔

— ● —

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا

بقیہ: دعوتی و تربیتی نصاب

۶۔ اجتماعات کے ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ہفتہ وار درس قرآن میں شمولیت کی پابندی وہیں ہوگی جہاں یہ حلقہ قائم ہے۔ بصورت دیگر اس کے لئے کوشش کی جائے اور اگر فی الحال امکان نہ ہو تو اسرہ کے اجتماع ہی میں کچھ وقت درس قرآن یا ترجمہ قرآن کے لئے رکھا جائے۔

۷۔ منفرد رفقاء کے لئے مرکز یا علاقائی مرکز میں ماہانہ ملاقات کے لئے تشریف آوری کی پابندی اس صورت میں جبکہ خط و کتابت کے ذریعہ رابطہ نہ ہو سکتا ہو امرائے حلقہ اپنی صوابدید اور علاقائی حالات کی روشنی میں اس مقصد کے لئے دن اور اوقات معین کر سکتے ہیں۔ تاہم عام حالات میں بھی ہمارے علاقائی مراکز میں رفقاء کی پذیرائی اور رفقاء کا ذمہ دار حضرات سے ملاقات کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

۸۔ تعمیر سیرت و کردار اور تزکیۂ نفس کے لئے غور و فکر۔ تدبر۔ جائزہ۔ ادعیہ ماثورہ اور اذکار مسنونہ کا اہتمام تجویز کیا گیا ہے۔ اگر کسی مزکی اور تربیت کنندہ کی صحبت نصیب ہو جائے تو وہ سونے پر سہاگہ ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا اہتمام ذاتی اور مقامی حالات پر منحصر ہوگا۔ رفقاء خصوصی اوقات تنہائی میں باطنی بیماریوں پر غور و فکر کریں اور اذکار مسنونہ کے لئے صبح و شام کے کچھ خصوصی اوقات مقرر کریں۔ نیز عام حالات اور روزمرہ معروفیات کے دوران بھی ان کا خیال رکھیں۔

نوٹ: تربیتی و تنظیمی نصاب برائے رفیق مبتدی سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے بعد ایک رفیق نصاب کے اگلے مرحلے یعنی تربیتی نصاب برائے رفیق منتظم حصہ اول کا اہل ہوگا۔ رفیق منتظم کے لئے تربیتی نصاب حسب موقع و ضرورت بعد میں ارسال کئے جائیں گے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (قرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد	۳۷
شمارہ	۸
ذوالحجہ	۱۴۰۸ھ
اگست	۱۹۸۸ء
فی شمارہ	۵/-
سالانہ زرتعاون	۵۰/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا - ۱۵۰ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا -	۶ - امریکی ڈالر یا - ۱۰۰ روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، اسکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ -	۹ - امریکی ڈالر یا - ۱۵۰/- " "
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ -	۱۲ - امریکی ڈالر یا - ۲۰۰/- " "

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ - داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن - لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

اقتدار احمد

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"میثاق" کے قارئین کو بتانے کی ضرورت نہیں، صرف یاد دلانے کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ یہ ماہنامہ، مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کا ماہوار جریدہ "حکمت قرآن"، قرآن اکیڈمی، قرآن کالج اور خود تنظیم اسلامی مع اپنے مقاصد، اپنی اساسی دعوت اور اپنے طریق کار کے، ایک ہی سراج منیر کی مختلف کرنیں ہیں۔ ان سب کا آغاز دعوت رجوع الی القرآن سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے ایک بندے کو توفیق دی کہ وہ قرآن عظیم کو اپنا امام، نور و ہدایت، رحمت اور آخری دلیل بنائے بلکہ واقعہ یہ ہے اللہ کے کلام مبین نے اس شخص کو اپنی تحویل میں لے لیا یعنی صحیح معنوں میں POSSESS کر کے چھوڑا۔ قرآن مجید کے اعجا(ز) کا بیان تو ان سطور کے راقم کی استعداد سے بہت بلند ہے لیکن یہ بہرحال آنکھوں دیکھی بات ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو جنہوں نے اپنا پورا زمانۂ تعلیم بزبان انگریزی ایک فنی علم حاصل کرتے گزارا، دینی درسگاہوں کے فیض سے محروم رہنے اور عربی زبان کی بھی باقاعدہ تحصیل کے بغیر محض کتاب اللہ سے محبت اور تعلق قلبی نے اس درجہ مسحور کیا کہ وہ سالہا سال اس کی تعلیم او(ر) تعلّم کو معاش کی مشقت کے ساتھ چلا کر جب تھک گئے تو انہوں نے دونوں میں سے ایک چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اسے قرآن سے سچے عشق اور تائید ایزدی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے گلو خلاصی معاش کی تگ و دو سے ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن، ان کا پورا وقت لوگوں کو ہدایت کے اسی ابدی سرچشمے کی طرف بلانے میں صرف ہوا ہے۔ ع جنوں میں جتنی بھی گزری بکا(ر) گزری ہے۔

انہوں نے انجمن بنائی تو اسی نام سے، کانفرنسیں اور محاضرات کئے تو اسی حوالے سے اکیڈمی بنائی تو اسی غرض سے اور آخر میں ایک کالج کی بنا رکھی تو اسی کام کے لئے کہ نوجوانو(ں) مروجہ نصاب تعلیم کے ساتھ قرآن مجید سے اس حد تک متعارف کرا دیا جائے اور عربی ز(بان) میں اتنی اہلیت بہم پہنچا دی جائے کہ پھر اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو اپنے دین کی خدمت

لئے قبول فرمالے تو ان کی عملی و علمی کاوشوں اور ہدایت و حکمت دینی کے اصل ماخذ کے مابین کوئی حجاب موجود نہ ہو جو اُسے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہر طرف پھیلے ہوئے مغالطوں میں سے کسی میں مبتلا ہونے کے امکان سے دوچار کر دے۔ تجربے اور مشاہدے کی بات ہے' کوئی راز نہیں کہ دین کا کام کرنے کا داعیہ کچھ لوگوں میں پیدا تو ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید اور احادیث نبوی کی زبان سے اجنبیت اور نتیجے میں واقع ہونے والی نارسائی ان میں سے اکثر کو خرد کی گتھیاں سلجھانے میں الجھا دیتی ہے اور وہ جنوں کی اس کیفیت سے محروم رہ جاتے ہیں جو دین کو دنیا پر ترجیح دینے کے لئے ضروری ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کے ساتھ زندہ و متحرک تعلق کا ایک انعام یہ بھی ملا کہ انہوں نے اپنی جماعت 'تنظیم اسلامی' کی تاسیس کی تو اس کا منہج اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور محور خود قرآن مجید کو رکھا۔ تنظیم اسلامی کے دعوتی اجتماعات میں پروگرام کی واحد شق درس قرآن ہوتی ہے۔ توسیع دعوت کا کام دروس قرآن کے ان آڈیو اور ویڈیو کیسٹس سے لیا جاتا ہے جو امیر تنظیم اسلامی ملک کے طول و عرض اور دنیا کے دور دراز گوشوں میں بڑے بڑے اجتماعات کے روبرو بنفس نفیس دیتے رہے اور آج بھی دیتے ہیں۔ اور تو اور تنظیم اسلامی کا لٹریچر بھی خود قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب اور حکمت قرآنی ہی کی بعض توضیحات پر مشتمل ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک کتابچے کا عنوان جس کی اشاعت و تقسیم پر خاص توجہ دی گئی اور جو اردو' عربی' انگریزی' فارسی اور سندھی زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے' تنظیم اسلامی کا تعارف نہیں بلکہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ہے۔ جو اس اعتبار سے ثقہ دینی حلقوں اور عامۃ المسلمین سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے کہ اس میں جس بے غرضی' دردمندی' خلوص اور دو اور دو چار کے سے انداز میں مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کیا گیا ہے' وہ ایک بار تو ضرور ہی ہر کلمہ گو کے دل میں کتاب ہدایت کی طرف التفات پیدا کر دیتا ہے۔

اور یہ سب کچھ محض حسن اتفاق یا ایک شخص کے ذاتی ذوق و شوق کا مظہر نہیں' اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجرب نسخہ ہے۔ قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ کتاب ہدایت تاریخ انسانی کے اس مثالی طور پر مکمل ترین انقلاب کا واحد

ثور، مکمل لائحہ عمل اور تنہا گائیڈ بک تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں
پا کر کے دکھایا جس پر آج ہم چلتے پھرتے ہیں۔ اب جس کسی کو عظمت رفتہ کو آواز دینا
صود ہو، تجدید دین اور احیائے اسلام مطلوب ہو اور اسلامی انقلاب کی جھلک دیکھنے اور
مانے کی آرزو ہو، اس کے لئے واحد اور موثر طریق کار یہی ہو گا کہ اسی کتاب کو حرز جان
ئے، اسی سے قلب و ذہن کا رشتہ استوار کرے اور اسی کو رہنما بنائے۔ اس امت میں
ملاح احوال کا کام جب بھی ہوا اسی طریقے سے ہو گا جس طریقے سے خیر القرون میں ہوا تھا۔
ترم ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت رجوع الی القرآن اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نکتۂ آغاز ہے۔ ان کے
دس قرآن سب کے لئے عام ہیں۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک مرد و زن سب ہی اپنی
پنی ضرورت اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن

ہتہ نوجوانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمارا نظام تعلیم
حال پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو تو کفر و الحاد کی آندھی کا سامنا
کئے بغیر چارہ ہی نہیں جو الا ماشاء اللہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے عقائد اور ایمانیات کے ڈھانچے
کا چولیں ہلا کر چھوڑتی ہے۔ وہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں، ان کے دل دین کی مبادیات
پر ادنیٰ درجے کے ایقان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور معاشرتی دباؤ کے تحت جب وہ کچھ
رسوم و قیود کی پابندی کرتے ہیں تو اس کا اثر ان کی شخصیت پر الٹا ہوتا ہے۔ اندر سے وہ بٹ کر
رہ جاتے ہیں، آدھے تیتر آدھے بٹیر..... اس عارضے کا شافی علاج بھی رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے ابدی معجزے یعنی قرآن مجید ہی میں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے میں عربی زبان
سے عدم واقفیت اور کلام مبین کے اسلوب بیان سے اجنبیت آڑے آتی ہے۔ حصول ثواب
کے لئے اس کی تلاوت بھی یقیناً مبارک ہے لیکن دل و دماغ پر کسی دیرپا اثر اور افکار و معتقدات
میں اس درجے کی تبدیلی جو عملی زندگی پر نقوش چھوڑ سکے، قرآن مجید کو سمجھے اور اس پر غور کئے
بغیر ممکن نہیں۔

انجمن خدام القرآن کے قیام کا مقصد ہی منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین یعنی قرآن حکیم کے
علم و حکمت کی اس پیمانے اور ایسی علمی سطح پر تشہیر و اشاعت ہے جو امت مسلمہ کے فہیم عناصر میں

تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا کر سکے اور یوں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کے دور ثانی کی راہ ہموار ہو جائے۔ اس ضمن میں متعدد منصوبوں پر کام کیا گیا جن میں سے قابل ذکر "رفاقت سکیم" اور "دو سالہ نصاب" ہیں۔ اول الذکر میں ایسے نوجوانوں کو شامل کیا گیا تھا جنہوں نے کسی نہ کسی شعبہ میں کم سے کم گریجویشن کی ہو اور جو تعلیم و تعلّم قرآن اور خدمت دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا ارادہ کر چکے ہوں۔ الحمد للہ کہ اس سکیم میں متعدد باصلاحیت نوجوانوں نے شاندار مستقبل اور پیشہ ورانہ کیریئر قربان کر کے از سرنو طالب علمانہ زندگی کو اختیار کیا اور ان میں سے بیشتر اب قرآن اکیڈمی کا مستقل اثاثہ ہیں یا پھر اپنی اپنی جگہ خدمت دین میں مصروف ہیں۔ دو سالہ نصاب میں سے لگ بھگ پچاس ایسے افراد کو گزارا گیا جو گریجویٹ یا لگ بھگ اتنی ہی اہلیت کے حامل تھے۔ انہیں عربی اور فارسی میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی گئی کہ علوم دینی کے اس عظیم ورثے سے متعارف ہو سکیں جو ان زبانوں میں مقیّد ہے' قرآن مجید کا ترجمہ سبقاً سبقاً اس انداز میں پورا کرایا گیا کہ بالاخر وہ ترجمے سے بے نیاز ہو جائیں۔ حدیث و اصول حدیث اور فقہ و اصول فقہ سے بھی آشنائی پیدا کی گئی کہ دین کا فلسفہ اور اس کی حکمت کے اسرار ان کے بغیر نہیں کھلتے۔ یہ نصاب جس سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی اہلیت پیدا فرما دی ہے کہ پورے اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنے اپنے حلقہ اثر میں قرآن مجید کے درس کی محفلیں جمائے ہوئے ہیں' ان دنوں موقوف ہے۔ البتہ اس کے دوبارہ اجراء پر بھی سوچا جا سکتا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معدودے چند نوجوانوں کی طرف سے اس کے لئے اصرار موصول ہوا ہے لیکن جب تک ان کی تعداد اتنی نہ ہو جائے کہ مطلوبہ انتظامات کا جواز بن سکے' اس وقت تک اس بھاری پتھر کو صرف چوما جا سکتا ہے' اٹھانا ممکن نہیں۔ قارئین کی توجہ کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ان کے حلقہ تعارف میں اگر ایسے باہمت جوان موجود ہوں جو اپنے دین کو سمجھنے اور سمجھا سکنے کی استعداد پیدا کر لینے کی خواہش رکھتے اور اس کے لئے عمر عزیز کے دو سال فارغ کرنے پر آمادہ ہوں تو انہیں قرآن اکیڈمی سے رابطہ قائم کرنے کو کہیں۔ مطلوبہ تعلیمی اہلیت بی۔ اے' بی۔ ایس۔ سی یا کوئی اور مساوی ڈگری ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ دو سالہ نصاب بھی قرآن اکیڈمی کا ایک مستقل شعبہ رہے۔

انجمن خدام القرآن نے پچھلے سال قرآن کالج کا آغاز کیا ہے جس میں ایف اے ' ایف ایس سی اور آئی کام یا ڈی کام یعنی ہائر سیکنڈری تعلیم سے فارغ شدہ طلبہ کو تین سال میں بی۔ اے پاس کرایا جائے گا۔ اس سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور ان کے والدین پانچ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کرلیں تو پوری تفاصیل ان کے علم میں آجائیں گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جامعہ پنجاب کے قواعد کے مطابق لازمی مضامین یعنی انگریزی (۲۰۰ نمبر) اور اسلامیات و مطالعہ پاکستان (۱۰۰ نمبر) ' دو انتخابی مضامین (کل ۴۰۰ نمبر) اور ایک اختیاری مضمون (۱۰۰ نمبر) کی تیاری کرانے کے علاوہ نوخیز ذہنوں میں دین سے شعوری وابستگی کا پیج بونے کے لئے جو اضافی تعلیم دی جائے گی وہ تجوید ' عربی قواعد اور بول چال ' ترجمہ قرآن مکمل مع مختصر تشریح ' تعلیم حدیث اور قرآن مجید کے اس منتخب نصاب کے نسبتاً تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہوگی جو انجمن کے قیام کی بنیاد بنا اور جس سے حکمت قرآنی اس حد تک آشکار ہو جاتی ہے کہ پھر اس سے دل و دماغ کو روشن کرنے کے لئے پورے مصحف کو پڑھنے اور سمجھنے کا مضبوط داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سارے کام کے لئے طلبہ سے محض ایک سال اضافی طلب کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک سال بظاہر اضافی ہے لیکن اگر ان حالات پر نظر ڈالی جائے جن کا سکہ ان دنوں ہمارے کالجوں اور جامعات میں رواں ہے تو معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی سبب سے تعلیمی دورانیے میں اضافہ ہمارے ہاں ایک معمول بن چکا ہے۔ اب وہ زمانے لد گئے جب چودہ سال میں ایک طالب علم بی۔ اے ' بی ایس سی ' بی کام ' سولہ سال میں ایم اے وغیرہ اور سولہ ہی سال میں ایل ایل بی پاس کر لیا کرتا تھا۔ اور نہیں تو امتحانات اور داخلوں کے نظام میں ہی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی اڑچن آجاتی ہے کہ ایک سال فالتو لگائے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ قرآن کالج سے بی۔ اے پاس کرنے والے طلبہ اور ان کے بزرگوں کو جو بڑا امتحان درپیش ہے وہ فی الحقیقت یہ ہے کہ ایم اے ' ایل ایل بی یا بی ایڈ میں داخلہ ملنے کے مواقع کی موجودگی میں بھی اور تعلیمی میدان میں معاش کے علاوہ سول سروس کے امتحانات پاس کر لینے کے امکانات کے باوصف سائنس اور سائنسی علوم و فنون کے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ روشن مستقبل اور کامیابی پر کھلتے ہیں۔ سو اگرچہ یہ ضمانت کہیں سے بھی حاصل نہیں ہوتی کہ اپنی سی پوری کوشش کے باوجود نمبروں کی اس منزل ہفت خواں کو وہ ضرور ہی طے

کرلیں گے جس کے بغیر مستقبل کی روشنی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی، تاہم یہ اپنے آپ سے ایک شعوری فیصلہ لینے کا سوال ہے۔ کیا دنیا کی کامیابی و کامرانی ہی سب کچھ ہے؟ کیا دین اپنی اس غربت کے دور میں ہماری طرف سے اتنی سی قربانی کا بھی مستحق نہیں؟

قرآن کالج کے اس پروگرام کی اصل روح یہ ہے کہ جو طلبہ بھی اس میں داخلے کے لئے ہمیں میسر آئیں ان کے ناپختہ ذہنوں پر عظمت قرآن کا نقش بٹھا دیا جائے اور ان کے صاف و شفاف دلوں میں دین سے تعلق اور محبت کی شمع روشن کر دی جائے۔ پھر وہ کہیں بھی جائیں، کسی بھی میدان کو اپنی ترکتازی کے لئے منتخب کریں، زمانے کا سامنا کرتے ہوئے ان کے ذہن کتنے ہی حجابات قبول کر لیں اور مادہ پرستی کا کتنا ہی زنگ ان کے دلوں پر جم جائے، دین سے تعلق کی ایک چنگاری ضرور کہیں نہ کہیں دبی رہ جائے گی جو کسی بھی وقت ان کی زندگی کا نقشہ بدل ڈالنے کا سبب بن سکے گی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ انہی طلبہ میں سے چند کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرما لے اور وہ یہاں سے بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد بھی دنیا داروں کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ دین کا علم حاصل کرنے اور پھر اسے پھیلانے کا داعیہ اس شدت سے ان میں ابھر آئے کہ وہ اپنے کیریئر تج دیں اور اپنی صلاحیتیں اللہ کے کلمے کو بلند کرنے میں کھپانے کا فیصلہ کر لیں۔ ایسا ہوا تو کتنا مبارک ہو گا یہ فیصلہ اور کس قدر اجر کما لے جائیں گے وہ والدین جو اولاً اپنے بچوں میں اس ارادے کے پیدا ہونے کا باعث اور بعد میں ان کے ممد و معاون بنیں۔ ہمارے ہاں ایصال ثواب اور صدقۂ جاریہ کے بہت سے تصورات رائج ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اولاد کا دین کی خدمت میں مصروف ہونا والدین کے لئے سب سے بڑا صدقۂ جاریہ اور ثواب کا نہ ختم ہونے والا ایصال ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان توقعات میں سے اعلیٰ چھوڑ، ادنیٰ درجے کی توقع کے لئے بھی یہ لازم آتا ہے کہ اللہ کے دین کے لئے اپنی اولاد میں سے ذہین تر اور قابل ترین بچوں کو اس رخ پر لگایا جائے۔ از کار رفتہ، معذور یا کسی بھی طرف چلنے میں ناکام رہنے والے طلبہ کو اگر ادھر بھیج دیا گیا تو نتیجہ معلوم!۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ناپسندیدہ طرز عمل سے اجتناب کرنے کی توفیق دے کہ اچھا مال تو ہم دنیا کے لئے سمیٹ رکھیں اور گھٹیا حصہ دین کے کھاتے میں ڈال کر یہ اطمینان محسوس کریں کہ حق ادا ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

قارئین کے علم میں ہے کہ آج سے چند سال قبل 'الھدیٰ' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کے مرتب کردہ منتخب نصاب کے دروس کا جو پروگرام مسلسل ۶۵ ہفتوں تک پاکستان ٹیلی ویژن سے ہفتہ وار نشر ہوتا رہا تھا، ابھی وہ نصاب بقدر نصف مکمل ہوا تھا کہ پروگرام اچانک بند کر دیا گیا۔ ٹی وی پر نشر شدہ ان دروس کو کیسٹوں سے منتقل کر کے بحمد اللہ 'میثاق' میں 'الھدیٰ' ہی کے زیرِ عنوان شائع کیا جاتا ہے اور اب ان نشر شدہ دروس میں سے صرف سورۃ الحجرات کے درس کی اشاعت باقی رہ گئی ہے محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا ایک بھرپور تعارف چونکہ اس سے قبل 'مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول سورۃ الحجرات کی روشنی میں' کے زیرِ عنوان پمفلٹ کی شکل میں شائع شدہ موجود ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے باضابطہ درس سے قبل مناسب سمجھا گیا کہ مذکورہ بالا جامع تحریر شامل اشاعت کر دی جائے تاکہ سورۃ کے مضامین کا بھرپور خاکہ سامنے آجائے۔

(ادارہ)

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۂ حجرات مکمل ہے
یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف
قومی و ملّی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی
ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جا سکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے
متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستورِ اساسی کیا ہے،
اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں
سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرضِ تفہیم تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔

پہلا حصّہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے 'اصل الاصول' یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور
ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی[1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملّت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست 'مادر پدر آزاد'
نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے 'پابند' ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ
خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح
اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جا سکتی ہے جو نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے
مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے
کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک
اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت
نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ)
اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا
کی مرضی و منشا کو پورا کرے

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل رُوح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقویٰ
اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی 'اصل ثانی' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملّی

---

[1] کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے   یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ) اور پھر اس قول و فعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (ع "ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر!)

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدہ توحید فی الالوہیۃ کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرز جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ملت اسلامیہ کے پاس وہ "مرکزی شخصیت"، موجود ہے جس سے تمدن انسانی کی وہ فطری ضرورت بہ تمام و کمال اور بغیر تصنع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور ہیرو (HEROES) گھڑنے کا کھکیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو ع "می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر" کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں، لیکن ملت اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیام قیامت پوری امت مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، امت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی "مرکزیت" ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرق اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENITY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور "علاقائی" شخصیتوں، کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے "وحدت ملت" کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حرمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے　　　ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں
روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ تر عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں 'محصور' ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیئت اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ 'مقامِ رسالت' کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع ع "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے مصداق ہے)

دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقۃً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدباب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[1] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل یعنی (ا): یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمّہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے۔ گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، (ب): اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر

---

[1] اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظِ مبارک مستحضر رہنے چاہییں کہ "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے)

مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئتِ اجتماعیہ کو کرنا چاہیے اور جب وہ گردن جھکا دے تو از سرِ نو عدل وقسط پر مبنی صلح کرادی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرر موکد ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ جب پوری ہیئتِ اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جاتے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لیے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے!

وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ۱۔ تمسخر (اس کے سدباب کے لیے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر وقیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳۔ تنابز بالالقاب یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد برائی کا نام بھی نہایت برا ہے) ۴۔ سوءِ ظن (اس لیے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵۔ تجسس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لیے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لیے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دار و مدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملتِ اسلامیہ کے استحکام کیلئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبت و اُلفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملتِ اسلامیہ کا استحکام

عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ ع "ہم تجھیے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے!" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف 'تقویٰ' ہے اس لیے کہ پوری نوع انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن [1] بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو [2] رخ لائق توجہ ہیں۔ ایک [1] یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی اُن کی جڑ میں جو گمراہی کار فرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے [2] یہ کہ اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہل ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیارِ عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

---

[1] چنانچہ جی ایچ ویلز (H. G. WELLS) نے اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یَاۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یَاۤاَیُّهَا النَّاسُ" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورۂ حجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اُس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کرلے اسے "اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" ایک انگریزی مقولے[1] کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے؛ بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفیٔ کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویّے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہو گئی۔

ایک: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اُس قاعدہ کلّیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا یہ چیز بھی مبنی برعدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول

[1] "Call the Rose by any name: It will smell as Sweet"

نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورٌ اور رحیمٌ سے کر دیا گیا، کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے[1] یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے پیچھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہدایتِ آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من دھن سب قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٔ ایمان میں سچے ہیں۔

سورۃ حجرات کی اس آیۂ کریمہ (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ) پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزوِ ثانی ختم اور جزوِ ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے ایک ایمانِ حقیقی جو جامع ہے ایمانِ قولی اور عملِ صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

سانحۂ ارتحال

پرچہ پریس میں جا ہی رہا تھا کہ یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ہمارے قابلِ احترام بزرگ اور رکن ادارہ تحریر محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے بڑے صاحبزادے حبیب میاں جمعہ ۲۹ جولائی کو مختصر علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ قارئین سے التماس ہے کہ مرحوم کی مغفرت کے لیے تہِ دل سے دعا کریں اور شیخ صاحب کے لیے بھی خصوصی دعا کریں کہ اللہ انہیں اس پیرانہ سالی میں اتنے بڑے صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے اور انہیں صحت کاملہ سے نوازے۔ جملہ وابستگان ادارہ اِس غم میں محترم شیخ صاحب کے برابر کے شریک ہیں۔ (ادارہ)

امیر تنظیم اسلامی کے

بعض ذاتی اور خاندانی کوائف

اُن کے اپنے قلم سے!

(قسطِ دوم)

اواخر ۶۵ء سے اواخر ۷۰ء تک پانچ سال کا عرصہ راقم کی زندگی کا مصروف ترین اور شدید ترین مشقت کا دور تھا۔ جس کے دوران مختلف ہی نہیں متضاد قسم کی مصروفیات کا شدید دباؤ راقم پر رہا۔

یادش بخیر، محنت و مشقت کی شدت کے اعتبار سے ان ایّام کا مقابلہ اگر کسی درجہ میں کر سکتے ہیں تو صرف ۵۰ء تا ۵۳ء کے وہ تین چار سال جو اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ساتھ انتہائی فعّال وابستگی میں گزرے تھے، اور جن کے دوران اولاً میڈیکل کالج کی نظامت، پھر لاہور اور پنجاب کی دوہری نظامت اور بالآخر پورے پاکستان کی نظامت علیا کا بوجھ راقم کے کندھوں پر رہا تھا[1]۔

---

[1] اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر محنت اور مشقت کی توفیق عطا فرمادی تھی اس کا کسی قدر اندازہ جنوری ۱۹۵۲ء کے ایک دن کی روداد سے ہوسکتا ہے۔ ان دنوں میں اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے ناظم کی حیثیت سے پنجاب کا طوفانی دورہ کر رہا تھا۔ اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی سیالکوٹ کا ایک روزہ سفر تھا جس میں تین ہائی سکولوں اور دو کالجوں میں تقریروں کا پروگرام تھا۔ اس زمانے میں سڑکیں بہت خراب تھیں اور ٹرانسپورٹ بھی ابھی بالکل دقیانوسی حالت میں تھی۔ چنانچہ لاہور سے سیالکوٹ کا اسی میل کا سفر ساڑھے تین چار گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ اور رات کو بسیں بالکل نہیں چلتی تھیں۔ لہٰذا لاہور سے ایک جونیئر ساتھی نذیر احمد خالد کی ہمراہی میں خالی پیٹ منہ اندھیرے روانگی ہوئی۔ سیالکوٹ پہنچتے ہی ساتھیوں نے بتایا کہ ایک ہائی سکول میں تقریر کا جو وقت طے ہوا تھا وہ ہوچکا ہے اور وہاں طلبہ اسمبلی کی صورت میں جمع ہیں اور شدت کے ساتھ انتظار ہو رہا ہے۔ لہٰذا کسی ناشتے وغیرہ کے بغیر سیدھے وہاں پہنچے۔ طے یہ تھا کہ سکولوں میں تقریر نذیر خالد صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

شدید مشقت کے اس دور ثانی (۶۵ء تا ۷۰ء) کی مصروفیات کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ:

ایک جانب مطب کی مصروفیت تھی جس میں صبح سے شام تو ہوتی ہی تھی، اس پر مزید یہ کہ چونکہ رہائش اور مطب یکجا تھے، لہٰذا رات کا آرام بھی یقینی نہ تھا۔ اور اکثر "تہجد بالمرضیٰ" کی صورت پیش آتی رہتی تھی۔

دوسری جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن تھے جو لاہور کے مختلف گوشوں میں قائم تھے اور جن سے ہفتے کی کوئی شام مستثنیٰ نہ تھی۔ ان میں سے جو حلقے دور دراز کے علاقوں میں قائم تھے وہ تو مریضوں کی یلغار سے محفوظ رہتے تھے، لیکن جو دو حلقے خود کرشن نگر میں قائم تھے ان کے ضمن میں تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ادھر میں درس دے رہا ہوتا تھا اور ادھر دروازے پر مریض یا ان کے لواحقین منتظر ہوتے تھے۔ شام کے ان دروس پر مستزاد تھا جمعہ کا خطبہ و خطاب اور اتوار کی صبح کا مرکزی درس قرآن! گویا ہفتے کا کوئی پورا دن تو کجا، دن کا کوئی حصہ بھی آرام کے لئے مختص نہ تھا!

تیسری جانب تحریر و تسوید کا کام تھا۔ جس میں "میثاق" کے اداریوں کے علاوہ اپنے دعوتی مضامین اور کتابچوں کی تالیف بھی شامل تھی۔

اور چوتھی جانب اور ان سب سے بڑھ کر پریشان کن تھا "دار الاشاعت الاسلامیہ" کا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کریں گے اور کالج میں راقم کرے گا۔ لیکن انہوں نے جیسے ہی تقریر شروع کی ان کی آواز بھی بھرا گئی اور ٹانگیں بھی کانپنے لگیں۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ: "باقی تقریر ڈاکٹر صاحب کریں گے!" چنانچہ اس روز راقم نے چار تقریریں کیں، تین ہائی سکولوں میں اور ایک جناح اسلامیہ کالج میں۔ (غنیمت ہے کہ مرے کالج اس روز کسی سبب سے بند تھا۔) ان تقاریر کے دوران بھی کچھ کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی بلکہ ایک جگہ سے فارغ ہوتے ہی بھاگم بھاگ دوسری جگہ جانا ہوتا رہا۔ اور جیسے ہی ہم جناح اسلامیہ کالج کی تقریر سے فارغ ہو کر نکلے، ہمیں بتایا گیا کہ لاہور کے لئے آخری بس کا وقت ہو گیا ہے۔ چنانچہ فوراً روانگی ہو گئی...... اور رات کو جب دیر گئے لاہور پہنچے تو ہاسٹل کا میس (MESS) بند ہو چکا تھا..... لہٰذا وہ رات بھی فاقے ہی سے بسر ہوئی (نذیر خالد صاحب ہاسٹل کی بجائے اپنے بھائی صاحب کے گھر پر رہتے تھے، لہٰذا شاید کہ انہیں واپسی پر کچھ دستیاب ہو گیا ہو۔)

انتظامی کھکھیڑ۔ جس میں خوشنویس حضرات کا تعاقب' کاغذ کی مارکیٹ سے رابطہ' مطابع کے چکر' دفتری اور جلد ساز حضرات کے ساتھ "سرد و گرم" معاملات' پھر پرچے اور کتابوں کی ترسیل' ڈاک کی دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر حسابات کا اندراج ایسے مشقت طلب اور خالص "غیر رومانوی" قسم کے کام شامل تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت یہ تمام کام میں تن تنہا کر رہا تھا... اور اس پورے کام میں میرے صرف دو معاون تھے۔ ایک مطلب کا ڈسپنسر اور دوسرے "دارالاشاعت" کے ایک جزوقتی کارکن!

الغرض... ان پانچ سالوں کے دوران صورت بالکل وہ رہی جس کا نقشہ حضرت حسرت نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری' چکّی کی مشقت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

بہر حال... سورۃ النجم کی آیات مبارکہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ ○ وانّ سعیہ سوف یریٰ ○" میں بیان شدہ قانون خداوندی کے مطابق اس محنت و مشقت کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی سے لگ بھگ دس برس قبل علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بہت سوں کے باطن میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ چنانچہ ۶۷ء میں 'تنظیم اسلامی' کی تأسیس کے ضمن میں ایک اہم اجتماع بھی ہوا۔ (اگرچہ یہ کوشش بھی ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق ناکامی سے دوچار ہوگئی) بلکہ ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ بھی وجود میں آگیا اور اس طرح ایک نئی تحریک کی داغ بیل پڑ گئی' لیکن اس کے ساتھ دو بحران بھی پیدا ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

چنانچہ...... ایک جانب صحت متاثر ہونی شروع ہوئی اور اوائل ۷۰ء میں تو اس نے گویا بالکل جواب دے دیا۔ نتیجۃً مستقل طور پر حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے' اولاً میں نے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی' اور درد اور بخار کو دفع کرنے والی ادویات کے سہارے اپنے معمولات جاری رکھے۔

لیکن جب ایک دو بار تھوک میں خون کی آلائش بھی نظر آئی تو سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ متعدد بار ایکسرے کرانے کے باوجود پھیپھڑوں میں تو کوئی واضح خرابی نظر نہ آئی۔ لیکن شام کے بخار اور ہلکی ہلکی کھانسی کے پیش نظر اکثر مخلصین کا اصرار تھا کہ ٹی بی کا علاج شروع کر دیا جائے..... وہ تو بھلا ہو ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کا کہ سختی کے ساتھ اڑ گئے کہ جب تک صریح اور مثبت شواہد نہیں ملیں گے میں ٹی بی کی ادویات استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ انہی دنوں پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم و مغفور) حکیم سعید احمد پھلوری (مرحوم) کو لے آئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پھیپھڑوں کے سرطان کی تشخیص کر ڈالی۔ چشتی صاحب ان کی "نبّاضی" کے بے انتہا معتقد تھے' لہٰذا اُن کے اصرار پر ایک کرم فرما کی وساطت سے ریلوے کیرن ہاسپٹل کے ڈاکٹر سعید صاحب سے باضابطہ "برانکو سکوپی" (BRONCHOSCOPY) کرانی پڑی جس کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ " پھیپھڑوں کی تمام نالیاں بالکل شیشے کے مانند صاف ہیں اور مجھے تو کہیں بلغم کی اتنی مقدار بھی نہیں ملی جسے خردبینی معائنے کے لئے نکال لاتا!" ..... گویا یہ ثابت ہو گیا کہ یہ علالت نتیجہ تھی صرف جسمانی مشقت کی زیادتی' آرام کی کمی' اور اعصاب پر متضاد قسم کے کاموں کے شدید دباؤ کا!

دوسری جانب ابتدائی "فارغ البالی" کے کچھ ہی عرصے بعد مالی مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا..... اور رفتہ رفتہ اس اعتبار سے بھی صورت حال تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔

کرشن نگر کے مکان کی خرید اور اس کی ابتدائی مرمت وغیرہ کے مصارف کے بعد جو سرمایہ میرے پاس بچا تھا' اس میں سے قدر قلیل کسی ہنگامی صورت حال سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے محفوظ رکھ کر باقی کل کا کل میں نے "دارالاشاعت الاسلامیہ" میں کھپا دیا تھا۔ لیکن اس سے جو مطبوعات شائع ہو رہی تھیں' ظاہر ہے کہ وہ نہ تو "نرم و گرم نان" (HOT CAKES) کے مانند بکنے والی تھیں' نہ ہی چٹ پٹے ڈائجسٹوں کی طرح قبول عام حاصل کر سکتی تھیں' لہٰذا جلد ہی محسوس ہوا کہ کل سرمایہ منجمد (BLOCK) ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ "تدبر قرآن" کی جلد دوم کی اشاعت کے لئے مجھے ایک دوست سے کچھ رقم حاصل کرنی پڑی۔ (جو انہوں نے قرض کی بجائے شراکت کی اساس پر دی' اور افسوس ہے کہ اس

وقت میں بھی اس شراکت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ صرف ایک
کتاب کے سلسلے میں نفع ونقصان کی شراکت حساب کتاب کے اعتبار سے ناقابل عمل ہے۔
لہذا جیسے بھی بن پڑا میں نے جلد ہی ان کی رقم معذرت کے ساتھ واپس کر دی 'اگرچہ وہ اس پر
کچھ جزبز بھی ہوئے۔)

جہاں تک میڈیکل پریکٹس کا تعلق ہے' میں اپنا سات آٹھ سال کا تعارف یا پیشہ ورانہ
"نیک نامی" (GOOD WILL) کا سرمایہ تو منٹگمری (ساہیوال) ہی میں چھوڑ کر کراچی چلا گیا
تھا۔ پھر لگ بھگ ساڑھے تین سال پریکٹس سے تقریباً لاتعلق رہا۔ مزید بر آں ان گیارہ
سالوں کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا تھا' اور ایک کثیر تعداد میں نوجوان
ڈاکٹر میدان میں آ گئے تھے' ۔ ــــ چنانچہ لاہور میں تو گلی گلی ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے
مطب قائم ہو چکے تھے' ان حالات میں جان توڑ محنت سے بھی مطب بس اتنا ہی جم سکا کہ میری
اور میرے اہل وعیال کی بقدر کفاف کفالت کر سکے جبکہ " دارالاشاعت " بھی مسلسل
" ھل من مزید " کے نعرے لگا رہا تھا اور " میثاق " بھی ہر ماہ اچھے خاصے " خسارے کی
سرمایہ کاری " کا متقاضی تھا!

الغرض وسط ۷۰ء تک صحت کی خرابی' اور مالی مشکلات دونوں نے مل جل کر ایک گھمبیر
مسئلے کی صورت اختیار کر لی۔ اور اگرچہ داخلی طور پر تو یہ اطمینان حاصل رہا کہ بحمد اللہ اپنے
مقصد زندگی کی خاطر وہ صورت پیدا ہو گئی کہ ۔

خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

لیکن خارجی طور پر' عالم اسباب وعلل میں "پس چہ باید کرد ؟" کا سوال پوری شدت کے
ساتھ سامنے آ کھڑا ہوا۔

ان دونوں برادرم اقتدار احمد سے تو مکانی فصل وبُعد بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ ان
کا کاروباری مرکز بھی کراچی میں تھا اور کاروباری سرگرمیاں بھی زیادہ تر اندرون سندھ تک
محدود تھیں نیز مزید بر آں کاروباری علیحدگی کے بعد سے کچھ ذہنی اور قلبی حجابات بھی طاری ہو

ہے جن میں جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے 'ان کے کاروبار میں نمایاں کامیابیوں اور ترقیوں سے پیدا شدہ مالی حیثیت کے فرق و تفاوت کی بنا پر بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے اپنا رہائشی اور کاروباری مرکز جوہر آباد کو بنایا اور ان کے کاروبار کا دائرہ پنجاب اور سرحد میں پھیلا اور اُس میں بھی فوری طور پر بہت ترقی اور وسعت ہوئی۔ لہٰذا ان کی لاہور آمد و رفت کا سلسلہ بکثرت جاری رہتا تھا۔ انہوں نے میرے حالات کا اندازہ کر کے کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناتے 'کچھ نظریاتی اور مقصدی ہم آہنگی کے پس منظر کے باعث 'اور کچھ کاروباری اشتراک اور پھر علیحدگی کے ضمن میں اپنی بعض زیادتیوں کی تلافی کی خاطر ۶۹۔ ۱۹۶۸ء کے آس پاس مالی تعاون کی صورت پیدا کرنی چاہی لیکن میں نے کچھ طبعی غیرت اور کچھ ان کی متذکرہ بالا زیادتیوں کے شدید ردّ عمل کے باعث ان کا کسی قسم کا تعاون قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس پر انہوں نے "زبردستی کے تعاون" کی بعض نہایت دلچسپ صورتیں اختیار کیں: مثلاً ایک یہ کہ "تدبر قرآن" کی جلد اوّل کے سو نسخے اپنی جیب سے پوری قیمت پر خرید کر بعض اعزّہ و احباب کو ہدیہ کر دیئے (حالانکہ ان میں سے اکثر کے بارے میں ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کا ایک لفظ بھی پڑھیں گے۔)

دوسرے یہ کہ میرے ذاتی فون سے لمبی لمبی کاروباری ٹرنک کالیں شروع کر دیں اور میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ یا اللہ! انہیں روکوں تو کیسے؟ اور نہ روکوں تو بل کیسے ادا ہو گا؟ کہ انہوں نے دفعۃً کہہ دیا کہ اس فون کا پورا بل میں ادا کروں گا۔ اور اس پر میں سوائے خاموشی اختیار کرنے اور کچھ نہ کر سکا!

تیسرے یہ کہ اسی فون کی سہولت کے پیش نظر میرے مکان کے ایک کمرے میں اپنا لاہور آفس قائم کر دیا۔ (واضح رہے کہ ان دنوں ٹیلی فون بہت کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب تھا اور مجھے بھی صرف مطب کی ترجیح کی بنا پر حاصل ہو گیا تھا)..... اور اس کے کچھ عرصے کے بعد "حساب دوستاں در دل" کے مطابق 'گویا اس کے کرائے کے طور پر نہ صرف یہ کہ مکان کی بعض بوسیدہ چھتوں کو اپنی "تیار چھتوں" سے بدل دیا' بلکہ اُن کے دفتر کے باعث جو تنگی پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالے کے لئے دوسری منزل پر کچھ اضافی تعمیر بھی کر دی۔ جس سے

ان کی مالیت میں لامحالہ گرانقدر اضافہ ہو گیا۔
چوتھے یہ کہ جب میں نے 'میثاق' کے مالی خسارے کے ناقابل برداشت ہونے کا ذکر
یثاق' ہی میں کیا تو انہوں نے فوراً پیشکش کر دی کہ اس کا کل خسارہ میرے ذمے رہے
۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جس سے میں دفعتہً دوچار ہوا۔ اس لئے کہ اوپر کی
ذکرہ جملہ صورتیں کچھ درپردہ اور بالواسطہ تعاون کی تھیں جبکہ یہ پیشکش کھلم کھلا اور براہ
ست تعاون کی تھی۔ اور میں اپنی اُس ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر جس کا ذکر اوپر ہو
اہے اسے ٹھکرانے والا ہی تھا کہ اچانک میرے اندر ہی سے یہ آواز آئی کہ "تم 'میثاق'
ند کے دین کی خدمت کے لئے شائع کر رہے ہو' اب اگر یہ مالی اسباب کی بنا پر بند ہو گیا تو تم
ہ کو کیا جواب دو گے اگر اسی اللہ کی جانب سے یہ حجت قائم ہو کہ ہم نے تو اس کا ذریعہ پیدا
ادیا تھا' تم نے اپنی ذاتی 'انا' کو کیوں مزاحم ہونے دیا؟" بنابریں میں نے خاموشی
تیار کر لی اور اس طرح بھائی جان کے "زبردستی کے تعاون" کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔
م واقعہ یہ ہے کہ جگر کے اس شعر کے مصداق کہ ۔

احساس خودی پر ہوتی ہے اک بوجھ نگاہِ لطف و کرم
جینا وہیں مشکل ہوتا ہے' مشکل جہاں آساں ہوتی ہے

ئی جان کے اس زبردستی کے مالی تعاون سے میرے اعصابی دباؤ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی
۔ اس لئے کہ ایک تو میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی تھی اور دوسرے انہوں نے اپنی
دتیوں کے اعتراف کے ساتھ معذرت نہیں کی تھی۔
موضوع گفتگو کی تکمیل کی خاطر یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ برادرم اقتدار احمد اور بھائی
ار احمد صاحب کے علاوہ دونوں چھوٹے بھائی ابھی کسی شمار قطار ہی میں نہیں تھے۔ ان میں
ے عزیزم ابصار احمد تو انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور مالی اعتبار سے خود دوسروں کے زیر
الت تھے۔ (اُن کی بیرونی تعلیم کے جملہ مصارف برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذمے لے
ئے تھے۔) البتہ اُن کے خطوط سے گاہ بگاہ ہمت افزائی بھی ہوتی رہتی تھی اور یہ اطمینان بھی
صل ہوتا رہتا تھا کہ انہیں میں نے جس مقصد کے تحت فلسفہ کے رخ پر ڈالا تھا اور جس مقصد
داغ بیل منٹگمری کے "دار المقامہ" میں پڑی تھی اس کی جانب تسلی بخش پیش رفت ہو رہی

ہے۔ خصوصاً جب انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ لکھا کہ: "جب سے یہاں (انگلستان) آیا ہوں "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کا مطالعہ چھ مرتبہ کر چکا ہوں اور ہر بار مجھے اس سے نئی رہنمائی حاصل ہوئی ہے!" تو خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ انشاء اللہ وہ اُس مقصد کے لئے مؤثر خدمات انجام دے سکیں گے جس کا خاکہ اس کتابچے میں دیا گیا ہے۔ رہے عزیزم وقار احمد تو وہ اگرچہ اولاً برادرم اقتدار احمد اور بعد ازاں بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ کاروبار میں بالفعل شریک تھے..... لیکن کچھ عمر میں کم ہونے' اور کچھ طبعاً کم گو اور نرم مزاج ہونے کے باعث کسی معاملے میں مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکتے تھے..... تاہم ان کی بھی ہمدردیاں مجھے ہمیشہ حاصل رہیں۔

وسط ۷۰ء تک ایک جانب تو' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' متذکرہ بالا دونوں "بحران" اپنی پوری شدت کو پہنچ گئے تھے..... اور دوسری جانب ۷۰ء کے عام انتخابات کے حوالے سے ذاتی طور پر میرے لئے دو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں :۔

ایک یہ کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے دل میں کچھ تو جماعت اسلامی کے ساتھ جذباتی لگاؤ نے دوبارہ زور پکڑا..... اور کچھ ملک اور قوم کی خدمت کے اُس جذبے نے انگڑائی لی جو بہت سے آسودہ حال لوگوں کے دلوں میں کچھ ملے جلے جذبات و محرکات کی بنا پر پیدا ہو جایا کرتا ہے..... چنانچہ انہوں نے انتخابات کی منجدھار میں چھلانگ لگا دی۔ اس سے ایک تو میرے اور اُن کے مابین زندگی میں پہلی بار نظریاتی بُعد پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ حجابات جو پانچ سال کی مدت میں بمشکل کچھ کم ہونے پر آئے تھے نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم ہو گئے بلکہ پہلے سے بھی دبیز تر ہو گئے..... ثانیاً جب ان کی انتخابی مہم عروج کو پہنچی اور انہوں نے واقعتہً دیوانہ وار گاؤں گاؤں اور گلی گلی صدا لگانی شروع کی تو غالباً انہیں شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ میرا ایک بھائی زبان اور قلم دونوں کی صلاحیتوں سے کسی قدر بہرہ ور ہونے کے ناتے میری اس مہم میں مؤثر مدد کر سکتا تھا' جو وہ نہیں کر رہا!..... اور واقعہ یہی تھا کہ میں اپنے نظریاتی موقف کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باعث ان کی اس مہم سے قطعاً لا تعلق تھا۔ لہٰذا فطری طور پر ان کی طبیعت میں شدید ردِ عمل پیدا ہوا..... اور کچھ اس بنا پر' اور کچھ اس وجہ سے کہ الیکشن کی شدید

مصروفیات کے باعث ان کے کاروبار کو بھی بڑا دھکا لگا تھا‘ اُن کی جانب سے ”زبردستی کا تعاون“ یکلخت بند ہو گیا۔ (اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب حکمت مضمر تھی جس کا اندازہ بعد میں ہوا‘...... چنانچہ اس کا تذکرہ بھی بعد ہی میں ہو گا! اور در حقیقت اسی کی وضاحت کے لئے راقم کو اپنے اور بھائی جان کے مابین معاملات کے اس ناخوشگوار حصے کا ذکر کرنا پڑا..... ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بڑے بھائی کی حیثیت سے‘ بلکہ تحریک اسلامی کے ساتھ اوّلین تعارف کا ذریعہ ہونے کے ناتے مجھ پر اُن کے بے شمار احسانات ہیں۔ اور میں اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اب جبکہ وہ دنیوی کامیابیوں اور کاروباری اور پیشہ ورانہ کامرانیوں سے حصّۂ وافر حاصل کر چکے ہیں۔ اور ”مسنون عمر“ کی بھی آخری حد کو چھو رہے ہیں اُن میں دین کے لئے دوبارہ وہی جوانی والا جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو جائے.... وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز!)

دوسرے یہ کہ جمعیت علماء اسلام نے جو ان دنوں مولانا مفتی محمود احمد مرحوم و مغفور کی زیر قیادت خاصی فعّال تھی مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ میں اُن کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو بار مولانا محمد اجمل خاں اور علامہ خالد محمود صاحب میرے مطب (یا مکان) پر تشریف لائے۔ میں نے ان حضرات سے لاکھ عرض کیا کہ میں نے تو پالیسی کے اسی اختلاف کی بنیاد پر کہ الیکشن کے ذریعے پاکستان میں اسلامی نظام نہیں قائم کیا جا سکتا‘ جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی‘ اب میں کیسے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہوں۔ لیکن اُن کی جانب سے اصرار جاری رہا ۔ ادھر کرشن نگر کے حلقے کی جماعت اسلامی کی ایک رسماً متفق لیکن عملاً سرپرست شخصیت‘ حاجی محمد لطیف (مرحوم و مغفور) نے ان حضرات کو میرے پاس آتے جاتے دیکھا تو یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ حضرات کسی اور امیدوار کے لئے تعاون (SUPPORT) حاصل کرنے کی غرض سے چکر لگا رہے ہیں‘ پُر جلال انداز میں فرمایا: ”اگر یہ لوگ ایسے ہی مخلص ہیں تو آپ کو کیوں نہیں کھڑا کرتے!“ اس پر جب میں نے عرض کیا: ”حاجی صاحب! وہ تو میرے پاس اسی لئے تشریف لائے تھے!“ تو انہوں نے فوراً فرمایا کہ ”اگر ایسا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جماعت اسلامی بھی آپ کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ بلکہ آپ کو SUPPORT کرے گی!“

(واضح رہے کہ حاجی صاحب موصوف خود تو جماعت اسلامی کے علاقائی "سرپرست" تھے ہی۔ ان کے صاحب زادگان بھی اس ڈیمو کریٹک یوتھ فورس کے چوٹی کے قائدین میں سے تھے جو اس وقت جماعت کی عوامی قوت کے اہم ترین ستون کی حیثیت رکھتی تھی چنانچہ ان کے ایک صاحب زادے "شوکت اسلام" کے جلوس میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے محافظِ خصوصی کی حیثیت سے ان کے بالکل برابر ایستادہ رہے تھے!) اس پر میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ: "حاجی صاحب! میرے پاس تو شاید ضمانت کے پیسے بھی نہ ہوں!" تو انہوں نے فرمایا کہ: "زرِ ضمانت بھی میرے ذمے رہا!"

اس پر 'میں یہ انتہائی راز کی بات بتانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ 'میں نے اپنے اندر واقعۃً بالکل وہی کیفیت محسوس کی جو کسی انگریز آئی سی ایس افسر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے کسی شخص نے رشوت پیش کی تو ابتداءً تو اس نے اُسے شرافت اور ملائمت کے ساتھ ردّ کر دیا لیکن جب وہ شخص مسلسل اصرار بھی کرتا رہا اور رشوت کی رقم بھی بڑھاتا چلا گیا تو ایک خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد اُس انگریز افسر نے اُس شخص کو نہایت سختی اور درشتی کے ساتھ حکم دیا کہ "میرے کمرے سے فوراً نکل جاؤ' اس لئے کہ اب تم 'میری قیمت' کے بہت قریب پہنچ گئے ہو!" چنانچہ میں نے بھی یہ اندیشہ شدّت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر یہ بات آگے بڑھی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نفس کی گہرائیوں میں حُبِّ جاہ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے 'اور میں بھی انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے اپنی منزل کھوٹی کر لوں۔ بنابریں میں نے ملک سے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت محسوس کی اور برادر عزیز وقار احمد کو کراچی فون کر دیا کہ میرے لئے عمرے کا بندوبست کریں تاکہ ایک تو میں انتخابات کے ہنگامے سے الگ تھلگ رہ سکوں۔ اور دوسرے حرمین شریفین کی پرسکون اور روح پرور فضا میں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و فکر کر کے اپنا آئندہ لائحہ عمل طے کر سکوں۔ عزیزم وقار احمد نے سوال کیا: "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا: "تم کارروائی شروع تو کرو' میں تاریخ بھی جلد بتا دوں گا!" ... مجھے کیا پتہ تھا کہ کراچی میں یہ کام کس آسانی اور عجلت کے ساتھ ہو جاتے ہیں 'انہوں نے دوبارہ کہا کہ آپ جب بھی جانا چاہیں گے انتظام ہو جائے گا!" اس پر میں نے تو گویا اپنے طور پر بہت

مشکل ذمہ داری اُن پر ڈال دی کہ: "میں تو ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں!" لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: "بس آپ تیار ہو کر آ جائیں آپ جملہ انتظامات موجود پائیں گے!" اور واقعۃً جب میں چند دن کے اندر اندر وہاں پہنچا تو مجھے نہ صرف عُمرے کا ویزا، اور پی آئی اے کا چار ماہ کا رعائتی ٹکٹ تیار ملا ... بلکہ حفظان صحت کے ٹیکے بھی "لگے لگائے" مل گئے (یعنی بغیر ٹیکہ لگوائے مصدّقہ سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا!) .... یہ دوسری بات ہے کہ میں لاہور سے متعلقہ ٹیکے لگوا کر گیا تھا اور اس سفر میں میرے پاس دو ہیلتھ سرٹیفکیٹ تھے۔ ایک جعلی اور دوسرا اصلی۔

میرا یہ سفر جو لگ بھگ ۱۵/۱۶ر شعبان المعظم سے ۱۷/۱۸ر ذی الحج ۱۳۹۰ھ تک پورے ایک سو بیس دن (یا تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلّوں) پر محیط رہا، میری زندگی کا طویل ترین سفر بھی تھا اور ہر اعتبار سے اہم ترین بھی۔ اس لئے کہ اسی کے دوران، عین حج کے موقع پر، میں نے اپنی حیات دنیوی کا اہم ترین فیصلہ کیا۔ یعنی میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد، اور جملہ صلاحیتیں اور توانائیاں، اور کُل اوقات وقف برائے نشر و اشاعتِ دعوتِ قرآن و سعیٔ اقامتِ دین و اعلاءِ کلمتہ اللہ!!

یہ فیصلہ جو اِس وقت چند الفاظ میں بیان ہو گیا ہے، اُس وقت کئی ماہ کے مسلسل غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ہو سکا تھا، جس کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ عقل و فہم کی جملہ صلاحیتیں ماؤف سی ہو گئی تھیں، حتیٰ کہ عارضی طور پر یادداشت بھی بالکلیہ زائل ہو گئی تھی! اور چند ساعتیں تو مجھ پر فی الواقع اس حال میں گزری تھیں کہ ؎

نہ ابتداء کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں، سو یہ بھی کیا معلوم!

لہٰذا اس کے ضمن میں کسی قدر تفصیل مناسب ہے، لیکن اس سے قبل جی چاہتا ہے کہ کچھ تذکرہ اُن "فیوض الحرمین" کا ہو جائے جن سے راقم الحروف اس سفر کے دوران اپنی بساط اور ظرف کے مطابق بہرہ یاب ہوا۔ مزید برآں کچھ ذکر ان دلچسپ اور اہم حالات و واقعات کا بھی ہو جائے جو ان ایّام میں پیش آئے اور جن کی خوشگوار یادیں میری یادداشت کے محافظ

خانے میں حسین خوابوں کے مانند محفوظ ہیں۔ اس لئے کہ اس عرصے کے دوران جہاں متذکرہ بالا سوچ بچار کے ضمن میں "پیچ و تاب رازی" کی کیفیت شدت کے ساتھ طاری رہی، وہاں حرمین شریفین کی حاضری کے صدقے "سوز و ساز رومی" کی کیفیت سے بھی بالکل محرومی نہیں رہی۔ اور اگرچہ یہ حالات و واقعات اس تحریر کے مقصد سے براہ راست متعلق نہیں ہیں تاہم امید واثق ہے کہ جملہ رفقاء و احباب اور قارئین "میثاق" انہیں دلچسپ اور معلومات افزا بھی پائیں گے اور کسی قدر سبق آموزی کا ذریعہ بھی!

ان چار مہینوں کے دوران سب سے زیادہ کیف آور اور روح پرور "چلہ" تو بلاشبہ وہ تھا جو مدینہ منورہ میں بسر ہوا۔ اس لئے کہ میں اواخر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے اور چند دن مکہ مکرمہ میں قیام کرنے کے بعد (جہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے پہلی ملاقات ہوئی جو بعد کی بہت سی ملاقاتوں اور قریبی تعلقات کی تمہید بن گئی) شعبان کے آخری ایام میں مدینہ منورہ پہنچ گیا تھا۔ اور الحمدللہ کہ نہ صرف یہ کہ پورا ماہ رمضان مبارک وہیں بسر ہوا بلکہ شوال کا پہلا عشرہ بھی وہیں گزرا۔ اور اس طرح ایک چلّے سے کسی قدر زائد ہی قیام طیبہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

ان ایام اور ان کے دوران کی کیفیات کی یاد میرے لئے مستقل سرمایۂ حیات ہے۔ مسلسل چالیس روز تک مسجد نبویؐ کی با جماعت نمازیں، صبح و شام مواجہہ شریف کی حاضری اور نبی اکرمؐ کے حضور ہدیۂ سلام پیش کرنے کی سعادت، پھر مسجد نبویؐ میں افطار کا کیف آور اور سرور انگیز منظر، پھر رات بھر مسجد نبویؐ کا کھلا رہنا اور بقعۂ نور بنے رہنا ...... پھر تراویح میں حجازی لحن کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنے کا انداز، جس سے قرآن مجید خود بخود قلب و ذہن کی گہرائیوں میں جذب ہوتا چلا جائے اور اس کا نور باطن کو منور کرتا چلا جائے، پھر صلوٰۃ الوتر میں دعائے قنوت کا طول اور اس میں الحاح و زاری اور گریہ و بکاء کی کیفیات ...... پہلی بیس راتوں کے دوران بھی تراویح کے بعد جا بجا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں نوافل کی ادائیگی اور قرآن مجید کی وجد انگیز اور روح پرور قرأت، جس سے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پوری مسجد شب بیداری کر رہی ہو، اور آخری عشرے کے تو کیا ہی کہنے کہ تراویح کے بعد تھوڑا

سوا فقہ دے کر ڈھائی تین گھنٹے پر محیط "صلوٰۃ اللیل" جس میں تین سوا تین پارے روزانہ کے حساب سے ایک اضافی ختم قرآن ہوا، اور جس سے فراغت کے بعد بمشکل بھاگ دوڑ کر کے ہی سحری کی جا سکتی تھی۔

دن کے اوقات میں بھی فجر اور ظہر کے درمیان نفس کا کچھ حق استراحت ادا کرنے کے بعد ظہر تا عصر اور عصر تا مغرب "رَوْضَۃٌ مِن رِیَاضِ الْجَنَّہ" یا صفہ کے چبوترے میں سے جہاں بھی جگہ مل جاتی مسلسل تلاوت قرآن کی سعادت حاصل رہتی اور اکثر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ میری قرأت کو غور اور شوق کے ساتھ سنتے!...... الغرض ع "ہر روز روزِ عید تھا، ہر شب شبِ برات!"

طیبہ میں اُس ماہ رمضان کے دوران میرے قلب و نظر کو جو جلا حاصل ہوئی اُس کا کماحقہ بیان و اظہار تو ناممکن ہے، صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ورڈزورتھ کے ان اشعار کے مطابق کہ:

I gazed and gazed but little thought,
What wealth the scene to me had brought
For, oft when on my couch I lie,
In vacant or in pensive mood.
They flash upon my inward eye,
Which is the bliss of solitude.
And then my heart with pleasure fills,
And dances with the daffodils.

میرا حال بھی یہ ہے کہ اُس کے بعد جب کبھی اس بھری دنیا میں تنہائی کا احساس شدت اختیار کر لیتا ہے اور ایک انجانی سی اداسی اور افسردگی دل پر طاری ہو جاتی ہے تو کہیں قلب کی گہرائیوں سے طیبہ کے اُس رمضان مبارک کی کیفیات کا نشاط انگیز سرور ابھرتا ہے اور طبیعت میں ایک نیا انبساط اور انشراح پیدا ہو جاتا ہے...... مزید برآں، یہ بھی میرے قلب پر طیبہ کے اُسی رمضان مبارک کے گہرے نقش کا ثمرہ ہے کہ جیسے ہی قرآن اکیڈمی کی مسجد تیار ہوئی اس میں اولاً رمضانِ مبارک کے آخری عشرے تک قیام اللیل کا اہتمام ہوا...... اور رفتہ رفتہ بات دورۂ

ترجمۂ قرآن تک جا پہنچی، جس کے دوران بحمد اللہ مسجد نبویؐ کی متذکرہ بالا کیفیات کا ایک ادنیٰ عکس "جامع القرآن" میں نظر آنے لگتا ہے، فللہ الحمد و المنۃ

قصہ مختصر یہ کہ اگرچہ میرے لئے واضح طور پر یہ بتانا تو ممکن نہیں ہے کہ اُس رمضانِ مبارک کے دوران حرمِ مدنی کے کیا کیا فیوض مجھے حاصل ہوئے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی حسین یادیں میرے نہاں خانۂ قلب میں کچھ اس طرح پیوست ہو گئی ہیں کہ اگرچہ اس کے بعد ماہ مبارک اٹھارہ بار آ چکا ہے۔ (بقول نعیم صدیقی ؎ "اٹھارہ سال یونہی حسرتوں میں بیت گئے!") اور الحمد للہ کہ ہر سال رمضان مبارک کے فیوض و برکات سے بقدر ظرف کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور ہوتا ہے تاہم حضرت جامیؒ کے الفاظ: ؎ "خدایا آں کرم بار دگر کن!" اور پیر مہر علی شاہؒ کے الفاظ: ؎ "شالا آون وت بھی اوہ گھڑیاں!" کے مصداق ہمیشہ دل سے اک ہُوک سی اٹھتی ہے کہ کاش وہ سعادت ایک بار پھر نصیب ہو جائے اگرچہ کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اب وہاں رش بے پناہ ہوتا ہے امید کم ہی ہے کہ وہ کیف اور سرور کبھی "بار دگر" حاصل ہو سکے!

آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنّوریؒ بھی اعتکاف کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ اُن کا قُرب میرے لئے ویسے بھی "نافلۃً لک" کے مصداق ایک اضافی سعادت کا ذریعہ تھا۔ مزید بر آں میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اُن کی خدمت میں اپنا کتابچہ 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' پیش کیا کہ "میں اسے بڑے پیمانے پر شائع کرنا چاہتا ہوں، آپ زحمت فرما کر اس پر ایک نظر ڈال لیں اور کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو متنبہ فرما دیں"...... اور میں اسے اپنے اور اپنی قرآنی تحریک پر اللہ تعالیٰ کے فضل کا مظہر سمجھتا ہوں کہ مولانا رحمہ اللہ نے اس کتابچے کا مطالعہ بحالتِ اعتکاف فرمایا...... اور صرف ایک جملے میں لفظی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ جس کی میں نے آئندہ ایڈیشن میں تعمیل کر دی۔

مدینہ منورہ میں میرا مستقل قیام مولانا عبد الغفّار حسن مدظلہ کے مکان پر رہا۔ اور اگرچہ میں نے کئی بار درخواست کی کہ وہ مجھے اجازت دے دیں کہ میں کسی ہوٹل وغیرہ میں منتقل ہو جاؤں لیکن انہوں نے کمالِ شفقت سے اپنے ہی پاس مقیم رکھا۔ اور اس حقیقت کا ذکر نہ کرنا

ا شکری کے ذیل میں آئے گا کہ لگ بھگ ڈیڑھ ماہ کے مسلسل قیام کے باوجود ان کی جانب سے تواضع اور مہمان نوازی میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ترقی ہی ہوتی چلی گئی۔

ان کے صاحب زادے برادرم صہیب حسن بھی جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد اُن دنوں سعودی حکومت کی جانب سے مشرقی افریقہ میں "مبعوث" اور تعلیمی و تبلیغی خدمت میں مشغول تھے، اپنی سالانہ تعطیلات پر مدینہ منورہ آ گئے تھے۔ (آج کل وہ یہی خدمات انگلستان میں سرانجام دے رہے ہیں) ۔ ان کی رفاقت اور معیت بھی اس پورے عرصے کے دوران میرے لئے ازبس غنیمت ثابت ہوئی۔ بلکہ اُن کی ہمراہی میں ایک دو روزہ یادگار سفر الرّیاض کا بھی ہوا۔ جس کے دوران حجاز او نجد کے مابین تمدن و ثقافت کے نمایاں فرق و تفاوت کا علم حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ اور برادرم صہیب حسن دونوں کو اس مہمان نوازی اور خاطر مدارات کا اجر جزیل عطا فرمائے۔

الحمدللہ کہ راقم ہرگز کسی مغالطے یا خبط ذہن میں مبتلا نہیں ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قافلے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا جو براہ راست تحدیث الٰہی اور بشاراتِ ربانی سے مشرف ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے قیام طیبہ کے دوران بعض بالواسطہ بشارتیں راقم کو حاصل ہوئیں جن کا تذکرہ محض تحدیثاً للنعماء کیا جا رہا ہے :-

۱۔ ایک روز مجھے مسجد نبویؐ میں بعض حضرات نے بتایا کہ ایک بزرگ تمہیں بڑے والہانہ انداز میں تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' کا مطالعہ کیا ہے اور جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہو ملاقات کے لئے بہت بیتاب ہیں۔ اگلے روز میں باب مجیدی سے مسجد نبویؐ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ کسی کی نشاندہی پر وہ بزرگ دوڑ کر میرے پاس آئے اور نہ صرف یہ کہ نہایت گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا بلکہ میری پیشانی اور داہنے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ کہے وہ نقل نہیں کیے جا سکتے! ادھر میں اتنا خجل اور محجوب تھا کہ نگاہ بھر کر ان کے چہرے کو دیکھ بھی نہ سکا۔ تاہم راقم کو بہت مسرت حاصل ہوئی کہ اس کتابچے کی اس انداز میں مدینہ منورہ میں

پذیرائی مجھ ایسے شخص کے لئے یقیناً بہت بڑی بشارت ہے!

۲۔ اسی طرح ایک روز میں اشراق کے بعد سویا ہوا تھا کہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے ایک ملاقاتی تشریف لے آئے۔ اور چونکہ میرا قیام مولانا کے مکان کی بیٹھک ہی میں تھا اور مولانا نے وہیں ان کا استقبال کیا لہٰذا میری بھی آنکھ کھل گئی۔ تاہم میں چادر اوڑھے اس انتظار میں لیٹا رہا کہ جیسے ہی وہ صاحب رخصت ہوں میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا جاؤں ... کہ اچانک ان کی ایک بات نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا ... وہ مولانا سے کہہ رہے تھے کہ "مولانا! دو ماہ قبل میں لاہور گیا تھا۔ وہاں میں نے ۲۷ رجب کی شب کو ایک مسجد میں معراج النبیؐ کے موضوع پر ایک تقریر سنی ... "اس کے بعد جو تحسین آمیز کلمات انہوں نے کہے انہیں بھی نقل کرنا مناسب نہیں ہے' البتہ اس پر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ "بارالٰہا! کہاں میں اور کہاں میری تقریر کی ایسی پذیرائی کہ اُس کا تذکرہ ان شاندار الفاظ میں مدینۃ النبیؐ میں ہو رہا ہے!" گویا ع "اک بندہ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!" اور ع "یہ نصیب 'اللہ اکبر' لوٹنے کے جائے ہے!" ... بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب کراچی کے مشہور ڈینٹل سرجن اور نامور مذہبی و سماجی کارکن ڈاکٹر الٰہی علوی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے' جن کا خاصا بڑا کاروبار صدر' کراچی میں ہے! ... میں نے اپنی اُسی طبعی محجوبیت کی بنا پر نہ اس وقت اُن سے تعارف حاصل کیا' نہ ہی مولانا کو یہ بتایا کہ یہ میری تقریر کا تذکرہ تھا۔ البتہ بعد میں اُن سے تعارف بھی ہوا اور وہ میرے کراچی کے دروس و خطابات میں ذوق و شوق کے ساتھ شرکت بھی فرماتے رہے!

لہ میرے ساتھ اسی نوعیت کا "حادثہ" نومبر ۱۹۵۴ء میں کراچی میں بھی ہوا تھا کہ جب میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جہانگیر پارک میں ڈاکٹر عمر ملک کے زیر صدارت منعقدہ جلسۂ عام میں "طلبہ کے مسائل اور ان کا حل" کے موضوع پر ایک گھنٹہ چالیس منٹ کی تقریر کر کے ڈائس سے اترا تو ایک سفید ریش بزرگ نے جو ایک جانب کھڑے ہوئے تھے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور نہایت جذباتی انداز میں سینے سے لگا کر فرمایا: "عزیزم! آپ جتنی دیر وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے ہیں' میں آپ کی جگہ مولانا مودودی کو دیکھتا رہا ہوں!" (واضح رہے کہ مولانا مودودی مرحوم ان دنوں ملتان جیل میں نظربند تھے)۔

اُن دنوں کی چند اور ملاقاتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

عیدالفطر کے روز سعودی عرب کے مختلف شہروں میں مقیم جماعت اسلامی کے چند حباب راؤ محمد اختر صاحب کی معیت میں مولانا عبدالغفار حسن سے ملاقات کے لئے تشریف ائے تو چونکہ میں بھی وہیں مقیم تھا لہٰذا مجھے بھی اس ملاقات میں شمولیت کا "شرف" حاصل ہوا چونکہ اس وقت پاکستان کے (دسمبر ۷۰ء کے) عام انتخابات بالکل سر پر تھے' لہٰذا نفتگو ان ہی کے بارے میں ہوتی رہی اور سب حضرات اپنے اپنے تخمینے اور اندازے بیان رتے رہے۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ جماعت اسلامی کو مرکزی اسمبلی کی کم از کم ساٹھ نشتیں مل جائیں گی۔ زیادہ محتاط حضرات بھی کم از کم تیس چالیس کے بارے میں تو یقین کامل رکھتے تھے۔ ادھر میں جان بوجھ کر خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا۔ کہ اچانک راؤ صاحب نے (واضح رہے کہ وہ جمعیت طلبہ کے زمانے میں ہمارے "برخورداروں" میں شامل تھے!) مجھ سے براہ راست سوال کر دیا کہ : "ڈاکٹر صاحب آپ کی رائے کیا ہے؟" میں نے عرض کیا کہ : "میری بات آپ حضرات کو پسند نہیں آئے گی' لہٰذا اصرار نہ فرمائیں!" ..... لیکن جب ان کی جانب سے شدید اصرار ہوا تو میں نے عرض کیا کہ : "میرے نزدیک مغربی پاکستان میں تو آپ حضرات کو صرف چار یا پانچ سیٹیں ملیں گی۔ البتہ مشرقی پاکستان میں آٹھ سے دس تک کا معاملہ ہو سکتا ہے!" اس پر ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا۔ اور سب نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب' کم از کم تیس سیٹوں کے بارے میں تو ہمارے دشمنوں کا بھی یہ خیال ہے کہ ہمیں بہرصورت مل کر رہیں گی!" جس پر میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ : "آپ مجھے خواہ دوست سمجھیں' خواہ دشمن' بہرحال میری رائے یہی ہے جو میں نے عرض کر دی!"

چند ہی دنوں کے بعد الیکشن ہوا اور اس کے نتائج وہیں مدینہ منوّرہ میں مولانا عبدالغفار حسن کی اسی بیٹھک میں سنے تو راقم خود حیران و ششدر رہ گیا کہ مغربی پاکستان کی حد تک تو میری رائے حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ براہ راست جماعت کے ٹکٹ پر تو چار ہی امیدوار کامیاب ہو سکے تھے' پانچویں مولانا ظفر احمد انصاری تھے جو آزاد امیدوار کی حیثیت میں' لیکن جماعت اسلامی کی سپورٹ ہی کی بنیاد پر کامیاب ہوئے تھے! مشرقی پاکستان

کے بارے میں بھی میری رائے صحیح ہی ثابت ہوئی تھی اس لئے کہ دونوں کی تعداد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں جماعت کا معاملہ مغربی پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دوگنا بہتر رہا تھا۔ اگرچہ سائکلون کی تباہی سے پیدا شدہ اثرات اور اس کے ضمن میں بی بی سی کے گمراہ کن پروپیگنڈے نے نتائج کو بالکل الٹ کر رکھ دیا تھا!

۲۔ عید کے دوسرے دن بخاری حضرات کی رباط میں مولانا بنوریؒ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہاں اچھی خاصی مجلس جمی ہوئی تھی۔ ادھر میں ایک ذاتی مسئلے میں مولانا سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا تھا کافی انتظار کے بعد میں نے درخواست کر ہی دی کہ مجھے چند منٹ تخلیہ میں درکار ہیں۔ مولانا کمال شفقت و مروت سے وہاں سے اٹھ کر مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے ۔ وہاں میں نے عرض کیا کہ : "مولانا! میں بہت پریشان ہوں کہ میرا دل مسجد نبویؐ میں تو خوب لگتا ہے' مسجد حرام میں بالکل نہیں لگتا' اور ہزار کوشش کے باوجود وہاں دلجمعی حاصل نہیں ہوتی!" میری بات سن کر مولانا پر دفعۃً رقّت طاری ہو گئی اور انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا : "ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایک دینی و روحانی معاملے میں رہنمائی چاہی ہے۔ ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دنیا ہی کے مسائل و مشکلات کا رونا رونے آتا ہے۔" ساتھ ہی انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ میرے لئے اپنے خصوصی اوقات میں صمیم قلب سے دعا کریں گے۔ میرے دل پر مولانا رحمۃ اللہ کے خلوص و اخلاص اور سادگی اور صاف گوئی کا بہت اثر ہوا۔ اور اس کے بعد میں اپنے کراچی کے دوروں کے مواقع پر حتی الامکان مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور اُن کی شفقت اور عنایت سے مستفید و مستفیض ہونے کی کوشش کرتا رہا۔ اور خود مولانا نے بھی ایک بار اپنی دورۂ حدیث کی کلاس سے مجھے دعوت خطاب دے کر اور پھر میری درخواست پر پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ ۱۴ تا ۱۶ ار دسمبر ۱۹۷۳ء کے افتتاحی اجلاس میں شرکت فرما کر اور ایک شب میرے ہی غریب خانے پر قیام فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔

۳۔ مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے مکان پر ایک یادگار ملاقات مولانا محمد علی لکھویؒ (والد ماجد مولانا محی الدین لکھوی و مولانا معین الدین لکھوی) سے ہوئی۔ جس کے دوران ایک تو مفصل گفتگو علم تفسیر پر ہوئی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ بھی اپنی

تمام تر وہابیت اور روایت پرستی کے باوجود کسی نہ کسی درجے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے خیالات سے متأثر تھے...... اور دوسرے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ایک اہم اور عبرت انگیز واقعہ علم میں آیا۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ وہ علماء ہند کے اُس وفد میں شامل تھے جس نے ملک عبدالعزیز ابن سعود مرحوم سے جدہ میں ملاقات کی تھی تاکہ انہیں فتحِ حجاز پر مبارکباد بھی دے اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کرے کہ حرمین شریفین کو جملہ مسلمانانِ عالم کے لئے "کھلے شہر" قرار دے دیا جائے۔ مولانا نے بتایا کہ جب ہم لوگوں نے مبارکباد پیش کی تو شاہ مرحوم سراپا عجز و تواضع بن گئے اور کہنے لگے کہ: "یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہم ایسے بادیہ نشینوں اور "اونٹ کا پیشاب پینے والوں" کو حرمین شریفین کی خدمت سونپ دی ہے!" ...... لیکن جب ہم نے اپنا دوسرا مدعا بیان کیا تو بادشاہ کے تیور ایک دم بدل گئے اور ان کا ہاتھ بے اختیار تلوار کے دستے پر پہنچ گیا اور انہوں نے غیظ و غضب کے عالم میں ارشاد فرمایا: "کیا کہا؟ ہم نے حجاز کی حکومت بزورِ شمشیر حاصل کی ہے! اب اسے جملہ مسلمانان عالم کے حوالے کیوں کر دیں؟" ...... اس سے اندازہ ہوا کہ آلِ سعود کے مزاج میں آغاز ہی سے نجدی مذہبیت کے ساتھ ساتھ دولت اور حکومت کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ (اس کا ایک نہایت تلخ مشاہدہ راقم کو اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی اجلاس کے ضمن میں بھی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل پھر کبھی سہی)

اپنے ذاتی مسئلے میں رہنمائی کے لئے میں نے مکہ مکرمہ میں طواف اور سعی کے دوران بھی قلب کی گہرائیوں سے دعائیں کی تھیں۔ اور پورے ماہ رمضان مبارک کے دوران بھی میں مسلسل دعا بھی کرتا رہا تھا۔ اور کسی قدر سوچ بچار بھی کرتا رہا تھا اور اگرچہ رمضان مبارک کی اپنی مصروفیات اور خصوصاً روحانی کیف و سرور نے مسئلے کے حل کی جانب زیادہ متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دی تھی، تاہم تحت الشعور میں "پس چہ باید کرد؟" اور "To. be or not to be is the Question" کی ادھیڑ بن دھیمے دھیمے انداز میں جاری رہی تھی!

رمضان مبارک کے اختتام پر ایک تو ویسے بھی ایک نوع کے۔ Anti-Climax کی سی

کیفیت لازماً پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ خلا کا سا احساس ہونے لگتا ہے اور ایک گونہ اداسی اور افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے' اور طیبہ کے رمضان کے بعد تو یہ معاملہ بہت ہی نمایاں تھا پھر پاکستان کے عام انتخابات میں تمام مذہبی جماعتیں جس طرح چاروں شانے چت ہوئی تھیں اور بڑے بڑے سیاسی اور صحافی پنڈتوں کی پیشین گوئیوں کے بالکل برعکس پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں خالص سیکولر مزاج کی حامل جماعتوں کو واضح اور مطلق اکثریت حاصل ہو گئی تھی' اس کا بھی دل و دماغ پر شدید اثر تھا۔ ایسے میں جب ذہن نے توجہ کے پورے ارتکاز کے ساتھ اپنے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا' اور ایکؔ جانب معاش اور اہل و عیال' دوسریؔ جانب دین اور اس کی دعوت و تحریک' اور تیسریؔ جانب "عافیت جاں' راحت تن' صحت داماں" کے تلخ مگر سنگین حقائق ایک دم ذہن میں تازہ ہو گئے تو میں نے بالکل ایسے محسوس کیا جیسے میں پہاڑ تلے آ گیا ہوں۔

ایک بات تو اس عرصے کے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری غور و فکر کے نتیجے میں بالکل قطعی اور دو ٹوک انداز میں سامنے آ چکی تھی..... یعنی یہ کہ معاش و مطب اور دعوت و تحریک' دونوں کو میں جس انداز میں گزشتہ پانچ سال کے دوران ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا تھا وہ اب مزید جاری رہنا ناممکن تھا اور حالات ایک ایسے فیصلہ کن دوراہے پر آ پہنچے تھے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے انداز میں ایک دو ٹوک فیصلہ لازمی تھا۔

مجھے اپنے سامنے دو راستے واضح طور پر نظر آ رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو ذہن و قلب کی کامل یکسوئی کے ساتھ اختیار کرنا اور دوسرے کو واضح شعوری فیصلے کے ساتھ ترک کرنا ناگزیر ہو گیا تھا :-

ایکؔ یہ کہ مطب بند کر دوں۔ اور پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت اور تحریک کے لئے وقف کر دوں۔ اور معاش کے معاملے میں کُلّیتہً اللہ پر توکّل کروں اور اس یقین کا سہارا لوں کہ۔ "وَكَأَيِّنْ مِنْ دَآبَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۝" (العنکبوت۔ ۶۰) ..... اور

دوسرےؔ یہ کہ دعوت و تحریک کے ضمن میں جتنی پیش رفت ہو چکی ہے اس سے بھی کسی

ذر پسپائی اختیار کر کے اسے ایک سطح پر منجمد (SEAL) کر دوں' اور اپنی اصل توجہ کو مطب اور معاش پر مرتکز کر کے ثانوی درجے میں درس و تدریس کا کام جس قدر بھی ہو سکے اُس پر اکتفا کر لوں۔

پہلی بات کہنے میں جس قدر آسان تھی' واقعتہً اتنی ہی مشکل اور کٹھن تھی۔ اور اگرچہ بحمد اللہ میرا ذاتی رجحان اسی کی جانب تھا لیکن یہ حقائق بھی پوری شدت کے ساتھ پیش نظر تھے کہ مطب کے سوائے معاش کا کوئی ظاہری یا مرئی ذریعہ یا وسیلہ سرے سے موجود نہ تھا' چنانچہ نہ کوئی زمین تھی نہ جائداد' اور روئے ارضی پر میری کل "ملکیت" اُس مکان کی صورت میں تھی جس میں میں اور میرے اہل و عیال رہائش پذیر تھے' لہٰذا وہ بھی کسی آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا رہی نقد پونجی تو وہ ایک قدر قلیل کے سوا سب کی سب "دارالاشاعت" کے اسٹاک کی صورت میں جامد (BLOCK) ہو چکی تھی' دوسری جانب میں تنہا نہ تھا بلکہ نو دس افراد کے کنبے کا واحد کفیل تھا' پھر تا حال نہ کوئی جماعت تھی نہ تنظیم جس کی جانب سے "کفاف" کی توقع کی جا سکے۔ رہا خاندان' تو اس کا شیرازہ بھی بالکل منتشر ہو چکا تھا اور صورت بالکل وہ بن چلی تھی کہ ؎ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" الغرض' یہ تمام تلخ تر سنگین حقائق مجھے اپنے سر پر بالکل "و رفعنا فوقکم الطور" کی سی کیفیت کے ساتھ معلق نظر آ رہے تھے۔ اور ان سب پر مستزاد' اور بعض پہلوؤں سے ان سب سے مشکل سوال یہ تھا کہ اگر۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کے مصداق ان تمام حقائق و واقعات کو نظر انداز کر کے چھلانگ لگا دی جائے تو آیا یہ دین اور شریعت کی رو سے جائز بھی ہو گا یا نہیں؟

رہی دوسری صورت تو یہ آسان بھی تھی اور دنیا کے عام دستور اور چلن کے موافق بھی..... لیکن مجھے یہ صریحاً "خودکشی" کے مترادف نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ میں نے پورے بیس سال قبل اٹھارہ برس کی عمر اور نیم شعوری کے دور میں "فرائض دینی" کے ایک خاص تصور کے مطابق اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر کے سفر کا عملاً آغاز کر دیا تھا۔ پھر جیسے

جیسے معلومات میں اضافہ ہوا' اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی اس تصور اور رخ کے بارے میں اعتماد اور یقین میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب قرآنِ حکیم اور سنت و سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تک براہ راست رسائی ہوئی تب تو "وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ" کے مصداق پورا انشراح اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ۔ ہم جا ایں جا است!" اور "اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ" ...... پھر اس ذہنی اور قلبی انشراح کے ساتھ ساتھ بحمد اللہ عملی پیش قدمی بھی جاری رہی تھی۔ چنانچہ زمانہ طالب علمی میں اسی تصور کے حسن معنی کے خاطر خوب سوچ سمجھ کر اور پورے شعوری طور پر اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کیریئر کی قربانی کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسلسل بیس برس تک بفضلہ تعالیٰ جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں اسی رخ پر صرف کئے رکھی تھیں۔ (اس میں جو ذرا سی کی اُن تین سالوں کے دوران آئی تھی جو مشترک خاندانی کاروبار میں شمولیت کی صورت میں بسر ہوئے' تو اس کا اصل سبب بھی "سیر عن اللہ الی اللہ" کے مانند اسی مقصد زندگی کے نام پر دی جانے والی دعوت کے سوا کچھ نہ تھا۔)
اور بحمد اللہ اُس وقت تک میرا ضمیر بالکل مطمئن تھا کہ بفضلہ تعالیٰ میں نہ صرف یہ کہ ۔

"واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریّتِ جاں' راحتِ تن' صحّتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی"

کے معیار پر پورا اترا تھا...... بلکہ میں نے اپنے تصوّرات و معتقدات اور زندگی کے رُخ اور مقصد کے خاطر "غیروں" کے "ناوکِ دشنام" کے وار بھی خوشدلی سے سہے تھے اور "اپنوں" کے "طرز ملامت" کی بھی ہر ادا کو برداشت کیا تھا۔ اور جہاں اپنے موقف کی صحت کے یقین کی بنیاد پر دشمنوں سے جنگیں لڑی تھیں وہاں اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دوستوں اور بزرگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی...... لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس سب کے بعد اگر اب' جبکہ مجھ پر اللہ کا مزید کرم یہ ہو گیا تھا کہ اسّی اللہ نے اپنی کتابِ حکیم کے ساتھ قلبی اُنس اور ذہنی مناسبت عطا فرمادی تھی اور نہ صرف یہ کہ اس کے فہم کے لئے میرے ذہن و قلب کے دروازے کھول دیئے تھے بلکہ اس کی تفہیم و تبلیغ کے لئے میری زبان کو بھی

ں کر دیا تھا محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا جسم و جان کی صحت و خیریت کی خاطر میں نے
راہ سے انحراف تو کجا اس کی ترجیحات (Priorities) میں کوئی ردّ و بدل بھی کیا تو میں یقیناً
"میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" ...... اور ع "وہ بد نصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں
!" کا مصداق کامل بن کر رہ جاؤں گا۔ پھر اس معنوی خود کشی کے بعد محض حیوانی
ضرورتوں کی خاطر اور ایک جدید طبی اصطلاح کے مطابق 'Human Vegetable' کی
صورت میں زندہ رہنا "چہ ضرور؟" گویا ع "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا!" [1]

الغرض 'یہ تھی وہ ادھیڑ بُن جس میں میں رمضان مبارک کے بعد شدت کے ساتھ مبتلا ہو
گیا تھا۔ کہ دل پہلی راہ کی جانب کھینچتا تھا اور توکّل و تفویض کی راہ دکھاتا تھا تو نفس دوسرے
راستے کی طرف رہنمائی کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ "رشوت" بھی پیش کرتا تھا کہ سعودی عرب کی
ملازمت اختیار کر لو، تنخواہ بھی اچھی ملے گی، حج اور عمروں کی سہولت بھی میسّر رہے گی، اور
حرمین کی نمازوں کے ذریعے اجر و ثواب کے انبار بھی جمع کیے جا سکیں گے، جن سے کسی نہ کسی
حد تک دعوت و اقامتِ دین کی راہ سے پسپائی اختیار کرنے کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ (واضح
رہے کہ اس وقت تک سعودی عرب میں پاکستانی ڈاکٹروں کی مانگ بہت تھی!)

میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا، اور اس شش و پنج نے مجھے بالکل اس کیفیت سے دوچار
کر دیا تھا جو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے جو ایک حدیث
میں وارد ہوئے ہیں، یعنی۔ "قد امرضتنی و اسقمتنی و احزنتنی" [2] کہ اچانک
لندن سے برادر عزیز ابصار احمد کی زوردار دعوت موصول ہوئی کہ آپ کے پاس حج تک کافی

---

[1] کسی غیر معروف شاعر کے یہ دو اشعار مجھے بے حد پسند ہیں: ؎

اِک تصور کے حسنِ معنی پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

[2] "جس نے مجھے بیمار کر دیا ہے اور نڈھال کر دیا ہے اور غمزدہ کر دیا ہے"۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث میں وارد ہوئے ہیں جسے احمدؒ، بزارؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے حدیث حسن قرار دیا ہے!

وقت ہے کیوں نہ ایک چکر انگلستان کا لگا لیں؟...... میرے دل نے بھی صلاح دی کہ زندگی کا اہم ترین اور مشکل ترین فیصلہ مسلسل ایک ہی فضا میں رہتے ہوئے کرنے سے بہتر ہے کہ ایک مختلف بلکہ مخالف ماحول میں اپنی قوتِ ارادی اور ذہن و قلب کی استقامت و مقاومت کو آزما لیا جائے... چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا۔ اور برادرم صہیب حسن کی معیت میں دوسرا عمرہ ادا کرتے ہوئے جدّہ آنا ہوا۔ اور وہاں بھی انہی کی رہنمائی میں لندن کے لئے ویزا کے حصول اور پھر سستے ٹکٹ کی تلاش کے مراحل طے ہوئے، اور اغلباً ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو میری لندن اور اُن کی نیروبی روانگی ہو گئی۔ اور غالباً ۱۵ر دسمبر کی سہ پہر کو جدّہ ہی میں میرے اعصاب پر جو شدید دباؤ پچھلے دو ہفتوں کے دوران رہا تھا، اس کا ظہور اس طور سے ہوا کہ مجھے دفعتاً اپنے ذہن میں ایک مہیب خلا محسوس ہوا اور میری یادداشت یکسر جواب دے گئی۔ چنانچہ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے میری نگاہوں کے سامنے کی چیزوں کے سوا ہر شے اور ہر بات میرے ذہن سے اوجھل اور حافظے سے محو ہو گئی ہے۔ اس روز چند گھنٹے مجھ پر جس شدید الجھن میں گزرے اس کی یاد ہی سے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اور میں اللہ کی پناہ مانگنے لگتا ہوں۔ میری اس کیفیت پر برادرم صہیب حسن بھی سخت پریشان ہوئے تاہم وہ ہر طرح مجھے سکون پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ رات کی آمد کے ساتھ ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی اور میں گویا دوبارہ دنیا میں آ گیا۔ (جاری ہے)

اسلام میں داڑھی کا مقام

—— — ازقلم: حافظ خالد محمود خضر ——

تنظیم اسلامی ایک انقلابی جماعت ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ کا حکم اور اس کا دین غالب و
بلند کرنے کا علم لے کر اٹھی ہے۔ رفقائے تنظیم کی زندگیوں کا مقصد اور نصب العین اس
ہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور استعدادات کے ساتھ جدّوجہد اور کشاکش کے ذریعے رضائے
ں کا حصول ہے۔ اس انقلابی تنظیم کے رفقاء لفظ "انقلاب" کے معنی و مفہوم سے بھی
بے خبر نہیں ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق اگر ایک طرف اصطلاحاً کسی ملک یا معاشرے کے
ماعی نظام میں کسی نوع کی اساسی نوعیت اور قابلِ لحاظ مقدار کی حامل تبدیلی پر ہوتا ہے تو دوسری
ف اس کے لفظی معنی بدل جانے اور لوٹ آنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ "انقلاب اسلامی"
ے علمبردار ایک طرف اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ و اقامت دین کے لئے جہد و کوشش کرتے
ئے اس راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو دوسری طرف خود اپنی
رگیوں میں بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔
وں نے جس دین کو دینِ حق سمجھا ہے اور اس کے نظامِ عدل و قسط کے فیوض و برکات سے وہ
ے عالم کو مستفیض کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے قریبی حلقۂ اثر، اپنے گھر اور اپنی ذات کو اس کے
رے سے محروم نہیں رکھتے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو شخص اپنے گھر کی چار دیواری میں اسلام
ظام نافذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اپنے پانچ چھ فٹ کے جسم پر حاکم حقیقی کا حکم جاری و
ری نہیں کر سکتا وہ اگر اس زعم میں مبتلا ہے کہ اس کی کوشش و کاوش سے معاشرے میں کوئی
ل لحاظ تبدیلی آ سکتی ہے تو ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں!

موجودہ دور میں "اقامتِ دین" کے لئے کام کرنے والی جماعتوں کے درمیان "تنظیم اسلامی" اگرچہ ایک چھوٹے سے قافلے کا نام ہے لیکن اس کے لئے یہ مابہ الامتیاز ہے کہ میر کارواں کی حقیقت شناس نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ راہ حق میں صرف انہی جانوں کا خون رنگ لاتا ہے جو تربیت و تزکیہ کی بھٹی سے گزر کر کندن بن چکی ہوں اور جن کے ظاہر و باطن میں "اسلامی انقلاب" کا عکس نظر آ رہا ہو...... چنانچہ "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" کے فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں رفقائے تنظیم کو انکی نجی زندگیوں اور اپنے اپنے دائرۂ مسئولیت میں اسلامی تعلیمات و احکامات کے مطابق تبدیلیاں لانے کی ہدایات دی جاتی ہیں... اور اس نعمت پر قسامِ قسمت کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی رفقائے تنظیم کو دین کے ایسے احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہوئی ہے جو معروف معنوں میں بڑے دیندار اور دین پسند طبقات کے ہاں بھی لائقِ اعتناء قرار نہیں پاتے۔ مثلاً شادی بیاہ کی غیر اسلامی رسومات سے اعلانِ برأت اور ستر و حجاب کے شرعی احکام پر عمل درآمد یقیناً ایسے اقدامات ہیں جن کا حوصلہ وقت کے بڑے بڑے خدامِ دین میں بھی (الاماشاءاللہ) نہیں پایا جاتا۔ لیکن انہی اقدامات پر اکتفاء کرتے ہوئے تربیت کے مرحلے کی تکمیل کا کسی بھی درجے میں احساس ایک خطرناک غلطی ہوگی۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ رفقائے تنظیم قرآن و سنت کے معیار کے مطابق حقیقی مسلم و مومن بننے کے لئے جہدو کوشش کرتے رہیں۔ اس ضمن میں ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح یکساں ضروری ہے۔ باطنی طور پر وہ ایمانِ حقیقی 'تقویٰ' خدا ترسی اور اسلامی اخلاق کے پیکر ہوں تو ان کے ظاہر میں بھی اُس نقشے کا عکس موجود ہو جو نقشہ ہمیں حدیث و سیر کی کتابوں میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی ظاہری وضع قطع اور چال ڈھال کے متعلق ملتا ہے۔ ظاہری وضع قطع کے ضمن میں ایک نہایت اہم چیز سنت نبویؐ کے مطابق چہرے کی تزئین ہے۔ پیشِ نظر تحریر میں دین میں داڑھی کی اہمیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شرعی مقدار کی طرف بھی توجہ دلائی جائے گی تاکہ اس معاملے میں کوتاہی کرنے والے حضرات اپنے عمل کی اصلاح کی طرف مائل ہو سکیں۔

تقاضائے فطرت...... فطرتِ انسانی میں بھلے برے کی تمیز فاطرِ فطرت کی طرف سے ودیعت شدہ ہے اور ایک سلیم الفطرت اور سلیم الطبع انسان اپنے نورِ فطرت کی روشنی ہی میں ایسی

وضع قطع اختیار کر سکتا ہے جو احسن الخالقین کے منشاء کے مطابق ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

عشر من الفطرة۔ قص الشارب' واعفاء اللحیہ' والسواک' واستنشاق الماء' وقص الاظفار' وغسل البراجم' ونتف الابط' وحلق العانة'۔ وانتقاص الماء... الخ

ترجمہ۔ "دس چیزیں فطرت سے ہیں۔ مونچھیں کٹوانا' داڑھی بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنا' ناخن کاٹنا' انگلیوں کے جوڑوں کے اوپر کے حصے کو صاف رکھنا' بغل کے بال صاف کرنا' زیر ناف کے بال صاف کرنا' پانی سے استنجاء کرنا۔ اور راوی کا کہنا ہے کہ وہ دسویں چیز بھول گیا۔ (مسلم باب خصائل الفطرة)

اس حدیث کی تشریح میں محدثین کرام نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان فطری امور کو ترک کر دینے والا اشرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی کی صورت انسانوں جیسی ہی نہ رہی تو مسلمانوں جیسی کہاں رہے گی!

ابلیس لعین جب نافرمانی و سرکشی کے باعث بارگاہِ رب العزت سے دھتکارا گیا تو اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور کہا تھا: "وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ"۔ (ترجمہ) "اور میں ان کو حکم دوں گا جس سے یہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے"۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ داڑھی منڈانا بھی اس صورت بگاڑنے میں شامل ہے۔ گویا آدمؑ کا ازلی دشمن شیطان مردود ابن آدم کو راہِ ہدایت سے بھٹکانے اور گمراہی کے گڑھوں میں دھکیلنے کے لئے جو ذرائع اور ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے خوبصورت بننے کا جھانسہ دے کر اسے اس کی فطری زینت سے محروم کر دیتا ہے۔

جملہ انبیاء کی سنت

انسانوں میں انبیائے کرامؑ (علیہم الصلوٰة والسلام) وہ ممتاز اور برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کا نورِ فطرت درجۂ کمال کو پہنچا ہوتا ہے' اور اس کے ساتھ نورِ وحی کا اتصال نور علیٰ نور کا مصداق کامل ہے..... یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے مندرجہ بالا حدیث میں "فطرت" سے سننِ انبیاء مراد لی ہیں۔ یعنی مذکورہ دس چیزیں (جن میں سے اوّلین مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا

بڑھاتا ہیں) جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہیں' جو بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے اور ہمیں ان کی اقتداء و پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔
چنانچہ سورۃ الانعام کے رکوع نمبر ۱۰ میں اٹھارہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اسمائے گرامی ذکر کر کے فرمایا گیا کہ انبیائے کرامؑ کی برگزیدہ جماعت ہی صراط مستقیم پر گامزن تھی اور اس کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام۔ ۹۰)
ترجمہ۔ "یہ (انبیاء) ہی ایسے حضرات تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی تھی' تو آپؐ بھی ان ہی کے طریقے پر چلیئے!"

اتباع رسولؐ کا تقاضا

دنیا کا عام دستور ہے کہ لوگ جس شخصیت سے محبت کرتے ہیں یا کسی وجہ سے اس سے متاثر ہوتے ہیں اس کی وضع قطع اور چال ڈھال اختیار کرنے کو باعث فخر سمجھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب آنجہانی ماؤزے تنگ کی "ماؤ کیپ" سوشلسٹ دنیا کے علاوہ ہمارے یہاں کے ماؤ نواز حلقوں میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوئی تھی۔ اسی طرح بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح سے اظہار عقیدت کے طور پر ان کی ٹوپی اور شیروانی نے ہمارے لئے قومی لباس کا درجہ اختیار کر لیا۔ اس ضمن میں سکھ مذہب کے پیروکار اس انتہا پر پہنچے کہ اپنے گرو گوبند سنگھ کے اتباع میں انہوں نے خلافِ فطرت پابندیوں کو بھی قبول کیا اور ان کے ہاں سر اور داڑھی تو درکنار' جسم کے کسی بھی حصے سے بال کاٹنا حرام قرار پایا۔ لیکن ایک ہم ہیں جو دین فطرت کے پیروکار ہوتے ہوئے اپنے اُس آقا و مولا اور محسن و مربی کی وضع قطع ترک کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں جسؐ نے انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند کر کے تہذیب و تمدن کا شعور بخشا۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہماری زبانیں اپنے نبی محترم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح و نعت کرتے اور ان سے عشق و محبت کا دم بھرتے نہیں تھکتیں' لیکن ہم آنحضورؐ کی پسند اور ناپسند کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار نہیں بنا سکتے۔ ہم صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے ان کی معاشرت کے خوگر ہو گئے اور ہماری معاشرتی رسومات پر ہندوانہ تمدن کی گہری چھاپ پڑ گئی۔ رہی سہی کسر انگریز کے دورِ غلامی نے نکال دی اور ہماری نگاہیں مغربی تہذیب کی چکاچوند سے اس طرح خیرہ ہوئیں کہ وہ قوم جو دنیا کو تہذیب و تمدن اور آداب معاشرت سکھانے آئی تھی وہ

یار کی تہذیب اپنانے کو اپنے لئے باعثِ شرف سمجھنے لگ گئی' اور ہم نے یورپی لباس زیب تن
نے اور ٹائی کا پھندا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ اپنے چہروں کو بھی سنت
یؐ کے جمال سے محروم کر ڈالا۔

امتِ مسلمہ اگر محض رسم دنیا اور دستورِ زمانہ ہی کی رعایت کرتی تو بھی اپنے قائدِ حقیقیؐ کی
ایک سنت اس قابل تھی کہ اسے حرزِ جاں بنایا جاتا' لیکن اس پر مستزاد یہ کہ خود خالق
نات نے ہمیں آنحضورؐ کے اتباع کا حکم فرمایا۔ قرآن حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلمؐ
سے بایں الفاظ خطاب فرمایا گیا:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ
مہ۔ " (اے نبی! اہل ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری
ع کرو۔ نتیجۃً اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری لغزشوں سے درگزر فرمائے
" گویا اتباعِ رسولؐ کا راستہ محبوبیتِ الٰہی کا راستہ ہے۔ اللہ کے محبوبؐ کا اتباع کرنے
خود اللہ کا محبوب بن سکتا ہے۔ اور اتباع کا تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
انی سنتوں سے اپنی شخصیتوں کو منور کیا جائے۔

بعض نادان اس بنیاد پر داڑھی اور دیگر سنتوں کا التزام ضروری نہیں سمجھتے کہ نبی اکرم صلی
علیہ وسلم کی ان عادات کا تعلق آپؐ کے اپنے شخصی مزاج' قومی طرزِ معاشرت اور اپنے
ر کے تمدن سے تھا۔ لیکن ان کا یہ طرزِ استدلال قرآن و حدیث کی روشنی میں اس طرح غلط
، کہ اولاً تو قرآن نے اتباعِ رسولؐ کا حکم دیا ہے اور اتباع کا دائرہ آپؐ کی تمام سنتوں کو محیط
،' خواہ وہ ایسی عظیم سنت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی اس کا قیام و
ہو' اور خواہ وہ اس کی نسبت سے وہ چھوٹی چھوٹی سنتیں ہوں جن کا تعلق آپؐ کی روزمرہ
گی کے معمولات سے ہو۔ اور ثانیاً اس بات کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ایسی تمام سنتیں
یں حضورؐ نے کبھی ترک نہ فرمایا ہو اور امت کو انہیں اختیار کرنے کا حکم بھی فرما دیا ہو' ان
علق حضورؐ کے اپنے معاشرے کے رسم و رواج اور آپؐ کے عہد کے تمدن تک محدود نہیں
ا بلکہ یہ دین میں سننِ مؤکدہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں' جن پر عمل ہر امتی کے لئے لازمی و
وری ہوتا ہے اور جن کا ترک کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کے زمرے میں آتا
، معلوم نہیں کہ اس قسم کے مغالطے پیدا کرنے والے حضرات کو قرآن کریم کے
ات مبارکہ کیوں نظر نہیں آتیں۔

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

یعنی رسول تمہیں جس بات کا حکم دیں اُس پر کاربند ہو جاؤ اور جس چیز سے روکیں اس سے مجتنب ہو جاؤ

داڑھی کا وجوب فرمانِ نبویؐ سے

داڑھی کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں مندرجہ بالا نکات یعنی اس کا تقاضائے فطرت ہونا، جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بالا جماع اس کو اختیار کرنا اور خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سنتِ مبارکہ پر ہمیشہ عمل پیرا رہنا ایسے نکات ہیں جن سے داڑھی رکھنے کے وجوب پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ گویا اگر بالفرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی رکھنے کا صراحۃً حکم نہ دیتے تو بھی امت کے لئے اس پر عمل لازم تھا۔ لیکن اس بارے میں ایک دو نہیں، متعدد احادیث نبویؐ ملتی ہیں جن میں آنحضورؐ نے صراحت کے ساتھ اور بڑے تاکیدی انداز میں صرف داڑھی رکھنے ہی کا نہیں، داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے، للہٰذا شرعاً اس کے واجب ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اس سلسلے کی احادیث بخاریؒ، مسلمؒ، مالکؒ، ترمذیؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہیں۔ رحمہم اللہ علیہم اجمعین!

(۱) عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
انھکوا الشوارب واُعفوا اللحی (بخاری)

(۲) اُحفوا الشوارب واُعفوا اللحی
(مسلم، ترمذی، موطا امام مالک، ابو داؤد، نسائی)

دونوں احادیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی مونچھوں کو خوب کم کرو، اور داڑھیوں کو خوب بڑھنے دو!

(۳) "خالفوا المشرکین وفروا اللحی واُحفوا الشوارب"
(بخاری)

وفی روایۃ- اوفروا اللحی واُحفوا الشوراب (مشکوٰۃ - قدیمی کتب خانہ)

(۴) خالفوا المشرکین اُحفوا الشوارب واُوفوا اللحی" (مسلم)
ان دونوں احادیث کے معنی یہ ہوئے کہ مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھوں کو خوب باریک کرو

اور داڑھیوں کو خوب بڑھاؤ!

(۵) عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم- جزو الشوارب' وأوفوا اللحی' خالفو المجوس (مسلم بحوالہ جامع الاصول)

وفی روایة: وأرخوا اللحی بالخاء المعجمة

وفی روایة اخری- وأرجوا اللحی بالجیم واصله ارجئوا

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مونچھوں کو کترنے میں مبالغہ کرو' اور داڑھیوں کو خوب زیادہ کرو' مجوسیوں کی مخالفت اختیار کرو!)

مندرجہ بالا احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے داڑھیاں بڑھانے کے لئے امر صریح کے چھ صیغے نقل ہوئے ہیں۔ اَعفوا' اُوفوا' اَرخوا' اَرجوا' وفروا ور اُوفروا ..... اور ان چھ میں سے کسی ایک کے معنی بھی محض داڑھی رکھنے کے نہیں ہیں لہ داڑھی بڑھانے' بڑھنے دینے' خوب زیادہ کرنے اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینے کے ں۔ اور اصول یہ ہے کہ "الامر للوجوب" یعنی امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ اور خارجی ئن کے بغیر اس سے اباحت یا استحباب مراد نہیں لیا جا سکتا۔ چنانچہ اس ضمن میں اتنی ید اور مختلف انداز سے امر کی اس قدر تکرار فقہاء کے نزدیک اس مسئلے کے واجب شرعی نے کی واضح دلیل ہے اور اس سے گریز وانحراف کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اتنی یح کے باوجود بھی اگر کسی نے اپنے ذہن میں اس خیال خام کو جگہ دے رکھی ہو کہ ممکن ہے یہ امر محض اخلاقی حکم کے طور پر آیا ہو تو اس کے اس شبہ کا ازالہ مندرجہ ذیل حدیث سے ہو جانا چاہئے۔

عبدالله ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم انه امر حفاء الشوارب واعفاء اللحی- وفی روایة بإیفاء اللحیة - (مسلم' ترمذی)

- عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ نے مونچھیں پست کرنے اور داڑھیاں بڑھانے کا حکم دیا ہے۔

جن کا دعویٰ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے متعلق صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض داڑھی رکھنے کا نہیں بلکہ بتکرار و اعادہ داڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی' خشخشی' فرنچ کٹ اور بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم "مولوی دیدار علی کی داڑھی" کی قسم کی داڑھیاں شارع علیہ السلام کا مطلب پورا نہیں کرتیں۔

داڑھی منڈانے میں کفار سے مشابہت

مندرجہ بالا احادیث میں خالفوا المشرکین اور خالفوا المجوس کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی منڈانا اور پست کرانا مشرکین اور مجوسیوں کا شیوہ تھا' لہٰذا ان کی مخالفت میں داڑھیاں خوب بڑھانے کا حکم دیا گیا۔ کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنا اور ان کی وضع قطع اور طور طریقوں کی مخالفت دین کی مستقل تعلیم ہے۔ چنانچہ حدیثِ نبویؐ ہے:

من تشبہ بقوم فھو منھم (احمد' ابو داؤد)

ترجمہ۔ "جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی تو (انجام کار) وہ انہی میں سے ہو گا"۔

دنیا میں کسی بھی قوم اور مذہب کا مستقل وجود اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اور باقی رہ سکتا ہے جبکہ وہ وضع قطع اور تہذیب و ثقافت میں اپنی امتیازی خصوصیات برقرار رکھے۔ چنانچہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملتِ اسلامیہ ان نظریاتی اور عملی امتیازات کا دل و جان سے تحفظ کرے جو دینِ اسلام کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتے ہیں' اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کی اس کے باغیوں اور سرکشوں سے تمیز کی جا سکتی ہے۔ انہی امتیازات کو شعائرِ اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں داڑھی بھی اسلام کا ایک اہم شعار ہے۔

داڑھی منڈانے میں عورتوں سے مشابہت

داڑھی نہ رکھنے میں جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صریح نافرمانی کے علاوہ کفار سے مشابہت کے گناہ کا پہلو بھی ہے' وہاں اس عملِ قبیح میں گناہ کا ایک مزید پہلو عورتوں سے مشابہت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ جسمانی ہیئت عطا فرمائی ہے اور اسے سخت ناپسند کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مشابہت اختیار کریں۔ قاری محمد طیب صاحب "داڑھی کی شرعی حیثیت" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر وہ تشبّہ (یعنی تشبّہ بالکفار) اس وجہ سے گناہ تھا کہ اس سے دو گروہوں کا خصوصیاتی فرق مٹ کر حدودِ الٰہی کی تخریب ہو جاتی تھی تو یہ تشبہ (یعنی تشبہ بالنساء) بھی اسی لئے گناہ ہو گا کہ اس سے دو صنفوں کا خصوصیاتی فرق مٹ کر حدودِ خداوندی کی تخریب ہوتی ہے۔ اس لئے شریعت نے اس تشبہ کو بھی خواہ مرد عورت سے کرے یا عورت مرد سے 'لعنت قرار دیا ہے کہ یہ خدا کی بنائی ہوئی حدود کو مٹاتا ہے" چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کرتے ہیں:

لعن اللہ المتشبهين من الرجال بالنساء و المتشبهات من النساء بالرجال

ترجمہ۔ "اللہ نے لعنت بھیجی ہے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر اور مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر"۔

داڑھی منڈانا مُثلہ ہے

کسی کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر شکل بگاڑ دینے کو مثلہ کہا جاتا ہے' جو شریعت میں حرام ہے' خواہ یہ سلوک کسی دوسرے فردِ نوعِ بشر کے ساتھ کیا جائے یا خود اپنی شکل و صورت کے ساتھ۔ قاضی محمد شمس الدین صاحب نے اپنی تصنیف "داڑھی کی اسلامی حیثیت" میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ من مثل بالشعر فلیس له عند اللہ من خلاق

ترجمہ۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے (داڑھی کے) بالوں کا مُثلہ کیا اس کا اللہ کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں"۔

کتاب مذکور میں مختلف حوالوں سے وضاحت کی گئی ہے کہ اس حدیث کی تشریح میں شارحین حدیث نے بالوں کے مثلہ سے داڑھی کے بالوں کا مونڈنا یا دور کرنا ہی مراد لیا ہے۔ اور فتاویٰ نجدیہ میں اس حدیث کو داڑھی منڈانے کے حرام ہونے میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ بھی داڑھی کے دور کرنے کو مُثلہ ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ جمل کے موقع پر جب بصرہ کے گورنر حضرت عثمان بن حنیف کی داڑھی نوچ ڈالی گئی تو اسے مُثلہ ہی کہا گیا۔ فقہاء نے بھی داڑھی کے نوچنے یا مونڈنے کو ناک یا کان کاٹنے کی طرح مثلہ ہی قرار دیا

ہے اور اسے قابلِ تاوان جرم ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کسی شخص کی داڑھی زبردستی مونڈ ڈالے تو مونڈنے والے پر ناک کان کی دیت کے برابر دیت لازم ہوگی' کیونکہ اس نے ایک شخص کا جمال ضائع کر دیا۔ (ملاحظہ ہو ہدایہ کتاب الدیات) پس ثابت ہوا کہ داڑھی منڈانے والے حضرات خود اپنا مثلہ کرتے ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی شکل و صورت کو بگاڑتے ہیں اور ایسے لوگ حدیث نبویؐ کی رو سے اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

واضح رہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک مونچھوں کا استرے سے مونڈنا بھی مثلہ ہے' کیونکہ احادیث میں مونچھیں کترانے' خوب باریک کرنے اور کاٹنے میں مبالغہ کرنے کا حکم ہے' کہیں بھی سرے سے مونڈ ڈالنے کا حکم نہیں ہے۔

داڑھی منڈانا قومِ لوطؑ کا عمل

علامہ آلوسیؒ نے "روح المعانی" میں ابن عساکر وغیرہ کے حوالے سے حضرت حسن سے مرسلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ قوم لوطؑ میں دس خصلتیں تھیں' جن کی وجہ سے وہ ہلاک کی گئی۔ ان دس میں علاوہ دیگر بد خصلتوں کے' داڑھیاں منڈانا اور مونچھیں بڑھانا بھی روایت کیا ہے۔

داڑھی منڈانے والوں سے حضورؐ کا اظہار ناپسندیدگی

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنے رسالہ "داڑھی کا وجوب" میں اور قاضی شمس الدین صاحب نے "داڑھی کی اسلامی حیثیت" میں مستند تاریخی حوالوں سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک پہنچا تو اس نے غصے میں آ کر اس کو چاک کر دیا اور یمن میں اپنے گورنر بازان کو حکم بھیجا کہ اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ بازان نے اس مقصد کے لئے ایک فوجی دستہ مامور کیا۔ اس دستے کے دو افسر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو رعبِ نبوت کی وجہ سے ان کی رگہائے گردن تھرتھرا رہی تھیں۔ مجوسیوں کے دستور اور فیشن کے مطابق ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ مکروہ شکل بہت ناگوار گزری اور آپؐ نے اپنا رخِ انور

ان سے پھیر لیا۔ اور فرمایا تم پر ہلاکت ہو، کس نے تمہیں ایسا حلیہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے رب (کسریٰ) نے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔

ہمارے لئے غور و فکر کا مقام ہے کہ جب غیر مسلم سفیروں کی اس خلاف فطرت شکل و صورت سے آنحضورؐ کو اتنی تکلیف پہنچی کہ آپؐ نے ان سے منہ پھیر لیا، تو قیامت کے روز اپنے امتیوں کی ایسی ہی مکروہ صورتوں سے آپؐ کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اور اگر وہ ذاتِ اقدس ہی ناگواری اور بیزاری سے منہ پھیر لے جس کی شفاعت پر ہماری امیدیں وابستہ ہیں تو یہ کتنا بڑا خسارہ اور کس قدر محرومی ہوگی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی کیفیت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی کیفیت اور مقدار کی مندرجہ ذیل احادیث سے بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے تو پانی کی ایک لپ لے کر اپنی ٹھوڑی کے نیچے داخل کرتے۔ پس اس سے اپنی داڑھی کا خلال فرماتے اور کہتے کہ اسی طرح میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔

(ابو داؤد بحوالہ مشکوٰۃ)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کا خلال فرمایا کرتے تھے۔ (ترمذی و دارمی بحوالہ مشکوٰۃ)

خلال کے اصطلاحی معنی وضو کے دوران ہاتھوں کی انگلیوں کو داڑھی کے بالوں میں اندر کی جانب سے داخل کر کے باہر کو نکالنا ہیں۔ مذکورہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک دراز تھی، ورنہ چھوٹی داڑھی میں خلال کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں تو پانی خود بخود جلد تک پہنچ جاتا ہے۔

اب چھوٹی چھوٹی اور خشخشی داڑھیوں والے حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ نہ صرف اُن کی داڑھیاں سنتِ نبویؐ کے مطابق نہیں ہیں، بلکہ وہ وضو میں داڑھی کا خلال کرنے کی سنّت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کث اللحیۃ تملاء صدرہ (ترمذی۔ بحوالہ داڑھی کی اسلامی حیثیت)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھنی داڑھی رکھتے تھے جو آپؐ کے سینہ مبارک کو بھر دیتی تھی"۔

حضرت عبداللہ بن سخبرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جسے بخاری اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے حضورؐ کی ریش مبارک کے گھنا اور دراز ہونے کی یہ کیفیت ملتی ہے کہ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے صحابہ کرامؓ سری نمازوں میں آپؐ کی داڑھی کی حرکت دیکھ کر سمجھ لیا کرتے تھے کہ آپؐ قرات فرما رہے ہیں۔

اسی طرح کئی اور احادیث سے بھی آپ کی ریش مبارک کا خوب گھنا اور دراز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمان رسولؐ کی تعمیل اور اتباع رسولؐ کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی من پسند چھوٹی چھوٹی داڑھیوں کے جواز کے دلائل ڈھونڈنے کے بجائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اختیار کر لیا جائے۔

داڑھی کی شرعی مقدار

اب رہا یہ سوال کہ شرعی طور پر داڑھی کی کوئی حد بندی بھی ہے یا نہیں تو جان لینا چاہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً داڑھیاں بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اس کے لئے کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی کہ اس حد تک پہنچنے پر داڑھی کا بڑھانا بند کر دیا جائے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ہمیں داڑھی کو معتدل رکھنے کے لئے اسے تراشنے کی حد ضرور مل جاتی ہے، یعنی داڑھی کے بال اصلاح طلب ہوں تو ان کی تراش خراش کی جائے، لیکن مقررہ حد سے زیادہ نہ تراشی جائے۔ تو آیئے اس مقررہ حد کی تعیین کے لئے احادیث کی طرف رجوع کریں۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یاخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا (رواہ الترمذی) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت

کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی میں سے (یعنی) اس کے طول و عرض میں سے کچھ حصہ تراش دیا کرتے تھے"۔

یہ تراشنا کس حد تک ہوتا تھا؟ احادیث مبارکہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک (اس تراشنے کے باوجود) کم از کم ایک مشت بلکہ اس سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جس میں آپؐ خلال فرماتے، کنگھی سے اس کو درست فرماتے اور اس کے گنجان اور دراز ہونے کا یہ عالم تھا کہ اس نے سینۂ مبارک کے اوپر کے حصے کے طول و عرض کو بھر رکھا تھا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا بچشم سر مشاہدہ کرنے والے تھے۔ آپؐ کے یہ جاں نثار ساتھی آپؐ کے اقوال کو اپنے سینوں میں اور آپؐ کے افعال کو اپنی زندگیوں میں محفوظ کر لیتے تھے، لہٰذا ان سے بڑھ کر آپؐ کی سنتوں کا شیدائی اور آپؐ کی وضع قطع کا اتباع کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرام میں سے جو حضرات اپنی داڑھیاں تراشتے تھے وہ ایک قبضہ (مشت) سے زائد ہو جانے کی صورت میں تراشتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل اتباع سنت ہی کا مظہر تھا چنانچہ یہ ہمارے لئے معیارِ عمل ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) جب حج یا عمرہ سے فارغ ہو کر حجامت بنواتے تو داڑھی کو مٹھی میں لے کر ایک مشت سے زائد کو تراش دیتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عمر اور حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہما) بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ عینی شرح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کی بے ڈھب داڑھی کی اصلاح کے لئے قینچی منگوائی۔ پھر اس کی داڑھی کو مٹھی میں لیا اور ایک شخص کو حکم دیا، جس نے آپؐ کے ہاتھ کے نیچے نکلتے ہوئے بالوں کو کاٹ دیا۔ (بحوالہ "داڑھی کے متعلق شرعی فیصلہ")

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی کی اصلاح اور موزونیت کے لئے اسے طول و عرض میں تراشنا پسندیدہ ہے، لیکن یہ تراشنا ایک مشت سے زائد مقدار میں درست ہو گا، اس سے کم میں نہیں! چنانچہ اس مسئلے پر تمام فقہائے امت کا اتفاق ہے کہ داڑھی کا ایک مشت سے کم کرنا جائز نہیں اور اس کا سرے سے صفایا کر دینا سب کے نزدیک حرام ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ خود شارع علیہ السلام نے داڑھی کی کوئی حد مقرر نہیں

ائی' اس لئے مختلف روایات سے فقہاء و محدثین نے ایک مشت کی جو حد مقرر کی ہے یہ
رحال ان کا استنباط ہے اور کوئی مستنبط حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو ایک منصوص
م کی ہوتی ہے۔ ان حضرات کی یہ بات اگرچہ اصولی طور پر درست ہے لیکن اس سے ان کا یہ
یجہ نکال لانا کہ داڑھی کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' کسی طور سے بھی
رست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ حکم مستنبط ایک مشت تک داڑھی بڑھانے کو لازم
ار نہیں دیتا بلکہ حکم منصوص جو مطلق تھا (یعنی مطلقاً داڑھیاں بڑھانے کا) یہ اس کو مقید کرتا
ہے اور اس کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ اور ایک مشت سے زائد کو تراشنے کی گنجائش نکالتا
ہے۔ چنانچہ جو حضرات تعامل صحابہ اور تعامل امت کے باوجود داڑھی کی ایک مشت مقدار کے
ائل نہیں ہیں' منطقی طور پر ان کے لئے مناسب تر طرز عمل ہو گا کہ وہ احادیث کے ظاہری الفاظ
عمل کرتے ہوئے داڑھیوں کو علیٰ حالہا بڑھنے دیں اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں!

اسلام میں داڑھی کے مقام اور اس کی حیثیت و اہمیت پر علمائے کرام کی بہت سی تصانیف
جود ہیں۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ مختصر
مضمون علماء کی تحریروں سے استفادہ کر کے ان کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے' اور اس کی
اعت سے تنظیم اسلامی کے رفقاء اور دیگر احباب کی رہنمائی مقصود ہے۔ امید ہے کہ جو
ضرات اس ضمن میں تساہل اور کوتاہی کا شکار ہیں وہ اس سنتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰة
لسلام کی اہمیت سے آگاہی حاصل کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر سکیں گے! وفقنا اللہ

ماخذ و مراجع

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ جامع الترمذی
۴۔ الموطا للامام مالک
۵۔ مشکوٰة المصابیح
۶۔ منہج انقلاب نبوی' ڈاکٹر اسرار احمد
۷۔ رسالہ داڑھی کا فلسفہ' سید حسین احمد مدنی
۸۔ داڑھی کی شرعی حیثیت' قاری محمد طیب صاحب
۹۔ داڑھی کا وجوب' مولانا محمد زکریا کاندھلوی
۱۰۔ داڑھی کی اسلامی حیثیت' قاضی شمس الدین
۱۱۔ رسائل و مسائل (حصہ اول) 'سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

تحریکِ نور بدیع الزمان سعید نورسی

تحریک اسلامی کے تسلسل کی پیش گوئی متعدد احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

(۱) عن عائذبن عمرو المزنی رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہ قال الاسلام یعلوا ولا یعلی علیہ (اخرجہ الدارقطنی)

ترجمہ ... اسلام غالب آکر رہے گا یہ مغلوب نہیں ہو گا۔

(۲) ان اللہ عزوجل یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ سنۃ من یجدد لھا دینھا (اخرجہ ابو داؤد۔ حاکم۔ طبرانی)

ترجمہ.... بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے سرے پر مقرر کرتا رہے گا جو (افراد یا جماعتیں) اس کے لئے اس کا دین تازہ کرتے رہیں گے۔

(۳) عن جابر بن عبداللہ قال قال النبی علیہ الصلوۃ والتسلیمات لاتزال طائفۃ من امتی یقاتلون علی الحق ظاھرین الی یوم القیامۃ (رواہ مسلم)

ترجمہ..... میری امت کبھی ایک ایسے گروہ سے خالی نہیں ہو گی جو حق پر لڑتا نہ رہے۔ یہ غالب رہیں گے قیامت کے دن تک۔

(۴) لن یبرح ھذالدین قائما یقاتل علیہ عصابۃ من المسلمین حتی تقوم الساعتہ (اخرج مسلم عن جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ)

ترجمہ..... قیامت تک ایک جماعت مسلمانوں کی اس دین کو قائم رکھنے کے لئے لڑتی رہے گی۔

(۵) عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم (قال

ثلاث من اصل الایمان الکف عمن قال لااله الاالله ولانکفره بذنب ولانخرجه من الاسلام بعمل والجهاد ماض منذبعثنی الله الی ان یقاتل آخر هذه الامة الدجال لایبطله عدل عادل ولاجور جائر والایمان بالاقدار (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ..... "تین چیزیں ایمان کی جڑ سے پیدا ہوتی ہیں (یا ایمان کی جڑ کا حصہ ہیں) ایک یہ کہ لا الہ الا اللہ کہہ دینے والے سے ہاتھ روک لینا اور یہ کہ ہم تکفیر نہیں کرتے کسی کی گناہ کے سبب اور یہ کہ ہم کسی کو عمل کے سبب سے اسلام سے خارج نہیں کرتے اور یہ کہ جہاد باقی رہے گا میری بعثت سے اس امت کے اس آخری حصہ تک جو دجال سے قتال کرے گا اسے عادل کا عدل ظالم کا ظلم اور تقدیر پر ایمان مٹا نہ سکے گا"۔

یہ اور ایسی ہی دیگر بے شمار احادیث جنہیں ہم نے طوالت کے خوف سے نقل کرنے سے گریز کیا ہے' پانچ باتوں کی شہادت دیتی ہیں ایک تو یہ کہ اسلام اپنی اصلی اور کامل شکل میں باقی رہے گا دوسرے یہ کہ بہر حال غلبہ و فتح اسلام کے مقدر میں ہے۔ تیسرے یہ کہ اہل حق کی جماعت علمی و فکری اور عملی و حکومتی سطح پر اسے قائم رکھنے کے لئے برسرپیکار رہے گی وہ لوگ جو بلا قتال کئے اسلام کے غلبہ پر یقین رکھتے ہیں انہیں اپنے مرض کا علاج لسان نبوی کے ان شفا بخش الفاظ میں تلاش کرنا چاہئے۔ یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة گویا یہ غلبہ واظہار مشروط ہے قتال علی الحق سے اسی لئے عصابۃ المسلمین کے قتال سے دین قائم ہوتا ہے یا رہتا ہے۔ چوتھے یہ کہ جہاد ہر حال میں فرض رہے گا خواہ وہ موافق حالات ہوں یا ناموافق اور پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ اہل حق کی جماعت کی پہچان یہ ہے کہ وہ جہاد و قتال اور غلبہ و اظہار دین حق سے وابستہ ہوتی ہے یعنی اس کی پوری زندگی دین کی سرفرازی کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یہ احادیث اپنے اندر نہایت تشریح طلب مطالب اور اپنے دعاوی کی پشت پر نہایت قوی تاریخی شہادتیں رکھتی ہیں تاہم طوالت کے خوف سے ان چند موٹے موٹے مطالب کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں اور ان تاریخی شہادتوں میں سے دور جدید کی پانچ شہادتیں یکے بعد دیگرے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں ترکی' بلاد عرب' برصغیر' افغانستان اور مشرق بعید میں احیائے اسلام کے لئے ہونے والی بعض اہم تحریکیں پیش نظر ہیں۔

ثانیٔ مجدّد الف ثانی اور تحریک نور، بدیع الزمان سعید نورسی

حالاتِ زندگی علامہ بدیع الزمان سعید نورسی کا اصل نام سعید اور نورسی گاؤں کی نسبت ہے۔ اللہ تعالٰی کی حکمتیں بھی عجیب ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں جس شخصیت کو انہوں نے قرآن وایمان کا نور پھیلانے پر سب سے بڑھ کر مامور کیا اسے نور کی اتنی نسبتوں سے نوازا کہ انسان حیران ہو کر کہتا ہے کہ یہ اتفاق نہیں ہے چنانچہ آپ کی والدہ صاحبہ کا اسم شریف نور گاؤں کا نام نورس قادری سلسلہ کے شیخ کا نام نور الدین نقشبندی سلسلہ کے شیخ کا نام نور محمد اور قرآن کے استاد کا نام حافظ نوری تھا۔ آپ کے مشہور عالم رسائل' رسائل نور اور تحریک تحریک نور کہلاتی ہے۔

آپ ترکی کے صوبہ بتلیس کے ضلع ہیزان میں ۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۰ھ میں ایک کرد گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے باپ کا نام مرزا تھا۔ مجھے بہن بھائیوں کی صحیح تعداد کا علم تو نہیں ہو سکا تاہم آپ پر لکھی گئی کتب میں ملا عبداللہ بڑے بھائی اور عبدالمجید نامی چھوٹے بھائی کا تذکرہ بصراحت ملتا ہے۔

بچپن ہی سے آپ میں حدت مزاج' ذہانت' عزت نفس اور عبقریت کی صفات نمایاں تھیں۔ آپ میں حق گوئی اور دین کی حمیت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے جابر سلطانی اور اتاترکی امراخوفزدہ ہو جاتے تھے۔ بچپن میں آپ پڑھائی کی طرف رغبت نہیں رکھتے تھے تاہم ایک خواب میں قیامت کا منظر دیکھ کر آپ نے تعلیم کی طرف ذوق وشوق سے رجوع کیا۔ حافظہ و ذہانت کا یہ عالم تھا کہ مدارس میں رائج تمام کتب نہ صرف سمجھ کر پڑھ لیں بلکہ ازبر بھی کر لیں۔ تھوڑے عرصہ میں ایسا ہو جانا کیونکہ ناممکن تھا لہٰذا علماء سعرؔدؔ نے اکٹھا ہو کر ایک دن ان کا امتحان لیا اور آپ سے ایسے سوالات ہر موضوع سے متعلق پوچھنے شروع کر دیئے جن کا جواب دینا بڑے بڑے اساتذہ کے لئے مشکل تھا مگر سعید نورسی علیہ الرحمتہ ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتے چلے گئے جس پر علماء نے انہیں بدیع الزمان کے خطاب سے نوازا۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ سال تھی۔

اس کے بعد استاد بدیع الزمان زہد و تقشف اور عبادت وریاضت میں مصروف ہو گئے۔ تاہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ اس سلسلہ میں ان کے بے شمار واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ جن میں آپ نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر اعلائے کلمۃ

الحق کا فریضہ سرانجام دیا۔ ماردین میں یہ فریضہ سرانجام دینے کی پاداش میں آپ کو اپنی زندگی کی پہلی جلاوطنی سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ بتلیس چلے آئے اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ تاہم زیادہ عرصہ آپ نے یہاں قیام نہ کیا اور دان تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے پندرہ سال قیام کیا اور اپنے دینی فرائض کو نہایت جانفشانی سے ادا کیا۔ دان میں استاد سعید نے جدید علوم میں مہارت بہم پہنچائی اور جدید دنیا کے تغیرات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اب استاد اس نتیجہ پر پہنچے کہ دینی مدارس میں از کار رفتہ علوم کو خارج کر کے جدید علوم داخل کئے جانے چاہئیں تاکہ علماء جدید دور کے فتنوں کا احسن طریق سے مقابلہ کر سکیں۔ اس خیال کے تحت استاد نے ایک یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا اور امداد حاصل کرنے کے لئے سلطان کے دربار میں حاضر ہونے استنبول پہنچے۔

آپ کے استنبول پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی عقل و دانش کا شہرہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ استنبول کے قدیم و جدید علماء نے آپ سے سوالات کئے اور خود کو بے بس پایا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سعید نورسی کسی عالم سے خود کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ مجھے علماء کے علم پر اعتماد ہے البتہ انہیں اگر میرے بارے میں شک ہے تو وہ اپنا اطمینان کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی عجیب لگتی ہے کہ جس نے بھی ان سے بحث و مناظرہ کیا خود کو ہمیشہ ان سے علم میں فروتر پایا۔ استاد عالم اسلام کی ان چند گنی چنی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جن کی شخصیت ہر اعتبار سے مسلمہ بلند اور غیر متنازعہ رہی ہے۔

استاد بدیع الزمان سعید نورسی نور اللہ مرقدہ کی انقلاب انگیز زندگی کا آغاز ۱۹۰۹ء سے ہوتا ہے جب پانچ اپریل کو عید میلاد النبی کے دن آپ نے اتحاد محمدی کی بنیاد ڈالی۔ یہ جماعت ترکی میں آزاد دور مشروطیت کو مشروع دور مشروطیت تک لانا چاہتی تھی۔ مختصر عرصہ کے دوران اس کے ارکان پچاس ہزار سے متجاوز ہو گئے۔ استاد سعید اس جماعت کو منظم اور تربیت یافتہ انقلابی جماعت بنانا چاہتے تھے مگر مدرسی علماء کی اکثریت نے ناعاقبت اندیشانہ انداز میں عوام کو اکسا دیا اور انہیں اور ترکی فوج کے بعض دستوں کو لے کر پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیا۔ گو بدیع الزمان رحمت اللہ علیہ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی تاہم دارالحکومت پر باغی فوجوں نے قبضہ کر لیا جسے سالونیکا سے آکر محمود پاشا نے فوجی جنگ کے ذریعہ ختم کیا۔ ۲۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کو بغاوت مکمل فرو کر کے سرکردہ علماء اور سلطان کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی جگہ محمد رشاد کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ یہ کامیابی دراصل شریعت حقہ کے

علمبرداروں کے خلاف اباحیت پسندوں کی کامیابی تھی۔ مشروطیت سے جو اباحیت شروع ہوئی تھی اس نے اب مکمل غلبہ پالیا چنانچہ ۱۹ ارکان اور ۱۵ علماء کو پھانسی دے دی گئی۔ اتحاد محمدی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور ابھی استاد نورسی کے اوپر عدالت مقدمہ چلا رہی تھی اور شریعت کا نفاذ چاہنے کے جرم میں انہیں پھانسی پر لٹکانا چاہتی تھی کہ عدالت کے باہر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے غیظ و غضب کا اظہار کیا جس سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے انہیں چھوڑ دیا تاہم وہ ان پر کوئی الزام ثابت بھی نہ کر پائی تھی۔ عدالت کی تقریر ان کی مشہور تقاریر میں سے ایک ہے۔ استاد نے اس کے بعد شام کا سفر کیا اور جامعہ اموی میں تقریر کی جو خطبہ شامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے عالم اسلام کے امراض گنائے ہیں۔ یہ امراض آج بھی ہمارے جسد ملی میں ناسور کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اب بھی ضرورت ہے کہ ان کی تشخیص سے فائدہ اٹھا کر علاج کی تدبیر کی جائے۔ یہ امراض استاد کے بقول چھ ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے مایوسی۔ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں صداقت اور اخلاص کا فقدان۔ دشمنی اور عداوت باہمی میں روز افزوں دلچسپی اور انہماک۔ اہل ایمان کا منظم و مربوط نہ ہونا۔ جبر و استبداد کا غلبہ اور خود غرضی مفاد پرستی اور انانیت۔

دمشق سے واپسی پر استاد ہمہ تن ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے لئے جت گئے تاہم جلد ہی پہلی بڑی جنگ چھڑ گئی اور یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ترکی کی بقا کی اس جنگ میں استاد بھی برابر کے شریک رہے اور فوج میں داخل ہو کر اعلیٰ افسر کے مقام تک ترقی کی۔ آپ اس جنگ میں آبدوز کے ذریعہ طرابلس پہنچے اور وہاں اتحادیوں سے جنگ کی اور پھر روس کے خلاف بھی برسر پیکار رہے۔ اس جنگ میں آپ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے بالآخر روسی آپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈھائی سال کے بعد آپ قید خانہ سے بھاگ گئے اور استنبول پہنچے۔ یہاں آپ کو دارالحکمت اسلامیہ کا رکن بنا دیا گیا جو آپ کی علمی صلاحیتوں کا حکومت اور علماء کی طرف سے واضح اعتراف تھا۔ جب اناطولیہ میں تحریک آزادی اٹھی تو استاد نے اس میں بھرپور شرکت کی اور فتاویٰ تقاریر اور تحریری ذرائع سے عوام کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ برطانوی حکومت اس زمانہ میں علماء کو خرید رہی تھی تاکہ تحریک آزادی کی جڑ کاٹی جائے۔ استاد نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا اور انگریز دانت پیس کر رہ گئے کیونکہ استاد کی سی وجاہت اور تقویٰ و تدین کے مقابلہ میں ترکی عوام کسی عالم کی نہ سنتے تھے۔

۲۳ راپریل ۱۹۲۰ء کو استاد نے انقرہ میں مجلس کبیر ملی کے اجلاس میں شرکت فرمائی اور دعا

کی۔ مجلس میں استاد کی تقاریر سے ایک سو ساٹھ ارکان توبہ کر کے شعائر اسلام اور صوم وصل
کے پابند ہو گئے۔ استاد نے جمہوری حکومت کو اسلام کی راہ پر ڈالنے کی بے پناہ کوشش کی تا
اباحیت پسندوں کا غلبہ اتنا قوی تھا کہ استاد مایوس ہو گئے۔ انہی دنوں آپ کی پختہ طور پر یہ را
بن گئی کہ مسلمان ایمان واسلام سے ذہنی وقلبی سطح پر محروم ہو گئے ہیں اور اب ضرورت اس ا
کی نہیں کہ وعظ وتلقین کے ذریعہ انہیں اسلام پر چلنے کا حکم ونصیحت کی جائے بلکہ ضرورت ا
امر کی ہے کہ ان کے سینوں میں از سر نو کشت ایمان کی تخم ریزی کی جائے۔ استاد بدیع الزما
سعید نورسی نور اللہ مرقدہ چودھویں صدی کے دیگر خادمانِ دین سے اس اعتبار سے بلند ا
مختلف نظر آتے ہیں کہ انہوں نے بروقت بالکل صحیح تشخیص وتجویز ہی نہیں کی بلکہ ایک انتہا
مشکل اور نامساعد دور میں کروڑوں بندگان خدا کو ارتداد سے محفوظ رکھا۔ آپ کا خیال تھا
ایمان کا فقدان سب مسائل اسلامیہ کی جڑ اور قرآن سے مضبوط تعلق اس مسئلہ فقدان کا ح
ہے۔ آپ واحد شخص ہیں جس نے چودھویں صدی میں قرآن سے ایمان کے چھ ارکا
لاکھوں سینوں میں زندہ اور روشن کر دیئے۔ آپ کے رسائل نور ایمان کا موجیں مارتا سمن
ہیں جو انہیں پڑھ لیتا ہے وہ اللہ رسول اور قرآن کا سچا محب اور آخرت کا عمدہ کاشت کار ہ
جاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے آپ نے ایمان کی تخم ریزی کا کام کیا اور ۱۹۶۰ء تک اپنی وفات تک
جاری رکھا۔ اس چالیس سالہ جدوجہد میں آپ نے حقیقی آزادی کے بحیثیت مجموعی بمشک
تمام چار پانچ سال گزارے ہوں گے۔ باقی سارا عرصہ آپ نے قید وبند جلا وطنی دربدری ا
نظر بندی وغیرہ میں گزارا۔ یہی صورت حال آپ کی تحریک کے ساتھ بھی ہے۔ دنیا میں س
سے زیادہ مقدمات نوریوں اور اخوانیوں پر قائم ہیں۔ آپ کو جیل میں کئی مرتبہ زہر دینے
کوشش ہوئی۔ دو دفعہ یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی تاہم اس وقت آپ جانبر ہو گئے مگر مرض
الوفات میں آپ اس زہر کا اثر بہت محسوس کرتے تھے۔ آپ نے ۲۳ر مارچ ۱۹۶۰ء کو ا
میں انتقال فرمایا اور درگاہ خلیل الرحمٰن میں دفن ہوئے۔ جمال گرسل کے فوجی انقلاب ک
بعد آپ کی نعش کو سپارٹا منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت آپ کے انتقال پر کئی ماہ گزر چکے تھے ا
لاش بالکل تروتازہ تھی۔ سب نے کہا کہ یہ ایک شہید کی نعش ہے۔

اخلاق وکردار...... استاد بدیع الزمان سعید نورسی رحمتہ اللہ علیہ انتہائی اعلیٰ اور کریما
اخلاق واوصاف کے حامل تھے۔ آپ نے ساری زندگی تجرد میں گزاری کیونکہ بقولِ خود آ

ہنگامہ آرائی کے کس لمحہ میں فرصت پاکر نکاح کرتے اور رفیقۂ حیات کے حقوق ادا کرتے۔
تاہم آپ کے تقویٰ للّٰہیت اور پاک دامنی کی تمام دنیا گواہ ہے۔ غض بصر اور عورتوں سے
بات چیت نہ کرنے کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ اکثر روزہ سے رہتے اور جس دن روزہ نہ ہوتا اس
دن بھی ایک پیالہ شوربہ دو روٹیاں اور ایک گلاس پانی کا 'کل غذا ہوتی۔ تنہائی نہایت مرغوب تھی
اور مغرب سے لے کر دوسرے دن دوپہر تک کسی سے ملاقات نہ کرتے۔ بہت کم سوتے تھے
اور رات کا بیشتر حصہ قرآن حکیم اور نماز شبانہ کی سنگتِ بابرکت میں گزارتے۔ محترمہ مریم
جمیلہ نے اکل حلال کی سختی سے متعلق ان کا معمول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر مصدقہ
حلال غذا میسر نہ آتی تو گھاس پات تک پر گزارہ کر لیتے مگر مشتبہ غذا کو ہاتھ نہ لگاتے۔ اپنے
کھانے کا کچھ حصہ چیونٹیوں کو ضرور ڈالتے اور فرماتے کہ یہ ان کی جمہوریت کو خراج دیتا ہوں۔
حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور کوئی تعلیم مصلحت سے آشنا کرنا چاہتا تو شیر کی طرح غضب
ناک ہو جاتے۔ آپ کی قید و بند اور جلا وطنیوں اور نظر بندیوں میں آپ کی اس صفت کا
نمایاں ہاتھ ہے۔ شاگردوں اور چھوٹوں کی نصیحت کو تحمل سے سنتے اور پھر اصلاح کو قبول بھی
کرتے۔ بچوں پر نہایت شفیق تھے ان کی گفتگو اہتمام کے ساتھ سنتے اور ان سے اپنے لئے دعا کی
درخواست کرتے۔ آپ فرماتے یہ رسائل نور کی آنے والی اولادیں ہیں۔ مایوس نہ خود ہوتے
تھے نہ دوسروں کو ہونے دیتے تھے۔ سنت کا خصوصی اہتمام فرماتے اور دینی معاملات میں فقہی
اور نظری توسع کے قائل تھے۔

ضرورتِ رشتہ

گریڈ ۱۸ کے سرکاری ملازم، لاہور میں اپنا مکان ہے، کے نوجوان بیٹے عمر ۲۵½ سال،
تعلیم میٹرک، سرکاری ٹیکنیکل ملازمت، باشرع، پابندِ اسلامی اطوار کے لئے ہم پلّہ رفیقۂ
حیات بلا امتیازِ ذات تعلیم کم از کم مڈل، نیک سیرت، صوم وصلوٰۃ کی پابند، امورِ خانہ داری
سے واقفیت جس کے سرپرست تنظیم اسلامی و انجمن خدام القرآن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ
دلچسپی رکھتے ہوں رجوع فرمائیں۔ نیز جہیز کی ضرورت نہیں۔ نکاح اور رخصتی مسجد سے ہوگی۔

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲
معرفت دفتر تنظیم اسلامی۔ A-۶۷ علامہ اقبال روڈ
گڑھی شاہو۔ لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار

میاں عبد الواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیور ®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور

۲۲- لیاقت علی پارک ۳- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان

فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

محمد یعقوب

مسلمانوں کی موجودہ حالت
اور
اسلامی انقلاب کی برکات

ایک بھرپور جائزہ

الحمدلله رب العالمین والصلاة والسلام علی خاتم النبیین وسید المرسلین محمد رسول الله صلی الله علیه وسلم

بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں قریباً نصف صد مسلمان ممالک بشمول پاکستان مغرب کے براہ راست غلبہ و تسلط سے آزاد ہوئے۔ اگرچہ ان تمام ممالک میں آزادی کی تحریکیں کم و بیش اس صدی کے شروع سے جاری تھیں لیکن ان کی آزادی ان کی تحریکوں سے کہیں زیادہ مغربی اقوام کی جنگ زرگری کا نتیجہ تھی، جنگ عظیم دوم نے انہیں وقتی طور پر اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ ان ممالک پر براہ راست سیاسی غلبہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے مغرب نے انہیں جسمانی طور پر تو آزاد کر دیا لیکن اپنی علمی برتری، اخلاقی تفوق، معاشی استحکام اور ٹیکنالوجی کا غلام بنائے رکھا۔ ادھر چونکہ آزادی بھی خون کے عوض نہیں خریدی گئی تھی بلکہ ایک قسم کی ""آئینی جدوجہد" کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی اس لئے آزادی حاصل کرنے والوں کی اچھی خاصی اکثریت کو تو اس کا سرے سے فہم و ادراک ہی نہیں تھا کہ وہ کس نعمتِ عظمیٰ سے نوازے گئے ہیں اور یہ کہ اس سلسلہ میں ان پر کیا نئی اور اہم ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ اور جس چھوٹی سی اقلیت کو اس کا احساس تھا (ان میں جاگیردار اور بیورو کریٹس پیش پیش ہیں) وہ اپنے طبقے کے مزاج کے عین مطابق ذاتی منفعتوں، گروہی مفادات کے حصول اور اس کے لازمی نتیجہ یعنی محلاتی سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک اقلِ قلیل البتہ جب سے اب تک اہلِ درد کی موجود ہے جو ظلمت کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی کے مصداق بساط بھر روشنی بکھیرتی رہی ہے۔

آزادی...... ہم عام طور پر سنتے اور پڑھتے ہیں کہ پاکستانی عوام تاہنوز آزادی کی صحیح برکات سے متمتع نہیں ہو سکے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "قومی آزادی" سے مراد کیا ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے محض سیاسی آزادی یا زیادہ سے زیادہ معاشی آزادی سمجھتے ہیں حالانکہ اصل آزادی اس سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی نہیں ہے۔ ہر قوم کا ایک نظامِ حیات اور طرزِ حیات ہوتا ہے چنانچہ ہر قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنے اس نظامِ حیات کی تابع ہوتی ہے۔ دوسری قوموں کی سیاسی غلامی کے دور میں کوئی قوم اپنے اس مخصوص نظامِ حیات پر عمل نہیں کر سکتی اسی لئے وہ آزادی کے خواب دیکھتی ہے اس کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس کے حصول کے لئے اپنے بہترین فرزندوں کی قربانی پیش کرتی ہے۔ اور جونہی وہ دوسری قوموں کے سیاسی غلبہ سے نجات پاتی ہے یعنی معروف معانی میں آزادی حاصل کر لیتی ہے وہ فوراً زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مخصوص نظامِ حیات کو جاری و ساری کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے ادارے وجود میں لاتی ہے جو اس کے نظامِ حیات کو پوری قوت کے ساتھ اس کے حاصل کردہ خطۂ زمین میں رائج و نافذ کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ ایسا تعلیمی نظام (تعلیمی نصاب، تعلیمی ادارے اور ماہرین تعلیم) وضع کرتی ہے جو اس کے مخصوص نظام حیات اور طرزِ زندگی کو آئندہ نسل کے ذہنوں میں نقش کر دے اور آنے والی نسلیں اس نظام حیات کی امین بن جائیں.... اسی طرح وہ ایسے معاشی، معاشرتی اور فوجی ادارے، اسی طرح مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ وجود میں لاتی ہے جو الگ الگ ہونے کے باوجود ایک حیاتیاتی اکائی کی طرح باہم دگر مربوط و معاون ہوتے ہیں۔ اور اس عمل میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتی۔ یہی وہ چیز ہے جسے کسی قوم کی حقیقی آزادی کہا جا سکتا ہے۔

ہماری حالت...... اب اگر ہم اپنے گریبان میں جھانکیں اور سیاسی آزادی کے بعد کے اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی کم از کم تعریف پر بھی پورا نہیں اترتے... پاکستان کے کسی بھی مسلمان سے پوچھ دیکھئے کہ ہمارا نظام حیات کیا ہے تو فوراً جواب ملے گا۔ "اسلام"... اس لئے کہ اس میں دو رائیں ہیں ہی نہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جس قدر ملک بھی آزاد ہوئے ان سب نے آزادی کی جنگ کسی قومیت (ایک نسل، ایک ملک، ایک زبان اور ایک کلچر) کی بنیاد پر لڑی تھی۔ جبکہ تنہا پاکستان ہی وہ ملک ہے جو ایک مذہب یعنی اسلام کے نظریہ حیات) کے نام پر وجود میں آیا۔ لیکن سیاسی آزادی کے بعد ہم

نے کون سے ادارے قائم کئے جو ہمارے نظام زندگی کو تقویت دیتے؟ کیا ہم نے مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ کو اس نہج پر ڈالا؟ کیا ہم نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جو اسلام کو نئی نسل کا اوڑھنا بچھونا بنادیتا؟ کیا ہم نے ایسے معاشی و اقتصادی ادارے قائم کئے جو ہمیں ایک طرف تو اقوام مغرب کا دست نگر نہ ہونے دیتے اور دوسری طرف اندرون ملک کے تمام طبقات میں تقسیم دولت کے عادلانہ نظام کو استوار کرتے؟ کیا ہم نے ایسے معاشرتی ادارے قائم کئے جو ملک سے غیر ملکی اثرات کو ختم کرتے اور اسلامی طرز معاشرت کو رائج و متعارف کراتے؟ کیا ہم نے ایسی بے داغ انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی جس کی موجودگی میں کمزور طبقات مطمئن و خود پسند' اور طاقتور طبقات ہراساں و محتاط ہوتے؟

یقیناً ایسا نہیں ہوا بلکہ اس ملک کے بانی اور عظیم قائد کے آنکھیں بند کرتے ہی ملک کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح طالع آزماؤں نے لوٹ کا مال سمجھا' ملکی سیاست پر وہ "کھوٹے سکے" مسلط ہو گئے جو قائد کی جیب میں حالات کی ستم ظریفی نے ڈال دیئے تھے' کبھی بیورو کریٹس نے نقب لگائی تو کبھی فوجی موقع شناسوں نے..... کہاں کا نظریہ حیات اور کدھر کے ادارے' بقول شاعر ؎

ہمارے ملک کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

نتیجتہً ہر شعبۂ زندگی میں وہ لوٹ مچی اور وہ ہاہا کار ہوئی کہ الاماں! ' ہر کسی نے ملک کی آزادی اور سالمیت کو تو ایک طرف رکھا اور بقدر ظرف بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ ذاتی مفادات ہر دوسری قدر سے بالاتر ہو گئے۔ یہ آپا دھاپی اور افراتفری اگرچہ ہر حساس شخص پر روشن ہے تاہم یاد دہانی کے لئے قومی زندگی کے چند گوشوں کی ہلکی سی جھلک دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

نظامِ تعلیم...... نظامِ تعلیم ہی دراصل وہ شاہ کلید ہے جس سے آزادی و سرفرازی کے تمام بند دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور آزاد قومیں سب سے زیادہ دھیان اور وسائل اسی شعبہ میں کھپاتی ہیں۔ مشہور انگریز امیر البحر نیلسن نے فرانس سے واٹر لو کی بحری جنگ جیتنے کے بعد بیان دیتے ہوئے کہا تھا "ہم نے یہ جنگ کیمرج اور آکسفورڈ کے میدانوں ہی میں جیت لی تھی' لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد پاکستان میں سب سے زیادہ اسی شعبہ کو نظر انداز کیا گیا۔ اس بات کی طرف قطعی توجہ نہ دی گئی کہ بچوں کو کیا پڑھانا چاہئے اور کیوں؟ نصابِ تعلیم کیا ہو اور بچوں کے ذہنوں کو کس سانچے میں ڈھالنا ہے؟ تعلیمی اداروں میں حسن انتظام تو کیا فقط

انتظام بھی عنقا ہو گیا۔ بچوں میں بغیر محنت کئے نہ صرف پاس ہونے بلکہ اچھے نمبر لے جانے کا رجحان پیدا ہوا۔ ٹیوشن نے وبائی مرض کی طرح پورے نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تعلیمی اداروں کے اندر سیاست در آئی۔ بچے پڑھنے پڑھانے سے بے زار اور سیاسی ہنگامہ آرائی میں مشاق ہو گئے طالب علموں کے ہاتھوں میں کتابوں کی بجائے ہتھیار ہونا قابل فخر ٹھہرا۔ ان کی نظروں میں علم کی وقعت نہ رہی تو علم دینے والے کی کیا حیثیت ہوتی؟ نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیمی سطح تک اساتذہ بھرتی کرنے کا کوئی ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا جو ہمارے نظریۂ حیات کے مطابق ہوتا۔ نچلی سطح پر تو بگاڑ کی انتہا ہو گئی۔ اساتذہ میں سیاسی عناصر کی ہمہ وقت مداخلت اور دھونس سے ایسے ایسے "شاہکار" گھس آئے کہ جنہیں دیکھ کر تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں اور اخلاق نے سر پیٹ لیا۔ اعلیٰ تعلیمی سطح پر بھی محض ڈگریوں پر نظر کی گئی اور معلومات عامہ جانچی گئی۔ نظریۂ حیات سے اٹوٹ وابستگی اور تعلیم و تعلم سے طبعی میلان وہاں بھی نظر انداز ہوا۔ ہر قسم کا رطب و یابس اس حساس ماحول میں دھکیل دیا گیا۔ بعض اجنبی نظریۂ حیات کے حاملین نے تو باقاعدہ منصوبہ بندی سے تعلیمی اداروں کا رخ کیا اور طلباء کے نوخیز کچے ذہنوں میں وہ زہر ہلاہل بھرا کہ اس کی زہرناکی قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ آج حال یہ ہے کہ قوم کے حساس ترین شعبہ (نظام تعلیم) میں ایسے اساتذہ کی کثرت ہے جو یا تو غیر اسلامی نظریہ ہائے حیات میں یقین رکھتے ہیں یا پھر کسی نظریہ زندگی سے وابستہ نہیں اور محض اپنی تنخواہوں' ٹیوشنوں اور دیگر حصولِ زر کے ذریعوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

معاشی حالت...... ہمارے ہاں رواج یہ چل نکلا ہے کہ جونہی کسی نے ملک میں موجود مختلف طبقات کے درمیان وسیع معاشی خلیج پر بات کی جھٹ سے اس پر کمیونسٹ اور "سرخا" ہونے کا لیبل لگا کر بارہ پتھر کر دیا۔ حالانکہ دولت اور وسائل دولت کا منصفانہ اور عادلانہ تقسیم اسلام کا منشاء ہے۔ اسلام ہرگز نہیں چاہتا کہ دولت اغنیاء کے درمیان ہی گھومتی رہے۔ امیر امیر تر ہوتے جائیں اور غریب غریب تر۔ ہمارے ہاں جو حالت ہے اظہر من الشمس ہے۔ ایک طرف وہ جاگیردار ابن جاگیردار ہیں جن کے محل ملک کے تمام بڑے شہروں میں موجود ان کے قدوم میمنت لزوم کے انتظار میں سالوں خالی رہتے ہیں اور ایک طرف وہ بے گھر و بے در لوگ ہیں کہ کڑکڑاتی سردیاں' برستی برساتیں اور جھلسا دینے والی گرمیاں جن کے جسم و جان کے

اندر سے گزرتی ہیں۔ ایک طرف عوام الناس خاص طور پر دیہاتیوں کے بچے ہیں کہ جن کے لئے اوّل تو سکول موجود نہیں اور اگر ہے تو وہاں بے سرو سامانی کا وہ عالم ہے کہ صحراؤں اور ویرانوں کو ان پر رشک آتا ہے اور دوسری طرف ایچی سن کالج اور اس جیسے سینکڑوں تعلیمی ادارے ہیں کہ رشک جنت و فردوس نگاہ ہیں..... ایک طرف لاکھوں بیوائیں اور ان کے بچے ' لاکھوں معذور اور ان کے خاندان ' لاکھوں بے وسیلہ لوگ ' ہزاروں بے روزگار اور بے نور انسان حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

متوازن غذا کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے 'محض خوراک اور قوت لایموت کے حصول سے قاصر مختلف جسمانی و نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہیں ' اور دوسری طرف ایک طبقہ کے کتے بھی نرم و گرم بچھونوں پر استراحت فرماتے ہیں اور بھرا پیٹ ہونے کے سبب گوشت کی ران کو محض سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک جانب وہ خواتین ہیں کہ جن کے محض ڈریسنگ ٹیبل کو اپ ٹوڈیٹ رکھنے پر لاکھوں روپے ماہوار خرچ ہوتے ہیں اور دوسری جانب عورت نما مخلوق ہی عین حالتِ حمل میں بیس بیس اینٹیں اٹھا کر چار چار منزل اوپر چڑھتی اترتی ہے..... ایک طرف پانچ سے پندرہ سال کے بچے بوٹ پالش کرتے ' ہوٹلوں میں برتن دھوتے ' بسوں اور ٹرکوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے اور مستریوں کے پاس یا چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں کمر توڑ مشقت کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اسی عمر کے بچے زرق برق لباسوں میں چمکتی کاروں پر اعلیٰ درسگاہوں کو اس شان سے جاتے ہیں کہ سکول کے گیٹ سے کلاس روم تک بستہ اٹھا کر لے جانے کے لئے ایک مودب نوکر ساتھ ہوتا ہے۔ اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ ان دو طبقات کے درمیان یہ فرق و تفاوت روز بروز گہرا اور وسیع ہوتا جارہا ہے ملکی معیشت نام کی کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی 'محض غیر ملکی قرضوں پر گزارہ ہو رہا ہے۔ اور قرضوں کے سود کی ادائیگی کے لئے مزید قرضے حاصل کرنا ہی خارجہ پالیسی کی کامیابی سمجھا جارہا ہے۔ جو غیر ملکی قرضے حاصل کئے جاتے ہیں انہیں غیر پیداواری منصوبوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ ان قرضوں کا ایک بہت بڑا حصہ تو قرض دینے والا ملک اپنے مشیروں اور ماہرین کی گراں قدر تنخواہوں کی صورت میں واپس لے لیتا ہے اور جو کچھ باقی بچتا ہے وہ ملکی بیورو کریٹس اور ماہرین کی نذر ہو جاتا ہے عوام کے حصے میں محض قرضے کا بوجھ آتا ہے۔ ملک کا خزانہ اس حد تک خالی ہے کہ شاید چند سالوں تک حکومت کو ملازمین کی تنخواہ کی ادائیگی کے لئے بھی اندرونی و بیرونی قرضوں پر انحصار کرنا پڑے۔ ملک دیوالیہ ہو چکا ہے لیکن آپ ذرا ایک نظر بڑے بڑے افسروں کے دفاتر میں جھانک کر دیکھیں تو آپ وہاں عیش و

عشرت کے وہ وہ سامان پائیں گے کہ آپ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے۔ یہ محض دفتروں کا حال ہے دیگر اللے تللے اس پر مستزاد ہیں۔ ٹیکس دہندگان کی تمام تر ذہانت اور صلاحیت اس کوشش میں صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح ملکی خزانے میں ایک پیسہ نہ جانے پائے اور سرکاری ملازمین ان کی اس کوشش میں پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔

بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو بے دریغ قرضے جاری کئے جاتے ہیں اور وہ انہیں شیرمادر کی طرح ڈکار جاتے ہیں اور حکومت کمال فراخدلی سے ان کی معافی کا اعلان بھی کر دیتی ہے اور عوام کے سامنے ان مگرمچھوں کے نام تک نہیں آنے دیئے جاتے...... یہ محض ایک ہلکی سی جھلک ہے، ذہین قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

معاشرتی حالت...... ہمارا معاشرہ اب کوئی منظم معاشرہ نہیں رہا۔ دس کروڑ عوام مختلف قسم کے افقی اور راسی طبقات اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پھر یہ گروہ بھی منظم نہیں ہیں بلکہ آگے گروہوں اور ٹولیوں میں منقسم ہیں۔ اگر کوئی منظم ہے تو بس سرمایہ دار، جاگیردار اور بیورو کریٹس، دیہات میں تو حالت اور زیادہ دگرگوں اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ کی مانند ہے۔ ہندو منوسمرتی کا وہاں مکمل راج ہے۔ دیہی معاشرہ برہمن، کشتری، ویش اور شودر میں نہ سہی زمیندار اور کمی کے نسلی گروہوں میں تقسیم ہے۔ کمی کا لفظ بولنا اور استعمال کرنا اگرچہ قانوناً ممنوع ہے لیکن عملاً دھڑلے سے بولا بھی جا رہا ہے اور برتا بھی...... بے چارے دھوبی، موچی، نائی، مراثی اور دیگر پیشہ ور صدیوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ یہ مسئلہ معاشی نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ خالصتاً ایک معاشرتی روگ ہے۔ ان "کمیوں" میں بے شمار ایسے بھی ہیں جو معاشی خوشحالی میں زمینداروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں لیکن زمیندار طبقہ انہیں جس حقارت سے دیکھتا اور سلوک کرتا ہے وہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ شہروں کا رخ کر رہے ہیں اور یوں شہروں میں مزید معاشرتی اور انتظامی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ انتخابات سے ان لوگوں کو بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ یونین کونسل کی ممبری، چیئرمین شپ اور کونسلری سے لے کر صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشستوں تک ہر جگہ زمیندار طبقہ ہی چھایا ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر نیکی، ذہانت اور تعلیم کے باوجود بیچارے کمیوں کی کیا مجال ہے کہ وہ زمیندار کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے؟ نتیجتاً عوامی نمائندگی کے عہدوں پر قابض ہونے کے بعد زمیندار طبقہ اور زیادہ مضبوط ہو کر "کمیوں" کے لئے مزید وحشت اور دہشت کا سبب بن

جاتا ہے۔

رشوت، غبن اور بد عنوانی...... رشوت ستانی ایک قدیم روگ ہے اور ہر زمانے میں اس کا چلن رہا ہے۔ حتیٰ کہ انگریز کے زمانہ اقتدار میں بھی جو کم از کم انتظامی لحاظ سے ایک مضبوط زمانہ تھا لوگ رشوت لیتے دیتے تھے مگر بہت چھپ چھپا کر اور ڈر ڈرا کر۔ لیکن اب تو اس کا وہ زور ہے اور یوں سینہ زوری سے لی جاتی ہے بلکہ اپنا حق سمجھ کر دھڑلے سے وصول کی جاتی ہے کہ الاماں والحفیظ۔ غبن و بد عنوانی اس پر مستزاد ہے۔ اس کی بے شمار وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ زمیندار طبقہ کا سرکاری ملازمتیں اختیار کر لینا ہے۔ یہ طبقہ رشوت لینے میں بڑا دلیر ہوتا ہے اس وجہ سے کہ انہیں اپنی ملازمت کے کھٹائی میں پڑ جانے کا کوئی ایسا غم نہیں ہوتا۔ ملازمت نہ بھی رہے تو آبائی زمین تو کہیں گئی نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ علاقہ کا ایم پی اے بھی اپنا اور ایم این اے بھی اپنا۔ سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشوت صرف یہی طبقہ لیتا ہے دوسرے بھی لیتے ہیں لیکن رشوت، بد عنوانی اور غبن میں دیدہ دلیری اسی طبقہ کی پیدا کردہ ہے۔

رسوماتِ قبیحہ...... شادی بیاہ پر بے تحاشا خرچ کرنا، لڑکیوں کے لیے چوڑے جہیز، سینکڑوں افراد پر مشتمل براتیں اور پھر ان کی پر تکلف دعوتیں، نمائشی اور آرائشی روشنیوں کی چکاچوند، بینڈ باجے، آتش بازی اور اسی طرح کی دوسری لغویات اور دولت کی نمائش بھی زیادہ تر ایسے طبقے کی طرف سے ہوتی ہے جس کے ہاں مالِ حرام وافر تعداد میں پہنچتا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر عام آدمی کے دل و دماغ میں بھی ایسے ہی خواب جنم لیتے ہیں اور جب وہ اپنی حقیر کمائی سے ایسا نہیں کر سکتا تو ایک طرف جرائم پیشگی اور دوسری طرف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یوں معاشرتی مسائل مزید گھمبیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سرکاری محکمے اور ادارے...... جیسا کہ آپ جان چکے ہیں رشوت، بد عنوانی اور غبن سرکاری محکموں کا عام چلن بن چکا ہے۔ بیچارے غرباء اور ضعفاء ہاتھوں میں درخواستیں پکڑے دفاتر کے چکر پر چکر کاٹتے رہتے ہیں اور کہیں کوئی فریاد رس نہیں پاتے۔ بڑے افسروں کے دروازے بند اور دور باش کی صداؤں سے گونجتے ہیں اور ماتحت عملہ بالعموم تن آسان، نا اہل اور بسا اوقات حرام خور ہوتا ہے۔ سائل کدھر جائے؟ مثال کے طور پر صرف دو حکومتی اداروں کا ہلکا سا خاکہ پیش ہے۔

واپڈا...... یہ ایک ملک گیر ادارہ ہے اس کے پاس بے شمار وسائل اور افرادی قوت ہے یہ سستی بجلی پیدا کرتا ہے اور مہنگے داموں مہیا کرتا ہے۔ پھر بھی یہ سدا مقروض اور مسلسل گھاٹے میں ہے۔ وجہ؟ اس کے ملازمین اسے کھائے چلے جا رہے ہیں اور بجائے اس کی روک تھام کے بجلی کے نرخ کسی اعلان و جواز کے بغیر مسلسل بڑھائے جا رہے ہیں اور اس نرخ بالا کن کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

ریلوے...... بالکل یہی حال ریلوے کا ہے۔ گاڑیوں میں رش کا وہ عالم ہوتا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور آمدن کا پوچھو تو مسلسل خسارہ! وجہ وہی کہ باڑ کھیت کو کھائے جا رہی ہے۔ اس کے ملازمین ہی اسے نگلے جا رہے ہیں اور قرض پر گزارہ چل رہا ہے۔

سیاسی صورت حال...... "سیاست" ایک معزز ترین کام بلکہ مسلسل محنت کا نام ہے۔ کیونکہ اہل سیاست کا کام انسانی گروہوں اور منتشر افراد کو متحد کرنا، منظم و منضبط معاشرے تشکیل دینا، ضعیف و ناتواں اور طاقتور و مضبوط کے درمیان قانون کی عملداری قائم کرنا نیز انسانوں کی صلاحیتوں اور قوتِ کار کو ایک مثبت رخ پر چلا کر انسانیت کو اوجِ کمال کی طرف لے جانا ہوتا ہے۔ اسی لئے امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہود کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے" لیکن اس مملکت خداداد میں اگر آپ ایک عام دیہاتی، مزدور یا ٹھیلے، تانگے والے سے پوچھیں کہ سیاست کا کیا مطلب ہے تو وہ فوراً کہے گا "عیاری، مکاری، بددیانتی اور فریب دہی" کبھی آپ نے سوچا سیاست کا یہ مفہوم انہوں نے کیوں اور کیسے اپنایا؟ دراصل یہ ایک بڑی دردناک حقیقت ہے۔ قائد اعظم کے بعد سے ہماری سیاست جاگیرداروں کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی رہی ہے۔ پاکستان سے پہلے ان کی مخصوص شکارگاہیں ہوا کرتی تھیں جہاں وہ ہرنوں اور گیدڑوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ پاکستان کے بعد انہوں نے پورے ملک کو اپنی شکارگاہ قرار دے لیا اور یہاں انسانی عزتِ نفس کا شکار کھیلنے لگے ؎

کیوں نہ جنت کو بھی دوزخ میں ملا لیں یارب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی!!

جاگیرداروں کے پاس (جو کہ اب تیزی سے صنعت کار اور سرمایہ دار بھی بنتے جا رہے ہیں) وقت اور دولت کی فراوانی ہے۔ لہٰذا یہ وادی ان کے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔ اس لئے کہ قبل پاکستا[ن] ان کی جاگیر کی حدود میں انسانی سر ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے تھے۔

اب موقع آیا کہ پورا ملک نہیں تو کم از کم پورا صوبہ ان کی سلامی میں کھڑا ہے۔ ادھر نظام بھی ایسا تھا کہ کوئی انہیں عوامی نمائندہ منتخب ہونے، وزارتوں کے قلمدان سنبھالنے اور ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس نوزائیدہ ملک کے سیاسی افق پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گئے۔ اب ان کی "اہلیت" تو صرف یہ تھی کہ وہ جاگیردار تھے اور مقصد صرف اپنے طبقے کے مفادات کی حفاظت اور شخصی سربلندی تھا ... ملک و قوم کی سربلندی، نظریۂ حیات کا استحکام، دوررس منصوبہ بندی، جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی کا فروغ، عظیم انسانی قدروں کا احیاء، ملک میں موجود صلاحیتوں کا بھرپور استعمال، آئندہ نسلوں کی تیاری کے لئے ایک مضبوط اور خود کار نظام کا قیام وغیرہ سب ان کے لئے بے معنی چیزیں تھیں حتیٰ کہ روزمرہ کے حکومتی امور کی انجام دہی کا دماغ بھی ان کے پاس نہیں تھا چنانچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ بیورو کریسی پر انحصار کیا۔ وہ بیورو کریسی جو سالہا سال کی محنت سے انگریز بہادر نے غلام قوم پر اپنا شکنجہ مضبوط رکھنے کے لئے تیار کی تھی، جسے صرف اس بات کی تربیت دی گئی تھی کہ نظم و نسق (Law & Order) کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہونے دیں یا دوسرے لفظوں میں رعایا کو چوں چرا نہ کرنے دیں۔ چنانچہ بیورو کریسی نے ابتداء میں یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے موجودہ آقا انگریز آقاؤں کی طرح آگاہ، سرگرم اور باصلاحیت نہیں ہیں تو ان کے دلوں میں خود آقا بن جانے کا سودا سمایا اور وہ فی الواقع آقا بن بیٹھے.... ایسی حالت میں فوج کیوں پیچھے رہتی، جرنیلوں کو بھی حکمرانی کا شوق چرایا اور چونکہ ان کے پاس "قوت" کا استحقاق بھی تھا لہٰذا کون روک سکتا تھا؟

سیاسی جماعتیں...... دنیا کے عام چلن کے مطابق اس بدقسمت ملک میں بھی سیاسی جماعتیں رہی ہیں اور ہیں۔ سب سے پہلے تو مسلم لیگ کا ذکر کرنا چاہیئے کہ بلاشبہ پاکستان کے قیام میں اس "جماعت" کے قائدانہ رول کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن "مسلم لیگ" ایک جماعت کی بجائے ایک شخص کا نام تھا۔ محمد علی جناح ہی مسلم لیگ تھے۔ کیونکہ اگر یہ واقعی کوئی جماعت ہوتی تو قائد کی وفات کے بعد بھی "قائم" رہتی۔ جماعتوں کو افراد کی موت سے کوئی گزند نہیں پہنچا کرتا۔ اور اب تو "مسلم لیگ" (اگر کہیں ہے تو) محض جاگیرداروں اور طالع آزماؤں کی پناہ گاہ کا نام ہے۔ باقی سیاسی جماعتوں کو تین واضح گروپوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ مذہبی سیاسی جماعتیں...... ان میں سے صرف جماعت اسلامی ہی قدیم بھی ہے اور غیر فرقہ وارانہ بھی...... لیکن اب اس کی یہ حالت ہے کہ دین کو تو ثانوی حیثیت حاصل ہے اور سیاست کو اولیت دی جاتی ہے اور وہ بھی انتخابی سیاست کو۔ اس طرح اس نے گویا حصولِ اقتدار کو اپنا نصب العین اور دوسری سیاسی جماعتوں اور اقتدار پسند عناصر کو اپنا حریف بنا لیا ہے۔ اس طرح اس کے میدانِ عمل میں تنگی اور محدودیت پیدا ہو گئی ہے۔

دوسری مذہبی سیاسی جماعتیں خالصتاً فقہی فرقوں پر مشتمل ہیں اور اس طرح گویا انہوں نے خود ہی اپنے کو محدود کر لیا ہے۔

ب۔ سیکولر سیاسی جماعتیں...... اس گروپ میں مسلم لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل پیپلز پارٹی، تحریک استقلال وغیرہ اہم ہیں یہ اگرچہ کسی خاص طبقے اور فرقے تک محدود نہیں ہیں لیکن اول تو لوگ انہیں آزما چکے ہیں۔ دوسرے ان جماعتوں میں وہ جاگیردار، سرمایہ دار اور بیورو کریٹس گھسے ہوئے ہیں جو ہمارے ملک کی ابتر صورت حال کے اصل ذمہ دار ہیں۔

ج۔ علاقائی جماعتیں...... اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے گروہ شامل ہیں جو زیادہ تر بعض شخصیتوں کے گرد گھومتے ہیں اور گروہی مفادات کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ملک گیر سیاست میں قطعاً بے اثر لیکن بعض وقتی اور علاقائی عصبیتوں کے علمبردار اور نظم و نسق کے مسائل پیدا کرنے کے اہل ہیں۔ ان ہی میں بعض گروہ علی الاعلان پاکستان کو توڑنے اور اسلام کو ختم کرنے کی باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب سیاسی جماعتیں زیادہ تر اپنے قائدین کے اخباری بیانوں کی حد تک زندہ ہیں۔ عوام کی سیاسی تربیت، اپنے کارکنوں سے گہرا ذاتی رابطہ اور ان کی تعلیم و تربیت، اپنے ولولہ انگیز پروگرام کے بل بوتے پر نچلی سطح پر عوام میں نفوذ، نظم و ضبط، دنیا کے جدید ترین رجحانات کا مطالعہ اور روح عصر سے آگاہی، اس علم اور آگاہی کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل اور طرز عمل میں انقلابی تبدیلیاں، عوام کی نفسیات سے آگاہی اور اندرون ملک اور بیرون ملک عوام کے اذہان پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کا علم اور اس طرح کی بے شمار چیزیں جو سیاسی جماعتوں کے لازمے کی حیثیت رکھتی ہیں یہاں مفقود ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لینا اور ملک و قوم کی فلاح و فوز کے لئے ان کی طرف دیکھنا محض خوش فہمی ہے۔

دینی حالت...... اگر تو دین محض نماز روزے کا نام ہوتا تو بلاشبہ ۱۰ فیصد آبادی کو "دینی" قرار دیا جاسکتا تھا۔ (اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ اتنے فیصد لوگ ہی اس کی پابندی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر قسم کے اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں لیکن اس طرف کبھی کسی کا خیال ہی نہیں گیا کہ ایک "مسلم ملک" میں پنج وقتہ نمازیوں کا شمار ہی کر لیا جائے) لیکن دین ان شعائر اسلامی کے ساتھ ساتھ اجتماعی عدل کا نام بھی ہے۔ (لیقوم الناس بالقسط) نماز روزہ کے پابند تو اس معاشرے میں مل ہی جاتے ہیں' عدل اجتماعی کا تو نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہر فرقے کے چوٹی کے علماء تو شاید اس سے واقف ہوں لیکن مساجد کے عام ائمہ بھی اس حقیقت سے ناواقف محض ہیں۔ ان کا کام بالعموم اسلام کے نام پر اپنے اپنے فرقے کا پرچار کرنا' دوسروں کی تکفیر کرنا' فقہی اختلافات کو اچھالنا' بال کی کھال کھینچنا' خالص کلامی مسائل کو ان پڑھ عوام کے ہاتھوں میں دے دینا اور اس طرح افتراق و انتشار کو ہوا دینا ہے۔

دوسری طرف تصوف کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی عیاں را چہ بیاں کے مصداق سب پر کھلا ہے۔ تہذیب الاخلاق اور مکارم اخلاق جو تصوف کا اصل ہدف تھے زیب طاق نسیاں ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر زور شیخ پرستی' قبر پرستی' میلوں ٹھیلوں اور عرسوں پر ہے۔ چند خدا ترس مشائخ کو چھوڑ کر اکثریت دوکانداری کر رہی ہے عوام کو مختلف توہمات میں مبتلا کر کے شرک و بدعت اور غیر اسلامی شعائر کا پرچار ہو رہا ہے۔ تعویز گنڈوں' جھاڑ پھونک اور شفاعت باطلہ کے نام پر غریب جاہل عوام کا استحصال روز افزوں ہے۔

ملک کے نظم و نسق کا حال...... پولیس اور عدالتوں کا اصل کام کمزوروں کو زبردستوں کے ظلم و زیادتی سے بچانا ہوتا ہے۔ پولیس کے ذمے ہے کہ وہ ظلم کو اس کے وقوع سے پہلے روکے اور کمزوروں کے حقوق کی نگرانی کرے اور اگر ظلم و زیادتی اور حقوق کی پائمالی وقوع پذیر ہو ہی جائے تو ایسا کرنے والوں کو جلد از جلد عدالت کے سامنے پیش کرے۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ فوری طور پر حقدار کو حق دلائے اور کسی قسم کے دباؤ میں نہ آئے.....اب ذرا پولیس کی کارکردگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے۔ ہے کوئی کل سیدھی؟ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے کیا ہماری پولیس مظلوموں کی ہمدرد ہے؟ ضعیفوں کی پناہ گاہ ہے؟ کمزوروں کی آخری امید ہے؟ بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کسی غریب کے ہاں چوری ہو جائے' ڈاکہ پڑ جائے یا فریب دہی سے اس کی عمر بھر کی محنت شاقہ کی کمائی لٹ

جائے، پولیس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ پولیس رپورٹ تک درج کرنے سے محترز رہتی ہے۔ ہاں کسی "پہنچ والے" کا معمولی نقصان بھی ہو جائے تو پورے محلے اور پورے گاؤں کو لپیٹ میں لے لیا جاتا ہے۔ قتل کی صورت میں البتہ پولیس پہنچتی ہے تاکہ ایک سیدھے سادے کیس کو اپنی دانشمندی سے الجھا کر پیچیدہ بنا سکے...... اسی کا ایک شعبہ ٹریفک پولیس ہے جو ٹریفک کے بے عیب بہاؤ میں تو کوئی کردار ادا نہیں کرتی البتہ اس کی اپنی چاندی ہوتی رہتی ہے آدھی پولیس تو ہر وقت "مشاہیر قوم" کی آؤ بھگت، ان کی حفاظت و سہولت اور ناز برداری میں لگی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قتل، چوریاں، ڈاکے، بینک ڈکیتیاں، دنگے فساد، مار پیٹ اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی وسیع پیمانے پر جاری ہے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ کسی کا گھر اگر محفوظ ہے تو محض تائید قدرت کی بدولت، کسی عورت کی عزت محفوظ ہے تو فضل ایزدی سے۔ ملکی انتظام و انصرام کا یہ حال ہے کہ ع نے ہاتھ باگ پر ہے نے پائے رکاب میں۔

تبدیلی کے امکانات؟...... ملک کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خستہ و خراب ہے جس کا ایک اجمالی سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ہمسایہ طاقتوں کی رال پاکستان پر ٹپک رہی ہے اور اس کے بعض بد خواہ بھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے سرگرم ہو گئے ہیں...... ہمیشہ حکمران طبقہ (جاگیردار، سرمایہ دار، افسر شاہی) نظام میں کوئی تبدیلی لانا ہی نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اسی نظام اور ایسی ہی صورت حال میں ان کا بھلا ہے۔ وہ بھلا ایسے نظام کو کیوں بدلیں گے جس میں انہیں خدائی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان کی تو پوری کوشش ہوگی کہ صورت حال میں سر مو فرق نہ آئے اور حالات جوں کے توں (*Status Quo*) رہیں۔ سیاسی جماعتیں اس کو یوں نہیں بدل سکتیں کہ اول تو کوئی ایسی سیاسی جماعت ہے نہیں جو عوام کی عظیم اکثریت کے دلوں کی دھڑکن بن جائے۔ اس لئے کہ عوام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت افقی اور راسی سینکڑوں خانوں میں تقسیم در تقسیم کیا جا چکا ہے۔ دوسرے سیاسی جماعتوں میں باہم اس قدر سر پھٹول، منافرت اور بُعد ہے کہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ تیسرے یہ کہ عوام میں ابھی وہ سیاسی شعور اور کس بل نہیں ہے کہ وہ جاگیرداروں کی جاگیروں میں رہتے ہوئے ان کے خلاف ووٹ دے سکیں لہٰذا انہیں اسمبلیوں میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ چوتھے یہ کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر باقی تمام سیاسی جماعتوں کی باگ ڈور اور لیڈر شپ انہی وڈیروں کے ہاتھ میں ہے۔

کوئی جماعت بھی کامیاب ہو حکومت وڈیروں ہی کی بنے گی..... اور اگر کہیں پانسا پلٹتا نظر آیا تو مارشل لاء کا عفریت سر پر سوار!..... ایک اور مؤثر عنصر یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اور عوام سے رابطے کے تمام وسائل انہی طبقات کے قبضے میں ہیں لہٰذا معاشرے پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔

کیا کیا جائے؟...... حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں کسی آئینی اور قانونی طریقے سے کوئی بڑی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ آئینی اور قانونی طریقے سے صرف حکومت کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ پورے نظام کو تبدیل کر دینا کسی بھی طرح اور کبھی بھی ممکن نہیں ہوتا..... اور پاکستان میں محض حکومت کو تبدیل کر کے کسی بڑی تبدیلی کی توقع رکھنا حماقت ہے...... حکومتیں اس سے پہلے بھی تبدیل ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی مگر عوام اور ہمارے مخصوص طرز زندگی میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہوگی اس لئے کہ معاشرہ میں ایک طاقتور، مؤثر اور منظم طبقہ سرے سے کوئی تبدیلی چاہتا ہی نہیں اور جو لوگ تبدیلی چاہتے ہیں وہ فی الحال اس قابل نہیں کہ کوئی تبدیلی (آئین کے اندر رہتے ہوئے) لا سکیں۔

انقلاب...... پاکستان کے مخدوش اور ابتر حالات، اسلام سے کھلی بیزاری بلکہ بغاوت، کمزور اور ناتواں طبقوں کا استحصال، امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال، مسلسل گرتا ہوا معاشی گراف، بد نظمی، رشوت، نا اہلی، غبن اور سرکاری ملازمین کی من مانی، بیرونی مداخلت کا خطرہ اور اندرونی فسادیوں کی ریشہ دوانیاں اس بات کی مقتضی ہیں کہ یہاں ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کیا جائے...... ایک ایسا انقلاب جو نیچے سے اوپر تک سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ اس لئے کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جہاں عام اور معروف طریقوں سے تبدیلیاں نہ لائی جا سکتی ہوں اور جہاں فرسودہ اور متعفن نظام نے عوام الناس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہو اور جہاں ایک قلیل لیکن مکروہ طبقہ کروڑوں لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو وہاں انقلاب لازمی اور لابدی ہو جایا کرتا ہے۔ پاکستان میں ایسی ہی صورت حال ہے بلکہ اس سے بھی کئی گنا خوفناک..... چنانچہ ہمہ گیر انقلاب کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ع

جزدار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہ گار سوئے دار چلے ہیں

مغرب میں انقلاب فرانس نے پورے یورپ میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

ظلم و جہل کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں نے ایک انقلاب کی بدولت ساری دنیا کی سیاسی اور علمی قیادت سنبھال لی...... مشرق میں روس و چین نے اشتراکی انقلاب کے ذریعے اپنے مردہ اور سڑے ہوئے معاشروں کو حیات نو عطا کی اور آگے بڑھ کر سپر طاقتوں کی صف میں قدم رکھا اور وہ مسلم امّہ جس نے کئی صدیوں تک دین اور دنیا دونوں جہتوں میں اپنی سیادت و قیادت کے پھریرے لہرائے تھے' انقلاب سے بدکنے اور خوفزدہ ہونے کے باعث آج خستہ و ماندہ سسک رہی ہے۔ حالانکہ ع جس میں ہو نہ انقلاب موت ہے وہ زندگی

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

انقلاب کیسے؟..... اس مختصر مضمون میں اس عظیم موضوع کو سمیٹنے کی گنجائش نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایسے مخلص لوگ جو قلب کی گہرائیوں سے یہ چاہتے ہوں کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے اور وہ اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کے لئے آمادہ و تیار ہوں۔ ہر مصیبت جھیلنے اور ہر مشقت اٹھانے میں بے باک ہوں' اپنے اور اپنے گھر والوں کی حد تک شعائر اسلامی کے پابند ہوں' کبائر سے مجتنب اور صغائر کے ترک میں کوشاں ہوں اور وہ کسی ایک قیادت کے ہاتھ میں بیعت کر کے ایک متحد' منظم اور ایثار پیشہ جماعت میں ڈھل جائیں۔ اطاعت امیر اور نظم و ضبط کے خوگر ہوں' اپنی مرضی اور رائے کو ترک کرنے والے اور مکمل طور پر امیر کے اشارۂ ابرو کے منتظر ہوں۔ یاد رہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے۔ جب ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے اور وہ تربیت و آزمائش کی بھٹی میں سے گزر چکے اور ان کی تعداد بھی "معقول" ہو جائے تو "منکرات" کے خلاف پرامن مظاہرے 'پکٹنگ اور احتجاج سے اپنا جہاد شروع کر دے۔ پھر اس کے بعد آنے والے حالات خود اس کے لئے عمل کی راہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے دروازے کھولتے چلے جائیں گے حتیٰ کہ برائی کی تمام قوتیں اور مسلم معاشرہ کی گردنوں پر سوار گمراہ اور ظالم طبقہ سرنگوں ہو جائے .. اور جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا کا ربانی فیصلہ پورا ہو جائے۔

انقلاب کا نتیجہ..... یاد رہے کہ انقلاب کبھی "پرامن" نہیں ہوتا۔ ہاں حسن تدبیر سے اور اللہ کی تائید و نصرت سے خون خرابے کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں بے پناہ انسانی توانائی پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ایٹم کے مرکزے (نیوکلس) کو

پھاڑا جائے تو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح جب کسی نظام کے نیوکلس کو پھاڑا جائے تو بے شمار انسانی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ہوتا دراصل یوں ہے کہ اس زوال آمادہ معاشرہ میں بے شمار انسانی صلاحیتیں (Talent) بے استعمال اور بے فائدہ اور بے سمت موجود ہوتی ہیں۔ انہیں استعمال میں لانے والا' انہیں ایک رخ دینے والا اور انہیں مجتمع (Pool) کرنے والا نہیں ہوتا۔ انقلاب کے نتیجے میں یہ سب Talent ایک نئے جوش و خروش اور نئے ولولے کے ساتھ ابھرتا ہے اور قوم کے رگ و ریشے میں خون تازہ کی طرح دوڑتا ہے۔ چنانچہ وہ منزلیں جو خواب و خیال دکھائی دیتی تھیں ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح قدموں میں آن گرتی ہیں۔ سالوں کے کام لمحوں میں ہوتے اور کٹھن راہیں پل بھر میں طے ہوتی ہیں...... ملک میں چونکہ کوئی مؤثر مخالف اور منفی قوت باقی نہیں رہتی اس لئے پوری قوم متحد' منظم اور پرجوش ہو جاتی ہے جس سے ترقی کا گراف ۹۰ درجے پر اٹھتا اور اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ قوم اپنے پسندیدہ نظام حیات اور طرز زندگی کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے مچھلی پانی میں آ جائے۔ غرض انقلاب نام ہے حیات نو اور زندگی تازہ کا۔

انقلاب کے ثمرات و برکات...... اس میں شک نہیں کہ انقلاب کے لئے کچھ قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ کچھ سرفروشوں کو بنیاد کی اینٹیں بننا پڑتا ہے لیکن اس سے ایک بیمار معاشرہ از سرنو صحت مند' توانا اور پرجوش ہو جاتا ہے اور انقلاب کا قائد اگر اس جوش و جذبہ اور ابلتی ہوئی توانائی کو مثبت سمت میں کامیابی سے ڈھال سکے اور قوم میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کر سکے تو اس کی برکات سے نہ صرف آئندہ آنے والی سینکڑوں نسلیں متمتع ہوتی ہیں بلکہ ایسا خالص اسلامی انقلاب ملک کی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں رہتا اور ایک چشمہ صافی کی طرح ابل ابل کر پوری مسلم ملت کو سیراب کر دیتا ہے۔ پوری امت اس سے حیات نو اور جذبہ تازہ حاصل کرتی ہے۔

انشاء اللہ انقلاب کے بعد اسی پاکستانی قوم کو جو اب آپ کو از کار رفتہ' رشوت' بددیانتی اور خود غرضی میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہے' پہچان نہیں سکیں گے...... زندگی کے ہر شعبہ میں اور حیات کے ہر گوشہ میں ایسی ایسی تبدیلیاں آئیں گی کہ قلم انہیں لکھنے سے عاجز اور نطق انہیں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

۱۔ مثال کے طور پر تمام جاگیریں ختم کر دی جائیں گی اور زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے گی جس سے ایک طرف وہ طبقہ ختم ہو جائے گا جو قوم کی گردن پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے اور دوسری طرف ہزاروں بے زمین ہاریوں کو زمین مل جائے گی جہاں وہ جی جان سے محنت کر کے اناج کے ڈھیر لگا دیں گے۔

۲۔ **تعلیمی انقلاب......** ملک و قوم کے تمام تر وسائل کا بڑا حصہ تعلیمی نظام کی تعمیر نو اور اس کے پھیلاؤ میں صرف کیا جائے گا۔ اور یہ تعلیم بے مقصد' بے سمت' بے اخلاق اور بے دین نہیں ہو گی۔ بلکہ پوری ذمہ داری اور منصوبہ بندی سے چند ہی سال میں سو فیصد شرح تعلیم حاصل کر لی جائے گی۔ اور چونکہ یہ تعلیم علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ گہری دینی سمجھ بوجھ بھی پیدا کرے گی اس لئے وہ جہل اور توہمات جو معاشرہ کو گھیرے ہوئے ہیں از خود کافور ہو جائیں گے۔

۳۔ **معاشی انقلاب......** سود (جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ ہے) کا بلکلیہ ختم کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اندرون ملک سرمایہ داری کی جڑ کٹ جائے گی اور بیرون ممالک تمام قرضوں کا صرف اصل زر ادا کیا جائے گا اور آئندہ کسی قوم یا ادارے سے کوئی قرضہ نہیں لیا جائے گا۔ مکمل طور پر اپنے وسائل سے کام چلایا جائے گا۔ غیر ضروری اور غیر پیداواری اخراجات بیک جنبش قلم ختم کر دیئے جائیں گے۔ سادگی اور کفایت شعاری قومی نعرہ ہو گی۔ سادگی اوپر سے نیچے کی طرف سفر کرے گی۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں بعد المشرقین کو ختم کر دیا جائے گا۔

۴۔ **صنعتی انقلاب......** ہمارے ہاں بے پناہ ذہانت و صلاحیت موجود ہے وہ صرف استعمال نہیں ہو رہی۔ انقلاب کے نتیجے میں جب مختلف صلاحیتوں کو مجتمع کیا جائے گا اور انہیں ضرورت کے مطلق سرمایہ اور وسائل مہیا کئے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند ہی سالوں میں ہم وہ کچھ خود پیدا نہ کرنے لگیں جو آج در آمد کرتے ہیں۔ ہماری سرزمین میں جو بے شمار دفینے ہماری ضرب کلیمی کے منتظر ہیں ان سے انتفاع عام کی فوری اور بھرپور کوشش کی جائے گی۔ ایجاد و اختراع میں نوجوانوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی جائے گی بلکہ انہیں وسائل اور پشت پناہی بھی مہیا کی جائے گی۔

۵۔ پین اسلام ازم...... جیسا کہ آپ جانتے ہیں حقیقی انقلاب کسی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا چنانچہ ایک صحیح اسلامی انقلاب انشاءاللہ آگے بڑھ کر پوری امت کو سیراب کرے گا۔ اور پچاس کے قریب مسلم ممالک ایک جسد واحد کی صورت متحد و مربوط ہو جائیں گے۔ ایک کے وسائل دوسرے کے اور دوسرے کی افرادی قوت تیسرے کے کام آئے گی۔ سب کا درد ایک اور سب کی قوت بھی ایک ہو جائے گی۔ اور یوں ایک عظیم الشان اسلامی قوت وجود میں آجائے گی۔ پھر کوئی بعید نہیں کہ پوری دنیا کی قیادت آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ کمزور قومیں مدد واستعانت کے لئے آپ کی طرف دیکھا کریں گی اور آپ کے اشارۂ آبرو سے اقوام عالم کی تقدیروں کے فیصلے ہوں گے پوری دنیا سے ظلم واستحصال کا خاتمہ ہو گا اور انسانیت کا رخ جذبات سفلی سے اخلاق اعلیٰ کی طرف پھر جائے گا۔ پوری دنیا ھُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کے کلمۂ حق سے گونج اٹھے گی...... دیگر ادیان باطلہ سرنگوں اور زیردست ہوں گے وھم صاغرون

لیکن اس سب کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہے۔ کچھ سرفروشوں اور کفن بردوشوں کی مانگ ہے۔

اے ابنائے وطن ہے ہمت ؟

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

آدابِ معاشرت

شیخ رحیم الدین
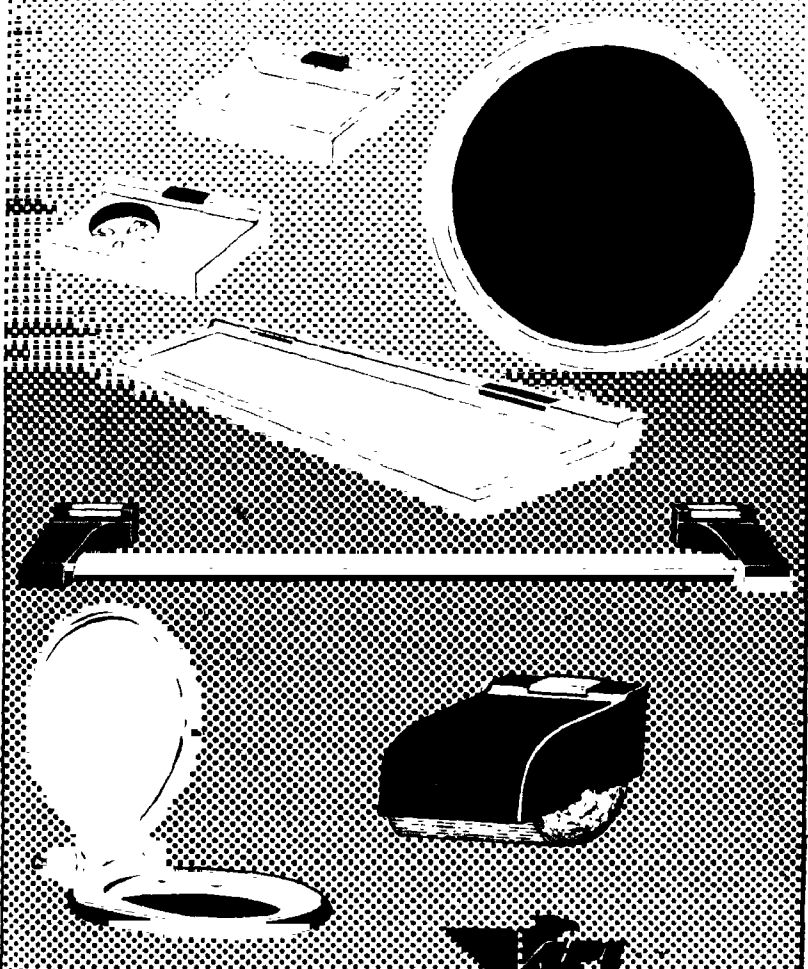
انسانی شخصیت انفعال پذیر ہوتی ہے جو کہ اپنے دوستوں کے اخلاق وعادات واطوار سے غیر شعوری طور پر اثرات قبول کرتی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی دوستی اختیار کرنی چاہیئے جو کہ نیک اور صالح ہوں کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں تقویٰ کی روش کو اختیار کیا ہوا ہو۔ کیونکہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

- مجلس میں آتے اور جاتے وقت سلام کرنا چاہیئے۔
- مجلس میں بیٹھنے کے لئے دو آدمیوں کو ہٹا کر نہ بیٹھے، جہاں آسانی سے جگہ مل جائے بیٹھ جائے۔ ہٹا کر بیٹھنا متکبرین کا طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو آدمیوں کے درمیان (اپنے بیٹھنے کے لئے) تفریق کرے مگر ان کی اجازت سے (جامع الترمذی)
- اسی طرح کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھنا بھی سخت معیوب ہے۔
- آدابِ مجلس میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ دو آدمی تیسرے بھائی سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ تیسرا بھائی اسے اپنے خلاف ہونے کا شبہ کرے۔
- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم تین ہو تو دو (آدمی) تیسرے (ساتھی) سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں یہاں تک کہ تم لوگوں سے مل جاؤ اس لئے کہ یہ (تیسرے سے الگ ہو کر دو آدمیوں کی سرگوشی) اسے غمزدہ کرے گی۔ (صحیح مسلم)
- مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے اگر کوئی کسی ضرورت کی وجہ سے اٹھ کر گیا ہو تو اس کی جگہ پر نہ بیٹھیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گا تو پھر اس کی جگہ پر بیٹھنے میں کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔

- مجلس میں کسی امتیازی جگہ پر بیٹھنے سے اجتناب کیجئے۔ اسی طرح مجلس میں ادب سے بیٹھے، پاؤں پھیلاکر یا صاحبِ صدر کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا آدابِ مجلس کے خلاف ہے۔
- مجلس میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا چاہیئے اور اس طرح بیٹھنا چاہیئے کہ آنے والے اور جانے والے لوگوں کو زحمت نہ ہو۔ اور اگر لوگ زائد ہو جائیں تو سمٹ کر بیٹھ جانا چاہیئے اور آنے والوں کو خندہ پیشانی سے جگہ دینی چاہیئے۔
- مجلس میں اگر آپ نے کچھ کہنا ہو تو صدرِ مجلس سے اجازت طلب کریں اگر وہ اجازت دیدیں تو اپنی بات کہیں اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو پھر دل میں ملال نہ آنے دیں۔
- مجلس میں جو باتیں راز کی ہوں اس کو لوگوں سے بیان نہ کریں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "المجالس بالامانۃ" یعنی مجلس کی باتیں امانت ہیں۔
- مجلس میں جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو جب تک وہ طے نہ ہو جائے اس میں دوسرا موضوع نہ چھیڑیئے اور دوسروں کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع نہ کیجئے۔ اور اگر کبھی ایسی کوئی ضرورت پیش ہی آگئی ہے تو بولنے سے پہلے اجازت لے لیجئے۔
- مجلس میں صرف دنیا کی باتیں کرنا اور صرف دنیا کے کام کرنا اور ذکر اللہ سے محروم رہنا شدید محرومی ہے۔ حضرت ابوھریرۃؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جو کسی جگہ پر بیٹھے اور اس میں اللہ کا ذکر نہ کرے۔ اس پر اللہ کی طرف سے حسرت ہے (یعنی وہ قیامت کے دن افسوس کرے گا)۔
- کوشش کیجئے کہ آپ کی کوئی مجلس خدا اور آخرت کے ذکر سے خالی نہ رہے۔ اور جب آپ محسوس کریں کہ حاضرین دینی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہے تو گفتگو کا رخ کسی دنیوی مسئلہ کی طرف پھیر دیں اور پھر جب مناسب موقع پائیں تو گفتگو کا رخ حکمت کے ساتھ دینی موضوع کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں۔
- حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم آخر میں جب مجلس سے اٹھنے کا ارادہ کرتے تو یہ دعا کرتے۔

سبحانك اللّٰهم وبحمدك اشهد ان لا إله الا انت

رفتارِ کار

امیرِ تنظیمِ اسلامی کا تین روزہ دورۂ فیصل آباد

مرتب : محمد یعقوب

گذشتہ اجلاسِ شوریٰ میں فیصلہ ہوا تھا کہ محترم ڈاکٹر صاحب پاکستان میں تنظیمی اعتبار سے قائم مختلف حلقوں کو اپنے قیمتی وقت میں سے ہر ماہ تین دن دیا کریں گے اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر فیصل آباد سے جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا مراسلہ موصول ہوا کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ وہاں ۲۹ر تا ۳۱ر جولائی کے پروگرام میں تشریف لا رہے ہیں لہٰذا آپ بھی آئیے اور رفقاء کو بھی ساتھ لائیے۔

ہم پانچ رفقاء گوجرانوالہ سے علی الصبح فیصل آباد پہنچے تو ہمارا خیال یہ تھا کہ فیصل آباد والے اپنی محدود افرادی قوت (۲۹ رفقاء صرف) اور محدود مالی وسائل کے پیشِ نظر کوئی بھرپور پروگرام ترتیب نہیں دے سکیں گے، لیکن کوچ جونہی فیصل آباد کے مضافات میں پہنچی، ہم نے ایک خوشگوار حیرت سے دیکھا کہ ہر بڑے چوک میں جہازی سائز کے کپڑے کے بینرز آویزاں ہیں جن پر محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب کی آمد کی نوید اہلِ شہر کو سنائی گئی ہے۔ سفید براق کپڑے کے یہ بینرز صبح کی نرم رو ٹھنڈی ہوامیں پھڑپھڑا رہے تھے گویا امیر محترم کی آمد پر خنداں و رقصاں ہوں۔ ہم سے دور ایک پر رونق چوک میں رکشہ میں بیٹھے کوئی صاحب لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ امیر محترم کی فیصل آباد میں آمد اور خطاب عام کا اعلان بڑے دلپذیر لب و لہجہ میں کر رہے تھے۔ کوچ سے اتر کر ہم احسان پرنٹنگ پریس (جہاں استقبالیہ شعبہ تھا) کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ فیصل آباد تنظیم کی سوزوکی پک اپ ہمیں خوش آمدید کہنے کو پہنچ گئی معلوم ہوا ان تین دن کے لئے ہمارا قیام جناح کالونی میں واقع پی ایم اے کی عمارت میں ہو گا۔ وہاں ایک زیر تعمیر بڑے آڈیٹوریم میں ہماری عارضی رہائش کا انتظام تھا۔ اتنی کوئیک سروس اور اس قدر درست انتظام!

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پی ایم اے کی زیر تعمیر عمارت میں مختلف شہروں سے آئے ہوئے رفقاء کافی تعداد میں جمع تھے۔ حلقہ وسطی پنجاب جس کا ہیڈ کوارٹر فیصل آباد ہے' گوجرانوالہ ڈویژن کے تمام اضلاع' فیصل آباد ڈویژن کے تمام اضلاع اور سرگودھا ڈویژن کے تمام اضلاع (ماسوائے جھنگ) پر مشتمل ہے۔ لہٰذا مختلف اضلاع سے ستاون رفقاء وہاں جمع تھے۔ اپنے کام کاج چھوڑ کر اپنی گوناگوں مسروفیتوں سے نکل کر' اپنے عزیزوں اور بچوں سے جدا ہو کر' اپنے وقت اور اپنے پیسے کا ایثار کر کے' اپنی محبتوں اور اپنے مشاغل کو تج کر مختلف پیشوں' مختلف تعلیمی معیار' مختلف سماجی اور معاشی پس منظر کے ساتھ وہاں جمع تھے۔ کس لئے؟ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے' اللہ کی سرزمین پر اللہ کی حکمرانی کا ڈنکہ بجانے کا سودا لئے' اُس عظیم اسلامی انقلاب کا تصور دلوں میں بسائے جس سے تمیز آقا و بندہ مٹ جائے گی' جس سے ۔

پھر دلوں کا یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

معلوم ہوا قبلہ ڈاکٹر صاحب جمعہ کی نماز جناب سیاح الدین کا کاخیل کی قائم کردہ مسجد اور دارالعلوم "اشاعت العلوم" لکڑ منڈی میں پڑھائیں گے۔ اس ادارہ جلیلہ کے ناظم جناب عبدالرشید ارشد صاحب ہیں اور مسجد کے خطیب جناب مسلم قاسمی صاحب ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کا تعارف کراتے ہوئے ہماری معلومات میں یہ بیش قدر اضافہ کیا کہ موصوف "خان" بھی ہیں دونوں جلیل القدر اصحاب علم نے جس خوشدلی اور تعاون علی البر کا مظاہرہ فرمایا' تنظیم اسلامی فیصل آباد ان کی تہہ دل سے ممنون ہے۔

یہاں بھی فیصل آباد کی تنظیم کے رفقاء' اُن کے امیر جناب رحمت اللہ بٹر صاحب اور حلقہ کے امیر جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کی محنتوں کا ثمر ہمارے سامنے تھا.... اشاعت العلوم کی وسیع مسجد کانوں کان بھری ہوئی تھی اور لوگ غضب کی گرمی اور حبس میں مسجد کے صدر دروازے تک امیر محترم کی پکار پر گوش بر آواز تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مخصوص طرز تخاطب اور مردانہ لب ولہجہ کے ساتھ سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کی روشنی میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اور اس سلسلہ میں امت کی ذمہ داریوں پر گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک سحر تھا جو پورے مجمع پر طاری تھا ایک اعجاز نطق تھا جو دلوں کو برما رہا تھا' رقت تھی کہ بار بار امنڈی چلی آتی تھی.... اللہ کرے زور خطاب اور زیادہ۔

جمعہ ۲۹ر جولائی ہی کی شام کو ضلع کونسل کے وسیع سبزہ زار میں محترم ڈاکٹر صاحب کا

خطاب عام تھا۔ فیصل آباد کی تنظیم کے رفقاء اپنے امیر کی سربراہی میں فیصل آباد جیسے وسیع شہر کے گلی کوچوں میں منادی لگا رہے تھے۔ گرمی اور حبس کی پرواہ کئے بغیر تھکن اور بے آرامی کے باوصف ' وسائل کی کمی کے باوجود ... اور اس کا نتیجہ مغرب کی نماز کے بعد ضلع کونسل کے سبزہ زار پر نکلا ' جہاں ہزاروں لوگ کاروں ' سکوٹروں ' سائیکلوں پر اور پیدل ہجوم کئے ہوئے تھے۔ وسیع لان پر بچھی دریاں بھر گئیں ان سے پیچھے قطار اندر قطار پڑی کرسیاں کم پڑ گئیں اور سینکڑوں لوگ یا تو کھڑے رہے یا لان کی مخملیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ نماز مغرب کے کچھ دیر بعد خطاب شروع ہوا ... موضوع تھا "فلسفہ شہادت" عوام کا مجمع اور یہ خالص علمی موضوع! دل میں خوف پیدا ہوا کہ "عوام" کو کیا چیز بٹھائے رکھے گی؟۔ نہ فرقہ واریت کا چٹخارہ ' نہ سیاست کی شیرینی ' نہ دشنام و تکفیر کا بارہ مصالحہ ' نہ سبز باغ دکھانے کا گڑبڑ گھٹالہ ... لیکن ڈاکٹر صاحب نے شہادت کے مروجہ مفہوم سے لے کر شہادت علی الناس کے زروۂ سنام تک کے مختلف مراتب و مراحل سے عوام کو یوں روشناس کرایا کہ میں نے سینکڑوں سروں کو ہلتے اور سینوں کو وجد کرتے پایا ... بے پناہ گرمی تھی اور حبس ایسا کہ جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے "وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ!" مشرق اور جنوب میں واقع سڑکوں پر ٹریفک کا شور اس پر مستزاد ... لیکن لوگ یوں جم کر بیٹھے اور بیٹھ کر جمے کہ آخری لفظ ادا ہونے تک ایک تنکا تک نہیں ہلا۔ ڈاکٹر صاحب ... نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی سنت مطہرہ اور خلفائے راشدین کے عمل کا نقشہ ایسے پر اثر اور دلسوز الفاظ میں کھینچا کہ عوام تو عوام خواص تک کے دل پگھل پگھل گئے۔ اعلان ہوا اس کے دوسرے اور عملی حصے کا بیان کل یعنی ۳۰ ر جولائی کی شام کو یہیں اسی وقت ہو گا ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

رات ساڑھے نو بجے یہ محفل دلپذیر ... اور وعظ دلگداز اختتام کو پہنچا۔ نماز عشاء وہیں ادا کی گئی۔

ہمارا ... خیال تھا۔ ۳۰ جولائی کا پورا دن رفقاء اپنی تھکن اتارنے اور اپنی توانائیوں کو مجتمع کرنے میں گزاریں گے لیکن کہاں؟ "اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا" اب معلوم ہوا دس بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک ریکس ہوٹل کا ایئرکنڈیشن ہال بک ہے جہاں امیر محترم فیصل آباد کے اہل علم و دانش سے "اہل علم و دانش کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب کریں گے۔ ۹ بجے صبح سوزوکی پک اپ اور سفید ویگن پھر حرکت میں آئیں اور ہم لدپھند کر وہاں پہنچے۔ ساڑھے دس بجے تک ہال اپنی تنگ دامانی پر شکوہ سنج تھا۔

خطاب شروع ہوا اب کے رنگ ہی اور تھا۔ اگر چہ مرکزی خیال وہی تھا جس نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ، حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب لیکن محفل تھی اہل علم و دانش کی، چنانچہ ضروری ہوا کہ بات کسی اور رخ سے سامنے آئے "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" امیر محترم نے "علم کی وحدت" کا فلسفہ پیش فرماتے ہوئے کہا کہ علم انسان کی مشترکہ میراث ہے اور اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ علم دین کو اگرچہ دیگر علوم پر فوقیت و برتری حاصل ہے لیکن دیگر علوم حواسی و قلبی سے صرفِ نظر نقصان دہ ہے، اس کی تقسیم کی وجہ سے علمائے دین مدرسوں اور خانقاہوں میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ایوانہائے حکومت و اقتدار پر سیکولر ذہن رکھنے والا طبقہ قابض ہو گیا ہے نیز آپ نے علماء دین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ "دین کے محدود تصور" سے نکلیں اور "دین" کے اصل تقاضوں یعنی غلبہ دین و اقامت دین کی منزل کی طرف ہماری اور عوام الناس کی راہنمائی فرمائیں۔ یہ خطاب کوئی سوا بارہ بجے تک جاری رہا۔ بعدہ، سوالات کی دعوت دی گئی جن سے ڈاکٹر صاحب اپنی خداداد ذہانت سے باحسن وجوہ عہدہ بر آ ہوئے چائے تو ہونا ہی تھی سو ہوئی اور ایک بجے یہ یادگار محفل بادل نخواستہ برخواست ہوئی کہ ظہر کا وقت قریب تھا۔

۳۰ ر جولائی کو ظہر کی نماز کے بعد دوسرے مقامات سے آئے ہوئے رفقاء تو رات بھر کی تھکن اتارتے رہے لیکن آفرین ہے فیصل آباد کے رفقاء پر کہ وہ پھر اس وسیع شہر کے گلی کوچوں میں پھیل گئے اور بعد از نماز مغرب کے خطاب عام کی منادی کرنے لگے خدشہ تھا کہ آج کی حاضری قدرے کم ہو گی اس لئے کہ گذشتہ روز جمعۃ المبارک کی تعطیل عام کی وجہ سے لوگ زیادہ تعداد میں آئے تھے، اور آج چونکہ یوم کار (WORKING DAY) ہے اس لئے لوگ کم ہوں گے لیکن مغرب کے بعد جونہی ضلع کونسل کے سبزہ زار پر آوازۂ حق بلند ہوا، لوگوں کی ٹولیاں ضلع کونسل کے باب النور سے داخل ہونا شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کل سے بھی قدرے بڑھ گیا۔ اس میں جہاں فیصل آباد کی تنظیم کی محنت شاقہ کا ہاتھ تھا وہاں لوگوں کی اپنی "پیاس" اور "تلاش حق" کو بھی دخل تھا۔

امیر محترم نے گذشتہ روز کے خطاب کی تلخیص سے تقریر کا آغاز فرمایا اور پھر بحالیٔ جمہوریت اور عوام کے حقوق کی بازیابی کے موضوع سے ہوتے ہوئے اپنے اصل موضوع یعنی اسلامی انقلاب کے مراحل و لوازم کو نہایت جوش و خروش اور انشراح صدر سے بیان فرمایا۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو بیسیوں بار سنا ہے لیکن آج رنگ دگر تھا......
امیر محترم نے گلے کی خرابی (جو مسلسل استعمال پر بطور احتجاج بیٹھا جا رہا تھا) کے باوجود رات ساڑھے دس بجے تک قلب کو گرمایا اور روح کو تڑپایا۔ عوام نے پوری دلجمعی سے سنا۔ دو ڈھائی گھنٹہ اس حبس میں بیٹھنا خصوصاً جبکہ عوام کا مخصوص بارہ مصالحہ بھی نہ ہو خاصا کٹھن کام تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے لوگ اب روایتی سیاست بازوں کی بجائے کسی مردِ حق آگاہ کی تلاش میں ہیں۔

رات ساڑھے دس بجے حسب معمول لان میں عشاء کی با جماعت نماز ادا کی گئی اور پھر دیگر تمام حضرات توشب بسری کے لئے روانہ ہوئے جبکہ رفقاء تنظیم نے جلسہ گاہ میں بچھی ہوئی دریاں اور بکھری ہوئی کرسیاں سمیٹنا شروع کیں۔ یہاں میں گجرات کے رفقاء کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ جس محنت، لگن اور شوق سے کام کرتے ہیں لائق صد تحسین اور قابل تقلید ہے۔

۳۱ر جولائی اتوار کو صبح ناشتے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب پی ایم اے کی عمارت میں رفقاء سے ذاتی رابطہ کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے تھکن اور بے آرامی کے باوجود تمام رفقاء کا ذاتی تعارف حاصل کیا اور مفید پندو نصائح سے نوازا آپ نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "میں فیصل آباد کی تنظیم کو اس عمدگی اور محنت سے اجتماع منعقد کرنے پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور ان کے جذبے اور لگن کے پیش نظر اس بات پر بھی آمادہ ہوں کہ ہر ماہ فیصل آباد میں درس قرآن دینے کے لئے حاضر ہو جاؤں"۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ہر شخص اچھی طرح جان لے کہ ہماری جدو جہد کا محور و مرکز قرآن ہے لہٰذا تمسک بالقرآن اختیار کیجئے اور اسے دل کے اندر اتاریئے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ انفرادی نیکی کے ساتھ اجتماعی نیکی کی طرف بڑھئے۔ تنظیم ایک مشکل ترین کام ہے اس میں انسان کو "انا" کی قربانی دینا پڑتی ہے لیکن تنظیم کے بغیر کسی موثر اور نتیجہ خیز تحریک کا آغاز نہیں کیا جاسکتا۔

دوران گفتگو نئے مرتب شدہ تنظیمی و تربیتی نصاب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا تمام رفقاء بالعموم اور سینئر رفقاء و بالخصوص اس بات کا برا نہ مانیں کہ انہیں از سر نو بعض بنیادی کتابچوں اور کیسٹوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ اسے قند مکرر کے طور پر پڑھیں اور اسے کرنے کا ایک اہم کام جانیں۔

آپ نے رفقاء کو تلقین کی کہ کسی ہنگامی سیاست بازی یا ہنگامی عوامی تحریک کی چکا چوند سے مرعوب نہ ہوں اور پورے صبرو سکون کے ساتھ اپنا اصل کام یعنی ذاتی تربیت، تنظیم اور

کردار سازی پر توجہ مرکوز رکھیں اپنے ارادوں کو بلند اور اپنی ہمتوں کو مجتمع رکھیں۔

گھنٹہ بھر کی اس نشست کے آخر میں آپ نے بعض رفقاء کے سوالات کے جوابات دیئے اور دعا پر نشست اختتام پذیر ہوئی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب میاں محمد نعیم صاحب نے امراءُ نقباء اور ذمہ دار حضرات کو پکڑ بلایا اور امیر محترم کی رفقاء سے ملاقات کی روشنی میں آئندہ مجوزہ اجتماع رفیقان حلقہ وسطی کی تاریخ اور مقام کے بارے میں مشورہ کیا۔ اب دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ کھانے کے بعد گوجرانوالہ ' سیالکوٹ اور گجرات سے آئے ہوئے بیشتر رفقاء خوشگوار یادیں لئے روانہ ہوئے۔ لیکن کچھ رفقاء سوال و جواب کی آخری نشست کے لئے رک گئے جن کی تواضع نقیب اسرہ گوجرانوالہ جناب محمد امین شاد صاحب نے آئس کریم سے کی۔ جزاک اللہ

۳۱ ؍ جولائی کی تپتی ہوئی سہ پہر کو ۴ بجے جب ہم ڈاکٹر صاحب کی معیت میں ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں داخل ہوئے تو معدودے چند لوگ ہی ہال میں موجود تھے۔ مایوسی کی ایک ٹھنڈی لہر میرے دل کو چھوتی ہوئی گزر گئی بہرحال ڈاکٹر صاحب نے کرسی سنبھالی اور چند ایک سوالوں کے جوابات دینا شروع کئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈسٹرکٹ کونسل کا ہال بھر گیا۔ سوالات کی پرچیاں آنی شروع ہوئیں تو انبار لگ گئے۔

جوابات دینے کے لئے وقت کا تعین پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ یعنی چار تا ساڑھے پانچ بجے شام۔ اس ڈیڑھ گھنٹہ میں اتنے سارے سوالوں کا جواب ممکن نہ تھا۔ لہٰذا بہت سے اصحاب کو اپنے سوالات کے جوابات سے محروم رہنا پڑا۔ انہیں تنظیم اسلامی فیصل آباد کے دفتر سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ سوالات میں سے بعض تو محض سوالات تھے جبکہ بعض خاصے تیکھے اور پہلودار تھے۔ ان کے جواب بھی امیر محترم نے بڑے تحمل اور بردباری سے دیئے۔ پانچ بجکر ۲۵ منٹ پر ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہ ساڑھے پانچ بجے نماز عصر ادا کرنا تھی۔ ہجوم مشتاقاں آپ کے جلو میں تھا۔ ڈسٹرکٹ کونسل کی عمارت کے اندر واقع مسجد میں نماز عصر مقامی امام کی اقتدا میں ادا کی گئی اور وہیں مسجد میں نماز کے بعد چار باہمت افراد نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کر کے تنظیم اسلامی کا دست و بازو بننا قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے اور جس راہِ پر خار پر انہوں نے چلنا اپنی آزاد مرضی سے قبول کیا ہے وہ راہیں اُن کے لئے آسان فرما دے۔ آمین ثم آمین۔

بقیہ: حرفِ اول

محترم ڈاکٹر اسرار احمد اپنی جماعت 'تنظیم اسلامی' اپنی انجمن 'انجمن خدام القرآن اور اپنے سامعین کے مستقل حلقے یعنی مسجد دار السلام باغ جناح میں یہ آوازہ لگا چکے ہیں کہ قرآن کالج میں نئے سال کے آغاز کے لئے اپنے بیٹوں اور اپنے حلقہ احباب میں موجود بچوں کو تیار کریں۔ قارئین "میثاق" کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ ع

اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی

وہ بھی اپنے گھر اور آس پاس کا جائزہ لیں اور تندرست و توانا' ذہین اور ہونہار طلبہ کو قرآن کالج سے بی۔ اے پاس کرنے کی ترغیب دیں۔ انجمن کے ذرائع و وسائل اگرچہ محدود ہیں تاہم مناسب خرچ پر ہوسٹل کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور سے باہر کے طلبہ کے لئے بھی کوئی عذر موجود نہیں۔ دین کی سربلندی و سرفرازی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خواہش جن دلوں میں موجود ہے کم از کم انہیں تو ضرور یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ کام محض دعاؤں سے نہیں ہو گا' کچھ کئے ہی بات بنے گی۔ ہم خود اگر اپنی توانائیاں دنیا کے حصول میں لگانے پر مجبور ہو گئے ہیں تو اپنی اولاد کی زکوٰۃ ہی نکالیں۔

اور آخری گزارش اس سلسلے میں یہ ہے' جس کے بغیر بات مکمل نہ ہوگی' کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے اعوان و انصار' سامعین اور قارئین کو یہ دعوت دینے سے پہلے خود اپنے بچوں کو اس کام پر لگایا' اپنے اعزہ اور اقرباء کو اس پر آمادہ کیا اور اللہ کے دین کے لئے جھولی سب سے پہلے اپنے خاندان کے سامنے ہی پھیلائی تھی۔ رفاقت سکیم میں ان کے دو بیٹے (ایک ایم بی بی ایس اور دوسرا ایم اے) اور دو سالہ نصاب میں ایک چھوٹا بھائی اور تین داماد شریک تھے جن میں سے ایک داماد ہی نہیں' بھتیجا بھی تھا۔

پاکستان کا
نمبر
1
بائیسکل
سُہراب

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی
رُوح افزا
تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو، کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔
فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقہ، تاثیر اور معیار میں لازوال۔
رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا
ہمدرد
ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں
خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے
ADARTS
HMD-6/87
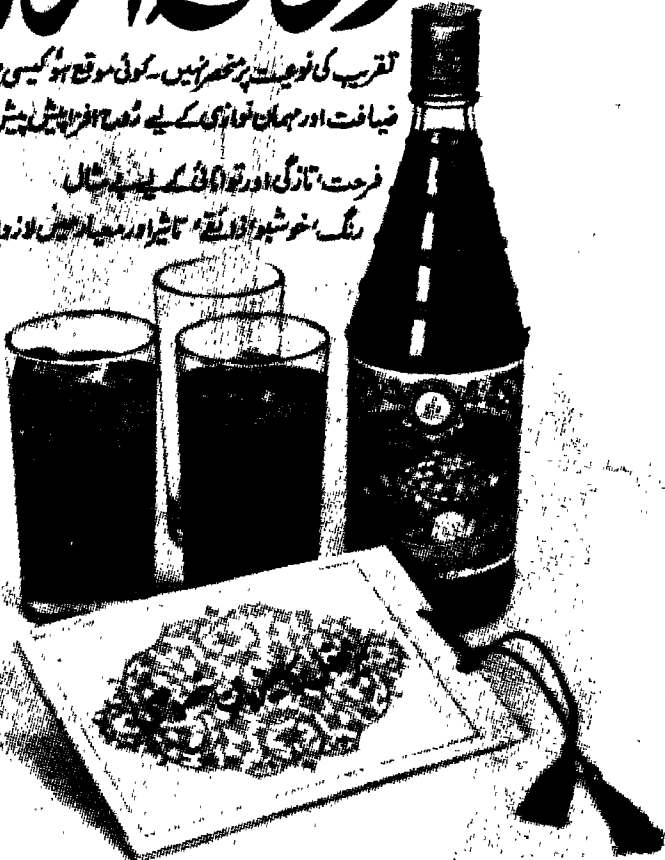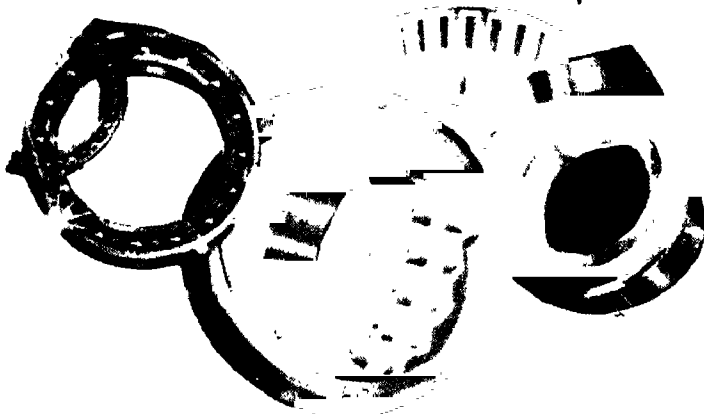
بیرونِ پاکستان خریدار حضرات متوجہ ہوں

آپ کی سہولت کے لئے مندرجہ ذیل مقامات پر ہمارے نمائندگان موجود ہیں۔
زرِ تعاون اور تجاویز و شکایات ان کے پاس بھجوائے جا سکتے ہیں ۔۔۔!!

برائے جدہ (سعودی عرب)

MR MUHAMMAD ASGHAR HABIB
CC 720 SAUDIA P.O BOX 167
JEDDAH 21231 K S A
TEL OFF. 6513140 RES. 6721490

برائے سعودی عرب

MR. ABDUR RAUF
P.O BOX 3691
RIYADH 11481 KSA
TEL OFF: 4771614 RES: 4771539

برائے مشرقِ وسطیٰ و امارات

MR. MOHAMMAD HANEEF DAR
JAMIAT KHUDAMUL QURAN
P.O BOX 388 ABU DHABI UAE

برائے یورپ

MR SYED HASHIM
2 FALCON CRESCENT, PONDERS END
ENFIELD, MIDDLE ESEX EN 3 4LT UK.
TEL 01 - 804 - 1295

برائے امریکہ

DR. KHURSHID A. MALIK
SOCIETY OF THE SERVANTS OF AL-QURAN NORTH-AMERICA
810, 73rd STREET, DOWNERS GROVE ILLINOIS 60516 USA
TEL: 312, 964-7806, 312-969-6755

برائے کناڈا

MR. ANWAR-UL-HAQ QURESHI
SOCIETY OF THE SEVANTS OF AL-QURAN NORTH AMERICA
323, RUSHOLMS ROAD 1809 TORONTO OFFICE
TORONTO ONT M6H 2Z2 CANADA
TEL: 416-531-2902, 416-596-0447

برائے بھارت

MR. HYDER MOHI UD DIN GHAURI
ANJUMAN KHUDAM-UL-QURAN
4-1-444 2nd FLOOR BANK STREET
HYDERABAD 500001 AP INDIA
TEL. 42127

DAR

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے [illegible] اور اطاعت کی

جلد ۳۷
شمارہ ۹
محرم الحرام ۱۴۰۹ھ
ستمبر ۱۹۸۸ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات ـ ۲۵ سعودی ریال یا ۱۵۰/- روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا ـ ۶ امریکی ڈالر یا ۱۰۰/- روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ ـ ۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰/- 〃 〃
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ ـ ۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰/- 〃 〃

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لیمٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶ ـ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ـ ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶ ـ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ـ ۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱ ـ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی ـ فون ۲۱۶۵۸۶
پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ ـ کے ماڈل ٹاؤن ـ لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس [illegible] لاہور

مشمولات

عرضِ احوال

صدر ضیاء الحق کی حادثاتی موت پر
امیر تنظیم اسلامی کے تاثرات

صدر ضیاء الحق مرحوم کی حادثاتی شہادت کا واقعہ ۱۷ اگست کو پیش آیا۔ ۱۹ اگست کے خطابِ جمعہ میں یہی جانکاہ حادثہ امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا موضوع تھا۔ خطاب کے نصف اوّل میں محترم ڈاکٹر صاحب نے صدر ضیاء کی موت کو شہادت کی موت قرار دیتے ہوئے اس عظیم سانحے پر اپنے احساسات و جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اور ملک و ملت پر اس حادثے کے ممکنہ اثرات اور فوری اہمیت کے کاموں پر روشنی ڈالی تھی اور خطاب کے نصف آخر میں انہوں نے صدر ضیاء مرحوم کے ساتھ اپنے روابط اور دوطرفہ تعلقات پر وضاحت سے گفتگو کرتے ہوئے صدر صاحب کے اُن احسانات کا بطور خاص ذکر کیا تھا جو محترم ڈاکٹر صاحب کی تحریک اور خدمتِ قرآنی کے کام میں اُن کے لئے باعثِ تقویت ثابت ہوئے۔ خطاب کے پہلے حصے کا بھرپور ملخص محترم اقتدار صاحب کے قلم سے ہفت روزہ 'ندا' کے شمارہ ۲۶ کے ادارتی صفحات میں اور نصفِ ثانی کی تلخیص شمارہ ۲۷ میں 'منبر و محراب' کے زیرِ عنوان شائع ہوئی تھی۔ موجودہ حالات میں امیرِ تنظیم کا یہ خطاب چونکہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے لہٰذا افادہ عام کے لئے اسے ہفت روزہ 'ندا' کے شکریے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔

(ادارہ)

(۱)

پاکستان ہفتہ رفتہ میں ایک بحران اور ہیجانی کیفیت سے گذرا ہے۔ صدر مملکت اور چیف آف آرمی سٹاف' جنرل ضیاء الحق ایک حادثے سے دوچار ہوئے اور افواج پاکستان کے قیمتی افسروں اور جوانوں کی ایک معتدبہ تعداد کے علاوہ امریکی سفیر اور فوجی افسروں کے ساتھ خود بھی لقمہ اجل بن گئے۔ یہ سانحہ بذات خود بھی بہت بڑا تھا لیکن جونہی ایسے شواہد سامنے آئے جن سے اس کا ایک تخریبی کارروائی کا نتیجہ ہونا تقریباً ثابت ہو گیا' قوم کے غم واندوہ میں کئی گنا اضافہ ہوا اور لوگوں نے بجا طور پر ان کی شہادت کو اپنی پیشانی کا جھومر سمجھنا اور دشمنوں کے عزائم پر تشویش کا اظہار شروع کر دیا۔ حادثے کی تحقیقات جاری ہیں اور اگر اس میں راز داری نہ رکھی گئی تو صرف یہ معلوم ہونا باقی ہے کہ ملک دشمنوں کے کس گروہ نے اپنے منصوبے کی تکمیل کے لئے طریقہ کون سا اختیار کیا تھا ورنہ اگلے ہی روز کراچی میں تیل کی تنصیبات پر راکٹوں اور میزائلوں کے حملے نے یہ راز طشت ازبام کر دیا کہ اب ملک کو نئی طرز کی اور خوفناک تخریب کاری کا سامنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے ہمیں اس حملے کے عواقب سے محفوظ رکھا ورنہ جو تباہی لانے کا ارادہ کیا گیا تھا' وہ واقعی بہت بڑی ہوتی۔

جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سال تک کوس لمن الملک بجاتے یوں اچانک منظر سے ہٹ جانے کو کسی نے بھی معمولی واقعہ قرار نہیں دیا۔ بین الاقوامی سطح پر قابل ذکر لوگوں کا ردعمل اور ذرائع ابلاغ کے تبصرے شاہد ہیں کہ اس واقعہ کو اور اس کے اثرات کی شدت کو ہر جگہ پوری طرح محسوس کیا گیا ہے۔ ملک کے اندر بھی ہر سیاسی جماعت اور مسلکی گروہ نے معاشرے کے ہر طبقے اور پیشہ ورانہ تنظیم نے اور رائے عامہ کی نمائندگی کرنے والے سب ہی چھوٹے بڑے سیاسی' مذہبی اور سماجی راہنماؤں نے اس پر رائے زنی کی ہے۔ ملکی اخبارات و جرائد کو تو ظاہر ہے کہ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی تھا۔ ہم جب لکھنے بیٹھے تو امیر تنظیم اسلامی پاکستان' برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا تازہ خطبہ جمعہ ہمیں اپنے دل و دماغ کی مراد محسوس ہوا اور ہم نے کسی تکلف میں پڑنے کی بجائے مناسب سمجھا کہ اپنے اداریئے میں انہی کے جذبات و خیالات کی ترجمانی پر بس کریں کہ ہم بھی کہنا یہی کچھ چاہتے تھے چاہے اس خوبی سے اپنا مافی الضمیر بیان نہ کر سکتے۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

گذشتہ سات سال سے ہمیں جنرل صاحب کی پالیسیوں سے شدید اختلاف رہا ہے اور ہم نے بلا جھجک اس کا اظہار کیا۔ "ندا" کی فائل بھی جسے شائع ہوتے ابھی صرف چھ ماہ ہوئے ہیں' گواہ ہے کہ ہم نے اس سلسلے میں نہ کسی رورعایت سے کام لیا اور نہ نتائج کی پرواہ کی اور

لوگوں نے اس طرز عمل کو ہمارے احساس کی شدت پر محمول کیا ہو تو عجب نہیں۔ لیکن جس پالیسی کو وہ لے کر چل رہے تھے اس کے دونوں پہلوؤں پر ہم نے ہمیشہ احقاق حق اور ابطال باطل کے جذبے کے ساتھ اور اپنے اللہ اور ضمیر کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داری کے تحت لگی لپٹی رکھے بغیر بات کی ہے۔ ان کی خارجہ پالیسی کو جو بحیثیت مجموعی فی الحقیقت بھٹو مرحوم ہی کے بنائے ہوئے خطوط پر چلتی رہی ہے' ہم نے ملک کے مفاد میں سمجھا اور اس میں جو ایک نیا عامل ان کے اپنے دور میں شامل ہو' اس پر ان کی حکمت عملی کو خراج تحسین پیش کرنے میں بھی ہم پیچھے نہ رہے۔ ہم نے ان صفحات میں جہاد افغانستان میں ان کی عزیمت اور کردار کی پختگی کا اعتراف کرتے ہوئے اس تاریخی جدوجہد میں کامیابی کا سہرا ان کے سر باندھا۔ افغانیوں نے اگر جاں فروشی' شجاعت اور جذبۂ ایمان کے ایک روشن باب کا اضافہ تاریخ اسلام میں کیا ہے تو جنرل ضیاء نے ان کی پشت پناہی' ان کی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے' دنیا بھر کی توجہ اس طرف منعطف کرانے اور سیاسی میدان مارنے کے علاوہ ان کے خاندانوں اور مہاجرین پر مشتمل لاکھوں مسلمانوں کو اپنے ملک میں ٹھکانا دے کر ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا تھا۔ ہماری تنقید کا ہدف ان کی اندرون ملک پالیسی تھی جسے ہم نے شعوری طور پر اور دلیل و برہان کے ساتھ ملک اور اسلام کے لئے مہلک اور سخت نقصان دہ سمجھا۔ ہمارے نزدیک سابق وزیر اعظم کی ناکامی بھی داخلی محاذ پر ہی الم نشرح ہوئی تھی ورنہ خارجہ حکمت عملی میں تو وہ بھی بہت نام کما گئے۔ وہ عالم اسلام کی آنکھ کا تارا سمجھے گئے اور شاہ فیصل شہید جیسے سنجیدہ اور متدین حکمران بھی انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ یوں لگتا ہے جیسے پوری دنیا میں مسلم ممالک کے زعماء بین الاقوامی مسائل پر رہنمائی اور ماہرانہ رائے کے لئے ان کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ کسی کی چند خوبیوں سے متاثر ہو کر اس کے ہر برے کام پر ڈھکن رکھ دینا افراط ہے اور چند خامیوں کی وجہ سے سب بھلائیوں پر پانی پھیر دینا تفریط۔ ہم اس ناپسندیدہ اور غیر معتدل طرز عمل سے بچتے ہوئے جنرل ضیاء کی داخلی حکمت عملی پر تیز و تند تنقید کرتے رہے ہیں۔

لیکن اب وہ ہمارے درمیان موجود نہیں اور ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت پر عمل کرنا ہے کہ اپنے فوت شدگان کا ذکر اچھے انداز میں کیا کرو۔ ہمارے لئے اصل رہنما اصول تو یہی ہے تاہم ایک ضمنی بات یہ بھی ہے کہ ہم جنرل ضیاء کے بارے میں یا کسی بھی اور شخص کے متعلق اس کے ظاہر کے مطابق رائے قائم کرنے اور بیان کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم ان کے اچھے کاموں اور برے کاموں کی نوعیت اور اثرات وہی سمجھنے پر قادر تھے جو کچھ کہ وہ نظر آتے رہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں معاملہ نیت کے مطابق ہو گا۔ حضور اکرمؐ کا وہ قول مبارک جس سے حدیث کے ہر مجموعے کا آغاز ہوتا ہے' بہت مختصر اور سادہ لیکن حد درجہ

حکیمانہ ہے..... "بے شک اعمال کا مدار نیتوں پر ہے" ...... ہم پر ان کی اور کسی کی بھی نیت آشکار نہیں ہو سکتی تھی۔ جب تک وہ ہم میں موجود تھے، ہم نے ان کے ظاہر پر تنقید کی، لیکن اب یہ ہماری ذمہ داری نہیں۔ وہ اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں جو ان کی نیت کا حال بھی جانتا ہے اور یہ بھی کہ اس نے انہیں کیا صلاحیتیں دے کر دنیا میں بھیجا تھا اسے معلوم ہے کہ کیا مواقع کن حالات میں انہیں مہیا کئے گئے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں اگر ان سے کوتاہی ہوئی تو اس کے اصل اسباب و محرکات کیا تھے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کی علیم و خبیر ذات ہی کے علم میں ہیں اور دین نے ہمیں سکھایا ہے کہ انہی کی روشنی میں ان کا محاسبہ ہو گا۔ وہاں کے پیمانے بھی یقیناً یہاں کے اندازوں سے مختلف ہیں۔ ہم صمیم قلب سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے، ان پر رحم کھائے، انہیں اپنی رحمت میں داخل کرے اور حساب کتاب کو ان کے لئے آسان کر دے۔ رب کریم ان کی قبر کو روشن رکھے، انہیں عزت والے مقام میں ٹھکانا دے اور انہیں اپنے صالح بندوں میں شامل فرمائے۔ آمین۔

ہم اس موت کو ان کے لئے اور ان کے سب مسلمان ساتھیوں کے لئے آخرت کے اعتبار سے خیر کا موجب سمجھتے ہیں اور بالخصوص جنرل ضیاء کی ذات کے لئے اسے دنیاوی پہلو سے بھی بہت اچھی اور خوش آئند قرار دیں گے۔ وہ سب وردی میں تھے، اپنے فرائض کی بجا آوری کی غرض سے سفر پر گئے اور دفاع وطن کے مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے ضروری ساز و سامان اور مہارت کی فراہمی کے بارے میں تسلی کر کے اپنے بال بچوں کے حقوق ادا کرنے واپس آ رہے تھے کہ اچانک حادثاتی طور پر قضا نے آ لیا۔ ہمارے دین کی تعلیم کے مطابق انہوں نے شہادت پائی ہے اور جب تفصیلات سامنے آئیں اور یہ بات یقینی معلوم ہونے لگی کہ وہ حادثے ہی کے نہیں، تخریبی کارروائی کے بھی شکار ہوئے ہیں تو ان کی موت زیادہ ہی نفع کا سودا ہو گئی۔ ہاں ہم ان کے لئے اسے نفع کا سودا قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے نزدیک زندگی، قوت کار، مواقع اور صحت و تندرستی سب کی سب مآلِ کار انسان کے لئے حساب کتاب کی اصطلاح میں ذمہ داریاں (LIABILITIES) ہیں اور اثاثہ یعنی (ASSET) فی الحقیقت صرف وہ ہے جو ساتھ چلا جائے، جو اثاثہ یہ حضرات لے گئے ہیں وہ انشاءاللہ ان کی ذمہ داریوں کے مقابلے میں بھاری رہے گا اور وہ اللہ کے فضل سے فائدہ میں رہیں گے۔ تخریب کاری نے انہیں شہید ہی نہیں، مقتول بھی بنا دیا ہے اور مقتول کو ہابیل و قابیل کے واقعہ کے ضمن میں اس نص قرآنی سے یہ اضافی فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں کا بوجھ بھی قاتل اپنے سر لے گا۔ جنرل ضیاء کی موت کو ہم ان کی دنیا کے لئے قابل رشک کہتے ہیں۔

یوں کہ اس موت نے انہیں جو اعزاز و اکرام دیا اور جس والہانہ محبت و عقیدت کے

اظہار کے ساتھ ہموطنوں نے انہیں سفر آخرت پر روانہ کیا' اس کا عشر عشیر بھی انہیں بعد میں نہ
مل سکتا تھا۔ ان کے خلاف ایک عوامی تحریک اٹھنے کے واضح امکانات تھے اور ماضی میں
حکمرانوں کے خلاف جب بھی روایتی ردعمل کا اظہار شروع ہوا' اس میں معقولیت اور شائستگی
نے راہ نہ پائی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری انٹرویو میں خود یہ کہا تھا کہ گیارہ سال سے
لوگ میرا چہرہ دیکھتے تنگ آ گئے ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انہیں کس صورت حال کا سامنا ہوتا
تاہم بھلائی کی امید بہت کم تھی۔ وہ اس ناخوشگوار انجام سے صاف بچ گئے۔

ملک و قوم کے مستقبل کے حوالے سے ہم تخریب کاری کے اس نئے ڈھنگ پر
تشویش کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ واقعہ اور اگلے روز کراچی میں تیل کی تنصیبات پر حملہ جس
امر کی غمازی کرتا ہے وہ ماضی کے واقعات سے مختلف ہے۔ پہلے دھماکوں سے مقصود خوف و
ہراس پھیلانا تھا' اب ان کا نشانہ حساس ترین مقامات ہیں بلکہ ملک کی شہ رگ ہدف ہے۔
صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی بڑی اور دشمن طاقت نے یہ سلسلہ شروع کیا ہے اور اس کا مقابلہ
کرنے کے لئے اب اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ سیاسی
جماعتوں کو بھی پرانی باتیں بھول کر قومی یکجہتی اور ملکی سلامتی کی بات کرنی چاہئے۔ ایک باب تھا
جو بند ہو گیا' اب دلوں سے غبار اور عناد کھرچ کر نکال دیا جائے۔ سیاسی اختلاف کو مبالغہ
آرائی سے بچانا اور مذہبی یا فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دینے سے باز رہنا وقت کی ضرورت ہے۔
پہلے بھی تھی' اب کہیں زیادہ ہے۔ دشمنوں کو یہ موقع نہ دیا جائے کہ وہ سیاسی اختلافات اور
فرقہ وارانہ کشیدگی کی فضا میں چنگاری پھینک کر آگ بھڑکانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اور اب
یہ بات بھی خاصے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ علامہ عارف حسین حسینی کا قتل بھی تخریب
کاری کے اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ جذبات کی شدت پر تیل
چھڑکنے کا ملک دشمن منصوبہ مؤثر نہ ہوا۔ اور اس کے اثرات اگر اب بھی کہیں محسوس کئے جا
رہے ہیں تو انہیں حکمت اور دور اندیشی سے دور کیا جانا چاہئے۔ اندیشہ ہے کہ ایسے حوادث
آئندہ ہمیں زیادہ تیزی سے گھیرے میں لینے کی کوشش کریں گے جس سے نکل سکنے میں ہماری
ساری امیدیں قومی اتحاد' یکجہتی' حب وطن اور اللہ تعالیٰ کی اعانت سے وابستہ ہیں۔

یہ امر اطمینان بخش ہے کہ حکومت کی سطح پر اس ناگہانی صورت حال میں جو انتظام سوچا
گیا وہ دستوری اور آئینی ہے۔ جن حضرات نے بھی یہ فیصلہ کیا' اچھا کیا اور ہمیں اس سے بحث
نہیں کہ فیصلہ کا اختیار انہیں کیسے حاصل ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک و ملت کی قسمت ان کے
ہاتھوں میں دے دی تھی' وہ کوئی غلط طرز عمل بھی اختیار کر سکتے تھے اور اس بات کی ہرگز ضمانت
نہیں دی جا سکتی کہ ان کے اگلے سب اقدامات بھی درست اور صائب ہی ہوں گے لیکن ان

سے درخواست ضرور کی جا سکتی ہے کہ پاکستان کی مصلحت کو ہر ذاتی اور گروہی مفاد سے بالا رکھیں۔ ہم ان کے لئے توفیق اور استقامت کی دعا کریں گے۔ ان کا یہ پہلا فیصلہ درست ہے "اللہ چاہے تو آئندہ بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ فوج اس موقع پر ایک بڑے حادثے کی آڑ میں مارشل لاء لگا سکتی تھی جس کا عوامی ردعمل بھی حالات کی نزاکت کے باعث متوقع نہ تھا۔ لیکن الحمد للہ کہ انہوں نے بھی ملک کی گاڑی کو دستور کی پٹڑی پر چلانے کے فیصلے میں سول انتظامیہ کو مدد ہی دی۔

ہماری فوج کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ وطن عزیز کے دفاع کے لئے قوم کو ایک خالص پیشہ ور (PROFESSIONAL) فوج درکار ہے۔ ہماری ضرورت بلکہ مجبوری ہے کہ عوام کو اپنی فوج سے محبت ہو۔ اشتراک اقتدار کی آرزو دل میں رکھ کر خدا کے لئے وہ محبت کو نفرت میں بدلنے کا جواز نہ مہیا کریں اور ہم سادہ دلیل سے بتائیں گے کہ اقتدار و حکومت میں شریک بن کر وہ اگر آبادی کے ایک حصے کے مفادات کا تحفظ کر کے محبت کے حقدار بنتے ہیں تو دوسرے حصے میں احساس محرومی کی افزائش کا باعث بنتے اور نفرت کی علامت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ہم نے پچھلے شمارے کے اداریئے میں جنرل ضیاء الحق سے بھی یہی عرض کیا تھا اور اب قدرے تفصیل سے کہتے ہیں کہ ملک خداداد کے حالات برادر ملک ترکی سے بہت مختلف ہیں وہاں سرحدوں سے ملحقہ تھوڑے سے علاقوں کو چھوڑ کر ملک کے بیشتر اور وسطی رقبہ پر ہر اعتبار سے ایک باہم مربوط قوم آباد ہے۔ نسل ایک' زبان ایک اور دین ایک اور وہاں تو مذہبی اور مسلکی اختلاف کا بھی نام و نشان نہیں۔ پوری قوم فقہ حنفیہ کی پابند اور تصوف کے ایک ہی سلسلے سے منسلک ہے۔ سلسلۂ نقشبندیہ کی جڑیں صرف وہیں بہت گہری نہیں' روسی ترکستان میں بھی موجود ہیں۔ وہاں کی فوج بھی ملک کی عظیم اکثریت کی نمائندہ ہے' اسی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ اگر ملک کے انتظام پر قابض ہو جائے یا اقتدار میں حصہ طلب کرے تو کوئی خطرہ نہیں۔ اس کے افراد کا تعلق ملک کی غالب آبادی سے ہے۔ ہمارے ہاں کا نقشہ تقریباً برعکس ہے۔ دین کے سوا قوم میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ نہ نسل ایک' نہ زبان ایک' نہ تہذیب و تمدن ایک اور نہ جغرافیائی حالات یکساں اور اس پہ قیامت یہ کہ فوج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے ملک میں ایک واضح تقسیم نظر آتی ہے۔ شمال بلکہ شمال کے بھی بالائی حصے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ تقریباً پوری فوج کا تعلق اسی خطہ سے ہے جبکہ ملک کے جنوبی حصے یعنی سندھ اور بلوچستان بلکہ ایک حد تک جنوبی پنجاب کی آبادی کا بھی افواج پاکستان میں وجود شاذ کے حکم میں آتا ہے' نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس تناظر میں فوج کا اقتدار سنبھالنا یا حکومت میں شریک ہونا شمال کی جنوب پر بالادستی قرار پاتا ہے۔ قوم کا ایک حصہ اپنے آپ کو محکوم سمجھنے پر

مجبور ہو جاتا یا کر دیا جاتا ہے' احساس محرومی کو کالی زبان مل جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے وہی علاقے حساس ہیں اور دشمنوں کو لقمۂ تر نظر آتے ہیں۔ وہاں اگر مقامی آبادی سے ملک کا دفاع کرنے والوں کو عزت و وقار بلکہ محبت اور امداد و تعاون نہ ملے تو ہماری ناقص رائے میں کیل کانٹے سے لیس اور عددی لحاظ سے مضبوط و مرتب فوج بھی دشمنوں کا راستہ روکنے میں کامیاب نہ ہوگی۔

ہم ایک بار پھر ذمہ داران حکومت اور زعمائے سیاست کی توجہ کے لئے اپنی بات دہراتے ہیں کہ تخریبی کارروائیوں کا جو سلسلہ اب شروع ہوا ہے' اسے معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔ دیوہیکل سی۔ ۱۳۰ جیسے مضبوط جہاز کو گرالینا جس کا نام ہی ہرکولیس ہے' آسان نہ تھا۔ اس نوع کی تخریبی کارروائیاں اگر بیرونی ہاتھوں نے کی ہیں تب افسوس کا مقام نہیں محض تشویش اور احتیاطی تدابیر کا مسئلہ ہے کہ اپنے ازلی دشمنوں سے ہمیں خیر کی توقع ہی کب تھی لیکن خدانخواستہ اگر یہ کسی اندرونی طاقت کی کارگزاری ہے یا اندرونی ہاتھ بھی اس میں شریک ہیں تو یہ بڑی ہی خوفناک بات ہے۔ ایسے لوگوں کو عوام الناس کی ہمدردی اور تائید و تعاون سے محروم کر دینا ہماری اولین ترجیح ہونی چاہئے۔ اس ہولناک عامل کی وجہ سے یا اس کے پردے میں ذمہ داران حکومت کی طرف سے کوئی غیر جمہوری کام نہ کئے جائیں۔ ہم صاف بات کرنا چاہیں گے کہ عام انتخابات ۱۶/ نومبر کو یا ممکن ہو تو اس سے پہلے آزادانہ' سیاسی اور خالص جماعتی بنیادوں پر کرائے جائیں اور کسی بھی سیاسی جماعت کو الیکشن میں حصہ لینے سے روکنے کی تدبیر آزمائی نہ جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کی عظیم اکثریت بالعموم اور پرانی نسل بالخصوص آج بھی محب وطن ہے۔ جمہوریت کو کام کرنے کا موقع دیا جائے اور تحفظات کے بغیر خوش دلی سے دیا جائے تو انتخابی عمل پر بھی یہی محب وطن اکثریت اثر انداز ہوگی۔ بصورت دیگر جمہوری راستوں کی بندش توڑ پھوڑ' ہنگاموں اور تخریبی کارروائی کی راہیں کھولے گی جس کے لئے نوجوان نسل بڑی حد تک تیار کی جا چکی ہے اور بعض علاقوں میں آج بھی دندنا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی صورتحال سے وطن عزیز کو اپنی پناہ میں رکھے۔

———(۲)———

آج میں موقع کی مناسبت سے صدر ضیاء الحق صاحب کے ساتھ اپنے معاملے اور باہمی تعلقات کے ضمن میں وضاحتی نوعیت کی چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں' اور ان کے چند ذاتی احسانات کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے مجھ پر کئے۔ ویسے بھی ہمارے دین

کی تعلیم یہی ہے کہ فوت شدگان کا ذکر بھلے انداز میں کرنا چاہئے اور ان کی خوبیوں ہی کا ذکر ہونا چاہئے اور ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی میرے سامنے ہے کہ "جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا"۔ اور چونکہ گزشتہ کچھ عرصے سے میری جانب سے صدر ضیاء کی پالیسیوں کے بارے میں تنقیدی نوعیت کی باتیں ہی آپ حضرات کے سامنے آئی ہیں۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آج ان کے احسانات کا ذکر کر کے اس معاملے کو بیلنس کر دوں۔ ساتھ ہی مجھ پر ان کی ایک ذاتی نوعیت کی زیادتی کا ذکر بھی محض اس اعتبار سے کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے قبل چونکہ میں نے متعدد بار تلخی کے ساتھ اپنے قریبی حلقوں میں اس کا ذکر کیا ہے' لہٰذا آج میں علیٰ رؤس الاشہاد صاف دلی کے ساتھ انہیں معاف کرتے ہوئے اس زیادتی سے اس دنیا ہی میں ان کو بری کرنے کا اعلان کرنا چاہتا ہوں۔

(ضیاء الحق صاحب کے ساتھ میرا اولین غائبانہ تعارف ۶۷ء میں ہوا جب میں نے "میثاق" کی ادارت سنبھالی۔ اُس وقت میرے علم میں یہ بات آئی کہ وہ ابتداء ہی سے میثاق کے مستقل قارئین میں شامل تھے۔ اُن دنوں وہ ملتان میں جی او سی تھے۔ گو اس زمانے میں ان سے ملاقات کا موقع تو نہ ہوا تھا لیکن "میثاق" کے ذریعے سے ہمارے مابین ایک ذہنی رابطہ گویا ۶۷ء سے موجود تھا۔ پھر انہی دنوں جب میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تفسیر "تدبر قرآن" کی جلد اول شائع کی اور ضیاء الحق صاحب کے بھیجنے پر ایک فوجی افسر اسے خریدنے کے لئے میرے دفتر میں آئے' تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہماری فوج میں اوپر کی سطح پر دینی تعلیم کا ذوق رکھنے والے آفیسرز موجود ہیں۔ اس دور کا ایک یہ معاملہ بعد میں میرے علم میں آیا' اور خود ضیاء صاحب نے اپنی بعض گفتگوؤں میں اس کا ذکر کیا ہے کہ وہ کبھی کبھی مسجد خضراء میں میرے درس میں بھی شریک ہوتے تھے۔ لیکن اُس وقت چونکہ وہ محض ایک سامع کے طور پر تشریف لاتے تھے اور ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی لہٰذا ان سے براہ راست تعارف حاصل نہ ہو سکا۔)

ان سے دوسرا رابطہ 'اور یہ بھی براہ راست نہیں تھا' نومبر ۷۷ء میں ہماری چوتھی سالانہ قرآن کانفرنس کے موقع پر ہوا۔ اُن دنوں جنرل صاحب نے تازہ تازہ اقتدار سنبھالا تھا۔ کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے قبل رات کو اچانک جنرل صاحب کا فون آیا کہ وہ قرآن کانفرنس کے لئے اپنا پیغام بھجوانا چاہتے ہیں۔ اور وقت کی کمی کے پیش نظر تحریری صورت میں پیغام بھجوانے کے بجائے وہ ٹیلی فون ہی پر اپنا پیغام DICTATE کرانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ

جنرل صاحب کی ہدایت پر بریگیڈئر صدیق سالک نے 'جو اب ان مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکے ہیں جنہوں نے صدر ضیاء کے ساتھ شہادت پائی' ٹیلی فون پر صدر صاحب کا پیغام لکھوایا جو اگلے دن کانفرنس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ میرے لئے ضیاء الحق صاحب سے براہ راست گفتگو کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہاں میں یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ہماری کانفرنس میں کسی اہم سرکاری عہدیدار کا پیغام پڑھ کر سنایا جانا ایک غیر معمولی بات تھی' اس لئے کہ الحمدللہ ہمارا شروع سے یہ معاملہ رہا ہے کہ ہم نے اپنی کسی قرآن کانفرنس یا انجمن کی کسی تقریب میں کسی سرکاری عہدیدار کو مدعو کیا ہے نہ ان کے پیغامات حاصل کرنے کی سعی کی ہے چنانچہ اس پہلو سے ہمارا ادارہ اللہ کے فضل سے ہر قسم کے سرکاری اثرات سے بالکل پاک رہا ہے۔ لیکن میری معلومات کی حد تک ضیاء الحق صاحب چونکہ نہ صرف یہ کہ دینی و مذہبی مزاج رکھتے تھے بلکہ ان کی ابتدائی تقاریر میں اسلام کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کا بھرپور اظہار بھی ہوا تھا لہٰذا میں نے قرآن کانفرنس میں ان کا پیغام پڑھ کر سنایا لیکن ساتھ ہی میں نے دوٹوک انداز میں یہ بھی عرض کر دیا تھا' اور یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ ضیاء الحق صاحب آپ بہت بڑی ذمہ داری کے بوجھ تلے آ گئے ہیں' اب آپ کے ذمے ہے کہ پاکستان میں اسلام کو نافذ کریں اور پورے اسلام کو نافذ کریں' ادھورا اسلام اللہ تعالیٰ کو کھلے کفر سے زیادہ ناپسند ہے۔ میں نے اس موقع پر زور دے کر یہ عرض کیا تھا کہ پورے دین کو نافذ کیجئے اور تدریج کے چکر میں نہ پڑیئے۔ تدریج اس وقت درست تھی جب شریعت نازل ہو رہی تھی۔ اب دین مکمل ہو چکا' شریعت کی تکمیل ہو چکی لہٰذا تدریج کی بات کرنا اپنے آپ کو دھوکہ دینے کے مترادف ہے۔ ساتھ ہی میں نے اس خدشے کا اظہار بھی کیا تھا کہ اگر آپ یہاں مکمل اسلام کے نفاذ کی کوشش کریں گے اور اس سلسلے میں ہر ممکن قدم اٹھانے کا عزم کریں گے تو یہ معاشرہ آپ کو برداشت نہیں کرے گا اور اٹھا کر پھینک دے گا۔ لیکن یہ بات آپ کے لئے انتہائی خوش آئند اور مبارک ہو گی کہ آپ اقتدار چھوڑنا گوارا کر لیں لیکن دین و شریعت کے ساتھ اپنی وابستگی سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں۔ میں نے مثال دی تھی کہ بیسویں صدی میں ایک برطانوی بادشاہ ایک عورت کی محبت میں اگر تخت حکومت کو ٹھوکر مار سکتا ہے تو اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی کی وجہ سے اگر کوئی حکمران حکومت سے دستبردار ہونے کی مثال قائم کر دے تو یہ واقعتہ ایک بڑی بات ہو گی۔

جنرل ضیاء الحق صاحب کے ساتھ براہ راست ملاقات کا موقع اگست ۱۹۸۰ء میں علماء

کنونشن کے موقع پر ملا۔ مجھے کنونشن میں شرکت کا دعوت نامہ ملا تو میں نے شرکت
معذوری ظاہر کی۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس قسم کی تقاریب میں شرکت کے ساتھ میری ط
مناسبت ہی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ میرے پاس عذر موجود تھا کہ ۲۰ر اور ۲۱ر اگست
درمیانی شب مجھے اپنے سفر امریکہ پر روانہ ہونا تھا اور ۲۰ر اگست ہی کو علماء کنونشن کا آغاز
تھا۔ صدر صاحب کی طرف سے پیغام آیا کہ اگر آپ کنونشن میں شریک نہیں ہو سکتے تو ۸
اگست کے مشاورتی اجلاس میں ضرور شرکت کیجئے جو کنونشن ہی کے سلسلے میں منعقد ہو گا۔ ا
میرے پاس عدم شرکت کے لئے کوئی عذر نہ تھا۔ چنانچہ اس موقع پر صدر صاحب کے سا
مسلسل آٹھ گھنٹے اجلاس میں شریک ہونے کا موقع ملا اور چونکہ معدودے چند افراد ہی ا
مشاورتی اجلاس میں شریک تھے لہٰذا بہت قریب سے صدر صاحب کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ا
اجلاس میں میرا ایک مشورہ تو انہوں نے صدفی صد قبول کیا' حالانکہ دیگر تمام غیر فوجی شرکا
کی رائے میری رائے سے مختلف تھی۔ مشورہ طلب معاملہ یہ تھا کہ کنونشن کا نہج کیا ہو؟ ا
کس طور پر CONDUCT کیا جائے۔ تمام لوگوں کی رائے یہ تھی کہ اس میں ضیاء صاحب
مفصل تقاریر کرنی چاہئیں کہ لوگ تو ان ہی کو سننا چاہتے ہیں۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ کنونشن میں
صدر صاحب کا انداز یہ ہونا چاہئے کہ اولاً وہ اس تقصیر کا اعتراف کریں کہ تین سال کا عرصہ
گزر جانے کے باوجود ابھی تک شریعت کی جانب کوئی فیصلہ کن قدم اٹھایا نہیں جا سکا۔ اور ثانیاً
کہ صدر صاحب کو اس کنونشن میں بطور سامع کے شریک ہونا چاہئے کہ وہ علماء سے پوچھیں او
معلوم کریں کہ ابھی تک شریعت کے سلسلے میں جو ابتدائی نوعیت کے اقدامات کئے گئے ہیں ان
کے بارے میں علماء کی رائے کیا ہے! وہ ان اقدامات کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں! میں حیران ہو
کہ صدر صاحب نے میری رائے کی تصویب کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ کنونشن اسی طور سے منعقد
ہو گی۔ بلکہ صدر صاحب نے مجھے کنونشن میں شرکت کے لئے مجبور کرتے ہوئے یہ پیشکش بھی
کی کہ آپ ۲۰ر اگست کے اجلاس میں شریک ہو جائیں' میرا فالکن طیارہ آپ کو اسی رات
کراچی پہنچا دے گا۔ اس پیشکش پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے قبول کرنے سے تو میں نے
معذرت کر لی لیکن ان کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنے پروگرام میں اس طرح تبدیلی کی
کہ ۲۰ر تاریخ کے اجلاس میں شرکت کے بعد بذریعہ پی آئی اے اسلام آباد سے سیدھا کراچی
روانہ ہو گیا۔

دوسرا مشورہ میں نے زکوٰۃ آرڈیننس کے بارے میں دیا تھا کہ خدارا اس آرڈیننس کے

ذریعے ناواقف سُنّیوں کو شیعہ بنانے کا راستہ نہ کھولئے اس لئے کہ اگر آپ نے اس آرڈیننس سے شیعہ حضرات کو مستثنیٰ قرار دیا تو یہ چیز بے شمار سُنّیوں کے شیعہ بن جانے کا باعث ہوگی۔ لہٰذا اس شکل میں آرڈیننس نافذ کرنے سے یہ بہتر ہوگا کہ اسے واپس لے لیا جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا یہ مشورہ انہوں نے قبول نہیں کیا۔ اپنے اس فیصلے کی مصلحتوں سے وہ خود ہی بہتر طور پر واقف ہوں گے۔ بہر کیف میں نے ان واقعات کا تذکرہ اس اعتبار سے کیا ہے کہ یہ اندازہ ہو جائے کہ ان کے میرے ساتھ معاملے کی نوعیت کیا تھی۔

پھر جب میں امریکہ میں تھا تو مجھے بتایا گیا کہ حکومت پاکستان کو میری تلاش ہے۔ معلوم ہوا کہ صدر صاحب کو یو این او میں تقریر کرنا تھی اور وہ اپنے وفد میں مجھے شامل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ امریکہ میں مجھ سے رابطہ کیا گیا اور صدر صاحب کی خواہش مجھ تک پہنچائی گئی۔ یہ میرے ساتھ صدر صاحب کے حسن ظن کا بہت بڑا مظہر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے معذرت کر لی کہ میں اپنے آپ کو اس وفد میں شامل ہونے کا اہل نہیں پاتا۔

اس کے بعد صدر صاحب کی مجھ پر ذاتی حیثیت میں عنایات کا ایک بڑا مظہر یہ سامنے آیا کہ مجھے مرکزی وزارت کی پیشکش کی گئی۔ صدر کے ایک قریبی عزیز کرنل نور الٰہی صاحب نے' جو بہت عمدہ سرجن اور بہت نفیس انسان ہیں' صدر صاحب کی یہ آفر مجھ تک پہنچائی۔ میں نے معذرت کی کہ مجھے اس قسم کی ذمہ داریوں کا تجربہ ہے نہ میں اس کا اہل ہوں۔ ساتھ ہی میں نے بطور عذر یہ دلیل بھی دی کہ مارشل لاء حکومت میں کسی سویلین وزیر کا دائرہ کار اور اختیارات اتنے محدود ہوتے ہیں کہ وہ کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکتا لیکن خرابی کا سارا الزام اسی کے سر آتا ہے۔

اس کے بعد مرحلہ آیا مجلس شوریٰ کا۔ اس پیشکش کو نہ قبول کرنے کا میرے پاس کوئی عذر نہیں تھا چنانچہ میں نے اس آفر کو قبول کیا۔ میری دلیل یہ تھی کہ یہ حکومت میں شمولیت کی صورت نہیں ہے بلکہ صرف مشورے کا معاملہ ہے۔ تمام اختیارات مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے ہاتھوں میں ہیں اور تمام ذمہ داری اسی کی ہے۔ ہم نے اس ملک کے شہری کی حیثیت سے اگر اس حکومت کو طوعاً یا کرھاً قبول کیا ہے یا کم از کم اس کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند نہیں کیا تو ایسی حکومت اگر مشورہ طلب کرتی ہے تو خیر کا مشورہ دینے اور غلط بات پر ٹوکنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی بلکہ یہ تو ہر شہری کا اخلاقی فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ حکومت کے مشورہ طلب کرنے پر مشورہ دے۔ میں نے اس وقت عرض کیا تھا کہ میں اپنی مسجد کے منبر پر کھڑا ہو کر صدر صاحب

کی پالیسی پر تنقید کرتا ہوں یا انہیں مشورے دیتا ہوں تو اگر وہ مجھے اپنے قریب آکر مشورہ دینے کی دعوت دیتے ہیں تو کم از کم میرے پاس ان کی پیشکش کو رد کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں نے جب وہاں مشورے کی فضا کو مفقود پایا اور پارلیمانی انداز کی کھینچ تان میں وقت کو ضائع ہوتے دیکھا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ صدر صاحب ہمارے مشوروں پر سنجیدگی سے سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں تو کُل دو ماہ بعد ہی صدر صاحب کی خدمت میں استعفا پیش کر دیا۔

اب میں صدر صاحب کے اُن چند ذاتی نوعیت کے احسانات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے میری تحریکِ قرآنی کے کام کو آگے بڑھنے میں بہت مدد ملی۔ اور ان احسانات کا بار میں ذاتی طور پر اپنے کاندھوں پر محسوس کرتا ہوں۔ ان میں نمایاں ترین معاملہ ٹی وی پروگرام "الہدیٰ" کا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ملک میں ایسے خالص دینی پروگرام کا ترتیب دیا جانا ہرگز ممکن نہ ہوتا اگر صدر صاحب اس میں ذاتی دلچسپی نہ لیتے۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ ہمارے سرکاری ذرائع ابلاغ پر جس ذہن اور جس مزاج کے لوگوں کا غلبہ ہے' یہ پروگرام ان کے سینوں پر سانپ کی طرح لوٹ رہا تھا۔ قرآن کے انقلابی فکر کا مسلسل پندرہ ماہ تک ٹی وی پر نشر ہونا ان لوگوں کو کیونکر گوارا ہو سکتا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دین کی خدمت کے جس کام کو لے کر میں چل رہا ہوں اس کے اعتبار سے یہ صدر صاحب کا مجھ پر بہت بڑا احسان تھا۔ اگرچہ ۷۹ء کے رمضان المبارک میں ٹیلی ویژن پر "الکتاب" کے نام سے میرے درسِ قرآن کا جو پروگرام نشر ہوا تھا اس میں ضیاء الحق صاحب کا ہاتھ نہ تھا بلکہ ٹی وی کے ایک سینئر پروڈیوسر کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے وہ پروگرام ترتیب دیا گیا تھا۔ ۸۰ء کے رمضان کے دوران بھی یہی پروگرام ٹی وی پر دوبارہ نشر کیا گیا اور اس سے اگلے سال الف لام میم کے عنوان سے پروگرام ریکارڈ کیا گیا جو رمضان المبارک کے دوران نشر ہوا۔ پھر مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے "الہدیٰ" پروگرام کی تجویز پیش کی گئی جس سے ضیاء الحق صاحب نے صد فی صد اتفاق کرتے ہوئے اس کے اجرا کا حکم دیا اور ان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے مسلسل پندرہ ماہ یہ پروگرام جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر صدر صاحب کا خصوصی حکم نہ ہوتا تو اس پروگرام کا آغاز ہی نہ ہو پاتا۔ اس لئے کہ بالکل آغاز ہی میں خواتین کی شرکت کے مسئلے پر معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آرہا تھا۔ میں مُصِر تھا کہ اگر خواتین اس پروگرام میں شرکت کرنا چاہیں تو انہیں پردے میں ہونا چاہئے' وہ برقعہ اوڑھ کر پروگرام میں شرکت کریں۔ جبکہ ٹی وی کے کارپردازان کو اس سے

شدید اختلاف تھا۔ بالآخر طے کرنا پڑا کہ خواتین کی شرکت کے معاملے کو ہی ختم کر دیا جائے۔ بہرکیف "الہدٰی" پروگرام کے معاملے کو میں اپنے اوپر اور اپنی تحریک پر صدر صاحب کا بہت بڑا احسان سمجھتا ہوں اور اس احسان کا علیٰ رؤوس الاشہاد اعتراف کرنا اپنا اخلاقی فریضہ خیال کرتا ہوں۔

پھر میرے ساتھ ان کے حسن ظن اور تعلق خاطر کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ ستارۂ امتیاز پانے والوں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل کیا گیا۔ اور اگرچہ وہ شاید اس بات سے ناراض ہوئے ہوں گے کہ میں اس تقریب میں شریک نہ تھا جس میں یہ ایوارڈ تقسیم کیا گیا۔ لیکن مجھے چونکہ بحمد اللہ اس قسم کے دنیاوی ایوارڈز سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ویسے بھی اس قسم کی مجالس میں شرکت میری طبع اور میرے مزاج کے خلاف ہے کہ کسی کے سامنے سر جھکا کر میڈل وصول کیا جائے کہ اس میں میرے نزدیک سجدۂ تعظیمی سے ایک گونہ مشابہت موجود ہے' لہٰذا مجھے اس تقریب میں نہ جانا تھا نہ گیا۔ بہرکیف اسے بھی میں ضیاء الحق صاحب کے احسانات میں شمار کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے اس ایوارڈ کے لائق سمجھا۔

ان کا ایک بہت بڑا احسان مجھ پر بالواسطہ ہوا' جس کا ذکر بارہا میں اپنے قریبی رفقاء کی محفلوں میں کر چکا ہوں کہ سیرت مطہرہ کے از سر نو مطالعے اور فلسفۂ سیرت کو گہرائی میں سمجھنے کی تحریک میرے اندر اُن سیرت کانفرنسوں کی وجہ سے ہوئی جن کا اجراء صدر صاحب نے اپنے دور حکومت کے ابتدائی برسوں میں کیا تھا۔ چونکہ تمام سرکاری محکموں کو حکومت کی جانب سے سیرت کے جلسوں کے انعقاد کی خصوصی ہدایات دی گئی تھیں لہٰذا ہر محکمہ سیرت کے جلسے کا اہتمام کرنے کا پابند تھا۔ اور اُن دنوں چونکہ شاید اس وجہ سے کہ "الہدٰی" پروگرام کے حوالے سے میرا تعارف وسیع حلقوں میں پھیل گیا تھا' ان جلسوں میں تقاریر کے لئے ہر جانب سے تقاضے آتے تھے۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے بغور مطالعے کی تحریک میرے اندر انہی تقاریر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس سے قبل میرا اصل موضوع صرف قرآن تھا' حدیث سے ربط و تعلق بھی واجبی نوعیت کا تھا اور سیرت کا مطالعہ بھی گہرا نہ تھا...... لیکن اب چونکہ مجھے سیرت کے موضوع پر بار بار خطابات کا موقع ملا اور تقاریر کے معاملے میں چونکہ ہمیشہ میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ بعد کی تقریر میں پہلی تقریر سے زائد مواد سامعین کے سامنے لاؤں تو لامحالہ مجھے مختلف زاویوں سے سیرت کے مطالعے اور اس پر غور و فکر کا موقع ملا اور اس حوالے سے دین کے فلسفہ و حکمت کی کئی نئی راہیں میرے افقِ ذہنی و فکری پر وا ہوئیں۔ چنانچہ میری

تحریک اور مشن کے اعتبار سے سب سے اہم اور قیمتی چیز جو مجھے اس ذریعے سے حاصل ہوئی وہ یہ کہ انقلابی جدوجہد کے مختلف مراحل اور ان کے باہمی ربط و تعلق کا گہرا شعور بحمد اللہ انہی تقاریر کے ذریعے سے مجھے حاصل ہوا۔ میرے نزدیک اسلامی انقلابی عمل کے فہم میں اصل رہنمائی سیرت کے مطالعے ہی سے ملتی ہے۔ ہاں سیرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث کا مطالعہ بھی ہو تو نور علیٰ نور! مختصراً یہ کہ اسے بھی میں صدر ضیاء الحق کے احسانات میں شمار کرتا ہوں کہ مجھے سیرت پر تقاریر کے جو مواقع ملے' بالواسطہ طور پر صدر صاحب ہی اس کا باعث بنے۔

یہاں تک تو صدر صاحب کے بلاواسطہ اور بالواسطہ احسانات کا تذکرہ تھا اور اگرچہ دنیا کے عام دستور کے مطابق تو میری جانب سے بھی جواباً صدر صاحب کی بھرپور تائید و حمایت ہونی چاہئے تھی۔ لیکن الحمد اللہ میرا مزاج یہ ہے کہ میں اپنی رائے پر حتی الامکان کسی چیز کو اثرانداز نہیں ہونے دیتا۔ بڑی سے بڑی عقیدت بھی بحمد اللہ میری رائے اور سوچ پر اثرانداز نہیں ہوتی اور میں صرف اپنے رب اور اپنے ضمیر کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتا ہوں۔ ع "کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق" ۔ چنانچہ میں نے ان کی پالیسیوں میں جو بات غلط محسوس کی اس سے اختلاف کیا اور اس اختلاف کو پوری شدت سے بیان کیا۔

گفتگو کے اختتام سے قبل میں اُس ذاتی شکایت کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جس کا حوالہ میں نے گفتگو کے آغاز میں دیا تھا۔ اس شکایت کا تعلق اسی مسجد یعنی مسجد دارالسلام سے ہے۔ آپ حضرات کو یاد ہو گا کہ ۸۲ء میں ایک بار صدر صاحب کو اس مسجد میں جمعہ ادا کرنا تھا۔ چنانچہ اس کا پہلے سے اعلان بھی کیا گیا اور بھرپور حفاظتی انتظامات بھی۔ خطبے میں ان کے سامنے میں نے دو باتیں رکھی تھیں۔ ایک یہ کہ آپ کے دور میں پہلی بار خواتین کی ہاکی ٹیم ملک سے باہر جا رہی ہے۔ آپ نے چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے اعلان کے ساتھ عنانِ حکومت سنبھالی تھی اور انتہائی افسوسناک بات ہے کہ آپ کے دور میں اس جسارت کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ صدر صاحب نے میرے مشورے کو درخور اعتناء سمجھتے ہوئے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ خواتین کی ہاکی ٹیم غیر ملکی دورے پر نہیں جائے گی۔

دوسری بات میں نے کرکٹ کے کھیل کے بارے میں عرض کی تھی کہ اس کھیل کی وجہ سے جمعے کا تقدس بری طرح پامال ہو رہا ہے۔ یوں بھی ہمارا ملک اس شاہانہ کھیل کا متحمل نہیں

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

امیرِ تنظیمِ اسلامی کے

بعض ذاتی اور خاندانی کوائف

اُن کے اپنے قلم سے!

(قسطِ سوم)

لندن میں میرا قیام وسط دسمبر ۱۹۷۰ء سے وسط جنوری ۱۹۷۱ء تک تقریباً پورے ایک ماہ
ہا۔ یہ میرا "عالمِ مغرب" سے پہلا "بالمشافہ" تعارف تھا' اس لئے کہ اس وقت تک میں
رونِ پاکستان صرف ایک بار ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے سلسلے میں گیا تھا (جس میں مجھے
راللہ والد صاحب مرحوم اور والدہ صاحبہ مکرمہ دونوں کی معیت کی سعادت حاصل تھی!)
راب دوسری بار بھی لندن کے اس سفر سے قبل تک "مُلّا کی دوڑ مسجد تک!" کے مصداق
ری کل تگ و تاز صرف سرزمین مقدس تک محدود رہی تھی۔ علاوہ ازیں پاکستان سے
انگی کے وقت تک سفرِ یورپ کا ارادہ تو کجا گمان تک نہ تھا۔ لہٰذا اب جو اچانک "یورپ
زا" کی صورت پیدا ہوئی تو بے اختیار حضرت اکبر کا یہ شعر ذہن میں گردش کرنے لگا کہ ؎

سدھاریں شیخ کعبے کو' ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا' ہم خدا کی شان دیکھیں گے

چہ میرے لئے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ نہ صرف
لہ یہ دونوں کام ایک ہی سفر میں ہو رہے تھے' بلکہ مزید یہ کہ انگلستان کی VISIT حجاز
رس کی دو VISITS کے درمیان آ رہی تھی' اس لئے کہ ایک ماہ بعد ہی مجھے حج بیت اللہ
۔لئے دوبارہ حجاز آنا تھا' لہٰذا دل کو یہ اطمینان حاصل تھا کہ اگر دیارِ مغرب میں غیر ارادی
پر قلب و نظر کی کچھ آلودگی ہو بھی گئی تو واپسی پر عمرہ اور حج کے ذریعے تصفیہ اور تزکیہ ہو
ئے گا۔

سب جانتے ہیں کہ دسمبر اور جنوری کے دوران پورے یورپ میں شدید ترین سردی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کا کسی قدر خوف مجھ پر بھی طاری تھا' لہٰذا میں نے مدینہ منورہ سے ایک نہایت بھاری بھرکم اور طویل وعریض اوور کوٹ خرید لیا تھا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے لندن میں پورے ایک ماہ کے قیام کے دوران سردی کی وجہ سے کسی تکلیف کا قطعاً احساس نہ ہوا۔ حالانکہ پاکستان میں میں سردی کے موسم میں بالعموم زکام اور نزلے کا شکار رہتا ہوں' جس میں ناک کی بندش اور مسلسل ریزش پر مستزاد مسلسل چھینکوں کے دَوروں سے طبیعت بہت پریشان رہتی ہے۔ لیکن وہاں اس کے باوجود کہ وقفہ وقفہ سے برف باری بھی ہوتی رہی مجھے پورے ایک ماہ کے دوران ایک چھینک بھی نہیں آئی۔ اور نہ صرف یہ کہ جہاں بھی جانا ہوتا تھا وہاں "ٹھنڈا یا گرم؟" کے جواب میں ہمیشہ آئس کریم طلب کرتا تھا' بلکہ ہائیڈ پارک میں چہل قدمی کے دوران بسا اوقات درختوں کی شاخوں پر جمی ہوئی برف بھی اتار اتار کر کھاتا رہتا تھا...... معلوم ہوا کہ میرے لئے خشک سردی نقصان دہ ہے جبکہ مرطوب سردی میرے مزاج سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔

لندن میں برادر عزیز ابصار احمد کا قیام لندن یونیورسٹی کے ایک ہاسٹل "للین پنسن ہال" میں تھا' جو نہایت آرام دہ اور ہر طرح سے آراستہ اور پیراستہ تھا۔ دراصل یہ اس سے قبل ایک اعلیٰ درجہ کا ہوٹل تھا (لازماً فائیو سٹار رہا ہو گا) اور اسی سے برطانیہ کے اس وقت کے وزیر جنگ لارڈ پروفومو اور ایک سوسائٹی گرل کرسٹائن کیلر کا بدنام زمانہ سکینڈل متعلق تھا (جس کی وجہ سے لارڈ پروفومو کو وزارت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے) اور غالباً اسی بدنامی کے باعث ہوٹل بند ہو گیا تھا اور اس عمارت کو لندن یونیورسٹی نے طلبہ کی رہائش کے لئے حاصل کر لیا تھا۔ بہرحال اس ہاسٹل میں ہر طرح کا آرام میسر تھا' ہر کمرے کے ساتھ جدید ترین آسائشوں سے مرصّع نہایت صاف ستھرا غسل خانہ منسلک تھا اور سنٹرل HEATING کے ذریعے ٹمپریچر ایسا رکھا جاتا تھا کہ رات کو بھی محض رسماً ایک چادر اوڑھنے کی نوبت آتی تھی' اور گرم کپڑے صرف باہر نکلتے ہوئے ہی پہننے پڑتے تھے۔

للین پنسن ہال' لندن کے عین قلب میں پیڈنگٹن (PADDINGTON) ریلوے سٹیشن سے بالکل متصل اور ہائیڈ پارک سے چہل قدمی کے فاصلے پر واقع تھا۔ لہٰذا

لندن کے جملہ مرکزی مقامات کی سیر تو پیدل ہی ہو گئی۔ اسی زمانے میں اندازہ ہوا ہم تمام بھائیوں میں سب سے بڑے یعنی اظہار احمد صاحب اور سب سے چھوٹے یعنی ابصار احمد کے مزاج میں بعض دوسری مشابہتوں کے علاوہ ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں پیدل چلنے کا خصوصی شوق رکھتے ہیں۔ چنانچہ بھائی جان جن دنوں میکلیگن انجینئرنگ کالج لاہور (جواب یونیورسٹی بن چکی ہے) میں زیر تعلیم تھے تو سردیوں کے موسم میں ان کا ایک پسندیدہ مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ اتوار کو علی الصبح باغبانپورہ سے جی ٹی روڈ پر پیدل چلتے ہوئے امرتسر پہنچ جاتے تھے اور شام تک واپس بس کے ذریعے آجاتے تھے۔ اسی قدر میں نے ان دنوں عزیزم ابصار احمد کو پیدل چلنے میں انتھک پایا۔ نتیجتاً مجھے بھی ان ایام میں بہت پیدل چلنا پڑا اور جہاں تک یاد پڑتا ہے خود مجھ پر بھی کم از کم اس وقت یہ شاق نہیں گذرا تھا۔

لندن سے باہر بھی متعدد مقامات پر ریل یا کار کے ذریعے جانا ہوا۔ ان میں سے ایک ایک سفر آکسفورڈ، ریڈنگ (جہاں کی یونیورسٹی سے عزیزم ابصار احمد نے ایم فل کیا تھا) اور ونڈسر (جہاں کا شاہی قلعہ پوری دنیا میں مشہور ہے) کا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے مزید سیاحتی نوعیت کے اسفار کی یاد اب دھندلا گئی ہے۔ البتہ ایک اور سفر کی یاد حافظے میں پوری طرح برقرار ہے، جس کی نوعیت بالکل جدا تھی۔ یہ سفر میں نے برمنگھم کا کیا تھا اور اس کا مقصد اسلامی جمعیت طلبہ کے دور کے ایک ہم عصر ساتھی پروفیسر خورشید احمد صاحب سے ملاقات کی تجدید تھا۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں جمعیت کے ہم دونوں سے سینئر ناظم اعلیٰ ڈاکٹر محمد نسیم صاحب کی قیام گاہ پر تقریباً چوبیس گھنٹے مسلسل ایک ہی کمرے میں مقیم رہے تھے۔ (اس لئے کہ نمازیں بھی ہم نے وہیں ادا کی تھیں!)

اس سیر و تفریح کا میری صحت پر بہت اچھا اثر مرتب ہوا۔ اور بحمد اللہ طبیعت کا وہ اضمحلال بہت حد تک رفع ہو گیا جو پورے ایک سال کے مسلسل شام کے بخار پھر مدینہ منورہ کے رمضان مبارک کی شدید مشقت و ریاضت، اور ان سب پر مستزاد رمضان کے بعد کے دو ہفتوں کے دوران اسی "پس چہ باید کرد" کی نوعیت کے سوچ بچار سے پیدا ہوا تھا، جس کا مفصل ذکر اس سے قبل ہو چکا ہے اور جس کے زیر اثر لندن روانہ ہونے سے ایک دن قبل جدہ میں مجھ پر یادداشت کے عارضی طور پر ماؤف ہونے کا حملہ ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ

ی اس اچانک "لندن یاترا" میں بھی اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت اور میرے لئے اہم مصلحت تھ

لندن کے اس سفر کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری عظیم تر حکمت و مصلحت کا
ماس وادراک بھی مجھے جلد ہی ہو گیا۔
جہاں تک مغربی فکر اور فلسفے کا تعلق ہے اس سے تو بحمد اللہ مجھ میں کوئی مرعوبیت سرے
، موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ اول تو میں بالکل بچپن ہی سے علامہ اقبال کا کلام انتہائی ذوق و
ق سے پڑھتا رہا تھا جنہوں نے اپنے بارے میں بالکل بجا طور پر فرمایا ہے کہ ۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف!

ِ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی اور بعض دوسرے اصحاب قلم کی تحریروں کے ذریعے مغربی فکر و
فہ اور تہذیب و تمدن کی بے راہ روی کا بھرپور اندازہ ہو گیا تھا۔ مزید بر آں چند ہی سال قبل
مہ اقبال کے "خطبات" کے گہرے مطالعے سے بحمد اللہ ایمان باللہ اور توحید کے ضمن
ں "رسوخ علمی" وقت کے اعلیٰ ترین فلسفہ و حکمت کی سطح پر بھی حاصل ہو چکا تھا' (اس کی
ریب یوں ہوئی تھی کہ جب عزیزم ابصار احمد کراچی یونیورسٹی میں ایم اے فلسفہ کر رہے تھے
نہوں نے "خطبات اقبال" کے فہم کے سلسلے میں مجھ سے مدد طلب کی تھی۔ میں نے اس
ے قبل ایک دو بار خطبات کا مطالعہ کرنا چاہا بھی تھا تو پہلے ہی خطبے میں وارد شدہ بھاری بھر کم
فیانہ اصطلاحات سے شکست مان کر کتاب ہاتھ سے رکھ دینی پڑی تھی اور آگے بڑھنے کی
ت ہی نہیں آئی تھی۔ لیکن اب جب چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے "حسن ظن" کی بنا
مدد چاہی تو طبیعت نے ایک چیلنج سا محسوس کیا' چنانچہ جیسے بھی بن پڑا خطبات کا بالاستیعاب
طالعہ کیا اور اس طرح اپنی "علمیت" کا بھرم قائم رکھا۔)
لہٰذا فکر کی حد تک تو میں مطمئن تھا البتہ میرے تحت الشعور میں یہ اندیشہ ضرور موجود تھا
. کہیں مغرب کی سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی سے قلب و ذہن زیادہ اثر نہ لے لیں۔ لیکن الحمد للہ
. عملاً صورت بالکل برعکس رہی۔ چنانچہ مجھے لندن کی تعمیرات میں سے بھی صرف ایک چیز

نے متاثر کیا، یعنی اس کی زیر زمین ریل (TUBE) کے نظام نے اور انگریزی تہذیب کی بھی بس ایک ہی بات بھلی لگی اور وہ تھی انگریزوں کی کم گوئی اور خاموشی پسندی ۔۔ اس کے علاوہ میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا کہ یہاں بھی عام انسان ہی بستے ہیں، جن کے مسائل و معاملات بالکل ویسے ہی ہیں جیسے کسی دوسری جگہ کے انسانوں کے، چنانچہ برادرم ابصار احمد کے دوست اور ملنے جلنے والے جب بھی مجھ سے دریافت کرتے کہ "آپ نے یہاں آکر خاص بات کیا محسوس کی؟" تو میرا جواب یہی ہوتا تھا کہ "اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہاں کی انسانی مادہ کی ٹانگیں ننگی ہوتی ہیں!" (یہ غنیمت ہے کہ ان دنوں شدید سردی کے باعث اوپر کا تن اکثر و بیشتر لباس میں ڈھکا ہوا نظر آتا تھا ورنہ اگر موسم گرمی کا ہوتا تو لازماً معاملہ مزید دگرگوں ہوتا) اور اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ بحمد اللہ میں نے مغربی تہذیب سے شدید نفرت اور حقارت کے جذبات اپنے اندر محسوس کئے اور انسانی حریت اور معاشی انصاف کے میدانوں میں یورپ نے تمدنی ارتقاء کے جو مراحل شدید محنت و مشقت سے طے کئے ہیں وہ سب میری نظر میں نہایت حقیر اور بے وقعت ہو کر رہ گئے جب میں نے وہاں اپنی آنکھوں سے صنفِ نازک اور انسانیت کے "نصف بہتر" کی توہین و تذلیل کی صورت میں شرف انسانیت کو پامال ہوتے دیکھا!..... میں نے محسوس کیا کہ وہ جنس لطیف جو مشرق میں آج بھی "جنس گراں مایہ" کا درجہ رکھتی ہے مغرب میں ایسی "جنس ارزاں" بن گئی ہے کہ اس نے نہ صرف یہ کہ محض ایک کھلونے اور دل بہلانے کے ذریعے کی حیثیت اختیار کر لی ہے بلکہ اس اعتبار سے بھی مرد کی شان استغنا بے حسی کی حدوں کو چھو رہی ہے اور بے چاری عورت اس کے لئے زیادہ سے زیادہ جاذب نظر بننے کے لئے لباس کی تہمت سے کُلیتہً بری ہونے کے لئے بے تاب ہے!...... اس سے جہاں عورت پر ترس آیا اور مغربی تہذیب سے شدید نفرت پیدا ہوئی وہاں دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کے لئے شکر و حمد کے جذبات بھی ابھرے کہ اس نے ہمیں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا فرما کہ کتنا عظیم احسان فرمایا ہے اور کیسی کیسی پستیوں اور گندگیوں سے بچالیا ہے!...... اور تب مجھے محسوس ہوا کہ کیوں علامہ اقبال نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اسلام کے نظام اجتماعی کی برکتوں کے ضمن میں حریت انسانی، اور عدل اقتصادی دونوں پر انسانیت کے نصف بہتر کے ناموس کی حفاظت کو مقدم رکھا ہے اور

ابلیس لعین کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکار شرع پیغمبرؐ کہیں!
الحذر! آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن' مرد آزما' مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں!

اس کے ساتھ ہی دل میں اس عظیم اور نازک ذمہ داری کا احساس شدت کے ساتھ ابھرا جو شرع و آئین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی حامل و امین امت پر عائد ہوتا ہے۔ کہ دنیا کو اس قعر مذلت سے بچانے کی ذمہ داری ہم پر تھی...... کہ ہم شرع و آئین پیغمبر' علیہ الصلوٰۃ والسلام کی علمی اور عملی شہادت دیتے' اور بقول علامہ اقبال۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے!

کے مصداق بنتے' جبکہ فی الواقع ہمارا حال یہ ہے کہ پوری امت مسلمہ بالعموم اور اس کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کی عظیم اکثریت بالخصوص خود "محروم یقین" ہے۔

اس سلسلے میں میرا ذہن خود اپنے ذاتی مسئلے کی جانب بھی منتقل ہوا کہ کیا اندریں حالات ایک ایسے شخص کے لئے جسے خود بھی اسی جدید تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے کے باوصف اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے "یقین" کا کچھ سرمایہ اور "شرع و آئین پیغمبرؐ" پر

ذہنی و قلبی اعتماد کی دولت عطا فرما دی ہو' اور اس سے بھی اہم تر یہ کہ اپنے کلام پاک اور "نوع انساں را پیام آخریں" کے ساتھ قلبی و ذہنی مناسبت بھی عطا فرما دی ہو' اور اس کے بیان و اظہار کے لئے زبان کی گرہ کو بھی کھول دیا ہو' جائز ہے کہ وہ اپنی بہتر اور بیشتر مساعی کو محض اپنی اور اپنے اہل و عیال کی معاش کے لئے وقف کر دے؟...... اور اس طرح' الحمد للہ کہ' انگلستان کی مخالفِ دین و مذہب فضا نے میرے حق میں "تندیٔ باد مخالف" کا روایتی رول ادا کیا۔ اور قیام لندن کے دوران جیسے جیسے وقت گذرا میری طبیعت کا غالب رجحان اس جانب بڑھتا چلا گیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ معاش کے معاملے کو بالکلیہ اللہ کے حوالے اور اس کے وعدے "و یرزقہ من حیث لا یحتسب" پر "اندھا" اعتماد کرتے ہوئے اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت و حکمت قرآنی کی نشر و اشاعت اور احیاء اسلام اور غلبہ دین کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا جائے!

مغرب کی خلافِ دین و مذہب فضا کے دین و مذہب کے حق میں ردعمل کا ایک اور عمومی مشاہدہ بھی مجھے لندن کے قیام کے دوران ہوا۔

لندن میں جمعہ کی نماز کے لئے اہم ترین جگہ تو ریجنٹ پارک کی مسجد تھی (جو اس وقت تک تو صرف ایک وسیع کوٹھی کی شکل میں تھی' اب ماشاءاللہ عظیم الشان مسجد اور اہم "اسلامک کلچرل سنٹر" کی صورت اختیار کر چکی ہے) لیکن اس کا فاصلہ ہماری جائے قیام سے بہت زیادہ تھا۔ ہمارے لئے قریب ترین مقام پاکستانی سفارتخانے کے قریب واقع "پاکستان اسٹوڈنٹس ہاسٹل" تھا جہاں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی تھی۔ وہاں میں نے ایک عجیب معمول دیکھا کہ جمعے کی نماز کے بعد بیس پچیس کے قریب اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان (بعض ڈاکٹریٹ کے لئے کوشاں اور اکثر ایک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے حصول کے بعد کسی دوسری یونیورسٹی سے "توثیق مزید" کی سعی میں مشغول) جن کی اکثریت اعلیٰ مغربی لباس میں ملبوس اور جن کے چہرے داڑھی سے مبرا ہوتے تھے' ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ کر قرآن مجید کے ایک رکوع کا مطالعہ اس طور سے کرتے تھے کہ پہلے ہر شخص اس رکوع کی تلاوت کرتا تھا تاکہ وہ خود بھی دوسروں سے سن کر اپنی تلاوت کی تصحیح کر سکے اور اگر پھر بھی اس کی تلاوت میں کوئی

غلطی رہ جائے تو دوسرے اس کی تصحیح کر دیں۔ پھر چند شرکاء جو اس رکوع کا مطالعہ مختلف تفسیروں سے کر کے آئے ہوتے تھے اپنا اپنا حاصل مطالعہ بیان کرتے...... اور اس طرح اس رکوع کے مضامین جملہ شرکاء محفل کے ذہنوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو جاتے تھے۔

میں نے دل میں سوچا کہ پورے پاکستان میں اس معیار اور اس مزاج کے لوگوں کی کسی ایسی ہفتہ وار نشست کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا' پھر یہاں اس کے انعقاد کا سبب کیا ہے؟ بہت غور و فکر کے بعد اس کی جو توجیہ میری سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ دیار مغرب میں حصول تعلیم یا تلاش معاش کے لئے آنے والے نوجوان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کے نہ تو اپنے ذہن و فکر میں مذہب و اخلاق کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں' نہ ہی ان کے خاندانی پس منظر میں گہری اور مضبوط مذہبی روایات موجود ہوتی ہیں' ایسے لوگوں کی اکثریت تو انگریزی زبان کے محاورے " DOWN THE DRAIN " کے مصداق مغربی تہذیب کے بدرو میں خس و خاشاک کے مانند بہہ جاتے ہیں' لیکن دوسری قسم کے نوجوان جن کے اپنے ذہن و قلب میں مذہب کی جڑیں گہری ہوتی ہیں یا کم از کم ان کی خاندانی روایات اور تہذیبی پس منظر میں دین مذہب کو اہم مقام حاصل ہوتا ہے ان کی دینی غیرت و حمیت خواہ اپنے ملک میں کسی سبب سے خوابیدہ ہی رہی ہو یہاں کے مخالفانہ ماحول میں راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کے مانند بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ ان میں اپنے مذہبی و تہذیبی تشخص کا احساس شدت سے جاگ جاتا ہے اور ا اس کے تحفظ کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں. اور یہ گویا وہی چیز ہے جسے عرف عام میں "اقلیتی ردعمل" (MINORITY REACTION) کہا جاتا ہے...... بعد میں اس کیفیت (PHENOMENON) کا مشاہدہ مجھے نہایت شدت اور وسعت کے ساتھ امریکہ میں بھی ہوا۔

بہر حال' میں جس ادھیڑ بن میں کچھ عرصے سے مبتلا تھا' اس کے معاملے میں ایک جانب فیصلہ کن رجحان کے پیدا ہونے میں' یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس "ردعمل" کو بھی دخل حاصل تھا۔ اگرچہ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سب مشیت ایزدی کا مظہر اور فضل خداوندی کا ثمرہ تھا کہ اس نے مجھے دین و مذہب کے اعتبار سے ایک مخالفانہ اور متضاد فضا میں بھیج کر میرے تحریکی داعیئے کی تربیت اور میری قوت ارادی اور خود اعتمادی کی تقویت

سامان فراہم کیا تھا۔ اس لئے کہ میں تو گھر سے انگلستان کا قصد کر کے نکلا ہی نہیں تھا' گویا میرا سفرلندن نہ معروف معنی میں اختیاری وارادی تھا' نہ خالص اتفاقی..... بلکہ فی الحقیقت اس میں "بہ جئت علی قدر یٰموسٰی" کا ادنیٰ عکس موجود تھا! اس لئے کہ ہمارے نزدیک تو "فاعل حقیقی" سوائے اللہ کی ذات کے اور کوئی ہے ہی نہیں! (بقول حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ "لافاعل فی الحقیقت ولا مؤثر الا اللہ!")

قیام لندن کے دوران ایک اور واقعہ بھی قارئین کی دلچسپی کا موجب ہو گا۔ ایک روز ہم دونوں بھائی اس مرکز کے ارادے سے نکلے جو جماعت اسلامی کے حلقے کے لوگوں نے تازہ تازہ قائم کیا تھا اور جہاں سے کچھ ہی عرصہ قبل ایک انگریزی جریدے " IMPACT " کی اشاعت شروع ہوئی تھی۔ مجھے خیال تھا کہ شاید وہاں جمعیت یا جماعت کے پرانے ساتھیوں میں سے کسی سے ملاقات ہو جائے۔ ہمارے پاس اس جگہ کا ایڈریس تو تھا لیکن عزیزم ابصار احمد کے لئے بھی وہ علاقہ نیا تھا۔ لہٰذا ہمیں اس جگہ کی تلاش میں دقت ہو رہی تھی۔ اسی اثناء میں ہمیں اچانک وہاں ایک ہندوستانی پاکستانی وضع قطع کے شخص نظر آئے تو ہم نے ان سے رجوع کیا۔ انہوں نے ہم دونوں کو غور سے دیکھنے کے بعد ذرا توقف کیا' اور پھر کہا "میں خود بھی وہیں جا رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ آ جایئے!" ..... چنانچہ ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ جتنی دیر ہم وہاں رہے وہ بھی خاموشی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ جب ہم وہاں سے چلنے لگے تو انہوں نے آہستگی سے دریافت کیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ وہ جمعہ کا دن تھا اور ہمیں نماز جمعہ کے لئے پاکستان ہاسٹل جانا تھا۔ جب ہم نے انہیں اپنا ارادہ بتایا تو انہوں نے کہا "کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟" ظاہر ہے کہ ہمارا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ "بسروچشم!" چنانچہ وہ ہمارے ساتھ ہی پاکستان ہاسٹل گئے۔ وہاں جمعہ بھی اس روز مجھے ہی پڑھانا تھا جس میں وہ بھی شریک رہے' پھر "مطالعۂ قرآن" کی معمول کی نشست کے بجائے بھی میرا ہی درس قرآن رکھا گیا تھا چنانچہ اس میں بھی انہوں نے شرکت کی' اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا تو اس میں بھی وہ ہمارے ساتھی کی حیثیت سے شریک رہے۔ بعدازاں جب شام کے قریب ہم وہاں سے روانہ ہونے لگے تو انہوں نے دوبارہ اسی آہستگی اور شائستگی

کے ساتھ کہا " آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا اگر میں بھی آپ کے ساتھ آپ کی قیام گاہ پر چلوں ! " ...... اب ہمیں بجاطور پر کسی قدر حیرت تو ہوئی تاہم تہذیب کا تقاضہ یہی تھا کہ ہم کہتے " ضرور چلئے ! " ...... چنانچہ وہ ہمارے ساتھ ہی للین پنسن ہال آگئے ' اور وہاں کسی قدر توقف اور کچھ روایتی خورد و نوش کے بعد انہوں نے اپنا راز کھولا کہ " میرا نام غیاث ہے ' میرا تعلق سکھر سے ہے ' وہاں میں جمعیت کا کارکن تھا ' اور آپ سے غائبانہ متعارف بھی تھا اور دلی محبت بھی کرتا تھا ' مجھے جب معلوم ہوا کہ آپ جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے ہیں تو مجھے تعجب بھی بہت ہوا تھا اور رنج بھی ' آج کل میں مانچسٹر میں مقیم ہوں اور وہیں سے میں نے کیمسٹری میں پی ایچ ڈی کیا ہے ' کل ہی مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ آپ ان دنوں لندن آئے ہوئے ہیں ' لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آپ کا قیام کہاں ہے۔ میں مانچسٹر سے صرف آپ کی ملاقات کے لئے آیا ہوں اور " IMPACT " کے دفتر اس امید میں جا رہا تھا کہ شاید وہاں کسی سے آپ کا پتہ مل سکے ' کہ اچانک آپ نے خود ہی رہنمائی کے لئے مجھ سے رجوع کر لیا اور اس طرح میری مشکل آسان ہو گئی۔ میں آپ سے صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے اسباب کیا ہیں ؟ "

حسن اتفاق سے اس وقت میرے بریف کیس میں " تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ " کا ایک نسخہ موجود تھا جو میں نے انہیں دے دیا۔ جس پر انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور اگلے روز دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد پورے تین دن تک ہمیں ان کی کوئی خبر نہ ملی جس پر ابتدا میں تو کچھ تشویش سی رہی لیکن پھر ہم بھی کچھ بھول سے گئے تھے کہ اچانک چوتھے دن وہ تشریف لے آئے۔ اس حال میں کہ نہایت مضمحل اور نڈھال تھے اور انتہائی اداسی اور افسردگی ان پر طاری تھی ...... آتے ہی کہنے لگے " میں ان تین دنوں کے دوران بالکل پاگل پن کی کیفیت سے دوچار رہا ہوں[1] میں نے آپ کی کتاب جاتے ہی ایک نشست میں پڑھ ڈالی تھی اور اس کا فوری ردعمل مجھ پر یہ ہوا تھا کہ میں نے کتاب کو تو زور کے ساتھ دیوار پر دے مارا تھا اور بے اختیار یہ الفاظ میری زبان سے نکل گئے تھے کہ " مجھے

ملہ I have been mad all these day

دھوکہ دیا گیا ہے!^ل...... آج بھی میں بمشکل ہی اپنے آپ کو اس قدر سنبھال سکا ہوں کہ آپ کی کتاب واپس کرنے آ گیا ہوں!"۔

میں نے جواباً کتاب تو ان ہی کے پاس رہنے دی اور انہیں سمجھایا کہ "مجھے یا آپ کو کسی نے جان بوجھ کر دھوکہ نہیں دیا' تحریکوں اور جماعتوں سے نیک نیتی کے ساتھ بھی غلطیاں ہو جاتی ہیں اور باہمت لوگوں کا فرض ہے کہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے آئندہ کے لئے صحیح لائحہ عمل اختیار کر لیں اور اگر مقصد پر یقین اور اعتماد برقرار رہے تو از سرنو کمرہمت کو کس کر ع "ہوتا ہے جادہ پیا پھر کارواں ہمارا!" کے سے انداز میں پھر رخت سفر باندھ لیں۔ مجھے اصل تشویش اس بات کی ہے کہ ایک جانب تو جماعت اسلامی کی قیادت لگ بھگ ربع صدی کے تجربات کے باوجود بھی اپنے طریق کار پر نظر ثانی پر آمادہ نہیں ہو رہی' اور دوسری جانب جو لوگ طریق کار سے اختلاف کے باعث جماعت سے علیحدہ ہوئے تھے ان کی اکثریت تعطل کا شکار ہو کر مقصد اور نصب العین ہی کے بارے میں مذبذب اور متردد ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اندریں حالات جن لوگوں پر موجودہ طریق کار کی غلطی واضح ہو جائے لیکن اصل نصب العین کے ساتھ وابستگی برقرار رہے ان کی ذمہ داری دوچند ہو جاتی ہے! اس کے ساتھ ہی میں نے انہیں دعوت دی کہ واپس پاکستان تشریف لے آئیں اور تحریک کے رخ کو صحیح سمت میں موڑنے کی جو کوشش بھی کر سکتے ہوں اس سے دریغ نہ کریں۔ انہوں نے اس وقت تو میرے مشورے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ دیار مغرب میں جاڈیرہ لگانے والوں کی اکثریت وہاں ایسی بے بس سی ہو جاتی ہے کہ پھر لاکھ خواہش کے باوجود مراجعت وطن تقریباً ناممکن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک تو ان سے رابطہ رہا اور انہوں نے اپنا ایک مقالہ بھی عالم اسلام کی احیائی تحریکوں کے جائزے پر مشتمل مجھے ارسال کیا تھا جس میں میری کتاب سے بڑے مفصل اقتباسات درج کئے تھے...... لیکن پھر رابطہ ٹوٹ گیا...... اور ایک طویل عرصے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کی انقلابی مذہبیت یا مذہبی انقلابیت نے شکیل بدایونی کے اس شعر کے مصداق کہ۔

تو اگر برا نہ مانے' تو جہان رنگ بو میں
میں سکون دل کی خاطر کوئی ڈھونڈ لوں سہارا

ل I have been cheated

لی انقلاب کی تائید اور وکالت کے ذریعے تسکین کی صورت پیدا کر لی۔ چنانچہ آج کل وہ
ٹر کلیم صدیقی صاحب کے قائم کردہ "مسلم انسٹیٹیوٹ لندن" میں، ڈاکٹر صاحب سے
ت راست کے طور پر والہانہ اور ہمہ تن و ہمہ وقت انداز میں کام کر رہے ہیں کاش
ب بھی وہ پاکستان واپس آکر اپنے ملک میں اسلامی انقلاب کے بنیادی تقاضوں
PRE-REQUISITES) کو پورا کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوں۔ وما ذالک
لی اللہ بعز بز!

اپنی اس پہلی اور طویل ترین لندن "یاترا" کے ذکر کے اختتام سے قبل' زیادتی ہو
اگر اس حقیقت کا اظہار نہ کروں کہ اس ایک ماہ کے عرصے کے دوران عزیزم ابصار احمد
نے میری خدمت اور خاطر تواضع کا بھرپور حق ادا کیا اور ایک طالب علم کی حیثیت سے جو رقم
انہ اخراجات کے لئے انہیں برادرم اقتدار احمد کی جانب سے ملتی تھی اس میں سے انہوں نے
کچھ پس انداز کیا ہوا تھا اس میں سے دل کھول کر خرچ کیا۔ فجزاہ اللہ احسن
لجزاء

وسط جنوری ۱۹۷۱ء میں لندن سے جدہ واپس جاتے ہوئے میں نے دو دن بلجیم کے
ار الحکومت برسلز میں قیام کیا۔

اس کی تقریب یہ ہوئی کہ حجاز مقدس میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے ایک رشتے
کے پھوپھا' سید منظور حسنؒ عرصہ دراز سے مقیم تھے۔ ان کا اپنا مکان تو مکہ مکرمہ میں تھا لیکن
ن کے صاحب زادے جدہ میں مقیم تھے۔ اور وہ خود بھی موسم حج میں اپنا مکہ والا مکان حجاج
رام کو کرائے پر دے کر جدہ چلے جایا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے موقع
پر میں نے بھی اپنے والدین اور منٹگمری (ساہیوال) کے بعض دوسرے رفقاء کے ساتھ ان ہی
کے مکان میں قیام کیا تھا۔ شاہ صاحب حد درجہ نیک دل اور دین دار مسلمان تھے' اور چونکہ
سعودی عرب کے مخصوص ماحول میں ان کی نیکی اور جذبہ تبلیغ و خدمت دین کو کوئی اور لائحہ عمل
دستیاب نہیں تھا للہذا انہوں نے ایک خاص کام اپنے ذمے لے لیا تھا اور وہ یہ کہ دنیا بھر میں
جہاں کہیں سے بھی انہیں کسی غیر مسلم کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع ملتی تھی' اس سے
رابطہ قائم کر کے اس کی مشکلات اور مسائل معلوم کرتے تھے اور پھر حتی الامکان انہیں حل

کرنے کی کوشش کرتے تھے...... اس بار لندن روانگی سے قبل جب ان سے جدہ میں ملاقات ہوئی توانہوں نے برسلز کے ایک نوجوان کا ایڈریس مجھے دیا اور خواہش ظاہر کی کہ میں اس سفر میں کسی طرح دو دن نکال کر وہاں جاؤں اور اس نوجوان سے ملاقات کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے قیام لندن کے دوران اس نوجوان سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ شادی کے خواہشمند ہیں تو اس سلسلے میں برادرم ابصار احمد کے ملنے جلنے والوں میں ایک نہایت شریف اور نیک ترک مسلمان سے ان کی دختر کے بارے میں بات بھی کی تھی' جو لندن میں درزی کا کام کرتے تھے۔ اور اب میں ان سے ملاقات کے لئے برسلز حاضر ہوا تھا۔

ان کی ہدایت پر میں نے برسلز کے ایک ہوٹل میں قیام کر لیا تھا۔ جہاں وہ میرے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد آ گئے۔ ان سے جو حالات معلوم ہوئے وہ میرے لئے نہایت سبق آموز بھی تھے اور غیرت و حمیت دینی کی تقویت کا باعث بھی!

ان کا والدین کا رکھا ہوا نام وان کنٹر (VONCANTER) تھا' اور ان کے والدین راسخ العقیدہ رومن کیتھولک تھے جن کی وہ واحد "اولاد" تھے۔ ایک بار وہ سیر و سیاحت کی غرض سے مراکش گئے تو وہاں کا معاشرہ انہیں اتنا پسند آیا کہ وہیں ایک سکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ اور بالاخر وہیں مشرف بہ اسلام ہو گئے اور عبدالعزیز نام اختیار کر لیا۔ واپس آئے اور والدین کے علم میں ان کا اسلام لے آنا آیا تو انہیں صدمہ تو بہت ہوا لیکن بالاخر انہوں نے باہم یہ مصالحت کر لی کہ وہ گھر میں ساتھ ہی رہیں گے اور کبھی مذہب کے معاملے میں گفتگو نہیں کریں گے۔

اس وقت ان کی عمر ۲۷' ۲۸ کے لگ بھگ تھی۔ اور سرخ و سپید چہرے پر بھورے رنگ کی داڑھی بہار دے رہی تھی۔ دین کے فلسفہ و حکمت سے تو انہیں کوئی خاص ذہنی مناسبت نہ تھی لیکن فقہی معلومات میرے مقابلے میں کم از کم دس گناہ زیادہ تھیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جب اصولی طور پر اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تو پھر تمام مذاہب فقہ کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد مذہب حنبلی اختیار کیا تھا۔

میں نے ان سے بلا شائبۂ تکلف و تصنع یہ کہا کہ : "ہم جب اپنی یعنی قدیم الاسلام قوموں کی حالت کو دیکھتے ہیں تو اسلام کے مستقبل کی جانب سے مایوسی سی ہونے لگتی ہے لیکن

آپ ایسے لوگوں کو دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ اسلام میں اتنی قوت تسخیر موجود ہے کہ وہ نئے ورزندہ و بیدار لوگوں کو اپنے دامن میں کھینچ لے، اور کیا عجب کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اسی طور سے ہو!" ...... گویا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!

انہوں نے مجھے برسلز کی سیر بھی خوب کرائی۔ اور ایک بار کھانے کے لئے اپنے گھر بھی مدعو کیا جہاں ان کے والدین سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان کے والد بلجیم کے پولیس چیف تھے، اور ان کا ایک نہایت اعلیٰ بنگلہ مضافات برسلز میں تھا وہاں مجھے دو حیرتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک یہ کہ ان کے والد اعلیٰ ترین سرکاری افسر ہونے کے باوجود انگریزی سے نابلد محض تھے (اس کا تجربہ مجھے برسلز ایئرپورٹ پر بھی ہو چکا تھا، جہاں انگریزی جاننے والا شخص صرف انکوائری آفس میں تھا) اور دوسری اور کہیں زیادہ حیران کن بات یہ کہ عبدالعزیز وان کنٹر نے مجھ سے کہا کہ۔ "آپ یہاں پورے اطمینان کے ساتھ کھائیں پئیں، اس گھر میں کبھی نہ خنزیر کا گوشت آیا ہے نہ شراب کا کوئی قطرہ!" معلوم ہوا کہ رومن کیتھولک لوگوں میں ایسے باعمل عیسائی (PRACTICING CHRISTIANS) اب بھی موجود ہیں جو فرمان عیسویؑ کے مطابق شریعت موسویؑ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی پابندی کرتے ہیں۔

بہرحال برسلز کا یہ دو روزہ قیام بھی میرے لئے ایمان افروز ثابت ہوا۔ اور اس سے بھی میرے مستقبل کے عزائم کو تقویت حاصل ہوئی اور مجھے اپنے دل میں وہی جذبہ ابھرتا محسوس ہوا جسے مسلمانوں کے قلوب میں علامہ اقبال نے اپنے ان الفاظ سے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ع "گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا!"

(اگرچہ جدہ پہنچ کر جب میں نے اپنی اس ملاقات کی مفصل رپورٹ سید منظور حسنؒ کو سنائی تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر رنج بھی پہنچا کہ انہوں نے عبدالعزیز کے مسلک حنبلی اختیار کرنے پر شدید مایوسی اور بددلی کا اظہار فرمایا...... اس لئے کہ وہ خود مسلکاً اہل حدیث تھے اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے یہاں انتہائی نیک دل اور مخلص لوگ

بھی فروعی و فقہی اختلافات کے ضمن میں کتنے حساس اور متشدّد واقع ہوئے ہیں!)

چلتے چلتے برسلز کا ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ میں جب برسلز ایئرپورٹ سے ٹیکسی پر شہر جا رہا تھا تو ٹیکسی ڈرائیور نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں مجھ سے پوچھا "پاکستانی ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا' تو اس نے دوسرا سوال کیا! "اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟"...... اس پر جب میں نے کہا۔ "لندن سے!" تو اس نے پلٹ کر میری جانب غور سے دیکھا اور شدید حیرانگی کے ساتھ کہا۔ "کیا کہا؟ لندن سے! میں نے آج تک لندن جانے کے خواہشمند پاکستانی ہی دیکھے ہیں۔ لندن سے آنے والے پاکستانی تو تم پہلے نظر آئے ہو!"...... میں اس وقت تو اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ لیکن جب ہوٹل میں چند پاکستانی نوجوانوں سے ملاقات ہوئی تو ان کے ذریعے ساری بات معلوم ہوئی...... دراصل برسلز غیر قانونی طور پر انگلستان میں داخل ہونے کی کوشش کرنے والے پاکستانیوں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ وہاں سے چونکہ صرف رودبار انگلستان ہی کو پار کرنا ہوتا تھا لہٰذا یہ غیر قانونی دھندا زوروں پر تھا کہ کوئی موٹر لانچ بھاری کرائے وصول کر کے رودبار کو کراس کر کے انگلستان کے ساحل پر کسی جگہ اپنا انسانی کارگو اتار کر واپس بھاگ آتی تھی۔ آگے وہ لوگ خود جانیں اور برطانیہ کی پولیس یا کوسٹ گارڈز!...... یہی نہیں بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ چھوٹے سائز کے چارٹرڈ ہوائی جہاز پاکستانیوں سے لدے ہوئے جاتے ہیں اور کسی جنگ کے زمانے کی پرانی اور متروک الاستعمال ایئرسٹرپ پر لوگوں کو اتار کر واپس آ جاتے ہیں!...... اس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے پاکستانی "رفیق" آج کل سعودی عرب میں اپنی "کاریگری" کا جو لوہا منوا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ؎ "سو پشت سے ہے پیشہ آباء سپہ گری!"

واپس سعودی عرب پہنچا تو یہ غالباً جنوری ۷۱ء کی اٹھارہ تاریخ تھی اور اتفاقاً جدہ ہی میں راؤ محمد اختر صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے مدینہ منورہ کی عید الفطر کے دن والی ملاقات کے بعد پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ پاکستان کے عام انتخابات کے نتائج کی بنا پر وہ نہایت پژمردہ اور مضمحل تھے' میں نے لوہا گرم سمجھ کر کہا۔ "راؤ صاحب! کیا اب بھی آپ لوگ اپنے اندازوں اور

طریق کار پر نظر ثانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؟"...... تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تڑخ کر جواب دیا "ڈاکٹر صاحب! اب تو اگر خود مولانا مودودی بھی طریق کار کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے، تو ہم انہیں بھی ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے!"

مجھے اس وقت تو ان کی بات ایک "جذباتی طوفان" (EMOTIONAL OUTBURST) کا مظہر نظر آئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ فی الواقع جماعت کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی تھی!۔

مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا..... تو وہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے ملاقات ہوئی، انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس مولانا مودودی کی اس تقریر کا ٹیپ پہنچ گیا ہے جو انہوں نے لاہور کے ایک اجتماع کارکنان میں انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی پر جماعت ہی کے حلقے کے بعض صحافیوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں کی تھی۔ (واضح رہے کہ یہ وہی صحافی تھے جو انتخابات سے قبل جماعت اسلامی کی شاندار متوقع کامیابی کے ضمن میں مبالغہ آمیز اندازے شائع کرتے رہے تھے، لیکن اب جبکہ نتیجہ برعکس نکل آیا تھا تو جماعت کی بعض حکمت عملیوں اور بالخصوص طریق تنظیم کو ہدفِ تنقید بنا رہے تھے!)۔ چنانچہ میں نے ان کے مکان پر حاضر ہو کر اس تقریر کا ریکارڈ سنا... تو مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مولانا کسی جیوری کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہو کر صفائی پیش فرما رہے ہوں۔ چنانچہ اس پر میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے کہ اللہ اکبر کس قدر دردناک اور حسرتناک معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی دعوت و خدمت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کی جدوجہد میں صرف کر دی، اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ۔

ایک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاک بخارا و سمرقند!

بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا..... اور ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے انہیں غلبہ دین کی جدوجہد کا سپاہی بنا دیا، عمر کے آخری حصے میں اپنے ہی عقیدت مندوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے..... اور اپنے بیٹوں کی عمر کے نوخیز و نومشق صحافیوں کے سامنے اپنے

بعض اساسی نظریات ' بالخصوص ہیت تنظیمی کا دفاع کرنے پر مجبور ہو گیا ہے...... فاعتبروا یا اولی الابصار!

بہر حال اواخر جنوری ۷۱ء کی کسی تاریخ کو مکہ مکرمہ میں زبیر عمر صدیقی صاحب کے مکان پر جو چند آنسو میری آنکھوں میں بے اختیار امنڈ آئے تھے انہوں نے میرے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا جو ۱۹۶۲ء کے بعد سے مولانا مودودی کے ساتھ کدورت کی بنا پر جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے..... کہ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرا تعلق اتار چڑھاؤ کے متعدد ادوار سے گزرا ہے ' اور ان کے بارے میں میرے احساسات اور قلبی کیفیات میں کئی بار تغیر و تبدل ہوا ہے۔ چنانچہ :۔

۱۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی پندرہ سے اکیس برس عمر کے دوران ان کے ساتھ میرا تعلق غایت درجہ محبت اور احترام ہی کا نہیں ' انتہائی عقیدت کا بھی تھا۔ اور میں اپنے چھوٹے سے ذہن اور محدود معلومات کی بنا پر انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد امت مسلمہ کا عظیم ترین فرد سمجھتا رہا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار ادھر لاہور اور پنجاب میں تحریک ختم نبوت کے ضمن میں جماعت اسلامی کے رول اور ادھر کراچی میں طلبہ کی کمیونسٹ تحریک کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رول سے میرے ذہن میں اولین شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں اُس اختلافی سوچ کا آغاز ہوا۔ جو ۵۶۔ ۵۵ء تک اپنے نقطہ عروج تک پہنچ گئی اور نومبر ۵۶ء میں اس اختلافی بیان کی صورت میں ضبط تحریر میں بھی آگئی جو پورے دس سال بعد (۱۹۶۶ء میں) " تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ " کے نام سے شائع ہوا...... اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ عقیدت کا تو خاتمہ ہو گیا ' تاہم محبت اور احسان مندی کا جذبہ برقرار رہا۔

۳۔ ۵۶ء سے اپریل ۵۷ء تک مولانا مرحوم کے بعض اقدامات کی بنا پر ان کے ساتھ حسن ظن کو شدید صدمہ پہنچا...... لیکن اس کے باوجود ایک گونہ دلی تعلق بھی برقرار رہا...... اور

احسان مندی کے جذبات میں بھی کوئی کمی نہیں آئی..... اور اپریل ۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد سے اپریل ۶۲ء تک یہ کیفیت علیٰ حالہٖ برقرار رہی۔ چنانچہ ابتداء میں تو میں ملاقات کے لئے بھی حاضر ہوتا رہا اور اگرچہ یہ محسوس کر کے کہ مولانا بھی میری آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور ۵۔ اے' ذیلدار پارک کی عمومی فضا میں تو بہت ہی ناگواری پائی جاتی ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں کے چہرے تو ہو بہو "تعرف فی وجوھھم المنکر" کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں' میں نے آمدورفت تو بند کر دی..... تاہم مولانا سے کوئی قلبی بُعد پیدا نہیں ہوا اور احسان مندی کے جذبات تو جوں کے توں قائم رہے۔ چنانچہ اپریل ۶۲ء میں حج کے لئے روانگی سے قبل میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ۔ "مولانا! میں حج کے لئے جارہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگرچہ جماعت کی پالیسی سے میرا اختلاف نہ صرف علیٰ حالہٖ قائم ہے بلکہ شدید تر ہو گیا ہے..... لیکن میرے دل میں آپ کی جانب سے کوئی کدورت نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری جانب سے کوئی مَیل ہو تو آپ بھی اسے صاف فرمالیں!" اس پر مولانا نے بڑے اطمینان اور انشراح کے ساتھ فرمایا: "آپ بالکل مطمئن رہیں' میرے دل میں آپ کی جانب سے ہرگز کوئی میل نہیں ہے!"..... یہی وجہ ہے کہ جب میری روانگی کے بعد دفعتہً مولانا کو سعودی حکومت کی جانب سے "رابطۂ عالم اسلامی" کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ اور چند روز بعد وہ بھی حجاز مقدس پہنچ گئے تو میں نے ان سے متعدد بار مکہ مکرمہ میں فندق مصر میں ملاقات کی۔ پھر منیٰ میں بحالت احرام شرف ملاقات حاصل کیا۔ اور آخری بار مدینہ منورہ میں ملاقات بھی کی اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں کچھ گفتگو بھی کرنی چاہی۔ اگرچہ اس کا جواب مجھے بہت حوصلہ شکن ملا۔

۴۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک جانب جمہوریت کے عشق میں جس انتہاپسندی کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر بلکہ ملحد عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی' اور مبالغہ آرائی اس حد تک پہنچ گئی کہ صدر ایوب خاں بمقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے باب میں یہ الفاظ تک کہہ دیئے گئے کہ۔ "ایک جانب ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی

نہیں کہ وہ مرد ہے' اور دوسری جانب ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے!" ...... اور دوسری طرف عوامی توجہ کا مرکز بننے کے لئے دینی اعتبار سے اس درجہ پستی اختیار کر لی گئی کہ "غلاف کعبہ کی رام لیلا" منعقد کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہ کیا...... وغیرذالک...... تو' مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ' میرے دل میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ یہاں تک کہ احسان مندی کے جذبات بھی اس منفی جذبے کے نیچے دب کر رہ گئے...... یہی سبب ہے کہ میری ۶۶ء تا ۷۰ء کی تحریروں میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے!۔

۵۔ اور یہی وہ کیفیت تھی جس میں ایک اچانک انقلاب اواخر جنوری ۷۱ء کی اس شام کو مکہ مکرمہ میں آیا۔ جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اور جس کے نتیجے میں نفرت کی جگہ تاسف آمیز حسرت نے لے لی' اور اگرچہ اختلاف پوری شدت کے ساتھ قائم رہا ... تاہم قلب کی گہرائیوں سے ذاتی احسان مندی کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا۔ جو بحمد اللہ آج تک برقرار ہے!۔

۶۔ لیکن اس کے بعد بھی مولانا سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی۔ اس لئے کہ ایک تو اس طویل عرصے کے دوران بہت سے اسباب کی بنا پر' اور بالخصوص میری اپنی بعض تحریروں کے باعث حجابات بہت گہرے ہو چکے تھے...... دوسرے پالیسی کا اختلاف جوں کا توں برقرار تھا ... اور یہ بات میرے علم میں بہت دیر کے بعد آئی کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی شکست کے بعد مولانا اپنی بعد از تقسیم ہند پالیسی سے مایوس ہو گئے تھے اور تہہ دل سے چاہتے تھے کہ اسے تبدیل کر دیا جائے۔ لیکن اب کچھ اپنی ضعیفی اور علالت' اور کچھ جماعت کے کارکنوں' اور بالخصوص اس کی نئی قیادت کے مزاج میں سیاسی رنگ کے پختہ ہو جانے کے باعث وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے...... بہرحال' جب میرے علم میں یہ حقائق آئے تو فطری طور پر دل میں ملاقات کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن جن ذرائع سے مولانا کے نقطہ نظر کی تبدیلی کا علم حاصل ہوا تھا ان ہی کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے گرد جماعت کا حفاظتی حصار بہت سخت ہے' اور اول تو ان سے میری ملاقات ہی محال کی حد تک مشکل ہے' ثانیاً اس کی توقع بہت کم ہے کہ مولانا کھل کر بات کر سکیں۔ لہٰذا اس "سعیٔ لاحاصل" کا ارادہ ترک کر دیا۔

۷۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اگست میں امریکہ سے ایک زوردار دعوت موصول ہوئی اور میں نے اسے قبول کر لیا تو اس خیال کے تحت کہ مولانا بھی آج کل وہیں مقیم ہیں دل میں دبی ہوئی خواہش کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پختہ ارادہ کر لیا کہ وہاں ملاقات ضرور کروں گا لیکن افسوس کہ جیسے ہی میں امریکہ پہنچا' مولانا شدید علیل ہو گئے' اور شدید خواہش کے باوجود ان سے زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف ان کے مردہ جسد خاکی کی زیارت اور نماز جنازہ میں شرکت نصیب ہو سکی۔ ... اور اس موقع پر مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق کے اس جملے نے میری حسرت کو دوچند کر دیا کہ۔ "ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہشمند تھے' لیکن ان کے معالجین کی سخت ہدایت تھی کہ ان سے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے سوا اور کوئی نہ ملنے پائے!"

قصہ مختصر یہ کہ اس طویل داستان کا ایک باب جنوری ۷۱ء میں اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ اس ضمن میں مبادا کوئی یہ کہے کہ یہ سب بعد کی سخن سازی ہے' میں اپنی دو تحریریں اس قسط کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کر رہا ہوں۔ ایکؔ۔ ماخوذ از "تذکرہ و تبصرہ" میثاق دسمبر ۷۲ء اور دوسریؔ۔ ماخوذ از "تقدیم" کتاب "اسلام اور پاکستان" شائع شدہ جنوری ۸۳ء۔

اس کے بعد جب مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانگی ہوئی تو میری ذہنی کیفیات اور قلبی احساسات اُس سے بہت مختلف تھے جو اُس وقت تھے جب تین ماہ قبل اواخر اکتوبر ۷۰ء میں میں اس سفر کے پہلے عمرے کے بعد مدینہ منورہ جا رہا تھا۔

اولاً... ' میری جسمانی صحت اس وقت کے مقابلے میں بہت بہتر ہو چکی تھی اور ایک سالہ علالت کے آثار تقریباً ختم ہو چکے تھے۔

ثانیاً..... ذہن اس شش و پنج اور ادھیڑ بن سے تقریباً فارغ ہو چکا جو آئندہ زندگی کے بارے میں "ادھر یا ادھر" کے آخری اور حتمی فیصلے کے ضمن میں قریباً چھ ماہ سے شدت سے جاری تھی اور جس نے مجھے "قد امرضتنی و احزنتنی و اسقمتنی" کے مصداق مزید مضمحل کر دیا تھا..... چنانچہ اس معاملے میں ذہن اس پر تقریباً یکسو ہو چکا تھا کہ

مطب کو خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ اور اس معاملے میں اب صرف ایک خلش باقی رہ گئی تھی جس کے بارے میں آخری فیصلہ میں نے حج پر ملتوی کر دیا تھا۔ (اس کا ذکر بعد میں آئے گا!)

ثالثاً... مولانا مودودی کے بارے میں دل کا غبار دھل جانے سے بھی طبیعت کو ایک گونہ سکون حاصل ہوا تھا۔

ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ دل پر انبساط اور انشراح کی کیفیت طاری تھی، اور جوں جوں طیبہ کا فاصلہ کم ہو رہا تھا میری طبیعت میں وہی کیفیات پیدا ہوتی جا رہی تھیں جن کی ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے ان اشعار میں کی ہے۔

باایں پیری رہِ یثرب گرفتم
نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرشام
کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ!

لہٰذا مدینہ منورہ میں حضرت جامیؔ کے اس شعر کے مصداق کہ۔

مشرف گرچہ شد جامیؔ ز لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کن!

دوبارہ تقریباً دو ہفتے میرے اسی کیف و سرور، اور سوز و گداز کی کیفیت میں گزرے جن میں ماہ رمضان مبارک گزرا تھا بلکہ اس بار ایک نئی سعادت یہ نصیب ہوئی کہ چونکہ مولانا عبدالغفار حسن اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں حدیث کے استاد کی حیثیت سے خدمت سرانجام دے رہے تھے اور اس طرح انہیں ایک سرکاری حیثیت و وجاہت حاصل تھی لہٰذا ان کی "سرپرستی" میں میں نے مسجد نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے درمیانی برآمدے میں مسلسل پانچ دن مغرب سے عشاء تک "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔ اور اس کے بعد بھی کئی دن تک یہ سلسلہ اس طرح جاری رہا کہ پہلے میں مختصر خطاب کرتا تھا اور پھر مولانا مدظلہ مسائل و مناسک حج کی وضاحت فرماتے تھے!۔
(گویا میرے اس کتابچے کا حرم نبویؐ سے دوہرا تعلق قائم ہو گیا...... یعنی پہلا یہ کہ رمضان

مبارک کے آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنوری نے بحالت اعتکاف اس کا مطالعہ فرما کر ایک جملے میں اصلاح تجویز فرمائی اور اب ایام حج میں اس کے جملہ مضامین سلسلہ وار مسجد نبویؐ میں بیان ہوئے' ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم! ع "یہ نصیب! اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے!"

یہ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے کہ اس بار بھی میں مولانا عبد الغفار حسن مدظلہ کی مہمان نوازی سے بھرپور متمتع ہوا۔ اس ضمن میں مولانا کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا ذکر نہ کرنا بھی ناشکری ہو گا۔ اس لئے کہ انہوں نے واقعی میری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اس کا اصل اجر تو انہیں آخرت ہی میں ملے گا۔ البتہ ایک چھوٹا سا فوری صلہ انہیں اللہ کی جانب اس صورت میں مل گیا کہ وہ ایک عرصے سے علیل تھیں اور کوئی علاج بھی ان کی طبیعت کے موافق ثابت نہیں ہو رہا تھا لیکن میرا علاج انہیں راس آ گیا ... اور ان کی صحت کسی قدر بہتر ہو گئی!

مدینہ منورہ سے فروری ۷۱ء کے پہلے ہفتے میں حج کے لئے روانگی مولانا عبد الغفار حسن صاحب اور ان کے صاحب زادگان کی معیت ہی میں ہوئی۔ اور احرام بھی ہم نے ٹھیک اسی جگہ باندھا جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقع پر باندھا تھا!۔

مولانا کی معیت ہی کے طفیل اس بار حرم مکی میں بھی عین بیت اللہ کے سامنے رکن شامی کے بالمقابل "رملہ" میں (کنکریوں والے پلاٹ جو اب ختم ہو گئے ہیں!) مغرب اور عشاء کے مابین سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر متعدد تقاریر کی سعادت نصیب ہوئی اور مجھے آج تک ان مبارک لحات کا کیف و سرور اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں مکی دور بعض واقعات کو بیان کرتے ہوئے بیت اللہ اور حرم کی سرزمین کی جانب اشارہ کرتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ "یہی وہ جگہ ہے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ جب آنحضورؐ نماز میں کھڑے۔ ابو جہل نے اپنی چادر کو رسی کی صورت میں بٹ کر اس کا پھندہ آپؐ کی گردن مبارک ڈال کر اس طرح مروڑا تھا کہ آپؐ کی آنکھیں ابل پڑی تھیں!" تو پورے مجمع پر شدید طاری ہو جاتی تھی اور ہر شخص کے دل میں وہی جذبہ موجزن ہو جاتا تھا جس کی تعبیر کبھی تحریکی دور میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ میں کی تھی کہ...... "بد قسمت ہول

ہمارے وجود اگر اس راہ میں ہماری ایک ہڈی بھی نہ ٹوٹے!"

جیسے کہ اس سے قبل ذکر ہو چکا ہے' میں نے پہلی بار حج مئی ۱۹۶۲ء میں والدین کی معیت میں کیا تھا۔ (اس مرتبہ یہ عجیب اتفاق ہوا تھا کہ جس روز ہم نے کراچی سے جدہ ہوائی سفر کیا وہ میری ۳۰ویں سالگرہ کا دن تھا' یعنی ۲۶ر اپریل ۱۹۶۲ء) اس وقت تک حجاج کرام کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی' لہٰذا حج کے دوران بڑا سکون و اطمینان اور ہر طرح کی دلجمعی حاصل رہی تھی..... اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۰ر تا ۱۲ر ذی الحجہ قیام منیٰ کے ایام واقعتاً الفاظ نبویؐ "ایام اکل و شرب" کے مصداق ایک نہایت پاکیزہ جشن یا اہل تقویٰ کی پکنک کے مانند گزرے تھے..... اور سید عقیل عطاس کے احاطے میں حاجیوں کے خیمے فاصلے سے اس طرح لگے ہوئے تھے کہ کسی تنگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا تھا اور قربانی کا گوشت پکانے کے لئے جا بجا کھلے میدان میں چولھے جلتے نظر آتے تھے.....

لیکن افسوس کہ اس بار اگرچہ حج کے جملہ مناسک تو بحمد اللہ بحسن و خوبی ادا ہو گئے تاہم وہ دلجمعی قطعاً حاصل نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ ایک تو گزشتہ نو سالوں کے دوران حاجیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی... اور دوسرے ان غیر ملکی لوگوں (بالخصوص پاکستانیوں) نے جو بسلسلہ روزگار سعودی عرب میں مقیم تھے... اور ہر سال محض تفریح طبع یا وقت گزاری کے لئے حج پر چلے آتے تھے' حج کے تقدس کو بری طرح پامال کر دیا تھا چنانچہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے عرفات کے میدان میں کچھ لوگوں کو تاش کھیلتے ہوئے دیکھا اور خاص طور پر اس صورت حال سے تو طبیعت بہت ہی منغّض ہوئی کہ چونکہ یہ لوگ معلموں کے خیموں کا کرایہ ادا کرنے سے بچتے تھے اور سڑکوں اور راستوں ہی پر ڈیرہ ڈال دیتے تھے' لہٰذا ہر چہار طرف گندگی پھیل جاتی تھی... (یہ صورت حال ۱۹۷۴ء اور پھر ۱۹۷۹ء کے حج کے موقع پر اور بھی زیادہ شدت کے ساتھ نظر آئی۔ البتہ ۱۹۸۶ء میں اگرچہ اژدہام تو بے انتہا تھا' لیکن بحمد اللہ اس اعتبار سے صورت حال بہتر نظر آئی۔ اس لئے کہ سعودی عرب کی حکومت نے غیر ملکی کارکنوں اور ملازموں پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ پانچ سال میں صرف ایک بار حج کر سکتے ہیں۔) تاہم ایام حج میں میں اپنی اس الجھن کے بارے میں مسلسل غور کرتا رہا جس پر سوچ بچار کو میں نے

ی موقع کے لئے مؤخر کر دیا تھا۔

وہ الجھن یہ تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا بڑا فیصلہ کر تو
رہا ہوں کہ حصول معاش کے واحد ذریعے یعنی مطب کو بند کر دیا جائے در آں حالیکہ
دوسرا کوئی مرئی اور محسوس و مشہود ذریعہ سرے سے موجود نہیں ہے اور سوائے اللہ تعالیٰ کی
رزاقیت پر "اندھے" اعتماد (BLIND FAITH) کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی
اور یہ بھی یقیناً اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے اس پر میرے دل کو مطمئن کر دیا
ہے..... لیکن ایک پہلو سے میرا یہ فیصلہ "خلافِ قرآن" ہے' اس لئے کہ قرآن مجید نے
انسان کی شعوری پختگی کی عمر چالیس سال قرار دی ہے بفحوائے آیت قرآنی "حتّیٰ اذا
بلغ اشدّہ و بلغ اربعین سنة۔ الایہ" (سورۂ احقاف۔ آیت نمبر ۱۵)
اور میں اتنا بڑا اقدام اس وقت کر رہا ہوں جبکہ ابھی پورے انتالیس سال کا بھی نہیں ہوا۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہے کہ یہ آیہ مبارکہ اور اس کے حوالے سے یہ خیال کہ
انسان کی نفسیاتی اور شعوری پختگی کی عمر چالیس سال ہے' بہت عرصہ سے میرے ذہن میں
موجود تھا... چنانچہ نومبر ۱۹۶۵ء میں جب والد صاحب مرحوم کا انتقال ہوا' اور اس صدمے
کا غم ہلکا کرنے کے لئے میں نے برادرم وقار احمد کی معیت میں وادی کاغان کا رخ کیا (جس
میں میں اپنی پرانی ھلمین کار میں وادی کاغان کے درمیانی مقام جرید تک پہنچ گیا تھا) تو
جاتے یا آتے ایک دن کا قیام ایبٹ آباد میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر ہوا۔ وہ نومبر کی
۲۶ر تاریخ تھی اور مجھے اچانک یاد آیا کہ یہ بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کا یوم پیدائش ہے۔
چنانچہ اس کے باوجود کہ ان دنوں میرے تعلقات ان سے خاصے کشیدہ تھے' میں نے ایبٹ
آباد ہی سے انہیں ایک خط تحریر کیا تھا کہ: آج آپ انتالیس سال پورے کر کے چالیسویں
میں داخل ہو گئے ہیں' اور یہی از روئے قرآن انسان کی پختگی کی عمر ہے' لہٰذا آپ ذرا اپنے
ماضی اور حال پر دوبارہ نظر ڈالیں... اور غور کریں کہ عنفوان شباب میں آپ نے تحریک
اسلامی کا دامن کن جذبات اور احساسات اور کن عزائم اور امنگوں کے ساتھ تھاما تھا اور
اب آپ بالکلیہ کن مشاغل و مصروفیات میں منہمک ہیں!.... اپنے اس خط میں بھی میں
نے پوری آیہ مبارکہ درج کر دی تھی اور پھر لاہور واپسی پر "میثاق" کے خوشنویس صاحب

سے اس کی خوشنما کتابت کرا کے بھی ارسال کر دی تھی۔ اور بعد ازاں اس کا چربہ "میثاق" میں بھی شائع کر دیا تھا۔ (اور اب بھی اس کا عکس اس تحریر کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیا جارہا ہے)

مزید بر آں اسی آیہ مبارکہ کے حوالے سے میرے ذہن میں بعض اوقات یہ خیال بھی آتا تھا کہ بعض سابق داعیان و خادمان دین کی مساعی میں ثبات و استقلال کی کمی کا سبب بھی شاید یہی تھا کہ انہوں نے اپنی دعوت و تنظیم کا آغاز نیم پختہ عمر میں کر دیا تھا۔ چنانچہ آغاز تو بلاشبہ ؎ "دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں!" اور ؎ "آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم!" والا تھا لیکن افسوس کہ انجام بھی ؎ "ہو گئے خاک 'انتہا یہ ہے!" سے مختلف نہ ہوا۔

یہی وجہ ہے کہ خود میں نے اس وقت تک ایک "داعی" کی حیثیت سے سامنے آنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اور میں اپنی حیثیت واقعتاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم یا زیادہ سے زیادہ خادم کی سمجھتا تھا اور اس وقت بھی میرے سامنے اصل مسئلہ کسی نئی صورت یا جماعت کے آغاز کا نہیں تھا' بلکہ صرف تعلیم و تعلم قرآن کی ہمہ وقت و ہمہ تن خدمت کے لئے مطب کو بند کر دینے کا تھا لیکن چونکہ یہ بھی بجائے خود ایک بڑا فیصلہ تھا لہٰذا مجھے اس میں تردّد اور تذبذب تھا کہ آیا مجھے چالیس سال کی عمر سے قبل اتنا بڑا اقدام کر گزرنا چاہئے یا نہیں؟

عرفات میں میں نے اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے خصوصی دعا کی اور بار بار دعاء استخارہ کو دہرایا..... لیکن تذبذب میں کوئی کمی نہیں آئی۔ لیکن واپسی پر ایک روز حرم میں بیٹھے ہوئے اچانک دماغ میں بجلی سی کوندی اور دفعتہً یہ خیال دل میں آیا کہ قرآن کی تقویم قمری ہے' اور قمری سال شمسی سال سے دس دن کے قریب چھوٹا ہوتا ہے..... اب جو اپنی عمر کا حساب لگایا تو سارے عقدے ایک دم حل ہو گئے' اس لئے کہ اس وقت شمسی حساب سے میری عمر انتالیس برس سے لگ بھگ ڈھائی ماہ کم تھی..... گویا کہ قمری حساب سے میں تقریباً چالیس برس کا ہو چکا تھا!

لہٰذا اسی وقت آخری فیصلہ بھی کر لیا اور اللہ سے عہد بھی باندھ لیا کہ۔ "پروردگار! میں

ہد کرتا ہوں کہ آج کے بعد سے اپنی توانائیوں یا صلاحیتوں یا اوقات کا کوئی حصہ تلاش
عاش میں صرف نہیں کروں گا...... اور اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت تیری کتاب مبین
ور تیرے دین بر حق کی خدمت کے لئے وقف رکھوں گا...... رہا میری اور میرے اہل و عیال
ی معاش کا معاملہ تو وہ کلیۃً تیرے سپرد ہے'۔

سپردم بہ تو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ کم و بیش را!

(جاری ہے)

ضمیمہ جات

(۱)

اقتباس از تذکرہ و تبصرہ 'میثاق'
بابت دسمبر ۷۲ء

"قارئین 'میثاق' گواہ ہیں کہ دسمبر ۷۰ء کے عام انتخابات میں جماعت اسلامی پاکستان کے چاروں شانے چت ہو جانے کے بعد ہم نے ان صفحات میں کبھی جماعت یا مودودی صاحب کا ذکر تک نہیں کیا۔ سوائے اوائل ۷۲ء میں سقوط مشرقی پاکستان پر بحث کے دوران ایک مختصر سے تذکرے کے جس کی حیثیت بالکل ضمنی تھی!

اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جماعت کی پالیسی سے ہمارا اختلاف ختم ہو گیا بلکہ صرف یہ تھا کہ ایسی عبرتناک شکست اور ذلت آمیز ناکامی کے بعد مزید تنقید "مرے کو ماریں شاہ مدار" کے مترادف ہوتی چنانچہ اس کے باوجود کہ متعدد حضرات نے شدت کے ساتھ تقاضا کیا کہ جماعت اسلامی کی عبرتناک شکست پر مفصل تبصرہ کیا جائے' ہماری غیرت نے یہ بھی گوارا نہ کیا کہ چند سطور اسی طرح کی لکھ دیتے کہ "دیکھ لو! سیاسی معاملات میں ہماری سوجھ بوجھ صحیح ثابت ہوئی یا تمہاری لن ترانی؟" یا کم از کم یہ شعر ہی پیش خدمت کر دیتے کہ۔ ؎

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

اس کے بالکل برعکس ہماری دلی کیفیت، خدا شاہد ہے، تأسف آمیز ہمدردی ہی کی رہی۔ یہاں تک کہ جب مکہ معظمہ میں مودودی صاحب کی اس تقریر کا ریکارڈ سننے میں آیا جو انہوں نے انتخابات میں ناکامی کے فوراً بعد "عذر گناہ" کے طور پر انتہائی معذرت خواہانہ انداز میں کی تھی تو واقعہ یہ کہ دل میں شدید ہمدردی کا داعیہ ابھر آیا تھا اور یہاں تک خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب دوبارہ جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔

اور ہمیں اب اس راز کے افشاء میں بھی کوئی باک نہیں کہ اگر کہیں واقعتاً مودودی صاحب کو یہ توفیق حاصل ہو جاتی کہ وہ بقول علامہ اقبال مرحوم منطق کی ایچ پیچ والی دلیلوں میں مہارت دکھانے کے بجائے "اخلاص و مروت" کی روش اختیار کرتے ہوئے صاف صاف اقرار کر لیتے کہ ہماری بعد از قیام پاکستان کی پالیسی غلط ثابت ہو گئی ہے اور اب ہم دوبارہ اپنے سابقہ طریق کار ہی پر عمل پیرا ہو جائیں گے تو کم از کم راقم الحروف تو اپنے آپ کو جماعت کی رکنیت کے لئے دوبارہ پیش کر ہی دیتا (چاہے جماعت اسلامی کی "بیورو کریسی" اس پیشکش کو ٹھکرا ہی دیتی!) اس لئے کہ دوسرے جتنے بھی معاملات میں راقم کو اختلاف ہی نہیں شدید اختلاف ہے وہ سب مودودی صاحب کے ذاتی افکار و نظریات سے متعلق ہیں۔ جماعت کی پالیسی سے نہیں!"

(۲)

اقتباس از "اسلام اور پاکستان"
شائع شدہ جنوری ۸۳ء

"اس ضمن میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا۔ جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔

لیکن پھر جب اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی اتنا ہی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں طویل عرصے تک مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی لیکن آخر کار اس پر افسوس، ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آ گیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے ..... میری پیش نظر تحریریں چونکہ ان تین ادوار میں سے درمیانی دور سے تعلق رکھتی ہیں لہٰذا ان میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے جس کے لئے میں مولانا مرحوم کے تمام محبّین و معتقدین سے بھی معذرت خواہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر ۷۹ء میں امریکہ میں مولانا سے میری وہ ملاقات ہو جاتی جس کی ایک شدید خواہش لئے ہوئے میں وہاں گیا تھا تو میں ان سے بھی معافی حاصل کر لیتا ..... اس لئے کہ اسی زمانے کے لگ بھگ مجھے ایک اطلاع ایسی ملی تھی جس سے پورا اندازہ ہو گیا تھا کہ مولانا کے دل میں میری جانب سے کوئی تکدر یا رنج نہیں ہے۔ (یہ اطلاع جناب عبدالرحیم ' ڈپٹی چیف مکینیکل انجینئر کراچی پورٹ ٹرسٹ نے دی تھی کہ ایک نجی ملاقات میں جس میں وہ خود موجود تھے مولانا مرحوم نے میرے بارے میں یہ الفاظ فرمائے تھے کہ۔ "اس شخص کے بارے میں مجھے یہ اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی رہے گا دین کا کام کرتا رہے گا!") جس کی تائید مزید مجھے بفلو میں مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کے موقع پر مل گئی جب مولانا کے خلف الرشید ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے معلوم ہوا کہ میری مولانا سے ملاقات کی خواہش یکطرفہ نہ تھی بلکہ ' ان کے الفاظ میں۔ "..... ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن ....." ..... بہرحال یہ میرا اور مولانا مرحوم کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ میدانِ حشر میں جب میں ان سے اپنی تلخ نوائی کی معافی چاہوں گا تو وہ مجھے ضرور معاف کر دیں گے

(۳)

سورۃ احقاف کی جس آیۂ مبارکہ کا حوالہ راقم نے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب کے نام اپنے ۲۶ نومبر ۶۵ء کے خط میں دیا تھا۔ بعد میں اس کی خوشنما کتابت کرا کے اسے ان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور آخری الفاظ حذف کر کے "چالیسویں سالگرہ" کے عنوان سے 'میثاق' میں بھی دوبارہ شائع کیا گیا۔ سامنے کے صفحے پر اصل کتبہ کا عکس دیا جا رہا ہے۔ (اسرار احمد)

أعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم

بسم الله الرحمٰن الرحيم

حَتّٰى

یہاں تک کہ

إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ

جب وہ اپنی پوری پختگی کو پہنچتا ہے

وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً

اور چالیس برس کا ہو جاتا ہے

قَالَ

تو کہتا ہے کہ

رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ

اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیے

وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰهُ

اور ایسے نیک اعمال کروں جو تجھے پسند ہوں

وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي

اور میری اولاد کو میرے لیے بھلائی کا ذریعہ بنا

إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ

میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں ــ اور ــ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں!

(سورۂ احقاف - آیت - ۱۵)

بڑے بھائی کی خدمت میں ● چالیسویں سالگرہ کے موقع پر

منجانب ــــ خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

اعلان داخلہ

قرآن کالج — لاہور

الحمدللہ کہ گذشتہ سال سے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام قرآن کالج کے نام سے ایک نئی تعلیمی اسکیم کا باضابطہ آغاز ہو چکا ہے۔ اس اسکیم کے تحت ایف۔اے، ایف۔ایس۔سی پاس طلبہ کو داخلہ دیا جاتا ہے۔ اور تین سال کے عرصے میں جامعہ پنجاب کے نصاب کے مطابق بی اے کے امتحان کی باقاعدہ مناسب تیاری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے ایک بنیادی نصاب کی تکمیل بھی کرا دی جاتی ہے۔ جس میں عربی زبان کی مضبوط بنیادوں پر تحصیل، پورے قرآن مجید کا ترجمہ اور تعلیم حدیث کے پروگرام خصوصیت کے ساتھ شامل ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں :

- ★ ایف اے، ایف ایس سی اور آئی کام پاس طلبہ سے درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو طلبہ نتیجہ کے منتظر ہوں وہ بھی درخواست دے سکتے ہیں۔
- ★ داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۸۸ء ہے۔ جبکہ داخلہ ٹیسٹ یا انٹرویو ان شاء اللہ اکتوبر کے مہینے میں ہوگا۔ جس کی معینہ تاریخ سے درخواست دہندگان کو مطلع کر دیا جائے گا۔
- ★ ذہین اور مستحق طلبا کے لیے اخراجات میں رعایت کی گنجائش بھی ممکن ہے۔
- ★ بیرونِ لاہور کے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

نوٹ : کالج پراسپکٹس اور داخلہ فارم حاصل کرنے کے لیے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے نام پانچ روپے کا منی آرڈر یا ڈاک ٹکٹ یا پوسٹل آرڈر روانہ کریں۔

المعلن : قمر سعید قریشی، ناظمِ اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن فون : ۸۵۲۶۸۳

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ نشست ۵۴

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۱)

اس سورۂ مبارکہ کا تعارف اور اس کے مضامین کا تجزیہ گذشتہ ماہ کے میثاق میں شائع کیا جاچکا ہے۔ اس شمارے سے اس سورہ مبارکہ کے درس کی اقساط ہدیۂ قارئین کی جارہی ہیں۔

(ادارہ)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۔ (صدق اللّٰہ العظیم)

(ترجمہ) "اے ایمان والو! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت ہے جس کی تلاوت ابھی آپ نے سماعت فرمائی اور اس کا ترجمہ بھی سنا۔ مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے ' اس کا درس نمبر چودہ اس پوری سورۂ مبارکہ پر مشتمل ہے...... ترتیب مصحف کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ جو اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ہے ' ۲۶ویں پارے میں سورۃ الفتح کے فوراً بعد وارد ہوئی ہے...... اگر اس کے مضامین پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات میں جو مضامین آئے ہیں ' یہ پوری سورۂ مبارکہ ان کی مزید تشریح اور توضیح پر مشتمل ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں ربطِ مضمون کے اعتبار سے اس کا جو مقام ہے ' اسے بھی ذہن میں تازہ کر لینا انشاء اللہ مفید ہو گا...... اس منتخب نصاب کا تیسرا حصہ اعمالِ صالحہ کے مباحث پر مشتمل ہے...... اعمالِ انسانی کے ضمن میں پہلے دو دروس میں انفرادی سیرت و کردار سے متعلق قرآن مجید کی رہنمائی ہمارے سامنے آئی تھی۔ اس کے بعد ایک درس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم ہے یعنی گھریلو زندگی ' خاندان کا ادارہ ' عائلی نظام ' اس سے متعلق ہم نے پوری سورۃ التحریم پڑھی تھی...... اجتماعی زندگی میں اس سے بلند تر سطح پر ہماری معاشرتی یا سماجی زندگی کا دائرہ ہے۔ اس کے متعلق ہم نے گذشتہ چار نشستوں میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیا تھا...... اب جو اجتماعیت کی بلند ترین سطح ہے ' یعنی قومی و ملی اور سیاسی و ریاستی زندگی ' اس سے متعلق نہایت اہم مضامین اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہو رہے ہیں ' جس کا مطالعہ ہم اللہ کے نام اور اس کی توفیق سے آج شروع کر رہے ہیں۔

یہ بات میں نے اس سے پہلے بھی ایک موقع پر عرض کی تھی ' آج اسے تازہ کر لیجئے کہ قرآن حکیم اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسی عام طور پر انسانی تصانیف ہوتی ہیں...... انسانی تصنیف میں ابواب ہوتے ہیں۔ پھر ہر باب کا ایک عنوان ہوتا ہے جو اس باب کے مضامین کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر وہ باب ذیلی عنوانات یا فصول میں منقسم ہوتا ہے اور ہر فصل میں بحث کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے ' جبکہ قرآن مجید درحقیقت اس نوع کی کتاب نہیں ہے...... اسے ہم خطباتِ الٰہیہ کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ تعبیر غلط نہیں ہو گی...... نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے دوران مختلف مواقع اور مراحل پر یہ خطباتِ الٰہیہ نازل ہوتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی دعوتِ توحید کو جن حالات ' موانعات اعتراضات

اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آتا تھا' ان کی مناسبت سے حضورؐ کو ہدایات دی جاتی رہیں اور متعلقہ بحثیں نازل ہوتی رہیں..... ان ہی کے ضمن میں وہ دائمی و ابدی رہنما اصول بھی دے دیئے گئے جن پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی استوار دیکھنا چاہتا ہے' لیکن ان کے لئے قرآن حکیم میں غور و فکر اور تدبر لازم ہے..... ان کو معلوم اور اخذ کرنے کے لئے آیات کے بین السطور جھانکنا پڑتا ہے..... سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے یہ چیز معین کرنی پڑتی ہے کہ یہاں کون سے دائمی اور ابدی رہنما اصول ہمیں مل رہے ہیں..... اس پہلو سے اگر غور کریں تو اگرچہ سورۃ الحجرات کے شانِ نزول کے ضمن میں ہمیں روایات ملیں گی' لیکن تفسیر قرآن کا ایک مستقل اصول ہے کہ الاعتبار لعموم اللفظ لالخصوص السبب.......... یعنی قرآن مجید کے فہم کے ضمن میں اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہو گا' نہ کہ اس سبب کا جو کسی خاص واقعہ کے اعتبار سے شان نزول بنا ہے..... اگر اس عموم کو پیش نظر رکھیں گے تو واقعہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی دنگ رہ جاتی ہے کہ ریاست کی سطح پر اس سورہ مبارکہ میں کتنی اعلیٰ ترین اور جامع ترین رہنمائی دے دی گئی ہے..... حالانکہ تصورِ ریاست (CONCEPT OF STATE) انسانی تاریخ کے اعتبار سے ایک جدید تصور ہے' لیکن قرآن مجید نے ریاست کی سطح پر ان دائمی و بنیادی اصولوں کی رہنمائی نوع انسانی کو عطا فرمادی تھی کہ جنہیں اسلامی ریاست میں روبعمل لایا جائے گا۔ ان سب کے لئے بنیادی و اساسی رہنمائی ہمیں اس سورۂ مبارکہ میں مل جاتی ہے۔

اس سورت کو ہم بغرضِ تفہیم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات جان لیجئے کہ یہ تقسیم قطعی تعیین کے ساتھ نہیں ہو گی بلکہ مضامین کی (OVERLAPPING) ہو گی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کے تین حصے ہیں جو تقریباً چھ چھ آیات پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصہ میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کے جو بنیادی اصول ہیں اور جن ستونوں پر یہ عمارت کھڑی ہے' ان کو معین کیا گیا ہے..... دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کو انتشار سے بچانے' امت کی شیرازہ بندی کو قائم و برقرار رکھنے کے ضمن میں آٹھ احکام دیئے گئے ہیں' جن میں ہم دیکھیں گے کہ دو بہت اہم اور بنیادی احکام ہیں اور چھ ان دو کے مقابلہ میں نسبتاً چھوٹے احکام ہیں..... آخری حصہ میں پھر ایک تو یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ کا پوری نوعِ انسانی کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اور ان تعلقات کی بنیادیں کیا ہیں..... ! پھر سب سے اہم مسئلہ یہ زیر بحث آتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں کسی

شخص کو شامل کرنے کے لئے معیار کیا ہے! یا زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اور اساس کیا ہے...... پھر اسی کے ضمن میں ایک اہم مضمون آئے گا جس پر یہ سورۂ مبارکہ ختم ہو گی کہ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے...... ؟ میں نے بطور تمہید ایک اجمالی اور مختصر سا جائزہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا کہ یہ ہیں وہ اہم مضامین جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت پر اپنی نگاہوں کو مرتکز کریں' فرمایا۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (ترجمہ) "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آگے مت بڑھو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو' اور جان رکھو کہ اللہ (ہر چیز کا) سننے والا' جاننے والا ہے" ...... اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ جیسے ایک مسلمان فرد' اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہوتا ہے' اور اس کے لئے مادر پدر آزادی کا کہیں وجود نہیں ہے' ویسے ہی ایک مسلمان معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست بھی مادر پدر آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابند ہے ... اسلام میں آزادی کا تصور یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے لئے ہر نوع کی دوسری غلامی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے یوں ادا کیا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طور سے تعبیر فرمایا مثل المومن ومثل الایمان کمثل الفرس فی اُخِيَّتِهٖ "مومن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے" ...... بڑی پیاری تمثیل ہے۔ ایک گھوڑا تو وہ ہے جس پر کوئی پابندی نہیں ہے' کوئی بندش نہیں ہے' وہ جدھر چاہے منہ مارے' جدھر چاہے زقند لگائے' آزادی کے ساتھ جس طرف چاہے اور جہاں تک چاہے خوب دوڑ لگائے۔ اس کے برعکس ایک گھوڑا وہ ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے...... اب آپ فرض کیجئے کہ دس گز کی ایک رسی ہے جس سے وہ گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا دس گز کے دائرہ کے اندر وہ گھوم پھر سکتا ہے...... اس گھوڑے کو اتنی آزادی ہے کہ وہ جس طرف چاہے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جا کر بیٹھ جائے' مزید آگے جانا چاہے تو چند قدم اور اٹھا لے

لیکن دس گز سے آگے ہرگز نہیں جاسکتا' اس لئے کہ بندھا ہوا ہے...... بقول اقبالؒ ۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تو یہ نہایت بلیغ تمثیل اور تشبیہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی کہ ایک بندہ مومن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام اور اوامر و نواہی کا پابند ہے' وہ بندھا ہوا ہے..... اب ظاہر بات ہے کہ جب مسلمان فرد اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا پابند ہے تو مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ ان سے کیسے آزاد ہو جائے گی! مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ان احکام کی پابندی ضروری ہے میں عرض کر چکا ہوں کہ عائلی زندگی اجتماعیت کی پہلی سطح ہے' معاشرتی زندگی اس سے بلند تر سطح ہے اور سیاسی زندگی یعنی ریاستی سطح پر ہمارے معاملات' یہ اجتماعیت کا بلند ترین تصور ہے۔ پس ہر سطح اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی پابند ہے۔ اگر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ موجود ہے اور ان کی ایک آزاد خود مختار ریاست قائم ہے تو اس کے معاملات میں' اس کے دستور و آئین میں اور اس کے قوانین میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام سے تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہے حقیقی مفہوم اس سورہ مبارکہ کی پہلی آیت کے اس حصہ کا۔ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَ رَسُولِهِ (ترجمہ)...... "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسولؐ سے"۔ یہاں جو لفظ تُقَدِّمُوا' آیا ہے' اس کا لفظی ترجمہ ہو گا "مت آگے بڑھاؤ"۔ اس سے آگے لفظ "اَنفُسَكُمْ" کہ "اپنے آپ کو آگے نہ بڑھاؤ" یا لفظ رأیکُمْ' کہ "اپنی رائے کو آگے مت بڑھاؤ"۔ محذوف ماننا پڑے گا۔

بَيْنَ يَدَيِ اللَّهِ وَ رَسُولِهِ "اللہ اور اس کے رسول سے"...... آیت کا یہ حصہ دونوں محذوف الفاظ کے ساتھ جڑا رہے گا...... مفہوم یہ ہو گا کہ یہ ایک دائرہ ہے...... تمہاری زندگی خواہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو' خواہ اجتماعی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتی ہو' اس دائرے کے اندر اندر محدود رہنی چاہئے۔

اگر آپ غور کریں تو یہ اسلامی ریاست کی سطح پر اس کی حیات اجتماعی اور دستور اساسی کا اصل الاصول ہے' یا یوں کہئے کہ اس کی پہلی دفعہ اس آیت سے معین ہوتی ہے...... اس لئے کہ آپ کو معلوم ہے کہ ریاست کے ضمن میں سب سے پہلی بحث یہ آئے گی کہ حاکمیت (SOVEREIGNTY) کس کی ہے!...... آپ جانتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ

صرف اللہ ہی ہے..... بقول علامہ اقبال مرحوم۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

لہذا مسلم معاشرتی نظریہ (MUSLIM SOCIAL THOUGHT) یا مسلم سیاسی خیال (MUSLIM POLITICAL THOUGHT) میں اساسی و بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ معروف الفاظ سورۂ یوسف کے ہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ یعنی حکم دینے کا اختیار مطلق اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے..... اسی بات کو سورۃ الکھف میں منفی انداز میں یوں فرمایا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ○ "اور وہ اپنے حکم (کے اختیار) میں کسی کو شریک کرنے کے لئے تیار نہیں ہے"..... البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے اصول کا انسانی معاشرہ میں عملی طور پر جو نفاذ ہو گا' وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے واسطہ سے ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ تو غیب کے پردوں میں ہے اس کا حکم سب لوگوں کو براہ راست نہیں پہنچتا بلکہ اس نے اپنے احکام لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنی حکمت بالغہ سے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا جس کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیّین' سیّد المرسلین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم..... لہٰذا حاکمیتِ الٰہیہ کی جو عملی تشکیل ہو گی وہ سورۃ النساء کی اس آیت کے حوالے سے ہو گی کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہیں ان کی"۔ اس آیۂ مبارکہ میں "اَطِيْعُوْا" جو صیغہ امر ہے' دو مرتبہ آیا ہے' اللہ کے ساتھ بھی اور رسول کے ساتھ بھی۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی (صلی اللہ علیہ وسلم)"..... لیکن آگے جب اس اطاعت کی زنجیر کی تیسری کڑی آئی تو فعل امر "اَطِيْعُوْا" کو لوٹایا نہیں گیا بلکہ فرمایا گیا۔ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ "اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں"..... اس اسلوب سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بالذات اور مطلق ہے۔ جبکہ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ' کی اطاعت مشروط ہو گی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرہ کے اندر اندر حکم دے سکتے ہیں' اس کے باہر نہیں۔ اس کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائمی طور پر یہ اصول الاصول معین فرما دیا ہے کہ لا طاعةَ لمخلوقٍ

و معصیة الخالق یعنی کسی ایسے معاملہ میں مخلوق میں سے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی معصیت یعنی اللہ کی نافرمانی آ رہی ہو۔

پس قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے جو احکام دیئے گئے ہیں' ان سب کو جمع کیا جائے تو اس کا جو حاصل نکلتا ہے اسے بڑی جامعیت اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں بیان فرما دیا گیا ہے بایں الفاظ مبارکہ۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (ترجمہ)...... "اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول سے (صلی اللہ علیہ وسلم)" ...... یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ بڑے دستوری' آئینی اور قانونی الفاظ ہیں اس اصل الاصول کی تعیین کے لئے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام امور و مسائل اور معاملات اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر رہیں گے' اس سے تجاوز جائز نہیں ہو گا۔ البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے حسب حالات اور حسب موقع اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں یہ بات اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ اہل لغت و نحو تمام کے تمام اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ "امر" کے مقابلہ میں "نہی" میں زیادہ زور (EMPHASIS) ہے... یعنی ایک یہ کہ حکم دیا جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو" دوسرے یہ کہ بات یوں کہی جائے کہ "اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو" ... تو یہ جو دوسرا انداز ہے' اس میں تاکید کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

پھر یہ کہ ہم اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ الفاظ نہایت جامع (COMPREHENSIVE) ہیں...... یہ الفاظ اس طریقہ سے اس بات کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے جو واضح احکام ہیں' ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکے گا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ ان کے اندر اندر آزادی حاصل ہے جیسے گھوڑے کی مثال کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کو بس اتنی آزادی ہے کہ وہ اپنی رسی کی مقدار کے مطابق ایک معین دائرے کے اندر اندر گھوم پھر سکتا ہے اور جس سمت چاہے اور رسی کی حدود میں رہتے ہوئے جتنے فاصلے پر چاہے جا کر بیٹھ سکتا ہے۔ لہٰذا سورۃ الحجرات کے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک دائرہ کھینچ دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی حیثیت "حدود اللہ" کی ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ البتہ اس دائرے کے اندر اندر تمہیں

اختیار ہے کہ اپنے ریاستی، مملکتی اور انتظامی امور اپنی صوابدید سے طے کر سکتے ہو، اپنے قوانین بنا سکتے ہو۔

لیکن اس کے لئے بھی ایک اصل الاصول سورۃ الشوریٰ میں بیان کر دیا گیا ہے جسے اختیارات کے دائرے میں بہرحال ملحوظ رکھنا ہو گا۔ وہ اصل الاصول یہ ہے کہ۔ وَ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ "اور (اہل ایمان) اپنے معاملات، اپنے کام باہمی مشورے سے چلاتے ہیں" (آیت ۳۸) یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرے کے اندر بھی کسی فرد واحد، کسی خاندان، یا کسی طبقہ یا کسی گروہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قوت نافذہ پر قابض ہو کر اس طرح بیٹھ جائے کہ گویا وہ اصل حکمران ہیں اور بقیہ لوگ صرف ان کی رعیت ہیں کہ جس طرح چاہیں ان پر اپنی مرضی ٹھونس دیں۔ اسلام اس نوع کے Authoritarianism اور Totalitarianism کی یعنی کسی فرد، طبقے، گروہ کی یا خاندان میں اختیارات کے ارتکاز کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی ریاست کے معاملات کو چلانے کے لئے شورائیت کا نظام از روئے قرآن مجید لازم ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں یہ اصل الاصول اور اسلامی نظام حیات کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجتماعی امور جن کے متعلق قرآن و سنت میں کوئی صریح حکم یا ہدایت نہ ہو، مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ البتہ یہاں شوریٰ کی کوئی خاص شکل متعین نہیں کی گئی ہے اور اس کے بارے میں ہمیں قرآن میں کسی دوسرے مقام پر بھی کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ملتا کہ نظام حکومت کیا ہو! ۔ صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو! وحدانی ہو کہ وفاقی ہو! ...... اور اگر عام انتخابات ہوں تو اس کے لئے ووٹ کا حق کسے ہے، کسے نہیں ہے۔ یہ تمام معاملات انتظامی امور ہیں۔ تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے جس سطح پر جو معاشرہ ہو گا، اس کی مناسبت سے لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ کے اصول کے پیش نظر تمام معاملات اس دائرے کے اندر اندر رہیں جو کتاب و سنت نے تمہارے لئے کھینچ دیا ہے۔ اور یہ معاملات باہمی مشورے سے انجام پائیں۔ نظام شورائیت کی کوئی معین شکل نہ دینے کی یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کے دائمی و ابدی اوامر و نواہی اور احکام ساری دنیا کے لئے، ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ہیں لہٰذا شوریٰ کا ایک خاص طریقہ ہر دور، ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لئے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ البتہ شوریٰ کا جو قاعدہ آیت کے اس حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ۔ اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَهُمۡ "(اہل ایمان) اپنے کام باہم مشاورت سے چلاتے ہیں" تو یہ

قاعدہ تین باتوں کا متقاضی ہے ایک یہ کہ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو' ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہئے خواہ وہ براہ راست شریک ہوں' یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے شریک ہوں۔ دوسرے یہ کہ مشورہ آزادانہ' بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہئے۔ دباؤ یا لالچ کے تحت مشورہ لینا مشورہ نہ لینے کے برابر ہے۔ تیسرے یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اتفاق رائے سے دیا جائے یا جسے ان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق حکومت اور اجتماعیت کے تمام معاملات چلائے جائیں۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہم نے قائداعظم مرحوم و مغفور کے الفاظ میں اس لئے حاصل کی تھی کہ ہم ایک آزاد و خود مختار خطہ اس مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو ابدی اصول ہیں ہم اس مملکت کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لئے ایک تجربہ گاہ بنائیں۔ اسے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ اور نمونہ کی ایک اسلامی ریاست بنا کر پوری دنیا کے سامنے پیش کریں......

الحمدللہ ہمارے یہاں "قرارداد مقاصد" میں یہ بات طے ہو گئی کہ "حاکیت مطلقہ اللہ کی ہے"۔ ہم نے پہلی بار اس اصول سے دنیا کو روشناس اور متعارف کرایا۔ اور یہ بات پیش نظر رکھئے کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ کسی آزاد و خود مختار اور ذمہ دار اسمبلی نے (وہ ہماری دستور ساز اسمبلی تھی) اس طریقہ سے ایک اجتماعی فیصلہ کا اعلان و اظہار کیا کہ ریاست میں حاکیت مطلقہ اللہ کی ہے۔ اس کے متعلق ہم گویا یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کی سطح پر یہ کلمہ شہادت تھا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلَ اللّٰهِ جس کا اعلان و اظہار قرارداد مقاصد کے ذریعے سے پوری دنیا کے سامنے ہوا۔ اور میں آج خراج تحسین ادا کرنا چاہتا ہوں اس شخص یا ان اشخاص کو جنہوں نے اس دفعہ کے الفاظ معین کئے ہیں جو ہمیشہ سے دستور پاکستان کے رہنما اصولوں میں شامل رہی ہے

"کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن اور سنت سے متخالف و متضاد اور متصادم ہو"۔

میں نہیں جانتا کہ ان کے پیش نظر یہ آیہ مبارکہ تھی یا نہیں جس کا ہم آج مطالعہ کر رہے ہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ کامل ترین نمائندگی کرتے ہیں اس آیہ مبارکہ کے الفاظ کی لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (ترجمہ)......"مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے"...... اور قرارداد مقاصد کی مذکورہ دفعہ کے الفاظ

ہیں...... دستورِ پاکستان۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ' قرآن مجید ہے...... اگر آپ اس سے آگے نہیں بڑھتے تو اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ آپ اللہ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ' آپؐ کے افعال ' اعمال اور اقوال ہیں...... اگر ہم اس سے آگے نہ بڑھنے کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوا! یہ کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے دائرہ کے اندر رہنے کا عزم کیا ہے...... میرے نزدیک یہ دفعہ اسلامی دستور کی جو بنیادی شرط ہے ' اسے بتمام و کمال اور باحسن وجوہ پورا کرتی ہے۔ بشرطیکہ یہ دفعہ محض رہنما اصول (DIRECTIVE PRINCIPLES) میں نہ ہو بلکہ نافذ العمل دفعات (OPERATIVE CLAUSES) میں شامل ہو...... بدقسمتی سے ہماری کوتاہی یہ رہی ہے کہ اس کو تاحال نافذالعمل دفعہ بنانے کے بجائے صرف رہنما اصولوں میں رکھا گیا ہے...... البتہ موجودہ دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام کی صورت میں یوں سمجھئے کہ اس دفعہ پر عمل کا کسی نہ کسی درجے میں آغاز ہوا ہے اور دورِ جدید میں اسلامی ریاست کے تقاضوں میں سے ایک بنیادی تقاضے کو ناقص شکل ہی میں سہی پورا کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اللہ کرے کہ وہ دن جلد از جلد پاکستان پر طلوع ہو کہ اسلامی ریاست کے جو بھی تقاضے ہیں ان پر بھرپور انداز اور عزم بالجزم سے اقدامات شروع ہوں......

اب آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے ' اس کے ضمن میں اگر آپ حضرات کوئی سوال کرنا یا کوئی اشکال پیش کرنا چاہیں تو اس کے لئے حاضر ہوں۔

سوال و جواب

☆ ...... سوال...... ڈاکٹر صاحب! قرآن مجید کی رو سے انسان اس زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے تو اسے حکم دینے کا اختیار کیوں نہیں ہے......؟۔

○ ...... جواب...... اچھا سوال ہے۔ میں نے جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ یہ تھے کہ حکم دینے کا اختیارِ مطلق اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے ' یہ جو VICEGERENCY یعنی اختیارِ مطلق کا معاملہ ہے یہ صرف اللہ کے لئے ہے...... البتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے انسانوں کو کچھ اختیارات تفویض کئے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم اختیار تو رسولؐ کو حاصل ہوتا ہے۔ وہؐ بھی حکم دیتے ہیں لیکن وہی حکم جو انؐ کو وحی جلی یا وحی متلو یعنی قرآن مجید کے ذریعہ سے

ہے یا جو وحی خفی یا وحی غیر متلو سے دیا جاتا ہے' جس کو ہماری دینی اصطلاح میں سنن رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بصراحت ارشاد باری تعالیٰ موجود ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (ترجمہ) ... "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی در حقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی" (سورہ النساء۔ ۸۰)

پھر اسی سورۃ النساء میں یہی بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر ارشاد فرمائی گئی۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (ترجمہ)..... "اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے" (آیت ۶۴)۔ پھر یہ بات ذہن میں رکھئے کہ جب انسان خلیفہ ہے تو خلیفہ اور حاکم میں یہی تو فرق ہے کہ حاکم کا اختیار مطلق ہوتا ہے کہ وہ جو چاہے حکم دے..... مگر خلیفہ یا نائب کا یہ فرض ہے کہ وہ اصل حاکم کی مرضی کو پورا کرے خلافت یا نیابت (VICEREGENCY) کا تصور یہی ہے۔ البتہ ایک دائرہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے اندر' جو مباحات کا دائرہ ہے۔ اس میں خلیفہ کو اختیار ہے کہ شوریٰ کے مشورے سے جو مناسب سمجھے فیصلہ کرے..... اور اسلامی ریاست کے شہریوں کو ان فیصلوں کی اطاعت کرنی ہوگی۔

مزید بر آں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر اطاعت کے بے شمار دائرے ہیں۔ اولوالامر کے علاوہ والدین' اساتذہ اور مرشدین کی اطاعت ہے' اسی طرح جماعتوں اور جمعیتوں کے امرا کی اطاعت ہے..... بیوی کے لئے شوہر کی اطاعت ہے..... لیکن یہ اور اسی نوع کی دوسری تمام اطاعتیں مشروط ہیں اطاعت بالمعروف کے ساتھ..... اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم سے باہر کسی کی اطاعت نہیں ہے۔

☆ ... سوال..... ڈاکٹر صاحب! آپ نے ترجمہ میں تقویٰ کا لفظ جوں کا توں استعمال کیا ہے .... اس کا کوئی ترجمہ پیش نہیں فرمایا..... تقویٰ کی تشریح کیا ہے! اس پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟۔

○ ... جواب..... تقویٰ کی تشریح اپنی جگہ ایک اہم موضوع ہے۔ تقویٰ کا عام طور پر جو ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرنا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ تقویٰ کے اصل معنی ہیں کسی چیز سے بچنا ..... قرآن نے اس میں یہ اصطلاحی معنی پیدا کئے "اللہ کی نافرمانی سے بچنا ..... اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچنا" یہ ہے تقویٰ کے لفظ کا دین کی اصطلاح میں اصل مفہوم اور یہ مفہوم اس آیت

مبارکہ میں بڑی خوبصورتی سے آیا ہے۔ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدِي اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (ترجمہ)... "اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو اور اس کے احکام کو توڑنے سے بچو"۔ یہی تقویٰ اصل میں وہ جذبہ محرکہ ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی پر کسی مسلمان فرد یا کسی مسلمان معاشرے یا کسی اسلامی ریاست کو آمادہ کرتا ہے۔

حضرات! آج ہم نے سورۃ الحجرات کی پہلی آیت پر کچھ غور کیا ہے۔ یہ مضمون ابھی کئی نشستوں میں چلے گا اور اگلی نشست میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی جو اصلِ ثانی ہے یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی شخصیت۔ انشاء اللہ اس پر گفتگو ہوگی۔

اقول قولی ھذا و استغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

☆☆☆☆☆

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر

حقیقتِ جہاد کے موضوع پر میری آج کی گفتگو در حقیقت تتمہ ہے میری ان تقاریر کا جو حقیقتِ ایمان کے موضوع پر ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ از روئے قرآن ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ایمان حقیقی معنوں میں موجود ہو گا تو جہاد لازماً موجود ہو گا۔ ان دونوں کے مابین ایسا گہرا رشتہ و تعلق ہے کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ چنانچہ ایمان کی حقیقت پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر جہاد کی حقیقت پر گفتگو کو بھی اس میں شامل نہ کیا جائے۔

جہاد کے بارے میں چند مغالطے

جہاد کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں چند در چند قسم کے مغالطے ہیں لہٰذا میں سب سے پہلے انہی مغالطوں کا ذکر کرتا ہوں جن کی وجہ سے جہاد کے بارے میں ہمارا پورا تصوّر مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔

اس ضمن میں سب سے بڑا اور بنیادی مغالطہ یہ ہے کہ جہاد کے معنی جنگ سمجھ لئے گئے ہیں اور لفظ جہاد ذہن میں آتے ہی جنگ کا نقشہ نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جنگ یا قتال اگرچہ بلاشبہ جہاد کی آخری اور تکمیلی شکل ہے لیکن جہاد کے معنی جنگ نہیں ہیں۔ بلکہ جہاد اور قتال کے مابین وہی رشتہ و تعلق ہے جو اسلام اور ایمان کے مابین یا نبوت اور رسالت کے مابین ہے۔ یعنی جس طرح اسلام عام ہے' ایمان خاص ہے اور نبوت عام ہے' رسالت خاص ہے اسی طرح جہاد عام ہے' قتال خاص ہے۔ جنگ کے لئے قرآن مجید کی جو اصل اصطلاح ہے وہ قتال ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ○ "جنگ کرو ان سے یہاں تک کہ فتنہ فرو ہو جائے اور دین کل کا کل اللہ ہی کے لئے ہو جائے"۔

(الانفال۔ ۳۹) اسی عمل کے بارے میں فرمایا۔ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ "تم پر جنگ فرض کر دی گئی اور اب وہ تمہیں ناگوار اور گراں محسوس ہو رہی ہے۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو برا سمجھو درآنحالیکہ اسی میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ کسی چیز سے تم محبت کرو درآنحالیکہ اس میں تمہارے لئے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے"۔ (البقرۃ۔ ۲۱۶) قتال کے بارے میں چوٹی کی آیت سورۃ الصف کی آیت نمبر ۴ ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○
"اللہ تو محبت کرتا ہے اپنے ان بندوں سے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں"۔ تو جنگ کے لئے قرآن مجید کی اپنی اصطلاح ہے قتال۔ جہاد دین کی بہت وسیع اصطلاح ہے۔ اس کا ایک جزو بلکہ ایک تکمیلی مرحلہ قتال ہے۔

جہاد فرض کفایہ یا فرض عین

جہاد اور قتال دونوں کو مترادف اور ہم معنی سمجھ کر لازم و ملزوم جان لینا یہ وہ چیز ہے کہ جس نے پوری سوچ اور پورے نقطۂ نظر کو بنیادی طور پر غلط کر کے رکھ دیا ہے۔ چونکہ ذہن میں جہاد کے معنی جنگ ہو گئے لہٰذا اب بنائے فاسد علی الفاسد کے طور پر جب استدلال کی بنیاد ایک غلط تصوّر پر اٹھے گی تو مزید غلطی ہو گی۔ چنانچہ ہمارے ہاں جس نئی نبوت نے ظہور کیا اس نے تو جہاد کو ساقط ہی کر دیا۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی کا یہ شعر ہے کہ "دین کے لئے حرام ہے اے دوستو قتال"۔ اور جب ذہنوں میں یہ تصور ہو کہ قتال ہی جہاد ہے تو جہاد بھی یکسر خارج از بحث ہو گیا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ یہ ٹھوکر اسی نے کھائی ہے بلکہ جہاد کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں بھی ایک مغالطہ موجود ہے کہ یہ فرضِ عین نہیں، فرضِ کفایہ ہے۔ یہ درست ہے کہ قتال ہر وقت فرض نہیں ہوتا۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کے دوران بھی صرف جنگِ تبوک ہی ایک ایسی جنگ تھی جس میں ہر مسلمان پر یہ فرض کر دیا گیا تھا کہ وہ نکلے۔ اس سے پہلے کبھی بھی نفیرِ عام نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس کے لئے ترغیب دی گئی، شوق دلایا گیا۔ اللہ کی راہ میں گردن کٹوانے کا جذبہ پیدا کیا گیا لیکن اس کو فرضِ عین قرار نہیں دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی کسی جنگ میں نہیں گیا تو اس سے محاسبہ بھی نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہمارے ذہنوں میں جہاد کے بارے میں بھی یہ تصور قائم ہو گیا کہ یہ بھی فرض کفایہ ہے۔

فرضِ عین وہ ہوتا ہے جو ہر حال میں ہر آن فرض ہے۔ نماز فرضِ عین ہے لہٰذا اگر جنگ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آ جائے تو ادا کرنی ہوگی۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

اور اگر کوئی ایسا ہی شدید وقت ہے کہ ساری جماعت کے لئے بیک وقت ادائیگی ممکن نہیں تو صلوٰۃ الخوف کا پورا ایک نقشہ بیان کر دیا گیا ہے کہ آدھی فوج محاذ پر رہے اور آدھی نماز ادا کرے اور پھر یہ جائیں اور دشمن کا سامنا کریں اور جو رہ گئے ہیں وہ نماز ادا کریں۔ اسی طرح اگر بیماری کے باعث وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو۔ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ لیٹ کر پڑھ لو۔ حتیٰ کہ اشارے سے پڑھ لو لیکن یہ وہ فرضِ عین ہے کہ کسی صورت بھی اس سے استثناء نہیں ہے۔ تو یہ فرضیت تو ہم مسلمانوں کے ذہنوں پر بجا طور پر مسلط ہو گئی لیکن ہم نے اپنے ذہنوں میں جہاد کے معنی چونکہ جنگ سمجھے اور جنگ ہر حالت میں فرض نہیں ہے ' لہٰذا جنگ کے متعلق سارے تصورات لفظ جہاد کے ساتھ وابستہ ہو گئے کہ جہاد بھی فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ اصل میں مغالطہ یہیں لاحق ہوا ہے ورنہ یہ بات غلط نہیں ہے کہ جنگ فرضِ عین نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے پورے پندرہ برس کے دوران جنگ ممنوع تھی ' بلکہ جنگ تو بہت دور کی بات ہے مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ قرآن مجید میں ذکر ہے کہ اس وقت کچھ پرجوش لوگ اجازت طلب کرتے تھے اور بار بار کہتے کہ ہمیں بھی اجازت دی جائے کہ ہم بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیں۔ اس وقت ان سے کہا گیا کہ۔ کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ۔ نہیں 'اپنے ہاتھ بندھے رکھو! ماریں کھاؤ ' جھیلو ' برداشت کرو ' یہاں تک کہ تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹا دیا جائے تو لیٹ جاؤ لیکن اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ وہ تو جب اقدام کا مرحلہ آیا تو مدافعت میں ہاتھ اٹھانے اور پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ملی۔ چنانچہ جنگ یقیناً فرضِ عین نہیں ہے۔ وہ تو جب اس کا مرحلہ آئے گا تب ہی فرض ہوگی اور فرضِ کفایہ ہی رہے گی۔ نفیرِ عام کا حکم تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی دے سکتے تھے۔

جہاد ایمان کا رکن ہے

جنگ اور قتال کے تصور کو جہاد کے ساتھ نتھی کر لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دینی تصورات میں جہاد اپنے اصل مقام و مرتبہ سے ہٹ کر صرف ایک فرضِ کفایہ کے درجے میں رہ گیا۔ حالانکہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جہاد ایمان کا رکن ہے۔ اس کو اب آپ اس حوالے سے سمجھئے

کہ ایمان کے دو درجے ہیں۔ ایک قانونی ایمان جس کی بنیاد پر ہم دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اسی کے لئے اصطلاح ہے اسلام۔ اسلام میں ایمان کا "اقرار باللسان" والا جزو شامل ہے۔ یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی گواہی اسلام کا پہلا رکن ہے۔ اس کے ساتھ چار ارکان اور شامل کر لیجئے۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ' تو یہ پانچ ارکان ہو گئے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اب ایمان کے دوسرے جزو "تصدیق بالقلب" کو لیجئے جس کا تعلق حقیقی ایمان سے ہے۔ اس کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کو شامل کیجئے تو یہ ایمان کے دو رکن ہیں۔ یہ بات سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ سے بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ

"یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے نبیؐ ان سے فرما دیجئے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں (یعنی ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے' ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے' ہم نے مزاحمت اور مقابلہ چھوڑ دیا ہے) اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا"۔

اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ اب اگر جاننا چاہتے ہو کہ ایمان اصل میں کیا ہے اور حقیقی ایمان کی کسوٹی اور معیار کیا ہے تو جان لو کہ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا "مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے"۔ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا نے بات واضح کر دی کہ یہاں تصدیق بالقلب والے ایمان کا ذکر ہے اور تصدیق بالقلب بھی ایسی کہ جو یقین کی کیفیت اختیار کر چکی ہو' جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں۔

وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ "اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں"۔ تو یہ ہوئے ایمانِ حقیقی کے دو ارکان...... رکنِ اوّل دل میں یقین اور رکنِ ثانی عمل میں جہاد فی سبیل اللہ۔

اس بات کو سمجھ لینے سے وہ اصل مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ آیا جہاد فرض کفایہ ہے یا فرضِ عین۔ قانونی سطح پر یہ ماننا پڑے گا کہ جہاد فی سبیل اللہ ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے۔ تو جو

ہوئی محض قانونی سطح پر دنیا میں مسلمان کہلوائے جانے پر قانع ہو اور اسے آخرت کی کوئی پروانہ ہو
تو اس کے لئے تو معاملہ بڑا آسان ہے۔ اسے جہاد کا کھکیڑ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔
البتہ جسے یہ تشویش ہو کہ میں اگر مسلمان بنا ہوں تو صرف اس دنیا میں مسلمان کہلوانے کے لئے
نہیں بنا بلکہ مجھے تو اصل میں آخرت درکار ہے ' میرا مطلوب و مقصود تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور جہنم
سے چھٹکارا پانا ہے تو وہ جان لے کہ پھر جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی مفر نہیں ہے۔ اس سے بچاؤ
کی کوئی امکانی صورت اور اس سے کوئی استثناء (EXEMPTION) سرے سے ہے ہی نہیں!
اس لئے کہ اس آیت کے اول و آخر میں حصر کا اسلوب ہے۔ شروع میں انّما کلمۂ حصر ہے۔
اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ ... مومن تو صرف وہ ہیں ' مومن تو بس وہی ہیں۔ یعنی حقیقی مومن تو بس وہی
ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر ' پھر شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے جہاد کیا
اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ۔ آخر میں پھر حصر ہے۔ اُولٰئِکَ ھُمُ
الصّٰدِقُوْنَ ○ بس یہی لوگ ہیں سچے۔ یعنی اپنے دعوائے ایمان میں تو بس وہی لوگ سچے
ہیں جو ان دونوں شرطوں کو پورا کریں۔ دل میں یقین اور عمل میں جہاد۔

جہاد کا مفہوم

جہاد کی اہمیت اور اس کی حیثیت سے آگاہی کے بعد اب ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ جہاد ہے
کیا! سب سے پہلے لفظ جہاد کے لغوی معنی سمجھئے۔ اس کا مادہ (ROOT) جہد (ج ہ د)
ہے۔ لفظِ جہد ہماری زبان میں بالکل صحیح مفہوم میں مستعمل ہے۔ عربی زبان کے بعض الفاظ
ایسے بھی ہیں جو اردو میں آکر اپنے اصل مفہوم کے بجائے دوسرے معنی میں استعمال ہونے
لگے ہیں۔ لیکن لفظ "جہد" اردو میں بھی بالکل اسی مفہوم میں استعمال ہوتا ہے جو مفہوم اس کا
عربی میں ہے۔ یعنی کوشش ' کسی کام کے لئے محنت کرنا۔ لیکن جب یہ باب مفاعلہ میں آتا
ہے تو اس میں دو معنی پیدا ہوتے ہیں۔ دو فریقوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں آکر جہد و
کوشش کرنا اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کرنا۔ عربی زبان میں مفاعلہ کے وزن پر
جو مصدر آتے ہیں ان میں سے اکثر میں یہ دونوں مفہوم ملیں گے۔ مثلاً مباحثہ دو فریقوں کا
آپس میں بحث کا تبادلہ ہے۔ جب ایک وکیل یکطرفہ دلائل دے رہا ہوتا ہے تو اسے بحث کہا
جاتا ہے ' لیکن جب دو فریق آمنے سامنے آکر ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے بحث کرتے
ہیں اور دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مؤقف کو غلط اور اپنے اپنے مؤقف کو درست
ثابت کرنے کے لئے دلائل دیئے جاتے ہیں تو یہ چیز مباحثہ کہلاتی ہے۔ اسی طرح کا فرق قتل

اور مقاتلہ میں ہے۔ قتل ایک یکطرفہ عمل ہے۔ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا' بغیر اس کے کہ دوسرے کا بھی اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ تھا تو یہ قتل ہے۔ البتہ جب دو افراد' دو گروہ' دو فوجیں یا دو جماعتیں ایک دوسرے کے مدمقابل آ جائیں اور دونوں کا ارادہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کا ہو تو اب یہ قتل نہیں رہے گا' مقاتلہ بن جائے گا' مفاعلہ کے وزن پر۔ تو اسی طور پر جہد سے مجاہدہ بنتا ہے۔ جب دو جہدیں ایک دوسرے کے سامنے آ کر باہم ٹکرا رہی ہوں اور دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کے درپے ہوں تو یہ مجاہدہ ہے۔ اسی کو فِعال کے وزن پر جہاد کہا جاتا ہے' کیونکہ باب مفاعلہ کے مصدر فِعال کے وزن پر بھی آتے ہیں۔ مثلاً مقاتلہ اور قتال' مجاہدہ اور جہاد' مجادلہ اور جدال' منافقہ اور نفاق' مفاعلہ کے وزن پر بھی آتے ہیں اور فعال کے وزن پر بھی۔

جہاد کے لئے اگر آپ فارسی میں مترادف لفظ تلاش کریں تو وہ ہو گا کشمکش' بلکہ کشاکش۔ جہد جو یکطرفہ عمل ہے' اس کے لئے بھی ہم نے جو لفظ "کوشش" تلاش کیا تھا وہ بھی اصل میں فارسی کا لفظ ہے جو اردو میں بھی مستعمل ہے۔ دوطرفہ جدّوجہد میں دو فریقوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں کوشش کرنا اور اس میں ہر ایک کو دوسرے کے زیر کرنے کی فکر ہونا "کشمکش" کہلاتا ہے۔ (ویسے اس کے لئے صحیح لفظ "کشاکش" ہے۔ لیکن اردو میں "کشمکش" زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔) تو جو فرق کوشش اور کشمکش میں ہے وہی جہد اور مجاہدہ میں ہے۔ انگریزی میں اس کا مترادف (EQUIVALENT) ہو گا TO STRUGGLE یعنی مقابلے میں موجود مزاحمت (RESISTENCE) سے نبرد آزما ہو کر اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرنا۔ اور یہی کشمکش اور مجاہدہ ہے۔

ہر کوئی کسی نہ کسی راہ کا مجاہد ہے

دوسری بات اب یہ سمجھئے کہ دنیا میں ہر شخص مجاہد ہے۔ جہاد کے مختلف درجات (LEVELS) ہیں لیکن کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو مجاہدہ نہ کر رہا ہو۔ آپ کاروبار میں اپنے کسی قریب کے دوکاندار سے مسابقہ (COMPETITION) کر رہے ہیں۔ گاہک کو اپنی طرف راغب کرنے کے لئے وہ بھی ہر ممکن زور لگا رہا ہے اور آپ بھی لگا رہے ہیں تو یہ مجاہدہ ہی تو ہے۔

حفیظ نے شاہنامۂ اسلام میں اپنی زندگی کے کچھ حالات بھی لکھے تھے۔ آٹھویں جماعت میں میں نے یہ اشعار پڑھے تھے۔ ان میں ایک شعر بڑا پیارا لگا تھا۔

مجھے مسجد سے مکتب کی طرف تقدیر نے کھینچا
تنازع للبقاء کی آہنی زنجیر نے کھینچا

یعنی میری تعلیم کا آغاز تو مسجد سے ہوا تھا لیکن پھر وہ جو بازار گرم تھا RUGGLE FOR EXISTENCE کا اس کی وجہ سے پھر مجھے مسجد کی تعلیم کو چھوڑ کر سکول کی طرف آنا پڑا۔ یہ "تنازع للبقاء" (STRUGGLE FOR EXISTENCE) ڈارون کے فلسفۂ ارتقاء کا بڑا بنیادی نکتہ ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نظریہ درست ہے یا غلط' اس کی رائے میں ارتقاء (EVOLUTION) کا سبب یہ ہے کہ وسائلِ حیات محدود ہیں اور زندہ رہنے کی خواہش رکھنے والے LIVING ORGANISMS کو اس کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کرنا پڑتی ہے۔ اور اس مسابقت کے نتیجے میں "بقائے اَصلح" (SURVIVAL OF THE FITTEST) کے اصول کے مطابق جو اپنے آپ میں ماحول کے ساتھ جتنی مطابقت' ساز گاری اور ہم آہنگی پیدا کر لے گا' اس کے باقی رہنے کے امکانات اتنے ہی زیادہ ہوں گے۔ اور جو ماحول سے ساز گاری اور ہم آہنگی اختیار نہ کر سکے گا' ختم ہو جائے گا۔ جس ORGANISM نے اپنے ماحول سے ساز گاری کے لئے اپنے اندر تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی تو پھر اس کی نسل میں یہ تبدیلی بڑھتی چلی جائے گی اور بڑھتے بڑھتے ایک نئی نوع (SPECIES) وجود میں آ جائے گی۔ تو یہ ہے اس کا ارتقاء کا فلسفہ جس کی پہلی اینٹ تنازع للبقاء ہے۔ یعنی دنیا میں باقی رہنے کے لئے مجاہدہ اور کشمکش ناگزیر ہے۔ یہی مجاہدہ اور جہاد ہر شخص کر رہا ہے۔ ہر کوئی اس بھاگ دوڑ اور کشمکش میں ہے کہ وسائلِ حیات کے حصول میں وہ دوسرے سے بازی لے جائے۔ اسی کے لئے محنت' کوشش اور جدّوجہد ہو رہی ہے۔ راتوں کا جاگنا اور دن بھر کی مشقت اسی کی خاطر ہے۔ یہ مجاہدہ ہم میں سے ہر شخص کر رہا ہے لیکن یہ مجاہدہ فی سبیل النفس ہے۔

جو لوگ اس سطح سے ذرا اوپر اٹھ جاتے ہیں اور جن کا کوئی نظریہ' کوئی آئیڈیل' کوئی فلسفہ اور اپنا کوئی خاص نقطۂ نظر بھی ہو تو انہیں پھر اس کے لئے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص جو وطنیت کا قائل اور وطن کی عظمت کا پجاری ہے وہ وطن کی عزت و عظمت اور سربلندی کے لئے جدوجہد کرے گا۔ اپنے وطن کی سالمیت کے خلاف کوئی دوسرا وطن خطرناک عزائم رکھتا

ہو تو اس سے اپنے ملک کے تحفظ اور بقاء کی خاطر جدوجہد اور کشمکش مجاہدہ فی سبیل الوطن ہو گا۔
ایک شخص قومیت کا پرستار ہے' نیشنلسٹ ہے تو وہ مجاہد فی سبیل القومیہ ہے۔ ایک شخص جو اشتراکیت کا قائل ہے اور اس کی نظر میں یہی اصل نظام ہے' عدل قائم ہو سکتا ہے تو اسی سے ہو سکتا ہے۔ اب اگر وہ مخلص ہے تو جان لڑائے گا' محنت کرے گا' اور مارکسزم کو قائم کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے گا۔ یہ مجاہد فی سبیل الاشتراکیہ ہے۔
اسی طرح ایک شخص ہے جو شرک کا علمبردار ہے' جیسے کہ مکہ کے لوگ تھے۔ ان کا ایک طور طریقہ تھا' ان کی روایات اور رسومات تھیں۔ ان کے اپنے عقائد اور اپنا ایک نظام تھا۔ ان کے اعتبار سے تو حضورؐ باغی تھے جو ان کی آبائی روایات کو توڑنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو مشرکین آبائی روایات کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے وہ بھی مجاہد تھے۔ یعنی مجاہد فی سبیل الشرک یا مجاہد فی سبیل الطاغوت۔ چنانچہ یہ لفظ جہاد قرآن مجید میں ایک سے زائد مقامات پر مشرک والدین کے لئے استعمال ہوا ہے۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا

"اگر تیرے والدین تجھ سے جہاد کریں اس پر کہ تو شریک ٹھہرائے میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو جس کے لئے تیرے پاس کوئی دلیل نہیں (نہ کوئی عقلی بنیاد ہے اور نہ کسی آسمانی کتاب میں اس کی سند ہے) تو ان دونوں کا کہنا مت مان۔" سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو بالکل نوجوان بلکہ نوعمر (TEEN-AGER) تھے۔ باپ بہت پہلے فوت ہو چکا تھا' ماں نے پالا پوسا۔ اب جو نوجوان اس عمر میں حضورؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہا ہے آپ اس کی سعادت مندی کا تصور تو کیجئے۔ کتنا صالح اور سلیم الفطرت نوجوان ہو گا۔ اس کے دل میں اپنی والدہ کا کیا مقام ہو گا اور وہ اس کے حقوق کو کتنا پہچاننے والا ہو گا۔ اس نوجوان کے لئے کتنی بڑی آزمائش اور کتنا کٹھن مرحلہ ہے کہ ماں نے بھوک ہڑتال کر دی ہے کہ اگر سعد اپنے باپ کے دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی نہ پیوں گی اور اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی۔ تو قرآن مجید میں یہ باتیں یونہی کہانیوں کے طور پر نہیں آئی ہیں بلکہ حقائق و واقعات تھے اور اس نوعیت کے مسائل تھے جن پر یہ ہدایات نازل ہوئیں۔

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا

صبر کرو' جھیلو' چاہے ماں تمہاری آنکھوں کے سامنے دم توڑ دے لیکن تمہیں توحید پر قائم رہنا ہے۔ تو یہ جہاد ہے' کشمکش ہے۔ وہ ماں جو ہے مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے۔ اسی طرح

جہل بھی مجاہد تھا' بلکہ وہ تو مقاتل تھا۔ اس نے اپنی ان روایات کے تحفظ کے لئے جنگ لڑی
راپنی گردن کٹادی۔

معلوم ہوا کہ جہاد ایک UNIVERSAL PHENOMENON ہے۔ جہاں
ین ہو گا جہاد ہو گا' یقین نہیں ہو گا تو جہاد نہیں ہو گا۔ مثلاً ایک شخص مارکسسٹ ہونے کا
عویدار ہے لیکن وہ اس کے لئے جہاد نہیں کر رہا' کمیونزم کے لئے قربانیاں نہیں دے رہا'
نت اور بھاگ دوڑ نہیں کر رہا بلکہ کسی سرمایہ دار ملک کے کسی پر تعیش شہر میں آرام سے پاؤں
یلا کر سوتا ہے' وہاں مراعات حاصل کر رہا ہے' سرمایہ داروں کے ساتھ اس کے مراسم ہیں
ر سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ اس کی موافقت ہے تو آپ اس کے بارے میں کیا کہیں گے؟
ں نا کہ جھوٹا اور فریبی ہے۔ اس طرح کے لوگ صرف ذہنی تعیش کے لئے مارکسسٹ
بنے پھرتے ہیں۔ یہ حقیقی مارکسسٹ نہیں ہیں۔ سچا اور مخلص مارکسسٹ تو صرف وہی
گا کہ جو مجاہد فی سبیل الاشتراکیہ ہو۔ صداقت ہو گی تو جہاد لازماً ہو گا۔

اب ذرا آیت قرآنی کی طرف دوبارہ توجہ مرتکز کیجئے۔

ا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○

مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں
ے۔ اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ بس سچے
ہی لوگ ہیں"۔ اپنے دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ ہیں۔ سچا مارکسسٹ صرف وہ
گا جو مارکسزم کے لئے اپنی جان اور مال کھپائے' یہاں تک کہ وقت آنے پر جان کی
ی لگا دے' پھانسی کا پھندا چوم کر گلے میں ڈال لے یا گریبان کھول کر فائرنگ اسکواڈ کے
امنے کھڑا ہو جائے۔ سچا قوم پرست وہ ہو گا کہ اگر وقت آئے تو اپنے قوم و وطن کی خاطر سینے پر
باندھ کر کسی جہاز کی چمنی کے اندر اتر جائے۔ اسے معلوم ہے کہ جب یہ بم پھٹے گا تو اس کے
س طرح پرخچے اڑیں گے کہ کسی کو اس کی ایک بوٹی تک دستیاب نہ ہو گی لیکن وہ مطمئن ہے
اس کی جان کی قربانی سے جہاز تباہ ہو جائے گا اور دشمن کا عظیم نقصان ہو گا۔ وہ واقعتاً سچا قوم
ست ہے۔ تو جہاں سچائی ہو گی' خلوص ہو گا' جہاد لازمی طور پر ہو گا۔

اب ذرا اسی کو آپ اپنے اوپر منطبق کرنے کے لئے تیار ہو جائیں؟ کیونکہ لینے اور دینے
ے باٹ ایک جیسے ہونے چاہئیں' ورنہ بہت بڑی وعید ہے۔ سورۃ المطففین قرآن مجید کی بڑی

اہم مکی سورۃ ہے۔ اس کی ابتدائی آیات یہ ہیں۔

وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا کَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ یُخْسِرُوْنَ ○ ۔ ہلاکت ہے' تباہی ہے' بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو ناپ اور تول میں کمی کرتے ہیں کہ جب ناپ اور تول کر لیتے ہیں تو پورا لیتے ہیں اور جب دیتے ہیں تو کم کر دیتے ہیں۔ آپ اس مارکسسٹ پر جو اپنے نظریئے سے مخلص نہیں ہے بڑے کھلے دل سے اور بڑے دھڑلے سے جو حکم لگاتے ہیں ذرا اسی بات میں اپنے آپ کو تولیے۔ جو شخص غیر اسلامی ماحول میں سانس لے رہا ہو اور اسے بدلنے کی جدوجہد نہ کرے' اس کی زندگی جہاد سے خالی ہو' اس میں وہ کشمکش' وہ بھاگ دوڑ' وہ محنت و مشقت اور وہ ایثار و قربانی نظر نہ آئے جو انقلابِ اسلامی کے لئے لازمی ولابدی ہے تو ذرا اس پر بھی وہی فتویٰ لگایئے کہ جھوٹ موٹ کے مسلمان بنے پھرتے ہیں' صرف ذہنی تعیش کے طور پر اسلام کا نام لیتے ہیں' یہ حقیقی مومن نہیں ہیں۔ سچا مومن تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو اپنی جان اور مال اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے' اللہ کے کلمے کو سربلند کرنے کے لئے' اللہ کے جھنڈے کو اونچا کرنے کے لئے اور اللہ کے احکام کی تنفید کے لئے کھپا رہا ہو۔ "جہاد فی سبیل" کی اصطلاح ہم نے مختلف مثالوں کے ذریعے سمجھی ہے کہ جہاد کسی نہ کسی نصب العین (CAUSE) کے لئے ہوتا ہے۔ تو اللہ کے لئے جو جہاد ہو گا وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو گا۔

جہاد میں مال و جان کی قربانی لازمی ہے

جہاد فی سبیل اللہ کے مختلف مراحل اور مراتب ہیں' جو بعد میں بیان ہوں گے۔ اب یہاں ایک بات یہ سمجھ لیجئے کہ اس جہاد میں' جدوکوشش میں' اس کشمکش میں انسان کے پاس وہی تو چیزیں ہیں جو وہ لگا سکتا ہے۔ ایک اپنا مال اور دوسری اپنی جان۔ چنانچہ کسی بھی نظریئے کو پھیلانا ہو' کسی خیال کی اشاعت مطلوب ہو' کسی پیغام کو دنیا میں عام کرنا ہو تو اس کے لئے اولین چیز تو پیسہ ہے جو صرف ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ جسم اور جان کی صلاحیتیں' قوتیں اور توانائیاں لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ اوقات بھی لگتے ہیں لیکن میں وقت کو تیسری چیز کے طور پر نہیں گن رہا' کیونکہ وقت درحقیقت پیسہ ہی ہے۔ اسی لئے قرآن مجید میں اس کی کہیں علیحدہ وضاحت نہیں ملے گی۔ اس کو کہیں الگ شمار نہیں کیا گیا۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے اور آج کے دور میں آکر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے۔ وقت ہی تو پیسہ ہے۔ (TIME IS MONEY)

وقت کو جب آپ اپنی جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ ضرب دیتے ہیں تو پیسہ بناتے ہیں۔ چنانچہ وقت اب سرمایہ (CAPITAL) ہی کی ایک صورت ہے۔ آپ نے وقت صرف کر کے پیسہ بنایا ہے۔ اگر پیسہ دے دیا تو گویا کہ وقت صرف کیا۔ اور اگر پیسہ موجود ہے تو کسی مقصد کے لئے کسی کی خدمات بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ تو یہ دونوں باہم مبادلہ پذیر اجناس (INTERCONVERTIBLE COMMODITIES) ہیں۔ لہٰذا مال میں وقت کو بھی شامل سمجھئے۔

کسی جدوجہد میں مال کے علاوہ جو چیز درکار ہوتی ہے وہ جسم و جان کی صلاحیتیں' توانائیاں اور قوتیں ہیں۔ قرآن ان سب کو ایک لفظ "نفس" میں جمع کر لیتا ہے۔ چنانچہ جَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ کا مفہوم ہو گا کہ جہاد کرو اللہ کی راہ میں اور اس میں کھپاؤ اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی' اپنے اوقات' اپنی توانائیاں اپنی صلاحیتیں' اپنی قوتیں' اور اپنی ذہنی و عملی استعدادات اس راہ میں لگا دو یہاں تک کہ جب وقت آ جائے تو نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں آ جاؤ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ اگر ایمان کا مقصد معیّن ہو جائے کہ محض قانونی سطح پر مومن و مسلم کہلوانے کے لئے نہیں بلکہ آخرت میں سرخروئی کے لئے مومن بننا ہے اور جہنم سے چھٹکارا پانا ہے تو اس کے لئے جہاد سے مفر نہیں ہے! اس پر سورۃ الصّف کی ان آیات کی طرف ذہن کو متوجہ کیجئے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○

"اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس تجارت کی طرف جو تمہیں عذاب الیم سے چھٹکارا دلا دے؟" اہل ایمان سے یہ سوال کیا گیا۔ پھر آگے اس کا جواب دیا گیا۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت عام ہے کہ سوال کر کے پھر اس کا جواب دینا۔ حضورؐ نے بھی یہ اسلوب کثرت سے اختیار فرمایا ہے۔ مثلاً اتدرون من المفلس؟ "جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟" ۔ سوال کیا' پھر جواب عنایت فرمایا۔ اسی طرح سوال کیا۔ "کیا تم جانتے ہو کہ بندوں کے اللہ پر کیا حقوق ہیں اور اللہ کے بندوں پر کیا حقوق ہیں؟" پھر جواب میں اس کی وضاحت فرمائی۔ تو یہ اسلوب قرآن و حدیث میں بہت عام ہے۔

یہاں سورۃ الصّف میں بھی یہی اسلوب ہے۔ پہلے سوال کیا گیا۔

"کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اس کاروبار کی طرف جس کا نفع یہ ہے کہ عذاب الیم سے چھٹکارا پا جاؤ؟" دیکھئے 'انسانی ذہن کے کس قدر قریب آ کر بات کی گئی ہے۔ کوئی بھی کاروبار ہو اس سے مقصود منفعت ہوتی ہے۔ پھر ہر شخص جانتا ہے کاروبار میں دو چیزیں لگتی ہیں' کچھ سرمایہ اور محنت۔ اس کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ چھوٹی سی چھابڑی کے لئے بھی سو پچاس کی کوئی چیز اور ایک شخص کی صبح سے شام تک کی محنت درکار ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑے کاروبار میں بھی سرمایہ اور محنت دونوں چیزیں کھپتی ہیں تو کچھ منفعت حاصل ہوتی ہے۔ تو کیا تمہیں وہ کاروبار بتا دیا جائے جس کی منفعت دردناک عذاب سے چھٹکارا پا جانا ہے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ "ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر"۔ ترجمہ میں "پختہ" کا لفظ اس لئے بڑھایا گیا ہے کہ خطاب "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے ہو رہا ہے۔ یعنی ان لوگوں سے خطاب ہے جو قانوناً مومن اور مسلم تھے۔ اب ان سے کہا جا رہا ہے۔ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ..... "اللہ اور اس کے رسولؐ پر حقیقۃً ایمان لاؤ"۔ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ "اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ"۔ یعنی ہر کاروبار کی طرح اس کاروبار میں بھی سرمایہ اور محنت 'مال اور جان کھپانا پڑیں گے۔

ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ "یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو"۔ چنانچہ اس بحث کا حاصل یہ ہوا کہ ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ لازم و ملزوم ہیں اور جہاد میں مال اور جسم و جان کی توانائیاں کھپتی ہیں۔

(جاری ہے)

آخرت پر ایمان

محمد غوری صدیقی

دینِ اسلام کی اساس "ایمان" پر ہے اور اس ایمان کے تین بنیادی عناصر ہیں۔

(۱) ایمان باللہ۔ اللہ (یعنی اس کی توحید اور اس کی تمام صفات) پر ایمان۔

(۲) ایمان بالرسالت۔ انبیاء و رسل پر عموماً اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر خصوصاً ایمان جس میں فرشتوں اور کتابوں پر خصوصاً قرآن پر ایمان شامل ہے۔

(۳) ایمان بالآخرۃ۔ مرنے کے بعد (عالم برزخ پر) دوبارہ زندہ ہونے اور یوم قیامت یا یوم حشر پر ایمان جس میں اعمال کی جزا و سزا اور جنت و دوزخ پر ایمان شامل ہے۔ تمام اعمال کی جڑ اور بنیاد یہی تینوں "ایمانیات" ہیں۔ لیکن انسان کو نیک اعمال پر کاربند ہونے کی ترغیب و تشویق دلانے اور مجبور کر دینے والی شے یعنی جذبۂ محرکہ یہی آخرت پر ایمان ہے۔ اگر یوم جزا و سزا پر یقین حاصل نہ ہو تو اللہ کو عالم الغیب اور قادر مطلق اور رسولؐ کو بہترین نمونۂ زندگی تسلیم کرنے کے باوجود انسان نہ نیکی کی طرف راغب ہو سکتا ہے اور نہ بدی سے باز آسکتا ہے۔

تنظیم اسلامی کے رفقاء نے اللہ تعالیٰ کے دین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقۂ انقلاب پر سربلند کرنے اور قائم کرنے کا عزم کیا ہے لیکن ۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس راہ کے مصائب و شدائد جھیلنے اور ثابت قدم رہنے کے لئے آخرت کی بازپرس اور انعامات کا یقین ہونا لازمی ہے۔ اس راہ میں سست روی، تساہل پسندی، بچ بچ کر اور کنارے کنارے چلنے کی روش اس اخروی زندگی پر تذبذب اور بے یقینی کا لازمی نتیجہ ہے۔

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

انسان کی فطرت میں نفع کی طرف میلان اور نقصان سے اجتناب مضمر ہے۔ اس کی تمام تر سعی و

جہد اسی نفع و نقصان کی شرح اور تناسب سے وجود میں آتی ہے۔ اگر آخرت کے نفع و نقصان کی وسعت و ہمہ گیریت، اور اس کی مقدار سمجھ میں آ کر یقین کا درجہ اختیار کر لے تو کوئی وجہ نہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے جانثار صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر چل کر آج کا مسلمان پھر وہی تاریخ نہ دہرائے۔ کہ ۔

دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

اور ۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

"جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ" کا یہ غلغلہ انہی نفوسِ قدسیہ نے بلند کیا تھا جو آج تاریخ میں صحابہ کرامؓ کے نام سے موسوم ہیں جن کا قول تھا کہ اگر جنت اور دوزخ ہمارے سامنے بھی آ جائیں تو ہمارے ایمان میں مزید کوئی اضافہ نہ ہو گا کیونکہ یقین کی آنکھوں سے ہم ان کو پہلے ہی دیکھ رہے ہیں۔

اعمال کے لوازم اور نتائج...... جس طرح دنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کے اعمال کے بھی کچھ اثرات و لوازم ہیں جو ان سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ جس طرح سنکھیا سے اس کا زہریلا پن، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت دور نہیں کی جا سکتی اسی طرح غرور و خاکساری، بخل و فیاضی، انتقام و درگزر، شجاعت و بزدلی اور ایمان و کفر سے اُن کے لازمی اثرات و نتائج دور نہیں کئے جا سکتے۔ ہر عمل کا ایک اپنا اثر اور نتیجہ ہے۔ یہی اثر اور نتیجہ اعمالِ نیک و بد کرنے والوں کو آخرت میں دے دیا جائے گا۔ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ، ۲۸) جو کچھ تم کرتے تھے آج وہی بدلہ میں پاؤ گے۔ گویا جزا و سزا در اصل ہمارے ہی نیک و بد اعمال کے ردّ عمل کا نام ہے۔ قرآن میں ایک اور جگہ ہے۔ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى (طٰہٰ، ۱۰) تاکہ ہر جان (انسان) کو اس کا بدلہ دیا جائے جو اس نے کیا۔ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (النحل ۳۴) پس ان کے برے کام اُن پر پڑے اور ان کا مذاق اڑانا ان پر الٹ پڑا۔ غرض یہ کہ آخرت کی جزا و سزا ان ہی دنیوی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔

حصول عیش و راحت کا اصول...... فطری قانون جس کا ہم سب خود اس دنیوی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں یہ ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اُسی وقت بچ سکتے ہیں جب اُس کی خاطر چھوٹی چھوٹی تکالیف برداشت کریں اور بڑی خوشی کو اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب اس کے لئے چھوٹی چھوٹی خوشیاں قربان کریں۔ قرآن کریم میں دنیا کو عاجلہ (جلد ملنے والی) اور موت کے بعد کی زندگی کو آخرۃ (بعد میں آنے والی) کہا گیا ہے۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی کچھ چیزیں جلد مل جاتی ہیں اور کچھ کے لئے انتظار اور صبر کرنا پڑتا ہے۔ پست خیال اور کم ہمت لوگ فوری فائدوں کو ترجیح دے کر دنیا کے دیرپا اور بڑے فائدوں سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن بلند ہمت و عالی حوصلہ لوگوں کا طرز عمل اس کے برخلاف ہوتا ہے۔ فاتح اور کشور کشا اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالتے ہیں تاکہ سلطنت اُن کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ کل کو دولت میں کھیلیں۔ کسان اپنی گندم کا بیج آج مٹی میں ملا دیتا ہے تاکہ کل کو اس کی کوٹھیاں دانوں سے بھر جائیں۔ ہر مذہب و ملت کا انسان اپنے بچے کو بیس پچیس سال تک تعلیم و تربیت اور مشق و امتحان کی بھٹی میں خوشی خوشی جھونک دیتا ہے تاکہ دنیا میں اس کی آئندہ زندگی راحت و مسرت میں بسر ہو۔ یہ انسان اس لئے کرتا ہے کہ اس کو یہ دنیا میں ہوتا نظر آتا ہے اور اس کو اس پر یقین ہو چکا ہے۔ اگر یہی یقین آخرت پر اور جنت و دوزخ پر ہو جائے تو ہم یقیناً جنت کے لئے (جو کہ رضائے الٰہی کا انعام ہے) اس دنیا کی ہر تکلیف اور ہر نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں گے اور دوزخ سے (جو اللہ کی ناراضگی کی سزا ہے) بچاؤ کی خاطر اس عارضی دنیا کا ہر نفع، لذت اور عیش و راحت قربان کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لیکن یہ صبر و استقامت سے ہی ممکن ہے۔ بفحوائے قرآن کریم:

وَ جزٰاھُمْ بِمَا صَبَرُوْا (الدھر) اور اللہ نے ان کو صبر کرنے پر مزدوری عطا فرمائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

حفّت الجنّة بالمكاره وحفت النّار بالشّهوات

جنت کے گرد دنیاوی تکالیف اور ناگوار چیزوں اور جہنم کے گرد لذات دنیا اکٹھی کر دی گئی ہیں۔

وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ○ (النازعات)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا تو جنت اس کا ٹھکانہ ہو گی۔

آخرت کی صداقت کے برحق ہونے کے دلائل...... قرآن حکیم نے قیامت اور مرنے کے بعد دوسری زندگی پر نفس لوامہ کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ "وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ" ○

"اور نہیں (تمہارا انکار قیامت غلط ہے) میں نفس لوامہ کو (قیامت پر) گواہ کے طور پر پیش کرتا ہوں"۔ نفس لوامہ انسان کی وہ باطنی حقیقت ہے جس کو ضمیر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو کہ نیکی کی ترغیب دیتا ہے اور برائی پر ٹوکتا ہے۔ انسان کے اندر نیکی اور بدی کی پہچان رکھی گئی ہے بفحوائے الفاظ قرآنی۔ "فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا" اب نیکی اور بدی کا نتیجہ بھی لازماً نکلنا چاہئے ورنہ انسان کو ان کا شعور دینا لاحاصل قرار پائے گا۔

چونکہ دنیا میں نیک و بد اعمال کے نتائج یا تو نکلتے نہیں یا اعمال کے تناسب سے نہیں نکلتے بلکہ اکثر اوقات نیکی و اصول پرستی کا نتیجہ الٹا مصیبتوں' تکالیف اور تنگی و ترشی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بے اصول' بدکار' اور جھوٹے کاروبار میں ملوث لوگ یہاں عیش کرتے اور بظاہر نعمتوں میں کھیلتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ عقل سلیم کا تقاضا ہے کہ عدل و انصاف کی خاطر دنیائی زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہئے جہاں ان اعمالِ نیک و بد کے تناسب سے ان کے نتائج نکلیں۔ اگر آخرت نہ ہو تو نیک و بد برابر ہو جائیں گے اور قرآن میں اللہ تعالیٰ اس کی نفی اس طرح کرتے ہیں۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○ (القلم)

کیا ہم مسلمانوں (فرمانبرداروں) اور مجرموں کو ایک جیسا کر دیں گے تم کو کیا ہوا ہے کیسا فیصلہ کرتے ہو ——— اور اگر ایسا ہو تو یہ پوری کائنات اندھیر نگری' چوپٹ راجہ قرار پائے گی۔ قرآن کریم میں اس کائنات کی تخلیق کے مقصد کے متعلق ارشاد ہے۔ اس کائنات میں تو ایک ذرہ بھی بیکار نہیں ہے۔

چنانچہ انسان اور انسانی اعمال کیسے بیکار اور بے نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ دنیا کے ان ہی انسانی اعمال کے نتائج کے ظہور میں آنے کا دوسرا نام آخرت ہے۔

اب اس دنیا کی ہر چیز محدود ہے۔ اس کی زندگی مختصر' اس کی لذتیں عارضی' اس کی کلفتیں اور تکالیف محدود ہیں۔ یہاں کسی کو اس کے جرم کے مقدار و معیار کے مطابق سزا دی

نہیں جا سکتی۔ ہٹلر، چنگیز خان جن کی وجہ سے کروڑوں بندگانِ خدا خاک و خون میں تڑپے،
سانیت جن کے جرائم و اعمالِ بد کی وجہ سے آج تک سسک رہی ہے۔ دنیا میں ان کو کیا اور
تنی سزا دی جا سکتی تھی۔ آخرت کی لاانتہاہی اور نہ ختم ہونے والی زندگی میں دنیا کے یہ عارضی
ر محدود قوانین نہ ہوں گے۔ از روئے قرآن:

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، عنقریب ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے۔ جیسے جیسے ان کی کھالیں جلتی جائیں گی ہم ایک نئی کھال پیدا کر دیں گے تاکہ وہ عذاب چکھتے رہیں۔" (النساء۔ ۵۶)

ی سلسلۂ عذاب کبھی ختم نہ ہو گا۔ دنیا میں کھال جل جانے کے بعد تکلیف کا احساس بوجہ
بے ہوشی یا موت ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں موت بھی نہ ہو گی۔

دوبارہ زندگی کے ناممکن ہونے کا اعتراض کم عقلی کی نشانی ہے۔ جب اللہ نے انسانوں کو
لی مرتبہ پیدا کر دیا تو دوسری مرتبہ کیا مشکل ہے۔ ویسے بھی کسی چیز کو پہلی مرتبہ بنانا مشکل اور
دسری مرتبہ بنانا آسان ہوتا ہے۔ اسی واسطے دلیل کے طور پر فرمایا گیا۔
فعیینا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ (ق) کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے کے بعد عاجز آ گئے ہیں؟

جہاں تک جنت اور دوزخ کا تعلق ہے۔ تو جس خدا نے چاند، سورج اور ان سے
روڑوں گنا بڑے ان گنت سیارے بنائے، اس کے لئے دوزخ جنت بنانا کیا مشکل ہے۔

پھر یہ کہ "انسان نے اس دنیا کی زندگی میں جتنے عمل کئے ہیں ان سب کا ریکارڈ محفوظ ہے
ور وہ حشر کے دن پیش ہو گا"۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس کا ثبوت آج ہم کو اس دنیا میں بھی مل
رہا ہے۔ ہم کیمرہ سے حرکات اور ٹیپ ریکارڈر سے آوازوں کو محفوظ کر کے جب چاہتے دیکھ
ور سن سکتے ہیں تو اللہ کے لئے تو یہ کہیں زیادہ آسان ہو گا۔

مؤمنین کا صبر و ثبات...... مومن کو جو کچھ دنیا میں ملتا ہے جب تک اس کو اللہ کے
حکام کے مطابق لگا کر کھپا نہ دے حقیقی مومن شمار نہیں ہو سکتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ
(التوبہ)

بے شک اللہ نے مؤمنین کے جان اور مال خرید لئے ہیں جنت کے بدلے میں۔

سورۃ العصر میں تمام بنی نوعِ انسان کے خسارے کا بیان ہوا ہے۔ اور اس خسارے سے
بچنے کے لئے جو چار اوصاف بیان ہوئے ہیں ان کے حامل انسان دنیا میں قربانیاں دیتے اور

تکالیف و مصائب جھیلتے جھیلتے موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں اور حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

"زمانہ گواہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان یقیناً تباہی و ہلاکت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے نیک اعمال کیے۔ حق و صداقت کی دعوت مل جل کر دی اور مل جل کر صبر کی ایک دوسرے کو تلقین کی"۔

یقیناً اس سورۃ مبارکہ میں موت کے بعد آنے والی زندگی کی کامیابی کی شرط اول "صبر و استقامت" بیان ہوئی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیاں اور مصائب و شدائد جو آپؐ کی پوری زندگی پر محیط ہیں روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔

حضرت سمیہؓ کو قبولِ اسلام کی پاداش میں ابو جہل ظالم نے نازک مقام پر نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ دنیا میں ان کو کیا ملا۔ یقیناً اُن کا اجر آخرت میں محفوظ ہے۔ حضرت بلال حبشیؓ غلام تھے اور ان کا آقا دین توحید پر ڈٹے رہنے کی پاداش میں انہیں ننگے بدن مکہ کی سنگلاخ تپتی ہوئی زمین پر گرمی کے موسم میں رسی باندھ کر اس طرح گھسیٹتا تھا جس طرح مردہ جانوروں کو بھی نہیں گھسیٹا جاتا۔ لیکن انہوں نے اس دنیا کی تمام تکالیف کو آخرت کی کامیابی کے پیش نظر برداشت کیا۔ حضرت حباب بن ارتؓ کو سلگتے انگاروں پر ننگی پیٹھ کے بل لٹا کر اوپر سے سل رکھ دی جاتی تھی۔ چربی پگھل کر انگاروں کو بجھا دیتی تھی لیکن انہوں نے دل میں روشن نورِ ایمان کی شمع کبھی بجھنے نہ دی۔ ان آخرت کی کامیابی کی خاطر جو کہ رضائے الٰہی کا پیغام ہے۔ حضرت یاسرؓ کے چاروں ہاتھ پاؤں چار سانڈھ اونٹوں کے ساتھ رسوں کے ذریعے باندھ کر مطالبہ کیا گیا کہ محمدؐ کا ساتھ چھوڑ کر آبائی دین میں واپس آ جاؤ تو نہ صرف جان بخشی کر دی جائے گی بلکہ عزت و آرام اور آسائشیں مہیا کر دی جائیں گی۔ اس مردِ مجاہد نے دین حق پر ثابت قدم رہ کر اپنے جسم کے چار ٹکڑے کروا لئے انہوں نے دنیا کی زندگی اور عیش و نشاط پر کس کو ترجیح دی؟ یقیناً آخرت کی کامیابی کو۔ حضورؐ نے حضرت حرامؓ کو ایک نامۂ مبارک دے کر جس میں اسلام کی دعوت تھی عامر بن طفیل (جو کہ بنی عامر کا رئیس تھا) کے پاس بھیجا۔ اس کو اسلام سے سخت عداوت تھی۔ اس نے والا نامہ کو پڑھا بھی نہیں اور ایک نیزہ حضرت حرامؓ کو ایسا مارا جو سینہ سے پار اتر گیا اس وقت ان کی زبان سے وہ جملہ نکلا جو کہ تاریخ میں داستانِ عزیمت کا ایک باب رقم کر گیا' کہ فزتُ برب الکعبۃ "رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کون سی کامیابی تھی جو اُن پر روشن ہوئی؟ یقیناً آخرت کی کامیابی۔

ایک موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔
"خدا کی قسم تم لوگ جلد گھبرا گئے ہو۔ تم سے پہلی مسلمان امت میں ایسا بھی ہوتا رہا کہ کسی مومن کو پکڑ کر زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور سر پر آرا چلا کر جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ گڑھوں میں آگ دہکا کر مومنوں کو زندہ جلا دیا جاتا تھا۔ مومنوں کو لٹا کر لوہے کے کنگھوں سے زندہ حالت میں ہڈیوں پر سے گوشت کھرچ لیا جاتا تھا اور وہ دین پر قائم رہ کر یہ سب کچھ برداشت کر جاتے تھے"۔ ان مومنین کا اجر بھی یقیناً آخرت کی زندگی میں ہی ملے گا۔

تاریخ انسانی انبیاء و رسل اور ان کے پیرو کاروں، صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین، اولیائے کرام اور دیگر مصلحین و مومنین کی داستان ہائے عزیمت سے بھری پڑی ہے جو کہ اسی ایک نکتۂ ایماں کی تفسیریں ہی تو ہیں یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت اور آخرت پر یقین۔ ان حضرات کی تمام تر سعی و جہد کا مرکزی نقطہ آخرت کی زندگی کو بنانا اور سنوارنا تھا۔ ان حضرات نے دنیا سے جو ملا، اس کو ایمان، عملِ صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی منزلوں سے گزرتے ہوئے لگا دیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ جس وقت ایمان لائے بہت کامیاب تاجر تھے۔ چالیس ہزار دینار پر مشتمل سرمایہ موجود تھا۔ یہ سب دعوتِ حق کی راہ میں برف کی طرح پگھل گیا۔

بقیہ : عرضِ احوال

ہو سکتا کہ پانچ پانچ دن تک پوری قوم ہذیانی کیفیت کا شکار رہتی ہے۔ خدارا اس کھیل کو دیس نکالا دے دیں۔ بہر کیف میرا یہ مشورہ صدا بصحرا ثابت ہوا اور کرکٹ کے معاملے میں ان کی پالیسی جوں کی توں برقرار رہی۔ اس حد تک مجھے بھی ان سے شکایت نہ تھی۔ لیکن بعد میں ایک عرب اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے اس واقعہ کا تذکرہ انہوں نے جس انداز میں کیا وہ خلاف واقعہ ہی نہیں انتہائی توہین آمیز بھی تھا۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں اسے یوں بیان کیا کہ میں اتفاقاً اس مسجد میں نماز کے لئے چلا گیا جہاں ڈاکٹر اسرار احمد نماز پڑھاتے ہیں۔ نماز کے بعد انہوں نے مجمع لگالیا اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں کرکٹ پر پابندی لگادوں۔ ظاہر بات ہے کہ صدر صاحب کا بیان بالکل خلاف واقعہ تھا۔ قدرتی طور پر مجھے ان کے طرز عمل پر شدید رنج ہوا۔ لیکن اس ایک واقعے کے علاوہ میری معلومات کی حد تک انہوں نے پبلک میں میرے خلاف اور کوئی بات نہیں کی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آج اس واقعے کا ذکر میں نے صرف اس اعتبار سے کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس زیادتی پر میں نے انہیں صاف دلی سے معاف کیا اور آخرت میں اللہ کے ہاں اس زیادتی پر ان کا محاسبہ نہیں کروں گا۔

آخر میں آپ سے میری استدعا ہے کہ ملک و ملت کے نازک مسائل پر سنجیدگی سے سوچئے۔ یہ ہماری قومی ذمہ داری بھی ہے اور دینی بھی۔ اس لئے کہ ہمارے ملک کی جڑ اور بنیاد صرف اور صرف اسلام پر قائم ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ پورے عالم اسلام اور خصوصاً برعظیم پاک و ہند میں اسلام کا مستقبل پاکستان کے ساتھ وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح رخ پر سوچنے اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

قافلۂ انقلاب اسلامی، قدم بقدم (۲)

قاضی ظفر الحق

تحریکِ نور بدیع الزمان سعید نورسی

آغاز و ارتقاء...... بدیع الزمان سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ ایک سیماب صفت اور بے قرار روح کے حامل فرد تھے اور ان کی بچپن سے لے کر وفات تک کی تمام زندگی از حد پرہنگام اور شوریدہ تھی۔ تاہم وہ رسائل اور وہ تحریک جس نے انہیں ایک تاریخ ساز شخصیت بنا دیا' ان کی زندگی کے آخری پینتیس سالوں کا ثمر ہیں۔

۱۹۲۲ء میں جب سعید نورسی علیہ الرحمۃ مجلس کبیر ملی کی افتتاحی تقریب میں شریک ہوئے اور وہاں ترکوں کی کامیابی کے لئے دعا کی تو آپ یہ دیکھ کر نہایت غمگین ہوئے کہ ارکان مجلس میں اسلامی شعائر سے نفور پایا جاتا ہے۔ آپ نے ایک بیان مجلس کے نام لکھ کر کاظم قرہ بکر پاشا کو تھمایا اور خود مجلس سے تشریف لے گئے۔ آپ کے بیان میں اخروی تذکیر اتنی مؤثر تھی کہ مجلس کے ایک سو ساٹھ ارکان نے وہیں اسلامی زندگی بسر کرنے اور پابندی سے نماز پڑھنے کا عہد کیا۔ اس واقعہ سے مصطفیٰ کمال کو تو آگ لگ گئی اور وہ آپ سے الجھ پڑا۔ آپ نے اسے اس کی بداعمالیوں اور آزادروی پر سرزنش کی۔ پھر بددل ہو کر انقرہ سے چلے آئے اور مشرقی ترکی کے ایک گوشہ ' وان' میں عزلت گزیں ہو گئے۔ عملی اور ملکی سیاست سے آپ کو نہایت وحشت ہو چکی تھی چنانچہ آپ نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام کی بنیاد ایمان ہے اور اسلامی زندگی کے احیاء کے لئے ایمان کا ہمہ گیر احیاء ضروری ہے اور اس کا ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ چنانچہ وان میں آپ نے گردو نواح کے نوجوانوں کو جمع کیا اور انہیں قرآن حکیم کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ آپ کی تعلیم کا انداز اتنا مؤثر تھا کہ جلد ہی طلباء کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور یہ اضافہ یہاں تک بڑھا کہ حکومت نے پریشان ہو کر آپ کو اور آپ کے چند ساتھیوں کو گرفتار کر لیا۔ آپ کو آٹھ سال کے لئے برلا جیل بھیج دیا گیا۔ تحریک نور کا پودا جو آپ وان میں لگا چکے تھے' اب اپنے قائد اور اس کے روح پرور اور ایمان افروز دروس سے محروم ہو چکا تھا۔ مگر جیل کی دیواریں اس مرد عظیم تر کا راستہ نہیں روک سکتی تھیں۔ سعید

نورسی کے سینہ سے نکلنے والا ایمان کا سیلاب جلد ہی پہرے داروں کے دل کے بند دروازوں پر دستک دینے لگا۔ سعید نورسی علیہ الرحمۃ نے انہیں پہرے داروں کو ایمان کی ترسیل کا ذریعہ بنالیا اور قرآن حکیم کی آیات و سور کی تفسیر پر مبنی نور کی شعاعیں خطوں اور رسالوں کی صورت میں جیل سے نکل کر ظلمت کدۂ ترکی کو روشن کرنے لگیں۔ طلبۂ نور نے اس نورِ ایمان کو ہاتھوں سے نقل کر کے گھر گھر پہنچانا شروع کر دیا کیونکہ پریس میں ایسا "خطرناک" مواد چھپنا ممنوع ہو چکا تھا۔ بعض نوری طلبہ نے اس سلسلہ میں نہایت حیرت انگیز قربانیوں کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے خود کو اپنے استاد کی طرح تنہائی میں قید کر لیا اور ان رسالوں کی نقلیں تیار کرنے لگے یہاں تک کہ کئی کئی سال گھروں میں بند رہ کر بتادیئے ان کی انگلیاں جواب دے گئیں اور ان پر قلموں کے انمٹ نشانات قائم ہو گئے جو یقیناً آخرت کا بڑا سرمایہ ہیں۔

اس دوران حکومت چھاپے مارتی' طلبہ کو گرفتار کرتی اور مقدمہ پر مقدمہ قائم کرتی رہی یہاں تک کہ سعید نورسی علیہ الرحمۃ کی وفات تک حکومت ان پر تیس سالہ عرصہ میں ۴۳۴ بار خفیہ تحریک چلانے' تختہ الٹنے کی سازش کرنے' اصلاحات کی مخالفت کرنے اور دیگر بے سروپا الزامات کے تحت مقدمے چلا چکی تھی۔ مگر حکومتوں کی یہ ساری تگ و دو بادۂ الست کے مے خواروں کی گرمئ ذوق اور تپشِ شوق کے آگے ہار گئی۔ مہ و سال کی گردش کے ساتھ ساتھ تحریکِ نور دیہاتوں' شہروں' کارخانوں قدیم مدرسوں جدید د جامعات' سرکاری دفاتر یہاں تک کہ فوجی اور نیم فوجی اداروں تک وسیع ہوتی چلی گئی۔ ثروت صولت صاحب کے کہنے کے مطابق یہ تحریک نورسیؒ کی وفات تک دس لاکھ نفوس کو اپنا گرویدہ کر چکی تھی۔

مشہور مقولہ ہے کہ انقلاب دیواروں میں بند نہیں رہتا۔ چنانچہ ایمان کا یہ سیلاب اور کایہ پلٹنے والا یہ انقلاب دیگر اسلامی تحریکوں کے برعکس' جو مسلم معاشروں یا ملکوں میں پھیلیں' یورپ و امریکہ کی طرف بڑھنے لگا۔ آج یہ تحریک جرمنی میں نور انسٹی ٹیوٹ کے نام سے کام کر رہی ہے' جہاں ثروت صولت صاحب کے بیان کے مطابق تمیں دینی مدارس میں رسائلِ نور کی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔ امریکہ میں بھی ترک طلبہ نے ایک ماہنامہ انور جاری کیا ہے' جو ۱۹۷۴ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور وہاں بھی انہوں نے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا ہے' جس کے زیر اہتمام استاذ محترم کی تصانیف اور رسائل کی یورپی زبانوں میں اشاعت ہوتی ہے۔

طلبۂ نور کے کام کا طریقہ...... دنیائے اسلام میں اس وقت جتنی بھی تحریکیں احیائے

اسلام اور تجدیدِ دین کا کام کر رہی ہیں' سب کی سب مخصوص ہیئتِ تنظیمی اور طریقِ کار رکھتی ہیں' سوائے نوری تحریک کے۔ جس کے بانی سیاست سے سخت متنفر تھے اور انجمن سازی کو سیاست ہی کا ایک شاخسانہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ تحریک نور کا مطالعہ کرنے والے کو یہ چیز ورطۂ حیرت میں غرق کر دیتی ہے کہ اس کانہ تو کوئی امیر ہے نہ مامورین' نہ دستور ولائحہ عمل ہے اور نہ ہی دفاتر و مراکز۔ بانیٔ تحریک کے الفاظ میں یہ تحریک دلوں سے خطاب کرتی ہے اور دلوں میں ہی اس کا قیام ہے۔ لیکن حیرت اس وقت دو چند ہو جاتی ہے' جب مختلف معاملات میں طلبہ نور ہم آہنگ و یک سوئے عمل ملتے ہیں۔ یہ یقیناً استاذ نورسی علیہ الرحمۃ کی معجز نما تربیت کا اثر ہی ہے کہ بلا انجمن کے اس تحریک کی فتوحات نہایت سریع اور شاندار ہیں۔ نور طلبہ ترکی میں اسلامی کتب کی اشاعت و ترجمہ کی تحریک کے روحِ رواں ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے قدیم ترکی زبان میں لکھا گیا اسلامی لٹریچر بھی جدید ترکی میں منتقل کروایا اور کیا ہے اور عصرِ حاضر کے مفکرینِ اسلام کی کتب بھی نہایت ذوق و شوق سے ہاتھوں ہاتھ لی ہیں اور ہر طرح سے ان کی پذیرائی کی ہے۔ اس طرح گویا دورِ جدید کا وہ ذہن جس نے لاشعوری طور پر اسلام سے پسپائی اختیار کر لی تھی' اب نوری طلبہ کی اس جدوجہد کے نتیجہ میں' ایک بار پھر رجوع الی اللہ کے حیات بخش عمل میں شریک ہو چکا ہے۔

نوری طلبہ دعوت و تبلیغ کے ضمن میں جہاں کتب اور رسائل کا جدید ہتھیار استعمال کر رہے ہیں وہیں وہ اسلامی جذبہ کے فروغ کے لئے مساجد' امام و خطیب' انسٹی ٹیوٹ کے قیام اور تبلیغی و دعوتی مہموں کے اہتمام کا بھی بندوبست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نور طلبہ باقاعدگی سے اجتماع کرتے' سالانہ استاذ مرحوم کی برسی مناتے اور مجالس ذکر و فکر' درسِ قرآن' دعائیہ مجلسوں کا انعقاد اور رسائلِ نور کی تعلیم کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔

استاذ مرحوم کی برسی کے موقع پر یہ سب کچھ جمع ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی اس اجتماع میں تعداد بیس بیس ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

تحریکِ نور کا سیاسی مسلک...... طلبۂ نور کے خود غیر سیاسی ہونے سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا صحیح نہیں ہو گا کہ وہ ملک میں ہونے والی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ سے بالکل ہی لاتعلق رہتے ہیں' کیونکہ سیاسی تبدیلیوں کا اب تک جس جماعت پر براہِ راست اثر سب سے زیادہ پڑتا ہے وہ نوری ہی ہیں۔ ترکی کی سیاست پر نظر رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ ترکی سیاست میں امریکہ گردی اور یہودی ادارے فری میسن کی دخل اندازی بہت زیادہ ہے اور نوری طلبہ کمیونزم الحاد' فری

میسنر یوں اور شریعت دشمن عناصر کے سخت مخالف ہیں چنانچہ یہ عناصر بھی ان طلبہ کی جان کے لاگو رہتے ہیں اسی لئے ہر فوجی انقلاب میں نوری تختۂ مشقِ ستم بنتے رہے ہیں۔ اس کشمکش کے پیشِ نظر نوری طلبہ ہمیشہ اس سیاسی جماعت کو انتخابات میں ووٹ ڈالتے ہیں جو اعتدال پسند ہو اور سیکولرزم کی تعریف "مذہب دشمنی" کرنے کے بجائے "مذاہب میں عدم مداخلت" کرتی ہو۔ پہلے یہ پارٹیاں دو تھیں یعنی عدالت پارٹی اور ڈیمو کریٹک پارٹی، مگر اب ان میں ایک زیادہ جاندار اسلامی سیاسی پارٹی بھی شامل ہو گئی ہے۔ ہماری مراد نجم الدین اربکان کی ملی سلامت پارٹی سے ہے۔ یہ پارٹی واضح طور پر شریعت کی حکمرانی کا تصور رکھتی ہے تاہم کافی کمزور ہے۔ اگر ملی سلامت پارٹی اور تحریکِ نور میں اتحادِ عمل ہو جائے تو ہم امید کر سکتے ہیں کہ جلد یا بدیر ترکی میں بھی اسلامی انقلاب کی نوید سننے میں آ سکتی ہے۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔

آدابُ المعاشرہ

شیخ رحیم الدین

رنج وغم کے مواقع پر بندۂ مومن کا طرزِ عمل

دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جو کہ رنج وغم اور تکلیف ومصیبت سے بچا ہوا ہو۔ اور یہ تکالیف وصدمات مسلم وغیر مسلم سب پر برابر آتی ہیں لیکن ان صدمات وآفات پر دونوں کا رویہ جدا جدا ہوتا ہے۔ ایک بندۂ مومن پر جب کوئی آفتِ ارضی وسماوی آتی ہے تو وہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرتا ہے اور بڑے سے بڑے صدمے پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ رب العزت نے یہ جو کچھ کیا ہے اس میں کوئی حکمت مضمر ہے۔ اس سے مسلمان کو یک گونہ روحانی سکون حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کافر ایسے مواقع پر ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے اور مایوسی کا شکار ہو کر بعض اوقات خودکشی کر بیٹھتا ہے۔

قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ۔

(الحدید ۲۲-۲۳)

"جو مصائب بھی روئے زمین میں آتے ہیں اور جو آفتیں بھی تم پر آتی ہیں وہ سب اس سے پہلے کہ ہم انہیں وجود میں لائیں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی محفوظ اور طے شدہ) ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات خدا کے لئے آسان ہے تاکہ تم اپنی ناکامی پر غم نہ کرتے رہو"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

"مومن کا معاملہ بھی خوب ہے وہ جس حال میں بھی ہوتا ہے خیر ہی سمیٹتا ہے۔ اگر وہ دکھ

درد یا بیماری و تنگدستی سے دوچار ہوتا ہے تو سکون کے ساتھ برداشت کرتا ہے اور یہ آزمائش اس کے حق میں خیر ثابت ہوتی ہے اور اگر اس کو خوشی و خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ خوشحالی اس کے لئے خیر کا سبب بنتی ہے۔" (مسلم)

اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ صرف دنیاوی لذات و اموال کو مقصود نہ جانیں بلکہ یہ یقین رکھیں کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے۔ اگر مال جائے یا کوئی عزیز فوت ہو جائے تو صبر سے کام لے اور یہ سمجھے کہ مال اور عزیز و اقارب اور اپنی زندگی ہر چیز آخر کار ختم ہو جائے گی اور اللہ تعالیٰ ہی وارث و مالک ہے۔

اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (الانفال: ۴۶) — بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی آفت و پریشانی آجائے تو صبر و تحمل کے ساتھ کام لیں اور نماز پڑھ کر اللہ سے مدد مانگے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (البقرہ: ۱۵۳) — "اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ بے شک اللہ صبر والوں کے ساتھ ہے۔"

مصائب و آلام پر صبر کرنے والوں کے لئے تین بہت بڑے اجر بتلائے گئے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (البقرہ ۱۵۵ : ۱۵۷)

"اور صبر کرنے والوں کو خوش خبری دے دو، وہ لوگ کہ جب انہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے مہربانیاں ہیں اور رحمت، اور یہی ہدایت پانے

والے ہیں ۔"

مسلمانوں پر جو بھی رنج و پریشانی آتی ہے اس سے ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" ایماندار مرد اور ایماندار عورت کے جان و اولاد اور مال میں مصیبت آتی رہتی ہے حتی کہ وہ اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا ۔"

(جامع الترمذی)

عام طور پر جو آدمی زیادہ صالح ہوتا ہے اس پر آزمائشیں بھی زیادہ آتی ہیں مگر اس کو اللہ رب العزت صبر کی بھی خوب توفیق عنایت فرماتا ہے ۔

حضرت مصعب بن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا :

" اے اللہ کے رسولؐ ! کن لوگوں پر زیادہ آزمائش آتی ہے ! آپؐ نے فرمایا : انبیاء علیہم السلام پر پھر ان سے جو مشابہ ہوں پھر جو ان سے مشابہ ہوں (یعنی جو زیادہ تابعدار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں)۔ انسان پر اس کے دین کے مطابق ابتلاء آتا ہے اگر وہ اپنے دین میں نرم ہو تو اس پر دین کے مطابق آزمائش ہوتی ہے۔ بندے پر آزمائش جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اسے زمین پر اس طرح چھوڑتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا ۔"

(جامع الترمذی)

دکھ درد میں ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہیئے۔ دوستوں اور عزیزوں کے رنج و غم میں شرکت کرنی چاہیئے، اس طرح ان کے غم کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

"سارے مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف میں ہوتا ہے (مسلم)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ :

"جس شخص نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کی تو اس کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا کہ خود مصیبت زدہ کو ملے گا ۔"

(ترمذی)

مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنے مسلمان بھائی کے جنازے میں شرکت کریں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص جنازے میں شریک ہوا اور جنازے کی نماز پڑھی تو اس کو ایک قیراط بھر ثواب ملے گا اور جو نماز جنازہ کے بعد دفن میں بھی شریک ہوا تو اس کو دو قیراط ملیں گے۔ کسی نے پوچھا دو قیراط کتنے بڑے ہوں گے؟ فرمایا دو پہاڑوں کے برابر"

(بخاری و مسلم)

رنج و غم کی شدت، مصائب کے نزول اور پریشانی و اضطراب کے مواقع پر یہ دعائیں پڑھنی چاہئیں۔ حضرت سعد بن وقاصؓ کہتے ہیں کہ نبیؐ نے ارشاد فرمایا:

حضرت یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں اپنے پروردگار سے جو دعا مانگی تھی وہ یہ تھی:

"لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ"

پس جو مسلمان بھی اپنی کسی تکلیف یا تنگی میں خدا سے یہ دعا مانگتا ہے خدا اسے ضرور قبولیت بخشے گا۔

حضرت ابو موسیٰؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لاحول و لا قوۃ الا باللہ ولا ملجا من اللہ الا الیہ" یہ کلمہ ننانویں بیماریوں کی دوا ہے۔ سب سے کم بات یہ ہے کہ اس کا پڑھنے والا رنج و غم سے محفوظ رہتا ہے۔

اسلام نے بے صبری دکھانے، بین کرنے، ماتم کرنے اور اسی طرح کے دوسرے کام کرنے کو جاہلیت کی علامت قرار دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کسی مصیبت و آفت کے وقت اپنے گالوں پر تھپڑ مارے، اور گریبانوں کو چاک کرے، اور جاہلیت کی سی باتیں کرے وہ ہم میں سے نہیں (صحیح البخاری)

البتہ اگر صدمہ اور غم کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور زبان سے کوئی بات اسلامی تعلیمات کے خلاف نہ نکلے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ آپؐ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم کے پاس آئے اس وقت حضرت ابراہیم پر سکرات

کا عالم طاری تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپ بھی رونے لگے؟" حضورؐ نے فرمایا: "اے ابنِ عوف! یہ رحمت ہے۔" پھر مزید آنسو نکل پڑے۔ آپؐ نے فرمایا: "بے شک آنکھ آنسو بہاتی ہے اور دل غمگین ہے اور ہم صرف وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو۔" اور اے ابراہیم میں تیرے فراق میں غمگین ضرور ہوں"۔ (صحیح البخاری)

بہر حال ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اللہ رب العزت کی حمد وثنا کرے اور کوئی وقت بھی شکر اور صبر سے خالی نہ رہے۔ بلکہ اکثر چاہیئے کہ دنیا و آخرت دونوں جگہ بھلائی و عافیت کی دعا کرے۔ یعنی یہ کہا کرے کہ:

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ آمین یارب العالمین!

برسات میں سب کے لیے موزوں

رُوح افزا کو لیموں کی اضافی لذّت سے لذیذ تر بنائیے

موسم بدلے تو انسانی مزاج بھی ذائقے میں تبدیلی چاہتا ہے۔ برسات سے پوری طرح لطف اٹھانے اور موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے رُوح افزا میں لیموں کا تازہ رس شامل کیجیے اور ایک نئے ذائقے کا لطف اٹھائیے۔

یہ رُوح افزا سکنجبین آپ کے ذوق اور ذائقے کو تسکین فراہم کرے گی اور جسم و جان کو سکون اور فرحت بخشے گی۔

رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں بے مثال
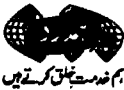
مشروبِ مشرق رُوح افزا

رُوحِ پاکستان

ہم خدمتِ خلق کرتے ہیں

خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

ADARTS-HRA 7/86

حدیثِ مُبارکہ

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ خَلَعَ یَدًا مِنْ طَاعَۃٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَلَا حُجَّۃَ لَہٗ وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاہِلِیَّۃً (مسلم)

جس شخص نے اطاعت سے پہلوتہی کی وہ اللہ تعالےٰ سے قیامت کے روز اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اُس کے پاس کوئی حجت و دلیل نہیں ہوگی۔ اور جو شخص اس حال میں مرا کہ اُس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

عطیہ اشتہار : عبداللہ نفیس، سرگودھا

ان شاء اللہ العزیز

تنظیم اسلامی حلقۂ سرحد کا

علاقائی اجتماع

۱۱ ستمبر ۸۸ء تا ۱۳ ستمبر

جامع مسجد سپین جماعت (سفید مسجد) یونیورسٹی ٹاؤن پشاور میں منعقد ہوگا

- ۱۱ ستمبر کو صبح ۸ بجے اجتماع کا آغاز ہوگا۔
- بیرون حلقہ سے شرکت کے خواہشمند رفقاء تنظیم ۹ ستمبر تک اپنی شرکت کی حتمی اطلاع سے جناب اشفاق میر صاحب امیر تنظیم اسلامی پشاور کو درج ذیل پتہ پر آگاہ کریں!

عیسیٰ نور پلازہ، بالمقابل کالٹیکس پٹرول پمپ، یونیورسٹی روڈ، یونیورسٹی ٹاؤن پشاور۔ فون: ۴۱۸۶۱

المعلن: میجر (ریٹائرڈ) فتح محمد، ناظم حلقہ سرحد
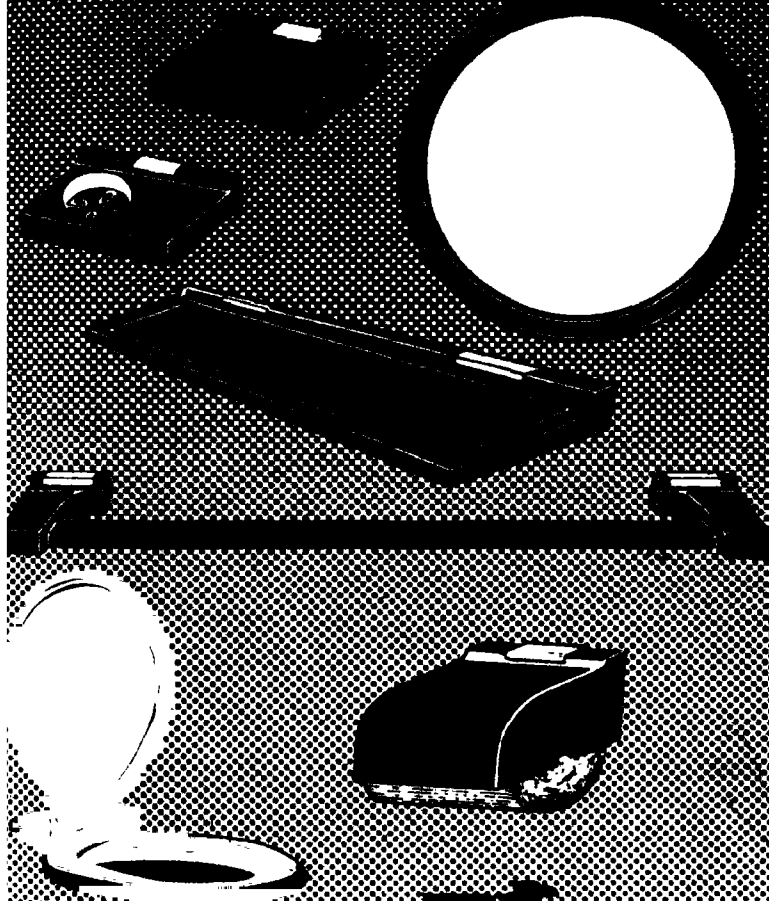
ASIA
SIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ان گناہوں پر، ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

أَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

داخلے مطلوب ہیں

دینی تعلیم کا ایک سالہ تدریسی نصاب

قرآن اکیڈمی لاہور میں اِس سال بحمداللہ دینی تعلیم کے ایک سالہ تدریسی منصوبے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ ایک سال میں دیگر علومِ دینیہ سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ طلبہ کو قواعد عربی کی پختہ بنیادوں پر تعلیم کے ذریعے عربی زبان کی اتنی استعداد بہم پہنچائی جائے گی کہ معمولی سی اضافی کوشش اور مشق کے بعد قرآن حکیم کو ترجمے کی مدد کے بغیر براہِ راست سمجھنا ممکن ہوگا۔ انشاءاللہ۔

طالبانِ علم قرآن کے لیے یہ نصاب ان شاء اللہ العزیز ایک مضبوط بنیاد کا کام دے گا۔ مزید برآں اُن گریجویٹ طلبہ کے لیے جو ایم اے (عربی یا اسلامیات) میں داخلے کا ارادہ رکھتے ہوں اور ابھی داخلوں کے انتظار میں ہوں، عربی زبان اور دینی علوم سے متعارف ہونے کا یہ بہترین موقع ہوگا۔

اس کورس میں :

★ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا۔ وہ طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں جو بی اے یا کسی مساوی امتحان کے نتیجے کے منتظر ہوں۔

★ ذہین اور مستحق طلبہ کے لیے اخراجات میں رعایت کی گنجائش ہوگی۔

★ بیرونِ لاہور سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود ہے۔

★ داخلہ کے لیے درخواستیں وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ ستمبر ۸۸ء ہے۔

★ اوقاتِ تدریس صبح ۸ تا دوپہر ایک ہوں گے۔

تفصیلات خط لکھ کر طلب کریں۔

المعلن : قمر سعید قریشی، ناظمِ اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور

اِن شاءَ اللہ العزیز

کوئٹہ شہر میں امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

۱۰ اور ۱۱ اکتوبر ۸۸ء بروز سوموار اور منگل

گورنمنٹ سائنس کالج آڈیٹوریم جناح روڈ میں

دونوں دن بعد نماز مغرب

حقیقتِ ایمان

کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے، عنوانات پشت پر ملاحظہ فرمائیں

اُخروی فوز و فلاح کی شرطِ لازم

اور اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کی نظریاتی اساس کے

فہم و شعور کے لیے ـــــــ اس موقع کو غنیمت سمجھیں!

ع ”صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!“

عنوانات

سوموار ۱۰ اکتوبر ۸۹ء

★ ایمان کے لفظی معنی ★ ایمان کا اصطلاحی مفہوم

★ ایمان کا موضوع ـــــ مابعد الطبیعیاتی مسائل

★ ایمانیاتِ ثلاثہ ـــــ توحید، معاد، رسالت ـــــ کا باہمی ربط

★ ایمانِ مجمل اور ایمانِ مفصل

★ ایمانیات ثلاثہ کی تقابلی اہمیت

اور

★ ایمان کے دو درجے ـــــ قانونی ایمان اور حقیقی ایمان

منگل ۱۱ اکتوبر ۸۸ء

۱ ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی

کے داخلی اور خارجی ثمرات

★ داخلی ثمرات ـــــ ذہنی اطمینان اور قلبی امن و سکون

★ خارجی ثمرات ـــــ عملِ صالح اور جہاد فی سبیل اللہ

۲ ایمان کے اجزائے ترکیبی اور اس کے حصول کے ذرائع

★ نورِ فطرت اور نورِ وحی

★ ایمان و یقین کا اصل منبع و سرچشمہ ـــــ قرآنِ حکیم

★ ایمان کے اضافی ذرائع ـــــ تزکیۂ نفس اور صحبتِ صالح

ج

إن شاء الله العزيز

تنظیمِ اسلامی حلقۂ وسطی پنجاب کا

سہ روزہ علاقائی اجتماع

۱۹ ؍ تا ۲۱ ؍ اکتوبر ۱۹۸۸ء بروز بدھ تا جمعہ

بمقام: دارالبوچاں، عقب پرانی جیل

گجرات

منعقد ہوگا، جس کے دوران دوسرے تنظیمی اور تربیتی پروگرام کے علاوہ

۱۹ ؍ اور ۲۰ ؍ اکتوبر کو بعد نمازِ عشاء

امیر تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

جلسۂ عام سے خطاب فرمائیں گے۔

بیرونِ حلقہ سے تشریف لانے والے حضرات ۱۹ ؍ اکتوبر کو صبح دس بجے تک

دفتر تنظیمِ اسلامی دارالبوچاں، عقب پرانی جیل پہنچ جائیں

المعلن: شمس الحق اعوان امیر تنظیمِ اسلامی گجرات، وناظم اجتماع

الحمد للہ کہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ذیلی تنظیم

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی

کو ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کی درخشاں، اسکیم میں

مسجد کی تعمیر کے لئے ایک پلاٹ حاصل ہو گیا ہے

جس پر

جامع القرآن

کی تعمیر

کا آغاز انشاء اللہ العزیز بہت جلد ہو جائے گا!

اور ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے اسی پلاٹ پر

جمعرات ۱۳ اکتوبر ۸۸ء کو بعد نماز مغرب

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر موسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور —— و امیر تنظیم اسلامی پاکستان

"سیرت نبوی ﷺ کا انقلابی پہلو"

ع "صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے!"

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۷
شمارہ ۱
صفر المظفر ۱۴۰۹ھ
اکتوبر ۱۹۸۸ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ امریکی ڈالر

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن - لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

گذشتہ ماہ دو خطبات جمعہ میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب امیر تنظیم اسلامی پاکستان نے ملک کی اکتالیس سالہ سیاسی تاریخ کا ایک جائزہ پیش کیا اور اس کے پس منظر کے ساتھ ساتھ آئندہ عام انتخابات کے تناظر میں قومی سیاسی جماعتوں اور مذہبی و دینی گروہوں کو نام لے لے کر کچھ مشورے بھی دیئے۔ یہ سب باتیں تقریباً پوری کی پوری "میثاق" کی اس اشاعت میں شامل ہیں۔ عین ممکن ہے کہ قارئین کے ذہن میں بھی ان کے مطالعہ کے بعد یہ خیال پیدا ہو لیکن بعض احباب نے ان خطبات کو سن کر یا اخبارات میں 'ان کی ادھوری رپورٹ پڑھ کر ہی اس ردعمل کا اظہار کیا کہ امیر تنظیم کو اپنی بات ماضی کے حوالے سے کہہ کر ختم کر دینی چاہئے تھی' مختلف جماعتوں اور گروہوں کو براہ راست مخاطب کرنا غیر ضروری تھا' جن سے یہ توقع تو عبث ہے کہ یہ باتیں انہوں نے گوش حقیقت نیوش سے سنی ہوں البتہ انہیں اپنے معاملات میں مداخلت قرار دے کر ایک طرح کی تلخی ضرور محسوس کی ہوگی۔ "عرض احوال" میں ہم اسی خیال پر گفتگو کریں گے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہ رہے ہیں اس کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی انداز میں ان خطبات میں بھی یقیناً موجود ہے لیکن تمہید کے طور پر انہیں الگ سے بیان کر دینا بھی مفید ہو گا۔

اس معاملے کے چند پہلو تو ایسے ہیں جن کا ذکر ہی کافی ہے' کسی لمبی چوڑی وضاحت کی ضرورت نہیں البتہ کچھ دیگر گوشوں پر نسبتاً زیادہ تفصیل سے بات کرنی ہوگی۔ اول الذکر پہلو کے عنوانات یہ ہیں کہ

۱۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اور تنظیم اسلامی سے منسلک افراد مروجہ انتخابی سیاست سے تو کامل اجتناب برتتے ہیں لیکن سیاست بذات خود ان کے لئے شجر ممنوعہ نہیں۔ انقلابی سیاست تو وہ کر ہی رہے ہیں' مروجہ سیاست کے اتار چڑھاؤ اور ملکی حالات سے باخبر رہنا اور حسب ضرورت لوگوں کو ان کے نتائج و عواقب سے آگاہ رکھنا بلکہ خبردار کرتے رہنا بھی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

۲۔۔۔ مروجہ ملکی سیاست پر صرف وہ لوگ ہی اثر انداز نہیں ہوتے جو لنگر لنگوٹے کس کر اکھاڑے میں اترے ہوئے ہوں۔ ملک و قوم کے بظاہر غیر متعلق لیکن سوچنے سمجھنے والے

خیر خواہ بھی اپنے بروقت مشوروں کے ذریعے ان معاملات میں ایک تعمیری کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مثبت انداز میں کہا جائے تو باشعور اور قلم پر قدرت رکھنے والے صحافیوں کے کام کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو بلاواسطہ حصہ لئے بغیر بھرپور سیاست کرتے ہیں اور منفی اسلوب میں بات سمجھانی ہو تو ہم قارئین کو یاد دلاتے ہیں کہ امریکی سیاست پر ایک خوردبینی اقلیت پس منظر میں رہ کر بھی محض اس بنا پر تسلط جمائے ہوئے ہے کہ ذرائع ابلاغ پر اس کا قبضہ ہے۔ مٹھی بھر یہودی بلکہ صیہونی اس سپرپاور کی داخلی و خارجی حکمت عملی پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہیں۔

۳...... "الدین النصیحة" کی جو تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اس کے مطابق ملک کی کوئی جماعت بلکہ عامتہ المسلمین میں سے بھی کوئی فرد اس دائرے سے باہر نہیں رہ جاتا جو نصح و خیر خواہی کی لکیر نے معاشرے کے گرد اگرد کھینچ دیا ہے۔

۴..... ہر موقع محض اصولی باتیں کہہ کر بس کر دینے کا نہیں ہوتا۔ اشاروں کنایوں میں بات کی جائے تو ہر شخص کسی دوسرے کو اس کا مخاطب سمجھتا ہے اور قائل کا مقصد ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں اس امر کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ لوگوں کو فرداً فرداً متوجہ کر کے مشورے اور نصیحت کا حق ادا کیا جائے۔ ہاں اس کی نوبت آ جائے تو ہمدردی' دلسوزی اور دانائی کے عناصر خطاب میں ضرور شامل ہونے چاہئیں اور ظاہر ہے کہ ان لوازم کا مکلف ہر کہنے والا اس صلاحیت کی حد تک ہی ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہو۔

۵..... ایسے مواقع پر جب بات کو صاف صاف کہنا قوم اور معاشرے کے حق میں سودمند ہو' گول مول باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن میں سے کچھ کو اپنے موقف کے صحت و صواب پر اعتماد نہیں ہوتا' کچھ مصلحت کا مونہہ دیکھتے رہتے ہیں اور کچھ کا خیال یہ ہوتا ہے کہ بعد میں اپنی بقراطیت کا لوہا منوائیں گے کہ دیکھا ہم نے تو اشارہ کر دیا تھا' تم ہی ایسے کودن تھے جو سمجھ نہ پائے۔

ان اشارات کے بعد جن عوامل پر ہم قدرے تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے قارئین کو دعوت فکر دیں گے' وہ درج ذیل ہیں۔

۱..... ہمارے ملک میں بحران کی کیفیت اور حالات کی نزاکت یوں تو ضرب المثل بن چکی ہے' کوئی دن نہیں گیا جب یہ الفاظ تکیہ کلام کے طور پر استعمال نہ ہوئے ہوں لیکن آج کل حالات ہمیں جس موڑ پر لے آئے ہیں وہ واقعی بالکل نیا ہے۔ ہمارے دائیں بائیں' آگے پیچھے صورت حال اس سے پہلے کبھی یوں بیک وقت مخدوش نہیں ہوئی تھی۔ دنیا کی دونوں

سپر طاقتوں کی یکساں توجہ کے مرکز ہم اس طرح کبھی نہ بنے تھے۔ مارشل لاء کی ایسی طوالت ماضی میں یہاں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ملک کی سیاسی قوتیں اس انداز میں کبھی شل نہ ہوئیں۔ ملک کے باشندوں میں علاقائی اور لسانی بنیادوں پر اس قدر واضح اور موثر تقسیم پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے۔ ایک ہی شہر اور محلے کے باسی کلمہ گو مسلمانوں نے ایک دوسرے کے جان و مال اور عزت و آبرو پر درندوں کی طرح حملے اس سے پہلے کبھی نہ کئے تھے۔ شعائر دینی اور حدود اللہ پامال تو پہلے بھی تھیں لیکن ان کا مثلہ یوں کب ہوا۔ شریعت پر دو فرقوں کے درمیان اختلاف اور الحاد و اباحیت زدہ طبقے کی طرف سے اس کا استہزا ہوتا آیا ہے لیکن خود اہل سنت کے مابین اس کی تعبیر اور نفاذ پر مرنے مارنے کے لئے یہ صف آرائی تو کبھی نہ ہوئی تھی جو شامت اعمال نے ماضی قریب میں ہمیں دکھائی۔ غرض آج ہم بحران اور حالات کی نزاکت کی جس کیفیت سے دوچار ہیں وہ روائتی نہیں، بہت ہی منفرد اور معکوس معنی میں بڑی ہی مثالی ہے۔ یہ وقت اشاروں کنایوں میں بات کرنے کا نہیں، کھل کر کہنے کا ہے کہ ہنوز ؎

غنیمت ہے جو ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

۲...... سانحہ اوجڑی کیمپ کے بعد سے اور بالخصوص (۲۹ر مئی) کی تاریخ سے پاکستان پے در پے ایسے واقعات سے دوچار ہے جس نے صورت حال میں بہت بڑی بڑی اور بنیادی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ وہ کچھ وقوع پذیر ہو گیا جو کسی کے سان گمان میں نہ تھا۔ سب نے دیکھا کہ ملک کی سیاسی سٹیج پر جو ڈرامہ سٹیج کیا جا رہا تھا، اس کا منظر ہی نہیں بدلا کہانی بھی بدل گئی، ماحول مختلف ہو گیا اور کرداروں کو نئے رول لینے پڑے۔ ہماری سیاسی مفاہمتوں اور مخاصمتوں کی بساط بعض صورتوں میں تو بالکل ہی الٹ کر رہ گئی۔ ہماری گزشتہ اکتالیس سالہ تاریخ میں ایسا موقع پہلے کبھی نہ آیا تھا کہ سیاست اور اہل سیاست یوں ٹھٹھک کر رہ گئے ہوں اور حالات و واقعات کے تیزی سے گردش کرتے پہیے نے انہیں مجبور کر دیا ہو کہ اس کے تھم جانے کا انتظار کریں۔ انتظار کے اس وقفے میں غور و فکر کی مہلت میسر آئی ہے جس سے فائدہ اٹھانا تبھی ممکن ہے جب ماضی کے تجربات کا تجزیہ کر کے آئندہ کا لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ ڈاکٹر اسرار احمد خود تو اس چکر میں پڑے ہی نہ تھے، ان کو اپنی سوچ کا زاویہ بدلنے کی ضرورت نہیں لیکن ملک کی سیاست پر موثر کردار ادا کر سکنے والے لوگوں کو توجہ دلانا ان کا فرض تھا اور ہے کہ اب اپنی حکمت عملی بدل ہی رہے ہو تو یوں بدلو کہ پچھلی کوتاہیوں کا ازالہ ہو جائے۔ خدا لگتی کہئے کہ کیا ہم سب لوگ ان دنوں نجی محفلوں میں اس انداز کی گفتگو

نہیں کرتے رہے کہ فلاں جماعت کو یہ کرنا چاہئے 'فلاں کو وہ کرنا چاہئے 'فلاں فلاں کو ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا چاہئے 'فلاں فلاں کو مل کر کام کرنا چاہئے ورنہ فلاں کا داؤ چل جائے گا 'فلاں کا جادو سر چڑھ کر بولے گا...... وغیرہ۔ تو اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ہمیں یہ باتیں سوچنا اور کہنا زیب دیتا ہے تو امیر تنظیم اہی کو اس سطح سے بیان کیوں نہ کریں جو ان کے لئے موزوں ہے۔ اس فورم کو استعمال کرنے میں جھجک کیوں محسوس کریں جو انہیں میسر ہے۔

۳ تنظیم اسلامی کی انقلابی سیاست اگرچہ ابھی ابتدائی مرحلوں میں ہے لیکن ہم اس بات پر حق الیقین رکھتے ہیں کہ یہاں اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا قیام انقلابی عمل سے ہی ہو گا اور یہ کہ پاکستان کی واحد وجہ جواز اور اس کے استحکام کا راز حقیقی اسلام کے واقعی نفاذ میں ہی مضمر ہے جس کے لئے ہم بساط بھر کوشاں بھی ہیں۔ تاہم ملک کو چالیس سالوں پر محیط سیاسی بد عملی نے افراتفری اور انتشار و خلفشار کی جس شدت میں مبتلا کر دیا اور اس کے وجود تک کو جس خطرے سے دوچار کر دیا ہے اسمیں کمی لانے کے لئے ایک فوری تدبیر کے طور پر یہاں جمہوریت کی عمل داری اور سیاسی عمل کی روانی سب سے زیادہ مطلوب حیلہ ہے اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے 'نئے عام انتخابات سر پر ہیں جن کے بارے میں توقع ہوئی ہے اور مطالبہ بھی کیا جاتا ہے کہ آزادانہ 'منصفانہ اور پوری طرح سیاسی (یعنی جماعتی) ہوں۔ بدقسمتی سے اس باب میں قوم کے تجربات بہت تلخ ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک دو ہی عام انتخابات ہوئے ہیں۔ ایک ۱۹۷۰ء میں جن کے بارے میں عمومی اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ آزادانہ اور خالص سیاسی تھے اور دوسرا ۱۹۷۷ء میں جو بھرپور انداز میں سیاسی تو تھے 'آزادانہ و منصفانہ نہیں۔ پہلے کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا اور مسلمانوں کو بدترین شکست کی شکل میں تاریخی ذلت و رسوائی کا مونہہ دیکھنا پڑا تو دوسرے نے ملک کے طویل ترین مارشل لاء کو جنم دیا۔ گویا ملک گیر پیانے پر عام انتخابات ہمیں راس تو کبھی نہ آئے لیکن ان کے بغیر اب چارہ بھی کوئی نہیں رہ گیا۔ ہم تاریخ کے جبر کا شکار ہیں یا ستم ظریفی کے 'بہرصورت اس مرحلے سے گذرنا تو ہو گا۔ ایسے نازک موقعے پر ہوائی باتیں کرنا اور آپ جناب کے تکلف میں پڑنا وہی لوگ گوارا کر سکتے ہیں جنہیں ملک و قوم سے محض مونہہ دیکھے کی محبت ہو 'حقیقی تعلق نہیں۔ کسی کے دل میں قوم کا واقعی درد ہو گا تو وہ لوگوں کی خوشی ناخوشی کی بھی پرواہ کئے بغیر اپنی بات بالکل متعین پیرائے میں کہنے پر مجبور ہو گا 'صرف فارمولے دینے پر اکتفا نہیں کرے گا بلکہ ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرے گا 'مشورے دے گا۔

۴ پچھلے عام انتخابات کے مذکورہ مواقع پر ہمارے ان چوٹی کے صحافیوں اور سکہ بند دانشوروں نے جن کی "اسلام پسندی" مسلمہ تھی' اپنی "قلم کاری" اور چرب زبانی سے وہ سماں باندھا اور اسلام کے نام پر الیکشن کے میدان میں اترنے والی جماعتوں کو وہ سبز باغ دکھائے کہ انہیں "فتح مبین" سامنے پڑی نظر آنے لگی اور ان میں سے ہر ایک اس زعم کا شکار ہو گئی کہ بس اس بار تو پالا مار ہی لیا' اسلام آیا کہ آیا۔ اس تعلی میں ان کاغذی گھوڑے دوڑانے والوں اور جوش میں مونہہ سے جھاگ اڑانے والوں نے شاعرانہ گریز کا وہی انداز اختیار کیا تھا جو عام لوگ اب ہم سے بھی چاہتے ہیں کہ بات کہیں ضرور لیکن یہ پتہ نہ چلے کہ مخاطب کون ہے۔ لیکن کسے معلوم نہیں کہ ان دونوں مواقع پر اور خاص طور پر ۱۹۷۰ء میں سارے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ امیدوں پر پانی پھر گیا اور مرے پہ سو درے یوں کہ وہی اسلام پسند صحافی اور دانشور اپنی سابقہ تحریروں اور تقریروں کے روائتی ابہام کی آڑ میں اپنی ممدوح جماعتوں کا مذاق اڑانے پر اتر آئے' اور حد درجہ ڈھٹائی کے ساتھ ان کی کوشش اور تدبیر میں کیڑے نکالتے پائے گئے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر اسرار احمد کا رویہ ریکارڈ پر ہے' سیاست و صحافت سے دور کا تعلق رکھے بغیر انہوں نے "میثاق" میں ملکی منظر و پس منظر کی وہ حقیقت پسندانہ نقشہ کشی کی اور مختلف جماعتوں' گروہوں اور شخصیات کو نام بنام وہ صاف صاف پیغام دیئے کہ اگر ان پر کان دھرا جاتا تو آج ہم ایک مختلف پاکستان میں زندگی گذار رہے ہوتے۔ آج سے اٹھارہ (۱۸) سال پہلے ان کی سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا تو اتنا زمانہ گزرنے پر جس میں ایک بچہ بھی سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے اور تاریخ و سیاست کے اتنے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف کی نظر میں جو وسعت پیدا ہو چکی ہو گی' اس کا اندازہ کیسے قائم کیا جائے۔ بایں ہمہ اگر وہ اس تاریخ ساز لمحے میں "ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم" پر عمل کریں اور اپنی سوچ کو عام کرتے ہوئے صاف صاف کہنے کی بجائے شرما شرمی سے کام لیں تو یہ بخل ہو گا' تھڑدلا پن ہو گا جس پر تاریخ انہیں معاف کرنے پر تیار نہ ہو گی۔

۵ ... ہمارا ایک المیہ یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کی روح اور ایک مربوط اسلامی معاشرے کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے ہم نے "غیر جانبداری" کا ایک خاص طرز عملی مستقل اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے دین کا مزاج تو یہ ہے کہ دو بھائیوں یا مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان تصادم پایا جائے تو دونوں جانب کے متعلقہ افراد بالخصوص اور ذمہ داری کی رکھنے والے اصحاب فہم و دانش بالعموم' معاملے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اختلا

کا تعین کریں۔ ان کے درمیان مصالحت و مفاہمت پیدا کرنے کی غرض سے پوری دلی آمادگی کے ساتھ بلکہ صورت حال میں خود کو کماحقہ' مبتلا کر کے کوشاں ہوں اور اس کے بعد بھی اگر کوئی ایک فریق اپنے غلط موقف پر اڑا رہے تو اپنا وزن دوسرے فریق کے پلڑے میں ڈال کر زیادتی کرنے والی کی ٹھیک سے مزاج پرسی کریں۔ لیکن اب اس رویئے کو دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے کا نام دیا جانے لگا ہے۔ چہ خوب! یہ غیر جانبداری کا خول نہیں' منافقت ہے' دھوکے کی ٹٹی ہے۔ آج قومی منظر پر جو محاذ آرائی نظر آتی ہے اور کسی بھی طور ملک و قوم کی بھلائی میں نہیں' اس کی گرم بازاری میں مصلحت کا اسیر ہو جانا اور ایک فریق کا نام لیتے اس لئے ڈرنا کہ دوسرا فریق کیا کہے گا' ہمارے قومی کردار کی اسی کمزوری کی علامت ہے۔

آخری بات ان خطبات میں ڈاکٹر اسرار احمد نے خود ہی ہم سے بہتر پیرائے میں کہہ دی ہے۔ جن لوگوں سے انہیں کوئی توقع تھی یا کسی درجے میں اب بھی باقی ہے' ان سے شکایت میں تلخی کچھ زیادہ ہی آ گئی۔ سچی بات تو ویسے ہی کڑوی ہوتی ہے' اپنے پیاروں سے کہی جائے تو اس کی کڑواہٹ میں شدت در آتی ہے۔ لیکن ہم دردِ دل کہتے ہی رہیں گے ۔

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اِک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

ملک و قوم کو درپیش اس مرحلے پر کوئی یہ چاہے کہ ڈاکٹر اسرار احمد مونہہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہیں تو یہ خام خیالی ہے۔ انہیں مروجہ سیاست سے لینا دینا تو کچھ ہے نہیں۔ محسوس یہ کرتے ہیں کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں اس سے زبوں حالی کے ذمہ داروں کو خبردار بھی نہ کیا تو خدانخواستہ وہ خطہ ارضی ہی ہم سے نہ چھن جائے جس میں اللہ کی کبریائی کا خواب ہم دیکھتے ہیں' جس کے بارے میں یہ تمنا دلوں میں پال رہے ہیں کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا نکتہ آغاز بن جائے۔ ایسا نہ ہو کہ پھر کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ رہے ۔

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

***

تذکرہ و تبصرہ

قومی سیاست کی تاریخ کے تناظر میں

مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی خدمت میں

چند گزارشات اور مشورے

امیر تنظیم اسلامی، ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب جمعہ

(ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر)

پاکستان کے موجودہ حالات میں جو پہلو تشویش ناک یا مایوس کن ہیں ان کے ضمن میں بارہا آپ حضرات کے سامنے تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ میں نے بارہا یہ بھی عرض کیا ہے کہ میں مزاج کے اعتبار سے غالباً قنوطیت پسند انسان ہوں اور حالات کے تاریک پہلو پر کچھ زیادہ نگاہ رکھنے کا عادی ہوں۔ اس کا فائدہ بھی ہوتا ہے کہ انسان کو مایوسی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ بقول شاعر۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے!

اگر حالات کے بارے میں آپ کا مطالعہ اور تجزیہ امید بھرا نہیں بلکہ مایوس کن ہے تو جو بھی صورت حال سامنے آئے گی اس کو قبول کرنے کے لئے آپ پہلے ہی ذہناً تیار ہوں گے۔ لہٰذا میں ان موضوعات پر تفصیلاً گفتگو بھی کرتا رہا ہوں اور لکھتا بھی رہا ہوں میری کتاب "استحکام پاکستان" اور اس کے بعد "استحکام پاکستان اور مسئلہ سندھ" شائع ہو کر اب خاصی بڑی تعداد میں ہمارے معاشرے میں پھیل بھی چکی ہیں۔ میں نے پاکستانی معاشرے کے بارے میں اخلاقی زوال اور اخلاق کے بحران کا تذکرہ بھی بارہا کیا ہے۔ پھر یہ کہ نہ صرف جو اندرونی خلفشار ہے اس کا تذکرہ ہوتا رہا ہے بلکہ بیرونی خطرات جو ہمارے وجود تک کے لئے ایک زبردست خطرہ

ہیں ان سب کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔ لہٰذا کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ جمعہ کی گفتگو کے حوالے سے چند نکات میں اس وقت کی صورت حال کا تجزیہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

۱۔ امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود...... امت مسلمہ کا مقصدِ وجود اور اس کا فرض منصبی بعثت محمدی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مقصد کی تکمیل ہے۔ قرآن حکیم میں اس امت کی غرض وغایت یہ بیان ہوئی :

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط

"اے مسلمانو! ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت (ایک بہترین امت) بنایا ہی اس لئے ہے تاکہ تم گواہی دو پوری نوع انسانی پر اور ہمارے رسولؐ گواہی دیں تم پر۔" (البقرۃ۔ ۱۴۳)

اب گواہی دینے کا مفہوم کیا ہے؟ لفظ شہادت کے معنی کیا ہیں اور اصطلاحاً شہادت علی الناس سے کیا مراد ہے؟ اس وقت اس بحث میں پڑے بغیر صرف یہ سمجھ لیجئے کہ "شہادت علی الناس" کارِرسالت اور فرائضِ نبوت کے لئے جامع ترین اصطلاح ہے۔ یعنی ابلاغ و تبلیغ اور عملی شہادت کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کر دینا اور اجتماعی سطح پر دین حق کی ایسی گواہی دے دینا کہ اللہ کے ہاں جا کر دنیا یہ نہ کہہ سکے کہ پروردگار ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تیرا دین کیا ہے 'تو ہم سے چاہتا کیا ہے۔ اسی کے لئے انبیاء بھیجے گئے 'اسی کے لئے خاتم المرسلینؐ آئے اور اب آپؐ پر ختم نبوت کے بعد یہ فریضہ بحیثیت مجموعی امت محمدیہؐ کے حوالے کر دیا گیا۔ گویا کہ یہ ہمارا مقصدِ وجود اور فرض منصبی ہے۔

۲۔ شہادتِ حق کا تقاضا...... اسی شہادت حق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ دین کے اجتماعی نظام کا ایک عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ لہٰذا بعثت محمدیؐ کی خصوصی غرض جو قرآن مجید میں تین مقامات پر آئی وہ یہ ہے کہ :

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

"وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسولؐ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ تاکہ غالب کرے اسے کل کے کل نظام اطاعت پر 'کل کے کل دین پر 'کل کے کل نظام زندگی پر۔" اور یہ کام حضورؐ نے کر کے دکھایا جس کی دشمنوں نے بھی گواہی دی 'اپنوں نے تو خیر دینی ہی ہے کہ اس

، بہتر نظام اجتماعی کبھی اس روئے ارضی پر قائم نہیں ہوا۔ اُس نظام اجتماعی کا ایک نمونہ دنیا ، سامنے پیش کرنا بھی امت کا فرض منصبی ہے۔

۔ **امتِ مسلمہ کی موجودہ حالت** ...... اللہ کی طرف سے امت مسلمہ پر ان رائض کی تعیین کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ امت اگر ان فرائض کو ادا کرے تو اللہ کو نہایت ب ہو گی ' بہت چہیتی ہو گی ' اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کے شامل حال ہوں گی اور اللہ تعالیٰ کی ہو نصرت اسے میسر رہے گی۔ اور اگر اہل امت یہی کام چھوڑ دیں تو پھر دنیا میں جیسے اور ۔ آباد ہیں ایسے ہی مسلمان آباد ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کوئی خصوصی وعدہ اس امت مسلمہ ، ساتھ نہ نصرت کا ہے نہ تائید کا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ۔ دو اور دو چار کی طرح ، عدہ ہے کہ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ بلکہ عام دستور یہ ہے کہ جو پنے مقصد وجود کو پورا نہ کرے اسے اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں یا کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر نک دیا جاتا ہے۔ وہ قلم جو لکھ نہ سکے ' اسے آپ جیب میں سجائے نہیں پھرتے۔ لہٰذا ت مسلمہ بھی اپنے فرض منصبی کو چھوڑ دینے کے باعث عذاب خداوندی کی ایک کیفیت میں نتار ہے۔ اب یہ بھی دنیا کی عام قوموں کی طرح ایک قوم بن گئی ہے۔ جس طرح انہیں اپنے دی مفادات سے بحث ہے ' اسی طرح کا معاملہ ان کا ہے۔ جس طرح ایک عام انسان ' کسی د ' سکھ ' پارسی یا عیسائی کو ساری فکر بس اپنی معاش ' اپنے بال بچوں کی پرورش ' اپنے گھر کی اوٹ اور اپنے فرنیچر اور ساز و سامان کی ہوتی ہے ' ایسے ہی ایک مسلمان کے ذہن کے اوپر بھی ل یہی فکر سوار ہو گئی تو پھر کیا فرق رہ گیا سوائے نام کے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ آج ہم "مخذول" ہو لے ہیں ' تائید خداوندی اور رحمت خداوندی ہمارا ساتھ چھوڑ چکی ہے بلکہ اللہ تعالےٰ کی سزا ا پر مسلط ہے۔ چنانچہ پوری دنیا میں ذلت و رسوائی ہمارے لئے ایک علامت (SYMBOL) بن چکی ہے۔ پوری دنیا میں کہیں بھی ہمارا باوقار اور اپنے پاؤں پر کھڑے نے والا وجود نہیں ہے۔ ہم دوسروں کے دست نگر ہیں ' ہماری پالیسیاں کہیں اور بنتی ہیں ' ارے لئے معاشی نظام اور اس کے لئے بنیادی اصول بھی کہیں اور طے ہوتے ہیں۔ ہم یا تو اُن کے شکنجے میں اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ہمارا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہے ' یا ہم نے میں اپنی دولت کا امین بنا رکھا ہے۔ عرب ممالک کے اربہا ارب ڈالر ان کے بنکوں میں رکھے دئے ہیں اور نتیجۃً وہ ان کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ یہ ہمارا حال ہے بحیثیت

مجموعی، لہٰذا وہ ذلت اور رسوائی جس کے لئے قرآن مجید میں ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّ
وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ کے الفاظ بھی سابقہ امت مسلمہ کے
استعمال ہوئے تھے، اگر آپ باریک بینی سے دیکھیں تو موجودہ امت مسلمہ بھی اسی کا نقشہ پ
کرتی ہے۔

۴۔ **پاکستان کا خصوصی معاملہ**...... پوری امت مسلمہ میں پاکستان کا معا
ع "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" کے مصداق خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ
کا واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا۔ لہٰذا یہاں معاملہ دوہرا ہے ع "جن کے ر
ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے"۔ چنانچہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب بھی دوہرا ہے۔ ایک تو پو
امت مسلمہ پر ذلت و رسوائی کا جو عذاب مسلط ہے اس میں ہم بھی گرفتار ہیں۔ اس
علاوہ ہم پر دو اضافی عذاب نازل ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک عذاب وہ ہے جو سورۃ الانعام
آیت نمبر ۶۵ میں بیان فرمایا گیا۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ

یعنی تمہیں گروہوں میں، طبقات میں تقسیم کر دے گا اور آپس میں ٹکرا دے گا۔ ا
دوسرے کی قوتیں ایک دوسرے پر استعمال ہوں گی۔ آج ہماری قومی زندگی جس انتشار
دوچار ہے وہ یہی نقشہ پیش کر رہی ہے۔ وہ ایک مسلمان قوم جس نے ایک بنیان مرصوص ہو
ہندو اور انگریز دونوں کی خواہشات کے علی الرغم پاکستان حاصل کیا تھا، آج وہ قومیتوں
منقسم ہو چکی ہے۔ کہیں لسانی قومیتیں ہیں، کہیں صوبائی اور علاقائی قومیتیں ہیں، کہیں قبائلی عصبی
ہیں۔ باقی مذہبی فرقہ واریت اور طبقاتی انتشار، امیر اور غریب کے درمیان رسہ کشی یہ اپنی
ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ افقی اور عمودی دونوں سطحوں پر ہماری تقسیم در تقسیم کا عمل جاری ہے
یہ وہ عذاب خداوندی ہے کہ جس کے لئے قرآن حکیم میں اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِ
بَعْضَكُمْ بَأْسَ بَعْضٍ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔

دوسرا اضافی عذاب جس میں ہم مبتلا ہیں وہ درحقیقت عملی نفاق ہے۔ حضورؐ نے منافق ک
چار علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا اؤتمن
خان، واذا خاصم فجر...... یعنی جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو خلاف
ورزی کرے، جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے اور جب اختلاف ہو جائے تو آپے سے باہ

ہو کر گالی گلوچ پر اتر آئے۔

حضورؐ نے فرمایا کہ جس میں یہ چاروں ہیں وہ کٹر منافق ہے اور ایک ہے تو گویا اسی حساب سے ۲۵ فیصد منافق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی عملی تفسیر ہمارا معاشرہ ہے۔ نفاق کی ان علامتوں میں سے وہ کونسی ہوگی جو ہمارے اندر نہیں پائی جاتی۔ اس وقت ہم شدید اخلاقی بحران سے دوچار ہیں۔ نفاق کے اس عذاب کی وجہ کیا ہے؟ اس کے لئے میں نے بارہا سورۃ التوبہ کی آیات کا حوالہ دیا ہے کہ جب کوئی گروہ یا کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی خاص وعدہ کرے اور پھر اس وعدے کی خلاف ورزی کرے تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ اس قوم کے اندر نفاق پیدا کر دیتا ہے۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ (پس اللہ نے سزا کے طور پر ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا) تو یہ ہے صورت حال اُمت مسلمہ اور خاص طور پر وطن عزیز پاکستان کی! ویسے اگر اس کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے حالات کن اعتبارات سے خراب ہیں اور کن کن پہلوؤں سے تشویش ناک اور مایوس کن ہیں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ لیکن اگر قرآن مجید سے اس کی توجیہہ دریافت کریں گے' اس کا سبب معلوم کرنا چاہیں گے تو اس کا لبِ لباب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ گزشتہ خطابات جمعہ میں اس پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔

موجودہ صورتِ حال کے خوش آئند پہلو

اللہ کے فضل و کرم سے

مایوسیوں کے ان گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں اس وقت ملکی سطح پر سیاسی اور قومی اعتبار سے چند چیزیں ایسی بھی ہوئی ہیں جو بڑی امید افزا ہیں۔ ہماری توجہ ان اچھی چیزوں کی طرف بھی رہنی چاہئے تاکہ مایوسی کا پلڑا بہت زیادہ جھک نہ جائے۔ اگر مایوسی کا پلڑا زیادہ جھک جائے تو انسان میں کچھ کرنے کی ہمت نہیں رہتی' اس کے اعضاء اور اعصاب شل ہو جاتے ہیں اور قوتِ عمل جواب دے جاتی ہے۔

عدو شرے بر انگیزد کہ خیر ما دراں باشد..... گزشتہ تیس سال کے عرصے سے ہماری قومی سیاست اس مسموم دائرہ خبیثہ (VICIOUS CIRCLE) کے اندر چکر کاٹ رہی ہے کہ ہر مرتبہ کوئی آمر حکومت پر مسلط ہو جاتا ہے اور پھر دائیں اور بائیں بازو کی

تمام سیاسی جماعتیں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر سب جمع ہو کر اس کی ٹانگ گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا متحدہ محاذ بنتا ہے اور یہ متحدہ محاذ جب تحریک چلاتا ہے تو توڑ پھوڑ، ایجی ٹیشن، ہنگامہ آرائی اس کا لازمی حصہ ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ آمر بہرحال معزول ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ کوئی اور سیاسی عمل پختہ بنیادوں پر موجود نہیں للذا کچھ عرصہ کے بعد پھر اختلال پیدا ہوتا ہے اور ملکی اور قومی سطح پر پھر کسی آمر کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی آمریت کا تخت جما کر بیٹھ جائے پھر وہی چکر چلتا ہے پھر سب لوگ جمع ہو کر اس کی ٹانگ گھسیٹتے ہیں، پھر وہی ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس چکر میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کوئی بیرونی یا اندرونی دشمن اس سے فائدہ نہ اٹھالے جائے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہو گا کہ ہمارے ہاں یہ تشویش بار بار پیدا ہوئی ہے کہ یہ ملک باقی رہے گا یا نہیں!

گزشتہ تیس سالوں میں جو سیاسی صورتحال دو مرتبہ پیدا ہو چکی تھی، اب پھر تیسری مرتبہ اس کے لئے فضا تیار ہو چکی تھی۔ اب صدر ضیاء الحق صاحب کے خلاف عوامی سطح پر ایک انتہائی خاطر مذہبی و لادینی سیاسی پارٹیاں باہم گٹھ جوڑ کر رہی تھیں۔ ایم آر ڈی تو خیر جو تھی سو تھی، لیکن اب بقیہ جماعتیں بھی اسی نہج کے اوپر سوچ رہی تھیں۔ ان سب کا پھر ایک متحدہ محاذ وجود میں آتا، پھر وہی رسہ کشی ہوتی، پھر وہی عوامی تحریک چلتی اور وہی توڑ پھوڑ اور ہنگامے ہوتے۔ اس میں شدید اندیشہ تھا کہ ہمارے بیرونی دشمن جو اس وقت سب سے زیادہ تاک میں اور دھاک میں بیٹھے ہوئے ہیں اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت ہماری سالمیت کے بدترین دشمن ہیں اور دونوں کا بڑا گہرا باہمی گٹھ جوڑ ہے۔

دونوں کو پاکستان کی طرف سے ہمیشہ سے شدید تشویش لاحق رہی ہے۔ اب "مسئلہ افغانستان" سے انکی فکر اور تشویش میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اگر وہاں پر مجاہدین کی مستحکم حکومت قائم ہو جائے تو روس کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ روسی ترکستان میں جو پانچ سات کروڑ مسلمان آباد ہیں، ان کا وہاں پر مسلط روسی نظام کے خلاف ایک تحریک برپا کر دینا ایک لازمی امر ہے۔ افغانستان میں ایسے عناصر کی حکومت جنہیں بنیاد پرست (FUNDAMENTALISTS) کہا جاتا ہے اگر مستحکم ہو جائے تو ہندوستان کا خطرہ بھی دوچند ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ نہ تو احمد شاہ ابدالی کو بھولے ہیں، نہ محمود غزنوی کو اور نہ ہی شہاب الدین غوری کو۔ اسی طرح چاہے خاندان غلاماں کے حکمران ہوں، چاہے خاندان مغلیہ کے یا لودھی خاندان کے سب وہیں سے ہندوستان میں آئے۔ ہندوستان کے ہندو اس طویل تاریخ کو کس طرح

اموش کر سکتے ہیں۔ یہ خطرہ توان کے ذہنوں پر کابوس کی طرح سوار ہے۔ وہاں اگر خالص
سلامی حکومت قائم ہو جائے تو بھارت کی تو نیند اچاٹ ہو جائے۔
سانحۂ بہاولپور کے بارے میں یقین کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا' لیکن غالب قرائن اسی
ت کے حق میں ہیں کہ یہ عظیم حادثہ انہی دونوں کے گٹھ جوڑ سے ہوا ہے۔ انہوں نے کوشش
ہے کہ پاکستان کو غیر مستحکم (DE STABILIZED) کر دیں۔ ان حالات میں اگر کہیں وہ تحریک چلتی تو میرے نزدیک
معاملہ بڑے خوفناک نتائج کا حامل ہو سکتا تھا۔ یہ تو ہم پر اللہ کا ایک بہت بڑا احسان ہوا ہے کہ
وقت وہ معاملہ اس طور سے ختم ہو گیا۔ اللہ نے صدر ضیاء الحق صاحب کو انتہائی قابل
ک موت عطا فرما دی جو دنیوی اور اخروی دونوں اعتبارات سے ان کے لئے انتہائی باعزت
قابل احترام بھی ہو گئی اور وہ منظر سے بھی ہٹ گئے۔ اور جو صورت حال اس قسم کی کسی
یک کی کامیابی کے بعد ہوتی وہ اس وقت ملک میں پیدا ہو گئی۔ تو میرے نزدیک یہ بھی اللہ کی
ت کا ایک مظہر ہے کہ اس توڑ پھوڑ' ایجی ٹیشن اور ہنگامے سے ملک محفوظ رہا۔ صدر
ءالحق صاحب تو صاف کہتے تھے کہ اُن کا حلقۂ انتخاب فوج ہے۔ تو اگر کہیں خدانخواستہ وہ
ادم ہو جاتا تو گویا کہ براہ راست فوج کی محاذ آرائی عوام کے ساتھ ہوتی۔ یہ معاملہ ہمارے
ے انتہائی خوفناک نتائج کا حامل ہوتا تھا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے اور اس شر سے اللہ
، ہمارے لئے ایک خیر بر آمد کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
سىٰٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ
شَرٌّ لَّكُمْ
ور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو درآنحالیکہ اس میں تمہارے لئے خیر ہو اور ہو سکتا
، کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور اس میں تمہارے لئے شر ہو۔" وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ○ "اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔" فارسی کا ایک بڑا عمدہ مصرع
، ہے

عدو شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

، دشمن ہمارے لئے شر کا اہتمام کرتا ہے' فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ
قدرت کاملہ ہے کہ وہ اسی کو ہمارے حق میں خیر بنا دیتا ہے۔ کبڑے کو کسی نے زور سے لات
ی تو اس کی کوب نکل گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی قدرتوں کے مظاہر ہیں۔ اگرچہ
رے لئے یہ حادثہ انتہائی افسوسناک ہے اور جس درجہ میں اس پر افسوس اور تاسف کا اظہار

کیا گیا ہے وہ یقیناً ایک مثالی شے ہے اور پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثال شاید قائد اعظم
انتقال کے بعد کسی شخصیت کے بارے میں نہ ملے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمن کے اس شر
اندر سے ہمارے لئے خیر بر آمد کر دیا کہ اس دائرہ خبیثہ (VICIOUS CIRCLE) ک
خطرناک ترین موڑ لا محالہ آنے والا تھا، اسے خود ہی ختم کر دیا اور جو صورت اس کے بعد
ہونی تھی وہ اس وقت پیدا ہو گئی۔

ضیاء مرحوم کی وفات سے پیدا شدہ خلا کے منفی اثرات سے بچے رہنا

دوسری بڑی ہی خوش آئند بات یہ کہ یہ بھی یقیناً اللہ کا بہت بڑا فضل و کرم ہے کہ
ضیاء الحق صاحب کی اتنی گھمبیر شخصیت کے اٹھ جانے سے جو اتنا مہیب خلا پیدا ہوا ہے، اس
بھی اس ارض پاکستان پر کوئی منفی اثرات مترتب نہیں ہوئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قائد اعظم محمد
جناح اور قائد ملت لیاقت علی خان دونوں کو ذرا ایک طرف رکھ دیجئے تو اتنی گھمبیر شخصیت
ہمارے ہاں کوئی اور نہیں آئی۔ یعنی ایک طرف فوج ان کی پشت پر، فوج ان
CONSTITUENCY، اور آخری دم تک چیف آف آرمی سٹاف کی وردی ان کے جسم
موجود تھی۔ ثانیاً ہمارے ملک کے سیاسیین کا ایک دھڑا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اگرچہ
انہوں نے سیاسی لوگوں کے بارے میں کبھی کوئی کلمۂ خیر نہیں کہا، بلکہ وہ تو سیاسی جماعتوں
سیاست دانوں کا تذکرہ انتہائی تحقیر آمیز انداز میں کرتے رہے۔ ایک ایرانی اخبار کو انٹرویو د
ہوئے انہوں نے یہاں تک کہا تھا کہ یہ سیاست دان کیا ہیں، ان کی کوئی حیثیت نہیں۔
جب انہیں بلاؤں گا یہ دم ہلاتے ہوئے میرے پاس آ جائیں گے۔ بہرحال ہمارے یہا
سیاست دانوں کی ایک جنس ہے، جو کہ ہر صاحب اقتدار کے آگے پیچھے رہتے ہیں، اس کا کا
پڑھتے ہیں اور اس کا دم بھرتے ہیں۔ ضیاء الحق کے اندر تو پھر بھی ذاتی شخصیت و کردار
اعتبار سے بہت ساری باتیں ایسی موجود تھیں جو قابل مدح تھیں، لیکن یہاں تو اگر کوئی شخص ا
اوصاف سے بالکلیہ خالی ہو تو تب بھی اس کے گلے میں ہار ڈالنے والے موجود ہیں۔ بہرحا
ان سیاست دانوں کا بھی ایک مضبوط دھڑا ان کے ساتھ تھا۔

پھر ہمارے ملک میں مذہب کا نعرہ سیاسی اپوزیشن کا ایک بہت بڑا ہتھیار رہا ہے۔ ایوب
خان اور بھٹو کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں سب سے مؤثر نعرہ یہی مذہب ہی کا تھا، لہٰ
پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی تحریک کو بھی تحریک نظام مصطفیٰ بننا پڑا۔ اس کے بغیر عوا

اپل حاصل نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہ ہتھیار بھی اب ضیاء الحق صاحب نے اپنے ہاتھ میں لے لیا
تھا اور اسے کسی اور سیاسی و مذہبی جماعت کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیا تھا۔ اس طرح انہوں
نے ان کو بالکل نہتا کر کے رکھ دیا تھا۔ لہٰذا اتنی گمبھیر شخصیت اس وقت کوئی نہیں تھی اور نہ ہی
مستقبل قریب میں کوئی توقع ہے کہ ایسی کوئی شخصیت سامنے آ سکے۔ اب ان کے یکدم ہٹ
جانے سے ایک بہت بڑا مہیب خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اور واقعی ہمارے دشمنوں نے سمجھا تھا کہ اس
سے پاکستان یکدم تہ و بالا ہو کر رہ جائے گا۔ اگرچہ ہم "چہ نسبت خاک را با عالم پاک" کے
مصداق اس حادثے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر کسی طرح بھی قیاس نہیں کر سکتے،
لیکن ہم اپنے حالات کے لئے روشنی حاصل کرنے کے لئے دور صحابہؓ ہی کی طرف رجوع
کرتے ہیں۔ ایرانی مجوسیوں نے یہ سمجھا تھا کہ حضرت عمرؓ کو شہید کر دیا جائے تو یہ تمام تانا بانا
بکھر جائے گا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا، اللہ کا فضل شامل حال رہا اور وہ نظام برقرار رہا۔ اب کروڑ
ہیں ایک کی نسبت سے ہی اپنے اس معاملے کو دیکھیں تو یہاں بھی اللہ کا بڑا فضل ہوا ہے کہ
ارض پاکستان پر اتنے مہیب خلاء کے بعد بھی کوئی منفی اثرات مترتب نہیں ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ
کی خصوصی رحمت تھی کہ حالات کا دریا بڑی روانی اور عمدگی کے ساتھ بہتا رہا، جس پر پوری دنیا
نے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ دنیا تو اپنے ظاہری اسباب کے حوالے سے گفتگو کرتی ہے، لیکن
ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ " لا مؤثر فی الحقیقۃ و لا فاعل الا اللہ " اللہ کے سوا نہ کوئی
فاعل حقیقی ہے اور نہ ہی کوئی مؤثر حقیقی۔ تمام لوگوں کے دل اللہ کی انگلیوں کے
مابین ہیں، جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ جو کچھ ہو رہا ہے اگرچہ اس کے ظاہری اسباب پر
بھی گفتگو ہونی چاہئے کہ ہم عالم اسباب میں رہ رہے ہیں اور اسباب و علل کے ایک سلسلے میں
بندھے ہوئے ہیں، لیکن ان تمام اسباب کے پیچھے مسبب الاسباب کا ہاتھ کارفرما ہے۔ تو میرے
نزدیک یہ رحمت خداوندی کا بہت بڑا مظہر ہے کہ ہم اپنے انتہائی دگرگوں اندرونی حالات اور
تمام تر مذہبی و سیاسی انتشارات کے باوجود اس مہیب خلاء سے بخیر و خوبی گزر گئے ہیں، بلکہ صحیح تر
الفاظ یہ ہوں گے کہ اللہ نے ہمیں گزار دیا ہے۔

میں نے اپنی کتاب "استحکام پاکستان" میں تصویر کے یہی دو رخ دکھائے ہیں کہ
حالات و واقعات کو دیکھتا ہوں تو بہت مایوسی ہوتی ہے، لیکن یہ بھی نظر آتا ہے کہ مشیت ایزدی کا
اس خطۂ ارضی کے ساتھ کوئی طویل المیعاد منصوبہ (LONG TERM PLAN) وابستہ ہے
اور غلبۂ اسلام جو عالمی سطح پر ہو کر رہے گا، اس کی تحریک کے لئے شاید اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس

کی مشیت میں اس خطۂ ارضی کا انتخاب ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے
اب تک گذشتہ چار سو برس میں جتنی بھی تجدیدی تحریکیں اٹھی ہیں وہ سب کی سب اسی سرز
سے متعلق ہیں۔ پھر اسلام کے نام پر پاکستان کا معجزانہ قیام اللہ تعالیٰ کی خصوصی مشیت
حکمت کا مظہر ہے۔ اگرچہ ۱۹۷۱ء میں ہماری پیٹھ پر اللہ کے عذاب کا کوڑا برسا تھا اور یہ ملک
دولخت ہو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب تک یہ "مغربی پاکستان" بھی قائم ہے تو ہمار
بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کی خصوصی رحمت کے سہارے قائم ہے۔ اللہ کی رحمت اور اس
فضل و کرم کے یہ دو بہت بڑے مظاہر جو سامنے آئے ہیں تو اس سے میری امید کو بڑی تقویت
حاصل ہوئی ہے۔

دو اہم شخصیتوں کا احساسِ ذمہ داری

تیسری خوش آئند بات یہ ہے کہ اس وقت دو اہم شخصیتوں نے جن پر بڑی ذمہ دار
آ پڑی ہے' بڑا مثالی کردار ادا کیا ہے۔ ان کے دل میں اگر ذرا سی بھی اقتدار کی خواہش کروٹ
لیتی تو صورت حال مختلف ہوتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انسان کے جو حیوانی داعیات ا
محرکات ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے۔ بلکہ نفسیات میں ایڈلر کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ انسان
محرکات عمل میں سب سے قوی محرک غلبہ اور اقتدار کی خواہش اور حبِ تفوق ہے۔ ہم اس
نظریئے کو تو درست تسلیم نہیں کرتے لیکن اس حد تک بات صحیح ہے کہ یہ خواہش نفس کے اند
موجود ہوتی ہے۔ نئی پیدا شدہ صورت حال میں ایک طرف غلام اسحاق خان صاحب کو موقع
تھا کہ وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرتے' جس سے اقتدار کو طول دیا جا سکتا۔ لیکن الحمد للہ
انہوں نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا ہے۔ ان کی اس وقت کی نفسیاتی کیفیت میں ان کی ۴
برس کی عمر کو بھی دخل ہے اور اُن کے ملکی معاملات کے طویل تجربے کو بھی۔ بہر حال اب تک
تو صورت یہی ہے' آئندہ کے لئے ہم یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل میں کوئی اس طرح
کی امنگ پیدا نہ کر دے اور وہ اس ملک کو معروف معنوں میں دستوری پٹڑی کے اوپر ڈال
سکیں۔ اسی طرح کا معاملہ ہمارے چیف آف آرمی سٹاف کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزا دے
کہ انہوں نے بھی اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا ہے۔ افواہیں تو بہت ہیں اور معلوم نہیں کہ کس
حد تک صحیح ہیں' بہر حال یہ تو اخبارات میں بھی آ چکا ہے کہ انہیں باقاعدہ اکسایا گیا ہے' لیکن
الحمد للہ انہوں نے اس وقت تک اس رخ پر نہیں سوچا' بلکہ اس کے برعکس انہوں نے جوا

پالیسی بیان کی ہے وہ اطمینان بخش ہے۔ تو میرے نزدیک یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور اس ملک کے مستقبل کے بارے میں اچھی امید دلانے والی باتوں میں سے ایک ہے۔

اب تک کی گفتگو میں میں نے آپ کے سامنے ایک طرف تو پاکستان کے موجودہ حالات کے منفی پہلو کا مختصراً تجزیہ پیش کیا ہے کہ اس کا سبب کیا ہے' قرآن مجید کی رو سے اس کی تشخیص کیا ہے؟ اور دوسری طرف حالات کے جو امید افزاء پہلو ہیں وہ بھی میں نے آپ کے سامنے رکھ دیئے ہیں۔

سیاسی و مذہبی رہنماؤں کی خدمت میں چند مشورے

اب ان حالات میں میں سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی خدمت میں کچھ مشورے پیش کرنا چاہتا ہوں' جو میرا آج کا اصل موضوع ہے۔ اس کے ضمن میں میں سب سے پہلے عرض کر دوں کہ میرے بارے میں اب تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں۔ میں بہت پہلے یہ طے کر چکا ہوں کہ اس انتخابی سیاست کے میدان میں قدم رکھنا ہی نہیں۔ میں ۶۵ ,۶۶ء میں جب لاہور آیا تھا اُس وقت صدر ایوب خان کے خلاف فضا ہموار ہونی شروع ہو گئی تھی۔ اُن دنوں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب خود چل کر کئی بار میرے کلینک میں آئے۔ یہ حنیف رامے صاحب اور عبداللہ ملک صاحب وغیرہ کے ساتھ ایک گروپ بنا کر سیاسی تحریک شروع کرنے کی سوچ رہے تھے۔ بعد میں اس گروپ نے بھٹو صاحب کے ساتھ منسلک ہو کر پاکستان پیپلز پارٹی کی شکل اختیار کی۔ انہوں نے دعوت دی تو اس وقت بھی میں نے اپنا ایک کتابچہ "اسلام کی نشأۃ ثانیہ' کرنے کا اصل کام" ان کی خدمت میں پیش کر دیا تھا کہ جناب میں تو یہ کام کرنا چاہتا ہوں۔ پھر یہاں کتنے ہی موڑ آئے اور سیاست کی بہتی گنگا میں کتنے ہی لوگوں نے ہاتھ دھوئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ میں نے کسی موڑ پر بھی کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ سیاست کے میدان میں دو چیزوں کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے' یعنی کچھ بولنے کی صلاحیت اور کچھ لکھنے کی صلاحیت' لیکن میں نے بفضلہ تعالیٰ یکسو ہو کر اپنی ان صلاحیتوں کو قرآن مجید کی دعوت کو عام کرنے میں لگایا ہے۔ پیش نظر کیا تھا؟ دین کا انقلابی تصور سامنے آ جائے اور غلبۂ دین جو مقصدِ بعثتِ محمدیؐ ہے' اس کے لئے تن' من' دھن سے جہاد اور جدوجہد کرنے کی آرزو اور جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور یہ قرآن ہی سے ہو گا' کسی اور کے اپنے

فلسفے سے یا کسی کی تصانیف سے نہیں ہو گا۔ قرآن ہی اس کے لئے منبع اور سرچشمہ ہے۔ تو یہ میرا مقصد تھا جس کے لئے میں لگا رہا۔ پھر جو لوگ عہد کریں کہ اس مقصد کے لئے تن، من، دھن لگا دیں گے، ان کو منظم کرنے کے لئے تنظیم اسلامی قائم کی۔ میں آج تک کسی سیاسی میدان میں نہیں آیا اور آئندہ کے لئے بھی یہی عزم ہے کہ انتخابی سیاست میں تو قدم ہی نہیں رکھنا ہے۔

البتہ جیسا کہ بارہا عرض کیا ہے کہ اس ملک کے شہری ہونے کے اعتبار سے مجھے اس کی بھلائی مطلوب ہے۔ دنیوی اعتبار سے بھی کہ اسی سرزمین پر میرا گھروندہ ہے اور اسی سے میری اولاد کا مستقبل وابستہ ہے اور دینی اعتبار سے بھی، اس لئے کہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اسلام کے عالمی غلبے کا تعلق بھی مشیت ایزدی میں اسی خطۂ ارضی کے ساتھ ہے اور اس ملک کی جڑ اور بنیاد اسلام کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اس ملک کی خیر خواہی میں مشورہ دینا میں نے ہمیشہ اپنا فرض سمجھا ہے اور اس کے لئے میرے سامنے جو اصولی ہدایت ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے جس میں دین کی تعلیم کا خلاصہ آ گیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: الدین النصیحۃ یعنی دین تو نام ہے خیر خواہی کا، اخلاص کا، وفاداری کا، دوسروں کی بھلائی چاہنے کا۔ ہمارے ہاں لفظ نصیحت صرف ایک معنی میں آتا ہے کہ کسی کو اچھی بات کہنا، نصیحت کرنا، لیکن عربی میں اس کا اصل مفہوم خلوص اور اخلاص ہے۔ آپ کسی کو نصیحت بھی کرتے ہیں تو جب تک آپ کے دل میں اس کی خیر خواہی نہیں ہوگی، آپ کی بات نصیحت شمار نہیں ہوگی۔ تو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ دین تو اصل میں نام ہی نصیحت کا ہے یعنی خلوص و اخلاص اور وفاداری و خیر خواہی کا۔ قیل لمن یا رسول اللہ۔ سوال کیا گیا کہ حضورؐ کس سے خلوص و اخلاص اور وفاداری؟ کس کی خیر خواہی؟ بڑی پیاری بات ہے جو حضورؐ نے جواب میں فرمائی۔ یہ پورے دین کا ایک خلاصہ ہے۔ آپ نے فرمایا: للہ ولکتابہ ولرسولہ ولائمۃ المسلمین وعامتہم۔ یہ خلوص و اخلاص اور وفاداری سب سے پہلے اللہ کے ساتھ۔ ہمارا یہ دین دینِ توحید ہے۔ اس کی جڑ بنیاد ہی ایمان باللہ ہے۔ پھر اللہ کا کلام ہے جو گویا کہ اس کی صفت ہے۔ کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے۔ یہ ہمارے اور اللہ کے درمیان زندہ رابطہ ہے، یہ حبل اللہ ہے، اس کے ساتھ وفاداری۔ پھر وہ ہستی جس پر یہ نازل ہوئی، جس نے ہمارے لئے ہر اعتبار سے اپنا اسوۂ حسنہ چھوڑا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ

وفاداری۔ اس کے بعد فرمایا گیا : و لائمۃ المسلمین۔ اور مسلمانوں کے جو امام ہوں ' جو ان کی قیادت کر رہے ہیں ' جن کی طرف لوگ رہنمائی کے لئے دیکھتے ہوں ان کی خیر خواہی۔ ائمۃ المسلمین سیاسی بھی ہو سکتے ہیں اور دینی بھی۔ ہر مسجد کے اندر ایک امام ہوتا ہے ' جو آگے ہوتا ہے اور مقتدی اس کی پیروی کرتے ہیں۔ تو یہ امامت صرف سیاسی امامت نہیں ہے بلکہ اس کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں ' ان کی ملی زندگی کے اندر ' جو لوگ بھی کسی اعتبار سے نمایاں حیثیت کے حامل ہوں اور لوگ ان کی پیروی کرتے ہوں ' اور ان سے رہنمائی اخذ کرتے ہوں وہ ان کے ائمہ ہیں۔ و عامتہم ..... اور مسلمان عوام جو ہیں ان سب کے ساتھ بھی خلوص و اخلاص اور وفاداری۔ چنانچہ یہ ہے در حقیقت وہ جذبہ جس کے تحت میں یہ باتیں کہہ رہا ہوں۔

مروّجہ پارلیمانی نظام سیاست کو برقرار رکھیے!

سب سے پہلے میں سیاست کے بارے میں چند باتیں اور اہل سیاست کو کچھ مشورے عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے کہ مروجہ پارلیمانی سیاست ہماری ماضی کی تاریخ کے ساتھ بھی وابستگی رکھتی ہے ' اسی کے ذریعے سے پاکستان وجود میں آیا اور اسی کا ہماری قوم کو کچھ تجربہ بھی ہے۔ لہٰذا بحالات موجودہ اس سے انحراف کی کوئی کوشش انتہائی خوفناک ہو سکتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس سے بہتر کوئی اور نظام نہیں ہے۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا نظام جو ہے صدارتی نظام سے قریب تر ہے لیکن موجودہ حالات میں مناسب ترین یہی ہے کہ مروّجہ پارلیمانی نظام میں کہیں کوئی بنیادی تبدیلی فوری طور پر نہ لائی جائے۔ کوئی بنیادی تبدیلی کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں آ سکتی ہے ' جس کے لئے پہلے اس کا فلسفہ پیش کرنا ہو گا اور اس کے حق میں دلائل دینے ہوں گے۔ بدقسمتی سے ماضی قریب میں کچھ لوگوں نے صدر ضیاء الحق صاحب کو بڑی غلط پٹیاں پڑھائیں اور غلط فلسفے ان کے ذہن میں ڈالے ' جس کی وجہ سے انہوں نے اس پارلیمانی نظام سیاست کو خلاف اسلام سمجھ لیا کہ اسلام کا نظام کچھ اور ہے۔ وہ کیا ہے؟ اس کی بھی کوئی تعریف ' کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شدید کنفیوژن پیدا ہو گیا۔ تو اب جبکہ ضیاء الحق صاحب تو منظر سے ہٹ گئے ہیں از سر نو اس بحث کو نہیں اٹھانا چاہئے۔ جن لوگوں نے ان کو یہ پٹیاں پڑھائیں ان میں سے ایک صاحب

اس وقت بھی وزارت کے منصب پر فائز ہیں۔ ان کا عجیب نقشہ میرے سامنے آیا کہ ابھی جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ انتخابات سے قبل نگران حکومتیں اور وزارتیں ختم کر دی جائیں یا کم سے کم یہ طے کر دیا جائے کہ جو وزارت پر ہو گا' وہ الیکشن میں حصہ نہیں لے گا تو ان صاحب نے دہائی دی کہ دنیا میں کہاں یہ اصول ہے؟ حالانکہ یہ وہی صاحب ہیں جو دنیا کی کسی بات کو ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ سیاسی جماعتوں کے قیام کو بھی خلاف اسلام سمجھتے ہیں' اور جماعتی سیاست کو کفر قرار دیتے ہیں' لیکن چونکہ حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے اس وقت وہ وزیر ہیں لہٰذا اب دہائی دے رہے ہیں کہ دنیا میں تو کہیں اس کا رواج نہیں ہے۔ تو یہ ہے ہماری ژولیدہ فکری اور ہمارے قول و عمل کے تضاد کا عالم! اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ چونکہ خود پاکستان کا وجود میں آنا بھی مروّجہ پارلیمانی سیاست ہی کا مرہون منت ہے اور اسی نظام سیاست کو لے کر چلنے کی کچھ صلاحیت اور کچھ تجربہ اس قوم کو حاصل ہوا ہے لہٰذا اس میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔

جماعتی سیاست خلافِ اسلام نہیں ہے

دوسری بات یہ کہ میں علیٰ وجہ البصیرت کہہ رہا ہوں کہ اس میں ہرگز کوئی شے خلاف اسلام نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جب الازہر کے ریکٹر یہاں آئے تھے تو اسی قسم کے بزرجمہر جو یہاں موجود ہیں' جنہوں نے صدر ضیاء صاحب کو نئے نئے فلسفے پڑھائے تھے' انہوں نے ان سے فتویٰ لینے کی کوشش کی تھی کہ یہ جماعتی سیاست اور سیاسی جماعتوں کا قیام خلافِ اسلام ہے۔ انہیں کچھ لوگوں کی طرف سے فتوے مل بھی گئے تھے اور انہوں نے بڑے پرامید انداز میں چاہا تھا کہ ایک ہزار سالہ علمی تاریخ کے حامل' عالم اسلام کے قدیم ترین دار العلوم کے ریکٹر اور شیخ الازہر سے اگر یہ فتویٰ مل جائے تو کیا کہنے ہیں! لیکن اللہ کا شکر میں نے اس وقت بھی ادا کیا تھا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی ہاں میں ہاں نہیں ملائی بلکہ صاف کہا تھا کہ سیاسی جماعتوں کا قیام اور جماعتی بنیادوں پر سیاست کا چلانا ہرگز خلاف اسلام نہیں ہے۔ میرا یہ انشراحِ صدر پہلے بھی تھا کہ یہ خلاف اسلام نہیں ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے اعتبار سے اس سے بہتر کوئی شے ہو سکتی ہے۔ یہ بحث کی جا سکتی ہے کہ کونسی چیز بہتر ہے اور کونسی کمتر ہے لیکن میرے نزدیک اس وقت یہ بحث چھیڑنے کا بھی موقع نہیں ہے' اس لئے کہ کوئی بہتر شے لانے کے لئے کسی انقلابی عمل کی ضرورت ہو

گی۔ اس کے بغیر اس کا ذکر کرنا خالصتاً ذہنی انتشار پیدا کرنا ہے، جو ملک و ملت کے حق میں ہرگز مفید نہیں ہے۔

دو مضبوط اور مستحکم جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے

تیسری بات یہ جان لیجئے کہ اس مروجہ پارلیمانی نظام کی ایک لازمی شرط (PRE-REQUISITE) یہ ہے کہ دو بڑی بڑی مضبوط اور مستحکم سیاسی جماعتیں میدان میں موجود ہوں۔ اور اگر ایک ہی جماعت رہ جائے تو پھر آمریت پیدا ہو جائے گی خواہ کوئی بھی ہو، پیپلز پارٹی ہو یا مسلم لیگ۔ جب انا و لا غیری (میں اور میرے سوا کوئی نہیں) کی کیفیت ہوتی ہے، جب انسان دیکھتا ہے کہ کوئی اس کے مقابل نہیں، کوئی اس کا محاسبہ کرنے والا نہیں، کوئی مضبوط حزبِ مخالف نہیں تو اس کے اندر آپ سے آپ مقتدر اور مقتدر مطلق بننے کی خواہشات انگڑائیاں لینے لگتی ہیں۔ لہٰذا کسی کے اندر اس قسم کے خنّاس کو پیدا ہونے سے روکنے کے لئے اور اس پارلیمانی نظام کے بخیر و خوبی چلنے کے لئے دو مضبوط و مستحکم سیاسی جماعتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ ایسی عوامی قومی جماعتیں ہونی چاہئیں جن کا مؤقف اور نقطۂ نظر بہت زیادہ مختلف نہ ہو، ورنہ تو وہ انقلابی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ ان دونوں جماعتوں کے اندر انتہاپسندی نہ ہو بلکہ ان کے مابین فرق اس اعتبار سے ہو کہ جدید اصطلاح میں ایک کو 'RIGHT OF THE CENTRE' اور ایک کو 'LEFT OF THE CENTRE' کہا جا سکے۔ اس کی مثال برطانیہ کے پارلیمانی نظام میں بھی ہے اور امریکہ کے صدارتی نظام میں بھی۔ ہمارا نظام برطانوی پارلیمانی نظام کا چربہ ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ وہاں کی دو بڑی جماعتوں، کنزرویٹو پارٹی اور لیبر پارٹی کے نظریات و افکار میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کنزرویٹو پارٹی ذرا سا دائیں طرف ہے اور لیبر پارٹی ذرا سا بائیں طرف ہے۔ باقی ان کے مابین نہ قوم پرستی کی بنیاد پر کوئی اختلاف ہے اور نہ ہی وہاں کی دستوری روایات میں قطعاً کوئی اختلاف ہے۔ اختلاف ہو گا تو کچھ مالی معاملات میں اور کچھ امیگریشن پالیسی وغیرہ کے بارے میں اس لئے کہ گاڑی ٹھیک طور سے تب ہی چل سکتی ہے جب اس کے دونوں پہیے متوازی ہوں اور قریب قریب ہوں۔ اسی طرح آپ کو معلوم ہے کہ امریکہ میں اگرچہ صدارتی نظام ہے لیکن وہاں بھی دو پارٹیز ہیں اور کوئی لمبا چوڑا فرق و اختلاف ان میں نہیں ہے۔ ایک طرف ری پبلکن ہیں جنہیں آپ 'RIGHT OF THE CENTRE' کہہ سکتے ہیں اور

دوسری طرف ڈیموکریٹس ہیں جنہیں آپ ' LEFT OF THE CENTRE' کہہ سکتے ہیں اور میں اب جو بات کہنے والا ہوں اس کی شہادت آپ کو بے نظیر بھٹو صاحبہ کی اس دعا سے مل گئی ہوگی جو اخبار میں شائع ہوئی ہے کہ کاش امریکہ کے انتخاب میں ڈیموکریٹس جیت جائیں۔ یہ وہی ' LEFT OF THE CENTRE' والی بات ہے۔ ظاہر ہے کہ جو رجحان اپنا ہو گا اسی کے لئے پسندیدگی باہر بھی ہوگی۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اب تک تو ایسی کوئی شکل تھی ہی نہیں۔ کوئی سیاسی جماعت یہاں مستحکم نہیں تھی۔ ابتدا میں مسلم لیگ تھی جو بہت جلدی انتشار کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ پھر اسی کے بطن سے سہروردی کی عوامی لیگ بر آمد ہوئی' پھر اسی سے ممدوٹ شاہ کی جناح لیگ بر آمد ہوئی اور پھر نہ معلوم اس کے کیا کیا حصے بخرے ہوئے۔ کنونشن لیگ' کونسل لیگ اور قیوم لیگ اور اب تو پتہ نہیں کتنی لیگیں ہیں۔ وقت پڑنے پر مختلف سیاسی جماعتوں کے اتحاد بن جاتے ہیں۔ کچھ لیڈر جن کے بارے میں صحیح کہا تھا ضیاء الحق صاحب نے کہ تلنگے کی سواریاں ہیں' ان کے بیانات آتے ہیں' وقت کے اوپر جمع ہو جاتے ہیں اور بیچ میں کوئی مذہبی نعرہ شامل کر کے تحریک چلا لیتے ہیں۔ اس کے سوا ہماری کسی بھی جماعت کو کوئی سیاسی سٹینڈنگ حاصل نہیں ہے اب ایک خوش آئند تبدیلی یہ محسوس کی جا سکتی ہے کہ ضیاء الحق صاحب کے دورِ اقتدار کے گیارہ برس کے دوران پیپلز پارٹی نے ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اپنے ' CREDENTIALS' بہت مستحکم کر لئے ہیں۔ پاکستان میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال نہیں تھی کہ کوئی سیاسی پارٹی نہ صرف یہ کہ حکومت سے باہر رہ کر بلکہ وقت کی مضبوط ترین حکومت کی اولین دشمن شمار ہو کر اور اس کے خلاف ساری قوت بروئے کار آنے کے باوجود قائم رہ گئی۔ یہ واقعتاً بہت بڑی بات ہے۔ اگرچہ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس کا قائم رہ جانا میرے نزدیک پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے اور پارلیمانی سیاست کی پہلی لازمی شرط کے اعتبار سے ایک امید افزا بات ہے۔ اسی کے ساتھ ایک اور پہلو شامل کیجئے کہ الحمد للہ پیپلز پارٹی کا اب وہ جوشیلا اور ہنگامہ برپا کرنے والا انداز' وہ پہلی سی انتہا پسندی اور سوشلزم کے ساتھ وہ انتہائی وابستگی' یہ سب کچھ اب برقرار نہیں رہا۔ صورتِ حال رفتہ رفتہ یہاں آ گئی ہے کہ اب یہ کوئی انتہائی بائیں بازو کی پارٹی نہیں رہی۔ میرے اندازے میں یہ درمیان میں آ چکی ہے' اگرچہ اس کا رجحان

بائیں بازو کی طرف ہے اور اب آپ زیادہ سے زیادہ اسے LEFT OF THE CENTRE کی پارٹی کہہ سکتے ہیں۔ ان کا وہ انتہاپسندی والا رجحان اب ختم ہو چکا ہے اور بے نظیر صاحبہ نے بڑی بڑی یقین دہانیاں کروائی ہیں، باہر بھی، اندر بھی، فوج کو بھی، سرمایہ داروں کو بھی، طرح طرح سے اطمینان دلانے کی کوشش کی ہے کہ ؎

میرے اس دور کو اب قصۂ ماضی سمجھو![1]

وہ دور اور تھا، اب ہم کچھ اور ہیں۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ یقین دہانیاں نتیجہ خیز ہوں گی اور ان کی پارٹی ہمارے ملک میں ایک LEFT OF THE CENTRE پارٹی کی حیثیت میں کام کرے گی۔

دوسرا ایک عمدہ نکتہ جو سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کی صفوں میں بھی ایک معجزہ رونما ہو گیا ہے۔ جونیجو صاحب جس طرح ذلیل و خوار کر کے کوچۂ اقتدار سے نکالے گئے، جس طرح وقت کی گھمبیر ترین شخصیت نے ان کے خلاف الزامات لگائے اور جس بڑے پیمانے پر ان کی کردار کشی کی گئی، اس کے باوجود ان کا کھڑا رہ جانا، پھر یہ کہ ان کا شریفانہ انداز اختیار کئے رکھنا اور جواباً کوئی اشتعال انگیزی کا ثبوت نہ دینا، یہ بھی بڑی امید افزا بات ہے۔

ان کا پہلا ردِ عمل تو یہی تھا کہ ٹھیک ہے ان کا دستوری حق تھا، اگر انہوں نے برخاست کر دیا تو یہ ایک دستوری اقدام تھا۔ بعد میں اگرچہ انہیں خیال آیا کہ یہ بات میں نے کچھ زیادہ آگے کی کہہ دی ہے لیکن انہوں نے کوئی گالم گلوچ کی شکل اختیار نہیں کی، کوئی جذباتی ہنگامہ آرائی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور پھر ایک شخص جو اس طرح سے ایوان حکومت سے نکال باہر کر دیا گیا ہو، مسلم لیگ کے کچھ مؤثر عناصر کا اس کے ساتھ جڑا رہ جانا واقعتاً بہت بڑی بات ہے۔ چاروں صوبائی لیگیں جو حکومت میں ہیں یہ ابھی اس ٹیسٹ سے نہیں گزری ہیں۔ ان میں جو لوگ ہیں وہ اگر حکومت سے نکل جانے کے باوجود کھڑے رہ جائیں تو معلوم ہو گا کہ انہوں نے اپنے اس سیاسی ٹیسٹ میں اپنی اہلیت ثابت کر لی ہے۔ لیکن چاروں صوبائی ذی اقتدار شخصیتوں کی متحدہ کوشش کے باوجود جونیجو صاحب کا اپنی جگہ پر کھڑے رہ جانا اور ان کے پہلے کنونشن کا کامیابی سے منعقد ہو جانا میرے نزدیک یہ مسلم لیگ کی صفوں میں ایسا معجزہ

---

[1] اکبر الٰہ آبادی مرحوم شعر در اصل یوں ہے:۔

میرے اسلام کو اب قصۂ ماضی سمجھو! ہنس کے وہ بولی کہ پھر مجھ کو بھی ماضی سمجھو!

ہے، جو ایک عرصے کے بعد رونما ہوا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ میں نے یہاں دو جمعوں میں مسلم لیگیوں کے لئے دعا کرائی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں متحد ہونے کی توفیق عطا کرے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کہیں یہ صورت نہ ہوئی اور موجودہ صورت حال میں اقتدار پیپلز پارٹی کے پاس آگیا تو وہ بے راہ ہو جائیگی اور پھر اس کو روکنے، تھامنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ چنانچہ ملکی سیاست کو متوازن رکھنے اور صحیح رخ پر چلانے کے لئے کم سے کم دو مضبوط جماعتوں کا وجود ضروری ہے۔ اور اسی طرح سے پارلیمانی سیاست کا ایک لازمی تقاضا پورا ہو سکتا ہے۔

دائیں اور بائیں کی بنیاد پر نئی الائنمنٹ کیسے ہونی چاہیے

آپ لوگ محسوس کر رہے ہوں گے کہ کسی آمرانہ شخصیت کے میدان سے ہٹنے کے بعد ہمارے ہاں جو صورت ہوا کرتی تھی ــــــــــــ اب اس کے آثار دوبارہ پیدا ہو چکے ہیں۔ ضیاء صاحب کی موجودگی میں جو الائنمنٹ ہو رہا تھا وہ اب ٹوٹ پھوٹ رہا ہے۔ وہ کوئی اور صورت حال تھی جس میں کچھ جماعتوں کے درمیان مفاہمتوں کی فضا پیدا ہوئی تھی۔ اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اب ہمارے ہاں جو POLARIZATION ہو گی وہ لیفٹ اور رائٹ کی بنیاد پر ہو گی ان حالات میں سیاسی جماعتوں کے لئے میرا مشورہ کیا ہے، اس کو سمجھئے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ اللہ تعالیٰ مسلم لیگ کو توفیق دے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے گروپ مدغم ہو کر ایک مضبوط سیاسی جماعت بنائیں۔ ظاہر بات ہے کہ مسلم لیگ اسلام کی نام لیوا جماعت ہے اور پاکستان اسی کی جدوجہد سے وجود میں آیا تھا، چنانچہ اس طریقے سے یہ ایک مضبوط RIGHT OF THE CENTRE جماعت بن سکے گی۔ ایئر مارشل اصغر خان صاحب پیپلز پارٹی کی نسبت زیادہ بائیں طرف ہیں، ان کے نظریات کچھ زیادہ انقلابی ہیں لیکن کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے ــــــ انہوں نے بھی اب تک بڑی محنت کی ہے۔ میں ان کی محنت کا قائل ہوں، میں ان کے حب وطن کا قائل ہوں۔ پھر یہاں کے معاشی نظام کے اندر جو واقعتاً بہت زیادہ اونچ نیچ ہے، وہ چاہتے ہیں کہ اس میں ایک معتدل صورت پیدا ہو جائے۔ انتظامی ڈھانچے کے اندر بھی وہ چاہتے ہیں کہ بنیادی تبدیلی لائیں تاکہ زیادہ فطری سطح پر عوام کی شرکت ہو۔ ان کی جماعت نے بہت کچھ ہوم ورک بھی کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ واحد سیاسی جماعت ہے جس نے ہمارے مختلف معاشی اور سیاسی مسائل کے اوپر گروپ بنا کر کام کیا

ہے' لیکن یہ ان کا اپنی علیحدہ ڈفلی بجانا اور اپنا علیحدہ راگ الاپنا اس نے پہلے بھی بہت سے مراحل پر کافی نقصان پہنچایا تھا اور اب بھی یہ طرزِ عمل مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنا SOLO FLIGHT والا دور بھی پورا کر لیا ہے اور اس سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ قومی سیاست میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے اصل شے قیادت کا ایثار ہے۔ سیاسی پارٹیوں میں کوئی قیادت ہمیشہ کے لئے نہیں ہوتی۔ اب یہاں قائداعظم جیسی قیادت تو کسی کی نہیں۔ کوئی بھی نہیں کہ جو اس طرح کی صلاحیتوں کا مالک ہو کہ ان کی موجودگی میں کسی کا بھی چراغ نہ جل سکے۔ لہٰذا میرے نزدیک ان کے لئے بھی بہترین شکل یہ ہوگی کہ وہ یا تو پیپلز پارٹی کے ساتھ مدغم ہو جائیں یا اس سے اشتراکِ عمل کر لیں۔ مذہبی عناصر کے بارے میں اگرچہ تفصیلاً تو میں بعد میں عرض کروں گا لیکن میری خواہش یہ ہے کہ جو بھی مذہبی جماعتیں' مذہبی گروہ یا مذہبی شخصیتیں سیاست کے میدان میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں وہ بھی ان دو میں سے کسی ایک کو اپنے رجحان کے مطابق چن لیں۔ میرے سامنے سب سے بڑی مثال مسلم لیگ کی ہے۔ قائداعظم اس معنی میں کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے' جس معنی میں ہمارے ہاں ایک مذہبی آدمی کا تصور ہے۔ مسلم لیگ کی صف اول کی قیادت بھی کوئی اس طرح کے مذہبی لوگوں پر مشتمل نہیں تھی' لیکن کیسی کیسی عظیم شخصیتوں اور کیسے بڑے بڑے علماء و مشائخ نے ان کا ساتھ دیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا عبدالحامد بدایونیؒ جیسی علمی اور پیر جماعت علی شاہ صاحبؒ جیسی روحانی شخصیتوں نے ان کا ساتھ دیا تو وہ قومی سیاست کسی ایک نتیجے تک پہنچ سکی۔ اگر سب اپنی علیحدہ علیحدہ ٹکڑیاں بانٹ کر رکھتے تو کبھی بھی پاکستان کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا تھا۔ تو اس وقت جو لوگ بھی قومی سیاست کے دھارے میں آنا چاہیں ان کو بھی اپنا علیحدہ تشخص اور علیحدہ ٹکڑیاں بنا کر رکھنے کی بجائے کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اپنا رجحان دیکھیں اور دائیں یا بائیں جدھر بھی ہو ان میں شامل ہوں تاکہ اس ملک کے اندر دو مضبوط سیاسی جماعتیں وجود میں آ جائیں جو مروّجہ پارلیمانی سیاست کی شرط لازم ہے۔

اس سے ذرا آگے چلئے تو دائیں اور بائیں دونوں طرف انتہاپسند (EXTREMISTS) ہیں دائیں طرف مذہبی جماعتیں ہیں جن میں سے بعض انتہاپسند ہیں۔ بائیں طرف جو انتہاپسند ہیں وہ آپ کو معلوم ہے کہ نیشنلسٹ' کیمونسٹ اور سوشلسٹ ہیں۔ پاکستان میں نیشنلز م

کاسب سے بڑا گڑھ صوبہ سرحد ہوا کرتا تھا' جہاں پر پختون قومیت کا نعرہ لگتا تھا' بلوچستان میں نیشنلزم کے علاوہ کیمونزم بھی بڑی سائنٹفک بنیادوں پر ابھر رہا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب نیشنلزم کا سب سے بڑا گڑھ سندھ بن گیا ہے۔ وہاں پر پلیجو اور جام ساقی وغیرہ سندھی قوم پرستی کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں اور قوم پرستوں کا بادشاہ جی ایم سید بھی وہیں سرگرم عمل ہے۔ چنانچہ وہاں بڑی ہی تشویش ناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے اور اگر قومی سیاست کے دھارے کے یہ جو دو اہم حصے ہیں یہ مضبوط نہ کیے گئے تو شدید انتشار کا خطرہ ہے' جس سے فائدہ اٹھائیں گے یہی بائیں بازو کے انتہاپسند لوگ جو یہاں پر مارکسزم' سائنٹفک کیمونزم یا ' CESSATIONISM ' کے علمبردار ہیں اور پاکستان کو توڑنے کے عزائم کا برملا اظہار کرتے ہیں۔

مذہبی رہنماؤں سے چند خصوصی گزارشات

اب میں چند باتیں مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں اور مذہبی شخصیات کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے ہی قدم پر میں عرض کر دوں کہ مجھے بڑا خوف ہے کیونکہ اہلِ سیاست تو خود بھی کھلی بات کہتے ہیں اور انہیں کھلی بات سننے کی عادت بھی ہوتی ہے لیکن مذہبی رہنماؤں کے ہاں ع

ہشدار کہ رہبر دم تیغ است قدم را

کے مصداق بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں اتنے کھلے دل کے ساتھ بات سننے کی روایت اتنی زیادہ موجود نہیں ہے۔ پھر حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں جو جماعتیں یا شخصیات ہیں ان میں سے بہت سوں سے مجھ کو بڑی گہری محبت ہے۔ ان کا ادب و احترام تو ہے ہی' لیکن اس سے بڑھ کر مجھے ان سے عقیدت کے درجے تک محبت ہے۔ اس کے باوجود کچھ باتیں بہرحال کہنی ضروری ہیں کہ مجھے اپنا فریضہ ادا کرنا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو کھول دے اور کم سے کم کھلے دل کھلے ذہن کے ساتھ میری بات پر غور کرنے کے لئے ہی تیار ہو جائیں۔ یہاں وہ بات بھی دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجئے جو میں نے پچھلی مرتبہ بھی عرض کی تھی کہ مجھے جس سے جتنی زیادہ توقع ہوتی ہے' یہ توقع پوری نہ ہونے پر اس کے بارے میں اتنی ہی زیادہ شکایت ہوتی ہے اور اس کے بارے میں میری گفتگو میں' میری تحریر و تقریر

بں اتنی ہی زیادہ تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا کہ میری تلخی کو آپ ان کے ساتھ میری محبت کے
است متناسب (DIRECTLY PROPORTIONAL) سمجھئے! چنانچہ ۔

کھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
ج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

لقلابی جدوجہد یا انتخابی کشمکش ؟

ینی جماعتوں کے لئے میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے شعوری طور پر خوب سوچ سمجھ کر
ب فیصلہ کریں کہ انہیں دینی انقلابی رخ پر کام کرنا ہے یا قومی سیاسی رخ پر کام کرنا ہے۔ میں
پ سے عرض کر چکا ہوں کہ ان دونوں کاموں کے تقاضے بالکل جدا اور بالکل مخالف ہیں میں
نے پچھلی مرتبہ تین چیزیں تفصیل سے عرض کی تھیں کہ اگر آپ کو خالص دینی اور انقلابی کام
رنا ہے اور اسلام کو غالب کرنا ہے تو پہلا قدم ہو گا تصحیح عقائد۔ یعنی جو صحابہؓ کرامؓ کا سادہ صحیح
راوہام وغیرہ سے پاک عقیدہ تھا وہ لوگوں میں پیدا کیجئے۔ اس کے بغیر گاڑی نہیں چلے گی۔
سری شرط لازم یہ ہے کہ جو اس میدان میں کام کرنے کے لئے آئیں وہ خود دین پر عمل پیرا
ں۔ اگر وہ خود نماز تک نہ پڑھتے ہوں تو وہ دین کو قائم کرنے کا کام کیسے کر سکیں گے؟
رے یہ کہ پھر ان کی جو جماعت بنے وہ بھی چار آنے کی ممبری والی جماعت نہ ہو بلکہ اس
ں صرف وہی لوگ شامل کئے جائیں جو کم سے کم فرائض کو ادا کرنے والے ہوں، رزق حلال
قانع اور حرام سے بچنے والے ہوں۔ پھر یہ جماعت ایک منظم اور سمع وطاعت والی جماعت
۔ اور اس میں CADRES کا تعین ان کے خلوص واخلاص، تقویٰ و تدین اور قربانیوں کی بنیاد پر
نہ کہ ان کی ذات برادری، سرمایہ داری اور چودھراہٹ، یا زمینداری اور جاگیرداری کی بنیاد
و۔ تو اگر خالص دینی اور وہ بھی انقلابی نہج پر دینی کام کرنا ہے تو یہ تین چیزیں اس کے لوازم
حیثیت رکھتی ہیں۔

لی سیاست میں مذہبی عناصر کا کردار

اس کے برعکس اگر آپ کو قومی سیاست میں کوئی مؤثر رول ادا کرنا ہے تو اولاً یہاں عقائد

کی بحث مت چھیڑیئے۔ یہ بحث یہاں زہر قاتل ہو جائے گی یہاں تو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جذباتی محبت کی بات ہونی چاہئے۔ اسی بنیاد پر تو مسلم لیگ کی تحریک اٹھی تھی۔ وہاں عقائد کی بحث بالکل نہیں چھیڑی گئی۔ ثانیاً یہاں عمل کو بھی بالکل چھوڑ دیجئے۔ ہر کلمہ گو مسلمان ہے' فاسق بھی مسلمان' فاجر بھی مسلمان' گناہ کبیرہ کا مرتکب بھی کافر نہیں' مسلمان ہے۔ اگر آپ عمل کی بحث کو لے آئے تو آپ نے اپنا BASE پہلے ہی محدود کر دیا۔ اب آپ آگے کیا بڑھیں گے؟ مسلم لیگ کی تحریک میں نعرہ تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کوئی بھی ہو' کسے باشد' نہ عقیدے سے بحث ہو گی نہ ہی اس کے کردار و عمل سے بحث ہو گی۔ ثالثاً یہ کہ میدان کھلا رکھئے کہ حوصلہ مند لوگ آئیں اور آپ کی جماعت کو وسعت حاصل ہو اور اس میں سکہ رائج الوقت جو ہے اس کی بڑی قدر و قیمت ہے' اسے اپنی مٹھی میں لیجئے۔ سکہ رائج الوقت کیا ہے؟ سرمایہ داری' کوئی جاگیرداری اور زمینداری' کوئی سجادہ نشینی یا اس کے ساتھ کوئی وابستگی' یا کسی قبیلے کی سرداری یا کسی بڑی برادری کی چودھراہٹ! تو جس کے پاس یہ سکہ رائج الوقت ہے' اگر اسے آپ اپنی جماعت میں نہ آنے دیں اور سیاست بھی کرنا چاہیں تو گویا کہ آپ تضادات کا شکار ہیں۔ ان کو موقع دیں' وہ آئیں اور ان میں سے بہتر کا انتخاب کر لیجئے۔ یعنی جو اپنی حیثیت کے اعتبار سے بہتر ہوں' نہ کہ کردار کے اعتبار سے۔ اگر اب بھی یہ دیکھنا ہے کہ ان میں سے جس کا کردار بہتر ہے اس کو آگے آنا چاہئے تو پھر اس وادی میں کاہے کو قدم رکھنا ہے ۔ع "جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟" خوب اچھی طرح سے جان لیجئے کہ قومی سیاست کے تقاضے کچھ اور ہیں اور دینی' خصوصاً انقلابی سیاست کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ لہٰذا اس میں اول تو شعوری طور پر یہ فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمیں اِدھر جانا ہے یا اُدھر جانا ہے۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں ہو گا کنفیوژن رہے گا' وہی ہو گا کہ کچھ اِدھر کچھ اُدھر۔ اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اس کیفیت کے ساتھ بعض دینی جماعتیں اس وقت بری طرح دوچار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے کہ وہ اس معاملہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔ میرے نزدیک سیاست گناہ نہیں ہے اور میں نے ہمیشہ کہا ہے کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء بنو اسرائیل کی سیاست تو انبیاء کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس وقت تو یہ سیاست ہمارے لئے بہت بڑی ضرورت بن گئی ہے۔ پاکستان کے بقا کے لئے شرط لازم ہے کہ یہاں مضبوط مستحکم اور صحتمند سیاست کی بنیادیں قائم ہو جائیں

ورنہ وہی انتشار اور اضمحلال کی کیفیت رہے گی اور دشمن کی دراندازی کا خطرہ موجود رہے گا۔
اس اعتبار سے اس وقت اگر سیاست کے میدان میں کوئی مؤثر رول ادا کیا جاسکے تو یہ بھی میرے نزدیک کرنے کا ایک کام ہے' اگرچہ میری ترجیحات میں یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ میری ترجیحات میں اوّلیت انقلابی نہج پر اسلام کے لئے کام کرنے کی ہے اور میں اسی میں لگا ہوا ہوں۔

بہرحال مذہبی عناصر میں سے جو لوگ یہ طے کرلیں کہ انہیں سیاست ہی کے میدان میں اپنا رول ادا کرنا ہے تو انہیں حبِّ وطن اور اسلام پسندی والا مثبت کردار ادا کرنے کے لئے اس کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ مسلم لیگ بھی اسلام پسند سیاسی جماعت تھی۔ اس کا نعرہ تھا پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ! اس میں اگرچہ کچھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے لیکن ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ پہلے نمبر پر وہی لوگ تھے جو اسلام کے ساتھ قلبی اور جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بظاہر چاہے مذہبی نظر نہیں آتے تھے لیکن ان کی تہذیب و تمدن میں اسلامی روایات موجود تھیں۔ اس اعتبار سے کچھ مذہبی عناصر اگر سیاسی میدان میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیں تو یہ میرے نزدیک کوئی گھٹیا کام نہیں ہے۔ البتہ اس کی ایک شرط لازم ہے اور وہ یہ کہ کسی مذہبی سیاسی جماعت کی بنیاد فرقہ بندی پر نہیں ہونی چاہئے۔ یہ بنیاد انتہائی مہلک ہے۔ فرقے اور مسلک کے حوالے سے کرنے کے کام اور ہیں۔ ان کے لئے اگر ادارے قائم ہوں' انجمنیں اور جماعتیں بنیں تو کوئی حرج نہیں' لیکن سیاست کا میدان اس کے لئے موزوں نہیں۔ سیاست میں جب اسلام کے نام پر مذہبی عناصر تقسیم ہو جاتے ہیں تو اس کا سارا فائدہ سیکولر اور کمیونسٹ عناصر کو پہنچتا ہے۔ ہمارا دو دفعہ کا تجربہ اس پر شاہد ہے۔ چنانچہ جماعت بندی کی بنیاد فرقہ اور مسلک سے بالاتر ہونی چاہئے۔

قومی سیاست کو فرقہ بندی سے پاک رکھیے

مزید یہ کہ سیاسی پلیٹ فارم پر فرقے اور مسلک کی بات سرے سے ہونی ہی نہیں چاہئے۔ میں فقہی مسالک کی نفی نہیں کر رہا۔ اگر کسی کی ترجیحات میں اولین شے اپنے مسلک کی تبلیغ و اشاعت ہے تو وہ تبلیغی میدان میں کام کرے۔ اس کے لئے دارالعلوم اور انجمنوں کی سطح پر کام ہو سکتا ہے' لیکن ان بحثوں کو سیاسی میدان میں ہرگز نہ لایئے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ

ایک زمانے میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کراچی سے ایک مہم لے کر نکلے تھے انھوں نے پورے پاکستان کا دورہ کیا اور مختلف شہروں میں جا کر ایک بات کی تلقین کی کہ ہمیں یہ طے کر لینا چاہئے کہ فرقے اور مسلک کی بات اور مذہبی اختلاف کی بحث یا تو صرف اپنے مدرسے میں ہو یا اپنی جو مساجد ہیں ان کے منبر سے ہو۔ کبھی اجتماع عام میں اور پبلک پلیٹ فارم سے مذہبی اختلاف کی بات نہیں آنی چاہئے۔ مفتی صاحبؒ نے یہ کتنی صحیح بات کہی تھی جو اگرچہ صدا بصحرا ثابت ہوئی، لیکن آج اس کا تذکرہ کر کے ہمیں ان کے لئے دعائے خیر کرنی چاہئے۔ مفتی صاحبؒ نے اُس وقت پبلک پلیٹ فارم کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں یہاں سیاسی پلیٹ فارم کا لفظ استعمال کر رہا ہوں کہ اس پلیٹ فارم سے ایسی بات نہیں ہونی چاہئے کہ جو تقسیم کرنے والی ہو۔ قومی سیاست میں ان چیزوں سے بالاتر ہو کر لوگوں کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔

جماعتِ اسلامی کا المیہ

میرے ماضی کے اعتبار سے میرے نزدیک اہم ترین دینی جماعت جماعت اسلامی ہے۔ یہ واحد جماعت ہے جو انقلابی بنیادوں پر استوار ہوئی۔ کسی اور جماعت کے اندر رکنیت کی وہ شرائط نہیں ہیں جو اس کے ہاں ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے دستور کے اندر عقیدے کی پوری وضاحت اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی معیّن تعبیر بھی درج ہے —— گویا کہ کسی کے پاس اس کے خلاف کچھ ہے تو وہ اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ یہ وہ جماعت ہے جس نے تقسیم ہند سے پہلے مسلمانان ہند کی سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور اس نے صرف ہندوستان ہی کے نہیں فلسطینی مسلمانوں کے مسائل کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ ان کا تجزیہ یہ تھا کہ ہمارے تمام قومی امراض اور جملہ مسائل کا واحد سبب اسلام سے دوری ہے، اور ان کا واحد حل اسلام کے ساتھ عملی وابستگی اور اپنے فرض منصبی کو پہچان کر اسے ادا کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہونا ہے۔ پھر ان کا تنظیمی ڈھانچہ بھی انقلابی طرز کا تھا، لہٰذا یہ بھی انقلابی تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اپنے مزاج کی ساخت کے اعتبار سے یہ ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت تھی۔ اس کا تنظیمی ڈھانچہ ابھی تک انقلابی طرز کا ہے اور میرے نزدیک یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ اس نے اس تنظیمی ڈھانچے کو انتخابی سیاست کے میدان میں ڈال کر خود

بھی نقصان اٹھایا اور اس ملک کو بھی نقصان پہنچایا۔ اس پر میں نے بڑے شرح و بسط کے ساتھ گفتگو کی ہے اُس انٹرویو میں جو "ندا" کے ایک پینل نے مجھ سے لیا تھا اور جو "ندا" کے ستمبر کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ جماعت اسلامی کے اس انتقالِ مؤقف کے ہماری قومی اور ملی سیاست پر جو نقصانات مترتب ہوئے ان پر میں نے اپنی کتاب "اسلام اور پاکستان" میں بھی تفصیل سے بحث کی ہے۔

اس جماعت کے بارے میں میری خواہش، میری دلی آرزو اور تمنا جسے میں اس کے عوام و خواص کی خدمت میں درخواست کی صورت میں پیش کر رہا ہوں کہ خدارا اپنی موجودہ پالیسی پر نظر ثانی کریں اور اپنے اصل طریق کار، یعنی انقلابی نہج کو اختیار کرتے ہوئے انتخابی سیاست کے میدان سے دست کش ہو جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی انقلابی مشینری کو انتخابی سیاست کے میدان میں استعمال کر کے خود اپنے اوپر بھی ظلم ہے اور اس مشینری پر بھی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ان کے لئے پورے خلوص اور جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ طے کر لیں کہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس ایک فیصلے کے دو عظیم فائدے انہیں حاصل ہوں گے

انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کے دو عظیم فائدے

ایک یہ کہ اس ملک کے عام اسلام پسند لوگ انتخابی سیاست کے میدان میں دینی جماعتوں کی باہمی رسہ کشی کے باعث اسلام کے مستقبل کے بارے میں جس درجے شدید مایوسی کا شکار ہو چکے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دین و مذہب کے اعتبار سے ہمارے زوال و انحطاط کا اصل سبب دین دار اور دین پسند لوگوں کے ووٹوں کا تقسیم ہو جانا ہے، اس تأثر میں یک دم نمایاں کمی واقع ہو جائے گی اور اس خوشگوار تبدیلی کا سارا کریڈٹ جماعت اسلامی کو جائے گا جو آئندہ کے لئے انقلابی عمل میں ان کے لئے ایک بہت بڑا سرمایہ (ASSET) بن سکتا ہے۔ میں یہ باتیں جماعت کے ذمہ دار حضرات سے ملاقاتیں کر کے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پبلک پلیٹ فارم پر خطاب عام میں کہہ رہا ہوں کہ اس کا جماعت کو واقعتاً بہت بڑا فائدہ حاصل ہو گا۔

آئندہ انتخابات سے کنارہ کش ہونے کے فیصلے کا دوسرا اہم تر فائدہ جماعت اسلامی کو

یہ پہنچے گا کہ سیاست کے میدان میں موجود دیگر مذہبی جماعتیں کوشش کریں گی کہ جماعت اسلامی کے ساتھ اپنے معاملات درست کریں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ جماعت اسلامی کے زیر اثر ووٹروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمارے معاشرے میں موجود ہے۔ لہٰذا وہ اپنے حق میں جماعت کے خیر سگالی کے جذبات حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہوں گی۔ نتیجۃً ہمارے معاشرے میں سرایت شدہ فرقہ واریت کے زہر کی تلخی میں نمایاں کمی واقع ہو گی اور جماعت کے لئے موقع ہو گا کہ وہ اس سلسلے میں نیوکلیس بن کر ایک مؤثر کردار ادا کر سکے۔ جب جماعت اسلامی انتخابات میں اپنے امیدوار کھڑے نہیں کرے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے ووٹ تو انہی لوگوں کو جائیں گے جو دین کے علمبردار ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر ہم نے طے کر رکھا ہے کہ تنظیم اسلامی انتخابات میں حصہ نہیں لے گی، لیکن ہمارے ساتھی جب ووٹ دیں گے تو ان کے سامنے دو معیارات ہوں گے۔ اولاً یہ کہ جس شخص کو ووٹ دینا ہے وہ پابند شریعت ہو۔ اگر کوئی شخص خدا کا وفادار نہیں ہے تو وہ ہمارا اور اس ملک کا وفادار کہاں سے ہو جائے گا؟ ہم اس کو اپنا ووٹ دے کر اللہ کے ہاں اس کی بداعمالیوں میں حصہ دار نہیں بننا چاہتے۔ حدیث میں آیا ہے۔ من مشی مع فاسق لیقویه غضب الله تعالیٰ واهتزله العرش۔ جو شخص کسی فاسق کے ساتھ اسے تقویت پہنچانے کے لئے چلتا ہے، اللہ اس پر اتنا غضب ناک ہوتا ہے کہ اس کا عرش تھرا اٹھتا ہے۔ تو ووٹ دینے سے بڑی تقویت اور کیا ہو گی؟۔ ثانیاً یہ کہ جس شخص کے حق میں ووٹ دینا ہے اس کا تعلق کسی ایسی جماعت سے نہ ہو جس کے منشور میں کوئی شے خلاف اسلام ہو۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خود تو پابند شریعت ہے لیکن ایسا سادہ لوح ہے کہ جدید سیاست کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتا ———

اور کسی ایسی جماعت کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ رہا ہے جس کے منشور میں کوئی چیز خلاف اسلام ہے تو اسے بھی ہم ووٹ نہیں دیں گے۔ تو اگر جماعت اسلامی بھی یہی مؤقف اختیار کرے تو نہ صرف یہ کہ ان کے ووٹ اسلام ہی کے حق میں استعمال ہوں گے، بلکہ اسلام پسند عناصر ان کے قریب آنے کی کوشش کریں گے اور یہ مذہبی سطح پر لوگوں کے لئے مرجع بن سکیں گے۔

یہ دو نقد فائدے ہیں جو اس ایک فیصلے سے جماعت اسلامی کو حاصل ہوتے ہیں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ بصورت دیگر اگر جماعت اسلامی الیکشن میں حصہ لینے کی پالیسی ہی پر عمل پیرا رہتی ہے تو اس بار بھی وہی ہو گا جو ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ گنتی کی چند سیٹیں جو انہیں حاصل

تی رہی ہیں معمولی کمی بیشی کے ساتھ وہی آئندہ بھی ان کے حصے میں آئیں گی۔ میں نے مدینہ
ورہ میں بیٹھ کر ۱۹۷۰ء کے الیکشن سے چند روز قبل عیدالفطر کے دن یہ عرض کیا تھا کہ مغربی
کستان میں آپ کو چار یا پانچ سیٹیں ملیں گی اور مشرقی پاکستان میں آٹھ سے دس تک مل سکتی
ں۔ مغربی پاکستان کی حد تک تو میری بات حرف بحرف درست ثابت ہوئی کہ چار امیدوار
جماعت کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے جبکہ پانچویں مولانا ظفر احمد انصاری صاحب تھے جو
جماعت کی حمایت سے کامیاب ہوئے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ووٹوں کی گنتی کے اعتبار سے
جماعت کا معاملہ مغربی پاکستان سے بہتر تھا، لیکن سائیکلون کی تباہی سے پیدا شدہ اثرات اور
س کے ضمن میں بی بی سی کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے طوفان کے باعث صورتحال یکدم بدل
ئی تھی۔ آئندہ انتخابات میں بھی کسی بڑے اتار چڑھاؤ کی توقع کرنا نادانی ہے۔ جماعت
سلامی کے اکابرین سے میری گزارش ہے کہ وہ ناپ تول کر فیصلہ کریں کہ ان کے نزدیک
بند سیٹیں زیادہ وقیع ہیں یا وہ دو عظیم فائدے جن کا حوالہ میں دے چکا ہوں۔

قومی سیاست میں جمعیت اہلحدیث کا منفی طرزِ عمل

اس کے علاوہ باقی مذہبی جماعتوں کے بارے میں زیادہ تفصیل سے مجھے کچھ نہیں کہنا۔
دو جماعتیں تحریک نفاذ فقہ جعفریہ اور جمعیت اہلحدیث اصولاً میری بحث کے دائرے سے
خارج ہیں، ان میں سے تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کے بارے میں تو خاص طور پر میں اس لئے بھی کچھ
نہیں کہنا چاہتا کہ اس میں شیعہ سنی کا مسئلہ آ جاتا ہے۔ ویسے بھی وہ جماعت نہیں تحریک
ہے۔ ان کا انداز انقلابی ہے اور پھر ان کا الیکشن میں حصہ لینا بھی ابھی غیر یقینی ہے۔ البتہ
جمعیت اہلحدیث سے مجھے شدید شکایت ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو خالص مذہبی فرقہ واریت کی
بنیاد پر سیاست کر رہی ہے اگرچہ جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کی بنیادوں میں
بھی فرقہ واریت ہی ہے، لیکن نام میں فرقہ واریت نہیں ہے۔ یہاں تو نام ہی میں فرقہ موجود ہے
دھڑلے کے ساتھ اہلحدیث مسلک کی بنیاد پر سیاست کی جا رہی ہے۔ میرے نزدیک یہ ایک بڑا
منفی عمل ہے اور بہت ہی مضر ہے۔ اہلحدیث کو اہلحدیث کی حیثیت سے کام کرنا ہے تو وہ اپنے
عقائد اپنے مسلک کی تبلیغ کریں، اپنے دارالعلوم بنائیں، لیکن مسلک کی بنیاد پر سیاست میں آنا
اس ملک کی جڑوں کو کھودنے کے مترادف ہے۔ چونکہ مجھے ان کے ساتھ دلچسپی اور محبت ہے
اس لئے میں نے انہیں ذرا تلخ انداز سے مخاطب کیا ہے۔

جمعیّت علمائے اسلام اور جمعیّت علمائے پاکستان کے لیے صحیح تر راستہ

جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے

پاکستان الحمدللہ کہ ان دونوں کے نام میں فرقہ واریت نہیں ہے، لیکن دونوں کا تعلق دیوبندی اور بریلوی مسلک سے ہے۔ یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ سیاسی اعتبار سے بڑا مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں دیہات میں خاص طور پر عوام میں جو روایتی جذباتی مذہب چلا آرہا ہے وہ بریلویت نہیں۔ بریلویت تو کل کی شئے ہے۔ ہمارے ہاں سیال شریف، گولڑہ شریف، تونسہ شریف اور اسی طرح کی دوسری گدیوں کی جڑیں بڑی پرانی ہیں۔ بریلویت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج کل ان کے درمیان کچھ اشتراک ہو گیا ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان یا جماعت اہل سنت وغیرہ کے لئے عوام کے اندر اپیل موجود ہے لیکن ہے وہ اپنے مسلک کی بنیاد پر۔ اسی طرح جمعیت علمائے اسلام کے لئے دیوبندیت کی بنیاد پر مذہبی اپیل موجود ہے۔ ان میں تھانوی حضرات بھی ہیں جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا، باقی جن کا قلبی اور ذہنی اور روحانی رشتہ مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہے۔ وہ تحریک پاکستان کے مخالف تھے لیکن عوامی سطح پر ان کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ یہ دونوں جماعتیں سیاست میں ایک مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔ ان کے لئے سب سے بہتر صورت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اتحاد کی توفیق دے اور یہ کوئی ناممکن بات نہیں اس لئے کہ حنفیت ان کے درمیان قدرِ مشترک ہے۔ ان کی فقہ ایک، ان کے عقائد ایک ہیں۔ سارا فرق شخصیتوں کے ٹکراؤ کا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے درمیان جو قلمی رسہ کشی اور مناظرے ہوئے ہیں بعض مسائل پر اس نے سارا تلخی کا زہر گھولا ہے اور ان سے ذرا پہلے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا فضل حق خیر آبادیؒ کے مابین جو کچھ معاملات میں بحث و تمحیص ہوئی تھی وہ اس کے پس منظر میں ہے۔ ورنہ دونوں حنفی ہیں، دونوں کے عقائد وہی ماتریدی عقائد ہیں، امہات کتب ایک ہی ہیں۔

اگر تو یہ جمع ہو جائیں تو واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے اندر یہ بہت بڑا سیاسی کردار ادا کر سکتے ہیں اور میں اس کے کچھ آثار بھی دیکھ رہا ہوں۔ مولانا سمیع الحق صاحب کا کراچی جانا اور مولانا نورانی میاں سے ملاقات کرنا بہت اہم ہے۔ کچھ نہ کچھ ضرورت کا احساس ہو رہا ہے، اس لئے کہ جو نئی سیاسی قوتیں ابھر کر آ گئی ہیں علاقائی قومیتوں کی بنیاد پر یا لسانی قومیتوں کی بنیاد پر انہوں

نے ایک بہت ہی COMMON THREAT رکھ دیا ہے سب کے سامنے۔ مشترک دشمن بھی بسا اوقات ایک عارضی اتحاد پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں لیکن میں تو کہتا ہوں کہ یہ مثبت بنیادوں پر جمع ہوں۔ اسلام کے لئے کوئی اسلام لیگ بنالیں (اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے) اور پھر اگر دوسری جماعتیں میدان سے ہٹ جائیں تو ایک بہت بڑی قوت وجود میں آ سکتی ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں تو پھر یہ دائیں بائیں جدھر ان کا رجحان ہے ادھر کے اصل سیاسی دھارے میں مدغم ہو جائیں یا ایک کھرے تعاون کی شکل اختیار کرلیں جیسا کہ تحریک پاکستان کے دور میں تعاون تھا دیوبندیوں میں سے بھی تھانوی حضرات کا اور تقریباً تمام بریلوی مکتب فکر اور تمام مشائخ کا مسلم لیگ کے ساتھ۔ اگر اس وقت ایسا ہو سکتا تھا تو اب کیوں نہیں ہو سکتا' جتنا بڑا خطرہ اس وقت تھا اس سے بڑا خطرہ اب ہے' جس سے پاکستان آج دوچار ہے۔ اِس وقت ہندوستان ہم سے بیس گنا بڑی طاقت بن چکا ہے' روس ایک بہت بڑے خطرے کا نشان بن کر ہمارے سروں پر موجود ہے اِس وقت بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اُس وقت اگر ہندو کے مقابلے میں مسلمان جمع ہو گئے تھے مسلم لیگ کی قیادت میں تو آج کیوں نہیں ہو سکتے۔ اب میں آپ سے اپنے دل کی بات کہہ دوں' جمعیت علماء اسلام خاص طور پر مولانا فضل الرحمان گروپ' بڑی محبت ہے مجھے ان لوگوں سے' انہیں میں انقلابی مانتا ہوں وہ بھی کاش کہ انقلاب کا راستہ اختیار کرلیں' اس کے لوازم پورے کریں۔ یا پھر ان میں بائیں بازو کی طرف ایک رجحان موجود ہے۔ یہ زیادہ عوامی لوگ ہیں' ان میں کبھی وڈیرے لوگ شامل نہیں ہوئے' اسلام کے قانونی نظام کے اندر جتنا بھی سوشلزم آ سکے اس کے یہ لوگ قائل ہیں۔ جمعیت علماء ہند کے بڑے بڑے علماء میں بھی یہ رجحان موجود تھا اور آپ کو یاد ہو گا بھٹو صاحب کے ساتھ الائمنٹ کس کی ہوئی تھی' مولانا مفتی محمودؒ کی۔ باقی تمام علماء تو جمع ہو گئے تھے' بھٹو کے خلاف فتوے بھی انہوں دیئے تھے لیکن مولانا مفتی محمود کہاں کھڑے تھے۔ وہ درحقیقت ایک پس منظر ہے ایک مزاج ہے۔ اس کی مناسبت سے یا وہ انقلابیت کی طرف آئیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے میری ترجیح تو یہی ہے۔ ورنہ یہ کہ بائیں بازو کے ساتھ مل کر قوم کے سیاسی دھارے میں اپنا مثبت کردار ادا کریں۔

——— مولانا نورانی میاں کی مذہبی فرقہ واریت پر مبنی سیاست مجھے بہت ہی ناپسند ہے لیکن سیاسی معاملات میں ان کی دُور اندیشی' ان کی معاملہ فہمی کا میں بے انتہا

قائل ہوں۔ میرا تأثر یہ ہے کہ پاکستان میں جتنے لوگ، جتنی جماعتیں، جتنی مذہبی شخصیتیں سیاست کے میدان میں ہیں ان میں مولانا نورانی میاں اپنی بالغ نظری اور وسیع النظری کے سبب سب سے بڑھ کر ہیں۔ پوری دنیا میں وہ چکر لگاتے ہیں ان کے والد مرحوم نے پورے گلوب کے دو چکر لگائے تھے اسلام کی تبلیغ کے لئے۔ مولانا عبد العلیم صدیقیؒ اگرچہ خانوادۂ بریلی سے منسلک تھے لیکن جب قومی معاملہ آیا تو انہوں نے خانوادۂ بریلی کے حکم کو نہیں مانا ان کا حکم تھا کہ تحریک خلافت میں شریک مت ہو لیکن ان کے والد مولانا عبد العلیم صدیقی تحریک خلافت میں شامل ہوئے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ان کا ایک پس منظر ہے۔ شریعت محاذ میں شرکت کے وقت بھی میں نے واضح کیا تھا کہ اس میں شامل دینی جماعتوں کے سیاسی مؤقف سے مجھے اختلاف ہے۔ میرا سیاسی مؤقف تو وہ ہے جو مولانا نورانی کا ہے لیکن شریعت محاذ میں ہم صرف دینی بنیادوں پر شامل تھے۔ میں واقعتہً یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا نورانی میاں اس پوزیشن میں ہیں اگر وہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں یا یہ کہ جمعیت علماء اسلام کے ساتھ مل کر مذہبی بنیادوں پر ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرلیں تو وہ ایک مذہبی مزاج کے "قائد اعظم" بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں مطمئن ہوں کہ میں نے اپنی بات کہہ دی ہے اور اب مجھے اس کا کوئی حصہ اگلے جمعہ پر مؤخر یا ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم و لسائر المسلمین والمسلمات

طلبہ کے مسائل اور اُن کا حل

ڈاکٹر اسرار احمد

امیر تنظیم اسلامی و سابق ناظم اعلیٰ، اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان ڈاکٹر اسرار احمد کی اس تقریر کا خلاصہ جو موصوف نے نومبر ۱۹۵۳ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر ایک جلسۂ عام میں کی تھی جو جہانگیر پارک کراچی میں ڈاکٹر عمر حیات ملک (مرحوم) سابق پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور و وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔

یہ تقریر اسلامی جمعیت طلبہ مشرقی پاکستان نے تو بنگلہ زبان میں کتابی صورت میں شائع کی تھی لیکن مغربی پاکستان میں جمعیت کی بعد کی قیادت نے اسے لائق اعتناء نہیں سمجھا تھا ___ "طلبہ تنظیم اسلامی" کے پہلے آل پاکستان کنونشن کے موقع پر اس تقریر کی اشاعت ماضی اور حال کے مابین ایک ربط قائم کرنے کی کوشش کا مظہر ہے۔

(ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد:

صاحب صدر! بزرگو اور دوستو..... میری آج کی گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ طلبہ کے اصل مسائل کیا ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جاسکتا ہے۔

طلبہ کے مسائل کا خطرناک تصوّر...... اس سلسلے میں سب سے پہلے میں آپ حضرات کو یہ بتاؤں گا کہ طلبہ کے مسائل کا وہ تنگ نظرانہ تصور جو عام طور پر رائج ہے کس درجہ خطرناک اور ملک و ملت کے حق میں کتنے برے نتائج پیدا کرنے والا ہے۔ پھر میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارے اصل اور واقعی مسائل کیا ہیں اور ان کے حل کی صحیح راہ کون سی ہے۔

> آپ کو معلوم ہے کہ طلبہ کے مسائل کے بارے میں عام طور پر جو باتیں کہی اور سنی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ کالج کم ہیں' ہاسٹل نہ ہونے کے برابر ہیں اور جو ہیں ان کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تعلیم بے حد مہنگی ہے اور جو چیز ایک آزاد ملک میں بے دام ملنی چاہئے اس کی ہمارے ملک میں بہت گراں قیمت وصول کی جارہی ہے۔ امتحانات کا نظم ٹھیک نہیں ہے۔ سپلیمنٹری امتحانات کو جن پر ایک طالب علم کے ایک سال کے ضیاع کا معاملہ منحصر ہوتا ہے بے حد کم ہیں اور جو ہیں ان سے استفادہ کی شرائط انتہائی کڑی ہیں۔

یہ اور اسی طرح کے اور بہت سے مسائل ہیں جن پر "طلبہ کے مسائل" کا لیبل چسپاں کیا جارہا ہے اور ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کرنے کو طلبہ کی سعی و جہد کا مقصود قرار دیا جاتا رہا ہے اس پر ستم یہ کہ اگر کوئی اس سے بڑھ کر ملک و ملت کے مسائل کی طرف طلبہ کی توجہ کو منعطف کرانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے لئے بلا تکلف طلبہ کے نصب العین کے دشمن کا خطاب استعمال کر دیا جاتا ہے۔

ہماری رائے میں طلبہ کے مسائل کا یہ محدود تصور انتہائی تنگ نظرانہ ہے اور ان مسائل
لبہ کا نصب العین قرار دے کر اس کے لئے جدوجہد کرنا انتہائی خطرناک ہے۔ جب ہم
رائے کا اظہار کرتے ہیں تو سب سے پہلی بات جو پیش نظر رہنی چاہئے۔ وہ یہ ہے کہ ہم
طلبہ ہیں اور جن مشکلات کا میں نے ذکر کیا ہے، ان میں دوسرے طلبہ کی طرح ہم خود بھی
ی طرح گرفتار ہیں۔ یہ بات اگر حکومت اور نظامِ تعلیم کے ارباب بست و کشاد کی طرف
کہی جائے تو کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ طالب علم اس پر کان نہ دھریں۔ لیکن جب ان
کچھ طالب علم ساتھی ہی اس رائے کا اظہار کر رہے ہوں تو دوسرے طلبہ کو چاہئے کہ وہ
کے لئے بلا تکلف حکومت کے ایجنٹ کا خطاب استعمال کرنے سے قبل ان کی باتوں کو
اور ان پر غور کریں۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ ہے تو اس سے ہماری
یہ ہوتی ہے کہ اگرچہ یہ وہ مشکلات ہیں جن میں طلبہ گرفتار ہیں اور ملک و ملت کی فلاح و
کا واقعی تقاضا یہ ہے کہ ان کو دور کیا جائے لیکن فی الواقع انہیں طلبہ کے مسائل کا عنوان
، کر اپنی نگاہوں کو انہی تک محدود کرنا انتہائی تنگ نظری ہے۔ ہم طالب علم ایک ملک میں
والے مجموعہ افراد کا ایک حصہ اور ایک قوم کی متاعِ عزیز ہیں۔ ہمارے اصل مسائل وہی
جن میں ہمارا ملک گرفتار ہے اور جو ہماری قوم کو گھیرے ہوئے ہیں ملک کے نصب العین
مختلف ہمارا کوئی نصب العین اور قوم کے مسائل سے علیحدہ ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں'
ی نگاہوں کو اس قدر تنگ نہیں ہونا چاہئے کہ ان میں بس اپنی چند مشکلات ہی بار پا سکیں
انہیں اس قدر وسیع ہونا چاہئے کہ وہ ملک و ملت کے تمام مسائل پر محیط ہوں اور اپنی
ات کو بھی انہی کے نقطہ نظر سے جانچیں اور پرکھیں۔

پھر جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی مشکلات کے لئے سٹوڈنٹ کاز (STUDENT'S
CAUSE) کا نعرہ بلند کر کے کسی جدوجہد کا آغاز کرنا خطرناک ہے تو اس سے ہماری
ادیہ ہے کہ یہ طریقِ کار نہ صرف یہ کہ ان مشکلات کے حل کرنے میں مد اور معاون نہیں
ہے بلکہ بہت سے ایسے ناخوشگوار اور تلخ احساسات کو جنم دیتا ہے جو ہمارے ملی اور ملکی استحکام کی
وں کو اندر ہی اندر سے دیمک کی طرح چٹ کر سکتے ہیں۔

اوّل تو جب آپ اسٹوڈنٹ کاز کا نعرہ بلند کرتے ہیں تو گویا اعلان کرتے ہیں کہ طلبہ بقیہ قوم سے علیحدہ ایک طبقہ ہیں اور ان کا مفاد دوسرے طبقات سے متصادم ہے۔ طبقاتی کشمکش کا وہ احساس جو اس طرح پیدا ہوتا ہے ملی و ملکی استحکام کی جڑوں پر ایک تیشہ بن کر گرتا ہے۔ یہی وہ طریق فکر ہے، جو قوم میں ایک اور طرح کی تفریق سرمایہ و محنت کی شکل میں کرتا ہے اور وہاں طبقاتی تصادم پیدا کرتا ہے...... یہی طلبہ کو ایک اور حکومت اور نظام تعلیم کے ارباب بست و کشاد کو دوسرا طبقہ بنا کر انہیں لڑاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جہاں یہ طبقاتی تصادم پیدا ہو جائے وہاں بدامنی' بے چینی' ہنگاموں اور جھگڑوں کو پیدا ہونے سے روکنے والی چیز کون سی ہو سکتی ہے اور پھر یہ بھی ظاہر بات ہے کہ ان چیزوں کو ایک محب وطن اور محب قوم کبھی برداشت نہیں کر سکتا سوائے ان چند لوگوں کے کہ جو اس بدامنی اور بے چینی سے فائدہ اٹھا کر کسی اور تحریک کے پنپنے کا سامان پیدا کرنا چاہتے ہوں۔

پھر اس طرح طلبہ اور حکومت اور نظام تعلیم کے اربابِ کار کو مقابل کی صفوں میں کھڑا کرنے کے بعد مشکلات کے امن پسندانہ حل کی توقع رکھنا بھی حماقت ہے۔ مشترک مفاد اور مشترک مقصد کو درمیان سے نکال کر آپ ان کو ایک دوسرے کا مدّمقابل بنا دیتے ہیں اور اس طرح گفت و شنید اور افہام و تفہیم کے تمام راستے بند کر دیتے ہیں۔ پھر ایک ہی راہ ہے کہ طلبہ اپنی قوت کے اظہار کے لئے ہڑتالیں کریں اور جلوس نکالیں اور حکومت اپنے وقار کے بت کی پوجا کرتے ہوئے گولیاں برسائے اور لاٹھیاں چلائے۔ ایک دوسرے کی مشکلات کو پیش نظر رکھ کر اور ایک دوسرے کی شکایات پر ہمدردانہ غور کرنے کے رویہ کو ترک کرنے کے بعد اور ایک ہی قوم کے حصے اور ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہونے اور ایک مشترک مفاد اور ایک مشترک مقصد رکھنے کے تصور کو خارج از بحث کرنے کے بعد یہی ایک شکل رہ جاتی ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ جہاں بھی اس طریق کار پر عمل کیا گیا یہی نتائج نکلے اور اب جہاں بھی اس طریق کار کو اپنایا جائے گا ذہن چاہتا ہے اور عقل مطالبہ کرتی ہے کہ ٹھیک یہی بلکہ اس سے کہیں خراب نتائج رونما ہوں۔

یہ وہ حقائق ہیں جو نہ صرف دلائل کی بنا پر صحیح ہیں بلکہ اپنی پشت پر تجربات کا وزن بھی لئے ہوئے ہیں جن کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ طلبہ کے مسائل کا یہ تصور تنگ نظرانہ اور اس کے

حصول کو نصب العین بنا کر ایک جدوجہد شروع کرنا خطرناک ہے۔

ہمارا حقیقی مسئلہ..... اب میں آپ کو یہ بتاؤں گا کہ ہمارا اصل مسئلہ کون سا ہے۔ اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ میں ایک بات کہہ دوں میں چاہتا ہوں کہ آپ خود سوچ سمجھ کر ایک نتیجہ پر پہنچیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ذرا یہ سوچئے کہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ اس ملک اور اس قوم کی اجتماعی زندگی مین کیا مقام رکھتے ہیں۔ مختصر ترین الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک اور قوم کا مستقبل ان نوجوان طلبہ ہی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اس کی اچھائی اور برائی کا تمام تر انحصار طلبہ ہی پر ہوتا ہے۔ انہی کے ہاتھوں میں قوم کے مستقبل کی باگیں ہوتی ہیں کہ جدھر چاہیں موڑ دیں اور وہی ملک کے مستقبل کے بارے میں اصل فیصلہ کن طاقت ہوتے ہیں۔ چاہیں تو اسے عزت و سربلندی کے ساتویں آسمان تک پہنچا دیں اور چاہیں تو ذلت اور گمنامی کے گہرے غاروں میں جا گرائیں۔

چونکہ میری آئندہ گذارشات کا انحصار اسی ایک بات کے سمجھ لینے پر ہے اس لئے میں اس سلسلے میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کروں گا۔

طلبہ ایک تمدن کے وارث ہیں..... آپ جانتے ہیں کہ ہر قوم اپنا ایک ماضی رکھتی ہے جو اسے جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے جس کے بقا پر اس کے قومی تشخص کے بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ علوم میں اپنا ایک نقطۂ نظر، فنون میں اپنا ایک مزاج اور فلسفے اور عمرانیات میں اپنی ایک ڈگر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں نہ صرف یہ کہ اسی ڈگر پر چلیں بلکہ اس میں مزید ترقی کریں..... ظاہر بات ہے کہ یہ تمام کام اُس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا ہوتا ہے کہ وہ اُس قوم سے جو تمدن جو تہذیب اور جو کلچر ورثہ میں پائیں اسے زندہ رکھیں اور آنے والی نسلوں کو منتقل کریں..... اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر قوم اپنی کچھ اجتماعی خواہشات اور مجموعی ارادے اور مقاصد رکھتی ہے اور یہ اس قوم کے نوجوان طلبہ ہی کا کام ہے کہ وہ ان اجتماعی خواہشات کو پورا کریں اور مجموعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہوں۔

طلبہ ملکی استحکام کے محافظ...... اسی طرح کسی ملک کے استحکام اور بقاء
انحصار بھی اس کے نوجوان طلبہ ہی پر ہوتا ہے۔ انہی کو آگے بڑھ کر ملک کی انتظامی مشینری
چلانا ہوتا ہے۔ انہی کو ملک کی آزادی کا ضامن بننا ہوتا ہے۔ یہی ہوتے ہیں کہ جو ملک کے
دفاعی حصار کے مورچوں کا چارج لیتے ہیں۔ انہی کے ہاتھوں سے ملک کی تقدیر لکھی اور مٹا
جاتی ہے۔ یہی چاہیں تو ملک کو اوج ثریا تک لے جائیں اور چاہیں تو تحت الثریٰ میں پہ
دیں۔

لہٰذا آپ میری بات سے پوری طرح متفق ہوں گے اگر میں کہوں کہ کسی قوم کے طلبہ
کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح تیار کریں کہ وقت آنے پر قوم کے ماضی کے
علمبردار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ اس کے تمدن اور اس کے کلچر کے نگہبان ہوں اس کے علو
وفنون اور اس کے فلسفے اور آرٹ کو دنیا میں پھیلا سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی مجمو
خواہشات اور اس کے اجتماعی ارادوں اور مقاصد کی تکمیل کر سکیں...... اور کسی ملک کے طلبہ
اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ اس طرز پر تیار ہوں اور اس طرح ٹریننگ حاصل کریں کہ جب وہ ا
ملک کا کاروبار سنبھالیں تو ایک طرف اس کی آزادی کے ضامن بن سکیں اور اس کے دفاع
استحکام کی ذمہ داری لے سکیں اور دوسری طرف اس کی انتظامی مشینری کو باحسن طریق
سکیں اور دنیا میں اس کی نیک نامی کا باعث ہوں۔

یہ کسی ملک اور کسی قوم کے نوجوان طلبہ کا "اصل مسئلہ" ہوتا ہے کہ جس پر ان
نگاہوں کو مرتکز اور ان کی تمام کوششوں اور قوتوں کو مرکوز ہونا چاہئے۔

غور و فکر کا مقام...... اب میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اسے پیش
نظر رکھ کر آپ اپنے بارے میں سوچیں کہ آپ کا اصل مسئلہ کون سا ہے!

○ ...... قومیت کے اعتبار سے آپ امّت مسلمہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

☆ ...... اس امّت کے بارے میں کوئی غبی ہی ہو گا جو یہ نہ جانتا ہو کہ اس کی بنیاد نہ وطن
ہے نہ رنگ پر، نہ نسل پر ہے نہ زبان پر بلکہ دین پر ہے۔ جس سے مراد وہ نظامِ زندگی ہے
ایک خاص نظریئے (IDEOLOGY) پر مبنی ہے۔

☆ ... پھر یہ بھی آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس قوم کا ایک مخصوص نظریۂ کائنات و
ن ہے جو دنیا کے دوسرے تمام نظریات سے مختلف ہے علوم میں اس کا اپنا ایک مخصوص
نظر ہے جو دوسرے تمام نقطہ ہائے نظر سے علیحدہ ہے۔ فنون میں اس کا اپنا ایک مزاج اور
اور عمرانیات میں اس کی اپنی ایک ڈگر ہے۔ اس کا اپنا ایک تمدن ہے۔ یہ اپنا ایک مخصوص
ھتی ہے اور ان تمام چیزوں میں ایک غایت درجے کی انفرادیت کی حامل ہے۔
☆ پھر اس کے مجموعی ارادوں اور اجتماعی مقاصد کے بارے میں بھی کون نہیں جانتا کہ
م بس ایک قوم کی طرح ان تمام چیزوں کو اپنی ذاتی ملک سمجھ کر خاموش بیٹھنے والی نہیں
۔ بلکہ وہ کہتی ہے کہ یہ اللہ کا دین ہے جس کی میں علمبردار ہوں۔ جس کو دنیا میں پھیلانا
قصدِ وجود اور جسے دنیا میں قائم کرنا میری زندگی اور ایمان کا عین تقاضا ہے۔
ان حالات میں سوچئے کہ آپ کا اصل مسئلہ کیا ہے؟ کیا آپ مجھے ذرہ برابر بھی غلط
کا الزام دیں گے۔ اگر میں کہوں کہ ہمارا اصل مسئلہ دنیا میں اسلامی فکر کے داعی نظریہ
ی کے علمبردار اور اللہ کے دین کے فوج دار بن کر کھڑا ہونا اور عالمگیر اسلامی انقلاب کی
میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا ہے۔ جس ملّت سے آپ اپنا تعلق جوڑتے ہیں اور جس قوم
آپ اپنا رشتہ باندھتے ہیں اس کا آپ سے یہی مطالبہ ہے اور اگر آپ نے یہی کام نہ کیا تو
اپنی قوم سے ایک بہت بڑی غداری کے مرتکب ہوں گے۔

○ ..... پھر ملکی نقطۂ نگاہ سے بھی سوچ لیجئے۔

☆ .. آپ کا ملک اسلام کے لئے عالم وجود میں آیا ہے۔ اسلام ہی تھا کہ جس کے لئے
نے برعظیم ہند کی تقسیم کو گوارا کیا۔ اسی کی خاطر آپ نے چار کروڑ مسلمانوں کو ہندو
ت کے رحم و کرم پر چھوڑنا منظور کیا اسی کی خاطر آپ نے قربانیاں دیں اسی کے لئے آپ
گھربار چھوڑا، عصمتیں لٹوائیں اور خاک و خون میں لوٹنا پسند کیا۔
☆ پھر اسلام ہی آپ کے لئے ایک واحد چارۂ کار ہے اس کے بغیر آپ کے اتحاد کی
شکل نہیں پاکستان میں کوئی ایک قومیت نہیں بستی یہاں ہزاروں نسلی و لسانی قومیتیں آباد
۔ اسلام کے رشتے کو بیچ میں سے نکال دیجئے تو پھر کوئی اور چیز آپ کو جوڑ کر رکھنے والی
ہے۔ آپ کے ہاں وحدتِ فکر اتحادِ عمل اور اشتراکِ مقصد کی کوئی اور راہ موجود نہیں

ہے۔ جاننے والے پہلے بھی جانتے تھے اور اب تو حالات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ اسلا
کے سوائے آپ کے اتحاد کی اور کوئی سبیل موجود نہیں ہے۔ اسلام ہی ہے کہ جو آپ ک
مختلف حصوں کو متحد اور مجتمع رکھنے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے۔ جو آپ کو متحد کر کے ایک
قوت بنا سکتا ہے جو آپ کو وحدتِ فکر اور اتحادِ عمل کی نعمتوں سے مالامال کر سکتا ہے۔

پھر دنیا میں ہماری سربلندی اور عزت بھی اسلام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اوّل تو اسلا
کے بغیر آپ کا ایک قوم بننا ممکن ہی نہیں ہے تاہم بفرض محال آپ کسی اور طریقے سے ایک
منظم اور متحد قوم بن بھی جائیں تو دنیا میں پاکستان کی پوزیشن ایک ایسی چھوٹی سی قومی ریاست
سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنے وجود کے لئے بڑی طاقتوں کی نگاہ کرم پر انحصار رکھتی
اب دنیا میں ان چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں کا دور گذر چکا ہے' یہ نظریہ ہائے حیات کا دور ہے
یہاں وہی زندہ رہے گا اور پھلے پھولے گا جس کے پاس کوئی نظریہ..... ہو اور وہ اس کا داعی بن
کر کھڑا ہو سکے اور کہہ سکے کہ یہ ہے وہ چیز جو دنیا اور نوع انسان کے دکھوں کا مداوا بن سکتی
ہے۔

اس نقطۂ نظر سے آپ کو محسوس کرنا چاہئے کہ آپ وہ خوش قسمت مجموعۂ افراد ہیں جن
کے پاس اللہ کا دین من و عن موجود ہے۔ جن کا مقصد وجود ہی یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اس
دین کے داعی اور علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور جو اگر اپنے اس فرض کو ادا کریں تو نہ صرف
یہ کہ دنیا میں سربلندی اور سرفرازی ان کے قدم چومے گی بلکہ آخرت میں اللہ کا انعام و اکرام
ان کا استقبال کرے گا۔

چنانچہ ملکی نقطہ نگاہ سے بھی سوچئے تو آپ اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ آپ کا اصل مسئلہ
اقامت دین ہے۔ یعنی یہ کہ آپ پہلے پاکستان کو ایک مثالی اسلامی ریاست بنائیں اور پھر د
کے سامنے اللہ کے دین کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں اور نوع انسانی کو اس کی دعوت دے
سکیں۔

ہماری نگاہ میں طلبہ کا وہ اصل مسئلہ جس پر ہماری تمام توجہات کو مرتکز اور تمام
قوتوں کو مرکوز ہونا چاہئے اور جس کا مطالبہ ہم سے ہماری قوم بھی کرتی ہے اور ہمارا ملک بھی
جس پر ہماری دنیا کی بہتری کا بھی انحصار ہے اور آخرت میں اللہ کی خوشنودی کا بھی وہ یہ

"ہم اللہ کے دین کو دنیا میں عملاً قائم کریں"

کہنے کو یہ بات میں پہلے ہی دو الفاظ میں کہہ سکتا تھا لیکن اس سے میرا مطلب اچھی طرح
ح نہ ہوتا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کو قائم کرنا ہے تو عام طور پر
بھا جاتا ہے کہ ہم یہ بات مذہبی جنون اور ملّاپن کی دیوانگی میں کہہ رہے ہیں حالانکہ ہم اچھی
ح دلائل سے جانتے ہیں کہ یہی ہماری قوم کا مجموعی ارادہ ہے۔ اسی میں ہمارے ملک کی فلاح
، اور یہی چیز ہماری عزت و نیک نامی کی ضامن اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بن سکتی
۔

جو کچھ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں اس سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ہماری نگاہ
ں ہمارا اصل مسئلہ اللہ کے دین کا قیام ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ ملک کے عوام اور
اب حکومت کا بھی ہے اور طلبہ کا بھی، اگرچہ حکومت، عوام اور طلبہ تینوں ہی اس کام میں
بر کے حصہ دار ہیں لیکن طلبہ اس معاملہ میں کچھ زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور یہ اس وجہ سے
موجودہ نسل اپنی پوری نیک نیتی کے باوجود ان صلاحیتوں اور قوتوں سے عاری ہے جو اس کام
ے لئے در کار ہیں۔ موجودہ نسل دورِ غلامی کی پیداوار ہے اور اپنے ذہنی و فکری ڈھانچے اور
رت و کردار کے سانچے میں وہ تمام خرابیاں بدرجہ اتم لئے ہوئے ہے جو غلامی سے پیدا ہوتی
ں۔ قوم کی تعمیر نو..... اور دین کی اقامت کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دورِ آزادی میں
بیت پا رہے ہیں۔ ان ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایک نئے نظامِ زندگی کی تعمیر صحیح بنیادوں
ر صحیح طریقوں پر کر سکیں گے۔ لہٰذا اگرچہ یہ مسئلہ حکومت کا بھی ہے اور عوام کا بھی۔ لیکن
ن دونوں سے زیادہ اہم پارٹ اس کام میں آج کے طلبہ کو ادا کرنا ہے۔

موجودہ ماحول کا جائزہ...... اب آپ ان حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جن
ے آج پاکستان میں ہم دوچار ہیں اور جن سے عہدہ برآ ہو کر ہمیں اسلامی انقلاب کی راہیں
موار کرنا ہیں۔

میں اس جائزے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

☆...... ایک ہمارے عام معاشرے اور ریاست اور اس کے کاروبار کو چلانے والی حکومت کا جائزہ

☆...... دوسرے اس نظام تعلیم کا جائزہ جو اس وقت ہماری تعلیم گاہوں میں رائج ہے اور جن میں ان کَل پرزوں کو ڈھلنا ہے جو مستقبل کی مشینری کے لئے ہمیں درکار ہیں اور

☆...... تیسرے اس نسل کا جائزہ جو آج کالجوں اور اسکولوں میں زیر تربیت ہے اور جسے مستقبل میں ملک وملّت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ہے اس جائزے کے سلسلے میں جو مسائل مجھے آپ حضرات کے سامنے رکھنے ہیں ان کے ساتھ ہی میں ان کا وہ حل بھی عرض کردوں گا جو ہمارے پیش نظر ہے۔

عوام اور حکومت...... معاشرے، ریاست اور حکومت کے جائزے میں تین باتیں بالکل روز روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہیں۔

اوّل وہ دینی اور اخلاقی انحطاط کہ جو اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارا دینی معیار اس حد تک گر گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب بھیجنے سے قبل بندوں کو کس قدر ڈھیل دیتا ہے اور عام اخلاقی معیار اس درجہ کم ہو گیا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس اخلاق کے ساتھ ایک ھئیت اجتماعی کو کس طرح برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف وہ سیاسی اور انتظامی بگاڑ ہے جو ہماری ملی اور ملکی زندگی کو گھن کی طرح کھا رہا ہے لیکن میں ان کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہتا کیونکہ ان کی اصلاح کا کام براہ راست طلبہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ خود عوام سے متعلق ہے یا حکومت سے۔ ہمارے پاس تو اس کا ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ کہ آئندہ آنے والی نسلوں کی اخلاقی تربیت کی کوشش کی جائے اور اسے میں پھر بیان کروں گا۔

تیسری چیز انتہا درجہ کو پہنچی ہوئی معاشی بدحالی ہے' اور یہ چیز چونکہ ہم طلبہ پر بھی براہ راست اثرانداز ہوتی ہے۔ اس لئے اس معاملے میں' میں ذرا تفصیل میں جانا پسند کرونگا۔ یہی وہ ام الخبائث ہے جس کے پیٹ سے طلبہ کے وہ مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا ذکر میں نے اپنی گفتگو کے شروع میں کیا تھا۔ ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ معاشی بدحالی اپنی گہری جڑیں رکھتی ہے اور اس کے اسباب بہت دوررس ہیں اور یہ کہ اس کا علاج فوری طور پر ممکن نہیں۔ ... اور یہ صرف طلبہ ہی پر نہیں ملک کے ایک ایک فرد پر مسلط ہے لیکن ہم اس کے

ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس ملک کے سیاسی رہنما اس صورت حال کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے اپنی گدیوں کی حفاظت میں مگن ہیں اور انہیں اپنے سیاسی جوڑ توڑ سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اس ملک کے عوام کی معاشی بدحالی کو دور کرنے کی فکر کر سکیں۔

اس سال اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کے آرگن اسٹوڈنٹس وائس (STUDENTS VOICE) نے اپنے طور پر جو استصواب طلبہ کی معاشی حالت کے سلسلے میں کیا ہے اس کے نتائج اتنے زیادہ قابل اعتماد نہ بھی سہی جتنے حکومت کے کسی استصواب کے ہو سکتے ہیں۔ تاہم ان سے پتہ چلتا ہے کہ طلبہ کس قدر شدید قسم کے معاشی بحران میں مبتلا ہیں اور کس کس طور پر تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔

اس استصواب کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۵ فیصد طلبہ =/۲۰۰ روپے سالانہ کے قریب فیس ادا کرتے ہیں۔ بیاسی فیصد طلبہ =/۲۰۰ اور =/۴۰۰ ادا کرتے ہیں اور صرف تین فیصد طالب علم ہیں جنہیں سکالر شپ ملتا ہے۔

تعلیم کے کل سالانہ خرچ کے سلسلے میں استصواب بتاتا ہے کہ ۲۵ فیصد طلبہ کو تقریباً =/۲۵۰ روپے سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں ۵۹ فیصد طلبہ تقریباً =/۵۰۰ روپے سال میں خرچ کرتے ہیں اور ۱۶ فیصد کو اس سے بھی زائد رقم خرچ کرنا پڑتی ہے۔

پھر اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً ۳۰ فیصد طلبہ کو تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ۷۰ فیصد ہمہ وقتی ملازم بن کر بھی بہت کم کماپاتے ہیں اور ۶۰ فیصد کو اپنے گھر کے اخراجات بھی خود برداشت کرتے ہوتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ طلبہ کو تعلیم کی کس قدر گراں قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور وہ کن حالات میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

گرانیٔ تعلیم کا علاج...... اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتحال کا علاج کیا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں ہمارا یہ مطالبہ کرنا غلط ہے کہ حکومت فوراً ہمارے تمام مسائل کو حل کر دے اور چشم زدن میں ہماری تمام مالی مشکلات کو آسان بنادے وہاں ارباب کار کا ہم سے یہ توقع رکھنا بھی غلط ہے کہ ہم بس چپ چاپ انہیں کرسیوں اور گدیوں کی جنگ میں

مصروف دیکھتے رہیں اور ان سے اس بات کا مطالبہ نہ کریں کہ وہ اپنی امکانی حد تک صورت حال کی اصلاح کی فکر کریں۔ ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا اپنے مسائل کو مطالبات بنا کر اٹھانا اور پھر جلوس نکالنا اور ہڑتالیں کرنا قوم اور ملک دونوں کے حق میں مضر ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت بھی اس بات کو محسوس کرے کہ اگر اس نے صورت حال کی اصلاح کی پوری کوشش نہ کی اور ان مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ نہ کی جو اس ملک کے طلبہ کو درپیش ہیں تو پھر یہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی مشکلات ایک ایسے آتش فشاں کی شکل اختیار کر سکتی ہیں جسے پھٹنے سے روکنا کسی کے بس کی بات نہ ہوگی۔ اس سال کراچی کے واقعات سے جو تجربہ ہماری حکومت کو ہو چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد بھی مزید تجربات کی کوشش کرنا اگر حماقت نہیں تو کم فہمی ضرور ہے۔

ان مسائل کے حل کی جو صورتیں ہم نے مفید پائی ہیں وہ دو ہیں :۔

(۱) ۔ ایک یہ کہ ان کو پورے ٹھنڈے دل سے سمجھنے اور سمجھانے کے موڈ میں ذمہ دار لوگوں کے سامنے رکھا جائے اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ طلبہ کی مشکلات کو خود اپنی مشکلات سمجھتے ہوئے ان پر ہمدردانہ غور کریں اور جس حد تک ان کے امکان میں ہو انہیں دور کریں اس کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ طالب علم چوکنے ہوں اور اپنی باگ ڈور ایسے سنجیدہ لوگوں کے ہاتھ میں دیں جو معاملات کو پیچیدہ بنا کر اپنی لیڈری کا ڈھونگ نہ رچانا چاہتے ہوں بلکہ واقعی مسائل کا حل چاہتے ہوں اور نظام تعلیم کے کارپرداز اور حکومت کے اربابِ کار پوری سنجیدگی سے معاملات پر غور کریں اور جو کچھ وہ کر سکتے ہوں اس میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

(۲) ...... دوسرے یہ کہ طالب علم "اپنی مدد آپ" کے اصول پر عمل پیرا ہوں اور اپنی جن مشکلات کا حل خود کر سکتے ہوں ضرور کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جتنی قوت طلبہ اپنے مسائل کو حکومت کے سامنے رکھنے اور اس کیلئے آواز اٹھانے میں صرف کرتے ہیں اگر اتنی ہی قوت وہ اپنے مسائل کو خود حل کرنے میں صرف کریں تاکہ مسائل کا معتدبہ حصہ آپ سے آپ حل ہو جائے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے جو کہ آپ واقعی ان مسائل کا حل ہی چاہتے ہوں اور انہیں اٹھانے میں کوئی اور غرض آپ کے پیش نظر نہ ہو۔

نظامِ تعلیم کی خرابیاں...... عام معاشرے اور ریاست کے اس جائزے کے بعد اب ذرا اس نظام تعلیم پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں جس کے تحت ہم تربیت پا رہے ہیں۔

موجودہ نظام تعلیم میں دو طرح کی خرابیاں ہیں :۔

(ا)۔ ایک فروعی قسم کی جنہیں طریق تعلیم کی خرابیاں کہا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے ہاں تعلیم کا بہت پرانا طریقہ رائج ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ ترقی ہو چکی ہے اس کا ہمیں بس اتنا علم ہے کہ دنیا کے کچھ حصوں میں ترقی یافتہ طریقوں سے تعلیم دی جارہی ہے یہاں ابھی تک وہ طریقے استعمال نہیں کئے جارہے۔ اسی سلسلے میں کچھ اور شکایتیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ امتحان کا طریقہ غلط ہے۔ اساتذہ کی تنخواہیں کم ہیں' لائبریریاں کم ہیں' کھیلوں کا انتظام اچھا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ

(ب)۔ لیکن ہم جن خرابیوں کو اصل میں خطرناک اور مہلک سمجھتے ہیں وہ دوسری قسم کی ہیں اور انہی کو حقیقت میں نظام تعلیم کی خرابیاں کہا جاسکتا ہے اور وہ اس نظام تعلیم کی بنیادوں سے متعلق ہیں۔

(۱)۔ ہمارے نزدیک اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اب تو یہ بالکل بے مقصد ہے لیکن اس کے مرتب کرنے والوں نے ٹھیک اپنے مقاصد اور اپنی اغراض کے پیش نظر اس کا مقصد "غلام سازی" رکھا تھا۔ انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے اقتدار کی گاڑی کھچوانے کے لئے دیسی قلی مطلوب تھے اور ان دیسی قلیوں ہی کی تربیت کے لئے انہوں نے یہ نظام تعلیم مرتب کیا تھا جو ہمیں دورِ غلامی کی ایک وراثت کے طور پر ملا ہے۔

(۲)۔ بے مقصدیت کے علاوہ اس نظام تعلیم کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں مغرب کے مرتب شدہ علوم جوں کے توں پڑھائے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغرب میں علوم کا ارتقاء اور ان کی ترتیب ایک خاص نقطۂ نظر سے ہوئی ہے اور یہ نقطہ نظر سراسر ملحدانہ ہے۔ یہ الحاد ان علوم میں اسطرح پیوست ہے کہ اس کو ان علوم سے علیحدہ کر کے نہ پڑھا جاسکتا ہے اور نہ پڑھایا جاسکتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسطرح کے علوم نہ صرف یہ کہ ہمارے کام کے نہیں بلکہ ہمارے نقطہ نظر سے خطرناک ہیں۔

(۳)۔ اس نظام تعلیم کی تیسری خرابی یہ ہے کہ اس میں ایک طالب علم کو صرف مجموعۂ علوم

بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس کی سیرت و کردار کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

نئے نظام تعلیم کی ضرورت...... یہ نظام تعلیم جو متذکرہ بالا تین بنیادوں پر قائم ہے اور جس میں ان اصولی خرابیوں کے ساتھ ساتھ دوسرے فروعی نقائص بھی موجود ہیں ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ ہم زیادہ دیر تک اسے اپنے ملک میں برداشت کر سکیں۔ یہ نہ آزادی کی ضروریات پوری کرتا ہے اور نہ ہماری قومی خواہشات کی تکمیل میں مد ہے۔ اب جو کام ہمارے پیشِ نظر ہے یعنی پاکستان میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور پھر دنیا بھر میں اسلامی انقلاب کی علم برداری اس کا تقاضا ہے کہ اس نظام کو جلد از جلد ہماری تعلیم گاہوں سے رخصت کیا جائے اور اس کی جگہ ایک نئے نظامِ تعلیم کو رائج کیا جائے جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکتا ہو۔

ہمارے اس نئے نظامِ تعلیم کا واضح اور مثبت مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہو جو خود مسلمان بن کر اٹھیں اور دنیا میں اللہ کے دین کو قائم کر سکیں۔ یہ نظامِ تعلیم ہماری نسل کو مسلمان بنا کر اٹھائے اور ان میں اُن صلاحیتوں اور قوتوں کی نشوونما کا انتظام کرے جو دنیا میں اسلامی انقلاب لانے کے لئے ناگزیر ہیں۔

اس مقصد کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم کے لئے علوم و فنون کو خالص خدا پرستانہ نقطہ نظر سے مرتب کیا جائے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا صرف اختصار سے عرض کروں گا کہ اس سے ہماری مراد صرف یہ نہیں ہے کہ اسلامیات کے مضمون کو لازمی قرار دیا جائے بلکہ اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ تمام علوم کو از سرنو اسلامی نقطہ نگاہ سے مرتب کیا جائے اور مغرب کے فلسفے اور عمرانیات کو یہاں صرف تنقیدی نقطۂ نگاہ سے پڑھایا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام انسانی زندگی کے لئے جو ہدایات دیتا ہے وہ یہ ہیں اور اسے چھوڑ کر انسانوں نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں وہ یہ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ نظامِ تعلیم طلبہ کی سیرت و کردار کی تعمیر کی ذمہ داری بھی لے...... اسلام کے مفیدِ مطلب لوگ وہی ہو سکتے ہیں اور دنیا میں اسلامی انقلاب کا کام انہی لوگوں کے ہاتھوں سرانجام پا سکتا ہے جو سیرت و کردار کے اعلیٰ ترین مقامات پر سرفراز ہوں اور ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہمارے نظام تعلیم کا فرض ہونا چاہئے۔

یہ وہ بنیادی تبدیلیاں ہیں جو اس نظام تعلیم میں ہم چاہتے ہیں لیکن حاشاو کلا ہمارا ارادہ یہ نہیں ہے کہ اس معاملے کو ایک سیاسی نعرہ بنائیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ نظام تعلیم میں اتنا بڑا اور ایسا بنیادی انقلاب فوری طور پر نہیں لایا جا سکتا اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو ابھی نہ خود طلبہ میں، نہ عوام میں اور نہ ارباب حکومت میں... یہ احساس اور شعور پوری طرح پیدا ہو سکا ہے کہ نظام تعلیم میں اسطرح کی تبدیلی کی ضرورت ہے اور دوسرے یہ کام واقعی بڑا کٹھن ہے اور بڑی محنت چاہتا ہے اور اس بات کا طالب ہے کہ کچھ ہمت والے اہل علم اس کام کو اپنے ذمے لیں اور علوم کی از سرِ نو تدوین کا کام کریں تاہم اس معاملے میں جو کچھ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہئے وہ یہ ہے کہ :-

(۱) ۔ ایک طرف طلبہ میں عموماً اور عوام میں خصوصاً یہ احساس بیدار کیا جائے کہ یہ نظامِ تعلیم انتہائی ناقص ہے، اور ان اجتماعی خواہشات اور ارادوں کے پورا کرنے کی کوئی صلاحیت اپنے اندر نہیں رکھتا جو ہمارے پیش نظر ہیں۔

(۲) ۔ دوسری طرف اہل علم حضرات کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ مطلوبہ نظام تعلیم کی بنیادوں کو واضح طور پر مرتب کریں اور وہ طریقہ بتائیں کہ جس سے موجودہ نظامِ تعلیم کو آہستہ آہستہ نئی ضروریات کے مطابق ایک بالکل نئے نظام تعلیم میں تبدیل کیا جا سکے۔ اور

(۳) ۔ تیسری طرف حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ تدریجاً ایسے اقدامات کرے جن سے نظام تعلیم میں مطلوبہ تبدیلی لائی جا سکے۔

یہ تینوں کام اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ جن طلبہ نے اس کام کی اہمیت کو محسوس کیا ہو وہ منظم ہو کر ایک تنظیم بنائیں اور یہ تینوں کام کرنے کی کوشش کریں۔

طلبہ کا جائزہ...... اس جائزے میں تیسرے نمبر پر خود طلبہ ہیں اور انتہائی معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خرابیاں پورے طور پر خود ان میں بھی نفوذ کئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اقامتِ دین کے سلسلے میں اصل کام ہم طلبہ ہی کو کرنا ہو گا۔ اس لئے جو بیماریاں ہم اپنے اندر چھپائے پھر رہے ہیں، ان کی صحیح تشخیص اور ان کے علاج کی فکر بھی ضروری ہے لہٰذا اس معاملے میں کچھ طرف داری برتنا اور سارے کا سارا الزام حکومت

پر ڈال دینا صحیح نہیں ہے۔ ہمیں اپنی خرابیوں کا جائزہ کچھ زیادہ ہی باریک بینی سے لینا چاہئے
چنانچہ میں اس معاملہ میں بھی ذرا تفصیل سے کام لوں گا۔

(۱) گرد و پیش سے بے خبری...... سب سے پہلی بات جو مجھے کھٹکتی او
آپ کو بھی کھٹکتی ہوگی وہ بے حسی اور لاپرواہی ہے جو زندگی کا معمول بن گئی ہے۔ بہت کم طلبہ
ایسے ہیں جنھوں نے زندگی کے بنیادی مسائل پر کبھی سوچا ہے اور ان میں ان لوگوں کی تعداد
آٹے میں نمک کی مقدار جتنی ہے جنھوں نے سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا کوئی مقصد اور مصرف
بھی تجویز کیا ہے۔

اکثر ایسے ہیں جنہیں اس بات کا احساس تک نہیں ہے کہ اب ہم آزاد ہیں اور اس
حیثیت سے ہماری حالت اس حالت سے مختلف ہے جو اس سے سات[1] سال قبل تھی۔ ہم میں
سے ننانوے فیصد لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے بلکہ اس بات سے بھی
کہ خود ان کے ملک میں کیا ہو رہا ہے...... اب آپ خود سوچئے کہ اس قدر بے حسی او
بے ہوشی کس بات کا اشارہ کرتی ہے یقیناً اس بات کا کہ مریض بس دم بھر کا مہمان ہے۔

(۲) دینی اور اخلاقی حالت...... دوسری بات جسے میں نہایت اہم سمجھتا
ہوں یہ ہے کہ ہمارے طلبہ کا دینی معیار گرتے گرتے صفر تک پہنچ رہا ہے۔ دین کا علم یہاں
نام کو بھی نہیں ملتا دین کی بنیادی باتوں تک سے وہ لوگ بے خبر ہیں جو عنقریب گریجوایٹ بننے
والے ہیں، رہے نماز، روزہ اور دوسرے دینی فرائض تو ان پر عمل پیرا ہونا تو کجا ان کے مذاق
اڑانے تک کو اب فیشن کا مقام حاصل ہو چکا ہے

عام اخلاقی حالت بھی بے حد دگرگوں ہے...... اور اس کا اندازہ آپ سب حضرات کو
اچھی طرح ہے میں نہیں چاہتا کہ زیادہ تفصیل سے اس معاملہ پر گفتگو کروں، ہمارا اخلاق جس
درجہ گر گیا ہے اس کا ہمیں شب و روز مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اس سال کراچی کے طلبہ نے اور وہ
بھی کالجوں کے نہیں بلکہ ہائی سکولوں کے طلبہ نے لاہور جاتے ہوئے جو ہلڑبازی کی تھی وہ ابھی
ایک تازہ واقعہ ہی ہے جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اخلاق کو کس درجے گھن لگ چکا ہے۔
اسی طرح یہیں یوم استقلال پر جو کچھ ہوا تھا اسے کون نہیں جانتا صرف ان دو باتوں سے بھی اچھی

---

[1] واضح رہے کہ یہ تقریر ۱۹۵۴ء میں کی گئی تھی

طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری اخلاقی حالت کس قدر زبوں ہو چکی ہے۔

(۳) **تعلیمی معیار**...... پھر تعلیمی معیار کے بارے میں آئے دن خبریں سننے میں آتی رہتی ہیں کہ وہ دن بدن گر رہا ہے۔ امتحانوں میں کامیابی کا فیصد تناسب بہت گر چکا ہے پھر جو پاس ہوتے ہیں وہ بھی فی الواقع معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محنت کرنے کا مادّہ بالکل ختم ہو رہا ہے اور محنت سے جی چرانے کی عادت عام ہو رہی ہے۔

کم و بیش یہ ہے وہ حالت کہ جس میں خود ہم طلبہ گرفتار ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کی سب سے بڑی وجہ وہ غلط نظام تعلیم ہے جس کے تحت ہم نے پرورش پائی ہے اور اس کا واحد علاج ایک صحیح اسلامی نظام تعلیم ہے لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ابھی تو صحیح اسلامی نظام تعلیم کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا کجا کہ اس کے نفاذ کی امیدیں وابستہ کی جائیں اور اسی امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہا جائے۔ یہ صورتحال ایک فوری علاج کا مطالبہ کرتی ہے اور جہاں تک عقل کام کرتی ہے —————————— اس کا علاج صرف یہ نظر آتا ہے کہ جب تک ایک مکمل اسلامی نظام تعلیم درس گاہوں میں جلوہ آرا نہیں ہوتا وہ طلبہ جنہیں اصلاح کی ضرورت کا احساس ہے اور جو کم از کم اپنے بارے میں طے کر چکے ہیں کہ انہیں اقامتِ دین ہی کا کام کرنا ہے۔ منظم ہوں اور اس عبوری دور میں امکانی حد تک زیادہ سے زیادہ طلبہ کو موجودہ غلط نظام تعلیم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں اور ان کے لئے اس علمی اور اخلاقی تربیت کا اہتمام کریں جو انہیں ایک اسلامی نظام تعلیم مہیا کرتا اور زیادہ سے زیادہ طلبہ تک اسلام کی دعوت پہنچائے اور ان میں اصلاح کی ضرورت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کریں پھر ان لوگوں کو جو اس جذبے سے معمور ہو جائیں ایک نظم میں منسلک کریں اور انکی اخلاقی اور علمی تربیت کی کوشش کریں......

حضرات...... میرے نزدیک یہ ہے "طلبہ کے مسائل" کا صحیح تصور اور یہ ہے انکے حل کا صحیح طریق۔

اقول قولی ہذا واستغفر اللہ لی ولکم والسلام علیکم و رحمۃ اللہ

❋❋❋

نعیم اختر عدنان

پاکستان کی موجودہ صورتِ حال میں اسلامی انقلاب کی ضرورت و اہمیت

ایک ہمہ پہلو جائزہ

ہماری موجودہ حالت اور اس کا جائزہ

وطن عزیز مملکتِ خداداد پاکستان کا سماجی و معاشی اور سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر ظالمانہ و استحصالی اور یکسر غیر اسلامی ہے۔ اس لئے اس ملک کے کروڑوں باشندے جنہیں ہم بے بس اکثریت بھی کہہ سکتے ہیں۔ مسائل کے انبار تلے چیخ و پکار کر رہے ہیں مگر کوئی بھی تو ان کی آواز نہیں سنتا۔ آخر سنے بھی کون اور کیونکر؟

بانیٔ پاکستان جناب قائداعظم کی رحلت کے بعد وہ مٹھی بھر سرمایہ دار اور جاگیردار اقتدار کے وارث بن گئے جنہوں نے آزادی کی جدوجہد میں تو کوئی حصہ نہیں لیا تھا البتہ قومی وسائل کی لوٹ کھسوٹ ان کا ہمیشہ سے مقصد اولین رہا ہے۔

آپ پاکستان کی پہلی اسمبلی اور اُس کے بعد آج تک قومی و صوبائی اسمبلیوں کے منتخب ہونے والے ارکان کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہر دور میں جاگیردار طبقات ہی قوم کی گردن پر سوار نظر آئیں گے۔ مسلم لیگ، ری پبلکن پارٹی کنونشن لیگ، پیپلز پارٹی، غرض جس سیاسی قوت یا جماعت کے ہاتھ میں اقتدار آیا اس طبقے نے اس میں شامل ہونے اور اپنی سیاسی وفاداریاں بدلنے میں کبھی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور ہر حکومت نے ان کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ کروڑوں عوام یعنی بے بس اکثریت کے مفادات کو اس مٹھی بھر طبقہ کے مفادات کی چوکھٹ پر قربان کر دیا۔ حاصل کلام یہ کہ اس ملک کے اقتدار پر تقریباً نصف صدی سے ایک ایسا طبقہ قابض و متصرف ہے جو نہ صرف شریعت الٰہی کا باغی ہے بلکہ انسانی حقوق کو غصب اور پامال

کرنے والا بھی ہے۔ دوسری طرف عوام کی اکثریت کو ضروریات زندگی تک سے محروم کر
گیا ہے۔ چنانچہ وسائل رزق کی اس غیر منصفانہ تقسیم نے بے بس اکثریت کو مسائل کے نہ
ہونے والے سلسلے میں گرفتار کر دیا ہے۔

وطن عزیز کے موجودہ حالات کی تصویر کشی کی جائے تو اس کے مختلف رنگ کچھ اس طرح
سے سامنے آتے ہیں۔

سود خوری خدا اور رسولؐ کے ساتھ جنگ

سود جیسی خبیث شے کو شیر مادر سمجھنے والوں اور اس پر مبنی نظام معیشت کے حامل
معاشرے کو خدائے واحد نے اپنی آخری کتاب میں بہت سخت دھمکی دی ہے :۔ "اے وہ لوگو
جو ایمان کا دعویٰ رکھتے ہو اگر تم واقعی ایماندار ہو تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو اور تمہارا سود
(دوسروں کے ذمے) باقی ہے اس کو چھوڑ دو۔ پس اگر تم ایسا نہ کرو تو تمہارے خلاف اللہ
اور اس کے رسولؐ کی طرف سے اعلان جنگ ہے" (البقرۃ = ۲۷۸ ' ۲۷۹)

مسلمانان پاکستان ذرا غور فرمائیں کہ جو قوم کسی سپرپاور سے جنگ لڑ رہی ہو وہ راحت
آرام کی زندگی کیسے بسر کر سکتی ہے مگر افسوس کہ آج ہمیں اس کی حقیقت کی سنگینی کا احساس
تک نہیں کہ ہم اس کائنات کی واحد اور حقیقی سپرپاور سے برسرپیکار ہیں۔ مقام حسرت و
افسوس ہے کہ لاالہ الااللہ کے نام پر وجود میں آنے والی مملکت آج سودی نظام معیشت کی
ظلمتوں میں گھر کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کا نتیجہ بھگت رہی ہے۔

۲۔ ملاوٹ و دھوکہ دہی

آج ملاوٹ اور دھوکہ دہی کو دولت سمیٹنے کا ایک بہترین ہنر سمجھ لیا گیا ہے۔ اشیائے
خورد و نوش اور ادویات تک میں ملاوٹ آج ہماری قومی پہچان بن کر رہ گئی ہے اور ہم اپنے
بھائیوں کے ساتھ دھوکہ بازی کر کے اپنے لئے دنیا و آخرت کی رسوائی کا سامان جمع کر رہے
ہیں۔ اس فرمان نبویؐ کی روشنی میں کہ "جس نے ملاوٹ کی اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں"
اندازہ لگائیے کہ ہم اس انسانیت کش حرکت سے حضورؐ کی امت سے خارج ہونے کا خطرہ
مول لے رہے ہیں۔

اے کاش ہمیں اپنے مقام کا احساس ہوتا۔ یہ وہ مقام بلند ہے جس کی آرزو حضرت موسیٰ
جیسے صاحب کمال نبیؑ نے بھی کی تھی۔

۳۔ رشوت ستانی

اس میدان میں آج ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں ہمارا سربراہِ مملکت بھی یہ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتا کہ رشوت کا ریٹ پانچ روپے سے بڑھ کر پچاس روپے ہو گیا ہے۔ اور تو اور وزرائے کرام سے لیکر ارکان اسمبلی تک اس مرض میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ جب قوم کے راہنما و محافظ ہی ڈاکوؤں اور لیٹروں کا منصب سنبھال لیں تو باقی معاشرے کا ذکر ہی کیا! حالانکہ جس نبیؐ کے ہم ماننے والے ہیں اس ذات گرامی کا ارشاد ہے۔ "رشوت دینے والا اور رشوت لینے والا دونوں جہنمی ہیں"۔ کبھی یہ خیر امت اپنے نبیؐ کے اس فرمان کی صداقت پر غور کر لیتی تو یہ حالت ہر گز نہ ہوتی جس سے آج ہر اہل وطن پریشان ہے۔

۴۔ وعدہ خلافی اور خیانت

انفرادی سطح سے لے کر ملی و قومی سطح تک ہم اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اپنے ہم مذہب اور ہم وطن بھائیوں سے بھی وعدہ خلافی کی روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ پچاس سال قبل خالق کائنات سے کیا گیا وعدہ "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" ہم پس پشت ڈال چکے ہیں اور یوں قیام پاکستان کے مقاصد سے انحراف ہمارے اس قول و فعل کے تضاد کی منہ بولتی تصویر ہے۔

رہ گئی امانت اور اس کا پاس تو یہ تو گویا ہمیں معلوم ہی نہیں کہ کس چڑیا کا نام ہے۔ بس ہم تو صرف یہ جانتے ہیں ؎

اے دیانت بر تو لعنت از تو رنجے یافتم
اے خیانت بر تو رحمت از تو گنجے یافتم

اپنی حیثیت اور منصب سے ناجائز مفادات حاصل کرنا اپنا حق سمجھا جاتا ہے۔ سرکاری خزانے کا مفہوم گھر کی مرغی ہے جسے جب چاہا ذبح کر کے کھا لیا۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہو تو کیونکر؟ اور یوں ہم اپنے کردار سے اپنے مسلمان ہونے کا ناقابل تردید ثبوت فراہم کر رہے ہیں حالانکہ نبی رحمتؐ نے فرمایا "اس کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کی پاسداری نہیں اور اس کا کوئی دین نہیں جس میں وعدہ کی پابندی نہیں"۔ مگر اس فرمان نبوی کے باوجود ہمارے ایمان و اسلام کی مضبوط عمارت میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیسے مطمئن اور نڈر ہیں ہم لوگ!

۵۔ لینے اور دینے کے مختلف پیمانے

ایک معاملہ تو ناپ اور تول میں کمی کا ہے جسے ہم سب جانتے اور پہچانتے ہیں اور اس ک
ہمارے ہاں کمی نہیں۔ مگر اس سے اہم تر معاملہ حقوق و فرائض میں توازن کا ہے۔ یہاں
معلوم ہو گا کہ اپنے خود ساختہ حقوق کی فہرست بہت طویل بلکہ لامحدود مگر کسی قسم کے فرائض
اور ذمہ داریاں قبول کرنے کیلئے قطعاً تیار نہیں۔ جہاں تک دوسروں کے حقوق کا تعلق۔
ان کا ذکر بھی زبان پر نہ آئے گا۔ ان کیلئے فرائض اور ذمہ داریوں کی طویل فہرست تیار
رکھی ہے۔ ایک جاگیردار سے کسان اور ہاری کی اجرت اور ایک کارخانہ دار سے محنت کش
ملازم کی اجرت دریافت کیجئے۔ بات کچھ چھ سو اور سات سو کے درمیان چکر کھائے گی لیکن اگر
آپ اسی شخص کو چار ہزار روپے میں مہینہ بھر کیلئے گزر اوقات کرنے کیلئے کہیں تو جواب
"ناممکن" میں آئے گا۔ وجہ صرف ایک ہی ہے یعنی لینے اور دینے کے پیمانے مختلف ہو گئے
ہیں۔

٦۔ ظلم و ناانصافی

ہمارے اس طرز عمل کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے ا
فرمان کو فراموش کر دیا کہ "تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک
اپنے بھائی کیلئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اسے اپنے لئے پسند ہے۔" مغرب سے درآمد شدہ
موجودہ استحصالی نظام نے ظالم اور مظلوم دونوں کو اپنی اپنی حالت سے مطمئن رہنا سکھایا ہے ا
یوں گویا ظلم و ناانصافی ہمارے دل کی آواز بن گئی ہے۔ ظالموں کا تو شیوہ ہی ظلم کرنا ہے
مظلوم بھی ظلم کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ اور ظلم کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کرتا
حالانکہ خود دین اسلام عطا کرنے والے خالق نے نہ صرف ظلم کے خلاف احتجاج کی اجازت
دی ہے بلکہ ظالم کا ہاتھ پکڑنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید کے چھٹے پارے کی پہلی آیت کا مفہوم
ہے کہ اللہ تعالیٰ بری بات کو اونچی آواز سے بیان کرنے کو ناپسند کرتا ہے مگر مظلوم اس پابندی
سے آزاد ہے۔ یعنی ظالم اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا مظلوم کا حق ہے، مگر قرآن کی
انقلابی و آفاقی تعلیمات تو ہمارے دین دار طبقے نے عوام الناس سے چھپا رکھی ہیں اور انہیں
تقدیر کا مقدس فریب دے کر بہلایا جا رہا ہے۔ درآنحالیکہ رہبر اعظم محمد عربی صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا کہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ پوچھا گیا مظلوم کی مدد

کرنا تو معلوم و معروف ہے مگر ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟ فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے اس کے ظلم سے روک دیا جائے۔

۷۔ فحاشی و عریانی کا طوفان

واقعہ یہ ہے کہ آج ہم اس معاملے میں مغربی معاشرے کے دوش بدوش ہی نہیں اس سے دوہاتھ آگے نظر آتے ہیں کیونکہ ہم اس شعبہ میں اب ترقی پذیر نہیں ترقی یافتہ ہیں۔ بے حیائی و فحاشی کے آلات شاید مغربی ممالک نے ہمارے ہی لئے بنائے ہیں۔ ٹیلی ویژن ہو یا وی سی آر' اخبارات ہوں یا رسائل و جرائد' فائیو سٹار ہوٹلوں کے سوئمنگ پول ہوں یا تفریحی پارک' کالج ہو یا دفتر' الامان والحفیظ۔ یوں معلوم ہوتا ہے گویا ہم انسانیت کی سطح سے گر کر حیوانوں سے بھی بازی لے گئے ہیں۔

۸۔ مسرفانہ طرزِ معاشرت

معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین طبقاتی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ایک طرف کئی کئی ایکڑ پر مشتمل ایوان صدر' وزیر اعظم ہاؤس' گورنر ہاؤس اور دیگر سرکاری و نجی رہائشی بنگلہ جات' لمبی لمبی چمکدار کاریں اور عیاشی و فضول خرچی کے دوسرے لوازمات کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ دوسری طرف کروڑوں عوام بنیادی انسانی ضرورتوں سے بھی محروم ہیں۔ شہری علاقوں میں جائز ذرائع سے رہائشی پلاٹ خریدنا اور پھر اس پر عمارت۔ ناناناممکن ہے' لہٰذا خون پسینہ ایک کر کے کمائی ہوئی تنخواہ کا آدھا حصہ کرایہ مکان کے طور پر عمر بھر ادا کرنا پڑتا ہے۔ تعلیم و علاج کی سہولت کا ذکر ہی کیا' وہ تو گویا بس چند وڈیروں یا لیڈروں ہی کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی بے بس اکثریت یا معاشی غلاموں کو علم کے زیور سے آراستہ کر کے اور بیماریوں سے محفوظ تندرست جسم عطا کر کے یہ ظالمانہ طبقاتی نظام بھی تو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لہٰذا یہ بالادست طبقات کی مجبوری ہے۔ پھر ان طبقات کی بلا سے کہ عوام کو ٹرانسپورٹ کی کوئی سہولت میسر ہے یا نہیں! دفتر' فیکٹری' سکول' کالج اور ہسپتال جانے کیلئے اربن ٹرانسپورٹ' ویگن سروس اور پرائیویٹ بسیں کس طرح انسانوں کو بھیڑ بکریوں بلکہ گڈز کمپنیوں کے ٹرکوں میں لادی جانے والی اشیاء کی طرح ٹھونستی ہیں اس سے انہیں کیا غرض۔ ان ذرائع سے سفر کرنے والے حضرات کے اوسطاً چار گھنٹے روزانہ اس ٹرانسپورٹ کی نذر کرا دیئے جاتے ہیں تاکہ بارہ چودہ گھنٹے کی محنت و مشقت کے بعد یہ لوگ کسی اور طرف متوجہ ہی نہ ہو سکیں اور

صورت حال کچھ یوں ہو جائے۔

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

موجودہ صورتحال کے اسباب اور اس کے ذمہ دار طبقات

مملکت خداداد پاکستان میں نافذ سماجی، سیاسی اور معاشی نظام استحصالی اور آمرانہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر ناقص اور فرسودہ ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی بہتری کی توقع عبث ہے۔ جس انتظامی و معاشرتی نظام میں کسی شہری کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہو، اور جس عدالتی نظام میں انصاف ملتا نہ ہو مگر خریدا جا سکتا ہو، جہاں عظیم اکثریت بنیادی انسانی ضروریات تک سے محروم ہو، سر چھپانے کیلئے جھونپڑا اور دو وقت کا کھانا تک میسر نہ ہو، ایسا نظام آخر کس کام کا! لہٰذا ہمارے خیال میں موجودہ مشکلات اور مسائل کا واحد ذمہ دار یہی فرسودہ نظام ہے اور ان مسائل کا واحد حل اس نظام کی بیخ کنی ہے!

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہو گا کہ ظالمانہ اور فرسودہ ہونے کے باوجود یہ نظام رائج و نافذ کیوں ہے ہر رائج الوقت نظام کے کچھ محافظ بھی ہوتے ہیں، جن کے مفادات اس نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کی ساری توانائیاں اس ظالمانہ نظام کے تحفظ اور اسے برقرار رکھنے کیلئے صرف ہوتی ہیں۔

انبیاء کرام کی زندگیوں کا مطالعہ کیجئے۔ حضرت نوحؑ سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی کی تعلیم کے اولین مخالفین قوم کے سردار، چودھری اور وڈیرے ہی ہوتے تھے، جنہیں آپ بالادست طبقات بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی مختصر مگر با اختیار طبقہ جس کے ہاتھوں میں پورے ملک کی معاشی و سیاسی باگ ڈور ہوتی ہے اس ظالمانہ نظام کا پورا پورا دفاع کرتا ہے۔

پسماندہ اور دبے ہوئے طبقات کو معاشی و سماجی جبر سے نجات دلانا اسلام کی تعلیمات کے اہم ترین مقاصد اور اہداف میں ہمیشہ سے شامل رہا ہے۔ چنانچہ انہیں مراعات یافتہ بالادست طبقات کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے کیلئے اس طبقاتی اونچ نیچ کے بت کو پاش پاش کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر اجتماعی نظام کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔

،جان مذہبیت اور فرقہ واریت کا علمبر دار طبقہ

اس طبقے کی عظیم اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دین و مذہب سے عملی دلچسپی رکھتی
۔ چنانچہ انہی کے دم قدم سے مساجد تعمیر ہوتی ہیں اور آباد رہتی ہیں۔ مدارس و مکاتب اور
لعلوم قائم ہوتے ہیں اور ان میں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ جمعہ
ماعت کا نظام قائم ہے۔ ماہ صیام کے دوران تراویح اور شبینوں میں قرآن کی تلاوت کی
دت حاصل ہوتی ہے۔ حج و عمرہ کیلئے آمدورفت کا سلسلہ جاری ہے۔ الغرض عبادات و
مات کی حد تک پورا مذہبی ڈھانچہ قائم ہے۔ لیکن ذرا دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم
اکہ اس طبقے کی اکثریت کا تصور دین نہ صرف یہ کہ نہایت محدود ہے بلکہ اکثر و بیشتر حالتوں
سخ شدہ بھی ہے چنانچہ ان کے ہاں دین صرف بعض علامات اور رسومات کا مجموعہ بن کر رہ
ہے اور اُس کا کوئی تعلق نہ انسان کی انفرادی سیرت و کردار سے ہے نہ قومی و ملی امور اور
ی معاملات سے۔ نتیجۃً وہ دین جو اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے پوری انسانی زندگی کو اپنی
میں لیکر اُس پر حکمرانی چاہتا ہے اُن کے یہاں زندگی کے بہت ہی چھوٹے سے دائرے میں
دہو کر رہ گیا ہے اور اس کے وسیع تر تقاضوں کا انہیں سرے سے کوئی شعور ہی نہیں۔ یہی
ہے کہ اس حلقے کی ایک غالب اکثریت کا حال یہ ہے کہ دینداری کے جملہ مظاہر یعنی نماز '
؛' روزہ ' اور حج حتیٰ کہ پوری شرعی وضع قطع کے ساتھ ساتھ بلیک مارکیٹنگ بھی چلتی ہے اور
ہ اندوزی بھی ' اسمگلنگ بھی جاری رہتی ہے اور کرنسی کا غیر قانونی لین دین بھی ' اشیائے
ونوش اور ادویات تک میں ملاوٹ جیسی حد درجہ مکروہ حرکت انہیں برائی معلوم نہیں
ں۔ انکم ٹیکس ' کسٹم ' ایکسائز ڈیوٹی اور دیگر سرکاری محصولات کی چوری کو مباح قرار دینے
انہیں کوئی عار نہیں۔ رشوت دی بھی جاتی ہے اور لی بھی جاتی ہے۔ سودی رقوم سے کاروبار
سیع تر کرنا اور بنگلہ جات تعمیر کرنا تو شیر مادر ہے ہی ' جہاں موقع ملے جوئے اور سٹے سے بھی
اب نہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ اس حلقے کی اکثریت الا ماشاءاللہ ذاتی اخلاق اور بین
سانی معاملات میں بالعموم بہت گھٹیا ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ خشونت ' درشتی اور سنگ
بالعموم ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے ہیں۔ انسانی ہمدردی اور دل کی نرمی سے انہیں دور کا بھی
طہ نہیں (الا ماشاءاللہ)۔

ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل ان لوگوں سے بیزار و متنفر ہو کر

سرے سے دین ومذہب ہی سے بد ظن ہوتی چلی جارہی ہے۔ تصور مذہب کی اسی محدودیت
ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مذہب کے نام پر نت نئی رسومات ایجاد ہو رہی ہیں اور بدعات کا بازار گرم
سے گرم تر ہوتا جارہا ہے اور اسلام جو انتہائی سادہ ' دین فطرت ہے ' روز بروز اوہام کے پلندے
اور بدعات ورسومات کے طومار کی شکل اختیار کرتا چلا جارہا ہے ' اس کی بنیادی وجہ بالکل واضح
ہے کہ دین جسے انسان کی پوری انفرادی واجتماعی زندگی میں سرایت کر جانا چاہئے تھا جب سمٹ
سمٹا کر ایک گوشے میں مقید ہو گیا تو اس نے زور لگا کر اسی ایک گوشہ میں غیر متناسب طور پر بڑھنا
شروع کر دیا۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک طرف میت کی رسومات کا سلسلہ ہے کہ ربڑ کی طرح
کھنچتا چلا جارہا ہے اور دوسری طرف تہواروں اور جلوسوں کا معاملہ ہے کہ ان کی فہرست طویل
سے طویل تر ہوتی جارہی ہے اسی پر دوسرے معاملات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ
کہ مساجد جو رشد وہدایت کے سرچشمے تھے فرقہ پرستی کے گڑھ بن گئے اور یوں من دیگرم تو
دیگری والا معاملہ نظر آتا ہے۔

مختصر یہ کہ دین و مذہب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کی اکثریت کا تصور مذہب نہایت
محدود بھی ہے اور مسخ شدہ بھی۔ اس لئے یہ طبقہ بھی دانستہ اور نادانستہ طور پر موجودہ ظالمانہ
نظام کی گرفت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

اب ہمیں اس ظالمانہ نظام کو تبدیل کرنے کے طریق کار پر غور کرنا ہے۔ کسی بھی نظام کو
بدلنے کے دو طریقے مروج ہیں.......... انتخابی طریق کار اور انقلابی طریق کار۔ سب سے
پہلے ان دونوں طریق ہائے کار کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔

انتخابی وانقلابی جدّوجہد کا فرق

ہمارے نزدیک کسی بھی جماعت کیلئے سب سے پہلے فیصلہ طلب بات یہ ہوتی ہے کہ وہ
جس ملک میں کام کر رہی ہے یا کرنا چاہتی ہے ' آیا اس کے نزدیک اس ملک کا رائج الوقت
نظام (سماجی ' سیاسی ومعاشی ڈھانچہ) بنیادی طور صحیح ہے یا کلی طور پر غلط ہے۔ اگر کسی
جماعت کی رائے یہ ہو کہ موجودہ نظام تو صحیح ہے مگر اس کو چلانے والے ہاتھ غلط ہیں ' کچھ
جزوی خرابی یا خرابیاں ہیں تو وہ میدان سیاست کے راستے انتخابات میں قسمت آزمائی کر کے
ہاتھوں کو بدلنے کی کوشش کرے گی۔ اور اگر رائے یہ ہو کہ موجودہ نظام ہی غلط ہے تو جدوجہد
انقلابی خطوط پر ہو گی اور انتخابات کا راستہ اختیار کرنا اپنی منزل کھوٹی کرنے کے مترادف ہو گا۔

اب ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ اس مرحلے پر موجودہ حالات میں "اقدام" کی کیا صورت
ن ہے!

وطن عزیز پاکستان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور ارباب اقتدار بھی مسلمان
، لہٰذا "اقدام" کے لئے حکمت عملی غور و خوض کی متقاضی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کا مسلم
مت کے خلاف تلوار اٹھانا جائز ہے، لیکن اس کے لئے فقہاء نے بڑی سخت اور کڑی شرائط
دکی ہیں۔ ویسے بھی اب تمدن میں بڑی پیچیدہ تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ مزید یہ کہ ایک
ب عوام الناس بالکل نہتے ہوتے ہیں جبکہ دوسری جانب حکومت وقت کے پاس پولیس سے
کر مسلح افواج تک ہر قسم کے جدید اسلحہ سے لیس منظم و ہمہ وقتی ادارے موجود ہوتے ہیں جو
مت وقت کے ایک اشارے پر آن واحد میں سب کچھ تہہ و بالا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اب ان
ات میں مسلح تصادم عملی طور پر تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ موجودہ صورت حال کے
ابق حکمت عملی یہ ہوگی کہ اقدام کے مرحلے پر جبکہ دعوت و تنظیم اور تربیت کا کام مکمل ہو چکا
انقلابی جماعت برائی کو طاقت کے ذریعے روکے گی۔ وہ برملا اعلان کرے گی کہ یہ کام
یت کے خلاف ہے ہم اسے نہیں ہونے دیں گے۔ یہ منکرات ہمارے جیتے جی نہیں ہو
۔ یہ کام ہماری لاشوں پر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے ایسے منکرات کو ہدف بنایا جائے گا
کے بارے میں کسی فقہی مکتب فکر کو اختلاف نہ ہو اور سب اس کو منکر (برائی) تسلیم
تے ہوں، جیسے سودی نظام یا فحاشی و عریانی۔ یہ ہے ایک مسلمان ملک میں اسلامی نظام کے
م اور منکرات کے خاتمے کا اصل طریق کار۔ اور یہی نہی عن المنکر یعنی برائی کو روکنے اور
ے مٹانے کا نبوی طریق کار ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی
علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے اس پر فرض ہے کہ اسے ہاتھ
ے (یعنی طاقت سے) روک دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے (منع کرے)
اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے (برا سمجھے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ
ہے۔" انقلابی تبدیلی کے لئے اس حدیث نبویؐ پر اجتماعی عمل ناگزیر ہے۔

منکرات کے خلاف مظاہروں اور پکٹنگ (PICKETING) کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔
آج لوگ اپنے سیاسی و سماجی اور معاشی حقوق حاصل کرنے کے لئے یہ سب کچھ نہیں
تے؟ آخر ہڑتال کیوں ہوتی ہے؟ مظاہرے کس لئے ہوتے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ دنیا حاصل
نے کے لئے ہی باقی رہ گیا ہے؟ ہرگز نہیں! تمدن کی اس تبدیلی کو یکساں طور پر دین کے لئے

بھی استعمال کیا جاسکتا ہے' بلکہ استعمال کیا جانا ضروری ہے۔ البتہ اس کے لئے ایک شرط
رکھنی ہوگی اور یہی شرط کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور وہ یہ کہ جلسے جلوس' مظاہرے' ہڑتال
گھیراؤ' یہ سب کچھ پرامن ہو کر کیا جائے گا۔ کسی قسم کی توڑ پھوڑ منزل کو کھوٹا کرنے
مترادف ہوگی۔ ٹریفک کے اشارے اور گاڑیوں کے شیشے توڑ دینا' سرکاری املاک اور حکو
کے زیر انتظام چلنے والی بسوں کو آگ لگا دینا وغیرہ سب کمیونسٹوں کے ہتھکنڈے ہیں۔

انقلابی جدوجہد کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ایران کی ہے۔ پہلے تو شاہ کے حکم
پولیس اور فوج نے انقلاب کے علمبرداروں پر مظالم کی حد کر دی لیکن جب انقلابیوں کے
بشانہ عوام الناس کی اکثریت بھی سڑکوں پر نکل آئی تو اسی پولیس اور فوج نے نہتے عوام پر گو
کی بوچھاڑ کرنے سے انکار کر دیا۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوئی تو شہنشاہ ایران جیسے جابر
حکمران کو اپنی جان بچانے کے لئے ملک سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی[1] یہی صو
حال ۱۹۷۷ء میں نظام مصطفیٰ کی تحریک کے موقع پر پیدا ہوئی کہ فوج نے عوام پر گولیاں چ
سے انکار کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلام کے ٹھیکے داروں کی منافقت آڑے آ
نتیجتاً مارشل لاء دیکھنا پڑا۔

الغرض باطل نظام کی تبدیلی اور اسلام کے نظامِ عدل و قسط کا نفاذ صرف اور صرف
انقلابی جدوجہد کے ذریعے ممکن ہے' جو انقلاب نبویؐ کی طرز پر کی جائے۔ انتخابات کے ذ
اسلام کا نفاذ محال مطلق ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ کو عوام سے ووٹ لینے ہیں تو آپ ان
غلط عقائد و اعمال پر تنقید نہیں کر سکتے۔ پھر اسلام کے نام پر ووٹ مانگیں گے تو کوئی د
جماعت بھی اسلام ہی کے نام کو استعمال کر سکتی ہے۔ تو کیا ہر جماعت کو اپنا اسلام علیحد
کرنا ہوگا؟ اور اس طرح کئی اسلام وجود میں نہیں آجائیں گے؟ ہمارے ملک میں فرقہ وار
سب سے بڑا اور اہم سبب مذہبی جماعتوں کا انتخابی سیاست میں حصہ لینا ہی ہے۔ ویئے
پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ گواہ ہے کہ موجودہ انتخابی سیاست میں مذہبی جماعتیں کبھ
فیصلہ کن اکثریت حاصل نہیں کر سکتیں' لہٰذا انقلابی طریق کار اختیار کئے بغیر چارہ نہیں۔

اب ہمیں اس پوری انقلابی جدوجہد کا حاصل بیان کرنا ہے جسے ہم نے گزشتہ صفحا
پیش کیا ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ یہاں انقلاب ایران کی مثال محض انقلابی جدوجہد کی مثال کے ط

اسد ن انقلاب کے ثمرات یا منشور اسلام

اسلام کا انقلابی نظریہ توحید ہے، مکمل ترین اور خالص ترین توحید جسے آپ "توحید عملی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس توحید عملی کے تین شعبے ہیں۔ سیاسی سطح پر انسانی حاکمیت کی کلی نفی اور اس کی بجائے خلافت کا تصور۔ معاشرتی سطح پر طبقاتی تقسیم کی نفی اور کامل انسانی مساوات کا تصور۔ اور معاشی سطح پر انسانی ملکیت کی بجائے امانت کا تصور۔ اب ہم انہی تین سطحوں کو ذرا تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۱۔ **انسانی حاکمیت کی بجائے خلافت انسانی**...... سیاسی سطح پر توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا نہ صرف پیدا کرنے والا اور مالک ہے بلکہ حکومت و فرمانروائی کا اختیار بھی اُسی کو حاصل ہے۔ یعنی وہ صرف طبعی اختیار ہی کا مالک نہیں بلکہ سیاسی و آئینی اقتدار کا بھی مالک ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں اعلان فرمایا۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ۔ آگاہ ہو جاؤ کائنات کا خالق بھی وہی ہے (مالک بھی وہی ہے) اور حکم بھی اُسی کا چلتا ہے۔ توحید کا اصول انسانی حاکمیت کی کلی نفی کرتا ہے، خواہ یہ حاکمیت ایک فرد واحد کی ہو یا ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک پارٹی، یا پوری قوم کی (حاکمیتِ عوام) ہو۔ ایک فرد، ایک پارٹی، ایک قوم تو کیا پوری دنیا کے انسان بھی جمع ہو کر یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ خدا کے نازل کردہ قوانین میں اپنی مرضی کے مطابق کسی قسم کی تبدیلی کر سکیں۔ چنانچہ اسلام انسان کے لئے حاکمیت نہیں بلکہ خلافت کا تصور پیش کرتا ہے۔

خلافت سے مراد یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے خالق و مالک کی مرضی کو پورا کرے جو خدا کے نائب ہونے کی حیثیت سے اس پر فرض ہے۔ یہ نیابت و خلافت کسی مخصوص فرد، گروہ یا قوم کو نہیں سونپی گئی بلکہ اس کا حق ہر وہ شخص رکھتا ہے جو توحید، رسالت اور آخرت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت و خلافت کی شرائط پوری کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان اپنی آزاد مرضی سے اپنے میں سے خلافت کے لئے موزوں ترین شخص کو خلیفہ منتخب کریں گے۔ اسے خلافت عامہ کہا جاتا ہے اور یہ شہنشاہیت، پاپائیت اور لادینی جمہوریت کے برعکس اسلامی جمہوری رنگ رکھتی ہے۔ خلافت کے اسلامی تصور اور مغربی جمہوریت میں فرق یہ ہے کہ مؤخر الذکر میں عوام کے نمائندوں کی حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام کی شورائی خلافت میں عوام کے لئے [illegible]

تسلیم کیا جاتا ہے چنانچہ ایک اسلامی ریاست مغربی ریاست کی طرح مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہو سکتی بلکہ اُسے ہر آن اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے دائرے کے اندر رہنا ہوتا ہے۔

خلافت کا مقصد اسلام نے یہ متعین کیا ہے کہ وہ بھلائیوں کو فروغ دے اور برائیوں کا خاتمہ کرے جن کا وجود انسانی زندگی میں خالق کو ناپسند ہے۔ اسلامی ریاست کی یہ قطعی پالیسی ہے کہ اُس کی سیاست بے لاگ انصاف' بے لوث سچائی اور کھری ایمانداری پر قائم ہو اور وہ ملکی' انتظامی یا قومی مصلحتوں کی خاطر جھوٹ' فریب اور بے انصافی کو کسی حال میں بھی گوارا کرنے پر تیار نہ ہو۔

۲۔ ملکیت کی بجائے امانت...... معاشی و اقتصادی شعبہ میں نظریہ توحید کا فطری نتیجہ جسے اس دور میں کھول کر بیان کرنے کی ضرورت ہے' وہ انسان کی ملکیت مطلقہ کی کلی نفی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم مطلق نہیں' اسی طرح اس کے سوا کوئی مالک مطلق نہیں۔ گویا ہر شے کا مالک حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن مجید اور احادیث شریفہ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو مال کمانے اور رکھنے کی کھلی اجازت نہیں دیتا بلکہ اکتساب مال کے بعض ذرائع کو جائز قرار دیتا ہے اور بعض کو ناجائز۔ وسائل معاش میں جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی اساس یہ ہے کہ ایسے تمام ذرائع جن میں دوسرے شخص کی مجبوری' ضرورت' سادہ لوحی' یا ناتجربہ کاری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر یا دھوکہ دہی اور جبر کے ذریعے کسی کا مال ہتھیا لیا گیا ہو' شریعت میں ممنوع اور خلاف قانون ہیں۔ سود' جوا' ذخیرہ اندوزی' رشوت' بلیک مارکٹنگ اور دیگر ہر قسم کی دھاندلیاں بھی اسلام میں حرام ہیں۔ ان ذرائع سے کمایا ہوا روپیہ اگر راہ خدا میں بھی خرچ کر دیا جائے تو اس کی پذیرائی نہیں ہوتی۔ ایسے رزق سے جسم میں جو قطرۂ خون بنتا ہے اور جو گوشت پوست وجود میں آتا ہے' ارشاد مصطفویؐ کے مطابق وہ جہنم میں جلایا جائے گا۔ اسلام نے وہ تمام راستے بند کر دیئے ہیں' جن کے ذریعے ظالمانہ سرمایہ داری کو غذا پہنچتی ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے اس کی آمد و خرچ پر کئی ایک پابندیاں ہیں۔ جو مال ناجائز طریقہ سے حاصل کیا جائے گا وہ ضبط کر لیا جائے گا مگر جو کچھ جائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہے اُسے بھی خرچ کرنے کے معاملے میں انسان آزاد نہیں ہے۔ یہ مال اس کے پاس اللہ کی امانت

ہے اور اسے اس میں جائز تصرف کا حق دیا گیا ہے۔ اگر اس میں ناجائز طریقے سے تصرف کریگا تو حق
صرف بھی ختم ہو جائے گا۔ غور کیجئے معاشی سطح پر یہ کتنا عظیم انقلاب ہے۔ بقول شیخ سعدیؒ ۔

در حقیقت مالکِ ہر شے خدا است　　ین امانت چند روزہ نزدِ ما است

ار بقول علامہ اقبال مرحوم ۔

غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است　　ندہٗ مومن امیں' حق مالک است

اسلامی ریاست ہر شہری کی بنیادی انسانی ضروریات کی فراہمی کی ذمہ دار ہے۔ یہ بنیادی انسانی ضروریات رہائش کے لئے مکان ' زندہ رہنے کے لئے غذا ' سردی اور گرمی سے بچاؤ کے لئے مناسب لباس ' دین و دنیا کے علم کے لئے تعلیم ،جسم کو لاحق بیماریوں سے نجات کے لئے علاج اور انسانی نسل کے سلسلے کو قائم و جاری رکھنے اور جنسی خواہش کو جائز طریقے سے پورا کرنے کے لئے شادی جیسی ضروریات پر مشتمل ہیں۔ ان ضروریات کی فراہمی اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے الفاظ میں اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے باز پرس ہوگی۔ گویا معاشی سطح پر دولت کی منصفانہ تقسیم کے بغیر اسلامی انقلاب ادھورا اور نامکمل رہتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے تقویٰ و نیکی کو بھی معاشی کفالت سے مشروط کیا ہے۔ قرآن سورۃ المدثر میں بڑے مؤثر پیرائے میں اس حقیقت کو ایک انقلابی انداز میں بیان کرتا ہے کہ اہل جنت اہل جہنم سے پوچھیں گے (ترجمہ) "تمہیں کون سا جرم دوزخ میں لے گیا تو وہ جواب دیں گے کہ ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔" گویا قرآن مجید کی نظر میں نماز ادا نہ کرنا اور کسی غریب کو ضروریات زندگی بہم نہ پہنچانا دونوں یکساں نوعیت کے جرائم ہیں۔ بلکہ سورۃ الماعون میں بڑی وضاحت سے بیان فرمایا کہ "جو شخص یتیموں (بے سہارا) کی توہین کرتا ہے ان کو اپنے ہاں سے دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور غرباء و مساکین کی ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی ترغیب نہیں دلاتا وہ قیامت پر یقین ہی نہیں رکھتا۔" جو لوگ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے غریبوں کی امداد نہیں کرتے اور ان کی ضروریات کی فراہمی میں اپنا فرض ادا نہیں کرتے ان کے بارے میں قرآن مجید کا دل ہلا دینے والا ارشاد سنئے۔ (ترجمہ) "اس کو پکڑ لو ' پس اس کی گردن میں طوق ڈال دو۔ پھر اُسے بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو۔ پھر اسے ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ (بدبخت) خدائے ذوالجلال پر ایمان نہیں لایا تھا اور نہ ہی وہ غریبوں کی خوراک مہیا کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔" (الحاقہ) ان آیات میں جو رعب اور جلال ہے اس

سے دل کانپ اٹھتا ہے' رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک منصف مزاج انسان پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی مادی ضرورتوں کو انتہائی اہمیت دی ہے۔ اسلام نے صرف اخلاقی وعظ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قانونی طور پر ضرورت مند لوگوں کی کفالت کو اسلامی معاشرہ پر لازم قرار دیا ہے۔

توحید کے معاشی پہلو کے آخر میں ہمیں پاکستان کی زرعی اراضی کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثر زمین مسلمان فاتحین نے بزور شمشیر فتح کی ہے۔ ایسی مفتوحہ زمین خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے مطابق کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ زمین تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت (یعنی بیت المال کی) ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلامی انقلاب کے بعد ملک میں قائم بدترین جاگیرداری نظام کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہے اور یوں پورا ملک ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست کا روپ دھار کر دنیا کو اسلام کے قوانین کی برتری دکھا اور منوا سکے گا۔ ع

گر یہ نہیں تو بابا سب کہانیاں ہیں

کامل انسانی مساوات

انسانی تاریخ کا یہ المیہ رہا ہے کہ جہاں ایک طبقہ خدائی اختیارات (DIVINE RIGHTS) کا دعویٰ کر کے لوگوں پر حکومت کرتا رہا ہے اور جہاں انسان ملکیت مطلقہ کی ضلالت میں مبتلا رہا ہے وہاں وہ اس گمراہی میں بھی ٹھوکریں کھاتا رہا ہے کہ انسانوں میں ذات پات اور اونچ نیچ کی تقسیم ہے جبکہ معاشرتی سطح پر توحید کا تصور یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور ان کے مابین کوئی طبقاتی تقسیم نہیں۔ یہ رنگ و نسل اور یہ ذات پات کی تقسیم اور برہمن کا شودر پر' سید کا غیر سید پر اور وڈیرے کا مزارع پر بڑائی اور برتری کا دعویٰ سب باطل ہے۔ یہ ساری تقسیمیں غلط ہی نہیں موجب فساد بھی ہیں۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں۔ اس لئے کہ سب کا خالق ایک اللہ ہے اور سب ایک انسانی جوڑے آدم و حوا کی اولاد ہیں۔ ہاں اگر کوئی فضیلت ہے تو نیکی و تقویٰ اور اعلیٰ سیرت و کردار کی بنا پر ہے اور اس کا معاملہ بھی آخرت میں ہو گا۔ دنیا میں تمام انسان سماجی سطح پر کامل مساوات رکھتے ہیں۔ ع تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے۔ یہاں نہ کوئی حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے اور نہ محکوم رہنے کے لئے۔ اسلام سماجی سطح پر ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جو رنگ و نسل اور زبان کی

حد بندیوں کو توڑ کر توحید کے ماننے والوں کی ایک عالمی برادری کو معرض وجود میں لا سکے۔
الغرض اسلام انسان کے خلاف انسانی ظلم کو مٹانے کا حکم دیتا ہے اور سماجی سطح پر توحید کا تقاضا یہی
کامل سماجی مساوات ہے۔

حاصل کلام

تاریخ اسلامی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ اسلام دین حق ہونے کے باوجود آج غالب و نافذ
نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے اعمال کی تصویر میں اتارنے والے لوگ بہت کم ہیں۔
اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ جمہوریت اگرچہ ایک فریب و جھوٹ ہے مگر یہ اس لئے غالب و نافذ ہے کہ
اس کو حقیقت کا جامہ پہنانے والے بے شمار افراد موجود ہیں۔

اسلام کو سربلند دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی جملہ خود مختاریوں سے آزاد ہو
کر خدا تعالیٰ کے مطیع و فرمان بندے بن جائیں ——— اور اسے دنیا میں انقلابی
جدوجہد کے ذریعے نافذ و غالب کرنے کے لئے تن ' من ' دھن نچھاور کرنے پر آمادہ ہوں۔
۔ اگر باطل نظام اپنی قوت و فطرت کے لحاظ سے اتنا ہٹ دھرم واقع ہو کہ اس خالص انسانی
اور بے لوث کام میں خواہ مخواہ رکاوٹ ڈالے ——— تو ظلم و فساد کو مٹانے کے
لئے اسے پنجہ آزمائی کر کے اسلام کے عدل اجتماعی کو نظام کی حیثیت سے غالب و نافذ کرنے کی
انقلابی جدوجہد میں حصہ لینا ہوگا یہ کام دنیا کا نہایت کٹھن اور مشکل کام ہے۔

لیکن دینِ حق کو بالفعل قائم کرنا چونکہ مسلمانوں کے مقصد وجود کا بنیادی تقاضا ہے لہٰذا اس
کو سرانجام دینے کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے جو کہ اس نظام کو ماننے کے
دعوے دار ہیں۔ زندگی کے جتنے نقشے دوسروں کے پاس تھے وہ ان کو آزما کر دیکھ چکے اور ناکام
ہو چکے ' اب صرف اور صرف اسلام کا نقشہ باقی ہے جو ماضی میں آزمانے پر پورے طور پر
کامیاب ثابت ہوا اس لئے آج پھر اسے نافذ و غالب کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ انسانیت
کا قافلہ جو آج اپنوں اور بیگانوں کی چیرہ دستیوں سے لٹ رہا ہے زبانِ حال سے کہہ رہا ہے
صرف کہہ ہی نہیں رہا بلکہ ہر روز مطالبہ کر رہا ہے کہ ؎

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خواب گراں ' خواب گراں ' خواب گراں خیز!

★★★

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

(دوسری قسط)

آخرت پر ایمان

محمد غوری صدیقی

دنیا و آخرت ایک وحدت ہیں

آخرت کے یقین نے ہی (جو کہ اللہ کی توحید اور رسالت پر ایمان ہی کا نتیجہ ہے) صحابہ کرامؓ کی نگاہوں میں دنیا کو ہیچ بنا دیا تھا۔ دنیا کی ہر شے کے مقابلے میں ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی رضا عزیز تھی۔ راہِ حق میں موت جان سے زیادہ پیاری تھی۔ ان کو حضورؐ کے اس فرمانِ مبارک پر کامل یقین تھا کہ الدنیا مزرعة الآخرة کہ "دنیا تو آخرت کی کھیتی ہے"۔ بونا یہاں ہے اور کاٹنا آخرت میں ہے۔ دنیا بذاتہٖ مقصود نہیں ہے۔ یعنی حقیقت میں دنیا اور آخرت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ ہے کہ جس کی ابتدا دنیا ہے اور انتہا آخرت ہے۔ ان دونوں میں وہی تعلق ہے جو کھیتی اور فصل میں ہوتا ہے۔ آپ زمین میں جس چیز کی کاشت کریں گے اسی کی فصل تیار ہوگی۔ اور ہل چلانے ' بیج بونے ' پانی دینے اور کھیتی کی رکھوالی کرنے میں جو غلطیاں اور کوتاہیاں آپ کریں گے ان سب کا برا اثر آپ کو فصل کاٹنے کے موقع پر معلوم ہوگا۔ دنیا کی کھیتی کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں کام کرنے کے لئے انسان کو عمر اور کچھ تھوڑا بہت ساز و سامان اور قوتیں دی گئی ہیں۔ یہاں کی نیکیاں 'اللہ اور رسولؐ کی اطاعت 'اور اللہ کی راہ میں مال و جان کا جہاد آخرت میں اچھی فصل تیار کریں گے جو جنت اور اس کی نعمتوں کی صورت میں ہوگی۔ غفلت 'نفس پرستی 'معصیت ظلم و کفر اور دین کے لئے محنت سے فرار بری فصل تیار کریں گے جو جہنم کے مختلف عذابوں کی شکل میں ہو گی۔

حیاتِ دنیوی و سامانِ دنیا کا آخرت سے موازنہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں دنیا اور اس کے ساز و سامان کی چار حیثیتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) دنیا دار الامتحان ہے۔ یہ دار الجزاء نہیں ہے۔ یہاں اخلاقی اعمال کی جزا و سزا اگر

ہے بھی تو بہت محدود اور ناقص صورت میں ہے اور امتحان کا پہلو خود اس میں بھی موجود ہے۔
سورۃ ا ۔ ـــ میں فرمایا اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاط اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَۃً لَّھَا لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ○

کہ جس نے موت و زندگی کو بنایا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے عمل کرتا ہے۔
حقیقت میں یہ جو کچھ سروسامان بھی زمین میں ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا تاکہ اس کے ذریعے لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

اسی لئے حضورؐ نے فرمایا "الدنیا سِجن المؤمن وجنّۃ الکافر" "دنیا تو مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کی جنت ہے۔ مومن شریعت کا ہمہ وقتی قیدی ہے' کافر آزاد۔

(۲) دنیا کی دوسری حیثیت...... دنیا کی زندگی انتہائی محدود اور فانی اور حقیر و قلیل ہے جبکہ آخرت کی زندگی لامحدود 'غیر فانی اور عظیم و کثیر ہے۔ فرمایا

"کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ" (القرآن)
"ہر نفس (انسان) نے موت کا مزہ چکھنا ہے"۔

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ ○ (الرحمٰن)

اس زمین پر جو بھی ہے فانی ہے اور بقاء صرف ترے رب کو ہے جو ذوالجلال والاکرام ہے۔
حضورؐ نے فرمایا "واللہ ماالدنیا فی الاخرۃ الا مثل مایجعل احدکم اصبعۃ فی الیم فلینظر بم یرجع (مشکوۃ کتاب الرقاق)
حضورؐ نے فرمایا۔ "اللہ کی قسم دنیا کی حقیقت آخرت کے مقابلے میں اتنی سی ہے کہ جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں اپنی انگلی ڈبوئے تو ذرا دیکھے تو۔"
حضورؐ نے فرمایا کہ "پوری دنیا کی حیثیت اللہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں ہے ورنہ کافر کو پانی کا گھونٹ بھی نہ ملتا"۔ دنیا کا یہ سروسامان اللہ کے نزدیک کوڑے کرکٹ کی طرح ہے چنانچہ نافرمانوں اور کافروں کے پاس یہ زیادہ ملتا ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت

۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بھیڑ کے بچے کے پاس سے گزرے جس کے کان نہ
اور وہ مرا پڑا تھا۔ آپ ؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کون پسند کرے گا کہ یہ بھیڑ کا بچہ اس کو
درم میں مل جائے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم کو تو یہ مفت میں بھی منظور نہیں ہے۔
ؐ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ سورۃ المؤمنون
ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ دنیا میں قیام کی مدت کے بارے میں لوگوں سے دریافت
ں گے تو جواب ملے گا۔

ا لبثنا یوما او بعض یوم فسئل العادین ○

ں گے (رہے دنیا میں) ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ پس شمار کرنے والوں سے پوچھ لیجیئے۔

۔ **تیسری حیثیت**...... دنیا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان اپنے ظاہر کے
ے غافل اور ناکام کرنے والا ہے' اس لئے حقیر اور دھوکے کا سامان ہے۔ متاعِ غرور ہے۔

چوتھی حیثیت...... دنیا کی زندگی اور اس کا ساز و سامان ہی آخرت بنانے اور
ۃ کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہاں کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک چیز آخرت کے حوالے سے قیمتی
چنانچہ یہ متاعِ حسن ہے۔

قرآن مجید کی رو سے دنیا کا سامان دو قسم کا ہے۔ ایک وہ جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں
میں ڈالنے کے لئے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا
اور خدا فراموشی میں گم کر دیتے ہیں۔ یہ بظاہر نعمت لیکن حقیقت میں خدا کی پھٹکار اور
کا پیش خیمہ ہے۔ یہ متاعِ غرور ہے۔

کفروا و کذبوا بلقاء الاخرۃ واترفنھم فی الحیوۃ الدنیا

وں نے انکار کیا اور آخرت کو جھٹلایا اور ہم نے ان کو موجودہ زندگی میں نعمت دی۔
ب ہم نے چاہا کہ غارت کریں کسی بستی کو تو حکم بھیج دیا اس کے امیروں مالداروں کو۔
وں نے اس میں نافرمانی کی پھر حق ثابت ہوئی ان پر بات اور ہم نے ان کو اکھاڑ پھینکا۔ اور
حسن وہ سرو سامانِ دینا ہے جس سے انسان قوی اور خوشحال ہو کر اپنے خدا کا شکر کرتا
اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق اور زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے۔ یہ
کی زبان میں متاعِ حسن ہے۔ یعنی ایسا اچھا سامانِ زندگی جو محض عیشِ دنیا پر ہی ختم نہیں ہو
عیشِ آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

وَ اَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْهِ یُمَتِّعْکُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا

اور اگر تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت خاص تک تم
سامان زندگی دے گا اور ہر صاحب فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا۔ گویا اللہ کے نیک بندے
دنیا کے سرو سامان کو بھی آخرت کے داؤ پر ہی لگاتے ہیں۔

انسان کی حقیقی اور ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی کی ایک ہی صورت ہے کہ انسان اپنے اللہ
کے رسولؐ اور اس کے دین کی راہ میں جہاد کی محبت کے تقاضوں کو ہمیشہ ترجیح دے اور
رکھے اور دنیا اور اس کی مصروفیات کو پیچھے کر دے۔ آخرت کی کامیابی کا فیصلہ اسی تقدیم
کے رویہ پر کیا جائے گا۔ سورۃ القیامہ میں اسی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ○

اس دن انسان کو بتلا دیا جائے گا کہ وہ (دنیا میں) کس کو مقدم اور کس کو مؤخر کیا کرتا تھا
اکرمؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس زمین پر سب سے بہترین جگہیں مساجد ہیں کہ
اللہ تعالیٰ کو سجدے کئے جاتے ہیں اور بدترین مقامات بازار ہیں کہ جہاں دنیا مختلف رنگ
اور دلفریب صورتوں میں انسان کو اپنے اندر گم کرنے کے لئے موجود ہوتی ہے۔ حضور
اسی لئے بازاروں میں کم سے کم جانے کی تلقین فرمائی ہے۔

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "جو شخص دنیا سے منہ پھیر لیتا
اللہ تعالیٰ اس کے دل میں دانائی کی جڑ جما دیتا ہے۔ اس کی زبان سے عقلمندی کی باتیں نکلتی
ہیں۔ اللہ اس پر دنیا کے عیب کو ظاہر کر دیتا ہے"۔ (المشکوٰۃ کتاب الرقاق)
حضرت عثمانؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " آدمی کا ان چیزوں کے
کسی چیز میں کوئی حق نہیں ہے۔ (۱) رہنے کے لئے گھر۔ (۲) ستر ڈھانکنے کو کپڑا۔ (۳)
کھانے کے لئے سوکھی روٹی۔ (۴) پینے کو پانی۔

حضورؐ نے دنیا کی حقیقت اور اس میں صحیح طریقہ زندگی کو ذیل کی حدیث میں خوب
کر بیان کر دیا اور سمجھا دیا کہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں سے ایک دن چلے جانا ہے
دل تو صرف اپنے مقصد زندگی سے اور جہاں جا کر ہمیشہ رہنا ہے اس سے لگانا چاہئے۔ فرمایا
کن فیالدنیا کانک غریب او عابر سبیل وعد نفسک فی ا
القبور (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

یعنی "دنیا میں اس طرح رہو جیسے تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر ہو اور خود کو قبر والوں میں شمار
کرو"۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا

"یقول العبد مالی مالی و ان ماله من ماله ثلث ما اکل فافنی او لبس فابلی او اعطی فاقنی وما سوی ذالک فهو ذاهب و تارکه للناس"

"انسان کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال مگر حقیقت میں جس کو اس کا مال کہہ سکتے ہیں وہ تین سے زیادہ کا نہیں ہے۔ جو اس نے کھا کر فنا کر دیا۔ جو اس نے پہن کر بوسیدہ کر دیا۔ اور جو اس نے اللہ کے واسطے دے دیا اور اپنے لئے آخرت کا ذخیرہ بنالیا۔ اس کے سوا جو باقی رہا وہ لوگوں کے واسطے چھوڑ کر خود چل بسے گا اور وہ مال دوسروں کا ہو جائے گا۔

دنیا کی زندگی گزارنے کا طریقہ حضورؐ کے ایک واقعہ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ حضورؐ کے گھر ایک بکری ذبح ہوئی۔ حضورؐ گھر سے باہر تشریف لے گئے۔ واپس آکر حضرت عائشہؓ سے دریافت فرمایا۔ "ما بقی منها" "اس میں سے کیا باقی بچا"۔ حضرت عائشہؓ نے سارا گوشت راہ خدا میں بانٹ دیا تھا اور دستی کا گوشت جو حضورؐ کو مرغوب تھا بچالیا تھا۔ بولیں کہ "ما بقی منها الا لتفها" "کچھ باقی نہیں بچا سوائے دستی کے (گوشت)"۔ حضورؐ نے فرمایا کہ اے عائشہؓ! "بقی کلها الا کتفها" "سب کچھ بچ گیا سوائے دستی کے (گوشت کے)"۔ اس کو تو ہم کھا کر فضلہ بنادیں گے جو اللہ کی راہ میں دیا گیا وہ در حقیقت بچا اور اللہ کے خزانے میں محفوظ ہو گیا۔ "فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا" (جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے) پس وہ (اللہ) اس کو اس کے لئے دوگنا چوگنا بڑھاتا ہے"۔ گویا انسان اپنی جان و مال، وقت، صلاحیت، عزت، اولاد غرض کہ جو کچھ اس کے پاس اللہ کا دیا ہوا ہے اس میں سے جو اللہ کی راہ میں لگ کر کھپ جائے گا وہی قیمتی اور محفوظ ہو کر اس کو آخرت میں واپس ملے گا۔ "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" "کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے"۔ اپنی راہ میں خرچ کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض حسن قرار دیتے ہیں۔

حدیث نبویؐ میں آیا ہے کہ قیامت کے دن دنیا ایسی بدشکل بڑھیا کی صورت میں لائی جائے گی کہ لوگ اس کو دیکھ کر کہیں گے کہ "اس سے اللہ کی پناہ!" تب فرشتے کہیں گے کہ یہ وہی ہے جس پر تم لٹو اور فریفتہ تھے۔ لوگوں کو ایسی ندامت ہوگی کہ چاہیں گے ہمیں آگ میں ڈالے اور ختم کر دے۔

(جاری ہے)

طلبائے تنظیم اسلامی
کے پہلے آل پاکستان کنونشن کی رُوداد

مرتبہ: چوہدری غلام محمدؐ

یہ بات معلوم و معروف بلکہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوان ہر انقلابی تحریک کے روحِ رواں اور ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ وہ طبعاً گھسے پٹے مروجہ طریق کار پر آنکھیں بند کر کے کاربند رہنے کی بجائے اولاً غور و فکر کے بعد اس کی صحت اور حقانیت پر اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اگر دل گواہی دے دے اور عقل اس کی درستگی کو تسلیم کرے تو وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس راہ پر چل نکلتے ہیں۔ بالخصوص ذہین نوجوان فطرتاً نظامِ کہنہ کے بالقوہ باغی اور اس کے حسن و قبح پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لئے مضطرب ہوتے ہیں۔ ان میں نئی فکر، نئی سوچ کو قبول کرنے کا داعیہ ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جو عملی تقاضے ابھرتے ہیں ان کی طرف پیش قدمی میں بھی وہ پس و پیش نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ معمر لوگوں کی طرح اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار اور مزاجاً سود و زیاں اور مصلحتوں کے پرستار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انقلابی تحریک کو لبیک کہنے والوں میں بالعموم نوجوانوں کی اکثریت ہوتی ہے اور انہی کا جوش و جذبہ اور محنت و پیش قدمی تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ الحمدللہ تنظیم اسلامی کی پکار پر لبیک کہنے والوں میں بھی نوجوانوں کی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔ یہ نوجوان رفقاء دوسرے رفقاء کے دوش بدوش طے شدہ طریق کے مطابق دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شریک رہے ہیں تاہم ان کی جانب سے یہ مطالبہ پیش کیا جاتا رہا ہے کہ نوجوان طالب علموں کی اپنی مخصوص افتادِ طبع اور جداگانہ دائرۂ کار کی بنا پر ان کے لئے ایک الگ نظم ہونا چاہئے۔ یہ موضوع کچھ عرصہ سے تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت کے زیر غور رہا۔ اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کی ضرورت و اہمیت واضح طور پر سامنے تھی تاہم بعض خدشات بھی تھے، جن سے ماضی قریب کی بعض ملکی و غیر ملکی جماعتوں کو سابقہ

درپیش آیا۔ علیحدہ نظم کی صورت میں تحریک میں ایک متوازی بلکہ متضاد فکر کے ابھرنے کے امکانات موجود ہوتے ہیں اور ایسے مواقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں جبکہ جذبات و احساسات کی جداگانہ سطح کی بنا پر ایک ہی تحریک کے دو شعبوں کی جداگانہ قیادتوں کے فیصلے مختلف ہوں۔ لہٰذا فیصلہ یہی کیا گیا کہ ایک الگ تنظیم کی بجائے تنظیم اسلامی کی مرکزی قیادت ہی کے تحت تنظیم اسلامی سے وابستہ طلبا کا ایک حلقہ قائم کیا جائے، جس کا نام "طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان" ہو اور جس کے ذریعہ طالب علم رفقائے تنظیم کا کل پاکستان بنیاد پر باہم ربط و تعلق ہو۔ اور اس پلیٹ فارم سے ان کو اپنی صلاحیتیں پروان چڑھانے اور بروئے کار لانے کے بھرپور مواقع فراہم کئے جائیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ وہ ہنگامی مسائل اور انتخابی سیاست سے علیحدہ رہتے ہوئے انقلابی مشن کے لئے اپنے سیرت و کردار میں پختگی پیدا کریں۔

طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے حلقہ کو منظم اور فعال بنانے کے لئے ۱۴ / ۱۵ ستمبر کو قرآن اکیڈمی لاہور میں طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے پہلے سالانہ کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ ہوا۔ پاکستان کے دور دراز مقامات سے مندوبین ۱۴ ستمبر بدھ کی صبح ہی سے قرآن اکیڈمی لاہور پہنچنا شروع ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق اسی روز شام کو جناح ہال لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کا خطاب عام تھا۔ لیکن بعض انتظامی مجبوریوں کی وجہ سے یہ پروگرام ۱۵ ستمبر جمعرات شام تک ملتوی کرنا پڑا، جس کی وجہ سے بعض شرکاء کو بہت دقت ہوئی۔ ۱۴ ستمبر احباب و رفقاء نے باہم ملاقات، تبادلہ خیال اور مشوروں میں صرف کی۔ اور ۱۵ ستمبر کی صبح ساڑھے آٹھ بجے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے پہلے سالانہ کنونشن کے باقاعدہ خصوصی اجلاس کا آغاز ہوا۔ محترم امیر تنظیم اسلامی نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ تلاوت کلام پاک سے آغاز کے بعد میاں محمد نعیم صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان نے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے بارے میں مختصر تعارفی گفتگو کی۔ بعد ازاں مختلف مقامات سے آئے ہوئے مندوبین اور احباب نے اپنا اپنا تعارف پیش کیا اور مختصر تاثرات بیان کئے۔ مختلف مقامات کی کیفیات کا اندازہ ہوا، اہم معاملات پر مشورے ہوئے اور امیر محترم نے مناسب ہدایات دیں۔ طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے ذمہ دار حضرات کے تعین کے بارے میں مشورہ ہوا۔ اور اجلاس کے بعد مزید مشورہ کے بعد طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کے ناظم اعلیٰ کی ذمہ داری انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طالب علم منیر الحق حقی کو تفویض کر دی گئی۔ صوبہ سرحد کے ناظم کے طور پر خیبر میڈیکل کالج کے طالب علم حافظ محمد مقصود کا تقرر ہوا۔ ٹیکسٹائل انجینئرنگ کالج فیصل آباد کے طالب

علم غلام اصغر صدیقی صاحب کو پنجاب کا ناظم مقرر کیا گیا۔ لاہور کے ناظم کی ذمہ داری کے لئے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے طالب علم عبد الرؤف حیدر صاحب اور کراچی کے ناظم کی حیثیت سے اردو سائنس کالج کے سید یونس واجد صاحب کے تقرر کا فیصلہ ہوا۔

طلبہ تنظیم اسلامی کنونشن کے اس اجلاس خصوصی کے آخر میں جناب امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مختصر خطاب فرمایا۔ اقامت دین کی جدوجہد میں نوجوانوں کے مؤثر اور جاندار کردار کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف نے ارشاد فرمایا کہ نوجوان طالب علموں کو اپنی صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اپنی ترجیحات متعین کر لینی چاہئیں تاکہ محنت اور جدوجہد صحیح رخ پر ہو اور کوششیں بار آور ہو سکیں۔ آپ نے خصوصی طور پر توجہ دلائی کہ نوجوانوں کے سامنے اپنا نظریہ زندگی اور نصب العین پوری طرح واضح ہونا چاہئے۔ دینی اصطلاحات میں ہم ان کو ایمان 'محبت خداوندی' رضائے الٰہی کا حصول اور نجات اخروی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ دنیا کی کامیابی ہمارا ہدف نہیں۔ ہمیں اپنے فرائض دینی سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے محنت کرنا ہے۔ دوسری اہم بات جس پر ہر طالب علم رفیق کو لازماً توجہ دینی چاہئے وہ یہ ہے کہ عربی زبان کی اس قدر تعلیم ضرور حاصل کرے کہ قرآن مجید کو روانی سے پڑھتے ہوئے ترجمہ دیکھے بغیر مفہوم تک رسائی حاصل کر سکے۔ اگرچہ یہ تنظیم کے ہر رفیق کی ضرورت ہے۔ تاہم دوسروں کے لئے بعض حالات میں اس سے استثنا کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن طالب علم اس کو اپنے لئے فرض عین سمجھیں۔ قرآن مجید سے خصوصی تعلق ہماری دعوت کا سنگ بنیاد اور ہمارے جذبہ و ایمان کی آبیاری کا واحد مستقل اور خطا سے پاک ذریعہ ہے۔ ہمارے وہ نوجوان ساتھی جنہوں نے شعوری طور پر دین و ایمان کا راستہ اختیار کیا ہے اس کو حرز جان بنائیں۔

محترم امیر تنظیم نے طلبہ تنظیم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے پیش نظر کام کے دو شعبے ہیں' جو لازم و ملزوم ہیں۔ اولاً علمی سطح پر احقاق حق اور ابطال باطل اور ثانیاً عوامی سطح پر ایک عملی جدوجہد اور حرکت۔ اس میں بھی اول الذکر اس پہلو سے اولیت کی حامل ہے کہ نظریاتی انقلاب کے بغیر محض عملی جدوجہد اور حرکت خواہ کس قدر بھرپور انقلابی انداز میں بھی ہو نتیجہ خیز نہیں ہوتی اور اگر کوئی عارضی نتیجہ بر آمد بھی ہو جائے تو وہ دیرپا نہیں ہو سکتا۔ کسی انقلابی تحریک کے نتیجہ میں اعلیٰ سیاسی سطح پر بھی کوئی تبدیلی سودمند ثابت نہ ہو سکے گی اگر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں وہ لوگ موجود نہ ہوں جو علیٰ وجہ البصیرۃ اس انقلابی نظریہ پر یقین رکھتے ہوں۔ چنانچہ اسلامی انقلاب کے لئے ایسے لوگوں کی معتدبہ تعداد کا موجود ہونا اشد ضروری

ہے' جنہوں نے دین وایمان کا راستہ پورے یقین واعتماد سے اختیار کیا ہو۔ لہٰذا علمی سطح پر انقلاب برپا کرنے کی کوشش اہم تر ہے' اسی طرح عوامی سطح پر اگر عملی حرکت پیدا نہ ہو تو بھی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ محض علمی سطح پر کام کے نتیجہ میں مخصوص نظریات رکھنے والا ایک گروہ یا ایک مکتب فکر ہی وجود میں آسکتا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے طالب علموں پر زور دیا کہ وہ اپنی اپنی صلاحیتوں اور افتادِ طبع کا جائزہ لیں۔ باصلاحیت ذہین نوجوان جو تحقیقی اور تخلیقی کام کر سکتے ہوں اپنے آپ کو اس کام کے لئے وقف کریں۔ ـــــــــ ادب فلسفہ لٹریچر وغیرہ کے طالب علم اس کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ دینی تحریکوں کی جانب یہ لوگ کم متوجہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ان علوم کی تحصیل کے دوران ایمان وعقائد سے شدید تصادم درپیش ہوتا ہے۔ اس خطرناک وادی سے گزرتے ہوئے جنہوں نے ایمان ویقین تک اپنا راستہ محفوظ رکھا وہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے لہٰذا ان کی ذمہ داری بھی دوچند ہے۔ انہیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے فکر کے دھارے کا رخ موڑنا ہے۔ غلط نظریات کا ابطال دلیل وبرہان سے کرنا ہے۔ سائنس یا فنی علوم کے طلبا کے لئے بالعموم دعوت وتنظیم کا میدان زیادہ موزوں ہوتا ہے اور یہ بھی ایک مؤثر اور وقیع کام ہے' اس میں خلوص واخلاص کے ساتھ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاص اللہ تعالیٰ سے کہ اسی کی رضاجوئی پیش نظر ہے اور خلوص بندگان خدا سے کہ انہی کی بھلائی اور بہتری کے لئے انہیں قبول حق کی دعوت ہے۔

اس کے بعد جناب امیر تنظیم اسلامی نے طلبہ تنظیم اسلامی کو عملی سرگرمیوں سے متعلق بعض مشورے دیئے انہیں ہدایت کی کہ وہ تربیت گاہوں کا کثرت سے اہتمام کریں۔ تبلیغی سفر بھی ان کی تربیت کے لئے بہت مفید ثابت ہوں گے۔ اپنے سیرت وکردار کی تعمیر پر خصوصی توجہ دیں۔ اپنی تعلیم گاہوں میں حسب سابق خاموشی سے اپنا کام جاری رکھیں۔ ہنگامہ آرائی یا کسی اور تنظیم سے تصادم یا مقابلہ ہمیں مطلوب نہیں۔ یونین کے انتخابات یا طلبا کے نام نہاد مسائل ہمارا موضوع نہیں اس ملک وقوم کو مسلمان ہونے کے حوالہ سے جو مسائل درپیش ہیں وہی طلبا کے مسائل ہیں آپ اپنے آپ کو مستقبل کے اسلامی انقلاب کے لئے تیار کریں اور اپنی توانائیاں وقتی اور ہنگامی مسائل میں ضائع نہ کریں۔

۱۵ ستمبر جمعرات بعد نماز مغرب جناح ہال لاہور میں اجلاس عام ہوا۔ جس میں طلبہ تنظیم اور دیگر رفقائے تنظیم کے علاوہ کثیر تعداد میں دوسری طلبہ تنظیموں اور تعلیمی اداروں سے

غلق لوگ بھی شریک ہوئے۔ ہال ابتداء ہی میں پوری طرح بھر گیا۔ خالی جگہوں پر مزید
رسیاں لگائیں گئیں اور سٹیج سے ملحق جگہ پر بھی دریاں بچھائی گئیں۔ اس کے باوجود بھی لوگوں
کھڑے ہوکر کارروائی سننا پڑی۔ غالباً لوگوں کے لئے یہ بات ایک خوشگوار حیرت کا موجب
تھی کہ ایک نئی طلبا تنظیم ایسے وقت میں منظرعام پر آرہی ہے جبکہ تعلیمی اداروں اور
رسگاہوں کی فضا علم و آگہی کے نغموں کی بجائے ہنگامہ آرائی تصادم اور خونریزی سے مسموم
ہے۔ لیکن اس تنظیم کا یہ مؤقف واضح طور پر متعین ہے کہ طلبہ تنظیم انتخابات اور سیاسی
رپھڈول سے اجتناب کرتے ہوئے ایمان و شرافت کی فضا میں اپنے سیرت و کردار کی تعمیر اور
صول علم میں منہمک رہیں گے۔ اجلاس کی صدارت امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
نے کی اور سٹیج پر ان کے دائیں بائیں ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان میاں محمد نعیم صاحب اور ناظم
علی طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان جناب منیرالحق حقی متمکن تھے۔ امیر تنظیم اسلامی کے سامنے
واں سال رفقائے کار کی ایک کثیر تعداد اور دوسرے نوجوان سامعین کا ایک جم غفیر موجود تھا'
ن کے چہرے سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ایثار و
ربانی کے عزم سے تابناک تھے۔ عجیب کیف کا عالم اور روح پرور نظارہ تھا۔ محترم امیر تنظیم
راپا سپاس نظر آتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کی برس ہا برس کی محنت شاقہ اور
رق ریزی کو شرف قبول عطا کیا۔ خون جگر سے سینچے ہوئے ان بیل بوٹوں پر اب بہار کے آثار
ظر آرہے ہیں۔ اللھم زد فزد تلاوت کلام پاک کے بعد طلبہ تنظیم اسلامی کے ذمہ دار
حضرات کو مختصر خطاب کی دعوت دی گئی۔ جناب غلام اصغر صدیقی صاحب ناظم صوبہ پنجاب
نے واضح طریق سے طلبہ تنظیم اسلامی کے قیام کی غرض و غایت اور طریق کار پر روشنی ڈالی۔
حافظ محمد مقصود صاحب ناظم صوبہ سرحد نے دھیمے مدلل اور پر عزم انداز میں طلبہ تنظیم اسلامی
کے مقاصد اور عزائم کا تذکرہ کیا۔ کراچی سے جناب نوید احمد صاحب نے پرجوش انداز میں
فرائض دینی کو جامعیت سے بیان کیا۔ ناظم حلقہ لاہور جناب عبدالرؤف حیدر صاحب نے
پرشکوہ' رواں اور برجستہ انداز میں دینی ذمہ داریوں کی تین سطحوں کے بارے میں کلام کیا اور
طلبہ تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے ان کے لئے محنت و کوشش کے عزم کا اظہار کیا۔ اللہ
تعالیٰ ان جواں ہمت رفقائے کار کا حامی و ناصر ہو اور اپنی خصوصی رحمت سے ان کے لئے نیکی
اور سعادت کے راستے کشادہ کرے۔ آخر میں محترم امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے
اپنے صدارتی خطبہ میں طلبہ کے فرائض و مسائل کے موضوع پر مفصل خطاب فرمایا۔ آپ نے

(ماہ جون ۹۰ء)

مولانا عبدالحق رحمہ اللہ تعالیٰ

چند یادیں، چند تاثرات

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

ایوب خان مرحوم کا زلزلہ خیز دور آیا تو مری کے علاقہ کے ایک پیر صاحب نے دنیا کو باور
کرانا شروع کیا کہ مرحوم میرے مرید ہیں۔ ان پیر صاحب کی عادت یہ تھی کہ راستہ چلتے گاڑی
رکواتے' باہر نکلتے اپنے دوپٹہ سمیت سڑک پر نظریں جھکائے کھڑے ہو جاتے اور بعد میں کہتے
کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سواری جا رہی تھی یا پھر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا نام لیتے
کہ وہ گزر رہے تھے ..... گویا وہ ایک نووارد نوجوان علامہ صاحب کے واقعی پیش رو تھے۔ ادھر
کراچی کے ایک بڑے مولوی صاحب کے لیاقت علی خاں اور خواجہ ناظم الدین مرحومین سے جو
روابط شروع ہوئے انہوں نے ایوب خان کے دور میں مزید شدت اختیار کر لی..... چنانچہ پیر
صاحب موصوف نے بحق ایوب خان اہل دین کو اکٹھا کرنے کی راہ نکالی تو مولوی صاحب نے
اندرون سندھ اپنے مدرسہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد میں ایوب خان کو بلا کر ان سے علماء کو
پگڑیاں بندھوائیں اور مخصوص حوالوں سے پیر صاحب والا کام شروع کر دیا..... اس موقعہ پر
دیوبندی علمی تحریک سے وابستہ مدارس کے ارباب حل و عقد اکٹھے ہوئے اور علماء اور مدارس کو
"حکومتی اثرات" سے بچانے کی تدبیر سوچی۔ مدارس کی تعمیر و ترقی' ان کے تحفظ و بقا اور وقتی
ضرورتوں سے ان کے نظام و نصاب میں تبدیلیوں کی غرض سے ایک وفاق کی داغ بیل ڈالی'
جس کا نام "وفاق المدارس العربیہ" رکھا۔ اس اجلاس کے میزبان حضرت تھانوی رحمہ اللہ
تعالیٰ سے وابستہ عظیم شخصیت مولانا خیر محمد جالندھری تھے' جو اپنی وسعت قلبی کے لحاظ سے
تھانوی' مدنی ہر دو طبقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔ احقر ان دنوں اپنے برادر بزرگ
مولانا عزیز الرحمٰن خورشید سمیت ملتان میں مولانا کے مدرسہ خیر المدارس میں زیر تعلیم تھا......
اجلاس ہوا تو اس میں ملک بھر کے سینکڑوں علماء جمع ہوئے۔ مولانا مفتی محمد شفیع کراچی' مولانا
سید محمد یوسف بنوری' مولانا فضل احمد کھٹہ' مولانا عرض محمد کوئٹہ' مولانا غلام غوث ہزاروی'
مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا محمد علی جالندھری' مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھا' مولانا
عبدالحنان ہزاروی' مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل' مولانا مفتی محمود احمد' مولانا سید شمس

الحق افغانی...... ایسے لوگ وہاں تشریف لائے۔ دل کی طرح سفید براق داڑھیاں، چہروں پر سجدوں کے نشان، سراپا علم و حلم اور اخلاق و شرافت کی چلتی پھرتی تصویریں..... ایسا منظر احقر نے پہلی بار دیکھا۔ مدرسہ میں ۲۔ ۳ دن بہار کا سماں تھا۔ ہماری خوش قسمتی سے خدمت کے لئے منتخب طلبہ میں ہمارا بھی نام تھا، اس لئے ان حضرات کو اور بھی قریب سے دیکھا اللہ تعالیٰ گواہ ہے کہ جن حضرات نے بہت ہی متاثر کیا ان میں مولانا عبدالحق کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ یہ معلوم تھا کہ پشاور کے قریب اکوڑہ خٹک کی بستی میں مولانا کا عظیم الشان مدرسہ ہے۔ جسے قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ "پاکستان کا دیوبند" کہتے ہیں۔ تواضع، انکساری اور شفقت و مروت میں مولانا کا جواب نہ تھا۔ بسا اوقات یہ سوچنا پڑتا کہ میزبان ہم ہیں یا مولانا۔

انہیں دیوبند کی درسگاہ سے حصول علم کی سعادت میسر آئی اور وہ ان خوش قسمت حضرات میں سے تھے جنہیں اپنے استاد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد کا بے پناہ اعتماد حاصل تھا۔ مرحوم حصول علم کے بعد دیوبند میں مدرس بھی رہے۔ مولانا مدنی کے فرزند مولانا اسعد مدنی، مولانا احمد علی کے فرزند مولانا عبیداللہ انور اسی دور کے فیض یافتہ تھے اور ان حضرات نے شاگردی کا حق ادا کیا جبکہ مولانا سید حامد میاں بھی اس دور کے شاگرد تھے اور یہ معلوم ہے کہ زندگی کے آخری دور میں استاد شاگرد کا راستہ جدا ہو گیا جبکہ برادر عزیز مولانا فضل الرحمٰن نہ صرف ان کے بلکہ ان کے فرزند گرامی مولانا سمیع الحق کے بھی شاگرد ہیں، لیکن جو صورت حال ہے وہ بہرطور افسوسناک ہے۔

مدرسہ خیرالمدارس کے اس دور کی یادیں ذہن میں تھیں کہ فراغت (۱۹۶۶ء) کے بعد جلد ہی راولپنڈی کے ایک مدرسہ میں ختم بخاری شریف کی تقریب میں ان کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے بخاری شریف کی آخری حدیث پر نہایت عالمانہ گفتگو کی جس کو احقر نے مرتب کیا اور ہفت روزہ خدام الدین (میری ادارت سے بہت قبل) کی خصوصی اشاعت میں وہ بڑے اہتمام سے چھپی جس پر بعض عزیز طلبہ نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ پھر احقر مولانا غلام غوث کے حکم سے حضرو خطیب ہو گیا، اب مولانا کے بہت ہی قریب تھا۔ ان کے اور میرے درمیان محض دریائے اٹک حائل تھا کئی مرتبہ حاضری دی۔ استفادہ کیا یہ الگ بات ہے کہ اپنی نالائقی کے سبب آب حیواں سے کماحقہ سیراب نہ ہو سکا۔ میرے عزیز دوست مولانا عبدالکریم صاحب مولانا کے مدرسہ میں مدرس تھے۔ ان کے حوالہ سے ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں مولانا کے انتخابی جلسوں میں شرکت کی سعادت میسر آئی۔ مولانا اس میدان کے آدمی نہ تھے

لیکن مولانا غلام غوث ہزاروی کے اصرار پر انہوں نے ۱۹۷۰ء میں الیکشن میں حصہ لیا۔ ان کے مقابل خان عبدالغفار خان مرحوم کے دست راست اور خان عبدالولی خان صاحب کے مربرست، اجمل خٹک تھے، جنہیں عبرت ناک شکست ہوئی۔ جس کا صدمہ ولی خان کے لئے بہت سخت تھا اور وہ اپنی تمام تر سنجیدگی کے باوجود علماء پر ایسے برسے کہ توبہ بھلی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مفتی محمود صاحب مرحوم کی مصالح نے جمعیت اور نیپ کو ہم سفر بنا دیا اور مفتی صاحب کا فرزند اب تک اس عہد کو نبھا رہا ہے۔ مولانا نے اسمبلی کے ممبر کی حیثیت سے بڑے بڑے جغادری پارلیمنٹرین حضرات سے بڑھ کر کام کیا۔ اسلام، قومی اور علاقائی مسائل کے حوالہ سے ان کی عظیم الشان کارکردگی کا ریکارڈ محب گرامی مولانا سمیع الحق کی کاوش سے تحریری طور پر سامنے آگیا جس کو دیکھ کر ایک دنیا دنگ رہ گئی کہ ایک مدرسہ کا مہتمم اور شیخ الحدیث اور اس کی یہ بصیرت؟

۱۹۷۷ء میں مولانا پھر سامنے آئے اب قائد عوام مرحوم کے سرحدی وزیر اعلیٰ نصراللہ خان خٹک مولانا کے مد مقابل تھے۔ دوسرے معتبر حضرات کی طرح خٹک صاحب کی بھی خواہش تھی کہ بلا مقابلہ تاج سر پر سجالیں اس لئے اس پڑھے لکھے وزیر اعلیٰ نے جہالت یہ کی کہ الیکشن سے دست برداری کی درخواست مولانا کی طرف سے خود ہی الیکشن کمشنر کو بھجوادی اور دستخط کئے "مولانا عبدالحق صاحب۔"

اس حرکت کے خلاف اپیل ہوئی تو مسٹر بروہی مرحوم نے اپنی سعادت خیال کرتے ہوئے مولانا کا وکیل بننا پسند کیا گو کہ انہیں کوئی خاص محنت نہ کرنا پڑی اور بھٹو صاحب کے چہیتے چیف الیکشن کمشنر.... موجودہ وزیر قانون کے والد گرامی ... جسٹس سجاد جان نے عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر خود ہی مولانا کی وکالت کی...... کہ وہ متعدد مرتبہ اس درویش سے اس کی کٹیا میں مل چکے تھے۔ اس کے علم، اس کی شرافت، اس کے خلوص و تقویٰ اور اس کی وضع داری سے واقف تھے۔ انہوں نے ان سے کئی مرتبہ استفادہ کیا۔ مشکل علمی مسائل میں رہنمائی چاہی اور کہا کہ ایسے دستخط کوئی جاہل ہی کر سکتا ہے...... بلکہ شاید وہ بھی نہ کرے...... مولانا جیسے آدمی کے یہ دستخط کہ مولانا اور صاحب کے لاحقے سابقے ساتھ؟ بھٹو صاحب مرحوم اس درویش سے آگاہ تھے۔ ان کی خود سری نے اسے شکست سے دوچار کرنے کی غرض سے اپنے وزیر اعلیٰ کو حکم دے کر یہ حرکت کرائی جس کا خٹک صاحب کو بہت رنج تھا اور افسوس سے کہتے تھے کہ ایک درویش سے مجھے لڑانے کی کوشش کی گئی اور اس طرح عزت سادات سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اس الیکشن میں مولانا مطلق کہیں نہ جا سکے۔ حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمہ اللہ تعالیٰ کی طرح یہ الیکشن اس طرح لڑا کہ علالت کے سبب بستر پر ہیں۔ خدام مصروف عمل ہیں اور بہت بڑی اکثریت سے فتح حاصل کی۔ اسی طرح ۸۵ء کے غیر جماعتی الیکشن میں جماعتی بزرگوں اور احباب کی خواہش پر کامیابی سے الیکشن لڑ کر ریکارڈ قائم کیا...... وہ اپنے حلقہ کے ہی نہیں پورے ملک کے محبوب رہنما تھے۔

مولانا کا مدرسہ ایک ایسی بستی میں واقع ہے جہاں دشمنان دین وانسانیت سے حضرت الامیر سید احمد بریلویؒ قدس سرہ کی پہلی باقاعدہ جھڑپ ہوئی۔ دریائے کابل کے کنارے اس بستی کے درو دیوار سید صاحب اور ان کے مخلص رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے گواہ ہیں۔ دریا کی لہروں نے اس قافلہ سخت جان کی پذیرائی کی۔ اے کاش خوانین پشاور وہزارہ وفا کرتے تو برعظیم کا نقشہ مختلف ہوتا۔ اکوڑہ کی بستی میں مولانا کا مدرسہ تھا جو بقول مہتمم دارالعلوم دیوبند پاکستان کا دیوبند ہے اس میں تعلیم و تدریس کی طرح جہاد کی تعلیم وتربیت بھی ہوتی ہے گویا دیوبند کے قدم بہ قدم...... ہر سال سینکڑوں طلبہ فراغت اصل کرتے ہیں...... وہ جہاں نعمت علم سے سرشار ہو کر نکلتے ہیں وہاں جذبات حریت وجہاد سے ان کے قلوب لبریز ہوتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ افغانستان کی موجودہ جنگ سے ہو رہا ہے، جس کے درجنوں محاذوں پر مولانا کے شاگرد کمان کر رہے ہیں تو ہزاروں مختلف مورچوں پر سرگرم عمل ہیں...... سینکڑوں شہادت کی سعادت حاصل کر چکے ہیں، چونکہ خلوص و للھیت ان کا سرمایہ ہے اس لئے بعض پروپیگنڈسٹوں کی طرح کوئی چرچا ہے نہ ہنگامہ...... بلکہ فرض کی ادائیگی میں ہر شخص مصروف ہے۔ سرحد و بلوچستان اور افغانستان سے تاشقند و بخارا تک مولانا کے شاگردوں کی محنت نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وقت کا ابو حنیفہ یا بخاری (رحمہما اللہ تعالیٰ) چاروں طرف فیض لٹا رہا ہے۔ مدرسہ کا جلسہ تقسیم اسناد چند سال کے وقفہ سے ہوتا ہے جس میں ملک بھر کے علماء، مشائخ اور اہل دین شامل ہوتے ہیں۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری جب تک سفر و تقریر کے قابل رہے وہ تشریف لے جاتے۔ مولانا احمد علی لاہوری کو حضرت مدنی نے دیوبند سے خط لکھا کہ میرے لئے سفر پاکستان مشکل ہے مولانا عبدالحق کے مدرسہ میں آپ کا جانا اپنی ذات کے حوالہ سے ہی ضروری نہیں، میری نیابت کا فرض بھی ادا ہوگا۔ مولانا لاہوری جو ہم عصر ہونے کے باوجود حضرت مدنی کا بے پناہ احترام فرماتے...... زندگی بھر تشریف لے جاتے رہے۔ حضرت شیخ الہند کی آخری نشانی مولانا عزیز گل ہمیشہ سرپرستی فرماتے ہیں، جلسہ عجیب شان سے ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھی جلسہ دیکھا، غالباً ۶۹ء یا ۷۰ء تھا، چند سال بعد

جلسہ ہوا۔ ایک دن ظہر کی نماز سے قبل جلسہ شروع ہوا تو نمازوں کے وقفہ کے ساتھ اگلے دن ظہر کو ختم ہوا۔ رات دن کے ہر مرحلہ میں وقت کے اکابر علماء کی تقریریں...... مثلاً مولانا محمد ادریس کاندھلوی' مولانا شمس الحق افغانی' مولانا احتشام الحق تھانوی' مولانا محمد علی جالندھری...... وغیرہ' کسی مرحلہ پر تیس چالیس ہزار سے کم مجمع نہ تھا۔ جوانی کے سبب جاگنے کی مشق ہمیں خوب تھی اس لئے اس منظر کو خوب دیکھا اور ایک لطف محسوس ہوا۔ اس مرحلے پر مختلف اوقات میں کم از کم چالیس ہزار افراد نے کھانا بھی کھایا...... کھانا ایسے جاری رہا کہ جلسہ کی حاضری اور پروگرام ایک لحہ کے لئے متاثر نہیں ہوا۔ کھانا ایسا پاکیزہ اور لذیذ کہ شاہوں کو میسر نہ آئے۔ بڑے چھوٹے کی تمیز نہ تھی درجنوں تندور تھے جن میں مخصوص پشاوری روٹی پک رہی تھی اور سینکڑوں دیگیں پک رہی تھیں۔ علاقہ بھر کے لوگ جلسہ میں شریک ہوتے ہیں لیکن خالی ہاتھ نہیں بیل' گائے' بکری' دنبہ' چاول' آٹا' دالیں' گھی...... الغرض ہر شخص بقدر ہمت کچھ نہ کچھ لارہا ہے' درجنوں قصاب جانور ذبح کرنے اور گوشت بنانے میں مصروف ہیں۔ اسی طرح درجنوں باورچی لذیذ گوشت اور پلاؤ پکانے میں محو...... یہ سب مولانا کے خلوص کی برکت تھی۔ جبکہ کھانے پینے کی سینکڑوں دکانیں مستزاد...... میں نے یہ منظر زندگی بھر نہ دیکھا۔
رات کے آخری مرحلہ میں مولانا محمد علی جالندھری کی ساڑھے تین گھنٹے تقریر ہوئی۔ پنجابی کا ابوالکلام سٹیج پر آیا تو مولانا عبدالحق نے "متکلم اسلام" کے حوالہ سے تعارف کرایا۔ نماز فجر پر تقریر ختم ہوئی گلابی اردو اور مثالوں کے ذریعہ مدلل تقریر کا حال یہ تھا کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دریائے کابل جو جلسہ گاہ کی پشت پر بہہ رہا تھا اس کے پانی کی روانی زیادہ ہے یا مولانا کی تقریر کی...... مولانا نے علمی' دینی اور اس نوع کے فتنوں کی نشاندہی کی' جدید اعتزال اور جدید سبائیت پر ان کا تبصرہ اتنا بھرپور تھا کہ جلیل المرتبت علماء داد دے رہے تھے۔ مولانا نے بتلایا کہ کس طرح بعض لوگ اسلامی نظام کی اجارہ داری کے پردہ میں اصل اسلام کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں اور کس طرح اسلاف سے نئی نسل کا اعتماد ختم کر رہے ہیں۔

میں نے چند مرتبہ مولانا عبدالحق کے دولت کدہ پر ان سے ملاقات کی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ عظیم الشان مدرسہ کا بانی' کیسے نیم پختہ اور پرانے طرز کے مکان میں مقیم ہیں...... سچی بات یہ ہے کہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے بعد مولانا میرے خیال و مشاہدہ کے مطابق تیسرے بزرگ تھے جن کا مکان اس قدر سادہ' بوسیدہ اور برائے نام تھا۔ آج کے مہتمم حضرات کے باتھ روموں میں بجلی کے پنکھے اور قد آدم شیشے نصب ہیں جبکہ دین کے غم میں گھلنے والے بہت سے مدعیوں کی زندگی

دین لانے والے نبی رحمت اور پیغمبر معصوم کی زندگی سے کوسوں دور ہے۔ البتہ جو چند رندان قدح خوار دیکھے ان میں مولانا کا نام امتیازی حیثیت سے شامل ہے۔ جو لوگ مولانا سے عمر میں بڑے تھے ان کا احترام تو وہ کرتے ہی تھے' اپنے ہم عصروں حتیٰ کہ چھوٹوں کے لئے ان کا رویہ عجیب و غریب تھا...... ایسی تواضع اور ایسی فروتنی کہ میرے جیسا شخص بسا اوقات دم بخود رہ جاتا...... ایسی مثالیں کتابوں میں نظر آتی ہیں' اب اللہ تعالیٰ کی زمین پر ان کی تلاش مشکل ہے۔ یہ دور تو انسانیت کی توہین و تذلیل کا دور ہے جبکہ جاگیردار' وڈیرہ' صنعتکار' بر خود غلط مولوی' صاحب زادہ اور فقر غیور سے محروم پیر اپنے مزارع' مزدور' مقتدی اور مرید سے چار فٹ اونچا بیٹھتا اور اسوۂ رسولؐ کا مذاق اڑاتا ہے ...... ایسے دور میں مولانا کا وجود روشنی کا مینار تھا' اسوۂ رسولؐ و صحابہ کی چلتی پھرتی تصویر۔ اخلاق نبویؐ کا سراپا اور علم و حلم کی ڈھلی ہوئی تصویر...... ان کی خوش نصیبی قابل رشک ہے کہ ساری عمر قال اللہ اور قال الرسول کی خدمت میں گزار دی۔ حدیث کی معروف کتاب ترمذی کی نامکمل لیکن شاہکار شرح اور دسیوں علمی اور دینی کتابیں' عظیم الشان مدرسہ...... اس کی ان گنت شاخیں' ہزاروں سراپا علم و خلوص شاگرد اور صاحب علم و شرافت اولاد...... جس کا یہ ترکہ ہو اس پر رشک کیوں نہ کیا جائے۔

کتنی سعادت ہے کہ اپنے ہی دارالعلوم کے اس احاطہ میں دفن ہوئے جہاں ہزاروں بچے قرآن حفظ و ناظرہ پڑھ کر جا چکے ہیں اور روزانہ سینکڑوں پڑھتے ہیں...... دھرتی پر اللہ تعالیٰ کا نام جب تک لیا جائے گا اور قرآن کریم پڑھا جاتا رہے گا...... مولانا کی روح کی آسودگی کا سامان رہے گا۔ تلاوت قرآن کے زمزموں سے ان کی مقدس روح سرشار ہوتی رہے گی اور ہر آنے والا اس درویش خدامست کی قسمت پر رشک کرے گا۔

بقیہ: طلباتے تنظیم اسلامی

یہ بتایا کہ فرائض دینی کے بارے میں امت مسلمہ کے ہر فرد کا معاملہ یکساں ہے' شعور حاصل کر لینے اور بلوغت کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد بلا تخصیص ہر شخص بشمول طلباء ان کا مکلف ہے۔ امیر تنظیم نے فرائض دینی کی بہت مفصل اور دلپذیر تشریح فرمائی۔ طلبہ کے مسائل کے ضمن میں امیر تنظیم نے بتایا کہ ان کے مسائل معاشرے کے مسائل سے جداگانہ کوئی وجود نہیں رکھتے۔ یہ تقسیم مخصوص مفادات کے حامل لوگ کرتے ہیں۔ ہمارے دین کا یہ مزاج نہیں ہے۔ اس اجلاس کی کارروائی کے ساتھ رات دس بجے طلبہ تنظیم اسلامی پاکستان کا پہلا

رفتارِ کار

امیر تنظیم اسلامی کا دورۂ وہاڑی و بہاولپور

مرتبہ : محمد سعید بھٹہ، منظور حسین

رفیق محترم جناب رانا غلام اکبر صاحب کے فرزند سیف الرحمٰن اور رفیق محترم محمد یونس چودھری صاحب کی دختر نیک اختر کا نکاح مسنون ۲۹ر اگست کو وہاڑی میں ہونا طے تھا۔ امیر محترم اور میاں محمد نعیم صاحب (ناظم اعلیٰ) بھی اس میں شرکت کے لئے تشریف لا رہے تھے۔ لہٰذا رفقائے تنظیم اسلامی وہاڑی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دعوتی پروگرام طے کیا اور اس کے لئے بھرپور محنت کی۔

امیر محترم کے خطاب عام اور محفل نکاح کے انعقاد کے لئے وہاڑی کی تاریخی جامع مسجد کا انتخاب ہوا۔ انتظامیہ سے رابطہ اور ضروری اجازت کے مراحل رفقائے وہاڑی نے بہت مستعدی سے سر کئے اور عجلت میں طے کئے ہوئے اس پروگرام کے بقیہ انتظامی معاملات کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا۔ امیر تنظیم اسلامی کے خطاب کا عنوان تھا "سیرت النبیؐ کا انقلابی پہلو" ۔ اصلاح الرسوم پر بھی روشنی ڈالی گئی اور خطاب عام کے بعد اسی مسجد میں نکاح مسنونہ کی پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ حاضرین کی تعداد دو ہزار کے لگ بھگ تھی۔ رفقائے تنظیم اسلامی وہاڑی کی جانفشانی اور حسنِ تدبیر کے علاوہ اس پروگرام کی کامیابی میں مرکز حلقہ ملتان کے تعاون کو بھی دخل ہے۔ ہینڈ بلز' دعوتی کارڈز کی تیاری کے علاوہ رابطہ عوام وخواص کے لئے کارکنوں نے بہت محنت کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے اور مزید توفیق خیر کی سعادت سے بہرہ مند کرے۔

مجلس شوریٰ حلقہ جنوبی پنجاب نے سولہ اگست کو اپنے اجلاس میں رفقاء کے لئے دو روزہ سہ ماہی تربیتی اجتماع ستمبر کے پہلے ہفتہ میں بہاولپور منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق تربیتی اجتماع کینال کالونی بہاول پور کی جامع مسجد میں ۸ر ستمبر کو صبح ۹ بجے شروع ہوا اور ۹ر ستمبر کی شام کو اختتام پذیر ہوا۔

اس اجتماع میں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بھی شرکت فرمائی۔ بہاول پور ملتان سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر مین لائن پر واقع ایک تاریخی اور خوبصورت شہر ہے۔ اس شہر میں رفقائے تنظیم اسلامی حلقہ جنوبی پنجاب کا یہ پہلا اجتماع تھا جو دعوت و تبلیغ اور تربیت و تنظیم کے نقطہ نظر سے انتہائی کامیاب رہا۔ بہاول پور کی فضائیں دو دن تک داعیٔ انقلاب اسلامی کے انقلاب آفریں خطابات سے گونجتی رہیں۔ اس اجتماع کی تیاری' منصوبہ بندی اور تشہیر کے سلسلہ میں بہاول پور کے نقیب اسرہ جناب محمد سلیم اختر صاحب کے علاوہ رفیق محترم جناب ڈاکٹر عمر علی خان' جناب جاوید اختر اور دیگر رفقاء واحباب نے انتھک محنت کی۔ بہاول پور شہر کے لوگوں کی طرف سے جو بھرپور ملا وہ ان کی بہترین کارکردگی اور حسن انتظام کا مظہر تھا۔

۸ر اگست ۱۹۸۸ء بروز جمعرات رفقاء صبح آٹھ بجے ہی کینال کالونی کی خوبصورت مسجد میں پہنچ گئے۔ مسجد کے امام وخطیب مولانا حبیب احمد صاحب نے استقبال کیا۔ مذکورہ مسجد انتہائی سرسبز اور پرفضا مقام پر واقع ہے اور

حسن تعمیر کا ایک دلکش نمونہ ہے۔ گیارہ بجے اجتماع کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔ حاضری ۵۰ تھی۔ یہ اجلاس دن کے ایک بجے تک جاری رہا۔ میاں محمد نعیم صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان نے افتتاحی اجلاس سے خطاب کیا۔ ان کا خطاب جامع اور مفصل تھا جسے رفقاء نے شوق اور انہماک سے سنا۔ اپنے خطاب میں انہوں نے تربیتی اور تنظیمی نصاب کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی اور اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا۔ خاص طور پر اس کے عملی پہلوؤں سے رفقاء کو روشناس کرایا۔ اُن کی تقریر نے جہاں رفقاء کے شوق اور ولولے کو ابھارا وہاں تربیتی نصاب سے متعلق الجھنوں اور اشکالات کو رفع کرنے میں مدد دی۔ میاں صاحب کی مفصل گفتگو کے بعد جناب مختار حسین فاروقی نے رفقاء کو خود احتسابی کی طرف توجہ دلائی اور رفقاء سے فرداً فرداً ان کی کارکردگی اور رفتار کار کے بارے میں رپورٹ لی۔ ہر رفیق نے کھڑے ہو کر اپنی کارکردگی بیان کی۔ گزشتہ کوتاہیوں پر شرمندگی کا اظہار کیا اور آئندہ کی تلافی اور اصلاح کا عزم مصمم کیا۔ آخر میں مبصر کی حیثیت میں شریک رحیم یار خان کے ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے اپنے تاثرات بیان فرمائے اور تربیتی و تنظیمی اجتماع کے انعقاد پر خوشی کا اظہار فرمایا۔ یوں اجتماع کی پہلی نشست دن کے ایک بجے اختتام پذیر ہوئی۔

اجتماع کی دوسری نشست بعد نماز عصر شروع ہوئی اور نماز مغرب سے قبل اختتام پذیر ہوئی۔

مغرب کی نماز کے بعد امیر محترم نے مسجد میں مختصر خطاب فرمایا۔ رفقائے تنظیم اسلامی کے علاوہ مقامی نمازیوں سے مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ امیر محترم نے انفرادی سیرت و کردار ' زہد و تقویٰ اور تزکیہ نفس کو اپنا موضوع سخن بنایا اور اس موضوع سے متعلق آیات قرآنی اور احادیث شریفہ کی روشنی میں نہایت حکیمانہ باتیں ذہن نشین کرائیں جس سے زہد و تقویٰ کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیاں چھٹتی چلی گئیں اور دل احادیث شریفہ کے نورانی اثرات سے منور ہو گئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر رفقاء کے مختلف قافلے قائداعظم میڈیکل کالج کی طرف روانہ ہونے شروع ہوئے ' جہاں بعد نماز عشاء بوائز ہاسٹل فیصل ہال میں "حقیقت جہاد" کے موضوع پر امیر محترم کا خطاب ہونے والا تھا۔ خطاب کی دعوت وہاں کی اسلامی جمعیت طلبہ نے دی تھی۔ ہاسٹل کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض سبزہ زار میں بڑے قرینے اور سلیقے کے ساتھ صوفے اور کرسیاں لگائی گئی تھیں۔ سامنے پروقار سٹیج بنی ہوئی تھی۔ اس تقریب کے حسن انتظام کو دیکھ کر منتظمین کے نظم و ضبط اور صلاحیت انتظام کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے تشریف لانے تک پنڈال کھچا کھچ بھر چکا تھا اور طلباء و حاضرین اشتیاق کے ساتھ خطاب کے منتظر تھے۔ امیر محترم کے تشریف لانے کے فوراً بعد سٹیج سیکرٹری نے امیر محترم کا مختصر تعارف کرایا۔ رات کی خاموش اور پرسکون فضا میں ڈاکٹر صاحب کی پروقار اور انقلاب آفریں آواز دلوں کو گرما رہی تھی۔ امیر محترم نے جہاد کے لفظی و اصطلاحی مفاہیم واضح فرماتے ہوئے جہاد کے مختلف مدارج کا ذکر انتہائی شرح و بسط کے ساتھ فرمایا۔ مسلمانوں کے دینی فرائض یعنی عبادت رب ' شہادت علی الناس اور اقامت دین کے لئے ہر سطح پر جہاد فی سبیل اللہ کے لوازم واضح فرمائے اور جہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں پر سے پردہ اٹھایا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی اس تقریر کو سامعین نے سکون اور دلجمعی کے ساتھ سنا۔ تقریر کے اختتام پر سوال و جواب کی محفل جمی جس میں طلباء کا اشتیاق دیدنی تھا۔ امیر محترم سٹیج سے اتر کر ان میں اس طرح گھل مل گئے کہ اجنبیت کا کوئی شائبہ بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ امیر محترم اپنے ہی مقصد و ہم سفر اعوان و انصار میں تشریف فرما ہیں۔

سوال وجواب کی نشست کے بعد طلبہ وحاضرین نے انتہائی جوش وخروش اور محبت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو الواع کہا۔ پنڈال کے باہر تنظیم اسلامی حلقہ ملتان نے مکتبہ لگایا ہوا تھا جہاں بڑی رونق تھی اور لوگ بھرپور دلچسپی کا اظہار کر رہے تھے۔ یوں رات گئے یہ تقریب سعید انتہائی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

جامع مسجد کینال کالونی کے خطیب حضرت مولانا حبیب احمد صاحب نے رفقائے تنظیم اسلامی کی رہائش و اجتماع کے لئے اپنی مسجد، حجرہ، سٹور اور باتھ روم کی چابیاں کمال عنایت سے ہمیں عطا فرمائی ہوئی تھیں کہ ہم جس طرح چاہیں ان سے استفادہ کریں۔ فجزاہ اللہ احسن الجزاء۔ موصوف کا اصرار تھا کہ داعیٔ حق امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب آج بعد نماز فجر ہماری مسجد میں درس قرآن مجید دیں۔ گو امیر محترم کے خطابات کا شیڈول خاصا Tight تھا مگر ہم ان کے خلوص کے پیش نظر انکار نہ کر سکے۔ امیر محترم نے نماز فجر کے بعد سورۃ الحجرات کی آیات کے حوالے سے اپنے مخصوص انداز اور دل نشین پیرایہ میں ایمان قانونی اور ایمان حقیقی کا فرق واضح فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تصدیق بالقلب اور جہاد فی سبیل اللہ ایمان حقیقی کے دو رکن رکین ہیں اور فلاح ونجات اخروی ان دونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ گویا آج کا درس خود جاگو اور دوسروں کو جگاؤ کی پکار تھا۔ محفل درس میں اہل علم ودانش کے علاوہ اعلیٰ آفیسرز بھی موجود تھے۔ حاضرین کی تعداد دو سو کے لگ بھگ تھی۔ چند خواتین بھی اس درس میں باپردہ شریک ہوئیں۔ درس کے بعد امیر محترم نے بھی دیگر شرکاء کے ساتھ سادہ ناشتہ میں شرکت کی اور پھر قدرے آرام کے لئے اپنے کمرہ میں تشریف لے گئے کیونکہ چند ہی گھنٹوں کے بعد ارم ہوٹل میں علماء ودانشوران بہاول پور سے خطاب کا پروگرام تھا۔ ارم ہوٹل بہاول پور کے قلب چوک فوارہ کے قریب کھلی فضا میں واقع ہے۔ ارم ہوٹل میں علماء کا استقبال کرنے والے رفقاء جانب ہوٹل روانہ ہوئے جبکہ بقیہ رفقاء تلاوت کلام مجید اور باہمی تعارف میں مصروف رہے۔ ہوٹل پہنچے تو علماء کرام، پروفیسر صاحبان اور دانشور حضرات تشریف لا رہے تھے۔ ہم ان کے استقبال اور ہال کی طرف رہنمائی میں مصروف رہے۔ ملتان شہر اور احمد پور شرقیہ سے بھی علماء کرام ہماری دعوت پر تشریف لائے۔ پروگرام قدرے تاخیر سے شروع ہو سکا۔ آغاز رفیق مکرم حافظ محمد رفیق صاحب کی تلاوت قرآن مجید سے ہوا۔ موصوف نے سورۃ صف کے آخری رکوع کی تلاوت فرما کر گویا نبی اکرمؐ کے مقصد بعثت کی طرف اشارہ فرمایا اور من انصاری الی اللہ کی صدا بلند کی۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب نے امیر محترم کو دعوت خطاب دی۔ امیر محترم کے خطاب کے وقت ہال تقریباً بھر چکا تھا چونکہ محفل اہل علم ودانش کی تھی لہٰذا امیر محترم کے خطاب کا رنگ ہی نرالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑے ہی پر اعتماد انداز میں اہل علم ودانش کو "علم کی توحید" کی جانب توجہ دلائی۔ علماء کرام سے بڑے درد کے ساتھ اپیل کی کہ آپ دین کے محدود تصور سے نکلیں اور غلبہ واقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے ہماری سرپرستی فرمائیں۔ دانشوروں کو مشورہ دیا کہ وہ عربی زبان سے واقفیت حاصل کر کے علوم دینیہ سے براہ راست آگاہ ہوں اور اسلام وایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کریں۔ امیر محترم نے حاضرین کے سامنے یہ بات رکھی کہ علم الوحی کو علم الحواس پر کئی درجہ فوقیت حاصل ہے۔ مگر جب تک ہم جدید مفکرین وفلاسفہ کے گمراہ کن فلسفوں سے کماحقہ آگہی حاصل نہیں کر لیتے ان کا رد ممکن نہیں۔ نوجوانوں کے اذہان میں ملحد فلاسفہ نے شکوک وشبہات اور الحاد و مادہ پرستی کے جو کانٹے چبھو دیئے ہیں انہیں جدید علوم اور قرآن وحدیث کے علوم ومعارف سے مسلح ہو کر ہی نکالا جا سکتا ہے۔ امیر محترم نے تاریخ اسلام کے حوالہ سے امت مسلمہ کے عروج وزوال پر بھی روشنی ڈالی اور علم کی وحدت کے پارہ پارہ ہونے کے اسباب گنوائے۔ خطاب کے بعد سوال جواب کی نشست ہوئی۔ اس طرح یہ ما

شاہی جامع مسجد الصادق بہاول پور میں امیر محترم کا خطبۂ جمعہ طے تھا جس کی مناسب تشہیر بذریعہ ہینڈ بل ' پوسٹرز کی گئی تھی۔ خطبۂ جمعہ ٹھیک ایک بجے ہونا تھا۔ لہٰذا رفقاء و منتظمین نماز جمعہ کی تیاری کے لئے اپنے ہیڈ کوارٹرز (جامع مسجد کینال کالونی) کی جانب پلٹے جہاں رفیق محترم سیف الرحمٰن خان خلف الرشید رانا غلام اکبر خان کی دعوت ولیمہ ان کی منتظر تھی۔ کھانے سے فارغ ہو کر تمام رفقاء شاہی جامع مسجد کی طرف روانہ ہوئے۔ مسجد اسلامی ثقافت کا حسین مرقع تو ہے ہی لیکن خطیب شاہی مسجد حضرت مولانا قاضی رشید احمد صاحب کی ہمہ گیر اور دل نواز شخصیت نے بھی اسے مرجع خلائق بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے کمال لطف و کرم سے نہ صرف ہمیشہ ہماری سرپرستی فرمائی بلکہ جب کبھی بھی مسجد میں خطاب کے لئے عرض کیا گیا تو مسجد میں خطاب کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔ مسجد میں حاضری لگ بھگ چار ہزار تھی۔ امیر محترم نے قبل جمعہ افتتاحی کلمات کے طور پر حکمت و احکام جمعہ اور نبی اکرمؐ کے مقصد بعثت اور طریق تربیت پر مختصر روشنی ڈالی۔ اصل خطاب نماز جمعہ کے بعد ہوا۔ عنوان تھا "پاکستان کے موجودہ ناگفتہ بہ حالات اور تنظیم اسلامی کی پکار" امیر محترم نے اہل وطن کو حصول پاکستان کے مقاصد سے روگردانی پر اس کی سزا و عقوبت کے طور پر قومی و ملی سطح پر مرض نفاق کے تسلط کا احساس دلایا۔ اور اجتماعی توبہ اور اصل مقصد کی جانب رجوع و التفات پر زور دیا۔ امیر محترم کے ہر دو خطابات عام کے موقع پر مکتبہ بھی لگایا گیا اور تنظیم اسلامی کا تعارف بھی تقسیم کیا گیا۔ خطیب مسجد حضرت مولانا رشید احمد صاحب مدظلہ نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر کی تحسین فرمائی اور ہماری دعوت و فکر پر سنجیدگی سے غور و خوض کا وعدہ فرمایا۔

نماز عصر کے بعد رفقاء کا اختتامی اجلاس ہوا جس میں جناب محمد نعیم صاحب نے اہم ہدایات دیں۔ بعد ازاں امیر تنظیم اسلامی حلقہ ملتان نے ان وفود کی تجدید کی جو قبل ازیں مختلف اضلاع میں بغرض تبلیغ تشکیل دیئے گئے تھے۔ امرائے وفود کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر ماہ ستمبر کے اواخر تک دو روزہ تبلیغی دورے مکمل فرما کر مرکز ملتان رپورٹ کریں۔ رفقاء و شرکاء تربیت گاہ کا شکریہ ادا کیا گیا اور اختتام پر رفقاء کی توجہ بہاول پور کے جملہ پروگراموں پر اٹھنے والے اخراجات کی جانب مبذول کرائی گئی۔ صاحب حیثیت رفقاء نے اکثر و بیشتر اخراجات کو برداشت کرنے کا وعدہ فرمایا۔ نماز مغرب سے قبل ہی اس اجتماع کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا۔ بہاول پور سے باہر کے رفقاء تو دو روزہ تربیتی و توسیع دعوت کے خوش گوار پروگرام کی سہانی یادیں اور اک ولولۂ تازہ لئے گھروں کو رخصت ہوئے جبکہ امیر محترم کو ابھی نماز مغرب کے بعد اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن کی تقریب میں خطاب فرمانا تھا۔

حاضری قریباً سو تھی جس میں میڈیکل کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اساتذہ و پروفیسرز موجود تھے۔ خطاب کا عنوان تھا "اسلام میں خدمت خلق کا تصور"۔ امیر محترم نے محض طبی خدمات پر قانع خادمین خلق کے سامنے اعلیٰ و اکمل خدمت خلق کا جامع تصور "یعنی پوری انسانیت کو ہلاکت و بربادی سے بچا کر فلاح و نجات اخروی کے راستہ پر گامزن کرنا" پیش کیا۔

مقامی حلقوں کا کہنا ہے کہ اکثر و بیشتر پروفیسرز جو کبھی بھی اس قسم کے لیکچرز میں شریک نہیں ہوتے' بطور خاص امیر محترم کے لیکچر میں شریک ہوئے۔ امیر محترم جناب میاں محمد نعیم صاحب کی معیت میں بذریعہ ٹرین رات کے ایک بجے لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اہل بہاول پور کے دلوں کو داعیٔ انقلاب اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پکار پر سنجیدگی سے غور و فکر کرنے اور ان کا ساتھ دینے کی توفیق عطا

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE
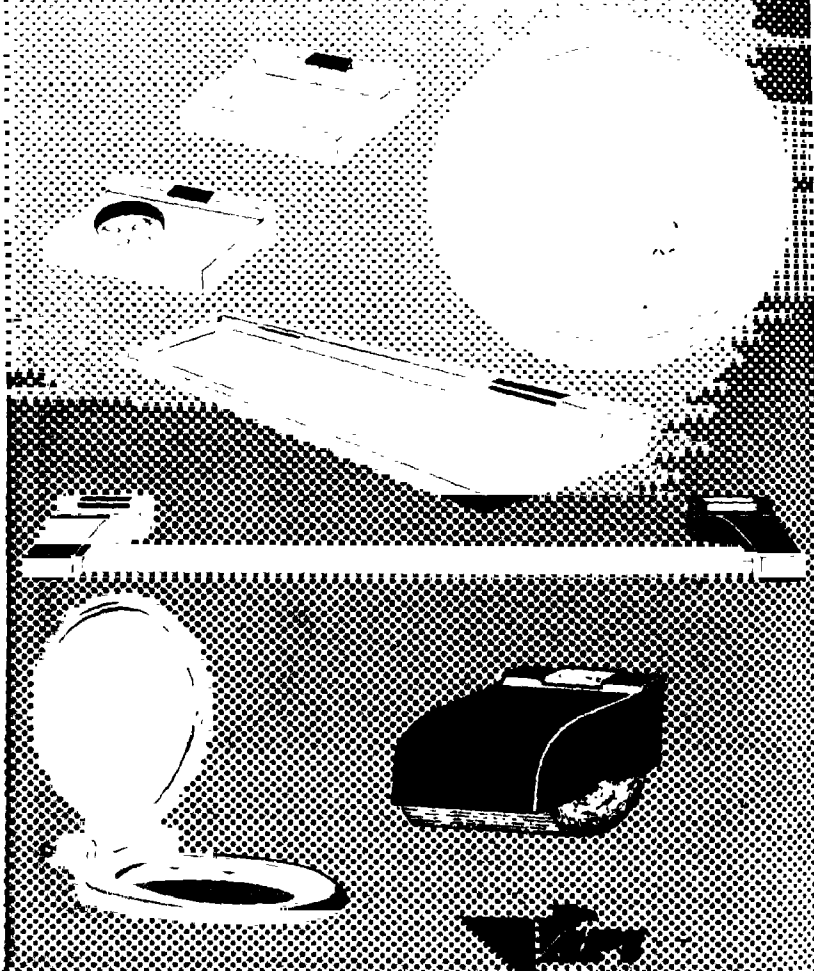
ان شاء اللہ العزیز تعالیٰ
انجمن خدام القرآن سندھ کراچی
کے زیر اہتمام
۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء ریکس آڈیٹوریم صدر کراچی میں
اسلام کا نظامِ حیات
کے موضوع پر "محاضراتِ قرآنی" منعقد ہوں گے جن میں روزانہ بعد نمازِ مغرب
ڈاکٹر اسرار احمد
صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ——— و امیر تنظیم اسلامی
• اسلامی نظام کی نظریاتی اساس
• اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام
• اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام
• اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام اور
• اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام
کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے اور متعلقہ سوالات کے جواب دیں گے
ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"
المعلن: (سید) سراج الحق، صدر، انجمن خدام القرآن سندھ
D-56، بلاک بی، نارتھ ناظم آباد، کراچی (فون :- ۶۲۲۴۴۵۰)
——— پشت پر بھی ملاحظہ فرمائیں ———

ان شاء اللہ العزیز وبعونہٖ تعالےٰ

انجمن خدام القرآن کے قرآنی محاضرات کے ساتھ ساتھ

ریکس آڈیٹوریم کراچی ہی میں ۱۷ تا ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ

بھی منعقد ہوگی، جس میں

★ قرآن حکیم کے دعوتی اور تربیتی نصاب اور

★ تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی کے علاوہ

★ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق و منہاج اور

★ دعوت و تنظیم کی راہ کی مشکلات اور اُن کا حل

ایسے اہم موضوعات پر مذاکرات ہوں گے

تنظیمِ اسلامی کے رفقاء ابھی سے رخصت وغیرہ کا بندوبست شروع کر دیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۷ دسمبر ۸۸ء کی سہ پہر تک ضرور کراچی پہنچ جائیں۔ وہاں سے واپسی کے لیے جمعرات ۲۲ دسمبر کی بعد دوپہر بکنگ کرائی جائے۔ قیام گاہ وغیرہ کے ضمن میں تفصیلی اطلاع 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔

المعلن : (میاں) محمد نعیم ، ناظمِ اعلیٰ ، تنظیمِ اسلامی پاکستان

۶۷۔ اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

(فون : ۳۰۵۱۱۰)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهٖ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس ... جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد	۳۷
شمارہ	۱۱
ربیع الاول	۱۴۰۹ھ
نومبر	۱۹۸۸ء
فی شمارہ	/۵
سالانہ زرتعاون	/۵۰

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات۔	۲۵ سعودی ریال
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا۔	۶۔ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ۔	۹۔ امریکی ڈالر
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔	۱۲۔ امریکی ڈالر

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ (پاکستان)، لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ ۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

براہ کرم خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر فرمائیں

مشمولات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرضِ احوال

پچھلے ہی شمارے میں امیر تنظیم اسلامی ' ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دو خطبات کے ماحصل کو یک جا کر کے شائع کیا گیا تھا ' جن میں انہوں نے قومی سیاست کی موجودہ صورت حال اور بالخصوص آئندہ عام انتخابات کے تناظر میں ملک کی سیاسی اور مذہبی جماعتوں کو کچھ مشورے دیئے اور یہ سب کچھ فی الحقیقت تمہید تھی ' اس عاجزانہ درخواست کی جو انہوں نے جماعت اسلامی کی خدمت میں پیش کی کہ اب بھی وقت ہے کہ وہ اسی اصولی اسلامی انقلابی جماعت کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لے ' جو اس کے بنیادی اصولوں ' تنظیمی ڈھانچے اور مزاج کی ساخت سے قریب تر ہے۔ گذشتہ اکتالیس سالوں میں اس نے یہاں کی انتخابی سیاست میں حصہ لے کر نہ ملک کے حق میں بہتری کی کوئی شکل پیدا کی اور نہ اسلام کی کسی درجے میں کوئی خدمت ہو سکی۔ رائج الوقت سیاست کے آنے والے معرکے میں وہ اپنی سب توانائیاں بھی جھونک دے تو اسمبلیوں میں گنتی کی چند سیٹیں جیت لینے سے بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکے گی ' جو اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے سلسلے میں تو کسی مثبت پیش رفت کا باعث ہرگز نہ ہو گا البتہ اسلام کی منزل ضرور کھوٹی ہو گی۔

افسوس کہ ایک دردمند بہی خواہ کے دل سے نکلی یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور جماعت کی قیادت نے ان چند ہفتوں کے دوران میدان سیاست میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ ہمارے روایتی طالع آزما سیاست دانوں کی بازی گری کو بھی پیچھے چھوڑ گئے جماعت کی اپنی اب تک کی سب ادلتی بدلتی انتخابی حکمت عملیاں بھی گرد ہو گئیں اور المیہ یہ ہے کہ اب وہ ایسے مقام پر آ پہنچی ہے جہاں سے واپسی کی توقع ایک معجزہ ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ اس بار وہ اپنے انتخابی سیاسی عمل کی اس انتہا کو چھونے کا فیصلہ کر چکی ہے جو قبل ازیں شاید اس کے اپنے وہم و گمان میں نہ تھی۔ ملک کے اولین عام انتخاب (پنجاب کے صوبائی الیکشن منعقدہ ۱۹۵۱ء) میں "ووٹر کے عہد نامہ" اور "اسلامی پنچایت" سے آغاز کر کے جس میں

امیدواری پوری صراحت کے ساتھ حرام تھی اور پارٹی ٹکٹ ایک لعنت' ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں اپنے موجودہ مقام تک کا فاصلہ طے کرنے میں اسے دوچار نہیں' ان گنت سخت مقامات سے گذرنا پڑا ہے' جن کی تفصیل کا بیان ہمارے لئے دلچسپی کا سامان نہیں' صدمے کی بات ہے۔ ہمارے قارئین کو تو کیا' خود جماعت اسلامی کی نئی نسل کو ہماری یہ بات شاید ایک چیستاں معلوم ہو اور کیوں نہ ہو' فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہے کہ تخیل کی حدوں کو پھلانگ جاتا ہے اور مرور ایام نے اس پر اتنے پردے ڈال دیئے ہیں کہ یاد ماضی کو باقاعدہ کریدنا پڑتا ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ حکایت دراز تو ہے' لذیذ نہیں۔ نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں۔ اس کے لئے یہ چند صفحات کافی بھی نہیں ہوں گے۔ کسی کو فرصت ہو تو اس کی تاریخ پر ایک پوری کتاب لکھی جانی چاہئے' جو دین کے کام کا داعیہ لے کر اٹھنے والی جماعتوں کے لئے داستان عبرت بھی ہوگی اور اس راہ عزیمت کی ان کھائیوں کی نشاندہی بھی' جن سے بچ کر نکلنا منزل مراد پانے کے لوازم میں شمار کی جائے گی۔ اس کے آخری باب کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہی جگر تھامنا پڑتا ہے۔

قاضی حسین احمد صاحب' امیر جماعت اسلامی نے اپنے ایک اہم وضاحتی بیان میں فرمایا' جس کا متعلقہ حصہ ہفت روزہ "ایشیا" (۲۷ر اکتوبر) سے نقل کیا جا رہا ہے' لہٰذا اس کی صحت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے کہ

> "اس (اسلامی جمہوری) اتحاد میں شامل ہونا جماعت کے لئے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ لیکن ملکی حالات کے پیش نظر اور قومی انتخابات کو یقینی بنانے کے لئے ہم نے اس اتحاد میں شامل ہونا ضروری سمجھا اور جماعت کے مشاورتی نظام نے تمام مراحل طے کر کے یہ فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ کرتے وقت ہماری راہ میں اگرچہ کئی مشکلات حائل تھیں لیکن ہم نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ اس اتحاد میں شامل ہونا چاہئے کیونکہ ملک کو بحران سے نکالنے کے لئے اس کے سوا کوئی اور متبادل راستہ نہیں ہے۔
>
> پاکستان عوامی اتحاد کے نام سے بھی ایک دوسرا سیاسی اتحاد بنا لیکن مسئلہ افغانستان کے بارے میں اس کے روس نواز اور بھارت نواز رجحان بالکل واضح ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ ان ممالک کے آلۂ کار ہیں لیکن اس مسئلے پر ان کا اب تک جو رویہ رہا ہے وہ جہاد افغانستان کی روح کے منافی ہے۔ اس اتحاد میں شامل ایک جماعت کے سربراہ تو افغانستان کا سرکاری دورہ بھی کر چکے ہیں اور انہوں نے اپنی پارٹی منشور میں یہ تک لکھ دیا ہے کہ پاکستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہو گا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے بارے میں ہمارا موقف یہ تھا کہ جو جماعتیں آٹھ سال سے
اس کے ساتھ ہیں وہ ان سے انتخابی اتحاد نہیں کر سکی تو اور کس پارٹی سے اس کا اتحاد ہو
سکتا ہے۔ "

اسلامی جمہوری اتحاد میں شمولیت مبارک کہ وہ اپنے ماضی اور اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار
سے نہ سہی، نام کا تو اسلامی جمہوری ہے، لیکن جہاد افغانستان کے دشمن پاکستان عوامی اتحاد
کے آن ملنے پر بھی جماعت کی جبیں پر شکن نہ آئی۔ اس کے دو تہائی حصے کو "عظیم تر اتحاد"
سے نکالا نہیں گیا بلکہ سیٹوں کی تقسیم سے غیر مطمئن ہو کر اسی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ حادثہ نہ
ہوتا تو روس و بھارت نوازی اور جہاد افغانستان کی روح کی نفی کھلے دل سے قبول کر لی گئی تھی۔
اور پاکستان پیپلز پارٹی اگر ان جماعتوں کو ساتھ رکھ سکتی جو آٹھ سال اس کے ساتھ رہیں تو
نویں سال جماعت اسلامی کو بھی اس کا اتحادی بننے پر اعتراض نہ تھا بلکہ وہ تو مفاہمت کی فضا
میں اس کے ساتھ اتحاد کے موضوع پر مذاکرات شروع بھی کر چکی تھی ..... اللہ، اللہ!
ایک اصولی اسلامی انقلابی جماعت کو نظام اسلام کے نفاذ کی منزل سر کرنے کے لئے کن دشوار
گھاٹیوں سے گذرنا پڑ رہا ہے۔

ملک کے دیگر مذہبی عناصر نے بھی اس موقع پر قابل رشک تو کیا معقول طرز عمل کا مظاہرہ
بھی نہ کیا۔ محض انتخابات میں حصہ لینے کے محدود اور خالص دنیاوی (بمقابلہ دین و مذہب)
مقصد کے لئے قائم ہونے والے عارضی اتحادوں اور گروہ بندیوں میں ان کی شمولیت بھی گوارا
کی جا سکتی تھی بشرطیکہ اس شمولیت میں اصولوں اور نظریات کا کچھ تو عمل دخل ہوتا لیکن
اخبارات کے صفحات گواہ ہیں کہ موقع شناسی اور مصلحت بینی کے اس "نیک کام" میں وہ
خالص دنیاداروں پر بھی سبقت لے گئے۔ اور پھر ٹکٹوں کی تقسیم پر جس انداز کی سودے بازی
ہوئی، مطلوبہ تعداد میں یا منتخب مقامات پر سیٹیں نہ ملنے پر اتحادیوں کو جیسے سب و شتم کا نشانہ
بنایا گیا، "نفسی! نفسی!" کی فریاد جس طرح کانوں کے پردے پھاڑتی رہی اور افراتفری کا جو یہ
عالم دیکھنے میں آ رہا ہے کہ عین پولنگ کے دن ہی معلوم ہو گا کہ کون کس کے ساتھ ہے، کون
کھڑا ہے، کون بیٹھ گیا اور کھڑا ہے تو کس سہارے پر، بیٹھ گیا تو کیا لے دے کر۔ یہ سب کچھ
دیکھ اور سن کر خدا یاد آتا ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی اپنی اس رائے پر اطمینان میسر تھا کہ اس باطل
نظام کی فاسد انتخابی سیاست سے دین و مذہب کا کچھ بھلا نہ ہو گا، اللہ تعالیٰ اپنے دین کی کسی
درجے میں سربلندی چاہنے والوں کو اس مشاہدے کی اذیت سے گذار کر بھی یہی کچھ سمجھنے کی
توفیق دے تو غنیمت ہے۔

بایں ہمہ انتخابات کی بیل گوارا حد تک امن و امان کی فضا میں منڈھے چڑھ جائے ' نتائج کو اس دوڑ میں شریک سب حلقے خوش دلی سے نہیں تو مارے باندھے ہی قبول کر لیں ' ملک کے آئین اور دستور زمانہ کے مطابق خیر و عافیت سے انتقال اقتدار کا مرحلہ طے پا جائے اور حزب اقتدار و حزب اختلاف دونوں ہی اپنا وہ کردار استقامت سے نبھانے کا پختہ ارادہ کر لیں جو اس طرز جمہوری کی مسلمہ روایات کا بنیادی تقاضا ہے تو ملک جمہوریت کی راہ پر گامزن تو ہو جائے گا۔ آثار جو انتخابی عمل کے آغاز پر ظاہر ہو رہے ہیں وہ اگرچہ کسی اچھے انجام کی امید نہیں دلاتے تاہم پاکستان کے ہر محب وطن مسلمان شہری کو نہایت الحاح وزاری سے اپنے رب کے حضور دعائیں کرنی چاہئیں کہ وہ ہمیں کسی اور آزمائش سے دوچار نہ کرے۔ آئندہ انتخابات اگر مطلوبہ نتائج دینے میں ناکام رہیں تب بھی اس بساط کو پھر سے لپیٹ نہ دیا جائے ' بلکہ بری بھلی جمہوریت کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا تو ایک دوبار کے تلخ تجربات کے بعد ہی سہی ' لوگ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھ لیں گے اور کم از کم وہ صورت تو نہ رہے گی جس کی ہولناکی کے تصور سے آج ہم لرزہ براندام ہیں۔ ملک کی جغرافیائی وحدت اور قوم میں اتفاق و یکجہتی کی فضا کے لئے جو خطرات جمہوری عمل کے تعطل میں مخفی ہیں وہ اب کسی دیدۂ بینا سے پوشیدہ نہیں۔ ہم پاکستان کی وحدت و سالمیت کے طالب ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھیں تو یہاں اس کے دین کی سربلندی کا خواب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

تنظیم اسلامی جمہوریت کی بحالی کی آرزومند ہے اور اس کے لئے صحیح رخ پر کی جانے والی ہر کوشش کی حمایت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ ہمیں یہ تو یقین ہے کہ یہاں جمہوریت ویسی ہی آئے گی جیسے خود جمہور ہیں ' لیکن یہ اطمینان بھی ہے کہ ملک خداداد سلامت رہے اور جمہوریت عوام میں معرفت نفس ہی پیدا کرنے کا باعث بن جائے تو اللہ اور اس کے دین کی طرف رجوع کی دعوت دینے میں کوئی امر مانع نہ ہو گا ' کچھ سہولت ہی پیدا ہو گی۔ مسلمانوں کے اس وطن میں کیسی بھی حکومت آجائے ہمیں اپنا کام کرنے سے نہ روکے گی اور نہ روک سکے گی ' بشرطیکہ زبان و قلم پر پہرے ہی بٹھا دیئے جائیں جو جمہوری چھوڑ ' نیم جمہوری حکومت سے بھی متوقع نہیں۔ "میثاق" کے آئندہ شمارے کے آنے سے بہت پہلے اللہ کو منظور ہوا تو ' یہ الیکشن کا ہنگامہ سرد ہو چکا ہو گا۔ ہم ان حضرات سے بالعموم جو ہمارے فکر اور ہماری دعوت سے اتفاق رکھتے ہیں اور اپنے رفقاء سے بالخصوص دعا کی مکرر درخواست کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی درجے میں الیکشن کے بخار میں مبتلا ہونے سے پرہیز کریں۔ اپنے اصل کام کی طرف توجہ مرکوز رکھیں اور اپنی صفوں کو مضبوط کریں۔ انتخابات کا جوش و خروش ختم ہونے پر انشاء اللہ لوگ

(۱۱، صفحہ)

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہدیٰ

درس ۱۲ نشست ۵۵

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۲)

السلام علیکم .... نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم .... امّا بعد

فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ـــ بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ۝۴ وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۵ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ

فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝٦ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝٧ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٨

(صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْم)

"اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر اور مت گفتگو کرو ان سے بلند آوازی کے ساتھ جیسے تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کر لیتے ہو۔ مبادا تمہارے تمام اعمال حبط ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پست رکھتے ہیں' وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لئے جانچ لیا ہے۔ ان کے لئے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی بلاشبہ وہ لوگ جو اے نبی' (صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے باہر سے' ان میں اکثر ناسمجھ ہیں اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود اُن کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لئے کہیں بہتر تھا۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو۔ مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں پچھتانا پڑے اور جان رکھو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر وہؐ تمہارا کہنا اکثر معاملات میں ماننے لگیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ لیکن اللہ نے تو ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اُسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے اور تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر کو بھی اور نافرمانی کو بھی اور معصیت کو بھی۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اصل میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور مظہر ہے اس کی نعمت کا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمالِ حکمت والا ہے۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین.... یہ سورۃ الحجرات کی آیات ۲ تا ۸ ہیں' جن کی تلاوت بھی آپ نے سماعت فرمائی اور ان کا رواں ترجمہ بھی سنا۔ ان آیات میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یا اُن کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کی جو دوسری اہم بنیاد ہے' اس کا ذکر ہے۔ پہلی بنیاد جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں ہے' دستوری اور آئینی نوعیت کی تھی کہ ایک اسلامی ریاست یا ایک اسلامی ہیئت اجتماعیہ یا ایک اسلامی معاشرہ پابند ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کا۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کا دائرہ وہ دائرہ ہے کہ مسلمان خواہ فرد ہو' خواہ معاشرہ ہو' خواہ پوری ملت اسلامیہ ہو' خواہ کوئی اسلامی ریاست ہو وہ اس دائرے کے اندر محدود رہے گا۔ اب اس دائرے کا ایک مرکز بھی ہے اور مرکزی شخصیت ہے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی میں جہاں اُس پہلی اصل کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے' وہ دستوری اور آئینی اصل ہے۔ وہاں دوسری بنیاد مرکزی نقطہ کی حیثیت کی حامل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دلی محبت ہو' حضورؐ سے عقیدت ہو' حضورؐ کا ادب و احترام ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ آپؐ کی توقیر و تعظیم ہو۔ گویا فی الجملہ ہر مسلمان کے دل میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپؐ کی تعظیم جاگزیں ہو۔

یہ درحقیقت وہ جذباتی بنیاد ہے جس سے ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب کا نقشہ بنتا ہے یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان میں صرف عقل و ذہانت (INTELLECT) ہی نہیں ہے بلکہ اس میں جذبات SENTIMENTS بھی ہیں۔ اور کسی بھی معاشرے میں جہاں اس کی عقلی اور فلسفیانہ اساسات کو اہمیت حاصل ہے وہاں جذبات کے لئے بھی کوئی مرکز ضروری ہے۔ اگر کسی کے ساتھ وہ جذباتی وابستگی نہیں ہے تو دل پھٹے رہیں گے' آپس میں بُعد رہے گا۔ اور ثقافت میں کوئی یک رنگی پیدا نہیں ہو سکے گی مسلمانوں میں کوئی تہذیبی و ثقافتی (CULTURAL HOMOGENITY) ہم آہنگی وجود میں نہیں آ سکے گی۔ یہ مطلوبہ متجانس کیفیت درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے ذریعے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ایک ہے اطاعت اور ایک ہے اتباع...... ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اطاعت نام ہے اس رویّہ کا کہ جو حکم ملے اُسے پورا کر دیا جائے..... اور یہ رویّہ تو اصل میں اس دستوری اور آئینی بنیاد کا جزو ہے جس پر ہم پچھلی

نشست میں گفتگو کر چکے ہیں۔ اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو عمل بھی اُس شخصیت سے منسوب ہو، جسے اللہ کا رسول مانا ہے، جس پر ایمان لایا گیا ہے، جس کی اللہ کے نبی ورسول کی حیثیت سے تصدیق کی گئی ہے، اب اس شخصیت کی نشست وبرخاست کا، اس کی گفتگو کا، اس کے رہن سہن کا، اس کی وضع قطع اس کی تہذیب اور اس کی پوری نجی و مجلسی زندگی کا جو بھی انداز ہو، اس پورے نقشے کو اپنے سیرت و کردار میں جذب کرنا، اِس رویّہ اور اس کیفیت کا نام دراصل اتباع ہے...... اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پھر یہ کہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے تمدن کے جو اصل خدوخال ہیں وہ درحقیقت اسی اتباعِ رسول ؐ سے وجود میں آئے ہیں..... یہ بات پیش نظر رہے کہ ہر معاشرے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے ایک خاص پس منظر میں کہا ہے کہ ؏ "خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انسان کی نظر" ..... تو آپ اسے چاہے انسان کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شمار کریں، لیکن یہ انسان کی عالمی (UNIVERSAL) کمزوری ہے کہ کوئی دل آویز اور دلنواز شخصیت ایسی ہو کہ اس سے محبت اور قلبی لگاؤ اگر ہے تو اُس معاشرے میں جو لوگ ہیں وہ پھر آپس میں ایک دوسرے سے قریب رہیں گے۔ ان کے دل کی دھڑکنوں میں ہم آہنگی ہوگی۔ انسان کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے قلبی لگاؤ کے لئے ایسی دل آویز اور دلنواز شخصیت موجود ہو جو معاشرے کی شیرازہ بندی میں نقطۂ ماسکہ کا کردار ادا کرے۔ اُسے آپ ہیرو کہیں، آپ اُسے کسی دوسرے اعلیٰ لقب سے پکاریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام معاشروں کو یہ ہیرو باقاعدہ گھڑنے پڑتے ہیں۔ یہ شخصیتیں تراشنی پڑتی ہیں اس لئے کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔ جذباتی وابستگی کے لئے ایک ایسا مرکز لازم ہے۔

کتنی بڑی خوش قسمتی ہے امتِ محمد کی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام.....) کہ یہاں کوئی مصنوعی شخصیت تراشنے اور گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے جیسا ابھی عرض کیا کہ دوسروں کو تو مصنوعی شخصیتیں گھڑنی پڑتی ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انہیں ایک نئی شخصیت کی ضرورت ہوگی۔ اس بات کی وضاحت کے لئے علامہ اقبال کا یہ مصرع بڑا پیارا ہے کہ ؏

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر

لیکن ہمارے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب، دلنواز، دلآویز، من موہنی شخصیت، معراجِ انسانیت پر فائز شخصیت...... جن ؐ کی سیرت و کردار پر کوئی دشمن بھی کہیں کوئی انگلی نہ

رکھ سکا انسانِ کامل، انسانی عظمت کا مظہرِ اتم شخصیت موجود ہے۔ یہ ہیں ہماری ملی تیرازہ بندی کے لئے مرکزی شخصیت۔ ان کے ساتھ دلی محبت، ان کا ادب، ان کی تعظیم، ان کا احترام، ان سے عقیدت۔ اگر اسلامی معاشرہ میں ان تمام امور کا جذبہ موجود رہے گا تو معاشرہ بنیانِ مرصوص بنا رہے گا۔ یہ وہ شخصیت ہیں کہ جن کے متعلق بالکل صحیح کہا ہے کسی شاعر نے کہ۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

یہ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ۔

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولھبی است

اب اگر ہم ان دونوں کو جمع کریں کہ ایک ہے ہماری ہیئت اجتماعیہ یا حیات ملی کے لئے دستوری، آئینی اور قانونی بنیاد..... تو وہ ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت۔ یہ تو گویا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے کے درمیان ہے ایک انتہائی دلنواز اور دلآویز شخصیت بقول شاعر ع۔ "نگہ بلند سخن دل نواز جاں پر سوز" ..... اس کے لئے اگر "مرکزِ ملت" کی اصطلاح اختیار کی جائے تو مجھے اعتراض نہیں۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمارا یہ مرکز دائم و قائم ہے۔ یہ کسی بھی دور میں بدلنے والا نہیں ہے بلکہ یہ تو ہمیشہ ہمیش کے لئے تا قیامِ قیامت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت ہے جو "مرکزِ ملت" کے مقام پر فائز رہے گی اور حضورؐ ہی کو معیارِ مطلق بنانا ہو گا..... مختلف مسلمان معاشروں اور مختلف مسلمان ملکوں میں یقیناً جب رہنما اور مصلح سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان سے محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہے۔ اگر ترکوں کے دلوں میں مصطفیٰ کمال کی عظمت ہے تو ٹھیک ہے وہ ان کے محسن تھے۔ اسی طرح پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں اگر قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم کی محبت ہے تو درست ہے۔ وہ ہمارے محسن ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اور جو ابدی معیار قائم و دائم رہے گا وہ شخصیت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اگر ہم نے اس معیار کو مجروح کر دیا تو یہ جان لیجئے کہ پھر مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی ایک اہم اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا وہ معیار ہے جو مستقل ہے، دائم و قائم ہے۔ یہ نہ صرف ہماری تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی (HOMOGENITY) کی ضمانت دیتا ہے۔ وضع قطع اور لباس کے حدود و قیود اور

نشست و برخاست کے انداز' یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے اتباع سے مسلمانوں میں' چاہے وہ مشرقِ بعید کے مسلمان ہوں' چاہے مغربِ بعید کے مسلمان ہوں' چاہے دنیا کے کسی خطے میں بسنے والے مسلمان ہوں' ان سب کے درمیان ایک مناسبت' ایک ہم رنگی' ایک یکسانیت پیدا ہوتی اور وجود میں آتی ہے...... بلکہ اس تہذیبی و ثقافتی ہم رنگی' ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ تہذیب و ثقافت کا ایک تسلسل و تواتر ہے جو چودہ سو سالوں سے جاری و ساری ہے۔ یہ اسی لئے ہے کہ وہ مرکزی شخصیت ہمیشہ ہمیش کے لئے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔

ان آیات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن میں کچھ بے احتیاطی ہوئی' جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بلند' ارفع و اعلیٰ مقام مجروح ہونے کا کچھ اندیشہ ہوا۔ کسی نے کبھی اپنی آواز کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سے کچھ بلند کر لیا فرمایا کہ مسلمانو! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ یہ وہ عمل ہے کہ تمہیں محسوس بھی نہیں ہوگا لیکن یہ اتنی بڑی گستاخی شمار ہوگی کہ تمہارے پچھلے کئے کرائے سارے کام حبط ہو جائیں گے۔ تمہاری ساری نیکیاں اکارت ہو جائیں گی۔ پھر مثبت انداز میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم اور اس کی افزائش کے لئے انہی کے دلوں کو جانچ کر پرکھ کر منتخب فرمالیا ہے کہ جو لوگ اپنی آوازوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے سامنے پست رکھتے ہیں۔ پھر یہ کہ کوئی باہر سے آیا۔ جیسے کتب سیر میں واقعہ ملتا ہے کہ بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے اور جیسا کہ عرب کا انداز اور وہاں کے بدوؤں کا ایک مزاج تھا۔ انہوں نے مسجد نبوی میں آکر پکارنا شروع کر دیا۔ یا محمد اخرج علینا "اے محمد' (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آیئے" اس پر ان کو ٹوک دیا گیا لیکن ساتھ ہی فرما دیا کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔ ان کی نیت میں خلل نہیں ہے۔ بس مزاج ہے اور وہ اکھڑپن جو ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے' اسی کا یہ ظہور ہے لہٰذا ٹوکنے کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ: وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ "اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا ہے" لیکن احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آیت نمبر ۶ میں جو بات آئی ہے' اس پر تو انشاء اللہ آئندہ نشست میں گفتگو ہوگی۔ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ پچھلی نشست میں میں نے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو تین موضوعات میں تقسیم اور معین کر کے بتائے تھے۔ تو چھٹی آیت کا ان معین موضوعات میں سے دوسرے موضوع سے تعلق ہے۔ لیکن آیات ۷ اور ۸ میں وہ اہم ترین بات آئی ہے جو

آج کی گفتگو سے متعلق ہے۔ فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ....
خوب اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مابین بلاشبہ جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت
ہے وہ اللہ کے رسول ہیں" ..... اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب ہیں
لیکن تمہیں آپؐ کی جو شان ہر آن ملحوظ رکھنی چاہئے وہ یہ حقیقت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ
وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ اب فرض کیجئے کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سمجھ کر کہ حضورؐ
میرے بھتیجے ہیں آپؐ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں جیسا ایک بڑا اپنے چھوٹے سے کرتا
ہے تو یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسول کی حیثیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا
فرمایا گیا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ط۔ "اور جان لو تمہارے مابین اللہ کے
رسول ہیں۔" انؐ کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اُمتی کو رسول کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اور وہ ہے
حضورؐ کا ادب، احترام، حضورؐ کی تعظیم و توقیر۔ اس کو ہر آن ملحوظ رکھو اس ضمن میں
صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ نقشہ خاص طور پر سامنے لایا گیا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں
ایمان کو راسخ کر دیا ہے، جاگزیں کر دیا ہے، اسے تمہارے دلوں میں کھُبا دیا ہے۔ تمہارے
دلوں کو ایمان سے مزین کر دیا ہے اور کفر سے اور فسق سے اور معصیت سے تمہیں طبعاً نفرت
ہو چکی ہے۔ اس اسلوب میں جہاں صحابہ کرامؓ کی مدح ہے، وہاں یہ ترغیب و تشویق کا بھی
انداز ہے کہ ذرا سی احتیاط اور ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضورؐ کی رسول اللہ ہونے کی
حیثیت کسی حال بھی نظرانداز نہ ہونے پائے۔

آخری بات یہ سامنے رکھئے کہ اس حکم پر ہم کیسے عمل کریں! اس کا تعلق ہم سے یہ ہے
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثابت شدہ سنتیں اور حضورؐ کی احادیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کی قائم مقام ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی معناً ہمارے مابین موجود ہیں، اس
لئے حضورؐ کی سنتیں آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ آج بھی
نصف النہار کے خورشید کی طرح درخشاں و تاباں ہے۔ ہمارے سامنے جب بھی کوئی بات
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آئے ہمیں اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے۔ اپنے فلسفے
چھانٹنے بند کر دینے چاہئیں۔ اپنی منطق کو پس پشت ڈال دینی چاہئے۔ اپنے "اقوال" پر تالا
ڈال دینا چاہئے۔ تحقیق تو ہو سکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی یا نہیں فرمائی
لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کی حدیث کے حوالے سے جب بات سامنے آئے تو زبان فوراً
بند ہو جائے۔ سر فوراً جھکا دیئے جائیں۔ بعد میں اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ روایت صحیح نہیں ہے

تو ٹھیک ہے اس پر اب عمل نہیں ہو گا۔ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات اگر سامنے آئے تو فوراً سر تسلیم خم کر دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے برعکس پھر بھی ہم اپنے فلسفے چھانٹیں اور اپنی منطق بگھاریں تو یہ وہ طرز عمل ہو جائے گا کہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ "مبادا تمہارے تمام اعمال اکارت ہو جائیں" وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ "اور تمہیں اس کا ادراک واحساس تک نہ ہو"۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اگر اس کے ضمن میں کوئی سوال یا اشکال ہو تو میں حاضر ہوں.....

سوال و جواب

سوال. نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہوتے ہوئے کسی اور کی رائے کو مقدم رکھنا کیا اتباع کے منافی نہیں ہے؟

جواب..... بہت عمدہ اور متعلق سوال ہے۔ اس کے ضمن میں جو بات جان لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ثابت شدہ فرمان کے ہوتے ہوئے کسی اور کی بات کو قبول کرنا یا اُسے مقدم رکھنا یقیناً اتباع کے منافی ہے۔ بلکہ یہ تو اطاعت کے بھی منافی رویّہ ہو جائے گا۔ لیکن اس میں کلام ہو سکتا ہے کہ آیا وہ فرمان حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ نہیں ہے۔ یا یہ کہ کسی موضوع پر حضورؐ سے دو تین اقوال منقول ہیں تو ان میں کون سا قول قوی تر ہے۔ اس کے ضمن میں کوئی گفتگو اگر ہے تو اس کی بنیاد پر فیصلہ کیا جائے تو یہ طرز عمل اس فتوے کی زد میں نہیں آئے گا۔

سوال..... ڈاکٹر صاحب! مختلف قوموں نے اپنے جو ہیروز گھڑے ہیں، وہ ان کی محبت میں حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اب ہماری محبت کا مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو حضورؐ کی محبت کی LIMITATION کیا ہو گی! اس میں ہم کس حد تک جا سکتے ہیں!

جواب...... یہ بھی بہت ہی عمدہ اور بڑا عملی سوال ہے۔ میں اس کے ضمن میں آپ کو شیخ ابن عربی کا ایک شعر سناتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔

الرب رب وان تنزل والعبد عبد وان ترقی

"رب، رب ہی رہتا ہے خواہ وہ کتنا ہی نزول اجلال فرمالے اور بندہ بندہ ہی رہتا ہے خواہ وہ کتنے ہی بلند مقام پر پہنچ جائے"۔

یہ جو فرق ہے کہ ایک مقام ہے اللہ کا اور ایک ہے مقام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس میں اگر فرق و تفاوت کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص شرک میں ملوث ہو جائے۔ لیکن الحمد للہ میں پورے اطمینان اور انشراح کے ساتھ یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ چودہ سو سال گزر جانے کے باوجود یہ اُمّت اللہ کے فضل و کرم سے اس طرح کی گمراہی سے بحیثیت مجموعی بچی ہوئی ہے۔ چنانچہ اگر ہم محبت و عقیدت کا معاملہ دیکھیں تو جتنی محبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیوں کو آنحضورؐ سے ہے۔ شاید اس کا عشر عشیر بھی دنیا میں کسی اور جگہ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن اس اُمّت نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے۔ ؎

با خدا دیوانہ باشد با محمدؐ ہوشیار

کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو الوہیت کی سطح پر نہ لے جایا جائے۔ الحمد للہ کہ یہ امت بحیثیت مجموعی اس نوع کی گمراہی سے تا حال محفوظ ہے اور انشاء اللہ العزیز تا قیامِ قیامت محفوظ رہے گی۔

حضرات! آج ہم نے مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کا ایک اہم اصول سورۃ الحجرات کی چند آیات کے مطالعے کے ذریعہ سے سمجھا یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مرکزی شخصیت سے محبت و عقیدت اور آپؐ کی توقیر و تعظیم اور آپؐ کا ادب و احترام اور آپؐ کے اتباع کی اہمیت ہمارے سامنے آئی۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح محبت، سچی محبت اور حضورؐ کے اتباع کا جذبہ پیدا فرما دے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

بقیہ: مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی شخصیت

ہم موافق ہیں اور ندوۃ المصنفین کا قائم رہنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے بہت ہی قریبی حلقے سے معلوم ہوا کہ مولانا افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد میں سے کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں نے اب تک کیا لکھا ہے، کیا لکھتا ہوں، میری کتابوں کے کیا کیا نام ہیں اور کون سی کتاب کس موضوع سے تعلق ہے بہرحال معاملہ کلیتہً اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی بہتر صورت پیدا فرما دے۔ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِکَ اَمْرًا۔

ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

خطاب جمعہ
ڈاکٹر اسرار احمد
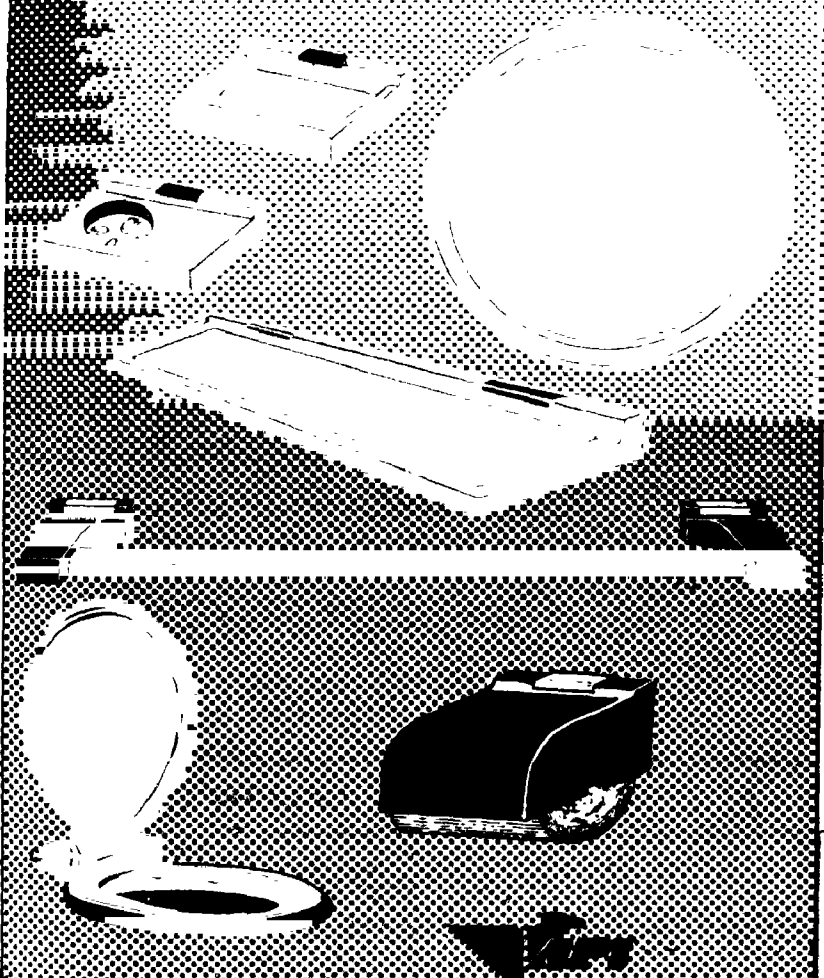
ایک پنتھ تین کاج

پاکستانی مسلمانوں کے دینی فرائض کا ایک نئے پہلو سے جائزہ

(ترتیب و تسوید: وقار احمد)

ماہ ستمبر میں طلبائے تنظیم اسلامی کے پہلے آل پاکستان کنونشن کے موقعہ پر امیر تنظیم اسلامی کا خطاب بعنوان "طلباء کے فرائض اور مسائل" جناح ہال لاہور میں ہوا تھا۔ اس کا تکمیلی بیان مسجد دارالسلام میں جمعہ کے خطاب میں ہوا۔

سب سے پہلے تو یہ اہم بات سمجھ لینی چاہئے کہ جہاں تک دینی فرائض کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے کسی طالب علم اور غیر طالب علم میں کچھ فرق نہیں ہے۔ دین میں اصل تقسیم جو معتبر ہے وہ ہے شعور اور بے شعوری کی تقسیم۔ جب تک کہ انسان شعور کی عمر تک نہیں پہنچا وہ دینی فرائض کا مکلف نہیں ہے لیکن جیسے ہی وہ شعور اور بلوغ کو پہنچ جائے تو تمام دینی فرائض اس پر بیک وقت اور بیک دم عائد ہو جاتے ہیں۔ جیسے نماز اور روزہ کی فرضیت عمل میں آتی ہے اسی طرح جملہ دینی فرائض شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد پوری طرح سے عائد ہو جاتے ہیں۔ فرائض دینی کے اعتبار سے ہمارے ہاں تصورات مختلف ہیں کچھ لوگ عبادات کو ہی کل دین جانتے ہیں اور کچھ اس سے وسیع اور بعض اس سے وسیع تر تصورات بھی موجود اور رائج ہیں۔ لیکن ایک اصولی بات سب کے نزدیک مسلم ہے کہ جو بھی دینی فرائض ہیں وہ ہر باشعور مسلمان پر عائد ہو جاتے ہیں، اس میں کوئی فرق اس سے واقع نہیں ہوتا کہ وہ ابھی کسی فن کی تحصیل میں یا علم حاصل کرنے میں منہمک ہے یا یہ کہ وہ عرف عام کے لحاظ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکا ہے اور ہمارے دین کے لحاظ سے تو طلبِ علم ایک ایسا مسلسل عمل ہے جو موت تک جاری رہتا ہے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید میں تلقین فرمایا گیا "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا" "پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما۔" اور حضورؐ نے فرمایا "اطلبوا العلم من المهد الى اللحد"

اس حدیث مبارکہ میں مہد کا ذکر بڑا ہی اہم ہے۔ جدید نفسیاتی تصور ہے کہ بچہ
پنگوڑے میں لیٹا ہوا بھی سیکھتا ہے۔ وہ اپنے حالات اور والدین سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتا ہے
اپنے ماحول میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے اس کا بھی بچہ تاثر (IMPRESSION) لے رہا ہوتا ہے۔ ا
علم حاصل کرنا تو مہد سے لے کر لحد تک کا ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اس طرح دینی فرائض
ادائیگی کے اعتبار سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ کوئی ابھی تعلیم حاصل کر رہا ہے یا یہ کہ جیسے
عرف عام میں کہتے ہیں کہ وہ اپنی عملی زندگی کا آغاز کر چکا ہے۔

محنت و مشقت انسان کا مقدر ہے...... اس حوالے سے دینی فرائض کا
تذکرہ رات کی مجلس میں ہوا تھا۔ یہ دینی فرائض ہمارے اکثر تنظیمی اجتماعات اور خطبات جمعہ
اہم موضوع رہے ہیں اور یہ موضوع مختلف عنوانات کے تحت اور مختلف مباحث کے ضمن میں
زیر بحث آتا رہا ہے۔ آج میں سورۃ البلد کی آیت نمبر ۴ کے حوالے سے جو سورۂ مبارکہ
مرکزی آیت بھی ہے، ہمارے دینی، ملی اور قومی فرائض کے موضوع پر ایک نئی ترتیب سے
اظہار خیال کروں گا۔ سورۃ البلد کی پہلی تین آیات وہ ہیں جن میں مختلف قسمیں کھائی گئی ہیں
اور چوتھی آیت میں وہ حقیقت بیان ہوئی ہے جس کے لئے قسمیں کھائی گئی ہیں یعنی لَقَدْ
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ "ہم نے انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔
"کبد" ایسی محنت و مشقت کو کہتے ہیں جس میں کچھ عنصر ELEMENT رنج و محن کا بھی
شامل ہو۔ ایک محنت تو وہ ہوتی ہے جو کرنے والے پر بار نہیں گزرتی، بلکہ بسا اوقات وہ خوشدلی
سے انجام دیتا ہے لیکن ایک وہ ہوتی ہے جس میں مشقت ہی مشقت ہو اور وہ اس کو جبراً کرنا پڑتی
ہو۔ لفظ مشقت کا مادہ "ش ق ق" ہے اور "شق" کہتے ہیں توڑ دینے کو، یعنی وہ انسان کی توڑ
پھوڑ کا سبب بن جاتی ہے اور اس میں رنج و الم کا عنصر بھی شامل ہو تو اس کا مجموعہ بنتا ہے
"کبد"۔ جیسے پہلے کئی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو مرتبہ
آتے ہیں اسی اہمیت کے لحاظ سے یہ موضوع بھی قرآن مجید میں آخری پارے کی ایک اور سورۃ
کا مرکزی مضمون ہے۔ سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ

"کدح" کہتے ہیں محنت و مشقت اور سعی و جہد کو۔ یعنی اے انسان تیرا مقدر یہی ہے کہ تجھے
مشقت پر مشقت جھیلنی ہوگی، یہاں تک کہ تو اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو جائے گا۔
ان دونوں آیات پر غور کرنے سے ایک تصور سامنے آتا ہے کہ ہر انسان کے لئے محنت

ر مشقت ہے اور اس کے لئے فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک بوجھ ہے اور اس بوجھ سے کوئی
ر دنوع بشر بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ ایک غریب آدمی بسا اوقات محسوس کرتا ہے کہ شاید امراء کے
لئے کوئی مشقت اور رنج نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سورۃ البلد کی اس آیت میں استشہاد
ر قسموں کے ساتھ جو عمومی قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے اس کے بعد انسانوں کی کسی قسم کو
شقتوں سے بری رکھنا ناممکن ہے۔ ہاں فرق کیفیت میں پایا جاتا ہے کہ کسی کے لئے جسمانی
محنت و مشقت زیادہ ہے اور کسی کے لئے ذہنی کوفت اور نفسیاتی کرب زیادہ ہے۔ چنانچہ ہمارا
مشاہدہ ہے کہ وہ شخص جس نے دن بھر کشتی چلائی ہو اور اینٹیں ڈھوئی ہوں وہ رات کو پر سکون
نیند سوتا ہے لیکن مرغن غذائیں کھانے والے اور ائر کنڈیشنڈ کمروں میں رات گزارنے والوں
میں بھی ایسے ہیں جنہیں نرم گدیلوں پر بھی نیند نہیں آتی اور انہیں مسکن اعصاب اور خواب
آور گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ نوعیت کا فرق تو ہے لیکن اس مشقت، الم اور رنج
——— سے مستثنیٰ کوئی نہیں ہے۔ غالبؔ نے جو بڑے حساس دل اور صاحب شعور
(شاعر) انسان تھے اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

بعض ذمہ داریوں کا احساس انسانی جبلت میں ہے..... انسان کے جملہ
فرائض اور ذمہ داریوں کی فہرست پر ایک نگاہ ڈالیں تو ان کی ایک تقسیم بڑی واضح نظر آتی ہے کہ
ایک طرح کے فرائض وہ ہیں جن کے لئے ایک زوردار داعیہ اور تقاضا (URGE) انسان کے
اندر سے ابھرتا ہے۔ ان فرائض کی بجا آوری کے لئے انسان کو نہ صرف یہ کہ کسی تلقین اور
نصیحت کی ضرورت نہیں بلکہ اس کا احسان بھی کسی پر نہیں جتلا سکتا۔ مثلاً انسان کے ساتھ پیٹ
لگا ہوا ہے جسے ہم معاش کے مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس پیٹ کو بھرنے کے لئے ہر شخص
از خود بھاگ دوڑ کر رہا ہے، معاشی جدوجہد میں لگا ہوا ہے اپنے اوقات اور اپنی صلاحیتیں خرچ کر
رہا ہے۔ اور اس معاملہ میں اسے کسی تلقین یا نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کو جدید
اصطلاح میں تحفظ ذات (PRESERVATION OF SPECIES) کی جبلت سے تعبیر کیا جاتا ہے
کہ اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے انسان اپنے ہاتھ پاؤں چلانے پر مجبور ہے۔ اسی طرح ایک
دوسرا بھرپور تقاضا جبلت انسانی میں جنسی جذبے کا ہے۔ یہی وہ زوردار داعیہ ہے جو انسان کو

شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں پڑنے پر مجبور کرتا ہے اور اس کے باوجود کہ انسان کو معلوم ہے
شادی کے بعد ذمہ داری کا بوجھ بہت بڑھ جاتا ہے اور پہلے اگر اسے صرف اپنا پیٹ پالنا تھا تو
وہ سارے کنبے کی کفالت کا ذمہ دار ہو گا وہ برضا و رغبت اس ذمہ داری کا بوجھ اپنے ..
ہے۔ جبلت انسانی کے اس داعیے کو جدید اصطلاح میں بقائے نسل (IIMAL
INSTINCT) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک تیسرا تقاضا جو انسان میں از خود ابھرتا
اور اس کے لئے بھی کسی وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ ہے کہ ہر انسان اپنا اور اپنے
کا سر چھپانے کے لئے کسی جھونپڑی یا مکان کا اہتمام کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے لئے
اسے شدید محنت کرنی پڑے' یہاں تک کہ قرضہ حاصل کرنا پڑے لیکن وہ مجبور ہے کہ
رین بسیرا اپنے لئے فراہم کرے..... یہ وہ تین ذمہ داریاں ہیں جن کا شدید تقاضا چونکہ ان
کے اندر سے ابھرتا ہے لہٰذا ان کے لئے کسی تلقین' وعظ یا نصیحت کی ضرورت نہیں۔ غور کر
پر معلوم ہو گا کہ ہماری نوے فیصد بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا ہدف یہی تین ذمہ دار
ہیں۔ بلکہ ہم جس قوم کے فرد ہیں اس کی اکثریت کی صد فیصد بھاگ دوڑ صرف انہی تین ذ
داریوں کی بجا آوری تک محدود ہے۔ ان سے زائد کسی ذمہ داری کے احساس اور شعور
ان کی زندگی یکسر خالی نظر آتی ہے۔ انہی تین طرح کی ضرورتوں کے لئے اس دور میں "رو
کپڑا اور مکان" کو عنوان بنایا گیا۔ اور یہ نعرہ لگانے کی دیر تھی کہ۔

کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو

کے مصداق تمام قوم اس پر ٹوٹ پڑی۔ اور اس ایک "ہو" نے ہمارے ملک کی سیاست کا جو نق
بنایا وہ ہم سب کو خوب معلوم ہے۔ اس نعرہ میں بظاہر جنسی تقاضے کا ذکر نہیں ہے لیکن
کرنے سے ایک عجیب حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں ازواج کو ایک دوسرے کے
بمنزلہ لباس قرار دیا گیا ہے: هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ○

اور اس طرح یہ نعرہ بعینہٖ انسان کی بنیادی ضرورتوں کا حامل بن جاتا ہے۔
انسان اپنی ان تین طرح کی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ایسے ایسے دکھ' تکلیفیں اور
مشقتیں جھیلتا ہے کہ جب اس کا مشاہدہ کوئی حساس دل انسان کرتا ہے تو تڑپ جاتا ہے۔ کو
شخص مئی اور جون کے مہینے کی شدید دھوپ میں اور زمین سے نکلتی ہوئی بھڑاس میں دن بھر کا

کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے لئے روٹی میسر کرتا ہے۔ کوئی ماں اپنی ممتا کے تقاضے کے تحت لمبی لائن میں کھڑی ہو کر اپنے بیمار بچے کے لئے دوا حاصل کرنے میں جس اذیت سے دوچار ہے اس کا احسان وہ کسی پر جتا نہیں سکتی۔ یہ سب اذیتیں جھیلنا اللہ تعالیٰ نے انسان کے مقدر میں رکھ دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ

اور انسان ان مشقتوں کا عادی ہو جاتا ہے۔ بقول غالب ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

ان ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے اعتبار سے انسان کا معاملہ کولہو کے بیل اور باربرداری کے اونٹ سے کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ انسان کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ اس لئے کہ جانوروں میں وہ احساسات نہیں پائے جاتے جن کا واسطہ انسان کو پڑتا ہے۔ کوئی بھی جانور اپنے بچے کی پیدائش کے بعد بہت ہی کم عرصے کے لئے اس سے متعلق رہتا ہے اور اس کے بعد ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں رہتا۔ لیکن انسانوں میں تو بچوں کا معاملہ سوہانِ روح بن کر رہ جاتا ہے۔ جس اولاد کے لئے والدین اپنی راتوں کی نیندیں حرام کرتے ہیں اور جس کے لئے اپنے آپکو ہمہ تن INVEST کر دیتے ہیں وہی اولاد ان کے لئے بڑھاپے میں سوہانِ روح بن سکتی ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے فَلَا تُعْجِبْکَ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (پس آپ تعجب نہ کیجئے ان کے مال اور اولاد سے۔ اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ اُن کو عذاب میں رکھے ان کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں..... التوبۃ: ۵۵) پھر سب سے بڑھ کر یہ اس کے رنج و غم اسی دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں، بلکہ مرنے کے بعد رب کے حضور حاضری اور مسئولیت بھی ہے! غرض انسان کا معاملہ حیوانات سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

بعض ذمہ داریاں جن کا تعلق انسان کے فہم و شعور سے ہے

ان تین ذمہ داریوں کے علاوہ ہر انسان کی تین ہی ذمہ داریاں ایسی ہیں جن کے لئے انسانی

جبلت میں کوئی زوردار داعیہ موجود نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق انسان کے فہم اور شعور سے ہے۔ ان کے ضمن میں ضرورت پیش آتی ہے کہ انسان کو بار بار یاد کرایا جاتا رہے، توجہ دلائی جاتی رہے اور تذکیر کرائی جاتی رہے، مبادا انہیں بھول جائے یا ان سے غافل ہو جائے۔

ملک و وطن کی آزادی اور تحفظ کا فکر............ ان تین میں سے پہلی ذمہ داری کا تعلق انسان کے ملک و وطن سے ہے۔ اپنے وطن کی عزت، وقار، آزادی اور تحفظ کا احساس اگر وطن کے رہنے والوں کو نہیں ہو گا اور اس کے لئے اپنی توانائیوں اور اوقات کا ایک حصہ مختص نہیں کریں گے۔ تو گویا وہ شاخِ آشیاں ہی ہر دم خطرے سے دوچار رہے گی، جس پر ان کا اور ان کی آل اولاد کا بسیرا ہے اور جس سے ان کا مستقبل وابستہ ہے ۔

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

اگر ہمارے غور و فکر اور ہماری بھاگ دوڑ کا ہدف صرف وہی تین چیزیں ہوں جن کا تعلق انسانی جبلت سے ہے تو وطن کی فکر کون کرے گا۔

قوم سے محبت اور وفاداری............ دوسری ذمہ داری ہر انسان پر اُس قوم کے حوالے سے عائد ہوتی ہے جس کا وہ فرد ہے۔ اپنی قوم کے لئے اگر اس کی صلاحیتوں اور اوقات کا ایک حصہ وقف نہیں ہے تو بات وہی ہو کر رہے جس کا نقشہ حالی نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ۔

تن آسانیاں چاہئیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام کے لئے اگر کوئی دوسرا بلند نصب العین نہیں ہے تو کم از کم اپنی قوم سے محبت اور اس سے وفاداری اور ملک و قوم کے مفادات کی خاطر اپنے ذاتی مفاد قربان کرنے کا جذبہ ان میں موجود ہے اور اسی کے باعث ان اقوام کا شمار دنیا کی باعزت اور باوقار قوموں میں ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا حال یہ ہو چکا ہے کہ نہ قوم سے محبت نہ وطن سے جذباتی لگاؤ۔ ہماری ۹۹ فیصد آبادی محض اپنے مفادات کے بارے میں سوچتی ہے اور انہی کے لئے بھاگ دوڑ کرتی ہے۔ قومی مسائل کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی ان کے پاس نہیں ہے۔

دین کی سربلندی کے لئے جہد و کوشش............ تیسری ذمہ داری او

ب سے اہم فریضہ جس کا تعلق انسان کے فہم و شعور سے ہے' دین و مذہب کی جانب سے ہر انسان پر عائد ہوتی ہے۔ دین اپنی جگہ خواہ صد فیصد حق ہو از خود غالب نہیں ہوا کرتا۔ دین کے ماننے والے ہی اسے سربلند کرنے یا پامال کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اگر دین پہلے سربلند تھا تو صحابہ کرام کی جان فروشیوں اور قربانیوں کی وجہ سے سربلند تھا اور آج اگر مغلوب اور سرنگوں ہے تو ہماری نا اہلی اور ہماری غفلت کی وجہ سے ہے۔ اس صدی کے آغاز میں ایک صاحبِ شعور شخص نے اس امت کی زبوں حالی پر بڑا دردناک مرثیہ کہا تھا ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے ! اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے !

اب ظاہر بات ہے کہ دین کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کی بازیافت کے لئے پھر محنت درکار ہو گی قربانیاں دینی ہوں گی اور اپنے اوقات اور صلاحیتوں کا ایک قابل ذکر حصہ اس کام میں لگانا ہو گا۔ بصورت دیگر اگر ہم انہی تین جبلی تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل میں لگے رہے تو دین کی سربلندی اور غلبے کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔

ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی' سب سے بڑی بدقسمتی کیونکر بنی؟

.... ان تین ذمہ داریوں کو جو انسان کے ملک' اس کی قوم اور اس کے دین و مذہب کی جانب سے اس پر عائد ہوتی ہیں اور جن کا تعلق انسان کے فہم اور شعور سے ہے ذہن میں رکھ کر اس نکتے پر غور کریں کہ ہم روئے زمین کی وہ خوش قسمت ترین قوم تھے' جن کے لئے یہ تینوں تقاضے ایک وحدت کی صورت اختیار کر گئے تھے اور بلاشبہ یہ بہت بڑی خوش بختی کی بات ہے کہ کسی شخص کے لئے یہ موقع ہو کہ اس کے لئے کسی ایک ذمہ داری کو ادا کرنا تینوں ذمہ داریوں کی ادائیگی کا قائمقام بن جائے۔ گویا ایک تیر سے تین شکار کرنا ممکن ہو جائے !!

اس بات کو ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہو گا۔ سب سے پہلے اس ذمہ داری کا تعین کیجئے جو ہمارے ملک پاکستان کی جانب سے ہم پر عائد ہوتی ہے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے' جس کا اظہار میں بار بار کر چکا ہوں اور اپنی کتاب استحکام پاکستان میں محکم دلائل سے یہ ثابت کر چکا ہوں کہ اسلام ہی ہمارے ملک کی واحد بنیاد اور اساس ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے معاملے کی مانند جو اپنی ولدیت اسلام بتایا کرتے تھے پاکستان کی ولدیت بھی صرف اور صرف

اسلام ہے۔ پوری دنیا میں یہ واحد ملک ہے جس کے لئے وجہ جواز سوائے اسلام کے اور کوئی نہیں۔ اور اگرچہ یہ ملک پاکستان اپنی جغرافیائی حدود بھی رکھتا ہے اور اس بنیاد پر کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ وطنی قومیت اس ملک کو سہارا دے سکتی ہے، لیکن ہم اسے اس ملک کی اساس اس لئے قرار نہیں دے سکتے کہ وطنی قومیت کی پرزور تردید پر ہم نے یہ ملک حاصل کیا تھا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور ساقی نے بنائی روش لطف و ستم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

لہٰذا وطنی قومیت کو ہرگز اس ملک کی بقاو استحکام کے لئے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح تاریخی اور جغرافیائی عوامل بھی اس کی پشت پر نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس ملک کی بقاو استحکام اگر مطلوب ہے تو اس کا واحد مؤثر ذریعہ یہ ہے کہ یہاں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے اور دین کو بالفعل نافذ و غالب کیا جائے۔

آگے چلئے، ہماری قومیت کا معاملہ بھی دنیا کی دیگر اقوام سے منفرد ہے۔ بقول اقبال ؎

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ہم نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہونے کے ناطے سے ایک عالم گیر قوم کے فرد ہیں۔ یہ درست ہے کہ پاکستان ہمارا وطن ہے، لیکن ہماری قومیت صرف اور صرف اسلام ہے۔ مسلمان خواہ مشرق بعید کا ہو یا مغرب بعید کا بحیثیت مسلمان ایک ملت اور ایک قوم کا فرد ہے۔ چنانچہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جب ہم نے مذہبی قومیت کے نام کا نعرہ لگایا اور اس کی بنیاد پر ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تو بڑی سے بڑی قوت بھی مسلمانان برصغیر کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور بالکل معجزاتی طور پر پاکستان وجود میں آ گیا۔

معلوم ہوا کہ ہماری قومیت بھی صرف اور صرف اسلام ہے اور اگر ہم دین اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں تو گویا ہمارے قومی تقاضے بھی از خود پورے ہوتے ہیں اور جہاں تک تیسری ذمہ داری کا تعلق ہے، جو دین و مذہب کی جانب سے ہم پر عائد ہوتی ہے تو سیدھی سی بات ہے کہ ہمارا دین و مذہب تو ہے ہی اسلام۔ دیکھئے! ہمارے لئے تینوں

ذمہ داریاں ایک وحدت کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔ صرف دین کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریوں اور فرائض کی ادائیگی پر ملک و وطن کے فرائض سے بھی ہم عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں اور قوم و ملت کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داریوں کی ادائیگی بھی ہمارے لئے ممکن ہو جاتی ہے۔ ..... اسلام کو مستحکم کرنے سے ملک بھی مستحکم ہوتا ہے اور ہماری قوم و ملت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ کیا اس سے بڑی خوش قسمتی کا تصور کیا جا سکتا ہے! تقابل کے لئے ذرا اپنے ان مسلمان بھائیوں کی ذہنی کشمکش کو تصور میں لائیے' جو ہندوستان میں آباد ہیں۔ ملک و وطن کے تقاضے انہیں ایک جانب کھینچتے ہیں تو دین و مذہب کے تقاضے دوسری جانب۔ خاص طور پر وہ مسلمان جو ہندوستان میں کسی عہدے یا منصب پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنے ملک سے وفاداری کا حلف اٹھاتے ہیں۔ اس حلف اور عہد کے تقاضے اور دین و مذہب کے تقاضے بالعموم بالکل متضاد ہوتے ہیں لیکن انتہائی افسوس اور رنج کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ ہم نے اپنی اس سب سے بڑی خوش قسمتی کو اسلام سے روگردانی کے باعث سب سے بڑی بدقسمتی میں تبدیل کر دیا۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں چالیس سال سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی اسلام جس کسمپرسی کے عالم میں ہے وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اس انحراف اور روگردانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھی کمزور پڑتے پڑتے دولخت ہو گیا اور پاکستانی قوم بھی مضبوط ہونے کی بجائے قومیتوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی۔ ابھی تک چار قومیتوں کے راگ الاپے جاتے تھے اب ایک پانچویں قومیت بھی سر اٹھا چکی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اسلام سے روگردانی کا منطقی نتیجہ یہی تھا' جو ہمارے سامنے آیا ہے۔ اس لئے کہ اگر اسلام اس ملک میں مضبوط ہوتا اور یہاں کے رہنے والوں کی وابستگی اسی کے ساتھ مستحکم ہوتی تو ملک بھی مضبوط ہوتا اور قوم بھی توانا ہوتی دیگر مسلمان ملک اگر اسلام سے انحراف کرتے ہیں تب بھی اس دنیا میں اپنی بقاء اور استحکام کے لئے ان کے لئے دوسرے سہارے موجود ہیں۔ کسی کو وطنی قومیت سہارا دے سکتی ہے تو کسی کے لئے لسانی قومیت سہارا بن سکتی ہے۔ لیکن مسلمانان پاکستان کے لئے اسلام کے سوا کوئی دوسرا سہارا موجود نہیں اور یہ وہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہر گزرنے والا لمحہ اس صداقت کو مزید محکم کر رہا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگر پاکستان کی سالمیت اور اس کا استحکام مطلوب ہے تو اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ اس ملک میں اسلام کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے اور دین کی جانب سے جو

ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کی ادائیگی پر ہر شخص کمربستہ ہو جائے۔ اسی سے ملک بھی مستحکم ہو گا اور پاکستانی قوم بھی ایک مضبوط قوم بن کر اقوام عالم میں ابھرے گی۔

ہمارے دینی فرائض اور ان کے مدارج

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ دین کی جانب سے ہم پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تین کے ہندسے کے حوالے سے ذہن نشین کر لیجئے کہ ہماری دینی ذمہ داریاں بھی تین ہی ہیں:

(۱) عبادت رب ..... یعنی خود اللہ کا بندہ بننا' اللہ کا مطیع بننا اور خود اسلام پر پوری طرح عمل پیرا ہونا۔ یہ پہلی ذمہ داری بھی کچھ آسان نہیں ہے۔ اس کے بارے میں اقبال نے کہا ہے ۔

چومی گویم مسلمانم بہ لرزم   کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ ر

اس مرحلے پر تین جہاد کرنے پڑتے ہیں۔

۱۔ نفسِ امّارہ سے جہاد..... ہمارے اندر موجود حیوانی داعیات (ANIMAL INSTINCTS) اندھے بہرے ہیں اور اپنی تسکین چاہتے ہیں۔ انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے۔ شدید بھوک لگی ہوئی ہو تو پیٹ یہ چاہتا ہے کہ اسے بھرا جائے' خواہ حلال سے' خواہ حرام سے۔ اسی طرح جب جنسی تقاضا ابھرتا ہے تو وہ اپنی تسکین چاہتا ہے' اسے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ جائز ذریعے سے ہو یا ناجائز ذریعے سے۔ لہٰذا سب سے پہلے اپنے اندر سے کشمکش کرنی ہو گی اور نفس کو اپنے تابع کرنا ہو گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ المجاهد من جاهد نفسه۔ "مجاہد تو ہے ہی وہ جو اپنے نفس سے جہاد کرے"۔ ایک حدیث کے الفاظ ہیں۔ ليس الشديد بالصرعة انما الشديد الذی يملک نفسه عند الغضب۔ "کسی کو کشتی میں پچھاڑ دینے والا پہلوان نہیں ہے' پہلوان تو دراصل وہ ہے جو غصے کی حالت میں اپنے نفس پر قابو رکھے"۔ حضورؐ سے پوچھا گیا۔ ای الجهاد افضل یا رسول الله؟ "اے اللہ کے رسولؐ! سب سے افضل جہاد کونسا ہے؟" فرمایا۔ ان تجاهد نفسک فی طاعة الله۔ "یہ کہ تم اپنے نفس سے جہاد کر کے اُسے اللہ کا مطیع بناؤ!"۔

۲۔ شیطان لعین سے جہاد........... شیطانِ لعین نفسِ انسانی میں پھونکیں مارتا رہتا

ہے اور اس کے حیوانی داعیات کو مشتعل کرتا رہتا ہے' لہٰذا نفس سے جہاد کے ساتھ ساتھ
یطان لعین سے جہاد بھی ضروری ہے۔
ا۔ بگڑے ہوئے معاشرے سے جہاد .... نفس اور شیطان سے جہاد کے
اوہ اپنے بگڑے ہوئے ماحول اور معاشرے کے ساتھ بھی کشمکش کرنا ہوگی' اس لئے کہ
اشرے کا رخ اور ہے' اس کی اقدار (VALUES) اور ہیں' اس کی پسند اور ناپسند کے
یارات اور ہیں۔ چنانچہ جب تک اس کے ساتھ کشمکش نہ ہوگی آپ خود مسلمان نہیں بن
تے۔ آپ کو ؏ "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ ستیز!" کی روش اختیار کرنا ہوگی۔ اگرچہ
لت اور عافیت کا راستہ ؏ "زمانہ باتو نہ سازد تو بازمانہ بساز!" والا ہے' لیکن صاحبِ ہمت
صاحبِ عزیمت لوگ پہلا راستہ اختیار کرتے ہیں اور زمانہ ان کی موافقت نہ کرے تو وہ خود
نے کے ریلے کے ساتھ بہنے کی بجائے مزاحمت کرتے ہیں اور اس سے جنگ کرتے ہیں۔
۔ دعوت و تبلیغ .... ہماری دوسری دینی ذمہ داری یہ ہے کہ دین کی تبلیغ اور
ت میں بھرپور حصہ لیں اور اسے دوسروں تک اس طرح پہنچائیں کہ ابلاغ کا حق ادا ہو
ۓ اور حجت قائم ہو جائے۔ اس کی بھی تین سطحیں ہیں اور یہاں بھی ہر سطح پر مجاہدہ کرنا ہو

معاشرے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اور ذہین اقلیت (INTELLECTUAL
MINORI) تک دین کا پیغام پہنچانا۔ ان کے لئے تبلیغ کا انداز کچھ اور ہوگا۔ یہاں
اپیل کی بجائے عقلی دلیل سے کام لینا ہوگا۔ انہیں وعظ و نصیحت کی بجائے حکمت سے
کرنا ہوگا' لیکن اس کے لئے پہلے دنیا کے فلسفوں اور ان کی حکمت کو سمجھنا ہوگا اور پھر
اور حکمت قرآنی کو سمجھ کر دلائل و براہین کے ساتھ ان فلسفوں کا ابطال کرنا ہوگا۔
یک زمانے میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے ایک شعر کہا تھا ؎

زمیں' یہ فضا کی رقاصہ آدمِ نو کے انتظار میں ہے

نعیم صدیقی صاحب نے ایک بڑا عمدہ شعر کہا تھا ؎

ہیں فلسفے زمانے کے آدمِ نو کو یہ نہ پال سکے!

دنیا میں یہ جو فلسفے ہیں یہ "آدمِ نو" کو تو وجود میں نہیں لا سکتے۔ اس "آدمِ نو" کو وجود
نے کے لئے قرآن کی حکمت درکار ہے۔ اور اس حکمت کو دنیا کے سامنے پیش کرنے

کے لئے پہلے خود اس سے سیراب ہونے اور اپنے قلوب و اذہان کو اس سے منور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے اپنے وقت' اپنی صلاحیتوں' اپنی قوتوں اور اپنی امنگوں کی قربانی دینی ہوگی۔ کچھ باصلاحیت ذہین نوجوان اپنے اعلیٰ ترین کیریئرز کو قربان کر کے اس میں لگ جائیں اور گھٹنے ٹیک دیں کہ "جاایں جااست" تب ہی یہ کام ہو سکتا ہے' از خود تو نہیں ہو سکتا۔

۲۔ دعوت و تبلیغ کی دوسری سطح عوامی سطح پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ یعنی معاشرے کے عام افراد کو ایک اصلاحی انداز میں مواعظِ حسنہ کے ذریعے بھلائی کی طرف بلانا اور انہیں برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کرنا۔

۳۔ دین کی دعوت و اشاعت کی تیسری سطح ایسے گمراہ فرقوں اور باطل مذاہب کے نظریات و افکار کا رد ہے جو اسلام کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آپ خلاء میں کام نہیں کر رہے بلکہ آپ کی دعوت و تبلیغ دین کے مقابلے میں کئی قسم کی قوتیں بر سرپیکار ہوں گی اور آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کریں گی۔ یہاں جدید نظریاتی قوتیں بھی ہیں اور قدیم مذہبی انداز کے فتنے بھی' جو اسلام کے پورے نظامِ فکر کو اندر سے کھوکھلا کرنے کے درپے ہیں۔ ان قوتوں کا مقابلہ علمی میدان میں کرنا ہوگا اور ان کو مناظروں اور مجادلوں سے شکست دینا ہوگی۔

دعوت و تبلیغ کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف سطحیں اور مختلف درجات ہیں۔ مذکورہ بالا تین سطحیں قرآن حکیم کی اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہوئی ہیں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ (النحل : ۱۲۵)

"اے نبیؐ! آپؐ اپنے رب کے راستے کی طرف بلایئے حکمت و دانائی کے ساتھ اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے اور اُن کے ساتھ ایسے طریقے پر بحث کیجئے جو سب سے بہتر ہو"۔

۴۔ **اقامتِ دین**.......... دین کی جانب سے ہم پر تیسری ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ دین کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو بالفعل قائم کریں۔ یہ ہمارے دینی فرائض کی بلند ترین منزل ہے۔ "اقامتِ دین" اور "اظہارِ دین" کی قرآنی اصطلاحات اسی ذمے داری کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں۔ اس سطح پر اُن استحصالی قوتوں کے خلاف جدوجہد اور پنجہ آزمائی

ناہوگی ، جولوگوں کو ظلم واستحصال کا نشانہ بنا کر اُن کے حقوق کو غصب کرتی ہیں اور دنیا میں
م نظام ہائے باطل کا تحفظ کرتی ہیں۔ اُن باطل نظاموں کی بیخ کنی کر کے اُس نظامِ برحق کو
م و نافذ کرنے کی جہد و کوشش کرنا جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دینِ حق کی صورت میں عطا فرمایا
، ہمارے دینی فرائض کا جزو لازم ہے۔ اس عادلانہ نظام کے عطا کرنے والے کی اپنی شان
"قَائِمًا بِالْقِسْطِ" ہے اور اس نے ہمیں بھی بایں طور پکارا ہے۔
یُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ (النساء) اور
وْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدۃ)
ں نظامِ عدل و قسط کے قیام کے لئے ہی اللہ نے اپنے رسولوں کو بھیجا اور کتابیں نازل فرمائیں۔
رۃ الحدید میں رسولوں کی بعثت اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارنے کا مقصد ہی یہ بیان
مایا گیا کہ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔
نانچہ ہمیں اس نظامِ عدل اجتماعی کے نفاذ اور اُس دینِ حق کے غلبے کے لئے تن من دھن لگانا
گا۔

اس مرحلے پر تصادم کی صورت محض نظریاتی نہیں ، بلکہ عملی ہوگی۔ یہاں طاقت طاقت
ے ٹکرائے گی۔ اور اس ٹکراؤ کے لئے پہلے طاقت فراہم کرنی ہوگی : وَاَعِدُّوْا لَهُمْ
مَا اسْتَطَعْتُمْ اور اس سلسلے میں ہتھیاروں کی طاقت سے بھی زیادہ ضروری انسانوں کی
طاقت ہے۔ ؏ انسانم آرزوست!
یہاں ایسی افرادی قوت کی ضرورت ہے جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ گہری وابستگی
اور وفاداری موجود ہو۔ یہ لوگ اپنے وجود سے حق کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ ؏ دے تو
بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی!
اس ضمن میں اقبالؔ کے دو اشعار کے بغیر یہ بحث تشنہ رہے گی ؎

مقامِ بندگی دیگر، مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ میخواہی، ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اللہ چاہتا ہے کہ اس جریدۂ عالم پر اہلِ ایمان اپنے خون سے اس کی توحید کی شہادت ثبت کریں ،
اور اس کے نظامِ عدل کی گواہی قولاً و عملاً قائم کریں۔ اس مرحلے کی بھی تین سطحیں ہیں۔

۱۔ صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) جب تک اسلام سے گہری وابستگی رکھنے والے افراد کی ایسی منظم جمعیت فراہم نہیں ہو جاتی کہ نظامِ باطل سے کھلم کھلا تصادم مول لیا جا سکے اس وقت تک "صبرِ محض" کے اصول پر عمل پیرا رہنا ہو گا۔ گویا اس دوران تصادم یکطرفہ ہو گا۔ نظامِ باطل کے پاسبانوں کی طرف سے بھرپور تشدد کیا جائے گا' ہر طرح کی سختی کی جائے گی' لیکن جواب میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ ہو گی' بلکہ ہر طرح کی سختی کا جواب صبر استقامت سے دیا جائے گا۔ مکی دور میں یہی "صبرِ محض" کا اصول پیشِ نظر تھا کہ حضرت بلالؓ کو مکہ کی گلیوں میں گھسیٹا جا رہا تھا اور حضرت خبابؓ بن الارت کو دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جا رہا تھا لیکن ان کو جھیلنے اور برداشت کرنے کی ہدایت تھی اور کسی جوابی اقدام کی اجازت نہ تھی۔ حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ "اصبروا یا آل یاسر فان موعدکم الجنۃ" کی ہدایت پر کاربند رہتے ہوئے سختیاں جھیلتے جھیلتے جامِ شہادت نوش کر گئے' لیکن مسلمانوں کو ان کے خون کا انتقام لینے کی اجازت نہ تھی۔

۲۔ اقدام (ACTIVE RESISTANCE) اقامتِ دین کی جدوجہد "صبرِ محض" کے کٹھن مرحلے سے گزر کر آخر کار "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہو گی۔ جب اتنی قوت فراہم ہو جائے کہ باطل نظام کو چیلنج کرنا ممکن ہو تو اس نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ کر اسے للکارا جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی جدّوجہد "اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا" کے فرمانِ الٰہی کے ساتھ "اقدام" کے مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ موجودہ دور میں "اقدام" کا انداز یہ ہو گا کہ منکرات کو چیلنج کیا جائے گا۔ جو کام شریعتِ اسلامی میں حرام ہیں اُن کے بارے میں دوٹوک اعلان کیا جائے گا کہ یہ ہمارے جیتے جی نہیں ہو سکیں گے۔ منکرات و فواحش کو رکوانے کے لئے مظاہروں' گھیراؤ اور پکٹنگ (PICKETING) کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ یہ کام وہی لوگ کر سکیں گے جو راہِ حق میں جان قربان کر دینے کے آرزومند ہوں۔ نظامِ باطل کو للکارنے سے جس تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا اس کے مقابلے میں ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ لاٹھی اور گولی کے باوجود قدم آگے بڑھانے ہوں گے' پیچھے نہیں ہٹنا ہو گا۔ سینوں پر گولیاں کھانی ہوں گی' گلیوں میں بھاگتے ہوئے پیٹھوں پر نہیں۔ توڑ پھوڑ اور ہنگامہ آرائی سے بالکلیہ اجتناب برتنا ہو گا۔ سٹریٹ لائٹس اور نیون سائنز کو توڑنا اور بسوں اور عمارتوں کو نذرِ آتش کرنا اسلام کا راستہ ہرگز نہیں۔ اس جدوجہد کی مثال ایرانی انقلاب کی شکل میں ہمارے سامنے ہے کہ لوگوں نے

استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قربانیاں دیں' سینوں پر گولیاں کھائیں' جان کے نذرانے پیش کئے' ساوک کے بھیڑیوں نے ان کی ہڈیاں توڑ ڈالیں لیکن انہوں نے توڑ پھوڑ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ گولیوں کی بوچھاڑیں بھی ان کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اڑھائی ہزار سالہ عظمت کی بازیافت کا خواب دیکھنے والے شہنشاہ آریہ مہر کو اپنا تخت و تاج چھوڑ کر بھاگتے بنی اور ؎

دو گز زمیں بھی مل نہ سکی کوئے یار میں!

لیکن اس مرحلے کے لئے معیار مطلوب کی حامل منظم جمعیت اور اس راہ میں جان نچھاور کرنے کی شدید تمنا ازبس ضروری ہے۔ یہ وہ آرزو ہے کہ جس کا اظہار خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمایا:

لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا..... "میری شدید آرزو ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں........ " حضورؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص اس حال میں مرجائے کہ نہ اس نے کبھی اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی تمنا پیدا ہوئی ہو تو اس کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہوئی۔ چنانچہ اگر دین کے لئے ایثار و قربانی کا شدید داعیہ موجود نہ ہو اور اس راہ میں جان نچھاور کرنے کی شدید تمنا دل میں نہ ہو تو یہ منزل سر نہیں کی جا سکتی۔

۴۔ مسلح تصادم (ARMED CONFLICT)........ اقدام کے مرحلے کے بعد اقامتِ دین کی جدوجہد کو "مسلح تصادم" کا مرحلہ پیش آ سکتا ہے۔ یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور قوت و طاقت کے استعمال سے باطل کی بیخ کنی کی جائے۔ آنحضورؐ کی انقلابی جدوجہد میں ہمیں یہ مرحلہ بدر و حنین وغیرہ کے معرکوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بحالات موجودہ تو یہ مرحلہ یکسر خارج از بحث نظر آتا ہے' تاہم اس کے امکان کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ہر صاحب شعور مسلمان پر دین کی طرف سے یہ تین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک پھر تین میں منقسم ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں طالب علم اور غیر طالب علم کے مابین کوئی فرق و تفاوت نہیں۔ طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمارے کوئی الگ مسائل نہیں ہیں۔ جو مسئلہ اس قوم کا ہے وہی طالب علموں کا مسئلہ ہے۔ یہ کمیونسٹ طریق کار ہے کہ

(باقی ص ۴۵ پر)

(قسط: ۲)

حقیقتِ جہاد

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر

اب آیئے اس بحث کی طرف کہ جہاد کے مراحل اور مراتب کیا ہیں؟ اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے؟ اس کی پہلی منزل کون سی ہے؟ دوسری منزل کیا ہے؟ کوئی تیسری منزل بھی ہے تو کون سی ہے؟ اور اس کی چوٹی کیا ہے؟ اگر یہ سارا تصور واضح نہ ہو تو انسان غلط جگہ پر اور غلط طریقے پر اپنی محنت صرف کرے گا اور وہ محنت اکارت جائے گی۔ آپ اس راستے میں جان اور مال تو کھپا رہے ہیں لیکن اس جدوجہد کی ترتیب آپ کے ذہن میں نہیں ہے' اس کے مراحل میں جو تقدیم اور تاخیر ملحوظ رکھنی ضروری ہے اس کا فہم نہیں ہے' چھلانگ مار کر چوتھی منزل پر چڑھنے کی کوشش ہو رہی ہے' قدم بقدم آگے چلنے کا شعور نہیں ہے تو محنتیں اکارت جائیں گی' کوششیں بار آور نہیں ہوں گی۔ البتہ ایک فرق ذہن میں رکھئے کہ یہ وہ میدان ہے کہ اس میں اگر کوئی شخص کسی مغالطے یا غلط فہمی کی بنا پر غلط طریقے پر کام کر رہا ہے' لیکن وہ اپنی جدوجہد میں مخلص ہے اور خالصۃً اللہ اور اس کے دین کے لئے کام کر رہا ہے تو اگرچہ دنیا میں اس کی محنت و کوشش نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو گی اور رائیگاں اور اکارت جائے گی لیکن آخرت میں اس کا اجر اس کے رب کے پاس محفوظ ہے۔

مجاہدہ مع النفس

جہاد کے مراتب کو سمجھنے کے لئے ایک تین منزلہ عمارت کی تشبیہ ذہن میں رکھئے' جس کی بنیاد زیرِ زمین ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ نگاہوں کے سامنے تو تین منزلیں ہیں۔ پہلی' دوسری اور تیسری۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس عمارت کے استحکام کا سارا دارومدار اس بنیاد پر ہے جس پر یہ منزلیں کھڑی ہیں۔ اگر یہ بے بنیاد ہی کھڑی کر دی گئی ہیں تو سیلاب کا معمولی سا ریلا بھی اسے زمین بوس کر دے گا۔ اسی طرح اگر بنیاد ٹیڑھی یا کمزور ہے تب بھی یہ عمارت مضمحل

رہے گی اور اس کے لئے استحکام نہیں ہو گا۔ تو جہاد کے مراتب میں پہلی چیز جس کو بنیاد (FOUNDATION) کی حیثیت حاصل ہے وہ مجاہدہ مع النفس ہے۔ اور اس کے باقی تین مراتب کی حیثیت تین منزلوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں اہم ترین چیز بنیاد ہے لیکن آج کے دور میں یہی سب سے زیادہ نظر انداز ہونے والی چیز ہے۔ اپنے نفس سے کشمکش کر کے اسے اللہ کا مطیع بنانا جہاد کی بنیاد ہے۔ اور جس طرح عمارت کی بنیاد زمین کے اندر ہوتی ہے اور نظر نہیں آتی اسی طرح جہاد کا یہ مرحلہ' جسے میں بنیاد سے تعبیر کر رہا ہوں' نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے۔ یہ مجاہدہ اکثر و بیشتر تو تنہائی میں ہوتا ہے۔ یہ باطنی جنگ مجاہدہ مع النفس ہے۔

انسان کا نفس بڑا خود سر ہے اور فرعون کی طرح خدائی کا مدعی اور اللہ کا مدمقابل بنتا ہے۔

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیک اورا عون' ایں را عون نیست

میرا نفس بھی فرعون سے ہرگز کم نہیں ہے' لیکن اس کا لاؤ لشکر تھا' میں فقیر آدمی ہوں۔ میرے پاس فوج نہیں ہے۔ وہ زبان سے بھی کہہ گیا اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی! میں زبان سے تو یہ نہیں کہہ سکتا لیکن میرا نفس یہی دعویٰ کرتا ہے۔ نفس کا کوئی تقاضا ابھرتا ہے تو وہ یہ تقاضا پورا کروانا چاہتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے! جدید سائیکالوجی آپ کو بتائے گی کہ نفس کی گہرائیوں میں جب کوئی خواہش جنم لیتی ہے' کوئی تقاضا ابھرتا ہے تو شخصیت کے اندر ایک شدید کھچاؤ (TENSION) پیدا ہو جاتا ہے اور اس کھچاؤ کو دور کرنے کی صورت یہی ہے کہ وہ خواہش پوری کی جائے۔ فرائیڈ نے اسی پر اپنے فلسفے کی منزلیں تعمیر کر لی ہیں کہ اگر کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے آپ وہ خواہش پوری نہیں کر سکتے تو وہ آپ کے اندر آپ کی نفسیات کی گہرائیوں میں جا کر ڈیرے جما لیتی ہے اور پھر وہاں سے آپ پر حملہ کرتی ہے۔ کبھی وہ خواہش آپ کو خوابوں میں نظر آئے گی' کبھی وہ تحت الشعور سے یکدم آپ پر حملہ کرے گی اور آپ کو چاروں شانے چت گرا دے گی۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بڑی نیک نیتی سے وعظ کہہ رہے ہوں اور عین اس وقت نفس کے تہہ خانوں سے وہ خواہش آپ پر حملہ آور ہو اور آپ کی نیت کے اندر خلل پیدا کر دے۔ تو یہ اس کا فلسفہ ہے۔

بہرحال اس کو چھوڑیئے' لیکن یہ تو ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ جب کوئی خواہش ابھرتی ہے تو یہ اپنی تسکین چاہتی ہے۔ اسے اس سے غرض نہیں ہے کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے' صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے' جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے! اللہ نے کون سا راستہ اس کی تسکین کا حلال

قرار دیا ہے اور کون سے راستے کو حرام قرار دیا ہے! تو یہاں ایک کشمکش کی ضرورت ہے۔ نفس ایک منہ زور گھوڑا ہے، جس کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ یہ مجاہدہ اور یہ کشمکش جہاد کی اصل بنیاد ہے۔ حضورؐ سے پوچھا گیا۔ ایّ الجھاد افضل یا رسول اللّٰہ ؟ اے اللہ کے رسولؐ سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟" دیکھئے اصل جو افضلیت ہے وہ بنیاد کی ہے اگرچہ وہ نظر نہیں آ رہی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے جواب دیا۔ ان تجاھد نفسک فی طاعة اللّٰہ "سب سے افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرو اور اسے اللہ کی اطاعت اور بندگی کا خوگر بناؤ" ۔ یہ ہے اصل جہاد ' یہ ہے اس عمارت کی بنیاد۔ اگر یہی نہیں ہے اور جہاد کی دوسری منزلیں تعمیر کرنی شروع کر دی گئیں تو وہ تعمیر بودی رہے گی اور کسی طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ کوئی معمولی سا ریلا بھی آئے گا تو اسے بہا کر لے جائے گا۔ اور جان لیجئے کہ اس دور میں ہمارے ہاں اس سلسلے میں جو محنتیں ہوئیں اور عوامی سطح پر ہم نے بڑے بڑے مورچے لگا کر جو تحریکیں چلائیں ان کی ناکامی کا اصل سبب یہی ہے کہ جہاد کی اس بنیاد کی طرف وہ توجہ نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے۔

اللہ کا ہم سے پہلا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہم اس کے بندے بنیں۔ ہمیں اس نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ ہم اس کی عبادت کریں۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ○ تمام رسول یہی دعوت لے کر آئے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ۔ خود قرآن اسی دعوت کو لے کر نازل ہوا۔ الٓرٰ کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ ○ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰہَ اسی کا عہد ہم اپنی نماز کی ہر رکعت میں کرتے ہیں۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ...... اب عبادت کے معنی کیا ہیں؟ اللہ کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی کلی اطاعت! حقیقت یہ ہے کہ یہ بڑا کٹھن راستہ ہے۔ اس میں باہر سے رکاوٹیں تو بعد میں آئیں گی، سب سے پہلی رکاوٹ تو اندر سے آتی ہے۔ اس راہ کا سب سے پہلا دشمن انسان کے اپنے اندر ہے یعنی نفسِ امّارہ۔ لہٰذا اس کے ساتھ کشمکش کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔

اب یہاں یہ بات ذہن میں رکھئے کہ نفس کے ساتھ اس کشمکش اور مجاہدہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہمیں کچھ ہتھیار عطا کر دیئے ہیں، جن کے ساتھ ہمیں نفس کے حملوں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ ہم پر اس نفس کا سب سے پہلا وار نسیان اور ذہول کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ ہمیں اپنے اندر اس طرح گھر کر لیتا ہے کہ ہمیں یہ یاد ہی نہ رہے کہ ہم اللہ کے بندے ہیں۔ اس کے لئے

ہمیں اللہ نے جو ہتھیار دیا وہ "نماز" ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ نفس کے اس حملے کا مقابلہ تم نماز کے ذریعے سے کرو۔ یہ نماز تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم نے اپنے رب سے ایک عہد استوار کر رکھا ہے۔ حفیظ کا ایک بڑا پیارا شعر ہے۔

سرکشی نے کر دیئے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

نفس کا دوسرا بڑا ہتھیار مال کی محبت ہے' جس کے ذریعے وہ ہم سے سرکشی کراتا ہے۔ نفس کا تقاضا ہے کہ مال آنا چاہئے' چاہے حلال ذریعے سے ہو یا حرام ذریعے سے' جائز ہو یا ناجائز۔ اس کے اس وار کو زکوٰۃ و صدقات کے ہتھیار سے روکو اور اس کی تلوار کو کند کر دو۔ اللہ کی راہ میں خوب انفاق کرو تاکہ نفس کا یہ وار بھی کاری نہ رہے۔ نفس کا ایک اور وار ہم پر ہوتا ہے خواہشات نفس کی صورت میں جن میں اہم ترین بھوک اور شہوت ہیں۔ بھوک زندگی کے تسلسل اور بقائے ذات (PRESERVATION OF SELF) کے لئے ضروری ہے اور شہوت بقائے نسل (PRESERVATION OF SPECIES) کے لئے' لیکن نفس ان دونوں داعیات کو بھڑکاتا ہے اور اس راستے سے زور لگا کر ہمیں بندگیٔ رب سے منحرف کرتا ہے۔ نفس کے اس وار سے بچاؤ کے لئے ہمیں جو ہتھیار دیا گیا وہ "روزہ" ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ...... یہ روزہ ڈھال ہے' نفس کے ان حملوں کو تم اس پر روک سکو گے۔

نفس کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں ایک اور جامع ہتھیار "حج" کا دیا گیا ہے۔ اس میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے تو زکوٰۃ و صدقات سے مناسبت ہو گئی۔ اس میں مشقت بڑی جھیلنی پڑتی ہے' جسمانی عبادت بھی ہے' طواف بھی ہے اور وہاں کی بہت سی مشقتیں ہیں لہٰذا نماز سے بھی مناسبت ہو گئی۔ اور احرام کے دوران شہوت وغیرہ پر پابندیاں بھی لگتی ہیں اس طرح اس کی صوم سے مشابہت ہو گئی۔ چنانچہ مجاہدہ مع النفس کے لئے جامع ترین ہتھیار جو ہے وہ حج ہے۔

اب آپ ٹھیک طور سے سمجھ گئے ہوں گے کہ فلسفۂ دین میں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ کی کیا حیثیت ہے۔ یہ درحقیقت مجاہدہ مع النفس کے ہتھیار ہیں۔ یہ انسان کی غرضِ تخلیق عبادت کے تقاضے پورا کرنے کی خاطر اس کو تقویت دینے کے لئے عبادات ہیں' جو فرض کر دی گئی ہیں

تاکہ وہ اللہ کا بندہ بن سکے جیسا کہ اس کا بندہ بننے کا حق ہے۔ لو یہ عبادات ہم پر بوجھ نہیں بلکہ اللہ کے انعامات ہیں۔ اس کی طرف سے ہمارے لئے عطیات اور تحائف ہیں۔ یہ ہتھیار ہیں جو اللہ نے ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے ہیں تاکہ ہم نفس کے حملوں کو روک سکیں۔ ان سب کے علاوہ مجاہدہ مع النفس کے لئے ایک ہتھیار اور بھی ہے' اور وہ ہے بالفاظ قرآنی : کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ..... یعنی ایسے لوگوں کی معیت اور مصاحبت اختیار کرو' ایسے لوگوں کی صحبت سے فیض حاصل کرو جو یا تو نفس کی کشمکش سے گزر چکے ہوں اور نفس کو زیر کر چکے ہوں یا بر سبیل تنزل وہ بھی اسی کشمکش میں لگے ہوئے ہوں تو وہ تمہارے لئے ذہنی سہارا بنیں۔

نہ من تنہا دریں مے خانہ مستم

جنید و بایزید ہم مست ایں جا

میں ہی نہیں ہوں تنہا میرے دائیں بائیں اور بھی ہیں جو اسی کشمکش میں اسی مجاہدہ مع النفس میں شریک ہیں۔

اسی کشمکش میں نفس کے پاس ایک ہتھیار اور بھی ہے' جس سے وہ ان تمام ہتھیاروں کو کند کر سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو ریاکاری کی طرف موڑ دیتا ہے۔ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اس نے اس میں ریاکاری کو شامل کر دیا تو ختم ہوا آپ کا وار۔ آپ نے روزہ رکھا لیکن اس نے آپ کی نیت پر حملہ کر کے اس میں ریاکاری کا عنصر داخل کر دیا تو آپ کا یہ ہتھیار بھی کند ہو گیا۔ اب اس کا کیا علاج ہو؟ سب سے بڑے طبیب امراضِ قلبیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا علاج یہ تجویز فرمایا ہے کہ ان عبادات کے ساتھ نفلی عبادات کو شامل کیا جائے اور وہ نفلی عبادت بالکل اخفاء کے ساتھ ہو۔ اگر آپ نفلی انفاق کر رہے ہیں تو اس کی کیفیت حضورؐ نے یہ بیان فرمائی کہ داہنے ہاتھ سے خرچ کرو تو بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ چلنے دو۔ نفلی نماز پڑھ رہے ہو تو ایسی تنہائی میں پڑھو کہ کسی کو پتہ نہ چلے اور کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی نہ کرو۔ اس طرح نفس کے اس ہتھیار کو بھی کند کر دیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ مجاہدہ مع النفس جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد اور فاؤنڈیشن ہے اور جو اس کو مستحکم کئے بغیر تعمیر اٹھانے کی کوشش کریں گے ان کی محنتیں اکارت جائیں گی۔ وقتی طور پر چاہے وہ بڑے جوش و خروش اور ہنگامے کی کیفیت پیدا کر لیں لیکن ان کی محنت نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔ اس لئے کہ وہ بنیاد ہی موجود نہیں ہے جس پر یہ ساری تعمیر کھڑی ہوئی ہے۔

نظریاتی اور فکری تصادم

اندر کی اس کشمکش کے بعد اب خارج میں کشمکش کا آغاز ہوتا ہے اور مجاہدہ مع النفس کی بنیاد پر جو پہلی منزل تعمیر ہوتی ہے اس کے لئے میں عنوان تجویز کر رہا ہوں "نظریاتی اور فکری تصادم"۔ اس لئے کہ جب ہم مذہبی اصطلاحات بولتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں خواہی نخواہی وہی محدود تصورات آجاتے ہیں جو ہم نے ان اصطلاحات کے ساتھ وابستہ کر لئے ہیں۔ اس تصادم میں فکر فکر سے 'نظریہ نظریہ سے اور خیال خیال سے ٹکرائے گا۔ آپ اللہ کے ماننے والے ہیں' وحی 'نبوت' رسالت اور آخرت کے ماننے والے ہیں تو آپ کو اپنا یہ نظریہ خیال اور عقیدہ و ایمان پھیلانا ہو گا' ورنہ بات کیسے آگے چلے گی؟ اور ظاہر بات ہے کہ آپ اپنے نظریات خلا میں تو پیش نہیں کر رہے۔ اس سے پہلے کچھ نظریات موجود ہیں۔ کچھ نظریات ہیں، یا شرک ہے یا وطن پرستی ہے یا الحاد ہے یا مادہ پرستی ہے یا مارکسزم ہے یا نیشنلزم ہے۔ آپ کو کفر و شرک 'الحاد و مادہ پرستی' وطن پرستی اور مارکسزم وغیرہ کے مقابلے میں نظریۂ توحید پیش کرنا ہے۔ آپ اکیلے تو نہیں ہیں کہ آپ نے جو خیال پیش کیا وہ آسانی سے پھیلتا چلا گیا' بلکہ دلیل دلیل سے ٹکرائے گی اور آپ کو دنیا کے سامنے باطل نظریات کو باطل اور اپنے نظریئے کو حق ثابت کرنا ہو گا اور اس کے لئے ذرائع ابلاغ میں سے ہر ممکن ذریعہ استعمال کرنا ہو گا

جہاد فی سبیل اللہ کی اس منزل کے لئے دینی عنوان ہو گا "دعوت و تبلیغ" ...... یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ۔ "اے نبیؐ پہنچایئے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے"۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ۔ "اے نبیؐ دعوت دیجئے اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ' موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان کے ساتھ جدال کیجئے بہترین طریقے پر"۔ دیکھئے یہ جدال بھی باب مفاعلہ سے ہے۔ جدل کے معنی جھگڑا اور جب جھگڑا دو فریقوں کے مابین ہو تو یہ مجادلہ اور جدال ہو گا۔ اس آیۂ مبارکہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ عقائد کی سطح پر آپؐ مخالفین سے بہترین طریقے پر جدال کیجئے۔ وہ آپ کی مخالفت میں بہت گھٹیا اور اوچھے وار کریں گے لیکن آپؐ پوری

متانت و سنجیدگی اور پوری شرافت و مروّت کے ساتھ ان سے مجادلہ کیجئے اور اسلام کی حقانیت کا لوہا منوایئے! تو یہ دعوت و تبلیغ در حقیقت نظریاتی تصادم ہے۔

اب ظاہر بات ہے کہ یہ کام گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ آپ اپنے دھندے میں لگے رہے اور بس اپنے پروفیشن ہی کو چمکانے کی فکر میں رہے تو کیسے ہو گا؟ اور جان لیجئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کام تن تنہا نہیں کیا تھا۔ نبیؐ کا پہلا شکار چار افراد تھے۔ یہاں شکار کا لفظ آپ کو کہیں ناگوار محسوس نہ ہو۔ یہ لفظ حضرت مسیحؑ نے ایک جگہ استعمال کیا تھا۔ جب آپ گلیلی جھیل پر پہنچے اور وہاں پر مچھیرے مچھلیاں پکڑ رہے تھے تو حضرت مسیحؑ نے فرمایا "او مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ کہ میں تمہیں انسانوں کا پکڑنا سکھاؤں"۔ انسان کو قائل کر کے ہم خیال بنانا اور نظریات و مقاصد میں اسے اپنا ساتھی بنالینا یہ انسانوں کا شکار ہے۔ تو حضورؐ کے پہلے شکار چار تھے ... (۱) زوجۂ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ' (۲) چچازاد بھائی حضرت علیؓ جو زیر کفالت اور زیر تربیت تھے (۳) ایک غلام زید بن حارثہؓ جو بعد میں آزاد کر کے بیٹا بنا لئے گئے اور (۴) نہایت گہرے دوست حضرت ابو بکر صدیقؓ۔ اب ایمان لانے کے بعد یہ حضرات دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری میں آپؐ کے دست و بازو بنے۔ لیکن اگر ابو بکرؓ یہ سوچتے کہ یہ کام تو انہی کا ہے 'میرا تو نہیں ہے' رسولؐ تو وہ ہیں 'میں تو نہیں ہوں' اللہ تعالیٰ "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ" کا حکم تو رسولؐ کو دے رہا ہے 'ابو بکرؓ کو تو نہیں دے رہا اور وہ اپنی تجارت میں لگے رہتے تو یہ بات کیونکر پھیلتی؟ بلکہ آپؓ ہمہ تن ہمہ وقت اسی کام میں لگ گئے ' جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لگے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو جو وجاہت و حیثیت دی تھی اور مکہ کی سوسائٹی میں جو مقام و مرتبہ عطا کیا تھا اس کے نتیجے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جھولی میں چھ ایسے شکار لا کر ڈالے جو ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی تھا۔ عشرۂ مبشرہ میں سے چھ صحابہؓ وہ ہیں جو حضرت ابو بکرؓ کی تبلیغ سے ایمان لائے 'جن میں عثمان غنیؓ بھی ہیں ' طلحہؓ و زبیرؓ بھی ہیں 'سعدؓ بن ابی وقاص اور عبدالرحمانؓ ابن عوف بھی ہیں (رضوان اللہ علیہم اجمعین)۔ ان میں سے ایک ایک شخص ایک ایک ہزار کے برابر ہے۔

ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ہیں کہ جو آکر حضورؐ کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور بلا تنخواہ ہمہ وقتی کارکن کی حیثیت سے اس کام میں لگ گئے۔ ان میں خبابؓ بن الارت ہیں جو لوہاری کا پیشہ کرتے تھے۔ ابو جہل نے ستایا اور دکان وغیرہ ضبط کر لی۔ انہوں نے کہا اور کہا ہے 'خوب ... !' فارغ ہوئے اور اب ہمہ تن حضورؐ کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

حضرت بلال ؓ کو بھی جب حضرت ابو بکر ؓ نے خرید کر آزاد کر دیا تو وہ بھی آ کر لگ گئے۔
مصعب ؓ بن عمیر کو گھر سے نکال دیا گیا تو وہ بھی رسول ؐ اللہ کے قدموں میں پہنچ گئے۔
یہ سب کس کام میں مصروف ہیں؟ حضور ؐ سے قرآن سیکھ رہے ہیں اور آگے سکھا رہے
ہیں۔ ادھر وحی نازل ہوئی ' ادھر ان نوجوانوں نے اسے حضور ؐ سے سیکھا ' یاد کیا اور گھر گھر پہنچ
کر جہاں بھی صاحب ایمان ہیں وہاں جا کر انہیں وہ قرآن سکھایا۔ خباب ؓ بن الارت قرآن کی
تو پڑھانے گئے تھے حضرت سعید ؓ اور ان کی اہلیہ فاطمہ ؓ بنت خطاب کو۔ سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی تھی
وہ سکھانے گئے تھے۔ اس وقت حضرت عمر ؓ آ پہنچے ' آگ بھبوکا بنے ہوئے۔ وہ تلوار لے کر
حضور ؐ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے تھے۔ کسی نے کہا کہاں جا رہے ہو؟ پہلے اپنے گھر کی
خبر لو ' تمہاری بہن اور بہنوئی ایمان لا چکے ہیں۔ اس وقت حضرت عمر ؓ ابن خطاب کے جلال کا
کیا ٹھکانہ ہو گا ' اس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ جا کر دروازے پر دستک دی۔ گھر والوں کو
معلوم ہوا کہ عمر آ گئے ہیں تو لرزہ طاری ہو گیا۔ خباب ؓ بن الارت کو چھپایا گیا۔ وہ وہاں کیا
کرنے گئے تھے؟ قرآن پڑھا رہے تھے۔ سورۃ طٰہٰ سکھا رہے تھے۔ تو جہاد کے اس مرحلے پر جسے
ہم نے "نظریاتی و فکری تصادم" کا نام دیا سب سے بڑا ہتھیار قرآن مجید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی انقلابی جدوجہد کی نظریاتی اساس بھی قرآن مجید تھا اور
نظریاتی تصادم کے مرحلے پر آپ ؐ کا سب سے بڑا ہتھیار بھی یہی قرآن ہی تھا۔ چنانچہ آپ ؐ کو
اسی کی تبلیغ کا حکم ہوا: بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ "پہنچاؤ وہ جو نازل کیا گیا آپ
پر آپ ؐ کے رب کی طرف سے"۔ اسی کے ذریعے آپ ؐ نے انذار فرمایا۔ وَ اُوْحِيَ إِلَيَّ
هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْ بَلَغَ۔ "اور یہ قرآن مجھ پر وحی کیا گیا ہے تاکہ میں
خبردار کروں اس کے ذریعے سے تمہیں اور جسے بھی یہ پہنچ جائے"۔ اسی سے تبشیر
فرمائی۔ اسی کو ذریعۂ تذکیر بنایا: فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ "پس آپ ؐ
قرآن کے ذریعے سے اسے یاد دہانی کراتے رہیں جو میری تنبیہ سے ڈرتا ہے"۔

اب اگر آپ اپنے ماحول میں چاروں طرف دیکھیں تو کچھ چیزیں خود بخود عیاں ہو جائیں
گی۔ کوئی دعوت اگر اس قرآن کو بائی پاس کر کے ہو رہی ہو تو وہ اس نہج پر نہیں ہو رہی
جس پر محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کر رہے تھے۔ وقت کھپ رہا ہے ' صلاحیتیں صرف
رہی ہیں ' محنتیں لگ رہی ہیں لیکن اس نہج پر اور اس ترتیب کے ساتھ نہیں لگ رہی ہیں تو نتیجہ
نہیں نکلے گا۔ البتہ اگر نیت صحیح ہے تو اجر ملے گا ' اِلّا یہ کہ اس میں کوئی ریاکاری یا دنیاداری

دوسری ہے ورنہ اگر خلوص ہے تو اجر ضائع نہیں ہو گا لیکن محنت نتیجہ خیز نہیں ہو گی۔
"نظریاتی و فکری تصادم" کے اس مرحلے اور "دعوت و تبلیغ" کی اس منزل کے لئے
مع ترین عنوان قرآن مجید کی ایک اصطلاح "شہادت علی الناس" بنے گی جو تبلیغ، تعلیم،
ین، انذار اور تبشیر سب کو محیط ہے۔ یعنی "لوگوں پر گواہی دینا" ...... وہ یہ نہ کہہ سکیں
ہم تک یہ بات پہنچائی ہی نہیں گئی۔ اس اصطلاح میں "علی" مخالفت کا مفہوم ادا کر رہا
، اس لئے کہ یہ گواہی آخرت میں لوگوں کے خلاف جائے گی کہ اے اللہ ہم نے پہنچا دیا
۔ اب یہ خود ذمہ دار ہیں۔ "علیٰ" کا استعمال مخالفت میں ہوتا ہے اور "ل" کا حق
۔ مثلاً اَلْقُرْاٰنُ حُجَّۃٌ لَّکَ اَوْ عَلَیْکَ۔ "قرآن حجت ہے یا تمہارے حق میں یا
رے خلاف۔" گواہی کا معاملہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ یہ ایک فریق کے حق میں ہو گی تو
رے کے خلاف جائے گی۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا
امِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَ
بِیْنَ ...
ے اہل ایمان، عدل و انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے حق میں گواہی
چاہے وہ گواہی تمہارے اپنے خلاف پڑ رہی ہو یا والدین کے یا رشتہ داروں کے خلاف۔
نساء = ۱۳۵) یہ فریضہ شہادت علی الناس، امتِ مسلمہ کا اجتماعی نصب العین ہے۔

ہر مسلمان کا انفرادی نصب العین "عبادتِ رب" ہے...... اللہ کا بندہ بننا۔ لیکن جب
کے بندے بن کر اجتماعی حیثیت میں یہ ایک امت بنتے ہیں تو اب بحیثیت امت انکا فرض
ہے؟ انفرادی سطح پر ان کا ہدف تھا۔ اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ اب اس اجتماعی
پر ان کی قوتوں اور ان کے مجاہدے کا ہدف ہو گا شہادت علی الناس: وَ کَذٰلِکَ
لْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوْنَ الرَّسُوْلُ
یْکُمْ شَھِیْدًا "ہم نے اسی لئے تو تمہیں بہترین امت (درمیانی امت) بنایا تاکہ تم ہو
گواہ تمام انسانوں پر اور رسول ہو جائیں گواہ تم پر"۔ اور "پر" کا مفہوم ذہن میں رکھئے کہ
لاف" کا ہے۔ یعنی تاکہ تم قیامت کے دن لوگوں کے خلاف گواہی دے سکو کہ اے اللہ
نے پہنچا دیا تھا، اب یہ خود ذمہ دار ہیں مسئول ہیں اور رسولؐ تمہارے خلاف گواہی دیں کہ
اللہ میں نے انہیں پہنچا دیا تھا۔

یہ بات ذرا آسانی سے حلق سے نیچے نہیں اترے گی' اس لئے کہ واقعہ یہ ہے کہ
آیت کے مفہوم کو سمجھنے میں عام طور پر غلطی ہوتی ہے۔ اس میں جو لفظ "علیٰ" ہے بنیا
طور پر اسے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ مخالفت کے لئے آتا ہے حق کے لئے نہیں آتا۔ اس
نقشہ بھی قرآن نے کھینچا ہے۔ میں نے اپنے کتابچے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
میں تفصیل سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بار حضورؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرما
کی کہ مجھے قرآن سناؤ۔ انہوں نے کہا کہ حضورؐ آپ کو سناؤں' آپؐ پر تو نازل ہوا ہے
آپؐ نے فرمایا ہاں' لیکن دوسروں سے سننے میں اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں
سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ چشم تصور سے دیکھئے کہ وہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم
کی مجلس میں گردن جھکائے' آنکھیں بند کئے ہوئے پڑھ رہے ہیں۔ جب اس آیت پر پہنچے
فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ
شَهِيدًا۔ تو حضورؐ نے فرمایا: حسبک' حسبک...... "بس کرو!" اور اب حضرت
عبداللہ بن مسعودؓ نظریں اٹھا کر دیکھتے ہیں تو حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔
لئے؟ کیونکہ یہ گواہی امت کے خلاف دینی پڑے گی کہ اے اللہ میں نے پہنچا دیا تھا' اب
ذمہ دار ہیں۔ اسی لئے گواہی لی حضورؐ نے حجۃ الوداع میں: اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ "میں
پہنچا دیا کہ نہیں؟" اور تمام حاضرین نے بیک زبان کہا۔ "اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ
وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ......

"ہاں حضورؐ ہم گواہ ہیں کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا' حق امانت ادا کر دیا' حق نصیحت ادا کر
دیا......" اس پر آپؐ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ
اشْهَدْ اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ...... اے اللہ تو بھی گواہ رہ' میں فارغ ہوا' میرا بوجھ اتر گیا۔
(سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا) وہ قولِ ثقیل آج میرے کاندھوں سے اتر کر ان
کاندھوں پر آ گیا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ۔ پس پہنچائیں جو
ہیں ان کو جو یہاں نہیں ہیں۔ میں سبکدوش ہوا' میرے کاندھوں کا بوجھ اب تمہا
کاندھوں پر ہے۔ تم گواہی دے رہے ہو کہ میں نے پہنچا دیا۔ اب تمہیں یہی گواہی پوری
انسانی سے لینی ہو گی ورنہ ہو سکتا ہے کہ روزِ محشر عدالتِ خداوندی میں دنیا تمہارے خ
استغاثہ لے کر کھڑی ہو جائے کہ اے اللہ ان کے پاس تیرا دین تھا۔ انہوں نے ہمیں پہنچ
نہیں' تو ہم اس پر عمل پیرا کیسے ہوتے؟۔ استغاثہ میدانِ حشر میں ہمیں مجرم ثابت کر سکتا۔

آپ غور کیجئے کہ یہ کام گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ جہاد کے اس مرحلے میں پیسہ بھی صرف ہو
اور جسم و جان کی توانائیاں بھی۔ صحابہ کرامؓ نے اس راہ میں بے دریغ خرچ کیا۔ حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ان کے پاس چالیس ہزار درہم کا سرمایہ تھا اور
جب تیرہ برس بعد ہجرت کے لئے جا رہے تھے تو سب ختم ہو چکا تھا۔ یہ سارا سرمایہ کہاں پگھل
گیا؟ دین کی دعوت و اشاعت میں کھپا دیا۔ تنہا حضرت ابوبکرؓ نے چھ غلام اور کنیزوں کو خرید کر
اللہ کی راہ میں آزاد کیا، جن میں ایک حضرت بلالؓ بھی ہیں۔ مسلمانوں میں جو بھی تنگدست
تھے ان کی مدد کے لئے آپؓ کا ہاتھ ہر وقت کھلا تھا۔ پھر جو توانائی اور قوت کبھی پیسہ کمانے پر لگتی
تھی وہ اب دین پر لگ رہی ہے۔ مال کے بڑھنے کا راستہ مسدود اور خرچ بے انتہا بڑھ رہا ہے۔
چنانچہ سارے کا سارا مال اس راستے میں خرچ ہو گیا۔ تو یہ ہے جہاد کا دوسرا مرحلہ، مجاہدہ مع
النفس کی بنیاد پر قائم ہونے والی پہلی منزل...... فلسفیانہ انداز سے یہ نظریاتی و فکری تصادم کی
منزل ہے اور دینی اصطلاحات میں اسے دعوت و تبلیغ کی منزل کہا جائے گا اور اس کا حاصل ہے
شہادت علی الناس۔ اور اس میں مال و زر، جسم و جان کی صلاحیتیں، توانائیاں اور قوتیں اور
اوقات کا کھپانا ناگزیر ہے۔ (جاری ہے)

بقیہ: خطابِ جمعہ

مختلف طبقات میں ان کے مسائل کا علیحدہ علیحدہ شعور بیدار کیا جائے اور بتدریج
(CLASS CONSCIOUSNESS) اور (CLASS STRUGGLE) اور
پیدا کر کے کمیونسٹ انقلاب کی راہ ہموار کی جائے۔ لہٰذا ہمیں اس
برائی کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دینا چاہئے۔ انفرادی اور اجتماعی سطح پر اس قوم اور اس ملک کا
ایک ہی مسئلہ ہے اور وہ ہے اسلام اور اس کا غلبہ...... پہلے اپنی ذات پر، پھر پاکستان پر اور پھر
اگر اللہ ہمیں ہمت دے تو پورے کرۂ ارضی پر...... !! اسی پر ہماری دنیوی کامیابی اور عزت و
وقار کا دار و مدار ہے اور اسی پر ہماری اخروی فلاح بھی موقوف ہے۔
اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے!
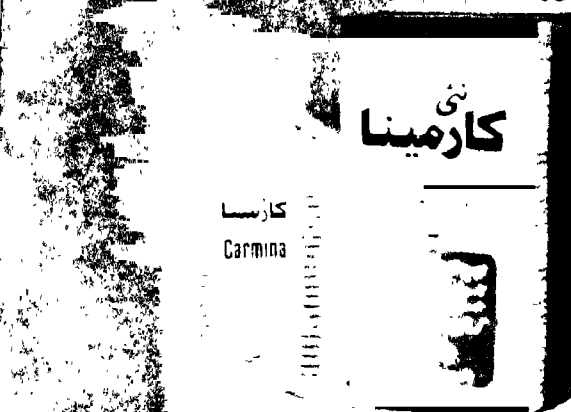
نئی
کارمینا
نئی
کارمینا
کارمینا
Carmina
نئی
کارمینا
تحقیق روحِ تخلیق ہے

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

مختار حسین فاروقی

یوں تو ہر مسلمان کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور
ں برداری دین کا اہم حصہ اور بنیادی اہمیت کی چیز ہے مگر ایک سچی انقلابی جماعت کے فرد
لئے جو اللہ کی توفیق کے طفیل خود کو دل و جان سے خدمت و اشاعت دین کے کام میں کھپا
ے کا متمنی ہو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اہمیت کئی گنا بڑھ جاتی
۔ پوری زندگی میں اطاعت کا یہ جذبہ ایمان کا حاصل بھی ہے اور مظہر بھی۔ اللہ تعالیٰ اور
کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت اور وفاشعاری کے جذبات اگر صرف
زبان پر ہیں تو اطاعت بھی صرف سطحی اور زبانی جمع خرچ تک محدود ہو گی اور اگر محبتِ
ندی اور عشق رسولؐ کا جذبہ حرزِ جان بن گیا ہے اور رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے تو
ں برداری کا یہ جذبہ بھی اتنا ہی گہرا ہو گا اور زندگی کے تمام گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

آیئے دیکھیں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے کون کون سے گوشے ہیں اور
کے تقاضے کیا ہیں؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ بات اگر ہمارے ذہن نشین ہو جائے تو
سر اقدم لامحالہ اپنے طرز عمل اور افکار و نظریات کا ایک بے لاگ تجزیہ ہو گا کہ ہم میں سے
خود اس وقت کہاں کھڑا ہے؟

ت کا معنی اور مفہوم

اطاعت کا لفظ "طوع" سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں "خوشدلی" اور "آزاد
ی" یا خوشدلی اور اپنی آزاد مرضی سے کسی کام کا کرنا۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن مجید میں
کرھاً کی ترکیب میں متعدد مقامات پر وارد ہوا ہے۔ اسی طرح لفظ "تطوّع" بھی
ع" ہی سے بنا ہے اور اس میں بھی یہی مفہوم شامل ہے۔ طوع سے جب "اطاعت" کا
ب افعال میں بنتا ہے اس کے معنی ذرا سے بدل جاتے ہیں یعنی کسی دوسرے انسان'

دوسری ہستی یا کسی دوسری چیز کی فرماں برداری کرنا۔ اگرچہ اس میں بھی خوشدلی اور آزاد مرضی کا عنصر شامل ہے مگر بے ذرا مخفی یعنی جبر اور اکراہ کے ساتھ جو حکم مانا جارہا ہوگا وہ بھی اطاعت ہی کہلائے گی مگر جیسے کہ آگے بیان ہوگا ایسی اطاعت جزوی ہو سکتی ہے مکمل او ہمہ گیر طریق پر پوری زندگی میں ممکن نہیں ہے۔

اطاعت اور فطرتِ انسانی

شاید عام آدمی یہ سمجھتا ہے یا بے دین لوگوں کی طرف سے یہ تصور دانستہ عام کیا گیا۔ کہ ہم تو "آزاد" لوگ ہیں جو کسی دوسرے کی اطاعت نہیں کرتے اور یہ لوگ جو اللہ تعالیٰ او اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں یہ لوگ پابند ہیں اور بہت سار۔ قاعدوں اور ضابطوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔

حقیقت میں شاید ایسا نہیں ہے۔ اور کلیتہً "آزاد" تو دنیا میں کوئی مخلوق نہیں۔ جمادات و نباتات تو پورے طور پر فطرت کے قوانین کے پابند ہیں ہی' حیوان بھی جو زندگی ۔ مقابلۃً اونچے درجے پر فائز ہیں مکمل طور پر خالق کائنات کے پہلے سے طے شدہ ضابطے ا قانون کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ حیوانات کا کھانا پینا' رہنا سہنا' غرض یہ کہ ہ فعل ان کی جبلت کے تابع ہوتا ہے..... رہا انسان..... جو اشرف المخلوقات ہے تو اسے اللہ ۔ چونکہ اپنا خلیفہ بنایا ہے لہٰذا جہاں ایک طرف حضرت انسان اللہ تعالیٰ کے طے شدہ بہت ۔ ضابطوں کا پابند ہے اور اُن سے (اپنے سے کمتر مخلوقات کی طرح) سرِ مو انحراف نہیں کر ۔ وہاں یہ ابنِ آدم تھوڑی سی "آزادی" بھی رکھتا ہے اور اُسے یہ اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی مر (زندگی کی شاہراہ پر) چاہے تو اسلام اور ایمان کی زندگی اختیار کر لے اور چاہے تو کفر ا تکذیب کی روش اختیار کر لے۔

اسلام میں داخل ہو کر بندہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکا پابند ہو ہی جاتا ہے "کفر" کی زندگی گزارنے والا شخص بھی کلیتہً "آزادی" سے زن نہیں گزارتا بلکہ نظریات و افکار و اعمال کی پیروی پر ارادتاً اور برائی کی طرف میلان کی وجہ ۔ دباؤ کے تحت بھی مجبور نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایسا انسان سماجی دباؤ' معاشرتی رسوم و رواج اجتماعی قومی حالات کے تحت زندگی گزارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ فطرتِ انسانی میں اپنی مرضی کو دبا کر کسی اور اعلیٰ تر ہستی کی

بر آری کرنا شامل ہے۔ فرق صرف یہ رہے گا کہ مسلمان اپنی آزاد مرضی کو اپنے خالق اور رب کے قدموں اور چرنوں میں لا کر ڈال دیتا ہے اور اس کی اطاعت کے جذبے سے سرشار ہو کر "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ " کا نغمہ الاپتا ہے اور کافر و مشرک، پتھر کی مورتیوں، نفسانی خواہشوں اور اپنے ہی جیسے بعض دوسرے مجبور و محکوم بندوں کی اطاعت گزاری اور غلامی اختیار کر لیتا ہے۔ کسی ہوشمند اور غیر جانبدار شخص کے لئے فیصلہ زیادہ مشکل نہیں ہے کہ کون حقیقت سے قریب ہے اور کون فطرتِ انسانی کو مسخ کرنے کی پاداش میں اس سے کوسوں دور اور قرآن مجید کے الفاظ میں " ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا " کا مصداق ہے۔

نتیجۃً انسان خواہی نخواہی کسی نہ کسی کی اطاعت کر رہا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب، کہ آیا وہ اطاعت صرف دنیاوی زندگی اور یہیں کے مفادات تک محدود ہے جسے قرآن مجید "اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا" کہتا ہے یا اس کے ثمرات حیات بعد الممات میں بھی خوشگوار ہوں گے، اس بات پر منحصر ہے کہ انسان کا نصب العین اور مقصدِ زندگی کیا ہے؟ مقصد اگر صرف شکم پروری اور تن پروری ہے یا دنیاوی مفادات جمع کرنا ہے اور آرام و آسائش کے ساتھ زندگی گزارنا ہے تو انسان ایک مخصوص قسم کے نظامِ اطاعت کے حوالے ہو جائے گا جو اپنی نفسانی خواہشات کے اتباع سے شروع ہو گا۔ جسے قرآن مجید "اپنے نفس کو اپنا معبود بنا دینا" قرار دیتا ہے، اور درہم و دینار کی بندگی سے ہوتا ہوا شرک پر ختم ہو گا، جس میں انسان کے لئے بے اطمینانی، بے چینی، کرب والم اور بالآخر "عذابِ شدید" کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور...... اگر مقصد اپنے خالق و مالک کو پہچاننا اور اس کی رضا اور خوشنودی ہے تو زندگی میں ترجیحات بالکل دوسری ہوں گی اور انجام بھی بالکل مختلف۔ یہی راستہ ہمارے دینِ اسلام کا راستہ ہے اور اسی راہ کے ہم سب مسافر ہیں۔ یہی راستہ انقلاب آفریں بھی ہے اور حیات بخش بھی لہٰذا اس کی قدرے تفصیل کی ضرورت ہے، جو بعد کے مباحث میں آ رہی ہے۔

جزوی اطاعت یا کلی اطاعت

قرآن مجید جس اطاعت کا مطالبہ اپنے ماننے والوں سے کرتا ہے وہ کلی اطاعت ہے نہ کہ جزوی! سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً

اے ایمان والو اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے (یعنی مکمل طور پر)

ربِ ذوالجلال کے نزدیک یہی چیز پسندیدہ اور مطلوب ہے کہ بندہ یکسو ہو کر اس کی اطاعت اور بندگی اختیار کرے اور اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ایک سے زیادہ "مطاع" بنانے کی بجائے صرف اور صرف خدائے واحد ہی کی اطاعت اور فرماں برداری کرے۔ چنانچہ یہ بات اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند اور اس کے غضب کو بھڑکانے والی ہے کہ آدمی کچھ معاملات میں خدا کی بندگی اور اطاعت بھی کرے اور کچھ گوشوں میں آسانی کی طلب اور مفاداتِ دنیوی کے حصول کے پیش نظر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی پیروی بھی کرے۔ گویا زندگی کی وحدت کو مختلف گوشوں اور خانوں میں تقسیم کرے اور خدا اور شیطان کو بیک وقت خوش رکھنے کی پالیسی پر عمل پیرا نظر آئے۔ یہ صورتِ حال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے اور ایسی عبادت اور اطاعت بھی انسان کے منہ پر دے ماری جانے والی چیز ہے اور آخرت کی میزان میں نہ صرف بے وزن ہے بلکہ الٹا موجب مواخذہ و سزا۔

اللہ تعالیٰ کی یہ ناراضگی بلا سبب اور بلا وجہ نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ شرک گناہِ کبیرہ ہے اور قرآن مجید میں دو جگہ اللہ تعالیٰ نے بڑے واضح اور واشگاف الفاظ میں یہ اعلان فرمایا ہے کہ یوں تو سب گناہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں مگر شرک تو ایسا گناہ ہے کہ اس کی معافی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا! ذرا غور کرنے پر آپ بھی اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ جزوی اطاعت یا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی ایسی اطاعت اور پیروی جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے علی الرغم اور خلاف کی جائے یقیناً 'شرک' ہی کے ذیل میں آئے گی۔ قرآن مجید میں سورۃ الکھف میں فرمایا گیا۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا

ترجمہ..... اور اللہ تعالیٰ اپنے حکم (نظامِ اطاعت) میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

اور اصولی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور مخلوق میں سے کسی اور کی اطاعت کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان مبارک بہت واضح ہے۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

ترجمہ..... خالق (اللہ تعالیٰ) کی نافرمانی کر کے کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں کی جانی چاہئے۔

گویا اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تابع تو بہت ساری اطاعتیں ہو سکتی ہیں اور دین اسلام میں
ں کا اپنا مقام بھی ہے مگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی اور بغاوت کر کے یا اس کی جگہ پر کسی
ی کی اطاعت کرنا صریح شرک ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ قرآن مجید میں اکثر
سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو جو لازمی قرار دیا گیا ہے تو یہاں رسول اللہ صلی اللہ
یہ وسلم کی اطاعت در حقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی
اطاعت اور فرماں برداری ہے ہی بواسطہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم چنانچہ سورۃ النجم میں فرمایا گیا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

ترجمہ ... "اور (ہمارا رسولؐ) وہ اپنی خواہش سے نہیں کلام فرماتے بلکہ (ان کی)
بات ایک القائے ربانی ہوتا ہے جو ان کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

اور سورۃ النساء میں مزید کھول دیا گیا۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ

ترجمہ..... "اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی
اطاعت کی"۔

گویا اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی پسند و ناپسند معلوم کرنے کا ہمارے پاس بجز لسانِ
رسالت و نبوت کے کوئی اور ذریعہ ہی نہیں ہے۔ لہٰذا محمد رسولؐ اللہ کی اطاعت ہی اطاعتِ
خداوندی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں دونوں اطاعتوں کا اکثر ساتھ ساتھ ذکر آتا ہے۔

مزید یہ کہ اسی بات کا دوسرا سرا یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ استاد کی
اطاعت، والدین کی اطاعت، بزرگوں کی اطاعت، اہل علم و فضل کی اطاعت، حاکم وقت کی
اطاعت، غرض سبھی اطاعتیں اپنی جگہ ضروری ہیں اور ان کا ایک اپنا اپنا مقام ہے جس کا ذکر
قرآن مجید میں اور احادیث نبویؐ میں بکثرت ملتا ہے۔ بنیادی بات وہی ہے کہ خالقِ کائنات کے
احکام کے تابع رہ کر دیگر تمام اطاعتیں، فرماں برداریاں حتیٰ کہ نازبرداریاں تو جائز اور مستحسن
ہیں مگر اُس کے احکام سے بغاوت اور سرکشی کرتے ہوئے جس کسی کی اطاعت کی جائے گی،
اس کا شمار شرک میں ہو گا۔ جو یقیناً ہم سب کو ناپسند ہے لہٰذا کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنی
زندگیوں میں یک رنگی اختیار کریں۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعتِ کلی کا قلادہ اپنے گلے میں ڈال لیں۔

اسی میں ہمارے لئے دین و دنیا کی بھلائی ہے وگرنہ اس اطاعت میں شرک کی آمیزش ہماری ساری محنت اور قربانی پر پانی پھیر دے گی۔

اس تفصیل میں جانے سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جائے گی کہ کلی اطاعت توحید کا عملی مظہ ہے اور اس اطاعت میں دوسروں کو شریک کرنا شرک ہی کی ایک قسم ہوگی خواہ اسے آپ خف کیوں نہ شمار کریں۔ اس اصول کو ذرا آگے بڑھایئے اور عملی معاملات پر اسے منطبق کیجئے صاف طور پر سمجھ میں آئے گا کہ اگر نفس کی اطاعت ہو رہی ہے تو یہ نفس پرستی کہلائے گی' آبا اجداد کی اندھی تقلید کی جارہی ہے تو یہ آباء پرستی ہوگی' اور انسان اگر دولت کا بچاری بن بیٹھ ہے تو اسے زر پرستی کہا جائے گا۔ اسی طرح کسی ملک کے نظام اجتماعی میں قانونی و دستوری سطح اگر کوئی "شخصِ واحد" اپنی اطاعت کا طلب گار ہے تو یہ "خدائی کا دعویٰ" ہے جو فرعون ۔ کیا اور اگر کوئی قوم کسی دوسری قوم کو اپنا غلام بنا کر اس کو حیوانوں کی سطح پر رکھے ہوئے ہے تو استبداد اور استعمار کی بدترین شکل ہے جس کی قرآن مجید میں مذمت فرمائی گئی۔ اور اسی پر بس نہیں' اس اصول کو آگے بڑھایئے تو انسان کو "وطن پرستی" بھی شرک نظر آئے گی او حاکمیتِ عوام کا نظریہ بھی شرک معلوم ہو گا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جزوی اطاعت کی یہ شکلیں جو جدید سیکولر دور میں بہت عام ہو گئ ہیں انسان کو اطاعتِ خداوندی سے منحرف کرنے والی ہیں اور ان سب کے ڈانڈے شرک ہ سے ملتے ہیں۔ یہ شرک ہی کے مختلف پرتو (SHADES) ہیں ان میں ظلمت و گمراہی کی شدت میں تو فرق ہو سکتا ہے مگر نوعیت میں کوئی تفاوت نہیں۔

اطاعت کے ساتھ ساتھ محبت بھی ضروری ہے!

اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اقرار کرنا اور پھر پوری زندگی میں اس "اطاعتِ کلی" ے وعدے کو نبھانا بڑا کٹھن اور مشکل کام ہے مگر اس کو مزید مشکل بنانے والی چیز انسان کی خود اپ اندر کی کیفیات و احساسات ہیں جو کبھی ایک جیسے نہیں رہتے بلکہ ہمہ وقت "مرغِ باد نما" کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سب کا ذاتی تجربہ ہے کہ کبھی تو آدمی بڑے شوق سے نماز پڑھتا ہے' دل کی آمادگی کے ساتھ اطاعت کرتا ہے مگر بسا اوقات ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے کہ انسان کو نماز کے لئے بھی اپنے آپ پر جبر کرنا پڑتا ہے۔

اگر یہ کیفیت کبھی کبھی ہو اور وقتی و عارضی ہو تو قابل عفو ہے اور اس کی توجیہہ کسل

ف اور دیگر اسباب سے کی جا سکتی ہے۔ مگر جب یہ کیفیت پھیلنی شروع ہو اور شوقِ عبادت
جذبۂ فدویت گھٹتا چلا جائے تو یقیناً خطرے کی بات ہے۔ ایسے ہی ایک گروہ کا نقشہ قرآن
ر میں مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچا گیا ہے جو اسی قسم کے روحانی مرض کے اگلے درجے
ں پہنچ چکے تھے۔

یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی وَلَا یُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَھُمْ کٰرِھُوْنَ

ترجمہ..... "وہ نماز کے لئے نہیں آتے مگر کسلمندی کے ساتھ اور نہیں خرچ کرتے مگر
ی ناگواری کے انداز میں۔" (سورۃ التوبہ)

جو لوگ روحانی اور باطنی طور پر اس درجہ بھٹک جائیں تو قرآن مجید کی اصطلاح میں ایسے
گوں کو "منافق" کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے اور دل کا یہ روگ ایسی بیماری ہے جس کا
بل ہم میں سے کوئی بھی برداشت نہیں کرنا چاہتا اور ہے بھی یہی صحیح کہ برداشت بھی نہیں کرنا
چاہئے کہ منافق وہ ہے کہ دنیا بھی گئی اور آخرت بھی خراب! ع
"نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ! نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے" اور آخرت میں ان کا
عبرتناک انجام ان الفاظ میں وارد ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

ترجمہ..... "یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے"۔

لہٰذا شعوری طور پر کوشش ہونی چاہئے کہ آدمی اس کیفیت کو اولاً تو اپنے اوپر مستولی نہ
ہونے دے اور اگر اس کا دیرپا سایہ پڑتا ہوا نظر بھی آئے تو اس سے جان چھڑانے کی فکر
کرے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نفاق کے اس مہلک مرض سے بچائے۔ آمین۔ اس لئے کہ
منافقت کے بالکل برعکس "ایمان" کی نشانی کے طور پر جو باتیں قرآن مجید اور احادیث نبویؐ
میں مذکور ہیں اس سے بندۂ مومن کی جو تصویر بنتی ہے وہ بالکل دوسری انتہا پر ہے۔ چنانچہ نبی
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے متعلق ہماری رہنمائی اور معیارِ حقیقت کے طور پر اپنی
کیفیت یوں بیان فرمائی۔ قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ "میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے"
اور...... اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن نماز بندۂ مومن کی معراج ہے۔

یا یوں فرمایا کہ دین کا بلند ترین مقام یہ ہے کہ

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ

ترجمہ...... "کہ تو اللہ کی بندگی کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے اگر ایسا نہیں تو وہ تو
دیکھ ہی رہا ہے"۔

یا فرمایا کہ جب تک انسان اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا
اس وقت تک مومن نہیں ہے مزید بر آں اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لازمی حصے اور
تقاضے کے طور پر فرمایا کہ۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُ کُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَ وَالِدِہٖ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِیْنَ

ترجمہ...... "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس
اولاد، اس کے والدین اور تمام انسان سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں"۔

بات بالکل واضح ہے کہ اگر کسی کی اطاعت اس طور پر کرنی ہے کہ دل میں کسل اور ج
اکراہ کی کیفیت نہ ہو تو اس ہستی سے محبت کا ہونا شرط لازم قرار پائے گا۔ اور جیسے جیسے اطاعت
کامل اور مکمل ہوتی چلے جائے گی محبت کا یہ جذبہ بھی اپنے کمال کی حدوں کو مس کرتا ہوا نظر
آئے گا۔ اطاعت اللہ تعالیٰ کی ہو اور چاہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی، جذبۂ فدویت
محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ اگرچہ محبت خداوندی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا اپنا
مقام ہو گا محبت خداوندی برتر اور سب سے اوپر ہو گی اور محبت رسول اور عشق محمدی
بہرحال اور بہر طور اس کے تابع ہی ہو گا۔ چنانچہ اطاعتِ کامل کے ساتھ جو محبت کامل کا درجہ
مطلوب ہے، قرآن میں اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں ان الفاظ میں ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا یُّحِبُّوْنَهُمْ کَحُبِّ اللّٰهِ
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

ترجمہ...... "اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر دوسری ہستیوں کو اس کا
مدِ مقابل بناتے ہیں اور ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہئے۔ اور اہل
ایمان سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں"۔

معلوم ہوا کہ اہل ایمان کی شدید ترین محبت اللہ تعالیٰ سے ہے اور اس کے برعکس
کافروں اور مشرکوں کا نقشہ یہ سامنے آیا کہ "وہ جن ہستیوں کی خدا کو چھوڑ کر اطاعت کرتے
ہیں ان ہستیوں سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسے خدا سے کرنی چاہئے گویا...... حاصل کلام کے
طور پر یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ اطاعت اور محبت کا چولی دامن یا جسم و جان کا تعلق

اسوۂ رسولؐ اور اتباع کا جذبہ

اطاعت اور فرماں برداری میں جو چیز مضمر ہے اور پوشیدہ سمجھی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر حکم کی اطاعت ضروری ہے اور ہر حکم بجالانا لازمی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا دین میں اطاعتِ کلی مطلوب ہے نہ کہ جزوی! یعنی کل زندگی میں اور روز مرّہ کے ذاتی اور نجی سے لے کر اجتماعی اور قومی معاملات تک میں یہ اطاعت درکار ہے۔

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا یہ راستہ جب انسان عملاً اور جذبہ صادق کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح اور لفظاً ((IN BLACK & WHITE)) احکام یقیناً زندگی کے بہت سے معاملات کا احاطہ کرتے ہیں لیکن زندگی کی بہت سی دشوار گزار گھاٹیوں میں رہنمائی کے لئے صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کا ایک "سراجِ منیر" ہی بندۂ مومن کی رہنمائی کرتا ہے جو دُور صراطِ مستقیم کے پرلے سرے پر پوری آب و تاب سے روشن نظر آتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ روز مرّہ زندگی کے عام معاملات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی انسانی زندگی ہی ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے اور اس کا زیادہ حصہ بھی حکماً نہیں "بیانیہ" انداز میں ہے جس سے حضورؐ کے معمولاتِ زندگی کا ایک خاکہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

عبادات اور احکام خداوندی کے ساتھ اسوۂ رسولؐ کا یہ نقشہ جس میں شادی بیاہ، نکاح و طلاق، رہن سہن، نشست و برخاست اور دیگر معاشی و معاشرتی معاملات میں ہماری رہنمائی موجود ہے یہی اسوۂ رسولؐ ہے اور حقیقتاً "سنت" کا لفظ اسی پوری زندگی کی روش پر ہی بولا جاتا ہے جو نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہمیں نظر آتی ہے۔ کہ ایک شخص عبدِ کامل کے مقام پر فائز ہو کر دین کی جدوجہد اور اس کی تبلیغ و تعلیم میں کس طرح منہمک نظر آتا ہے۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کے واضح احکامات کی تعمیل اور فرماں برداری تو اطاعت کہلائے گی جبکہ غیر واضح اور اشارہ و کنایہ بلکہ چشم ابرو کے اشارے سے دیئے گئے احکام کی بجا آوری کے لئے قرآن مجید کی اصطلاح "اتباعِ رسولؐ" کی ہے۔ اور اگر کسی کو آخرت کی بھلائی مطلوب ہے تو سر جھکا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اطاعت اور اتباع اختیار کر لے کامیابی یقینی ہے۔ اور کیوں نہ ہو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (آل عمران ۔ ۳۱)

ترجمہ..... کہہ دیجئے (اے نبیؐ) اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میرا اتباع کرو (نتیجۃً) اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔

اتباعِ رسولؐ سے مراد ہے کہ آدمی اپنی وضع قطع، شکل و صورت، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے کے انداز، آمد و رفت حتیٰ کہ زندگی کے پوشیدہ معاملات تک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو اختیار کرلے۔ اور سمجھے اور یقین کرے کہ ہر معاملے میں اس لئے ایک طریقہ اور اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں موجود ہے۔ اس کی تلاش کرے، اس کو سیکھنے کی کوشش کرے اور جیسے جیسے تفاصیل معلوم ہوتی چلی جائیں ان کو دائرۂ عمل میں لاتا چلا جائے اور حرزِ جان بناتا چلا جائے۔ یہ مقام بلند ایسا ہے کہ اتباعِ رسولؐ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات زندگی سے ایک گونہ مشابہت تو پیدا ہوتی ہی ہے، انسان خدا کا "محبوب" بن جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگ جاتے ہیں۔ اللہ اللہ اتنا اونچا درجہ جو ابنِ آدم حاصل کر سکتا ہے!

اتباعِ رسولؐ کے ذکر میں ایک پہلو عام طور پر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باریک اور چھوٹے چھوٹے معاملات میں تو پیروی کا معاملہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے مگر (جیسا کہ انسانی فطرت ہے) اس انہماک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی حیاتِ طیبہ کے چند نمایاں ترین اور سورج سے زیادہ روشن گوشے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ ہمارے معاشرے میں ایسے بھی مل جائیں گے۔ جنہیں مسنون دعائیں، اذکار تسبیحات، نشست و برخاست، وضع قطع حتیٰ کہ استنجاء کے لئے ڈھیلوں کی مطلوبہ تعداد کی تو فکر دامن گیر رہے گی (اور رہنی چاہئے) مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی کے بعض نمایاں گوشے مثلاً قرآن مجید کا یاد ہونا، رات کی طویل نمازیں، تبلیغ دین اور اس کے لئے محنت اور جدوجہد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، حلال کمانے اور کھانے کی کوشش اور سب سے بڑھ کر اقامتِ دین کے لئے محنت اور اپنے آپ کو کھپا دینے کا جذبہ جس میں ہجرت و جہاد کے مراحل محسوس و مشہود ہوں، ان کی زندگی سے بالکل غائب ہوں گے۔ یہ عدم توازن ہماری کم علمی اور ماحول میں دین سے مجموعی دوری کے سبب سے ہے۔ اس سے شعوری طور پر بچنے کی ضرورت ہے۔ ذاتی اور اجتماعی معاملات میں اور نجی اور گھریلو معاملات میں ہر پہلو سے اتباعِ رسولؐ کا یہ جذبہ یکساں طریق پر پروان چڑھنا چاہئے۔ ورنہ شدید

عدم توازن پیدا ہو گا جس سے نہ صرف انسان کی اپنی شخصیت یک رخی ہو جائے گی بلکہ سوچ اور فکر میں کجی پیدا ہونے کا اندیشہ بھی ہے جو نہایت خطرناک ہے۔

آخری بات

اطاعت، محبت اور اتباعِ رسولؐ کی جو وضاحت اوپر بیان ہو چکی ہے اس کو معیار بنا کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیں تو ایک تضاد ہمیں نظر آئے گا۔ قول اور فعل کا تضاد، ظاہر و باطن کا تضاد، بلاشبہ ہم خدا پرستی اور اتباعِ رسولؐ کو چھوڑ کر دنیا پرستی میں مبتلا ہو چکے ہیں اور آخرت کی زندگی پر دنیا کی زندگی کو ترجیح دے کر اسی "کم تر" کے حصول کے لئے رات دن سرتوڑ کوششوں میں مصروف ہیں۔ ہر طرف یہی دوڑ نظر آئے گی اور آج کے غیر مسلم اور مغربی معاشرے کا توذکر ہی کیا، خود مسلمان معاشروں میں بھی "ڈالر" اور دنیاوی عزت و جاہت کا حصول ہی مطمحِ نظر اور نصب العین ہو کر رہ گیا ہے۔

اندریں حالات عام مسلمان تو خوابِ غفلت میں ہیں ان سے کیا شکوہ! غنیمت ہیں وہ لوگ جو اس غفلت سے بیدار ہو کر ہوش میں آئے ہیں اور خدا اور رسولؐ کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو پہچان کر ان کی بجا آوری میں مشغول ہیں۔ ایسے خوش بخت لوگوں پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہیں۔

اولاً خود بھی جاگتے رہنا ہے، دنیاومافیہا کی محبت میں گرفتار نہ ہو کر صرف آخرت میں خدا کی رضا کی کوشش کرنا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دین پر عمل کرنا ہے اور دوسروں کے لئے بھی نمونہ بننا ہے اور اس کے غلبہ اور نفاذ کے لئے بھی سرتوڑ کوشش کرنا ہے حتیٰ کہ جان کی بازی بھی لگانا پڑے تو اس سے بھی گریز نہیں کرنا ہے۔ ثانیاً اپنے اعزہ و اقارب، حلقہ احباب اور محلہ اور شہر میں حسب استطاعت دوسروں کو بھی اس خواب غفلت سے جگانا ہے۔ دلسوزی اور ہمدردی کے ساتھ انہیں اپنے نقصان کا احساس دلانا ہے او[ر] انہیں بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی طرف لانا ہے ان کے اندر بھی وہی سوزِ دروں او[ر] جذبۂ عمل پیدا کرنا ہے کہ وہ خود بھی ایک داعی بن کر کھڑے ہوں اور دوسروں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔

ثالثاً اس تمام عرصے میں اور زندگی کے تمام گوشوں میں رخصت کے بجائے عزیمت کا پہلو اختیار کرنا ہے، تاکہ بہت سے دوسرے ضعیف اور کمزور ساتھیوں کو نشان راہ مل سکے

(باقی صفحہ ۲ پر)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی شخصیت

اور

مولانا ابوالکلام آزاد

کے بارے میں ان کے خیالات و تأثرات

★★★

تحریر: مولانا محمد اسحاق بھٹی

(بشکریہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور)

★★

مولانا محمد اسحٰق بھٹی کی یہ تحریر ماہنامہ قومی ڈائجسٹ کے اکتوبر ۸۸ء کے شمارے میں صرف 'مولانا سعید احمد اکبرآبادی' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اور اس پر ادارۂ قومی ڈائجسٹ نے حسب ذیل نوٹ درج کیا ہے:

سابق صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق شہید کے اُستادِ محترم، برِصغیر کی ایک بلند پایہ علمی شخصیت، کلکتہ کے ایک دینی مدرسے کے پرنسپل، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے رُوحِ رواں، "ندوۃ المصنّفین" کے بانی، رسالہ "برہان" کے مدیرِ اعلیٰ، قریباً ایک درجن کتابوں کے صاحبِ نظر مصنّف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار کی علمی کاوشوں اور داخلی و خارجی زندگی کا نقاب کُشا تذکرہ جو بہت سے لوگوں کے لیے حیران کُن بھی ہوگا اور معلومات افزا بھی! ایک ایسے شخص کی دِل کُشا باتیں جس کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا واقعتاً تصنیف و تالیف رہا۔

اُن کے قریبی دوست محمد اسحاق بھٹی کے قلم سے

اس تعارفی نوٹ سے تو گمان ہوتا ہے کہ اس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی شخصیت اور اُن کے سوانح و خدمات کا تذکرہ ہوگا لیکن ۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی اس تحریر کے ۹ صفحات

اس تقریر پر مشتمل ہیں جو مولانا موصوف نے ۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء کو جناح ہال لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات کی اس نشست میں کی تھی جس کا عنوان تھا " مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار اور ان کے علمی و عملی کارنامے " ـــــ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس کے عنوان میں چند الفاظ کا اضافہ کر کے اسے موضوع اور مشمولات کے مناسب بنا دیا ہے ـــ یہ تقریر اب سے بہت پہلے ٹیپ سے اتار کر انجمن کے مجلّہ 'حکمتِ قرآن' میں شائع کر دی گئی تھی ۔ بعد ازاں اسے 'حکمتِ قرآن' ہی سے لے کر ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے کچھ توضیحی اور بعض اختلافی حواشی کے ساتھ نہایت آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا تھا جس کا عکس راقم کی کتاب " جماعت شیخ الہندؒ " کا مستقل جزو بن چکا ہے ! ـــــ اب مولانا اسحٰق بھٹی صاحب کی یہ تحریر ایک اضافی شہادت کے طور پر شائع کی جا رہی ہے ، تاکہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جو خیالات اپنی اُس تقریر میں ظاہر فرمائے تھے اُن کی ان کے ساتھ نسبت میں کسی کو شک نہ رہے ـــــ مولانا اسحٰق صاحب کا حافظہ قابلِ داد بلکہ قابلِ رشک ہے کہ انہوں نے محض سن کر تقریر کو اتنی تفصیل اور صحت کے ساتھ تحریر فرما دیا ـــــ اس تقریر کے علاوہ اس تحریر میں چند باتیں مزید بھی ہیں جو یقیناً قارئین کی دلچسپی کی موجب ہوں گی ـــــ

اسرار احمد

۱۹۶۹ء کے مئی کا مہینہ تھا اور دن کے دس گیارہ بجے کا وقت تھا کہ ایک صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ لائے اور سب سے پہلے مولانا محمد حنیف ندوی کے کمرے میں آئے (اب کئی سال سے اس کمرے میں دفتر ہے) حُسنِ اتفاق سے مَیں وہیں بیٹھا تھا۔ لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف مرحوم ان کے ساتھ تھے۔ شیخ صاحب ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا : " یہ ہیں ۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ـ ! "

مولانا حنیف ندوی ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مَیں بھی جلدی سے اُٹھا اور دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ رفقائے ادارہ میں سے سید محمد جعفر شاہ پھلواروی اور رئیس احمد جعفری کو اطلاع دی گئی ، وہ بھی آ گئے اور یہ حضرات ا[illegible] باتیں کرتے رہے۔ میری حیثیت سامع کی تھی ۔ مَیں خاموش بیٹھا ان کی باتیں سُنتا رہا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو مَیں نے پڑھا تو تھا لیکن ان کو دیکھنے اور ان کی باتیں سُننے کا اتفاق آج پہلی دفعہ ہوا۔ پورا مناسب جسم ، نہ فربہ نہ دھان پان۔ گندمی سا رنگ ، سر پر قراقلی ٹوپی۔ پاجامہ ، کرتہ اور ہلنڈری شیروانی زیبِ تن۔ معتدل ڈ[illegible] سیاہ اور سفید بالوں کا خوبصورت مجموعہ۔ گفتگو کا انداز نہایت دھیما۔ بات چیت میں توازن کا غلبہ اور لہجے میں اعتدال کی فرا[illegible]

اس سے دو سال قبل ۱۹۶۷ء میں مولانا حنیف ندوی کی کتاب " عقلیاتِ ابن تیمیہ " شائع ہوئی تھی جو تبصرے کے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو بھیجی گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ماہانہ رسالے " برہان " میں اس پر تبصرہ کیا تھا۔ مولانا ندوی کو تبصرے کے بعض پہلوؤں سے متعلق مولانا اکبر آبادی سے دوستانہ شکوہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مولانا اکبر آبادی نے یا تو کتا[ب] اچھی طرح پڑھی نہیں یا ایک علمی موضوع کے بارے میں معاصرت سے کام لیا ہے یا پھر اس لیے ان کے ساتھ انصاف نہ[یں] کیا گیا کہ وہ ان کے حلقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ اس کا ذکر مولانا ندوی اپنی محفلِ احباب میں کئی دفعہ کر چکے تھے۔ اب مولانا اکبر[آبادی] تشریف لائے تو خیر خیریت کے بعد مولانا ندوی نے اس موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ مولانا ندوی کا اندازِ گفتگو قدرے

...عانہ" تھا۔ مولانا اکبر آبادی کا اسلوبِ کلام ان کے مقابلے میں نرم بلکہ کہنا چاہیے "مدافعانہ" تھا۔ وہ تقریباً ایک ... یہاں رہے۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کے بارے میں چند باتیں پوچھیں اور رفقائے ادارہ سے ... مصنفین، ہندوستان کے دیگر علمی و تحقیقی اداروں اور بعض اشخاص سے متعلق ان سے دریافت کیا اور وہ تشریف لے گئے۔

... سے کوئی پانچ سال بعد ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت پر انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام منعقدہ قرآنی محاضرات میں شریک ... اس موقعے پر مَیں بھی مدعو تھا اور مجھے "برصغیر پاک و ہند میں علمِ حدیث، عہدِ تابعین میں" کے موضوع پر مقالہ پیش کرنا ... پہلی مرتبہ ان سے ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔ اس وقت میری کتاب سلسلۂ "فقہائے ہند" کی چند جلدیں چھپ ... اور ان کے مطالعے میں آچکی تھیں۔ ان کے بارے میں مجھ سے بعض باتیں پوچھیں، کچھ مفید مشورے دیے۔ برصغیر کے ... فقہا کے متعلق گفتگو ہوئی اور از راہِ کرم میرے کام کی تحسین فرمائی۔

... ۱۹۸۴ء میں وہ پھر پاکستان آئے۔ اب کی مرتبہ قاضی اطہر مبارک پوری اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ فارسی کے صدر ... احمد بھی ان کے ساتھ تھے۔ ۲۲ مارچ کو یہ تینوں حضرات ادارہ ثقافتِ اسلامیہ تشریف لائے لیکن اس دن میری طبیعت ... تھی اور مَیں دفتر نہیں جا سکا تھا۔ دوسرے حضرات بھی دفتر سے جا چکے تھے۔ یہ تینوں بزرگ مجلسِ ترقیٔ ادب کے ... جناب احمد ندیم قاسمی سے ملے اور میرا ذکر کیا۔ اتفاق سے قاسمی صاحب کے پاس اس وقت جناب میرزا ادیب صاحب ... فرما تھے۔ میرے گھر سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ان کا مکان ہے، وہ میرے مہربان ہیں اور ایک دوسرے ... ہماری آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ قاسمی صاحب نے میرزا ادیب صاحب کی معرفت مجھے پیغام پہنچایا کہ ہندوستان ... اہلِ علم بزرگ پنجاب گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور تمہیں ملنا چاہتے ہیں۔ مَیں شام کو وہاں پہنچا تو یہ حضرات ... نہیں تھے، کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد آئے تو نہایت تپاک سے ملے اور ایسے معلوم ہوا کہ ہم میں سے ... کے درمیان کوئی ذہنی فاصلہ نہیں ہے اور سب ایک ہی نقطۂ فکر کے حامل ہیں۔

قاضی اطہر مبارک پوری ہندوستان کے ممتاز سکالر اور عربی اور اردو دونوں زبانوں کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اگست ... میں ان کو عربی زبان کی خدمت کے سلسلے میں صدرِ ہندوستان کی طرف سے صدارتی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ ۱۹۷۸ء میں ... یہ لاہور آئے تھے اور مولانا عطاء اللہ حنیف (مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ، لاہور) کے ہاں گئے تھے تو مجھے بھی یاد فرمایا تھا اور ... ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور قاضی اطہر مبارک پوری سے پہلے سے آشنائی تھی۔ ڈاکٹر ... احمد کی بعض کتابیں اور ان کے کچھ مضامین و مقالات تو ہندوستان کے بعض رسائل و جرائد میں پڑھے تھے لیکن ان سے ... ملاقات پہلی دفعہ ہوئی۔

قاضی اطہر مبارک پوری نے اس ملاقات میں عربی زبان کی اپنی تصنیف شدہ چند کتابیں از راہِ نوازش مجھے عطا فرمائیں۔ مولانا اکبر آبادی نے میری حقیر سی تصنیفی خدمات کو سراہا اور "المعارف" کو (جو میری ادارت میں شائع ہوتا ہے) معیاری رسالہ ... دیا۔ اس کے بعض مضامین کو جو اس عاجز نے لکھے ہیں، بالخصوص لائقِ تعریف گردانا۔ یہ ان کی مہربانی اور مجھ پر شفقت کی ... تھی اور ظاہر ہے ان کی یہ باتیں میرے لیے حوصلہ افزائی اور مسرت کا باعث تھیں۔ مجموعی اعتبار سے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ... علمی کاوشوں اور اس کی مطبوعات کی انہوں نے بہت تحسین فرمائی۔ بلاشبہ وہ اونچے مرتبے کے اہلِ علم اور صاف دل صاحب ... تھے اور ان کی یہ باتیں ان کے وسعتِ قلب کی آئینہ دار تھیں۔

مَیں شام کو ساڑھے چھ بجے ان سے ملا تھا، گیارہ بجے تک ان کی مجلس میں رہا۔ اس اثنا میں بہت سی باتیں ہوئیں اور پاکستان ... ہندوستان کے مختلف اداروں اور افراد کی علمی سرگرمیوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔

یہ تینوں حضرات حکومت پاکستان کی دعوت پر آئے تھے اور اسلام آباد کی ایک سرکاری تقریب میں شرکت کے بعد لاہور آئے ہوئے تھے۔ یہ رات انہوں نے حکومت کے مہمان کی حیثیت سے پنجاب گیسٹ ہاؤس میں بسر کی۔ دوسرے دن ۲۴ مارچ کو علی الصبح قاضی اطہر مبارک پوری اور ڈاکٹر نذیر احمد تو اپنے وطن ہندوستان تشریف لے گئے لیکن مولانا سعید احمد اکبر آبادی اپنے داماد پروفیسر محمد اسلم (شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی) کے مکان پر سمن آباد چلے گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر اسرار احمد کے منعقد کردہ محاضرات قرآنی میں شرکت کرنا تھی۔

۲۵ مارچ سے ۲۸ مارچ (۱۹۸۴ء) تک جناح ہال (لاہور) میں انجمن خدام القرآن کی طرف سے ڈاکٹر اسرار احمد نے محاضرات قرآنی کا اہتمام کیا۔ اس کی صدارت کے فرائض مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے انجام دیے۔ ۲۷ مارچ کی شب کو خود مولانا اکبر آبادی کی تقریر تھی۔ تقریر کا موضوع تھا: "مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار اور ان کے علمی و عملی کارنامے"۔ تقریر سے پہلے میں نے ان سے کہا بڑا عجیب و غریب موضوع آپ کو دیا گیا ہے۔ وہ مسکرائے اور کہا: "اچھا جو خدا کو منظور!"

ہال میں کرسیوں کا انتظام تھا اور تقریر سے پہلے ہی ان پر سامعین نے قبضہ جما لیا تھا۔ نیچے فرش پر بھی بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ سٹیج بھی حاضرین سے بھر گیا تھا۔ گیلری بھی پر تھی اور ہال اچھی خاصی وسعت کے باوجود اپنی تنگ دامانی پر نالاں تھا۔ برآمدے میں بھی لوگ کھڑے تھے اور باہر بھی جہاں تک لاؤڈ سپیکر کی آواز پہنچ سکتی تھی، لوگ موجود تھے۔ میرے خیال میں جناح ہال نے اتنا ہجوم کبھی نہیں دیکھا ہوگا، جتنا آج مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تقریر میں دیکھا۔

مولانا ابوالکلام کے انہوں نے کئی واقعات بیان کیے۔ طرز ادا نہایت دلچسپ اور انداز کلام انتہائی دلکش۔ میں نے ان کی تقریر پہلی مرتبہ سنی تھی اور ان کے قریب ہی سٹیج پر بیٹھا تھا۔ ہم پاکستانیوں کے نقطۂ نظر سے موضوع بہت نازک تھا اور اس بنا پر اور بھی نازک تھا کہ مقرر مولانا آزاد کے مداح بلکہ معتقد تھے اور ہندوستانی باشندے تھے۔ فاضل مقرر کو داد دینی چاہیے (اور تقریر کے دوران سامعین نے داد دی) کہ نہ کہیں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹا، نہ کسی موقعے پر فرطِ عقیدت نے زبان کو حدِ اعتدال سے باہر نکلنے دیا اور نہ تقریر کی روانی میں فرق آیا۔ یہ ان کا کمال تھا جس سے سامعین بے حد متاثر ہوئے۔ تقریر ڈیڑھ گھنٹے تک جاری رہی اور لوگوں نے نہایت اطمینان اور دلچسپی سے سنی۔

انجمن خدام القرآن کے ارباب انتظام نے تو اسے مقرر کی آواز میں ٹیپ کر لیا تھا لیکن میں اس سہولت سے محروم تھا۔ اس لیے جیسے جیسے فاضل مقرر کے الفاظ ان کی زبان سے نکل کر میرے پردۂ سماع سے ٹکراتے جاتے تھے، میں انہیں اپنے ذہن میں محفوظ کرتا جاتا تھا۔ پھر چند روز بعد اسے قلم و قرطاس کی گرفت میں لے آیا تھا۔ ممکن ہے اس میں روایت لفظ کی زیادہ پابندی نہ رہی ہو کہیں کہیں روایت بالمعنیٰ کی آمیزش بھی ہو گئی ہو، اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے۔

آئیے اب مولانا اکبر آبادی کی تقریر سنیے۔ انہوں نے مولانا آزاد کے متعدد واقعات بیان کیے۔ میں نے ہر واقعے پر گول دائرے میں نمبر لگا دیے ہیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا: مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر سے مجھے عزیز لکھنوی کا یہ شعر یاد آرہا ہے۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

① مولانا آزاد کے بارے میں کچھ باتیں تو وہ ہیں جو میرے سامنے ہوئیں اور میں نے ان سے سنیں اور کچھ وہ ہیں جو

نے بزرگوں اور اکابر علما سے معلوم ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور پھر کسی نہ کسی صورت میں یہ
سلسلہ ان کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) تک جاری رہا۔ وہ انتہا درجے کے جینئس اور نابغہ شخصیت تھے۔ ذہانت و فطانت،
حفظ و اتقان اور علم و ادراک میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا۔ مختلف موضوع کی کتابوں پر انہیں اس قدر عبور و استحضار تھا کہ وہ
ہر معنوں میں چلتا پھرتا کتب خانہ تھے۔ انہوں نے تعلیم کہاں حاصل کی؟ کس عالم سے کیا پڑھا؟ اس کا کچھ پتا نہیں چلتا۔
خود انہوں نے اس کی وضاحت فرمائی اور نہ کبھی کسی نے ان سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی۔

(۲) اُن کے والد مولوی خیر الدین کلکتہ اور اس کے قرب و جوار کے بہت بڑے پیر اور صاحبِ طریقت تھے۔
ے بڑے لوگ ان کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے، جن میں سیٹھ اور دولت مند لوگ بھی تھے اور قدیم و جدید کے ماہر علما بھی۔
لوم ہوتا ہے مولوی خیر الدین مرحوم نے انہی میں سے جو جس علم کا ماہر تھا، اسے بیٹے کی تعلیم پر مقرر کر دیا تھا۔

(۳) مولانا کو شروع ہی سے پیری مریدی کے اس انداز سے جو ان کے گھر میں رائج تھا، نفرت تھی اور وہ اس سے
دت کا اظہار کرتے تھے۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے اس سلسلے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ پیرزادہ اور صاحب زادہ
، اور ان کا گھر روحانی فیض حاصل کرنے والوں کا مرجع تھا، اس لیے لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان کے انکار
، باوجود لوگوں نے ان سے اپنے گھر میں یہ سلسلہ جاری رکھنے پر بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہفتے میں دو دن
رات اور ہفتے کو آجایا کرو۔ میں درسِ قرآن دیا کروں گا اور مسائل بتایا کروں گا لیکن روپے پیسے یا نذرانہ قبول نہیں کروں گا۔
سلسلہ کچھ عرصہ چلا، پھر بند کر دیا۔

(۴) مولانا بہت زیادہ ذہین، اونچے مرتبے کے عالم اور بلند پایہ مصنف و مقرر تھے۔ اگر اپنے باپ کا سلسلۂ مشیخت
ی رکھتے تو اس میں نہایت کامیاب رہتے۔ مگر یہ ان کی افتادِ طبع کے خلاف تھا۔

(۵) آزادیٔ وطن سے ٹھیک دو ماہ بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مولانا آزاد نے ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی،
ولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو لنچ پر بلایا۔ میں ان حضرات سے چھوٹا تھا، مجھے نہیں بلایا گیا تھا لیکن مَیں
ی ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ میں اس قسم کی دعوتوں میں ان کے ساتھ نتھی ہو جاتا تھا (یہ الفاظ مولانا اکبر آبادی نے مسکراتے ہوئے
ہائے) کھانے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ میں دو باتیں کہنا
ہتا ہوں —

ایک یہ کہ ہم قیامِ پاکستان کے مخالف تھے اور ہمارے نزدیک نیک نیتی سے یہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے
سائل اور ان کی مشکلات کا صحیح حل نہ تھا۔ لیکن اب پاکستان بن گیا ہے۔ ہمیں پاکستان اور تحریکِ پاکستان کے رہنماؤں کی مخالفت
ں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالنا چاہیے۔ بلکہ نہایت اخلاص کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو، پاکستان اور وہاں کے مسلمانوں
مدد کرنی چاہیے اور دعا کرنی چاہیے کہ پاکستان قائم اور مستحکم رہے۔ اگر خدانخواستہ پاکستان کو کوئی نقصان پہنچا تو ہندوستان اور پاکستان
ونوں ملکوں کے مسلمان کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے نزدیک ہندوستان کے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنی کوئی علٰحدہ
تنظیم نہیں بنانی چاہیے، برادرانِ وطن کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے زور دے کر کہا: لیکن یہ
رکھیے کہ اپنے مذہب اور تہذیب و ثقافت کی حفاظت ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ مولانا آزاد نے اس موقعے پر دائیں ہاتھ
حرکت دیتے ہوئے کہا: "اس پر کوئی کمپرومائز نہیں ہو سکتا۔" (مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی زبان سے یہ الفاظ بیان کرتے
ہوئے دائیں ہاتھ کو حرکت دی اور کہا: "مولانا نے یوں کیا۔")

(۶) جب مجھے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنایا گیا۔ (اس منصب پر ان کو مولانا آزاد نے فائز کیا تھا) تو شیخ الحدیث
مسند جمعیت علمائے ہند کے مشہور عالم مولانا عبدالحلیم صدیقی کے سپرد ہوئی۔ اس کے لیے ان سے تین سال کا معاہدہ
ہوا تھا۔ یہ مدت ختم ہوئی تو میں نے ان کو علٰحدہ کر دیا۔ مولانا عبدالحلیم صدیقی عربی کے بہت بڑے ادیب تھے۔ لیکن علم حدیث
میں زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے۔ میں علم حدیث کے کسی ماہر عالم کو اس منصب پر لانا چاہتا تھا اور میرے نزدیک مولانا
حبیب الرحمٰن اعظمی اس کے لیے زیادہ موزوں تھے۔ اس اثنا میں میں دہلی آیا۔ مولانا کو پتا چلا تو ایک دن اپنے پرائیویٹ
سیکرٹری اجمل خاں صاحب سے مجھے ٹیلی فون کرایا کہ میں کل صبح نو بجے پارلیمنٹ ہاؤس میں مولانا سے ملوں۔ میں وہاں پہنچا
وہ ٹھیک نو بجے تشریف لائے۔ پہلے خیر خیریت پوچھی۔ پھر فرمایا :

"مجھے معلوم ہوا ہے۔ آپ نے مولوی عبدالحلیم صدیقی کو ملازمت سے الگ کر دیا ہے۔"

میں نے کہا : "جی ہاں — !"

فرمایا : "کیوں ؟"

عرض کیا : "وہ عربی ادبیات اور دیگر علوم میں تو درک رکھتے ہیں۔ لیکن علم حدیث میں انہیں مہارت حاصل نہیں۔ شیخ
الحدیث کا منصب بہت بڑا منصب ہے۔ میں اس منصب پر کسی ایسے شخص کو لانا چاہتا ہوں جو حدیث کا ماہر ہو۔"

فرمایا : "علم حدیث میں مہارت سے آپ کی کیا مراد ہے ؟"

عرض کیا : "علم حدیث کے بہت سے شعبے ہیں۔ علم رجال، اقسام حدیث، راویوں کے بارے میں معلومات وغیرہ۔"
مولانا نے میری بات سُنی تو علم حدیث اور اس کے متعلقات پر تقریر شروع کر دی۔ رمضان کا مہینہ تھا، گرمیوں کے دن
تھے اور مولانا روزے سے تھے۔ حدیث، رجال حدیث، رواتِ حدیث، اقسام حدیث، کتبِ حدیث، شروح حدیث، تدوین
حدیث اور ہندوستان میں علم حدیث کی آمد اور ترویج و اشاعت پر دو گھنٹے تقریر کی اور ایسے نکات بیان کیے جو نہ میرے
علم میں تھے اور نہ کبھی سُنے تھے۔ تقریر ختم ہوئی تو فرمایا : "مولوی عبدالحلیم کو اپنی جگہ پر رہنے دیجیے۔ اب آپ کو کوئی انور شاہ
ملے گا نہیں، انہی کو شیخ الحدیث ماننا اور انہی سے کام لینا ہوگا۔"

میں اجازت لے کر آنے لگا تو فرمایا : "میری بات آپ کو یاد رہے گی ؟"

میں نے کہا : "صاحب ! کیا میں آپ کا فرمان بھول کر آپ سے دشمنی کروں گا۔"

پھر دو دفعہ فرمایا : "اللہ آپ کو جزائے خیر دے ! اللہ آپ کو جزائے خیر دے !!"

(۷) مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بے پناہ ذہانت اور کتابوں پر عبور و استحضار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ
۱۹۲۰ء میں مجلسِ خلافت کی جو کانفرنس آگرہ میں مولانا آزاد کے زیرِ صدارت ہوئی تھی، میں اس میں شریک نہیں تھا مولانا نے
اس میں "خلافت اور جزیرۃ العرب" کے موضوع پر زبانی خطبہ دیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ وہ خطبہ اس قدر عالمانہ اور محققانہ تھا
کہ علمائے کرام اس میں موجود تھے، وہ مولانا کے خطبے سے انتہائی حیران اور متعجب تھے کہ یہ شخص کس قدر روانی سے
کتابوں کی عبارتیں پڑھ رہا ہے اور باقاعدہ کتابوں کے حوالے دے رہا ہے۔

(۸) مولانا آزاد، امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم سے بہت متاثر تھے اور ان کی تمام کتابیں مولانا کے کتب خانے میں
تھیں۔ مولانا کی وفات کے بعد حکومتِ ہند نے آزاد بھون کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے، مولانا کا کتب خانہ اس میں
منتقل ہو گیا ہے۔ اس میں ہر موضوع کی کتابیں موجود ہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ مولانا نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ان پر
ان کے حواشی ہیں۔ حکومتِ ہند نے ایک محکمہ قائم کر کے ایک صاحبِ علم کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ مولانا کے حواشی

رلی۔ یہ کام ہو رہا ہے۔

(۹) مولانا نہایت خوددار تھے اور وقار سے زندگی بسر کرتے تھے۔ ان پر انتہائی مالی پریشانی کا دور بھی آیا لیکن وہ اس کا
سے اظہار نہ کرتے تھے۔ جس زمانے میں وہ تفسیر ترجمان القرآن کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، اس زمانے میں ان کے کاتب منشی عبدالقیوم
جو کانپور کے رہنے والے تھے اور چھ سات مہینے تفسیر کی کتابت کے سلسلے میں مولانا کے پاس رہے تھے۔ اس کے بعد وہ
سے پاس "برہان" میں آگئے تھے اور اس کی کتابت کرتے تھے۔ وہ ان کی زندگی کے عجیب و غریب واقعات سنایا کرتے
مثلاً منشی عبدالقیوم نے بتایا کہ مولانا کلکتے کے علاقہ بالی گنج میں ایک دو منزلہ کوٹھی میں رہتے تھے اور اس کا پانچ سو روپے
کرایہ تھا۔ مولانا کی مالی حالت اس زمانے میں اتنی کمزور تھی کہ انہیں مجبوراً کوٹھی کا نیچے کا حصہ کرائے پر دینا پڑا۔ اس
ہیں ان پر ایسا وقت بھی آیا کہ غربت کی وجہ سے ان کا چولہا نہ جلتا تھا۔ ان کے ملازم کا نام احمد تھا۔ وہ احمد کو ایک چونی دیتے
آہستہ سے کہتے، دو روٹیاں اور دال لے آؤ۔ مولانا اور ان کی بیوی ایک ایک روٹی دال کے ساتھ کھا کر گزارہ
تے تھے۔

اسی دوران ایک دن مولانا سے ملاقات کے لیے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو ان کے گھر آئے۔ مولانا کا ایک ہی
تا تھا جو وہ پہنتے تھے۔ کھدر کی قمیص مونڈھے سے پھٹی ہوئی تھی۔ مولانا کو ان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو پھٹی ہوئی قمیص کو
ہپانے کے لیے اوپر چادر اوڑھ لی۔ اسی حالت میں بیٹھے ان سے باتیں کرتے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ مولانا تنگ دستی کے
ہے ہیں۔ انہوں نے اس کا کچھ اشارہ کیا تو فرمایا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے"۔

(۱۰) مولانا کسی کے خلاف کوئی بات نہ کہتے تھے۔ ان کا ایک خاص موقف تھا جس کا وہ کھل کر اظہار کرتے تھے
ن کسی کی مخالفت کرنا یا کسی کے بارے میں حرفِ شکایت زبان پر لانا وہ جانتے ہی نہ تھے۔ (مولانا اکبر آبادی نے بتلایا)
لعہ احمد نگر سے رہائی سے کچھ عرصہ بعد وہ دہلی سے الٰہ آباد جا رہے تھے۔ ان کی ٹرین علی گڑھ پہنچی تو مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے ریلوے
سٹیشن پر ان کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا اور نہایت نازیبا حرکات کیں۔ جواہر لال کو پتا چلا تو وہ الٰہ آباد میں ان کی عیادت
آئے اور اس حادثے پر اظہارِ افسوس کیا۔ مولانا نے مسکرا کر فرمایا، یہ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے۔ طلبا ہمارے بچے ہیں
در بچے والدین سے کچھ کہیں تو انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ آئندہ ہمیں انہی سے کام لینا ہے، ان کی باتیں سننی اور برداشت
کرنی چاہئیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے جب یہ واقعہ بیان کیا تو ایک بات مجھے بھی یاد آئی۔ کئی سال ہوئے ہندوستان کے ایک
صاحب جو مسلمان تھے، لاہور آئے اور ہمارے دفتر ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لائے۔ مجھ سے ان کی ملاقات ہوا
دھر ادھر کی چند باتوں کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔ وہ ہندوستان کے محکمۂ تعلیم میں ایک
اعلیٰ منصب پر فائز تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ایک دن کسی محکمانہ کا
کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمت میں گئے۔ مولانا وزیرِ تعلیم تھے۔ محکمے کے چند افسر وہاں موجود تھے۔ مولانا نے میری طرف
دیکھا تو فرمایا "آپ کو کہیں دیکھا ہے"۔ ان کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔ اس لیے کہ علی گڑھ ریلوے سٹیشن
پر جن طلبا نے مولانا کے خلاف مظاہرہ کیا تھا، میں ان میں پیش پیش تھا اور اب کئی سال بعد ان کے ماتحت تھا اور انہ
نے مجھے پہچان لیا تھا۔ لیکن یہ بات مولانا نے یہیں ختم کر دی اور میرے ساتھ ہمیشہ شفقت کا برتاؤ کرتے رہے۔

(۱۱) مولانا اکبر آبادی نے فرمایا کہ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے ہندوستان کے تعلیمی، ثقافتی، تہذیبی اور تصنیفی اداروں
حفاظت کے لیے بھرپور کوششیں کیں اور حکومت کی طرف سے انہیں گراں قدر مالی امداد دلائی۔ مثلاً دائرۃ المعارف حیدرآ

(دکن) مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، دار المصنفین اعظم گڑھ، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور بعض دیگر اداروں کا جو ہندوستان کے مسلمانوں علمی اور ثقافتی مراکز ہیں، حفظ و بقا مولانا آزاد ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مولانا نے ان کے لیے لاکھوں روپے کی سالانہ امداد منظور کرائی جو ان اداروں کو باقاعدہ حکومت ہند کی طرف سے مل رہی ہے۔

(۱۲) مولانا آزاد سے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے تعلق خاطر کے بارے میں مولانا اکبر آبادی نے بتایا کہ شیخ ان کے بہت مداح تھے اور ان کی تحریریں ذوق و شوق سے سنتے اور پڑھتے تھے۔ وہ "الہلال" کے منتظر رہتے۔ جونہی الہلا پڑھنا یا سننا شروع کر دیتے اور اول سے آخر تک تمام مضامین کا مطالعہ کرتے۔

(۱۳) مسجد کانپور کے سلسلے میں مولانا آزاد نے الہلال میں مدلل اور زوردار مقالے لکھے تھے۔ جن سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک خاص جوش اور جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دنوں یو پی کا انگریز گو، جیمس مسٹن دار العلوم دیو بند گیا مولانا آزاد بھی وہاں پہنچ گئے۔ لیکن مولانا کو دروازے پر روک دیا گیا۔ دار العلوم کے احا میں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ گورنر دار العلوم کے اندر وہاں کے علما اور اصحاب انتظام سے گفتگو کر رہا تھا اور مولانا باہر کھڑ شیخ الہند ان دنوں بیمار تھے اور گھر میں تھے۔ وہ دار العلوم میں گورنر کی آمد کے خلاف تھے۔ انہیں مولانا آزاد کی تشریف آو کا پتا چلا تو آدمی بھیج کر مولانا کو گھر پر بلایا۔ نہایت احترام سے پیش آئے اور فرمایا میں نہیں چاہتا تھا کہ گورنر کو دار العلوم میں آ کی دعوت دی جائے۔ یہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے۔ انہوں نے مولانا کو دعا دی اور ان کی تعریف کی۔ فرمایا مجھے افسوس آپ کو دار العلوم میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

دوران گفتگو میں مولانا آزاد نے شیخ الہند سے پوچھا: آپ میری اور الہلال کی اتنی تعریف کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا اس لیے کہ آپ نے ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور الہلال میں جرأت مندی کے ساتھ وہ موقف اختیار کیا ہے جو اور کو نہیں کر سکا تھا۔

(۱۴) مولانا اکبر آبادی نے مولانا آزاد کی بیعت اور ان کو امام الہند بنانے کا واقعہ بھی بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہند کے اکثر علما جن میں اہل حدیث اور دیو بندی حضرات شامل تھے۔ مولانا کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور انہیں امام الہند بنانا چ تھے۔ لیکن دیو بند کے مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور ہمارے استاد مولانا انور اس کے مخالف تھے۔ ے نزدیک اختلاف کی چند وجوہ تھیں۔

ایک یہ کہ مولانا آزاد اگرچہ بہت بڑے عالم، ذہین اور تحریر و تقریر میں بے مثال ہیں، لیکن کسی دار العلوم کے باقا سند یافتہ نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ نوجوان ہیں اور ان کے مقابلے میں بہت سے بزرگ علما اس ملک میں موجود ہیں۔

تیسری یہ کہ مولانا علم و فضل کے باوجود اتقا اور پرہیز گاری میں اس مقام پر نہیں ہیں جس کا یہ منصب تقاضا کر چوتھی وجہ وہ حضرات یہ بیان کرتے تھے کہ جن امور کے نفاذ کے لیے بیعت کرنے اور امام الہند بنانے کا منصوبہ گیا ہے۔ انہیں اس ملک میں نافذ کون کرے گا؟ اس کے لیے قوت تنفیذیہ کا پایا جانا ضروری ہے جو موجودہ دور غلا میں ممکن نہیں۔

(۱۵) مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کسی مسئلے کو زیر بحث لاتے تو اس کے تمام گوشوں کی وضاحت کرتے اور اپنے موقف کی تائید میں ایسے ایسے دلائل بیان فرماتے کہ کوئی اس کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ انہوں نے م محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے بتایا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی کا مولانا آزاد کے ہاں بہت آنا

تھا۔ جوش خدا کو نہیں مانتے تھے (اور بقول مولانا اکبر آبادی کے) "عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اس سلسلے میں ان سے کم درجے کے نہ تھے": "ایک دن یہ دونوں مولانا آزاد کے مکان پر ان کے پاس بیٹھے تھے کہ مولانا نے ان سے کہا: میرا آپ سے بہت عرصے سے تعلق ہے۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا جو اب تک نہیں کہی۔ یہ زندگی کا آخری دور ہے۔ میں چاہتا ہوں، اب یہ فرض ادا کر دوں۔

انہوں نے پوچھا: ایسی کون سی بات ہے؟

فرمایا: میں خدا کے وجود کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ کل دس بجے یہاں آجایئے۔

مولانا عبدالرزاق نے اسی شام یہ بات مسجد فتح پوری میں بعض لوگوں کو بتا دی جن میں مولانا محمد میاں مراد آبادی بھی تھے۔ ان حضرات نے مولانا سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا اور پوچھا کہ ہم لوگوں کو بھی اس مجلس میں آنے کی اجازت ہے؟ مولانا نے فرمایا: ہاں آپ بھی آجایئے اور بھی جو لوگ آنا چاہیں آجائیں۔ — چنانچہ دوسرے دن وقت مقررہ پر مولوی عبدالرزاق، جوش ملیح آبادی اور مولانا محمد میاں (مولانا اکبر آبادی نے بعض اور حضرات کے نام بھی لیے جو مجھے یاد نہیں رہے) مولانا کے مکان پر پہنچ گئے۔

مولانا اکبر آبادی نے کہا کہ مجھے مولانا محمد میاں نے بتایا کہ مولانا آزاد نے تقریر شروع کی اور وجود باری پر تمام دلائل قرآن سے دیے لیکن نہ کہیں قرآن کا نام لیا، نہ کوئی آیت پڑھی اور نہ کسی حدیث کا حوالہ دیا۔ تمام دلائل اس طرح عقلی انداز میں پیش کیے کہ دل میں اترتے اور اپنی جگہ بناتے جاتے تھے۔ ہم مولانا کے اثر آفریں اسلوب کلام اور طرز بیان پر حیران تھے۔ اس قسم کی باتیں نہ ہمیں سوجھی تھیں اور نہ کبھی سنی تھیں۔ مولانا تقریر ختم کر چکے تو فرمایا: میرے بھائی — میں اپنا فرض ادا کر چکا۔ اب کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو — !

مولوی عبدالرزاق نے کہا: مولانا — میں آپ کے سامنے توبہ کرتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں کہ میرا پہلا نقطۂ نظر غلط تھا۔ میں اللہ کو مانتا ہوں اور اپنے پچھلے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگتا ہوں۔

جوش ملیح آبادی نے کہا: مولانا: میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے۔

یہ تو تھی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روایت جو انہوں نے مولانا محمد میاں مراد آبادی کے حوالے سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں بیان کی — لیکن بہت عرصہ ہوا میں نے کہیں اس ضمن میں جو واقعہ پڑھا تھا اس میں مولانا عبدالرزاق کا نام نہیں تھا۔ جوش ملیح آبادی کا نام بھی نہیں تھا۔ صرف یہ الفاظ مرقوم تھے کہ ایک مشہور شاعر سے مولانا نے کہا کل میں آپ سے خدا کے وجود کے بارے میں بات کروں گا — یہ الفاظ بھی نہیں تھے کہ جوش نے مولانا سے کہا کہ میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا، لیکن میرا دل نہیں مانتا کہ خدا ہے — — تاہم "مشہور شاعر" سے مراد جوش ملیح آبادی ہیں۔

اب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے بارے میں سنیے۔ ان کا شمار مولانا آزاد کے قدیم رفقا اور معتقدین میں ہوتا ہے۔ کلکتہ میں مولانا نے جو مدرسہ قائم کیا تھا، اس کا منتظم انہی کو بنایا گیا تھا۔ عربی کے آدمی تھے اور بہت باخبر عالم تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم تھے۔ امام ابن عبدالبر کی مشہور عربی کتاب "العلم والعلماء" کا ترجمہ بھی انہوں نے کیا اور امام ابن تیمیہ کی بعض کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ ۱۹۲۳ء میں مولانا آزاد نے کلکتے سے "الجامعہ" کے نام سے جو ہفت روزہ عربی رسالہ جاری کیا تھا اس کے ایڈیٹر یہی عبدالرزاق ملیح آبادی تھے۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد نے وزارت تعلیم کی طرف سے "ثقافۃ الہند" کے نام سے عربی میں جو ماہانہ رسالہ دہلی سے جاری کیا تھا، اس کے ایڈیٹر بھی یہی تھے۔ اب اس رسالے کے

ایڈیٹر ڈاکٹر نثار احمد فاروقی ہیں جو دہلی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے چیئرمین ہیں اور میرے مخلص دوستوں میں سے ہیں۔ مولانا کی وفات کے بعد مولانا عبدالرزاق نے مولانا کے حالات میں دو تین کتابیں بھی لکھیں۔

میرے خیال میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام سے متعلق مولانا سعید احمد اکبرآبادی یا مولانا محمد میاں کو سہو ہوگیا۔ منکرِ خدا وہ نہیں تھے، کوئی اور صاحب ہوں گے۔

(۱۶) مولانا اکبرآبادی نے تقریر کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ پنڈت سندرداس نے مجھے بتایا کہ گاندھی جی نے ایک بار ان سے کہا کہ مولانا آزاد بہت بڑے عالم و فاضل ہیں اور ہمیں ان پر فخر ہے۔ ہم ان کے مشوروں کے محتاج رہتے ہیں۔ ملکی معاملات میں ان کی رائے کو آخری رائے سمجھا جاتا ہے اور کانگریس کے اکثر فیصلے مولانا آزاد کی رائے کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے دیکھا کہ ان میں روحانیت نہیں ہے۔ اس کے برعکس مولوی حسین احمد مجھ سے ملتے ہیں تو میں ان میں ایک روحانی کشش محسوس کرتا ہوں (مولانا اکبرآبادی نے "مولوی حسین احمد" کہا تھا۔)

پنڈت سندرداس کی یہ بات بیان کرنے کے بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے کہا کہ مولانا آزاد کا ظاہر اور باطن ایک تھا۔ انہوں نے کبھی اپنے آپ کو چھپایا نہیں۔ مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو سب کے سامنے پیتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ لوگوں کے جانے کے بعد یا ادھر اُدھر چھپ چھپا کر پئیں (مولانا اکبرآبادی نے یہ الفاظ اس انداز سے کہے کہ سامعین کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ خود مقرر بھی مسکرائے)

مولانا اکبرآبادی نے فرمایا: یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے، اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ ان میں کوئی برائیاں ہوں تو اللہ ان کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔

(۱۷) مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے پنڈت جواہر لال نہرو کے سابق سیکرٹری متھائی کی کتاب کا ذکر بھی کیا۔ انہوں نے کہا متھائی نے اس کتاب میں مولانا آزاد پر بعض الزامات عائد کیے تھے۔ متھائی گھٹیا ذہنیت کا مالک تھا اور محکمانہ اعتبار سے بہت بُری شہرت رکھتا تھا۔ اس کی کتاب شائع ہوئی تو ہندوستان کے سنجیدہ ذہن کے لوگوں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی اور اس کے مندرجات کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا۔ مولانا کے سیاسی مخالفوں نے بھی اسے لائقِ توجہ قرار نہیں دیا۔ تاہم بعض حضرات نے اس کا جواب دیا اور مولانا کے دفاع کے ساتھ ساتھ خود متھائی کے ذاتی کردار کی وضاحت کی اور اس کی فطرت کا تجزیہ کیا۔ جواب دینے والوں میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی۔

مولانا اکبرآبادی نے کہا مجھے پتا چلا ہے کہ پاکستان کے بعض اصحاب متھائی کی کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کے اس حصے کو خوب اچھالا، جس کا تعلق مولانا آزاد سے تھا۔ میرے خیال میں وہ لوگ خود متھائی کے عمل و کردار سے واقف نہیں ہیں اگر انہیں اس سے تھوڑی بہت واقفیت حاصل ہوتی تو اسے قطعاً قابلِ التفات نہ ٹھہراتے۔ غالباً وہ مولانا کی ان خدمات سے بھی آگاہ نہیں ہیں جو انہوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے سرانجام دیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان کے متعدد مشہور تعلیمی اور تصنیفی ادارے محض مولانا آزاد کی کوششوں سے محفوظ رہے۔

مولانا اکبرآبادی کی تقریر ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی اور لوگوں نے نہایت اطمینان و سکون سے سنی۔ ان کی یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو مجھے سننے کا موقع ملا اور جس سے میں انتہائی محظوظ اور متاثر ہوا۔

مولانا اکبرآبادی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے برصغیر میں علمی اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف اور تعلیم و تدریس میں ان کو خاص شہرت حاصل تھی اور اس سلسلے میں ان کا تجربہ بہت وسیع تھا۔ قدیم و جدید پر ان کی نظر تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دور میں وہ قدیم و جدید کا سنگم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی سے کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کو

مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر کر دیا تھا اور یہ خدمت انہوں نے حُسن و خُوبی کے ساتھ انجام دی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وہ کئی سال شعبۂ دینیات کے استاد رہے۔ بعض دیگر تعلیمی اداروں کے اربابِ انتظام نے بھی ان کو اس ذمّہ دارانہ منصب پر فائز کیا اور وہ ان کی توقعات پر پورا اُترے۔ اپنے ملک (ہندوستان) سے باہر کی بعض یونیورسٹیوں کے اصحابِ بست و کشاد نے بھی تعلیم و تدریس کے لیے ان کی خدمات حاصل کیں اور وہاں کے علما و طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

آزادی سے کچھ عرصہ قبل وہ دہلی کے سینٹ سٹیفنس کالج میں پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں صدرِ پاکستان جنرل ضیاءالحق بھی اس کالج میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کے حلقۂ شاگردی میں شامل تھے۔ مولانا اکبر آبادی نے ایک مرتبہ خود اس کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب جنرل ضیاءالحق پاکستان کے صدر بنے تو دہلی کے بعض حضرات نے ان سے کہا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں۔ اسلام آباد میں ان کی صدر سے ملاقات ہوئی تو صدر نے کہا آپ کی عمر تو بے شک بڑھ گئی ہے، لیکن چہرے کے خد و خال وہی ہیں۔

تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے لیے تین اصحابِ علم نے دہلی کے قرول باغ میں "ندوۃ المصنفین" کے نام سے ۱۹۳۸ء میں ایک ادارہ قائم کیا تھا اور اس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ "برہان" جاری کیا گیا تھا جس کے فرائض ادارت مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے سپرد ہوئے تھے۔ ان اصحابِ ثلاثہ کے اسمائے گرامی ہیں: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔

۱۹۴۷ء میں جب دہلی پر خون کی گھٹا چھائی اور قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا تو قرول باغ کا علاقہ بھی اس کی زد میں آگیا اور ندوۃ المصنفین کی مطبوعات، کتب خانہ، عمارت اور تمام سامان فسادی عناصر نے نذرِ آتش کر دیا۔ اس کے بعد حالات میں کچھ تبدیلی آئی تو ندوۃ المصنفین کے بانیوں نے دہلی کی جامع مسجد کے قریب اُردو بازار میں از سرِ نو کام کا آغاز کیا اور محنت و سعی سے اس تصنیفی و اشاعتی ادارے کو نئی زندگی سے روشناس کرایا اور کام کی رفتار کو آگے بڑھایا۔

بلاشبہ یہ تینوں بزرگ میدانِ علم و تحقیق کے شہسوار تھے اور انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بے حد لگن اور کوشش سے اس سلسلے کو جاری رکھا۔ ان میں سے مولانا حفظ الرحمٰن ۲ اگست ۱۹۶۲ء کو عازمِ فردوس ہوئے، مفتی عتیق الرحمٰن نے ۲ مئی ۱۹۸۴ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور اس سے ٹھیک ایک سال بارہ دن بعد ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بہشت بریں کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ نہایت افسوس ہے ہم ان کی وفات سے تقریباً سوا تین سال بعد ندوۃ المصنفین کے بانیوں کی آخری نشانی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی صفِ ماتم بچھا رہے ہیں۔

وہ صاحبِ نظر مصنّف اور منجھے ہوئے مقالہ نگار تھے۔ سوچ سمجھ کر قلم اُٹھاتے اور پھر عُمدہ اسلوب سے صفحاتِ قرطاس کو اپنے افکار و تصوّرات سے مزیّن کرتے جاتے۔ ان کی تصنیفات ان کی اصابتِ فکر کی آئینہ دار اور تحقیق و کاوش کی غمّاز ہیں۔ "برہان" میں ان کے مطبوعہ مقالات ان کے علم و ادراک اور دقّتِ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ **فہمِ قرآن**: اس کتاب کا ایک حصّہ قرآن سے متعلق اور ایک حصّہ حدیثِ رسولؐ کی جمع و تدوین کے بارے میں ہے۔ چالیس برس سے زائد عرصہ ہوا کہ سب سے پہلے مَیں نے ان کی یہی کتاب پڑھی تھی، جس کا نقشِ تاثر اب تک لوحِ قلب پر مرتسم ہے۔

۲۔ **وحیِ الٰہی**: اپنے موضوع کی بہت اچھی کتاب ہے۔

۳۔ **اسلام میں غلامی کی حقیقت**: غلامی ایک اہم مسئلہ ہے اور شریعتِ اسلامی نے غلام کو جو حقوق عطا کیے ہیں اور غلامی کا سسٹم ختم کرنے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں، اس کتاب میں اسے تفصیل سے

بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ غلامانِ اسلام : اس میں ان غلاموں کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شرفِ صحبت حاصل تھا یا جو تابعین کی وسعت پذیر فہرست میں شامل تھے۔

۵۔ صدیقِ اکبر : یہ کتاب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے۔

۶۔ عثمان ذوالنورین : اس میں خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ تفصیل سے بیان کی گئی ہے۔

۷۔ مسلمانوں کا عروج و زوال : اپنے موضوع سے متعلق یہ لائق مطالعہ کتاب ہے۔

۸۔ خطباتِ اقبال پر ایک نظر : اس میں علامہ اقبال کے خطبات کا دینی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیا گیا ہے۔

۹۔ نفثۃ الصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت : یہ کتاب ان کے دو مقالوں پر مشتمل ہے جو "برہان" میں شائع ہوئے تھے اور بعد کو انہیں کتابی شکل دے دی گئی۔ اس میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی گئی ہے کہ ہندوستان کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ مولانا ممدوح نے لکھا ہے کہ ہندوستان نہ دارالکفر ہے، نہ دارالحرب ہے اور نہ دارالامن ہے۔ یہ دارالقوم ہے جس میں مذاہب کی بہت سی قومیں آباد ہیں۔

۱۰۔ چار علمی مقالات : یہ "برہان" میں ان کے شائع شدہ چار علمی و تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے۔

ہندوستان کے سیاسی معاملات کو مولانا اکبر آبادی اپنے رسالے "برہان" میں کھل کر زیر بحث لاتے اور بغیر کسی جھجک اور رو رعایت کے ان پر اظہارِ رائے کرتے تھے۔ جن مسائل و معاملات کا تعلق وہاں کے مسلمانوں سے ہوتا، ان کے بارے میں ان کا قلم بالخصوص جوش میں آجاتا تھا۔ اس کے لیے "برہان" کے اداریے دیکھے جا سکتے ہیں، وہ اس کی شہادت دیں گے۔

وہ ہندوستان کی بزمِ علم کے ممتاز رکن، دبستانِ دیوبند کے لائق احترام بزرگ، دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے ممبر، شیخ الہند اکیڈمی کے صدر تھے اور صدر کی حیثیت سے دیوبند کے مجمع علما میں ان کا دفتر تھا۔ علی گڑھ میں گھر تھا اور ان کے اہل و عیال وہیں مقیم ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وہ سالہا سال منسلک رہے تھے اور وفات سے کچھ عرصہ پہلے علی گڑھ میں اقامت گزیں تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ حضرت مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے فیض یافتہ اور اس دور عالی مرتبت اساتذہ کے آخری تلامذہ میں سے تھے۔ اب غالباً مولانا انور شاہ کے چند ایک شاگرد اس دنیائے فانی میں موجود ہیں اور وہ ہیں گوجرانوالہ کے مولانا محمد چراغ صاحب — !

مولانا سعید احمد کئی مہینوں سے بیمار تھے۔ مئی ۱۹۸۴ء میں مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا، اس سے بھی وہ متاثر ہوئے۔ اس سے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید اچانک وفات پا گئے تھے۔ اس المیہ سے بھی وہ بہت مغموم تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عمر سعید کی وفات کے دن انہوں نے کسی معاملے میں بیٹے کو سخت ڈانٹ پلائی تھی۔ عمر سعید نیند آور گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے، باپ کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ ان کی ڈانٹ سے دل برداشتہ ہو کر بیٹے نے مقررہ مقدار سے زیادہ گولیاں کھالیں، جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس اعتبار سے وہ اپنے آپ کو بیٹے کی موت کا باعث قرار دینے لگے تھے۔

بیٹے کی وفات سے کچھ عرصہ بعد اگست ۱۹۸۴ء میں ان کو علی گڑھ میں کتے نے کاٹ لیا تھا۔ ڈاکٹروں نے ان کے پیٹ پر ٹیکے لگائے۔ چند روز بعد وہ جگہ جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، متورم ہو گئی اور انہیں بخار آنے لگا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق وہ ملیریا بخار تھا اور انہیں کونین کی گولیاں کھلانا شروع کر دی گئیں۔ کونین کے زیادہ استعمال نے ان کے جگر کو متاثر کیا اور خون

ہونا بند ہوگیا۔ جگر کی خرابی نے یرقان کی شکل اختیار کر لی اور انہیں بغرضِ علاج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہسپتال میں داخل
ا دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت توجہ سے علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ ان کی صاحبزادی کو جو (کراچی رہتی ہیں) باپ کی بیماری کا
اطلاع علی گڑھ پہنچیں اور بہتر علاج کے لیے انہیں کراچی لے آئیں۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو معلوم ہوا مثانے میں پتھری
ہوگئی ہے اور پیٹ میں، جہاں ٹیکے لگائے گئے تھے، سرطان نمودار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق اس کا علاج
پریشن تھا۔ لیکن کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ وہ آپریشن کے متحمل نہ ہوسکتے تھے۔

مولانا اکبر آبادی جس طرح تندرستی کے عالم میں خوش و خرم رہتے تھے۔ پتا چلا ہے کہ حالتِ مرض میں بھی اسی طرح ہشاش بشاش
رہتے تھے۔ نماز بروقت ادا کرتے تھے، تھوڑا بہت مطالعے کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور کراچی کے جو اہلِ علم ملاقات اور عیادت کو
آتے، ان سے بھی بات چیت ہوتی، جس میں بعض اوقات طوالت بھی آجاتی۔ بالآخر موت کا وقت آگیا۔ ۳ رمضان المبارک
۱۴۰۵ھ (۲۴ مئی ۱۹۸۵ء) کو افطار سے تھوڑی دیر پہلے وہ غسل خانے سے وضو کر کے اپنے کمرے کو جا رہے تھے کہ چلتے چلتے
حرکتِ قلب بند ہوگئی اور پل بھر میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ انہوں نے کراچی میں وفات پائی اور اسی شہر کی سرزمین میں
مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی مرحوم کے دارالعلوم (کورنگی) کے احاطۂ قبرستان میں مفتی صاحب کے مرقد کے قریب دفن
کیے گئے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۱۹۰۸ء کو آگرہ (یوپی) میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حساب سے وہ اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ گئے تھے
اور کم و بیش زندگی کی ستتر بہاریں دیکھ چکے تھے، لیکن ان کا شمار ہمارے نزدیک اُن شخصیتوں میں ہوتا تھا جن کے بارے میں موت
کی الم ناک خبر سننے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ بے شک عمر کی کسی منزل میں داخل ہوجائیں، خیال یہی رہتا ہے کہ ابھی اس دُنیا میں
ان کی ضرورت ہے اور ان کا دائرہ فیض رسانی اور وسیع ہونا چاہیے اور لوگوں کو ان سے مستفید ہونے کے مزید مواقع میسر آنے
چاہئیں۔ لیکن یہ ہماری ایسی خواہش ہے جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ موت کا سایہ ہر شخص پر ہر آن منڈلا رہا ہے، کسی کو
اس سے مفر نہیں۔ ہر شخص چھوٹا ہو یا بڑا، عالم ہو یا جاہل، نبی ہو یا ولی، غوث ہو یا قطب، سب کے درِ حیات پر بالآخر فرشتۂ
اجل عزرائیل آ دستک دیتا ہے اور اپنی اپنی باری پر ہر ذی روح کو موت کی وادی میں دھکیلتا جاتا ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت۔

میاں ہیر وارث شاہ کے دو شعر یاد آرہے ہیں۔ رانجھا جب جوگی بن کر ہیر سے ملاقات کے لیے رنگ پور کھیڑیاں گیا
اور بھیک مانگتے مانگتے ہیر کے دروازے پر پہنچا تو سہتی کے ہاتھوں اس کا ٹھوٹھا (کاسۂ گدائی) ٹوٹ گیا۔ جوگی نے اس پر
خفگی کا اظہار کیا تو وارث شاہ کی زبان میں سہتی نے اس سے کہا:

جو جمیاں مرے گا سبھ کوئی گھڑیا بھج سی واہ سب وہین گے وے
میر، پیر، ولی، غوث، قطب جاسن ایہ سبھ لپارڈے ڈھین گے وے
جدوں سب اعمال دی خبر پچھے ہتھ پیر گواہیاں کہن گے وے
جدوں عمر دی اودھ میعاد پگی عزرائیل ہوری آ بہن گے وے

ان دو شعروں میں دردناک انداز میں موت کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور انسانی زندگی کو فانی اور عارضی قرار دیا گیا ہے۔

مولانا اکبر آبادی کی وفات کے بعد یہ افسوس ناک انکشاف ہوا کہ جن تین اہلِ علم (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مفتی عتیق الرحمٰنؒ
عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ) نے ندوۃ المصنفین قائم کیا تھا اور جنہوں نے خود بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں اور بہت سے
حضرات کی کتابیں شائع فرمائیں، ان کی اولاد میں سے کوئی شخص نہ تو اس قابل ہے کہ تصنیفی و تالیفی خدمت انجام دے سکے اور نہ
کسی میں یہ صلاحیت ہی پائی جاتی ہے کہ اس تحقیقی ادارے ندوۃ المصنفین یا "برہان" کو زندہ رکھ سکے۔ حالات ہر اعتبار سے

(باقی صــــ پر)

بقیہ: اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

اور شاید آپ کی یہ عزیمت بہت سے دوسروں کے لئے مہمیز کا کام دے کر آمادۂ عمل کر سکے۔

اور رابعاً اس راستے پر بڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے مدد و نصرت کا طلب گار رہنا ہے اور جہاں کہیں غلطی ہو یا گناہ سرزد ہو جائے اور اطاعت اور اتباع میں کوتاہی ہو جائے وہاں جلد از جلد توبہ واستغفار اور ندامت وافسوس سے اس کی تلافی کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی حق کو سمجھنے اس پر عمل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کی توفیق بخشے اور تادم آخر دین اسلام پر قائم رکھے۔ آمین۔

سیّد شبیر حسین شاہ زاہد

ختم نبوت اساساتِ دین میں سے وہ اہم عقیدہ ہے' جو دوسرے تمام بنیادی عقائد پر ایک مسلمان کو مستحکم کرتا ہے' جبکہ اس عقیدہ کی عدم موجودگی میں دوسرے تمام عقائد کا ہونا بھی ایک مسلمان کو کفر میں گرنے سے نہیں بچا سکتا۔ دینی عقائد میں سے یہی وہ عقیدہ ہے' جس پر قولی و عملی ایمان افرادِ امت کے درمیان اخوت و اتحاد اور ہمہ گیری کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ صرف قرآن مجید کی آیۂ ختم نبوت مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (سورۃ الاحزاب۔ ۴۰) سے صریحاً اور آیۂ تکمیلِ دین اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورۃ المائدہ۔ ۳) سے وضاحتاً ثابت ہے۔ بلکہ قرآن پاک کی ایک سو دوسری آیات اسے اشارۃً و کنایۃً واضح کرتی ہیں۔ دو سو سے زیادہ احادیثِ نبویؐ سے یہ عقیدہ تفسیراً' تمثیلاً' تاکیداً اور حکماً مصدق کیا گیا ہے۔ آغازِ اسلام سے لے کر آج تک تمام ادوار کے علماء' فقہا' اولیاء' اصفیاء' اتقیاء اور اہلِ علم حکمرانوں کے نزدیک یہ عقیدہ مسلّم چلا آرہا ہے۔ اس کے منکرین کے ارتداد و قتل کی حلّت پر اجماعِ صحابہؓ اسلامی تاریخ سے نہ صرف روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ بلکہ اس عقیدہ کی حفاظت و صیانت اور تشہیر کے مقاصد کی خاطر لڑنے مرنے والوں کو با جماعِ صحابہؓ ہمیشہ غازی و شہید سمجھا گیا ہے۔

شاعرِ مشرق' مصوّرِ پاکستان ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال دنیائے اسلام کے عموماً اور مسلمانانِ ہند کے بالخصوص وہ رجلِ کبیر ہیں۔ جن کی شاعرانہ عظمت و شہرت اور اسلامی فکر و فلسفہ کا شہرہ چار دانگِ عالم میں مشہور ہے۔ ۹ر نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں نور محمد صاحب کے ہاں پیدا ہونے والی یہ عظیم ہستی نہ صرف دینی عقائد و اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتی تھی۔ بلکہ اسلامی تاریخ میں آنے والے تغیرات و انقلاب (مشرکانہ و مخالفِ اسلام تحریکوں) پر اُن کی فلسفیانہ و

عالمانہ نظر تھی۔ دوسرے دینی عقائد کے علاوہ تحریکِ احمدیت کے ضمن میں ختمِ نبوتؐ کے بارے میں آپ کے نظریات اور منکرینِ ختمِ نبوت یعنی احمدیوں کا محاسبہ وعما کمہ بھی منظرِ عام پر آیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور قادیانیت کے حوالے سے علامہ صاحب نے ہندوستان کی سیاسی فضاء میں مسلمانانِ ہند کے الگ ملی تشخص اور امتیازی دینی حیثیت کے حوالے سے جو کوششیں کیں۔ وہ آپ کے عقیدۂ ختمِ نبوتؐ پر عملی ایمان کے سلسلے میں شاہد ہیں۔ جن سے انکار ممکن نہیں۔

علامہ اقبال نے ختم نبوت کی تشریح وتعبیر اور منکرین (فرقۂ احمدیت) کے محاسبہ کے سلسلے میں تین طرح کے اقدامات کئے۔ اولاً عقیدۂ ختمِ نبوتؐ کو اپنے شاعرانہ کلام کے ذریعے عام کیا اور منکرین کی موشگافیوں کا ابطال کیا۔ ثانیاً منکرینِ ختم نبوت کے شخصی و جماعتی نظریات و عقائد پر گرفت کی اور ان کا سیاسی محاسبہ کیا۔ ثالثاً منکرینِ ختم نبوتؐ کے نام نہاد حمایتیوں کے شکوک رفع کر کے اسلام اور عام ہندوستانی مسلمانوں کو قادیانیت کے مکروہ نظریات وباطل عزائم سے متأثر ہونے سے بچایا۔ ختم نبوت کے سلسلے میں آپ نے رہوارِ تخیل کو یوں عازمِ منزل کیا۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد	بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را !	او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت	داد ما را آخریں جامے کہ داشت
لانبی بعدی ز احسانِ خداست	پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰےؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو	حفظِ سرِّ وحدتِ ملت ازو ! !
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست	تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں بر کند !	نعرۂ لاقوم بعدی می زند

(مثنوی اسرار ورموز ص ۱۱۸)

اردو کلام میں آپ کے دو اشعار زبانِ زدِ خاص وعام ہیں جو اپنے اندر ختمِ نبوتؐ کا مفہوم لئے ہوئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

وہ دانائے سُبل، ختمِ رسل، مولائے کل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہیؔ قرآں، وہیؔ فرقاں، وہیؔ یٰسیں، وہیؔ طٰہٰ

ختم نبوتؐ کی تشریح و تعبیر اور منکرین کے عقائد کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ ...

(۱) "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالتؐ پر ایمان ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے۔ اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے کہ نہیں میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے دو راہیں ہیں۔ یا وہ اعلان کریں کہ الگ امت ہیں۔ یا ختمِ نبوت کی تاویلیں چھوڑ کر اسے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کریں۔" (حرفِ اقبال)

(۲) "اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کی حدود مقرر ہیں یعنی وحدت والوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ یقین ہی وہ حقیقت ہے۔ جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجۂ امتیاز ہے اور اس امر کے لئے فیصلہ کن ہے۔ کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں۔ اور رسولِ کریمؐ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انہیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریمؐ کی ختمِ نبوت کو نہیں مانتے۔" (حرفِ اقبال)

(۳) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے، جو ضمیرِ انسانی کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ آزادی کا راستہ دکھایا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطۂ نظر کو یوں بیان کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم، جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس کا انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غدّاری کرتا ہے۔" (حرفِ اقبال)

(۴) "ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے الہام ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے۔ تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا حالانکہ جیسا کہ طبری لکھتا ہے وہ حضورؐ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا قائل تھا۔ اور اس کی اذان میں حضور اکرمؐ کی نبوتؐ کی تصدیق کی جاتی تھی۔" (انوارِ اقبال)

علامہ اقبال کی رائے میں اگر مرزا قادیانی نبوت کا دعویٰ نہ بھی کرتا اور صرف جہاد کی مخالفت پر اکتفا کرتا۔ تو تب بھی وہ امتِ محمدیہؐ میں شامل نہیں رہ سکتا تھا۔ کیونکہ فرضیتِ جہاد کا حکم قرآن حکیم میں موجود ہے قرآن کریم کی کسی نص کا انکار ہی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ایسی نبوت "برگِ حشیش" کی مانند ہے۔ جس کے عناصر میں قوت و شوکت (یعنی جہاد) کا پیغام نہ ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام (ضربِ کلیم)

مرزا غلام احمد قادیانی کے عقیدۂ باطلہ متعلقہ تنسیخِ جہاد کا فلسفیانہ تجزیہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے۔ صرف ایک چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے ۔ یعنی وحی کی سند' راسخ عقائد کو مؤثر طریق پر جڑ بنیاد سے اکھیڑنے اور مذکورہ بالا سوالات میں جو دینی نظریات مضمر ہیں ان کی ایک ایسی تفسیر و تعبیر کرنے کے لئے جو سیاسی طور پر مفید طلب ہو۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس (تنسیخِ جہاد) کی بنیاد وحی پر رکھی جائے۔ یہ بنیاد احمدیت نے فراہم کر دی۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انہوں نے سرانجام دی ہے۔" (یعنی عقیدۂ جہاد کو ختم کرنے کے لئے کوشش کی ہے) (احمدیت اور اسلام ص ۱۲۶)

علامہ اقبال نے منکرینِ ختمِ نبوت کے سرخیل مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد و افکار کی روشنی میں اس کے کردار پر بھی لکھا ہے۔ شاید آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس باطل تحریک (قادیانیت) کے چہرے سے نقاب اٹھایا۔ اور بانیٔ تحریک کے "الہامات" کی باحتیاط نفسی تحلیل کی فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کے مذہبی افکار کی تاریخ میں احمدیوں نے جو کارِ نمایاں سرانجام دیا۔ وہ یہی ہے کہ (تعلیماتِ اطاعت برطانوی حکومت کے ذریعے) ہندوستان کی موجودہ غلامی کے لئے وحی کی سند مہیا کر دی جائے۔ (احمدیت اور اسلام انگریزی ایڈیشن ص ۱۲۷)

مرزا قادیانی کے اسی عقیدۂ اطاعتِ برطانیہ پر یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں۔

فتنہ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (ضربِ کلیم)

وحدتِ افکار اور بانی قادیانی تحریک کے مفسدانہ عقیدہ کا ذکر کرتے ہوئے یوں گویا ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے !
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز (ضرب کلیم)

مرزا قادیانی کے اپنے کو حق، اپنے ماننے والوں کو ناجی و مسلمان اور نہ ماننے والوں کو کافر قرار دینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر (ضرب کلیم)

مرزا غلام احمد قادیانی کی ملتِ اسلامیہ سے غداری اور حکومتِ برطانیہ سے وفاداری کو کس جگر سوزی سے بیان کرتے ہیں۔

عصرے من پیغمبرے ہم آفرید
آں کہ در قرآن جز خود را ندید
از دمِ او وحدتِ قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم (ضرب کلیم)

حضرت علامہ اقبال نے تحریکِ منکرِ ختمِ نبوت (احمدیت) کا سیاسی میدان میں بھی پیچھا کیا۔ اور ان کے سیاسی اغراض و مقاصد کھول کھول کر مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کر دیئے۔ ملتِ اسلامیہ اور ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ان کے عزائم کی قلعی کھولی۔ فرماتے ہیں۔

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ؟ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ ابھی قادیانی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکیں اگر حکومت کے لئے یہ گروہ مفید ہے تو وہ اس کی

خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ لیکن اس ملت کے لئے اُسے نظرانداز کرنا مشکل ہے جس کا اجتماعی وجود اس کے باعث خطرے میں ہے" (خط علامہ اقبال بنام سٹیفس مین)

قادیانیوں کے خدشات اور ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"یہ بات بھی اتنی ہی درست ہے کہ قادیانی بھی ہندی مسلمانوں کی سیاسی بیداری پر پریشان ہو رہے ہیں۔ کیونکہ وہ (قادیانی) محسوس کرتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے سیاسی وقار میں اضافہ اُن کے اس ارادے کو کہ وہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ہندوستانی نبی کی امت تراش لیں، یقیناً ناکام بنادے گا۔"

پھر قادیانیوں کے اس سیاسی مسئلے کا آئینی حل تجویز فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے حکمرانوں کے لئے بہترین طریقِ کار میرے خیال میں یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ قوم قرار دے دیں۔ یہ بات خود قادیانیوں کے اپنے طریقِ کار کے عین مطابق ہوگی۔ اور ہندوستانی مسلمان اُن کو ویسے ہی برداشت کرلیں گے جیسا کہ وہ باقی مذہبوں کے پیروؤں کو برداشت کرتے ہیں۔"

اگرچہ علامہ اقبال قادیانیت سے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے۔ لیکن اس کے مضمرات کا مطالعہ انہوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے تجرباتی دور ۳۲۔ ۱۹۳۱ء میں کیا۔ اس کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیرالدین محمود تھے۔ علامہ اقبال نے یہ محسوس کر کے کہ کمیٹی کی آڑ میں قادیانیت کے عزائم پورے کئے جارہے ہیں۔ سید محسن شاہ ایڈووکیٹ اور خان بہادر حاجی رحیم بخش کو ہم خیال بنایا (یہ کمیٹی کے ممبر تھے) اور لکھ دیا کہ آئندہ کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہو۔ ۷ار مئی ۱۹۳۳ء میں مرزا بشیرالدین محمود مستعفی ہو گیا۔ علامہ اقبال صدر منتخب کئے گئے۔ لیکن علامہ نے محسوس کیا کہ مرزائیوں نے ایک ایسا جال بچھار کھا ہے جس سے کشمیر کمیٹی کی افادیت ختم ہو چکی ہے۔ آپ نے ۲۰ر جون ۱۹۳۳ء کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ایک پریس بیان میں کہا کہ

"بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتّباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔" (تحریک ختم نبوتؐ ص ۹۷)

کشمیر کمیٹی کے بارے میں علامہ اقبال کا دوسرا بیان ۲ ر اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جاری ہوا۔ جس میں صدارت سے اپنی دستکشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ اغراض و مقاصد پر اشارے کئے کہ تحریکِ کشمیر کی آڑ میں کس طرح یہ فرقہ اپنا دامِ تزویر بچھا کر مسلمانوں کو شکار کر رہا ہے۔ سیاسی اختلاف کے اس واقعہ کے بعد علامہ اقبال نے اس تحریک' اس کے مقاصد' عقائد و نظریات اور دوسرے پہلوؤں کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ مذہبی حیثیت کے معاملہ میں سید سلیمان ندوی' علامہ انور شاہ محدث کشمیریؒ اور سید پیر مہر علی شاہؒ سے قلمی رابطہ قائم کیا۔ مکمل فلسفیانہ اور مذہبی مطالعہ کے بعد احمدیّت کے بارے میں ۲ ر مئی ۱۹۳۵ء کو بیان جاری کیا۔ جس سے قادیانی قلعہ میں تھرتھری پیدا ہو گئی جس سے انگریز سب سے زیادہ مضطرب ہوئے۔ اس لئے کہ "مرزا قادیانی انگریزوں کا ہی خود کاشتہ پودا تھا۔" [1] پنڈت جواہر لال نہرو نے مرزائی امت کے دفاع میں "ماڈرن ریویو" کلکتہ میں تین مقالے تحریر کئے۔ علامہ نے ان مقالوں کے جواب میں "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے ایک معرکتہ الآراء مقالہ لکھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو تو اس سے خاموش ہو گئے۔ لیکن خود قادیانی علماء و فضلاء بھی علامہ اقبال کے فلسفیانہ تجزیہ' علمی نکات اور واضح سوالات کے جواب میں کچھ نہ کہہ سکے۔ ۲۱ ر جون ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال نے اپنے ایک نجی خط میں پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ لکھ کر قادیانیوں کی سیاسی قسمت اور مذہبی حیثیت کا فیصلہ کر دیا کہ

"میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدّار ہیں" [2]

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام اپنے ذاتی خط میں قادیانیت اور اسلام کے بارے میں متعدد شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(۱) وہ (مرزا غلام احمد قادیانی) کہتا ہے کہ میں اسلام کے مقدّس پیغمبر کا بروز ہوں اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بروز ہونے کی صورت میں اس کی خاتمیت حقیقتہً خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت ہے۔گویا معاملے کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ دونوں خاتمیتوں کو (اس کی اپنی اور

---

[1] مرزا غلام احمد قادیانی نے درخواست بحضور لیفٹیننٹ بہادر بجناب خاکسار غلام احمد' مندرجہ تبلیغ رسالت جلد ہفتم صفحہ ۱۹ میں اپنے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت) ایک قرار دے کر وہ تصورِ خاتمیت کے زمانی مفہوم سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

(۲) یہ بھی کہا جاتا ہے اور اس سلسلے میں ہسپانیہ کے عظیم القدر مسلمان صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پیش کی جاتی ہے کہ ایک مسلمان ولی کیلئے بھی روحانی ارتقاء کے دوران میں ایسے تجربات ممکن ہیں۔ جنہیں صرف شعورِ نبوت سے مختص مانا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شیخ محی الدین ابن عربی کا یہ نظریہ نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے نامحکم ہے۔ لیکن اگر اسے درست مان بھی لیا جائے تو قادیانیوں کا استدلال شیخ محی الدین ابن عربی کے صحیح مؤقف سے متعلق کاملاً غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ اسے خالصتاً ذاتی تجربہ قرار دیتے ہیں۔ جس کی بناء پر کوئی اِن لوگوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دے سکتا۔ جو اس پر اعتقاد نہ رکھیں۔ اور ایسا اصلاً ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل شیخ کے نقطۂ نگاہ کے مطابق ایک عہد یا ایک ملک میں ایک سے زیادہ ولی ہو سکتے ہیں۔ جو شعورِ نبوت تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر مان بھی لیا جائے۔ ایک ولی کیلئے نفسیاتی اعتبار سے عرفانِ نبوت حاصل کر لینا ممکن ہے تو اس عرفان کی عمرانی وسیاسی اہمیت کوئی نہیں کیونکہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز نہیں بن سکتا۔ اور اس اعلان کا حق دار نہیں ہو سکتا۔ کہ وہی تنظیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کیلئے ایمان وکفر کا معیار ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کرتے ہوئے میں "فتوحاتِ مکیہ" سے متعلقہ عبارتوں کا مطالعہ غور واحتیاط سے کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ یہ عظیم القدر ہسپانوی صوفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کا ویسا ہی پختہ معتقد ہے جیسا کوئی راسخ العقیدہ مسلمان ہو سکتا ہے۔ اگر اسے صوفیانہ کشف میں معلوم ہو جاتا کہ آگے چل کر مشرق میں تصوف کے بعض ہندوستانی عطائی اس کی صوفیانہ نفسیات کے پردے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت پر زد لگانے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ تو وہ علمائے ہند سے بھی پہلے دنیا کے مسلمانوں کو غدارانِ اسلام کے خلاف متنبہ کر دیتا۔

(۳) جس حد تک ہندوستان کا تعلق ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں کے مسلمان کسی ایسے سیاسی نظریئے (تحریکِ احمدیت کی طرف اشارہ ہے) کے روبرو سرِ تسلیم خم نہ کریں گے۔ جو اُن کی مستقل تہذیبی حیثیت کو تباہ کر دے۔

مستقل تہذیبی حیثیت کے متعلق اسمینان ہو جائے تومذہب اور حُبّ وطن کے تقاضوں میں ہم آہنگی کرنے کیلئے ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

میں ہزہائی نس آغاخان (آغاخان سوم محمد شاہ کی طرف اشارہ ہے) کے متعلق بھی ایک بات کہنا چاہتا ہوں میرے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغاخاں کو کیوں حملے کا نشانہ بنایا۔ شاید وہ سمجھتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ وہ بظاہر اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اسماعیلیوں کی فقہی تاویلات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہوں 'اسلام کے بنیادی اصول پر ان کا ایمان ہے۔ بلاشبہ وہ دائمی امامت پر یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اُن کے نزدیک امام ربّانی الہام کا حامل نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف شریعت کا شارح ہوتا ہے۔ (جبکہ قادیانیوں کے یہاں یہ بات نہیں ہے)

(۴) یہاں یہ بھی بتادینا چاہئے کہ تحریکِ احمدیت دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک گروہ قادیانیوں کا ہے اور دوسرا لاہوریوں کا۔ قادیانی گروہ بانیٔ تحریک کو مکمل نبی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن لاہوریوں نے اعتقاداً یا مصلحتاً یہی مناسب سمجھا کہ قادیانیت کو مدھم سُروں میں پیش کیا جائے۔ تاہم یہ مسئلہ کہ بانیٔ احمدیت ایسا نبی تھا۔ جس کی بعثت کا انکار مستلزم کفر ہو دونوں گروہوں کے درمیان محلِ نزاع ہے۔ احمدیوں کی اس داخلی کشمکش کے سلسلے میں یہ فیصلہ کرنا کہ کون حق بجانب ہے۔ میرے پیش نظر مقصد کیلئے غیر ضروری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور اس کے وجوہ ابھی پیش کروں گا کہ ایسے نبی کا خیال جس کا انکار ملت سے خارج ہونے کو مستلزم ہو احمدیت کی اصل واساس ہے اور قادیانیوں کا موجودہ امام لاہوری امام کے مقابلے میں روحِ تحریک سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ (یعنی حاملینِ عقیدہ ختم نبوتؐ کو کافر قرار دینے میں تیز ہے)

چونکہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ بانیٔ احمدیت الہام کا حامل تھا۔ لہٰذا وہ پوری دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیٔ تحریک کا استدلال جو صرف قرونِ وسطیٰ کے علم الکلام کے لئے زیبا سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ ہے کہ اگر اسلام کے مقدّس پیغمبرؐ کی روحانیت دوسرے نبی کی تخلیق نہ کرے تو اس روحانیت کو ناکام سمجھا جائے گا۔ وہ اپنی نبوت کو اسلام کے مقدّس پیغمبرؐ کی نبوت پرور روحانی قوت کی شہادت قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر آپ یہ سوال کریں کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیاد

پیغمبروں کی تربیت بھی فرما سکتی ہے۔ تو اس کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) آخری نبی نہ تھے۔ آخری نبی میں (مرزا قادیانی) ہوں۔

ڈاکٹر علامہ اقبال نے تحریکِ احمدیت اور فتنۂ قادیانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے حرفِ اقبال میں لکھا ہے کہ

کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت (جمہور مسلمانانِ ہندوستان) کو رواداری کی تلقین کی جائے۔ حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو۔ اگرچہ وہ تبلیغ دشنام سے لبریز ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر جو انہوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب (اُن کی علیحدگی کا) مطالبہ کرتے ہیں۔

آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کر دوں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے تو میں اُسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ اولاً اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے۔ جس کے حدود مقرر ہیں۔ یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان' انبیاء پر ایمان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجۂ امتیاز ہے۔ ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویئے کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ بانیٔ تحریک (مرزا قادیانی) نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)' مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلقی' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ ثالثاً اس امر کو سمجھنے کیلئے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی

مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کیلئے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد¹ — کے ان کی موجودہ آبادی جو چھپن ہزار ہے۔ انہیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس طرح انہیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں (علیحدگی کی صورت میں) ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی (خط علامہ اقبال بنام اسٹیٹس مین (دہلی) منقول از حرفِ اقبال)

علامہ اقبالؒ کی یہی دینی وسیاسی فہم وفراست تھی۔ جس کی بناء پر آپ نے نہ صرف منکرینِ ختم نبوتؐ (قادیانیوں) کے عقائد ونظریات اور اسلام پر اس کے منفی اثرات کو محسوس کیا۔ بلکہ سیاسی میدان میں ان کے مفاد پرستانہ ومنافقانہ مقاصد کو بھی سمجھ لیا۔ اور پھر نہ صرف اپنے تجزیات اور رائے سے مسلمانانِ ہندوستان کو باخبر رکھا بلکہ غلط فہمیوں کا شکار اور شکوک پھیلانے والے غیر مسلم حمایتیوں پر بھی احمدیوں کی اصلی تصویر ظاہر کی۔ یہ علامہ اقبال کا عشقِ رسولؐ ہی تھا۔ جس نے ان کو حاکمانِ وقت کی پروردہ جماعت کی مخالفت ومحاسبے پر ابھارا۔ ورنہ اس دور میں ہندوستانی سیاست دان مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور حکومتِ وقت کی مخالفت مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جو کہ قادیانیت کی پشت پر تھی۔

قادیانی حضرات علامہ موصوفؒ کی ایک تقریر "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے ایک جملے کو بہت اچھالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علامہ مرحومؒ قادیانی تحریک کو ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس جملے کے بارے میں خود حضرت علامہؒ کی وضاحت موجود ہے۔ فرماتے ہیں۔

۱۔ مفادات کے سلسلہ میں بڑے بڑے امور کو چھوڑیئے۔ صرف سرکاری ملازمتوں کے شعبہ کو لیجئے۔ ہندوستان میں جب سرکاری ملازمتوں میں تناسب مقرر ہوا تو ہندوؤں کیلئے ½۶۶ فیصد، مسلمانوں کیلئے ۲۵ فیصد اور بقایا ½۸ فیصد "دیگر اقلیتوں" کیلئے طے ہوا تھا۔ دیگر اقلیتوں میں سکھ، پارسی، ہریجن، بدھ، جین، بہائی سب شامل تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر احمدی بھی اپنے آپ کو مسلمانوں سے الگ شمار کرواتے۔ تو یہ انہی دیگر اقلیتوں کے زمرے میں شامل ہو جاتے۔ اس سے ان کو جس قدر ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ وہ ظاہر ہے۔ (ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت ص نمبر ۱۲۵)

جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ ... لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کیلئے برسوں چاہئیں.......... ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا۔ جب ایک نئی نبوت ..... بانی اسلامؐ کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت' کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ (حرف اقبال')

مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٔ نبوت سے قبل بعض مسلمان اسے اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ خیال کرتے تھے۔ خود حضرت علامہ کے بعض رشتہ دار حتیٰ کہ اُن کے والد شیخ نور محمد اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد بھی مرزا غلام احمد سے متاثر تھے اور عیسائیوں سے مناظرہ کرنے کیلئے اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ مگر جب مرزا کے مخفی عزائم ودعاوی بے نقاب ہوئے اور مسلمان کا سوادِ اعظم اس نبی بدحواس اور عالِم بے علم سے الگ ہو گیا تو علامہ کے والد اور دوسرے رشتہ داروں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کا ثبوت خود مرزائیوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ مثلاً

(ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا... شیخ نور محمد صاحب نے غالباً ۱۸۹۱ء یا ۱۸۹۲ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سید حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (نقل کفر کفر نباشد) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال اسکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ اس لئے ان دنوں میں انہوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے۔ تو اُن کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انہوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود کی خدمت میں ایک خط لکھا۔ جس میں تحریر کیا کہ

"میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں" اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا۔ جس میں لکھا تھا کہ "شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں" (کافر قرار دے دیئے گئے) ..... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے، اُس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پروپیگنڈا تھا"۔ (سیرت المہدی جلد ۳ ص ۲۴۹ از مرزا بشیر احمد)

مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک بیٹے کی تحریر آپ پڑھ چکے ہیں اب دوسرے بیٹے کا بیان بھی پڑھ لیجئے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ علامہ اقبال قادیانیوں کی مخالفت کی وجہ سے اُنہیں کس قدر "ناپسند" تھے۔ بلکہ مبغوض تھے۔

"اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت جماعتِ احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اٹھے پھر امراء، پھر پیروں، گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت۔ ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے۔ اس طرح اعلیٰ عہدیدار خاموش تھے۔ یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ یہ طوفانِ مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انہوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ظفر علی خان صاحب نے ایک بیان جاری کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آ گیا کہ میں پیچھے کیوں رہوں (اور وہ بھی احمدیت کی مخالفت میں میدان میں کود پڑے)" (تقریر مرزا بشیر الدین محمود مطبوعہ الفضل قادیان ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء)

لہٰذا اب عوام الناس کے دھوکہ کیلئے علامہ اقبالؒ کی تحریروں اور تقریروں کو توڑ مروڑ کر یا سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کرنے سے احمدی کسی صورت میں بھی اسلام اور مسلمانوں کی نظر میں مقبول و پسندیدہ نہیں ہو سکتے۔ بلکہ علامہ اقبالؒ کا مذہبی اور سیاسی سطح پر ان سے اختلاف تمام خاص و عام کی نظروں میں آ گیا ہے۔ وہ تو (علامہ اقبالؒ) قادیانی تحریک کے پھلنے پھولنے سے پہلے ہی (۱۹۳۸ء میں) فوت ہو گئے۔ ورنہ اگر آپ زندہ رہتے تو قادیانیوں کا محاسبہ کرتے رہتے اور سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خانؒ اور تحفظِ ختمِ نبوتؐ کے

دوسرے پیروکاروں کو آپ کی ذات سے وہ استحکام نصیب ہوتا کہ یہ تحریک قیام پاکستان سے قبل ہی دم توڑ دیتی۔ اور وہ روح فرسا اور حوصلہ شکن واقعات ظہور میں نہ آتے۔ جن کا ظہور پاکستان اور ملتِ اسلام کیلئے خطرناک ثابت ہوا۔ بلکہ کئی واقعات کے اثرات ہمیشہ پاکستان کے استحکام کو مجروح کرتے رہیں گے۔ مثلاً تقسیم ہند کے وقت قادیانیوں کا جدا محضرنامہ پیش کرنا اور ضلع گورداسپور کو "ویٹی کن سٹیٹ سٹی" کی شکل دیئے جانے کا مطالبہ کرنا۔ جس پر انگریزوں نے یہ ضلع بھارت کے حوالے کر دیا اور بھارت نے اس ضلع کی راہ سے کشمیر میں اپنی فوجیں داخل کر کے انہیں حقِ خودارادیت سے محروم کر دیا۔ اگر علامہ اقبالؒ چند سال اور زندہ رہتے تو شاید قادیانیوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ایمان نہ رکھنے اور اجرائے نبوت کا عقیدہ رکھنے کی بناء پر بہت پہلے غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جاتا۔ جس کا مطالبہ علامہ مرحوم نے ۳۶۔ ۱۹۳۵ء میں اپنے بیانات میں کر دیا تھا کہ

"قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا جائے"

بقیہ: عرض احوال

ان کی بات زیادہ توجہ سے سنیں گے۔ اس دوران میں وہ لوگوں تک پہنچنے کے ذرائع تلاش کریں۔ انہیں اپنے ووٹ کا حق بھی استعمال کرنا چاہئے لیکن اس کے لئے وہ کسی اثرورسوخ سے متاثر نہیں ہوں گے۔ ان کے ووٹ کا مستحق صرف وہ امیدوار ہو گا جس کی اپنی زندگی میں اسلام یعنی اللہ کی فرمانبرداری کا عکس نمایاں طور پر موجود ہو اور اگر وہ کسی جماعت یا سیاسی دھڑے کی نمائندگی کر رہا ہے تو اس کے منشور میں خلاف دین کوئی پروگرام شامل نہ ہو۔ ان دو شرائط کے ساتھ اگر ووٹ دینے کا موقع موجود ہے تو اس کے استعمال کو فرض جانیں بصورت دیگر وہ مجبور نہیں کئے جا سکتے۔ سو فیصد ووٹ تو کسی بھی الیکشن میں کاسٹ نہیں ہوتے۔ ووٹ دینا ایک شخص مخصوص کی اہلیت پر گواہی کے مترادف ہے اور جھوٹی گواہی دینے سے خاموشی اختیار کرنا یقیناً بہتر ہے۔

انتخابات کے بارے میں تنظیم اسلامی کی پالیسی

حالیہ انتخابات کے ضمن میں تنظیم اسلامی کی پالیسی کو واضح شکل دینے کے لئے گذشتہ ماہ امیر تنظیم اسلامی نے لاہور میں موجود اراکین مجلس مشاورت کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں اسلام آباد سے میجر محمد امین منہاس صاحب کو بطور خاص دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے ذہن میں کچھ معین تجاویز رکھتے تھے۔ اس مشاورت میں انتخابات کے بارے میں تنظیم کی اس سابقہ پالیسی کو برقرار رکھنے کا فیصلہ ہوا جس کا ذکر اس سے قبل اپریل ۸۸ء کے 'میثاق' میں صراحت کے ساتھ آچکا ہے۔
اس اہم فیصلے کی نقل بطور یاددہانی ہدیۂ قارئین کی جا رہی ہے۔

(الف) تنظیم اسلامی بحیثیت "تنظیم" انتخابات میں حصہ نہیں لے گی۔ نہ ہی کسی 'امیدوار' یا کسی 'جماعت' یا کسی 'محاذ' کے لئے تنظیم اسلامی یا اس کے رفقاء کوئی کنویسنگ یا عملی تعاون کریں گے۔

(ب) جہاں تک رفقائے تنظیم کے حق رائے دہی کا تعلق ہے جو ایک دوسرے اعتبار سے ایک امانت کی ادائیگی ہے، اُس کے ضمن میں طے کیا گیا کہ رفقائے تنظیم اپنا ووٹ کسی ایسے امیدوار کے حق میں استعمال کر سکتے ہیں جو :

(ا) خود بھی پابندِ شریعت ہو ——— اور

(ii) کسی ایسی جماعت سے وابستہ نہ ہو جس کا منشور اسلامی اصولوں سے متصادم ہو ۔

صراحتیں :

۱ ۔ مندرجہ بالا اصول و مبادی میں " انتخابات " سے اصلاً مراد قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے وہ انتخابات ہیں، جن کے نتیجے میں کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے ایوانات اور حکومتیں تشکیل پاتی ہیں۔ جن کے حیطۂ اختیار میں قانون سازی اور جن کے ہاتھوں میں قوتِ نافذہ کی زمام کار ہوتی ہے ۔

۲ ۔ البتہ ان " انتخابات " کے ذیل میں نیم سرکاری (SEMI-GOVERNAMENT ———) ادارے بھی شامل ہیں، جیسے بلدیاتی اور کونسلوں کے انتخابات وغیرہ ۔

۳ ۔ تنظیم اسلامی " بحیثیتِ تنظیم " ایسے کسی انتخاب میں حصّہ نہیں لے گی۔ یہ بات مندرجہ اصول و مبادی میں بصراحت موجود ہے ۔ تنظیم کا کوئی رفیق بھی ایسے کسی انتخاب میں ذاتی ، انفرادی، شخصی حیثیت سے بھی حصّہ نہیں لے سکے گا۔ اس کی خلاف ورزی فسخِ بیعت اور اخراج عن التنظیم کی مستوجب ہو گی ۔

۴ ۔ کالجوں، یونیورسٹیوں کی غیر جماعتی یونینوں کے انتخابات میں رفقائے تنظیم انفرادی حیثیت سے حصّہ لینے کے مجاز ہوں گے۔ اسی کا اطلاق ٹریڈ یونینوں کے انتخاب پر بھی ہو گا۔ لیکن اس کے لئے رفقائے تنظیم کے لئے لازمی ہو گا کہ وہ امیرِ تنظیم یا مقامی تنظیموں کے امرا سے پیشگی اجازت حاصل کر لیں ۔

کاروانِ خوشبو

بیرونِ پاکستان رفقاء تنظیم کی سرگرمیاں

مرتب: محمد احمد خاں

دور جدید کی ایجادات میں کیسٹس (CASSETTES) کو ذرائع ابلاغ کے میدان میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس ایجاد کے ذریعے جہاں شر بہت سرعت سے پھیلا ہے وہاں فلیبلغ الشاھد الغائب کے مخاطبین کو بھی اپنے کام میں قدرے آسانی ہو گئی ہے۔ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ذریعے دنیا کے کس کس کونے میں کلام الٰہی کا علم و فہم اور اس کی دعوت پہنچ چکی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے عطا کردہ اجتماعی نظام کے مطابق ایک اجتماعی معاشرہ تشکیل دیا جائے اور نوع انسانی کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا جائے تاکہ لوگ بچشم سر اس نظام کی برکات و خوبیاں ملاحظہ کر سکیں۔ تنظیم اسلامی بھی ایک ایسا ہی کارواں ہے جو کلامِ الٰہی کی خوشبو پھیلانے کا بیڑا اٹھائے ہوئے میدانِ عمل میں رواں دواں ہے۔ اس کے رفقاء جہاں وطنِ عزیز میں مسلمانوں کو بھولے ہوئے سبق کی یاد دہانی کروانے میں مشغول ہیں، وہاں دیارِ غیر میں بھی ان کی سرگرمیاں مثال پیش کرتی ہیں۔ آیئے آج اپنے بیرون وطن مقیم رفقاء کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں جو ہزارہا مشکلات کے باوجود قوت ایمانی کے بل بوتے پر قرآن حکیم کی انقلابی دعوت پھیلانے میں مصروف عمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کے عزم کو جواں رکھے اور انہیں دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امیر محترم ۱۹۷۸ء میں پہلی بار بعض احباب کی دعوت پر قرآن کی انقلابی دعوت کو متعارف کرانے امریکہ اور کناڈا تشریف لے گئے تھے۔ یہ دورہ بیرون پاکستان تبلیغی سرگرمیوں اور دوروں کے ایک باقاعدہ سلسلے کی تمہید بن گیا۔ اگلے برس ٹورنٹو اور شکاگو میں مقامی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا...... جہاں مرکزی انجمن خدام القرآن کی ذیلی انجمنیں (SOCIETY OF SERVANTS OF AL-QURAN) بھی قائم ہوئیں۔ ٹورنٹو کی تنظیم

ایک نمایاں حیثیت اس اعتبار سے رکھتی ہے کہ وہاں کے رفقاء کا ایک مخصوص طریق کار دعوت پھیلانے کے ضمن میں سامنے آیا ہے۔ وہ لوگ اپنے مقامی امیر تنظیم ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب کی قیادت میں اجتماعی طور پر مختلف مقامات کے ٹور کرتے ہیں اور قرآن کی انقلابی دعوت پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کی سعی وجہد کے نتیجہ میں **بفضلہٖ تعالیٰ** مشی گن میں تنظیم کا قیام عمل میں آیا اور آج کل محترم ڈاکٹر عبدالفتاح صاحب اور ان کے رفقاء کا ہدف سینٹ لوئس اور واشنگٹن ہیں۔ آئندہ برس یعنی ۱۹۸۹ء میں ایک دس روزہ سمر کیمپ (SUMMER CAMP) کی تیاری پورے زور شور سے ہو رہی ہے۔ جہاں امیر محترم خود شرکت فرمائیں گے۔ امید ہے کہ یہ کیمپ امریکہ و کناڈا میں قرآن کی انقلابی دعوت کے حوالے سے اپنی نوع کا ایک منفرد اجتماع ہو گا۔ انسانی صلاحیت کا ایک عظیم سرمایہ شمالی امریکہ میں موجود ہے۔ کیا عجب کہ دیار فرنگ ہی سے قرآن کی انقلابی دعوت اٹھے اور دنیا بھر کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ امریکہ کی ریاست ٹیکساس میں بھی ہمارے چند نوجوان ساتھی دعوت قرآنی کو پھیلانے کیلئے مقدور بھر جدوجہد میں مصروف ہیں اور نجانے کہاں کہاں اور کون کون اس مبارک فریضہ کو ادا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے جانے پہچانے ساتھیوں اور انجانے دوستوں سب پر اپنی رحمتیں و برکتیں نازل فرمائیں۔ .... آمین

مشرقِ وسطیٰ میں ایک کثیر تعداد پاکستانیوں کی محنت و مزدوری میں مصروف ہے۔ دلچسپ ات یہ ہے کہ وہاں بھی تنظیم اسلامی کی دعوت اکثر و بیشتر امریکہ و کناڈا سے ہی پہنچ کر متعارف وئی ہے۔ امیر محترم اکثر اس کا ذکر فرمایا کرتے ہیں کہ پاکستان کے شہروں میں تو ہماری دعوت تعارف ہو ہی چکی تھی، مگر دیہاتوں میں ہماری دعوت مشرق وسطیٰ سے پہنچی ہے۔ وہ اس طرح ہ وہاں مقیم رفقاء کی اکثریت دیہات سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے دیہاتوں ں جا کر کام کیا تو آج ہمارے رفقاء میں ایک کثیر تعداد دیہاتی بھائیوں کی ہے۔ بعض عرب مالک میں مخصوص حالات و پالیسی کے باعث رفقاء کھل کر باقاعدہ عوامی سطح پر دعوت پیش بں کر سکتے، لیکن پھر بھی وہاں لٹریچر اور کیسٹس جس تیزی کے ساتھ پھیلائے جا رہے ہیں۔ ں کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناسازگار حالات میں بھی اللہ تعالیٰ نے رے رفقاء کو وہ جذبۂ ایمانی عطا فرما رکھا ہے کہ ہمیں بھی ان پر رشک آتا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی سب سے بڑی مقامی تنظیم ابوظہبی میں قائم ہے۔ یہاں رفقاء کی تعداد وقت مرکزی ریکارڈ کے مطابق ۸۰ ہے اور یہاں جمعیت خدام القرآن کے نام سے ذیلی

بھی قائم ہے۔ حال ہی میں پاکستان مرکز کے قریب ہی ایک وسیع فلیٹ میں دفتر
المطالعہ قائم کیا گیا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ہر برس امیرِ محترم کا پروگرام عوامی سطح پر
جائے۔ ہمارے ابوظہبی کے رفقاء کی سعی وجہد کے نتیجے میں اب تمام عرب امارات میں
سطح پر رابطے قائم ہو رہے ہیں۔ دوبئی میں مقامی دفتر کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔
الخیمہ اور کویت میں بھی اس نہج پر کام ہو رہا ہے۔ امید ہے انشاءاللہ جلد ہی وہاں بھی
وجود میں آ جائیں گے۔ بیرونِ پاکستان جہاں دعوتی کام پر زور دیا جاتا ہے وہاں الحمد للہ
کام پر بھی اسی قدر توجہ دی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں حسبِ سہولت باقاعدگی کے ساتھ ایک روزہ
ناپس منعقد کئے جاتے ہیں اور تنظیمی لٹریچر کا اجتماعی مطالعہ پھر اس کے مختلف پہلوؤں پر
فکران پروگراموں کا مستقل حصہ ہوتے ہیں۔ یہ وہی طریق کار ہے جو بزرگ رفیق محترم
الحق سید صاحب نے متعارف کروایا تھا اور بہت مقبول ہوا۔ بیرونِ پاکستان تنظیمی
مات میں حاضری بھی پاکستان میں اجتماعات کے مقابلہ میں حیران کن حد تک زیادہ ہوتی ہے
۸۰ تا ۹۰ فیصد تک غیر حاضر رفقاء میں سے اکثریت یا تو چھٹی پر پاکستان آئی ہوئی ہوتی ہے یا
کا وقت ہونے کے باعث وہ اجتماعات میں حاضر ہونے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ تحریر انجمن
القرآن انڈیا حیدر آباد کا ذکر کئے بغیر نامکمل ہی رہے گی۔ جہاں انجمن ہذا کے روحِ رواں
حیدر محی الدین غوری نے احباب کے تعاون سے خط و کتابت کورس کا آغاز مقامی طور پر
یا ہے اور قرآنی دعوت کا کام بھی نہایت تیزی سے پھیل رہا ہے۔ میثاق اور حکمت قرآن
انے کیلئے جس لگن سے وہاں کام ہو رہا ہے۔ اس کے نتائج بھی بڑے ہی حوصلہ افزاء ظاہر
ہے ہیں۔ آیئے آج پھر عزم تازہ کریں اور قرآن کے انقلابی فکر کو پھیلانے اور تن من
ن سے دین کی خدمت اور سربلندی کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔

کوئٹہ میں ایمان کی بہار

امیر تنظیم اسلامی کے ۲ روزہ دورے کی رُوداد

امیر تنظیم اسلامی کا حالیہ دورہ اُن کے پچھلے دورۂ جون میں ہی طے پا گیا تھا جس میں
موع اور مقام بھی خود امیر محترم طے کر چکے تھے۔ اس سے قبل کوئٹہ میں امیر محترم کے اکثر
س و خطابات شہر کی مختلف مساجد میں ہوا کرتے تھے۔ پچھلی مرتبہ تجرباتی طور پر ڈاکٹر صاحب

کا ایک خطاب گورنمنٹ سائنس کالج کوئٹہ کے آڈیٹوریم میں رکھا گیا۔ امیر محترم نے ا
مقام کو کافی پسند فرمایا' چنانچہ طے کر لیا گیا کہ آئندہ سے امیر تنظیم کے تمام دروس
پروگرام اسی مقام پر منعقد کئے جایا کریں گے کیونکہ یہاں ہر مکتبۂ فکر کے لوگ اس انقلا
دعوت سے بلا کسی روک ٹوک کے فیض یاب ہو سکتے ہیں۔ امیر محترم کے حالیہ دورۂ کوئٹہ
دوران دوروزہ خطاب جو کہ "حقیقتِ ایمان" کے موضوع پر تھا مذکورہ بالا آڈیٹوریم میں ر
گیا۔ آڈیٹوریم کی دستیابی کے لئے ہمارے ایک بزرگ رفیق جناب چوہدری محمد یوسف صاح
کا ذکرِ خیر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہو گی موصوف سابق ایم پی آر اور ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان کے
عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب بھی پریکٹس جاری رکھے ہوئے ہیں
موصوف نے ذاتی دلچسپی لے کر مقامی امیر کی حسب ہدایت سیکرٹری تعلیم بلوچستان سے
ملاقات کر کے اس آڈیٹوریم کو پروگرام کے لئے بغیر کسی معاوضے کے حاصل کر لیا۔

امیر محترم کے حالیہ دورۂ کوئٹہ کے لئے تین بڑے بڑے بینرز بنوائے گئے جو کہ شہر کی
پرہجوم جگہوں پر آویزاں کئے گئے' مزید بر آں دورے سے تین روز قبل روزنامہ "جنگ"
کوئٹہ میں پروگرام کا اشتہار دیا گیا۔ اس کے علاوہ دس ہزار ہینڈ بلز چھپوائے گئے جن کو دور ے
سے ماقبل جمعے کے بعد شہر کے مختلف علاقوں اور جامع مساجد میں تقسیم کیا گیا۔ الغرض دورے
کی پبلسٹی کے لئے ساتھیوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مرکز سے ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب محم
نعیم صاحب دورے سے ایک روز قبل ہی تشریف لا چکے تھے جنہوں نے ہمیں دورے کے لئے
مفید ہدایات سے نوازا۔ امیر محترم مورخہ ۱۰ر اکتوبر کو بوقت پونے دو بجے دوپہر کوئٹہ پہنچے۔
ایئرپورٹ پر ان کے استقبال کے لئے مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب' جناب میاں محمد نعیم
صاحب اور جناب خاور قیوم صاحب موجود تھے۔ امیر محترم کی رہائش کا انتظام اس مرتبہ
ہمارے بزرگ رفیق جناب چوہدری محمد یوسف صاحب کے گھر پر تھا۔ تمام رفقاء کو ہدایت تھی
کہ عصر کی نماز چوہدری صاحب کی رہائش گاہ پر ہی ادا کریں گے تاکہ امیر محترم کے ساتھ تمام رفقاء
کی ملاقات ہو جائے۔ نماز عصر امیر محترم کی اقتداء میں پڑھنے اور اُن کے ساتھ ملاقات کرنے
کے بعد رفقاء درس کے سلسلے میں اپنی اپنی ڈیوٹیوں پر روانہ ہو گئے۔

نمازِ مغرب کے ساتھ ہی وہ لمحہ آ گیا تھا کہ جب ایمانیات کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو
ہونی تھی۔ پروگرام کا آغاز راقم الحروف کی تلاوت سے ہوا۔ ٹھیک پونے سات بجے امیر محترم
نے درس کا آغاز فرمایا۔ حاضری تقریباً چار صد کے لگ بھگ تھی پہلے دن امیر محترم نے

ایمانیات کے ذیل میں بنیادی مباحث کا آغاز فرمایا جن میں ایمان کے لفظی معنی' ایمان کا اصطلاحی مفہوم' ایمان کا موضوع مابعد الطبیعاتی مسائل' ایمانیات ثلاثہ' توحید' معاد اور رسالت کا باہمی ربط' ایمان مجمل اور ایمان مفصل' ایمانیات ثلاثہ کی تقابلی اہمیت اور ایمان کے دو درجے قانونی ایمان اور حقیقی ایمان بڑے ہی دلنشین انداز میں بیان فرمائے۔ اگرچہ اس گفتگو کا ہر ہر موضوع اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن اس سلسلے کی سب سے اہم بحث ایمانیات ثلاثہ کا باہمی ربط اور ان کی تقابلی اہمیت اور ایمان کے دو درجے جس میں قانونی ایمان اور حقیقی ایمان اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑی ہی مؤثر محسوس ہوئی۔ جس سے نہ صرف آج کل کی جدید اسلامی ریاست کے بڑے بڑے عقدے حل کرنے کی رہنمائی ملتی ہے بلکہ سلف صالحین میں ہمارے دو معتبر بزرگوں کی ایمان کے سلسلے میں مختلف آراء کی خوبصورت انداز میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔

امیر محترم نے قرآن و حدیث کی روشنی میں فرمایا کہ فکری و نظری اعتبار سے اصل اہمیت ایمان باللہ کی ہے جبکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد اس کی دو شاخیں ہیں۔ قانونی و فقہی اعتبار سے اصل اہمیت ایمان بالرسالت کی ہے جبکہ عمل کے اعتبار سے اصل اہمیت ایمان بالمعاد کو حاصل ہے۔ بندۂ مومن کی سوچ و فکر کے دھارے کو بدلنے اور اُس کے عمل کی درستگی کے لئے ایمان بالمعاد مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طرح قانونی اور حقیقی ایمان کے ضمن میں امیر محترم نے فرمایا کہ اس دنیا میں کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے صرف اتنا کافی ہو گا کہ وہ زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرے اور کوئی ایسا عقیدہ نہ رکھتا ہو' جو اسلام کے بنیادی عقائد سے متصادم ہو۔ اس سے اسلام کے قانونِ وراثت اور اسلامی ریاست میں ایک کامل شہری کی حیثیت سے جتنے فوائد ہیں وہ اُس کو حاصل ہوں گے کیونکہ قانونی طور پر وہ مسلمان ہے چاہے فاسق ہو یا فاجر ہو جبکہ آخرت کے اعتبار سے صرف زبان سے اقرار کافی نہیں ہو گا بلکہ اُس کا دارومدار اُس کے حقیقی ایمان پر منحصر ہو گا۔ امیر محترم نے سلف صالحین میں دو معتبر بزرگوں امام ابو حنیفہؒ اور امام بخاریؒ کی ایمان کے بارے میں مختلف آراء کو تطبیق دیتے ہوئے فرمایا کہ اصل میں امام ابو حنیفہؒ بنیادی طور پر ایک فقیہ تھے جن کی نظر ایمان کے قانونی پہلوؤں پر زیادہ تھی جبکہ امام بخاریؒ ایک محدث تھے جن کی نظر ایمان کے حقیقی پہلوؤں پر تھی۔ اس طرح ان دونوں بزرگوں کی ایمان کے بارے میں مختلف آراء کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں تطبیق دی گئی۔ پہلے دن کی نشست جو کہ تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔

بڑے ہی دلنشین انداز میں ایمانیات کی بنیادی مباحث کا احاطہ کیا گیا۔ دعا کے بعد نماز عشا
کی گئی جس کا انتظام کالج کے لان میں کیا گیا تھا۔ حسبِ پروگرام رفقاء کا کھانا اور رات کا
مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب کے گھر پر تھا۔ رفقاء نے رات کا کھانا امیر محترم کے
مقامی امیر کے گھر پر تناول فرمایا۔ رات کو شب بسری کے سلسلہ میں تمام رفقاء کا
اکرام الحق صاحب کے گھر ہی میں رہا۔

اگلی صبح نمازِ فجر کے بعد میاں محمد نعیم صاحب نے تنظیمی نوعیت کے کچھ پروگرام تر
دیئے تھے۔ جس میں نماز فجر کے بعد ہمارے ایک رفیق خاور قیوم صاحب کا آدھ گھنٹہ
درس قرآن تھا جو انہوں نے بڑی عمدگی کے ساتھ دیا۔ ہمارے دوسرے سینئر رفیق سیّد بر
علی صاحب نے تنظیم اسلامی کوئٹہ کی مختصر تاریخ اور اس کا جائزہ بڑے ہی خوبصورت پیرائے
بیان فرمایا۔ بعدازاں اجتماعی ناشتہ کے بعد رفقاء کے اندر اجتماعی شعور بیدار کرنے ک
اظہار خیال کا ایک پروگرام ہوا۔ جس میں ہر رفیق نے بڑے ہی سلیقے سے مقامی تنظیم
رفتار کار کا جائزہ اپنے اپنے انداز میں پیش کیا۔ جس میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر خامیوں
نشاندہی کی گئی اور تحدیثِ نعمت کے طور پر بحیثیت مجموعی خوبیوں کا ذکر بھی کیا گیا۔ بعد میں ر
نے متبدی رفیق کے مروجہ تربیتی نصاب کے ضمن میں کوئٹہ کے رفقاء کا گذشتہ دوماہ کا فردا فر
جائزہ پیش کیا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن امیر محترم تشریف لے آئے۔ رفقاء نے ا
موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے امیر محترم سے مختلف نوعیت کے سوالات کئے۔ جس کے جوابا
امیر محترم نے تفصیلی انداز میں دیئے۔ ٹھیک سوا ایک بجے اجتماعی دوپہر کا کھانا چن دیا گیا۔ نم
ظہر کی ادائیگی اور آرام کیلئے امیر محترم جناب چودھری صاحب کی رہائش گاہ پر واپس تشریف لے
گئے۔ دیگر رفقاء بھی شام چار بجے تک اپنی اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ مجت
ہو گئے اور شام کے درس کیلئے تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

ایمان کی اس دوروزہ بہار کا یہ دوسرا دن تھا جس میں حاضری گذشتہ روز سے زائد تھی۔
امیر محترم نے ایمان حقیقی یا یقین قلبی کے داخلی اور خارجی ثمرات اور ایمان کے اجزائے ترکیب
اور اس کے حصول کے ذرائع بڑے ہی دلنشین اور خوبصورت انداز میں بیان فرمائے۔ امی
محترم نے فرمایا کہ اگر بندۂ مومن کو ایمان حقیقی کی دولت حاصل ہو جائے تو اس کے تین ثمرات
اس کی شخصیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ پہلا تو داخلی ثمرہ ہے جس میں بندۂ مومن کو ذہنی اطمینان
اور قلبی امن و سکون ملتا ہے اس کے علاوہ دو خارجی ثمرات ہیں جس کے لئے امیر محترم نے

قرآن وحدیث کے بیشتر حوالہ جات سے ثابت کیا کہ خارج میں ایک تو ائس کا عمل درست ہو جاتا ہے اور دوسرا اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ صاحبِ ایمان شخص جہاد فی سبیل اللہ کی کٹھن منزل پر دل وجان سے گامزن ہو جاتا ہے۔ ایمان کے اجزائے ترکیبی اور حصول کے ذرائع کی وضاحت کرتے ہوئے سورۃ الحجرات کی روشنی میں آپ نے فرمایا کہ حقیقی ایمان کی موجودگی میں مومن کا ایمان اللہ اور رسولؐ پر پختہ ہوتا ہے اور پھر وہ شک میں نہیں پڑتا اور ساتھ ہی اپنے مال اور جان کو جہاد فی سبیل اللہ میں لگاتا اور کھپاتا ہے۔ یعنی ایمان کے اجزائے ترکیبی دو ہیں ایک اللہ اور رسولؐ پر پختہ یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔

آخر میں امیر محترم نے انجمن خدام القرآن کوئٹہ کے قیام کے سلسلے میں اس کا تعارفی جائزہ پیش کیا۔ جس کے لئے فوری طور پر جناب چودھری محمد یوسف صاحب کو اس کا کنوینر مقرر کیا گیا اور ساتھ ہی لوگوں کو اس کے دستور کے مطالبہ اور اس میں شرکت کی ترغیب وتشویق دلائی۔ انشاء اللہ جلد ہی کوئٹہ میں بھی انجمن خدام القرآن کی ایک باقاعدہ ذیلی شاخ کا افتتاح ہو جائے گا۔ دعا کے بعد جن لوگوں نے جلد ہی جانا تھا اُن کیلئے ایک علیحدہ نماز عشاء کی جماعت منعقد کی گئی۔ جبکہ آڈیٹوریم ہال میں پروگرام کے مطابق سوال وجواب کی نشست کا پروگرام جاری رہا۔ جس میں امیر محترم نے درس سے متعلق اور دیگر تنظیمی نوعیت کے سوالات کے تسلی بخش جوابات دیئے۔ آخر میں دعا کے بعد نماز عشاء ادا کی گئی۔ دو حضرات جنہوں نے تقریباً پندرہ بیس روز قبل بیعت نامہ فارم پر کئے تھے، باقاعدہ طور پر امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس کے علاوہ ایک نئے صاحب نے اگلے روز چودھری محمد یوسف صاحب کے گھر پر جاکر سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت کی۔ دورے کے تیسرے روز یعنی ۱۲ر اکتوبر کو صبح گیارہ بجے امیر محترم کو بلوچستان ہائیکورٹ بار کونسل سے خطاب فرمانا تھا۔ الحمدُ للہ امیر محترم نے استحکام پاکستان اور موجودہ سیاسی صورتحال پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی۔ جس سے ہماری وکلاء برادری کافی مطمئن نظر آتی تھی۔ بعدازاں کچھ سوال وجواب اور ہلکی پھلکی چائے کے بعد یہ پروگرام بھی اختتام پذیر ہوا۔ اس کے بعد امیر محترم چودھری صاحب کے ساتھ ہمارے رفیق خاور قیوم صاحب کے ہاں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ کھانے اور نماز سے فراغت کے بعد جناب میاں محمد نعیم، مقامی امیر جناب اکرام الحق صاحب، جناب خاور قیوم صاحب اور راقم الحروف نے امیر محترم کو رخصت کیا۔ اس طرح ایمان کی بہار کے اس سہ روزہ پروگرام نے ایک مرتبہ پھر کوئٹہ کے شہریوں کو بالعموم اور مقامی رفقاء کو بالخصوص ایمان کی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ان گناہوں پر، ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ولیسا بوجھ نہ ڈال جیسا تونے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہوگزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۔

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

اِن شاءَ اللہُ العزیز

انجمن خدام القرآن سندھ کراچی

کے زیرِ اہتمام

۱۷ تا ۲۱ دسمبر ۸۸ء ریکس آڈیٹوریم صدر کراچی میں

اسلام کا نظامِ حیات

کے موضوع پر "محاضراتِ قرآنی" منعقد ہوں گے جن میں روزانہ بعد نمازِ مغرب

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ——— و امیر تنظیم اسلامی
درج ذیل موضوعات پر خطاب فرمائیں گے اور متعلقہ سوالات کے جواب دیں گے

★ ۱۷ دسمبر بروز ہفتہ — **اسلامی نظام کی نظریاتی اساس**

★ ۱۸ دسمبر بروز اتوار — **اسلام کا اخلاقی و روحانی نظام**

★ ۱۹ دسمبر بروز پیر — **اسلام کا سماجی و معاشرتی نظام**

★ ۲۰ دسمبر بروز منگل — **اسلام کا سیاسی و ریاستی نظام**

★ ۲۱ دسمبر بروز بدھ — **اسلام کا معاشی و اقتصادی نظام**

نوٹ: خواتین کے لیے پردے کا انتظام ہوگا، اجتماع کے بعد نمازِ عشاء باجماعت ادا کی جائے گی

المعلن: (سید) سراج الحق، صدر انجمن خدام القرآن سندھ
D-56، بلاک بی، نارتھ ناظم آباد، کراچی (فون :- ۶۲۴۴۵۰)

ان شاء اللہ العزیز وبعونہٖ تعالیٰ

انجمن خدام القرآن کے قرآنی محاضرات کے ساتھ ساتھ

ریکس آڈیٹوریم کراچی ہی میں ۱۷ تا ۲۲ دسمبر ۱۹۸۸ء

تنظیمِ اسلامی کی مرکزی تربیت گاہ

بھی منعقد ہو گی، جس میں

★ قرآن حکیم کے دعوتی اور تربیتی نصاب اور

★ تزکیۂ نفس کے اصول و مبادی، کے علاوہ

★ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق و منہاج، اور

★ دعوت و تنظیم کی راہ کی مشکلات اور اُن کا حل

ایسے اہم موضوعات پر مذاکرات ہوں گے

تنظیم اسلامی کے رفقاء ابھی سے رخصت وغیرہ کا بندوبست شروع کر دیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۷ دسمبر ۸۸ء کی سہ پہر تک ضرور کراچی پہنچ جائیں۔ وہاں سے واپسی کے لیے جمعرات ۲۲ دسمبر کی بعد دوپہر بکنگ کرائی جائے۔ قیام گاہ وغیرہ کے ضمن میں تفصیلی اطلاع 'میثاق' کے آئندہ شمارے میں شائع کر دی جائے گی۔

المعلن: (میاں) محمد نعیم، ناظمِ اعلیٰ، تنظیم اسلامی پاکستان

۶۷ - اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور
(فون: ۳۰۵۱۱۰)

SUBSCRIPTION RATES OVERSEAS

U S A US $ 12/=
c/o Dr. khursid A. Malik
SSQ 810 73rd street
Downers Grove IL 60516
Tel: 312 969 6755

c/o Mr. Rashid A. Lodhi
SSQ 14461 Maisano Drive
Sterling Hgts MI 48077
Tel: 313 977 8081

CANADA US $ 12/=
c/o Mr. Anwar H. Qureshi
SSQ 323 Rusholme Rd # 1809
Toronto Ont M6H 2Z2
Tel: 416 531 2902

UK & EUROPE US $ 9/=
c/o Mr. Zahur ul Hasan
18 Garfield Rd Enfield
Middlesex EN 34 RP
Tel: 01 805 8732

MID-EAST DR 25/=
c/o Mr. M. A. Javed
JKQ P.O.Box 4699
Dubai UAE
Tel: 459 112

ABU DHADI DR 25/=
c/o.Mr. M. Ashraf Faruq
JKQ P.O.Box 27628
Abu Dhabi
Tel: 479 192

K S A SR 25/=
c/o Mr. M. Rashid Umar
P.O.Box 251
Riyadh 11411
Tel: 476 8177

JEDDAH SR 25/=
c/o Mr. M. A . Habib
CC 720 Saudia P.O.box 167
Jeddah 21231
Tel: 651 3140

INDIA US $ 6/=
c/o Mr.Hyder M. D. Ghauri
AKQI 4-1-444 2nd Floor
Bank St Hyderabad 500 001
Tel: 42127

To, Maktaba Markazi Anjuman
Khudam ul Quran Lahore.
U B L Model Town Ferozpur Rd
Lahore.

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ فون: ۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی- فون: ۲۱۶۵۸۶
پبلشرز: لطف الرحمٰن خان مقامِ اشاعت: ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن- لاہور
طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

اقتدار احمد

عرضِ احوال

ان صفحات میں جماعت اسلامی کا ذکر اگرچہ موقع و محل کی مناسبت سے ہی آتا ہے' تاہم جب بھی ایسا ہوا' ہمارے بعض قارئین نے ناک بھوں چڑھائی کہ ہم مثبت انداز میں اپنی بات کہنے پر بس کیوں نہیں کرتے' خوباں سے چھیڑ کیوں چلائے رکھتے ہیں۔ پھر جماعت سے متعلق کسی موضوع پر گفتگو میں ہماری تقریر و تحریر میں جو ذرا تلخی در آتی ہے' اسے بھی ہمارے درد سے نا آشنا لوگ چشمک' رقابت بلکہ بعض اوقات حسد تک سے تعبیر کرتے رہے' حالانکہ سینوں میں چھپے بھید جاننے والے کو خبر ہے کہ ہمارے دل میں وابستگانِ جماعت کے لئے جذبۂ خیر خواہی کے علاوہ جو ہے وہ محبت ہی محبت ہے۔ ان میں اگرچہ آہِ سحر گاہی سے وضو کرنے والے اب خال خال ہی رہ گئے ہیں' تاہم اکثریت کے ذہنوں میں دین کا وہ ہمہ گیر تصور آج بھی موجود ہے' مذہبیت کے گنبد میں بند لوگوں کو جس تک رسائی حاصل نہیں۔ جماعت قیامِ پاکستان کے بعد ایک غلط موڑ مڑ کر اب اپنی منزل سے بہت دور ہو گئی ہے' لیکن اس کا نقطۂ آغاز بھی درست تھا اور ہدف کے تعین میں بھی ترجیحات کی ذرا سی اونچ نیچ کے سوا کوئی غلطی نہ پائی جاتی تھی۔ وہ آج سر سے پاؤں تک ایک خالص قومی سیاسی جماعت نظر آتی ہے تو کیا ہوا' اس کی اٹھان ایک اصولی انقلابی تنظیم کی سی تھی اور اس گئے گذرے زمانے میں بھی اس کے کارکنوں میں مقصد سے لگن' خلوص اور ایثار کا اتنا سرمایہ پایا جاتا ہے جو چراغ لے کر ڈھونڈے بھی دوسرے لوگوں میں بقدرِ قلیل ہی ملے گا۔ ان کا ذکر چھڑنے پر سینے میں ایک تیر سا آ کر پیوست ہو جاتا ہے' نالہ و شیون میں تلخی بھی آ ہی جاتی ہے۔

ہم جماعت اسلامی کے بارے میں بات کرنے اور اس کے وابستگان سے خطاب کا اپنے تئیں مستحق بھی سمجھتے ہیں۔ کوئی لاکھ ہمارے کام کی تحقیر کرے' اس حقیقت سے انکار نہ کر سکے گا کہ ہماری سعی و جہد کا مرکز و محور بھی دین ہے' ہم اسی منزل کے راہی ہیں جس کی طرف از تالیس سال قبل جماعت نے سفر شروع کیا' رجوع الی اللہ کی اسی دعوت کے نقیب ہیں جس کی مدہم پڑتی آواز کو مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے ایک نیا آہنگ دیا تھا اور ہماری صفوں میں آج بھی وہ لوگ موجود ہیں بلکہ رہنمائی کے مناصب پر فائز ہیں جنہیں شوق جادہ پیمائی ہی

جماعت سے نہ ملا' ایک عرصہ ہمرکابی کا شرف بھی حاصل رہا ہے۔ ہمیں تجدید و احیائے د
کا وہ سبق بھلائے نہیں بھولتا جو جماعت نے دیا اور جس کی فکر ہمیں بے چین کئے رکھتی ہے
کیا قیامت ہے کہ وہی لوگ سب کچھ بھول بھال کے اب خود فراموشی کی راحت تک کے مز
لوٹ رہے ہیں جنھوں نے ہمارا خواب و خور حرام کیا۔ انہیں جھنجوڑ کر جگانے کی کوششیں بھی
کریں تو سوا مشکل ہے۔ آج انہیں ایک بے حقیقت اور وقتی مہم سر کرتے ہوئے ہنگامہ آر
کے رائج الوقت انداز اپناتے' ووٹروں کے شکار کے لئے روایتی ہانکا کرتے' شرتال میں نعر
لگاتے' شائقین کے جوش و خروش کو ہاتھ ہلا ہلا کر بڑھاوا دیتے' استقبال کرنے والوں
کندھوں پر سواری کرتے' ہاروں سے لدے پھولوں اور پتیّوں کی بارش میں نہاتے' میدا
سیاست کے حریفوں کو دعوت مبارزت دیتے ہوئے متانت و شائستگی کا دامن چھوڑتے' ز
حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ہوائی باتیں کرتے' بدنامِ زمانہ موقع پرستوں' فہ
بٹیروں اور سیاسی شعبدہ بازوں کی رفاقت و ہمنوائی کرتے اور خود امیرِ جماعت کو اپنا پورا قیمتی
وقت' پوری توانائی اس نیک کام میں جھونکتے دیکھتے ہیں تو اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے' اک
درد جگر میں ہوتا ہے۔ فریاد لب پہ آنے کے لئے مچلتی ہے۔ ہم نشیں! میں بھی کوئی گل ہوا
کہ خاموش رہوں۔ ایسے میں چشمک' رقابت یا حسد کا کیا گذر' دل و دماغ پر تو حسرت کا قبضہ
غاصبانہ ہے۔

تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل اور جماعت کی نوجوان نسل نے وہ مناظر نہیں دیکھے جو ا
گنہگار آنکھوں کے سامنے آج بھی پھرتے ہیں۔ یہ لوگ ذرا ہمارے ساتھ آئیں' گردش ایا
کو پیچھے کی طرف دوڑاتے ہیں۔ یہ ازمنۂ قدیم کا نہیں' قیام پاکستان کے بعد اسی شہر لاہور کا ذکر
ہے۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ملتان سنٹرل جیل میں سیفٹی ایکٹ کے تحت خاصی طویل
اسیری گذار کر ایک زوردار مہم اور مجلس دستور ساز کی بے جواز معطلی سے پیدا ہونے وا
دستوری خلاء کے نتیجے میں رہا ہوئے اور ریل کے ذریعے لاہور مراجعت فرما رہے ہیں۔ ریلو
سٹیشن پر جماعت کے زعماء' اراکین اور ہمدرد اسلامی جمعیت طلبہ کے نوخیز جوانوں اور مولا
کے احباب سمیت استقبال کے لئے جمع ہیں۔ پلیٹ فارم کے ہجوم میں یہ گروہ اپنی متانت
سنجیدگی اور پروقار حرکات و سکنات کے باعث بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ نوجوانوں کے
ایک پرّے میں' جن کے چہرے خوبصورت داڑھیوں سے مزیّن ہیں' کھسر پھسر ہوئی اور
آنکھوں ہی آنکھوں میں باہم دگر اشاروں کے بعد' ایک لمبا تڑنگا گورا چٹا نوجوان قائم مقام امیر

جماعت اسلامی پاکستان کے قریب آتا ہے۔ روئے روشن گرمئ شوق اور جوشِ دروں سے تمتا رہا ہے' جسے مدعا کی جسارت کا احساس اور بھی گلنار کئے ہوئے تھا...... "مولانا! ہمیں نعرے لگانے کی اجازت مل سکتی ہے؟" اور جواب ملتا ہے۔ "ہرگز نہیں۔ یہ ہمارا طریقہ نہیں" امیر جماعت کے قریبی رفقاء بھی متوجہ ہو جاتے ہیں' ان کے چہروں پر تبسم کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے جس میں نوجوان کے جذباتِ عقیدت کا احترام' اس کی خواہش کی معصومیت کا اعتراف اور محبت و شفقت کا رنگ نمایاں تھا۔ ان کی سفارش پر امیرِ جماعت بھی موم ہو جاتے ہیں' موقع ہی ایسا تھا' خود ان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ امارت کے بارِ گراں سے سبک دوش ہونے والے تھے چنانچہ صرف ایک نعرہ محض ایک بار لگانے کی اجازت مرحمت کر دی جاتی ہے۔ نعرۂ تکبیر' اللہ اکبر۔ نوجوان نہال ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے لپکتا ہے۔ گاڑی کی آمد آمد ہے لہٰذا اب صف بندی کر لی گئی ہے' پہلا نمبر قائم مقام امیر جماعت کا اور اکابر واصاغر حسبِ مرتبہ و مقام۔ مولانا مودودی کسی سہارے کے بغیر ریل کے ڈبے سے اترے اور اپنے پیروں چل کر تشریف لائے اور ظاہر ہے کہ پھر مصافحہ و معانقہ میں بچی گرم جوشی کا پر خلوص اظہار بھی سلیقہ سے ہوا ہو گا' لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ نعرہ ایک اور صرف ایک بار ہی لگا۔ قائم مقام امیر جماعت مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ تھے اور نوجوان یوسف خان۔ دونوں بحمد اللہ بالترتیب فیصل آباد اور لاہور میں مقیم ہیں۔ مولانا اب جماعت کے ساتھ نہیں' شاید ان کی گواہی معتبر نہ ٹھہرے' لیکن جناب یوسف خاں تو آج بھی جماعت اسلامی کے عوامی سیاستدانوں میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ۸۵ء کے الیکشن میں جماعت کی طرف سے صوبائی نشست پر مقابلہ کر کے ہار گئے تھے۔

ایک ہی واقعہ کی منظر کشی میں اتنی سطریں کھپ گئیں لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ ان گذرے واقعات کے مناظر اور اساطیر الاولین کی جھلکیاں دکھانے پر آئیں تو دیکھنے والوں کی آنکھیں تھک جائیں گی' پتھرا جائیں گی۔ اور ۱۹۵۱ء کی پہلی انتخابی مہم کا ذکر کرنے کی تو تاب ہی نہیں جس میں ہم نے خود اس انہماک سے کام کیا اور خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں کو یوں تج دیا تھا کہ سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی۔ تقابل میں زمین و آسمان' خوب و زشت اور حرام و حلال کا فرق واقع ہو جائے گا' لہٰذا پھر سہی۔ ایک جھلک جو ہم دکھا چکے ہیں اسی سے قیاس کر کے نقشہ پورا کر لیا جائے اور اپنی سرگرمیوں کے نقش و نگار سے موازنہ بھی۔ جماعت کے مخلصین کو ہماری دعوت بس اتنی ہے کہ اپنے اس لٹریچر کا ایک بار پھر غ

سے مطالعہ کریں' جن کے خطوط پر مولانا مودودی مرحوم و مغفور نے اپنی تحریک اسلامی کو استوار کیا تھا اور اُس زمانے پر نگاہ باز گشت ڈال دیکھیں جو ۱۹۵۰ء کے بھی دو تین سال بعد تک چلا تھا۔

ہم نے انہیں دلسوزی اور غایت درجہ کی عاجزی سے کہا کہ انتخابی سیاست کی غلاظت سے بچ کر نکلتے ہوئے اپنے اسی کردار کو نبھانے کی فکر کریں جو ایک اصولی' اسلامی' انقلابی جماعت کو زیب دیتا ہے تو اس لئے نہیں کہ ان کی "سیٹوں" پر ہم خود ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ حالیہ الیکشن میں اپنے سب اصول' اپنے طریق کار' اپنا طرۂ امتیاز اور اپنے طور اطوار قربان کر کے انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اس کے نفع نقصان کا میزانیہ تو بنا کر دیکھیں۔ کیا کھویا کیا پایا؟۔ ہمیں انہیں اپنی قیادت سے برگشتہ کر کے کچھ نہ ملے گا' لیکن ذرا غور تو کریں راہبر انہیں کہاں سے کہاں لے آئے ہیں۔ کیا ان کا یہی مقام تھا جہاں آج کھڑے نظر آتے ہیں؟۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ان کی قیادت کو بھی ماں سے زیادہ چاہنے والی پھاپھا کٹنیوں نے شیشے میں اتارا۔ دانشوروں کے مفت مشوروں اور صحافیوں کے ندرت خیال کی لڑیوں میں پروئے گئے چمکتے مٹکتے الفاظ پر مشتمل تجزیوں نے سبز باغ دکھائے۔ منصورہ کے "گیٹ آفس" میں سارا ریکارڈ محفوظ ہو گا۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ کن نازک مراحل میں کون کون نابغۂ عصر دانشور اور صحافی غول در غول اپنے قیمتی مشوروں کی سوغات لاتے رہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو جماعت کے مخلصین سے زیادہ اسلام کا درد دل میں رکھتے ہوئے بھی جماعت کے نظم کی پابندی قبول نہیں کرتے۔

دستِ ہر نا اہل بیمارت کند   سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

اللہ تعالیٰ ہمیں اس شقاوتِ قلبی سے بچائے رکھے کہ ہم اپنے دینی بھائیوں کے تازہ زخموں پر نمک پاشی سے حظ اٹھائیں۔ ہمیں تو یہ یقین خامہ فرسائی پر مجبور کرتا ہے کہ جماعت اسلامی میں ابھی وہ سعید روحیں موجود ہیں' ان رجالِ رشید سے تا حال اس کی صفیں خالی نہیں ہوئیں جو اس موقع کو دروں بینی اور خود احتسابی کے کام لائیں گے۔ حاسبوا قبل ان تحاسبوا۔ اُخروی محاسبہ کے تو خیال سے ہی مسلمان لرزتا ہے' محاسبہ رائے عامہ بھی کرے گی۔ حالیہ انتخابات میں ہزیمت پر شاید اعداد و شمار کے گورکھ دھندے کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی جائے' لیکن ہمارے سب کے سب بھائی تو خیالستان کے باسی نہیں۔ خدا کے لئے تنقیحات و توجیہات کے سحر سے نکل آیئے اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت اپنے

اندر پیدا کیجئے۔ اپنے اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے اور اپنی قدروں کے نازک شیشے کو محفوظ رکھ کر جماعت کو ایک بھی سیٹ نہ ملتی تب بھی وہ کامیاب کہلاتی، اس بگڑے ہوئے معاشرے میں اپنے کردار سے کچھ شمعیں تو روشن کر جاتی۔ لیکن اب کیا نتیجہ نکلا ہے، ہم نہیں کہتے، وہ خود ہی غور فرمائیں۔ اس عاشقی میں کیا عزتِ سادات بھی چلی نہیں گئی؟

ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ دین سے خلوص واخلاص کا رشتہ رکھنے والے، غلبۂ دین کا واضح تصور رکھتے ہوئے اس کی آرزو میں جینے والے اور نجات وفلاحِ اُخروی کے خواہشمند وابستگانِ جماعت اسلامی اپنی جماعت کو چھوڑ کر ہم سے آملیں۔ ہمیں خود "الجماعت" اور "الحق" یا عقلِ کل ہونے کا دعویٰ نہیں۔ تمنا ہے تو بس اتنی کہ دین کے اس زیاں کا احساس ہو جائے جو اس منظم قوت کو ایک خالص عوامی سیاسی جماعت کے قالب میں ڈھالنے سے ہوا ہے حالانکہ حقیقی صورت حال کے اعتبار سے ابھی ایک "انقلابی جماعت" کی سی جدوجہد درکار تھی۔ عوامی سیاسی جماعت تو کم ترشے ہے، سیاسی جماعت اور انقلابی جماعت کے طریقِ کار اور طرزِ عمل میں بھی جو "باریک سافرق" ہوتا ہے، اس کے بارے میں تلاش کرنے پر مولانا مودودی مرحوم ومغفور کے یہ الفاظ ہمارے بھائیوں کو اپنے لٹریچر میں ضرور مل جائیں گے کہ......

> "اب ایک جماعت تو وہ ہوتی ہے کہ جس کے پیش نظر ایک قوم یا ملک کے مخصوص حالات کے لحاظ سے سیاسی تدبیر کے طور پر ایک خاص نظریہ اور پروگرام ہوتا ہے۔ اس قسم کی جماعت محض ایک سیاسی جماعت ہوتی ہے"۔.........
>
> "دوسری جماعت وہ ہوتی ہے جو ایک کلی نظریہ اور جہانی تصور (WORLD IDEA) لے کر اٹھتی ہے جس کے سامنے تمام نوعِ انسانی کے لئے بلا لحاظ قوم ووطن ایک عالمگیر مسلک ہوتا ہے جو پوری زندگی کی تشکیل وتعمیر ایک نئے ڈھنگ پر کرنا چاہتی ہے۔ جس کا نظریہ ومسلک، عقائد وافکار اور اصول اخلاق سے لے کر انفرادی برتاؤ اور اجتماعی نظام کی تفصیلات تک ہر چیز کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے............"

اس باریک سے فرق سے ہر دو نوع کی جماعتوں کے رنگ ڈھنگ اور کارکنوں کے نقطۂ نظر میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اور زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ جس پر اب انگشت نمائی کی حاجت نہیں۔ آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ صورت حال کھلی کتاب کی

طرح سامنے پڑی ہے۔ جماعت اسلامی کے مخلص وابستگان نوشتۂ دیوار پڑھنے پر آمادہ ہو جائیں اور اپنی اجتماعیت کو صبغت اللہ کے اسی رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھالیں کہ یہی رنگ اس خاکے میں سجتا ہے جو جماعت کی تاسیس کے موقعہ پر مرتب کیا گیا تھا' تو یہ "من عزم الامور" یقیناً ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی تائید انہیں میسر ہوگی اور ہم ان کے قافلے میں چھوٹے بن کر شامل ہونے کو اپنی سعادت شمار کریں گے۔ اس کے لئے اپنے رب سے توفیق طلب کی جانی چاہئے۔ عزیمت کے اس مقام تک پہنچنا میسر نہ ہو تب بھی اس کی طرف مراجعت کا سفر تو جاری رہنا چاہئے جس کے دوران انہیں از خود محسوس ہو گا کہ ان کی واپسی میں دین حق کی سربلندی اور ملک وملت کی سرفرازی کے آثار پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ سنگہائے میل مہمیز کا کام دیں گے اور لبوں پر شاعر مشرق کی یہ حدی ہوگی۔

تیز ترک و گامزن منزلِ ما دور نیست

خلاصۂ کلام یہ کہ حالیہ انتخابات میں اپنی جماعت کی حکمت عملی کو اس منطقی انتہا تک پہنچا ہوا دیکھ کر جس کی ابتداء ۱۹۵۱ء میں خلوص ونیک نیتی سے انتخابی مہم کو دین کی منشاء اور اپنے اصولوں کے ممکن حد تک تابع رکھ کر لیکن ایک غلط مفروضے کی بناء پر کی گئی تھی' نتائج کا موازنہ کر کے اور نفع نقصان کا میزانیہ مرتب کرنے کے بعد جماعت اسلامی کے وابستگان ہمت نہ ہاریں بلکہ اللہ کا نام لے کر خود احتسابی کا ڈول ڈالیں کہ یہی تقاضائے وقت ہے۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

احتساب کا یہ عمل اب بھی ان کی جماعت کو نام کی نہیں' حقیقی تحریک اسلامی بنا سکتا ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی۔

●

نبی اکرم ﷺ سے

ہمارے تعلق کی بنیادیں

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الہُدیٰ

درس نمبر ۱۲ نشست ۵۶

مباحثِ عمل صالح

مسلمانوں کی سیاسی و مِلّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

(۳)

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ○

وقال تبارک و تعالی

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا ج فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰہِ ج فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○ صدق اللہ العظیم۔

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو

چھان بین کر لیا کرو۔ مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں پچھتانا پڑے"......

اس کے بعد فرمایا...... "اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کراوو اور اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرنے پر مصر رہے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ پھر اگر وہ اللہ کے حکم کو تسلیم کر لے تو پھر صلح کرادو ان دونوں کے مابین انصاف کے ساتھ 'اور عدل سے کام لو۔ یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔ یقیناً تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے مابین صلح کرادیا کرو 'اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔

محترم حاضرین و معزز ناظرین!

ابھی آپ نے سورۃ الحجرات کی آیت نمبر چھ اور اس کے بعد آیات نمبر نو اور دس کی تلاوت اور ترجمہ سنا۔ جیسا کہ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی شیرزاہ بندی کو مستحکم رکھنے کیلئے چند نہایت اہم احکام ہیں جو سورۃ الحجرات میں وارد ہوئے ہیں۔ پچھلے دو دروس میں مسلمانوں کی حیات ملی یا ہیئتِ اجتماعیہ کی جو دو بنیادیں ہیں ان کی نشاندہی ہو گئی تھی۔ ایک دستوری ' آئینی و قانونی بنیاد جس پر نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے۔ دوسری وہ جذباتی بنیاد جس سے تمدن اور تہذیب و ثقافت وجود میں آتی ہے...... اب اس ہیئتِ اجتماعیہ کی شیرازہ بندی کو مضبوط رکھنے کیلئے دو احکام ان آیات میں وارد ہوئے جو آج ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں اور یہ دونوں احکام نہایت اہم ہیں۔

پہلا حکم یہ ہے کہ محض افواہ پر کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ اگر کہیں سے کوئی خبر آئی اور خبر بھی اہم قسم کی ہو (عربی میں نبأ اہم خبر کو کہتے ہیں) تو اس کے ضمن میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو گا کہ یہ خبر لانے والا کون ہے! اگر وہ کوئی انتہائی معتبر شخصیت ہو مثلاً حضرت ابو بکر صدیقؓ 'عمر فاروقؓ 'عثمان غنیؓ 'یا علی مجتبیٰؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ میں سے کوئی خبر دے رہا ہو تو کسی تحقیق ' کسی تبیین اور کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے 'لیکن اگر اس خبر کا لانے والا کوئی ایسا شخص ہے کہ جو احکام الٰہیہ پر اس طور پر کاربند نہیں ہے جس طور پر ایک مومن صادق کو ہونا چاہئے تو ایسے شخص کی لائی ہوئی خبر پر کوئی اقدام کرنا بہت خطرناک ہو سکتا ہے 'لہٰذا اس کی تحقیق 'تبیین

ر تفتیش ضروری ہے' اور اسی سے یہ بات از خود سامنے آتی ہے کہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ جس کے
رے میں معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص متقی ہے یا فاسق' تو سب سے پہلے اس شخص کے بارے
ں تحقیق کرنی ہوگی کہ اس کا کردار کیسا ہے! اس کا اخلاق کیسا ہے! دین کے ساتھ اس کے
ویئے اور طرز عمل کا معاملہ کیسا ہے!..... تو یہ دونوں چیزیں سامنے رکھئے کہ خبر لانے والے
کے بارے میں بھی تحقیق و تفتیش..... اور پھر جو "خبر" لائی گئی ہے' اس کے بارے میں بھی
پوری چھان بین کرنی ضروری ہے۔ ان دونوں مرحلوں سے گزر کر پھر کوئی فیصلہ کیا جائے اور
س فیصلے کے مطابق پھر کوئی اقدام ہو.....

واقعہ یہ ہے کہ اگر ان معاملات میں سہل انگاری سے کام لیا جائے اور ان احتیاطوں کو
لحوظ نہ رکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ نادانی میں' نادانستگی میں' جہالت میں کسی غلط اطلاع کی
بنیاد پر کوئی اہم اقدام ہو جائے اور بعد میں معلوم ہو کہ یہ اطلاع ہی سرے سے غلط تھی۔ یہ
معاملہ عام طور پر خود ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے کہ ایک افواہ کہیں سے چلی اور پھر وہ
بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک کی زبان سے نکلی اور دوسرے کے کان تک پہنچی۔ اب جب اس کی
زبان سے نکلتی ہے تو اس میں اضافے ہوتے ہیں اور پھر یہ افواہ اضافوں کے ساتھ معاشرے میں
جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات بڑی اہم ہے
کہ تحقیق و تفتیش کے ذریعے سے صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد کوئی اقدام ہو۔ اس سلسلے
میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بہت ہی پیارا ہے۔ آپؐ نے ایک ایسا معیار
ہمارے سامنے رکھا ہے کہ واقعۃً اگر اس پر انسان کسی درجے میں بھی عمل پیرا ہو جائے تو اس
طرح کے تمام اندیشوں کا سدباب ہو جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ "کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ
بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے"..... اب دیکھئے کہ بڑی عجیب' بڑی
پیاری بات ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے کسی سے کچھ سنا'
اس میں کوئی اضافہ بھی نہیں کیا' وہی بات جوں کی توں آگے بیان کر دی تو یہ طرزِ عمل ہی اس
کے جھوٹا ہونے کیلئے کافی ہے۔ غور کیجئے کہ بات کیا ہے! اسے یہ چاہئے تھا کہ اس بات کو اپنی
زبان سے نکالنے سے پہلے خود اس کی تحقیق کر لے۔ بالفرض وہ بات غلط ہے تو اس غلط بات
کے پھیلانے میں وہ بھی ایک واسطہ بن گیا۔ اس کے ذریعے سے وہ جھوٹ کتنی دور تک پھیل
سکتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

اب اس کے ضمن میں ایک بات مزید نوٹ کرلیں۔ یہ آیت نمبر چھ ہے۔ ہم نے پچھلے درس میں جو آیت نمبر سات پڑھی تھی' اس میں خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے کہ...... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ ساتویں آیت کے اس جزو کو چھٹی آیت سے بھی ربط ہے۔ وہ اس پہلو سے کہ تمام اطلاعات اور تمام خبروں کی تحقیق وتفتیش ہونی چاہئے' لیکن جو بات خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو رہی ہو' چاہے وہ کتنی چھوٹی سے چھوٹی بات ہی کیوں نہ ہو' ہر مسلمان کیلئے وہ بات اس اعتبار سے بہت بڑی ہے کہ یہ حضورؐ کے فرمان کے طور پر پیش کی جارہی ہے۔ اسی سے تو ہماری ساری شریعت اور ہمارے تمام قوانین کا ڈھانچہ بنے گا۔ اور جیسے کہ میں گذشتہ نشست میں عرض کرچکا ہوں کہ اسی پر تو ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب وثقافت کی تشکیل ہوگی' لہٰذا اس معاملہ میں سہل انگاری' صرفِ نظر یا تساہل عام معاملات کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

یہ ہے وہ اہم بات جس کے تحت ہمارے محدثین کرامؒ نے احادیث کی تحقیق وتفتیش میں اپنی پوری کی پوری زندگیاں لگادیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجرِ عظیم عطا فرمائے کہ انہوں نے حضورؐ کی احادیث بیان کرنے والے راویوں کے حالات کی بھی پوری چھان بین کی اور جرح وتعدیل کے اصول معین کئے۔ اس طرح اسماء الرجال کا ایک بہت بڑا علم' ایک بہت بڑا فن وجود میں آیا۔ ہزاروں راویانِ احادیث کی زندگیوں کے بارے میں تحقیق ہوئی۔ پھر ان کے حالات مدون کر کے ضبطِ تحریر میں لائے گئے' پھر ان کی درجہ بندی کی گئی۔ اگر کسی شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے منسوب کر کے کوئی بات کہی تو اسے محض اس بنیاد پر قبول اور تسلیم نہیں کر لیا جائے گا کہ یہ بات "قال قال رسولُ اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم" کے الفاظ سے بیان کی گئی ہے' بلکہ اس کی پوری تحقیق وتفتیش اور پوری چھان بین ہوگی۔ روایتاً بھی ہوگی اور درایتاً بھی ہوگی۔ ان راویوں کے حالات پر بھی جرح ہوگی جو اس کو بیان کرنے والے ہیں۔ حدیث میں جتنے بھی واسطے اور LINKS ہیں' ان کی ثقاہت اور ان کے تدین کی بھی تحقیق ہوگی۔ پھر حدیث کے متن پر درایتاً بھی غور کیا جائے گا۔ یہ سارے کا سارا نظام درحقیقت اسی حکم کے تحت ہے کہ "اے اہل ایمان' اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی اہم خبر لے کر آئے تو تحقیق اور تفتیش کر لیا کرو"۔

اب آیئے اس دوسرے بڑے حکم کی طرف جو آیات نمبر نو اور دس میں ہمارے سامنے

آیا ... اگر اس ساری احتیاط کے باوجود مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین کوئی نزاع برپا ہو جائے' کوئی جھگڑا ہو جائے' کسی نوع کا اختلاف رونما ہو جائے اور یہ اس شدت کو پہنچ جائے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو ایک مسلم معاشرے کا کیا رویّہ ہو! فرمایا..... وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا ۔ "اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں" ..... اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان بھی آخر انسان ہیں۔ خطا اور نسیان کا ارتکاب ہر انسان سے ہو سکتا ہے' لہٰذا مسلمانوں کے مابین اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے' وہ باہم لڑنے اور جھگڑنے لگ پڑیں' تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے' ایسا ہو سکتا ہے۔ پوری نیک نیتی کے ساتھ بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ پھر حالات ایسی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ دونوں فریق اگرچہ نیک نیت ہیں' لیکن پھر بھی مسئلہ الجھتا چلا جاتا ہے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ کچھ خارجی عناصر بھی موجود ہیں اور کوئی سازشی عنصر اندر بھی موجود ہے کہ جو دونوں فریقوں کو بھڑکا رہا ہے تو ہو سکتا ہے کہ خلوص اور نیک نیتی کے باوصف وہ جھگڑا باہمی قتال اور جنگ کی صورت اختیار کر جائے۔ اس صورتحال کا مطلب یہ نہیں ہو گا کہ ان میں سے کسی ایک فریق کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جائے یا ان کے ایمان کی نفی کر دی جائے ... جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت کے آغاز میں دونوں لڑنے جھگڑنے والے گروہوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا ۔ "اور اگر اہلِ ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں" ..... چنانچہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی ایمان کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

آگے چلئے۔ اس سورۂ مبارکہ کی آیات زیرِ مطالعہ میں ایک پورا یہ قانون بیان ہوا ہے' جس کی کئی دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ یہ ہے کہ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَہُمَا ۔ "یہ تمہارا فرض ہے کہ ان کے مابین صلح کرا دو"۔ یعنی بے تعلقی کا رویہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیں مداخلت کی کیا ضرورت ہے! یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے جس سے وہ خود نمٹیں۔ یہ روش چھوٹی سطح پر بھی غلط ہے اور بڑی سطح پر تو انتہائی غلط ہے۔ اگر دو بھائیوں کے مابین اختلاف ہو گیا ہو اور بقیہ بھائی یا قریبی اعزّہ یہ سوچیں کہ یہ اپنا اختلاف آپس ہی میں طے کریں۔ ہم اگر ایک کے حق میں بات کریں گے تو خواہ مخواہ دوسرے کی خفگی اور ناراضگی مول لیں گے اور اس کے حق میں بات کریں گے تو پہلا خفا اور ناراض ہو جائے گا تو یہ بے تعلقی کا رویّہ بہت غلط ہے۔ اس کیلئے انگریزی محاورے NIP THE EVIL IN THE BUD

کے مطابق عمل ہونا چاہئے۔ چنانچہ برائی نے جہاں بھی ظہور کیا ہے' وہ ایک رخنہ ہے' جو مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ میں رونما ہوا ہے' اس فصیل میں ایک دراڑ پڑ گئی ہے' اگر یہ دراڑ بڑھ گئی تو اس سے غنیم کو اندر آنے کا موقع ملے گا۔ دشمن اندر گھس آئے گا' لہٰذا پہلی فرصت میں اس دراڑ کو بند کرو اور اس رخنے کو ختم کرو۔ چنانچہ حکم دیا گیا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا - یہ پہلی دفعہ ہے اور چونکہ اَصۡلِحُوۡا فعل امر ہے اور فقہ میں عام طور پر یہ اصول مانا جاتا ہے کہ الامر للوجوب - پس معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں پر واجب اور فرض کیا جارہا ہے کہ وہ مصالحت کرائیں۔

اب اس کے بعد دوسری دفعہ ہے۔ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىہُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى "اگر مصالحت اور صلح کی کوشش کے باوجود ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرتا جارہا ہے" اس زیادتی کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گروہ مسلمانوں کی جو مجموعی طاقت اور قوت ہے اسے صلح سے انکار کر کے ضعف پہنچانے کا سبب بن رہا ہے اور بے جا طور پر اپنی زیادتی پر مصر ہے۔ دوسری یہ کہ جو صلح اور مصالحت کرائی گئی تھی' اس کی شرائط پر وہ کاربند نہیں رہا۔ اس نے از سرنو کوئی زیادتی کی ہے۔ ان دونوں حالتوں کے بارے میں حکم مل رہا ہے۔ فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ - "اب تم اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے"...... یعنی اب یہ جھگڑا دو فریقوں کے مابین نہیں رہا' بلکہ ملت کا بحیثیت مجموعی جو مقام و مرتبہ ہے' اس گروہ نے اسے چیلنج کیا ہے۔ وہ اسے غیر مؤثر بنانے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہے' لہٰذا اب امت کی مجموعی طاقت بروئے کار آئے اور وہ لڑے اور وہ زیادتی کرنے والے گروہ کو مجبور کرے کہ وہ اس زیادتی سے باز آجائے۔ چنانچہ فرمایا۔ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ - یہاں "امر اللہ" میں ان شرائط کی طرف اشارہ ہے جو ملت کی ہیئتِ اجتماعیہ نے ان دونوں فریقوں کے مابین طے کرائی تھیں۔ وہی شرائط درحقیقت امر اللہ ہیں۔

تیسری دفعہ یہ بیان فرمائی۔ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا "پھر اگر وہ فریق لوٹ آئے' زیادتی سے باز آجائے تو پھر ان کے مابین از سرنو صلح کراؤ' عدل کے ساتھ اور انصاف کرو"...... آیت کے اس حصے پر غور فرمایئے۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں واقعتہً گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور سر جھکانا پڑتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا' یہ اللہ ہی کا کلام ہے...... یہاں بات دو اسلوبوں سے فرمائی گئی ہے۔ "بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا"...... "اب جو صلح کراؤ تو عدل کے ساتھ کراؤ اور دیکھو

انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے"۔ یہ تکرار کیوں ہوئی؟ اس لئے کہ جب ملّت نے بحیثیت مجموعی ایک فریق کو صلح پر مجبور کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ جذبات میں آ کر اس فریق پر کوئی ناروا زیادتی ہو جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ دبانے کا رجحان پیدا ہو جائے' لہٰذا یہ خاص احتیاط کا مقام ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بطور سزا اس پر ایسی شرائط عائد کر دی جائیں جو نامناسب و ناروا ہوں اور جو زیادتی کے زمرے میں آتی ہوں' چنانچہ متنبہ کر دیا گیا ہے کہ زیادتی کرنے والا فریق بھی آخر مسلمان ہی ہے' اہلِ ایمان ہی میں سے ہے' لہٰذا اب کہیں اس پر زیادتی نہ ہو جائے اور عدل و قسط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ آیت کے آخر میں فرمایا۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ "جان رکھو کہ بلاشک وشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے"۔

اس کے بعد اگلی آیت میں ایک حتمی و قطعی ضابطہ و قاعدہ اور سنہرا اصول بیان فرما دیا گیا کہ مسلمانوں کے مابین معاملات اور تنازعات طے کراتے ہوئے جو روح کارفرما رہنی چاہئے' جو اہم ترین بات پیش نظر رہنی چاہئے وہ کیا ہے! اس کی ان الفاظ مبارکہ میں تعلیم دی گئی اور تلقین فرمائی گئی اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ "یقیناً تمام مسلمان' تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"۔۔ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ لہٰذا اپنے بھائیوں کے مابین صلح' صفائی اور مصالحت کرادیا کرو"۔۔۔۔ ان الفاظ مبارکہ کے ذریعے سے فطرت انسانی کو اپیل کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے کہ دو بھائیوں کے مابین جھگڑے کو دیکھ کر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ دو بھائیوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھ کر ہر سلیم الفطرت انسان یہ چاہے گا کہ ان کے مابین صلح اور مصالحت کرائے' تو اسی فطرت کو اپیل کیا جارہا ہے کہ مسلمان تو سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان سب کا ایک دوسرے سے رشتۂ اخوت ہے' لہٰذا اگر مسلمانوں کے مابین کہیں ایسا اختلاف ہو جایا کرے کہ جھگڑے اور لڑائی کی نوبت آجائے تو اسی جذبے اور روح کے ساتھ جو بھائی بھائی ہونے کے ناطے اور رشتے کے باعث تم میں ہونی لازمی ہے' ان کے مابین صلح کرانے کی کوشش کرو۔ آخر میں فرمایا۔ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ "اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔ اس کی نافرمانی سے بچتے رہو۔ اسی طرز عمل کے نتیجے میں تم امید کر سکتے ہو تم پر رحم کیا جائے گا' تم پر رحمت خداوندی کا سایہ ہو گا"۔

آج کے سبق میں جو احکام آئے ہیں' اب انہیں ذہن میں مستحضر کر لیجئے۔ پہلے حکم میں کسی بھی جھگڑے یا تنازع کے وجود میں آنے کو روکنے کی تدبیر بتائی گئی کہ افواہوں پر کوئی

اقدام نہ ہو۔ تحقیق و تفتیش کے بعد کوئی فیصلہ کیا جائے۔ دوسرے میں رہنمائی دی گئی کہ اگر پھر بھی کوئی جھگڑا ہو ہی جائے تو اس کے ضمن میں تفصیلی احکام دے دیئے گئے، جنہیں میں نے تین دفعات کی شکل میں، آپ کے سامنے بیان کیا ہے۔ ہمیں ان کو اپنی گھریلو سطح پر، برادری کی سطح پر اور محلہ کی سطح پر پیش نظر رکھنا چاہئے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ جلد وہ دن بھی لائے کہ پوری امت مسلمہ، پوری امت محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ایک وحدت کی شکل اختیار کر لے، ان کے آپس کے جھگڑے، تنازعات، اختلافات ختم ہو جائیں اور یہ بات صورت واقعہ اختیار کر لے کہ ۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یا جیسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ مسلمان قوموں کی ایک دولت مشترکہ (CommonWealth) ہی وجود میں آ جائے، پھر عجیب بات ہے کہ علامہ نے طہران کا تذکرہ کیا تھا کہ ۔

طہران ہو اگر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

اللہ تعالیٰ اگر ہمیں عالم اسلام کا ایک کامن ویلتھ قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے تو ہم اس بلند سطح پر بھی ان احکام قرآنیہ پر عمل کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو آج کے سبق میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اب اگر اس کے بارے میں کوئی وضاحت مطلوب ہو تو میں حاضر ہوں۔

سوال وجواب

سوال...... ڈاکٹر صاحب! ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان آپس میں متحد نہیں۔ کیا ان میں اتحاد اور اشتراک ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو کیسے؟

جواب...... یہ موجودہ دور کا بڑا اہم مسئلہ ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ اس وقت ہم شدید انتشار کا شکار ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے اتحاد کی جو اصل بنیاد ہے، ہمارا ربط و تعلق اس سے کمزور ہو گیا ہے۔ مثلاً آپ کے سامنے یہ بات آئی کہ مرکزی شخصیت جناب

(باقی ص۴۸ پر)

تذکرہ وتبصرہ

حالیہ الیکشن کے چند خوش آئند پہلو

نئی صورت حال میں سیاستدانوں اور کار پردازانِ حکومت کی خدمت میں مخلصانہ مشورے

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطابِ جمعہ، بتاریخ ۱۸ نومبر ۸۸ء

(بشکریہ: ہفت روزہ 'ندا' لاہور)

حضرات! ان اجتماعات میں اگرچہ ہم چند سورتوں کا مطالعہ کر رہے تھے جن میں سے سورۃ اللیل میں آج آگے بڑھنا تھا لیکن ظاہر ہے کہ آپ حضرات یہ جاننا چاہتے ہوں گے کہ قومی اسمبلی کے الیکشن کے بعد کی صورتحال میں میرے نزدیک ملک وملت کے لئے اور خاص طور پر اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے جو سب سے صحیح صورت ہو وہ میں آپ کے سامنے رکھوں۔ کسی بھی شخص کی سوچ کامل نہیں ہو سکتی، کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی بات صد فیصد درست ہو گی لیکن ہر شخص جو بھی رائے دیانتاً رکھتا ہے اسی کو پیش کرتا ہے، میری ان آراء سے آپ کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ کہ میں اپنے آپ کو اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور پاتا ہوں کہ جو بھی میری رائے ہے اس کو میں دیانتاً آپ کے سامنے رکھوں۔

مقام شکر ہے

سب سے پہلے تو تہہ دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ انتخابات کا سب سے اہم، پہلا اور کٹھن مرحلہ طے پا گیا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔ اسی کے ضمن میں آج میں سوچ رہا تھا تو چونکہ میری فکر کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے بنا ہے اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں، تو میں نے اس وقت کی صورتحال اور ملک وملت پر شدید قسم کے خطرات کے سائے کے بارے میں سورۃ الفتح اور سورۃ الانعام کی چند آیات سے روشنی پائی۔ صلح حدیبیہ سے متصلاً قبل جو

صورت بن چکی تھی وہ انتہائی خوفناک تھی اور آثار انتہائی مخدوش تھے۔ ادھر مکہ میں مشرکین عرب اور ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیؓ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے اور یہ بات صرف محاورے میں نہیں ہے بلکہ عالمِ واقعہ میں ہوتی کہ خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔ صحابہ کرامؓ کا جو حال تھا وہ بعد میں اس واقعہ سے ظاہر ہو ہی گیا کہ حضورؐ نے جب صلح فرمائی تو لوگوں کے دل پژمردہ تھے۔ تین مرتبہ حضورؐ نے فرمایا کہ اب اٹھو اور احرام یہیں کھول دو اور قربانی کے جو جانور ساتھ لائے ہیں انہیں یہیں پر ذبح کر دو تو ایک شخص بھی نہ اٹھا۔ حضرت عمرؓ کا تو مشہور واقعہ ہے کہ سخت بے چین اور پریشان تھے اور نیت میں گستاخی کا شائبہ بھی نہ ہونے کے باوجود ظاہری انداز گستاخانہ سا تھا جس پر وہ ساری عمر پچھتاتے رہے اور یہی کیفیت حضرت علیؓ کی ہوئی، زندگی میں کبھی انہوں نے حضورؐ کی حکم عدولی نہ کی لیکن وہاں یہ حرکت سرزد ہوئی۔ نیت یہ نہیں تھی لیکن جذباتی فضا ایسی تھی کہ حضور اپنے نام کے ساتھ رسولؐ اللہ کے الفاظ مٹا دینے کا حکم دیتے ہیں تو کہا کہ میں اپنے ہاتھ سے تو نہیں مٹا سکتا۔ یہ ساری کیفیت ظاہر کر رہی ہے کہ وہ کس درجے جذباتی ہیجان کا عالم تھا۔ اس مرحلے پر اللہ نے بچایا تو اس پر اپنا احسان جتایا ہے۔ "اور وہی ہے جس نے روک رکھا ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے"۔ (الفتح۔ ۲۴) ایک عام انسان اور مسلمان میں فرق یہی ہے کہ جو شخص یقین اور ایمان سے عاری ہے وہ صرف ظاہری اور مادّی اسباب تک اپنی نگاہ محدود رکھتا ہے جبکہ مومن بھی سوچتا تو ضرور ہے کہ یہ کیوں ہو گیا، کیسے ہو گیا لیکن وہ ان تمام اسباب کے پردے میں مشیت ایزدی کا مشاہدہ کرتا ہے، جو مسبب الاسباب ہے اور مدبر ہے۔ "تدبّر سے اتارتا ہے کام آسمان سے زمین تک پھر چڑھتا ہے وہ کام اس کی طرف ایک دن میں جس کا پیمانہ ہزار برس کا ہے تمہاری گنتی میں"۔ (السجدۃ۔ ۵) اللہ کے اپنے نقشے ہیں لیکن اگرچہ کسی آن اور کسی لحظہ مشیتِ ایزدی اور اذنِ رب کے بغیر کوئی پتا بھی جنبش نہیں کرتا لیکن بندۂ مومن بھی اسباب سے مستغنی نہیں، اسے حکم ہے کہ اسباب کو بروئے کار لائے استعمال کرے تاہم اس کا تکیہ اور دارومدار اور توکل ان اسباب پر نہیں ہوتا۔ تو میں اسی کا حوالہ دے رہا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے۔ سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۲۵ میں فرمایا کہ اللہ کا کوئی کام بھی حکمت سے خالی نہیں ہے۔ تمہیں تو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ تم نے دب کر صلح کی ہے لیکن اللہ نے تمہیں فتح دی ہے۔ مکہ میں ایسے کمزور صاحبِ ایمان مرد بھی تھے اور صاحبِ ایمان عورتیں بھی جو ہجرت نہیں کر سکے، جن کے پاس وسائل و ذرائع نہیں تھے۔ اگر جنگ کی

یہ بھی دبک جاتی تو پھر وہ بھی نہ بچ سکتے۔ وہ پیس کر رکھ دیئے جاتے یعنی گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا' اللہ تعالیٰ کو اپنے ان کمزور اور ضعیف مومن مرد اور مومن عورتوں کی بھی مصلحت منظور تھی۔ اگر وہ یہاں پر پس کر رہ جاتے تو تم پر ایک حرف آتا اور بعد میں تم پچھتاتے بھی کہ تم نے اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرا دیا۔ جنگِ جمل میں کیا ہوا تھا صلح آخری درجے کو پہنچ چکی تھی حضرت عائشہؓ کے نمائندے حضرت علیؓ کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے' صلح ہو گئی اور معاملہ تقریباً طے ہو گیا تھا لیکن منافقوں اور سبائیوں کا جو عنصر حضرت علیؓ کی فوج میں موجود تھا' اسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی صلح ہو گئی تو ہمارا ٹھکانہ نہیں رہے گا' ہم تو برباد ہو کر رہ جائیں گے چنانچہ انہوں نے فوراً جا کر رات کی تاریکی میں حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا۔ اب کیسے تحقیق ہو کہ حملہ آور کون ہیں اور یہ کہ آیا انہوں نے حضرت علیؓ کے حکم پر حملہ کیا ہے یا خود کیا۔ رات کی تاریکی میں پھر جو جنگ ہوئی تو ایک ہی رات میں دس ہزار مسلمان کام آئے۔

اس پہلو سے غور کیجئے کہ اس وقت خدانخواستہ کوئی ہنگامہ یا فساد اگر ہو جاتا تو اس کے جو نتائج نکلتے وہ انتہائی خوفناک ہوتے۔ نہ معلوم کتنے بے گناہ لوگ اس کے اندر ختم ہو جاتے۔ تو اللہ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں اس صورتحال سے بچایا ہے۔ میں نے جب اس معاملے پر مزید غور کیا تو سورۂ انعام کی دو آیات میں مجھے اور روشنی نظر آئی۔ "اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان" (الانعام۔ ۶۱) اللہ تو اپنے بندوں پر پورے طور پر مستولی' مقتدر ہے اور قابو یافتہ ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی پتا تک جنبش نہیں کھاتا۔ یہ کائنات پورے طور پر اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہے اور انسانوں میں سے بھی کسی کا خواہ کوئی ارادہ ہو اللہ کا اذن ہو گا تو وہ اپنے ارادے پر عمل پیرا ہو سکے گا۔ "وہ اپنے تمام بندوں پر پورے طور پر قابو یافتہ ہے"۔ اس کے قابو سے باہر کوئی نہیں ہے۔ سب کے دل اس کی انگلیوں کے مابین ہیں آج آپ سخت دشمنی کے ارادے سے کسی کے لئے نکلے ہوں راستے ہی میں اللہ آپ کے دل میں اس کے لئے محبت پیدا کر سکتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ تمام انسانوں کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے مابین ہیں جدھر چاہتا ہے' ادھر کر دیتا ہے۔ فرمایا گیا کہ اللہ تم پر اپنے نگہبان بھیجتا رہتا ہے۔ یہ یونہی نہیں ہو جاتا۔ فرشتے اللہ کے حکم سے حفاظت کرتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کو اس کا تجربہ ہے۔ بسا اوقات آدمی محسوس کرتا ہے کہ زناٹے کے ساتھ کوئی گاڑی اس کے اتنے قریب سے گزری ہے کہ وہ یہ یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کسی نے ہاتھ دے کر اسے بچایا ہے۔ ورنہ اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں

تھا۔ اگر چہ وہ ہاتھ نظر نہیں آتا لیکن در حقیقت وہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا کوئی فرشتہ ہے کہ جس نے اس کو بچایا۔

اسی سورۂ مبارکہ کی آیت نمبر ۶۵ میں ارشاد ہوتا ہے۔ "کہئے کہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا تمہیں بھڑا دے مختلف فرقوں میں تقسیم کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی ایک کی" ۔ (الانعام۔ ۶۵) بدترین عذاب کی صورت وہ تیسری ہے جو اس وقت ہم پر آسکتی تھی لیکن اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں بچایا ہے۔

اقتدار اعلیٰ کا بھی شکریہ

ان چند حوالہ جات سے آپ سب حضرات سے استدعا کروں گا کہ پورے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا تہہ دل سے شکر ادا کریں۔ اس وقت اس بات کا پورا امکان موجود تھا کہ ہمارے لئے بہت سی تباہی و بربادی کا سامان خود ہمارے کرتوتوں کی وجہ سے ہو جاتا۔ اللہ نے اپنے خصوصی فضل و کرم سے ہمیں اس سے بچایا۔ یہاں ایک حدیث نبویؐ کا حوالہ بھی بے محل نہ ہو گا۔ کہ جہاں اللہ کا شکر ہے وہاں بندوں کا شکریہ بھی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا" ۔ اور سورۂ لقمان میں فرمایا گیا "کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا" ۔ (لقمان۔ ۱۴) اسی لئے ہمیں شعوری طور پر شکریہ ادا کرنا ہے سب سے پہلے پاکستان کی مسلح افواج کا اور بالخصوص جنرل مرزا محمد اسلم بیگ صاحب کا جو اس وقت ہمارے چیف آف دی آرمی سٹاف اور کمانڈر انچیف ہیں۔ تمام مسلح افواج نے بالعموم اور انہوں نے بالخصوص اس ملک و ملت پر جو احسان کیا ہے تو پوری قوم کے ذمے ہے کہ ان کا شکریہ ادا کرے۔ بلکہ میں یہاں یہ کہنے میں بھی کوئی باک محسوس نہیں کرتا کہ افواج پاکستان کے ذمے ایک بہت بڑا قرض تھا جو انہوں نے ادا کر دیا ہے۔ مسلسل مارشل لاء جو یہاں چلتے رہے ہیں ' پہلے ایوب خان کا مارشل لاء تھا اور پھر یحییٰ خان کا مارشل لاء اور آخر میں ضیاء الحق صاحب کا طویل ترین مارشل لاء۔ تو اگر چہ واقعہ یہ ہے کہ پوری فوج اس میں ملوث (INVOLVE) نہیں ہوا کرتی ' صرف اوپر کی سطح کے کچھ لوگ ہوتے ہیں جو مختلف جگہوں پر مارشل لاء کی ڈیوٹی ادا کرتے رہے ہیں ' بدنامی پوری فوج کے ذمے آتی ہے۔ چنانچہ لوگوں میں جو نفرت پیدا ہو گئی تھی وہ پوری فوج کے بارے میں تھی اور ملک و ملت کے

مستقبل کے اعتبار سے یہ معاملہ انتہائی خوفناک تھا۔ اللہ تعالیٰ افواج پاکستان کے سربر آوردہ حضرات کو اس کا اجر و ثواب عطا فرمائے کہ انہوں نے قوم کا ایک بہت بڑا قرض ادا کر دیا جیسا کہ میں اکثر مصری افواج کا حوالہ دیا کرتا ہوں کہ ۶۷ء میں انہیں یہودیوں کے ہاتھوں جو نہایت ذلت آمیز شکست ہوئی تھی' واقعہ یہ ہے کہ ۷۳ء کی رمضان کی جنگ میں انہوں نے قرض چکا دیا اور اپنے ماتھے پر سے کلنک کا ٹیکہ دھو ڈالا۔ اس وقت امریکہ کو بالکل عریاں ہو کر سامنے آنا پڑا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت وہ اسرائیل کو اس طریقے پر PROTECT نہ کرتا جیسے کہ وہ خود اس کی اپنی ریاست ہو' تو اسرائیل کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ گولڈا میئر اس وقت اس درجے مایوس ہو چکی تھی کہ اس نے خود لکھا ہے کہ میں خودکشی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے اس وقت افواج پاکستان کا اور خصوصاً جنرل اسلم بیگ صاحب کا کہ واقعتاً بہت بڑا دھبہ تھا افواج پاکستان کے ماتھے پر جس کو انہوں نے دھو دیا' بہت بڑا قرض تھا ملک و ملت کا جو انہوں نے ادا کر دیا۔

اس کے بعد ہم اپنے موجودہ صدر جناب غلام اسحاق خان صاحب کے بھی مشکور و ممنون ہیں کہ یہ مرحلہ طے کرنے میں انہوں نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے پھر ہماری بالاتر عدلیہ بھی بجا طور پر شکریے کی مستحق ہے کہ اس نے بھی اپنا فرض بحسن و خوبی ادا کیا ہے۔ پھر الیکشن کمیشن نے جس طریقے سے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کیا ہے وہ بھی قابلِ تحسین ہے اور اس کے بعد میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کا کہ اگر ان کے اندر بھی صحیح صورت حال کا شعور نہ ہوتا اگر یہ لوگ ہنگامہ آرائی پر تل ہی گئے ہوتے تو فتنہ و فساد کی بڑی گرم بازاری ہوتی۔ پھر پاکستان کے تمام عوام کو بھی ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس موقع پر صورت حال کو پر امن رکھنے میں جس جس کا جتنا بھی حصہ ہے وہ اسی قدر شکریئے کا مستحق ہے۔

اس پوری صورت حال کا اگر بے لاگ تجزیہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی حمد کے کچھ اور پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ جو نتائج سامنے آئے ہیں فطری طور پر بعض حضرات ان پر ملول و غمگین ہوں گے جس کسی کی بھی بہت گہری سیاسی وابستگی کسی جماعت یا فرد کے ساتھ تھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس جماعت یا فرد کی شکست پر دل گرفتہ اور رنجیدہ خاطر ہو۔ لیکن صورت حال کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو میرے سامنے اس وقت چار پہلو ایسے ہیں کہ جو ملک و قوم کے مستقبل کے اعتبار سے نہایت خوش آئند ہیں اور انہیں بجا طور پر ایک اچھا شگون قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان مثبت اور

خوش آئند پہلوؤں میں سے اہم ترین یہ ہے کہ جو کھلم کھلا مخالفِ پاکستان قوت تھی وہ ان انتخابات کے نتیجے میں بالکل سرنگوں ہو گئی۔ جئے سندھ کی جس طرح ناک رگڑی گئی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ معاملہ پاکستانی مسلمانوں ہی کے لئے نہیں پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے نہایت خوش آئند ہے۔ اس لئے کہ میں پاکستان کو صرف پاکستانیوں ہی کے لئے اہمیت کی شے نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک تو یہ پورے عالمِ اسلام کا اثاثہ ہے میں نے بارہا یہ کہا ہے کہ میں قیام پاکستان کے معاملے کو اور اس کے اب تک کے بقاء کو اسلام کے احیاء اور اس کے عالمی غلبے کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی طویل المیعاد سکیم کا ایک جزو سمجھتا ہوں۔ اس اعتبار سے اس جماعت یا اس فرد کی شکست نہایت خوش آئند ہے کہ جو برملا یہ کہہ رہا تھا کہ اس ملک کو توڑ دینا چاہئے، جس کی سرگرمیاں مخالفِ پاکستان ہی نہیں مخالفِ اسلام تھیں، جس نے اپنی کتابوں کے ذریعے سے اسلام کی جڑیں کھودی ہیں اور وہاں کے تعلیم یافتہ ذہنوں میں یہ زہر بری طرح سرایت کر رہا تھا یہ سمجھنا بھی غلط ہو گا کہ وہ زہر اب ختم ہو گیا ہے۔ اس کے اثرات ابھی موجود ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس گروہ کی ناک بری طرح رگڑی گئی ہے اور ثابت ہو گیا ہے کہ سیاسی سطح پر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے بارہا کہا ہے کہ خدارا سیاسی عمل کو جاری رہنے دو اور الیکشن کی راہ کی رکاوٹ مت بنو اس لئے کہ مارشل لاء کی چھتری تلے مخالفِ پاکستان قوتیں پھلتی پھولتی ہیں اور انہیں فروغ حاصل ہوتا ہے۔ جیسے کہ مشرقی پاکستان کے بارے میں میں نے کہا تھا وہاں پاکستان کے مخالفین کی اکثریت کبھی بھی نہیں رہی لیکن یہ ہماری اپنی غلط پالیسیاں اور غلط اقدامات تھے جن کی وجہ سے طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی اور ہم نے اپنی غلطیوں سے ان لوگوں کو دلیل فراہم کر دی جو پاکستان کے دشمن تھے۔ بالکل یہی کچھ سندھ میں ہو رہا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں تو دشمنوں کو دودھ پلا پلا کر پالا گیا ہے۔

پاکستان کے دشمنوں کی سرکوبی

آپ کو شاید اس کا احساس نہ ہو مجھے خوب اندازہ ہے کہ کس قدر شدید خطرات اس وقت سندھ میں پاکستان کو لاحق تھے۔ میں نے پوری کتاب اس موضوع پر لکھی ہے حالانکہ میں سیاست کے میدان کا کھلاڑی نہیں ہوں۔ میں "استحکامِ پاکستان" کے بعد "اسلامی انقلاب" کے موضوع پر کتاب لکھنا چاہتا تھا لیکن مجھے پوری کتاب لکھنا پڑ گئی مسئلہ سندھ پر۔ جس کے آغاز میں میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا اور جلی حروف میں لکھا تھا کہ وہ ایک ہی سن ہجری یعنی

۹۳ء اور ۱۲۷۱ء جس میں اسلام داخل ہوا تھا یورپ میں اسپین کے راستے اور ہندوستان میں سندھ کے راستے۔ آج پانچ سو برس ہونے کو آئے کہ اسپین سے اسلام کا خاتمہ ہو چکا' کہیں وہ وقت تو نہیں آ گیا کہ پورے برعظیم پاک و ہند سے اسلام کا خاتمہ اسی سندھ کے راستے سے ہو جہاں سے اسلام داخل ہوا تھا۔ اس لئے کہ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ پاکستان کو کچھ ہو جانے کا مطلب صرف پاکستان ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ میرے نزدیک یہ چیز پورے برعظیم پاک و ہند سے اسلام کے خاتمے کی تمہید بن جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دل میں شاید اللہ کے لئے اس حمد و شکر کے وہ جذبات موجزن نہ ہوں جو میرے قلب کی گہرائیوں سے اس وقت نکل رہے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہنا بھی درست نہ ہو گا۔ وہ زہر ابھی وہاں سرایت کئے ہوئے ہے۔ ہمارے طرز عمل میں پھر اگر کوئی غلطی ہوئی تو جیسا کہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے "بعید نہیں تمہارے رب سے کہ تم پر رحم کرے اور اگر تم پھر وہی کرو گے تو ہم پھر وہی کریں گے"۔ (بنی اسرائیل۔ ۸) تم نے دیکھ لیا کہ تمہارا رب تم پر رحمت فرمانا چاہتا ہے لیکن تم نے وہی طرز عمل اختیار کیا تو ہم بھی پھر وہی طرز عمل اختیار کریں گے تو ابھی ہمیں ضرورت ہے کہ اپنے طرز عمل کو صحیح رکھیں اور اپنا پورا جائزہ لیتے رہیں۔ لیکن بہرحال اس وقت لمحۂ شکر ہے اور موجودہ صورتحال کا یہ پہلو تو بہت ہی خوش آئند ہے کہ کھلم کھلا مخالفِ پاکستان اور مخالفِ اسلام قوت کو بہت ہی شرمناک ہزیمت ہوئی ہے۔ انہیں تو جرات ہی نہیں ہو سکی کہ میدان میں آئیں اور ان کا کوئی بھی سپورٹر ان انتخابات میں کامیاب نہیں ہوا۔

دوسرا خوش آئند پہلو حالیہ انتخابات میں یہ سامنے آیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کی مخالف قوتوں کو بھی اس موقع پر منہ کی کھانی پڑی۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ ہمارے ملک میں نظریہ پاکستان کو خطرہ دو جماعتوں سے ہے۔ ایک کا تعلق جنوب مشرق سے اور دوسرے کا شمال مغرب سے ہے۔ دونوں کا عنوان ایک ہی ہے یعنی عوامی نیشنل پارٹی۔ جنوب مشرقی گوشے سے جو عوامی نیشنل پارٹی ابھر رہی تھی اس کے روح رواں رسول بخش پلیجو اور جام ساقی وغیرہ ہیں۔ یہ لوگ پکے سوشلسٹ بلکہ مارکسسی ہیں اور بڑی تیزی سے ابھرتی ہوئی آندھی کی مانند اس گوشے سے ابھر رہے ہیں۔ دوسری جانب ادھر روس کے زیر اثر ولی خان ہیں جو ہمیشہ مسلم لیگ اور قائداعظم کی شخصیت میں کیڑے نکالنے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ ان کی ساری تحقیق و جستجو کا ہدف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ کسی طور تحریکِ پاکستان اور اس کے زعما کو بدنام کیا

جائے۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ ان دونوں قوتوں کی بھی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ سند
میں تو خیر ان کا ایک آدمی بھی کامیاب نہیں ہوا لیکن جس شرمناک شکست کا سامنا انہیں صو
سرحد میں کرنا پڑا ہے وہ بھی میرے نزدیک پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے بہت خوش آ
ہے۔

سندھ، بلوچستان اور پیپلز پارٹی

ابھی تک جو دو باتیں میں نے لکھیں وہ تو سب لوگوں کو اپنے دل کی آواز معلوم ہوئی ہو
گی، لیکن تیسری بات جو میں کہنے والا ہوں وہ شاید آپ سب کو پسند نہ آئے۔ اسے سمجھنے
لئے ذہن و قلب کو ذرا وسعت دینی ہوگی۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کی اس بھرپور ہمہ جہت کام
کو میں پاکستان کے حق میں ووٹ تصور کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اندرون سندھ پاکستان کا
لینے والے جونیجو اور پیر پگاڑہ کی طرح کے دو چار افراد ہی تھے جن کی سیاسی حیثیت کھل کر سا
آچکی ہے۔ یہ لوگ سندھ میں مخالف پاکستان طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مق
کرنے والا پاکستان کا حامی عنصر (PRO_PAKISTAN ELEM_ENT) اگر وہاں موجود تھا تو صرف
پارٹی کی شکل میں۔ میرے احباب جانتے ہیں کہ میں کہتا رہا ہوں کہ فیڈریشن کی علام
اندرون سندھ صرف پیپلز پارٹی بن کر رہ گئی ہے تو درحقیقت پیپلز پارٹی کے لئے یہ وا
اندرون سندھ پاکستان کے حق میں تھا۔ اصل میں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مختلف علاقے
لوگوں کی سوچ مختلف ہے۔ ایک دوسرے کے علاقوں کے حالات سے لوگ واقف نہیں
کی اکثریت کو معلوم نہیں ہے کہ سندھ کے حالات کیا ہیں۔ ہم لوگ اپنی اپنی کلھیو ں
اندر گڑ پھوڑتے رہتے ہیں' اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے خیالات و احساسات ہی کو پور
ملک کے لئے پیمانہ قرار دے کر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ ذرا چل پھر کر دیکھئے کون کون
قوتیں وہاں کار فرما ہیں! لوگوں کے احساسات اور خیالات کیا ہیں! تب آپ کو اندازہ ہو
وہاں پیپلز پارٹی کی یہ بھرپور کامیابی کیا معنی رکھتی ہے۔ اسی طرح اگر آپ کے مشاہدے
وسعت ہوگی تبھی یہ بات بھی سمجھ میں آئے گی کہ بلوچستان میں پیپلز پارٹی کو ایک آدھ سیٹ
سوا کوئی نمایاں کامیابی حاصل کیوں نہ ہو سکی۔ اس لئے کہ وہاں کے لوگوں کو یہ احساس
کہ پیپلز پارٹی کی حکومت کے دور میں ان پر آرمی ایکشن ہوا تھا اور ان کے ساتھ زیادتی کی
تھی۔ ظاہر بات ہے کہ پیپلز پارٹی کے بارے میں بلوچستان کے لوگوں کے جو احساسات ہیں

آپ کے نہیں ہو سکتے...... تو مختلف علاقے کے لوگوں کے احساسات مختلف ہوتے ہیں جنہیں مدِنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ بہرکیف حالیہ انتخابات کے خوش آئند پہلوؤں میں سے تیسرا میرے نزدیک یہ ہے کہ سندھ میں پیپلز پارٹی کو جو متفقہ ووٹ ملا ہے اسے میں پاکستان کے حق میں ووٹ قرار دیتا ہوں اور یہ بات بلاشبہ نہایت خوش آئند ہے۔

ایک اور خوش آئند علامت

چوتھی خوش آئند چیز وہ خوشخبری ہے جو ابھی اخبارات کے ذریعے سے آپ تک نہیں پہنچی۔ میرے ایک ساتھی نے کراچی سے ٹیلی فون پر اس کی خبر مجھے دی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ کراچی میں ایم کیو ایم نے جو بے مثال کامیابی (SWEEPING MAJORITY) حاصل کی ہے پاکستان میں الیکشن کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر موجود نہیں ہے۔ لیکن شاید آپ کو یاد ہو کہ ایم کیو ایم کا آغاز بڑا خوفناک تھا۔ میں "استحکام پاکستان" کے اگلے حصے "اسلامی انقلاب کیا' کیوں اور کیسے؟" کی تالیف کے خیال سے حجاز مقدس کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ کراچی میں چند گھنٹے مجھے ٹھہرنا پڑا۔ اس مختصر وقت میں کراچی کی فضا میں مجھے شدید تناؤ محسوس ہوا۔ ان دنوں ایم کیو ایم قوت پکڑ رہی تھی اور تشدد اور خون ریزی کے واقعات عام ہو چکے تھے۔ میرے اعصاب پر کراچی کے ان حالات کا اتنا شدید دباؤ پڑا کہ حجاز مقدس میں دس دن تک گویا میں اپنے حواس میں نہیں تھا۔ ایک سکتے کی کیفیت مجھ پر طاری رہی۔ پھر میں نے قلم اٹھایا تو "اسلامی انقلاب" کی بجائے "مسئلہ سندھ" پر ایک پوری کتاب وجود میں آگئی۔ اس لئے کہ ایم کیو ایم کا طوفان جب اٹھا تو اس میں تین چیزیں بہت نمایاں تھیں۔ مذہب اور مذہبی شخصیتوں کا شدید استہزاء اس کی بنیاد میں شامل تھا۔ پھر پاکستان اور نظریۂ پاکستان سے نفرت کی آمیزش بھی موجود تھی۔ خاص طور پر علامہ اقبال سے شدید نفرت کا اظہار کیا جا رہا تھا اور تیسری تشویش ناک بات یہ کہ ایک مخصوص مذہبی مکتب فکر کی روح اس میں سرایت کئے ہوئے تھی جس کا کردار ہماری پوری اسلامی تاریخ میں منفی رہا ہے۔ یہ تین چیزیں ایسی تھیں کہ جن کا مجھے شدید صدمہ ہوا تھا اور میں پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے بہت ہی اندیشوں میں مبتلا ہو گیا تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے آباؤ اجداد کا تحریکِ پاکستان میں سب سے بڑھ کر حصہ تھا۔ مسلم لیگ کی پوری قیادت ان لوگوں کے بزرگوں پر مشتمل تھی' لیکن آج انہی کی اولاد کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اسلام اور پاکستان سے نفرت ان کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ لیکن اب الحمدللہ

مجھے یہ خبر ملی ہے کہ ایم کیو ایم کا معاملہ اس پہلو سے نمایاں طور پر بہتر (IMPROVE) ہوا ہے۔ الیکشن میں بے مثال کامیابی حاصل کرنے کے بعد ان کی طرف سے کراچی میں بڑے پیمانے پر ایک پوسٹر لگوایا گیا ہے جس میں انہوں نے پاکستان اور اسلام کے ساتھ اپنی پوری وابستگی (COMMITMENT) کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ اس کے آثار میں پہلے سے دیکھ رہا تھا اور بعض حضرات سے میری اس موضوع پر گفتگو ہو چکی تھی، لیکن اب اس پر ان کی طرف سے پوسٹر کا نکل آنا نہایت خوش آئند ہے۔ اسی طرح وہ منفی مذہبی مکتبۂ فکر جو اس میں سرایت کر گیا تھا، اس سے بھی الحمد للہ انہوں نے بہت حد تک اپنا دامن چھڑا لیا ہے۔ ایم کیو ایم کے سلسلے میں یہ تین چیزیں پاکستان اور اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے نہایت خوش آئند ہیں۔ مختصراً یہ کہ میں نے وہ چار ہو ائنٹس آپ کو گنوا دیئے ہیں جو اس الیکشن کے نتیجے میں خوش آئند معلوم ہوتے ہیں۔

انتقالِ اقتدار کا مرحلہ

اب تیسری بات آپ کے سامنے عرض کرنی ہے کہ انتقالِ اقتدار کے مرحلے پر بھی جن کا میں نے پہلے شکریہ ادا کیا ہے دوبارہ انہی سے درخواست کرنی ہو گی کہ اس معاملے میں بھی کسی حیص بیص میں مبتلا نہ ہوں۔ سیاست دان چکر دینے کی کوشش کریں گے، ان کو اس کام میں بڑی مہارت حاصل ہے لیکن ہماری سب سے یہی درخواست ہو گی کہ اس چکر میں نہ پڑیں۔ عوام کو بھی ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے اور سیاسی جماعتوں کو بھی ان امور پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ یہ کوئی آخری مقابلہ تو ہے نہیں۔ الیکشن کی پٹڑی پر یہ گاڑی اگر چل پڑی تو میرا اندازہ ہے کہ اوّل تو دو ڈھائی سال کے اندر اندر ورنہ پانچ سال کے بعد تو الیکشن ضرور ہوں گے۔ لہٰذا اس معاملے کو SPORTSMAN SHIP' کے انداز میں لینا چاہئے۔ یہ کوئی ابدی شکست یا ابدی فتح کا معاملہ نہیں ہے۔ سیاسی افق پر بڑے بڑے زعماء نمودار ہوتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں گم ہو جاتے ہیں۔ اونچ نیچ ہوتی ہی رہتی ہے۔ لہٰذا اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنانے کی بجائے جو بھی RULES OF THE GAME ہیں ان کے مطابق اس معاملہ کو لے کر چلنا چاہئے۔ ورنہ شدید اندیشہ ہے اس میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو اس سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ یہ ساری محنت اور اربوں روپے کا صرف اکارت جائے گا۔ چنانچہ موجودہ صورتحال کے جو بھی منطقی تقاضے ہیں، ان کو پورا کرنا چاہئے۔ اس میں نہ تو کسی

ں کو خواہ وہ کتنی ہی بڑی شخصیت ہو' آڑے آنا چاہئے نہ سیاسی جماعتوں کو کسی غلط رخ پر
ں پروسس کو ڈالنا چاہئے۔ سب کا فرض ہے کہ مل جل کر جو بھی اس وقت جمہوریت چل
ی ہے' اس کے تقاضوں کو پورا کریں۔ ایک جمہوریت وہ ہے جس کا عکس ہمارے ذہنوں
ں اسلامی جمہوریت کی شکل میں محفوظ ہے۔ وہ جمہوریت تو بالفعل موجود ہی نہیں۔ تو جو بھی
ں وقت بالفعل (DE FACTO) صورتحال ہے اس کے مطابق اس معاملے کو طے کیا جانا
اہئے۔ میرے نزدیک اس میں کوئی قطعاً شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ اب پیپلز پارٹی کا
لاحق ہے کہ اسے بلاتاخیر حکومت بنانے کی دعوت دی جائے۔ وہ کسی اتحاد میں شریک ہوئے
یر سنگل پارٹی کی حیثیت سے اتنی بڑی تعداد میں سیٹیں لے گئی ہے جس کا خود مجھے بھی اندازہ نہ
ھا۔ میں یہ تو توقع کرتا تھا اور اس کا اظہار گذشتہ پانچ چھ برس سے میں اپنے ساتھیوں کے
سامنے کرتا رہا ہوں کہ بھٹو کا ایک بلینک چیک (BLANK CHEQUE) پیپلز پارٹی کے پاس
موجود ہے۔ آپ الیکشن کو کتنے ہی التواء میں ڈال دیں اور مؤخر کر دیں لیکن جب بھی الیکشن
منعقد کرایا جائے گا وہ چیک ایک بار ضرور کیش ہو گا اور پیپلز پارٹی واحد اکثریتی جماعت
(SINGLE MAJORITY GROUP) کی حیثیت سے ابھر کر آئے گی' لیکن جس نوع کی
کامیابی حالیہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کو حاصل ہوئی ہے وہ میرے اندازوں سے بڑھ کر ہے۔
الیکشن سے متصلاً قبل جو صورتحال تھی اس میں یہ چیز میں واضح طور پر دیکھ رہا تھا کہ ہر
گزرنے والے دن میں پیپلز پارٹی کی پوزیشن سندھ میں بہتری کی طرف اور پنجاب میں تنزلی کی
جانب مائل تھی۔ اس لئے کہ پنجاب میں واقعتاً نواز شریف صاحب کی صورت میں ایک قیادت
ابھری ہے۔ اس قیادت نے کام کر کے دکھایا ہے۔ بڑی محنت و مشقت کی ہے۔ جو بھی وقت
ملا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی جواں ہمتی اور قوت کار کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر یہ
کہ سوسائٹی کے مختلف طبقات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ
انہوں نے پنجاب میں بہت کچھ حاصل (GAIN) کیا ہے اور جیسا کہ میں نے متعدد بار عرض
کیا ہے کہ اب یہ نہ سمجھئے کہ اس ملک کی حکومت پھولوں کی سیج ہے۔ یہ کانٹوں بھرا بستر ہے۔
اب جو بھی حکومت میں آئے گا اسے کام کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ اب فضا بدل چکی ہے' لوگ
جاگ گئے ہیں۔ کچھ علاقے ہیں جہاں لوگ ابھی سوئے ہوئے ہیں لیکن اکثر و بیشتر علاقوں میں
لوگوں کو اپنے حقوق کا احساس ہو گیا ہے۔ اب ان کے اندر حکومت اور سیاسی قیادت کے
احتساب کا مادہ پیدا ہو چکا ہے۔ لہٰذا جو یہاں آئے گا اسے کام کرنا پڑے گا۔ اس لئے کہ اسے

نظر آئے گا کہ چند سالوں کے بعد اسے پھر احتساب کے کٹہرے کے اندر کھڑا ہونا ہو گا۔ اور یہی جمہوریت کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔

پیپلز پارٹی کا حق تسلیم کیا جائے

حاصل کلام یہ کہ پیپلز پارٹی کو جو ان انتخابات میں واحد اکثریتی جماعت کی شکل میں ابھر کر آئی ہے' اس کا حق ملنا چاہئے اور جمہوری سیاست کے مروجہ اصولوں کو پورا کیا جانا چاہئے۔ کسی بھی دلیل یا چال بازی کے ذریعے اگر اس کے جائز حق کو غصب کرنے کی کوشش کی گئی تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا اور تباہی گویا پھر آپ کے سروں کے اوپر مسلط ہو جائے گی۔ خاص طور پر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں۔ بہت سے لوگ بڑے دھڑلے کے ساتھ کہتے رہے ہیں کہ بھٹو نے پاکستان کو توڑا۔ اگر وہ ۷۰ء کے الیکشن کے نتیجے تسلیم کرتا اور شیخ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ کو جو سب سے بڑی پارٹی کے طور پر سامنے آئی تھی' حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی تو یہ ملک نہ ٹوٹتا۔ اس منطق کو موجودہ صورتحال پر منطبق کر کے غور کیجئے کہ اگر اس موقع پر پیپلز پارٹی کے حق کو نظر انداز کر دیا گیا تو کیا یہ اسی نوع کا معاملہ نہیں ہو گا جو ۷۰ء میں عوامی لیگ کے ساتھ روا رکھا گیا تھا اور جس کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا تھا۔ میری دانست میں یہ اس وقت کی غلطی سے دس گنا بڑی غلطی ہو گی۔ اس لئے کہ عوامی لیگ کا تو سوائے مشرقی پاکستان کے' دیگر کسی صوبے میں وجود ہی نہیں تھا۔ وہ ایک خالص علاقائی پارٹی تھی' جبکہ پیپلز پارٹی نے ملک کے اہم ترین صوبے یعنی سندھ میں نہ صرف یہ کہ مکمل ترین اکثریت حاصل کی ہے بلکہ پنجاب میں بھی اسے اسلامی جمہوری اتحاد پر برتری حاصل ہے۔ اسی طرح صوبہ سرحد میں بھی اس کا شمار بڑی جماعتوں میں ہوتا ہے اور بلوچستان میں بھی ایک سیٹ کی شکل میں ان کی نمائندگی موجود ہے۔ صوبہ سندھ میں تو اس نے اس طور سے برتری حاصل کی ہے کہ وہاں کسی اور سیاسی جماعت کا سوائے ایک محدود علاقائی جماعت کے' وجود ہی نہیں۔ اس اعتبار سے کسی جوڑ توڑ کے ذریعے اور بعض آزاد امیدواروں کی قیمتیں لگوا کر یا کسی بھی ہتھکنڈے سے اگر ان کے حق کو غصب کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ بہت بڑی ناانصافی ہی نہیں بہت بڑی غلطی ہو گی اور جمہوریت کی بحالی کیلئے کی گئی تمام کوششیں...... اور یقیناً ان کوششوں میں تمام سیاسی جماعتوں کا حصہ ہے...... ضائع ہو جائیں گی۔

عورت کی سربراہی کا مسئلہ

اس مسئلے کا ایک پہلو ایسا ہے جس کے بارے میں ہم سب کے دلوں میں ایک کھٹک موجود ہے اور جو ایک سوال کی صورت میں ہم میں سے بعض کی زبانوں پر وقتاً فوقتاً آتا رہتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک عورت کا سربراہ بننا اسلام کے نقطۂ نگاہ سے کیسا ہے؟ صحیح ہے کہ غلط؟ جائز ہے کہ ناجائز؟ خاص طور پر میرا معاملہ یہ ہے کہ عورتوں ہی کے مسئلے میں' میں سب سے زیادہ بدنام ہوں۔ یہاں تک کہ ضیاء الحق صاحب نے بھی مجھ سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ ۵ر مئی ۸۲ء کو جب میں مجلس شوریٰ سے اپنا استعفیٰ پیش کرنے گورنر ہاؤس گیا تھا تو وہاں صدر صاحب نے فرمایا کہ فلاں پرچے میں آپ کے بارے میں ایک مضمون چھپا ہے جس میں آپ کے بارے میں بڑے تعریفی کلمات بھی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ شکوہ بھی ہے کہ عورتوں کے معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ اس معاملے میں نرمی کر لیں تو سب ٹھیک ہو جائے۔ میں نے صدر صاحب سے عرض کیا تھا کہ "کیا آپ مجھے یہ SUGGEST کر رہے ہیں؟"

تو واقعہ یہ ہے کہ اگر میں اپنے ضمیر کے خلاف اپنی رائے بدلوں گا تو میں تو ختم ہو جاؤں گا' میری تو اخلاقی موت وہیں پر واقع ہو جائے گی۔ دلیل سے بات کیجئے اور مجھے قائل کیجئے کہ اسلام میں عورت کا مقام کیا ہے؟ اسلام کا عائلی نظام کیا ہے؟ اس وقت میں نے وہ الفاظ بھی کہے تھے کہ آپ نے شرعی عدالت قائم کی ہے اور اس میں اپنے منتخب کردہ علماء کو بٹھایا ہے۔ یقیناً یہ بہت بڑا انقلابی قدم ہے لیکن عائلی قوانین کے معاملے میں ان کے ہاتھ باندھ کر آپ نے اس سارے کام کی نفی کر دی ہے۔ مقام تعجب ہے کہ اس عدالت پر آپ کو یہ اعتماد بھی نہیں ہے کہ وہ عائلی قوانین کے بارے میں صحیح رہنمائی دے سکتی ہے! حالانکہ یہ علماء آپ کے اپنے منتخب کردہ ہیں۔ تو کیا آپ کو ان کی دیانت پر اعتماد نہیں ہے یا ان کے علمِ دین کے بارے میں شکوک لاحق ہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کے معاملے میں جو میں کہتا ہوں وہ مان لیں۔ میں کون ہوتا ہوں! اتھارٹی آپ ہیں نہ میں! جب آپ نے بھی مان لیا کہ اتھارٹی تو اللہ ہے تو شرعی عدالت کے ہاتھ کھول دیجئے۔ وہ قرآن و سنت کی روشنی میں جو فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہو گا۔ بہرحال عورتوں کے مسئلے میں اور ستر و حجاب کے معاملے میں جس شخص کے نظریات اتنے واضح اور بنیاد پرستانہ ہوں کہ امریکہ کے چار کونوں کے اہم اخبارات میں اس کے بارے میں مقالات شائع ہوئے ہوں تو ظاہر ہے کہ عورتوں کے بارے میں ایسے شخص کے نظریات

ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ لیکن عورت کی سربراہی کے مسئلے کو میں ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میری وہ رائے اپنی جگہ پر قائم ہے اور میرا قطعی مؤقف یہی ہے اسلام کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اسلام عورت کا یہ مقام نہیں سمجھتا اور اس کے اوپر یہ ذمہ داری نہیں ڈالتا کہ ملکی معاملات اس کے ہاتھ میں ہوں اور اسے حاکمِ وقت کا مقام دیا جائے۔ یہ چیزیں اسلام کے مزاج اور روح کے منافی ہیں' لیکن میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ ڈھائی تین سال پہلے جنگ فورم کراچی میں یہ سوال مجھ سے کیا گیا تھا کہ کسی عورت کا سربراہِ حکومت بننا اسلام کے مطابق ہے یا نہیں؟ میں نے کہا تھا یہ اسلام کے مطابق نہیں ہے' اسلام کی روح کے منافی ہے۔

انہوں نے سوال کیا اگر بے نظیر وزیر اعظم بن گئیں تو آپ کیا کریں گے؟ میں نے جواب دیا برداشت کریں گے۔ اور کتنے ہی منکرات ہمارے معاشرے میں ایسے ہیں جنہیں ہم برداشت کر رہے ہیں۔ مارشل لاء کو برداشت کرتے ہوئے ہمیں آٹھ سال بیت گئے ہیں۔ منکرات کے خلاف جدوجہد کرنے کا بھی ایک طریقہ ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا کیا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ کوئی کھڑا ہو جائے' نعرے مارے اور اسی وقت جا کر ہنگامہ کھڑا کر دے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ کر سکتے تھے کہ ابتدائی مکی دور ہی میں بتوں کو تڑوا دیتے۔ چار چھ افراد کی جانیں پیش کرنی پڑتیں۔ ستر جانوں کا ہدیہ تو غزوۂ احد میں بھی دینا پڑا تھا۔ مکی دور میں بھی ایسے فدائین موجود تھے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم وابرو کے اشارے پر گردنیں کٹوانے کو بے تاب تھے۔ وہ سارے بتوں کو توڑ ڈالتے' لیکن آپؐ نے یہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ وحی کے آغاز کے تیرہ سال بعد تک حضورؐ اسی گھر کا طواف کرتے رہے جس میں بت رکھے ہوئے تھے۔ ہاں جب اپنے انقلابی عمل سے گزر کر اور اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے فاتح کی حیثیت سے مکے میں داخل ہوئے تو پہلا کام یہ کیا کہ ایک ایک بت کو توڑ ڈالا۔ پھر ان بتوں کا وجود ایک لحظے کیلئے گوارا نہ فرمایا۔ یہ ہے طریق کار منکرات کے خلاف جہاد کا۔ غور کیجئے کہ اگر آغازِ وحی کے وقت ہی سارے بت توڑ دیئے جاتے تو اس وقت ابھی آپ کو زمین میں وہ غلبہ عطا نہیں ہوا تھا کہ مشرکین کو قوت کے بل پر بت گری سے روک سکتے۔ چند دنوں کے اندر اندر وہ پھر دو چار سو بت اپنے ہاتھوں سے تراش کر کعبہ میں رکھ دیتے۔ لیکن ۱۰ ر رمضان المبارک ۸ھ کو فتح مکہ کے موقع پر جب آپؐ نے بتوں کو توڑا تو اس دن سے آج تک کعبے پر کسی بت کا پرچھاواں نہیں پڑا۔ یہ ہے توازن اس انقلابی عمل کا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا۔ تو یہ جان لیجئے کہ اگرچہ عورت کی سربراہی کا معاملہ اسلام کی

روح کے منافی ہے لیکن منکرات کے خلاف ہمیں اسی انداز سے عمل کرنا ہوگا جو ہمیں سیرت نبویؐ میں نظر آتا ہے۔

اب میں آپ سے ایک سوال کرتا ہوں کہ کیا آپ کا معاشرہ اسلام کے منکرات سے بالکل پاک اور صاف ہے؟ یہاں کوئی اور منکر تو نہیں ہے جسے آپ برداشت کر رہے ہوں! مقام شرم ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی سربراہی کے معاملے سے ہزار گنا بڑے منکرات موجود ہیں جنہیں ہم بلا کھٹکے برداشت کر رہے ہیں لیکن اس مسئلے پر ہم اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور اپنا الّو سیدھا کرنے کیلئے اسلام کی آڑ لے کر لوگوں کے جذبات مشتعل کرنے کے درپے ہیں۔ ذرا سود سے اس معاملے کا موازنہ کیجئے جو اس سے ہزار گنا بڑا منکر ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت کی سربراہی کے خلاف احادیث میں اشارے ملتے ہیں۔ لیکن سود کی حرمت کا معاملہ تو قرآن میں اس انداز میں آتا ہے کہ اگر اس سے باز نہیں آتے تو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے اور حدیث میں سود کی حرمت اور شناعت کا ذکر اس قدر بلا دینے کے انداز میں ہے کہ جھرجھری آ جاتی ہے۔ حضورؐ کے فرمان کے بموجب سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں جن میں سب سے ہلکا اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔ موازنہ کیجئے اِس کو بھی تول لیجئے اُس کو بھی تول لیجئے - آپ میں سے کتنے ہیں جو سود سے بچے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے حاجی اور نمازی اور بڑے بڑے دین کے ٹھیکیدار سب اس حمام میں ننگے ہیں۔ ایک مسئلہ کو لے کر کھڑا کر دینا اور اس کو اپنے اعصاب پر سوار کر دینا جبکہ اس سے ہزار گنا جرم کو سب نظر انداز کر رہے ہوں، در حقیقت کم فہمی کا مظہر ہے۔

اپنے گھروں میں بھی جھانکیے

اللہ تعالیٰ زندگی میں مجھ پر وہ دن نہ لائے کہ میں دین کے کسی منکر کو معروف کا درجہ دے دوں، لیکن کبھی ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھئے کہ جس تہذیب کی نمائندہ (SYMBOL) بے نظیر ہے آپ میں سے کتنے ہیں جن کے گھر میں وہ تہذیب نہیں ہے! کتنوں کے گھر کے اندر شرعی پردہ موجود ہے؟ بڑے بڑے حاجی اور نمازی لوگوں کو میں نے دیکھا ہے لمبی لمبی داڑھیاں لے کر اپنی بے پردہ بہو، بیٹیوں اور بیویوں کو اپنے برابر کار میں بلکہ سکوٹروں پر اپنے پیچھے بٹھا کر لے کر جاتے ہیں۔ گریبان میں جھانکئے کون ہے جو اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ کرتا ہے! میں اگر پردے کی بات کرتا ہوں تو الحمد للہ کہ میں نے اپنے گھر میں

شرعی پردہ نافذ کیا ہے' لیکن یہ لوگ جو آج اسلام کے علمبردار بنے ہوئے ہیں' ان کی اپنی تہذیب اور تمدن وہی مغرب پرستانہ ہے۔ ضیاء الحق صاحب جا کر نئی نویلی دلہنوں کے ساتھ فوٹو نہیں کھنچواتے رہے؟ وہ ان سب خواتین اور دلہنوں کے محرم تھے؟ اور یہ شادی بیاہ کے مواقع پر جو فوٹوگرافر کے سامنے آپ کی سجی ہوئی دلہنیں آتی ہیں اور جو وڈیو فلمیں بنتی ہیں تو کیا یہ سب اسلام کے مطابق ہے!

ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکئے ہماری تہذیب کیا ہے' اس وقت ہم کہاں چلے گئے ہیں! حضورؐ کا فرمان ہے۔ "تمہارے اپنے اعمال تم پر حاکم بن جاتے ہیں" بارہا میں آپ کو یہ حدیث سنا چکا ہوں۔ "جیسے تم خود ہو گے' ویسا ہی تمہارے اوپر سربراہ آ جائے گا"۔ لہٰذا ملامت اگر کرنی ہے تو اپنے آپ کو ملامت کیجئے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے یہ ایک انڈکس ہے کہ ہمارا معاشرہ اسلام سے کس قدر دور چلا گیا ہے۔ امریکہ میں آج تک عورت سربراہِ مملکت نہیں بنی' کسی کو خیال تک نہ آیا کہ وہ بھی الیکشن لڑ سکے۔ لیکن یہاں ہندوستان میں سربراہ بن گئیں اور اب پاکستان میں بھی کوئی دیر کی بات رہ گئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ پیپلز پارٹی والے اگر اپنے طور پر فیصلہ کر لیں کہ بے نظیر صاحبہ حکومت سے باہر بیٹھ کر پارٹی کو آرگنائز کریں اور سربراہ کے طور پر کسی مرد کو سامنے لے آئیں تو کیا ہی کہنے ہیں! لیکن آپ کے معاشرے نے ثابت کر دیا ہے کہ دین کی اقدار کے ساتھ اس کا کتنا تعلق ہے۔ نام نہاد اسلامی جمہوری اتحاد نے جب عفیفہ ممدوٹ کو اپنا پارٹی ٹکٹ دے دیا ہے تو کم از کم ان کے منہ پر اب یہ بات سجتی نہیں کہ ایک عورت سربراہ مملکت نہیں بن سکتی۔ اچھی طرح سمجھئے کہ یہ معاملہ میرے نزدیک آج بھی منکر ہو گا' لیکن معاشرے میں بے شمار منکرات ہیں جو اس سے کئی گنا بڑے ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو توفیق دے کہ منکر کے استیصال کا جو طریقہ محمد رسول اللہؐ نے سکھایا ہے اس کو اختیار کریں۔ انقلاب لائیں' معاشرے کی اقدار کو تبدیل کریں۔ اللہ کرے کہ ہماری کوششیں کامیاب ہوں' لیکن اس سے پہلے صرف ایک مسئلے کو مذہبی جذبات کے حوالے کر کے اور اس کی آڑ میں گاڑی کو غلط رخ پر موڑنے کی کوشش انتہائی بچکانہ سوچ ہے۔

اسلام اور عصرِ حاضر

اس معاملے میں' میں ایک بات اور عرض کر دوں کہ اس وقت جو ہماری سیاسی' قومی اور

لی زندگی ہے اس کے بارے میں آج سے ڈھائی سال پہلے میرے قلم سے جو تحریر اللہ نے نکلوا دی تھی۔ "ندا" کے پچھلے شمارے میں شائع بھی ہوئی تھی، میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ میری اہم ترین تحریروں میں سے ہے! اس میں، میں نے مغربی تہذیب کا تجزیہ کیا ہے کہ یہ بھی کلیتہً صد فیصد غلط نہیں ہے۔ اس میں بھی حق اور باطل ملے جلے ہیں۔ غالب عنصر اس میں باطل کا ہے۔ بعض اوقات کسی درخت پر آکاس بیل اس طرح چھا جاتی ہے کہ درخت نظر ہی نہیں آتا، لیکن وہ بیل خود کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک کہ نیچے وہ تنا موجود نہ ہو۔ باطل کھڑا ہی نہیں ہو سکتا حق کے بغیر۔ حق کا کوئی نہ کوئی جزوہ لیتا ہے تب اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ یہی معاملہ ہے مغربی تہذیب کا۔ اس دور میں جمہوریت اور سوشلزم یا یوں کہئے کہ عوام کے سیاسی حقوق اور معاشی عدل وانصاف کا ایک دھارا ایک خاص سمت میں جو بہہ رہا ہے تو یہ ایک تاریخی عمل کا حصہ ہے۔ ابھی تک وہ دھارا لادینیت کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ اگر آپ اس کا رخ دین کی طرف موڑ دیں تو بہت بڑا کمال ہو گا اور یہی درحقیقت کرنے کا کام ہے۔ لیکن یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ اس دھارے کے آگے بند لگانا چاہیں گے تو خود بہہ جائیں گے، آپ کے بند بہہ جائیں گے۔ یہ تاریخ کا ایک بہاؤ ہے۔ ادھر آپ کو جانا پڑے گا۔ اب کوئی فردِ واحد قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اب ارتکازِ دولت اور معاشی ناانصافی کا دور بھی ختم ہو رہا ہے۔ اب خواہی نخواہی اس نظامِ عدلِ اجتماعی کی طرف جانا ہو گا جو اصلاً اسلام نے عطا کیا تھا اور اس کا نمونہ قائم کر کے دکھایا تھا۔ سماجی سطح پر کامل مساوات کا یہ تصور کہ کوئی پیدائشی طور پر ادنیٰ یا اعلیٰ نہیں، کوئی گھٹیا نہیں کوئی بڑھیا نہیں، سب برابر ہیں، ہاں اپنے کردار اور اخلاق سے اونچے ہو جاؤ، پیدائشی طور پر کوئی اونچا یا نیچا نہیں ہے، اسلام ہی کا عطا کردہ ہے۔ ؎ "تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے"۔ اور نظامِ معاشی میں ارتکازِ دولت کے خلاف یہ اصول کہ "تاکہ (سرمایہ) تم میں سے دولت مندوں کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے"۔ (الحشر۔ ۷) اسلام ہی نے نوعِ انسانی کو عطا کیا ہے۔ بہرکیف میں نے اپنی اس تحریر میں واضح کیا ہے کہ تہذیبِ مغرب کے اندر کارفرما بعض بنیادی اصول اسلام کی روح سے مطابقت رکھتے ہیں لیکن اس کے اوپر خلافِ اسلام چیزوں کا ایک دبیز غلاف ہے جسے ہٹا کر اس کے اصل باطن کو نکھارنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ۶۷ء میں میں نے ایک تحریر لکھی تھی "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" اس کے ساتھ اگر آپ مذکورہ بالا تحریر کو ملا کر پڑھیں تو میری سوچ اور میرے فکر کا پورا تانا بانا واضح طور پر آپ کے سامنے آ جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ

اسلام میں جمہوریت اور سوشلزم کی بحث خواہ مخواہ چھیڑ دی گئی ہے۔ اگر اسلام میں جمہوریت ہے تو اسلام میں سوشلزم بھی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ

اسلام کا اپنا ایک نظامِ حیات ہے' کامل۔ اس میں جمہوریت بھی ہے' سوشلزم بھی۔ لیکن یہ دونوں چیزیں بہت سی باتوں کے ساتھ ہیں اور کمالِ توازن اس سے سوا' اور اسلام آئے گا تو اپنی جڑ پر ہی آئے گا' کسی اور کی جڑ پر نہیں آ سکتا۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ اس وقت جمہوریت کی تحریک چلے گی تو اس کے نتیجے میں سیکولر ڈیماکریسی آئے گی۔ اس لئے کہ آپ کا معاشرہ سیکولر ہے۔ مذہب کا تو تھوڑا سا ملمع ہے۔ ذرا سا رگڑ دیں تو برا نہ مانئے' اندر سے سیکولر ازم نکل آئے گا۔ ہر شخص کی سوچ پیسے کے گرد گھومتی ہے۔ خالص مادی سوچ اور ایک خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر ہے' جو ہم سب کم و بیش اپنائے ہوئے ہیں۔ سیکولرازم ہمارے اندر سرایت کئے ہوئے ہے' لہٰذا جمہوریت ایسی ہی آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جمہوریت کی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بحالیٔ جمہوریت کا سب سے بڑا حامی ہونے کے باوجود میں تحریکِ نظامِ مصطفیٰ کے بھی قریب نہ گیا' جو ایک مقدس عنوان کے تحت خالص سیاسی تحریک تھی۔ اس کی پاداش میں مجھے سمن آباد کی مسجد خضراء سے بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن ملکِ خدا تنگ نیست' پائے گدا لنگ نیست' اللہ تعالیٰ جہاں بھی موقع دیں گے وہاں دین کی خدمت کرتا رہوں گا۔ ٹی۔ وی پر اگر پندرہ مہینے تک الہدیٰ کا پروگرام چلا تو وہ ایک خداداد موقع تھا' بند کر دیا گیا تو کیا مجھے تو اپنا کام کرنا ہے۔ ذرائع اور مواقع میسر ہوں اور میں انہیں استعمال نہ کروں تو میں مجرم ہوں۔

مذہبی جماعتوں کی حیثیت

یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے' جو الیکشن کے نتائج سے اور زیادہ منکشف ہو کر سامنے آ گئی کہ ہمارا معاشرہ حقیقتاً اور واقعتاً سیکولر معاشرہ ہے۔ افراد کو چھوڑ دیجئے' افراد بڑے اونچے اونچے بھی ہوتے ہیں' بات اکثریت کی ہو رہی ہے کہ اکثر کا حکم ہی کُل کے اوپر لگایا جائے گا۔ میں نے اپنی تازہ تقریروں میں وضاحت سے کہا کہ مذہبی جماعتوں کی حیثیت محض ضمیموں کی ہے اور وہ ثابت ہو گئی۔ ان ضمیموں کا جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یاد ہو گا میں نے کہا تھا کہ دو ہی گروہ اپنی جڑیں رکھتے ہیں۔ ایک جمعیت علمائے اسلام فضل الرحمان گروپ اور دوسرا جماعت اسلامی۔ فضل الرحمٰن گروپ کا ذرا سا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہے اور میں نے

ے خوش آئند قرار دیا تھا کہ ساری اسلامی جماعتیں دائیں بازو کی ہی بنی پھرتی ہیں تو اچھا ہے
لہ ایک گروہ LEFT OF THE CENTRE بھی ہے، جو کسی نہ کسی درجے میں عوام کی بات بھی
رتا ہے اور اسلام کی بھی۔ ایسا نہ ہو کہ ایک طوفان آئے تو اس اسلام کو بھی بہا کر لے جائے،
جسے سرمایہ داری کا چوکیدار بنا کر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ سب کے سب فتوے زمینداری،
جاگیرداری اور سرمایہ داری کو تحفظ دے رہے تھے اور یہ اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے
بڑے خطرے کی بات تھی۔ اس جماعت نے ثابت کیا ہے کہ اس کا کچھ اثر و رسوخ ہے۔
اگرچہ ہے تو ایک تنگ پٹی میں جو بلوچستان کے پختون علاقے سے چل کر سرحد کے ساتھ مل جاتا
ہے لیکن ایک حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ اثر سندھ میں بھی تھا لیکن ثابت ہو گیا کہ وہ اپنے آپ کو
منوانے کے قابل نہیں تھی۔ وہاں پر اس کی کوئی سیاسی حیثیت نہ نکلی۔ رہا پنجاب تو یہاں سرے
سے اسے کوئی عمل دخل ہی نہیں۔ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے تو میرے نزدیک
بدقسمتی سے وہ "الٹرا رائٹسٹ" بن گئی، گویا سرمایہ داری اور جاگیرداری کی سب سے
بڑی محافظ یہی ہے۔ کچھ تھوڑی سی روشنی پچھلے دنوں ان دعووں میں نظر آئی تھی کہ ہم
جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف جدّوجہد کریں گے، بیڑے غرق کر دیں گے، لیکن
پھر جو کچھ ہوا وہ آپ کے سامنے ہے، میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام
جاگیرداروں کے حق میں قطعاً نہیں اور میں تو اس بات کا دھڑلے کے ساتھ قائل ہوں اور
اعلان کرتا ہوں کہ امام اعظم ابو حنیفہؒ، امام دار الھجرت امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تینوں کے
نزدیک مزارعت مطلقاً حرام ہے۔ زمین خود کاشت کرو اگر کر سکتے ہو ورنہ دے دو کسی اور
کو۔ کوئی اور بھائی خون پسینہ ایک کرے اور تم مالک ہونے کی حیثیت سے اس کا (LIONS
SHARE) وہاں سے لے جاؤ اور اپنے بنگلوں کے اندر بیٹھے رہو تو یہ کہاں کی شرافت ہے۔
یہ کسی درجے میں بھی مروت ہے؟ کوئی شریف انسان اسے گوارا نہیں کرے گا تو اسلام کیسے
گوارا کر لے۔ یہ تو بعد کے دور کی بات ہے کہ اس کے جواز میں کچھ شرطیں لگا کر فتوے دیئے
گئے، لیکن دوڑیئے نا پیچھے کی طرف! اگر آپ چاہتے ہیں کہ دین کو اپنے اسلاف سے سیکھیں تو
ظاہر بات ہے کہ متأخرین پر متقدمین کی رائے کو فوقیت دی جائے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ مجھے جماعت اسلامی سے دلچسپی ہے کیونکہ اس میں پڑھے لکھے نوجوانوں
کی بہت بڑی تعداد آئی ہے لیکن میرے نزدیک جماعت کا دائیں بازو کی انتہا پر چلے جانا
درحقیقت اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے صحیح نہیں۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ سیاست،

قانون ' دستور اور اسلامی ریاست کے موضوعات پر مولانا مودودی کی خدمات بہت وسیع ہیں ' لیکن اس ایک میدان میں بدقسمتی سے ان کی سوچ 'ان کا مطالعہ بہت پیچھے رہ گیا۔ انہوں نے اسلام کے معاشی نظام کو صحیح طور پر نہیں سمجھا۔ جمعیت علمائے پاکستان کا جو حشر ہوا' آپ کے سامنے ہے۔ بحیثیت جماعت کے تو اس نے اپنا تشخص بھی گنوا دیا۔ مولانا نورانی میاں سے میری بڑی اچھی توقعات وابستہ تھیں لیکن افسوس کہ وہ سب کی سب ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ ان کی دو بڑی قیمتی شخصیتیں اسمبلی میں پہنچ گئی ہیں۔ مولانا عبدالستار نیازی کی پاکستان 'اسلام اور تحریک پاکستان کے ساتھ گہری کمٹ منٹ ہے۔ ان کا ایوان میں پہنچ جانا بہت خوش آئند ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پچھلی بار عرض کیا تھا کہ باقی جن حضرات کو عوامی اتحاد کے ٹکٹ دیئے گئے ہیں 'ان میں ایک استثناء ہے۔ محمد حسین انصاری صاحب' جو حافظ قرآن بھی ہیں اور جنہوں نے اپنے چہرے کو بھی سنت رسولؐ سے مزین کیا ہے۔ انصاری صاحب بھی ایک اچھا اضافہ ہیں لیکن میرا اب بھی مشورہ یہی ہے کہ جے یو پی کا مقام مسلم لیگ کے اندر ہے باہر نہیں۔

تحریک پاکستان میں بریلوی مکتبہ فکر کے علماء کا جو مقام تھا انہیں اپنے اسی مقام کو اختیار کرنا چاہئے۔ علماء کا مدنی گروپ تحریک پاکستان کے ساتھ نہیں تھا' جماعت اسلامی بھی تحریک پاکستان کے ساتھ نہیں تھی' وہ اپنا علیحدہ تشخص برقرار رکھیں تو رکھیں لیکن ثابت ہو گیا کہ جے یو پی کا علیحدہ کوئی سیاسی تشخص ہے ہی نہیں۔ انہیں تو مسلم لیگ میں ضم ہونا چاہئے۔ میرا اب بھی یہی مشورہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کو یہ کڑوی گولی نگلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ جمعیت اہل حدیث کے مولانا لکھوی کی کوئی حیثیت کسی جمعیت کی بنیاد پر نہیں بلکہ علاقے کے اندر اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنا پر تھی۔ ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھوی اس پورے علاقے کے روحانی پیشوا تھے اور پیر کا درجہ رکھتے تھے لیکن آج وہ اتحاد میں شامل ہو کر گم ہو گئے اور جہاں تک درخواستی گروپ کا تعلق ہے 'ان کی کوئی آزاد حیثیت نہیں اور الیکشن کے نتائج سے یہ ثابت ہو گیا ہے۔ مولانا سمیع الحق صاحب کو بھی میں آپ کی وساطت سے یہ مشورہ دوں گا کہ اپنی اصل جماعت کے ساتھ شامل ہو جایئے۔ یہ انمل بے جوڑ قسم کے گٹھ جوڑ جو صرف وقتی مصلحتوں کے تحت اتحاد بنے' درحقیقت کسی صحت مند انداز کی علامت نہیں۔ انہیں اپنے اصل گروپ کے ساتھ ملنا چاہئے اور وہ مل جل کر عوامی سطح پر دین کا کام کر سکتے ہیں۔ ان دھڑے بندیوں میں تقسیم ہو کر انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کو بہت ہی کم کر لیا ہے۔

مسلم لیگ اور پیر پگارا

چند مشورے اور دے رہا ہوں، جو اگر قبول کیے جائیں تو ملک و قوم کے حق میں نیک فال ہو گی۔ میرے نزدیک مسلم لیگ نے اتحاد کر کے بہت نقصان اٹھایا ہے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے تشخص کا بیڑہ غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ فائدہ کچھ نہیں ہوا لیکن تشخص ختم ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کی بھی تلافی کرنے کے لئے ایک سنہری موقع آیا ہے۔ مسلم لیگ کے احیاء کے لئے اس سے زیادہ مناسب موقع اور کوئی نہ ہو گا۔ اتحاد کو ایک طرف رکھ کر مسلم لیگ سامنے آئے اور یہ جماعت ایک عوامی قوت کے طور پر ابھرنے کا چیلنج قبول کرے۔ میں نے جو کہا وہ کچھ لوگوں کو برا لگا تھا کہ پیپلز پارٹی نے ایک بہت بڑا ٹیسٹ پاس کیا ہے۔ گیارہ برس تک ایک جماعت گورنمنٹ سے باہر رہی ہو اور وقت کے مقتدر اعلیٰ کا سب سے بڑا ٹارگٹ رہی ہو اور پھر بھی وہ برقرار رہ جائے تو اس کا برقرار رہ جانا ہی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور ایسے چیلنج ہی تو ہوتے ہیں جو جماعتوں اور تحریکوں کے سامنے آ جائیں تو ان کے ابھرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لئے

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میری بنیاد مسلم لیگی ہے۔ میں مولانا مدنیؒ کا انتہائی عقیدت مند ہوں شخصی اعتبار سے لیکن ان کی پالیسی کو آج بھی صحیح نہیں سمجھتا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو بیسویں صدی کا پہلا داعی الی القرآن سمجھتا ہوں اور میں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء کے دوران انہی کی چلائی ہوئی تحریک کو لے کر چل رہا ہوں۔ لیکن ابوالکلام کی سیاسی پالیسی میرے نزدیک سیاسی اعتبار سے غلط تھی۔ میری رائے مسلم لیگ کے ساتھ تھی اور میں آج بھی پاکستانی ہوں۔ مجھے تو اب بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو مجھ سے زیادہ پاکستانی ہوں۔ جو لوگ پاکستان کے ٹھیکیدار اور مسلم لیگ کے چوکیدار بنے پھرتے ہیں، مجھے ان میں بھی وہ جذبات رکھنے والے نظر نہیں آتے جو میں پاکستان اور مسلم لیگ کے لئے رکھتا ہوں۔

میں نے طالب علمی کا دور تحریک پاکستان پر لگایا تھا اور میں پاکستان پر ایمان رکھتا ہوں۔ وقتی طور پر بعض اوقات مایوسی طاری ہو جاتی ہے جیسا کہ میں نے "استحکام پاکستان" کے دیباچہ میں لکھا، لیکن میرے خوابوں کی تعبیر پاکستان سے وابستہ ہے۔ اگرچہ میں مسلم لیگ میں نہیں

ہوں اور ایک انقلابی جدوجہد کے لئے اینٹ روڑا یا یوں کہئے کہ گھو نسلا بنانے کے لئے تنکے تلاش کرتا پھرتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ ایک سیاسی قوت کے طور پر برقرار رہے مستحکم ہو اور یہ کہ مسلم لیگ کی تحریک کے احیاء کے لئے یہ بہت ہی سنہری موقع ہے۔ آزمائش کا دور کسی بھی عوامی تحریک کے لئے لازم ہوتا ہے۔ قائداعظم اور قائد ملت جیسے بزرگوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا لیکن اصولاً یہ بات غلط ہے کہ پارٹی اور حکومت کے عہدے ایک جگہ ہوں۔ یہ گویا اپنے ہاتھوں اس پارٹی کو ختم کر دینے اور گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔

اب ایک فیصلہ اللہ نے کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کے صدر بھی آؤٹ اور جنرل سیکریٹری صاحب بھی آؤٹ۔ اب کوئی متبادل ان کے سامنے ہے ہی نہیں۔ لہٰذا وہ فراغت کے ساتھ باہر آئیں اور مسلم لیگ کو منظم کرنے کا بیڑہ اٹھائیں اور اس کے لئے کمر ہمت کس لیں۔ اس کے لئے انہیں ذرا محنت تو کرنی پڑے گی لیکن نوٹ کر لیجئے میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ آپ سندھ کے ووٹ کو اینٹی پاکستان یا اینٹی مسلم لیگ ہرگز نہ سمجھ لیں۔ اصل میں اس وقت سندھ میں پیپلز پارٹی ہی مسلم لیگ ہے۔ پاکستان کے نام پر پہچانی جانے والی جماعت ایک ہی رہ گئی ہے لہٰذا چاہے پارٹی لیول پر اس کا کچھ بھی مطلب لیا جائے لیکن یہ واقعہ ہے عوام کا ووٹ پاکستان کے حق میں آیا ہے۔ مخالف پاکستان عناصر کو انہوں نے مسترد کر دیا ہے۔ یہ سنہری موقع ہے اور جیسا کہ اقبال نے کہا کہ ۔

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے پھر بھی کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر مسلم لیگ کو منظم کیا جانا چاہئے۔ پیر پگاڑا صاحب کے لئے بھی موقع ہے کہ آئیں اور کوشش کریں۔ وہ میدان میں نکلے تو ہیں اور اگرچہ پہلا تجربہ انہیں بڑا تلخ ہوا۔ بعض اخبارات میں آپ نے بھی پڑھا ہو گا کہ ان کے مرید بھی یہ کہتے ہیں کہ ''سر سائیں جا' ووٹ بھٹو جا'' لیکن بہرحال یہ بھی لوگوں کے اندر سیاسی شعور کی علامت ہے۔ اس کو بھی آپ نیک شگون سمجھئے۔ اللہ نے انہیں فارغ کر دیا ہے وہ بادشاہ گری کا فن چھوڑ دیں اور عملی سیاست کے میدان میں آئیں۔ ان کی ذات اور شخصیت ایک علیحدہ شے ہے لیکن ان کا خاندان پاکستان کے عظیم ترین خاندانوں میں سے ہے۔ ان کے والد اتنے بڑے روحانی رہنما اور مجاہد حریت تھے کہ انگریزوں نے ان کی لاش تک نہیں دی۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ پھانسی دی یا

(آخری قسط)

حقیقتِ جہاد

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

ترتیب و تسوید: حافظ خالد محمود خضر

عملی تصادم

نظریاتی و فکری تصادم کے بعد عملی تصادم کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر عمل کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ قوتیں باہم متصادم ہوتی ہیں' اس لئے کہ دین کی صرف تبلیغ ہی نہیں کرنی ہے بلکہ اسے عملاً قائم کرنا ہے۔ اسلام کا معاملہ دنیا کے کسی بھی مذہب یا کسی بھی دیگر نظام سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت اور مارکسزم کو لیجئے! عیسائیت نام ہے ایک عقیدے (DOGMA) اور کچھ اخلاقی تعلیم کا۔ عیسائیت کے پاس کوئی قانونی نظام نہیں' نظام حیات کا کوئی ڈھانچہ نہیں' کوئی شریعت ہی نہیں چنانچہ حلال و حرام کی کوئی قیود نہیں' مراسم عبودیت (RITUALS) تک نہیں' نماز روزہ کچھ بھی نہیں۔

انجیل میں شریعت ہے ہی نہیں بلکہ حضرت مسیح (علیہ السلام) نے شریعت موسوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو برقرار رکھا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں شریعت کو [منسوخ] کرنے آیا ہوں۔ حضرت مسیحؑ کے بعد سینٹ پال نے شریعت کو ساقط کر دیا۔ اب [عی]سائیت کی تبلیغ صرف ایک عقیدے کی تبلیغ ہے۔ یعنی بس مسیحؑ کو مان لو' کسی عمل کی ضرورت [نہ]یں۔ موت تک جو بھی گناہ کرو گے ان کا کفارہ وہ پہلے ہی دے چکے ہیں۔ عیسائیت نے [ج]ب تمام شرعی حدود و قیود ختم کر کے یہ شکل اختیار کی تو یہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ اسی [ط]رح کا کام آغاخانیوں نے ہندوستان میں کیا۔ ان کی تبلیغ یہ تھی کہ نو (۹) اوتاروں کو ماننے کے ساتھ ساتھ دسواں اوتار حضرت علیؓ کو مان لو۔ کسی شریعت وغیرہ پر عمل کی ضرورت ہی نہیں۔ البتہ جو پرانے اسماعیلی ہنزہ وغیرہ میں آباد ہیں' ان کے ہاں شریعت موجود ہے' اگرچہ امام ان کے بھی آغاخان ہیں۔ مارکسزم کی تبلیغ عیسائیت کی تبلیغ کے بالکل برعکس ہے۔ وہ ایک نظریاتی اور انقلابی تبلیغ ہے' جس کا مقصد ایک نظام کو قائم کرنا ہے۔

صرف عقیدے کی تبلیغ اور کسی نظام کو بدلنے کی تبلیغ میں فرق یہ ہے کہ مقدم الذکر تبلیغ ایسی بیل کے مانند ہے جو زمین پر نیچے نیچے پھیلتی چلی جاتی ہے' اور متوخر الذکر تبلیغ کی مثال ایک درخت کی سی ہے جو اوپر اٹھتا ہے۔ اسلام کی تبلیغ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اس میں ایمان کی تبلیغ بھی ہے اور اسلام کو قائم کرنا بھی ہے۔ یہ قائم کرنے کا جو مرحلہ ہے اس کو میں "اقامتِ دین" سے تعبیر کر رہا ہوں۔ ہمیں دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے : اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ..... اور جب دین کو قائم کرنے کے لئے کوشش ہوگی تو اس میں عملی تصادم کا مرحلہ آکر رہے گا۔ اس لئے کہ جو نظام پہلے سے موجود ہے اس کے ساتھ لوگوں کے مفادات وابستہ ہیں۔ جب آپ اس کو اکھاڑنا چاہیں گے تو ان کی چودھراہٹوں پر ضرب پڑے گی اور وہ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ وہ اپنے مفادات کے دفاع کے لئے آپ سے مقابلہ کریں گے' آپ سے انتقام لیں گے۔ "اقامتِ دین" کے اس مرحلے پر عزیمتیں ٹکرائیں گی۔ اب صرف نظریات کا تصادم نہیں' بلکہ قوتوں کا تصادم ہو گا۔

کوئی بھی انقلابی جماعت جب کسی انقلابی نظریئے کو لے کر اٹھتی ہے تو پہلا دور یہ ہوتا ہے کہ جب ماحول انتقامی کارروائی کرے تو اسے جھیلیں اور برداشت کریں۔ شدید ترین تشدد کے باوجود صبر و استقامت سے کام لیں اور مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھائیں۔ مسلمانوں کو ابتدا میں یہی حکم تھا۔ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ ...... "اپنے ہاتھ بندھے رکھو!" یہ صبرِ محض (PASSIVE RESISTANCE) کا مرحلہ ہوتا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ طاقت عطا فرما دے تو ہاتھ کھول دیئے جاتے ہیں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر یہ حکم نازل ہوا۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۨ ۝ اب صبر محض کا دور ختم ہوا اور اقدام (ACTIVE RESISTANCE) کا مرحلہ شروع ہوا۔ اس مرحلے پر جہاد مجاہدہ مع النفس اور دعوت و تبلیغ کے مراحل سے گزر کر اور نظریاتی تصادم کی سطح سے ابھر کر اب بالفعل قوتوں کے ٹکراؤ کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اب یہاں غور کیجئے کہ اس مرحلے پر سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے؟ اللہ نے اگر ہمیں اس کشمکش میں ڈالا ہے تو نہتا نہیں ڈالا ہے' بلکہ ہر مرحلے کے لئے ہتھیار دیئے ہیں۔ اس مرحلے پر اصل ہتھیار ہو گا ایک منظم جماعت!

ویسے تو ہر سطح پر ہی ہم مقصد لوگوں کی موجودگی مفید ثابت ہوتی ہے۔ پہلی سطح پر بھی ہم

خیال لوگوں کا ایک حلقہ ہو تو مجاہدہ ں آسان ہے۔ دوسرے مرحلے پر دعوت و تبلیغ کے کام کے لئے بھی اگر کچھ لوگ جمع ہو کر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائیں تو زیادہ بہتر نتائج نکل سکتے ہیں' لیکن اس سطح پر اصل ہتھیار قرآن ہے۔ اسی سے نظریاتی فتح حاصل ہو گی' اسی سے دلوں میں ایمان پیدا ہو گا اور اسی سے کفر والحاد اور مادہ پرستی و شرک کی جڑیں کٹیں گی۔ البتہ اس تیسرے مرحلے پر جماعتی قوت ناگزیر ہے اور یہی اس مرحلے کا اصل ہتھیار ہے۔ اور جان لیجئے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال ہے کہ آپ نے فدائین کی ایسی منظم جماعت قائم کی' جس کی نظیر بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ جس زمانے میں اس مقدس جماعت پر شدید ترین تشدد ہو رہا تھا اور انہیں مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' اُس دور کا ایک واقعہ پڑھنے میں آتا ہے کہ ایک بار ابو جہل نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو تھپڑ مارا تو انہوں نے بھی جواباً تھپڑ رسید کر دیا۔ اس لئے کہ وہ بھی قریشی تھے اور اپنی یہ توہین برداشت نہ کر سکے۔ لیکن اس پر حضورؐ نے شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ڈسپلن کی خلاف ورزی پر انہیں کچھ عرصہ کے لئے مکہ سے باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ یہ عالم تھا حضورؐ کی قائم کردہ جماعت میں نظم و ضبط کا! انقلاب برپا کرنے کے لئے واقعۃً ایک منظم اور مربوط جماعت کی ضرورت ہوتی ہے' جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جو اس کے مقصد سے گہری وابستگی اور وفاداری کے حامل ہوں۔ جن کی کیفیت یہ ہو کہ ع "ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" اور صرف مشغلے کے طور پر کسی جماعت میں شامل ہونے والے' جن کی کیفیت "سر تسلیم خم ہے......" والی نہ ہو' کبھی کوئی انقلاب نہیں لا سکتے۔ محض ہجوم (MOB) سے انقلاب نہیں آیا کرتا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے التزام جماعت کا حکم دیا ہے۔ "علیکم با لجماعة لا اسلام الا با لجماعة" ......اور جماعت بھی "سمع و طاعت" والی...... درکار ہے' ڈھیلے ڈھالے نظم والی جماعت نہیں! اس جماعتی نظم کی بنیاد کے بارے میں ہدایت بھی ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ سے ملتی ہے...... یعنی اس کی بنیاد "بیعت" پر ہونی چاہئے۔ آپؐ تو اللہ کے نبیؐ اور رسولؐ تھے اور آپؐ کو لوگوں سے بیعت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ جو بھی ایمان لے آیا کہ آپؐ اللہ کے رسولؐ ہیں' اس کی تو ہمہ وقت بیعت ہو گئی۔ اب اس کے پاس کوئی اختیار کہاں رہ گیا کہ وہ آپؐ سے یہ استفسار کرے کہ آپؐ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اور اگر آپؐ کی کسی بات کو ماننے سے انکار کر دے تو ختم ہوا اس کا ایمان۔ یہی

بات حضرت سعدؓ بن عبادہ نے بدر سے قبل ہونے والی مشاورت میں کہی تھی کہ۔ انا
امنا بک و صدّ قنا ۔...... "حضور! ہم آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپؐ کی
تصدیق کی ہے ' ہم نے آ. للہ کا رسول مانا ہے ' ہمارا یہ ایمان ہے کہ آپؐ کی زبان مبارک
سے جو کچھ بھی نکلے وہ وہ نا کے مطابق ہوتا ہے۔ اب آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں ' جو ارا د
ہو بسم اللہ کیجئے۔ اگر حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو برک الغماد تک دوڑاتے ہو۔
دبلا کر دیں گے۔ آپؐ حکم دیں گے تو ہم سمندر میں اپنی سواریاں ڈال دیں گے "۔ اس
کے باوجود حضورؐ ت مراحل پر صحابہ کرامؓ سے بیعت لیتے رہے ہیں۔ اس لئے کہ بعد م
آنے وا ذں سے رہنمائی در کار تھی ' ان کے لئے مثال چھوڑنا تھی۔

اب حضؐ کے بعد کوئی نبی تو نہیں آئے گا۔ جو بھی اس کام کو لے کر اٹھے گا ایک ام
ہو گا ' عام ان ہو گا ' لیکن جماعت کی بنیاد حضورؐ کی سنت کے مطابق بیعت پر ہو گی۔
طاعت فی روف کی بیعت کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے دائرے کے اندر ا
سنوں ۔ اور اطاعت کروں گا۔ معصیت میں اطاعت نہیں ہو گی۔ بے چون و چرا
غیر مشر اطاعت صرف رسولؐ کی ہو سکتی ہے۔ آپؐ کے بعد ہر امیر کی اطاعت مشروط ہو
کہ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ کے کسی حکم کے خلاف کوئی حکم ہو تو نہیں مانیں گے۔ لیکن ا
وائرے کے اندر اندر سر تسلیم خم ہے۔ سمجھ میں آئے گا تب بھی مانیں گے ' سمجھ میں نہ
آئے گا تب بھی مانیں گے۔ ہمیں اچھا لگے گا تب بھی مانیں گے ' اچھا نہیں لگے گا تب بھی ما
لے۔ اسی طرح جیسے ہمیں صحابہ کرامؓ کا عمل ملتا ہے۔ بایعنا رسول الله صلى ال
عليه وسلم على السمع والطاعة والهجرة والجهاد فى سبيل ال
فى العسر واليسر والمنشط والمكره۔

ایک اور حدیث میں الفاظ آتے ہیں۔ و على اثرة علينا ...... یعنی
ہے ہم یہ محسوس کریں کہ ہم پر دوسرے کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ یہ امارت جو کسی اور کو دے
ی گئی ہے اس کا میں زیادہ حقدار تھا۔ اُس کے باوجود سنیں گے اور مانیں گے۔ یا اس رجزیہ
عر کے حوالے سے سمجھ لیجئے جو اس وقت صحابہ کرامؓ کی زبانوں پر تھا جب غزوۂ خندق کے
وقع پر کدالیں چل رہی تھیں اور خندق کھودی جا رہی تھی۔ نحن الذين بايعوا محمدا
على الجهاد ما بقينا ابدا (ہم ہیں وہ لوگ جنہوں نے بیعت کی ہے محمدؐ سے جہاد
! جب تک ہم باقی ہیں ' جان میں جان ہے ' جہاد جاری رہے گا)۔

قتال فی سبیل اللہ

جہاد کا آخری اور تکمیلی مرحلہ جو درحقیقت اس عمارت کی بلند ترین منزل ہے' قتال فی سبیل اللہ ہے۔ یہ ایک طرح سے تیسرے مرحلے کا تتمہ ہے۔ یہاں میں اس اصطلاح کو واضح کر دینا چاہتا ہوں تاکہ جہاد اور قتال میں خلط مبحث (CONFUSION) باقی نہ رہے۔ جہاد اس مرحلے پر آکر قتال کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس لئے کہ انقلاب برپا کر دینا اور نظام باطل کو جڑ سے اکھاڑ کر اللہ کے دین کو بالفعل قائم کر دینا قتال کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ یہ ہے وہ بات جس پر سخت ٹھوکر کھائی ہے غلام احمد قادیانی آنجہانی نے۔ وہ یہ سمجھا کہ آج کی دنیا بڑی معقول ہو گئی ہے پہلے اجڈ اور گنوار لوگ تھے' وہ بات مانتے نہیں تھے اُن میں سمجھ نہیں تھی' اس لئے طاقت کے ساتھ منوانا پڑتا تھا۔ آج تو بڑا متمدن اور مہذب دور ہے۔ آج عقل سے بات منوائی جا سکتی ہے' دلیل سے لوگوں کو قائل کیا جا سکتا ہے' لہٰذا آج کے دور میں قتال کا کوئی سوال نہیں ہے ع

دیں کے لئے حرام ہے اب دوستو قتال!

یہ اس کی بہت بڑی ٹھوکر اور بہت بڑی گمراہی تھی۔ یہ جان لیجئے کہ قتال یا مزاحمت (RESISTANCE) جو بھی کسی معاشرے کی طرف سے ہوتی ہے وہ لاعلمی کی وجہ سے نہیں بلکہ مفادات کے تحفظ کی خاطر ہوتی ہے۔ وہ مفادات آج بھی جوں کے توں ہیں۔ وہ "لات و منات" جو ہیں وہ آج بھی اسی طرح جواں ہیں۔ آپ تبلیغ کرتے چلے جایئے۔ مسائل ستریز کے طریقے پر کوئی

ہسپتال' کوئی سکول کھول دیجئے' اور کچھ لوگوں کے نام چپکے سے بدلوا دیجئے' وہ اور بات ہے۔ اس سے کبھی کوئی نظام تبدیل نہیں ہو گا۔ نظام کی تبدیلی کے لئے ہر سطح پر جہاد کرنا ہو گا' جس کی آخری منزل قتال ہے۔ اس لئے تاکہ اللہ کا حکم نافذ ہو' اس کی بڑائی فی الواقع تسلیم کی جائے' اس کی بات سب سے بلند ہو! "لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا" اور اقبال کے الفاظ میں۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملّا و جمادات و نباتات

اسلام میں نیچے نیچے پھیلنے والی تبلیغ کا تصور نہیں ہے' بلکہ چار دانگ عالم میں اللہ کی کبریائی کا نفاذ

مقصود ہے۔
يَاۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ...... اے نبیؐ آپ کے مشن کا نقطۂ آغاز تو ہے انذار! آخرت سے ڈرانا' خبردار کرنا اور اس کی منزل کیا ہے؟ ہدف کیا ہے؟ وہ تکبیرِ رب ہے! اللہ بڑا ہو' اللہ کی بڑائی مانی جائے' اللہ کی کبریائی کا نفاذ ہو اور یہ قتال کے بغیر بھی نہیں ہو گا۔

دیکھئے میں یہ بات ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں کہ اگر کوئی انقلاب بغیر قتال کے آ سکتا تو محمد رسول اللہ کا انقلاب ہوتا۔ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم...... خونریزی کس کو اچھی لگتی ہے' فطرت انسانی اس سے اباء کرتی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ انقلاب اس کے بغیر نہیں آ سکتا۔ اگر آ سکتا تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انقلاب ہوتا۔ لیکن حضورؐ کو تو یہ حکم دیا گیا۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ "اور قتال جاری رکھو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کل کا کل صرف اللہ کے لئے ہو جائے۔ اگر دین کی یہ تفریق رکھنی ہے تو بات اور ہے کہ نماز اللہ کے لئے پڑھیں گے' کاروبار رواج کے مطابق کریں گے اور باقی جو دنیا کا دھندا چل رہا ہے وہ اپنے طور پر چلتا رہے گا' ہم اس کے ساتھ مفاہمت کئے رہیں گے تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر دین کل کا کل اللہ کے لئے کرنا ہے تو اس کے لئے تلوار ہاتھ میں لینا ناگزیر ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ کلام کے طور پر عرض ہے کہ جہاد اور قتال مترادف الفاظ نہیں ہیں بلکہ ان میں عام اور خاص کی نسبت ہے۔ قتال درحقیقت جہاد کا آخری اور تکمیلی مرحلہ ہے۔ جہاد فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہے اور ہر حالت میں فرض ہے' قتال اگرچہ ہر وقت فرض نہیں ہوتا لیکن اس کا حکم کسی مخصوص زمانے کے لئے نہیں تھا' بلکہ غلبۂ دین کے لئے قتال ہر دور میں ناگزیر ہے اور سخت ٹھوکر کھائی ہے جس نے اسے موجودہ دور میں ساقط قرار دیا ہے...... جہاد ارکانِ اسلام میں سے نہیں ہے لیکن یہ ایمانِ حقیقی کا رکنِ رکین ہے اور اللہ کے ہاں مومن صادق قرار پانا ہے تو اس سے کوئی مفر نہیں۔ از روئے ارشاد ربانی اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝

جہاد کے چار مراحل ہیں (۱) مجاہدہ مع النفس' یعنی بندگیٔ رب کے لئے نفس کے ساتھ کشمکش۔ اس مرحلے کے لئے اللہ نے ہمیں عبادات کی صورت میں ہتھیار عطا فرمائے ہیں۔ (۲) نفس کے ساتھ کشمکش کے بعد خارج میں نظریاتی و فکری تصادم ہو گا' یعنی دعوت و تبلیغ

کے ذریعے سے بگڑے ہوئے ماحول اور معاشرے کی اصلاح کی کوشش اور فریضۂ شہادت علی الناس کے ذریعے لوگوں پر اتمامِ حجت قائم کر دینا۔ اس مرحلے کا سب سے بڑا ہتھیار قرآن ہے۔ (۳) اس سے اگلا مرحلہ عملی تصادم کا ہے یعنی دین کو بالفعل قائم کرنے اور اس کے نظام کو نافذ کرنے کے لئے قوت کا استعمال عملی تصادم کا مرحلہ بالترتیب صبر محض' اقدام اور مسلح تصادم کے مراحل طے کرتا ہے۔ اس مرحلے پر اصل ہتھیار ایک منظم (DISCIPLINED) جماعت ہے جو ایسے افراد پر مشتمل ہو جو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے اپنی جان' مال اور سب کچھ قربان کر دینے کا عزم و حوصلہ لے کر آئے ہوں۔ (۴) جہاد کی بلند و بالا عمارت کی بلند ترین منزل قتال فی سبیل اللہ ہے جس کے بغیر انقلاب اسلامی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا!

بقیہ: خطاب جمعہ

کیا گیا اور ورثاء کو لاش تک نہ دی گئی۔ کہیں ان کی قبر نہ بن جائے جو سندھ کے حریت پسندوں کے لئے ایک بہت بڑا مرکز بن جاتی۔ انہوں نے ان دونوں بھائیوں کو یورپ کی فضاؤں میں پروان چڑھایا کہ وہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اپنا ماضی فراموش کر دیں۔ اگر واقعتاً انہیں شعور ہو جائے کہ وہ کس گدی پر بیٹھے ہیں تو کیا ہی بات ہے۔ اس گدی سے سید احمد شہید بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے قافلے کو پذیرائی ملی تھی جو کبھی حکمرانوں کو بھی نہ ملی۔ تحریک شہیدین کے ساتھ طے ہوا تھا کہ رائے بریلی سے چل کر تاریخ کے طویل ترین "لانگ مارچ" کے بعد یہ مجاہدین شمال سے سکھوں پر ضرب لگائیں گے اور ادھر سے پیر جو گوٹھ کا لشکر جنوب سے حملہ آور ہو گا۔ وہ یہ بھی فراموش نہ کریں کہ سندھ ہی واحد صوبہ تھا جس کی صوبائی اسمبلی نے پاکستان کے حق میں قرار داد منظور کی۔ کچھ عجب نہیں کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اور مسلم لیگ ایک واقعی حقیقی اور عوامی جماعت کی حیثیت سے سندھ ہی سے دوبارہ ابھرے۔

حسنِ انتخاب

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

مباہلے کا جواب

قادیانیوں کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ مسلمانوں کی توجہ حاصل کرنے اور انہیں انتشارِ ذہنی میں مبتلا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً مباہلے کا چیلنج کرتے رہتے ہیں لیکن ہر بار چیلنج کرنے کے بعد وہ میدان سے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ گرد تک کا نشان نہیں ملتا۔ چونکہ ان کا اہم مقصد عام مسلمانوں کی توجہ کا حصول ہوتا ہے لہٰذا ادارہ میثاق نے دانستہ ان کے حالیہ چیلنج کو لائقِ اعتناء نہ سمجھا تھا لیکن نومبر کے "اقراء ڈائجسٹ" میں اس موضوع پر مولانا یوسف لدھیانوی کی ایک تحریر نظر سے گزری۔ تحریر میں مباہلے سے متعلق قادیانیوں کے پھیلائے ہوئے مغالطوں کو چونکہ بہت خوبصورتی سے رفع کیا گیا ہے لہٰذا اسے اقراء ڈائجسٹ کے شکریے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

جنابِ مرزا طاہر احمد صاحب سلامٌ علیٰ من اتبع الہدیٰ۔

گزشتہ دنوں آپ کی طرف سے مباہلہ کا چیلنج شائع ہوا، میں اسے شاید لائقِ التفات نہ سمجھتا مگر طویل سفر سے واپسی پر ڈاک میں اس کی ایک کاپی موجود پائی جس میں بطورِ خاص مجھے مخاطب کیا گیا تھا۔ جس کا جواب بطورِ خاص مجھ پر لازم ہوا۔ اس لیے جواباً چند نکات عرض کرتا ہوں :

ا۔ سب سے پہلے اس پر آپ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ناکارہ کا نام دورِ حاضر کے مسیلمۂ کذاب مرزا غلام احمد قادیانی کے مخالفوں کی فہرست میں درج فرمایا۔ یہ دراصل بہت بڑا اعزاز ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىِٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

(المائدہ : ۵۴)

اے ایمان والو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر، تیز ہوں گے کافروں پر، جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہیں عطا فرمائیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں بڑے علم والے ہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں مرتدین سے مقابلہ کرنے والے حضرات کے چھ اوصافِ عالیہ بیان فرمائے ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے محبوب بندے ہیں۔ دوم یہ کہ وہ حق تعالیٰ شانہٗ کے سچے محب اور عاشق ہیں
سوم یہ کہ وہ اہل ایمان کے حق میں نہایت پست اور متواضع ہیں۔ چہارم یہ کہ وہ اہل کفر کے مقابلہ میں نہایت
سخت ہیں۔ پنجم یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ
بجالاتے ہیں۔ ششم یہ کہ وہ دین کے معاملہ میں کسی ملامت گر کی پروا نہیں کرتے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ حق تعالیٰ
کا فضل خاص ہے جس کو چاہتے ہیں یہ فضل عطا فرما دیتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے اولین مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم تھے جنہوں نے
مسیلمہ کذاب اور دیگر مرتدین کا مقابلہ کیا اور اس دور میں اس آیت کریمہ کا مصداق وہ حضرات ہیں جو مسیلمہ
پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی مرتد اور اس کی ذریت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ پس آپ کا اس ناکارہ کو مرزا غلام
احمد قادیانی کے مخالفین میں شمار کرنا گویا اس امر کی شہادت ہے کہ یہ ناکارہ اس دور میں آیت کریمہ کا مصداق ہے
ظاہر ہے کہ یہ اس ناکارہ کے بارے میں حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل عظیم کی شہادت و بشارت ہے، جس پر آپ کا
جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔

یہ ناکارہ آنحضرت خاتم النبیین و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا ادنیٰ ترین اور نالائق ترین امتی ہے
اور اپنی روسیاہی و نالائقی میں پوری امتِ محمدیہ (علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ وسلام) میں شاید سب سے
بڑھ کر ہے۔ ہمارے حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کے بقول:

کس نیست دریں امتِ تو آنکہ چوں احقر
با روئے سیاہ آمدہ و موئے زریری

ایسے نالائق و ناکارہ اُمتی کے لیے اس سے بڑھ کر کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ اسے یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهٗ کا
مصداق بنا دیا جائے۔ آپ کی تحریر سے اس ناکارہ کو توقع ہو گئی ہے کہ ان شاء اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے
اس ناکارہ و نالائق "با روئے سیاہ آمدہ و موئے زریری" امتی کی شفاعت فرمائیں گے۔

جب کبھی شوریدگانِ عشق کا ہوتا ہے ذکر
اے زہے قسمت کہ ان کو یاد آ جاتا ہوں میں

بہرحال آپ نے مرزا قادیانی کے مخالفوں میں اس فقیر کا نام شامل کر کے مجھے بڑا اعزاز بخشا ہے۔ ان شاء اللہ
آپ کی یہ تحریر مجھے فردائے قیامت میں سندِ شفاعت کا کام دے گی اس لیے آپ کے منہ میں گھی شکر۔

۲۔ ــــــ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے رسالہ انجامِ آتھم میں اپنے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ آئندہ وہ علماء
کو مخاطب نہیں کرے گا۔ مرزا کے الفاظ یہ ہیں:

الیوم تمنینا ما کان علینا من التبلیغات...... وان معنا ان لا نخاطب العلماء بعد ھٰذہ التوضیحات.... وھذہ منا	ہمارے ذمہ جو تبلیغ فرض تھی آج ہم نے اس کا حق ادا کر دیا۔ اور اب ہمارا قصد یہ ہے کہ ان توضیحات کے بعد ہم علماء کو مخاطب نہیں کریں گے اور یہ ہماری طرف سے مخاطبا

خاتمۃ المخاطبات (ص ۲۸۲) کا خاتمہ ہے۔

جب مرزا قادیانی ۱۸۹۷ء میں وعدہ کر چکا تھا کہ آئندہ ہم علماء کو خطاب نہیں کریں گے تو کیا
نو سال کے بعد یہ وعدہ ـــ جو آپ کے عقیدے میں "وما ینطق عن الہوٰی ان ہو الا وحی یوحیٰ"
کا مصداق تھا ـــ منسوخ ہو گیا یا آپ کے نزدیک مرزا کے وعدے وعید اور قول و فعل ایسے نہیں
جن کا لحاظ التفات کرنا مرزا کی ذریت کے لیے ضروری ہو؟

۳ ـــ آپ نے علمائے امت کو مباہلہ کا چیلنج دیا ہے۔ مباہلہ دو فریقوں کے درمیان حق و باطل
اور صدق و کذب کے جانچنے کا آخری معیار ہے۔ کیا آپ کے نزدیک ایک صدی کا عرصہ
گزر جانے کے باوجود مرزا غلام احمد قادیانی کا صدق و کذب اب تک مشتبہ ہے کہ آپ اس
کے لیے مباہلہ کرنے چلے ہیں؟ آپ کو یا آپ کی جماعت کو اب تک اس معاملہ میں اشتباہ ہو تو
ہو لیکن الحمدللہ امتِ اسلامیہ کو اور امت کے اس نالائق ترین فرد کو مرزا قادیانی کے جھوٹا ہونے
میں ادنیٰ سے ادنیٰ شبہ نہیں، امتِ اسلامیہ کا قطعی و اجماعی عقیدہ و ایمان ہے کہ آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والا بلا شک و شبہ جھوٹا، مرتد اور زندیق ہے اور
وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "ثلاثون کذابون کلھم یزعم انہ رسول اللہ" کی صف
میں شامل ہے ـــ حق تعالیٰ شانہ نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے مرزا غلام احمد قادیانی
مسیلمہ پنجاب کے جھوٹا ہونے پر ایسے بے شمار قطعی دلائل و شواہد جمع کر دیئے ہیں جن سے مرزا
کا کذب آفتاب نصف النہار کی طرح عیاں ہو چکا ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں مرزا کا کذاب
ہونا کسی ایسے شخص پر مخفی نہیں رہ سکتا جس کے دل میں نورِ ایمان کی معمولی روشنی باقی ہو اور جس
کی دل کی آنکھیں یکسر بند نہ ہو گئی ہوں۔ ہاں! جو شخص ارشادِ خداوندی:

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ	اور جو شخص دنیا میں اندھا رہے گا سو وہ آخرت
فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا	میں بھی اندھا رہے گا اور زیادہ راہ گم کردہ ہوگا۔

کا مصداق ہو اس کے لیے سیاہ و سفید اور صدق و کذب کے درمیان امتیاز ممکن نہیں۔ مرزا کے جھوٹ
کے لیے یہی کافی ہے کہ اس نے اپنی نام نہاد وحی کے ذریعہ اعلان کیا تھا کہ محترمہ محمدی بیگم کا آسمان
پر اس سے نکاح ہو چکا ہے اور وہ ۱۸۸۸ء سے لے کر ۱۹۰۷ء تک اس نکاح کی منادی کرتا رہا۔ اور
اسی نکاح کو پکا ثابت کرنے کیلئے اس نے ضمیمہ انجام آتھم میں یہاں تک لکھ دیا:

"یاد رکھو کہ اگر اس پیشگوئی کی دوسری جز پوری نہ ہوئی (یعنی محمدی بیگم بیوہ ہو کر
مرزا کے نکاح میں نہ آئی) تو میں ہر ایک بد سے بدتر ٹھہروں گا۔ اے احمقو! یہ
انسان کا افترا نہیں۔ یہ کسی خبیث مفتری کا کاروبار نہیں۔ یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کا سچا
وعدہ ہے۔ وہی خدا جس کی باتیں نہیں ٹلتیں، وہی ربّ ذوالجلال جس کے
ارادوں کو کوئی روک نہیں سکتا۔" (ص ۵۴)

ہمارا بھی ایمان ہے کہ خدا کی باتیں نہیں ٹلتیں۔ اس کے سب وعدے سچے ہوتے ہیں۔ ان میں کبھی تخلف نہیں ہو سکتا اور اس کے ارادوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ پیشگوئی کی دوسری جز پوری نہیں ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے محمدی بیگم کا سایہ دیکھنا بھی مرزا کو نصیب نہ ہوا جس سے قطعی طور پر ثابت ہوا کہ یہ خبیث مفتری مرزا غلام احمد قادیانی کا افترا تھا اور وہ اپنے اقرار کے بموجب ہر بد سے بدتر ہے۔ یہودی، نصرانی، ہندو سکھ اور چوہڑے چمار بھی غیر مسلم ہیں، بُرے ہیں، مگر مرزا باقرارِ خود ان سے بھی بدتر ہے۔ کیا اس خدائی فیصلے اور مرزا کی اپنی تحریر کے بعد بھی مرزا کے جھوٹا، مفتری اور ہر بد سے بدتر ہونے میں کوئی شک رہ جاتا ہے؟ یہ میں نے صرف ایک مثال ذکر کی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ نے مرزا کو جھوٹا اور روسیاہ کرنے کے لیے سیکڑوں نہیں ہزاروں دلائل جمع کر دیئے۔

۴ ـــــــ دیگر دلائل کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی نے لوگوں سے مباہلے بھی کئے۔ جن کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے مرزا کا مسیح کذّاب ہونا کھلے طور پر واضح فرما دیا، مثلاً:

الف: مرزا قادیانی نے ایک عیسائی پادری ڈپٹی آتھم سے پندرہ دن تک مناظرہ کیا۔ جب مرزا اپنے مضبوط حریف سے عہدہ برآ نہ ہو سکا تو جنابِ الٰہی سے فیصلے کا طالب ہوا، بقول اس کے خدا نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں فریقوں میں سے جو جھوٹ پر ہے وہ آج کی تاریخ (۵ر جون ۱۸۹۳ء) سے پندرہ مہینے کے اندر ہاویہ میں گرایا جائے گا۔

اس مباہلہ کی پیشگوئی کا اعلان کرتے ہوئے مرزا نے لکھا:

"میں اس وقت اقرار کرتا ہوں کہ اگر یہ پیشگوئی جھوٹی نکلی، یعنی وہ فریق جو خدا تعالیٰ کے نزدیک جھوٹ پر ہے۔ پندرہ ماہ کے عرصہ میں آج کی تاریخ سے بسزائے موت ہاویہ میں نہ پڑے تو میں ہر ایک سزا اُٹھانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھ کو ذلیل کیا جاوے، رُوسیاہ کیا جاوے، میرے گلے میں رسّہ ڈال دیا جاوے، مجھ کو پھانسی دیا جاوے، ہر ایک بات کے لیے تیار ہوں۔"

میعاد گزرتی گئی اور قادیانی امت کو یقین تھا کہ ان کے مسیح کذّاب کی پیش گوئی کے مطابق آتھم پندرہ مہینے کے اندر ضرور مر جائے گا۔ کیونکہ مرزا نے یہ بھی لکھا تھا:

"اور میں اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ضرور ایسا ہی کریگا، ضرور کریگا، ضرور کریگا، زمین و آسمان ٹل جائیں گے پر اس کی باتیں نہ ٹلیں گی۔"

لیکن جب میعاد میں صرف ایک رات باقی رہ گئی تو قادیان میں پوری رات شورِ قیامت برپا رہا۔ اور سب مرد وزن، چھوٹے بڑے اللہ تعالیٰ کے سامنے ناک رگڑتے، روتے یہ بین کر رہے تھے کہ یا اللہ آتھم مرجائے یا اللہ آتھم مرجائے اور سب کو یقین تھا کہ آج سورج طلوع نہیں ہوگا کہ آتھم مرجائے گا۔ مرزا غلام احمد قادیانی

نے آتھم کو مارنے کے لیے ٹونے ٹوٹکے بھی کئے اور چنے پڑھوا کر اندھے کنوئیں میں ڈلوائے لیکن ان تمام تدبیروں، دعاؤں، شور و غوغا کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آتھم کو مرنے نہیں دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فعل سے ثابت کر دیا کہ :

- مرزا قادیانی کی یہ پیشگوئی خدا کی طرف سے نہیں تھی بلکہ مرزا کا اپنا افتراء تھا۔
- مرزا قادیانی اور ڈپٹی آتھم دونوں جھوٹے تو تھے ہی، مگر مرزا، آتھم سے بڑا جھوٹا تھا۔
- اللہ تعالیٰ کی نظر میں مرزا قادیانی اس سزا کا مستحق تھا جو اس نے خود اپنے قلم سے تجویز کی تھی یعنی:

اس کو ذلیل کیا جائے۔

رُوسیاہ کیا جائے۔

اس کے گلے میں رسّہ ڈالا جائے۔

اس کو پھانسی پر لٹکایا جائے۔

اور جو سزا ممکن ہو سکتی ہے اس کو دی جائے۔

کیا اس خدائی فیصلے کے بعد بھی مرزا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کسی مباہلے کی ضرورت رہ جاتی ہے؟

ب: ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۱۰ھ کو امرتسر کی عیدگاہ کے میدان میں مرزا قادیانی نے حضرت مولانا عبدالحق غزنوی مرحوم و مغفور سے رُو در رُو مباہلہ کیا۔ اس کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے دے دیا کہ مرزا قادیانی، حضرت مولانا موصوف کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ اور مولانا موصوف مرزا کے مرنے کے بعد بھی سلامت باکرامت رہے

کیا اس کے بعد بھی مرزا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کسی آسمانی شہادت کی ضرورت ہے؟

ج: ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو مرزا قادیانی نے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری فاتح قادیان کے خلاف مباہلہ کا اشتہار شائع کیا جس کا عنوان تھا: "مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے ساتھ آخری فیصلہ"۔

اس میں مرزا نے اللہ تعالیٰ سے نہایت تضرع و ابتہال کے ساتھ گڑگڑا کر مکرر سہ کرر یہ دعا و التجا کی تھی کہ ہم دونوں میں سے جو جھوٹا ہے وہ سچے کی زندگی میں ہلاک ہو جائے۔" مگر نہ انسانی ہاتھوں سے بلکہ طاعون و ہیضہ وغیرہ امراض مہلکہ سے۔" اور اس اشتہار میں مولانا مرحوم کو مخاطب کر کے مرزا نے لکھا

> "اگر میں ایسا ہی کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ آپ اپنے ہر ایک پرچے میں مجھے یاد کرتے ہیں تو میں آپ کی زندگی میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ مفسد اور کذاب کی بہت عمر نہیں ہوتی۔ اور آخر وہ ذلت اور حسرت کے ساتھ اپنے اشد دشمنوں کی زندگی میں ہی ناکام ہلاک ہو جاتا ہے، اور اس کا ہلاک ہونا ہی بہتر ہوتا ہے تا وہ خدا کے بندوں کو تباہ نہ کرے۔
>
> اور اگر میں کذاب اور مفتری نہیں ہوں۔ اور خدا کے مکالمہ اور مخاطبہ سے مشرف ہوں اور مسیح موعود ہوں تو میں خدا کے فضل سے امید رکھتا ہوں کہ سنت اللہ کے مطابق آپ مکذبین کی سزا سے نہیں بچیں گے۔

پس اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں سے نہیں' بلکہ محض خدا کے ہاتھوں سے ہے' جیسے طاعون' ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں' آپ پر میری زندگی میں ہی وارد نہ ہوئیں تو میں خدا کی طرف سے نہیں۔

یہ کسی الہام یا وحی کی بنا پر پیشگوئی نہیں۔ محض دعا کے طور پر میں نے خدا سے فیصلہ چاہا ہے"

اور اس اشتہار کے آخر میں مرزا قادیانی نے لکھا:

"بالآخر مولوی صاحب سے التماس ہے کہ وہ میرے اس تمام مضمون کو اپنے پرچہ میں چھاپ دیں' اور جو چاہیں اس کے نیچے لکھ دیں۔ اب فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

مرزا قادیانی نے نہایت آہ وزاری کے ساتھ گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے جو فیصلہ طلب کیا تھا اس کا نتیجہ سب کے سامنے آگیا کہ مرزا ۲۵ رمئی ۱۹۰۸ء کو رات دس بجے تک چنگا بھلا تھا۔ شام کا کھانا کھایا اور رات دس بجے کے بعد اچانک خدائی عذاب یعنی وبائی ہیضہ میں مبتلا ہوا' اور دونوں راستوں سے غلیظ مواد خارج ہونا شروع ہوا' چند ہی گھنٹوں میں زبان بند ہوگئی اور بارہ گھنٹوں کے اندر ۲۶ رمئی ۱۹۰۸ء کو ہلاک ہوگیا۔ جبکہ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری مرحوم ومغفور مرزا کی ہلاکت کے بعد اکتالیس سال تک ماشاء اللہ زندہ وسلامت رہے۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں سرگودھا میں واصل بحق ہوئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اس خدائی فیصلے اور مرزا کی مُنہ مانگی موت نے ثابت کردیا کہ وہ مفتری اور کذاب تھا۔ مسیح موعود نہیں تھا اور یہ کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں' بلکہ شیطان کی طرف سے تھا۔

مرزا طاہر صاحب! کیا اس خدائی فیصلے کے بعد بھی کسی مباہلہ کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

۵۔۔۔۔ آج آپ علمائے امت کو مباہلہ کے لیے بلاتے ہیں۔ کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ نصف صدی ...ک آپ کے ابا مرزا محمود کو مباہلہ کے مسلسل چیلنج دیئے جاتے رہے۔ اور مرزا محمود نے ان میں سے کسی ...ک کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کی بھی چند مثالیں سُن لیجئے:

...ف: مولانا عبدالکریم مباہلہ نے مرزا محمود پر بدکاری کا الزام لگایا' اسے بار بار مباہلہ کا چیلنج دیا' اس کے لیے 'مباہلہ' نامی اخبار جاری کیا۔ مرزا محمود نے مباہلہ کا چیلنج قبول کرنے کے بجائے مولانا عبدالکریم ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔ ان کا مکان جلا دیا گیا' ان پر قاتلانہ حملہ کرایا گیا اور بالآخر ان کو قادیان چھوڑنے ...بور کردیا۔

اگر مرزا محمود میں حق وصداقت کی کوئی رمق تھی تو اس نے مولانا عبدالکریم مباہلہ کا چیلنج کیوں قبول ...کیا ۔۔۔ مولانا عبدالکریم مرحوم کی بہن سکینہ' جو مرزا محمود کے گناہ کا تختۂ مشق بنی۔ شاید آج بھی ...رہ ہے ۔۔

...: عبدالرحمٰن مصری مرزا محمود کا ایسا وفادار اور مقرب مُرید تھا کہ مرزا محمود کی غیر حاضری میں وہ ...ن میں 'قائم مقام خلیفہ' تک بنایا گیا۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں مرزا محمود نے اس کے لڑکے کو اپنی ہوس کا ...بنایا۔ عبدالرحمٰن مصری نے مرزا محمود سے اس معاملہ کی تحقیقات کے لیے جماعت کے چند سرکردہ

زاد پر مشتمل کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جس کے سامنے وہ اپنے الزامات ثابت کر سکے۔ مرزا محمود نے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے بجائے عبدالرحمٰن مصری اور اس کے ساتھی فخرالدین ملتانی کو ظلم و جبر کا نشانہ بنایا۔ ملتانی کو قتل کر دیا گیا اور مصری پر نقض امن کے تحت مقدمات دائر کر دیئے گئے۔ عبدالرحمٰن مصری نے عدالت عالیہ لاہور میں بیان دیتے ہوئے کہا:

"موجودہ خلیفہ سخت بد چلن ہے، یہ تقدس کے پردہ میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے۔ اس کام کے لیے اس نے بعض مردوں اور بعض عورتوں کو بطور ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو کرتا ہے۔ اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے۔ اس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں۔ اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔"

عبدالرحمٰن مصری نے مرزا محمود کے نام ایک خط میں یہ بھی لکھا تھا:

"میں آپ کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ مجھے مختلف ذرائع سے یہ علم ہو چکا ہے کہ آپ جنبی ہونے کی حالت میں ہی بعض دفعہ نماز پڑھانے آجاتے ہیں۔"

ان تمام غلیظ الزامات کے باوجود مرزا محمود کو عبدالرحمٰن مصری کا سامنا کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور ایسے مصری کی دعوت کو قبول کرنا موت سے بدتر نظر آیا ـــــ کیا اس سے کھلے طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس کا انگ انگ اور بند بند نجس تھا۔ اور کیا اس کے بعد بھی کسی عقلمند کو اس کے جھوٹا اور نجس ہونے میں کوئی شبہ رہ سکتا ہے۔

ج: پھر آپ ہی کی جماعت کے ایک منحرف گروہ نے 'حقیقت پسند پارٹی' تشکیل دی، جس نے مرزا محمود پر سنگین اخلاقی الزامات عائد کئے۔ انہوں نے 'تاریخ محمودیت' نامی کتاب لکھی، جس میں مرزا محمود کی بدکاریوں پر ۲۸ قادیانی مردوں اور عورتوں کی مؤکد بعذاب حلفیہ شہادتیں قلمبند کی گئیں۔ اور ان حلفیہ شہادتوں میں یہاں تک لکھا گیا کہ مرزا اپنی بیٹیوں کی بھی عصمت دری کرتا ہے، اور یہ کہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بیوی سے بدکاری کراتا ہے۔ 'تاریخ محمودیت' میں مرزا محمود کو مباہلہ کا چیلنج دیا گیا۔ اور ان مؤکد بعذاب حلفیہ شہادتوں کے مقابلہ میں اس سے مؤکد بعذاب حلف اٹھانے کا مطالبہ کیا گیا۔

پھر یہی مضمون راحت ملک کی کتاب "ربوہ کا مذہبی آمر" میں، شفیق مرزا کی کتاب "شہر سدوم" میں اور مرزا محمد حسین بی کام کی کتاب "منکرین ختم نبوت کا انجام" میں دہرایا گیا۔ اور مرزا محمود سے حلف مؤکد بعذاب کے ساتھ ان واقعات کی تردید کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن مرزا محمود نے ان میں سے کسی چیلنج کا جواب نہ دیا اور اس پر سکوت مرگ طاری رہا۔ البتہ اپنے بھولے بھالے خوش عقیدہ مریدوں کو ان کتابوں کے نہ پڑھنے کا 'سرکاری فرمان' جاری کر دیا۔ کیا اہل عقل اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کریں گے کہ مرزا محمود کے اخلاقی خط و خال وہی تھے جو ان کتابوں میں حلفیہ شہادتوں کے ذریعہ بار بار دہرائے گئے ہیں۔ مرزا طاہر صاحب! کیا اسی 'خاندانی تقدس' کے بل بوتے پر آپ علمائے امت کو مباہلہ کی دعوت

دینے چلے ہیں؟

بادۂ عصیاں سے دامن تر بہ تر ہے شیخ کا
اس پہ دعویٰ ہے کہ اصلاحِ دو عالم ہم سے ہے

مرزا طاہر صاحب! اگر آپ کا خیال ہے کہ آپ کے باپ پر "حقیقت پسند پارٹی" کے الزامات غلط ہیں تو آپ نے ان کے مطالبہ کے مطابق حلف مؤکد بعذاب اٹھا کر ان الزامات کی تردید کرنے اور مباہلہ کرنے کی جرأت آج تک کیوں نہیں کی؟

د: آپ کی جماعت میں کسی اور کو معلوم ہو یا نہ ہو لیکن آپ کو تو یقیناً معلوم ہوگا کہ آپ کے آباکی موت کن عبرت ناک حالات میں ہوئی، اور وہ اپنی زندگی کے آخری گیارہ سالوں میں ایک طویل عرصہ تک کس طرح مرقع عبرت بنا رہا۔ خصوصاً اس کے آخری دورِ ایام میں اس کی کیفیت کیا تھی؟ اور اس کی موت کیسی عبرتناک ہوئی۔

اور پھر یاد ہوگا کہ آپ کے بڑے بھائی مرزا ناصر کی ناگہانی موت کس طرح واقع ہوئی۔ آپ کے اسلام آباد کے 'قصرِ خلافت' کے سامنے ہونے والے جلسہ میں شیرِ ختم نبوت رفیق محترم جناب مولانا اللہ وسایا زید مجدہٗ نے آپ کی ہمشیرہ صاحبہ کا جو خط پڑھ کر سنایا تھا اس کا کیا مضمون تھا جس کو سن کر مرزا ناصر صدمہ کی تاب نہ لا سکا اور یکایک اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ مرزا طاہر صاحب! کیا اپنے بھائی، اپنے باپ اور اپنے دادا کی عبرت ناک موتوں کو بچشمِ خود دیکھنے اور سننے کے بعد بھی آپ کے لیے کسی مزید سامانِ عبرت کی ضرورت ہے؟ کہ آپ علمائے امت سے مباہلہ کرنے چلے ہیں؟ کیا آپ یہ دعا کرنے کی جرأت کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے باپ اور دادا کی سی موت نصیب کرے؟

۶۔ رفیقِ محترم جناب مولانا منظور احمد صاحب چنیوٹی مدظلہ العالی آپ کے ابا مرزا محمود کو اس کی زندگی میں ہر سال مباہلہ کی دعوت دیتے رہے۔ اس کی عبرت ناک موت کے بعد آپ کے بھائی مرزا ناصر کو ہر سال مباہلہ کا چیلنج دیتے رہے۔ اور اس کی ناگہانی موت کے بعد خود آپ کو بھی التزام کے ساتھ ہر سال مباہلہ کی کھلی دعوت دیتے رہے۔ انہوں نے متعدد بار ویمبلے ہال لندن میں بھی آپ کو دعوت دی۔ لیکن آپ کے باپ کو، آپ کے بھائی کو اور خود آپ کو آج تک اس چیلنج کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ کیا اس کا صاف صاف مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اپنے اور اپنے باپ دادا کے جھوٹا ہونے کا حق الیقین ہے۔ مرزا طاہر صاحب! علمائے امت کو مباہلہ کا چیلنج دینے سے پہلے کیا آپکا فرض نہیں تھا کہ آپ یہ تمام قرضے ادا کر دیتے جو آپ کے اور آپ کے باپ دادا کے ذمہ واجب الادا ہیں؟

۷۔ آپ نے اس فقیر کو مباہلہ کی دعوت دی ہے، یہ فقیر اس کے لیے بسروچشم حاضر ہے۔ لیکن مباہلہ کا وہ طریقہ نہیں جو آپ نے اختیار کیا ہے اور جس کی آپ نے علمائے امت کو دعوت دی ہے کہ وہ بھی آپ کی طرح گھر بیٹھے آپ پر لعنتیں بھیجتے رہیں اور اخباروں اور رسالوں میں لعنت کی پتنگ بازی کرتے پھریں۔ گھر بیٹھ کر چرخہ چلانا عورتوں کا مشغلہ ہے اور کاغذی پتنگ بازی بچوں کا کھیل ہے۔

مباہلہ کا طریقہ وہ ہے جو قرآن کریم نے آیتِ مباہلہ میں بیان فرمایا ہے کہ دونوں فریق اپنی عورتوں، بچوں

اور اپنے متعلقین کو لے کر میدان میں نکلیں، چنانچہ اس آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نصاریٰ نجران کے مقابلے میں نکلے اور ان کو نکلنے کی دعوت دی۔ اور خود آپ کا دادا مرزا غلام احمد قادیانی حضرت مولانا عبدالحق غزنوی مرحوم و مغفور کے مقابلہ میں عیدگاہ امرتسر کے میدان میں نکلا۔

اگر آپ اس فقیر کو مباہلہ کی دعوت دینے میں سنجیدہ ہیں تو بسم اللہ! آیئے۔ مردِ میدان بن کر میدانِ مباہلہ میں قدم رکھئے۔ تاریخ، وقت اور جگہ کا اعلان کر دیجئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں وقت فلاں جگہ مباہلہ ہوگا۔ پھر اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو ساتھ لے کر مقررہ وقت پر میدانِ مباہلہ میں آ جایئے۔ یہ فقیر بھی انشاء اللہ اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو ساتھ لے کر وقتِ مقررہ پر پہنچ جائے گا۔

اور بندہ کے خیال میں مباہلہ کے لیے درج ذیل تاریخ، وقت اور جگہ سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔

تاریخ : ۲۳ر مارچ ۱۹۸۹ء
دن : جمعرات
وقت : دو بجے بعد از نمازِ ظہر
جگہ : مینارِ پاکستان لاہور

میں نے اس کو بہترین تاریخ، وقت اور جگہ اس لیے کہا کہ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کے دادا مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی نے ۲۳ر مارچ ۱۸۸۹ء کو لدھیانہ میں اپنی دجالی بیعت کا سلسلہ شروع کیا تھا گویا ۲۳ر مارچ ۱۹۸۹ء کی تاریخ آپ کے مسیح دجال کی صد سالہ تقریب ہے اور اس نے لدھیانہ میں سلسلۂ بیعت کا آغاز کیا تھا، میدانِ مباہلہ میں آپ کا مقابلہ بھی لدھیانوی سے ہوگا — اس طرح بابِ لُدّ پر مسیح دجال کو قتل کیا جائے گا۔ ظہر کے بعد کا وقت میں نے اس لیے تجویز کیا کہ حدیثِ نبویؐ کے مطابق اس وقت فتح و نصرت کی ہوائیں چلتی ہیں۔ اور جگہ کے لیے مینارِ پاکستان کا تعین اس لیے کیا ہے کہ پاکستان میں اس سے بہتر اور کشادہ جگہ اجتماع کے لیے شاید کوئی اور نہیں ہوگی علاوہ ازیں ۲۳ر مارچ کی تاریخ یومِ پاکستان بھی ہے۔ یومِ پاکستان کو مینارِ پاکستان پر اجتماع نہایت مناسب ہے۔ تاہم مجھے اس تاریخ وقت اور جگہ پر اصرار نہیں۔ بلکہ تاریخ، وقت اور جگہ کی تعیین کو آپ کی صوابدید پر چھوڑتا ہوں آپ جو تاریخ، وقت اور پاکستان میں مقامِ مباہلہ مناسب سمجھیں، تجویز کر کے مجھے اطلاع دیں۔

یہ فقیر امتِ محمدیہؐ کا ادنیٰ ترین خادم ہے اور آپ چشمِ بد دُور "امام جماعتِ احمدیہ" ہیں اِس فقیر کو اپنے ضعف و قصور کا اعتراف ہے اور آپ کو اپنی امامت و زعامت اور تقدس پر ناز ہے۔ لیکن الحمد للہ ثم الحمد للہ یہ فقیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کا ادنیٰ غلام ہے۔ اور آپ جھوٹے مسیح کے جانشین ہیں۔ یہ فقیر سیدِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ رحمۃ للعالمینی سے وابستہ ہے اور آپ دورِ حاضر کے مسیلمہ کذاب کے دم چھلے ہیں۔ یہ فقیر اپنی نالائقی کا اعترافِ تقصیر لے کر میدانِ مباہلہ میں قدم رکھے گا۔ آپ اپنی امامت و زعامت اور تقدس پر ناز کرتے ہوئے آیئے۔ میں حضرت خاتم النبیین

صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت کا عَلَم اٹھائے ہوئے آؤں گا۔ آپ مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت و مسیحیت کا سیاہ جھنڈا لے کر آئیے۔

آئیے! اس فقیر کے مقابلہ میں میدان مباہلہ میں قدم رکھیے اور پھر میرے مولائے کریم کی غیرت و جلال اور قہری تجلّی کا کھلی آنکھوں تماشا دیکھیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نصاریٰ نجران کے بارے میں فرمایا تھا کہ اگر وہ مباہلہ کیلئے نکل آتے تو ان کے درختوں پر ایک پرندہ بھی زندہ نہ بچتا۔

آئیے! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ادنیٰ امّتی کے مقابلہ میں میدانِ مباہلہ میں نکل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوّت کا اعجاز ایک بار پھر دیکھ لیجئے۔

اس ناکارہ کا خیال ہے کہ آپ آگ کے اس سمندر میں کودنا کسی حال میں قبول نہیں کریں گے، اپنے باپ دادا کی طرح ذلّت کی موت مرنا پسند کریں گے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نالائق امّتی کے مقابلہ میں میدانِ مباہلہ میں اترنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

۸ــــــ یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اس ناکارہ کو یا دیگر علمائے امت کو آپ سے یا آپ کے باپ دادا سے کوئی ذاتی عناد نہیں۔ نہ کسی جائیداد کا جھگڑا ہے۔ نہ کسی ریاست کا تنازع ہے۔ واللہ العظیم ہم آپ کے خیر خواہ ہیں اور نہایت دردمندی و دل سوزی سے چاہتے ہیں کہ آپ دوزخ کی آگ سے بچ جائیں۔ مرزا قادیانی کے دجل و فریب اور مکاری و عیاری کی دھجیاں اس لیے بکھیرتے ہیں تاکہ امت محمدیہ کے ایمان کو بچایا جاسکے اور آپ کی جماعت کے افراد کو دوزخ کی جلتی آگ سے نکالا جاسکے۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارا یہ عمل محض رضائے الٰہی کے لیے اور آپ کی اور امتِ محمدیہ کی خیر خواہی کے لیے ہے۔ ہماری خیر خواہی آپ لوگوں کو مرنے کے بعد معلوم ہوگی۔ میں آج پھر آپ سے اور آپ کی جماعت کے ایک ایک فرد سے نہایت اخلاص و خیر خواہی اور دل سوزی و دردمندی کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ لوگ راستے سے بھٹک گئے ہیں، مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسیح کے قربِ قیامت میں آنے کی خبر دی ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا:

"خبردار! کوئی تم کو گمراہ نہ کردے، کیونکہ بہتیرے میرے نام پر آئیں گے اور کہیں

گے میں مسیح ہوں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ کریں گے۔" (متی ۲۴: ۴-۵)
مرزا غلام احمد قادیانی بھی انہی لوگوں میں سے تھا جنہوں نے مسیح ہونے کا دعویٰ کر کے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا۔ مرزا غلام احمد نے یا آپ لوگوں نے جو تاویلات ایجاد کر رکھی ہیں وہ محض نفس و شیطان کا دھوکہ ہے۔ یہ تاویلیں نہ قبر میں منکر نکیر کے آگے چلیں گی اور نہ فردائے قیامت میں داورِ محشر کے سامنے کام دیں گی۔

مرزا طاہر صاحب! آپ کے لیے اپنی امامت و امارت اور خاندانی گدی کو چھوڑ کر حق کا اختیار کرنا بے شک مشکل ہے، لیکن اگر آپ محض رضائے الٰہی کے لیے حق کو اختیار کر لیں تو حق تعالیٰ شانہٗ آپ کو دنیا و آخرت میں اس کا ایسا بہترین بدلہ عطا فرمائیں گے کہ اس کے مقابلہ میں آپ کی موجودہ ریاست و امارت ہیچ در ہیچ ہے۔ اور اگر آپ نے ریاست کو حق پر ترجیح دی تو مرنے کے بعد ایسی ذلت اور ایسے عذاب کا سامنا کرنا ہوگا جس کے سامنے موجودہ عزت و وجاہت لغو و لایعنی ہے۔ میں آپ کی جماعت کے تمام افراد سے بھی گزارش کرتا ہوں کہ مرنے سے پہلے توبہ کر لیں، اور میں آپ کو، آپ کی جماعت کو اور ان تمام افراد کو جن کی نظر سے میری یہ تحریر گزرے، گواہ بناتا ہوں کہ میں نے حق و صداقت کا پیغام آپ تک پہنچا دیا، کسی شخص کے دل میں حق طلبی کا جذبہ ہو اور وہ اپنا اطمینان چاہتا ہو تو اس کو سمجھانے کے لیے تیار ہوں۔

۹۔۔۔۔ آپ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں اپنا جواب اخباروں اور رسالوں میں شائع کر دوں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے میں نے اشاعت کی کوشش کی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اپنے اخبارات و رسائل میں میرا جواب شائع کرا سکتے ہیں۔

۱۰۔۔۔۔ میں نے آپ کو میدانِ مباہلہ میں اترنے کی جو دعوت دی ہے چار مہینے تک اس کے جواب کی مہلت دیتا ہوں۔ اور جواب کے لیے آخری تاریخ یکم جنوری ۱۹۸۹ء مقرر کرتا ہوں۔

۱۱۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے دیگر اکابر علماء کے نام بھی مباہلہ کا چیلنج بھیجا ہوگا۔ اس لیے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ علمائے امت کے اس خادم کا جواب سب کی طرف سے تصور فرمائیں۔ ہر ایک کو فرداً فرداً زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك
واتوب اليك۔ وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

SV ADVERTISING

رفتار کار

امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ جھنگ کے تاثرات

مرتّب : مختار حسین فاروقی

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لاہور سے ۶ ر نومبر کو سڑک کے سفر کے ذریعے صبح ۴۰۔ ۱۰ بجے ور نمنٹ کالج تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ آپ کے دست راست جناب قمر سعید قریشی ماحب بھی تشریف لائے تھے۔ دوسری اہم شخصیت جناب حافظ احمد یار صاحب کی تھی، جو اسی رزمین جھنگ کے موضع باغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیات کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور کالج ہذا میں بھی تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔ آج کل ونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد الحمد للہ پورا وقت ڈاکٹر صاحب کے اہم تعلیمی ادارے قرآن اکیڈمی یں تدریسی مشاغل میں گزرتا ہے۔

پرنسپل کالج ہذا جناب سمیع اللہ قریشی صاحب نے دیگر اساتذہ کے ہمراہ مہمانان گرامی کا استقبال کیا۔

گورنمنٹ کالج جھنگ کے در و بام اور فضائیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اور اُن کے انقلابی فکر کے لئے نئی نہیں ہیں۔ انہوں نے یہاں دعوتِ قرآنی کا بیج فروری ۶۸ء اور ۶۹ء کے خطابات کے دوران بویا تھا۔ اور اس کی آبیاری کی تھی۔ اس دعوت سے کالج کی فضا تو معطّر ہے ہی 'اہلِ دل حضرات اور خود پرنسپل صاحب کے قلب و ذہن میں بھی ۔

ہلکی ہلکی سی یاد باقی ہے — تم ملے تھے کہ خواب آیا تھا

اس وقت کے خطابات کے نقوش باقی ہیں۔

۶ ر نومبر ۸۸ء کا سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر خطاب گویا ایک معنوی تسلسل ہے جو اللہ تعالیٰ نے بہم پہنچا دیا۔

آپ نے اپنے خطاب میں دلوں کو گرمایا اور سامعین کو ایک ولولہ تازہ عطا فرمایا۔ معاً میرے ذہن میں یہ خیال کوند گیا کہ کاش کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس سرزمین میں تھوڑا وقت

صرف فرمائیں تو عجب نہیں کہ یہاں کی زرخیز زمین نم ہو کر ایسی شاندار فصل دے کہ اسلام نشاۃ ثانیہ کے لئے ہراول دستے کا کام دے سکے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْزٍ

....

قرآن مجید میں خالق کائنات نے آسمان' زمین' دریا' ندی' نالوں اور فصلوں کو آیات اور نشانیاں قرار دیا ہے اور ایسی مثالیں بیان فرمائی ہیں کہ دلوں کی دنیا کی بربادی اور سرسبزی و شادابی کے لئے بارش اور فصلوں کی روئیدگی کو بطور نشانی ذکر کیا ہے۔ اگر یہ ہی ہے تو یقیناً ایک داعیِ حق اور مذہبی مصلح کا کام ایک کسان کے کام سے مشابہت رکھتا ہے' دلوں کے موسموں اور دلوں کی زمینوں کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے ان میں تیاری کے بعد بیج ڈالتا ہے اور پھر اس بیج کو موسمی تھپیڑوں سے بچاتے ہوئے اپنی فصل کو لہلہاتی کھیتی میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میدان زراعت کا ہی ایک سلوگن ہے "جتنی گوڈی اتنا ڈوڈی' زمین میں جتنی محنت کرو گے اتنی ہی اچھی فصل پاؤ گے اور پھل پھول لگیں گے۔ داعی حق کے لئے یہ گوڈی کا عمل تذکیر و یاد دہانی ہے تاکہ دلوں میں اگر کچھ خودرو خیالات و باطل نظریات نے جڑیں پکڑ لی ہوں تو اس جنگل کو صاف کر دیا جائے اور از سرنو دلوں کو "پیغامِ سجود" سنایا جائے تاکہ مخاطبین کے دل پسیج جائیں اور وہ بارگاہِ حق میں سجدہ ریز ہو کر اپنی لوحِ جبیں تازہ کر لیں۔

سرزمین جھنگ کا خطہ مردم خیز ہے یا نہیں اور یہاں کی مٹی ذرا نم ہو تو زرخیزی کے کس معیار پر پورا اترے گی اس کا فیصلہ تو یقیناً اہل علم کو کرنا ہے مگر اتنی بات عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ خطہ بھی باب الاسلام وادیٔ سندھ کی تہذیب و ثقافت کا اثر لئے ہوئے ہے اور آج بھی اپنے بہت سارے ثقافتی معیارات میں عوامی سطح پر سندھ کی ٹھیٹھ تہذیب سے مشابہ ہے' یہاں بھی سیاسی اور معاشی سطح پر زمینداری اور جاگیرداری کے پوٹھوہار میں (نشیب و فراز) میں بہت اونچی اونچی چوٹیاں بھی ملتی ہیں' جن کا ٹھان اب مرورِ زمانہ کے ساتھ زائل ہو رہا ہے۔

برصغیر میں ورودِ اسلام کے دورِ اول میں جب سندھ کو باب الاسلام بننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی تو یقیناً سرزمین جھنگ اسی "عربی الاصل اسلام" کی آمد پر باب الاسلام کا عقبی حصہ تھی۔ اس لئے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی آمد پر (۹۳ھ مطابق ۷۱۲ء) مسلمان مجاہدین ملتان کو فتح کرنے کے بعد شمال میں پہاڑیوں سے

امن تک (FOOT OF THE HILLS) پہنچے تھے۔ اگر ایسا ہے اور یقیناً ہے تو سرزمین
ھنگ کا دورِ تابعین کے عربی شاہسواروں کی قدم بوسی کا شرف حاصل کرنا ایک طرۂ
نیاز ہے۔

جہاں تک اس بات کے تاریخی شواہد کا تعلق ہے تو موجودہ ضلع جھنگ کی حدود میں (جو
ازشتہ ایک صدی سے مسلسل سکڑ رہا ہے ضلع فیصل آباد کے نہری علاقے کی آبادی سے پہلے
ھنگ کی حدود ضلع شیخورہ پورہ سے ملتی تھیں) بھی ایک سے زائد جگہ ایسی قبریں ملتی ہیں جو صحابہ
ی قبروں کے نام سے مشہور ہیں لیکن چونکہ ان کے نام اور دیگر کوائف معلوم نہیں اس لئے
ے مجہول گواہی ہی شمار کیا جائے گا' جب تک کسی اور ذریعے سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔
لراس کے بعد تو ایک طویل فہرست ہے اہل علم و فضل کی جو ایک تسلسل کے ساتھ اس خطے
یں موجود رہے ہیں اور شمال مغرب سے برصغیر میں اسلام کے ورودِ ثانی کے وقت سے (جو
سقوط بغداد کے لگ بھگ ہوا) یہاں مسلمان صوفیائے کرام کا وسیع حلقہ موجود رہا ہے۔
چنانچہ اس کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے۔

(۱) ... حضرت غازی پیر (اصل نام۔ حضرت جلال الدین محمد)
وفات ۱۳۲ھ۔ مدفن شورکوٹ شہر

(۲) ... حضرت مخدوم تاج الدین اٹھارہ ہزاری
ولادت ۳۶۳ھ وفات ۴۲۸ھ مدفن اٹھارہ ہزاری

(۳) .... حضرت میاں چنوں وفات ۶۴۵ھ مدفن قصبہ میاں چنوں

(۴) .... حضرت مخدوم نورنگ جہانیاں
ولادت ۵۹۷ھ وفات ۶۶۹ھ مدفن شورکوٹ

(۵) .. حضرت ماچھی سلطان
ولادت ۷۵۳ھ وفات ۸۳۲ھ مدفن۔ قصبہ ماچھی سلطان

(۶) ..... حضرت شاہ اسماعیل بخاری
ولادت ۷۶۲ھ وفات ۸۵۰ھ مدفن ٹھٹھی چنیوٹ شہر

(۷) ...... شیخ جوہر المعروف شیخ چوہڑ
وفات ۸۰۴ھ مدفن۔ شیخ چوہڑ تحصیل جھنگ

(۸) ...... حضرت کبیر نیکوکارہ ولادت ۸۳۲ھ وفات ۹۲۷ھ

اس کے علاوہ بھی بہت سے بزرگان دین کے مدفن ہیں جن کا تذکرہ طوالت کے سبب نہیں دیا جارہا ہے جو تاریخ کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے (واضح رہے کہ حضرت سیّد علی ہجویری (المعروف داتا گنج بخش) کا ورود لاہور ۴۳۱ ہ کا ہے)۔

....

اب قارئین کو دوبارہ گورنمنٹ کالج کی جلسہ گاہ کے پنڈال لے چلتے ہیں جو سائنس بلاک کے سامنے وسیع گراؤنڈ میں سجایا گیا تھا۔ شامیانے قطار اندر قطار ایستادہ تھے۔ مہمانانِ گرامی اور سامعین کے لئے کرسیاں آراستہ کی گئی تھیں اور طلبہ کے لئے بھی نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ اور دیگر مہمانان گرامی جب پرنسپل صاحب کی معیت میں پنڈال میں داخل ہو رہے تھے تو تعلیمی اداروں کے ماحول کے مطابق تمام طلباء نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔

کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ بعد ازاں کالج ہذا کے ایک طالب علم نے ہدیۂ نعت پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مختصر تعارف کے بعد آپ کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ خطاب کا عنوان تھا "عصر حاضر میں باطل نظریات سے متاثر احباب کے اشکالات کو واضح کرنا اور اسلامی انقلاب کے لئے فکری و عملی رہنمائی"

ڈاکٹر صاحب موصوف سٹیج پر تشریف لائے آپ نے سورۂ حدید کی آیت نمبر ۲۵ اور سورۂ صف کی آیت ۹ کی تلاوت فرمائی اور بعد ازاں ایک گھنٹہ چالیس منٹ تک خطاب فرمایا۔

....

اساتذہ مہمانانِ گرامی اور طلباء کی تعداد جو پنڈال میں موجود تھی ایک ہزار سے متجاوز تھی۔ آس پاس روشوں، درختوں کے سائے اور برآمدوں میں ایستادہ احباب الگ تھے۔ دھوپ میں بھی کثیر تعداد میں طلبا اور اساتذہ دھوپ کی تمازت کے باوصف سحر بیان سے متاثر کھڑے نظر آرہے تھے۔

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے انقلاب کا موضوع اور ڈاکٹر صاحب کا اندازِ خطاب گویا سونے پر سہاگہ۔ ؎

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا

ڈیڑھ گھنٹے کے اس خطاب میں ایسی سلاست روانی اور برجستگی تھی کہ وقت کا احساس بھی نہیں

ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ان کے ایک شاگرد متی (SAINT MATHEW) نے کہا ہے آپ جب خطاب فرماتے تھے تو ایسے لگتا تھا جیسے آپ You are speaking with Authority اسی کی مثال بچشم سر دیکھنے کو ملی کہ آں موصوف انتہائی برجستہ اور حتمی لہجے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ خطاب ایسا مدلل تھا کہ فصاحت و بلاغت کا حق ادا ہو گیا۔

آپ نے تلاوت کردہ آیات کی وضاحت کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ انقلاب انسانی

هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔

***

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔

اجتماعیت سے متعلق کسی گوشے میں کسی اہم تبدیلی کا نام ہے اور اسلام نے سیاست، معیشت اور معاشرت میں ایسی BASIC اور PROFOUND تبدیلیاں کی ہیں کہ اس کی نظیر تاریخ انسانی سے ملنا محال ہے۔ آپ نے "الفضل ما شهدت به الا عداء" کے مصداق متعدد غیر مسلموں کے انقلاب محمدیؐ کی ہمہ گیریت اور عظمت کے اعتراف کے حوالوں سے اپنے خطابات کو مزین فرمایا تا آنکہ بات دل سے نکلی اور دلوں میں اترتی چلی گئی۔

آپ نے معیشت کے میدان میں سرمایہ داری کے خاتمے اور زمینداری و جاگیرداری (ABSENTEE LANDLORDISM) کا صریحاً خلاف اسلام ہونا واضح فرمایا۔ اور اس کے نتیجے میں تمام انسانوں پر ہونے والے مظالم، تعدی اور استبداد کے خاتمے پر ہی اسلام کی حقیقی برکات کے عام ہونے کو مشروط فرمایا۔

معاشرتی سطح پر نسلِ آدم میں تمیزِ بندہ و آقا کو ختم کرنا اسلام کی تعلیمات کا بنیادی پتھر

ہے۔ چنانچہ کالے اور گورے لوگوں میں رنگ، نسل، زبان اور پیشے کی بنیاد پر تمام فضیلتیں جو بدقسمتی سے غیر مسلموں سے متعدی ہو کر ہمارے اندر بھی راہ پا چکی ہیں اسلام کے منافی ہیں۔ آپ نے واضح فرمایا کہ شرفِ انسانیت میں تمام انسان حتیٰ کہ عورت اور مرد میں بھی برابری ہے۔ ہمارے اندر بھی عزت کے یہ غلط معیار ہندو معاشرے کے زیر اثر آ گئے ہیں ورنہ دشمن گواہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تقسیم کو ختم کر کے عملاً ایسی لعنتوں سے پاک معاشرہ قائم فرمایا تھا۔

سیاسی سطح پر "عوامی خلافت" اسلام کا تصور حکومت ہے اس لئے کہ اصل حاکیت (SOVEREIGNTY) اللہ تعالیٰ کی ہے اور انسان کو صرف احکام خداوندی کی تنفیذ کرنا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے اندر اندر باہمی مشورے سے معاملات دنیا کو چلانا ہے یہ حکمرانی کا حق تمام انسانوں کو مساوی طور پر حاصل ہے لہٰذا کوئی خاندان یا گروہ یا قوم کسی دوسرے انسان گروہ یا قوم یا خطہ پر اپنے ذاتی حسب و نسب یا جاہ و حشمت کی وجہ سے حکمرانی کا حق نہیں رکھتا! اسی وجہ سے اسلام نے سربراہ حکومت کا تصور خلافت راشدہ کے دور میں "درویش حکمران" کا دیا ہے، جو قیصرو کسریٰ سے بڑی سلطنتوں کے فرماں روا ہونے کے باوصف نہ خدام و حشم رکھتے تھے نہ باڈی گارڈ نہ قلعہ اور محل بناتے تھے، نہ تخت و تاج! اس کی مثال تاریخ انسانی میں تلاش کرنا بے سود ہے۔

....

آپ نے وضاحت فرمائی کہ اسلام نے یہ انقلابی تصورات دیئے ہیں مگر جب تک ان کو عملاً دنیا میں نافذ نہیں کیا جاتا۔ اس کا کچھ حاصل نہیں ہے قرآن مجید میں مذکورہ آیت واقعی دنیا کے انقلابی لٹریچر میں عریاں اور کھلی عبارت ہے کہ ان تصورات کو جو اسلام کے عدل اجتماعی کا نمونہ ہیں اس کو عملاً نافذ کرنے کے لئے لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لو۔ لوہے کو خالق کائنات نے بنایا اور اتارا اسی لئے ہے اگرچہ اس میں لوگوں کے لئے اور بھی منفعت کا سامان ہے مگر چاہیے کہ اہل ایمان اٹھیں اور اللہ کے دین کو باقی تمام ادیان پر غالب کر کے دم لیں۔ یہی مشن تھا تمام رسولوں کا اور یہی مقصد تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے جانے کا جو قرآن مجید میں واضح طور پر مذکور ہے۔

جدید دور میں انسانی علوم و فنون سے جو بیداری پیدا ہوئی ہے تو انسان نے قدیم جاگیرداری

نظام اور شہنشائیت سے بغاوت کا علم بلند کر کے اس سے نجات حاصل کر لی مگر اس کے لئے بڑا خون خرابہ کرنا پڑا۔ اس "آزادی کی نیلم پری" کی کوکھ سے جلد ہی آزاد معیشت کے پہلے ثمر کے طور پر سرمایہ داری کی لعنت نے جنم لیا اور انسان کو سرمایہ دار بھیڑیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اسی کا ردعمل تھا جو کمیونزم کی شکل میں ظاہر ہوا۔ مگر جلد ہی انسان کو احساس ہوا کہ اس طرح تو پہلے سے موجود تھوڑی سی آزادی بھی پیٹ کے دوزخ کے بھینٹ چڑھ گئی اور انسان سوشلزم کے سرخ جنت میں بس ایک معاشی حیوان بن کر رہ گیا۔

انسان اسی افراط و تفریط میں اپنے تجربات سے فائدہ اٹھا کر ایک بہترین نظام کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ وہ تصورات کی حد تک آج اس مقام تک آپہنچا ہے جسے (SOCIAL DEMOCRACY) سوشل ڈیموکریسی کہا جا رہا ہے۔ درحقیقت انسان علومِ نبوت سے آنکھیں بند کر کے یہ سب سے اونچا مقام ہے جو حاصل کر سکتا ہے اس سے آگے تو نورِ مصطفیٰ ہی اس کی آنکھ کا سرمہ بن سکتا ہے۔ آج کا انسان خواہی نخواہی اسلام کے تصورات ہی کی طرف آ رہا ہے اور نقشہ وہی جم رہا ہے جو علامہ اقبال نے پون صدی قبل چشمِ باطن سے ملاحظہ فرمایا تھا۔

هر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
زاں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ست

آج سے چودہ سو برس قبل جو معاشرہ محمد رسول اللہ نے اپنی کثیر جماعت کے ساتھ مل کر قائم فرمایا تھا وہ کوئی دو چار افراد پر مشتمل نہیں تھا بلکہ ایک عظیم خطے پر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں عظیم انقلاب آگیا تھا اور آج بھی جو اسلامی انقلاب کے بعد معاشرہ وجود میں آئے گا وہ

☆ ... سود اور سرمایہ داری کا مکمل استیصال کرے گا۔
☆ ...... سماجی اور معاشرتی سطح پر کامل مساوات کا علمبردار ہو گا۔
☆ ... زمینداری اور جاگیرداری (جو سود ہی کی ایک شکل ہے) اس کا قلع قمع کرے گا۔

یہاں تک کہ مسلمان ریاست میں:

(۱) ... تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفالت کرے گا۔

(۲) ... تعلیم اور علاج کے میدانوں میں معاشرے میں موجود تمام ناہمواریوں کو ختم کردے گا اور ایک نظام نافذ کرے گا۔

یہ عناصر وجود میں آئیں گے تو اسلام کی برکات عام مسلمان تک پہنچ سکتی ہیں ورنہ بیچارہ جیسے صدیوں سے محروم ہے اب بھی محروم ہی رہے گا۔

....

یہ متوقع عالمی اسلامی انقلاب کب اور کیسے آئے گا یہ غور طلب بات ہے۔ پہلی بات تو بڑی سادہ اور حتمی ہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے ارضی کے انسانوں کے لئے تاقیامت نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

(۲) اور آپؐ پر نبوت ورسالت کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے لہٰذا اس بات کا منطقی نتیجہ ہے کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا یہ نظام جیسے عرب میں قائم ہوا ایسا ہی تمام روئے ارضی پر اس کا قیام اور غلبہ ایک لابدی اور منطقی امر ہے ختم نبوت کا۔ اور دوسری جانب خبر دی ہے خود آپؐ نے کہ وہ وقت آکر رہے گا کہ اسلام اس روئے ارضی پر ہر گھر میں داخل ہو کر رہے گا چاہے کوئی عزت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا چھوٹا بن کر جزیہ دے اور اجتماعی قانون (LAW OF THE LAND) اسلام کا قبول کرے۔

لہٰذا پہلی بات تو طے ہوئی کہ یہ کام ہونا ہے۔ رہی دوسری بات کہ کون کرے گا وہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ کام اب اس "امتِ محمدؐ" کو کرنا ہے۔ اللہ نے اس امت کو بنایا اسی لئے ہے اور اس کے ذمے کام بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے۔ اس امت کے ہر فرد یعنی مسلمان کے ذمے ہے کہ اس اسلامی انقلاب کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو مکمل کرے جو دیکر آپ کو بھیجا گیا تھا۔ یہ اللہ کی بھی مدد ہے کہ دین اس کا ہے اور محمدؐ کی بھی مدد ونصرت ہے کہ مقصد اور مشن ان کا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقدس کام میں اپنا خون پسینہ لگانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

جہاں تک عملی رہنمائی کا سوال ہے تو اس کو ڈاکٹر صاحب نے وقت زیادہ ہو جانے کے باعث مختصر الفاظ میں واضح فرمایا کہ اس کے لئے ہمیں سیرت النبیؐ کی طرف پلٹنا ہو گا اور اس کی

ورق گردانی کرنا ہوگی۔

غلبۂ اسلام کا کام جیسے دورِ اوّل میں ہوا ویسے ہی اب بھی ہوگا۔ سیرت کا مطالعہ کریں تو انقلاب کے ضمن میں چھ ادوار ہیں جو ہمیں واضح طور پر نظر آتے ہیں جو مختصراً یہ ہیں۔

(۱) دعوت...... آپ نے توحید و رسالت و معاد پر ایمان کی دعوت دی اور لوگوں کو پکارا۔

(۲) تنظیم...... جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے آپ کے گرد جمع ہوئے آپ نے ان کی تنظیم فرمائی، منظم فرمایا اور سمع و طاعت کی تربیت دی۔

(۳) تربیت...... دعوت و تنظیم کے بعد آپ نے اس خاص اسلامی انقلاب کی مناسبت سے اصحاب کی تربیت فرمائی۔ صاف ظاہر ہے جیسا کسی سے کام لینا ہو ویسی ہی تربیت درکار ہے اس کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ ان تین مرحلوں دعوت تنظیم تربیت کے نتیجے میں ایک مضبوط پارٹی ... حزب اللہ وجود میں آئی۔

(۴) صبرِ محض...... چوتھا مرحلہ صبر اور برداشت کرنے کا ہے کہ جو مشکل اور تکلیف آئے اسے خندہ پیشانی سے برداشت کرو اور جواب مت دو۔ ماریں کھاؤ، ہاتھ مت اٹھاؤ وجہ یہ ہے کہ شروع میں انقلابیوں کی تعداد کم ہوتی ہے اگر وہ اسی ابتدائی سٹیج پر جوابی کارروائی کرنا شروع کر دیں تو ظالم نظامِ باطل کو اخلاقی جواز مل جائے گا وہ انہیں کچل کر رکھ دے گا اسی لئے حکم ہے "کُفُّوْا اَیْدِیَکُمْ" اب جو زیادتی ہو رہی ہے وہ بغیر اخلاقی جواز کے ہو رہی ہے لہٰذا دیکھنے سننے والے اندر ہی اندر مسلمانوں سے متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں اور خاموش اکثریت (SILENT MAJORITY) جو خاموش ہوتی ہے اندھی بہری نہیں ہوتی تاثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

(۵) اقدام...... جب معقول قوت فراہم ہو جائے تو باطل نظام کی کسی دکھتی رگ کو چھیڑ دو کرے گا جس کے نتیجے میں باطل اپنی پوری قوت اور شان و شوکت سے وار کرے گا۔ اور اس کے اگلے مرحلے کے طور پر

(۶) مسلح تصادم...... مسلح تصادم ہوگا جیسے بدر سے لے کر خندق تک ہوا اور بالآخر کل ۶ سال کے اس مسلح تصادم کے نتیجے میں اسلام غالب ہو گیا۔ اصلاً اس چھٹے مرحلے کے بعد ساتواں مرحلہ ہے تخت یا تختہ۔ چونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبیؐ تھے، رسولؐ تھے لہٰذ

چوتھا مرحلہ شروع کرتے وقت اللہ تعالیٰ سے مکمل رہنمائی کے نتیجے میں کوئی غلطی کاامکان نہیں تھااس لئے کامیابی یقینی تھی۔ مگراب جب کہ کوئی نبی نہیں رسول نہیں تمام غیر نبی ہیں جن کا اللہ سے ہم کلامی اور وحی کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے تمام تر خلوص اور تقویٰ کے باوجود غلطی کاامکان موجود رہے گا۔ تاہم اگر صحیح اور بروقت فیصلہ کر لیا گیاتو کامیابی کاوعدہ اللہ کی طرف سے موجود ہے۔ نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ

....

تقریر کے اختتام پر پرنسپل صاحب شکریہ کے کلمات ادا فرمارہے تھے اور اس بابرکت محفل کے برخاست ہونے کااعلان کر چکے تو طلبا کے لئے بقیہ کلاسوں کی چھٹی کااعلان کر دیا گیا۔

چائے سے فراغت کے بعد سٹاف روم میں موجود اساتذہ کے ساتھ ایک نشست میں ڈاکٹر صاحب نے سوالات کے جوابات دیئے۔ وقت زیادہ ہو چکا تھا لہٰذا یہ محفل بہت مختصر رہی۔ اختتام پر پرنسپل صاحب اور دیگر سٹاف ممبران نے مہمانانِ گرامی کو پرجوش الوداع کہا اگرچہ ماحول کی کیفیت کچھ اس سے مختلف نہ تھی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

بعدازاں ڈاکٹر صاحب حسب پروگرام رفقاء کی معیت میں جھنگ سٹی میں واقع جناب آفتاب اقبال صاحب کے ہاں تشریف لے گئے جہاں سب احباب نے دوپہر کا کھانا تناول فرمایا احباب کے سوالوں کے جواب دیئے اور بالآخر ۳۰ - ۲ بجے دوپہر جھنگ میں مختصر قیام کے بعد یہ قافلہ واپس عازم لاہور ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس پروگرام کو کالج کے سٹاف اور پرنسپل صاحب نے تو پوری دلجمعی اور تندہی سے کامیاب کرایا۔ دیگر احباب میں جناب رحیم صدیقی صاحب اور آفتاب اقبال صاحب نے قابل قدر محنت کی۔ جھنگ کے علاوہ ملتان سے بھی جناب سعید ہٹہ صاحب' چودھری شفیع صاحب' جناب اقبال صاحب اس پروگرام میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ ان تمام حضرات کا جنھوں نے دامے درمے سخنے اس کارخیر میں حصہ لیا ان سب کا شکریہ ادا نہ کرنا احسان فراموشی ہو گی۔

——— (۲) ———

انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں امیر تنظیم اسلامی کا خطاب

"انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور" طلبہ تنظیم اسلامی کے مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں رفقاء کی تعداد اٹھائیس (۲۸) ہے۔ یونیورسٹی کو دو اُسروں میں تقسیم کرنے کے بعد انتظامی ضرورت کے تحت مزید چار حلقوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ یہاں تنظیم کے لٹریچر اور کیسٹوں پر مشتمل دو لائبریریاں قائم ہیں۔ الحمد للہ یونیورسٹی میں تنظیم کی دعوت کافی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ سینکڑوں طلبہ تک اسلام کی انقلابی دعوت پہنچ چکی ہے۔

طلبہ تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے مختلف ہوسٹلز میں چار ہفتہ وار دروسِ قرآن عرصہ ایک سال سے باقاعدگی کے ساتھ منعقد ہو رہے ہیں۔ (جبکہ یہ اعزاز کسی دوسری تنظیم کو حاصل نہیں) نارمل حالات میں دروس میں طلبہ کی حاضری تیس سے پینتیس تک ہوتی ہے۔

کافی عرصہ سے یونیورسٹی رفقاء کی خواہش تھی کہ امیر محترم سے ملاقات کی جائے' بالآخر میاں نعیم صاحب (ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی) کی وساطت سے ۳۰ اکتوبر کا دن ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کیلئے طے پایا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات بڑی خوش کن رہی۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رفقاء نے ڈاکٹر صاحب کو یونیورسٹی میں خطاب کرنے کا دیرینہ مطالبہ داغ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال شفقت کے ساتھ اس دعوت کو قبول فرمایا۔ تاریخ ۲ نومبر (بعد نمازِ عشاء) طے پائی۔ خطاب کی دعوت و انتظامات کیلئے ہمارے پاس تقریباً دو دن تھے' جبکہ پندرہ ہوسٹلز میں مقیم تقریباً پانچ ہزار طلبہ ہمارے پیش نظر تھے۔ گویا وقت کم اور مقابلہ سخت تھا' لیکن تمام رفقاء نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا اور اپنے آپ کو اس خطاب کے انتظامات کیلئے کھپا دیا۔ دوسری تنظیموں کے غیر ذمہ دارانہ رویّوں کی وجہ سے یونیورسٹی انتظامیہ کافی محتاط ہو چکی ہے' لہٰذا قدم قدم پر مشکلات کا سامنا تھا۔ لیکن اللہ کے فضل سے ہر کام خوش اسلوبی کے ساتھ طے پاتا گیا۔

ہر رفیق "فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ" کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا نظر آتا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ غلط تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے غلط استعمال نے نوجوانوں کو اپنے دین ومذہب

سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ اللہ کے یہ داعی ہوسٹل کے ہر کمرے میں جا کر قرآن کی دعوت پہنچا رہے تھے۔ تھکن اور بے آرامی کے باوصف ایک ہی جذبہ کارفرما تھا کہ کس طرح قرآن کا انقلابی پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ جائے۔ اللہ کا دین سب سے سربلند ہو جائے۔ پروفیسر صاحبان کیلئے خصوصی دعوتی کارڈ چھپوائے گئے۔ شعبۂ علوم اسلامیہ کے چیئرمین پروفیسر عبدالحفیظ صاحب نے اس اجتماع کی صدارت قبول فرمائی۔ ۲۔ نومبر کی شب 'رفقاء کے چہرے مسرت سے دمک رہے تھے۔ ملٹی پرپز ہال (MULTI-PURPOSE HALL) جو کہ یونیورسٹی کا سب سے وسیع اور خوبصورت ہال ہے۔ قرینے کے ساتھ سجایا گیا تھا۔ سٹیج پر لگا ہوا بینر هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ "جہاں نبی کریمؐ کا مقصدِ بعثت متعین کر رہا تھا۔ وہاں امت محمدیہؐ کو جہدِ مسلسل کی دعوت بھی دے رہا تھا۔

قائد تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد بروقت ہال میں تشریف لے آئے۔ تلاوتِ قرآن پاک سے تقریب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد راقم (ناظم طلبہ تنظیم اسلامی انجینئرنگ یونیورسٹی) نے ڈاکٹر صاحب اور طلبہ تنظیم کا مختصر تعارف کروایا۔ پروفیسر عبدالحفیظ صاحب نے اپنے مختصر خطاب میں طلبہ کی توجہ قرآن مجید کے حقوق کی طرف مبذول کرائی۔ ہال میں موجود تمام کرسیاں پُر ہو چکی تھیں اور بیچ کی خالی جگہیں کھڑے ہوئے طلبہ سے پر ہو رہی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب تقریباً دو سال کے عرصے کے بعد یونیورسٹی میں تشریف لائے تھے۔ اپنے خطاب کے آغاز میں فرمایا کہ جو لمحات نوجوانوں کے ساتھ گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ میرے لئے نہایت مسرت بخش اور خوش کن ہوتے ہیں۔ آج کی نشست کا موضوع "قرآن۔ خدا کا آخری پیغام" درحقیقت علامہ اقبال مرحوم کے ایک شعر ؎

نوعِ انسان را پیامِ آخرین   حامل او رحمۃٌ للعالمین!!

سے مستعار لیا گیا ہے۔ موضوع سامنے آتے ہی کچھ بنیادی نوعیت کے سوالات ذہن میں اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے پیغام سے کیا مراد ہے؟ اور یہ آخری پیغام کیوں ہے؟

ڈاکٹر صاحب نے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو طرح کے علوم سے سرفراز فرمایا ہے۔ ان میں سے ایک علم کو ہم "تجرباتی علوم" کا نام دے لیتے ہیں۔ اس علم کی بنیاد انسان کے حواس پر ہے۔ یہ وہ علم ہے جس کے حصول کیلئے بنیادی استعداد انسان کے اندر پیدائشی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔ یہ علم بتدریج آگے بڑھ رہا ہے۔

ں طرح آم کی گٹھلی میں پتے، شاخیں اور پھول بالقوہ موجود ہوتے ہیں۔ بالکل یہی مثال اس
ہ کی ہے۔ اس علم کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّهَا
(ترجمہ..... اور علم دے دیا اللہ نے حضرت آدمؑ کو کل چیزوں کے اسماء کا)

دوسری قسم کے علم کا تعلق انسان کی اپنی ذات اور اس کائنات سے متعلق ہے۔ انسان
ں کائنات کی کلی حقیقت جاننا چاہتا ہے۔ میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں وغیرہ جیسے
سوال ہر دور میں انسان کے ذہن میں اٹھتے رہے ہیں۔ اس غور و فکر کے نتیجے میں فلسفیانہ علوم
پیدا ہوئے۔ گویا انسان محض "تجرباتی علوم" ہی کا محتاج نہ تھا۔ نظری و فکری علوم بھی آغاز ہی
سے انسان کی ضرورت رہے ہیں۔ اس علم کی عظیم حقیقت کا بیان سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع
میں ہے۔ جب حضرت آدمؑ کو کرّمنا کا تاج پہنا دیا گیا تو ساتھ ہی ہدایت کر دی گئی۔

فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ هُدًی فَمَنۡ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ

(ترجمہ۔ پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت۔ سو جو
شخص پیروی کرے گا میری ہدایت کی تو ان پر نہ کچھ اندیشہ ہو گا اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں
گے)

طلبہ کو غالباً پہلی مرتبہ تاریخ فلسفہ کے حوالے سے قرآن کو سمجھنے کا موقع میسر آیا تھا۔
لہٰذا سب حاضرین ہمہ تن گوش ہو کر تقریر سن رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کے ایک
اور گوشے پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق کے ساتھ ہی دو قافلوں نے بیک
وقت سفر شروع کیا۔ ایک "قافلۂ نبوت" اور دوسرا "قافلۂ انسانیت" قافلہ نبوت کے
ذریعے انسان کو اللہ کی جانب سے وقتاً فوقتاً ہدایت پہنچتی رہی۔ یہاں تک کہ یہ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر اپنی تکمیلی شان حاصل کر گیا۔ گویا ہدایت آپؐ پر پہنچ کر
"الھدیٰ" بن گئی۔ اللہ نے اس ہدایت کو کامل، دائمی بنا کر اس کی حفاظت کا ذمہ لے
لیا۔ تمام اساتذہ اور طلبہ ڈاکٹر صاحب کے مدلّل اور مربوط خطاب میں اپنی ذہنی الجھنیں دور
ہوتی ہوئی محسوس کر رہے تھے۔

موضوع کے آخری حصے کی طرف آتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "قرآن کا
آخری پیغام" ہونا ارتقاء انسانی کے حوالے سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ بنیادی طور پر نوعِ
انسانی کا ارتقاء تین گوشوں میں ہوا۔ پہلا ارتقاء سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں ہوا۔ یہ

ارتقاء آج اپنے عروج پر ہے۔ اس ارتقاء کے حوالے سے قرآن کے "پیغام آخر" ہونے کا ایک پہلو قابل توجہ ہے۔ علوم طبیعیہ کی وسعت و ترقی کے ساتھ ذرائعِ ابلاغ (MEANS OF COMMUNICATION) کا ارتقاء ہوا۔ اس پہلو سے انسان اب اس مقام تک پہنچ چکا تھا کہ ایک آخری پیغام اس کے ہاتھ میں تھما دیا جائے۔ پہلے یہ اس لئے ممکن نہ تھا کہ انبیاء کسی خاص قوم کی طرف مبعوث کئے جاتے تھے۔ ان کا خطاب "اے میری قوم" سے شروع ہوتا تھا، لیکن حضورؐ کو تمام انسانیت کیلئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ قرآن تمام انسانیت کو "اے لوگو!!" کے عنوان سے مخاطب کرتا ہے۔ اس دور میں فاصلے سکڑ گئے ہیں اور اب ایک نبی کی دعوت پوری نوعِ انسانی تک پہنچانا عملاً ممکن ہے۔

دوسرا ارتقاء فلسفیانہ سوچ کے میدان میں ہوا۔ تاریخ فلسفہ کے اکثر ماہرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال (چھ سو قبل از مسیح اور چھ سو بعد از مسیح) فلسفیانہ غور و فکر کے اعتبار سے بہت اہم اور تخلیقی (PRODUCTIVE) تھے۔ اس دور میں افلاطون، ارسطو، زرتشت اور گوتم بدھ جیسے عظیم فلاسفر پیدا ہوئے اور آج بھی ان کے نظریات کو فکر انسانی میں بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ موجودہ دور کے تمام فلسفے اور تمام نظریات درحقیقت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ تمام فلسفے ان بارہ سو سالوں کے دوران منصۂ شہود پر آچکے تھے، جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ گویا انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا وہ بعثت محمدیؐ سے قبل سوچ چکا تھا۔ اور اب ضرورت تھی کہ انسان کو ایک ہدایتِ کلی (قرآن) سے سرفراز کر دیا جائے اور مکمل ہدایت نامہ اور مکمل فکری غذا انسان کے ہاتھ میں تھما دی جائے۔

تیسرا ارتقاء "تہذیب و تمدن" کے شعبہ میں ہوا۔ انسانی تمدن کا ارتقاء غاروں، قبیلوں اور ریاستوں سے ہوتا ہوا بالآخر قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں اور شہنشاہیت تک جا پہنچا۔ اس میدان میں بھی انسانی سوچ حضورؐ کی بعثت سے قبل بلوغت کی حد کو چھو رہی تھی۔ لہٰذا اس میدان میں بھی اصولی ہدایات دینے کے بعد سلسلۂ پیغام خداوندی کو قرآن کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔

رات کافی گذر چکی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کا خطاب دلوں کو قرآن کے نور سے منور کر رہا تھا۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اب ضرورت ہے کہ ہم اس کامل ترین پیغام، قرآن کو تمام دنیا کے سامنے عملی صورت میں پیش کریں اور اسلام کے ابدی اصولوں کی بنیاد پر ایک معاشرہ بالفعل قائم کر کے دکھائیں، لیکن اس کیلئے شدید محنت درکار ہوگی۔ ضرورت اس

ت کی ہے کہ ہم قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے دردمندی
ے ساتھ فرمایا کہ جن طلبہ کو ناظرہ قرآن نہیں پڑھنا آتا وہ جلد از جلد اس کی طرف متوجہ ہوں
جنہیں پڑھنا آتا ہے، وہ قرآن پر غور و تدبر کیلئے کمر کس لیں۔ اتنی عربی ہر طالب علم کو
نی چاہئے کہ جب وہ قرآن پڑھے تو اس کا براہ راست مفہوم سمجھتا جائے اور اس کے
ات کو اپنے قلب پر محسوس کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے
مایا کہ تنظیم کی جانب سے عربی سکھانے کیلئے ہر ممکن تعاون کیا جائے گا۔ دعا کے ساتھ یہ
روقار تقریب اختتام پذیر ہوئی اور طلبہ و حاضرین قرآن کی عظمت کا نقش دلوں میں لئے وہاں
سے رخصت ہوئے۔

مرتب: اکرام اللہ
(ناظم طلبہ تنظیم اسلامی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور)

(۳)

نیشنل کالج آف ٹیکسٹائل انجینئرنگ فیصل آباد میں رفقاء تنظیم اسلامی کی دعوتی سرگرمیاں

ہمارے کالج میں طلباء کی کل تعداد دو سو کے لگ بھگ ہے اور راقم کے علاوہ چند دیگر رفقائے تنظیم بھی اس کالج کے طالب علم ہیں۔ جناب بھائی غلام اصغر صدیقی (سال چہارم) نے قریباً دو سال قبل یہاں پر تنہا دعوت و تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا۔ الحمد للہ اب ان کے گرد و پیش رفقائے تنظیم اور معاونین کا ایک معقول حلقہ موجود ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ حلقہ وسعت پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کو ہمیشہ حق کا داعی بنائے رکھے اور ثابت قدم رکھے۔ ہمارے رفقاء میں سے تقریباً ۷۰ فیصد فعال طور پر دعوتی اور تنظیمی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔

یوں تو ایک بندۂ مومن ہر پل ہی اپنے قول یا عمل سے دوسروں کو دعوتِ حق دیتا ہے، لیکن دعوت دین کے لئے باقاعدہ منظم جدوجہد کرنا بھی ہر مسلمان کا فرض ہے۔ چنانچہ ہم بھی مختلف طریقوں اور پروگراموں کے ذریعے لوگوں کو حق کی جانب پیش قدمی کی دعوت دیتے ہیں۔

ہم نے یہاں ہفتہ وار درس قرآن کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب ہر ہفتہ کو نماز عصر کے بعد "منتخب نصاب" سے اپنے مخصوص علمی و فکری انداز میں

درس قرآن دیتے ہیں۔ حاضری ۱۰ سے ۱۵ تک رہتی ہے۔ درس کی حاضری بہتر بنانے ا
توسیع دعوت کے لئے ہم نے ایک ہینڈ بل چھپوا کر اپنی قریبی بستی مانانوالہ کے علاوہ سٹیم یا
اسٹیشن اور گٹی گرڈ اسٹیشن کی مساجد میں بھی خاصی تعداد میں تقسیم کیا ہے۔ ہینڈ بل تقسیم کر
میں کچھ دوستوں نے ہم سے جس طرح بھرپور تعاون کیا اور خود ہمارے ساتھ مختلف مساجد
گئے، میں ان کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔
کالج میں لائبریری کے باہر جو بلیک بورڈ بنے ہوئے ہیں ان کا بھی خوب استعمال کیا
ہے اور اصغر صدیقی بھائی (ناظم پنجاب) اکثر ان پر آیات قرآنی مع ترجمہ اور علامہ اقبال
اشعار لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ کام ہاسٹل کے نوٹس بورڈ سے بھی لیا جاتا ہے۔ مثال کے ط
پر پنجاب کے سیلاب اور پھر حیدر آباد کے سانحہ کے بعد "پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریوں
لے کر حیدر آباد اور کراچی کی قیامت صغریٰ تک" کی سرخی کے تحت طلباء کو ان کی ذ
داریوں کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی۔
گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے ایک سو طلباء کو "میثاق" کے پرچے بذریعہ ڈاک
ارسال کروائے اور چھٹیوں کے بعد ایک سروے رپورٹ تیار کی۔ سروے رپورٹ میں مندر
ذیل سوالات پوچھے گئے:

۱ - کیا آپ کو چھٹیوں کے دوران "میثاق" باقاعدگی سے ملتا رہا؟
۲ - کیا آپ نے ہر میثاق کے تقریباً چالیس فیصد صفحات کا مطالعہ کیا؟
۳ - کیا آئندہ بھی آپ خود "میثاق" کے خریدار رہنا چاہتے ہیں یا دوستوں سے لے کر
مطالعہ کرنا چاہتے ہیں؟
۴ - کیا آپ نے رعایتی قیمت کے حساب سے "میثاق" کی ادائیگی کر دی ہے؟۔

اس رپورٹ کے بڑے حوصلہ افزاء نتائج بر آمد ہوئے۔ اور اب بھی ہر ماہ کالج میں
"میثاق" کے تقریباً ساٹھ پرچے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے "ندا" کے تقریباً پندرہ
پرچے بھی آرہے ہیں جس سے طلباء میں دین کی طرف رغبت کے علاوہ سیاسی شعور بھی پیدا ہو
رہا ہے۔ "ندا" کی خریداری کے لئے ہم نے تین تین طلباء کے گروپ بنائے ہوئے ہیں تاکہ
ان پر زیادہ معاشی بوجھ بھی نہ ہو۔ اس طرح ۱۵ پرچوں سے تقریباً ۴۵ طلباء استفادہ کر رہے
ہیں اور ایک دو حضرات تو اکیلے ہی خرید رہے ہیں۔
نمازِ عشاء کے بعد تذکر بالقرآن کے حوالے سے ہم نے ایک پروگرام شروع کر رکھا

ہے۔ جس میں اصغر صدیقی بھائی دس منٹ کے لئے درس قرآن دیتے ہیں۔ اس میں اکثر تین
ر رفقاء شرکت کرتے ہیں اور کبھی کبھار کوئی دوسرا ساتھی بھی ہمارے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔
یکم اکتوبر کو نماز عصر کے بعد ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن تھا۔ اسی روز
از مغرب کے بعد رفیق محترم محمد شریف عثمانی صاحب کا درس قرآن رکھا گیا تھا۔ اگرچہ وہ
ر تاخیر سے پہنچے، لیکن یہ پروگرام نہایت اچھا رہا۔ عثمانی صاحب نے سورۃ النور کا درس دینا
اور سورۃ النور سال چہارم کے کورس میں شامل تھی جس کا امتحان چند روز بعد ہونے والا تھا،
ں لئے حاضری خاصی تھی۔ سال چہارم کے تقریباً ۲۵ طلباء نے شرکت کی۔ عثمانی صاحب
پنے مخصوص شگفتہ لہجے میں درس دیتے جا رہے تھے اور طلباء سننے کے ساتھ ساتھ نوٹ بھی
رتے جا رہے تھے اور ایک ساتھی تو باقاعدہ کیسٹ پر ریکارڈ کر رہے تھے۔ اس سورۃ کے ضمن
ں آپ نے بعض فقہی مسائل پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ یہ پروگرام ۳۰-۷ سے لے کر
ات ۱۰ بجے تک جاری رہا۔
۲- اکتوبر کو رات نو بجے "اسلام کا معاشی نظام" کے موضوع پر امیر حلقہ وسطی
باب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا خطاب تھا۔ یہ عنوان بھی سال چہارم کے سلیبس میں سے
اور اگلے روز اس کا پیپر بھی تھا، اس لئے حاضری بہت اچھی رہی۔ اس خطاب میں چونکہ بعض
یسے حضرات بھی شرکت کر رہے تھے جو ہمارے ہفتہ وار درس قرآن میں پہلے شریک نہیں
تے رہے، اس لئے اصغر صدیقی بھائی نے پہلے ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا تفصیلی تعارف کرانا
اسب سمجھا۔ اس کے بعد راقم نے "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں سے چند اشعار پڑھ کر
ائے" جن کے مطالب کی وضاحت محترم ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔ یہ پروگرام بھی ایک
اتھی نے ریکارڈ کیا اور تقریباً ۱۰ بجے رات یہ محفل اختتام پذیر ہوئی۔

امتحانات کے سلسلے میں ہم نے سالِ چہارم کے سلیبس میں شامل احادیث پر بھی
س رکھا ہوا تھا۔ یہ درس چند روز کے بعد امیر تنظیم اسلامی فیصل آباد چوہدری رحمت اللہ بٹر
حب نے دیا۔ احادیث "امارت" کے موضوع پر تھیں۔ اس میں بھی حاضری اچھی خاصی
ا۔ لاہور سے محمد غوری صدیقی صاحب بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ درس کے بعد کھانے
دوران آپ نے نظم کی اہمیت کے متعلق رفقاء سے بڑی مؤثر گفتگو کی۔
سال چہارم کے امتحانات کے بعد ۱۸/ اکتوبر سے سال سوم کے امتحانات کا آغاز ہو رہا
۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر ایسے ہی پروگرام ترتیب دیئے گئے۔ اس سلسلے میں محمد شریف عثمانی

صاحب نے سورۃ النساء کی آیات پر مشتمل درس دیا۔ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے "حقیقتِ جہاد" کے موضوع پر خطاب کیا اور چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب نے سال سوم کے سلیبس میں شامل احادیث پر درس دیا۔ ان سب پروگراموں میں حاضری ۲۰ سے ۳۰ تک ہوتی تھی۔

۲۳ر اکتوبر کو ہاسٹل میں "فلسفۂ شہادت" کے موضوع پر امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا خطاب بذریعہ ویڈیو دکھایا گیا۔ حاضری ۱۵ تھی۔ یہ خطاب فیصل آباد ہی میں تنظیم اسلامی حلقہ وسطی پنجاب کے علاقائی اجتماع منعقدہ جولائی میں ہوا تھا۔ یہی خطاب محترم دوست منیر احمد صاحب نے اپنے گاؤں "باگیوالہ" میں بھی دکھایا تھا۔ منیر بھائی اسلامی جمعیت طلبہ کے سرگرم کارکن ہیں۔

۲۹ر اکتوبر کو "طلبائے تنظیم اسلامی" کے پہلے آل پاکستان کنونشن کی کارروائی بذریعہ ویڈیو دکھائی گئی۔ اس پروگرام میں تقریباً ۱۵ طلباء نے شرکت کی۔ چونکہ ان دنوں سال سوم کے امتحانات ہو رہے تھے' اس لئے یہ کارروائی کچھ روز کے بعد دوبارہ دکھائی گئی جس میں ۱۰ طلباء شریک ہوئے۔

جمعہ ۲۸ر اکتوبر کو ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ماہانہ درس قرآن تھا۔ ٹیکسٹائل کالج سے ہم نے سوزوکی کا انتظام کر رکھا تھا لیکن طلباء زیادہ تعداد کے باعث ایک سوزوکی میں نہ سما سکے اور باقی حضرات کو دوسرے ذرائع سے ڈسٹرکٹ کونسل ہال پہنچنا پڑا۔ کالج سے شرکت کرنے والوں کی کل تعداد ۲۴ تھی۔

امیر محترم نے سورۂ لقمان کی روشنی میں حکمتِ قرآنی کی اساسات کو واضح کیا۔ آپ نے بتایا کہ کس طرح سے ایک سلیم الفطرت انسان عقلِ صحیح کی رہنمائی میں حقیقت کو پا سکتا ہے اور عقل ارتقاء کی منازل طے کرتی ہوئی وحی کے بغیر بھی توحید تک پہنچ سکتی ہے' بشرطیکہ فطرت مسخ نہ ہوئی ہو۔ فطرت سلیمہ کا منطقی نتیجہ شکر ہے۔ اور عقل سلیم منعم حقیقی کو پہچانتی ہے اور اصل شکر اسی کا ادا کرتی ہے۔ عقلِ ناقص کی بدولت انسان کبھی سورج' کبھی آگ' اور کبھی پانی کو پوجتا ہے۔ لیکن عقلِ سلیم رکھنے والا انسان اپنے محسنِ حقیقی اور مسبب الاسباب تک رسائی حاصل کرتا ہے اور ان درمیانی اسباب میں ہی بھٹکتا نہیں رہتا۔

آپ نے فرمایا کہ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے اس میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جب نظامِ دین کی بات ہو گی تو اللہ کے شکر کے بعد رسولؐ کا ذکر آئے گا لیکن

جب حکمتِ دین کی بات ہو گی تو اللہ کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر آئے گا۔ کیونکہ اگرچہ اصل رب تو اللہ ہی ہے لیکن انسان کی پرورش میں کار فرما دنیوی عناصر میں سے والدین اور خصوصاً والدہ کے احسانات سب سے زیادہ ہیں۔ اس لئے یہاں پر اللہ کے شکر کے بعد والدین کے شکر کا ذکر ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ اگر والدین کوئی ایسا حکم دیں جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو تو اطاعت لازم نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مزید فرمایا کہ انسان میں نیکی اور بدی کا شعور ودیعت شدہ ہے۔ اب عقل اس کے نتیجے میں آخرت تک رہنمائی کرتی ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ اس نیکی اور بدی کے بدلے میں جزاء اور سزا بھی ناگزیر ہے جب کہ اس دنیا میں نہ کسی کو اس کی نیکی کا مکمل صلہ ملتا ہے اور نہ ہی برائی کے برابر سزا بھی ممکن ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ کوئی جہان اور بھی ہو جہاں پر اس نیکی اور بدی کی مکمل جزا اور سزا مل سکے۔

امیر محترم کے درس کے بعد ہم نے طلباء میں کتابچہ "طلبہ کے مسائل اور ان کا حل" اور طلبائے تنظیم اسلامی کا منشور تقسیم کیا۔ اور ان سے گذارش کی کہ ہمیں اپنے ایڈریس دیئے جائیں تاکہ بعد میں رابطہ ممکن ہو سکے۔ یہاں پر ۹۰ کتابچے تقسیم ہوئے اور ہمیں تقریباً ۷۵ طلباء کے ایڈریس موصول ہوئے۔

درس کے بعد ڈسٹرکٹ کونسل ہال کی مسجد میں سوال و جواب کی نشست ہوئی جس میں امیر محترم نے لوگوں کے سوالات کے جوابات دیئے۔ اس نشست کے بعد امیر محترم اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کے ہمراہ لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ میں اور زاہد بھائی امیر محترم کے ساتھ ہی اپنے کالج تک آئے اور کالج گیٹ کے سامنے ہم نے امیر محترم اور محترم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب کو الوداع کہا۔

———— (۴) ————

علاقائی اجتماع حلقہ وسطی پنجاب کی رپورٹ

گذشتہ جولائی کی ۲۹ / تاریخ کو فیصل آباد کے علاقائی اجتماع میں جب یہ طے ہوا کہ اکتوبر کی انیس تا اکیس کو گجرات میں ایک بار پھر حلقہ وسطی پنجاب کے رفقاء اکٹھے ہوں گے تو کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ پلوں کے نیچے سے اس قدر پانی بہہ چکا ہو گا اور اکتوبر کی یہ تاریخیں انتخابی گہما گہمی اور کھینچا تانی سے مملو ہوں گی۔

چنانچہ ۱۹ر اکتوبر بدھ کی شام کو جب راقم الحروف گجرات پہنچا تو شہر بھر میں سیاست گویا ابل رہی تھی۔ ہمارے دفتر کے قریب ہی مسلم لیگ ہاؤس میں مسلم لیگ والوں کا جلسہ تھا اور وسیع عمارت لوگوں سے پٹی پڑی تھی۔ اُدھر شہر کے کسی دوسرے کونے میں پیپلز پارٹی کے جیالے بھی جمع ہو رہے تھے کاروں میں نصب رواں دواں لاؤڈ سپیکروں سے بلند آہنگ اعلانات ہو رہے تھے۔ پورا شہر انتخابی بینروں اور جہازی سائز اشتہاروں سے کسی نمائش گاہ کا سماں پیش کرتا تھا۔ انہی جہازی سائز اشتہاروں میں تنظیم اسلامی کے ننھے منے اشتہار بھی یہاں وہاں چشمک زنی کر رہے تھے اور لمبے چوڑے انتخابی وعدوں کے نقار خانے میں تنظیم اسلامی کا طوطی بھی صدا لگا رہا تھا کہ آج رات بعد نماز عشاء مفکر اسلام جناب ڈاکٹر اسرار احمد عوام سے سیرۃ النبی کے انقلابی پہلو کے موضوع پر خطاب فرمائیں گے۔

دراصل یہ سہ روزہ تربیتی اجتماع ۱۹ر اکتوبر کو دس بجے قبل دوپہر ہی جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کے پرلطف درس قرآن سے شروع ہو چکا تھا اور گجرات کے ناظم جناب شمس الحق اعوان رفقاء کو نظم و ضبط اور اجتماع کی باریکیوں پر لیکچر پلا چکے تھے اور اب عشاء کی نماز کے بعد امیر محترم عوام سے خطاب فرمانے والے تھے۔ دارہ بلوچاں میں واقع تنظیم اسلامی کے دفتر کے عین سامنے کشادہ شاہراہ پر ایک تنگ سا راستہ گزر گاہ کے طور پر چھوڑ کر شامیانے لگے تھے۔ دریاں بچھی تھیں۔ ننھا سا سٹیج بنا تھا۔ یہ تھا وہ پنڈال جہاں سے داعیٔ انقلابِ اسلامی اہالیانِ گجرات کو مخاطب کرنے والے تھے۔

عشاء کی نماز کے بعد رفقاء پنڈال میں جمع ہوئے اکا دکا لوگ بھی آنے شروع ہوئے۔ گجرات جیسے پر از سیاست شہر پر انتخابی گہما گہمی مزید براں شہر میں انتخابی جلسے...... ایسے میں سیرۃ النبی کے انقلابی پہلو پر داعیٔ انقلاب کی تقریر سننے کون آتا؟ لیکن نہیں "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" ابھی اس مٹی میں کسی قدر نمی موجود ہے۔ چند صد لوگ انتخابی دھوم دھڑکے کے بھنور سے مثل حباب ابھرے اور تنظیم اسلامی کا پنڈال بھر گیا۔

کوئی ساڑھے آٹھ بجے امیر محترم کا خطاب شروع ہوا فصاحت و بلاغت کا چشمۂ صافی پھوٹ بہا... موضوع سیرۃ مطہرہ تھا لیکن ڈاکٹر صاحب محترم نے بات انتخابات کے انعقاد سے شروع کی اور فرمایا کہ اگرچہ میں نے اور میری جماعت نے انتخابی سیاست کو نہ اپنانے کا تہیہ کر رکھا ہے لیکن انتخابات ہوتے رہنے چاہئیں کہ اس کے دو فائدے ہیں ایک منفی یعنی یہ کہ

انتخابات میں لوگوں کے دلوں کی بھڑاس نکلتی رہتی ہے اور اندر ہی اندر یہ ناسور نہیں بنتی اس
طرح الیکشن گویا سیفٹی والو کا کام کرتے ہیں دوسرا فائدہ مثبت ہے کہ حکومت کو چلانے کے لئے
بہتر ہاتھ دستیاب ہوتے رہتے ہیں..... تاہم انتخابات کے ذریعے اسلام ہرگز نہیں آسکتا۔
اگر اسلام کی برکات کے سائے میں آکر دنیا و دین دونوں کی بھلائی چاہتے ہو تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کا انقلابی اسوہ اختیار کرو..... کہ یہی ایک فلاح کی راہ ہے۔ اب امیر محترم نے سیرۃ
مطہرہ کے حوالے سے پورا فلسفۂ انقلاب پیش فرمایا۔ یہ وعظ دلپذیر دو گھنٹے تک جاری رہا اور
باشندگان گجرات نے دلچسپی اور جمعی سے سنا۔ کاش ربِ عزّوجل لوگوں کے دلوں کو پھیر دیں اور
وہ اسلامی انقلاب کی راہ پر چل نکلیں۔

۲۰ اکتوبر جمعرات کو فجر کی نماز کے بعد سوال و جواب کی نشست تھی لیکن اس ایک گھنٹہ
میں کوئی "متعلق اور مربوط" سوال سامنے نہیں آسکا۔ تاہم بعض سوالوں کے سلسلہ میں امیرِ
محترم کی طرف سے مفید باتیں سامنے آئیں۔ ناشتہ کے بعد رفقاء نو بجے پھر جمع ہوئے اور
ساڑھے دس بجے تک ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی جناب میاں محمد نعیم صاحب نے نظم جماعت پر
اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ ٹھیک گیارہ بجے محترم ڈاکٹر صاحب پھر تشریف لائے اور ظہر کی
اذان تک رفقاء سے تعارف اور مختصر اظہار خیال کا سلسلہ جاری رہا جس کے اختتام پر نو رفقاء
نے بیعت کی جن میں سے تین نئے رفقاء تھے اللّٰھم زد فزد۔ نماز ظہر کے بعد دوپہر کے کھانے اور
آرام کا وقفہ تھا۔ نماز عصر کے بعد مسجد دارہ بلوچاں میں باقاعدہ کلاس لگی۔ تختۂ سیاہ اور چاک
موجود تھے جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب نے "دینی فرائض کا جامع تصور" کے موضوع پر لیکچر
کا آغاز فرمایا اور تین منزلہ تمثیلی عمارت کا نقشہ تختۂ سیاہ پر کھینچا لیکن اُن کے دل میں نہ جانے کیا
آئی کہ بیان سے دستکش ہوئے اور جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے بیان کا سرا پکڑا اور
لے دوڑے۔ نماز مغرب تک یہ کلاس جاری رہی اور جناب بٹر صاحب نے دینی میدان میں
کام کرنے والی مختلف جماعتوں کا جائزہ بھرپور انداز میں پیش کیا۔

اب شام ہو چکی تھی اور رفقاء نے رات کے کھانے کا اہتمام کیا کہ انہیں جامع مسجد فیصل
گیٹ پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس لئے کہ وہاں امیر محترم کا خطابِ عام تھا۔ یاد رہے کہ یہ مـ
برصغیر کے معروف علامہ جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری کی ہے اور انہوں نے تنظ
اسلامی کی درخواست پر نہایت خوش دلی سے ڈاکٹر صاحب کے خطابِ عام کی اجازت مرحـ
فرمائی تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے کہ ا

ایسے کتنے لوگ اس زوال پذیر معاشرہ میں رہ گئے ہیں؟

یہ بیس اکتوبر کی رات کا آغاز تھا جب ہم عشاء کی نماز کے لئے مقامی رفقاء کی رہنمائی میں جامع مسجد فیصل گیٹ پہنچے۔ اللہ اکبر کیا عالیشان مسجد ہے۔ وسیع' فراخ اور دیدہ زیب...... ہم مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ امیر محترم داخل ہوئے۔ میں نے بڑھ کر جوتے سنبھالنا چاہے تو مزاحاً فرمایا۔ "تم پر اعتماد نہیں تم زیادہ ہی انقلابی ہو"۔ اللہ اللہ! میں زیادہ انقلابی کیوں نہ ہوں جبکہ میں ایسے ماحول میں رہتا ہوں جہاں کمیوں کی عزتِ نفس دن میں کئی بار پامال ہوتی ہے۔ جہاں انسان کی تکریم کا نیلام عام ہر آن ہر گھڑی ہوتا ہے وہی انسان جس کے متعلق اس کے خالق ومالک نے فرمایا "وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ" میرے لئے ایسا کوئی انقلاب قابل قبول نہیں جس میں انسان کی عزتِ نفس کا تحفظ نہ ہو اور میرے لئے اس انقلاب کا انتظار اشد من الموت ہے لیکن میں اس انقلاب کا انتظار قبر میں بھی کروں گا۔ جس دن وہ انقلاب آ گیا میری قبر میں جنت کی کھڑکی کھل جائے گی۔ بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا مسجد کے اندر پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب قبلہ تو ایک بغلی کمرے میں جناب سید صاحب سے ملاقات اور قدرے استراحت کے لئے تشریف لے گئے اور ہم مسجد کی زیب و زینت پر سر دھننے لگے۔

ٹھیک پونے آٹھ بجے تنظیم اسلامی کے امیر اور جماعت توحید و سنت کے سربراہ حجرہ سے برآمد ہوئے۔ جناب سید عنایت اللہ شاہ بخاری کی امامت میں نمازِ عشاء ادا کی گئی۔ محراب کے سامنے سلیقہ سے بنے ہوئے کشادہ سٹیج سے جناب شمس الحق اعوان نے صدارت کے لئے جناب سید صاحب سے درخواست کی جو انھوں نے کمال مہربانی سے منظور فرمالی۔ بعدہ محترم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ اس دن کے موضوع "توحید عملی" پر اپنے خیالاتِ عالیہ کا اظہار فرمائیں تلاوت کلام اللہ سے آغاز پہلے ہی ہو چکا تھا۔

امیر محترم کی تقریر کا آغاز ساڑھے آٹھ بجے شب ہی ممکن ہو سکا۔ اس دوران یہ کشادہ مسجد دور دور تک سامعین سے بھر چکی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتداء میں توحید عملی کے موضوع کو اس طرح پھیلایا کہ مجھے خطرہ ہوا کہ وہ اسے نصف شب سے قبل سمیٹ نہ سکیں گے لیکن لف و نشر کے نشیب و فراز سے آگاہ اس مرد حق نے ڈھائی گھنٹہ میں موضوع کو یوں سمیٹا کہ نہ کوئی گوشہ تشنہ رہا اور نہ کہیں بے جا طوالت نظر آئی۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تعرف الاشیاء باضدادھا" شرک کو سمجھ لیجئے تو توحید سمجھ میں آ جائے گی۔ توحید کا عرفان حاصل کر لیجئے تو شرک کی حقیقت جان لیجئے۔ آپ نے

فرمایا یہ نظری توحید یا توحید فی العقیدہ ہے جو دین کی جڑ اور بنیاد ہے لیکن توحید ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کے ذاتی اعمال و افعال سے لے کر اجتماعی اعمال و افعال تک میں صرف ایک ہی ذاتِ احد کا حکم مانا جائے۔ سیاست ہو یا معیشت...... اقتصاد ہو یا معاشرت...... قانونی مسئلہ ہو یا عائلی الجھن، سرمایہ و محنت کی آویزش ہو یا زراعت و مضاربت کی کشمکش ہر کہیں، ہر حال اور ہر لحہ اللہ ہی کو حکم مانا جائے تو یہ ہو گی توحید عملی یا توحید فی العمل...... اللہ کے حکم یا دین کی بالادستی ہم پر اسی طرح فرض ہے جیسے دوسرے ارکان اسلام اور اظہارِ دین کے اس عمل کے لئے جماعت میں منسلک ہونا اتنا ہی لازم ہے جیسے نماز کے لئے وضو...... پھر اس جماعت کا مناسب قوت جمع کر لینے کے بعد فرض ہے کہ وہ طاغوتی اور باطل قوتوں سے ٹکرا جائے اور اس سلسلہ میں مادّی وسائل و ذرائع کی کمی کو قطعی خاطر میں نہ لائے کہ یہ بھی ایک عملی شرک ہے۔ بس اللہ پر توکل کرتے ہوئے اور امیر کی اطاعت کرتے ہوئے جہاد کا آغاز کر دے اب یا تو اس کے نتیجہ میں دین غالب ہو جائے گا یا پھر جماعت ختم ہو جائے گی...... دونوں راستے فلاح و فوز کی طرف جاتے ہیں...... اس راہ میں ناکامی کا سنگ میل کہیں نہیں آتا۔

دو ڈھائی گھنٹہ کی اس تقریر دلپذیر کے دوران آیات قرآنی اور احادیث نبویؐ اس کثرت سے حوالے کے طور پر آئیں کہ ڈاکٹر صاحب کے تبحرِ علمی پر ہم ایسے عامی تو رہے ایک طرف، چوٹی کے علماء تک وجد میں آ گئے اور اس بات کا اظہار جناب سید عنایت اللہ شاہ صاحب نے اپنی صدارتی، پراثر اور دھیمی اور مختصر تقریر میں برملا فرمایا۔ اللھم زد فزد۔

قریباً گیارہ بجے ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے اجازت طلب فرمائی اور اسی وقت عازم لاہور ہوئے۔

بقیہ: الہدیٰ

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگر دلی محبت کا رشتہ قائم ہو اور اگر ہم حضورؐ کے اتباع کی روش اختیار کریں تو یقیناً ہم ایک دوسرے سے بھی قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ جیسے ایک دائرے کے اندر آپ جتنا بھی مرکزی نقطہ کی طرف آئیں گے اتنا ہی آپس کا فاصلہ بھی کم ہو گا۔ اور جیسے جیسے اس مرکز سے دور ہوتے چلے جائیں گے' ویسے ویسے ایک دوسرے سے بھی فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کے ضمن میں اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ پھر وہی جذبۂ ایمان ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے۔ وہ یقین والا ایمان ' اللہ پر ' اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ' اللہ کی نازل کردہ آخری کتاب ہدایت قرآن مجید پر اور ساتھ ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا جذبہ ابھر آئے تو اتحاد و اشتراک یقیناً پیدا ہو جائے گا۔ جیسے جگر مراد آبادی نے کہا ہے کہ ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ڈاکٹر صاحب...... اسلامی معاشرے میں افواہ پھیلانا کیا قابل تعزیر جرم ہے؟

جواب...... یقیناً اس کے ضمن میں سزائیں معین کی جا سکتی ہیں اور جیسا کہ آپ نے لفظ تعزیر استعمال کیا ہے تو تعزیرات اصل میں انہی اسلامی سزاؤں کو کہتے ہیں جن کو باہمی مشورے سے حالات کے تقاضوں کے تحت ایک اسلامی ریاست خود طے کر لے ' اگرچہ بعض قسم کی تہمتوں کے بارے میں تو شریعت میں حد بھی مقرر ہے۔ جیسے اگر کسی پر بدکاری کی تہمت لگائی گئی ہو تو تہمت لگانے والے فرد کو اسی کوڑے لگانے کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح اگر جھوٹی گواہی دی گئی ہے تو اس کی سزا بھی شریعت میں مقرر ہے۔ اسی طریقہ سے ان اصولوں پر قیاس کرتے ہوئے غلط خبر گھڑنا یا غلط خبر کو پھیلانا ' ان کے بارے میں بھی ہم اپنے قانون میں کچھ سزائیں تجویز کر سکتے ہیں۔

حضرات! آج ہمارے سامنے مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کو محکم رکھنے کے ضمن میں قرآن مجید کی دو اہم ہدایات و تعلیمات آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

آخرت پر ایمان (قسط نمبر ۳)

محمد غوری صدیقی

نیا کی چوتھی حیثیت...... چونکہ انسان نے جو بننا اور بنانا ہے اسی دنیا میں اور ایسی مختصر
ندگی میں بننا اور بنانا ہے۔ للذا اس لحاظ سے دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ انتہائی قیمتی ہے اور ایک
ب چیز توشۂ آخرت ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین کی فکر میں ایک گھڑی کا
ور وفکر ستر سال کی بے ریا عبادت سے بڑھ کر ہے۔ ہم کو دنیا کے وقت کی قیمت کا اندازہ لگانا
شوار ہو جاتا ہے دنیا کی اس حیثیت کو پیش نظر رکھا جائے تو مومن در حقیقت وقت کا سب سے
ا قدر دان ہوتا ہے۔ جیسا سورۂ مؤمنون میں مومن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ وقت کے
ساب سے اور مال کی ضمن میں۔

الَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○

"اور وہ (مومن) لغو کاموں سے بچنے والے ہوتے ہیں اور وہ لوگ تزکیہ (کردار کی
صفائی) پر ہمیشہ کاربند رہتے ہیں"۔ آخرت اور دنیا کی زندگی اور اس کی کوششوں کے بارے میں
للہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا
لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ○ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى
لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل)

جو کوئی چاہتا ہے دنیا (اور اس کے فائدے) تو ہم اس کو اسی میں جتنا ہم جس کے لئے چاہیں گے
دے دیں گے۔ پھر ہم نے اس کے لئے جہنم بنائی ہے اس میں ڈالا جائے گا ملامت زدہ ہو کر
اور جو چاہے گا آخرت (کی بھلائیاں) اور کرے گا اس کے لئے کوشش اور وہ صاحب ایمان
بھی ہوا تو اس کی کوشش ٹھکانے لگی یعنی کامیاب ہوئی۔

یعنی دنیا کے طالبوں کو ضروری نہیں ہے کہ ان کی محنت کے مطابق اور ہر ایک کو دنیا کے

فائدے مل جائیں۔ یہ اللہ نے اپنے اختیار میں رکھا ہے کہ جس کو چاہیں گے اور جتنا چاہیں گے عطا کر دیں گے لیکن پھر ان کے لئے جہنم میں ہی رہنا مقدر ہو گا۔ البتہ مومن جو آخرت کے لئے رات دن خون پسینہ ایک کرتا ہے اس کو اس کی محنتوں اور قربانیوں کا بھرپور بدلا دینے کی بشارت ہے۔

دنیا کی زندگی آخرت کے لحاظ سے جتنی اہم ہے قیمتی ہے حضورؐ کی احادیث سے بھی واضح ہے۔ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" (حدیث نبویؐ)

دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی جو یہاں بویا وہی کاٹنا ہے۔ دنیا کی زندگی کو آخرت کے بنانے اور سنوارنے کے لئے استعمال کیا جائے تو انسان اپنے خول سے نکل کر اللہ کی مخلوق کی فلاح و بہبود میں لگتا ہے۔

دنیا میں مومنین کا طرزِ عمل......

ہر صاحب ایمان کو عموماً اور اسلامی انقلاب کی راہ میں جدوجہد کرنے والے اصحاب عزیمت کے لئے خصوصاً دنیا کی محبت دل سے نکالنا اور آخرت کی محبت پیدا کرنی ہو گی۔ دنیا آخرت کے لئے سعی و محنت کا تناسب بھی تقریباً وہی رکھنا ہو گا جو کہ ان دونوں میں ہے۔ دنیا کی محبت اور اس کے متعلقات سے دل لگانا ہی دراصل گمراہی کی سب سے بڑی اور اصل وجہ ہے اسلامی انقلاب کے مجاہدوں کو سب سے پہلے اپنی سوچ میں یہ انقلاب پیدا کر کے اور آخرت کو پیش نظر رکھ کر اپنی شخصیت میں انقلاب پیدا کرنا ہو گا اور اس بات کو ہر دم مدنظر رکھ کر کہ

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القیامہ)

ہرگز نہیں (اے لوگو تمہاری اصل گمراہی یہ ہے کہ) عاجلۃ (دنیا) سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (سورۃ الاعلیٰ)

بلکہ اصل بات (گمراہی کی) یہ ہے کہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

جو لوگ دنیا کی محبت میں گم ہو کر اللہ اس کے رسولؐ اور اس کے دین کی راہ میں جہاد کی

محبت کو پیچھے ڈال دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کو فاسق کہا ہے۔ سورہ توبہ آیت نمبر ۲۴ میں ارشاد ہے جو کہ ہر مسلمان خصوصاً اقامت دین کا عزم رکھنے والوں کے لئے ایک ہمہ وقتی کسوٹی ہے اپنا جائزہ لیتے رہنے کے لئے اور دنیا کی گرفت سے اس کے سنہری جالوں سے بچنے کے لئے بھی۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ○

(التوبہ آیت نمبر ۲۴)

دنیا اور اس کی یہ آٹھ محبتیں ایک طرف اور دوسری طرف اللہ اس کے رسولؐ اس کے دین کیلئے جہاد کی محبت درمیان میں ہر انسان کھڑا امتحان میں مبتلا ہے کہ۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

آخرت کی کیفیت یا مراحل......

آخرت کے لفظ میں عالم برزخ (یا قبر)، قیامت، حشر نشر، حساب کتاب اور جنت و دوزخ (اور ان میں داخلہ) سب مرحلے داخل ہیں۔ ایک حدیث میں تصریح ہے کہ قبر (یعنی عالم برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ آنحضورؐ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ایک موت سے قیامت تک دوسرا قیامت سے ابد تک کہ جس میں پھر موت اور فنا نہیں ہے۔ پہلے دور کا نام برزخ اور دوسرے کا نام بعث (جی اٹھنا) یا حشر نشر (اکھٹے کئے جانا) اور قیامت (کھڑا ہونا) ہے۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ موجودہ زندگی کے خاتمے کے بعد دوسری دنیا یعنی آخرت کی زندگی ہے۔ اور موجودہ زندگی کے اصلی اور دائمی نتائج اسی دوسری زندگی میں نکلیں گے۔ حضورؐ کی ایک بہت پیاری حدیث کا ٹکڑا اس ضمن میں حرف آخر ہے۔

واللہ لتموتن کما تنامون ثم لتبعثن کما تستیقظون ثم لتحاسبن بما تعملون ثم لتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوءً وانھا

لجنۃ ابدا اولنار ابدا
"اللہ کی قسم تم سب لازماً مر جاؤ گے جیسے روزانہ سو جاتے ہو۔ اس کے بعد تم کو لازماً دوبارہ زندہ کیا جائے گا جیسے روزانہ جاگتے ہو۔ پھر لازماً تم سے تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور پھر لازماً تم سب کو بدلہ دیا جائے گا نیکی کا نیک اور برائی کا برا اور وہ ہمیشگی جنت یا ہمیشہ کی آگ ہو گی"۔

عالم برزخ میں ارواح انسانی کا مقام اور مسکن......

سورۂ اعراف میں مذکور ہے کہ فرشتے جب منکرین حق سے سوال و جواب کر چکیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی روحوں کو حکم دیں گے کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہو جائیں۔

سورۃ اعراف کی آیت ۴۰ میں ہے

"بے شک جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا اور ان کو ماننے سے غرور کیا ان کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے حتیٰ کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے" (یعنی کبھی نہیں)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نافرمانوں ' دین کے دشمنوں اور جھٹلانے والوں کی ارواح مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی کی حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی۔ حضورؐ کی حدیث مبارک ہے کہ "قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنا دی جاتی ہے (نیکو کاروں اور مجاہدوں کے لئے) اور یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا بنا دی جاتی ہے" (نافرمانوں اور منکرین کے لئے) اس کے برخلاف پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت کے وقت ہی رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود میزبان رحمت اس کے کانوں میں یہ مژدۂ جانفزا سناتی ہے اور رس گھولتی ہے۔

سورۃ الفجر میں ہے

"اے نفس مطمئنہ (اے نیکو کار انسان) (جو دنیا میں اللہ کی محبت میں مگن رہا) لوٹ آ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں"۔

ان سے بھی بڑھ کر وہ پاکباز ارواح ہیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں ' فانی زندگیوں ' مادی خوشیوں اور عارضی راحتوں کو خدا کی راہ میں ' اس کے دین کی سربلندی اور اقامت دین

کے لئے قربان کیا۔ باطل قوتوں اور باطل نظام سے ٹکرا گئیں تاکہ اللہ کی زمین پر اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو جائے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے۔ فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○ "اور جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہوئے قتل ہو جائیں ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں رکھتے۔"

یہ پر مسرت زندگی جو اسلام اور اقامت دین کے مجاہدوں کو ملے گی جنہوں نے کشمکشِ حق و باطل میں سینہ سپر ہو کر جان کا نذرانہ پیش کر دیا کیسی ہوگی اس کی تفصیل سورۃ آل عمران آیت ۱۶۹ سے ۱۷۱ میں ہے جس کا ترجمہ ہے:

"اور تم نہ سمجھو ان لوگوں کو مردہ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دیئے جاتے ہیں۔ وہ خوش ہوتے ہیں اس پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دیا اور خوشی حاصل کرتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک ان تک نہیں پہنچے ان کے پیچھے سے۔ اس واسطے کہ نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو کوئی غم ہے۔ وہ خوش ہوتے ہیں اللہ کی نعمتوں اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

یہ پر مسرت زندگی شہداء کو ملے گی۔ اس زندگی کا مقام "رب کے پاس" بتایا گیا ہے۔ احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان شہیدوں کی روحیں قفس عنصری (جسم) سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں۔ اور عرش الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں۔ (بعض وہ سعید اور خوش نصیب روحیں ہیں جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت جعفر طیارؓ کے متعلق احادیث میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے۔ عالم برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو در حقیقت ان کے ان دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو میدان جہاد میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور اس حالت میں بھی انہوں نے اسلام کے علم (جھنڈے) کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازوؤں اور گردن کے سہارے بلند اور قائم رکھا تھا حتیٰ کہ شہید ہو گئے) حضورؐ کی حدیث مبارکہ ہے کہ "شہید کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اس کو اس کی جنت دکھا دی جاتی ہے۔

قیامت اور حشر نشر

قیامت ۔۔۔ : حشر تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے اکٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ نفسی نفسی کا

عالم طاری ہو گا۔ ہر شخص اپنے گناہوں کے بقدر پسینے میں ڈوبا ہو گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تمام انسان مرد وزن ننگے ہوں گے لیکن کسی کو کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ اس دن تمام زمینی رشتے ختم ہو جائیں گے۔

سورۃ معارج آیت ۱۱تا۱۴ میں ہے جس کا ترجمہ ہے:

"کوئی جگری دوست نہ پوچھے گا دوست کو حالانکہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ اس دن مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کی خاطر فدیہ میں دے دے اپنے بیٹے، اپنی بیوی اپنے بھائی کو اپنے خاندان کو جو اس کو پناہ دیتا تھا اور جتنے بھی زمین پر ہیں سب کو اور پھر خود کو بچا لے"

سورۃ المزمل میں فرمایا یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا ○ "وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دینے والا ہو گا" اس دن فرمانبردار اور نیکو کار لوگوں اور نافرمانوں اور بدکاروں کا نتیجہ ان کے چہروں پر ظاہر ہو گا

سورۃ قیامہ آیت ۲۲ تا ۲۴

"کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوں گے۔ اور کچھ چہرے اس دن اداس اور بجھے ہوئے ہوں گے اور خیال کرتے ہوں گے کہ آج ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے"۔

"یَقُوْلُ الْکَافِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا ○

اس دن کافر پکار اٹھیں گے کہ ہائے ہماری بدبختی کاش ہم مر کر مٹی میں مل کر مٹی ہو گئے ہوتے یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ

بے عمل، غافل انسان حسرت سے کہیں گے۔ کہ ہائے ہماری بدبختی کاش ہم نے اپنی زندگی کے لئے کچھ (نیک اعمال) آگے بھیجے ہوتے"

سورۂ انشقاق آیت ۷ تا ۱۲ میں ہے۔

"پس جس کو اعمال نامہ ملا داہنے ہاتھ میں تو اس کا حساب ہو گا آسان اور وہ لوٹے گا اپنے لوگوں کے پاس خوش خوش۔ اور جس کو ملا بائیں ہاتھ میں اس کا نامہ اعمال پیٹھ کے پیچھے سے تو موت موت پکارے گا اور گرے گا آگ میں"۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اس دن سختی کے خیال سے کانپا کرتے تھے کہا کرتے تھے کہ کاش میں گھاس کا تنکا یا چڑیا ہوتا تاکہ محاسبہ سے بچ جاتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا روز حشر ابن آدم کے قدم ہلنے نہ دیئے جائیں گے جب

تک وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے دے گا۔

(۱) عمر کن کاموں اور مشغلوں میں لگائی۔

(۲) خصوصاً جوانی کا حصہ کیسے گذارا

(۳) مال کن طریقوں سے کمایا حلال یا حرام

(۴) مال کن راستوں پر خرچ کیا

(۵) علم (دین کا) کتنا حاصل کیا اور آگے کتنا پہنچایا

سورۂ حدید میں مذکور ہے کہ ایک سخت مرحلے (ہو سکتا ہے کہ پل صراط) سے گزرتے ہوئے مومنین کے ایمان اور اعمال کا نور ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ اور کامیابی تک پہنچا دے گا۔

سورۂ حدید آیت نمبر ۱۲ اور ۱۳ میں ہے

"اس دن تو دیکھے گا کہ مومن مردوں اور عورتوں کے آگے اور داہنے طرف ان کا نور دوڑتا ہو گا۔ خوش خبری ہے آج کے دن تم کو (کہا جائے گا) آج تمہارے لئے باغات ہیں جن کے دامن میں نہریں بہتی ہیں۔ یہ عظیم کامیابی ہے۔ اس دن منافق مرد و عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہم کو بھی اپنے نور کی روشنی سے فائدہ اٹھا لینے دو کہا جائے گا کہ (ہو سکے تو) واپس لوٹ جاؤ (دنیا میں) اور وہاں یہ روشنی ڈھونڈو ان کے درمیان ایک فصیل کھڑی کر دی جائے گی جس میں ہو گا دروازہ اس کے اندر رحمت ہو گی اور اس کے باہر عذاب ہو گا۔"

بقیہ: ایک خط اور اس کا جواب

میرے بیان سے آپ کو طنز کے تیر نکلتے نظر آئے تو کچھ غلط نہیں۔ خدارا انصاف کیجئے! جو لوگ غلط پٹیاں پڑھا کر اور بڑھاوے دے کر بھلے مانس لوگوں کو غلط فہمی کی دلدل میں پھنسا آئے، انہیں طنز کے نشتر سے بھی واسطہ نہ پڑے؟ کیا انہیں تمغے دیئے جائیں گے؟......بایں ہمہ آپ میرے لئے دعا کرتے رہیئے اور گاہے گاہے رہنمائی بھی فرمایئے۔ سوز دروں میں کمی آئی تو تحریر میں سے یہ عیب ویسے بھی کم ہوتا ہی چلا جائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا وہ حق شناسی ہے، لیکن اس کا منطقی تقاضا یہ بھی تو ہے کہ ان کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔

والسلام مع الاکرام

خاکسار اقتدار احمد عفی عنہ
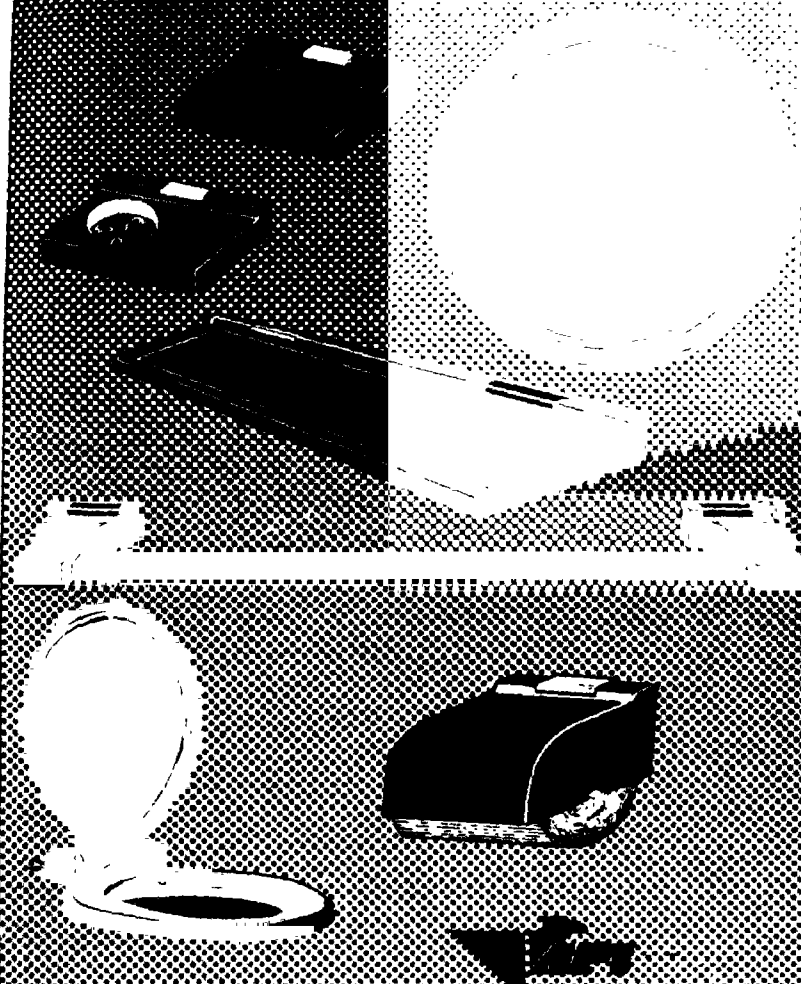
ایک خط اور اس کا جواب

محترم و مکرم جناب اقتدار احمد صاحب

السلام علیکم۔ میں ماہنامہ میثاق اور ہفت روزہ ندا کا مستقل قاری ہوں۔ آپ کے تبصرے میری خصوصی توجہ کا "ہدف" بنتے ہیں۔ آپ کی ہر تحریر خلوص، للّٰہیت اور جوش و جذبہ سے لبریز ہوتی ہے۔ تاہم اکتوبر کے میثاق کا عرض احوال پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوا کہ آپ بعض محاورات اور روز مرہ کے استعمال میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد کی طرح احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ جو آپ ایسے ثقہ صحافی کو زیب نہیں دیتا۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

لنگر لنگوٹ کس کر' مثلہ۔ ڈاکٹر اسرار احمد خود تو اس "چکر" میں پڑے ہی نہ تھے۔ یا ڈاکٹر اسرار احمد منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھے رہیں۔ شق (پیرا نمبر ۴) کی تحریر طنز و تشنیع کے تیروں سے چھلنی کرنے والی ہے۔ دھوکے کی ٹٹی۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانا۔

ہم توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ آپ کی تحریریں ایسے دلآزار الفاظ و محاورات سے پاک ہوں گی۔ امید ہے آپ ایک نادیدہ مخلص متعلم کی صاف گوئی کا برا نہ مانیں گے۔

جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے قومی و سیاسی تاریخ کے تناظر میں مذہبی و سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کو بر وقت صائب مشورے دیئے ہیں۔ صاحب موصوف بجا طور پر مذہبی جماعتوں کی فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف قلمی جہاد کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت جس مقام پر ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ قوم ان کی باتیں گوش ہوش سے سنے اور ان پر کان دھرے بلاشبہ ڈاکٹر صاحب پاکستان کے بزرگ مذہبی رسیاسی سٹیٹس مین ہیں۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترم پروفیسر غازی احمد اب ڈاکٹر صاحب کے دست و بازو بن گئے ہیں۔

والسلام محمد اکرم طاہر

ڈائریکٹر ادارہ تربیت اساتذہ و تحقیق میرپور

محترم جناب محمد اکرم طاہر صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'

قرائن سے اندازہ ہوا کہ آپ میرے بزرگ ہیں لہٰذا میرا جواب بہت مؤدبانہ ہوتا

چاہئے۔ تاہم کہیں کوتاہی ہو جائے تو معاف فرما دیجئے گا۔

میری تحریروں کا آپ کی توجہ کا ہدف بننا میرے لئے ایک اعزاز ہے اور ان میں اگر خلوص اور جوش و جذبہ آپ نے پایا تو یہ داد بھی میرے رہوارِ قلم کو مہمیز کا کام دے گی۔ البتہ للّٰہیت کا معاملہ اللہ اور بندے کے درمیان ہے۔ لکھتا تو اسی امید پر ہوں کہ میرے قلم کی کاوش شرف قبولیت پائے گی' دعا فرمایئے کہ یہ کاوش میرے نفس کو عُجب کی ہلاکت میں ڈالنے کی بجائے توشۂ آخرت فراہم کرے۔

آپ خود ماشاءاللہ صاحب ذوق اور قلم کے دھنی ہیں لیکن شاید اس طرف آپ کی توجہ مبذول نہیں ہوئی کہ "میثاق" میں میری تحریر کا عنوان ہی "عرض احوال" ہوتا ہے۔ اور کوئی دکھی دل اپنا حال بیان کر رہا ہو تو اسے زبان و بیان کے قواعد و ضوابط کی باریکیوں اور محاورات و روزمرہ کے استعمال میں ضرورت سے بھی زیادہ احتیاط کا پابند بنانا آہ و فغاں سے سُر تال کی لطافت کے تقاضے کے مترادف ہے۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد محاورات اور روزمرہ کے استعمال میں احتیاط کا دامن کیسے ہاتھ سے چھوڑتے تھے' اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں لیکن مجرد ان کے ساتھ نسبت ہی میرے لئے تعجب کا باعث ہوئی۔ کہاں مولوی نذیر احمد جیسے لوگوں کی تحریریں جن کا شمار اردو زبان و ادب کے مربّیوں میں ہوتا ہے اور کہاں اس مبتدی کی مشقیں۔ کجا رام رام کجا ٹیں ٹیں! اور یہ میں ثقہ صحافی کب سے قرار پایا؟۔ "ندا" میں ہی انتظار حسین کا ایک کالم چھپا تھا کہ کچھ لکھنے والے صحافت میں ادب بگھارتے ہیں اور کچھ ادب میں صحافت کی جولانیاں دکھاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا شمار نہ صحافیوں میں ہوتا ہے' نہ ادیبوں میں۔ میرا حال ایسے لوگوں سے مختلف نہیں۔ ہاں متانت و ثقاہت کا مجھے ضرور خیال رکھنا چاہئے کہ ہمارے دین کا مزاج یہی ہے۔

آپ کے توجہ دلانے کے باوجود مجھے ان محاوروں اور روزمرہ کے استعمال میں ابتذال یا دلآزاری کا کوئی پہلو نظر نہ آیا جو اس تحریر میں آئے ہیں۔ یقین مانیئے میں نے انہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے نکالا نہ تھا' روانی میں از خود نوکِ قلم پہ چلے آئے۔ حالات و واقعات کے تیزی سے گردش کرتے ہوئے پہیئے کا ذکر کر کے اگر میں نے یہ لکھا کہ "ڈاکٹر اسرار احمد خود تو اس چکر میں پڑے ہی نہ تھے" تو پہیئے اور چکر میں لفظی و معنوی مناسبت ظاہر ہے۔ (ویسے میں نے چکر کو واوین میں نہ رکھا تھا جیسا کہ آپ نے کیا اور اس سے بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے)۔ پچھلے عام انتخابات کے ضمن میں اسلام پسند صحافیوں اور دانشوروں کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے

پاکستان کا
نمبر
1
بائیسکل
سہراب

ایک مسنون دُعا

اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا مِنَ النِّفَاقِ وَاَعْمَالَنَا مِنَ الرِّيَاءِ وَاَلْسِنَتَنَا مِنَ الْكَذِبِ وَاَعْيُنَنَا مِنَ الْخِيَانَةِ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ۔

ترجمہ

اے اللہ ہمارے دِلوں کو نفاق سے پاک کر دے اور ہمارے اعمال کو ریا سے اور ہماری زبانوں کو جھوٹ سے اور ہماری آنکھوں کو خیانت سے تجھ پر روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

* * *

THLY
leesaq
IORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No. 12
DECEMBER 1988